الف اللہ
اور
انسان
قیصرہ حیات
WWW.PAKSOCIETY.COM

اللہ اور انسان کے انجانے "قریبی مگر پُر اسرار تعلق" پر لکھی گئی ایک منفرد تحریر...... کتاب گھر کے قارئین کے لیے ایک تحفہ خاص

# الف اللہ اور انسان



قیصرہ حیات

## انتساب!

اللہ اور انسان کے انتہائی

"قریبی مگر پُراسرار تعلق"

کے نام

# دیباچہ

لفظ "شاہکار" بولتے ہی ذہن میں ایک ایسی چیز کا تاثر ابھرتا ہے جو انتہائی خوبصورت اور ہمہ جہت ہو۔ جس کے ہر ہر زاویے میں مکمل ہم آہنگی اور خوبصورت تناسب ہو جو منفرد بھی ہو اور مربوط بھی۔ جس کا ہر پہلو حیران کن اور ہر جہت دلفریب اور چونکا دینے والی ہو۔

جس کا 'ظاہر' بھی حیران کرے اور باطن بھی۔ مگر اتنا خوبصورت اور 'مکمل' ہونے کے باوجود بھی اس کا ہر پہلو منظر عام پر آنے تک ایک 'سوال' بنا رہے۔ اپنے لیے بھی...... اور...... دوسروں کے لیے بھی...... جس کے بارے میں حتمی طور پر کچھ بھی نہ کہا جا سکے۔

اس کے 'اسرار' کھلنے کے باوجود بھی وہ پھر بھی اک 'اسرار' رہے۔

کائنات اور اس کی مخلوقات کا مشاہدہ کرنے کے بعد ذہن اس کرۂ ارض کی سب سے منفرد مخلوق 'انسان' پر آ کر رک جاتا ہے اور انسان کے بارے میں کئی سوالات سر اٹھانے لگتے ہیں۔

'انسان' کیا ہے؟

اسے خود بھی معلوم نہیں......

انسان کس شے سے بنا ہے......؟

مٹی سے یا نطفے سے......؟ وہ حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔

اس کے اندر کیا کچھ پوشیدہ ہے؟

دنیا کے تمام علوم پر مہارت اور دسترس رکھنے کے باوجود بھی وہ اس کا جواب دینے سے قاصر ہے۔

وہ اگلے لمحے کیا کرے گا؟ وہ خود بھی نہیں جانتا۔

اس کے 'ظاہر' اور 'باطن' میں تضاد کیوں ہے؟ اسے اس کی کوئی آگہی نہیں۔

اس کے جسمانی اعضاء اور نظام کے افعال کی کارکردگی کا اصل سرچشمہ کون سی قوت ہے؟ اسے اس کا بھی شعور نہیں۔

اس کی ہر لحہ بدلتی سوچ، نت نئے خیالات، احساسات، جذبات کس کس طرح اس کی نفسیات اور دنیاوی معاملات پر اثر انداز ہوتے ہیں؟ وہ خود بھی سوچ کر حیران رہ جاتا ہے۔

اپنی پیدائش سے لے کر موت تک وہ اپنے لیے بھی ایک سوال بنا رہتا ہے اور دوسروں کے لیے بھی۔

اس کا آغاز بھی مبہم ہے اور انجام بھی اک راز ہے۔ اس کے اپنے دعوے ہی کھوکھلے ثابت ہوتے ہیں۔ اس کی سوچیں قدم قدم پر اس کو مات دیتی ہیں۔ اس کی منصوبہ بندیاں کبھی کبھی اسے بری طرح ناکام کرتی ہیں اور کبھی کبھی معمولی کوشش اسے کامیابیوں کی معراج تک پہنچا دیتی

ہے۔ ذرۂ خاک دنیائے آسمان پر آفتاب بن کر چمکنے لگتا ہے۔ انسان خود بھی حیران رہ جاتا ہے اور دوسرے لوگ بھی حیرت سے اسے دیکھتے رہ جاتے ہیں، قدرت کا تخلیق کردہ یہ شاہکار انسان۔ کئی ہزار پرت کا مجموعہ ہے اور ہر پرت کھلنے پر وہ اک نئے اسرار سے آشنا ہوتا ہے اور ہر اسرار اس پر اس کی نئی حقیقت واضح کرتا ہے تو وہ خود ہی چونک جاتا ہے اور پھر چونک کر کائنات کی دائمی اور ابدی قوت 'اللہ' کی طرف دیکھتا ہے۔

جو خود بھی ایک ایسا 'اسرار' ہے، جس کی حقیقت کو سمجھنا انسان کے بس سے باہر ہے مگر اس 'اسرار' کی جستجو کی طلب اس نے ہر انسان کے دل میں ڈال دی ہے یوں جیسے انسان ایک ایسی نظر نہ آنے والی ڈور سے بندھا ہے جس کے سرے قدرت کے ہاتھ میں ہیں۔ وہی انسان کو رلاتا بھی ہے، ہنساتا بھی ہے اور چلاتا بھی ہے وہ انسان کے رگ و پے میں ایک ایسی طاقت ہے جو انسان کو ہر دم متحرک رکھتی ہے۔

'اللہ' اور 'انسان' کا کیا تعلق ہے؟

یہی اس ناول کا حقیقی موضوع ہے جو اپنے موضوع کی طرح پیٹرن میں بھی منفرد ہے اور میری دوسری تحریروں سے بہت مختلف ہے۔ اس کی انفرادیت اور تخلیق کا کریڈٹ میں صرف اللہ رب العزت کو دیتی ہوں۔ جس نے مجھے اس کام کے لیے منتخب کیا ہے اور یقیناً اس ناول کو پڑھنے کے بعد ہر قاری کے ذہن میں یہ سوال ضرور ابھرے گا کہ یہ ناول میں نے کیا سوچ کر......اور......کس سے متاثر ہو کر لکھا ہے؟

اس کا جواب یہی ہے کہ دسمبر 2008ء کی ایک صبح نماز فجر کے بعد اس ناول کا پیٹرن، نوری مخلوق (فرشتوں) کا بڑی سرکار (اللہ) سے انسان کے پتلے کے بارے میں بحث و مباحثہ اور ٹائٹل 'الف اللہ اور انسان' میرے ذہن میں نمودار ہوئے۔ میں خود بھی چونکی اور اس پر کام شروع کر دیا اس لیے میں اسے مکمل طور پر intutive ناول کہوں گی۔

اس ناول کی تقسیم جہاں، بہت منفرد ہے وہیں اپنے اندر بے پناہ وسعت لیے ہوئے ہے۔ اس کے چار مخصوص حصے ہیں۔

حصہ اوّل: اس حصے میں نوری مخلوق کی بڑی سرکار سے انسان کے پتلے کو دیکھ کر اس کی ظاہری و باطنی خصوصیات کے بارے میں بحث ہے۔ انسانی جسم کے اہم اعضاء یعنی دل، دماغ، معدہ اور آنکھیں بتلا کر ان کی مخصوص باطنی صفات محبت، عقل، خواہش اور عشق کو ڈسکس کیا گیا ہے۔

حصہ دوم: اس حصے میں محبت، عقل، خواہش اور عشق کے موضوعات پر انسانوں کی چار کہانیاں ہیں۔ جن میں انسانوں کے احساسات، جذبات، غم و خوشی، دکھ، درد، مصائب و آلام اور جسمانی و روحانی اذیتوں کو پیش کیا گیا ہے۔ لیکن ان کہانیوں کے آغاز میں بہت مختصر انداز میں دل، دماغ، معدے اور آنکھوں کے بارے میں سائنسی معلومات دی گئی ہیں ان کو لکھنے کا مقصد صرف یہی ہے کہ کس طرح سب انسانوں میں دھڑکنے والے دل، سوچنے والے دماغ اور دیکھنے والی آنکھیں ظاہری طور پر ساخت میں اور افعال میں ایک جیسی ہیں مگر باطنی خصوصیات میں سب ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ایک انسان کی سوچ دوسرے سے کبھی نہیں ملتی۔ ایک کی خواہشات اور جذبات کبھی دوسرے کی طرح نہیں ہو سکتے۔ اگر ایک چیز کسی انسان کی زندگی کا حاصل ہے تو دوسرے کے لیے بے معنی۔

حصہ سوم: ''انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا! یہ اس کی نفسیات ہے۔ وہ نہ کبھی مطمئن ہوتا ہے اور نہ ہی مکمل طور پر پر سکون۔ وہ ذرا سی تکلیف پر پریشان اور واویلا کرنے لگتا ہے اور ذرا سی خوشی پر اچھلنے کودنے لگتا ہے۔ اتنی طویل زندگیاں گزارنے کے بعد بھی انسان یہی سوچتا ہے کہ اس کی زندگی ضائع گئی اور انسانوں کی اکثریت ہر وقت قدرت سے یہی شکایت کرتی ہے کہ اسے کیوں پیدا کیا گیا؟ اس حصے میں

انسانوں کی اکثریت شکوے شکایات اور اپنی پریشانیوں پر واویلا کرتی ہے سوائے چند لوگوں کے جو اللہ کی رضا پر راضی رہتے ہیں۔

حصہ چہارم: حصہ اوّل کا اختتام انسان کو قدرت کا 'شاہکار' کہنے پر ہوتا ہے اور حصہ چہارم میں انسان کو قدرت کا 'شاہکار' ثابت کیا گیا ہے اور یہی اس ناول کو لکھنے کا مقصد ہے۔ یعنی اللہ اور انسان کے تعلق کو واضح کرنا۔ جب انسان اپنے آپ کو سمجھ کر اللہ سے اپنے تعلق کو مضبوط بناتا ہے تو انسان اللہ کے قریب ہوتا جاتا ہے۔ اس قربت سے اس کے اندر روحانی بصیرت اور اللہ کی ذات کا عرفان پیدا ہونے لگتا ہے اور اس عرفان سے اس کے اندر وجدان کے ایسے در وا ہونے لگتے ہیں۔ جو اسے اسرار حقیقی سے آشنا کرتے ہیں۔ ظاہری طور پر عام شکل و صورت اور حلیے کا انسان بھی اپنے اندر ایسی کائنات سمیٹے ہوئے ہے، جس سے وہ خود بھی واقف نہیں۔ اس لیے انسان اس دنیا میں اللہ کا ایک ایسا 'شاہکار' ہے جو خوبصورت بھی ہے اور ہمہ جہت بھی۔ جو مکمل بھی ہے اور ہم آہنگ بھی۔ جو حیران کن بھی ہے اور حیرت انگیز بھی۔

قدرت کا 'شاہکار' انسان مادیت کے اس دور میں اپنی اہمیت کھو رہا ہے۔ اسے شعور ہی نہیں کہ قدرت نے اسے کن بیش بہا صلاحیتوں اور خوبیوں سے نوازا ہے۔ اس کے لیے نہ اپنی زندگی کی کوئی اہمیت رہی ہے اور نہ دوسروں کی زندگی و عزت کی۔ ...ایک دوسرے کو ذہنی و جسمانی تکالیف پہنچانے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا گویا ہر طرف اک افراتفری اور مایوسی کی فضا پھیلی ہے۔

آج کا انسان اپنے آپ سے بھی مایوس نظر آتا ہے اور خدا سے بھی۔ ...اور یہ اس دور کا بہت بڑا المیہ ہے کہ بے شمار خوبیوں کا مالک انسان 'ناامید' ہو جائے اور وہ 'ناامید' تب ہی ہوتا ہے جب اس کا ایمان اس ہستی پر سے اٹھنے لگتا ہے جو امر 'کن' سے کائنات کو نیست و نابود بھی کر سکتی ہے اور بنجر و ویرانوں کو نخلستانوں میں بھی بدل سکتی ہے۔ اس ناول میں اللہ اور انسان کے درمیان اس پر اسرار تعلق کو واضح کر کے انسان کو 'پُر امید' رہنے کا پیغام دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ جوں جوں انسان 'پر امید' ہو کر اللہ کی طرف دیکھے گا اس کے لیے زندگی اور اس کی مشکل راہیں آسان ہوتی جائیں گی ضرورت صرف یقین کامل اور غیر متزلزل ایمان کی ہے۔ میں اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوئی ہوں فیصلہ قارئین کے ہاتھ میں ہے۔

اس ناول کی معاونت میں، میں اپنی چھوٹی بہنوں سنبل، خولہ اور بہت پیاری دوست رفعت منظور کی بے حد مشکور ہوں اور ان کی صحت اور زندگی میں کامیابیوں کے لیے دعا گو ہوں۔

منجانب

قیصرہ حیات

محرم الحرام، جنوری 2011ء

# حصہ اوّل

تمام نوری مخلوق انتہائی مئودبانہ انداز میں بڑی سرکار کے شاہی دربار میں کھڑی تھی۔ ان کے ساتھ ان کا لیڈر سب سے آگے کھڑا تھا، جو بڑی سرکار سے بہت محبت اور عقیدت کا دعویدار تھا اور جس کی اطاعت اور عبادت کی وجہ سے بڑی سرکار کے دربار خاص میں اسے انتہائی اہم مقام حاصل ہوا تھا۔ اس کے مقام و مرتبے کی وجہ سے بھی نوری مخلوق اس کی بہت عزت کرتی تھی۔ وہ سب حیران ہو رہے تھے کہ بڑی سرکار نے انہیں کس خاص مقصد کے لئے جمع ہونے کا حکم دیا ہے، کیونکہ بڑی سرکار اپنے ارادے، فیصلوں اور احکامات میں مختار کُل تھی۔ اسے کسی کے مشورے کی ضرورت نہ تھی۔

پھر ایسی کیا خاص بات ہے......؟ کیا اہم واقعہ رونما ہونے والا ہے کہ بڑی سرکار نے انہیں حاضر ہونے کو کہا تھا۔

انتہائی سفید، چمکدار اور آنکھوں کو خیرہ کرنے والی روشنی نے تمام دربار کو اپنی پرنور تابانیوں سے منور کر رکھا تھا۔ کسی کی آنکھ میں اتنی سکت نہ تھی کہ وہ اس روشنی کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھ سکتا۔ روشنی کی بدلتی چمک سے وہ بڑی سرکار کے تاثرات کا اندازہ کر لیتے۔ اس روشنی سے انتہائی پر جلال اور بارعب آواز بلند ہوتی۔ جس کے سامنے کسی کو بولنے کی جرات نہ تھی، مگر آج ان کو بڑی سرکار کے حکم سے بولنے کی اجازت دی گئی تھی۔ اس اذن نے ان کو مزید حیران کر دیا تھا۔ وہ منتظر تھے اور مضطرب بھی...... کہ نجانے کیا ہونے والا ہے۔ بالآخر بڑی سرکار کے حکم سے مٹی کا ایک پتلا ان کے سامنے پیش کیا گیا۔ مجمع میں سراسیمگی سی پھیل گئی۔ وہ حیرت اور تجسس سے اس کی جانب دیکھنے لگے۔ ان کے لیڈر نے پتلے کو دیکھا تو اس کے اندر اضطراب پیدا ہونے لگا۔ یہ...... یہ...... کیا ہے؟ لیڈر نے پوچھا۔

''مٹی کا پتلا...... جب اس میں...... میں اپنی روح پھونکوں گا تو یہ زندہ...... چلتا پھرتا...... باتیں کرتا ہوا...... بھاگنے دوڑنے والا ''انسان'' ہوگا۔'' بڑی سرکار نے جواب دیا۔

''انسان......؟'' لیڈر نے حیرت سے پوچھا۔

ہاں...... اشرف المخلوقات۔ میری پیدا کردہ تمام مخلوقات میں سب سے افضل...... اور مجھے سب سے عزیز تر ہوگا...... اور پوری کائنات میں یہ میرا ''شاہکار'' ہوگا۔ بڑی سرکار نے فخریہ انداز میں جواب دیا۔

شاہکار......؟ سب چونکے اور آہستہ آہستہ بڑبڑائے۔

''ہاں...... شاہکار......؟ بڑی سرکار نے جواب دیا۔

''حقیر مٹی سے تخلیق ہونے والا...... حقیر انسان؟ لیڈر نے قدرے حقارت سے پتلے کی جانب دیکھ کر کہا۔

''یہ زمین کے لئے تخلیق کیا جا رہا ہے اور زمین مٹی سے بنی ہوگی۔ یہ مٹی سے ہی جنم لے گا اور اسی میں دفن ہوگا...... زمین کی تخلیق کے اہم عناصر مٹی، ہوا اور پانی مل کر اس کا وجود تشکیل دیں گے اور یہ حقیر ہرگز نہیں ہوگا۔'' بڑی سرکار نے پرسکون انداز میں جواب دیا۔

اچانک سفید، چمکدار روشنی کی چند شعاعیں پتلے پر پڑیں تو کہیں سے یہ سفید، کہیں سے کالا، کہیں سے بھورا اور کہیں سے سیاہی مائل نظر آنے لگا۔ سب چونک کر اسے دیکھنے لگے۔

یہ ایک جیسا کیوں نظر نہیں آتا؟ حاضرین محفل میں سے ایک نے انتہائی حیرت سے پتلے کی جانب دیکھا اور سوال کیا، جس پر روشنی کی شعائیں مختلف انداز میں پڑ رہی تھیں۔

انسان جسمانی طور پر ایک جیسے ہوں گے، مگر رنگ، شکل وصورت اور جسامت میں دنیا کے سب انسان مختلف ہوں گے۔ کسی کو میں سفید، کسی کو کالا، کسی کو بھورا، کسی کو پتلا، کسی کو لمبا اور کسی کو چھوٹا، کسی کو اپاہج، کسی کو عقل سے عاری، کسی کو ذہین اور عقلمند بناؤں گا اور انہی میں سے اس کے ہم جنس اور جنس مخالف، یعنی مرد و زن پیدا کروں گا۔ جن کے ملاپ سے نسل انسانی نشوونما پائے گی۔ بڑی سرکار نے جواب دیا۔

ایک انسان دوسرے سے کیسے مختلف ہوگا؟ مجمع میں سے کسی نے پوچھا۔

''میں زمین کو مختلف رنگوں کا بناؤں گا، کہیں ہموار زمین، کہیں ریگستان، کہیں سرسبز و شاداب پہاڑ، کہیں مٹی جیسے سنگلاخ پہاڑ، کہیں برف پوش چوٹیاں، کہیں پانی کے وسیع سمندر، کہیں زمین کے اندر جہیں تخلیق کروں گا۔ ان مختلف زمینی حصوں میں مختلف قسم کی ہوائیں چلاؤں گا ان ہواؤں سے وہاں کے موسم بدلیں گے۔ یہ موسم اور ہوا وہاں کی مٹی پر اثرانداز ہوں گے اور انہی عناصر کی وجہ سے زمین کے ایک حصے کے لوگ دوسروں سے مختلف ہوں گے، نہ صرف یہ بلکہ وہاں پر پیدا ہونے والے پھل، پھول، اناج اور انسان کی ضروریات کی تمام چیزیں زمین کے دوسرے حصوں سے مختلف ہوں گی۔ یہاں تک کہ ہوا میں اڑنے والے پرندے ان کے رنگ، زمین پر چلنے والے جانور اور رینگنے والے کیڑے مکوڑے، سب کچھ ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے۔ بڑی سرکار نے جواب دیا۔

''آپ پھل، پھول، پرندے، جانور اور کیڑے مکوڑے کیوں پیدا کریں گے......؟ کسی نے سوال کیا۔

''میں یہ سب کچھ انسان کے لئے تخلیق کروں گا۔ اسے زندہ رہنے کے لئے جس شے کی بھی ضرورت ہوگی وہ میں کثرت سے اسے فراہم کروں گا۔ زمین کے ہر حصے کے انسانوں کی ضروریات مختلف ہوں گی اور میں زمین کے اندر اور باہر کو ان کی ضروریات کی چیزوں سے بھر دوں گا۔'' بڑی سرکار نے جواب دیا۔

''صرف انسان کے لئے...... اتنا کچھ؟ نوری مخلوق میں سے ایک اور نے سوال کیا۔

''ہاں...... میں اس کے لئے بے شمار مخلوقات، پانی میں زمین کے اندر، زمین کے اوپر تخلیق کروں گا۔ اس کے علاوہ زمین کے اوپر خوبصورت نیلا آسمان اس پر چمکنے والا سورج، جو زمین کو دن کے وقت روشن اور گرم رکھے گا، وہ تخلیق کروں گا، تاکہ دن میں انسان کام کرے اور اس کے آرام کے لئے سیاہ، خاموش، پرسکون اندھیری رات بناؤں گا اور جب رات کو آسمان تاریک ہو جائے گا تو اس پر روشنی کے ننھے منے ستارے اور خوبصورت روشنی سے بنا ہوا چاند بناؤں گا۔ یہ سب چیزیں زمین کی خوبصورتی میں اضافہ کریں گی اور انسان ان سے لطف اٹھائے گا۔ اس آسمان میں اڑنے والے رنگ برنگی، خوبصورت، گنگناتے چرند پرند سب کچھ انسان کے لئے تخلیق کروں گا۔'' بڑی سرکار نے محبت سے جواب دیا تو تمام نوری مخلوق حیران ہوگئی۔

''آپ انسان کو کیوں تخلیق کر رہے ہیں؟ لیڈر نے قدرے مضطرب ہو کر پوچھا۔

''سفید روشنی چمکی..... مگر کوئی جواب نہ دیا گیا..... جیسے بڑی سرکار اس سوال کا جواب ابھی نہ دینا چاہتی ہو۔ لیڈر اور مضطرب ہونے لگا۔ ہر طرف گہرا سکوت چھا گیا۔

''کیا انسان ہمیشہ زمین پر رہے گا؟'' کسی نے سوال کیا۔

''میں اس پتلے سے، بہت سے انسان مختلف شکلوں اور رنگوں کے پیدا کروں گا۔ نسل انسانی مختلف ادوار سے گزرے گی۔ بچپن سے جوانی، جوانی سے بڑھاپا اور پھر ان کو ایک خاص مدت یعنی عمر گزارنے کے بعد میں ان کو موت دوں گا اور مر کر وہ زمین میں دفن ہو جائیں گے.....'' بڑی سرکار نے جواب دیا۔

''وہ زمین پر رہ کر کیا کرے گا؟'' کسی ایک نے پوچھا۔

''دنیا کے سب انسان کچھ کام ایک جیسے کریں گے جیسے کھانا، پینا، سونا، جاگنا اپنی نسل کو بڑھانا .....'' بڑی سرکار نے قدرے توقف کیا۔

''اتنے سب کام آپ سب انسانوں کو کیسے سکھائیں گے؟'' حاضرین میں سے ایک نے پوچھا۔

''یہ سب انسان کی جبلت میں شامل ہوں گے..... یعنی پیدائش کے ساتھ ہی وہ ان کاموں کو خود بخود کرنا سیکھ لے گا۔ میں تخلیق کے وقت یہ سب کچھ اس کے اندر پیدا کردوں گا اور تا حیات یہ سلسلہ جاری رہے گا۔'' بڑی سرکار نے جواب دیا۔

''کیا انسان اپنی موت تک صرف یہی کام کرے گا؟'' لیڈر نے پوچھا۔

''نہیں..... ان کاموں کے علاوہ میں انسان کو کچھ مخصوص کاموں میں مصروف رکھوں گا..... جن کے ذریعے وہ اپنی بنیادی ضروریات یعنی کھانے پینے اور زندگی گزارنے کے لئے کئی دیگر ضروریات کو پورا کرے گا۔'' بڑی سرکار نے جواب دیا۔

''کیا انسان زمین پر صرف اس مقصد کے لیے بھیجا جا رہا ہے؟'' لیڈر نے معنی خیز انداز میں قدرے حقارت سے پوچھا۔

''نہیں..... ہر انسان کے اندر میں ایسی جستجو بھر دوں گا، جو اسے ان بنیادی کاموں کے علاوہ اور بہت کچھ کرنے پر مجبور کرے گی۔ کوئی پرندوں کی طرح ہوا میں اڑنے کی جستجو کرے گا، کوئی پانی کی مخلوق کی طرح تیرنا چاہے گا، کوئی پہاڑوں اور برف پوش چوٹیوں کو سر کرنے کی کوشش کرے گا، کوئی مختلف اور انوکھی اچھوتی چیزیں بنانے کا شوقین ہوگا، ہر وہ چیز جو اسے حیران کرے گی۔ وہ متجسس ہو کر اس کے بارے میں سوچے گا اور اس جیسا بننے کی کوشش کرے گا۔'' بڑی سرکار نے جواب دیا۔

''انسان یہ سب کام کیوں کرے گا؟'' حاضرین میں سے ایک نے سوال کیا۔

''میں انسان کے اندر ایسا اضطراب پیدا کروں گا جو اسے ہر وقت بے چین اور بے قرار رکھے گا۔ اس اضطراب کو دور کرنے کے لئے وہ کبھی زمین کی تہوں کو کھود ڈالے گا..... کبھی پہاڑوں کی چوٹیوں کو سر کرے گا اور کبھی چاند ستاروں تک بھی پہنچ جائے گا، مگر اس کو سکون نہیں ملے گا۔'' بڑی سرکار نے جواب دیا۔

''اور..... سکون..... اسے کہاں ملے گا؟'' انتہائی حیرت سے سوال کیا گیا۔

''اگر سکون...... میں پہاڑوں کی چوٹیوں، زمین کی تہوں اور سمندروں کی گہرائی میں رکھوں تو انسان اسے وہاں سے بھی حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ مگر میں سکون کو انسان کے اندر رکھوں گا۔ جس کے بارے میں وہ بہت کم سوچے گا۔'' بڑی سرکار نے جواب دیا۔

''انسان کے اندر، کیسے......؟ اور کیا؟ کسی نے حیرت سے پوچھا۔

''جسمانی طور پر دنیا کے سب انسان ایک جیسے ہوں گے اور انسان کو متحرک رکھنے والے جسمانی نظام اور پرزے بھی ایک جیسے ہوں گے، مگر انسان کے اندر ایک اور انسان ہوگا جو اسے خود بھی نظر نہیں آئے گا، مگر جس کے وجود کو وہ اچھی طرح محسوس کرے گا۔ اندر کا یہ انسان اس کے نفس...... باطن...... اور روح سے تشکیل پائے گا۔'' بڑی سرکار نے جواب دیا۔

''نفس...... کیا ہوگا؟'' پوچھا گیا۔

''خیر و شر...... اور خوبیوں و خامیوں کا مجموعہ، لامحدود خواہشات اس کے نفس میں جنم لیں گی اور ان کے حصول کے لئے وہ جائز و ناجائز ہر طریقے سے جدوجہد کرے گا۔ نیکی و بدی، لالچ و حسد، خودغرضی اور حرص و ہوس سب اس کے نفس میں ہوگا اور نفس ہر وقت کسی نہ کسی خواہش اور اس کے حصول کے لئے مضطرب و بے چین رہے گا۔ انسان ہر وقت اپنے نفس کی قید میں رہے گا، جو انسان اس پر قابو پائے گا اور اس کی قید سے آزاد ہوگا۔'' نفس کی اچھائی یا برائی۔ اس کے باطن کو تشکیل دے گی، جو انسان اپنے نفس پر قابو پائے گا تو اس کا باطن اچھا ہوگا۔ نفس کی خصوصیات اس کے باطن کی خوبصورتی اور بدصورتی میں اضافہ کریں گی۔'' جواب دیا گیا۔

''کیا انسان کا باطن نفس سے تشکیل پائے گا؟'' حیرت سے پوچھا گیا۔

''ہاں...... انسان کا نفس ہر وقت انسان کے اندر ہلچل، ہنگامہ اور بے قراری پیدا کرے گا، نفس کی پاکیزگی سے باطن روشن اور برائی سے باطن تاریک ہوگا۔'' بڑی سرکار نے جواب دیا۔

''اور...... روح کیا ہوگی؟'' حاضرین میں سے ایک نے پوچھا۔

''ہر مٹی کے پتلے میں جب میں اپنی روح پھونکوں گا تو وہ زندہ اور متحرک انسان ہوگا۔ انسان کے جسم کا تعلق ''نفس'' سے ہے...... اور انسان کا اس کے باطن سے اور باطن کا روح سے اور روح کا تعلق مجھ سے ہوگا۔ باطن کی اچھی خصوصیات اس کی روح کو طاقتور بنائیں گی اور ہر طاقتور روح مجھ سے اپنے تعلق کو مضبوط بنائے گی۔ منفی خصوصیات سے تشکیل پانے والا باطن روح کو کمزور کرے گا اور کمزور روح مجھ سے اس انسان کو بہت دور لے جائے گی۔ جب تک روح انسان کے اندر ہوگی وہ زندہ رہے گا۔ زندہ رہنے کے اس عمل کو ''زندگی'' کا نام دیا جائے گا اور جب میں اس کی روح قبض کرلوں گا تو وہ مر جائے گا اور انسان کا تعلق ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے ختم ہو جائے گا۔ اس عمل کو 'موت' کا نام دیا جائے گا۔ موت کے بعد انسان کے بے جان اور مردہ جسم کو...... جو اس پتلے کی مانند ہوگا۔ مٹی کے اندر دفنا دیا جائے گا، جبکہ روح میرے پاس زندہ رہے گی، کیونکہ وہ میرا امر ہو گی جسے کبھی فنا نہیں ہونا۔'' بڑی سرکار نے جواب دیا۔

''کیا انسان کا اندر اس کے جسم سے زیادہ مضبوط ہوگا؟'' ایک نے سوال کیا۔

"ہاں......انسان کا اندر کئی ہزار پرت کا مجموعہ ہوگا اور ہر پرت دوسرے سے مختلف ہوگا۔اس لئے وہ ہر لمحہ بدلتا ہوا، ایک مختلف انسان ہو گا۔وہ کبھی بھی ایک جیسے کام نہیں کرے گا، جو وہ سوچے گا اس کے مطابق عمل نہیں کرے گا اور جو کہے گا، اس پر خود ہی حیران ہوگا......اسے خود بھی ساری زندگی معلوم نہیں ہو پائے گا کہ وہ کیا ہے؟ کیونکہ اس کی اپنے اندر تک رسائی بہت مشکل سے ہو پائے گی......اس لئے وہ جو کچھ نظر آئے گا وہ ہوگا نہیں اور جو کچھ نہیں ہوگا وہ نظر آنے کی کوشش کرے گا اور ہر انسان کا 'اندر' بھی دوسرے انسان سے مختلف ہوگا۔" جواب دیا گیا۔

"اتنا مشکل اور پیچیدہ انسان؟" کسی نے انتہائی حیرت سے سوال کیا۔

"ہاں......اسی لیے تو......وہ میرا شاہکار ہوگا۔جواب دیا گیا۔

"مٹی کا پتلا......جو آپ کی پھونکی ہوئی روح سے زندہ ہوگا اور آپ کی دی ہوئی موت سے وہ فنا ہو جائے گا اور جس کو دنیا میں رہنے کے لئے آپ سب کچھ عطا کریں گے۔اس میں ایسا خاص کیا ہوگا کہ ہم اس کو شاہکار مانیں۔" لیڈر جو کافی دیر سے خاموش تھا۔بڑی سرکار کے اس دعوے پر قدرے نخوت سے بولا۔

سفید روشنی کی لو نہ کم ہوئی نہ زیادہ......ایک دم گہری خاموشی چھا گئی......یوں جیسے بڑی سرکار نے اس سوال کا جواب فوراً دینا مناسب نہ سمجھا ہو......اور محفل کو برخاست کر دیا گیا۔

'مٹی کا پتلا' اور اس کے بارے میں انکشافات نے نوری مخلوق کو بہت مضطرب اور بے چین کر دیا تھا۔

محفل کو برخاست کر دیا گیا، مگر تمام حاضرین محفل بہت مضطرب اور بے چین تھے کہ پتلے کے بارے میں مزید کیا انکشاف کیا جائے گا۔

(۱)

# "محبت"

حاضرینِ محفل بہت پُر اشتیاق نگاہوں سے سفید روشنی کی جانب دیکھ رہے تھے، جو پہلے سے بھی زیادہ آب وتاب اور حکمت سے چمک رہی تھی، جیسے مزید اسرار اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہو۔

ہر طرف گہرا سکوت چھایا تھا۔ ایک دم سفید روشنی پتلے کے سینے پر چمکی اور سب حیرت سے اس کے سینے کی جانب دیکھنے لگے۔

"یہاں انسان کا دل ہوگا، جو انسانی جسم کا سب سے اہم عضو ہوگا۔ جو جسمانی اور ظاہری طور پر انسان کو زندہ رکھے گا اور جیسے ہی یہ کام کرنا بند کر دے گا، انسان موت سے ہمکنار ہوگا۔" بڑی سرکار نے جواب دیا۔

"دل اتنا اہم حصہ کیوں ہوگا؟" کسی ایک نے سوال کیا۔

"انسانی جسم ایک سرخی مائل سیال مائع یعنی خون کی گردش کی وجہ سے حرکت کرے گا اور دل اس خون کو تمام انسانی اعضاء تک پہنچانے کا ذمہ دار ہوگا، جب دل حرکت کرنا چھوڑ دے گا تو خون کی گردش بھی رک جائے گی اور انسان بھی مر جائے گا۔" جواب دیا گیا۔

"کیا دل صرف یہی ایک کام کرے گا؟" حاضرین میں سے ایک نے پوچھا۔

"ہاں..... ظاہری وجسمانی طور پر یہ یہی کام کرے گا، مگر باطنی طور پر اس میں محبت، نفرت کے احساسات اور کئی طرح کے جذبات جنم لیں گے۔" جواب دیا گیا۔

"ایک ہی دل میں سے یہ سب کچھ کیسے جنم لیں گے؟" سوال کیا گیا۔

"ظاہری طور پر یہ گوشت کا ایک لوتھڑا ہوگا، مگر اس کے اندر چار خانے ہوں گے، جو ظاہری طور پر خون کی گردش کے ذمہ دار ہوں گے، مگر حقیقت میں، میں ان خانوں کو تمام مثبت اور منفی جذبات سے بھر دوں گا۔ دو خانوں میں سچ اور محبت کے مثبت جذبات ہوں گے، جبکہ دو خانوں میں منفی جذبات جھوٹ اور نفرت ہوں گے۔ سچ سے خلوص، دیانت، نیک نیتی، اعتبار اور ایمان جنم لیں گے، جبکہ محبت سے پیار، وفا، ہمدردی، ایثار اور رحم دلی پیدا ہوگی۔ جھوٹ سے مکر وفریب، ریاکاری، مکاری، بدنیتی، بے ایمانی، وسوسے، اوہام، شکوک وشبہات، خودغرضی پیدا ہوگی اور نفرت سے کینہ، دشمنی، حسد، لالچ، طمع وحرص، انتقام، غرور اور تکبر، قتل وغارت اور تباہی وبربادی کے جذبات جنم لیں گے۔" بڑی سرکار نے بتایا۔

"یوں محسوس ہو رہا ہے کہ آپ کے اس شاہکار میں شر، خیر سے زیادہ ہوگا؟" کسی نے معنی خیز انداز میں سوال کیا۔

"نہیں..... یہ خیر وشر سے ملا جلا ہوا انسان ہوگا، جس میں تمام جذبے کثرت سے موجود ہوں گے، مگر جس انسان میں خیر غالب ہوگا، وہی

کامیاب ہوگا اور جس میں شر حاوی ہوگا وہ خسارے میں رہے گا۔'' جواب دیا گیا۔

''اور...... دل میں خیر یا شر کے جذبات کس طرح غالب ہوں گے؟'' سوال کیا گیا۔

''دل میں بہت سے جذبات پیدا ہوں گے، مگر میں دل کو صرف 'محبت' کے لئے مخصوص کروں گا۔ ہر دل میں محبت ہوگی، مگر جس دل میں محبت زیادہ حاوی ہوگی وہ تمام منفی جذبوں پر غالب آجائے گی۔'' بڑی سرکار نے جواب دیا۔

''اور محبت کیسے غالب آئے گی؟'' پھر پوچھا گیا۔

''محبت کی بنیاد سوچ ہوگی، جو انسان زیادہ سچا ہوگا اور سچ کی جستجو کرے گا، خود بخود اس کے دل میں میری اس کے ہم جنسوں کی اور تمام دوسری مخلوقات کی محبت پیدا ہوتی جائے گی، جیسے جیسے انسان میں محبت کا یہ جذبہ شدت اختیار کرتا جائے گا تمام منفی جذبات ماند پڑتے جائیں گے۔ ہر محبت اور خیر کی بنیاد سچ پر ہوگی۔ دل میں جنم لینے والے تمام جذبات کو دل میں موجود سچ کا خانہ پرکھے گا اور جس جذبے میں ذرا سی جھوٹ کی آمیزش ہوگی وہی جذبہ انسان کے لئے 'آزمائش' بن جائے گا ہر سچا اور پاک دل ''قلب سلیم'' کہلائے گا۔'' بڑی سرکار نے جواب دیا۔

''قلب سلیم ...... کیا وہ کوئی خاص دل ہوگا؟'' سوال کیا گیا۔

''ہاں...... ہر سچے انسان کا دل ''قلب سلیم'' ہوگا۔ میں 'انسان' کو فطرت سلیمہ پر پیدا کروں گا۔ یعنی ہر بچہ نیک و پاک روح کے ساتھ، اپنے اندر 'خیر' لے کر جنم لے گا۔ لیکن بعد میں دنیا کے حالات و واقعات اس پر اس طرح اثر انداز ہوں گے کہ اس کے دل میں موجود منفی جذبات، خیر پر غالب آکر اسے برا انسان بنا دیں گے۔ 'قلب سلیم' میں خیر اور میری محبت غالب ہوگی، جو مجھ سے سچی محبت کرے گا، میں اپنی محبت کے تمام در اس پر وا کر دوں گا جو مجھ پر سچے دل سے اعتبار اور یقین کرے گا، میں اس کا غیر متزلزل ''ایمان'' بن جاؤں گا اور جو میرے بارے میں اچھا گمان کرے گا، میں اس کے لئے زندگی کی راہیں آسان کر دوں گا اور جو مجھ پر سچے دل سے ایمان رکھتے ہوئے اور سچی محبت کا دعویٰ کرتے ہوئے زندگی کی شاہراہ پر قدم رکھے گا تو میں اسے ایسے عرفان سے نوازوں گا، جس کا نعم البدل دنیا میں کوئی نہیں ہوگا۔ ذرا سا جھوٹ، بے ایمانی، بد اعتقادی، بد نیتی دل کو آلودہ کر کے اسے قلب سلیم کے دائرے سے خارج کر دے گا۔'' بڑی سرکار نے جواب دیا۔

''آپ نے دل کو محبت کے لئے ہی کیوں مخصوص کیا ہے؟'' کسی نے پوچھا۔

''انسان کا دل بہت نازک ہوگا، جو لمحوں میں کرچی کرچی ہو جائے گا...... ذرا ذرا سی تکالیف پر دکھی ہو جائے گا...... اور چھوٹی چھوٹی باتوں سے پریشان ہو جائے گا۔ ظاہری طور پر مضبوط جسامت والے انسانوں کے دل بھی اندر سے بہت نازک ہوں گے۔ وہ ایک لمحے میں خوش اور دوسرے لمحے میں رنجیدہ ہو جائے گا۔ اس کے اندر بہت لطیف احساسات و جذبات جنم لیں گے اور تمام مثبت جذبوں میں محبت، ایسا لطیف نازک اور خوبصورت جذبہ ہوگا جو اپنی سرشاری کی قوت سے کائنات کو تسخیر کرے گا۔ ایک انسان اپنی محبت کی وجہ سے دوسروں کی نفرت پر غالب آجائے گا۔ ان کے دلوں پر حکومت کرے گا۔ محبت میں ایسی قوت، لطافت اور سرشاری ہوگی کہ باقی کے انسان خود بخود محبت سے سرشار انسان کی جانب کھنچے چلے آئیں گے اور میں بھی بہت محبت سے 'انسان' کو تخلیق کروں گا۔ میں اپنی محبت کا رس انسان کے دل میں بھر دوں گا، جب وہ اس کی مٹھاس اور خوشبو کو

محسوس کرتے ہوئے اردگرد کی ہر شے کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھے گا تو اسے ہر طرف میں ہی نظر آؤں گا اور میری محبت میں وہ میری تمام مخلوق سے محبت کرے گا اور محبت کی ایسی داستانیں رقم کرے گا کہ تم بھی حیران رہ جاؤ گے اور اس محبت کی وجہ سے یہ تمہیں بھی مات دے گا۔" بڑی سرکار نے جواب دیا۔

"کیا......یہ پتلا......ہمیں......مات دے گا؟ لیڈر نے انتہائی حقارت سے مٹی کے پتلے کی جانب دیکھ کر کہا۔

"ہاں......تمہیں بھی......" ٹھوس لہجے میں جواب دیا گیا۔

"کیا یہ صرف اپنی محبت کی وجہ سے دوسروں کو مات دے دے گا؟" کسی اور نے سوال کیا۔

"ہاں......نفرت میں یہ 'محبت' سے بھی بڑھ جائے گا، لیکن وہ نفرت بھی کسی سے شدید محبت کی وجہ سے کرے گا اور اس شے کو پانے کے لئے اس کے اندر حسد، کینہ، خود غرضی، لالچ، دشمنی اور انتقامی جذبات شدت سے پیدا ہوں گے۔ یہاں تک کہ وہ اس شے کو پانے کے لئے دوسروں کو حد درجہ نقصان پہنچائے گا۔ یہاں تک کہ ان کو ختم بھی کر دے گا۔" جواب دیا گیا۔

"کیوں......؟" انتہائی حیرت سے سوال کیا گیا۔

"وہ اپنی محبت میں اس قدر دیوانہ ہو جائے گا کہ محبت کو پائے بغیر اسے کچھ دکھائی نہیں دے گا۔ دنیا کی کوئی اور شے اسے سکون نہیں دے گی اور اس شے کو پانے کے لئے وہ اس قدر جنونی ہو جائے گا کہ اپنے آپ کو بھی ختم کرنے سے گریز نہیں کرے گا۔"

تم اس کی محبت کا شعور نہیں کر سکتے کہ یہ کیسی محبت کرے گا۔" بڑی سرکار نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔

"کیسی محبت کرے گا؟" کسی نے چونک کر پوچھا۔

"محبت منفرد......شدید اور کٹھن۔" جواب دیا گیا۔

"منفرد محبت......کیسی ہوتی ہے؟" سوال کیا گیا۔

"دنیا کا ہر انسان دوسرے انسان یا شے سے اپنے جبلی تقاضے چاہت اور خواہشات کے مطابق محبت کرے گا۔ ایک کی محبت کی نگاہ، دوسرے سے مختلف ہوگی۔ ضروری نہیں کہ ایک کی محبت، دوسرے کی بھی محبت ہو اور ایک کی چاہت، دوسرے کی بھی چاہت ہو۔ ہر انسان اپنی سوچ اور چاہت کے مطابق محبت کرے گا۔ اس لئے ہر انسان کی محبت منفرد ہوگی۔" جواب دیا گیا۔

"اور......شدید محبت، کیسی ہوگی؟" حیرت سے پوچھا گیا۔

"اپنی محبت میں وہ کسی کی مداخلت برداشت نہیں کرے گا اور اس شخص یا شے کو پانے کے لئے وہ ہر ممکن کوشش کرے گا۔ بربریت اور درندگی پر اتر آئے گا۔ دوسروں کو بھی نقصان پہنچانے سے دریغ نہیں کرے گا اور اپنی جان کی بازی لگانے سے بھی نہیں ہچکچائے گا۔" بڑی سرکار نے جواب دیا۔

"محبت......کٹھن......کیسے ہوگی؟" سوال کیا گیا۔

''محبت کی راہ بہت مشکل اور کٹھن ہوگی۔ یہ پل میں انسان کو پُرامید اور پل میں مایوس کرے گی۔ وہ اندر ہی اندر اس قدر مضطرب، بے چین اور بے قرار ہوگا اور اپنے آپ سے ایسی جنگ میں مصروف ہوگا، جس کی کسی دوسرے کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی، مگر وہ شدید اذیت میں سے گزر رہا ہوگا۔ یہ اذیت اسے ایسی آزمائش میں ڈالے گی، جس سے نہ فرار ممکن ہوگی نہ نجات۔ جب وہ اپنی محبت کو پانے کی جدوجہد میں ناکام ہوجائے گا تو دیوانہ ہوجائے گا......اور محبت میں دیوانگی کا دوسرا نام 'عشق' ہے۔'' بڑی سرکار نے جواب دیا۔

''عشق......وہ کیا ہوتا ہے؟'' وہ حیرت سے چلائے۔

''کسی کی محبت میں جب انسان اپنے آپ کو بھول جائے گا اور اسے ہر طرف وہی دکھائی دے اور وہی سنائی دے، ہر لمحہ اس سے ہمکلام ہو، اسی سے دل کی باتیں اور راز و نیاز کہے، اس کو ہی اپنا سب کچھ سمجھے اور اس کے لئے مر مٹنے کو بھی تیار ہوجائے تو وہ محبت نہیں...... عشق کہلائے گا۔'' جواب دیا گیا۔

''کیا محبت......'عشق' سے مختلف ہے اور جو محبت کرے گا...... کیا وہ عشق نہیں کرے گا؟'' ایک نے سوال کیا۔

''محبت عشق کی سیڑھی پر پہلا قدم ہے...... محبت ابتداء ہے اور عشق اس کی انتہاء۔ محبت میں بہت سے لوگ شامل ہو سکتے ہیں، مگر عشق صرف ایک ہی سے ممکن ہے، محبت سے عشق تک کا سفر بہت مشکل اور کٹھن ہوگا۔ محبت عام ہوگی اور عشق خاص۔ محبت کا مرکز دل ہوگا اور عشق کا روح۔ محبت میں پانا ممکن ہوگا اور عشق میں کھو کر پانا اور پا کر کھونا ہوگا۔ محبت میں سرشاری اور عشق میں بے قراری ہوگی۔ محبت اور عشق کا سفر انسان کے لئے بہت کٹھن اور تکلیف دہ ہوگا۔'' بڑی سرکار نے جواب دیا۔

''کیا ہر انسان زندگی میں محبت اور عشق کرے گا؟'' پوچھا گیا۔

ہر انسان اپنی زندگی میں کسی نہ کسی شے یا دوسرے انسان سے محبت ضرور کرے گا، مگر عشق ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوگی۔'' جواب دیا گیا۔

''سب انسان محبت کیوں کریں گے؟'' حیرت سے پوچھا گیا۔

''کیونکہ محبت، انسان کی سرشت اور خمیر میں شامل ہوگی۔ اس کے وجود کی مٹی کو محبت کے پانی سے گوندھا جائے گا، وہ محبت کے لمس، اس کی طاقت، احساس اور اس کی تلاش و طلب کے بغیر اپنے وجود کو ادھورا محسوس کرے گا، جہاں اسے محبت ملے گی یہ اس کی طرف خود بخود متوجہ ہوگا۔ محبت کو پانے کے لئے جستجو کرے گا۔ محبت کی خاطر اذیتیں اور تکلیفیں اٹھائے گا، کیونکہ اس کی طلب وہ اپنے اندر محسوس کرے گا۔ جب اسے محبت نہیں ملے گی تو وہ زندگی سے بیزار ہوجائے گا۔ اس لئے وہ اسے کسی نہ کسی طرح اسے پانے کی کوشش کرے گا۔'' جواب دیا گیا۔

''کیا محبت، انسان کے لئے بہت ضروری ہوگی کہ وہ اس کے بغیر زندگی سے بھی بے زار ہوجائے گا؟ کسی نے سوال کیا۔

ہاں......کائنات کی تمام خوبصورتیوں کا سرچشمہ محبت ہوگی۔ محبت، میٹھا لمس اور خوشگوار احساس ہوگا۔ جیسے خوبصورت پھول کی خوشبو...... جیسے چاند کی چاندنی جیسے ہوا کی لطافت...... جیسے نور کی کرنیں۔ یہ اتنا خوبصورت اور پیارا جذبہ ہوگا کہ تم بھی انسانوں کی محبت دیکھ کر حیران رہ جاؤ گے۔ انسان محبت بھرے دل کے ساتھ جس طرف بھی دیکھے گا، اسے ہر شے مسکراتی نظر آئے گی، جس کو بھی محبت سے چھوئے گا......اس کی لطافت اس کی

روح کو سرشار کرے گی۔ محبت انسان کو ایسی خوشی دے گی، جس کا نعم البدل کائنات کی کوئی شے نہیں ہوگی۔ اسی لئے انسان محبت کو پانے کی خاطر انتہائی تکلیفیں اٹھائے گا۔" بڑی سرکار نے بھی محبت بھرے انداز میں بتایا سب کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔

"آپ نے انسان کو محبت کی صورت میں اتنا بڑا اور خوبصورت تحفہ دے دیا ہے؟" حیرت سے سوال کیا گیا۔

"تحفہ نہیں آزمائش۔" جواب دیا گیا۔

"آزمائش......؟" وہ حیرت سے چلائے۔

"ہاں......وہ محبت پا کر بھی مضطرب رہے گا اور نہ پا کر......اس سے بھی زیادہ مضطرب۔" جواب دیا گیا۔

"کیوں......؟"

"محبت اضطراب سے جنم لے گی۔ اس لئے انسان کو کبھی قرار نہیں ملے گا۔ وہ اس کو پا کر بھی اندر ہی اندر مضطرب اور بے چین رہے گا۔" جواب دیا گیا۔

وہ سب حیرت سے سوچ میں پڑ گئے۔ ان کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ مزید کیا پوچھیں۔ انہیں نہ محبت کی سمجھ آ رہی تھی اور نہ اس اضطراب کی، جو انسان کو بے قرار رکھے گا۔

ہر طرف گہرا سکوت چھا گیا......اور محفل برخاست ہوگئی۔

(۲)

## "عقل"

حاضرین محفل پھر جمع ہو گئے تھے، کیونکہ بڑی سرکار کے شاہی دربار سے یہی فرمان جاری ہوا تھا، وہ حیران و پریشان تھے۔ مٹی کے انسان نے ان کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ ان کی سوچوں کو الجھا دیا تھا...... اور...... اب...... پھر اس کے بارے میں کوئی نیا انکشاف ہونے والا تھا۔ ان کے اندر اضطراب اور گہرا تجسس تھا۔

ہر طرف گہری خاموشی چھا گئی...... سفید روشنی چمکی اور سب اس کی ہیبت سے مرعوب ہو گئے۔

"تم انسان کے دل اور اس کی محبت کے بارے میں جان کر مضطرب ہو گئے ہو...... کیا تم اب بھی اس کو میرا شاہکار نہیں مانتے؟" بڑی سرکار نے پوچھا۔

"کیا صرف اس کی محبت کی وجہ سے ہم اسے آپ کا 'شاہکار' مان لیں...... ایسی محبت، جس سے وہ خود بھی مضطرب اور پریشان رہے گا۔ جس کی تلاش میں وہ سرگرداں رہے گا، جو چیز خود اس کے لئے آزمائش ہو گی، اس کی وجہ سے ہم اسے کیسے شاہکار مان لیں؟" جواب دیا گیا۔

"مجھے معلوم تھا...... اس لئے اب میں تمہیں اس مٹی کے پتلے یعنی اس انسان کے بارے میں ایک اور انتہائی اہم بات بتانے والا ہوں۔ یہ دیکھو اور سفید روشنی پتلے کے عین سر پر چمکی اور سب متجسس ہو کر اس جانب دیکھنے لگے۔

"یہ...... کیا ہے......؟" سوال کیا گیا۔

"رئیس الاعضاء...... یعنی...... اس کا سر ہے...... اور سر کے اندر 'دماغ'......" بتایا گیا

"دماغ......؟" وہ حیرت سے چلائے۔

"ہاں...... دماغ۔" بتایا گیا اور پھر ہر طرف خاموشی چھا گئی۔

"انسان۔ دنیا میں جتنی ترقی کرے گا...... جو کچھ سوچے گا...... اس کی کامیابیاں، منصوبے، سازشیں سب اس دماغ سے وابستہ ہوں گے۔" جواب دیا گیا۔

"کیسے......؟" انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

"مٹی کا یہ پتلا دماغ کے بغیر نامکمل ہو گا۔ یہ بے جان اور مردہ رہے گا، جب تک کہ اس کے سر میں موجود دماغ ٹھیک طرح سے کام نہیں کرے گا۔ یہ اس کی وجہ سے حرکت کرے گا، اس کی وجہ سے بول سکے گا اور ایسے کام کرتے گا جو تم سوچ بھی نہیں سکتے۔" پرسکون انداز میں بتایا گیا۔

''کیسے کام......؟'' حیرت سے پوچھا گیا۔

''بہت مشکل...... بہت پیچیدہ...... اور بہت کٹھن'' بتایا گیا۔

''کیا اس کے دماغ میں بھی محبت ہوگی؟'' انہوں نے پوچھا۔

''نہیں...... اس کے دماغ میں ''عقل'' ہوگی۔''

''عقل...... وہ کیا؟'' انتہائی حیرانگی سے پوچھا گیا۔

''عقل...... ظاہری طور پر نظر نہیں آئے گی۔ جس طرح محبت دکھائی نہیں دے گی، مگر محبت کے بغیر انسان اپنے آپ کو نامکمل محسوس کرے گا، اسی طرح عقل کے بغیر انسان کچھ نہیں ہوگا۔ اپنی عقل سے وہ بلند و بالا عمارتیں بنائے گا۔ نت نئی چیزیں ایجاد کرے گا۔ کائنات کو تسخیر کرنے کے منصوبے بنائے گا۔ ایسی ایسی چیزیں بنائے گا کہ خود بھی حیران رہ جائے گا اور تم نہیں جانتے کہ عقل کی وجہ سے وہ کیا کیا کچھ کرے گا۔'' بڑی سرکار نے سنجیدگی سے کہا۔

''کیا کچھ کرے گا؟'' کسی نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ زمین پر فساد بھی پھیلائے گا...... اپنی عقل سے سازشیں سوچے گا اور دوسروں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا کہ اکثر اس کے ہم جنسوں کے لئے زندگی عذاب ہو جائے گی۔ وہ زمین پر اپنی حکومت اور سلطنت کو پھیلانے کے لئے لوگوں کا بے دریغ قتل کرے گا۔ ہر طرف شر پھیلائے گا۔ اپنے مفادات اور ہوس کو پورا کرنے کے لئے وہ سب کچھ کرے گا۔ دولت اکٹھی کرنے کے لئے نت نئے منصوبے سوچے گا۔'' جواب دیا گیا۔

''کیا عقل سے وہ اتنے برے کام کرے گا؟'' کسی نے سوال کیا۔

''نہیں...... اپنی عقل اور سوچ سے دنیا کو نئی اور اچھی باتیں بھی بتائے گا۔ اپنی عقل مندانہ سوچ سے دوسرے لوگوں کو نئی راہیں دکھائے گا۔ اپنی خوبصورت گفتگو سے لوگوں کے دلوں کو ایسا قائل کرے گا کہ وہ کچھ بھی کرنے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ یعنی ان میں انقلابی روح بیدار کرے گا اور جب بہت سے لوگ اس کی پیروی کریں گے تو ان کی مدد سے دنیا میں اپنی کامیابیوں کے جھنڈے گاڑے گا اور وہ چاند، ستاروں تک پہنچنے کی کوشش کرے گا۔'' بڑی سرکار نے بتایا۔

''کیا واقعی؟'' انہوں نے چونک کر پوچھا۔

''ہاں......'' جواب دیا گیا۔

''تو...... کیا...... وہ؟ وہ کچھ کہنا چاہتے تھے مگر بڑی سرکار کے رعب اور دبدبے کی وجہ سے کچھ کہنے کی جرات نہ کر سکے۔

سفید روشنی ایک دم تیزی سے چمکی اور وہ بوکھلا گئے۔

''تم...... جو کچھ سوچ رہے ہو۔ ایسا کچھ نہیں ہوگا......'' بڑی سرکار نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔

''کیا......؟ وہ ایک دم چونک کر بولے۔

''انسان...... چاہے زمین میں کتنی کامیابیاں کیوں نہ حاصل کرلے...... اور...... چاند ستاروں تک بھی کیوں نہ پہنچ جائے، مگر وہ میری سلطنت تک ہرگز نہیں پہنچ پائے گا......'' انتہائی مطمئن لہجے میں جواب دیا گیا۔ بڑی سرکار کے اس جواب سے گویا وہ سب مطمئن ہو گئے۔

''انسان اپنی عقل سے انتشار اور فساد کیسے پھیلائے گا؟'' کسی نے سوال کیا۔

''جس طرح انسان کے دل میں محبت پر نفرت غالب آئے گی اور وہ شر کی طرف مائل ہو کر اس کو پھیلانے کی کوشش کرے گا۔ اس طرح انسان کے دماغ میں موجود عقل پر برائی غالب آئے گی تو وہ دنیا کو تباہ و برباد کرنے کی کوشش کرے گا اور وہ برائی، غرور و تکبر اور اس کی خود پسندی ہو گی۔ انسان میں جب تکبر پیدا ہو گا تو وہ اپنے آپ کو دنیا کا سب سے اعلیٰ اور بہترین انسان سمجھے گا، اپنی ذات، اپنی سوچ اور باتوں کو سب سے زیادہ سراہے گا۔ اسے کوئی بھی اپنے جیسا نظر نہیں آئے گا، اپنے آپ کو منوانے کے لئے دوسروں کو نقصان پہنچائے گا۔'' جواب دیا گیا۔

''اس کے اندر تکبر کیسے پیدا ہو گا...... اور یہ کیا ہو گا؟''

''کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا؟'' انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

''انسان کو اس کی کامیابیاں اور ان کامیابیوں کے بل بوتے پر حاصل ہونے والی دولت اور شہرت اسے متکبر بنا دیں گی۔ اسے اپنی ذات کے علاوہ کوئی اور اہم نہ لگے گا۔ یہ خود پسندی، ہی تکبر کا باعث بنے گی اور جانتے ہو تکبر کیا ہو گا......؟''

''نہیں......'' انہوں نے جواب دیا۔

''قدم زمین پر ہوں اور نظر آسمانوں پر...... وہ اپنے ہم جنسوں کو زمین پر رینگنے والے معمولی اور بے وقعت کیڑے مکوڑے سمجھے گا اور اپنے آپ کو ہر ایک سے افضل اور بہترین۔ اپنے علاوہ نہ تو کسی کو اہمیت دے گا اور نہ ہی ان کی عزت کرے گا۔ اپنے فائدے حاصل کرنے کے لئے ان کے حقوق غصب کرے گا۔ ان کی زندگیاں اس کے نزدیک جانوروں سے زیادہ اہم نہ ہوں گی اور یہ تکبر اس میں اس حد تک جنون اور دیوانگی پیدا کرے گا کہ وہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے دنگا فساد پھیلانے سے بھی گریز نہیں کرے گا۔ دنیا کو تباہ و برباد کرنے کے منصوبے بنائے گا۔'' انتہائی سنجیدگی سے بتایا گیا۔

''کیا آپ اسے اتنے لوگوں کے حقوق غصب کرنے اور پھر ظلم و زیادتی، تباہی و بربادی کرنے دیں گے...... کیا آپ چاہیں گے کہ آپ کے بنائے ہوئے دوسرے انسان اس متکبر و باغی انسان کے ظلم کا نشانہ بنیں؟'' انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں...... میں اسے عقل اور طاقت دے کر دیکھوں گا کہ وہ کس طرح اسے استعمال کرتا ہے...... وہ دیوانگی اور جنون کی کس حد تک جاتا ہے...... اس کے اندر چھپا حیوان کیسی وحشت و بربریت پھیلاتا ہے؟

''کیا اس کے اندر حیوان بھی ہو گا؟'' حیرت سے پوچھا گیا۔

''ہاں...... اس کے اندر حیوان ہی نہیں کائنات کی ہر شے چرند، پرند، جانوروں، درندوں کی ساری صفات بھی جمع ہوں گی، یہاں تک کہ زمین پر رینگنے والے زہریلے سانپ جیسا زہر بھی اس کے اندر ہو گا...... مگر...... اس کے اندر رحم جیسی صفات بھی ہوں گی۔'' خوش کن لہجے میں بتایا گیا۔

''ہم جیسی......؟''

''ہاں...... جب وہ اپنی عقل، اور محبت کو مثبت انداز میں استعمال کرے گا۔ فرمانبرداری کرے گا۔''

''انسان کی عقل کیسے مثبت اور منفی باتوں کو جانچ پائے گی؟'' حیرت سے پوچھا گیا۔

''جس طرح دل کے اندر ایک باطنی دل 'قلب سلیم' ہوگا۔ اسی طرح دماغ کے اندر ایک باطنی دماغ یعنی انسان کا 'ضمیر' ہوگا۔ ضمیر سچ کا ایسا پیمانہ ہوگا، جس میں انسان اپنے اچھے اور برے اعمال کو جانچ سکے گا۔ انسان جو اچھے کام کرے گا اس پر ضمیر خوش اور مطمئن ہوگا اور بُرے اعمال پر ضمیر ناخوش ہوکر انسان کو ملامت کرے گا، وہ ملامت انسان کو اندر ہی اندر بہت بے چین اور مضطرب رکھے گی۔ اس ملامت سے انسان میں ندامت، شرمندگی اور پچھتاوے پیدا ہوں گے۔ ضمیر کی اس سرزنش پر انسان کی روح بھی بہت مضطرب اور بے چین ہوگی اور انسان اندر ہی اندر بہت دکھی اور پریشان بھی رہے گا۔'' بڑی سرکار نے بتایا۔

''کیا آپ ضمیر کو اس لئے تخلیق کریں گے کہ اس سے انسان کو دکھی اور پریشان رکھیں؟'' کسی نے پوچھا۔

''نہیں...... انسان کے لئے ضمیر ایک بہت بڑی نعمت ہوگی۔ یہ اس کے لئے ایسی خاموش عدالت ہوگی جو ایک منصف کی حیثیت سے اس کے اعمال پر اپنا فیصلہ سنائے گی۔ اگر میں انسان کو ضمیر عطا نہ کروں تو انسان اپنی سرکشی اور ظلم میں بہت آگے تک چلا جائے گا اور اسے روکنے والا کوئی نہ ہوگا۔ انسان کا ضمیر اسے بار بار روکے گا۔ اسے برے کام کرنے سے منع کرے گا۔ اس کے اندر ملامت کا احساس پیدا کر کے اسے پچھتاوے پر آمادہ کرے گا اور وہ ندامت کے آنسو بہا کر اپنی غلطیوں کی مجھ سے معافی طلب کرے گا اور آئندہ گناہ نہ کرنے کا وعدہ کرے گا۔ اگر میں انسان کو ضمیر عطا نہ کروں تو دنیا کا کوئی انسان بھی اپنے آپ کو گنہگار نہ سمجھے، کوئی گناہ پر نہ پچھتائے، کوئی توبہ طلب نہیں کرے گا، کوئی مجھ سے معافی نہ مانگے گا، سب اپنے آپ کو بے گناہ سمجھیں گے، بڑے بڑے غاصب اور ظالم بھی اپنے آپ کو معصوم اور گناہوں سے پاک سمجھیں گے۔ اس لئے میں نے ضمیر کو انسان کے اندر رکھوں گا کہ کوئی انسان دوسرے انسان کو اس کا گناہ یاد دلا کر شرمندہ نہ کرے، بلکہ انسان کا ضمیر اسے خود احساس دلا کر اسے شرمندہ کرے۔ میں جانتا ہوں کہ انسان کے لئے ندامت اور شرمندگی کا احساس بہت تکلیف دہ ہوگا اور خاص طور پر تب، جب اس کے ہم جنس اس کو اس بات کا احساس دلائیں گے، اس احساس سے بچانے کے لئے اس کے اندر ضمیر رکھ دیا کہ وہ انسان کو دوسروں کے سامنے شرمندہ ہونے سے بچائے ورنہ دوسروں کے احساس دلانے سے انسان کی فطرت میں موجود باغی عناصر اسے سرکشی پر مجبور کریں گے۔ انسان کو ان تمام منفی احساسات سے بچانا بہت ضروری تھا۔ اگر میں ایسا نہ کروں تو انسان بہت منتشر اور مضطرب ہو جائے۔ میں کائنات میں کسی اور مخلوق کو ضمیر عطا نہیں کروں گا، سوائے انسان کے۔ کیونکہ انسان سے بار بار غلطیاں اور گناہ سرزد ہوں گی اور انسان کو ان سے بچانا بہت ضروری ہے۔'' بڑی سرکار نے بتایا۔

''کیا قلب سلیم کی طرح ضمیر بھی چند خاص لوگوں کو عطا کیا جائے گا؟'' سوال پوچھا گیا۔

نہیں...... ضمیر ہر انسان کو عطا کیا جائے گا، مگر جن کے اندر خیر اور سچ غالب ہوگا ان کا ضمیر ان کے اندر ندامت کا احساس پیدا کر کے ان کو نیک کاموں کی ترغیب دے گا، وہ دوسروں کے ساتھ ظلم و زیادتی کر کے پچھتائیں گے۔ تاسف کا اظہار کریں گے اور اپنے آپ کو سیدھے راستے پر چلانے کی کوشش کریں گے، مگر جن کے اندر شر غالب ہوگا ان کا ضمیر آہستہ آہستہ مردہ ہو کر ختم ہو جائے گا۔ انسان کے اندر نہ ندامت باقی رہے گی اور

نہ پچھتاوے۔ ایسے انسان غاصب، ظالم اور جابر ہوں گے۔ وہ لوگوں کے حقوق غصب کر کے کبھی افسوس کا اظہار نہیں کریں گے۔ بڑے سے بڑا گناہ کر کے بھی وہ مطمئن رہیں گے۔ ایسے لوگ درندگی پر اتر آئیں گے اور وہ سرکشی وظلم میں، بہت دور نکل جائیں گے۔" بڑی سرکار نے جواب دیا۔

"کیا وہ محبت بھی عقل کی وجہ سے کرے گا؟" پوچھا گیا۔

"انسان کا دل تو دماغ کے تابع ہوگا۔ دماغ جسم کے سارے نظام کو چلائے گا، مگر 'محبت'...... عقل کے تابع نہیں ہوگی...... عقل اسے منطق دلیلیں دے کر روکنے کی کوشش کرے گی۔ اسے جنونی اور دیوانہ بننے سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرے گی، مگر محبت، عقل کی کوئی دلیل نہیں سنے گی اور اپنی من مانی کرے گی۔ جب انسان محبت کے نشے میں سرشار ہوگا تو وہ عقل کی کسی بھی بات کو اہمیت نہیں دے گا۔ عقل اس کی جنونی محبت سے ہار جائے گی اور جب اس کا دل ٹوٹے گا تب وہ عقل کی طرف توجہ دے گا، مگر تب سب کچھ بے معنی ہوگی۔" انہیں بتایا گیا۔

"یہ کیسی عجیب بات ہے کہ انسان کو چلانے والا...... اس کو حرکت دینے والا...... اس کی زندگی کا ضامن دماغ...... دل کے سامنے بے بس ہو جائے گا......؟" حیرت سے پوچھا گیا۔

"ہاں...... ایسا ہی ہوگا۔" جواب دیا گیا۔

"کیا محبت کی دیوانگی اور ہے؟ اور عقل کی دیوانگی کچھ اور......؟ کہ محبت میں دیوانہ انسان 'عقل' کی کوئی دلیل نہیں مانے گا اور اس کی کوئی بات نہیں سنے گا۔" انہوں نے حیرت سے سوال کیا۔

"محبت میں دیوانگی انسان کو عشق کی جانب لے جائے گی اور...... عقل میں دیوانگی انسان کو 'جنونی' بنا دے گی۔ وہ وہم، خدشات، وسوسوں کا شکار ہو کر اپنی ذہانت اور سمجھ بوجھ کھو بیٹھے گا، جبکہ محبت سے عشق اور عشق میں جنون انسان پر ایسے اسرار و رموز و نیاز واضح کرے گا کہ عقل بہت پیچھے رہ جائے گی...... عقل...... عشق کے سامنے ہار جائے گی۔ عقل اسے کھڑی دیکھتی رہے گی اور عشق محو پرواز ہوگا۔ عقل دلیل کو مانتے ہوئے چلے گی اور عشق دلیل کو ہی نہیں مانے گا۔ عقل کا حاصل سب کو نظر آئے گا اور عشق کا حاصل کسی کو بھی دکھائی نہیں دے گا۔ عقل کی منزل مکاں تک ہوگی اور عشق کی انتہا لامکاں تک...... عقل کی منطق کو سب مانیں گے اور عشق کے جنون پر سب حیران ہوں گے۔ عقل دیکھے گی اور عشق دکھائے گا۔ عقل سوال کرے گی، اور عشق خاموش رہ کر جواب دے گا۔ عقل انسان کو مطمئن کرے گی مگر عشق اسے ہمیشہ مضطرب رکھے گا۔" پرسکون منطقی لہجے میں جواب دیا گیا۔

"انسان کا دماغ بہت ہی حیران کن چیز ہے اور اس کی عقل اس سے بھی زیادہ حیران کن۔" انہوں نے حیرت سے کہا۔

"کیا تم اب بھی اسے میرا شاہکار ماننے سے انکار کرتے ہو؟ بڑی سرکار نے پوچھا۔

"وہ سب خاموش رہے اور سب نے سر جھکا لئے، جیسے وہ اس بات کو ماننے پر تیار ہوں بھی اور نہیں بھی...... مگر بڑی سرکار کی پرجلال اور پر ہیبت ہستی کے سامنے کوئی بھی بولنے کی جرات نہ کر سکے۔ سب مؤدبانہ انداز میں کھڑے رہے۔ مگر خاموش...... سر جھکائے ہوئے۔

محفل پھر برخاست کر دی گئی اور وہ پتلے کے بارے میں پہلے سے بھی زیادہ مضطرب اور پریشان ہو کر سوچتے گئے۔

......❁......

(۳)

# ''خواہش''

بڑی سرکار کی نورانی محفل میں حاضرین کا ہجوم تھا۔ سب پہلے سے بھی زیادہ پُر اشتیاق تھے۔ سوالات، وسوسے اور خدشات ان کے اندر تھے۔ وہ بڑی سرکار کی اپنے عجیب وغریب شاہکار سے محبت اور لگاؤ دیکھ کر حیران بھی ہو رہے تھے اور مشکوک بھی۔ کم خوبیوں اور زیادہ خامیوں والے انسان کے ساتھ بڑی سرکار کی محبت ان کو حیران کر رہی تھی۔ خیر وشر کا مجموعہ، خوبیوں اور خامیوں والا انسان...... شاہکار کیسے ہو سکتا ہے؟ بڑی سرکار نے انہیں بھی بہت کچھ عطا کیا تھا...... مگر...... گارے سے بنا ہوا، کمزور وناتواں کس طرح شاہکار ہو سکتا ہے، مگر بڑی سرکار کا کہنا اور ان کا چونکنا، مخمصے میں پڑنا، الجھنوں کا شکار ہونا، اندر ہی اندر مضطرب ہونا، انہیں خود مشکوک و پریشان کر رہا تھا۔

''اب میں تمہیں اس شاہکار کی ایک اور اہم بات بتانے جا رہا ہوں۔'' پارعب آواز بلند ہوئی۔

''سب چوکنا ہو گئے اور دم سادھ کر کھڑے ہو گئے یہ جاننے کے لئے...... کہ...... کیا نیا انکشاف ہونے والا ہے۔

''سفید اور چمکدار روشنی پتلے کے درمیانی حصے کو چمکانے لگی۔ سب نے چونک کر اسے دیکھا۔

''یہ...... پتلے کا پیٹ ہے۔ اس میں سب سے اہم حصہ معدہ ہے۔ انسانی دل اور دماغ کو کام کرنے کے لئے طاقت کی ضرورت ہوگی اور اس کی طاقت غذا مہیا کرے گی۔ میں اس کی غذا کا بندوبست زمین، اس کے پانی اور مختلف اشیاء سے کروں گا وہ منہ سے کھائے گا اور اس کی خوراک پیٹ میں یعنی معدے میں جا کر مختلف مراحل سے گزر کر اس کو طاقت، توانائی اور حرارت مہیا کرے گی، جس سے وہ حرکت کر سکے گا، کام کر سکے گا، زندگی میں محنت، مشقت کر سکے گا اور بھاگ دوڑ کر سارے کام سرانجام دے سکے گا۔ خوراک کے بغیر اس کا وجود ناممکن ہوگا، کیونکہ پیٹ کے اندر میں نے بھوک رکھی ہے۔ جو مرتے دم تک ختم نہیں ہوگی۔'' تفصیلاً بتایا گیا۔

''بھوک......؟'' انہوں نے چونک کر پوچھا۔

''بھوک یہ ہوس، حرص، لالچ کی ایسی طلب اور خواہش ہوگی جو کبھی ختم نہیں ہوگی۔ اس پتلے کی ساری زندگی اس بھوک کو مٹانے میں گزرے گی۔ صبح کھائے گا تو اسے دوپہر کے کھانے کی فکر ہوگی۔ دوپہر کو کھائے گا تو رات کے کھانے کی تیاری کرے گا۔ دن کا آغاز اور اختتام کھانے سے ہوگا، یوں محسوس ہوگا جیسے اس کی زندگی کا مقصد صرف کھانا پینا ہے مگر اس کی بھوک ختم نہیں ہوگی۔ انواع واقسام کے لذیذ کھانے، مزیدار، خوش ذائقہ، رنگ برنگے پھل، ٹھنڈے میٹھے مشروبات، دنیا کی کوئی کھانے والی شے ان کی بھوک کو ہمیشہ کے لئے ختم نہیں کر سکے گی۔ انسان کی ساری زندگی اور زندگی میں ساری جدوجہد پیٹ کی بھوک مٹانے میں گزرے گی۔ وہ زندگی کے گورکھ دھندوں میں پھنستا چلا جائے گا۔ یہاں تک

کہ حلال وحرام کی تمیز بھی کھو بیٹھے گا۔'' انتہائی سنجیدگی سے بتایا گیا۔

''حلال وحرام کی تمیز کیا ہوتی ہے؟'' انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

''اپنی جدوجہد اور محنت سے کما کر کھانا حلال اور کسی دوسرے سے چھین کر کھانا حرام ہوگا...... حلال کھانے سے اس میں نیکی پیدا ہوگی اور حرام کھانے سے بدی۔'' جواب دیا گیا۔

''یہ کیسے ممکن ہے...... کہ کوئی کسی سے چھین کر کھائے اور اپنی طلب پوری کرے۔ اپنی بھوک مٹائے۔'' انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

''سب ممکن ہوگا۔ جب انسان اپنی سوچ کو بدلے گا۔''

''وہ اپنی سوچ، کو کیسے بدلے گا؟'' حیرت سے پوچھا گیا۔

''میں انسان کو ایسے تخلیق کروں گا کہ انسان کا جسم، اس کی گفتگو۔ اس کا رہن سہن۔ اس کی سوچ کے تابع ہوگا اور اس کی سوچ۔ اس کے ماحول اور اس کی فطرت میں گندھی، سچائی، شرافت اور دیانت میں پنپے گی۔ کبھی اندر کی سچائی اور دیانت پر اس کے ماحول کی آلودگی غالب آجائے گی اور کبھی برے ماحول سے جنم لینے والی عادات اور اطوار پر اندر کی سچائی اور دیانتداری غالب آجائے گی، جو انسان برائی سے جلد متاثر ہوگا وہ اپنی سوچ کو اسی برائی کے مطابق ڈھال لے گا، اس کے نزدیک اچھائی و برائی کا فرق مٹ جائے گا۔ حلال وحرام کی تمیز ختم ہو جائے گی۔ جائز و ناجائز طریقے سے وہ اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کی فکر کرے گا۔ مگر اس کے پیٹ کی بھوک اور طلب بڑھتی جائے گی۔ کسی طرح کم نہیں ہوگی اور جن کی سرشت میں اچھائی، دیانتداری اور شرافت کے عناصر غالب ہوں گے۔ ان پر برے ماحول کی برائی اثر نہیں کرے گی۔ وہ انتہائی مشکل حالات میں بھی جائز اور حلال کے کھانے کو ترجیح دیں گے۔ وہ پیاس مٹائیں گے تو پاک صاف پانی سے۔ کھائیں گے تو اپنے ہاتھ کی کمائی......'' انہیں تفصیلاً بتایا گیا۔

''اور انسان کی سرشت میں اچھائی کا عنصر کس طرح غالب رہے گا؟'' انہوں نے پوچھا۔

''انسان کے اندر اچھائی کا پیمانہ اور معیار میرے فیصلے اور حکمت پر مبنی ہوگا۔'' جواب دیا گیا۔

''کیا انسان دنیا میں سارے کام اور ساری جدوجہد صرف پیٹ کی بھوک کو مٹانے کے لئے کرے گا؟'' سوال کیا گیا۔

''نہیں...... مگر سب سے اہم پیٹ کی بھوک ہوگی۔ اس کے بعد جنسی بھوک...... پھر ذہنی وعلمی و بھوک، روحانی بھوک ہوگی۔ جسمانی بھوک یعنی پیٹ کی بھوک تو وہ کھانے پینے سے مٹائے گا۔ حلال وحرام کھا کر، جائز و ناجائز طریقے سے رزق کما کر، مگر جنسی بھوک مٹانے کے لئے وہ 'شہوت زنی' اور بدکاری کرے گا...... میں انسان کی نسل کو پھیلانے کے لئے مرد وزن کے جنسی تعلقات کا مناسب اور خاطر خواہ انتظام کروں گا، مگر جس طرح جسمانی بھوک کو مٹانے کے لئے کچھ لوگ حرام طریقے اپنائیں گے پھر بھی ان کے اندر کی حرص اور طمع ختم نہیں ہوگی، اسی طرح بہت سے لوگ جنسی بھوک مٹانے کے لئے بدکاری پر اتر آئیں گے اور بعض اپنے اس عمل اور جذبے میں اتنے شدید ہوں گے کہ وہ درندوں اور چوپایوں سے بھی زیادہ رذیل ہوں گے...... پھر...... گمراہیاں ان کا مقدر ہوں گی اور شہوت زنی کا تعلق بھی پیٹ سے ہوگا۔ پیٹ تخلیق کا منبع اور مرکز ہوگا اور شہوت سے تخلیق جنم لے گی۔'' انتہائی سنجیدگی سے بتایا گیا۔

''کیا شہوت اور بدکاری میں کوئی فرق ہے؟'' سوال کیا گیا۔

''ہاں...... بدکاری، ناجائز اور حرام شہوت زنی کا نام ہے۔ مگر افسوس...... انسان...... اپنے اس جذبے میں بہت بدتر ہو جائے گا، مگر چونکہ انسان میں سے انسان اسی عمل سے جنم لے گا۔ اس لئے یہ بہت ضروری ہے۔'' ہر طرف گہری خاموشی چھا گئی......

''اور...... ذہنی و علمی بھوک، کیا ہوگی؟'' قدرے توقف کے بعد پوچھا گیا۔

''میں انسان کی ذات کے اندر جستجو اور تجسس کا ایسا عنصر رکھوں گا کہ وہ زندگی بھر اس کی تلاش میں سرگرداں رہے گا۔ وہ ہر وقت کسی نہ کسی چیز کا متلاشی رہے گا اور اسے پانے کے لئے جدوجہد کرے گا۔ جس انسان کو اپنا ہم خیال اور اپنے جیسی سوچ رکھنے والا کوئی دوسرا انسان نظر آئے گا تو وہ اس کی جانب لپکے گا۔ اس سے مل کر...... اس سے باتیں کر کے وہ اپنی ذہنی اور علمی بھوک مٹانے کی کوشش کرے گا...... اس کے دماغ میں خیالات او رسوچوں کا ذخیرہ ہوگا۔ لیکن وہ ہر گزرتے دن کے ساتھ اپنے اس ذخیرے میں اضافہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ اپنی علمی و ذہنی بھوک مٹانے کے لئے وہ دور دراز کے سفر کرے گا۔ علمی و سائنسی درس گاہوں اور تجربہ گاہوں کا رخ کرے گا اور ہر کسی کا علمی ذوق و شوق دوسرے سے مختلف ہوگا۔ کسی کو جسمانی بیماریوں میں دلچسپی ہوگی اور وہ اس کی تعلیم حاصل کرے گا۔ کسی کو ستاروں کی گردش، کسی کو زمین اور اس کے اندر چھپے خزانوں کی تلاش ہوگی اور کسی کو بلند و بالا عمارتیں بنانے کا شوق ہوگا۔ ہر ایک اپنے ذہن میں موجود اس شوق کی تسکین کے لئے اپنی اس بھوک کو مٹانے کی جدوجہد کرے گا اور جسمانی و جنسی بھوک کی طرح یہ بھوک کبھی ختم نہیں ہوگی۔'' پُر اعتماد لہجے میں بتایا گیا۔

''کیا روحانی بھوک بھی انسان کو بے قرار رکھے گی اور کبھی ختم نہیں ہوگی؟'' انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

''روح ہر انسان میں موجود ہوگی۔ روح کا جسم کے ساتھ وہی تعلق ہوگا، جو میرا انسانوں کے ساتھ ہوگا جسم کا دل کے ساتھ، دل کا دماغ کے ساتھ اور معدے کے ساتھ اور مٹی کا پانی کے ساتھ۔ یعنی کہ بہت قریبی تعلق ہوگا۔ انسان کا جسم میری روح کے بغیر ادھورا ہوگا۔ مگر روحانی بھوک ہر ایک کو نصیب نہیں ہوگی؟

''کیا مطلب......؟ انہوں نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

''دنیا میں بہت سے انسان کیڑے مکوڑوں اور جانوروں کی طرح زندگی بسر کریں گے۔ کھائیں گے، پئیں گے، سوئیں گے، مختلف کام کریں گے اور موت آنے پر مر جائیں گے۔ ان کے ہونے اور نہ ہونے سے دنیا اور دوسرے انسانوں کو کوئی فرق نہیں پڑے گا، نہ وہ دوسروں کو کوئی فائدہ پہنچائیں گے اور نہ ہی کوئی خاص نقصان۔ ان کے اندر روحانی طلب بہت کم ہوگی۔'' سنجیدگی سے بتایا گیا۔

''روحانی طلب کیا ہوتی ہے......؟'' پوچھا گیا۔

''کچھ انسانوں کے اندر اپنی حقیقت کو پانے کی بہت طلب ہوگی...... اپنی حقیقت انہیں اپنے اندر روح کی سچائی سے آشنا کرے گی اور روح سے آشنائی انہیں مجھ تک لے آئے گی۔ وہ میری جستجو اور تلاش کے لئے عبادت و ریاضت کریں گے اور میرے لئے بہت مشقت اٹھائیں گے۔ وہ اپنے وجود کو فنا کر کے مجھے طلب کریں گے اور مجھے پانے کے لئے وہ کیا کچھ کریں گے۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔'' مثبت انداز میں بتایا گیا۔

''کیا واقعی......؟'' انہوں نے حیرت سے کہا۔

''ہاں......روحانی بھوک مٹانے کے لئے انسان اپنی ذات فنا کر دے گا......اپنے آپ کو مٹا کر مجھے پائے گا۔'' قدرے خوش کن لہجے میں بتایا گیا۔

''کیا روحانی بھوک کا تعلق بھی پیٹ سے ہے؟'' سوال کیا گیا۔

''نہیں......اس کا تعلق روح سے ہوگا......اور روح کے لئے میں نے کوئی مخصوص مقام انسان کو نہیں بتایا۔ روح میرا راز ہے، اسرار ہے اور انسان اس اسرار کو پانے کے لئے ہمیشہ سرگرداں رہے گا۔'' جواب دیا گیا۔

''کیا انسان کا پیٹ صرف خرابیوں اور برائیوں کی آماجگاہ ہوگا، جس میں بھوک، لالچ، حرص، شہوت اور بدکاری پیدا ہوگی؟'' انہوں نے پوچھا۔

''نہیں ......اس میں نفس کشی بھی ہوگی'' پر مطمئن لہجے میں جواب دیا گیا۔

''نفس کشی...... وہ کیا ہے؟'' انتہائی حیرت سے پوچھا گیا۔

''بھوک لگی ہو...... انواع و اقسام کے کھانے سامنے ہوں۔ مگر انہیں کھایا نہ جائے...... کسی شے کی بہت ضرورت اور حاجت ہو...... مگر اسے طلب نہ کیا جائے...... کسی شے کے بغیر زندگی ناممکن دکھائی دے اور اس کی اشد ضرورت بھی ہو۔ مگر اس کی طرف ہاتھ نہ بڑھایا جائے......'' قطعیت سے بتایا گیا۔

''یہ......یہ......کیسے ممکن ہے؟ ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی اور انہوں نے انتہائی بے صبری سے پوچھا۔

''یہ ممکن ہوگا......جب انسان کے اندر روحانی بھوک بہت بڑھ جائے گی......تو......اسے دنیا کی کسی شے سے کوئی رغبت نہیں رہے گی......نہ بھوک اسے مضطرب کرے گی نہ شہوت بے قرار۔ اس کا پیٹ بھرا ہوا اور جسم نفسانی خواہشات سے بیزار ہوگا۔ جب دنیا کے اندر رہ کر اس کے اندر دنیا کی طلب نہیں رہے گی۔ تو اسے کھانے پینے اور دوسری چیزوں سے کیا کام، مگر ایسے لوگ، بہت کم ہوں گے، جو اپنے آپ کو نفس کشی پر آمادہ کریں گے۔ کیونکہ انسان کا نفس یعنی انسان کا اندر جو نظر نہیں آئے گا۔ وہ اسے کسی بھی لمحہ پُرسکون نہیں ہونے دے گا۔ انسان کسی شے یا کام سے باز رہنے کی کوشش کرے گا، مگر انسان کا نفس اس کے ارادے میں خلل ڈالے گا۔ اسے وہی بات کرنے کو کہے گا، جس کو نہ کرنے کا وہ سوچے گا۔ انسان کے نفس میں خواہشات کے انبار ہوں گے۔ ایک خواہش پوری ہونے کے بعد وہ دوسری کی تمنا کرے گا ساری زندگی ان خواہشات کی تکمیل میں گزرے گی۔ ایک خواہش پوری ہونے کے بعد وہ مطمئن نہیں، بلکہ اور مضطرب ہو جائے گا۔ پھر دوسری چیزوں کی طلب اور ہوس اس میں بڑھتی جائے گی۔ ساری زندگی خواہشات کا لامحدود سلسلہ جاری رہے گا اور یہ سلسلہ مرتے دم تک ختم نہیں ہوگا اور یہی خواہشات انسان کو مرتے دم تک زندہ رکھیں گی۔

بچپن سے لے کر جوانی، بڑھاپے اور موت تک انسان کے اندر ایک درخت کے لاتعداد پتوں کی طرح خواہشات پیدا ہوں گی، وہ ہر خوبصورت شے کو دیکھ کر اسے حاصل کرنے کی خواہش کرے گا، ہر اچھے اور خوبصورت انسان کو دیکھ کر اس جیسا بننے کی تمنا کرے گا، اس کی زندگی کی ساری تگ و دو کا مقصد اپنے اندر کی خواہشات کی تکمیل ہوگا۔ وہ انہیں جائز و ناجائز طور پر پورا کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس کی خوشی کا زیادہ تر تعلق

ان خواہشات کے پورا ہونے سے ہوگا اور جب اس کی خواہشات پوری نہیں ہوں گی تو وہ بہت مایوس اور بددل ہو جائے گا۔" جواب دیا گیا۔

"انسان اپنی خواہشات کیسے پورا کرے گا؟" حیرت سے پوچھا گیا۔

"انسان اپنی خواہشات کو پورا کرنے کی جدوجہد ضرور کرے گا مگر ان کی خواہشات پوری کرنا میرے اختیار میں ہوگا۔" بڑی سرکار نے کہا۔

"کیا آپ سب کی ساری خواہشات پوری کریں گے؟" کسی نے پوچھا۔

"نہیں...... بہت کم......" جواب دیا گیا۔

"کیوں......؟" حیرت سے پوچھا گیا۔

"انسان کی فطرت میں ناشکرا پن بہت ہوگا۔ اگر میں اس کی ساری خواہشات کو بھی پورا کردوں تو وہ ان خواہشات کے لئے مضطرب رہے گا جو پوری نہیں ہوں گی۔ اس لئے میں جو ضروری سمجھوں گا...... وہی خواہشات پوری کروں گا۔" جواب دیا گیا۔

"انسان جس وقت جو خواہش بھی کرے گا، کیا آپ اسی وقت اسے پورا کردیں گے؟ حیرت سے سوال کیا گیا۔

"نہیں...... اسے اپنی خواہش کو پورا کرنے کے لئے بہت کوشش، محنت، جدوجہد اور طویل انتظار کرنا پڑے گا۔" جواب دیا گیا۔

"انتظار...... کیوں؟" کسی نے چونک کر پوچھا۔

"انسان کی زندگی میں وقت کو بہت اہمیت حاصل ہوگی۔ اسے وقت کا احساس دلانے کے لئے انتظار کی کیفیت سے دوچار کروں گا۔ چونکہ انسان بہت بے صبرا اور جلد باز فطرت کا ہوگا، انتظار اس کے لئے کسی اذیت سے کم نہیں ہوگا، مگر وہ اس کیفیت سے بہت کوشش کے باوجود بھی نکل نہیں پائے گا۔ انتظار کا مقصد اس کے اندر صبر کے جذبات کو پروان چڑھانا ہوگا، مگر انسان انتظار کو اپنے لئے اذیت سمجھتے ہوئے جلد بازی میں انتہائی اقدام اٹھانے لگا اور اپنے بہت سے کام خود خراب کرلے گا۔ جن کا الزام وہ مجھے دے گا۔" سفید روشنی یوں چمکی جیسے مسکرا رہی ہو۔

"خواہش اور انتظار کا مقصد کیا ہوگا؟" پوچھا گیا۔

"انسان کے اندر کو مضطرب رکھنا۔" جواب دیا گیا۔

"کیوں؟" انتہائی حیرت سے پوچھا گیا۔

"جب تک انسان کا اندر مضطرب نہیں ہوگا۔ وہ متحرک زندگی نہیں گزارے گا۔ وہ کسی بھی شے کی جستجو نہیں کرے گا، اس لئے میں نے ہر جذبے کے اندر اضطراب رکھا ہے، تاکہ انسان متحرک رہے۔" جواب دیا گیا۔

اور جانتے ہو جب انسان کی خواہشات پوری نہیں ہوں گی تو کیا ہوگا؟ معنی خیز انداز میں سوال کیا گیا۔

"کیا ہوگا......؟" حیرت سے پوچھا گیا۔

"انسان انتہائی، مایوس، بددل اور قنوطی ہو جائے گا۔ وہ اتنا بےزار، پریشان اور متنفر ہو جائے گا کہ مجھ پر بھی اسکو یقین نہیں رہے گا۔" بتایا گیا۔

"آپ پر یقین۔ نہیں رہے گا...... یہ...... یہ ناممکن ہے۔" "آپ کا شاہکار...... جسے آپ محبت سے تخلیق کر رہے ہیں۔ کیا وہی آپ پر یقین نہیں کرے گا۔" حیرت سے پوچھا گیا۔

''ہاں......مجھ سے لڑے گا، جھگڑے گا، شکوے کرے گا، سرکشی کرے گا اور بے ایمانی کرے گا۔'' بتایا گیا۔

''کیسی بے ایمانی......؟'' انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ محبت، یقین اور اعتماد جو اسے مجھ پر ہونا چاہئے اسے دوسروں پر ہوگا۔ انہیں مجھ جیسا سمجھے گا۔'' انتہائی سنجیدگی سے بتایا گیا۔

''کیا......وہ اتنا سرکش اور ظالم بھی ہو جائے گا؟'' حیرت سے پوچھا گیا۔

''ہاں...... جب اس کے نفس میں میری جستجو اور میری طلب نہیں رہے گی۔ جب اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے حرص و ہوس اور لالچ سے بھر جائے گا تو جس شے کو اپنے لئے اہم سمجھے گا۔ اسے مجھ سے بڑھ کر چاہے گا۔ اس پر مجھ سے زیادہ یقین کرے گا۔ میری بجائے اس کی طلب زیادہ کرے گا۔'' بتایا گیا۔

''ہمیں......آپ کے شاہکار پر حیرت ہو رہی ہے کہ وہ آپ سے بھی باغی ہو جائے گا۔'' حیرت سے پوچھا گیا۔

''مگر......سب ایسے نہیں ہوں گے، جو نفس کشی کریں گے اور مجھے چاہیں گے میری تمنا کریں گے۔ انہیں میں اپنی محبت سے نوازوں گا۔'' مسکرا کر جواب دیا گیا۔

''انسان اپنے آپ کو نفس کشی پر کیسے آمادہ کرے گا؟'' سوال کیا گیا۔

''انسان کے وجود کے اندر تین اہم نفوس ہوں گے۔ پہلا نفس، یعنی نفس امارہ انسان کو برائیوں کی طرف مائل کرے گا۔ انسان کے اندر بے شمار خواہشات، آرزوئیں اور تمنائیں جنم لیں گی، وہ ان خواہشات کی تکمیل کے لئے جدوجہد کرے گا اور اس کا نفس ناجائز طریقوں سے بھی ان خواہشات کو پورا کرنے کے لئے اسے ترغیب دے گا۔ یہ بہت کمزور نفس ہوگا، یہ انسان کو برائی پر اکسائے گا اور جو انسان اس کے اسیر ہوں گے، خسارے ان کا مقدر ہوں گے۔

دوسرا نفس، نفسِ لوامہ ہے، جو انسان کو برا کام کرنے پر ملامت کرے گا۔ اندر ہی اندر اس پر تنقید کرے گا۔ اچھے کام پر خوش اور برے کام پر انسان کو مضطرب رکھے گا۔ اس نفس میں انسان کا ضمیر اہم کردار ادا کرے گا، جو نفس لوامہ کا ہی دوسرا نام ہے، جو انسان نفس لوامہ کی آواز کو سنے گا۔ بہت حد تک برائیوں سے بچا رہے گا۔

نفس مطمئنہ......تیسرا نفس، جو انسان اپنی ذات سے تمام برائیوں کو پاک رکھے گا، جو اپنی خواہشات کو میری رضا اور خوشی پر قربان کرے گا، میں جو کچھ اسے عطا کروں گا اس پر خوش ہوگا اور میرا شکر ادا کرے گا اور جو کچھ چھین لوں گا، اس پر صبر کرے گا۔ کوئی شکوہ نہیں کرے گا۔ ایسا نفس، حقیقت میں نفس کشی کرے گا، جو اپنی ذات اور اپنے نفس کو میرے حکم اور خواہش کے تابع کرے گا۔ میں ایسے نفس سے خوش ہوں گا اور ایسے انسانوں کو اپنے کرم سے نوازوں گا۔'' بڑی سرکار نے جواب دیا۔

سفید روشنی تیزی سے چمکی......یوں جیسے پُر امید انداز میں مسکرا رہی ہو۔

''کیا آپ اپنے اس شاہکار سے پُر امید ہیں؟'' حیرت سے پوچھا گیا۔

''ہاں......'' مثبت انداز میں جواب دیا گیا۔

''اس کے ظلم..... سرکشی اور بے ایمانی کے باوجود بھی.....؟''

''ہاں.....''

''آپ سے منکر ہونے کے باوجود بھی.....؟''

''ہاں.....''

''آپ سے مایوس اور ناامید ہونے کے باوجود بھی.....؟''

''ہاں.....''

''آپ کی باتیں اور حکم نہ ماننے کے باوجود بھی.....؟''

''ہاں.....''

''آپ سے لڑنے، جھگڑنے کے باوجود.....؟''

''ہاں.....''

''آپ سے محبت نہ کرنے کے باوجود بھی.....''

''ہاں.....''

''آپ کے بنائے ہوئے دوسرے انسانوں کو تباہ و برباد اور قتل کرنے کے باوجود بھی.....؟''

''ہاں.....''

''آپ کے بنائے ہوئے انسانوں پر ظلم اور ان کے حقوق چھیننے کے باوجود بھی.....؟''

''ہاں.....''

''کیوں.....؟'' انہوں نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

ہر طرف گہری خاموشی چھا گئی..... انہیں پتہ یقین ہونے لگا کہ بڑی سرکار انسان کی تخلیق کے راز میں ان کو شامل نہیں کرنا چاہتی..... اس لئے ان کو جواب دینا ضروری نہیں سمجھتی، وہ قدرے مایوس ہونے لگے..... بے چینی اور اضطراب ان کے اندر پیدا ہونے لگا۔ انہیں سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بڑی سرکار انسان کو اپنا شاہکار کیوں منوانا چاہتی ہے..... مگر اندر ہی اندر وہ اس پیچیدہ شاہکار کی خوبیوں اور خامیوں سے متاثر ہو رہے تھے۔ مگر کوئی ایسی بات اس میں نظر نہیں آرہی تھی کہ وہ فوراً اس کو شاہکار مان لیتے، اس کو شاہکار ماننے کے لئے انہیں اپنے اندر سے ایسی آواز کی ضرورت تھی جو فوراً ہی اس پر ایمان لے آتی۔ اس کو شاہکار سمجھ کر اس پر یقین کر لیتی، اس لئے وہ خاموش تھے۔ مگر اب کی بار ان کے پاس اور زیادہ سوالات تھے۔ وہ مزید الجھ گئے تھے..... محفل پھر برخاست کر دی گئی۔

(۴)

## ”عشق“

مجمع میں سراسیمگی کا عالم تھا۔ حاضرین محفل میں اضطراب اور بے چینی تھی۔ تجسس بھی تھا اور اشتیاق بھی۔ حیرانگی بھی اور پریشانی بھی۔

نجانے اب کیا بتلایا اور کیا دکھایا جانا تھا، مگر جو کچھ بھی بتلایا جارہا تھا وہ ان کی توقعات اور سوچوں سے ماورٰی تھا، مگر وہ اندر سے قدرے مطمئن تھے کہ مٹی کے اس انسان کو جو کچھ بھی عطا کیا جائے گا وہ مکمل خوبیوں سے پُر نہیں ہوگا۔ یہ شاہکار، مکمل شاہکار نہیں ہوگا۔ اس میں برائیاں زیادہ اور خوبیاں کم ہوں گی۔ وہ انسان کو شاہکار ماننے پر متفق نہ تھے جبکہ بڑی سرکار کے نزدیک وہ ایک شاہکار تھا۔

ایک دم سفید روشنی تیزی سے چمکی۔ سب اس کے جلال سے مرعوب ہونے لگے۔ ہر طرف گہری خاموشی چھا گئی۔

”اب میں تمہیں اس مٹی کے پتلے یعنی انسان کی ایک بہت خاص اور اہم بات بتانے والا ہوں۔“ بارعب آواز بلند ہوئی۔ سب حیرانگی سے ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے کہ اب کیا انکشاف ہوتا ہے۔

”اس پتلے کے سر میں پیشانی کے نیچے دو سوراخ رکھے ہیں، تیز روشنی پتلے کے سوراخوں پر پڑی تو انہیں دو گول خالی سوراخ نظر آئے۔

”جانتے ہو...... ان سوراخوں میں کیا ہوگا؟ بڑی سرکار نے پوچھا۔

”نہیں“ انہوں نے حتمی انداز میں جواب دیا۔

”ان سوراخوں کو میں اپنے نور سے بھر دوں گا۔“ انہیں بتایا گیا۔

”اپنے نور سے......؟“ انہوں نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

”ہاں...... میں انسان کو دو آنکھیں عطا کروں گا...... جو میرے نور کی روشنی سے چمکیں گی...... اور ان آنکھوں سے وہ دنیا کی ہر شے دیکھے گا، جو میں نے اس کے لئے بنائی ہیں......“ بتایا گیا۔

”کیا مطلب......؟“ انہوں نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

”خوبصورت سرسبز و شاداب باغات، ان میں کھلنے والے رنگ برنگی انواع واقسام کے پھول جن کی خوشبو سے دماغ معطر اور دل مسرور ہو گا۔ خوبصورت، خوش ذائقہ پھل، سرسبز لمبے درخت، اونچے نیچے پہاڑ، برف پوش بلند و بالا اونچی چوٹیاں، پہاڑوں کے جھرنوں سے بجتی گنگناتی آبشاریں، خوبصورت وادیاں، ڈھلوان، ہموار اور چٹیل میدان، ریت سے اٹے ہوئے ریگستان، بل کھاتی، شور مچاتی ندیاں، وسیع و عریض گہرے پانیوں سے بھرے ہوئے سمندر، نیلگوں آسمان پر چمکتا سورج اور چاند ستاروں سے مزین آسمان، آسمان اور زمین کے درمیان اونچی نیچی اڑانیں

بھرنے والے مختلف رنگ و نسل کے چہچہاتے، گنگناتے پرندے، زمین پر سرپٹ بھاگتے جانور، وحشی درندے، زمین کے اندر چھپے قیمتی خزانے اور سمندروں کی گہرائیوں میں چھپے انمول نگینے اور بہت کچھ، جس کا علم صرف مجھے ہے۔ یہ سب کچھ ادھورا ہی رہ جاتا۔ اگر میں انسان کو تخلیق نہ کرتا اور انسان کو میں اسی لیے تخلیق کر رہا ہوں کہ وہ میرے چھپے ہوئے خزانوں کو کھوجے اور پانے کی جستجو کرے۔ میری کرشمہ سازیوں کو دیکھے۔ میں جتنی محبت اور خوبصورتی سے جو چیزیں اس کے لیے تخلیق کروں گا، وہ ان کو سراہے، اس کو کائنات کی ہر شے میں، جب میں نظر آؤں گا تو پھر وہ مجھے پانے کی جستجو کرے گا۔ میری طرف آنے کی جدوجہد کرے گا اور یہ تب ہی ممکن ہوگا، جب وہ اپنی آنکھوں سے میری ہر ہر چیز کو توجہ اور غور سے دیکھے گا...... تو جو دماغ، عقل، ذہانت اور سوچ میں اسے دوں گا۔ ان کے ذریعے ان کو سوچے گا اور جب وہ ان چیزوں کے بارے میں سوچے گا تو اس کے دل میں ان کی نزاکت، لطافت اور طاقت کو محسوس کرے گا اور پھر اس کا اثر اپنی روح میں محسوس کرے گا۔ جب اس کی سوچ سے اس کی روح میں سرشاری آئے گی تو وہ ایک ایسے حسین احساس سے مسرور ہوگا جو اسے میری طرف لائے گا۔ وہ کائنات کے حسن و خوبصورتی، تناسب و ہم آہنگی کو دیکھ کر ان چیزوں کے بنانے والے کے بارے میں سوچے گا۔ اس کا فہم، ادراک اور تخیل مضبوط ہوگا۔ وہ ان چیزوں کو دیکھ کر اپنے تخیل میں حقیقی اور ابدی دنیا کے بارے میں تصویر بنائے گا۔ میرے بارے میں سوچے گا، وہ جتنا زیادہ میرے بارے میں سوچے گا، میرا اور اس کا تعلق اتنا ہی مضبوط ہوتا جائے گا۔ اس کے اندر روحانی صلاحیتیں تقویت پکڑیں گی۔ وہ جہاں جائے گا مجھے دیکھنے کی کوشش کرے گا اور جس شے کو چھوئے گا اسے، اس میں میرا احساس محسوس ہوگا۔ اس لیے ان آنکھوں سے اس نے بہت اہم کام کرنے ہیں۔" بڑی سرکار نے محبت بھرے انداز میں بتایا۔

"کیا وہ ان آنکھوں سے صرف خوبصورت چیزیں ہی دیکھے گا؟" انہوں نے معنی خیز انداز میں سوال کیا۔

"نہیں..... میری کائنات میں جہاں بہت خوبصورت اور پرکشش نظارے ہوں گے، وہاں بہت سی بدصورت چیزیں بھی ہوں گی، جس طرح انسان کے اپنے اندر خیر و شر ہوگا۔ وہی سب کچھ اس کے اردگرد کائنات میں بھی ہوگا۔ یہ جہاں بہت خوبصورت چیزیں تخلیق کرنے کی کوشش کرے گا، وہیں بدصورت اور کریہہ چیزیں بھی اپنے ذہن میں سوچے گا اور دنیا کو ویسا ہی بدصورت بنانے کی کوشش کرے گا۔" انہیں بتایا گیا۔

"وہ کیسے......؟" انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

"جب انسان کی آنکھوں پر خود بینی اور جہالت کے پردے پڑ جائیں گے۔" سنجیدگی سے بتایا گیا۔

"کیا...... آپ اس کی آنکھوں سے اپنا نور چھین لیں گے؟" انہوں نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

"نہیں...... ان کی آنکھیں میرے نور سے ہی دیکھیں گی...... مگر جب ان کے دل ہوس، خود غرضی اور لالچ سے بھر جائیں گے اور ذہن ان کے دل کی خواہشات کے مطابق سوچیں گے تو ان کا دنیا کو دیکھنے کا زاویہ بدل جائے گا۔ وہ اپنے نفس، اپنی خواہشات اور اپنے مفادات کو دوسرے لوگوں کے مفادات، ان کے احساسات اور جذبات پر ترجیح دیں گے۔ ان کا مشاہدہ بدل جائے گا۔ دنیا کو دیکھنے کا نظریہ مختلف ہو جائے گا، تب ان کے سینوں اور ذہنوں میں چھپی جہالت ان کو سچ اور حقیقت نہیں دکھائے گی، بلکہ جہالت اور گمراہی کی طرف لے جائے گی۔" بتایا گیا۔

"یہ کیسی جہالت ہوگی......؟" حیرت سے سوال کیا گیا۔

''وہ سچ کو دیکھ کر بھی اسے جھٹلائے گا......اور...... غلط و جھوٹی باتوں کے بارے میں سوچے گا...... شر کو پھیلانے کی جدوجہد کرے گا اور پھر تاریک راہوں کا مسافر بنے گا......'' سنجیدگی سے بتایا گیا۔

''کیا یہ آپ کے نور سے تاریک راہوں کی طرف جائے گا۔ کیا اسے سیدھا راستہ نظر نہیں آئے گا۔ جبکہ نور تو تمام اندھیروں کو ختم کر دیتا ہے۔'' انہوں نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

''نہیں...... صرف وہی انسان تاریک راہوں کے مسافر بنیں گے۔ جن کی آنکھوں پر جہالت کے پردے غالب آئیں گے ان میں کچھ ایسے بھی ہوں گے، جن کی بصارت کے اندر میں ایسی بصیرت رکھوں گا، جس کے بارے میں تم سوچ بھی نہیں سکتے......'' خوش کن لہجے میں بتایا گیا۔

''کیسی بصیرت......؟'' انہوں نے حیرانگی سے پوچھا۔

''انسان کی سوچ، فہم و دراک، شعور اور میری طلب مل کر اس کے اندر ایسی روحانی بصیرت پیدا کریں گے، جو اس کے اندر وجدان اور عرفان کے ایسے در وا کریں گے کہ یہ چل تو زمین پر رہا ہو گا مگر اس کی نگاہیں آسمانوں کے پار مجھ تک پہنچیں گی۔ وہ بات چیت تو اپنے ہم جنسوں سے کر رہا ہو گا، مگر مخاطب مجھ سے ہو گا۔ وہ ظاہراً خاموش بیٹھا ہو گا مگر اندر ہی اندر مجھ سے سرگوشیاں کر رہا ہو گا۔ اس کی آنکھیں بند ہوں گی، مگر وہ مجھ کو دیکھنے کی کوشش کرے گا۔ لوگ اس سے سوال کریں گے اور وہ جواب مجھ سے لے گا۔ وہ جواب کسی اور کو دے گا، مگر مشورہ مجھ سے کر رہا ہو گا۔ وہ تکلیف سے تڑپ رہا ہو گا، مگر میرے حضور اندر ہی اندر گڑگڑا کر اپنا دکھ بیان کر رہا ہو گا۔ وہ اپنی محبت اور چاہت کو میری محبت پر قربان کر دے گا...... وہ میری محبت اور جدائی میں تڑپے گا، آنسو بہائے گا اور اپنی جان بھی قربان کر دے گا۔ وہ اپنی قیمتی سے قیمتی شے کو میری چاہت پر فدا کرے گا۔ وہ مجھے چاہے گا اور میں اسے چاہوں گا...... وہ مجھ سے کچھ طلب نہیں کرے گا...... مگر میں پھر اسے سب کچھ عطا کروں گا...... لیکن ایسے خاص انسان بہت کم ہوں گے۔'' مثبت انداز میں بتایا گیا۔

''اور...... وہ...... خاص انسان کون ہوں گے؟'' حیرت سے سوال کیا گیا۔

''وہ جو سچ کے متلاشی ہوں گے اور سچ کی جستجو کریں گے، جن کے لئے دنیا بے معنی اور فضول ہو گی...... وہ اپنے اندر مجھے ہر جگہ اور ہر وقت محسوس کریں گے۔ وہ خود شناس ہوں گے، اپنے آپ کو پہچانتے ہوں گے، جنہیں معلوم ہو گا کہ ان کے دلوں میں حرکت کون پیدا کر رہا ہے۔ ان میں محبت کون بھر رہا ہے۔ نفرت، کینہ، حسد، عداوت، لالچ اور بغض سے ان کے دل کون صاف کر رہا ہے۔ ان احساسات میں جذبات کہاں سے آ رہے ہیں اور ان کے دماغوں میں ہر لمحہ نت نئی سوچیں اور خیالات کون بھر رہا ہے۔ ان کی آنکھوں میں چمکنے والے نور کی تجلیات کہاں سے آ رہی ہیں۔ ان کے پیٹوں میں بھوک اور نفس کشی کے احساسات کہاں سے جنم لے رہے ہیں۔ ان کے جسموں کو کون حرکت دے رہا ہے۔ کون حرارت عطا کر رہا ہے، کون انہیں بیمار کر رہا ہے اور کون ان کو شفا دے رہا۔ وہ ہر بات، میں میری، مرضی اور میری رضا چاہیں گے۔ میرے فیصلوں پر کبھی نہیں پچھتائیں گے۔ تب بھی نہیں جب میں ان سے کچھ چھینوں گا...... اور تب بھی نہیں جب میں ان کو ختم کر دوں گا۔ وہ بہت خاص ہوں گے...... وہ میری محبت میں دشمنوں کو بھی اپنا بنائیں گے۔ میری چاہت میں دشمنوں کو بھی معاف کر دیں گے۔ ان کے لئے صرف میں اہم ہوں گا اور میں ان کو تب ملوں گا جب وہ

اپنی انا، تکبر کو ختم کر کے میرے آگے عجز و انکساری سے سر جھکائیں گے۔ میرے فرمانبردار ہوں گے اور اس سے ان کے اندر روحانی بصیرت پیدا ہو گی۔" جواب دیا گیا۔

"کیا روحانی بصیرت بھی آپ کی محبت سے پیدا ہو گی؟" پوچھا گیا۔

"ہاں روحانی بصیرت کا سرچشمہ میرا عشق ہو گا، جو میرے عرفان سے جنم لے گا، جب انسان کو اپنے اندر اور باہر ہر جانب میں ہی نظر آؤں گا تو اس کے اندر عرفان اور وجدان کے دروازے کھلیں گے۔ اس کی روح ہر وقت مضطرب، بے قرار اور بے چین رہے گی۔ میرا ذکر، میری یاد اور میری تمنا اس کو بہت بے چین رکھے گی۔ اس کی متلاشی نگاہیں میری جستجو میں ہر جانب اٹھیں گی۔ میرے قرب کے لئے وہ اس قدر بے قرار ہو گا کہ اپنا سب کچھ چھوڑ کر جنگلوں، پہاڑوں اور ویرانوں میں نکل جائے گا۔ وہ کبھی مجھے میرے بنائے ہوئے نظاروں میں تلاش کرے گا...... تو...... کبھی اپنی روح کی پرواز میں...... میرے دیدار کی تمنا اس کے اندر ایک ایسی آگ بھڑکائے گی جو کسی پل ٹھنڈی نہیں ہو گی۔" بڑی سرکار نے جواب دیا۔

"عشق کیا ہو گا...... جو انسان کو اس قدر مضطرب رکھے گا؟" سوال کیا گیا۔

"جو ایک بار دیکھا...... اسے دوبارہ دیکھنے کی آرزو 'عشق' ہے۔ جب ایک بار میری حقیقت کا تھوڑا سا عرفان کسی روح کو ہو گا تو وہ اس قدر مضطرب ہو جائے گی کہ اسے دنیا کی کوئی شے سکون نہیں دے گی۔ وہ میرے ہجر میں روئے گا اور تڑپے گا اور میرے وصال کی تمنا دل میں لئے مارا مارا پھرے گا...... عشق کی حقیقت کیا ہے؟ تم اس کا شعور کبھی نہیں کر سکو گے، کیونکہ میں نے عشق کی نعمت سے صرف انسان کو نوازا ہے، ہم کو نہیں اور انسان جب سرکشی میں میری اطاعت کرے گا، مایوسی میں...... مجھ پر ایمان لائے گا...... اور جب وہ مجھے ظاہر میں پوشیدہ اور پوشیدہ میں ظاہر پائے گا۔ میں اس کی ظاہری آنکھ کے اندر روحانی آنکھ کا محور ہوں گا۔ وہ دنیا کو دیکھے گا، مگر اسے ہر طرف میں نظر آؤں گا...... وہ مجھ سے دور اور میں اس سے دور نہیں ہوں گا...... میں اس کے دل کی دھڑکنوں میں...... اس کی آنکھ کی بصیرت میں، دماغ کے شعور میں اور روح کے وجدان میں ہوں گا۔ عشق سوز ہے، ساز ہے، خاموشی ہے، آواز ہے، سکون ہے، اضطراب ہے، ہجر ہے، وصال ہے، میرے قرب اور دیدار کی تمنا اور انتہائے شوق کا نام عشق ہے۔ عشق شدت محبت سے جنم لینے والے فراق اور وصل کی انتہائی کیفیت کا نام ہے، جو انسان کو کسی بھی پل سکون نہیں لینے دے گا۔ یہ محبت، چاہت، جستجو اور شوق تمنا کے سفر کا نام ہے۔ عشق تڑپ کا نام ہے، معراج ہے، وصل کی تمنا ہے، محبت نقطہ ہے اور عشق دائرہ ہے، محبت عرفان ہے اور عشق وجدان...... محبت کا حاصل عشق ہے اور عشق کا حاصل کسی کو معلوم نہیں ہو گا، کیونکہ عاشق...... عشق تو ضرور کرے گا، مگر کیا پائے گا اور کیا کھوئے گا اور کیا کچھ کھو کر پائے گا...... اسے خود بھی معلوم نہیں ہو گا۔" بڑی سرکار نے بتایا۔

"کیا دنیا کے سارے انسان آپ سے عشق کریں گے؟" لیڈر نے حیرت سے پوچھا، جس کے اندر بہت اضطراب پھیل رہا تھا۔

"نہیں، بہت سے اپنے ہم جنسوں کے ساتھ عشق کریں گے...... مگر وہ عشق ان میں مزید اضطراب پیدا کرے گا...... کیونکہ عشق میں ٹھہراؤ نہیں...... عشق ہر وقت محو پرواز ہو گا، جب انسان اس کو پالے گا، جس سے وہ عشق کرتا ہو گا تو وہ جذبہ دم توڑ کر بے معنی ہو جائے گا۔ اس کو پا کر بھی اسے سکون نہیں آئے گا۔ وہ کسی اور شے کا متلاشی ہو گا...... لیکن میرے عشق کی کوئی منزل نہیں...... ہر انسان کا سفر بھی مختلف ہو گا اور منزل بھی...... اس

سفر میں وہ ایسی ایسی منازل اور مدارج طے کرے گا کہ خود بھی حیران رہ جائے گا...... میں اس کے اندر ہوں گا۔ اس کے بہت قریب، مگر پھر بھی وہ میرے قرب کی تمنا میں اپنے آپ کو فنا کرے گا۔" بڑی سرکار نے بتایا، روشنی یوں چمکی جیسے مسکرا رہی ہو۔

"یہ...... یہ...... کیسے ممکن ہے۔ آپ پاس ہوں اور پھر بھی آپ کی تلاش میں وہ سرگرداں رہے۔" لیڈر نے بوکھلا کر کہا۔

"یہی عشق ہوگا...... میں اس کے سامنے اور وہ میرے سامنے ہوگا...... پھر بھی مجھ تک پہنچنے کی تڑپ اس کو بے قرار رکھے گی...... میرے ہجر اور فراق میں وہ مضطرب رہے گا۔" بتایا گیا۔

"کیا آپ نے انسان کو اپنے عشق کے لئے پیدا کیا ہے؟" لیڈر نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں......" جواب دیا گیا۔

"کیوں......؟ لیڈر نے چونک کر پوچھا۔

"میری ذات کا عرفان اور میرے عشق کا شعور تم کبھی بھی نہیں کر سکتے تھے۔ تم میری عبادت تو کرتے ہو مگر مجھے عبادت سے زیادہ انسان سے اپنی بندگی، محبت، چاہت اور عشق مقصود ہے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ کون مجھے دیوانگی کی حد تک چاہے گا۔ کس کی زندگی کا حاصل صرف میں ہوں گا۔ کون مجھ سے سچی محبت کرے گا، کون میری جستجو کرے گا اور میرے فراق میں تڑپے گا...... کون میرے لئے اپنا سب کچھ قربان کرے گا...... کس کی تمنا اور حاصل صرف میں ہوں گا؟" محبت سے بتایا گیا۔

"کیا مٹی کے اس پتلے کے ذریعے آپ اپنی ذات کا عرفان چاہتے ہیں۔ کیا گارے سے بنے ہوئے اس انسان کی اتنی حیثیت ہوگی کہ وہ آپ کی ذات کا شعور کر سکے؟" لیڈر نے مایوس کن لہجے میں پوچھا۔

"ہاں......" جواب دیا گیا۔

"میں نہیں مانتا......؟ لیڈر نے نخوت سے کہا۔

"کس کو......؟" حیرت سے پوچھا گیا۔

"انسان کو...... اور اس کے عشق کو" لیڈر نے جواب دیا۔

سفید روشنی یوں چمکی جیسے خفگی کا اظہار کر رہی ہو۔ ہر جانب خاموشی چھا گئی۔ تمام حاضرین لیڈر کی گفتگو سے مضطرب ہو گئے تھے۔ ایک نے ہمت کی اور آگے بڑھ کر سوال کیا۔ "کیا انسان کی آنکھیں صرف روحانی بصیرت کے لئے پیدا کی جائیں گی؟"

"نہیں...... جب اس کے احساسات مجروح ہوں گے اور جب اس کے جذبات کو ٹھیس لگے گی...... جب اس کی روح دکھ درد کے شدید احساس سے مضطرب ہوگی اور وہ اپنے آپ کو بہت بے بس پائے گا...... تب اس کی آنکھوں سے مخصوص قسم کا پانی جاری ہوگا...... جو اس کے دل کے غبار کو کم کرے گا۔" سنجیدگی سے بتایا گیا۔

"کیسا پانی......؟" حیرت سے سوال کیا گیا۔

"وہ پانی..... " آنسو ہوں گے۔ آنسو مجروح جذبات کے اظہار کا ذریعہ ہوں گے۔ اگر انسان کو آنسو نہیں ملیں گے تو اس کا دل دکھ، درد کی شدت سے پھٹ جائے گا۔ اس کے اندر کے جذبات اور خیالات کا اظہار آنسوؤں اور خوشی کا اظہار ہنسی اور قہقہوں سے ہوگا۔ مایوسی کا اظہار خاموشی اور سرد آہوں سے ہوگا۔ آنسو جذبات کی سرشاری کا اظہار کریں گے۔ کبھی کبھار بہت خوشی سے بھی آنسو بہہ نکلیں گے، مگر زیادہ تر دکھ، درد اور کرب کے تاثرات کا اظہار ان سے ہوگا۔" بتایا گیا۔

"کیا آنسو انسان کو بے بس اور کمزور ثابت کریں گے؟" حیرت سے پوچھا گیا۔

"ہاں..... کسی حد تک..... مگر..... جن کو اپنے جذبات پر قابو ہوگا اور جو مجھ پر کامل یقین رکھیں گے ان کے دل اور اعصاب مضبوط ہوں گے۔ وہ دوسرے کمزور انسانوں کی طرح آنسو نہیں بہائیں گے۔" جواب دیا گیا۔

"اب تمہاری میری اس شاہکار کے بارے میں کیا رائے ہے؟ بڑی سرکار نے ان سے پوچھا۔

ہر طرف گہری خاموشی چھا گئی..... انہوں نے سر جھکا لئے، جیسے انسان کے بارے میں بہت کچھ جاننے کے باوجود بھی وہ اسے شاہکار ماننے کو تیار نہ ہوں..... مگر یہ ملا اس کے بارے میں کچھ کہنے کی ہمت اور جرأت نہ کر رہے ہوں۔

"سرکار آپ نے انسان کے دل میں محبت، پیار، ہمدردی، نفرت، حسد، کینہ اور لالچ..... دماغ میں عقل، سوچ، ذہانت، تکبر اور جنون۔ پیٹ میں بھوک، شہوت، بدکاری اور نفس کشی و خواہشات۔ آنکھوں میں نور، بصارت، جہالت اور روحانی بصیرت رکھے ہیں یہ کیسا شاہکار ہے جسے آپ نے سب کچھ ہی دے ڈالا ہے کہ وہ جو چاہے کرے، چاہے تو محبت کرے، پیار پھیلائے، چاہے تو نفرت کرے، چاہے تو عقل اور ذہانت سے محلات تعمیر کرے، چاہے تو دنیا کو تباہ و برباد کرنے کے منصوبے بنائے اور سازشیں کرے، چاہے تو اپنا بھی سب کچھ ہڑپ کر لے اور حلال و حرام کا فرق مٹائے بغیر دوسروں کا بھی حق غصب کر لے اور چاہے تو نفس کشی بھی کرے۔ چاہے تو آپ کے نور سے دنیا کو خوبصورت مناظر دکھائے اور چاہے تو اپنی آنکھوں پر جہالت کے پردے ڈال لے۔ کیا آپ نے اسے اپنی مرضی، ارادے اور اختیارات میں مکمل خود مختاری دے دی ہے؟" مؤدبانہ انداز میں سوال کیا گیا۔

"مجھے معلوم تھا..... تم یہ سوال ضرور پوچھو گے..... ہاں۔ میں نے اپنے اس شاہکار کو سب کچھ دے ڈالا ہے۔" پرامید لہجے میں بتایا گیا۔

سفید روشنی تیزی سے چمکی جیسے کوئی مسکرا کر کسی کو دیکھ رہا ہو۔ حاضرین محفل میں اضطراب سا پھیلنے لگا۔

"مگر..... سب کچھ دے کر بھی..... میں نے..... اسے..... کچھ نہیں دیا۔" قدرے توقف کے بعد بارعب آواز بلند ہوئی۔

"کیا مطلب.....؟" وہ چونکے۔

"انسان محبت تو ضرور کرے گا..... مگر محبت کو پانا اور کھونا اس کے بس میں نہیں ہوگا۔

وہ اپنی عقل، ذہانت اور سوچ سے بہت کچھ حاصل کرنے کی جدوجہد کرے گا..... وہ برسوں کوشش کرے گا مگر جب میں چاہوں گا تب وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگا۔ اگر میں نہیں چاہوں گا تو وہ کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ چاہے دنیا بھر کے وسائل اپنی کامیابی کے لئے استعمال کرے۔

وہ اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے بہت کچھ کرے گا...... مگر اپنی بھوک پر قابو نہیں پا سکے گا، جب تک میں اس کو نفس کشی پر آمادہ نہیں کروں گا...... اس کے اندر ہوس، حرص وطمع اور خواہشات کی طلب بڑھتی ہی چلی جائے گی۔ وہ ان پر کبھی بھی قابو نہیں پا سکے گا۔ جب تک کہ میں نہ چاہوں اور اس کی خواہشات کو پورا کرنا میرے اختیار میں ہوگا اور اس کے اندر شہوت کا جانور اسے درندگی اور وحشت پر ابھارے گا، مگر اس کے اس جذبے کو جب تک میں تکمیل نہیں ڈالوں گا، تب تک وہ مضطرب اور بے قرار رہے گا۔ وہ اپنی آنکھوں سے بہت نظارے دیکھے گا، مگر اس کے اندر خود شناسی، روحانی بصیرت اور وجدان کے دروازے صرف میں کھولوں گا...... دنیا کی کوئی طاقت اس پر قادر نہیں ہوگی کہ انسان سے کچھ چھین لے یا اسے کچھ عطا کر دے۔ انسان کے سارے کاموں، اس کی سوچوں، ارادوں اور منصوبوں کی ڈوریاں میں نے اس کی قسمت سے باندھ رکھی ہیں۔ وہ بہت کچھ کرنا چاہے گا، مگر اپنی قسمت کے ہاتھوں مجبور ہوگا۔ وہ بہت جدوجہد کرے گا...... مگر اس کی قسمت اس کو منہ کے بل گرائے گی وہ بڑے بڑے منصوبے بنائے گا مگر قسمت اسے مات دے گی۔ وہ اٹھ اٹھ کر اور آگے بڑھ بڑھ کر جدوجہد کرے گا۔ کوئی کامیابی اور فتح حاصل کرنے کے لئے اپنے سارے وسائل استعمال کرے گا، مگر جب تک اس کی قسمت ساتھ نہ دے گی تو وہ کچھ بھی نہیں کر سکے گا اور اس کی تقدیر اٹل ہوگی...... جسے میں لکھوں گا۔" فاتحانہ انداز میں بتایا گیا۔

"جب انسان کی تقدیر آپ نے لکھی ہے تو پھر انسان کس لئے جدوجہد کرے گا۔ اسے جو کچھ آپ عطا کریں گے...... اسے وہی ملے گا...... جو نہیں چاہیں گے...... وہ نہیں ملے گا...... پھر وہ کیا پانے کی کوشش کرے گا اور کیونکر......؟" انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

"انسان کو جو کچھ ملنا ہے یا نہیں ملنا ہے وہ میرا فیصلہ ہے اور یہ اس کی تقدیر ہوگی...... کس طرح اور کن راستوں پر چل کر اسے وہ پانا ہے یہ اس کی جدوجہد ہوگی...... انسان کا سفر تو اس راستے پر چلنا ہے جس کے اردگرد میں نے اس کے لئے بہت کچھ چھپا رکھا ہے۔ اب یہ اس کی قسمت ہوگی کہ اس کو چلنے کے لئے جو راستہ ملے گا...... وہ ہموار ہوگا یا کنکروں سے بھرپور، جن سے ٹکرا کر وہ بار بار ٹھوکریں کھائے گا...... گرے گا یا سنبھلے گا...... یہ اس کا نصیب اور قسمت ہوگی۔" بتایا گیا۔

"یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے آپ کا شاہکار بہت بے بس اور مجبور ہوگا؟" حیرت سے سوال کیا گیا۔

"نہیں...... تم اس کی سرشت کو نہیں جانتے۔ اگر میں ایسا نہ کرتا...... اور اسے کچھ عطا کرنا یا نا کام کرنا...... میں اپنے ہاتھ میں نہ رکھتا تو انسان کے اندر موجود انانیت، تکبر، خود پسندی، خود غرضی، بربریت، لالچ، وحشت اور ضلالت وظلمت کی کوئی حد نہ ہوگی۔ وہ اپنے ہم جنسوں کے لئے ایسی ایسی آزمائشیں اور مصیبتیں کھڑی کرے گا کہ دوسرے انسانوں کے لئے سانس لینی مشکل ہو جائے گی۔ وہ دوسروں کے لئے نہ ٹلنے والا خطرہ بن جائے گا۔ اس لئے اس خطرے کے شر سے دوسروں کو محفوظ رکھنے کے لئے میں ظالموں کو ایک مخصوص وقت اور عمر کے بعد موت دوں گا اور موت کے ساتھ اس کا ظلم، اس کی کامیابیاں وکامرانیاں، منصوبے اور سازشیں ختم ہو جائیں گی اور سب کچھ بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔" قطعیت سے جواب دیا گیا۔

"اگر اتنا سب کچھ عطا کرنے کے بعد انسان کو موت ہی دینی ہے تو پھر اسے زندگی کیوں دے رہے ہیں؟" حیرت سے پوچھا گیا۔

"میں انسان کو آزمائش میں ڈالنا چاہتا ہوں۔" جواب دیا گیا۔

''کیسی آزمائش......؟'' انتہائی حیرت سے پوچھا گیا۔

''زندگی کی آزمائش۔محبت، دولت، اقتدار اور خود شناسی کی آزمائش، جو زندگی کے اس کٹھن امتحان اور آزمائش میں سے کامیاب ہو کر گزریں گے، انھیں حیات جاودانی عطا کروں گا......ان پر اپنی نعمتیں نچھاور کروں گا......انہیں وہ کچھ عطا کروں گا، جن کے بارے میں انسان نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا۔'' بڑی سرکار نے محبت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

''سرکار......کیا آپ صرف انسان کو آزمائش کے لئے بنا رہے ہیں۔کیا اس کی زندگی کا کوئی اور مقصد نہیں ہوگا؟'' انہوں نے تجسس سے پوچھا۔

''میں اس کو جستجو کے لئے بنا رہا ہوں۔'' جواب دیا گیا۔

''کیسی جستجو......؟'' حیرت سے پوچھا گیا۔

ایک راز کو پانے کے لیے۔

''کیسا راز......؟''

''یہ ایک اسرار ہے جو صرف میرے اور انسان کے درمیان ہوگا......''

''کیا انسان، اس اسرار کو پالے گا......'' انتہائی حیرت سے پوچھا گیا۔

''سب نہیں......مگر بہت کم......''

''سب کیوں نہیں......؟''

''اگر سب جان گئے تو میں اسرار نہیں رہوں گا......اور مکمل کر سب کے سامنے آجاؤں گا......اور میں ان کی محبت کی شدت اور اس پیانے کو جاننا چاہتا ہوں، جو وہ مجھ سے ان دیکھے کریں گے......میری جستجو میں اور مجھے پانے کی جدوجہد میں وہ انتہائی کٹھن مراحل اور آزمائشوں سے گزریں گے......کچھ تو مجھے جاننے......پہچاننے اور ماننے سے ہی انکار کردیں گے۔کچھ مانیں گے مگر پہچانیں گے نہیں......اور کچھ جانیں گے بھی اور مانیں گے بھی......تم ہی بتاؤ......ایک انسان جو کسی کی محبت پانے کے لئے جستجو کرتا ہے۔کیا وہ اس کے برابر ہو سکتا ہے، جو کسی کی محبت کو سرے سے ہی نہیں مانتا......یا......پھر اس کی طرح جو کسی کی محبت کو چھیننے کی کوشش کرتا ہے......'' قدرے سنجیدگی سے سوال کیا گیا۔سب خاموش ہوگئے۔ان کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔

''کیا تم میری حقیقت جانتے ہو؟'' سوال کیا گیا۔

''جواباً وہ خاموش ہوگئے۔''

کیا تم مجھے جانتے ہو؟

وہ خاموش رہے۔

کیا مجھے مانتے ہو......؟

''ہاں......مثبت انداز میں قطعیت سے جواب دیا گیا''۔ سفید روشنی تیزی سے چمکی جیسے مسکرا رہی ہو۔

''اور جو، مجھے مان کر...... جانے اور پہچانے گا...... کیا وہ تمہاری طرح ہو سکتا ہے؟''

سب چونک گئے اور ایک دم بوکھلا کر سفید روشنی کی طرف دیکھنے لگے، مگر اس کی تاب نہ لا کر انہوں نے سر خاموشی سے جھکا لئے۔

''تمہاری مجھ تک ویسی رسائی کبھی ممکن نہیں ہوگی...... جیسی انسان کو ہوگی۔''

''انہوں نے پھر چونک کر سفید روشنی کو دیکھنا چاہا، مگر بڑی سرکار کے اس انکشاف پر وہ دکھی ہو گئے۔ بڑی سرکار اور ان کے درمیان اب کوئی تیسرا آ رہا تھا۔ ان کی محبت اور عبادت میں کوئی اور بھی شریک ہونے جا رہا تھا اور شراکت داری کے اس احساس نے ان کے اندر اضطراب پیدا کر دیا تھا۔ ان پر افسردگی چھا رہی تھی۔

بڑی سرکار نے ان کی طرف دیکھا...... ہر طرف گہری خاموشی سی چھا گئی۔

''وہ...... جو میری محبت ...... میں اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو جائے...... کیا...... وہ اس جیسا ہو سکتا ہے، جس کی محبت میں کوئی آزمائش ہی نہ آئے...... جو صرف محبت کرے...... مگر...... کوئی نذرانہ پیش نہ کرے۔'' بڑی سرکار نے کہا تو انہوں نے پھر چونک کر سفید روشنی کو دیکھا۔

''کیسا نذرانہ......؟'' قدرے توقف کے بعد انہوں نے پوچھا۔

''تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ میں انسان کو کیسے کیسے آزماؤں گا...... اس کو ایسی ایسی اذیت میں ڈالوں گا کہ وہ موت طلب کرے گا مگر میں اس وقت اسے موت بھی نہیں دوں گا...... وہ تکلیفوں سے فرار چاہے گا...... اور میں اس کے لئے سارے راستے بند کر دوں گا۔ وہ سکون کے چند لمحے مانگے گا تو میں ہر لمحے کو اتنا تکلیف دہ بنا دوں گا کہ ان کا دم گھٹنے لگے گا...... وہ میرے سامنے روئیں گے...... گڑگڑائیں گے...... آہیں بھریں گے...... شکوے کریں گے اور جھگڑا کریں گے، مگر میں ان کو آزماتا رہوں گا۔'' جواب دیا گیا۔

''کیوں......؟'' حیرت سے پوچھا گیا۔

''ان کا صبر...... دیکھنے کے لئے...... کہ وہ کس حد تک برداشت کر سکتے ہیں۔''

''کیا صرف صبر دیکھنے کے لئے آپ اس کو اتنی اذیت میں ڈالیں گے......؟'' انتہائی حیرت سے پوچھا گیا۔

''نہیں...... مجھ پر انسان کا ایمان اور یقین بھی دیکھنے کے لئے......'' سنجیدگی سے جواب دیا گیا۔

''ہمیں انسان پر افسوس ہو رہا ہے......؟'' وہ بولے۔

''کیسا افسوس......؟'' بڑی سرکار نے حیرت سے پوچھا۔

''آپ کا شاہکار انسان دنیا میں کتنی اذیت بھری اور بے بسی کی زندگی بسر کرے گا...... لیڈر نے قدرے طنزیہ انداز میں جواب دیا۔

''کیا مطلب...... تم کیا کہنا چاہتے ہو؟'' پوچھا گیا۔

''انسان، جسے آپ بہت محبت سے بنائیں گے۔ اس کو دنیا اور اس کی نعمتیں عطا کریں گے...... اس کو بے شمار صلاحیتوں سے بھی نوازیں

گے..... مگر وہ اتنا بے بس ہوگا کہ اپنی مرضی اور خواہش سے اپنی محبت کو پا بھی نہیں سکے گا۔ اتنی محنت کے باوجود بھی کامیابیاں حاصل کرنا اس کے لئے ممکن نہیں ہوگا۔ وہ جو چاہے گا..... اسے نہیں ملے گا..... اور پھر آپ اسے اذیتوں اور تکلیفوں سے بھری زندگی دیں گے..... وہ اپنی مرضی سے نہ مر سکے گا اور نہ ہی قرار حاصل کر سکے گا..... کیا آپ کا یہ شاہکار ادھورا انسان نہیں ہوگا؟ جسے آپ سب کچھ دے کر بھی کچھ نہیں دے رہے..... ہمیں تو اس پر افسوس ہو رہا ہے..... اور بہت دکھ بھی۔" وہ تاسف سے بولے۔

"انسان بھی ساری زندگی اس پر افسوس کرتا رہے گا۔ مجھ سے شکوے کرے گا کہ میں نے اس کے ساتھ زیادتی کی..... ظلم کیا..... اس کی تقدیر لکھی جو اس نے کرنا ہے، سب اس کی قسمت میں پہلے دن سے لکھ دیا گیا ہے..... تم انسان کو نہیں جانتے۔ میں اس کی فطرت، اس کے ضمیر، اس کی سرشت اور اس کے اندر کے رازوں اور ان سوچوں سے بھی واقف ہوں جو اس کے اندر جنم لیں گی..... میں بہت سی باتیں اس کی تقدیر میں لکھوں گا۔ مگر اس کی تقدیر سوچ، فیصلے اور عمل کے درمیان کچھ ایسے خلا ہوں گے جن کو انسان نے اپنے ارادے، مرضی اور فیصلوں پر کرنا ہوگا۔ جب ان نازک لمحوں میں انسان کی سرشت میں پنہاں پاکیزگی، عصمت، دانشمندی، خیر اور میری محبت کا عنصر غالب آئے گا۔ تب اس کی پہچان ہوگی..... جب وہ اپنی محبت سے انکار اور میری محبت کا اقرار کرے گا، جب وہ صبر میں میری رضا طلب کرے گا..... تب میں اسے منتخب کروں گا کہ وہ میری کتنی چاہت اور محبت کا حقدار ہے..... پھر میں اسے وہی کچھ عطا کروں گا، جس کی وہ مجھ سے توقع کرے گا..... مگر جن کی فطرت میں ٹیڑھا پن، کہیں نہ کہیں برائی چھپی ہوگی۔ وہ زندگی کے ان خلا کو ان برائیوں سے پر کرنے کی کوشش کرے گا..... اور جو ان کی اذیتوں، پریشانیوں اور دکھوں کو محسوس کر کے ان کی تکالیف کو کم کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ میں ان کو بھی سزا دوں گا اور ان کو بھی تکالیف میں ڈالوں گا۔ انسان کی ساری زندگی یہی سلسلہ جاری رہے گا۔" جواب دیا گیا۔

"ہم تو الجھ کر رہ گئے ہیں..... آپ کی حکمتوں، مصلحتوں، مخفی رازوں تک ہماری رسائی ممکن نہیں۔ آپ کا شاہکار کیا کرے گا اور دنیا میں کیسی زندگی بسر کرے گا..... اتنی تکالیف اور اذیتوں کے باوجود کیسے خوش رہے گا۔ ہمیں تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا..... مگر ہمیں اس شاہکار کے بارے میں خدشات، وسوسے اور اندیشے ہیں۔" کسی نے کہا۔

"کیسے اندیشے.....؟" بڑی سرکار نے پوچھا۔

"یوں لگ رہا ہے کہ آپ کا شاہکار..... انسان بہت مضطرب اور مایوس ہوگا۔ اپنی قسمت کے ہاتھوں مات کھا کر وہ کیسے خوش رہے گا..... اور آپ جن مخصوص لوگوں کی بات کر رہے ہیں، جن کی رسائی آپ تک ہوگی وہ مجھے ناممکن نظر آتا ہے۔ کیونکہ اس قدر مضطرب انسان آپ تک رسائی پا ہی نہیں سکے گا۔" لیڈر نے قدرے نخوت سے کہا۔

"کیوں.....؟" بڑی سرکار نے پوچھا۔

"کون سا ایسا انسان ہوگا، جس میں آپ کی محبت، آپ کا عشق، آپ کی جستجو، روحانی بصیرت اور اس کی روح میں وجدان اور عرفان غالب آئے گا..... اتنا سب کچھ ہونا ایک انسان میں ناممکن ہوگا۔" وہ قدرے حیرت سے بولا۔

''کیا تمہیں مجھ پر یقین نہیں؟'' سوال کیا گیا۔

''مجھے انسان پر اعتبار نہیں۔'' لیڈر نے جواب دیا۔

''کیوں......؟''

''مٹی کا کمزور انسان...... جسے خود بھی اپنے اندر کی خبر نہیں ہوگی...... جس میں کبھی شر غالب...... اور کبھی خیر...... جس کی فطرت میں محبت سے زیادہ فتنہ وفساد، حرص وہوس اور فساد زیادہ ہوگا...... جسے اپنی ذات سے آگہی نہیں ہوگی...... آپ تک کیسے پہنچ پائے گا...... سب ناممکن ہوگا۔'' لیڈر نے پتلے کی جانب نفرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرا بخشا ہوا شعور، میرا عطا کیا ہوا علم اور عرفان اسے مجھ تک لے آئے گا۔'' جواب دیا گیا۔

''آپ تک......؟'' اس نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

''ہاں...... مجھ تک......''

''آپ...... اسے اتنا بڑا درجہ عطا کریں گے......؟'' لیڈر نے چونک کر پوچھا۔

''ہاں......'' پرمطمئن لہجے میں جواب دیا گیا۔

''میری چھپی ہوئی ذات کو وہ دنیا پر آشکارا کرے گا، جب میری ہستی کا عرفان اسے ملے گا، تو وہ دنیا کو اس کے بارے میں بتائے گا۔'' جواب دیا گیا۔

''کیا اتنا بڑا کام یہ ناتواں، کمزور اور حقیر انسان کر سکے گا؟'' لیڈر کے اندر نفرت کی آگ بھڑکنے لگی اور اس نے اپنے غم وغصے کو چھپاتے ہوئے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

''ہاں......'' مثبت انداز میں جواب دیا گیا۔

''میں نہیں مانتا......'' لیڈر خفگی سے بولا۔

''کس کو...... مجھے یا...... انسان کو؟''

''انسان کو...... آپ کا شاہکار...... کبھی نہیں...... کبھی بھی نہیں......'' لیڈر نے قدرے غصے سے کہا۔

''تمہارے اس سوال کا جواب...... مٹی کا یہ پُتلا خود دے گا...... کہ وہ میرا شاہکار کہلانے کا اہل ہے یا نہیں۔'' جواب دیا گیا۔

''کیا اس کی اتنی حیثیت، مقام اور مرتبہ ہوگا کہ یہ خود اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کر سکے گا۔'' لیڈر نے چونک کر پوچھا۔

''ہاں...... اور یہ تم خود دیکھو گے۔'' بڑی سرکار نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے...... میں انتظار کروں گا...... کہ یہ کب اور کیسے اپنے آپ کو آپ کا شاہکار ثابت کرتا ہے۔'' وہ قدرے نخوت سے بولا اور شاہی دربار چھوڑ کر چلا گیا۔

تمام نوری مخلوق مضطرب ہوگئی اور اندر ہی اندر پریشان...... ان کا لیڈر جو بڑی سرکار کا منظورِ نظر تھا۔ اس مٹی کے پتلے کی وجہ سے بڑی سرکار کا شاہی دربار چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ ان کے لئے یہ انتہائی حیرت اور پریشانی کی بات تھی۔ وہ بہت بے قرار اور بے چین ہونے لگے، ہر طرف گہرا سکوت چھا گیا۔

''کیا تم بھی اسے میرا شاہکار نہیں مانتے؟'' بڑی سرکار نے بارعب انداز میں پوچھا۔

سب نے خاموشی سے سر جھکا لئے...... کسی کی کوئی آواز بلند نہ ہوئی۔

''میں تمہارے اندر کے اضطراب کو جانتا ہوں، تم بھی اس وقت تک اسے میرا شاہکار نہیں مانو گے...... جب تک یہ خود اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت نہیں کرے گا......'' بڑی سرکار نے پرامید لہجے میں کہا۔

سفید روشنی مٹی کے پتلے پر اس انداز سے چمکی کہ اس سے ست رنگی شعاعیں نکلنے لگیں۔ وہ سب حیران ہو گئے...... وہ گھبرا گئے اور بوکھلا گئے۔

سفید روشنی یوں چمکی جیسے ان کی بوکھلاہٹ پر مسکرا رہی ہو۔

سفید روشنی پھر پتلے پر اس انداز سے چمکی کہ اس کے مٹی کے وجود کو اپنے حصار میں لے لیا۔ وہ ابرق کی مانند سفید، چمکتا ہوا نظر آنے لگا۔ وہ حیران رہ گئے اور دم سادھے ایک دوسرے کی جانب حیرت سے دیکھنے لگے۔ سفید روشنی پھر چمکی جیسے مسکرا رہی ہو اور اس کی نورانیت ہر جانب پھیلنے لگی۔

# حصہ دوئم

# (۱)

سائنسی لحاظ سے دل انسانی جسم میں سب سے اہم اور خاص عضو سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ اگر دل کام کرنا چھوڑ دے تو انسان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ سب سے اہم اور نازک اعضاء کو خدا نے بہت حفاظت کے ساتھ سینے میں پسلیوں کے پنجر کے پیچھے رکھا ہے، تاکہ کسی چوٹ یا رگڑ وغیرہ سے محفوظ رہے۔ دل کے گرد ایک باریک لیئر ہوتی ہے جسے Pericardium Layer کہتے ہیں، جس میں ایک Fluid ہوتا ہے جو دل کو دھڑکتے ہوئے مزید کسی رگڑ یا شاک سے بچاتا ہے۔

دل کا کام تمام جسم کو آکسیجینیٹڈ خون بہم پہنچانا اور تمام جسم سے گندا خون لیکر اسے پھیپھڑوں تک پہنچانا ہے تاکہ وہ وہاں صاف ہو جائے۔ دل کے چار خانے ہوتے ہیں دو اوپر والے آریکل اور دو نیچے وینٹریکل، ان کے درمیان والوز ہوتے ہیں، جو دل کے پھیلنے اور سکڑنے پر کھلتے اور بند ہوتے رہتے ہیں۔ دل کے نظام میں دل، شریانیں وریدیں اور کیپلریز حصہ لیتے ہیں دل سے خون بڑی شریانوں کے ذریعے جسم کے مختلف حصوں تک پہنچتا ہے وہاں سے یہ تقسیم در تقسیم ہوتے ہوئے کیپلریز کے ذریعے جسم کے ہر حصے تک پہنچتا ہے اور جسم کو آکسیجن اور خوراک مہیا کرتا ہے۔

دل ایک سیکنڈ میں 72 مرتبہ دھڑکتا ہے۔ دل کو خدا نے بہت ہی مضبوط پٹھوں یعنی Cardiac Muscles سے بنایا ہوا ہے۔

دل تمام جسم میں گردش کرنے کے بعد وریدوں کے ذریعے دل کے دائیں حصے تک پہنچایا جاتا ہے، جہاں سے یہ پھر صاف ہونے کے لئے پھیپھڑوں تک بھیج دیا جاتا ہے اس طرح Blood Circulation کا نظام چلتا رہتا ہے اور آخری سانسوں تک جاری رہتا ہے۔

دل میں بہت سے باطنی جذبات جنم لیتے ہیں مگر محبت سب سے اہم ہے جو دل کو بہت مضطرب اور بے قرار رکھتی ہے...... اور نت نئے جذبوں سے آشنا کرتی ہے...... کوئی بھی انسان...... نہ تو اس کی شدت کو جان پاتا ہے اور نہ ہی اس کی گہرائی کو...... محبت کا فلسفہ اور راز کیا ہے......؟ یہ محبت کیا ہے...... اور دل کا اس سے کتنا گہرا تعلق ہے؟ جس سے گوشت کا یہ لوتھڑا ناآشنا رہتا ہے۔

☆

زنل کے دونوں ہاتھ Clay سے بھرے ہوئے تھے۔ وہ بہت انہماک محبت اور چاہت سے اسے گوندھ رہی تھی۔ اس کے خوبصورت سفید مرمریں ہاتھوں کی لمبی مخروطی انگلیاں کمال مہارت سے Clay میں کسی برقی مشین کی مانند تیزی سے حرکت کر رہیں تھیں اور اس کے لمبے، سیاہ ریشمی بالوں کی لمبی اور ڈھیلی چٹیا میں سے بالوں کی لٹیں باہر نکل کر اس کے خوبصورت ٹکیا نما گول، سفید اور سرخ چہرے کے گرد ادھر ادھر منتشر ہو رہیں تھیں اور ان لٹوں سے باریک بال اس کے بار بار سر ہلانے سے اس کے چہرے پر ادھر سے ادھر اڑتے پھر رہے تھے۔ ان کی چھیڑ خانیوں سے تنگ آ کر وہ قدرے جھنجلائے ہوئے انداز میں اپنے بالوں کو مٹی سے بھرے ہاتھوں سے کانوں کے پیچھے کرتی جس سے مٹی اس کے بالوں اور چہرے پر لگ گئی تھی۔ مگر وہ اپنے کام میں اس قدر محو تھی کہ اسے گرد و پیش کی کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ اس کی سیاہ، گہری خمدار بھنوؤں کے نیچے جھیل جیسی گہری آنکھوں

میں اک جستجو اور لگن تھی۔۔۔۔۔۔اس کے گال سردیوں کی نرم نرم دھوپ کی تمازت سے تمتما رہے تھے اور اس کی گلابی رنگت سرخ ہو رہی تھی۔ وہ بہت انہماک سے کوریڈور سے ملحقہ اوپن گراؤنڈ کے عین وسط میں زمین پر بیٹھی Sculpture کے لیے Clay تیار کر رہی تھی۔

شہیر کلاس روم کی کھڑکی میں سے مسلسل اسے دیکھ رہا تھا۔ "وہ کتنی خوبصورت ہے۔۔۔۔۔۔شاید اسے اپنے حسن کی طاقت کا خود بھی اندازہ نہیں۔۔۔۔۔۔ وہ حسن و خوبصورتی کا مکمل شاہکار ہے۔۔۔۔۔۔اس کے نقوش Egyptian کرداروں کی مانند تھے۔ ہیروں کی مانند چمکتی آنکھیں اور سفید چکنی جلد۔۔۔۔۔۔اس جیسا حسن اس نے اس سے قبل کہیں نہیں دیکھا تھا۔

اس نے ایک ماہ قبل اس کالج میں ایڈمیشن لیا تھا، کئی لڑکے ہر وقت اس کے ارد گرد منڈلاتے نظر آتے تھے۔ مگر وہ کسی کو لفٹ نہ کراتی تھی۔ شہیر اس کے قریب تو نہیں جاتا تھا مگر اس کی نظریں ہر وقت اس کے تعاقب میں رہتیں، وہ کیا کرتی ہے کس سے ملتی ہے۔۔۔۔ کس سے اس کی دوستی زیادہ ہو رہی ہے۔۔۔۔ اسے سب خبر ہوتی۔۔۔۔ اور جب کبھی دونوں کا آمنا سامنا ہوتا تو شہیر نظریں جھکا لیتا شاید اس کے حسن کو برداشت کرنے کی اس میں تاب نہ تھی۔ اس کا دل اسے دیکھتے ہی بلیوں اچھلنے لگتا۔۔۔۔ اس کو دیکھ کر اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگتیں اور جسم میں اک برقی رو سی دوڑ جاتی۔۔۔۔سارے جسم میں اک عجیب سی کپکپاہٹ پیدا ہوتی۔ وہ گھبرا کر جھرجھری لیتا اور جلدی سے وہاں سے چلا جاتا۔

"اس کو دیکھتے ہی اس کو کیا ہو جاتا ہے" کیا میرے اندر کوئی کمپلیکس ہے۔۔۔۔۔۔یا پھر مجھ میں خود اعتمادی کی کمی ہو رہی ہے۔ میں اسے دیکھ کر کیوں مضطرب اور بے قرار ہو جاتا ہے۔۔۔۔ اتنا بے بس کہ اس کی جانب نظریں اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔۔۔۔۔۔

لیکن۔۔۔۔۔۔مجھے تو کسی بھی قسم کا کوئی کمپلیکس نہیں۔۔۔۔۔۔

میں ایک امیر، دولت مند اور سیاسی اثر و رسوخ رکھنے والے خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ میری ممی منسٹر ہیں اور ڈیڈی بزنس مین۔۔۔۔۔۔اور مجھ جیسا خوبصورت، سمارٹ، ویل آف دراز قد لڑکا پورے کالج میں نہیں۔۔۔۔ مجھے۔۔۔۔ کسی بھی قسم کا کوئی کمپلیکس نہیں۔۔۔۔۔۔اور۔۔۔۔۔۔لڑکیاں تو مجھ سے خود دوستی کرنا چاہتی ہیں۔۔۔۔۔۔اور۔۔۔۔۔۔بہت سی لڑکیوں سے میری اچھی ہیلو ہائے بھی ہے۔۔۔۔۔۔بے اعتمادی کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔۔۔۔۔۔تو پھر۔۔۔۔۔۔زل کی پرسنالٹی میں کیا خاص بات ہے۔۔۔۔۔۔کہ میں اسے دیکھ کر بے قرار ہو جاتا ہوں۔۔۔۔۔۔اور نظر بھر کر اسے دیکھ نہیں پاتا۔۔۔۔۔۔" وہ اکثر راتوں کو مضطرب ہو کر سوچتا۔۔۔۔۔۔زل نے جب سے کالج جوائن کیا تھا شہیر کی راتوں کی نیند غائب ہو گئی تھی۔ ہر طرف نئی سٹوڈنٹ "زل درانی" کی آمد کا چرچا تھا۔ ہر جانب اس کے حسن کی باتیں ہوتی تھیں۔۔۔۔۔۔کوئی اس کی جھیل سی گہری، بڑی اور نیم مدہوش انداز میں کھلنے اور بند ہونے والی آنکھوں کی تعریف کرتا۔ کسی کو اس کے لیے سیاہ ریشمی بالوں کی ڈھیلی چٹیا بہت بھاتی، کوئی اس کے دراز قد، اور جاذب نظر و متناسب جسم کو سراہتا۔۔۔۔۔۔اور۔۔۔۔۔۔اساتذہ اس کی سٹڈیز میں لگن اور اس کے ٹیلنٹ کی بے حد تعریف کرتے۔۔۔۔۔۔وہ منی ایچر پینٹنگ میں کمال مہارت رکھتی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ Sculpture Making میں اس کا جواب نہیں تھا۔ وہ کمال خوبصورتی سے Clay اور پلاسٹر آف پیرس کے مجسمے بناتی۔ قدرت بہت کم لوگوں کو ایسا متناسب حسن عطا کرتی ہے۔ وہ "آئی اور چھا گئی" کے مصداق، وہ سب پر غالب آ گئی تھی۔ لڑکیاں اس کے حسن اور خوبصورتی کو رشک اور حسد کی نگاہ سے دیکھتی تھیں اور لڑکے اس کے ٹیلنٹ اور ہاتھوں میں فنکارانہ مہارت کو بھرپور انداز میں سراہتے نظر آتے تھے۔

کئی روز کی محنت شاقہ کے بعد زل کا بنایا Human bust تیار تھا اور اب ٹیبل پر رکھ کر انتہائی فنکارانہ مہارت کے ساتھ وہ Knife سے اس کے چہرے کے نقوش اور خدوخال نمایاں کر رہی تھی۔ وہ ایک مرد کا مجسمہ تھا۔ کلاس کے کئی لڑکے اور لڑکیاں زل کے ارد گرد کھڑے تھے۔ ان میں شہیر بھی شامل تھا۔

"زل تم نے تو بہت خوبصورتی سے اس کے فیچرز نمایاں کیے ہیں۔ کیا تم نے یہ آرٹ کہیں سے سیکھا......" اس کی کلاس فیلو روشنی نے پوچھا۔

"نہیں......تو...... ہماری فیملی میں کسی کا آرٹ سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا...... بلکہ مجھے تو سب لوگ بہت تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ لیکن میں کیسے اسے چھوڑ دوں۔ اللہ نے مجھے خود اس کی سینس اور ٹیلنٹ دیا ہے......" زل نے مسکرا کر نائف سے آنکھ کی Shape بناتے ہوئے کہا۔

"تمہیں اپنا ٹیلنٹ ضائع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں...... یقین مانو اس سے پہلے کبھی کسی نے اتنا خوبصورت Sculpture نہیں بنایا۔ یوں محسوس ہوتا ہے۔ ابھی اس میں روح ڈالی جائے تو یہ ایک خوبصورت آدمی بن کر کھڑا ہو جائے گا......" مریم نے مسکراتے ہوئے تعریف کی۔

"یار...... ہم تو صرف قدرت کی بنائی ہوئی چیزوں کی نقل کر سکتے ہیں...... اصل شاہکار تو وہی بناتا ہے...... جانتی ہو...... اس کی Clay کو Shape دیتے ہوئے میں کیا سوچ رہی تھی۔" زل نے روشنی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا......؟" روشنی نے حیرت سے پوچھا۔

"Sculpture بناتے ہوئے ہر چیز کی مقدار اور تناسب کا کتنا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ یہ Clay نہ زیادہ سخت ہو نہ زیادہ نرم...... بہت Carefully اور توجہ سے یہ کام کرنا پڑتا ہے۔ اب دیکھو...... میرے نائف کا اینگل تھوڑا سا بھی ادھر ادھر ہو جائے تو آنکھ کی shape ہی بدل جائے گی۔ یقین مانو میں تو اللہ کے ماسٹر مائنڈ کی قائل ہو گئی ہوں...... جس نے ہر انسان کو اس کے ملک اور ریجن کے مطابق شکل وصورت، رنگت، جسم اور قد کاٹھ دیے ہیں...... پھر ایک بھی انسان دوسرے سے نہیں ملتا...... اِٹس اے گریٹ ونڈر......" زل نے نائف کو ٹیبل پر رکھتے ہوئے روشنی سے کہا۔

"ہاں...... یہ تو ہے......" روشنی نے جواب دیا۔

"اب ہمارے ملک کے کچھ حصوں میں قدرت نے ایسے ایسے شاہکار تخلیق کیے ہیں...... کہ...... کبھی ہم ان کو دیکھتے ہیں اور کبھی اپنے آپ کو......" ارسلان نے شوخ انداز میں کہا جو کہ شکل وصورت میں کلاس کا سب سے عام سٹوڈنٹ تھا۔ اس کی سانولی رنگت چپٹی ناک چھوٹی چھوٹی آنکھیں چوڑا ماتھا اور سر پر انتہائی باریک اور بہت کم بال اس پر نظر کی موٹے شیشوں والی عینک، دبلا پتلا لمبا وجود، اسے دیکھ کر لڑکیوں کے چہروں پر کبھی خوشگوار تاثرات نمایاں نہیں ہوتے تھے۔ البتہ وہ بہت خوبصورت، معنی خیز اور دلچسپ گفتگو کرتا تھا۔ لڑکے لڑکیاں یہاں تک کہ اساتذہ بھی اس کی کمپنی انجوائے کرتے تھے۔ وہ اکثر شوخ و شریر انداز میں باتوں کی پھلجھڑیاں چھوڑتا تھا اور پھر دبی دبی مسکراہٹ سے ہر ایک کو شریرانہ انداز میں دیکھ کر انجوائے کرتا۔

"ایسی بھی بات نہیں...... اللہ نے ہر ایک کو بہت محبت سے بنایا ہے۔" زل نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"جناب...... یہ آپ اپنے بارے میں تو کہہ سکتی ہیں...... ہمارے بارے میں نہیں...... کیونکہ میں اکثر آئینے میں اپنا یہ چہرہ دیکھ کر سوچتا

ہوں.....اللہ نے بھی گلے سے ہی اتارا ہے۔" وہ قہقہہ لگا کر بولا تو سب ہنسنے لگے۔ شہیر بہت ریزرو قسم کا نوجوان تھا۔ وہ سب کی باتوں کو انجوائے کرتا مگر نہ تو کسی پر کومنٹس دیتا، نہ تنقید کرتا، نہ کسی بحث میں حصہ لیتا۔ وہ زیادہ تر سب سے الگ تھلگ رہتا۔ لیکن زل کی وجہ سے وہ پہلی بار اپنے کلاس فیلوز کے ساتھ گروپ کی شکل میں کھڑے ہو کر باتیں انجوائے بھی کر رہا تھا اور زل کو قریب سے دیکھ بھی رہا تھا۔

"آپ اپنے آپ کو Under estimate مت کریں۔ آپ جیسا دنیا میں دوسرا اور کوئی بھی نہیں..... آپ کو اللہ نے کتنی انفرادیت دی ہے۔ آپ نے کبھی اس کے بارے میں سوچا ہے؟ آپ اپنے بارے میں پازیٹو ہو کر سوچا کریں"۔ زل نے مسکراتے ہوئے Sculpture کے آئی بروکو Shape دیتے ہوئے رُک کر ارسلان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اگر ہم جیسا کوئی دوسرا ہوتا..... تو..... وہ ایسا احتجاج برپا کرتا کہ آپ دیکھتی رہ جاتیں۔" ارسلان نے شریرانہ انداز میں کہا۔

"کیسا احتجاج.....؟" روشنی نے چونک کر حیرت سے پوچھا۔

احتجاج کیا..... وہ تو حشر برپا کر دیتا..... کہ اس کو تو بنایا تھا..... مجھے کیوں اس جیسا بنایا ہے.....؟ ارسلان نے مضحکہ خیز انداز میں اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو سب نے پھر بھرپور قہقہہ لگایا۔

"یار لگتا ہے..... تمہیں اللہ سے بڑے ہی شکوے ہیں؟" پاس کھڑے اسامہ نے مسکرا کر ارسلان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں..... بالکل بھی نہیں..... میں تو اپنے آپ میں اللہ کے رنگ دیکھ کر خوش ہوتا ہوں..... اور جب لڑکیاں مجھے دیکھ کر میرا مذاق اڑاتی ہیں تو پھر میں اللہ سے کہتا ہوں..... یقیناً آپ بھی ان کے مذاق کو انجوائے کر رہے ہوں گے ٹھیک ہے بھئی سب خوش ہوں....." ارسلان نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یو آر ریو....." شہیر آہستہ آواز میں بولا۔

"شکر ہے..... یار..... تم بھی کچھ بولے..... ورنہ کئی عرصے تک ہم سمجھتے تھے۔ مسٹر شہیر احمد گونگے ہیں۔" ارسلان نے ہنستے ہوئے کہا تو شہیر زیر لب مسکرانے لگا۔

"ویسے تمہیں دیکھ کر مجھے ہمیشہ رشک آتا ہے..... تم پر قسمت بہت مہربان ہے..... تم ہماری کلاس میں اس وقت سب سے زیادہ ہینڈسم، سمارٹ لڑکے ہو۔ اور ممی تمہاری منسٹر..... ڈیڈی بزنس مین..... اسٹرونگ فیملی بیک گراؤنڈ..... یو آر..... ریئلی ویری لکی....." ارسلان نے مسکراتے ہوئے کھلے دل سے اس کی تعریف کی تو سب ارسلان کے "توجہ دلاؤ نوٹس" کی مانند شہیر کی طرف بغور دیکھنے لگے۔

واقعی وہ بے حد خوبصورت تھا۔ دراز قد، گندمی رنگت، خوبصورت نقوش و خدوخال اور قدرے براؤن گھنگریالے بال، گھنی مونچھیں..... وہ پہلی نظر میں ہی ویل گرومڈ پرسنالٹی لگتا..... اس کے مینرز اور بات کرنے کے انداز میں ایک مخصوص سٹائل تھا۔ وہ نہ کبھی کسی کے ساتھ زیادہ فرینک ہوا تھا اور نہ ہی کسی کو ذرا مزید بڑھانے کا موقع دیتا تھا۔ لڑکیوں سے اس کی اچھی ہیلو ہائے تھی مگر کوئی بھی اس حد تک نہ بھائی تھی کہ وہ کسی کے بارے میں سنجیدگی سے سوچتا۔

مگر زل کی بات اور تھی..... زل کو جب سے دیکھا تھا وہ اس کے حواسوں پر چھائی تھی..... زل جب پہلے دن کلاس میں داخل ہوئی تو شہیر

نے بڑ بڑا کر اسے یوں دیکھا تھا جیسے اس کے ذہن میں سمائی اور دل میں بسی کوئی خیالی تصویر، حقیقت میں انسانی روپ دھار کر اس کے سامنے آ کھڑی ہو......اور وہ انتہائی حیرت سے اپنی آنکھیں مل مل کر اسے دیکھ رہا ہو......

"ہائے......" زل نے مسکرا کر اسے کہا تو وہ یوں چونکا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔

"ہائے......" وہ آہستہ آواز میں بولا اور وہاں سے چلا گیا......زل اسے دیکھتی رہ گئی۔

پینتیس کے قریب سٹوڈنٹس کی کلاس میں بیس لڑکیاں اور پندرہ لڑکے تھے۔ رفتہ رفتہ سب میں بہت دوستی ہونے لگی......مگر......زل اور شہیر میں زیادہ فرینکنس نہ ہو پائی۔ وہ جب بھی ملتے......تو......"ہیلو......ہائے یا ہاؤ آر یو" کے مخصوص جملوں کے علاوہ کبھی بھی زیادہ بات نہ کر پاتے۔ زل کو دیکھ کر شہیر کی آنکھیں یکدم چمکتیں......اور وہ اسے اس انداز سے دیکھتا جیسے زل کے لئے بے شمار ان کہے جذبے اور بہت سی محبت اس کی آنکھوں میں سمٹ آتی ہو۔ اس محبت اور ان جذبوں میں کتنی گہرائی تھی......یہ صرف وہی جانتا تھا۔ زل کو کبھی بھی ان کی گہرائی اور شدت کا اندازہ نہ ہو پایا تھا۔

☆

پروفیسر رضا ربانی بہت تنقیدی انداز میں تمام سٹوڈنٹس کے بنائے ہوئے Sculptures کے بارے میں ڈسکشن کر رہے تھے۔ وہ باری باری سب کے Sculptures دیکھنے کے بعد کلاس روم کے عین وسط میں کھڑے ہو گئے۔ سب سٹوڈنٹس انکی طرف پر اشتیاق نظروں سے دیکھنے لگے۔

"سوائے ایک ماڈل کے......سب ماڈلز کے Facial expressions میں وہ گہرائی نہیں جو ہونی چاہئے۔" پروفیسر ربانی نے کہا۔

"اور......سر......وہ ماڈل یقیناً مس زل کا ہو گا۔" ارسلان جلدی سے بولا۔

"نہیں......وہ ماڈل شہیر کا ہے۔" پروفیسر صاحب نے پر ستائش نگاہوں سے شہیر کی طرف دیکھ کر کہا تو سب حیران رہ گئے......شہیر کو بھی اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

You know "Best art of the world is unconscious art"

یہ مشہور جملہ تو سب نے سنا ہو گا......اور یہ حقیقت بھی ہے......جب کوئی آرٹسٹ کسی شے کو تخلیق کر رہا ہوتا ہے تو اس وقت وہ ہر قسم کی سوچ سے بے خبر ہو کر صرف اور صرف تخلیق کے پروسیس میں سے گزر رہا ہوتا ہے۔

اور اس وقت وہ سب کچھ بھلا کر جتنی گہرائی، جتنی لگن اور توجہ سے اس میں انوالو ہو گا......وہ اس کی تخلیق کا مقام متعین کرے گی......اور وہ لگن، وہ گہرائی اس کی تخلیق کے کسی نہ کسی پہلو سے ضرور ظاہر ہو گی......میوزک ہے تو اس کی دھن اور سوز کی گہرائی سے آپ خود بخود جان جائیں گے......کہ اس کا مستقبل کیا ہو گا......اسی طرح آرٹ کی ہر برانچ میں آپ اس Rule کو اپلائی کر سکتے ہیں۔ شہیر کے ماڈل میں Facial Expressions بہت اسٹرونگ ہیں۔ ماڈل کے آئی بروز کی شیپ اور آنکھوں میں Eye Balls کی ٹھہری موومنٹ کا اینگل ہی اس کے

اندرونی تاثرات کی گہرائی کا پتا چلتا ہے۔ سب اپنے ماڈلز کی آئی بالز دیکھیں بہت سپاٹ لگ رہی ہیں اور چہرے پر مختلف شکنیں، لائنیں چہرے کے تاثرات کو اسٹرونگ مینر میں واضح کرتی ہیں...... اور اس میں بہت حد تک آرٹسٹ کی پرسنالٹی اور اس کے اندرونی تاثرات کی جھلک بھی نمایاں ہوتی ہے۔

ان ماڈلز کے ساتھ ان کے آرٹسٹ نہ بھی کھڑے ہوں تو ہم ان ماڈلز سے ان کے آرٹسٹوں کی پرسنالٹی جج کر سکتے ہیں۔ زل کا ماڈل بہت ایکسیلنٹ ہے، مگر ظاہری طور پر...... فیچرز بہت اچھے انداز میں carved out ہوئے ہیں مگر تاثرات میں کمی کا احساس نمایاں ہوتا ہے...... شاید اس لئے Male Model کو بناتے ہوئے زل کے ذہن میں ماڈل کی سائیکی تک رسائی نہیں ہوئی...... زل کا ماڈل ایک خوبصورت مگر سپاٹ چہرہ لئے ہوئے لگتا ہے اور شہیر کے ماڈل کے فیچرز نارمل ہیں، مگر تاثرات گہرے ہیں اور یہ ایک سنجیدہ مزاج ماڈل بھرپور تاثرات لئے ہوئے نظر آتا ہے۔

یہ بات ہر آرٹسٹ کی آبزرویشن اور فیس ریڈنگ کی صلاحیت کو ظاہر کرتی ہے اور چہرے کے تاثرات دینے کے لئے اسٹرونگ فیس ریڈنگ بہت ضروری ہے...... اور فیس ریڈنگ کے لئے اسٹرونگ آبزرویشن...... اور آبزرویشن کے لئے ادراک (Preception) بہت اسٹرونگ ہونی چاہئے...... اور ادراک کو مضبوط کرنے کے لئے کسی کی سائیکی اور سائیکی کو جاننے کے لئے اس کے دل تک رسائی ہونا بہت ضروری ہے۔'' پروفیسر ربانی نے کہا۔

''سر...... یہ تو بہت Campilicated chain ہے۔'' اس کا مطلب ہے ایوریج IQ رکھنے والا شخص اچھا آرٹسٹ نہیں بن سکتا۔'' عمر مصطفیٰ نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں...... ایسی بھی بات نہیں...... بہت ایوریج آرٹسٹس بھی Excell کر رہے ہیں...... لیکن آرٹ کی دوسری فیلڈز میں مگر Sculpture Making اور پورٹریٹس بنانے میں یہ پوائنٹس بہت اہم ہیں......'' پروفیسر ربانی نے بتایا۔

''سر...... کیا...... قدرت بھی انسانوں کو بناتے ہوئے ان باتوں کو مدنظر رکھتی ہے۔'' ارسلان نے اچانک سوال کیا تو سب چونک کر اسے دیکھنے لگے۔

''پروفیسر ربانی نے اس کی طرف بغور دیکھا اور خاموش ہو گئے، قدرے توقف کے بعد اسے دیکھتے ہوئے بولے۔

''ہاں...... ان کے جینز میں کسی حد تک یہ بات پوشیدہ ہوتی ہے کہ یہ کس قسم کا انسان ہوگا...... سنجیدہ، مزاحیہ، شکی یا جیسا بھی ہو...... جیسے جیسے بچے کی گروتھ ہوتی جاتی ہے۔ اس کا مزاج واضح ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ آپ اس کی حرکات دیکھ کر بتا سکتے ہیں کہ یہ مستقبل میں کیسا انسان ہوگا، کچھ بچے بچپن میں بہت خاموش اور جوان ہو کر بہت Jolly جبکہ کچھ بچپن میں بہت خوش مزاج ہوتے ہیں اور جوان ہو کر بہت سنجیدہ ہو جاتے ہیں۔ قدرت بہت ماہرانہ انداز میں ایک چیز کا لنک دوسرے سے جوڑتی ہے اور دونوں کے ملاپ سے پیدا ہونے والی چیز کی باطنی خصوصیات کا سرا بڑے اسرار انداز میں اس شے کے اندر رکھتی ہے۔ دل کس بات سے اچانک خوش ہوتا ہے اور کس بات پر ناراض ہو جاتا ہے۔ اس کی کوئی توجیہہ نہیں۔ اچانک رونما ہونے والی صورتحال میں ایک انسان کا ردعمل کیا ہوگا...... یہ شاید کوئی انسان خود بھی یقینی طور پر نہیں جانتا۔ اس لئے انسان کے اندر کے احساسات اور جذبات کو چہرے کے تاثرات بہتر طور پر بیان کرتے ہیں اور خاص طور پر آنکھیں غم و خوشی کی بہتر عکاس ہوتی ہیں۔ شہیر کے ماڈل میں

آئی ہاتھ کی موومنٹ کامت ٹھہراؤ بہت ہی خوبصورت ہے۔"

سر ضار ربانی نے پھر شبیر کی تعریف کی تو وہ سر جھکا کر مسکرانے لگا۔ سب سٹوڈنٹس نے پرستائش انداز میں شبیر کی طرف دیکھا۔

"او کے...... سٹوڈنٹس...... آپ سب نے بہت اچھا کام کیا...... ویل ڈن اینڈ کیپ اٹ اپ۔ اور یہ ذہن میں رکھیں پریکٹس ہمیشہ Skill کو چار چاند لگاتی ہے...... گڈ لک"۔ پروفیسر ربانی کہہ کر کلاس روم سے باہر چلے گئے اور سب سٹوڈنٹس شبیر کے ماڈل کے اردگرد اکٹھے ہو کر اسے بغور دیکھنے لگے اور اب انہیں اپنے ماڈلز اور شبیر کے ماڈل میں فرق واضح طور پر نظر آنے لگا ورنہ اس سے قبل سب زل کے ماڈل کی بھرپور تعریف کر رہے تھے۔ زل شبیر کے ٹیلنٹ کی معترف ہوگئی اور اس کی بھرپور انداز میں تعریف کرنے لگی اور وہ اس کے منہ سے تعریف سن کر مسرور ہونے لگا۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے زل کے ایک ایک لفظ پر وہ ہوا میں اڑ رہا ہو...... اس کے اندر ایک عجیب سی سرشاری پیدا ہونے لگی اور وہ محبت پاش نگاہوں سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔

☆

شبیر کا کمرہ کم کباڑ خانہ زیادہ بنا ہوا تھا۔ ہر طرف اس کی بنائی ہوئی پینٹنگز، مجسمے، Bust، ایزل اور کلرز بکھرے ہوئے تھے۔ وہ اس کا روم کم، اس کا سٹوڈیو زیادہ لگ رہا تھا۔ مسز فاخر نے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جھانکا تو وہ دنگ رہ گئیں۔ شبیر بیڈ پر لیٹا چھت کو گھور رہا تھا، مگر اس کے چہرے پر خوشی اور لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ مسز فاخر اسے بغور دیکھتی رہیں اور پھر دروازہ کھول کر اندر آ گئیں۔ شبیر بے خبر اپنی سوچوں میں گم چھت کو گھورتا رہا۔

"شبیر...... یہ تم نے کمرے کی کیا حالت بنا رکھی ہے...... اور تم کن سوچوں میں گم ہو؟" مسز فاخر کے چہرے پر خفگی کے تاثرات نمایاں ہونے لگے اور وہ قدرے درشت لہجے میں بولیں۔

"اوہ...... آئی ایم سوری...... ممی......" شبیر گھبرا کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔

"جب میں نے تمہاری ایکٹوٹیز کے لئے سپیشلی آرٹ سٹوڈیو بنوایا ہے تو پھر تم بیڈ روم کو کیوں استعمال کرتے ہو...... کیا یہ کسی منسٹر کے بیٹے کا بیڈ روم لگ رہا ہے...... ویری ہوپ لیس" مسز فاخر غصے سے بولیں۔

"ممی...... آئی ایم سوری...... لیکن میں یہاں زیادہ Comfortable محسوس کرتا ہوں۔" وہ آہستہ آواز میں بولا۔

"دیکھو بیٹا...... زندگی میں آگے بڑھنے کے لئے چیزوں کو ان کی مناسب جگہ پر اور وقت کو ٹائم ٹیبل کے مطابق استعمال کرنا بہت ضروری ہے۔ جس زندگی میں ڈسپلن نہیں ہوتا...... وہ ہیومن نہیں اینمل لائف ہوتی ہے...... انسان اور حیوان کی زندگی میں یہی فرق ہے۔" مسز فاخر نے اسے اپنے انداز سے سمجھانے کی کوشش کی۔

"مگر...... ممی...... انسان تو خود ہی بہت Unpredictable ہے وہ اگلے لمحے میں کیا کرے گا...... اور کیسے React کرے گا۔ یہ تو وہ خود بھی نہیں جانتا۔" شبیر نے آہستہ آواز میں کہا تو مسز فاخر نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

"بیٹا...... ہر انسان جانتا ہے کہ اسے کسی وقت بھی موت آسکتی ہے۔ شاید اگلے لمحے ہی...... مگر وہ یہ سوچ کر نہ تو کوئی زندگی گزارنا چھوڑتا

ہے۔۔۔۔۔ نہ اس کی پلاننگ کرنا اور نہ ہی اس کی انجوائے منٹس۔۔۔۔۔ اس لئے بیٹا۔۔۔۔ تمہاری اس بات میں کوئی Logic نہیں۔۔۔۔۔ جب تک زندگی ہے۔۔۔۔ اس کو اس کے تمام لوازمات کے ساتھ گزارنا پڑتا ہے۔ میں عذرا کو بھیج رہی ہوں، وہ آ کر کمرے کی صفائی کر دیتی ہے اور دوبارہ یہاں مجھے گندگی نظر نہ آئے۔۔۔۔۔ اپنے مینٹر کو اپنے سٹوڈیو تک محدود رکھو۔" مسز فاخر کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئیں اور شہیر نے گہری سانس لی۔

ممی شروع سے Dominating تھیں۔۔۔۔ گھر میں بڑی بیٹی اور سسرال میں بڑی بہو ہونے کے ناطے ہر کسی پر ان کا رعب تھا اور ویسے بھی قدرت نے ان کی پرسنالٹی میں رعب کا عنصر کچھ زیادہ ہی نمایاں رکھا تھا، اس لئے ہر کوئی ملنے والا بھی ان کی بارعب شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ مسز فاخر نے زندگی میں بہت جدوجہد کی تھی۔ ایک عام پارٹی ورکر سے وہ ایک منسٹر بنی تھیں اور انہوں نے زندگی کے بہت نشیب وفراز دیکھے تھے اس لئے وہ لائف میں بہت پریکٹیکل ہو کر سوچتی تھیں۔ شہیر کی آرٹ میں دلچسپی انہیں ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ ان کے نزدیک لڑکوں کو کسی پریکٹیکل فیلڈ میں نام پیدا کرنا چاہئے۔ اس کے برعکس ان کا بڑا بیٹا سمیر ان کی توقعات کے عین مطابق تھا، وہ انگلینڈ میں ایم بی اے کر رہا تھا اور اسٹڈیز میں بہت اچھا تھا۔ مسز فاخر سمیر کی ایکٹویٹیز کو بھی پسند کرتی تھیں۔ وہ گالف، سنوکر اور بیڈمنٹن کا بہت اچھا پلیئر تھا۔ ہارس رائیڈنگ، ہائیکنگ، سوئمنگ کرتا تھا، اس کے علاوہ پارٹیز اور لائف میں تھرل کا قائل تھا۔ جبکہ شہیر کو آرٹ اور کلاسیکل میوزک سے بہت لگاؤ تھا۔ وہ بہت کم گو اور تنہائی پسند تھا۔ سمیر Extrovert تھا اور شہیر Introvert قسم کا انسان تھا۔ سمیر Loud تھا۔ اپنے غم وغصے اور محبت کے اظہار میں بے حد پوزیسو اور Show off کا قائل تھا جبکہ شہیر اپنے جذبات کو دوسروں سے چھپا کر دل تک محدود رکھنے کا عادی تھا۔ سمیر جب بھی انگلینڈ سے گھر میں آتا تو گھر میں ہر طرف شور وہنگامہ برپا ہو جاتا جبکہ شہیر کے ہونے یا نہ ہونے سے کسی کو کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ شہیر کی زیادہ دوستی ڈیڈی کے ساتھ تھی اور ڈیڈی زیادہ تر گھر سے باہر ہی رہتے۔ جب شہیر فارغ ہوتا تو ڈیڈی مصروف ہوتے اور اگر وہ مصروف ہوتا تو ڈیڈی فارغ۔۔۔۔۔ اس لئے دونوں بہت کم ایک دوسرے سے کھل کر بات کر پاتے۔۔۔۔۔ شہیر کی ممی سے بہت کم انڈرسٹینڈنگ تھی۔ ممی اسے ہمیشہ پریکٹیکل اور ڈسپلنڈ ہونے کا درس دیتیں۔ ایک تو ان کی سیاسی زندگی کی وجہ سے ان کے پاس وقت کم ہوتا اور اگر کبھی وقت ملتا تو وہ اسے اخلاقی سبق دیتی رہتیں، وہ کبھی اس کے اندر جھانک کر نہ دیکھتیں۔

شہیر کو ہمیشہ اپنے گھر، اپنے دل اور اپنے اندر محبت کی کمی کا شدید احساس ہوتا، اس کے پاس دنیا کی ہر نعمت تھی بلکہ ہر شے کی فراوانی تھی مگر اس کا دل ہر وقت اداس رہتا، اسے کوئی چیز، کوئی نعمت اور آسائش مطمئن نہ کر پاتیں۔ اس کا دل ہر وقت مضطرب اور بے چین رہتا۔۔۔۔۔ اس نے آرٹ کا شعبہ بھی اس لئے منتخب کیا کیونکہ وہ اسے اپنے اندر کے جذبات کا بہترعکاس لگا۔ اسی لیے وہ اپنے اندر اٹھنے والے شوریدہ سر جذبوں، ہیجانی خیالات اور گمبھیر احساسات کو اپنے آرٹ اور فن کے ذریعے بہترین انداز میں ان کا اظہار کرتا ہے اور ممی کو یہ وقت کا زیاں لگتا تھا۔

☆

ژل اور شہیر کی ہر روز کسی نہ کسی موضوع پر کافی ڈسکشن ہوتی۔ وہ کبھی آرٹ کے مختلف پہلوؤں کو زیر بحث لاتے، کبھی نیچر اور کبھی انسانی نفسیات پر خوب ڈسکشن کرتے۔ شہیر بھی ژل کی کمپنی بہت انجوائے کرتا، اسے محسوس ہوتا جیسے ژل اور وہ ذہنی طور پر ایک دوسرے کے بہت قریب ہوں۔ اسے اندر ہی اندر طمانیت کا گہرا احساس مسرور رکھتا کہ جیسی لڑکی وہ اپنے تخیل میں سمائے بیٹھا تھا، اسے ویسی ہی لڑکی ژل کی صورت میں مل گئی تھی۔

''شہیر تمہارا چہرہ بہت منفرد چہرہ ہے......'' زل شہیر کا پورٹریٹ بناتے ہوئے۔ بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر بولی۔

''کیا ہے اس میں......؟'' شہیر اس کے سامنے اسٹول پر ماڈل بنا بیٹھا تھا۔ زل کے جملے پر اس نے چونک کر پوچھا۔

''چہرے پر سنجیدگی اور آنکھوں میں کچھ...... آئی ڈونٹ نو...... کچھ بہت ڈفرنٹ ہے۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا...... کیسے Explain کروں......'' زل قدرے جھنجھلا کر بولی۔

''کیا مطلب......؟'' شہیر نے حیرت سے پوچھا۔

''مجھے کبھی کبھی تمہیں دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے...... جیسے تم وہ نہیں ہو...... جو...... تم نظر آتے ہو......تم بہت مسٹیریس لگتے ہو......تمہاری آنکھیں......اور ان میں چھائی اداسی...... تمہاری پرسنالٹی کا ساتھ نہیں دیتی......'' زل نے اس کی آنکھوں میں بہت گہرائی سے جھانکتے ہوئے کہا۔

''اچھا......اس سے پہلے تو مجھے کسی نے ایسا نہیں کہا۔'' شہیر ٹالنے کے انداز میں بولا۔

''شاید تمہیں پہلے کسی نے اس نظر سے دیکھا ہی نہیں ہو......'' زل اپنی ہی لے میں بولی۔

''کس نظر سے......؟'' شہیر نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

تو وہ ایک دم ٹھٹکی اور چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

''آئی مین......ایک آرٹسٹ کی نظر سے'' اس نے جلدی سے بات بدلی۔

''ہاں......ممکن ہے......مگر......ہر آرٹسٹ بھی تو اس نظر سے نہیں دیکھتا جس نظر سے تم دیکھ رہی ہو۔'' نادانستہ جملہ شہیر کے منہ سے نکلا۔

''کیا مطلب......؟'' زل نے چونک کر پوچھا۔

''میرا مطلب ہے......کین آبزرویشن سے......'' شہیر گڑبڑا کر بولا۔

زل خاموشی سے اس کا پورٹریٹ بنانے میں مصروف ہوگئی اور شہیر مسلسل اسے دیکھتا رہا۔

''بھئی...... یہ پراجیکٹ کب تک چلے گا......کوئی ہم غریب، غرباء کو بھی پوچھ لیا کرے۔'' ارسلان اچانک گراؤنڈ کے قریب ٹیرس پر کھڑے ہوتے ہوئے بولا تو شہیر نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا۔

''سر ربانی کا حکم ہے......اب ہم کیا کر سکتے ہیں؟'' زل نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔

''سر ربانی بالکل بھی خدا ترس نہیں......کبھی چیریٹی کے طور پر ہی ہم غریب، غرباء کو بھی کسی ایسے پراجیکٹ میں شامل کرلیا کریں......مگر انہیں بھی ہم پر رحم نہیں آتا......اور میں ڈرتے ہوئے ان سے بات نہیں کرتا......یہی نہ کہہ دیں ''میاں...... یہ......منہ دھو کر رکھو......'' حالانکہ ہر روز رگڑ رگڑ کر یہ منہ دھوتا ہوں......پھر بھی دھونے والا ہی لگتا ہے۔'' ارسلان نے ہنستے ہوئے کہا تو زل نے بھرپور قہقہہ لگایا۔ وہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہی تھی، آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے اور شہیر بھی ان کی باتیں سن کر مسکرانے لگا۔

''یار تم لوگوں کا کتنا کام رہ گیا ہے...... مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے......میں تو کینٹینیریا جا رہا ہوں۔'' ارسلان منہ بنا کر بول

''آج کا کام تو بس تھوڑا سا رہ گیا ہے۔۔۔۔تم چائے کا آرڈر دو ہم آتے ہیں۔۔۔۔۔'' زل نے کہا تو ارسلان مسکراتا ہوا چلا گیا۔

''ارسلان جیسے زندہ دل اور ہنستے مسکراتے لوگ زندگی میں فلیور (Flavour) کا کام کرتے ہیں اور اسے خوشگوار بناتے ہیں۔'' زل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔۔۔He's very optimistic" زل تم میرا پورٹریٹ بنانے میں کتنا ٹائم لگاری ہو۔'' شہیر نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''اس لئے۔۔۔۔۔کہ۔۔۔۔۔یو۔۔۔۔۔آر ویری ڈیپ۔۔۔۔۔اور ڈیپ لوگوں کے Expressions بہت Carefully بنانا پڑتے ہیں۔'' زل نے کہا اور اپنا سامان سمیٹنے لگی۔

''آئی ڈونٹ تھنک سو۔۔۔۔۔'' شہیر نے گھمبیر مسکراہٹ سے کہا۔

''اچھا۔۔۔۔۔تو۔۔۔۔۔تم میرا پورٹریٹ بنانے میں کتنا ٹائم لوگے؟'' زل نے شہیر کے ہمراہ چلتے ہوئے پوچھا۔

''صرف دو دن۔'' شہیر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''ریئلی۔۔۔۔۔اِٹس امیزنگ۔۔۔۔۔'' زل نے حیرت سے پوچھا۔

''اس لئے کہ تمہارے Expressions کو سمجھنا میرے لئے مشکل نہیں۔'' شہیر نے کہا۔

''کیا۔۔۔۔۔کسی کے دل تک پہنچنا تمہارے لئے آسان ہے؟'' زل نے حیرت سے معنی خیز انداز میں پوچھا تو شہیر اس کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔

''کسی اور کے بارے میں دعویٰ تو نہیں کرتا مگر تمہارے بارے میں کسی حد تک کہہ سکتا ہوں۔۔۔۔۔ہاں''۔۔۔۔۔'' شہیر نے بھی معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا تو زل خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگی اور دونوں مسکراتے ہوئے کیفے ٹیریا کی طرف چلے گئے۔

☆

زل بہت سنجیدہ موڈ میں اسٹول پر بیٹھی تھی جب شہیر اس کا پورٹریٹ بنا رہا تھا۔ وہ ایک ٹک اس کی جانب دیکھتا اور پھر کام میں مصروف ہو جاتا۔ زل نجانے کس سوچ میں ڈوبی تھی کہ اس کی آنکھوں میں نمی سی تیرنے لگی۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی اپنے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے انگلیوں کے ناخنوں کو بجا رہی تھی۔ شہیر نے اس کی نم آنکھوں کی جانب دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ مگر اس کا پرسنل معاملہ سمجھتے ہوئے اس نے پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ البتہ وہ بار بار اس کی جانب دیکھتا رہا۔ بار ہا پوچھنے کی کوشش کرتا مگر پھر خاموش رہ جاتا۔

''زل۔۔۔۔۔پلیز اپنا چہرہ سیدھا رکھو۔'' شہیر نے کہا تو اس نے ہڑبڑا کر اس کی جانب دیکھا جیسے کسی خیالی دنیا سے حقیقی دنیا کی طرف لوٹی ہو۔۔۔۔۔اور۔۔۔۔۔اسے اپنے آنکھوں میں اترنے والی نمی کا احساس بھی اچانک ہوا ہو۔۔۔۔۔اس نے اپنی نم آنکھوں کو اپنی انگلیوں کی پوروں سے صاف کیا اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ شہیر کو محسوس ہوا جیسے وہ اس لمحے اندر سے بہت دکھی ہو رہی ہو مگر وہ پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

''شہیر۔۔۔۔۔پلیز۔۔۔۔۔آج کا کام وائنڈ اپ کر دو۔۔۔۔۔میری طبیعت ٹھیک نہیں۔۔۔۔۔میں بریک چاہتی ہوں۔'' زل آہ بھر کر اٹھی اور شکست

خوردہ لہجے میں اسے کہا۔

''ٹھیک ہے..... باقی کا کام کل کرلیں گے.....'' شہیر نے کہا۔

''ٹھیک ہے.....'' زل کہہ کر وہاں سے چلی گئی اور شہیر اس کے بارے میں سوچتا رہ گیا۔

''ضرور..... کوئی بہت بڑی پرابلم ہوگی..... جو..... زل یوں پریشان ہے، ورنہ وہ تو بہت Lively لڑکی ہے۔'' شہیر نے افسردگی سے سوچا اور ایزل اٹھا کر کلاس روم میں چلا گیا۔

پروفیسر مسز عطیہ رحمن کی کلاس اٹینڈ کرنے کے بعد وہ کیفے ٹیریا کی طرف گیا۔ کیفے ٹیریا کے ایک کونے میں زل اور ارسلان بیٹھے تھے۔ زل رو رہی تھی اور ارسلان اسے چپ کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ آج دونوں نے مسز عطیہ کی کلاس بنک (Bunk) کی تھی۔ شہیر ان کے پاس گیا تو زل نے جلدی سے اپنے آنسو صاف کیے اور اپنا بیگ اٹھا کر وہاں سے جانے لگی۔

''کہاں جا رہی ہو..... پلیز بیٹھی رہو.....'' ارسلان نے کہا۔

''اگر میں انٹرفیئر کر رہا ہوں تو میں دوسری ٹیبل پر بیٹھ جاتا ہوں۔'' شہیر نے شائستگی سے کہا۔

''نہیں..... یار ایسی کوئی بات نہیں۔'' ارسلان نے کہا تو زل خاموشی سے بیٹھ گئی۔ اس کی خوبصورت جھیل سی آنکھوں میں گلابی ڈورے نمایاں ہو رہے تھے اور آنکھیں متورم ہونے کی وجہ سے مزید بڑی اور خوبصورت لگ رہی تھیں۔ اس کی خوبصورت ستواں ناک رونے کی وجہ سے سرخ ہو رہی تھی۔ شہیر نے اس کی طرف گہری نگاہوں سے دیکھا اور خاموش ہو گیا۔

''یار..... شہیر..... تم ہی بتاؤ..... زندگی میں ہر پرابلم کا کوئی نہ کوئی حل ہوتا ہے نا.....'' ارسلان نے گویا اپنے کسی دعوے کی تصدیق کے لئے شہیر سے رائے طلب کی۔

''نہیں..... بہت سی پرابلمز کا کوئی حل نہیں ہوتا۔'' شہیر نے اپنی رائے دی۔

''لو..... یک نہ شد دو شد..... میں زل کو قائل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ ہر پرابلم کا کوئی نہ کوئی حل ہوتا ہے اور تم کہہ رہے ہو..... نہیں.....'' ''تم دونوں ایک جیسا کیوں سوچتے ہو..... سوائے میری شکل کے بدلنے کے..... باقی ہر پرابلم کا حل موجود ہے۔'' ارسلان نے شوخ لہجے میں کہا تو زل نم آنکھوں کے ساتھ ہنس پڑی، شہیر بھی مسکرا دیا۔

''ویسے مذاق کے علاوہ..... بات یہ ہے..... کہ جب انسان اپنے آپ کو کسی بند گلی میں پاتا ہے اور اسے کسی پرابلم کا کوئی حل نظر نہیں آتا..... تو اچانک کہیں نہ کہیں اللہ ضرور کوئی نہ کوئی اس کے لیے راستہ بنا دیتا ہے کہ وہ پرابلم solve ہو جاتی ہے۔ یہ میرا عقیدہ اور ایمان ہے اور میں اپنے عقیدے میں بہت Firm ہوں۔'' ارسلان نے کہا۔

''اپنی اپنی سوچ کی بات ہے اور ہر ایک کا کچھ نہ کچھ عقیدہ تو ضرور ہوتا ہے۔'' شہیر نے جواب دیا۔

''تم عقیدے کو سوچ سے علیحدہ کیوں سمجھتے ہو.....؟ اچھا تم ہی بتاؤ..... تم عقیدہ کس کو کہتے ہو؟'' ارسلان نے پوچھا۔

''کسی بھی بات کو سچ جانتے ہوئے اس کو تمام تر سچائیوں کے ساتھ ماننا......دل سے اور دماغ سے۔'' شہیر نے جواب دیا۔

''اور زل......تم بتاؤ۔'' ارسلان نے پوچھا۔

''ڈونٹ آسک می (مجھ سے مت پوچھو)'' وہ افسردگی سے بولی۔

''زل کو آج رہنے دیتے ہیں۔ آج اس کا عقیدہ آنسوؤں کے جزیرے میں ڈوبا ہوا ہے......پھر کسی روز اس سے پوچھیں گے۔

''شہیر تم نے ٹھیک کہا مگر تم نے سوچ کو عقیدے سے علیحدہ کیوں کیا...... ہر عقیدے کی بنیاد سوچ ہی ہے......اپنی اس سوچ کو سچ ماننا اور دل و دماغ کو اس پر گواہ بنا کر اس کی حفاظت کرنا۔ یہی سچا عقیدہ ہے اور میرا عقیدہ یہ ہے کہ خدا ضرور کبھی نہ کبھی بند گلی میں بھی راستہ پیدا کر دیتا ہے۔'' ارسلان نے کہا۔

''شاید ایسا ہی ہوتا ہو......'' شہیر نے جواب دیا۔

''یعنی کہ تم اس بات سے متفق نہیں ہو۔'' ارسلان نے پوچھا۔

''انسان زندگی کے بارے میں ویسا ہی رویہ اپناتا ہے، جیسے زندگی اسے ٹریٹ کرتی ہے۔'' شہیر نے کہا۔

''تو کیا......تم بھی کسی بند گلی میں ہو...... جس میں کوئی راستہ نہیں......'' ارسلان نے حیرت سے پوچھا۔

''معلوم نہیں......'' شہیر نے آہ بھر کر جواب دیا تو زل نے چونک کر دونوں کو دیکھا۔

''کیا......تمہیں اس میں کسی نئے راستے کی کوئی امید نہیں۔'' ارسلان نے پوچھا۔

''میں اس کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں؟'' شہیر نے سنجیدگی سے کہا۔

''یہی سوچ...... بالکل یہی سوچ تمہارے عقیدے کی کمزوری اور کچے پن کو ظاہر کرتی ہے......تم اس میں Firm نہیں ہو۔'' ارسلان نے ٹیبل پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''یار اب چائے کا آرڈر دو...... یا...... پھر عقیدہ پختہ کروا کے...... آرڈر دو گے۔'' شہیر نے کہا تو ارسلان نے چائے کا آرڈر دیا۔

زل مکمل طور پر خاموش تھی۔ چائے پیتے ہوئے بھی اس نے کسی قسم کی کوئی بات نہ کی۔

''اب میں چلتی ہوں......ڈرائیور میرا انتظار کر رہا ہوگا۔'' زل بیگ اٹھاتے ہوئے بولی۔

''اوکے......گڈ لک...... اینڈ پلیز بی پازیٹو'' ارسلان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اوکے......'' وہ مایوسی سے ہونٹ سکوڑتے ہوئے بولی۔

''مس زل......ایسے مایوس لہجے میں اچھی چیزیں اور کام بھی ہوتے ہوتے رہ جاتے ہیں...... پازیٹو......مینز (Means)...... پازیٹو......اینڈ ہنڈرڈ پرسنٹ پازیٹو'' ارسلان نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ مسکرا دی اور خوشی کی ایک لہر اس کے چہرے پر دوڑ گئی۔ اس کے چہرے کے تاثرات ایک دم بدل گئے۔ اس کی آنکھوں میں بھی امید کے دیئے جگمگانے لگے اور وہ وہاں سے چلی گئی۔

''دس از ہوپ ان لائف......'' ارسلان نے کہا تو شہیر بھی مسکرا دیا۔

''شہیر...... جانتے ہو...... جب امید زندگی سے ختم ہو جاتی ہے تو کیا ہوتا ہے......؟'' ارسلان نے انتہائی سنجیدگی سے پوچھا۔

''کیا ہوتا ہے......؟'' شہیر نے حیرت سے پوچھا۔

''پھر انسان...... انسان نہیں رہتا...... وہ پھر سے مٹی کا مجسمہ بن جاتا ہے...... بے رنگ، ساکن اور ساکت وجود جو ذرا سی ٹھوکر سے گر کر ریزہ ریزہ ہو جائے...... اور خدا نے مٹی کے مجسمے کو زندگی کی حرارت دی...... اس میں حرکت پیدا کی...... اسے متحرک کیا...... اسے چلتا پھرتا وجود بنایا...... تاکہ وہ ہر قدم پُر امید ہو کر اٹھائے جانتے ہو انسان ستر ہزار پرت کا مجموعہ ہے اور ہر پرت میں اک گہرا راز چھپا ہے...... اور ہر راز میں اک ''امید'' چھپی ہے......'' ارسلان نے چائے کا آخری گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔

''یار...... تمہاری انسانوں کے بارے میں بہت زیادہ ریسرچ ہے۔'' شہیر نے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔

''اوں...... ہوں...... ایک پرسنٹ بھی مکمل نہیں...... بس تھوڑی سی ہے...... جانتے ہو جب انسان کی پرسنالٹی میں کوئی نیگٹو پہلو ہوتا ہے تو وہ اس کی تسکین کیسے کرتا ہے......؟'' ارسلان نے پوچھا۔

''کیسے......؟'' شہیر نے حیرت سے پوچھا۔

''یا تو وہ ناامید ہو کر ڈپریشن کا شکار ہو جاتا ہے...... یا پھر پرامید ہو کر پازیٹو سوچنا شروع کر دیتا ہے۔ میں نے جب لائف میں بہت ڈپریشن آبزرو کیا...... تو...... پھر میں نے پازیٹو ہو کر سوچنا شروع کیا...... اور پھر ہر بند گلی میں ایک راستہ بننا شروع ہو گیا۔'' ارسلان نے مسکراتے ہوئے کہا اور دونوں کیفے ٹیریا سے باہر آ گئے۔

شہیر نے ایک دوبار زنل کا نام اس کے سامنے لیا تاکہ ارسلان اسے زنل کے بارے میں کچھ بتائے مگر ارسلان ہر بار بات کا رخ بدل دیتا۔

☆

زنل کیوں رو رہی تھی......؟ اس کی آنکھوں میں کیسی اداسی چھائی ہوئی تھی۔ اس کا فیملی بیک گراؤنڈ بھی بہت اچھا ہے۔ وہ اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ چار بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی اور سارے بھائی اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ پھر زنل کو کیا پریشانی ہو سکتی ہے۔ شہیر رات بھر اس کے بارے میں سوچتا رہا۔

''مجھے زنل سے کچھ پوچھنا چاہئے تھا...... اس کی پرابلمز شیئر کرنا چاہئیں تھیں، مگر میں خود کیسے اس کے ذاتی معاملات میں مداخلت کرتا......'' شہیر نے خود ہی اپنی سوچ کی تردید کی۔

زنل اس کے سامنے بیٹھی تھی اور وہ اس کے پورٹریٹ کو فائنل ٹچ دے رہا تھا۔ آج وہ پہلے کی طرح غیر مطمئن نہ تھی بلکہ اس کی آنکھوں اور چہرے پر طمانیت کا گہرا احساس نمایاں تھا۔ شہیر نے پورٹریٹ مکمل کر کے اسے دکھایا تو وہ دیکھ کر چونک گئی۔

''یہ...... یہ...... کیا؟ تم نے میری آنکھوں میں اتنی اداسی کیسے بھر دی؟'' زنل نے حیرت سے پوچھا۔

''کل تم اتنی ہی اداس تھیں۔'' شہیر نے بتایا تو وہ چونکی اور اسے دیکھ کر ایک دم خاموش ہو گئی۔

''مگر......کل کی فیلنگز ہمیشہ کے لئے تو نہیں تھیں......اور پورٹریٹ تو مستقبل میں بھی دیکھا جاتا ہے۔'' زل نے قدرے شاکی لہجے میں کہا۔

''زل......تخلیق لمحے بہت اہم ہوتے ہیں......جب کوئی تخلیق کار کوئی شے بنا رہا ہوتا ہے......تو اسے بنانے سے پہلے کی سوچ......

اور......اس وقت کی سوچ......جب وہ چیز بن رہی ہوتی ہے......تخلیق کار کے ذہن میں اس چیز کا ایک خاکہ بناتی ہے اور وہ اس وقت فیصلہ کرتا ہے کہ اسے کیسی چیز بنانی ہے......تمہارا پورٹریٹ جب میں نے شروع کیا تو میرے ذہن میں تمہارے تاثرات کے بارے میں بالکل مختلف سوچ تھی مگر کل صبح سے تم بہت اداس تھی اور تمہاری آنکھوں میں ٹھہری نمی تمہارے چہرے کے تاثرات کو بہت افسردہ بنا رہی تھی......پھر میں کیسے مسکراتے چہرے کے ساتھ اداس آنکھیں بناتا......'' شہیر نے کہا۔

''لیکن......تم کل یہ باتیں مجھے Explain بھی کر سکتے تھے۔ کہ تم کس نظر سے مجھے دیکھ رہے تھے......میں تو اپنے آپ سے بھی بے خبر تھی۔'' زل نے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے اپنا پراجیکٹ مکمل کرنا تھا۔'' شہیر نے وضاحت کی۔

''اور......یہ پورٹریٹ دیکھنے کے بعد پروفیسر ربانی جب آنکھوں میں اس نمی کی وجہ پوچھیں گے......تو......میں کیا جواب دوں گی......کیا تم میری پرابلمز اور میرے اندر کی پریشانی کو دوسروں کے سامنے ایکسپوز کر کے مجھے بے عزت کرنا چاہتے ہو؟'' زل خفگی سے بولی۔

''آئی ایم سوری......میرے ذہن میں ایسی کوئی بات نہیں تھی......اگر تم اس بات کو مائنڈ کرتی ہو تو میں یہ پورٹریٹ تمہارے سامنے پھاڑتا ہوں۔'' اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے پورٹریٹ کو پرزے پرزے کر دیا۔ زل حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی......اسے یقین نہیں آ رہا تھا......کہ یہ کیسا عجیب شخص ہے......جو ہر لمحے کے ساتھ بدل جاتا ہے......وہ خفگی سے اسے دیکھتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

☆

مسٹر اور مسز فاخر حسین، بہت دنوں بعد گھر میں ڈنر کر رہے تھے۔ شہیر بھی ان کے ساتھ موجود تھا۔ آج مسز فاخر نے بہت عرصے بعد اسپیشل ڈنر تیار کروایا تھا اور ان کا موڈ بھی قدرے خوشگوار تھا، البتہ شہیر کچھ اپ سیٹ نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اداسی کی گہری چھاپ تھی۔

''تہمینہ......آج خیریت تو ہے......یہ ڈنر کس خوشی میں ہے؟'' فاخر حسین نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''کوئی خاص وجہ نہیں......بس آج میں کچھ فارغ تھی سوچا......مل کر ڈنر کرتے ہیں۔'' مسز فاخر نے بتایا۔

''زہے نصیب......آج منسٹر صاحبہ کو ہمارے بارے میں بھی سوچنے کا وقت مل گیا۔'' فاخر حسین نے مسکراتے ہوئے مگر قدرے شاکی لہجے میں کہا۔

''فاخر......کیا آپ وہ وقت بھول گئے......جب میں گھر میں کھانا بنا کر آپ کے انتظار میں ساری ساری رات بیٹھی رہتی تھی اور آپ اپنی بزنس میٹنگز میں بزی رہتے تھے۔ تہمینہ نے بھی موقع دیکھ کر قدرے درشت لہجے میں کہا۔

''ہاں...... وقت وقت کی بات ہے...... کبھی آپ کو انتظار کرنا پڑتا تھا اور اب ہم باپ بیٹے کو کرنا پڑتا ہے۔'' فاخر حسین نے کہا تو تہمینہ ایک دم غصے سے مشتعل ہو کر وہاں سے اٹھ گئیں۔

''ارے بھئی...... آپ کہاں جا رہی ہیں...... میں تو مذاق کر رہا تھا......'' فاخر حسین نے قدرے گھبرا کر کہا۔

''رہنے دیجئے آپ...... میں سب جانتی ہوں...... آپ کو ساری زندگی مجھ سے شکوے ہی رہے ہیں...... اور اپنی ذات پر ذرا سی تنقید بھی آپ برداشت نہیں کر پاتے۔'' تہمینہ غصے سے کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

"She is very unpredictable" فاخر حسین نے تاسف سے کہا اور کھانا چھوڑ کر بڑبڑانے لگے۔

''مجھے آج تک اس کی سمجھ نہیں آئی...... فوراً لمحوں میں بدل جاتی ہے...... اچھی خاصی بات کر رہی ہو گی تو فوراً کسی نہ کسی بات کو مائنڈ کر کے موڈ آف کر لیتی ہے...... اس کے ساتھ تو مذاق بھی کھل کر نہیں کیا جا سکتا...... اب دیکھنا کئی روز تک موڈ آف رہے گا...... اور خوامخواہ ٹینشن پھیلائے گی۔'' فاخر حسین یوں بول رہے تھے جیسے انہیں اپنے کیے پر بہت پچھتاوا ہو رہا ہو۔

''ڈیڈی...... کیا...... مما شروع سے ہی ایسی ہیں؟'' شہیر نے کھانا چھوڑتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں...... اس کی ماں یعنی کہ میری پھوپھو بھی بالکل ویسی ہی تھیں...... یہ جینز کا اثر ہے...... پھوپھو کی اچھی باتیں تو تہمینہ نے Inherit نہ کیں...... اس ایک بات کو Inherit کر لیا...... میں اس کی...... اس عادت سے تنگ آ گیا ہوں...... ساری زندگی اس بری عادت کی نذر ہو کر بہت بدمزہ گزری ہے۔'' فاخر حسین نے کہا تو شہیر کو اپنی پورٹریٹ پھاڑنے کی حرکت یاد آ گئی...... اسے خود بھی اندازہ نہ تھا کہ وہ کیا کرے گا...... اور اس نے کیا کر دیا......

''کیا وہ بھی ممی کی طرح ہے؟''

کیا ہر شخص کے جینز میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ اس کی پرسنالٹی پر اس حد تک اثر انداز ہوتے ہیں۔

وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

☆

''یار شہیر کیا تم نے زل کا پورٹریٹ مکمل کر لیا ہے؟'' ارسلان نے اچانک شہیر سے پوچھا جبکہ زل ایزل پر رکھی ایک پینٹنگ مکمل کرنے میں مصروف تھی۔ اس نے چونک کر دونوں کو دیکھا۔

''نہیں......'' شہیر نے زل کی طرف مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''کیوں...... اتنے روز تو ہو گئے ہیں...... یار...... مجھے تو دال میں کچھ کالا لگ رہا ہے۔'' ارسلان نے ہنستے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب......؟'' شہیر نے انتہائی سنجیدگی سے پوچھا اور زل کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا...... زل کو اس کے دیکھنے کا انداز قدرے برا لگا اور وہ پینٹنگ کو وہیں ادھورا چھوڑ کر کلاس روم سے باہر نکل گئی۔

یہ زل کو کیا ہوا ہے کیا تم لوگوں میں کھٹ پھٹ ہوئی ہے ارسلان نے حیرت سے پوچھا۔

''غالباً.....تم سب کچھ جانتے ہو.....پھر بھی کچھ نہ جاننے کا پوز کر رہے ہو۔''شہیر نے اچانک درشت لہجے میں کہا۔

''شہیر.....یہ تم کو کیا ہو گیا ہے۔اور.....تم کیسی باتیں کر رہے ہو.....آر.....یو.....او کے.....؟''ارسلان نے اسے ریلیکس کرنے کے انداز میں اپنے اٹھے ہاتھوں کو آہستہ آہستہ اوپر سے نیچے کرتے ہوئے کہا۔

''میں سب جانتا ہوں،زل تم سے ہر بات شیئر کرتی ہے۔''شہیر نے خفگی سے کہا۔

''کیا زل نے تمہیں کچھ ایسا کہا ہے؟''ارسلان نے حیرت سے پوچھا۔

''اسے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں.....میں سب کچھ جانتا ہوں.....''شہیر کے لہجے میں عجیب سی تلخی اور شکایت تھی۔

''سوری.....اگر تم نے میری کسی بات کو مائنڈ کیا.....؟

ارسلان نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔شہیر کے دل میں ارسلان کے لئے نفرت سی پیدا ہونے لگی۔ورنہ اس سے قبل دونوں میں اچھی دوستی تھی۔نجانے کیا ہو رہا تھا کہ شہیر کا دل اس سے متنفر ہونے لگا تھا اور اسے اس بات کی خود بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی.....کیا وہ ''زل'' کی وجہ سے اس سے نفرت کرنے لگا تھا.....یا.....پھر اس اچانک پیدا ہونے والی نفرت کی کوئی اور وجہ تھی۔وہ خود ہی جھنجلانے لگا۔

''شہیر.....کیا تم لوگوں کا پراجیکٹ مکمل ہو گیا ہے۔''اچانک پروفیسر ربانی نے کلاس میں کھڑے شہیر سے پوچھا۔

''نو.....سر.....''شہیر نے آہستہ لہجے میں کہا۔

''زل نے تو اپنا پورشن Submit کروا دیا ہے.....میں آپ کا پراجیکٹ بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔''پروفیسر ربانی نے کہا۔

''آئی ایم سوری.....سر.....''وہ آہستہ آواز میں بولا۔

''کیا کوئی پرابلم ہے.....یا.....پھر.....کوئی اور ریزن.....؟''

''نو.....سر.....نو ریزن؟''وہ جلدی سے بولا۔

''تو پھر.....آپ کب مجھے اپنا ریزن پورشن دیں گے۔''سر رضا ربانی نے پوچھا۔

''اگلے ہفتے تک.....میں پوری کوشش کروں گا۔''شہیر نے کہا۔

''نیکسٹ ویک.....؟اٹ از ٹو لیٹ۔''پروفیسر رضا ربانی نے حیرت سے کہا۔

''سر.....کچھ ایسی مصروفیات ہیں.....''اس نے بہانہ بنایا۔

''شہیر.....یہ ذہن میں رکھیں.....یہ آپ کی ایکٹویٹیز یا پاس ٹائم نہیں۔اٹ از پارٹ آف یور سٹڈیز،انڈرسٹینڈ۔''پروفیسر رضا نے قدرے خفگی سے کہا تو شہیر نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔پروفیسر رضا کلاس سے باہر نکل گئے۔

وہ کیسی الجھن کا شکار ہو گیا تھا.....اسے خود بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا.....حالات کیسے الجھتے چلے جا رہے تھے.....اس کی ایک حرکت اسے کن

مشکلات سے دوچار کر رہی تھی۔ نجانے کیوں وہ اچانک ہائپر ہو گیا تھا اور اس نے زل کا پورٹریٹ پھاڑ دیا تھا...... اور اب وہ دوبارہ کیسے زل سے کہے۔

''اور...... وہ کیسے پھر اپنا ٹائم Spare کرے گی اور اگر وہ انکار کر دیتی ہے تو سر رضا کو وہ کیا کہے گا...... اور اگر وہ پورٹریٹ مکمل نہیں کر پاتا تو سر رضا کے سامنے شرمندہ ہوگا۔ وہ عجیب غصے کا شکار ہو رہا تھا۔

یہ میں کیا کر رہا ہوں......؟

مجھے کیا ہو رہا ہے......؟

میں کیوں ہائپر ہونے لگا ہوں......؟

میرے دل میں وسوسے کیوں پیدا ہونے لگے ہیں...... اور میں ارسلان سے کیوں متنفر ہونے لگا ہوں...... میرے دل میں اس کے لئے ''نفرت'' کیوں پیدا ہونے لگی ہے...... ان گنت سوالات...... وسوسے اور اندیشے، اس کے دل میں پیدا ہونے لگے......

''ایکسکیوزمی مس زل...... مجھے آپ سے ایک فیور چاہئے......'' شہیر نے گیٹ سے داخل ہوتی ہوئی زل کو روک کر پوچھا۔

''اگر...... آپ مجھے پورٹریٹ کے بارے میں کچھ کہنا چاہتے ہیں...... تو...... سوری...... میرے پاس اتنا وقت نہیں...... مجھے اور اسائنمنٹس بھی مکمل کرنی ہیں......'' زل نے دوٹوک لہجے میں کہا اور وہاں سے چلی گئی۔ شہیر کو بہت خفت سی محسوس ہونے لگی۔ اسے کبھی بھی زندگی میں ایسی صورتحال کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا اور زل بھی کبھی اتنی Rude نہیں تھی۔ یقیناً اسے ارسلان نے میرے خلاف بھڑکایا ہوگا۔ اس نے سوچا اور اس کے دل میں ارسلان کے خلاف مزید نفرت پیدا ہونے لگی۔

سارا دن وہ کلاس میں اپ سیٹ رہا زل سے ایک دوبار آمنا سامنا ہوا...... تو...... کبھی وہ روشنی سے باتوں میں مصروف ہوتی...... کبھی اسامہ سے...... اور زیادہ تر وقت وہ ارسلان کے ساتھ کبھی کیفے ٹیریا میں چائے پیتی ہوئی پائی گئی...... کبھی ارسلان کے ساتھ پینٹنگ بناتے ہوئے ہنستی مسکراتی باتیں کرتی ہوئی...... وہ شہیر کی آنکھوں میں کھٹکتی......

ارسلان بھی شہیر سے متنفر رہنے لگا تھا...... وہ ہیلو ہائے کے علاوہ اس سے کوئی اور بات نہ کرتا۔ شہیر جب کیفے ٹیریا میں داخل ہوتا تو ارسلان اسے دیکھتے ہی فوراً وہاں سے اٹھ کر چلا جاتا۔ اگر گروپ ڈسکشن ہو رہی ہوتی اور شہیر کچھ ڈسکس کر رہا ہوتا تو ارسلان فوراً وہاں سے ہٹ کر ادھر ادھر مصروف ہو جاتا۔

روشنی، عمر مصطفی، اسامہ سمیت تمام سٹوڈنٹس زل، شہیر اور ارسلان کے درمیان تناؤ کو محسوس کر رہے تھے۔

''زل...... کیا تمہارا اور ارسلان کا شہیر سے کوئی جھگڑا ہوا ہے؟'' روشنی نے سینڈوچ کھاتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں...... تو......؟ کس نے کہا؟'' زل نے بات بدلنے کی کوشش کی۔

''معلوم تو کچھ...... ایسا ہی ہو رہا ہے......'' روشنی نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''اپنی اپنی Assumptions ہیں۔ ورنہ ایسی کوئی بات نہیں...... اس کے ساتھ ایک اسائنمنٹ تھی وہ مکمل ہو گئی...... اب میں بھی بزی

ہوں۔۔۔۔۔اور۔۔۔۔۔وہ بھی۔۔۔۔۔" زل نے جواب دیا۔

"کیا تم شہیر کو ناپسند کرتی ہو؟" اچانک روشنی نے پوچھا۔

"کیا مطلب۔۔۔۔۔؟" زل نے چونک کر پوچھا۔

"کچھ Rumours سننے میں آ رہی ہیں۔۔۔۔۔" روشنی نے منہ بنا کر آہستہ آہستہ پوچھا۔

"روشنی۔۔۔۔۔تم کیا پوچھنا چاہ رہی ہو۔۔۔۔۔کھل کر بات کرو۔" زل نے دوٹوک لہجے میں پوچھا۔

"کیا تم جانتی ہو۔۔۔۔۔کہ۔۔۔۔۔شہیر تم سے محبت کرتا ہے؟" روشنی نے آنکھیں گھما کر پوچھا۔

"ک۔۔۔۔۔کک۔۔۔۔۔کیا۔۔۔۔۔محبت۔۔۔۔۔؟ اور مجھ سے۔۔۔۔۔؟ آر یو ان یور سینسز؟ زل کے لئے یہ انکشاف انتہائی چونکا دینے والا تھا۔ غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا تھا اور ہونٹ کپکپانے لگے تھے۔

"پلیز۔۔۔۔۔تم یوں ہائپر مت ہو۔۔۔۔۔" روشنی نے اس کا غصہ دیکھتے ہوئے کہا۔

"روشنی۔۔۔۔۔یہ باتیں کون پھیلا رہا ہے۔۔۔۔۔؟ کیا شہیر نے ایسا کچھ کہا ہے؟ زل نے حیرت سے پوچھا۔

"چھوڑو۔۔۔۔۔جس نے بھی کہا ہے۔۔۔۔۔مگر اس میں کچھ حقیقت بھی ہے۔" روشنی نے جواب دیا۔

"کیسی حقیقت۔۔۔۔۔؟ زل نے پھر چونک کر پوچھا۔

"یہی کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے۔" روشنی نے مسکرا کر جواب دیا۔

"پھر۔۔۔۔۔وہی بات۔۔۔۔۔میں تمہیں بتا رہی ہوں کہ ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔۔۔بس۔ اب میرا دماغ خراب مت کرو۔ میں جا رہی ہوں۔"

زل غصے سے اٹھ کر وہاں سے چلی گئی اور روشنی حیرت سے اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہ گئی۔

☆

"آئی ایم سوری سر۔۔۔۔۔میں آپ کو پورٹریٹ نہیں دے پاؤں گا۔۔۔۔۔وہ۔۔۔۔۔ان فیکٹ۔۔۔۔۔" شہیر کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا بہانہ بنائے؟

"جو بھی وجہ ہے۔۔۔۔۔صاف صاف بتاؤ۔" پروفیسر ربانی نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

"سر۔۔۔۔۔زل کا پورٹریٹ ٹھیک نہیں بنا تھا اور وہ میں نے غصے میں پھاڑ دیا۔۔۔۔۔اور اب وہ دوبارہ بنوانے پر رضامند نہیں۔۔۔۔۔" شہیر نے واضح انداز میں بتایا۔

"اور یہ کس نے ڈیسائیڈ کیا۔۔۔۔۔کہ۔۔۔۔۔وہ ٹھیک نہیں بنا تھا؟" پروفیسر ربانی نے اچانک پوچھا تو وہ چونک گیا۔

"زل نے۔۔۔۔۔" اس نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔۔۔آپ ارسلان کا پورٹریٹ بنالیں۔" پروفیسر ربانی نے کہا تو وہ چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔

"اب کیا ہوا۔۔۔۔۔؟" پروفیسر ربانی نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ ...... سر ...... ہی از ناٹ سیریس ...... خاموشی سے نہیں بیٹھا اور ......'' وہ بہانے بنانے لگا۔

''ٹھیک ہے ...... آپ اس اسائنمنٹ کو ہی چھوڑ دیں۔ شہیر مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے آپ کچھ اپ سیٹ ہیں۔'' پروفیسر ربانی نے اس کی جانب بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نو ...... سر ...... آئی ...... ایم ......'' وہ بولا۔

''مے ...... آئی ...... کم ان سر ......'' اچانک زل پروفیسر ربانی کے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے بولی۔ شہیر کو ان کے سامنے بیٹھا دیکھ کر چونکی۔

''یس ...... آیئے زل ...... میں آپ کا ہی انتظار کر رہا تھا ......'' پروفیسر ربانی نے کہا تو شہیر نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ زل کمرے میں داخل ہوئی اور شہیر کو قدرے نظر انداز کرتے ہوئے دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔

پروفیسر ربانی نے اپنے ٹیبل کی دراز میں سے اس کا بنایا ہوا شہیر کا پورٹریٹ نکالا تو دونوں چونکے۔

''زل ...... آپ نے پورٹریٹ تو اچھا بنایا ہے مگر ان کی ناک کی ٹپ اور Base میں فاصلہ زیادہ کر دیا ہے، اس معمولی سے فرق سے ان کے فیچرز میں نمایاں چینج محسوس ہو رہا ہے ...... یہ ادھر دیکھیں ......'' پروفیسر ربانی نے پورٹریٹ شہیر کے چہرے کے ساتھ رکھ کر بتایا تو زل نے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے بغور دیکھا ......

''اور ان کی آنکھوں کو دیکھیں ......'' پروفیسر ربانی کے کہنے پر اس نے شہیر کی آنکھوں کی طرف بغور دیکھا۔ اس نے بھی زل کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی Eye lids اور Eye lashes کو تھوڑا سا Shape دیں۔

''زل ...... دیکھنے میں تو یہ بہت معمولی فرق ہیں، مگر تھوڑے سے ڈفرنس سے شکل وصورت بدل جاتی ہے۔ ٹھیک ہے ...... ہم خدا کی طرح نہ تو پرفیکٹ ہو سکتے ہیں ...... اور نہ ہی اتنے ماہر ...... جو ہر شے کو انتہائی متناسب انداز میں بناتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے ...... ہم آرٹ کے لوگ تو immitators ہیں ...... جو اس کی بنائی ہوئی چیزوں کی کاپی کرتے ہیں ...... ارسطو نے بھی تو یہی کہا ہے نا ...... اور ایک آرٹسٹ کا بھی یہ کام ہے کہ وہ کم از کم کاپی تو ٹھیک بنائے ...... بناتے وقت ہر شے کے اینگل کا خاص خیال رکھے ......'' پروفیسر ربانی نے کہا۔

''رائٹ سر ...... میں اس کو ٹھیک کرتی ہوں۔'' زل نے پورٹریٹ اٹھایا اور باہر نکل گئی۔

تھوڑی دیر بعد شہیر بھی ان کے روم سے باہر نکلا ...... زل کوریڈور میں کھڑی تھی ...... اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح شہیر کو کہے کہ پورٹریٹ ٹھیک کرنے میں اس کی مدد کرے ...... اسے کچھ ٹائم دے۔ روشنی کی باتیں سن کر اسے ویسے ہی شہیر پر بہت غصہ تھا ...... دوسرا ...... اسے اپنا رویہ بھی یاد تھا۔ جب شہیر نے اسے پورٹریٹ بنانے کے لئے کہا تھا۔ وہ کشمکش کا شکار تھی اور ہونٹ چبا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سوال تھا۔

''پورٹریٹ ٹھیک کرنے کے لئے آپ کو میری ضرورت ہے ......'' شہیر نے اس کے قریب آ کر پوچھا۔

''یس آف کورس ......'' اس نے چہرہ دوسری جانب کرتے ہوئے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے ...... آپ اسے آج ہی ٹھیک کر لیں ...... کل میں بزی ہوں گا ...... مجھے مسز عطیہ کی اسائنمنٹ پر کام کرنا ہے۔'' شہیر نے

انتہائی نرم لہجے میں کہا تو وہ چونک کر اس کی جانب دیکھنے لگی۔ وہ اس سے کچھ اور توقع کر رہی تھی اور وہ اس کی توقعات کے برعکس ری ایکٹ کر رہا تھا۔

''اوکے......'' وہ اس کے ساتھ چل پڑی اور کلاس روم کے کوریڈور میں سے ہوتی ہوئی ٹیرس پر آ گئی...... شہیر اس کے سامنے اسٹول پر بیٹھ گیا۔ وہ مکمل خاموش تھا اور ادھر ادھر دیکھ رہا تھا جبکہ زل ایزل پر لگے بورڈ پر پورٹریٹ فنش کرنے میں مصروف تھی۔

اس نے پورٹریٹ کی طرف دیکھا اور پھر شہیر کی آنکھوں کی طرف انتہائی غور سے...... تاکہ......Eye lids اور Eye lashes کی Shape ٹھیک کر سکے۔ شہیر بھی اس کی طرف بغور دیکھنے لگا۔ آج اس کی آنکھوں میں کچھ عجیب سی بات تھی کہ وہ قدرے گھبرا گئی اور جلدی سے منہ موڑ کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اپنی کلرز پیلٹ ٹھیک کرنے لگی۔

''کتنا مشکل ہوتا ہے...... اپنی مرضی اور خواہش کے برعکس کوئی کام کرنا......'' اس نے دل میں سوچا وہ اس شخص کو دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی...... مگر اس کو اپنے قریب بٹھانے پر مجبور تھی۔

اس نے اپنے آپ کو سمجھایا اور پھر شہیر کی آنکھوں کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ اس کی طرف یوں دیکھ رہا تھا جیسے کوئی بہت چاہت اور محبت سے کسی کو دیکھتا ہے...... شہیر خاموش تھا مگر اس کی آنکھیں بول رہی تھیں...... اس کی زبان چپ تھی مگر آنکھیں محبت کی پیار بھری باتیں کر رہی تھیں۔

''کیا تم جانتی ہو...... کہ...... شہیر تم سے محبت کرتا ہے۔'' روشنی کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے......

''شہیر کو آج کیا ہو گیا ہے...... یا...... پھر میں کس illusion کا شکار ہو رہی ہوں۔'' اس نے اپنے دل میں پیدا ہونے والے وسوسوں کو جھٹکا اور شہیر کی طرف دیکھے بغیر پورٹریٹ میں بنی اس کی آنکھوں کی طرف دیکھنے لگی۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ آنکھیں بھی اس کی طرف یونہی دیکھ رہی ہوں جیسے وہ حقیقت میں اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ جھنجلانے لگی۔ اس کی آنکھوں سے اس کی جھنجلاہٹ ظاہر ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا۔

''شہیر کیوں مجھے ایسی نظروں سے دیکھ رہا ہے...... کہ...... میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے سحر میں گرفتار ہو رہی ہوں...... ایسا کچھ بھی نہیں...... یہ سب میرا وہم ہے۔'' اس نے اپنے خیال کو خود ہی رد کرنے کی کوشش کی۔

''مگر اس میں کچھ حقیقت بھی ہے......'' روشنی کے الفاظ پھر اس کے کانوں میں گونجے......

وہ اپنے آپ سے الجھنے لگی...... اس کا برش اس کے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ کلرز کو یونہی بے خیالی میں مکس کر رہی تھی اور مسلسل مکس کرتی جا رہی تھی۔

''زل...... آر...... یو...... اوکے......؟'' شہیر کافی دیر سے اسے یوں کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

''زل اچانک چونکی...... اور...... بوکھلا کر اس کی طرف دیکھنے لگی...... شہیر اٹھ کر اس کے قریب آ گیا...... اس کی قربت سے اسے وحشت سی ہونے لگی۔

''آپ ٹھیک تو ہیں......'' شہیر نے محبت بھرے لہجے میں پوچھا، زل ہونٹ چبانے لگی......

''آپ ادھر بیٹھیں......اور یہ کلرز پیلٹ مجھے دیں۔ مجھے اپنی Eyelids اور Eye lashes کی Shape بہت اچھی طرح معلوم ہے۔ میں ٹھیک کر دیتا ہوں۔'' شہیر نے اس کے ہاتھ سے برش اور کلرز پیلٹ لی اور پورٹریٹ کو ٹھیک کرنے لگا۔ زل عجیب الجھن کا شکار ہو رہی تھی۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا...... کیا کرے...... وہ اس صورتحال سے پہلی بار دوچار ہو رہی تھی۔ وہ بہت بولڈ اور کونفیڈنٹ تھی...... نجانے اسے کیا ہو رہا تھا......؟ وہ کیوں اتنی نروس ہو رہی تھی......؟

وہ اپنی سوچ میں گم تھی اور مسلسل شہیر کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ شہیر اپنے کام میں بہت مگن تھا۔ مگر اس کا ذہن کہیں اور تھا...... اور...... دل ان گنت سوالات کر رہا تھا۔

''میں جانتا ہوں...... تمہیں کیا ہو رہا ہے؟'' اس نے کن اکھیوں سے اس کی جانب دیکھ کر دل میں سوچا۔

''ایسا زندگی میں پہلی بار ہو رہا ہے......'' زل نے ہونٹ چباتے ہوئے سوچا۔

''میں نے تو تمہیں کچھ بھی نہیں کہا...... صرف...... محبت بھری نظروں سے دیکھا ہے۔'' شہیر نے زیر لب مسکراتے ہوئے سوچا۔

''اس کی آنکھوں میں آج کیا ہے......؟'' زل نے پہلو بدلتے ہوئے سوچا۔

''میں نہیں جانتا تھا...... محبت میں اتنی طاقت بھی ہو سکتی ہے۔'' شہیر نے کلرز پیلٹ کلرز لیتے ہوئے سوچا۔

''کیا واقعی......وہ مجھ سے محبت کرنے لگا ہے...... کیا اس کی آنکھیں مجھے یہی پیغام دے رہی ہیں۔'' زل نے اپنی نگاہیں اپنے پاؤں کے نیچے زمین پر مرکوز کرتے ہوئے سوچا۔

''ہاں...... میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں...... خدا کرے میری آنکھیں تم تک میرے دل کا پیغام پہنچا دیں اور کاش تم میرے اس پیغام کو سمجھ سکو......'' شہیر نے سوچا۔

''میں کیوں الجھ رہی ہوں...... اور...... مجھے یہ کیا ہو رہا ہے؟'' وہ بدحواس ہو کر اٹھی...... شہیر نے ایک ٹک اس کی جانب دیکھا اور کلرز پیلٹ سائیڈ پر رکھتے ہوئے اس کی جانب آیا۔

''زل...... اب دیکھئے اور بتایئے کہ میں نے کس حد تک پورٹریٹ کو ٹھیک کیا ہے۔'' شہیر نے زل کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا تو وہ خاموشی سے ایزل کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی اور پورٹریٹ کی طرف دیکھنے لگی۔ واقعی اس نے پورٹریٹ کو بالکل ٹھیک کر دیا تھا۔ شہیر ایزل کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

''اب غور سے دیکھیں اور بتایئے مجھ میں اور پورٹریٹ میں کتنا فرق ہے؟ شہیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

زل نے دونوں کو بغور دیکھا اور دیکھتی ہی رہ گئی......انیس...... بیس کا فرق بھی باقی نہیں رہا تھا۔

''مجھے تو بالکل ٹھیک لگ رہا ہے......'' زل نے آہستہ سے جواب دیا۔

''کیا پورٹریٹ میں میری آنکھیں وہی کہہ رہی ہیں...... جو وہ حقیقت میں کہنا چاہ رہی ہیں۔'' شہیر نے معنی خیز انداز میں کہا تو زل نے چونک کر پھر اس کی جانب دیکھا۔

"آئی ایم ایکسٹریملی سوری...... اس روز میں نجانے کیوں ہائپر ہو گیا تھا...... اور میں اپنے آپ کو بہت گلٹی فیل کرتا رہا ہوں...... آئی ہوپ...... یو انڈرسٹینڈ می" اس نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔

زل نے ایک ٹک اس کی جانب دیکھا اور خاموش ہو گئی۔

"پلیز...... زل...... میری فیلنگز کو سمجھنے کی کوشش کریں...... اس روز کے بعد میں نے اپنی غلطی کو شدت سے محسوس کیا ہے...... آئی ایم رئیلی......؟"

"تھینک یو...... اب میں چلتی ہوں۔" زل اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی اور شہیر خاموشی سے اس کی جانب دیکھنے لگا اور گہری سانس لی۔

زل ایزل اور پورٹریٹ اٹھا کر وہاں سے چلی گئی اور وہ وہیں کھڑا رہ گیا۔ اس لمحے اس کا دل کرچی کرچی ہو رہا تھا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا...... کیا کرے......؟ اور اس کی بات کو کیا سمجھے؟ اس نے تو پوری سچائی کے ساتھ اسے اپنے دل کی بات بتانے کی کوشش کی تھی اور اس کا غیر متوقع ردعمل اس کے لئے حیران کن تھا۔ وہ تو سوچتا تھا کہ جب وہ اسے اپنے دل کی بات بتا کر ایکسکیوز کرے گا۔ تو وہ مسکرا کر اس کی جانب دیکھے گی...... وہ سب کچھ بھلا دے گی...... مگر اس کا "تھینک یو" کہنے کا روکھا انداز...... سپاٹ آنکھیں...... اس کے دل میں نشتر کی چبھو رہے تھے...... اس کا دل بوجھل ہونے لگا اور اس کی سانس رکنے لگی...... آنکھیں نمی سے بھرنے لگیں...... وہ کہیں دور جانا چاہتا تھا...... بہت دور...... کسی ویرانے میں...... جہاں وہ اور اس کی سوچوں کے علاوہ کوئی اور نہ ہو...... وہ لانگ ڈرائیو پر نکل گیا۔ زل مسلسل اس کے ذہن میں تھی اور اس کا کہا ہوا جملہ اس کے ذہن میں جونک کی طرح چپٹ گیا تھا۔ اس نے کیوں ایسے کہا......؟ اس نے میری پوری بات بھی نہیں سنی...... اور...... وہاں سے چلی گئی...... کیا...... وہ میرے لئے وہ کچھ محسوس نہیں کر رہی جو میں اس کے لیے کر رہا ہوں...... میں اسے بتانے والا تھا...... کہ میں اس سے بہت محبت کرتا ہوں اور شاید اس کو اس بات کا اندازہ بھی ہو گیا تھا...... پھر جانتے بوجھتے ہوئے بھی اس نے مجھے نظر انداز کر دیا۔ اس کا مطلب ہے اس نے......" وہ جھنجھلانے لگا اور ڈرائیونگ کرتے ہوئے سر کے ایک ہاتھ سے بال نوچنے لگا۔ وہ اس لمحے اتنا ہائپر ہو رہا تھا کہ اسے سامنے آتا ہوا ٹرک دکھائی ہی نہ دیا اور بمشکل اس سے ٹکراتے ہوئے بچا۔ اس کی گاڑی بریک کی زوردار آواز کے ساتھ رکی۔ ٹرک بہت آگے نکل گیا تھا۔ سڑک پر اکا دکا گاڑیاں تھیں۔ وہ گاڑی روک کر سوچنے لگا۔

مجھے کیا ہو رہا ہے......؟ اور

میں کیوں اتنا جذباتی ہو رہا ہوں......؟

زل کا یہ "ری ایکشن" نیچرل تھا...... اس روز کے بعد کئی ایسے مواقع آئے جب زل کی فیلنگز ہرٹ ہوئیں تھیں۔ وہ مجھ سے ناراض تھی...... اور اس کو ہونا بھی چاہئے تھا۔ اس روز غلطی میری ہی تھی......" میں نے اس کی فیلنگز سمجھنے کی بجائے پورٹریٹ پھاڑ دیا...... وہ خود ہی زل کو بری الذمہ ٹھہرانے لگا...... زل اس کے ساتھ کچھ اور برا بھی کر سکتی ہے۔" وہ ایسا کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتا تھا وہ بہت مشکل سے اپنے آپ کو سمجھا کر گھر واپس آ گیا۔

☆

''سمیر گھر واپس آ رہا ہے......'' ممی نے رات کو اسے خبر سنائی۔

''کیوں......؟'' شہیر نے اچانک پوچھا۔

''اس کی سٹڈیز مکمل ہو گئی ہے......'' ممی نے خوش ہو کر بتایا۔

''اچھا......ہی......'' اس نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

''کیا بات ہے...... تمہیں اس کے آنے کا سن کر خوشی نہیں ہوئی۔''

ممی نے اس کے چہرے کی طرف بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا خوشی دکھانے کی چیز ہوتی ہے؟'' شہیر نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''ہاں...... انسان کے Expressions سے پتہ چل جاتا ہے...... کہ وہ خوش ہے...... یا...... ناخوش......'' ممی نے کہا۔

''ایک عام سی بات ہے Expressions وقتی ہوتے ہیں کبھی بھی اسٹرونگ نہیں ہوتے۔'' شہیر نے جواب دیا۔

''سمیر پورے سال کے بعد گھر واپس آ رہا ہے...... اور تمہیں اس کے آنے کی کوئی خوشی نہیں ہو رہی...... کیا تمہیں اس سے محبت نہیں؟'' ممی نے حیرت سے پوچھا۔

''ممی...... آپ کی اور میری فیلنگز میں اس لئے فرق ہے...... کہ ہم دونوں کا Relationship اس سے مختلف ہے۔ آپ ماں ہو کر سوچ رہی ہیں...... آپ کی فیلنگز اس کے لئے بہت اسٹرونگ ہیں...... جو میرے لیے کبھی بھی اتنی اسٹرونگ نہیں رہی ہیں...... اور سمیر...... میرا بھائی ہے...... لیکن وہ میرا فرینڈ کبھی بھی نہیں رہا...... جبکہ وہ سب کا فرینڈ ہے۔'' شہیر نے آہ بھر کر انتہائی سنجیدگی سے جواب دیا۔

''شہیر...... یہ تم کیسی باتیں سوچتے ہو...... میں تو تمہاری باتیں سن کر حیران ہو رہی ہوں...... تم نے یہ سب کچھ کیسے سوچ لیا......؟'' ممی نے حیرت سے پوچھا۔

''ممی...... سوچ...... سوچ ہوتی ہے...... اسے دماغ میں آنے کے لئے کسی منسٹر کی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی۔'' وہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا اور تہمینہ حیرت سے اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہ گئیں......

یہ کس بات کا ری ایکشن ہے......؟

وہ کیوں ایسے بی ہیو کر رہا ہے......؟

مسز تہمینہ پریشان ہو کر سوچنے لگیں۔

☆

ارسلان اور زحل کیفے ٹیریا سے باہر اوپن ایئر میں ایک بنچ پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

''کل شہیر تمہارا پورٹریٹ بنا رہا تھا...... میں نے کوریڈور سے گزرتے ہوئے دیکھا تھا...... تم کچھ اپ سیٹ لگ رہی تھی......'' ارسلان نے قدرے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

''ن......نہیں......ایسی کوئی بات نہیں......میں نے اس کا پورٹریٹ بنایا تھا......سربانی نے اس میں کچھ Flaws بتائے تھے......وہ مجھ سے ٹھیک نہیں ہو پا رہے تھے......تو......شہیر نے خود ہی ٹھیک کر لئے۔''زل نے صاف گوئی سے بتایا۔

''آئی......سی......زل......تمہیں شہیر کیسا لگتا ہے؟''ارسلان نے اچانک پوچھا تو وہ بوکھلا گئی۔

''ک......کیا......مطلب......؟''وہ ایک دم گھبرا کر بولی......اور......اس کی نظروں کے سامنے روشنی کا چہرہ گھوم گیا......وہ توقع کر رہی تھی کہ شاید ارسلان بھی اس سے وہی باتیں کرنے لگا ہے......

''میرا مطلب ہے......کچھ Unpredictable سا انسان ہے۔کچھ الجھا سا گہرے پانیوں کی طرح خاموش......اگلے لمحے کیسے ری ایکٹ کرے گا......یہ شاید وہ خود بھی نہیں جانتا......''ارسلان نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''ہاں......لیکن میرا خیال ہے......ہر انسان کسی نہ کسی حد تک Unpredictable ہی ہوتا ہے۔''زل نے جواب دیا۔

''نہیں......سب نہیں......کچھ......اور ان میں سے بھی کم یا زیادہ......ارسلان نے کہا۔

''تم شہیر کے بارے میں کیوں کونشس ہو رہے ہو؟زل نے پوچھا۔

''اس روز اس نے جس طرح میرے ساتھ بی ہیو کیا......میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا......اور......جانتی ہو......اس کا رویہ بہت توہین آمیز تھا......شاید میری شکل وصورت یا پھر میرے فیملی بیک گراؤنڈ کی وجہ سے ایسا تھا......مگر اس کا لب ولہجہ بہت تکلیف دہ تھا......''ارسلان نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

''کیوں......تمہارے فیملی بیک گراؤنڈ کو کیا ہوا ہے؟اور میرا نہیں خیال کہ ایسی کوئی بات اس کے ذہن میں ہو سکتی ہے......مجھ سے بھی تو......اس نے......''زل نے اچانک جملہ ادھورا چھوڑا اور خاموش ہو گئی۔

''کیا......تم سے بھی......؟''ارسلان نے حیرت سے پوچھا۔

''کچھ......نہیں......بس یونہی ہائپر ہو گیا تھا......''زل نے کہا۔

''زیلی......''ارسلان نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

''تم اپنے ذہن کو ایسی منفی باتوں سے دور رکھو تو بہتر ہے......؟زل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیوں......''میں بھی تو انسان ہوں......اور......میرے ذہن میں بھی ایسی منفی باتیں آسکتی ہیں۔''ارسلان نے ذومعنی انداز میں پوچھا۔

''ہاں......تم بھی انسان ہو......اور......ضرور ایسا سوچ بھی سکتے ہو......مگر اپنی سوچ کو پازیٹو رکھو تو بہتر ہے۔''زل نے رائے دی۔

''کیا سوچ کو پازیٹو رکھنا انسان کے اپنے بس میں ہے؟''ارسلان نے پوچھا۔

''یس......آف کورس......کسی حد تک......''

اور یاد ہے......اس روز......تم نے مجھے اس ٹاپک پر کتنا بڑا لیکچر دیا تھا......جب میں بہت اپ سیٹ تھی......کیا یاد آیا......؟''زل نے پوچھا۔

''ہاں......اچھی طرح یاد ہے......کیا ہوا اس مسئلے کا......'' ارسلان نے یاد کرتے ہوئے پوچھا۔

''ایز اٹ از......نو پراگریس......ارسلان۔ اگر اس روز تم مجھے Console نہ کرتے......تو......آئی ڈونٹ نو......میں کچھ کر لیتی۔'' زِل نے قدرے جذباتی انداز میں کہا۔

''کیا کر لیتی......؟ نہر میں کود جاتی یا کالج کی بلڈنگ کی چھت پر سے چھلانگ لگا دیتی......یا......پھر بہت ساری سلیپنگ پلز کھا کر مرنے کی ناکام کوشش کرتی۔ ویسے زِل تم نے پھر بھی زندہ بچ جانا تھا......اور پھر خواہ مخواہ میں ساری زندگی شرمندہ ہوتے رہنا تھا......'' ارسلان نے ہنستے ہوئے کہا۔

''نہیں......میں نے تو ایسا کچھ بھی نہیں سوچا تھا......میں تو کچھ اور کرنے کا پلان کر رہی تھی......'' زِل نے سنجیدگی سے کہا۔

''یعنی......کہ......اس سے بھی بڑھ کر کوئی خطرناک کام......؟'' ارسلان نے مسکراہٹ چھپاتے ہوئے کہا۔

زِل نے اس کو کچھ کہنے کے لئے جیسے ہی منہ کھولا۔ تو سامنے سے آتے شہیر کو دیکھ کر ایک دم خاموش ہو گئی۔

''ہیلو......آپ لوگ......یہاں ہیں اور میں آپ دونوں کو نجانے کہاں کہاں تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔'' شہیر نے اس قدر بے تکلفانہ انداز سے کہا کہ دونوں چونک گئے......دونوں نے حیرت سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور پھر شہیر کی طرف استفہامیہ نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

''بھئی......اس قدر حیران ہونے کی کیا بات ہے؟ چلیں انھیں سب لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں......'' شہیر نے جلدی جلدی دائیں ہاتھ سے چٹکیاں بجاتے ہوئے کہا۔

''کون لوگ......؟ زِل نے حیرت سے پوچھا۔

''بھئی......ہمارا گروپ......روشنی......اسامہ......عمر مصطفیٰ......مریم......فوزیہ......نیہا اور میں'' شہیر نے جلدی جلدی نام گنوائے۔

''مگر......سب لوگ کہاں جا رہے ہیں......اور یہ اچانک پروگرام کس نے بنایا ہے......؟'' ارسلان نے حیرت سے پوچھا۔

''آخر......یہ سب کیا ہے؟'' زِل نے بھی جھنجھلا کر پوچھا۔

''سب کچھ سمجھ میں آ جائے گا......بس......آپ لوگ میرے ساتھ چلیں۔'' شہیر جلدی جلدی بولا۔

اور دونوں اس کے اصرار پر اٹھ کر اس کے ساتھ چلنے لگے۔ لیکن......شہیر......کچھ تو بتاؤ......تم نے یہ اچانک پروگرام کیوں بنایا ہے؟'' ارسلان نے قدرے نرم لہجے میں پوچھا۔

''آئی......ہیو......اے......بگ سرپرائز فار یو'' شہیر نے کہہ کر زِل کی طرف ذومعنی نگاہوں سے دیکھا اور مسکرانے لگا۔

# (۲)

انسانی سوچ، فہم و ادراک، شعور، ذہانت اور عقل کا سرچشمہ دماغ، ہر دور میں خود انسان کے لئے ایسا سوال بنا رہا ہے جس کا جواب تلاش کرنے میں صدیاں گزر گئیں مگر قدرت کی اس کرشمہ سازی کا حتمی اور کلی جواب دینے سے قاصر رہا ہے۔

قدیم مصری لوگ انسانی دماغ کے وجود کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے اور اکثر ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دیتے تھے۔ ان کے خیال کے مطابق ذہن اور روح دل و جگر میں رہتی تھی جب وہ حنوط شدہ لاشیں (ممیاں) بناتے تھے تو ان کے نتھنوں سے دماغ نکال کر پھینک دیتے تھے اور بقیہ اعضا کو بہت احتیاط سے مرتبانوں میں محفوظ کر کے انہیں ان حنوط شدہ لاشوں کے مقبروں میں دفنا دیتے تھے۔

یونانیوں نے بھی قدیم مصریوں کے خیالات کی تائید کی۔ 5bc میں فلاسفر Alcmaeon نے تجویز کیا کہ دل نہیں بلکہ دماغ احساسات کا منبع ہے۔

450bc میں افلاطون نے کہا کہ دماغ ہی وہ عضو ہے جو ذہانت کے لئے مخصوص ہے اور اس کی spherical shape مکمل ذہانت کا گھر ہے۔

ارسطو نے کہا دماغ نہیں بلکہ دل ذہانت اور محسوسات کا گھر ہے۔

قدیم مصری بھی ایک لمبے عرصے تک اس خیال کی تائید کرتے رہے۔ Hetrpphilus نے کہا کہ دماغ ہی ایسا عضو ہے جو سوچنے کے لئے مخصوص ہے اور cereberum cerebellum کو بیان کیا اور یہ بھی دریافت کیا کہ nerves ہی وہ channels ہیں جو جسم میں رابطے کا ذریعہ ہیں۔

لیونارڈو ڈاونچی (Leonardo da vincy) نے پہلی بار دماغ کی پہلی اور بالکل ٹھیک ڈرائنگ بنائی۔

فرانسیسی فلاسفر Rene Descartes نے ایک کتاب لکھی جس کا نام Dehomini ہے جو اس کے مرنے کے بارہ سال بعد شائع ہوئی جس میں انسانی دماغ اور ذہن کے تاثرات کے بارے میں آئیڈیاز دیئے گئے۔

آسٹریلین ڈاکٹر Franz Gall نے دماغ کے ابھاروں اور رویے کے درمیان تعلق کو بیان کرنے کی کوشش کی۔

انگریز ڈاکٹر Jmaes Parkinson نے پہلی دفعہ دماغ کی بیماری جو بوڑھے لوگوں میں پائی جاتی ہے اور ان کی حرکات پر اثر انداز ہوتی ہے اسے دریافت کیا۔ اس کا نام Parkinson Diseas ہے۔ ایک امریکن ریل روڈ ورکر Phineas Gage ایک دھماکے کے بعد زندہ رہا جبکہ لوہے کا ایک راڈ اس کے دماغ کے اگلے حصے میں گھس گیا تھا۔ اس کے رویے میں تبدیلی رونما ہوئی جس نے سائنسدانوں کو اشارہ دیا

کر دماغ کا اگلا حصہ جسے cerebrum کہا جاتا ہے پرستانی کو کنٹرول کرتا ہے۔

Pierepaul Broca (پیری پال بروکا) نے دماغ کے دائیں حصے کی شناخت کی جو بول چال کو کنٹرول کرتا ہے۔

آسٹریلین ڈاکٹر Karl Wernick نے دماغ کا وہ حصہ دریافت کیا جو بائیں جانب ہوتا ہے اور جو بولنے کے لئے مخصوص ہے اور بول چال میں واضح الفاظ کے انتخاب میں مدد دیتا ہے۔

آسٹریلین ڈاکٹر سگمنڈ فرائیڈ نے Interpretition of Dream شائع کرائی جس کا بنیادی خیال نفسیاتی تجزیہ (Psycho Analysis) تھا۔ 1928 میں E.E.G (Electro (enciphalo gram) کے ذریعے دماغ کی لہروں کو ریکارڈ کیا۔

موجودہ دور میں سائنس نے دریافت کیا ہے کہ انسانی دماغ کا وزن 1.3 کلوگرام ہوتا ہے اور اس کا 90% حصہ پانی پر مشتمل ہے اور یہ سرخی مائل پنک کلر کا ہوتا ہے اور مکھن جیسا نرم ہے۔ یہ جسم کی 20% طاقت خرچ کرتا ہے۔ چاہے انسان سو رہا ہو یا جاگ رہا ہو cerebro spinal fluid دماغ کی حفاظت کرتا ہے۔

دماغ تین اہم حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

1. Fore brain
2. Mid brain
3. Hind brain

fore brain کو بھی تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

1. Thalamus
2. Limbic system
3. Cerebrum

sensory information پہلے تھیلمس کو جاتی ہیں وہاں سے Limbic system اور پھر cerebrum میں جاتی ہیں۔

Limbic system ایک arch کی صورت میں تھیلمس اور cerebrum کے درمیان پایا جاتا ہے یہ انسان کے رویے جیسے غصہ، ڈر، خوف، سکون، بھوک، پیاس، خوشی اور جنسی ردعمل پر شامل ہے۔ یہ یادداشت بنانے میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔

Lymbic system تین حصوں پر مشتمل ہے۔

Hypothalamus یہ ہارمونز پیدا کرتا ہے۔

Amygdala اس کے اندر نیورانز (برین سیلز) خوشی وغمی کے جذبات پیدا کرتے ہیں۔

Hippocampus لمبی یادداشت پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ Learning (سیکھنے) کے عمل میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

Cerebrum یہ دماغ کا سب سے بڑا حصہ ہے اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا جن کو رائٹ اینڈ لفٹ Cerebral Hemisphere

Right Cerebral Hemisphere

بائیں حصے کو کنٹرول کرتا ہے اور یہ تعمیری کاموں، تخیل، آرٹ اور میوزک کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

Left cerebral hemisphere دائیں حصے کو کنٹرول کرتا ہے۔ یہ زبان کو بولنے اور لکھنے میں مدد دیتا ہے۔ نیز سائنسی حساب کتاب اور تمام ٹیکنیکل کاموں کو سیکھنے میں مدد دیتا ہے۔ یہ دونوں حصے ایک دوسرے کے ساتھ مربوط (communicate) ہوتے ہیں۔

left hemisphere عام طور پر دائیں حصے پر غالب ہوتا ہے اسی لئے لوگ زیادہ تر دائیں ہاتھ سے لکھتے ہیں۔

cerebrum کے گرد 2 ملی میٹر موٹی layer ہوتی ہے اسے cerebral cortex یا grey matter کہتے ہیں۔ یہ بہت سلوٹوں (wrinkels) والی ہوتی ہے۔ یہ انسان میں ذہانت اور سوچ بچار کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔ یادداشت کا بھی اس سے گہرا تعلق ہے۔ یادداشت cerebral cortex کے مختلف حصوں میں (محفوظ) store ہو جاتی ہے۔

یہ نیورانز (برین سیلز) کے درمیان پیٹرن آف کنیکشنز کے طور پر محفوظ ہوتی ہے۔ ہر روز کے واقعات کو یاد کرنا جیسے چھٹی پر جانا، فلم دیکھنا، لمبی یادداشت اس کے ساتھ مخصوص ہے روزمرہ کے واقعات جن کو دماغ یاد رکھنا چاہتا ہے ان کو limbic system میں رکھتا ہے۔ limbic system باقاعدگی سے ان واقعات کو cortex میں بھیجتا ہے جہاں long term storage میں محفوظ ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے واقعات رات کو خوابوں کی صورت میں replay ہوتے ہیں۔

cerebrum پڑھنے، سننے، میوزک سے لطف اندوز ہونے، کسی مشکل کا حل سوچنے، درد کے احساسات اور پینٹنگ تخلیق کرتے ہوئے language سیکھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

Mid Brain

یہ دماغ کا درمیانی حصہ ہے جو قوت سماعت سے متعلقہ حصے کو کنٹرول کرتا ہے۔ یہ آنکھوں کے reflexes منعکسی حرکات کو بھی کنٹرول کرتا ہے۔ یہ raticular formation (شبیہ بننے کے عمل کو بناتی ہے) یہ forebrain اور hind brain کو بھی connect کرتا ہے۔

Hind brain

یہ دماغ کا پچھلا حصہ ہے۔ اس میں medulla pons اور cerebellum شامل ہے۔ medulla بہت سے خود بخود ہونے والے کام مثلاً دل کی دھڑکن سانس لینے کا عمل، بلڈ پریشر اور خوراک نگلنے کے افعال سرانجام دیتا ہے۔ بہت سے نیورانز جو pons میں ہوتے ہیں اور medulla کے اوپر موجود ہوتے ہیں جو سونے اور جاگنے کے درمیانی حالت میں اثر انداز ہوتے ہیں یہ سانس لینے کی شرح و رفتار کو کنٹرول کرتا ہے۔

cerebellum یہ brain stem سے اوپر موجود ہوتا ہے اور اسے چھوٹا دماغ کہتے ہیں۔ اس کی ساخت گوبھی کی طرح ہوتا ہے اس کا کام انسان کے جسمانی توازن کو برقرار رکھنا ہے۔ جسمانی حرکات میں ہم آہنگی پیدا کرنا دوڑتے اور بھاگتے وقت توازن برقرار رکھنا ہوتا ہے۔ یہ سیکھنے memory storage for behaviour میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اگر اس کو remove کر دیا جائے تو پھر بھی دماغ کام کرتا ہے مگر اس کی ہم آہنگی ڈسٹرب ہو جاتی ہے۔

cerebellum کا وقت کے ادراک سے گہرا تعلق ہے اس کا تعلق باطنی وجود یا جسم لطیف (روح) سے آنے والی اطلاعات اور حسی تحریکات sensory emotions سے ہے یہ جسم لطیف سے آنے والی اطلاعات کو لطیف طریقے سے interpret کرتا ہے جن لوگوں کی aesthetic متحرک ہوتی ہے ان میں cerebellum کا سائز چھوٹا ہوتا ہے یا اس کی ناقص کارکردگی کی صورت میں توجہ ایک نقطے پر مرکوز کرنے میں وقت پیش آتی ہے چوٹ کی صورت میں سیکھنے کی صلاحیت کم ہو جاتی ہے۔ ایسے لوگ لفظی غلطیاں کرتے ہیں وہ ہم آواز لفظوں میں فرق نہیں کر پاتے جیسے habit اور rabbit میں۔

دماغ میں چار قسم کی برقی رو مشاہدہ کی گئی ہیں بیٹا ویوز (Beta waves) الفا ویوز (Alpha waves) اور تھیٹا ویوز (Theta waves) گاما برین ویوز (Gama brain waves)

گاما ویوز نیند کی انتہائی گہری حالت میں پیدا ہوتی ہیں ان کی فریکوئنسی بڑھنے سے الفا، بیٹا اور تھیٹا میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ تھیٹا ویوز brain stem میں پیدا ہوتی ہیں۔

gama waves انتہائی لاشعوری کیفیت کی نمائندگی کرتا ہے اسے مشترک حواس یا کائناتی نگاہ کو autism جنون بھی کہتے ہیں۔

جب کسی شخص کا ذہن رویوں، ذہانت، احساسات، ردعمل طور طریقوں اور دوسری بہت سی باتوں سے متاثر ہوتا ہے تو اس کا لاشعور متحرک ہو جاتا ہے۔ ذہن کی یہ تمام صلاحیتیں ہر فرد میں مختلف ہوتی ہیں جو ہر ایک کی مختلف شخصیت (پرسنالٹی) بناتی ہیں۔

شخصیت کا دوسرا پہلو ذہانت ہے جو بہت سی چیزوں کا مجموعہ ہے جس میں کسی چیز کو یاد کرنے کی صلاحیت تخلیقی قوت، سیکھنے کی قابلیت، منصوبہ بندی، مہارت ٹھیک الفاظ کا استعمال اور کسی مسئلے کو حل کرنے کی صلاحیت شامل ہے۔ سائنسدانوں کا خیال ہے کہ ذہانت کے 120 مختلف پہلو ہیں۔

محسوسات کے بغیر دنیا بہت بے رنگ دکھائی دیتی ہے۔ حواس خمسہ اردگرد کی دنیا میں ہونے والی تبدیلیوں کو محسوس کرتے ہوئے انہیں دماغ میں بھیجتے ہیں اور اس طرح انسان مستقل طور پر گردوپیش میں ہونے والی تبدیلیوں سے آگاہ ہوتا رہتا ہے۔ کئی ملین (sensors) حسیات ایک جیسی مقدار میں جلد کے اندر مختلف انداز سے پھیلی ہوتی ہیں۔

سب سے زیادہ حسیاتی صلاحیت ہونٹوں، انگلیوں کی پوروں اور زبان میں موجود ہوتی ہیں۔

انسان کا شعوری ذہن گردوپیش کی ہر بات کی خبر رکھتا ہے لیکن یہ معلوم کرنے کے لئے کہ وہ سوتے وقت کیا کر رہا ہوتا ہے۔

E.E.G کے ذریعے سوتے ہوئے انسانی دماغ کی لہروں کا مشاہدہ کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا ہے کہ سویا ہوا شخص پہلے گہری نیند میں

گیا پھر ہلکی نیند میں گیا۔ پھر ہلکی نیند میں جسے rem کہتے ہیں جب وہ بیدار ہونے کے قریب تھا پھر وہ گہری نیند میں چلا گیا۔ ساری رات یہ عمل repeat ہوتا رہا اور rem sleep کے ساتھ یہ دورانیہ طویل ہوتا گیا۔

rem sleep میں ہی انسان خواب دیکھتا ہے سویا ہوا شخص جو مکمل طور پر بے ہوش نہیں ہوتا کیونکہ وہ کسی بھی اونچی آواز سے آسانی سے بیدار کیا جا سکتا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ

"sleep is a period of alter consiousness"

اور اس کے راستے میں Hypnoria (تحلیل نفسی) حائل ہے۔ ایک ہی جملے کے بار بار دہرانے سے انسان ٹرانس میں چلا جاتا ہے۔ جس میں اس کے ذہن کو باسانی ہدایات دی جا سکتی ہیں۔ اس عمل کے ذریعے لوگوں کے دماغی خوف کی کیفیات اور مختلف بیماریوں کی وجوہات جان کر علاج کیا جا سکتا ہے۔ انسانی دماغ کی پیچیدگیوں کو سمجھنا انتہائی مشکل کام ہے اور خاص طور اس کی باطنی خصوصیت عقل اور اس کی نیرنگیوں کو..... کسی بھی انسان کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔ عقل ایک راز ہے اور جس کا سرچشمہ صرف خدا ہے۔

☆

ڈاکٹر رابرٹ، علی موسیٰ کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے اپنے ویل فرنشیڈ ہال نما کلینک میں داخل ہوئے۔ ڈاکٹر رابرٹ کے چہرے پر حیرانگی و پریشانی کے تاثرات نمایاں تھے۔

''اٹس ریئلی ویری امیزنگ سچوئشن ...... بٹ ایوری پرابلم ہیز سلوشن (یہ بہت حیران کن صورت ہے مگر ہر مسئلے کا حل ہوتا ہے) ڈاکٹر رابرٹ نے پر امید لہجے میں کہا۔

''اسی لئے میں آپ کے پاس آیا ہوں...... وہ میرا اچھا دوست ہے...... اور میں اسے کھونا نہیں چاہتا'' علی موسیٰ نے قدرے سنجیدگی اور تاسف سے جواب دیا۔

''وہ کہاں ہے......؟'' ڈاکٹر رابرٹ نے پوچھا۔

''نیچے...... گاڑی میں......'' علی موسیٰ نے جواب دیا۔

''اکیلا......؟'' ڈاکٹر رابرٹ نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

''نہیں...... میرے ایک اور دوست کے ساتھ......'' علی موسیٰ نے کہا۔

''آپ ان کو میرے پاس لے آئیے...... میں انتظار کرتا ہوں'' ڈاکٹر رابرٹ نے کہا اور علی موسیٰ کلینک سے باہر نکل گیا اور ڈاکٹر رابرٹ اس کیس کے بارے میں سوچنے لگے۔

علی موسیٰ کو گئے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی مگر وہ ابھی تک نہیں لوٹے تھے۔ ڈاکٹر رابرٹ نے حیرت سے دیوار پر لگے کلاک کو دیکھا اور اٹھ کر کلینک کی بہت بڑی شیشے کی کھڑکی میں سے نیچے پارکنگ میں دیکھنے لگے۔ انہیں نہ تو علی موسیٰ نظر آیا اور نہ ہی کوئی اور علی موسیٰ کہاں گیا...... ؟ اس کی

خاطر میں نے آج اپنی ساری اپائنٹمنٹس کینسل کی ہیں......اور......" ڈاکٹر رابرٹ نے قدرے تشویش سے سوچا اور اپنے چہرے پر ہاتھ پھیر اور قدرے مایوسی سے سوچتے ہوئے اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئے۔ کہنی اپنے ٹیبل پر ٹکائے اور سر کو ہاتھ سے تھامے وہ گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

اچانک دروازہ کھلا اور علی موسیٰ ایک ویل ڈریسڈ آدمی کے ساتھ اندر داخل ہوا آدمی چہرے سے پڑھا لکھا، مہذب اور سلجھا ہوا شخص دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی عمر پچپن سال تھی اور آنکھوں پر سنہری فریم کی عینک لگا رکھی تھی۔ اس کی رنگت سانولی، نقوش، بھدے اور چہرے پر قدرے کرختگی تھی۔ آنکھوں میں عجیب سا اسرار تھا۔ سر کے بال قدرے گھنے تھے مگر ان میں سفیدی خصوصی طور پر نمایاں تھی۔ بلیک کلر کے تھری پیس سوٹ کے ساتھ سفید شرٹ اور میرون ٹائی میں وہ قدرے مہذب لگ رہا تھا۔

ڈاکٹر رابرٹ نے علی موسیٰ اور پھر اس شخص کی جانب استفہامیہ انداز میں دیکھا۔ علی موسیٰ کے چہرے پر تھکن اور پریشانی کے تاثرات نمایاں تھے اور آنکھوں میں بے چینی اور بے زاری تھی۔ ڈاکٹر رابرٹ نے ان تاثرات سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے ان سے کسی قسم کا سوال نہ کیا اور اس شخص کی جانب دیکھتے ہوئے قدرے پرتپاک انداز میں کھڑے ہو کر اس کا خیر مقدم کیا۔

"ویلکم......ڈاکٹر دانش......" ڈاکٹر رابرٹ نے اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے اور اس کی جانب بڑھ کر اپنا ہاتھ مصافحے کے لئے بڑھاتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر دانش نے مسکرا کر ڈاکٹر رابرٹ سے ہاتھ ملایا۔

"آیئے تشریف رکھیے......" ڈاکٹر رابرٹ نے کلینک کی ایک جانب انتہائی آرام دہ صوفے کی جانب اشارہ کیا، تینوں مختلف اطراف میں رکھے صوفوں پر بیٹھ گئے۔

"آپ لوگ کیا لیں گے......چائے یا کافی......؟" ڈاکٹر رابرٹ نے دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کافی......" علی موسیٰ نے ڈاکٹر دانش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اوکے......" ڈاکٹر رابرٹ نے اپنی ٹیبل پر رکھے انٹرکام پر کافی کا آرڈر دیا اور ان کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔

"ڈاکٹر دانش......میں آپ کی achievements کے بارے میں سن کر بہت خوش ہوا ہوں......یو......آر......اے جینئس رئیلی کا ڈگنفڈ......" ڈاکٹر رابرٹ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کونسی achievements......؟" ڈاکٹر دانش نے حیرت سے پوچھا تو ڈاکٹر رابرٹ نے علی موسیٰ کی طرف گہری نگاہوں سے دیکھا اور گہری سانس لی اور تینوں خاموش ہو گئے۔ ڈاکٹر رابرٹ کی نظریں مسلسل ڈاکٹر دانش کے چہرے پر تھیں اور وہ پر تجسس انداز میں ڈاکٹر دانش کے چہرے کا جائزہ لے رہے تھے جبکہ ڈاکٹر دانش ٹیبل پر پڑے کرسٹل باؤل میں رنگ برنگی beads (موتی) گننے میں مصروف تھے۔ شیف ٹرالی میں کافی لایا اور سب کے سامنے کافی کے کپ رکھے اور باہر چلا گیا۔

باہر موسم خاصا سرد ہو رہا تھا۔ کمرہ قدرے پرسکون اور گرم تھا۔ گرم بھاپ اڑاتی ہوئی کافی کی خوشبو دماغ کو مسرور کرنے لگی۔ علی موسیٰ نے

ڈاکٹر دانش کے کہنے پر کافی کا کپ پکڑا اور اسے آہستہ آہستہ پینے لگے۔ ڈاکٹر دانش کافی کی طرف بغور دیکھنے لگے اور شوگر بیگ کپ میں ڈال کر ایک چمچ سے ہلاتے ہوئے اس کی جانب بغور دیکھنے لگے اور آہستہ آہستہ سپ لینے لگے اچانک باہر سڑک پر پولیس وین کے سائرن کی تیز آواز سن کر تینوں چونکے اور سب نے سڑک کی طرف کھلنے والی کھڑکی کی جانب دیکھا۔ ڈاکٹر دانش کا ہاتھ کپکپایا اور انہیں زور سے جھٹکا لگا تو ہاتھ کی جنبش سے کرسٹل باؤل فرش پر گر گیا جو سفید چمکتی ہوئی ٹائلز سے بنا تھا۔

''اوہ.....'' ڈاکٹر دانش نے قدرے تاسف سے کہا اور فرش پر بکھرے اور پھسلتے موتیوں کو دیکھنے لگے جو سفید ٹائلوں پر تیزی سے ادھر ادھر پھیلتے چلے جا رہے تھے اور ٹائلز کی ہمواری اور پھسلن کی وجہ سے کہیں ٹھہر ہی نہیں رہے تھے۔

''کوئی بات نہیں.....آپ انہیں چھوڑیں'' ڈاکٹر رابرٹ نے کہا۔

''نہیں.....'' اور وہ پنجوں کے بل فرش پر بیٹھ کر رنگ برنگی موتیوں کو اکٹھے کرنے لگے۔ ڈاکٹر رابرٹ اور علی موسیٰ حیرت سے انہیں دیکھنے لگے۔

''ڈاکٹر دانش..... پلیز ڈونٹ ڈوات..... آپ..... آپ ایک جینئس سائنٹسٹ (سائنسدان) ہیں اور یوں'' ڈاکٹر رابرٹ نے قدرے گھبرا کر کہا۔

''نو..... آئی..... ایم ناٹ'' اور کبھی گھٹنوں کے بل اور کبھی پنجوں کے بل رینگ رینگ کر موتی اکٹھے کرتے اور انہیں ہاتھ میں پکڑی باؤل میں ڈالتے رہے۔

''علی موسیٰ.....ان دانوں کو کاؤنٹ (گنتی) کریں.....'' ان کو پچاس ہونا چاہیے.....میرا خیال ہے یہ پینتالیس ہیں، پانچ ادھر ہی کہیں ہوں گے'' ڈاکٹر دانش نے باؤل علی موسیٰ کو پکڑایا اور خود صوفے کے پاس قدرے لیٹ کر اس کے نیچے لمبا ہاتھ مار کر دانے ڈھونڈنے لگے۔

علی موسیٰ نے مایوسی سے ڈاکٹر رابرٹ کی جانب دیکھا اور ہاتھ میں رکھے موتیوں کو آنکھوں ہی آنکھوں میں بغور دیکھتے ہوئے کاؤنٹ کرنے لگے۔ وہ واقعی ہی پینتالیس تھے۔ ڈاکٹر دانش کبھی صوفے کے نیچے بقیہ دانوں کو تلاش کر رہے تھے کبھی ٹیبل کے نیچے..... پنجوں اور گھٹنوں کے بل چلتے ہوئے ان کی ٹائی مسلسل فرش سے ٹکرا رہی تھی اور وہ کسی پالتو جانور کی مانند ادھر ادھر موتیوں کو تلاش کر رہے تھے۔ بہت مشکل سے وہ پانچ موتیوں کو اکٹھا کر کے لائے اور انتہائی خوشی سے علی موسیٰ کے سامنے ٹیبل پر رکھے باؤل میں دانے ڈالے اور انتہائی خوشی سے اپنے ہاتھوں سے تالیاں بجانے لگے۔

''یہ ٹارگٹ بھی پورا ہو گیا'' وہ بچوں کی طرح بھرپور قہقہہ لگا کر بولے اور کافی کا کپ ہاتھ میں پکڑا۔

''اوہ..... یہ تو ٹھنڈی ہو گئی ہے'' ڈاکٹر دانش نے منہ بنا کر کہا۔

''کوئی بات نہیں..... میں اور منگواتا ہوں..... گرم کافی'' ڈاکٹر رابرٹ نے کہا۔

''اوہ..... نو..... آئی ڈونٹ لائک کافی..... میں نے کبھی کافی نہیں پی'' ڈاکٹر دانش نے بے زاری سے کہا تو علی موسیٰ نے چونک کر ان کی جانب دیکھا جو کافی کے سپ کو کبھی ختم نہیں ہونے دیتے تھے۔

ڈاکٹر دانش کی اس ایکٹیوٹی کے دوران علی موسیٰ اور ڈاکٹر رابرٹ نے بھی کافی نہیں پی تھی اور تینوں کے کپ ویسے ہی ان کے سامنے پڑے تھے۔علی موسیٰ اور ڈاکٹر رابرٹ کے چہروں پر گہری سنجیدگی چھائی تھی۔یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ڈاکٹر دانش کی حالت پر انہیں شدید دکھ ہو رہا ہو۔دونوں خاموش تھے اور ڈاکٹر دانش ان کی طرف نکھیوں سے دیکھتے اور شرما کر یوں دیکھتے جیسے کوئی شرارتی بچہ اپنے سے کسی بڑی عمر کے شخص کو دیکھ کر شرماتا ہوا ہنس رہا ہو۔

''ڈاکٹر دانش......آپ......؟''ڈاکٹر رابرٹ نے اپنے موڈ کو قدرے تبدیل کرتے ہوئے ڈاکٹر دانش کو مخاطب کرنا چاہا۔

''میں......میں ڈاکٹر دانش نہیں ہوں......میں تو......میں تو......''وہ ہاتھ کی انگلی اپنی دائیں کنپٹی پر رکھ کر سوچنے لگے۔

''میں کیا ہوں......؟''وہ بڑبڑائے۔

''ہاں......یاد آیا......میں تو 'ہمپٹی' ہوں''وہ ایک دم خوشی سے ہنستے ہوئے بولے اور بے ہنگم قہقہے لگانے لگے۔

''ہمپٹی......کون ہمپٹی......؟''ڈاکٹر رابرٹ نے حیرت سے پوچھا۔

آپ مجھے نہیں جانتے......ہمپٹی کو نہیں جانتے......سرکس میں سب مجھے ہمپٹی ہی کہتے ہیں۔میں سرکس میں جوکر ہوں clown......رنگ ماسٹر ڈیمٹی......مجھے بہت پیار کرتا ہے۔جب میں سرکس میں شو کرتا ہوں لوگ بہت تالیاں بجاتے ہیں......ایسے......اور ڈاکٹر دانش زور زور سے تالیاں بجاتے ہوئے ادھر ادھر گھومنے لگے۔ان کے چہرے پر انتہائی خوشی کے تاثرات تھے۔انہیں بالکل بھی ہوش نہیں تھا کہ ان کے بال کتنے بے ترتیب ہو گئے تھے اور ان کی ٹائی بالکل پیچھے جا چکی تھی۔دو گھنٹے پہلے کلینک میں آنے والا شخص قدرے مہذب لگ رہا تھا اور اب بالکل اس سے مختلف......واقعی جوکر اور پاگل دکھائی دے رہا تھا۔

میں سرکس میں جب clown cap ریڈ اور وائٹ کوٹ پہن کر آتا ہوں تو بچے خوشی سے چلانے لگتے ہیں۔میری طرف گفٹس پھینکتے ہیں اور ہر طرف ہمپٹی......ہمپٹی کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔میں ایک swing سے دوسرے swing تک ہوا میں یوں move کرتا ہوں اور اس نے اپنے دونوں پاؤں سے جوتے اتارے......ہاتھ اٹھا کر ایک صوفے سے دوسرے صوفے پر جمپ لگانے لگا اور اس لمحے وہ بہت خوش تھا۔عجیب انداز میں قہقہے لگا رہا تھا۔بے تحاشا ہنس رہا تھا ڈاکٹر رابرٹ اور علی موسیٰ اس کی جانب حیرت سے دیکھتے چلے جا رہے تھے مگر بہت خاموش تھے۔وہ پورے کلینک کو سرکس کا رنگ سمجھ کر چھلانگیں لگا رہا تھا۔کبھی فرش پر قلابازیاں کھانے لگتا،کبھی ڈانس کرنے لگتا اپنے منہ سے موسیقی کی مختلف دھنیں نکالتا۔خوش ہو کر سیٹیاں بجاتا اور وہ ایسا کرتے ہوئے خوب لطف اٹھا رہا تھا۔پندرہ منٹ تک وہ یونہی مختلف کرتب دکھاتا رہا اور پھر بے دم ہو کر صوفے پر بیٹھ گیا۔اس کے چہرے پر تھکاوٹ کے آثار نمایاں ہونے لگے۔وہ اپنے ہاتھ سے سر کو دبانے لگا یوں جیسے اسے سر میں درد محسوس ہو رہا ہو۔

ڈاکٹر رابرٹ اور علی موسیٰ بغور اس کے چہرے کی جانب دیکھتے رہے۔ڈاکٹر دانش نے آنکھیں بند کیں اور صوفے کی پشت کے ساتھ سر ٹکا دیا۔

علی موسیٰ نے حیرت اور تشویش سے ڈاکٹر رابرٹ کی جانب دیکھا۔علی موسیٰ کی آنکھوں میں ان گنت سوالات تھے۔وہ بہت کچھ پوچھنا چاہ رہا تھا اور جیسے ہی کچھ پوچھنے کے لئے لب کھولے تو ڈاکٹر دانش آنکھیں کھول کر ڈاکٹر رابرٹ اور علی موسیٰ کی جانب دیکھنے لگے۔

''آئی ایم سوری...... شاید میں سو رہا تھا'' ڈاکٹر دانش نے گلا کھنکارتے ہوئے کہا اور اپنے ہاتھ سے اپنے بالوں کو ٹھیک کیا، کھڑے ہو کر ٹائی اور اپنے ڈریس کو درست کیا اور اپنے آپ کو نارمل کرتے ہوئے ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ شاید میرے سونے کی وجہ سے آپ لوگوں نے بھی کافی نہیں پی۔ کیا گرم کافی کا ایک کپ مل سکتا ہے؟'' ڈاکٹر دانش نے ڈاکٹر رابرٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''Sure......'' ڈاکٹر رابرٹ مسکرا کر اپنی سیٹ سے اٹھتے ہوئے بولے اور انٹرکام پر دوبارہ کافی کا آرڈر دیا۔

تھوڑی دیر بعد شیف گرم کافی لے آیا اور تینوں فریش کافی پینے لگے۔ تینوں خاموش تھے۔ ڈاکٹر رابرٹ منتظر نگاہوں سے ڈاکٹر دانش کی جانب دیکھ رہا تھا۔ یہ جاننے کے لئے کہ وہ اب کس ٹرانس میں تھا۔

''ڈاکٹر دانش...... آئی ایم پراؤڈ آف یور اچیومنٹس (کامیابیوں)'' ڈاکٹر رابرٹ نے قدرے توقف کے بعد ڈاکٹر دانش کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... کامیابیوں کا ایک وقت ہوتا ہے...... اور اس کے بعد......'' ڈاکٹر دانش نے قدرے منطقی انداز میں کہہ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

ڈاکٹر رابرٹ نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

''اور...... اس کے...... بعد...... کیا ہوتا ہے؟'' ڈاکٹر رابرٹ نے حیرت سے پوچھا۔

''اس کے بعد...... دنیا خالی ہو جاتی ہے...... اس کے پاس انسان کو دینے کے لئے کچھ نہیں رہتا...... ہر طرف nothingness چھا جاتی ہے'' ڈاکٹر دانش نے آہ بھر کر انتہائی سنجیدگی سے جواب دیا۔

''ڈاکٹر دانش...... آپ سے ملنے کی مجھے شدید خواہش تھی...... اور مجھے یقین نہیں آ رہا...... کہ آپ جیسا عظیم سائنسدان آج میرے سامنے...... میرے کلینک میں ہوگا'' ڈاکٹر رابرٹ نے اس کے موڈ کو بدلنے کے لئے مسکرا کر کہا۔

''آپ کون ہیں......؟'' ڈاکٹر دانش نے حیرت سے پوچھا۔

''میں...... میں...... ڈاکٹر رابرٹ ہوں'' ڈاکٹر رابرٹ نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''یہ میرے بہت قریبی دوست ہیں...... آج میں ان سے ملنے آیا تو آپ کے بارے میں بتایا تو یہ چونک گئے اور آپ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی'' علی موسیٰ نے جلدی سے جواب دیا۔

''آئی...... سی...... نائس ٹو میٹ یو ڈاکٹر رابرٹ'' ڈاکٹر دانش نے کھڑے ہو کر ڈاکٹر رابرٹ سے ہاتھ ملایا۔

''تھینک یو......'' دونوں مسکرانے لگے۔

''ڈاکٹر دانش...... آپ نے نیورالوجی کی فیلڈ میں بہت شہرت حاصل کی ہے۔ میں نے وہ پیپرز پڑھے ہیں میں آپ کی ریسرچ اور ذہانت سے بہت متاثر ہوا ہوں بلکہ بہت متاثر ہوا ہوں۔ اتنی عقل، ذہانت اور علم سے خدا بہت کم لوگوں کو نوازتا ہے۔ آپ دنیا کے خوش قسمت ترین انسانوں میں سے ایک ہیں جن کو خدا نے اتنی بڑی کامیابیوں سے نوازا ہے'' آپ کو کامیابیوں کا یہ سفر کیسا لگا؟ ڈاکٹر رابرٹ نے بھرپور انداز میں ڈاکٹر دانش کی تعریف کرتے ہوئے سوال کیا۔

''ڈاکٹر......آپ کے سر کے بال کہاں گئے؟''ڈاکٹر دانش نے ڈاکٹر رابرٹ کے گنجے سر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''ک......ک......کیا؟''ڈاکٹر رابرٹ نے قدرے کھسیا کر پوچھا۔ان کے چہرے پر شرمندگی کے تاثرات نمایاں ہونے لگے۔

''ڈاکٹر رابرٹ آپ شرمندہ مت ہوں......آپ نے جو سوال پوچھا ہے......اس کا یہ جواب ہے، آپ کے بال بہت جلدی اڑ گئے......میری کامیابیوں کی طرح......کسی چیز کو پانے میں بہت اسٹرگل (جدوجہد) کرنی پڑتی ہے اور کھونے میں چند سال......شاید چند ماہ......یا پھر چند دن''ڈاکٹر دانش نے انتہائی سنجیدگی سے منطقی انداز میں جواب دیا تو ڈاکٹر رابرٹ اور علی موسیٰ نے گہری سانسیں لے کر قدرے تعریفی انداز میں ڈاکٹر دانش کی جانب دیکھا۔

''ڈاکٹر دانش......آپ واقعی ہی بہت جینئس ہیں''ڈاکٹر رابرٹ نے کہا۔

''ہاں......پیرنٹس نے اسی لئے میرا نام 'دانش' رکھا تھا''ڈاکٹر دانش نے قدرے خوشگوار موڈ میں مسکراتے ہوئے کہا۔آپ کے پیرنٹس (والدین) کہاں ہیں؟ڈاکٹر رابرٹ نے پوچھا۔

''کھو گئے......''ڈاکٹر دانش نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''کہاں......؟''ڈاکٹر رابرٹ نے چونک کر پوچھا۔

''معلوم نہیں''ڈاکٹر دانش نے مایوسی سے جواب دیا۔

''یہ کیسے ممکن ہے......کہ......آپ کو......ان کی کوئی خبر نہ ہو''ڈاکٹر رابرٹ نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

ڈاکٹر دانش نے ڈاکٹر رابرٹ کی جانب غور سے دیکھا اور اس کی آنکھوں میں بے یقینی دیکھ کر اپنے کوٹ کی جیب میں سے پارکر کا قیمتی اور نفیس پن نکال کر اسے فرش پر رکھا اور اپنے پاؤں کی ٹھوکر سے اسے لڑھکا دیا۔پن تیزی سے لڑھکتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ڈاکٹر رابرٹ اور علی موسیٰ حیرت سے ڈاکٹر دانش کی طرف دیکھنے لگے۔

''وہ بھی اس پن کی طرح کہیں کھو گئے ہیں......اس دنیا میں موجود ہیں......مگر اس پن کی طرح کہاں کھو گئے ہیں، معلوم نہیں''ڈاکٹر دانش نے جواب دیا۔

''کیا آپ نے ان کو تلاش نہیں کیا؟''ڈاکٹر رابرٹ نے پوچھا۔

''ڈاکٹر......کیا باہر کوئی ایکسیڈنٹ ہوا ہے......پولیس وین کے ہوٹرز کی آواز سنائی دے رہی ہے''ڈاکٹر دانش نے ڈاکٹر رابرٹ کی توجہ ہٹانے کی خاطر سڑک پر شور مچاتی ہارن بجاتی پولیس وین کے بارے میں کہا۔

''شاید......''ڈاکٹر رابرٹ نے جواب دیا۔

''علی موسیٰ......آئی ایم تائرڈ......اپنے فلیٹ میں واپس جانا چاہتا ہوں......کیا تم میرے ساتھ نہیں چلو گے؟''ڈاکٹر دانش نے علی موسیٰ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... میں آپ کے ساتھ ہی چلتا ہوں...... لیکن......'' علی موسیٰ کچھ کہتے ہوئے رکا۔

''ٹھیک ہے...... میں گاڑی میں جا کر بیٹھتا ہوں...... تم آجانا''

''تھینک یو...... ڈاکٹر رابرٹ...... یو...... آر...... اے نائس مین'' ڈاکٹر دانش اس سے مصافحہ کر کے بنا کچھ کہے سے باہر نکل گیا۔

''ڈاکٹر رابرٹ...... یہ...... سب کیا ہے......؟ ڈاکٹر دانش تو بالکل ابنارملز کی طرح بی ہیو کر رہے تھے۔ کیا وہ واقعی پاگل ہو رہے ہیں؟''

علی موسیٰ نے حیرت سے پوچھا۔

''آپ...... ڈاکٹر دانش کو کب سے جانتے ہیں؟'' ڈاکٹر رابرٹ نے علی موسیٰ کے سوال کا جواب دیئے بغیر کہا۔

''گزشتہ چند ماہ سے...... ہم دونوں نے ایک اپارٹمنٹ شیئر کیا ہے...... میرا تعلق جورڈن (اردن) سے ہے اور یہاں جاب کے سلسلے میں آیا ہوں...... ڈاکٹر دانش اس اپارٹمنٹ کے مالک ہیں جہاں میں رہ رہا ہوں۔ ڈاکٹر دانش از ریئلی سِک Sick...... وہ بہت بے بسی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کی لائف میں کوئی ہوپ نہیں وہ اکثر مرنے کی باتیں کرتے ہیں۔ میں ایک کمپنی میں بطور آرکیٹیکٹ جاب کرتا ہوں، رات کو واپس آتا ہوں تو ڈاکٹر دانش کی باتیں سن کر مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔ انسانیت کے ناتے میں انہیں آپ کے پاس لایا ہوں۔ آپ ایک اچھے سائیکاٹرسٹ ہیں۔ آپ کا بہت نام ہے، مجھے کئی روز سے محسوس ہونے لگا تھا کہ ڈاکٹر دانش کو کسی اچھے سائیکاٹرسٹ کی ضرورت ہے...... پلیز آپ ان کی مدد کریں'' علی موسیٰ نے افسردگی سے کہا۔

''ینگ مین...... گاڈ نے انسان کو دوسرے انسان کی صورت میں بہت بڑی نعمت اور تحفے سے نوازا ہے۔ جب کوئی انسان بغیر کسی لالچ...... اور غرض کے دوسرے انسان کے لئے دکھ، درد اور محبت محسوس کرتا ہے...... اور اس کی تکلیف کم کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس سے بڑھ کر اس انسان کے لئے اور کیا تحفہ ہوگا...... ڈونٹ وری...... میں ان کی پرابلم حل کرنے کی پوری کوشش کروں گا......'' ڈاکٹر رابرٹ نے علی موسیٰ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''تھینک یو ڈاکٹر......'' علی موسیٰ نے مسکرا کر جواب دیا۔

''پلیز...... مجھے ڈاکٹر دانش کے بارے میں تمام معلومات فراہم کرنے کی کوشش کریں، آئی مین...... ان کے فیملی بیک گراؤنڈ اور ان کے پرابلم اینڈ کومپلیکسز کے بارے میں...... ان فیکٹ یہ انسان کے اندر کے کومپلیکسز اور دماغ کے اندر کونفلیکٹ (کشمکش) ہوتی ہے جو نفسیاتی بیماریوں کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں۔ باتوں باتوں میں ڈاکٹر دانش کے اندر موجود کونفلیکٹ ایریاز کو چیک کرنے کی کوشش کریں'' ڈاکٹر رابرٹ نے علی موسیٰ کو کہا تو وہ توجہ سے ان کی باتیں اور ہدایات سننے لگا۔

''گڈ لک...... میں ڈاکٹر دانش کے ساتھ ایک اور میٹنگ کرنا چاہوں گا لیکن اس دوران آپ ان کی ساری حرکات کو نوٹ کر کے مجھے انفارم کریں'' ڈاکٹر رابرٹ نے اسے رخصت کرتے ہوئے کہا تو علی موسیٰ ان کا شکریہ ادا کرتا ہوا باہر نکل آیا۔

☆

''اماں...... کیا آپ نے عاصم کو کھانا کھلایا ہے؟'' فریحہ نے شام کو گھر داخل ہوتے ہوئے ادھیڑ عمر ملازمہ سے پہلا سوال کیا۔

''ہاں...... بہت مشکل سے......'' ملازمہ نے بیزاری سے جواب دیا۔

''کیوں......؟'' فریحہ نے حیرت سے پوچھا۔

''بی بی...... اب وہ جوان ہو رہا ہے...... بہت تنگ کرنے لگا ہے...... میرے قابو میں نہیں آتا۔ آپ اس کے لئے کوئی اور ملازمہ تلاش کریں...... میری بوڑھی ہڈیوں میں اب اسے سنبھالنے کی طاقت نہیں...... آپ میرا حساب چکتا کریں......'' اماں قدرے خفگی سے منہ بنا کر بولی۔

''اماں...... آج آپ کو کیا ہو گیا ہے...... آپ نے پہلے تو کبھی ایسی بات نہیں کی'' فریحہ نے اماں کی طرف بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''بی بی...... وہ پہلے اتنا تنگ بھی تو نہیں کرتا تھا، کھانا کھلانے بیٹھو تو اتنے زور سے ہاتھ پاؤں مارتا ہے کہ قابو میں نہیں آتا...... آج تو اس نے سارا سالن بھی میرے اوپر گرا دیا اور پانی بھی...... بڑی مشکل سے اسے سلایا ہے'' اماں قدرے تلخی سے بولی۔

''اماں...... میں سب سمجھتی ہوں اور آپ کی بہت شکر گزار بھی ہوں۔ اگر آپ نہیں ہوتیں تو شاید میں اتنی بے فکر ہو کر نوکری پر بھی نہ جا سکتی، اماں...... آپ نے میرا بہت ساتھ دیا ہے اتنے مشکل وقت میں...... جب میرے اپنے میرا ساتھ چھوڑ گئے ہیں۔ آپ میرے لئے آسرا بنی رہی ہیں...... میں جانتی ہوں عاصم اب بہت تنگ کرنے لگا ہے مگر آپ ہی بتایئے میں کیا کروں۔ کیا میں اسے کہیں پھینک سکتی ہوں...... کہیں چھوڑ سکتی ہوں'' فریحہ کی آنکھیں برسنے لگیں تو اماں کا دل پسیجنے لگا۔

''بی بی...... میرا یہ مطلب (مطلب) نہیں تھا۔ میں تمہیں دکھی تو نہیں کرنا چاہتی...... مگر...... میں بھی کیا کروں...... بی بی...... اب وہ بچہ نہیں رہا، بڑا ہو رہا ہے اس کے لئے کسی مرد کو نوکر رکھو...... میں بڑھیا کہاں تک اسے سنبھالوں، کبھی کبھار تو میرے اوپر ہی گر جاتا ہے...... سارے کا سارا...... مولا کے رنگ ہیں...... سارا جسم ٹھیک ٹھاک ہے...... بس دماغ میں ہی کوئی کسر رہ گئی ہے اور بیچارہ سب کا محتاج ہو گیا ہے'' اماں نے تاسف سے کہا تو فریحہ نے گہری سانس لی اور اماں کی طرف بغور دیکھنے لگی۔

''اماں...... اگر آپ کو کسی ملازم لڑکے کا بندوبست کر دوں پھر تو آپ ہمیں چھوڑ کر نہیں جائیں گی نا'' فریحہ نے پر امید لہجے میں کہا۔

''ہاں...... پھر...... میں رک جاؤں گی...... بی بی...... مجھے تجھ سے پیار بھی تو بڑا ہے...... جب میں یہاں آئی تھی...... بابا پانچ سال کا تھا اور اب وہ سولہ برس کا ہو گیا ہے......'' اماں نے کہا۔

''ہاں...... اماں...... وقت تو گزر گیا ہے مگر اس کی سب تلخیاں مجھے یاد ہیں...... شاید وقت سے وابستہ اچھی بری یادیں گزرے وقت کو کبھی بھولنے نہیں دیتیں'' فریحہ نے افسردگی سے کہا۔

''بی بی...... تیرا بڑا حوصلہ ہے...... اپنی ساری جوانی...... اس معذور بچے کے ساتھ گزار دی......'' اماں نے ہمدردی سے کہا۔

''اس کی ماں...... جو...... ہوں'' فریحہ نے نم آنکھوں سے جواب دیا۔

''باپ کی بھی تو کوئی ذمہ داری ہوتی ہے نا...... اس نے تو کبھی اس کی خبر ہی نہیں لی'' اماں نے کہا۔

"اماں..... وہ اسے اپنی اولاد سمجھے تو پھر ہے نا..... جو شخص یہ ماننے سے ہی انکار کردے کہ اس جیسے عقلمند اور قابل شخص کے ہاں کبھی ایسا بچہ پیدا نہیں ہوسکتا جو ذہنی طور پر معذور ہو..... تو وہ کیسی ذمہ داریاں سمجھے گا..... اور انہیں کیسے نبھائے گا" فریحہ نے آہ بھر کر جواب دیا۔

"بی بی..... یہ تو خدا کی خدائی میں حصہ ڈالنے والی بات ہے، کوئی اللہ کا بندہ ایسی بات نہیں کرسکتا" اماں نے حیرت سے کہا۔

"اماں..... جب اللہ انسان کو اس کی اوقات سے زیادہ نعمتوں سے نوازتا ہے تو وہ اپنے آپ کو ہی خدا سمجھنے لگتا ہے اور دوسرے انسان اسے زمین پر رینگنے والے کیڑے مکوڑے نظر آنے لگتے ہیں..... وہ بھی ایسا ہی انسان تھا..... اسے اپنے سوا کوئی اور نظر ہی نہیں آتا تھا..... ہر کوئی اس سے کمتر تھا..... ہر ایک اس کے سامنے صفر تھا" فریحہ مایوسی سے خلا میں گھورتے ہوئے بولی۔

"بی بی..... ایسے بندے کے ساتھ گزارا کرنا بڑا ہی مشکل ہو جاتا ہے..... تو نے کیوں ایسے مرد سے شادی کی؟" اماں نے پوچھا۔

"اماں..... قسمت سے بارے انسان کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا..... وہ کیا تھا..... ؟ مجھے شادی کے بعد پتہ چلا..... پھر..... میرے پاس کوئی راستہ نہ رہا" فریحہ کی آنکھیں پھر نم ہونے لگیں۔

"بی بی..... کھانا لاؤں؟" اماں نے پوچھا۔

"نہیں..... ابھی بھوک نہیں..... چائے کا ایک کپ لے آیئے" فریحہ نے کہا تو اماں اٹھ کر کچن میں چلی گئی اور فریحہ اٹھ کر عاصم کے کمرے میں گئی۔ وہ گہری نیند سو رہا تھا۔

فریحہ اس کے پاس بیٹھ گئی اور اس کی جانب بغور دیکھنے لگی۔ وہ انتہائی صحت مند اور جوان لگ رہا تھا۔ چہرے پر معصومیت تھی۔ مونچھیں رفتہ رفتہ گھنی ہونے لگی تھیں۔ سر کے بال بھی گھنے سیاہ تھے مگر فریحہ ہمیشہ انہیں بہت چھوٹا کروا دیتی تھی کیونکہ وہ غصے میں اپنے سر کے بالوں کو بہت بری طرح نوچتا تھا اور اکثر بالوں کی لٹیں اس کے ہاتھ میں آجاتی تھیں انہیں دیکھ کر فریحہ دکھی ہو جاتی تھی مگر عاصم کو اس تکلیف کا ذرا بھی احساس نہیں ہوتا تھا۔ وہ سویا ہوا بالکل ٹھیک لگ رہا تھا۔ اس کے سارے اعضا ٹھیک تھے سوائے دماغ کے..... ڈاکٹروں کو اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی تھی اور وہ کسی حتمی نتیجے تک نہیں پہنچ پائے تھے..... مگر وہ خود اس کی وجہ جانتی تھی..... وہ نم آنکھوں سے عاصم کی جانب دیکھتی رہی اور اس کے جوان، صحت مند مگر بے کار جسم کو دیکھ کر خون کے آنسو پیتی رہی۔

"بی بی..... چائے پی لو..... میں نے باہر میز پر رکھی ہے" اماں نے کمرے میں اس کے پیچھے آکر کہا تو فریحہ اپنی آنکھوں کو صاف کرتی ہوئی لاؤنج میں چلی گئی۔ فریحہ کے چہرے پر انتہائی دکھ اور افسردگی کے تاثرات تھے۔ وہ خاموشی سے چائے پی رہی تھی اور کسی گہری سوچ میں گم تھی۔

"بی بی..... تم نے اپنے شوہر سے طلاق بھی نہیں لی..... پھر اسے کیوں نہیں کہتی کہ وہ بچے کی ذمہ داری اٹھائے..... سارا دن ماری ماری پھرتی ہو..... نوکری کرتی ہو..... بچے کو سنبھالتی ہو..... اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو اس بچے کو کون سنبھالے گا..... کیا تم نے کبھی اس بارے میں سوچا ہے؟" اماں نے اس کے قریب کارپٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اماں..... ہر وقت یہی تو سوچتی رہتی ہوں..... اور اسی لئے تو اس سے طلاق نہیں لی..... کہ..... شاید اسے کبھی خیال آجائے اور وہ اسے

اپنی اولاد سمجھ لے" فریحہ نے آہ بھر کر کہا۔

"تم دونوں میں جھگڑا کس بات پر ہے...... وہ کہتا کیا ہے......؟ عجیب سر پھرا شخص ہے......" اماں قدرے خفگی سے بولی۔

"اماں...... ہم دونوں میں بہت اختلافات تھے...... مگر آپ ان باتوں کو نہیں سمجھ سکیں گی" فریحہ نے آہ بھر کر جواب دیا۔

"کیوں......؟ وہ دنیا کا انوکھا انسان تھا...... جس کی باتیں میں سمجھ نہیں سکوں گی" اماں غصے سے بولی۔

"ہاں...... وہ اپنے آپ کو دنیا کا سب سے انوکھا اور منفرد انسان سمجھتا تھا...... بہت قابل اور ذہین شخص تھا...... مگر......" فریحہ کچھ کہتے ہوئے رکی۔

"وہ بہت مشکل انسان تھا...... میری ہر بات سے الٹا مطلب نکالتا تھا۔ سیدھی بات کو بھی توڑ مروڑ کر یوں بیان کرتا تھا کہ میں پریشان ہو جاتی تھی...... وہ مجھے ذہنی طور پر بہت پریشان کرتا تھا...... مجھے ہر بات میں نیچا دکھانے کی کوشش کرتا تھا...... میں نے اس کے ساتھ شادی کے تین سال انتہائی اذیت میں گزارے تھے" فریحہ آہ بھر کر بولی اور اس کی آنکھوں کی نمی میں اضافہ ہونے لگا۔

"وہ ایسا کیوں کرتا تھا......؟" اماں نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ کومپلیکسڈ انسان تھا" فریحہ نے بے خیالی میں جواب دیا۔

"کیسا انسان تھا......؟" اماں نے حیرت سے پوچھا۔

"اسے اپنی عقل اور ذہانت پر بڑا مان تھا۔ وہ اپنے جیسا کسی کو نہیں سمجھتا تھا۔ میں اس کے سامنے بہت کم عقل اور بے وقوف تھی۔ وہ نہ تو میری کسی غلطی کو معاف کرتا تھا اور نہ ہی میری کسی بات کو اس میں سے کچھ نکالے بغیر جانے دیتا تھا...... اگر میں خاموش رہتی تھی تو اس سے بھی چڑتا تھا۔ بات کرتی تھی تو کٹہرے میں کھڑی ہو جاتی تھی۔ بحث کرتی تھی تو آپے سے باہر ہو جاتا تھا۔ ناراض ہوتی تھی تو طنز شروع کر دیتا تھا...... اف میں بتا نہیں سکتی...... اماں...... کہ وہ کیسا انسان تھا...... اسی لئے تو عاصم ایسا پیدا ہوا تھا...... ڈاکٹر کہتے تھے کہ میں شدید ذہنی دباؤ میں رہتی تھی اور اس کا اثر عاصم پر ہو گیا...... اور جانتی ہو...... اماں...... وہ مجھے کیا طعنے دیتا تھا......؟" وہ زخمی مسکراہٹ سے بولی۔

"کیا......؟" اماں نے حیرت سے پوچھا۔

"کہتا تھا...... کہ میں کند ذہن، کم عقل اور بے وقوف ہوں، اس لئے ایسا بچہ پیدا کیا...... اس نے کبھی اس بات کو مانا ہی نہیں کہ اس نے مجھے کبھی کسی دباؤ میں رکھا یا ذہنی اذیت دی...... اس کے نزدیک تو میں دنیا کی خوش قسمت ترین عورت تھی...... کہ...... میں اس کی بیوی تھی اور مجھے ہر وقت اس کا شکر گزار رہنا چاہیے تھا کہ اس نے مجھے اپنی بیوی بنانے کے قابل سمجھا تھا" فریحہ نے آہ بھر کر کہا۔

"بی بی...... مجھے تو واقعی اس کی باتیں سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں...... عجیب احمق انسان تھا" اماں نے ناک چڑھا کر غصے سے کہا۔

"احمق نہیں...... عقلمند...... دانشمند...... اور بے مثال" وہ آہستہ آہستہ بڑبڑائی۔

اچانک کسی شے کے فرش پر گرنے کی آواز سنائی دی۔ دونوں نے چونک کر عاصم کے کمرے کی جانب دیکھا اور بھاگتی ہوئی عاصم کے

کمرے میں گئیں۔ عاصم فرش پر گرا پڑا تھا۔ شاید اس نے سوتے ہوئے کروٹ لی اور فرش پر گر گیا تھا۔ فریحہ اور اماں اس کی جانب لپکیں، وہ بری طرح رو رہا تھا۔ فریحہ نے اس کے بے جان جسم کو اٹھانے کی کوشش کی مگر وہ اتنا بھاری ہو رہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ ہی گر گئی۔ اماں اس کی مدد کو لپکی اور دونوں نے بہت مشکل سے اسے اٹھا کر بیڈ پر لٹایا۔ وہ بری طرح چلا رہا تھا۔ شاید اسے کہیں چوٹ لگی تھی مگر وہ بتا نہیں سکتا تھا۔ صرف بے ہنگم انداز میں رو رہا تھا۔ اس کی بھیگی آنکھوں میں فریحہ کے لیے غصہ اور نفرت تھی۔ وہ اپنے غصے کا اظہار اپنے ہاتھوں کو عجیب انداز میں ہلا ہلا کر کر رہا تھا اور روتے ہوئے عجیب وغریب آوازیں نکال رہا تھا۔

"بیٹا..... چپ کرو..... مما ہے نا..... آپ کے پاس" فریحہ نے محبت سے اس کی پیشانی چومتے ہوئے کہا مگر وہ اسے اپنے ہاتھ سے پرے دھکیل رہا تھا جیسے وہ اس سے سخت ناراض ہو اور اس کی وجہ سے گرا ہو۔

"بیٹا..... آپ مجھ سے کیوں ناراض ہو رہے ہو.....؟" فریحہ نے محبت سے پوچھا اور وہ شاں شاں کی آوازیں نکالنے لگا۔

"عاصم بیٹا..... میں آپ کے کمرے میں آئی تھی مگر آپ سو رہے تھے۔ اس لیے واپس چلی گئی" فریحہ اس کی آوازوں کا مطلب سمجھتے ہوئے بولی۔

اس نے اپنی بھیگی آنکھوں سے فریحہ کی جانب دیکھا اور غوں غوں کی آوازیں نکالنے لگا اور اسے زبان دکھانے لگا۔

"اماں..... اسے بھوک لگی ہے، آپ دودھ میں کارن فلیکس ڈال کر لے آیئے" فریحہ نے کہا تو اماں باہر جانے لگی۔ عاصم نے پھر شاں شاں کی آوازیں نکالنی شروع کر دیں اور غصے سے ہاتھ بیڈ پر مارنے لگا۔

"کارن فلیکس نہیں..... تو..... پھر اور کیا کھاؤ گے.....؟" فریحہ نے مسکرا کر پوچھا۔

وہ مسلسل نفی میں سر ہلا رہا تھا۔

"بریڈ اور دودھ.....؟" فریحہ نے پوچھا۔

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے شاں شاں کرنے لگا۔

"چکن سینڈوچز" فریحہ نے مسکرا کر پوچھا۔

تو اس کی آنکھیں خوشی سے چمکیں۔ فریحہ مسکرانے لگی۔

"اماں..... میں اس کے لیے سینڈوچز لائی ہوں..... فریج میں پڑے ہیں، وہ لے آیئے" فریحہ نے کہا تو وہ خوشی سے دونوں ہاتھوں کو ہلانے لگا اور فریحہ نے نم آنکھوں سے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا۔ اماں چھوٹی ٹرے میں سینڈوچز اور دودھ کا کپ لے کر آ گئی۔ فریحہ نے ایپرن عاصم کی گردن کے گرد باندھا اور اس کے سر کو اپنی گود میں رکھ کر سینڈوچ کا تھوڑا تھوڑا حصہ اچھی طرح چمچ سے mash کر کے اس کے منہ میں ڈالنے لگی اور اس کے ساتھ چمچ سے دودھ اس کے حلق میں انڈیلنے لگی۔ وہ نہ تو خود کھا سکتا تھا اور نہ ہی چبا سکتا تھا۔ وہ بے جان وجود کی مانند بیڈ پر لیٹا رہتا تھا۔ وہ بات کو سمجھتا تھا مگر خود کچھ نہیں کر سکتا تھا اور فریحہ کو اس کا ہر کام کرنا پڑتا تھا۔ وہ زبان رکھتے ہوئے نہ بول سکتا تھا۔ مضبوط دانتوں کے باوجود چبا نہیں سکتا

تھا۔ صحت مند توانا ہاتھوں سے نوالہ اپنے منہ میں نہیں ڈال سکتا تھا۔ چلتے ہوئے وہ اکثر گر پڑتا تھا۔ فریحہ اور اماں بہت مشکل سے اسے پکڑ کر چلاتی تھیں۔ فریحہ کے لئے اس کا وجود ایک بہت بڑی آزمائش تھا۔ اس کا علاج دنیا کے کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں تھا۔ ماہر اور نامور ڈاکٹر اسے دیکھ کر بے بسی اور مایوسی کا اظہار کرتے۔ وہ اس کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ عاصم کا دماغ ٹھیک ہونے کے باوجود بھی ٹھیک نہیں تھا۔ اس کا ایک حصہ damage ہو گیا تھا۔ وہ چیزوں کو دیکھ سکتا تھا۔ باتوں کو سن سکتا تھا۔ پیغامات کو receive کر سکتا تھا۔ چیزوں کو محسوس کر سکتا تھا مگر دماغ respond نہیں کر سکتا تھا اور اس نے اس کے پورے وجود کو ناکارہ بنا دیا تھا۔ فریحہ نے اس کے علاج کے لئے کہاں کہاں رابطہ نہیں کیا تھا۔ بیرون ملک نامور نیورو سرجنز کو عاصم کی رپورٹس بھیجی تھیں ان سے رابطے کر کے اس کے ہر ممکن علاج کی کوششیں کیں تھیں مگر اس کی ہر کوشش ناکام ثابت ہوئی تھی۔ اس کی زندگی کا مقصد صرف عاصم کے وجود کو زندہ رکھنا تھا اور سولہ سالوں سے وہ اسی جدوجہد میں مصروف تھی۔ اس نے سول انجینئرنگ کر رکھی تھی اور اپنے شعبے میں اس نے بہت نام کمایا تھا۔ شہر کے مرکز میں اس کا ویل فرنیشڈ آفس تھا اور اپنے شعبے سے وابستہ چند ماہرین کے ساتھ مل کر کام کرتی تھی۔ وہ سب ایک ٹیم کے طور پر کام کرتے تھے۔ پورے ملک میں ان کے کام کی بہت شہرت تھی۔ فریحہ اپنی کمپنی کی ڈائریکٹر تھی۔ وہ صبح سے شام تک آفس میں مصروف رہتی۔ گھر آتی تو عاصم کی ذمہ داریاں نبھاتی۔ اس کی زندگی کے دو ہی مقاصد تھے کام اور عاصم۔ کام کرنا اس کی زندگی کا مشن تھا اور عاصم کو پالنا اپنے وجود کی تسکین کا ذریعہ تھا۔ وہ سولہ سالوں سے جس چکی میں پس رہی تھی۔ اس نے اس کے اعصاب کو شل کر دیا تھا۔ اپنے لئے اس کے پاس سوچنے کے لیے نہ تو وقت تھا اور نہ ہی فرصت۔ ہر نئے دن کے ساتھ عاصم اس کی پریشانیوں اور ذہنی اذیت میں اضافہ کر رہا تھا۔ دوسری جانب آفس میں اس کی مصروفیات بڑھ رہی تھیں۔ وہ جس روز آفس سے لیٹ گھر آتی تو عاصم اس سے خفا ہو جاتا اور کسی نہ کسی طریقے سے اپنی خفگی کا اظہار انتہائی شدید انداز میں کرتا جسے دیکھ کر فریحہ پریشان ہو جاتی۔ وہ اسے کچھ سمجھا نہیں سکتی تھی کیونکہ وہ اس کی باتوں کو سمجھ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ تو بس اسکے لمس کو محسوس کر سکتا تھا۔ اس کو چھونے، دیکھنے اور محسوس کرنے سے عاصم کو دلی طور پر سکون ملتا۔ اس کے اندر کوئی جذبہ تسکین پاتا تو وہ خوش ہو کر مطمئن ہو جاتا۔ وہ چاہتا کہ فریحہ اس کے پاس بیٹھی رہے۔ اس کا سر اپنی گود میں لئے اسے سہلاتی رہے اسے آہستہ آہستہ کھلاتی رہے اور وہ اسے دیکھ کر خوش ہوتا رہے مگر فریحہ کے لئے اس کے ساتھ یوں مصروف ہونا بہت مشکل تھا۔ وہ تھکی ہاری آفس سے واپس آتی تو اسے بس عاصم کی فکر ہوتی۔ کبھی چائے پیتی اور کبھی چائے پیئے بغیر ہی اسے کھلانے میں مصروف ہو جاتی۔ اس کو کچھ نہ کچھ کھلا کر پھر وہ خود کھاتی اور اس قدر تھک جاتی کہ وہیں بیٹھے بیٹھے سو جاتی۔

قدرت نے اس کو اس قدر سخت آزمائش میں ڈالا تھا کہ اس کے پاس کوئی راہ فرار نہ تھی۔

اماں اس سے باتیں کر رہی تھی اور وہ صوفے کی پشت کے ساتھ سر ٹکائے گہری نیند سو رہی تھی۔ اماں نے اس کی جانب دیکھ کر آہ بھری اور کلاک کی جانب دیکھا۔ نو بج رہے تھے اور وہ گہری نیند سو رہی تھی۔ اماں کو اس پر ترس آنے لگا۔ اماں نے فریحہ کو آہستہ سے بلایا۔

''بی بی...... اندر کمرے میں جا کر سو جاؤ......'' اماں نے کہا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ گئی اور نیند میں چلتی ہوئی اپنے بیڈروم میں جا کر سو گئی۔

☆

ڈاکٹر رمیض نے کامیاب نیورو سرجن کی حیثیت سے بہت نام کمایا تھا۔قدرت اس پر بہت مہربان تھی۔ وہ ایسی قسمت لے کر پیدا ہوا تھا کہ مٹی میں بھی ہاتھ ڈالتا تو وہ سونا بن جاتی جس راستے پر قدم رکھتا وہی راستہ اس کو خوش آمدید کہتا۔جس دروازے پر دستک دیتا وہی دروازہ اس پر مزید کامیابیوں کے در وا کرتا چلا جاتا۔ وہ بلا کا ذہین اور لائق نوجوان تھا۔انتہائی خوش قسمت اور خوش نصیب تھا۔قدرت کروڑوں انسانوں میں سے کسی ایک کو ایسی ذہانت، فطانت اور بلند نصیب سے نوازتی ہے۔اس کو جو کچھ بھی مل رہا تھا اس میں اس کی جدوجہد کم اور قدرت کی نظر کرم زیادہ تھی۔ اس کی ماں میٹرک پاس سادہ سی عورت تھی جبکہ باپ ایک سرکاری دفتر میں کلرک تھا۔رمیض کو ڈاکٹری کی تعلیم دلانا ان کی حیثیت سے باہر تھا مگر رمیض کو سکول کالج بورڈ اور یونیورسٹی میں ہمیشہ اول آنے پر حکومت کی جانب سے وظیفہ ملتا رہا جس سے اس کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام ہوتا رہا اسے بہت کم مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔حکومت کی جانب سے اسے نیورو سرجری میں سپیشلائزیشن کے لئے امریکہ بھیجا گیا اور جب وہ امریکہ سے واپس لوٹا تو ملک کے تمام بڑے ہسپتال اسے اپنے ہاں ملازمت دینے کے لیے رابطہ کرنے لگے مگر اس نے حکومت کے ایک خیراتی ہسپتال میں جاب کرنے کو ترجیح دی کیونکہ وہ اپنے آپ کو ملک اور حکومت کا قرض دار سمجھتا تھا۔عوام کی خدمت کے نام پر غریبوں کا خون چوسنے والے تمام ڈاکٹر اسے احمق اور بے وقوف کہتے تھے اور کسی نہ کسی طرح اس کی شہرت کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے مگر وہ ہر رکاوٹ اور حسد سے بے نیاز اپنا مشن جاری رکھے ہوئے تھا۔نیورو سرجری کے علاوہ اس کی زیادہ دلچسپی برین اسٹڈی میں ریسرچ تھی۔اس کے لئے برین بہت حیران کن معمہ تھا۔ظاہری طور پر ایک جیسی ساخت سے جنم لینے والی مختلف سوچیں مختلف آئی کیو لیولز۔ایک ہی خاندان اور ماحول میں پروان چڑھنے والے لوگوں کی سوچیں اور ذہنی بیماریاں، وہ بہت سی چیزوں کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔اسے ہاسپٹل میں ہی ایک بنگلہ ملا تھا جس میں وہ اپنے بوڑھے ماں باپ کے ساتھ رہتا تھا۔بنگلے کا ایک پورشن اس نے اپنی ریسرچ کے لئے مخصوص کر رکھا تھا جس میں وہ اپنے فارغ اوقات میں برین پر ریسرچ کرتا۔کمپیوٹر پر جدید تحقیق کے مطابق انفارمیشن لیتا اور اپنی بنائی ہوئی لیب میں مختلف انسانی دماغوں کو محفوظ کر کے ان پر ریسرچ میں مصروف رہتا۔اس سلسلے میں وہ ملک کے ٹاپ کلاس نیورو سرجنز اور ریسرچرز کے ساتھ ڈسکشن کرتا رہتا۔

''ڈاکٹر رمیض...... برین اسٹڈی بہت وسیع موضوع ہے۔بہت سے سائنسدانوں اور ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ ایک انسان اپنی پوری زندگی میں صرف 5 سے 10 فیصد تک اپنا دماغ استعمال کرتا ہے۔باقی 90% استعمال کیے بغیر ہی وہ اس دنیا سے چلا جاتا ہے۔دراصل انسان خود بھی مائنڈ پوٹینشل کے بارے میں واقف نہیں...... وہ اپنے ذہن کو صرف روزمرہ کے کام کاج، سونے جاگنے، تھوڑا بہت سوچنے سمجھنے اور لکھنے پڑھنے میں استعمال کرتا ہے اور بس......! ذہن سے کس حد تک اور کتنی تیزی سے کام لیا جا سکتا ہے شاید انسان کو اس کا شعور خود بھی نہیں اب ٹیلی پیتھی ہپناٹزم اور مختلف مائنڈ ریڈنگ ایکسپرٹ پر جیسے جیسے ریسرچ ہو رہی ہے۔انسان خود بھی حیران ہو رہا ہے اور اسے خود بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ واقعی برین کے بارے میں اس کی ریسرچ نہ ہونے کے برابر ہے۔آپ کی ریسرچ کا فوکس کیا ہے؟'' ملک کے ٹاپ کلاس نیورو سرجن ڈاکٹر محسن زیدی نے ڈاکٹر رمیض کی جانب بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''سر...... مجھے خود بھی معلوم نہیں کہ میں کیا ایکسپلور کرنا چاہتا ہوں اور مجھے کس بات پر فوکس کرنا چاہیے۔میری ریسرچ کا موضوع کیا

ہے؟ مجھے فی الحال کچھ معلوم نہیں صرف اتنا معلوم ہے کہ میرے پاس یہ ایک ٹاپک ہے جس کے بارے میں مجھے کچھ ریسرچ کرنی ہے..... میرے شعبے کے بہت سے لوگ مجھے بیوقوف کہتے ہیں کیونکہ وہ چیزوں کو ایز اٹ از اپنانے کے خواہشمند ہوتے ہیں لیکن میں کچھ تجربات کرنا چاہتا ہوں..... سر قدرت نے ہمارے لئے زمین بنائی ہے کہ ہم اس پر چل پھر سکیں سفر کر سکیں مگر انسان کی جستجو نے جب اسے اندر سے مضطرب کیا تو اس نے منزل کو سوچے بغیر اس کھودنا شروع کر دیا۔ جوں جوں انسان زمین کی گہرائی تک جاتا رہا۔ قیمتی خزانے اس کے ہاتھ آتے رہے اور جستجو کا یہ سفر ابھی تک مکمل نہیں ہوا۔ انسان بھی تو ایسا ہی ہے اس کے اندر ایک شے کی دریافت ایک دوسرے راز کی نشاندہی کرتی ہے۔ مجھے ابھی اپنی منزل کا پتہ نہیں لیکن میں کچھ ایسا کرنا چاہتا ہوں جس سے انسانیت کو صحیح معنوں میں فائدہ ہو۔ میں نے اس سلسلے میں کچھ ریسرچ کی ہے۔ یہ اس کی فائل ہے۔ آپ سینئر ہیں اور میں بہت جونیئر آپ کی رہنمائی چاہتا ہوں'' ڈاکٹر رمیض نے فائل ڈاکٹر زیدی کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا تو وہ نظر کی عینک لگا کر فائل کے ایک ایک صفحے کو بغور دیکھنے لگے۔ وہ دونوں مکمل خاموش تھے۔ ڈاکٹر رمیض ان کے چہرے پر نمودار ہونے والے تاثرات سے بہت سے اندازے لگانے میں مصروف تھا اور ڈاکٹر زیدی فائل کے صفحات میں کہیں گم ہو گئے تھے۔

''ماشاءاللہ..... آپ نے بہت ریسرچ کی ہے..... اور آپ کسی نہ کسی روز اپنی منزل بھی پا لیں گے، آپ کی ریسرچ سے ابھی مجھے بھی اندازہ نہیں ہو پا رہا کہ آپ کس سمت جا رہے ہیں کیونکہ بہت سے کاموں کا فیصلہ خود وقت اور قدرت کرتی ہے۔ انسان کو بہت بعد میں اس کا اندازہ ہو پاتا ہے..... آپ کی ریسرچ کے بارے میں پڑھ کر مجھے ڈاکٹر دانش بہت یاد آ رہے ہیں۔ ہی واز اے سپر جینئس مین (وہ بہت زیادہ ذہین آدمی تھے) نیورو سائنٹسٹ..... انہوں نے بھی بہت منفرد انداز میں برین پر ریسرچ کرنے کی کوشش کی..... مگر.....'' ڈاکٹر زیدی آہ بھر کر خاموش ہو گئے۔

''مگر کیا.....؟'' ڈاکٹر رمیض نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ ملک چھوڑ کر چلے گئے..... پھر واپس نہیں لوٹے'' ڈاکٹر محسن زیدی نے جواب دیا۔

''کیوں.....؟'' ڈاکٹر رمیض نے حیرت سے پوچھا۔

''ایک آپریشن کے دوران ایک مریض کی ڈیتھ ہو گئی۔ اس کے لواحقین نے ان پر قتل کا الزام لگا دیا۔ ڈاکٹر صاحب قدرے arrogant (مغرور) قسم کے انسان تھے جیسا کہ زیادہ تر کامیاب انسانوں کے بارے میں ایسا ہی سمجھا جاتا ہے۔ ان کا اپنی فیلڈ میں بہت نام اور عزت تھی جس سے دوسرے ڈاکٹرز بہت خائف تھے اور ان سے حسد و رقابت بھی رکھتے تھے۔ انہوں نے اس واقعے کو بہت ہوا دی اور یہ مشہور کر دیا کہ ڈاکٹر صاحب اس مریض کا آپریشن نہیں بلکہ اس پر کوئی ریسرچ کر رہے تھے اور اس عمل کے دوران مریض کی موت واقع ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب پر مقدمہ چلا انہیں عمر قید کی سزا سنائی گئی مگر کچھ فلاحی تنظیموں اور حکومت کی مداخلت سے ان کا جرم معاف کر دیا گیا مگر ڈاکٹر صاحب بہت دل برداشتہ ہو گئے اور ملک چھوڑ کر چلے گئے'' ڈاکٹر محسن زیدی نے مایوس کن لہجے میں بتایا۔

''ویری سیڈ..... اب وہ کہاں ہیں؟'' ڈاکٹر رمیض نے پوچھا۔

''شاید انگلینڈ میں..... مگر سنا ہے اب وہ کچھ نہیں کرتے بہت تنہائی اور مایوسی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ فیملی سے دوستوں سے اور اس ملک

سے مکمل طور پر تمام تعلقات توڑ چکے ہیں۔ مجھے اکثر بہت افسوس ہوتا ہے۔ وہ بہت لائق اور ذہین انسان تھے۔ انہوں نے بہت محنت اور جدوجہد سے اپنے شعبے میں نام کمایا تھا مگر رقابت، حسد اور دشمنی کی وجہ سے ان کا کیریئر ختم ہو گیا یا پھر قسمت کے ہاتھوں انہیں شکست ہوئی...... معلوم نہیں کیا ہوا......؟ مگر ایک قابل شخص جو ملک کا بہت بڑا سرمایہ تھا۔ وہ ضائع ہو گیا......" ڈاکٹر زیدی نے تاسف کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے بھی یہ جان کر بہت افسوس ہوا ہے" ڈاکٹر رمیض نے تاسف کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر دانش جیسے لوگ صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں مگر لوگ ان کی قدر نہیں کرتے......اور جب وہ دنیا سے چلے جاتے ہیں تو پھر ان کی یاد میں دن مناتے ہیں ان پر مقالات اور کتابیں لکھی جاتی ہیں ...... ڈاکٹر رمیض...... کیا آپ جانتے ہیں کہ انسان کا المیہ کیا ہے؟" ڈاکٹر زیدی نے گہری سانس لیتے ہوئے پوچھا۔

"نو...... سر......" ڈاکٹر رمیض نے جواب دیا۔

"انسان کا اپنے آپ کو کھو دینا" ڈاکٹر زیدی نے آہ بھر کر کہا۔

"کیا مطلب......" ڈاکٹر رمیض نے چونک کر پوچھا۔

"بہت کچھ پانے کی جدوجہد میں جب انسان اپنے آپ سے غافل ہو جاتا ہے......اور اپنی ذات کو بھول جاتا ہے تو اس سے اپنا آپ...... اسکی اپنی ذات......اس کا وجود بہت دور چلا جاتا ہے پھر اس کا کھوکھلا وجود بہت دیر تک اس کا ساتھ نہیں دے پاتا...... ڈاکٹر دانش کے ساتھ بھی شاید کچھ ایسا ہی المیہ تھا" ڈاکٹر زیدی نے فائل بند کر کے رمیض کی جانب بڑھائی۔

"کیا ڈاکٹر دانش کو کسی نے ملک میں واپس لانے کی کوشش نہیں کی؟" ڈاکٹر رمیض نے پوچھا۔

"شروع میں کچھ لوگوں نے اس کے بارے میں آواز بلند کی تھی مگر کسی نے توجہ نہ دی اور لوگ اپنی اپنی زندگیوں میں مگن ہو گئے" ڈاکٹر زیدی نے بتایا۔

"ملک کا اتنا قیمتی سرمایہ یوں ضائع ہو گیا اور کسی کو احساس ہی نہیں ہوا" ڈاکٹر رمیض نے کہا۔

"ڈاکٹر رمیض یہ سب صرف 'نظریہ ضرورت' کے تابع ہے...... جب تک آپ لوگوں کی ضروریات پوری کرتے رہیں گے...... دنیا آپ کی قدر بھی کرے گی اور آپ کو یاد بھی کرے گی...... جب آپ کسی کی ضرورت پوری نہیں کر سکتے ......لوگ آپ کو پاؤں تلے روند کر چلے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر دانش بہت لائق اور ذہین ڈاکٹر تھے مگر......شاید وہ کسی کی ضرورت نہ بن سکے......اس لئے لوگ ان کو بھول گئے" ڈاکٹر زیدی نے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب میں ان سے رابطہ کرنا چاہتا ہوں۔ ان کو ملک میں واپس لانے کی کوشش کروں گا...... کیا آپ میرا ساتھ دیں گے؟ ڈاکٹر رمیض نے عزم کا اظہار کرتے ہوئے کہا تو ڈاکٹر زیدی نے چونک کر ڈاکٹر رمیض کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں پرعزم چمک اور ارادے کی پختگی تھی۔

"یس آف کورس......آئی ایم وڈ یو......اور مجھے یقین ہے جب آپ دونوں مل کر کوئی جوائنٹ ریسرچ کریں گے تو دنیا کو ایک نئی فائدے مند چیز ملے گی" ڈاکٹر زیدی نے مسکراتے ہوئے کہا تو رمیض نے بھی مسکرا کر ان کی جانب دیکھا۔

"میرے پاس ان کے کچھ پرانے کونٹیکٹ نمبرز ہیں۔ میں ان پر رابطہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ انگلینڈ میں میرے بہت سے دوست ہیں ان سے بھی کونٹیکٹ کرتا ہوں" ڈاکٹر زیدی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"تھینک یو سر...... میں آپ سے ان چھ رہوں گیا، اب ہمارا مشن ڈاکٹر دانش کو ملک میں واپس لانا ہے" ڈاکٹر رمیض نے مسکراتے ہوئے کہا تو ڈاکٹر زیدی بھی مسکرا دیے۔

"ڈاکٹر رمیض...... آج مجھے آپ کی آنکھوں میں عزم دیکھ کر بہت خوشی ہوئی ہے جو اس بات کا اشارہ کرتی ہے کہ ٹیلنٹڈ لوگ جب اپنے جیسے لائق لوگوں کی قدر کرتے ہیں اور ان کی عزت کرتے ہیں تو انسانیت کے کھوئے ہوئے وقار کو بہت حوصلہ اور ہمت ملتی ہے۔ بیسٹ آف لک" ڈاکٹر زیدی نے اس کی تعریف کرتے ہوئے اسے رخصت کیا اور وہ بھی نئے عزم سے واپس لوٹا۔ اس کا ذہن مسلسل ڈاکٹر دانش کے بارے میں سوچ رہا تھا اور اس دن کے بارے میں جب وہ ڈاکٹر دانش کو ملک میں واپس لے کر آئیں گے۔

☆

علی موسیٰ ڈاکٹر رابرٹ بروکس کے کلینک میں ان کے سامنے بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر رابرٹ ڈاکٹر دانش سے کوئی بھی سیشن کرنے سے پہلے ان کی کیس ہسٹری کے بارے میں تفصیلاً جاننا چاہتے تھے اور ان کی زندگی کے بارے میں تفصیلاً علی موسیٰ بتا سکتے تھے جو گزشتہ کئی روز سے ڈاکٹر رابرٹ کے پلان اور ہدایات کے مطابق ڈاکٹر دانش کی تمام حرکات وسکنات اور باتوں کو نوٹ کر رہے تھے اور ان کو اپنی ڈائری میں لکھتے جاتے تھے۔

"ڈاکٹر رابرٹ...... ہی از ویری مسٹریس مین (وہ بہت پراسرار آدمی ہے) ان جیسا منفرد، عجیب اور حیران کن انسان میں نے اب سے پہلے کبھی نہیں دیکھا...... پہلے میں نے ان کی حرکات کو اور ان کی باتوں کا یوں نوٹس نہیں لیا تھا جیسا کہ اب لیا ہے...... پہلے وہ مجھے کچھ ذہنی طور پر اپ سیٹ لگتے تھے اور اب کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا ہیں؟ ذہنی بیمار...... ابنارمل...... پاگل یا پھر...... کوئی اور مخلوق......؟ مجھے تو کبھی کبھی ان سے خوف بھی آنے لگتا ہے اور ان پر شک بھی ہونے لگتا ہے...... کہ وہ کوئی جن ہیں یا بھوت" علی موسیٰ نے قدرے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

"آپ نے کیا آبزرو کیا ہے؟" ڈاکٹر رابرٹ نے پوچھا۔

"ڈاکٹر رابرٹ کبھی وہ سرکس میں ہنسانے والے جوکر بن جاتے ہیں۔ کبھی سرکس میں ویٹنگ کرنے والے ایڈونچر بن جاتے ہیں کبھی بیمار مریض...... کبھی ڈاکٹر...... کبھی ایک دم ہنسنا شروع کر دیتے ہیں۔ بچوں کی طرح تالیاں بجاتے ہیں، قہقہے لگاتے ہیں اور کبھی انتہائی سنجیدہ ہو جاتے ہیں، کبھی بہت دکھی اور پریشان ہو کر رونا شروع کر دیتے ہیں۔ کبھی احمقوں کی طرح باتیں کرنے لگتے ہیں تو کبھی انتہائی سمجھدار و مجھے تو ان کی بالکل بھی سمجھ نہیں آ رہی...... اور حیرت کی بات یہ ہے کہ جب وہ جوکر بنتے ہیں تو اپنی اصل شخصیت یعنی ڈاکٹر دانش کو بالکل ہی بھول جاتے ہیں۔ وہ اس وقت مکمل طور پر جوکر ہوتے ہیں اور جب ڈاکٹر دانش کے روپ میں باتیں کرتے ہیں تو ان کو وہ جوکر یاد بھی نہیں ہوتا لیکن جب وہ دوبارہ جوکر بنتے ہیں تو پھر وہی باتیں، ویسے ہی انداز میں دہرانے لگتے ہیں جیسے وہ اپنا ٹوٹا ہوا رابطہ پھر سے جوڑ کر سلسلہ آگے بڑھا رہے ہوں۔ مجھے تو کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے وہ ڈاکٹر دانش نہیں بلکہ کوئی سپر نیچرل مخلوق ہوں......" علی موسیٰ پریشانی سے بولے۔

''آپ پریشان مت ہوں، دراصل وہ multiple personality میں تبدیل ہو چکے ہیں سائیکاٹرسٹ اسے dissassociation اور اسے تین کیٹگریز سے define کرتے ہیں Eve white, Eve black and jane انسان کی مختلف حرکات اور شخصیات کو ان تین کیٹگریز میں سمو دیا ہے مثلاً صاف ستھرا، پرسکون اور خوش اخلاق شخص، ایو وہائٹ، کیٹگری میں آتا ہے۔ اچھل کود کرنے والا بے ہنگم بے اختیار ہنسنے والا اور خواہ مخواہ مشتعل ہونے والا 'ایو بلیک' میں اور سنجیدہ، سمجھدار، قابل، خوشگوار ہنسی ہنسنے والا 'جین' کیٹگری میں آتا ہے۔

جب ایسا شخص کسی دوسری اور بالکل مختلف پرسنالٹی کا روپ دھارتا ہے تو وہ اپنی اصل شخصیت کو بھول جاتا ہے پانچ سے دس منٹ یا اس سے زیادہ وقت کے لئے وہ اس پرسنالٹی میں آتا ہے۔ پھر اس سے دوسری تیسری یا اپنی اصل پرسنالٹی میں چلا جاتا ہے۔ ایک شخص ایک ہی وقت میں دو تین یا اس سے کئی زیادہ پرسنالٹیز adopt کر لیتا ہے اور ہر ایک سے بے نیاز رہتا ہے۔ اسے نہیں معلوم ہوتا کہ وہ چند گھنٹے یا چند منٹ پہلے کیا کر رہا تھا۔ وہ اپنے فرضی نام یا شخصیت سے بالکل مختلف کردار ادا کرتا ہے۔ ڈاکٹر رابرٹ نے اسے بتایا اور علی موسیٰ انتہائی حیرانگی سے ان کی باتیں سننے لگے۔

''یہ سب کیوں ہوتا ہے......؟ کیا یہ کوئی بیماری ہے؟'' علی موسیٰ نے حیرت سے پوچھا۔

'Escapism' یعنی (فرار) جب کسی کی زندگی میں بہت سی تلخیاں، الجھنیں، پریشانیاں اور ڈپریشن بڑھ جاتا ہے اور اس کا دماغ مختلف سوچوں سے تھک جاتا ہے تو اس کا لاشعور ایکٹو (متحرک ہو جاتا ہے جیسا کہ آپ بھی جانتے ہیں کہ لاشعور کا تعلق خوابوں، فینٹسی اور نامعلوم دنیا سے زیادہ ہے۔ ایسا انسان باہر کی تلخ اور شعوری دنیا سے فرار پانا چاہتا ہے اور ان سے بھاگ کر وہ اپنی لاشعوری دنیا میں کہیں گم ہونا چاہتا ہے وہ دنیا اسے خوش آمدید کہتی ہے وہاں اسے کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں ہوتا۔ وہ ہر طرح سے آزاد ہوتا ہے وہ جو چاہے کرے، کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ اس دنیا میں وہ ہیرو ہے اور وہ 'ہیرو' کبھی ٹارزن ہے، کبھی جن بھوت، پری سپر مین یا کوئی ایسا کردار جو اسے پسند ہوتا ہے اس کردار کی خوبیاں اسے متاثر کرتی ہیں اور اس کے لاشعور میں کہیں محفوظ ہوتی ہیں جب ایسا انسان روپ دھارتا ہے تو وہ وہی خوبیاں اپنانے کی کوشش کرتا ہے جو اسے اچھی لگتی ہیں۔ یوں ایک پرسنالٹی سے دوسری میں جاتے ہوئے اسے زیادہ وقت نہیں لگتا'' ڈاکٹر رابرٹ نے علی موسیٰ کو تفصیلاً بتایا۔

''ڈاکٹر دانش کس سے فرار چاہتے ہیں؟'' علی موسیٰ نے حیرت سے پوچھا۔

''یہی راز جاننے پر ان کا علاج ممکن ہو سکے گا اور اس کے لئے ان کے ماضی یعنی ان کی لائف ہسٹری کو جاننا بہت ضروری ہے۔ میں نے فون پر آپ کو direct کیا تھا کہ آپ زیادہ سے زیادہ ان کے بچپن، ان کے ماضی اور ان کے والدین کی باتیں کریں تاکہ ہم ڈاکٹر صاحب کے بارے میں ملنے والی معلومات سے ان حقائق تک پہنچ سکیں جن کی وجہ سے ان کی پرسنالٹی split ہو گئی ہے'' ڈاکٹر رابرٹ نے سنجیدگی سے کہا۔

''ڈاکٹر صاحب میں نے بہت کوشش کی کہ باتوں باتوں میں ان کے ماضی میں جھانک سکوں مگر ڈاکٹر دانش بہت ہوشیاری سے اس موضوع کو چھوئے بغیر دوسرے موضوع کی طرف نکل جاتے ہیں تب بھی نہیں جب وہ اصل میں ڈاکٹر دانش کے روپ میں ہوتے ہیں مجھے اکثر یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ جیسے وہ اس موضوع کو ناپسند کرتے ہیں کہ ان سے اس کے بارے میں ڈسکشن بھی کی جائے'' علی موسیٰ نے بتایا۔

''ڈاکٹر دانش نہ تو عام انسان ہیں اور نہ ہی عام مریض...... وہ بہت ذہانت رکھنے والے خاص انسان ہیں بہت کم لوگوں کو قدرت ایسی

ذہانت سے نوازتی ہے۔ یہ ان کا المیہ ہے کہ ان کی شخصیت بکھر گئی ہے اور اس کے پیچھے ضرور کوئی اہم وجہ ہو گی۔ آپ کو بہت ہوشیاری اور ٹیکنیکل انداز میں اس وجہ کو جاننے کی جدوجہد کرنی ہے" ڈاکٹر رابرٹ نے کہا تو علی موسیٰ انتہائی توجہ سے ان کی ہدایات کو نوٹ کرنے لگے۔

"میں پوری کوشش کروں گا کہ ان کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کر سکوں...... اور جیسے ہی مجھے کوئی انفارمیشن ملتی ہے میں آپ کو انفارم کروں گا" علی موسیٰ نے کہا۔

"اگلے ہفتے میرے ساتھ ان کا سیشن ہے اور میں چاہتا ہوں اس سے پہلے کچھ نہ کچھ معلومات میرے پاس ہوں۔ اس طرح تشخیص اور ٹریٹمنٹ میں آسانی ہو جائے گی" ڈاکٹر رابرٹ نے کہا تو علی موسیٰ خاموش ہو گئے۔

ڈاکٹر دانش اپنے اپارٹمنٹ میں موجود نہیں تھے۔ دروازوں کو بھی لاک نہیں لگا تھا اور وہ خود بھی کہیں نہیں تھے۔ علی موسیٰ گھبرا گئے اور اپارٹمنٹ کا ایک ایک کونہ چیک کیا مگر وہ کہیں موجود نہیں تھے۔ علی موسیٰ گھبرا کر ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ ان کا موبائل نمبر ڈائل کیا تو وہ بھی ٹیبل پر پڑا تھا۔

"وہ کہاں جا سکتے ہیں؟" علی موسیٰ نے انتہائی پریشانی سے سوچا اور گھبرا کر ڈاکٹر رابرٹ کو فون کیا۔ وہ بھی پریشان ہو گئے۔

"پلیز...... آپ انہیں جلد تلاش کریں ایسے مریض اکثر ہائپر ہو کر مرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں" ڈاکٹر رابرٹ نے کہا تو علی موسیٰ کے چہرے پر پسینہ آنے لگا۔

"اوہ...... تو......" علی موسیٰ بڑبڑائے اور فون بند کر دیا۔

"کہاں تلاش کروں......؟" علی موسیٰ نے سوچتے ہوئے اپنے آپ سے سوال کیا اور یہ ایسا سوال تھا جس کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

انہوں نے ساتھ والے اپارٹمنٹ کے دروازے پر دستک دی مگر وہاں سے بھی کوئی تسلی بخش جواب نہ ملا۔ واپس اپارٹمنٹ میں آ کر انہوں نے ڈاکٹر دانش کی وارڈ روب اور سامان چیک کیا۔ سب کچھ وہاں موجود تھا۔ وہ پریشان ہو کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگے۔ شام ہو رہی تھی۔ ہر طرف ملگجا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ موسم بھی سرد ہو رہا تھا اور ڈاکٹر دانش کا لانگ کوٹ بھی صوفے پر پڑا تھا۔ اگر وہ مزید بیمار ہو گئے تو......؟" علی موسیٰ نے پریشانی سے سوچا اور بے خیالی میں نیچے سڑک پر دیکھا۔ پانچ منزلہ بلڈنگ کے آخری فلور پر وہ رہتے تھے۔ اتنی اونچائی سے نیچے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر سڑک پر بہت لوگ دائرے کی صورت میں کھڑے تھے اور ان کے درمیان کون تھا وہ انہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ علی موسیٰ کو شک سا ہوا اور انہوں نے اپنی دوربین سے نیچے دیکھا، دائرے کے اندر ڈاکٹر دانش کھڑے تھے اور ان کے ارد گرد بچے اور لوگ خوشی سے تالیاں بجا رہے تھے۔ علی موسیٰ نے سکون کا سانس لیا اور بھاگتے ہوئے نیچے گئے۔ ڈاکٹر دانش بڑے ماہرانہ انداز میں الٹی سیدھی قلابازیاں مارنے میں مصروف تھے اور خاموش زبان سے الٹی اوٹ پٹانگ حرکتیں کر رہے تھے کہ ان کے گرد کھڑے بچوں کا ہنس ہنس کر برا حال ہو رہا تھا۔ علی موسیٰ بھاگتے ہوئے دائرے کے اندر گئے۔ ڈاکٹر دانش نے علی موسیٰ کی طرف دیکھا اور یوں نظر انداز کر دیا جیسے انہیں جانتے ہی نہ ہوں۔

"پلیز...... آپ لوگ یہاں سے جائیے...... یہ بیمار ہیں" علی موسیٰ نے بچوں اور لوگوں سے قدرے چلاتے ہوئے کہا۔ بچے اور لوگ حیرت سے ڈاکٹر دانش اور علی موسیٰ کی جانب دیکھنے لگے۔ علی موسیٰ کے بار بار کہنے پر وہ لوگ وہاں سے چلے گئے۔ ڈاکٹر دانش بچوں کو پکڑ پکڑ کر روکتے

لگے مگر علی موسیٰ انہیں جانے کے لئے کہتے رہے۔ سب کے جانے کے بعد ڈاکٹر دانش سڑک کی ایک جانب گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اونچی آواز میں رونا شروع ہو گئے۔

"پلیز ڈاکٹر دانش...... بی یور سیلف ...... موسم کتنا خراب ہو رہا ہے اور اندھیرا بھی ہو رہا ہے۔ آپ بیمار ہو جائیں گے پلیز گھر چلیں" علی موسیٰ نے گھبرا کر ان کا بازو کھینچتے ہوئے کہا۔

"ہاں...... سردی...... مجھے بہت سردی لگ رہی ہے......" ڈاکٹر دانش اپنے بازوؤں کو سمیٹتے ہوئے بولے اور علی موسیٰ انہیں اپارٹمنٹ میں لے کر گئے اور انہیں بیڈ پر لٹا کر کمبل اوڑھا دیا۔

"میں آپ کے لئے کافی لاتا ہوں" علی موسیٰ نے کہا اور کچن میں چلے گئے۔

تھوڑی دیر بعد وہ کافی کے دو مگ لیے ڈاکٹر دانش کے پاس آ گئے۔ باہر برفباری ہونے لگی تھی مگر ان کا کمرہ کافی گرم ہو رہا تھا کیونکہ علی موسیٰ نے ڈاکٹر دانش کے پاس رکھے ہیٹر کو قدرے تیز کر دیا تھا۔

ڈاکٹر دانش آپ کیوں باہر گئے......؟ کیا آپ بھول گئے تھے کہ کل رات آپ کو سردی سے بخار بھی ہو رہا تھا اور پھر بھی؟ علی موسیٰ نے حیرت سے مگر قدرے ملامت سے پوچھا۔

"میں تو کہیں نہیں گیا۔ دو دنوں سے اس کمرے میں بند ہوں۔ آپ جس سے مرضی پوچھ لیں اور میں بھلا اس سردی میں کیوں باہر جاؤں گا...... میں پاگل نہیں ہوں" ڈاکٹر دانش نے علی موسیٰ کی جانب دیکھتے ہوئے قدرے طنزیہ لہجے میں کہا اور علی موسیٰ حیرت سے ان کی جانب دیکھنے لگے۔

......❁......

# (۳)

قدرت نے انسان کو چلانے اسے توانائی بہم پہنچانے کیلئے ایک نہایت اہم اور پیچیدہ نظام، نظامِ انہضام بنایا ہے۔ یہ نظام منہ سے شروع ہو کر خوراک کی نالی معدہ، چھوٹی آنت، بڑی آنت اور آخر میں ریکٹم پر ختم ہوتا ہے۔ یہ نظام منہ سے شروع ہوتا ہے جس میں سب سے پہلے آنکھیں خوراک کو دیکھتی ہیں اور دماغ تک پیغام پہنچاتی ہیں کہ یہ چیز معدہ تک آ رہی ہے اور معدہ اس کے لئے تیار ہو جائے۔ دماغ فوری طور پر احکام بھیجتا ہے اور معدہ میں انیز ائمز آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ منہ کے اوپر خدا نے ناک شاید اسی مقصد کیلئے رکھی ہے تا کہ انسان باسی اور خراب چیزوں کو کھا کر کسی بیماری میں جتلا نہ ہو جائے۔ منہ میں خوراک کو زبان پر رکھتے ہی اس کا ذائقہ محسوس ہوتا ہے اور دماغ تک یہ پیغام پہنچایا جاتا ہے کہ کھانے والی چیز میٹھی، کھٹی، نمکین یا کسیلی ہے۔ خوراک کو منہ میں دانتوں کی مدد سے چبا کر باریک اور چھوٹے پیسز کی صورت میں تبدیل کر دیا جاتا ہے منہ میں موجود سلائیز (Saliva) خوراک میں شامل ہو کر اسے چھوٹے چھوٹے گولوں کی شکل میں حلق سے پھر خوراک کی نالی ایسوفیگس تک پہنچاتا ہے۔ ایسوفیگس سے خوراک معدہ میں پہنچ جاتی ہے۔ معدہ ایک تھیلی نما عضو ہے اس میں بہت زیادہ پھیلنے کی صلاحیت ہوتی ہے اس کی دیواریں لچکدار ہوتی ہیں۔ ان سے انزائمز خارج ہوتے رہتے ہیں جو خوراک کو ہضم کرنے میں مدد کرتے ہیں۔ یہاں خوراک semi liquid شکل میں بن جاتی ہے۔ معدہ سے آہستہ آہستہ خوراک چھوٹی آنت میں منتقل ہو جاتی ہے وہاں اس میں مزید رطوبتیں شامل ہوتی ہیں۔ جیسے پتے کی سیکریشن بائل لبلبے کی پینکریاٹک جوس جو چربی اور دوسرے مادوں کو ہضم کر کے مزید چھوٹے اجزا میں تقسیم کر دیتا ہے۔ انتڑیوں کی دیواروں سے ہضم شدہ خوراک خون کے ذریعے جگر تک پہنچ جاتی ہے اور پھر پورے جسم میں دل کے ذریعے پورے جسم میں گردش کرتی ہے جو خوراک ہضم نہیں ہوتی وہ pieces کی شکل میں بڑی آنت میں منتقل کر دی جاتی ہے جہاں سے یہ مزید ہضم ہونے کے بعد فضلے کی صورت میں جسم سے باہر دھکیل دی جاتی ہے۔

اس طرح کھانے کا یہ سلسلہ تاحیات جاری و ساری رہتا ہے اور جسم کو انرجی ملتی رہتی ہے۔ قدرت کا یہ نظام اسی طرح بہت پیچیدہ اور نہ سمجھ آنے والا ہے جس طرح مختلف اقسام کی بھوک اور ان سے جنم لینے والی طمع، ہوس اور لالچ.....

☆

وہ صبح کی بھوکی پیاسی، در در بھیک مانگتی، تھکی ہاری اپنی جھگی کی طرف جا رہی تھی۔ اس نے ایک تھیلا کندھے پر اٹھا رکھا تھا۔ اس میں بھیک کے نام پر اکٹھی کی گئی چیزیں، بچی کھچی روٹیوں کے ٹکڑے پلاسٹک کی خالی بوتلیں اور پھٹے پرانے کپڑوں کے چیتھڑے، ٹوٹے پھوٹے برتن اکٹھے کر رکھے تھے...... اسے بھیک مانگنے سے نفرت تھی مگر بھیک مانگنا اس کی مجبوری تھی...... جس دن وہ بھیک مانگنے نہ جاتی...... سارا دن اس کو کھانے کو کچھ نہ ملتا اور پیٹ تھا کہ بن کھائے اسے سکون نہ لینے دیتا...... اماں کے کوسنے اس کے کانوں میں گونجتے۔

''اری..... تو..... کسی نواب کی بیٹی نہیں..... جو تجھے کام کیے بغیر روٹی کھانے کو مل جائے گی..... یہاں کمانے کو کوئی نہیں اور کھانے کو سارا خاندان..... چل اٹھ..... حرام خور..... تیرے یہ نخرے..... ہم نہیں اٹھا سکتے.....'' اماں اس کی چٹیا پکڑ کر اسے جھگی سے باہر دھکا دیتی..... اور اس کا تھیلا جھگی سے باہر پھینکتی۔

''خالی ہاتھ مت آنا..... بھیک نہ ملے تو باہر سے کھا..... مر..... آنا..... یہاں آ کر تجھے کچھ نہیں ملے گا.....'' اماں غصے سے بولتی۔ اماں بھی سچ ہی کہتی تھی..... لولا لنگڑا بڈھا باپ..... سات بچے..... اماں اور..... وہ..... کھانے کو اتنے پیٹ..... اور کمانے کو..... وہ..... ابا..... اور دو بھائی..... دن بھر میں جتنی بھیک ملتی..... اس سے صرف دو وقت کی روکھی سوکھی روٹی ہی نصیب ہوتی۔

''پتا نہیں ربا..... تو نے ہمارے لیکھ کس ٹٹی قلم سے لکھے ہیں..... یہ بھی کوئی زندگی ہے..... میں لعنت بھیجتی ہوں ایسی زندگی پر..... ہم تو کتے بلیوں سے بھی بری زندگی گزار رہے ہیں۔ انہیں تو پھر بھی پیٹ بھر کر کھانا نصیب ہوتا ہے..... ہمیں ساری زندگی پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہیں ہوا.....'' رانی نے کھلے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے گہری سانس لی اور دکھی دل سے سوچا۔

شام کے گہرے سائے پھیل رہے تھے وہ تیز تیز قدم اٹھاتی اپنی جھگی کی طرف جا رہی تھی۔

''اری لیلی..... کاہے کو اتنی جلدی میں ہے..... دو گھڑی ہمارے پاس بھی بیٹھ جا.....'' شامو لنگڑے نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

''اری تھوکتی ہوں..... میں تجھ پر..... میرے لئے تو ہی رہ گیا ہے..... جو تیرے پاس بیٹھ کر میں اپنا منہ کالا کروں..... مردود لنگڑا'' رانی نے غصے سے شامو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیوں..... میرے پاس بیٹھتے ہوئے تجھے کیا تکلیف ہے..... قد کاٹھ میں تجھ سے لمبا ہوں..... خوبصورت ہوں..... جوان ہوں..... کماتا ہوں..... بس..... ذرا.....'' شامو نے مسکرا کر اسے چڑانے کے لئے کہا۔

''چل جا..... دفعہ ہو..... میرے منہ نہ لگ..... بڑا آیا..... اچھی طرح جانتی ہوں تجھے..... ناچ..... گا کر..... حرام کی کمائی کھاتا ہے اور رعب جماتا ہے جیسے افسر لگا ہے'' رانی نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

''اری..... تو..... کہے..... تو..... میں تیرے لئے کہیں افسر لگ جاؤں.....'' شامو نے آنکھ دباتے ہوئے کہا۔

''چھوڑ میرا راستہ..... اور مجھ سے فضول باتیں مت کر۔ تو محنت کر کے روٹی کھائے تو پھر تجھے پتہ چلے کہ محنت کی کمائی کیا ہوتی ہے۔'' رانی نے غصے سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اے..... رانی..... مجھے تجھ سے بڑی محبت ہو گئی ہے..... سچ تو بڑی اچھی لگے ہے مجھے'' شامو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بکواس بند کر..... محبت کرنے کے لئے تو ہی رہ گیا ہے..... سارے مرد مر گئے ہیں..... جو میں تجھ سے محبت کروں گی'' رانی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''اری..... کھسو..... حرام خور..... شرابیوں..... جوئے بازوں سے تو اچھا ہی ہوں۔ حلال کی کماتا ہوں..... تجھے رانی بنا کر رکھوں گا.....''

شامو نے مسکراتے ہوئے کہا تو رانی کا پارہ ہائی ہو گیا۔

''ہٹ...... میرے راستے سے...... ورنہ اتارتی ہوں جوتی......'' وہ نیچے جھک کر اپنی ٹوٹی ہوئی چپل اتارنے لگی...... تو...... شامو ہنسنے لگا۔

''چل...... جا...... عیش کر...... سن...... میں...... یہ تیرے لئے لایا تھا'' شامو نے اپنی جیب میں سے ایک چاکلیٹ نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔

''مجھے نہیں چاہیے...... تیری حرام کی کمائی کا'' رانی غصے سے بولی۔

''بھیک کی کمائی...... تو...... بڑی حلال کی ہوتی ہے نا......'' شامو نے ہنستے ہوئے کہا اور رانی منہ بسورتے ہوئے آگے بڑھ گئی...... شامو اسے دیکھ کر ہنستا رہا۔

☆

شامو...... فقیروں کی جھگیوں سے کچھ فاصلے پر کچی بستی میں ایک خستہ حال مکان کرایے پر لے کر رہتا تھا۔ اس کے ساتھ دو اور ہیجڑے نرگس اور فردوس رہتے تھے اور ایک سولہ سترہ سالہ لڑکا جمی تھا جسے ہیجڑا بننے کا شوق تھا اور اس کی حرکتوں کی وجہ سے اس کے گھر والوں نے اسے گھر سے نکال دیا تھا۔ وہ ان لوگوں کے پاس آ کر رہتا تھا۔ ڈھولک بہت اچھی بجاتا تھا اور اس کی آواز بھی بہت اچھی تھی۔ شامو، فردوس اور نرگس کے ساتھ جمی نے مل کر بڑا زبردست گروپ بنا رکھا تھا۔ شامو نے اپنا حلیہ رانی کی خاطر مردوں جیسا بنا لیا تھا۔ نجانے کیوں وہ رانی کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا...... اور رانی اس کی باتوں اور حرکتوں سے چڑتی تھی۔ اسے گالیاں دیتی تھی، اس سے نفرت کرتی تھی مگر وہ اس کی باتوں پر مسکراتا رہتا تھا۔

''اے شامو...... یہ چاکلیٹ تو بڑا مزے کا لایا تھا...... ہمارے لئے، ہم سب نے کھا لیا...... آج ایک اور لے آنا'' نرگس نے صبح اٹھتے ہی شامو سے کہا تو وہ غصے سے اسے دیکھنے لگا۔

''مرے...... تو یہ تیرے لئے تھوڑا تھا...... کاہے کو کھایا'' شامو غصے سے جھگڑا کرتے ہوئے بولا۔

''اس پر نام تھوڑا ہی لکھا تھا...... کہ تو کس کے لئے لایا ہے...... ہم نے سمجھا میرے، فردوس اور جمی کے لئے لایا ہے'' نرگس ہنستے ہوئے بولی۔

''تو...... نے میری پینٹ کو کیوں ہاتھ لگایا...... خبردار آئندہ میری چیزوں کی تلاشی لی...... تجھ پر چوری کا پرچہ کرا دوں گا'' شامو دھمکی کے انداز میں بولا۔

''اے...... ہائے...... بتا تو سہی...... کس کے لئے آج کل بڑا بانکا بن ٹھن پھر رہا ہے اور جیب میں چاکلیٹ بھی رکھتا ہے'' نرگس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ہے...... کوئی...... پر...... وہ تو نہیں'' شامو غصے سے بولا۔

''اچھا...... غصہ تھوک، سن...... آج رات بڑی زبردست پارٹی کے ہاں جانا ہے...... پانچ ہزار ایڈوانس لے لیا ہے...... بڑے امیر لوگ ہیں...... تیرے ٹھمکے کے شوقین...... بس...... ایسا ناچنا کہ واہ واہ ہو جائے'' نرگس نے اسے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

"نرگس...... میں نے فیصلہ کرلیا ہے ناچ...... گانا چھوڑ کر کوئی کام شروع کروں گا" شامو نے سنجیدگی سے کہا۔

"ارے پاگل ہورہا ہے...... ہیجڑوں کو کام کون دیتا ہے...... کمبخت اس پاپی پیٹ کی بھوک مٹانے کیلئے کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں تجھے شاید معلوم نہیں......اور...... یہ دنیا کسی کو خواہ مخواہ روٹی بھی نہیں دیتی...... ارے ہمیں تو کوئی بھیک بھی نہیں دیتا...... خوش قسمت ہیں...... وہ...... جن کو بھیک مل جاتی ہے" نرگس کی آنکھیں نم ہونے لگیں اور وہ سسکنا شروع ہوگئی۔ شامو کی آنکھوں کے سامنے رانی کا چہرہ گھومنے لگا......

"اٹھ...... عقل کر...... اور تیاری پکڑ" نرگس نے اسے محبت سے سمجھایا۔

"نہیں...... آج تم لوگ جاؤ...... میری طبیعت ٹھیک نہیں" شامو نے کہا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

"اس کی عقل تو گھاس چرنے گئی ہے...... باؤلا ہوگیا ہے کمبخت" نرگس بولنا شروع ہوگئی...... فردوس اور جی کمرے میں سے باہر صحن میں آگئے۔

"کیا ہوا...... نرگس...... کاہے کو واویلا کررہی ہے؟" فردوس نے پوچھا۔

"شامو...... کا دماغ خراب ہوگیا ہے...... کہتا ہے ناچ گانا نہیں کروں گا...... محنت کروں گا......" نرگس نے بتایا۔

"آپا...... تو...... کرلینے دے اسے شوق پورا...... ہر ہیجڑے کے دل میں محنت کرنے کی جو آگ بھڑکتی ہے نا...... خود ہی ٹھنڈی پڑ جاتی ہے...... جب کھانے کو کچھ نہیں ملتا" فردوس نے کہا۔

"دفعہ کر...... اسے جانے دے...... تو...... کاہے کو جی میلا کرتی ہے...... لوگوں نے تو تماشا ہی دیکھنا ہے...... ہمارا دیکھ لیں...... ہم ہیں نا......" فردوس نے نم آنکھوں سے نرگس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو نرگس نے حیرت اور افسردگی سے اس کی جانب دیکھا اور خاموش ہوگئی۔

☆

رانی نے تھیلا الٹایا تو اس میں سے دو سوکھی روٹیاں، نان کے چند ٹکڑے اور دو تین گلے سڑے سیب نکلے جو اس نے غلہ منڈی سے گزرتے ہوئے چوری چوری اپنے تھیلے میں ڈالے تھے......اس کا چھوٹا بھائی متھو بھیک میں چند روپے لایا تھا اور کہیں سے چرائی ہوئی روٹیاں...... متھو بھی کہیں سے نیاز کے چاول لفافے میں بھر کر لایا تھا اور ان چاولوں کو دیکھ کر سب کے منہ میں پانی آرہا تھا۔

"ارے واہ...... متھو...... تو نے بڑا اچھا کام کیا ہے...... بڑے دنوں سے دیگ کے چاول کھانے کو جی چاہ رہا تھا......" ملکے نے جھگی کے فرش پر اپنے آپ کو گھسیٹ کر چٹائی کے قریب لاتے ہوئے کہا اور للچائی نظروں سے چاولوں کی طرف دیکھنے لگا۔ چاولوں کی خوشبو ساری جھگی میں پھیل گئی......اماں کی طبیعت بڑی خراب ہورہی تھی۔ اس کے ہاں آٹھویں بچے کی پیدائش متوقع تھی وہ جھگی کے ایک کونے میں فرش پر میلا کچیلا گدا بچھا کر لیٹی کراہ رہی تھی۔

"میری حالت خراب ہورہی ہے" اماں نے رانی کو پاس بلا کر کہا۔

رانی کو ہر سال ایسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس نے جلدی سے بچوں کو کھانا کھلایا اور ساتھ والی جھگی سے نوری کو بلا کرلے آئی۔ باہر موسم بہت خراب ہورہا تھا۔ رانی بچوں اور ابے کے ساتھ جھگیوں سے باہر اندھیرے میں ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئی۔ موسم زیادہ ٹھنڈا ہورہا تھا۔

بچوں نے خوشی خوشی آگ جلائی اور آگ تاپتے ہوئے کھیلنے لگے۔ رانی مسلسل خاموش تھی اور گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

''کیا ہم صرف جھگیوں میں رہنے کے لئے پیدا ہوتے ہیں اور یہیں مر جاتے ہیں...... مولا...... تو نے ہم کو کاہے کو پیدا کیا...... سڑکوں اور گلیوں سے بھیک اکٹھی کرنے کے لئے......'' ایک دم بارش شروع ہو گئی...... بچے سردی سے ٹھٹھرنے لگے......

''رانی...... ان کو نوری کی جھگی میں لے جا...... باہر بہت ٹھنڈ ہو رہی ہے'' ابے نے رانی سے کہا تو وہ انہیں نوری کی جھگی میں لے گئی۔ نوری کے شوہر جگو کی نظروں سے رانی کو بہت ڈر لگتا تھا۔

''کمبخت ...... کیسے دیکھتا ہے...... اس کے دیدے بھی نہیں پھٹتے'' رانی نے دل میں سوچا۔

''پتا نہیں...... اماں کو بھی کیا سوجھتی ہے...... بچوں کا ڈھیر اکٹھا کرتی ہے کوڑے پر چھوڑنے کے لئے...... پہلے ہی کھانے کو کچھ نہیں...... اوپر سے اور بچے اکٹھے کرتی جا رہی ہے'' رانی نے غصے سے سوچا۔

''پانچ بیٹے...... اور تین بیٹیاں...... کیا کم اولاد ہے...... جواب اور چاہیے تھی...... اماں کو بچے کونسے سنبھالنے پڑتے ہیں۔ میں، گڈی اور شبو ہی سنبھالتی ہیں...... جیسے بچے پالنے کا ٹھیکہ ہم نے لیا ہوا ہے...... اب کی بار تو خود ہی سنبھالے گی...... میں نے تو صاف نہ کر دینی ہے...... خود ہی پیدا کرتی ہے تو خود ہی سنبھالے'' رانی نے غصے سے سوچتے ہوئے تہیہ کر لیا۔

نوری جھگی میں داخل ہوئی تو رانی نے حیرت اور سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

''رانی...... اب تو گھر جا...... تیری ماں اب ٹھیک ہے'' نوری بولی۔

''کیا ہوا ہے......؟'' رانی نے بے صبری سے پوچھا۔

''اس کو جائے پلا دینا......'' نوری نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''نوری لڑکا ہوا ہے یا لڑکی؟'' رانی نے پھر پوچھا۔

''میں اب بہت تھک گئی ہوں...... جا کر خود ہی دیکھ لے'' نوری نے جلدی سے کہا...... تو رانی اس کی جھگی سے باہر نکل آئی۔ نوری کی جھگی سے اپنی جھگی تک کا فاصلہ اس نے بڑی مشکل سے طے کیا۔

اس کی عمر سولہ سال تھی۔ قدرے سانولی رنگت، خوبصورت نقوش، لمبے سیاہ بالوں اور دراز قد کے ساتھ وہ بڑی دلکش لگتی تھی۔ سارے بہن بھائیوں کے نقوش اچھے مگر رنگ سانولے تھے۔ وہ جلدی سے اپنی جھگی میں داخل ہوئی۔ اس کی ماں یوں بے سدھ پڑی تھی جیسے اس کو کوئی سانپ سونگھ گیا ہو، اس کے پہلو میں ایک چھوٹا سا خوبصورت، گوری چٹی رنگت والا صحت مند بچہ بلک رہا تھا۔ ماں اس کے رونے بلکنے سے بے بہرہ چھت کو گھورتی جا رہی تھی اور آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ بہہ کر اس کے سر کے نیچے گدے سے تکیے کو بھگو رہے تھے۔

''اماں...... کیا ہوا ہے...... اور...... تو...... کیوں رو رہی ہے؟'' رانی نے اس کی نم آنکھوں کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''رو رہی ہے...... اپنی کالی کرتوتوں کو...... نجانے کیا کچھ......'' ابا بیساکھیوں کی مدد سے جھگی کے اندر آیا اور غصے سے برکتے کی طرف

دیکھتے ہوئے بولا۔ اس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں اور چہرے پر انتہائی غصے کے آثار نمایاں تھے۔

برکتے نے بے بسی اور رحم طلب نظروں سے اس کی طرف یوں دیکھا جیسے سارا قصور اسی کا ہو...... اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کی آہوں اور سسکیوں سے جگی کا بوسیدہ حال کپڑا بھی لہرانے لگا۔

"مگر ہوا کیا ہے......؟ ابا...... تو...... کیوں...... اماں پر برس رہا ہے؟" رانی نے حیرت سے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اری...... اس کو کھ جلی نے ہیجڑا جنا ہے...... کیا اس کو میں مبارکباد دوں......؟ کمبخت نے ناک کٹوا کر رکھ دی ہے...... ساری بستی میں خبر پھیل گئی ہے...... کہیں منہ دکھانے کا نہیں چھوڑا...... اس سے بہتر تھا یہ کچھ بھی نہ جنتی...... مجھے مرا ہوا بچہ قبول تھا مگر یہ نہیں......" ابے نے غصے سے برکتے کو گھورتے ہوئے کہا۔ رانی نے حیرت سے اپنے دونوں ہاتھ منہ کے اوپر رکھ کر اپنی چیخ روکنے کی کوشش کی...... اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا...... کیا کہے...... اس کی آنکھوں کے سامنے شامو کا چہرہ گھوم گیا۔

"تھوکتی ہوں میں تجھ پر...... میرے لئے تو ہی رہ گیا ہے جو تیرے پاس بیٹھ کر منہ کالا کروں...... ہیجڑا نا مراد"

رانی کو اپنے کہے ہوئے الفاظ یاد آنے لگے...... اور اس کی آنکھوں میں حیرت اور تاسف کا رنگ نمایاں ہونے لگا۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگیں۔ وہ بچے کی طرف دیکھتی تو آنکھوں کے سامنے شامو کا چہرہ نظر آتا۔

"اٹھا...... اسے...... اور کہیں پھینک آ...... مجھے نہیں چاہیے...... یہ بد......" ابا غصے سے بولا۔

"حرام کا نہیں ہے...... جو...... پھینک آؤں" اماں بمشکل اٹھ کر بولی اور رونے لگی...... بچہ بلکتا چلا جا رہا تھا۔

"مولا جانے...... کیا ہے...... کیا نہیں...... پر...... یہ...... یہاں نہیں رہے گا......" ابا غصے سے بچے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"ملکیا...... تو...... اس کا باپ ہے...... کا ہے کو اتنا جالم (ظالم) بن رہا ہے...... انسان ہے یہ بھی...... مولا کی دین ہے" برکتے نے اسے روتے ہوئے گود میں اٹھایا۔

"اری...... کونسا انسان...... ان جیسوں کو کون انسان سمجھتا ہے...... کون ان کو گھروں میں رکھتا ہے، خبردار جو تو نے اسے اپنا دودھ پلایا......" ملکے نے بچہ اس سے چھینتے ہوئے کہا۔

"رب کا خوف کر...... ماں ہوں میں اس کی...... مجھے دودھ تو پلانے دے...... بیچارے کا اس میں کیا قصور...... رب نے جو اس کے ساتھ کیا ہے...... تو...... تو...... نہ کر...... دیکھ کب سے بھوک سے تڑپ رہا ہے...... معصوم بھوک سے ہی مر جائے گا" برکتے نے رحم کی بھیک مانگتے ہوئے ملکے سے کہا۔

"مر جائے...... تو زیادہ اچھا ہے......" ملکا غصے سے بولا۔

بچے کے بلکنے کی آواز زور پکڑ رہی تھی...... رانی تو حیرت کے مارے کچھ نہیں بول رہی تھی۔ وہ ماں باپ کو حیرت سے باتیں کرتے ہوئے سن رہی تھی مگر نظریں مسلسل بچے پر تھیں۔

"ملکے ...... اتنا جالم نہ بن...... رب غصے ہو جائے ہے" برکتے نے کہا۔

"ہوتا ہے...... تو...... ہو جائے...... کاہے کو...... ہمیں ایسا بچہ دیا" ملکا غصے سے بولنے لگا۔

"توبہ...... توبہ...... رب سے زوراز وری کر رہا ہے...... میرے سے معصوم بچے کا رونا نہیں دیکھا جا رہا......" اور برکتے روتے ہوئے اسے دودھ پلانے لگی۔

ملکے نے غصے سے بچہ اس کے ہاتھ سے چھیننے کی کوشش کی۔ برکتے نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا...... بچہ اور زیادہ اونچی آواز سے بلکنے لگا۔ رانی حیرت سے انہیں دیکھتی رہی۔ بجو اور مٹھو ماں باپ کو دیکھتے رہے۔ باقی کے بچے توری کی جگی میں بے خبر پڑے سوتے رہے۔ ملکے نے برکتے کو زور سے دھکا دیا...... اور اسی کوشش میں بیساکھیاں اس کے بازوؤں کی گرفت سے ڈھیلی پڑ گئیں اور وہ دھڑام سے نیچے گر گیا۔

"کمزا تھ سے ہو انہیں جا رہا...... اور لگا ہے بچے کو چھیننے" برکتے نے غصے سے کہا۔

ملکا پھر غصے سے اٹھا اور بچے کو چھین کر اپنی چادر کے نیچے چھپایا اور بیساکھیوں کے سہارے اپنے آپ کو گھسیٹتا ہوا باہر نکل گیا۔ باہر کڑا کے کی سردی پڑ رہی تھی۔ پو پھٹنے میں ابھی کچھ وقت تھا۔

بارش کے بعد موسم بہت سرد ہوا تھا۔ برکتے اونچی آواز سے رونے لگی اور رانی بے بسی سے ماں کو دلاسا دینے لگی...... وہ بچوں میں سب سے بڑی تھی اور اس پر ہی تو ماں کو سنبھالنے کی ذمہ داری تھی۔ برکتے روتی، پیٹتی اور سینہ کوبی کرتی جا رہی تھی۔

"ہائے...... اس غریب کو جالم کہاں لے گیا...... باہر تو بڑی سردی ہے...... یا اللہ! میں کیا کروں...... تو ہی بچے کی حفاظت کرنا...... ملکے تو آگ کما رہا ہے...... جالم کہیں کے......" برکتے سینے پر زور زور سے ہاتھ مارتی جا رہی تھی اور روتی جا رہی تھی۔ رانی کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ وہ کیا کہتی کیسے دلاسا دیتی...... وہ بس ماں کے ہاتھ پکڑ کر اسے سینہ کوبی سے روکنے کی کوشش کرتی۔

☆

نرگس، فردوس اور جمی رات کو محفل سے واپس آ رہے تھے۔ شاموان کے ساتھ نہیں گیا تھا۔ اس لئے اس کی کمی محسوس ہوتی رہی مگر پھر بھی انہوں نے بہت روپیہ اکٹھے کر لیے تھے۔ وہ نیند اور تھکاوٹ سے چُور باتیں کرتے جا رہے تھے۔ ساری رات انہوں نے گانے بجانے کی محفل کو گرم رکھا تھا۔ تماشائیوں نے بھی ان سے بھرپور لطف اٹھایا تھا۔ کیسے کیسے انہیں تنگ نہیں کیا تھا۔ مگر وہ تو ان کا دل لبھانے آئے تھے۔ انہیں خوش کرنے آئے تھے۔ ان کی بری حرکتوں پر ان کے دل کٹتے تھے اور وہ کیسے پسینے میں بھیگ جاتے تھے...... دوسروں کو کیا خبر......! شاید قدرت نے ہی انہیں تماشا بنا رکھا تھا۔ دوسروں کو خوش کرنے کی بھاری ذمہ داری انہیں سونپ رکھی تھی اور وہ آنسو پی پی کر...... اپنے دلوں کو لہولہان کرتے ہوئے یہ فریضہ خوش اسلوبی سے انجام دینے کی کوشش کرتے۔

رات بہت سرد تھی اور ختم بھی ہونے والی تھی۔ تینوں باتیں کرتے ہوئے سڑک پر سے گزر کر اپنی بستی کی طرف جا رہے تھے۔ اچانک کسی بچے کے رونے کی تیز آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔

''ارے جی...... فردوس...... یہ آواز سن رہی ہو'' نرگس نے ان کی آواز کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... کسی بچے کے رونے کی آواز ہے...... آواز اس طرف سے آرہی ہے'' فردوس نے دائیں طرف اشارہ کیا۔

''ارے جی...... اپنی ٹارچ تو ادھر کر'' نرگس نے کہا تو جی نے اپنی ٹارچ ان کے آگے کی...... ذرا فاصلے پر کوڑے کرکٹ کا ڈھیر تھا...... وہاں ایک گندے سے کپڑے میں شیر خوار بچہ رو رہا تھا۔ بہت زیادہ سردی سے اس کا جسم اور چہرہ ٹھنڈا برف ہو رہا تھا مگر مسلسل رونے کی وجہ سے گلے کی رگیں پھول رہیں تھیں۔ فردوس نے آگے بڑھ کر بچے کو اٹھالیا۔

''کوئی حرامی لگتا ہے'' فردوس بڑبڑائی۔

''اے... ہائے... کیا بک رہی ہے... دیکھ تو سہی... رو رو کر اس کا کیا حال ہو رہا ہے'' نرگس نے اسے ٹوکا۔

فردوس نے جلدی سے اسے ساتھ لگایا اور اس کے گیلے کپڑے اتار کر اپنی جیکٹ میں لپیٹنا چاہا...... تو چونک گئی۔

''اری...... نرگس...... یہ تو تیرے میرے جیسا ہے...... نامراد اسے پھینک گئے...... مرے اس کی کلموئی ماں...... جو اس کو ایک دن بھی نہ رکھ سکی... '' فردوس گالیاں بکتے ہوئے بولی۔

''ہاں...... ایک دن کا ہی لگتا ہے...... چل...... جلدی سے گھر لے چل...... باہر ٹھنڈ بہت ہو رہی ہے'' نرگس نے کہا۔

فردوس نے اسے جلدی سے اپنے ساتھ لگایا اور گھر لے آئی۔ گھر پہنچی...... تو شامو گھر آچکا تھا اور سو رہا تھا۔ ان کے ساتھ بچے کے رونے کی آواز سن کر ہڑبڑا کر اٹھ گیا......

''اری...... نرگس...... فردوس...... یہ کہاں سے اٹھا لائی......؟'' شامو نے حیرت سے بچے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''یہ...... ہمارا ہی ہے'' فردوس مسکرا کر بولی۔

''ہمارا...... کہاں سے......؟ سچ بتاؤ...... کہاں سے اٹھا لائی، صبح کو پولیس گھر آگئی...... تو پھر بتانا...... کس کا ہے اور کہاں سے لائی......؟'' شامو نے خفگی سے کہا۔

''کا ہے کو بگڑ رہا ہے...... اپنی بستی سے باہر کوڑے کے ڈھیر سے اٹھا کر لائی ہیں...... کسی نے وہاں پھینک دیا تھا...... ہے تو ہماری جنس...... اس لئے اٹھالائے'' فردوس نے کہا۔

''اللہ نے ہماری بھی جھولی بھر دی...... سچ ہمیں بھی تو کھیلنے اور دل بہلانے کو بچے چاہیے ہوتے ہیں...... ادھر ادھر سے وہ ایسے بچوں کو بھیج کر ہماری جھولیاں بھرتا ہے۔ واہ مولا! تیرے بھی عجیب ہی رنگ ہیں'' نرگس خوشی کے مارے پھولی نہ سما رہی تھی...... اور بچے کے وارے نیارے جا رہی تھی...... دوپٹے کے پلو سے دس دس کے نوٹ نکال کر بچے کے سر سے وارے اور فردوس کو پکڑانے لگی۔

''یہ بچے کے سر کا صدقہ ہے...... صبح خیرات کر دینا'' نرگس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''آپا...... اس کو بہت بھوک لگی ہے...... ہمارے گھر میں تو فیڈر بھی نہیں...... کیسے دودھ پلائیں'' فردوس نے نرگس سے کہا۔

''شامو...... جا...... کہیں سے فیڈر لے آ'' نرگس نے کہا۔

''میں نہیں جا رہا فیڈر لینے جہاں سے بھی لینے جاؤں گا سب پوچھیں گے کس کے لئے...... تو...... میں کیا جواب دوں گا اور ویسے بھی لوگ پوچھتے کم مذاق زیادہ بناتے ہیں'' شامو نے منہ بسورتے ہوئے جواب دیا۔

''اے جی...... جا تو کہیں سے فیڈر لا...... بچہ بڑا ہی بھوکا ہے۔ دیکھ تو سہی بھوک سے نڈھال ہو رہا ہے...... ماں صدقے جائے...... تجھ پر...... چپ کر جا...... میرے لال'' نرگس نے بچے کو اپنے کندھے کے ساتھ لگاتے ہوئے چپ کرانے کی کوشش کی۔

جمی اس کی بات سن کر باہر نکل گیا۔

''بیچارا...... اس دنیا کا عذاب سہنے آ گیا ہے...... پتہ نہیں مولا بھی اپنے کیا رنگ دکھانا چاہتا ہے...... اپنی خوشی کے لئے ہم جیسوں کو ساری زندگی کے لئے سولی پر لٹکا دیتا ہے'' شامو نے نم آنکھوں سے کہا۔

''ارے چپ کر...... خواہ مخواہ بدشگونی نہ کر...... وہ مولا ہے...... بہتر جانتا ہے اس نے کیا کرنا ہے...... ہمارے گھر بچہ آیا ہے...... ہمیں اس کی خوشی منانی ہے......'' نرگس نے شامو کو ڈانٹا اور نیند اور تھکاوٹ سے چور جمائیاں لینے لگی لیکن کسی نے بھی سونے کی خواہش ظاہر نہ کی تھی۔ بچے کو پا کر وہ اس قدر خوش تھیں کہ انہیں نیند بالکل ہی بھول چکی تھی۔

جمی کہیں سے چھوٹا سا فیڈر لے آیا اور بچے کو دودھ پلایا۔ گرم کپڑوں میں لپیٹ کر اسے سلا دیا۔

''اس کے آنے سے ہماری زندگیاں بھی رنگین ہو جائیں گی...... میں آج ہی اس کے لئے رنگ برنگی کپڑے اور کھلونے لاؤں گی'' نرگس نے کہا۔

''اور آپا...... دیکھو کتنے نصیب والا ہے...... محفل سے جتنے پیسے آج ملے ہیں پہلے کبھی نہیں ملے...... مولا نے اس کے آنے سے پہلے ہی ہماری جھولی بھر دی'' فردوس نے خوشی سے کہا۔

''اور میں جانتا ہوں...... یہ کتنا بدنصیب ہے...... اس کی حیثیت تو راکھ جتنی بھی نہیں'' شامو نے آہ بھر کر سوچا اور کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔

☆

رانی کا دل بہت بوجھل ہو رہا تھا...... رات کو جو کچھ ہوا تھا اس نے اس کے دل و دماغ کو بہت پریشان کر رکھا تھا۔ کیسے تھوڑی ہی دیر میں کیا کچھ ہو جاتا ہے۔ رات کو بچہ پیدا ہوا اور صبح کو اس کا نام و نشان تک نہ تھا...... ملکا نجانے اسے کہاں چھوڑ آیا تھا۔ برکتے چیختی رہی اور اس سے پوچھتی رہی کہ وہ اسے اس کا کچھ تا پتا تو بتائے۔ اسے ڈر تھا کہ اس نے اسے مار ہی نہ دیا ہو...... مگر وہ اسے کچھ بھی نہیں بتا رہا تھا۔

''ملکے...... اسے کہاں چھوڑ کے آیا ہے؟'' برکتے نے بے بسی سے پوچھا۔

''اسے دفنا آیا ہوں...... اب آئندہ اس کے بارے میں مت پوچھنا'' ملکے نے غصے سے جواب دیا۔

''ہائے...... میں...... مر گئی...... زندہ کو دفنا آیا ہے...... جالم...... رب تجھے کبھی معاف نہیں کرے گا...... ارے کوئی باپ بھی اتنا جالم ہو سکتا

ہے......" برکتے نے روتے ہوئے کہا۔

"میں اس کا باپ نہیں ہوں........سنا تو نے.......خبردار جو مجھے اس کا باپ کہا...... مجھے اپنی نامردی محسوس ہوتی ہے......حرام خور نجانے کہاں کی بلا تھی.......جو میرے سر منڈھ رہی ہے" ملکے نے غصے سے چلاتے ہوئے کہا۔

تیری جبان میں کیڑے پڑیں جو ایسے اول فول بول رہا ہے، کمبخت تجھے نہیں پتہ........ کہ مولا جو چاہے پیدا کر سکتا ہے۔ برکتے نے روتے ہوئے کہا اور ملکا اسے گھورتا ہوا باہر نکل گیا۔ برکتے کی رو رو کر ہچکی بندھ گئی تھی۔ نوری کی جھگی سے سارے بچے واپس اپنی جھگی آئے تو ہر طرف افسردگی اور ماتم جیسی خاموشی تھی۔ رانی خاموش سے کونے میں بیٹھی تھی۔ اماں نے کچھ نہیں کھایا پیا تھا۔ رانی نے کالی سیاہ چائے کا ایک کپ بنا کر اسے دیا۔

"کیسے ہیں......؟ پتہ نہیں اس نے بھی کچھ پیا ہے کہ نہیں" برکتے بے بسی سے بولی تو رانی خاموش ہو گئی۔ اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اس نے بچوں کو تھوڑا بہت ناشتہ کرایا اور خاموشی سے تھیلا اٹھا کر چلی گئی...... بستی سے باہر نکلتے ہی اس کی نظریں شامو کی متلاشی تھیں مگر وہ کہیں نظر نہ آیا۔ آج اس کا دل چاہ رہا تھا شامو نظر آئے اور وہ اس سے کچھ پوچھے...... کچھ...... کچھ......؟ مگر کیا......؟ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ سارا دن افسردگی سے وہ ادھر ادھر ماری ماری پھرتی رہی۔ شام کو وہ واپس آ رہی تھی تو شامو اسے راستے میں نظر آ گیا۔ آج رانی اسے دیکھ کر چلائی نہیں تھی۔ اسے گالیاں نہیں دی تھیں۔ اس نے اسے کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی...... شامو بہت حیران ہو رہا تھا۔

"لیلیٰ......کیا ہوا تجھے......آج بڑی چپ ہے...... کسی حرامزادے نے تجھے چھیڑا تو نہیں دیا...... ایک بار اس کا نام بتا...... پھر دیکھ اس کے ٹوٹے کر آؤں گا" شامو نے ہوا میں اپنا مکا لہراتے ہوئے کہا۔

رانی خاموشی سے اس کی طرف یوں دیکھتی رہی جیسے اس کی بات اس نے سنی ہی نہ ہو۔

"شامو......تم......لوگ......" رانی نے بہت آہستہ سرد لہجے میں کہا۔

"کیا......ہم......لوگ......؟" شامو نے حیرت سے پوچھا۔

"تم لوگ......تم......" وہ ہونٹ چبانے لگی۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کیا کہے......؟ کیا پوچھے......؟ اس کی طرف بے بسی سے دیکھتی رہی اور آگے بڑھ گئی۔

"اے لیلیٰ......آج تجھے کیا ہوا ہے...... بڑی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو......لگتا ہے کوئی مسئلہ ہو گیا ہے" شامو اس کے جانے کے بعد سوچ میں پڑ گیا۔

☆

نرگس، فردوس اور جمی نے بچے کی خوشی میں میٹھے چاول پکا کر بانٹے تھے، ناچ ناچ کر اور اسے گود میں اٹھا کر لوریاں دیں...... سارا محلہ اکٹھا ہو گیا۔ سب میں مٹھائی بانٹی گئی۔

"خیر سے بچہ ہوا کس کے ہاں ہے...... یہ تو بتاؤ؟" ایک آدمی نے مٹھائی کھاتے ہوئے مذاقاً کہا۔

''مٹھائی کھانی ہے تو کھا...... ورنہ ادھر پکڑا...... فضول باتیں مت کر......'' نرگس نے اس کے ہاتھ سے مٹھائی چھینتے ہوئے کہا۔

''ارے میں تو...... یونہی کہہ رہا تھا۔ بچے کی ماں کو مبارکباد دینا چاہتا ہوں......'' اس آدمی نے جواب دیا۔

''میں ہوں اس کی ماں...... لے لی مبارکباد...... چل جا اب دفعہ ہو یہاں سے'' نرگس نے غصے سے اسے کہا تو وہ شرمندہ سا وہاں سے کھسک گیا۔

''اچھا بچے کا نام کیا رکھا ہے......؟'' ایک اور آدمی نے پوچھا۔

''تیرے نام پر نہیں رکھا...... ہماری مرضی جو دل چاہے کہہ کر بلائیں...... تجھے کیا تکلیف ہے......'' فردوس نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''سارے حرامزادے...... چسکے لینے آجاتے ہیں...... ہر وقت کا مذاق بھی کوئی اچھی بات ہے...... گھروں سے چاہے جوتیاں کھا کر آئیں باہر آ کر اپنی مردانگی کا رعب جھاڑتے ہیں...... اونہہ...... آئے بڑے مرد'' نرگس نے غصے سے گالیاں بکتے ہوئے کہا اور گھر کا دروازہ بند کر لیا۔

''فردوس چل بازار چلیں...... بچے کے لئے کپڑے اور کھلونے لے کر آئیں؟'' نرگس نے کہا۔

''آپا بچے کو بھی لے کر چلیں......؟'' فردوس نے حیرت سے پوچھا۔

''اری نہیں...... اسے جی کے پاس چھوڑ جاتے ہیں...... سن رے جی گھر ہی رہیو...... اور سن اسے شامو کے حوالے کر کے کہیں نہ جانا۔ وہ اس سے بڑی خار رکھتا ہے کہیں اسے مار ہی نہ دے'' نرگس نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

''ہائے...... میں مرگئی...... آپا...... یہ کیا کہہ رہی ہے...... شامو اتنا سنگدل اور ظالم ہو گیا ہے...... کہ بچے کو مار دے گا...... اللہ کی مار...... اس کمبخت نے جب سے مردانہ کپڑے پہننے شروع کیے ہیں...... مردوں کی طرح ہی سوچنا شروع ہو گیا ہے...... اسے کیا معلوم...... ماں کا دل کتنا نازک ہوتا ہے......'' فردوس نے اپنے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے اس کے تیور ٹھیک نہیں لگ رہے...... جی بچے کا خیال رکھنا...... صدقے جاؤں...... میری بلی...... میری گڈی...... میں ابھی آجاؤں گی...... رونا مت...... اور جی ماموں کو تنگ بھی نہ کرنا'' نرگس نے بچے کو چومتے ہوئے کہا۔

''چل ری...... فردوس...... بازار میں بڑا ٹیم لگے گا......'' نرگس نے کہا اور دونوں پرس سنبھال کر بازار کی طرف چل پڑیں، جہاں بچوں کے کھلونے اور کپڑے دیکھ کر رکتیں...... وہیں دکاندار اور لوگ ان کا مذاق اڑانا شروع کر دیتے۔

''ارے بھائی...... ذرا یہ گڑیا تو دکھا......'' نرگس نے ایک خوبصورت سی گڑیا کی طرف اشارہ کیا۔

''اچھا...... پہلے ٹھمکا تو لگا......'' دکاندار نے ہنستے ہوئے کہا۔

''چل...... دفعہ ہو...... مر...... میں کہیں اور سے لے لیتی ہوں'' نرگس نے جواب دیا۔

''یہ فراک کتنا پیارا ہے...... کتنے کا ہے......؟'' فردوس نے ایک دکاندار سے پوچھا۔

دکاندار نے ان کی طرف کوئی توجہ نہ کی اور دوسرے گاہکوں کو کپڑے نکال نکال کر دکھاتا رہا۔

''ارے بھائی...... یہ فراک دکھادو'' فردوس نے پھر کہا۔

دکاندار نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی۔

''ارے سنتا نہیں ...... کب سے کہہ رہی ہوں فراک دکھا...... ہم کب سے ادھر کھڑی ہیں...... تجھے نظر نہیں آتا'' نرگس نے خفگی سے کہا۔

''چل ہٹ ...... ادھر سے ...... اپنا آپ تو دیکھو ...... پھر شاپنگ کرنا، منہ اٹھا کر چلی آتی ہو ...... بھلا فراک تمہارے کس کام کا؟'' دکاندار بدتمیزی سے بولا۔

''ہم اپنے ......'' نرگس نے کچھ کہنا چاہا مگر فردوس نے اسے اشارے سے روک دیا۔

''چل ادھر سے ...... کہیں اور چلتے ہیں'' فردوس نے اسے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ کرلے گئی۔

''کاہے کو بچے کے بارے میں سب کو بتاتی ہے ...... پھر الٹی سیدھی سنے گی ...... آپا کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے ...... اللہ کی یہ زمین صرف مردوں اور عورتوں کے لئے ہی ہے ...... ہمارے لئے تو کوئی جگہ ہی نہیں ...... پتہ نہیں اس نے ہمیں انسانوں جیسی شکل وصورت کیوں دی ......؟ جانور ہوتے تو کوئی طعنے تو نہ دیتا نا ...... بے زبان کسی سے کچھ نہ پوچھتے مگر یہاں سب کے درمیان پیدا کر کے اس نے ہم سب سے بڑی زیادتی کی ہے ...... ہمیں لوگوں کو بتانا پڑتا ہے کہ ہم ہیں ...... اور ...... ادھر کھڑے ہیں مگر کوئی قدم رکھنے کو اور جگہ دینے کو تیار نہیں ہوتا ......'' فردوس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''ہاں ...... کبھی کبھی تو لگتا ہے ...... اللہ کی اس زمین پر کوئی ہمارا ہمدرد نہیں ...... کوئی ہمارے دکھوں کو نہیں سمجھتا ...... کچھ مولا نے ہمارے ساتھ زیادتی کی ...... اور ...... اس سے بڑھ کر اس کے بندے ہمارے ساتھ کرتے ہیں ......'' نرگس نے نم آنکھوں سے جواب دیا۔

''اے چمپا ...... کلی ...... ریشم ...... ریما ...... لال اور سبز پری کدھر کو جا رہی ہو ......؟ آج تو بڑے فیشن کر رکھے ہیں ...... یہ آنکھوں کے میزائل کدھر گرانے کے ارادے ہیں'' ایک جوان لڑکے نے پاس سے گزرتے ہوئے فردوس کو چٹکی کاٹ کر ہنستے ہوئے کہا۔

''اوئی میں مر گئی ...... اللہ کرے مرے تو ...... اور تیرے اگلے پچھلے بھی یہ میزائل میں تیری ماں کے گھر گراؤں گی ...... سارے سڑ کر راکھ ہو جائیں گے ......'' فردوس نے اسے گالیاں بکتے ہوئے کہا اور لڑکا ہنستا ہوا آگے نکل گیا۔ آگے جا کر وہ مڑ مڑ کر دیکھنے لگا، اس کی شرارت پر بازار کے سارے مرد ہنسنے لگے اور کوئی ادھر سے فردوس کو چھیڑنے لگا ...... کوئی دوسری جانب سے ...... فردوس روہانسی ہوگئی۔

''آپا گھر چل ...... یہاں تو سارے تماش بین اکٹھے ہوئے ہیں ...... بیڑا غرق ان کا ......'' فردوس نے کہا۔

''اری ...... بچے کے لئے کوئی خریداری تو کی ہی نہیں ...... ایسے ہی خالی ہاتھ کیسے چلے جائیں؟'' نرگس نے حیرت سے جواب دیا۔

''آپا ...... یہاں کوئی شاپنگ کرنے دے گا تو کرو گی نا ...... سب ہم سے مستی، شرارت اور مذاق کرتے ہیں ...... کوئی تجھے کچھ نہیں دے گا ......'' فردوس نے کہا۔

''اے ہائے ...... فردوس ...... بچے کے پاس تو ڈھنگ کے کپڑے بھی نہیں ...... سویٹر بھی نہیں ...... چل ادھر آ ...... یہ دکاندار بوڑھا ہے ...... اس سے لے لیتے ہیں'' نرگس نے ایک چھوٹی سی دکان پر کھڑے بوڑھے آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور اس سے چند جوڑے کپڑوں کے خریدے اور گھر واپس آ گئیں۔

☆

''اے جی...... کیا مصیبت ہے...... جب سے میں گھر آیا ہوں یہ ریں ریں کر رہا ہے...... دو پل بھی سکون سے لیٹنے نہیں دیا...... اچھا خاصا گھر میں سکون تھا، پتہ نہیں کہاں سے یہ مصیبت اٹھا لائے؟'' شامو نے غصے سے جی کو کہا جو روتے ہوئے بچے کو کندھے سے لگائے چپ کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''کوڑے کے ڈھیر سے اٹھایا ہے اسے...... نہ اٹھاتے تو مر جاتا بیچارا'' جی خالص زنانہ آواز نکالتے ہوئے بولا۔

''تو مر جاتا...... ہم کیا کرتے......؟'' شامو غصے سے بولا۔

''شامو...... یہ انسان کا بچہ تھا...... کتے بلی کا تو نہیں جو ہم اسے دیکھ کر وہیں پھینک آتے'' جی نے کہا۔

''اور جن کا ہے ان کو پھینکتے ہوئے کوئی خیال نہیں آیا...... تو تم لوگوں نے کیوں اٹھایا؟'' شامو بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

''ہائے شامو...... کیسی باتیں کر رہا ہے...... تیرے سینے میں دل نہیں کیا......؟ جو تو ایسی باتیں کر رہا ہے......'' جی نے بچے کو دوسرے کندھے کے ساتھ لگا کر پھر چپ کرانے کی کوشش کی...... تو...... شامو اس کی بات سن کر خاموش ہو گیا اور غصے سے باہر نکل گیا۔ فردوس اور نرگس گھر میں داخل ہوئیں۔ ان کے ہاتھ میں بچے کے لئے بہت سی چیزیں، کپڑے کھلونے اور پھل وغیرہ تھے۔ نرگس نے آتے ہی بچے کو پکڑا اور والہانہ انداز میں اسے چومنے لگی اور سینے کے ساتھ لگا لیا۔ بچہ خاموش ہو گیا۔

''ماں صدقے...... اپنی ماں سے اداس ہو گیا تھا...... دیکھ کیسے میرے پاس آتے ہی چپ ہو گیا ہے'' نرگس نے فرط جذبات سے لبریز نم آنکھوں کے ساتھ جی اور فردوس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ بھی مسکرانے لگیں۔

☆

برکتے کا رو رو کر برا حال ہو گیا تھا۔ نجانے اسے کیا ہوا تھا۔ اس کے معدے میں کوئی چیز ٹھہری نہ رہی تھی۔ پانی پیتی تو وہ قے کر دیتی...... دودھ یا چائے کچھ بھی ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ دو تین دن سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا اور نہ ہی اسے بھوک لگ رہی تھی...... سوائے چھوٹے بچوں کے کسی نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ نجانے کیسی اداسی چھا گئی تھی...... کوئی کسی سے نہ بات کرتا...... نہ کچھ کہتا بس خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے اور نظریں پھیر لیتے...... رانی، باپ کی طرف دیکھتی تو وہ منہ پھیر دیتا...... بجو اور مشو نے تو آپس میں بات تک کرنا چھوڑ رکھی تھی...... برکتے خاموش سی چارپائی پر لیٹی آہیں بھرتی کروٹیں بدلتی رہتی...... ہائے ہائے کی آوازوں پر سب چونک کر اسے دیکھتے اور پھر خاموش ہو جاتے۔

''بجو...... جا تھوڑا سا دودھ ہی لے آ...... اماں کو چائے بنا دوں'' رانی نے بجو کو دس سکے اکٹھے کر کے اور ایک گلاس پکڑاتے ہوئے کہا، وہ خاموشی سے گلاس لے کر چلا گیا۔

بجو نے دودھ کا گلاس دکاندار کے آگے کیا۔

''اس میں دس روپے کا دودھ ڈال دے......'' بجو نے سکے پکڑاتے ہوئے کہا۔

''اب کس کے لئے...... اتنا سا دودھ لیتا ہے......'' دکاندار نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''اماں کے لئے.....'' تجو نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

''سنا ہے.....تیری ماں نے ہنجڑا جنا ہے'' دکاندار نے ہنستے ہوئے کہا۔

شامو بھی وہاں دودھ لینے کھڑا تھا اس نے مڑ کر تجو کی طرف حیرت سے دیکھا۔ تجو کو کچھ سمجھ میں نہ آیا کیا کہے، اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں.....شامو نے اس کی طرف دیکھا۔''ہنجڑا گھر میں ہی ہے یا کوڑے کے ڈھیر پر پھینک آئے؟'' دکاندار نے ہنستے ہوئے تجو کو گلاس پکڑاتے ہوئے کہا.....ساتھ بنچ پر بیٹھے کچھ لوگ بھی ہنسنے لگے۔

تجو نے خاموشی سے گلاس پکڑا اس کا چہرہ پسینے سے شرابور ہونے لگا۔

''لا.....اس میں تھوڑا سا دودھ اور ڈال دوں.....ہنجڑے کو بھی تو پلانا ہوگا.....'' دکاندار نے پھر ہنستے ہوئے کہا۔

تجو نے غصے سے اس کی طرف دیکھا اور گلاس زور سے دکاندار کے چہرے کی طرف پھینکا۔ دودھ اس کے چہرے پر گر گیا اور تجو وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔

''ٹھہر جا.....تو.....حرام خور.....ایک ہمدردی کرو.....اوپر سے یہ بدلے.....'' دکاندار بڑبڑانے لگا۔

شامو دکاندار کی طرف دیکھنے لگا۔

''چاچا.....تجھے کیسے پتہ چلا کہ ان کے ہاں ہنجڑا پیدا ہوا ہے'' شامو نے حیرت سے پوچھا۔

''لے تجھے تو جیسے پتہ ہی نہیں.....تیرے ہی گھر میں تو ہے اور کس نے جنا ہے.....جو فردوس اور نرگس لڈو بانٹتی پھر رہی ہیں۔ سب کو خبر ہے کہ ملکے نے بچہ کہاں پھینکا اور کس نے اٹھایا.....اب.....بستی ہے ہی کتنی.....سب کو سب کی خبر ہے.....مگر.....میں اس کمبخت کو نہیں چھوڑوں گا۔ میرے سارے کپڑے خراب کر گیا ہے'' دکاندار نے کہا تو شامو خاموشی سے وہاں سے چلا گیا۔

☆

''تجو تو دودھ نہیں لایا.....اور گلاس کہاں ہے؟'' رانی نے حیرت سے پوچھا۔ تجو کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا اور اس کی ناک کے نتھنے پھول رہے تھے۔

''نہیں لایا دودھ.....اور آئندہ مجھے باہر سے کچھ لانے کو مت کہنا'' تجو غصے سے بولا۔

''کیا تو کسی سے لڑ کر آیا ہے؟'' رانی نے اسے پوچھا۔

''باہر ہر کوئی یہی پوچھتا ہے.....تیری اماں نے ہنجڑا جنا ہے.....کہاں ہے وہ.....؟ بس میں نہیں جاؤں گا'' تجو نے روتے ہوئے جواب دیا۔

''ساری بستی میں تھو تھو ہو رہی ہے۔ سب آتے جاتے مزے لے لے کر باتیں کرتے ہیں.....اب یہاں رہنا مشکل ہو گیا ہے.....سامان باندھو اور کسی دوسرے شہر چلتے ہیں۔ ہم یہاں رہ کر بے عزتی برداشت نہیں کر سکتے'' ملکے نے اچانک اپنا فیصلہ سنایا تو سب نے چونک کر اسے دیکھا۔

''مگر.....ابا.....ہم کہاں جائیں گے.....یہاں ہماری جھگی ہے'' رانی نے حیرت سے کہا۔

''جھگی ہے...... کوئی کوٹھی تو نہیں...... سامان اٹھائیں گے اور چل پڑیں گے...... مگر یہاں نہیں رہیں گے...... میں لوگوں کی باتیں نہیں سن سکتا...... بہت کالک لگ گئی منہ پر......'' مُلکے نے غصے سے کہتے ہوئے برکتے کی طرف دیکھا جیسے سارا قصور اسی کا ہو۔

''ہاں...... ابا ٹھیک کہہ رہا ہے'' تنو اور مٹھو نے بھی کہا۔

''سامان باندھو اور تیاری کرو......'' مُلکے نے کہا اور سگریٹ کے گہرے کش لگانے لگا۔ رانی نے برستی آنکھوں کے ساتھ سامان اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔

☆

شامو راستے میں منتظر بیٹھا تھا کہ رانی ادھر سے گزرے گی اور وہ اس سے کچھ پوچھے گا...... اور اس کو کچھ بتائے گا مگر شام ڈھلنے کو آ رہی تھی...... رانی ادھر سے نہ گزری۔

''معلوم نہیں...... اسے کیا ہو گیا ہے...... رانی آج ادھر سے نہیں گزری...... وہ کبھی چھٹی تو نہیں کرتی...... پھر کہاں چلی گئی...... کہیں بیمار ہی نہ ہو گئی ہو؟ نجانے کیوں اسے رانی سے محبت ہو گئی تھی۔ رانی اسے اچھی لگتی تھی...... کیوں اچھی لگتی تھی۔ یہ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا نادانستہ اس کے قدم رانی کی جھگی کی طرف اٹھ گئے...... وہاں پہنچا تو جھگی کی جگہ خالی پڑی تھی۔ اکا دکا کاغذوں کے ٹکڑے اور ٹوٹے برتن پڑے تھے۔ شامو نے حیرانگی سے ادھر ادھر دیکھا۔

''یہ...... یہ...... لوگ کہاں چلے گئے؟'' شامو نے ایک دس بارہ سالہ لڑکے سے پوچھا۔

''چلے گئے......'' اس نے جواب دیا۔

''کہاں......؟'' شامو نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

''پتہ نہیں......'' بچے نے کندھے اچکا کر جواب دیا۔

شامو پریشان ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ نوری اپنی جھگی سے نکلی تو شامو اس کی طرف لپکا۔

''یہ...... یہ...... یہاں پر جھگی تھی......'' وہ بمشکل بولا۔

''چلے گئے یہاں سے......'' نوری نے بیزاری سے جواب دیا۔

''کسی دوسرے شہر...... پتہ نہیں...... کہاں، مگر تو کیوں پوچھتا ہے؟'' نوری نے معنی خیز نظروں سے شامو کو سر سے لے کر پاؤں تک گھورا اور اپنی جھگی کے اندر چلی گئی۔ شامو کا دل بیٹھنے لگا۔ رانی اچانک اسے چھوڑ کر کہیں چلی گئی۔ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ رانی کو کہاں ڈھونڈے؟ کس جگہ تلاش کرے اور رانی اسے کچھ بھی بتائے بغیر کہیں چلی گئی تھی...... کوئی اتا پتا نہیں بتایا تھا۔

''شامو...... تیری طرح تیری محبت بھی بڑی بے وقعت نکلی...... اس نے تیری ذرا سی بھی قدر نہ کی...... پتہ نہیں...... ہماری ساری سوچیں...... ہمارے خیالات...... ہمارے جذبات سب ایک ہی نظر سے کیوں دیکھے جاتے ہیں اور دیکھنے والی نظروں میں ہمارے لئے کبھی بھی نرمی

نہیں ہوتی" شامو کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگیں۔

وہ گھر لوٹا تو رات گہری ہو رہی تھی۔ بچہ سو رہا تھا..... فردوس اور نرگس کسی نئے جوڑے پر گوٹا کناری لگا رہی تھیں۔ جمی پاس بیٹھا ٹیپ پر ایک نیا گانا سن رہا تھا اور ساتھ ساتھ اس اسٹائل میں ڈھولک بجانے کی کوشش کر رہا تھا۔ شامو کی طرف سب نے گہری نظروں سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر تھکاوٹ کے آثار نمایاں تھے اور آنکھیں جیسے بہت رونے سے سوجی ہوئی تھیں۔

"کیا ہوا تجھے..... کیا کسی کا جنازہ پڑھ کر آیا ہے؟" نرگس نے حیرت سے اس کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہمیں تو کسی کا جنازہ پڑھنے کی بھی اجازت نہیں....." شامو آہ بھر کر بولا۔

"کیا ہوا..... کاہے کو یہ رونی شکل بنائی ہے؟" فردوس نے اسے پوچھا۔

"کچھ نہیں ہوا" اس نے بے زاری سے جواب دیا۔

"سن شامو..... بہت روز ہو گئے..... تجھے دیکھتے ہوئے..... نہ تو ہمارے ساتھ دھندے پر جاتا ہے اور نہ ہی کچھ کما کر لاتا ہے اس طرح مفت کی روٹیاں تو ہم تجھے کھلا نہیں سکتے..... سیدھی طرح ہمارے ساتھ کام پر چل....." نرگس نے شامو کو دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

"اور اگر کام پر نہ جاؤں..... تو.....؟ تو پھر کیا کرو گی؟" شامو نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"تو پھر تمہیں..... یہ گھر چھوڑنا پڑے گا" نرگس نے ٹھوس لہجے میں کہا تو شامو سمیت فردوس اور جمی بھی حیران رہ گئے اور نرگس کی طرف دیکھنے لگے۔

"آپا..... یہ تو کیا کہہ رہی ہے؟ پندرہ سالوں سے یہ ہمارے ساتھ رہ رہا ہے..... جب یہ دس برس کا تھا تب ہمارے پاس آیا تھا..... اس سے ہمیں بچوں جیسا پیار ہے" فردوس نے کہا۔

"مگر اب یہ ساری عمر تو بچہ بن کر نہیں رہ سکتا..... بڑے اس کے ناز نخرے اٹھائے ہیں۔ ہمارے ساتھ بھی پیٹ لگے ہیں اور پیٹ تین وقت کا کھانا مانگتے ہیں..... اور کھانا پیسوں سے آتا ہے..... اور پیسے کام کرنے سے ملتے ہیں..... کام نہیں کرے گا تو پھر کیا کرے گا..... تو ہی پوچھ اس سے؟" نرگس نے غصے سے شامو کو گھورتے ہوئے کہا۔

"تیرے پاس اب بچہ آ گیا ہے نا..... اسی لئے تو اب مجھے نکال رہی ہو" شامو نے نرگس سے کہا۔

"جو مرضی سمجھ..... مگر..... تجھے یہاں رہنے کے لئے کام کرنا ہوگا ورنہ چھٹی کر" نرگس نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔

"تیرے نزدیک میری کوئی قدر نہیں..... تیرا میرا رشتہ بس اتنا سا ہے..... کام کروں..... پیسے لاؤں تو پھر یہاں رہ سکتا ہوں..... ورنہ نہیں..... ارے تم ہجڑے اسی لئے نامراد رہتے ہو..... کہ تم اپنے ہی لوگوں کے لئے وہ درد نہیں محسوس کرتے جو ماں باپ اپنی اولادوں کے لئے کرتے ہیں..... شاید اس میں تمہارا بھی قصور نہیں کہ تمہارے اپنے والدین بھی تو تمہارے لئے وہ درد محسوس نہیں کرتے جو اپنی دوسری اولاد کے لئے کرتے ہیں..... شاید ہم لوگوں کے رشتے دل اور خون کے نہیں پیٹ کے رشتے ہوتے ہیں..... ہم صرف اپنی اپنی بھوک مٹانے کے لئے ایک دوسرے کے

ساتھ جڑے ہیں..... جب تک ہم ایک دوسرے کے پیٹ کی بھوک مٹاتے رہتے ہیں..... ہم ایک دوسرے کے قریب ہیں ورنہ نہیں..... ٹھیک ہے..... میں یہ گھر چھوڑ کر جا رہا ہوں" شامو نے نم آنکھوں سے نرگس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا..... اور دروازے کی طرف جانے لگا۔

"آپا اسے روک..... یہ..... یہ کہاں جا رہا ہے؟" فردوس نے نرگس کے ہاتھوں کو پکڑتے ہوئے کہا۔

"اری جانے دے کمبخت کو..... نہ کام کا نہ کاج کا..... دشمن اناج کا..... دو دن بھوکا رہے گا تو دماغ ٹھکانے آ جائے گا..... آیا بڑا لاٹ صاحب کی اولاد..... کہتا ہے ناچ گانا نہیں کرے گا..... یہ نہیں کرے گا تو پھر اور کیا کرے گا..... ہیجڑوں کو کام کون دیتا ہے؟ رہنے دو..... اسے دو دن باہر..... دماغ ٹھکانے آ جائے گا..... "نرگس نے بے رخی سے کہا تو فردوس حیرت اور نم آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔

☆

شامو نے ساری رات بازار میں ایک ویران جگہ میں گزاری۔ سردی سے وہ ٹھٹھر رہا تھا سوائے اپنی جیکٹ اور پتلون کے اس کے پاس کوئی اور کپڑا نہ تھا۔ صبح بیدار ہوا تو بھوک سے بری طرح نڈھال ہو رہا تھا..... وہ بازار کی طرف چل پڑا۔ حلوائیوں کی دکانوں پر حلوہ پوری اور چھوٹے ہوٹلوں سے سالن اور پراٹھوں کی خوشبو نے اس کی بھوک اور بڑھا دی تھی۔ وہ للچائی نظروں اور بھوکے پیٹ کے ساتھ لوگوں کو کھاتے پیتے دیکھ رہا تھا اور اس کے منہ میں پانی آ رہا تھا۔ اس کا چائے پینے کو دل چاہ رہا تھا مگر اس کی جیب میں تو چند سکے بھی نہیں تھے کہ وہ چائے کا کپ پیتا.....

"بھائی..... کھانے کو کچھ دے دو..... میں آج کے دن سارے برتن دھو دوں گا....." شامو نے ایک ہوٹل والے سے درخواست کی۔

"چل ہٹ..... یہاں سے..... تجھ سے کام کروا کے یہاں میں نے مجرا لگانا ہے اور صبح سویرے مجھے کیا اپنی شکل دکھا دی ہے..... نجانے دن کیسا کٹے گا....." ہوٹل والے نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

"کیوں..... میں کوئی منحوس ہوں؟" شامو نے نم آنکھوں سے پوچھا۔

"منحوس نہیں..... مگر خوش نصیب بھی نہیں ہو..... خوش نصیب ہوتے تو یوں مانگتے پھرتے..... چل جا..... اب سویرے سویرے موڈ نہ خراب کر....." ہوٹل والے نے اسے ڈانٹا تو وہ نائی کی ایک دکان کے باہر دبک کر بیٹھ گیا جہاں سورج کی گرم شعاعیں سب سے پہلے پڑ رہی تھیں۔

"شکر ہے دھوپ پر انسانوں کی قدرت نہیں ورنہ یہ دھوپ بھی نہ سینکنے دیتے" شامو نے دکھ بھرے انداز میں سوچا اور نیلے آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔

"تجھے کیا کہوں.....؟ تو بھی تو ہماری نہیں سنتا..... ہمیں دیکھ کر تجھے دکھ نہیں ہوتا تو اور کس کو ہوگا" شامو نے سوچا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ وہ پیٹ کو ٹانگوں اور بازوؤں کے اندر دبا کر بیٹھا تھا تاکہ بھوک زیادہ نہ لگے۔ درمیانی عمر کے نائی نے دکان کھولی تو شامو جلدی سے وہاں سے اٹھ کر ذرا فاصلے پر بیٹھ گیا اور آنے جانے والوں کو یوں دیکھنے لگا جیسے اس کی نظریں تو ان کے چہروں پر ہوں مگر کہیں اور دیکھ رہی ہوں۔

نائی نے دکان کھولی تو لوگ اس کے پاس آنے جانے لگے۔ اس نے چند کرسیاں دھوپ میں رکھ دیں۔

ایک آدمی سر کی مالش کروانا چاہ رہا تھا۔ نائی کا ماتحت ابھی تک نہیں آیا تھا۔

"ابے.....سن.....تو سر کی مالش کر دے گا" نائی نے شامو کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں.....ہاں.....کروں گا....." شامو نے خوش ہو کر جواب دیا۔

"صاب باہر بیٹھ جاؤ.....دھوپ میں مالش کرالو" نائی نے اس آدمی سے کہا۔

"یہ.....مالش کرے گا" آدمی نے حیرت سے شامو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں.....صاب.....میں.....میں بہت اچھی مالش کرتا ہوں....." شامو نے جلدی سے کہا اور تیل پکڑ کر اس کے سر کی مالش کرنے لگا۔

"ابے.....تیرے تو ہاتھوں میں جان ہی نہیں ہے.....کیا زنانہ ہاتھ ہیں" آدمی نے اس کے ہاتھوں پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔

"چھوڑ.....کاہے کو.....میرے ہاتھ پکڑ رکھے ہیں" شامو ہاتھ چھڑاتے ہوئے بولا۔

"تجھے مردانہ ہاتھوں کی پکڑ بتا رہا ہوں" آدمی نے بے ہودہ سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"جمالے.....کوئی مرد بچہ بھیج.....جس کے ہاتھوں میں جان ہو.....نہ اس میں جان ہے نہ.....اس کے ہاتھوں میں" آدمی نے آواز لگاتے ہوئے کہا۔

"وہ.....اصل.....میں.....بھوک کی وجہ سے میرے ہاتھ.....ٹھیک طرح سے کام نہیں کر رہے" شامو نے سنجیدگی سے کہا۔

"تو.....کھانا کھا لینا تھا.....کس نے کہا.....بھوکا رہنے کو" آدمی نے کہا۔

"کھانے کے لئے پیسے چاہئیں.....اور میرے پاس پیسے نہیں ہیں" شامو نے رنجیدہ لہجے میں کہا۔ اس آدمی نے ایک ٹک اس کی جانب دیکھا اور جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر اسے دیا۔

"جا.....جا کر چائے پی لے، آدمی نے اپنی سخاوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"شکریہ.....صاب.....اللہ تجھے بہت دے" مارے تشکر کے اس کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے.....آنسو اس کی آنکھوں سے رواں ہو گئے۔

"جمالے.....تو اسے کوئی کام کیوں نہیں دیتا.....یار ان لوگوں کا بھی ہم پر حق بنتا ہے.....اسے کٹنگ ہی سکھا دے....." اس آدمی نے نائی سے کہا۔

"یہ لوگ ناچ گانے سے بہت کما لیتے ہیں.....ان کو کام کی کیا ضرورت؟" جمالے نے جواب دیا۔

"صاب جی.....میں وہ کام نہیں کرنا چاہتا....." شامو جلدی سے بولا۔

"جمالے.....رکھ لے.....بچارے کو.....کوئی ہنر اسے بھی سکھا دے" اس آدمی نے کہا۔

"ٹھیک ہے.....ضرورت تو مجھے بھی ہے.....میری اپنی اولاد اس ہنر کو سیکھنا نہیں چاہتی.....باپ.....دادا کے پیشے کو وہ لوگ برا سمجھتے ہیں.....انہیں شرم آتی ہے.....ایک دو کاریگر میں نے رکھے تھے.....مگر اب انہوں نے اپنے بیوٹی سیلون کھول لیے ہیں.....ٹھیک ہے.....اگر یہ کام

سیکھنا چاہتا ہے..... تو آ جائے" جمالے نے کہا تو شامو کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔

"کیوں نہیں..... میں دل لگا کر کام کروں گا....." شامو نے خوشی سے کہا۔

"مگر حلیہ تجھے لڑکوں والا بنانا پڑے گا..... لڑکی بن کر یہاں کام نہیں چلے گا" جمالے نے کہا۔

"ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے..... صاب جی بہت شکریہ آپ نے میری بڑی مدد کی..... اللہ آپ کو خوش رکھے" شامو نے فرط جذبات سے لبریز نم آنکھوں کے ساتھ اس آدمی سے کہا تو وہ مسکرا دیا۔

"جا..... جا کر چائے پی لے" اس آدمی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

شامو وہاں سے چلا گیا۔

"مولا کے رنگ ہیں نا..... انسان میں کسی ایک چیز کی کمی رکھ دے تو ساری دنیا کی دولت خرچ کر چھوڑے وہ کمی پوری نہیں ہوتی..... سارے قسمت کے کھیل ہیں..... وہ دینے پر آئے تو خزانوں کے منہ کھول دے..... نہ دینے پر آئے تو کون اسے کچھ کہہ سکتا ہے....." اس آدمی نے آہ بھرتے ہوئے کہا اور جمالے کو پیسے دے کر چلا گیا۔

☆

بھوک انسان کو کتنا ذلیل و خوار کرتی ہے کہ وہ ایسے کام کرنے پر بھی آمادہ ہو جاتا ہے جو وہ کبھی کرنا نہیں چاہتا..... پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے سو حربے آزماتا ہے..... ہر روز نئی ترکیبیں سوچتا ہے..... نئے منصوبے بناتا ہے۔ پیسہ اکٹھا کرنے کے ہزار جتن کرتا ہے اور اس پیسے کا سب سے پہلا مصرف اس کا پیٹ ہوتا ہے۔ نت نئے کھانے لذیذ کھانے..... چٹ پٹے اور مزیدار کھانے..... صبح کا آغاز کھانے سے شروع ہوتا ہے اور رات گئے تک کھانے کی ہی فکر لاحق رہتی ہے۔ شاید دن کی کوئی ایسی گھڑی ہو..... جب خالی پیٹ خاموش ہو کر بیٹھ جائے..... اسے تو ہر وقت..... ہر پل..... کچھ نہ کچھ کھانے کو چاہیے..... پیٹ بھرا بھی ہو تو آنکھوں میں ایسی بھوک رہتی ہے جو انسان کو سکون نہیں لینے دیتی..... بھوک مٹانے کی خواہش اور کھانے کی طلب..... انسان کو جتنا بے سکون رکھتی ہے شاید کوئی اور شے نہیں۔

صبح کا بھوکا رات کو بھوکا نہیں سو سکتا اور ایک دن کا بھوکا دوسرے دن بھوک برداشت نہیں کر سکتا اور دو دن کا بھوکا تیسرے دن ہر طریقے سے اپنی بھوک مٹانے کی کوشش کرتا ہے اور کئی دن کا بھوکا چوری، ڈکیتی، قتل اور ہر جرم پر آمادہ ہو جاتا ہے جسے وہ بھوکا ہونے سے پہلے برا سمجھتا تھا۔ زندگی کیسا گورکھ دھندا ہے جو انسان کو الجھائے رکھتی ہے۔ بڑے بڑے نظریات، آدرش، اخلاقیات سب جسم کی بنیادی ضرورتوں کے سامنے ناکام ہو جاتے ہیں..... بھوک ایسی نقاہت اور کمزوری لاتی ہے کہ سارے جسم کو مفلوج کر کے رکھ دیتی ہے۔ دماغ سوچنا چھوڑ دیتا ہے..... دل کی حرکت سست پڑنے لگتی ہیں اور جسم نڈھال ہو جاتا ہے..... اس لئے پیٹ کو بھرا رہنا چاہیے..... اور اس کو بھرنے کے لئے انسان حلال و حرام کی حدود بھی پار کرنے کی کوشش کرتا ہے..... اسے اس کا نفس ہر وہ کام کرنے پر آمادہ کرتا ہے جس سے اس کی بھوک ختم ہو جائے..... دن شروع ہوتے ہی کھانے پینے کی چیزوں سے بازار سجنے شروع ہو جاتے ہیں..... پھلوں کی دکانیں..... سبزیوں کے ٹھیلے..... گوشت کے انبار، قطار در قطار چھوٹے ہوٹلوں میں لٹکتے مرغے..... بڑے ہوٹلوں میں نت نئے پکوان..... انسان کی بھوک کسی طرح کم نہیں کر سکتے۔ نجانے قدرت نے بھوک میں کیا راز رکھا ہے کہ انسان

اس راز کو پانے کے لئے دن سے لے کر رات تک جستجو کرتا ہے مگر اس کو کوئی سراغ نہیں ملتا..... وہ بس کھاتا ہے..... پیتا ہے..... اور سوجاتا ہے.....
یوں لگتا ہے انسان کی زندگی کا مقصد صرف کھانا پینا ہے..... جوں جوں زمانہ ترقی کرتا جارہا ہے..... سب سے زیادہ توجہ اور زور کھانے پر دیا جا رہا ہے
مگر اس کے باوجود اس بھوک میں کمی نہیں آ رہی..... جو قدرت نے انسان کے اندر ڈال دی ہے اور جو مرتے دم تک ختم نہیں ہوتی۔

اس بھوک کے پیچھے کیا راز ہے.....؟

انسان شاید اس کی تہہ تک نہیں پہنچ پایا..... یا پھر اس کو پانے کی جستجو نہیں کرتا..... روز بروز اس کی بھوک بڑھتی جارہی ہے اور وہ اپنی جسمانی بھوک، نفسانی بھوک اور شہوانی بھوک کو ہر طریقے سے مٹانے کے ذریعے تلاش کرتا ہے..... وہ کسی اور بھوک کی طرف توجہ ہی نہیں دیتا..... وہ اپنی ہر قسم کی بھوک مٹانے میں حیوان بھی بن جاتا ہے..... درندوں اور چوپایوں جیسا بھی..... مگر اس بھوک کے بارے میں نہیں سوچتا..... جو قدرت اس سے چاہتی ہے۔ شاید اس بھوک کا تعلق آدم اور حوا کا جنت میں اس شجر ممنوعہ کا پھل کھانے سے ہے جو شیطان کے بہکاوے میں آ کر انہوں نے کھایا دیکھنے میں خوشنما اور پرلذت مگر جس کے نتیجے میں پچھتاوے ان کا مقدر ہوئے..... انسان نے کبھی نہیں سوچا کہ قدرت کی نافرمانی کے لئے آدم و حوا کوئی اور کام بھی کر سکتے تھے..... انہوں نے کھانے کے عمل کو کیوں چنا..... یا قدرت نے انہیں اس شے کے کھانے سے کیوں آزمایا.....؟

شاید اس لئے کہ اس کھانے کا انسان کے خمیر میں گندھی ہوئی اس بھوک سے گہرا تعلق تھا جو اسے ہر برے کام پر آمادہ کر سکتی ہے..... جس پر قابو پانے سے انسان 'اشرف المخلوقات' کے زمرے میں آتا ہے اور جس کو کھلا چھوڑنے سے..... اور..... اس پر قابو نہ پانے سے وہ حیوان سے بھی بدتر بن جاتا ہے.....

قدرت انسان کو اپنی ہر بھوک پر قابو پاتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہے کیونکہ مال و زر کی بھوک پر قابو پانے سے انسان کے اندر سے لالچ ختم ہوتا ہے..... دل کی خواہشات پر قابو پانے سے اس میں فیاضی آتی ہے..... شہوت کی بھوک پر قابو پانے سے اس میں پارسائی آتی ہے اور پیٹ کی بھوک پر قابو پانے سے اس میں نفس کشی آتی ہے.....

مگر کوئی بھی اپنی بھوک پر قابو نہیں پانا چاہتا.....

سب اپنی اپنی بھوک مٹانے کی فکر میں ہیں.....

ہر جائز و ناجائز طریقے سے.....!

حلال و حرام کما کر.....!

بس بھوک مٹانی ہے.....!

اور اس کے بعد.....!

بھوک پھر بڑھتی جاتی ہے.....!

ہر روز..... ہر شام..... ہر صبح..... ہر رات.....!

شامو نے ایک کھوکھے سے چائے کا کپ اور دو رس لے کر اپنی بھوک مٹائی..... چائے پیتے ہوئے وہ مسلسل سوچ رہا تھا..... اس شخص کے

بارے میں۔ جس نے زندگی میں پہلی بار اس کی مدد کی تھی...... ورنہ وہ تو انسانیت سے بددل ہو کر اعتبار کھو بیٹھا تھا...... ابھی تک اسے جتنے بھی انسانوں سے واسطہ پڑا تھا...... سب نے اسے مذاق اور طنز کا نشانہ بنایا تھا...... کسی نے اس سے دو بول ہمدردی کے نہیں بولے تھے اس نے بھی نہیں...... جس سے وہ محبت کرتا تھا...... وہ تو شہر ہی چھوڑ کر چلی گئی تھی...... اس نے آہ بھری اور چائے ختم کر کے خالی کپ کھوکھے والے کو پکڑایا۔ اس نے کپ پکڑ کر ایک کونے میں رکھ دیا...... جس کا مطلب شامو واضح طور پر سمجھ گیا...... وہ خاموشی سے جمالے کی دکان پر آ گیا۔

''کیا نام ہے تیرا...... سن...... کوئی شبنم...... لیلیٰ...... ریحانہ بتانا...... کوئی ڈھنگ کا نام بتانا'' جمالا ادھیڑ عمر کا قدرے سخت مزاج مگر صاف گو بندہ تھا۔

''شامو......'' وہ آہستہ سے بولا۔

''شامو...... ٹھیک ہے چلے گا......'' جمالا بڑبڑایا۔

''سن کٹنگ میں بڑا پیسہ ہے...... اگر تو مجھ سے لیڈیز کٹنگ سیکھ لے...... تا...... تو پھر دیکھنا کیسے وارے نیارے ہو جائیں گے...... میرا خیال ہے کٹنگ تو...... تو...... سیکھ ہی لے گا...... اتنا تو تیرا دماغ ہو گا ہی...... دماغ تو تم لوگوں کا پورا ہی ہوتا ہے...... نرتال کو تو بہت سمجھتے ہو'' جمالا مسکرا کر بولا تو شامو بھی ہنسنے لگا۔

''ہے تو...... تو...... خوبصورت...... ادھر...... آ...... پہلے میں تیری کٹنگ کر کے تیرا مردانہ حلیہ بناؤں...... پھر کام شروع کرنا'' جمالے نے قدرے نرمی سے اسے کہا اور اسے اپنے آگے بٹھا کر اس کی کٹنگ کرنے لگا۔ کٹنگ سے اس کا حلیہ قدرے بدل گیا۔

''شکر ہے اب تو کچھ لڑکا لگ رہا ہے......'' جمالے نے اسے بڑے سے آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا تو شامو بھی مسکرانے لگا۔

''تو...... رہتا کہاں ہے......؟'' جمالے نے اچانک پوچھا۔

''میں نے ان کو چھوڑ دیا ہے'' شامو نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

''کیوں......؟'' جمالے نے حیرت سے پوچھا۔

''میں ناچ گانا نہیں کرنا چاہتا تھا'' شامو نے جواب دیا۔

''اچھا...... تو...... پھر اب کہاں رہے گا......؟'' جمالے نے پوچھا۔

''معلوم نہیں......'' شامو نے افسردگی سے جواب دیا۔

''دکان کے پیچھے ایک کمرہ ہے...... تو بھی وہیں رہ لینا...... تیری تنخواہ میں سے کرایہ کاٹ لوں گا'' جمالے نے کہا تو شامو خوش ہو گیا۔

''چل جا...... اب نہا دھو کر آ...... اور پھر کام شروع کر'' جمالے نے کہا تو شامو خوشی خوشی حمام میں گھس گیا۔

☆

نئے شہر کے ویرانے میں آ کر انہوں نے اپنی جھگی لگائی تھی...... گندے نالے کے پاس کھلے میدان میں صرف ان کی ہی جھگی تھی...... جب تک فقیروں کی کوئی بستی نہیں ملتی...... انہوں نے وہیں رہنے کا سوچا تھا...... چھوٹے شہر سے بڑے شہر کی طرف آتے ہوئے نجانے کتنے دھوسے، کتنے

اندیشے اور کتنا خوف تھا۔۔۔۔۔مگر۔۔۔۔۔اب وہ شہر ان کے لئے تنگ پڑ گیا تھا۔ وہ کئی سالوں سے وہاں رہ رہے تھے۔۔۔۔۔مگر اچانک سب کچھ چھوڑنا پڑا۔۔۔۔۔ اگر وہ پیدا نہ ہوتا۔۔۔۔۔تو۔۔۔۔۔وہ اپنا شہر نہ چھوڑتے۔ سب اس کو ہی قصوروار ٹھہرا رہے تھے۔ ملکا رانی، بجو، مٹھو۔۔۔۔۔اور برکتے بھی۔۔۔۔۔نجانے قدرت کی کیا مصلحت تھی۔۔۔۔۔کہ دو دن میں ان کا دانہ پانی اس شہر سے اٹھ گیا تھا۔۔۔۔۔وہ شہر بدر ہو گئے تھے۔۔۔۔۔یا پھر اس نے ان کو کر دیا تھا۔۔۔۔۔سب کو نئے شہر، نئی جگہ اور نئے لوگوں سے کچھ خوف سا محسوس ہوتا تھا۔۔۔۔۔نجانے اس شہر کا مزاج کیا ہے؟ وہاں ان کی اپنی بستی تھی۔۔۔۔۔بستی کے لوگ ایک دوسرے کو جانتے تھے۔۔۔۔۔پہچانتے تھے۔ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے۔ آپس میں ایک دوسرے کی خوشیوں کو محسوس کرتے تھے۔۔۔۔۔انہیں مناتے تھے مگر یہاں ان کی جگی بالکل تنہا تھی۔۔۔۔۔نہ کوئی پرسان حال تھا۔۔۔۔۔اس بچے کی پیدائش کے بعد تو ان کے ہاں ایسی خاموشی اور سراسیمگی چھا گئی تھی کہ ایک دوسرے سے بات کرتے ہوئے بھی انہیں کوئی جھجک اور خوف محسوس ہوتا تھا۔۔۔۔۔ادھر۔۔۔۔۔ادھر کی باتیں کرتے۔۔۔۔۔مگر۔۔۔۔۔اس بچے کا ذکر نہ کرتے۔

برکتے کو بس ایک ہی فکر لگی رہتی تھی۔ نجانے وہ کہاں ہے؟ زندہ بھی ہے یا مر گیا ہے۔۔۔۔۔ملکا اسے کہاں چھوڑ آیا ہے اور وہ اسے کچھ بتاتا بھی تو نہیں تھا۔ بجو نے بتایا تھا کہ ابا اسے کوڑے کے ڈھیر پر چھوڑ آیا تھا مگر برکتے کا دل نہیں مانتا تھا۔ ملکا اس کا باپ تھا اور باپ اتنا ظالم کبھی نہیں ہو سکتا، اس لئے اس نے بجو کی بات پر یقین نہیں کیا تھا۔

''چلو۔۔۔۔۔اٹھو۔۔۔۔۔اور سب دھندے پر جاؤ۔۔۔۔۔یہاں سوئے پڑے رہنے سے کوئی روٹی تمہارے منہ میں ڈالنے نہیں آئے گا'' ملکے نے صبح سویرے اپنی بیساکھیوں سے بچوں کو اٹھانا شروع کیا تو وہ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ گئے۔

''مگر ابا۔۔۔۔۔اس شہر کا تو ہمیں کچھ پتا ہی نہیں۔۔۔۔۔کہاں جائیں۔۔۔۔۔نہ رستوں کی خبر۔۔۔۔۔نہ بازاروں کا پتا'' رانی نے پریشانی سے کہا۔

''سب پتہ چل جائے گا۔۔۔۔۔ایک بار گھر سے نکلو گی تو راستوں کی خوب خبر رکھنا۔۔۔۔۔جن راستوں پر چل کر جاؤ گی۔۔۔۔۔انہی پر واپس آ جانا۔۔۔۔۔جگہ کی نشانیاں دیکھتے جانا'' ملکے نے اونچی آواز میں کہا۔

رانی کا دل نہیں چاہ رہا تھا مگر ابے کے کہنے پر وہ چل پڑی۔۔۔۔۔تھیلا کندھے پر لٹکائے وہ انجانے راستوں پر چلتی رہی۔۔۔۔۔اسے کچھ خبر نہ تھی کہاں جانا تھا اور کس راستے سے واپس آنا تھا۔ اس کے ذہن میں تو صرف وہ بچہ تھا اور شامو تھے۔۔۔۔۔اور وہ رات تھی۔۔۔۔۔ایسی رات اس کی زندگی میں کبھی نہیں آئی تھی۔۔۔۔۔وہ کتنی خوفناک اور بھیانک رات تھی جس نے آناً فاناً ان کی زندگیوں کو بدل دیا تھا۔۔۔۔۔زندگی کیسے بدلتی ہے۔۔۔۔۔؟ کیسے انسان کو اٹھا کر ادھر سے ادھر پھینکتی ہے۔۔۔۔۔یہ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔۔۔۔۔قدرت کا ایک فیصلہ۔۔۔۔۔اس کا ایک 'امر کن' انسانوں کو کیسے کیسے قدم اٹھانے پر مجبور کر سکتا ہے۔۔۔۔۔اس بات پر اس نے پہلے کبھی نہیں سوچا تھا۔

نجانے کیوں اس بار برکتے بہت مطمئن تھی کہ بیٹا ہی ہوگا۔۔۔۔۔اس کا دل کہتا تھا کہ بیٹا ہوگا اور اس نے بچے کے کپڑے بھی لڑکوں والے مانگ تانگ کر اکٹھے کیے تھے۔۔۔۔۔بیٹے اس کے پاس پہلے بھی تھے مگر اس بار اسے کوئی انجانی سی خوشی محسوس ہوتی تھی۔ وہ بہت پرامید تھی اور اس ہونے والے بچے کو اپنے لئے خوش قسمت سمجھتی تھی۔ اسکا خیال تھا کہ اس کے ہونے کے بعد ان کے حالات بالکل بدل جائیں گے۔۔۔۔۔وہ اس کے بارے

میں بہت پرامید ہو کر رانی اور نوری سے باتیں کرتی...... وہ حیرت سے پوچھتیں کہ وہ کیوں اتنی پرامید ہے...... تو وہ ہنس کر جواب دیتی......

''جس دن مجھے اس کے ہونے کی خبر ملی تھی...... اس روز ملکے نے اپنی بیساکھیاں خریدی تھیں...... اور وہ میرے سامنے بیساکھیوں کے سہارے کھڑا ہو کر چلا تھا ورنہ زمین پر اپنے آپ کو گھسیٹ گھسیٹ کر کھینچتے ہوئے اس کی ٹانگیں اور رانیں بالکل چھل گئی تھیں''...... برکتے اس روز سے بہت پرامید ہو گئی تھی کہ نیا آنے والا بچہ ان کے لئے امید اور خوشیوں کا پیغام لے کر آئے گا...... مگر...... کیا ہوا تھا......؟

اس نے ان کی زندگیوں کو واقعی بدل دیا تھا...... مگر...... بہت مختلف انداز میں...... اس نے انہیں شہر بدر کر دیا تھا...... ان سے ان کی خوشیوں اور امیدوں کو چھین لیا تھا...... اس نے برکتے کو آنسوؤں کا سیلاب دے دیا تھا اور ملکے کو غم و غصہ...... اس واقعے نے رانی کے ذہن کو اتنا بدل دیا تھا...... کہ اسے زندگی اور انسانوں کے بارے میں ایک عجیب سی بے یقینی دے دی تھی...... انسان کی زندگی میں کچھ بھی ہو سکتا ہے...... اور...... وہ کچھ...... جس کے بارے میں انسان کبھی سوچتا بھی نہیں...... انہوں نے کبھی بھول کر بھی نہیں سوچا تھا کہ ان کے ہاں ایسا بچہ جنم لے گا...... اور یہ بھی کبھی نہیں سوچا تھا...... کہ وہ راتوں رات کسی دوسرے شہر چلے جائیں گے...... سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر۔

''کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے...... سب کچھ ممکن ہے۔ میں آج بھیک مانگ رہی ہوں...... کل کو میں کسی افسر کی بیگم صاحبہ بن کر گاڑی میں گھوم سکتی ہوں'' اس نے ایک بڑی صاف ستھری سڑک پر نئی سیاہ چمکیلی کار میں ایک عورت کو بیٹھے دیکھ کر سوچا اور خود ہی ہنسنے لگی......

''رانی...... تو...... اپنا...... منہ دھو کر رکھ...... منہ دھونے کو صابن نصیب نہیں ہوتا...... اور بیٹھنے لگی ہے گاڑی میں'' اس نے اس خیال کے آنے پر ہی اپنے آپ کو لعنت ملامت کی...... اور ایک سگنل پر رکی اس گاڑی کی مالکہ سے بھیک مانگی...... جس نے قدرے نخوت سے اس کی طرف دیکھا اور بن کچھ کہے گاڑی آگے بڑھا دی......

''دیکھ لیا...... بیگم صاحبہ تو بات کرنا پسند نہیں کرتی اور تو اس کی طرح گاڑی میں بیٹھنے کے خواب دیکھ رہی ہے'' اس نے دل میں سوچا اور چلچلاتی دھوپ میں ادھر ادھر ماری ماری پھرتی رہی...... شام ہونے کو تھی اور اسے راستے کا کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔ اس نے جو نشانیاں رکھی تھیں وہ کئی جگہوں پر ایک سی نظر آئیں...... اتنے فاصلے پر فلاں درخت ہے اور اس کی شاخیں نیچے کو لٹک رہی ہیں...... ٹی وی پر چلنے والے مختلف اشتہارات کے سائن بورڈز...... جو کئی جگہوں پر جا کر ایک جیسے لگے تھے۔ وہ ٹھٹکی...... وہ شکل کہاں گئی جو میں نے صبح دیکھی تھی اور اس کی نشانی رکھی تھی۔

''مجھے لگتا ہے...... میں راستہ بھول گئی ہوں......'' اس خیال سے ہی اس کا دل ڈوبنے لگا اور چہرے پر ٹھنڈے پسینے آنے لگے...... نیا شہر...... نئے لوگ...... نئی جگہ...... کسی کو کیا بتائے...... کیا سمجھائے...... کیا کہے...... اس نے پریشان ہو کر سوچا اور مختلف گلیوں اور بازاروں سے ہوتی ہوئی ایسے محلے میں داخل ہو گئی جہاں ڈھولک کی تھاپ، گھنگھروؤں کی جھنکار اور لش پش کرتے جوان اور درمیانی عمر کے مردوں کا رش سا لگا تھا...... وہاں آنے جانے والے مردوں کے چہروں پر عجیب سی مسکراہٹ اور آنکھوں میں سرشاری سی تھی۔ خوشبوؤں میں رچے بسے ان کے لباس اور پوشاکیں...... کسی اور ہی بات کا پتہ دے رہی تھیں۔

''اے...... تو...... ادھر کیا کرنے آ گئی ہے...... اپنے کپڑے تو دیکھ...... تیرا یہاں کیا کام؟'' ایک عورت نما مرد نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا

جس کی وہاں پھولوں اور گجروں کی چھوٹی سی دکان تھی۔

''میں راستہ بھول گئی ہوں'' رانی نے بمشکل جواب دیا۔

''یہاں سے جانے کے بعد پھر بھول جانا کہ کہاں سے ہو کر گئی ہو.....سنا تو نے.....'' اس نے قدرے خفگی سے کہا۔

''کیوں.....؟'' رانی نے نادانستہ پوچھا۔

''یہاں بڑے بڑے لوگ آتے ہیں.....تجھ جیسے بھوکے ننگے نہیں'' مرد نے جواب دیا۔

''پھر بڑے لوگ یہاں فقیروں کو بھیک بھی زیادہ دیتے ہوں گے'' رانی نے تجسس سے پوچھا۔

''نہیں جی.....وہ بھیک کسی کو نہیں دیتے.....ہاں.....روپیہ خوب لٹاتے ہیں'' مرد نے بتایا۔

''کس پر.....؟'' رانی نے حیرت سے پوچھا۔

''خوبصورت پریوں پر.....''

''کیا یہاں پریاں رہتی ہیں.....؟'' رانی نے حیرت سے چونکتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں.....انسان پریاں.....''

''کیا.....میں انہیں دیکھ سکتی ہوں؟'' رانی نے پوچھا۔

''چل ہٹ.....تو.....کون ہوتی ہے انہیں دیکھنے والی.....ان کو دیکھنے کے پیسے لگتے ہیں اور تو مجھ سے کیوں ساری باتیں پوچھ رہی ہے.....چل پیچھے ہٹ.....ہٹ یہاں سے.....نگار بیگم آ رہی ہے'' اس نے اسے راستے سے پیچھے ہٹایا.....رانی دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ایک خوبصورت فیشن ایبل جواں سال لڑکی کالی چادر میں لپٹی چھن چھن کرتی اس کے پاس سے گزری۔اس کے گورے چٹے پاؤں پر مہندی سے نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔اس کے سفید خوبصورت ہاتھوں کی انگلیوں میں مختلف نگینوں اور سونے کی جڑاؤ انگوٹھیاں بہت بھلی لگ رہی تھیں۔

''واقعی یہ پری ہی ہے.....'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

نگار بیگم کے ساتھ کئی اٹش پٹش کرتی لڑکیاں اور مرد تھے۔وہ گلی میں سے ہوتی ہوئی سڑک کے کنارے ایک بڑی سی سفید کار میں بیٹھ کر چلی گئی۔

''یہ کون تھی.....؟ کوئی پری لگتی ہے.....؟'' رانی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں.....یہاں کی سب سے خوبصورت پری ہے.....تم نہیں جانتی اس پر لوگ کس طرح نوٹ پھینکتے ہیں.....فرش نوٹوں سے بھر جاتا ہے اور یہ اس پر چلتی ہے'' اس آدمی نے بتایا۔

''اتنے سارے نوٹ.....اور یہ ان پر چلتی ہے'' رانی نے قدرے چیخ مار کر پوچھا۔

''ہاں.....اور نہیں تو کیا.....؟'' دکاندار نے ایک موتیے کا گجرا پروتے ہوئے کہا۔

''کیا یہ اصلی نوٹوں پر چلتی ہے؟'' رانی نے حیرت سے پوچھا۔

''اری......تو کس دنیا میں رہتی ہے...... بالکل اصلی نوٹ ہوتے ہیں......اور وہ بھی پانچ سو......اور ہزار ہزار کے......'' دکاندار نے مزے لے لے کر بتایا۔

''واقعی......ہمیں تو بھیک میں بھی کبھی سو روپیہ نہیں ملا......یہ دیکھ......سارے دن کی بھیک......'' اس نے اپنی جیب میں سے چند روپے اور چند سکے نکال کر اسے دکھائے......دکاندار نے دیکھ کر تاسف کا اظہار کیا۔

''بس اپنے اپنے نصیب کی بات ہے...... یہاں پر کئی آتیں اور کئی جاتی ہیں مگر ہر ایک کی قسمت نگار بیگم جیسی نہیں اس پر تو حسن دولت یوں برس رہی ہے......جیسے ساون کا مینہ سوکھی زمین پر برستا ہے......اور اسے دیکھتے ہی دیکھتے جل تھل کر دیتا ہے۔ نگار بیگم مٹی میں بھی ہاتھ ڈالتی ہے تو وہ سونا بن جاتی ہے......اور جس مرد کو بھی دیکھتی ہے...... وہی اس پر لٹو ہو جاتا ہے......فلموں والے اس کے آگے پیچھے پھرتے ہیں مگر یہ کسی کو پکڑائی نہیں دیتی......بڑے نخرے والی عورت ہے...... کسی سے خواہ مخواہ بات نہیں کرتی'' دکاندار نے کہا۔

''کیا تم سے کبھی اس نے بات کی......؟'' رانی نے پوچھا۔

''ہاں......کبھی......کبھار...... جب سپیشل گجرے بنوانے ہوں تو کوٹھے پر بلاتی ہے اور کہتی ہے......اچھو......بڑھیا گجرے بنانا......آج بڑھیا مہمان آنے والے ہیں...... پھر میں بہت بڑھیا گجرے بنا کر دیتا ہوں......'' دکاندار نے اسے بتایا۔

''کیا تیرا نام اچھو ہے......؟'' رانی نے پوچھا۔

''ہاں......اچھو پھول والا......میرے پھولوں کے گجرے اور ہار بڑے مشہور ہیں......'' اچھو نے اپنی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

''نگار بیگم نے کس سے شادی کی ہے......؟ لگتا ہے امیر بندہ ہوگا......جس کی بڑی سی گاڑی میں وہ ابھی بیٹھ کر گئی ہے'' رانی نے حیرت سے پوچھا۔

''شادی والے قصے کو نہ ہی چھیڑو تو بہتر ہے......اور......ایسی گاڑیاں تو ہر روز اسے لینے آتی ہیں......مت پوچھو......نگار بیگم کیا عورت ہے؟'' اچھو نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''کیسی عورت ہے......؟'' رانی نے پوچھا۔

''اٹھ......اور......گھر جا......شام بہت ہو رہی ہے......تیرا یہاں زیادہ دیر ٹھہرنا ٹھیک نہیں......'' اچھو نے کہا۔

''مگر......میں......تو راستہ بھول گئی ہوں......'' وہ پریشانی سے بولی۔

''جگہ بتا......میں تجھے راستہ سمجھاتا ہوں'' اچھو نے کہا۔

''معلوم نہیں......کیا بتاؤں......بس......ہماری جھگی کے پاس بڑا سا نالہ ہے......'' رانی نے بتایا تو اچھو سوچ میں پڑ گیا۔

''اس نالے سے پہلے ایک سکول بھی ہے نا......'' اچھو نے پوچھا۔

''ہاں......ہاں......وہی......'' رانی نے خوش ہو کر بتایا۔

''ادھر آ...... میں تجھے راستہ بتاتا ہوں......'' اچھا اسے گلی کی نکڑ پر لے گیا اور اسے راستہ سمجھانے لگا۔ رانی خوش ہو کر وہاں سے چلی گئی۔

سارا راستہ اس کے ذہن میں نگار بیگم اس کی بڑی سی گاڑی...... اور اس کے مہندی بھرے پاؤں تھے...... ''نگار بیگم پری ہے......؟ کیا عورت ہے؟ بڑے نصیب والی ہے...... ایسا نصیب کسی کسی کا ہوتا ہے...... وہ نوٹوں پر چلتی ہے۔ فرش ہزار اور پانچ سو کے نوٹوں سے بھرا ہوتا ہے تو وہ چلتی ہے'' رانی کا دماغ سوچ سوچ کر تھک گیا تھا۔

''وہ کیسے اتنے زیادہ نوٹوں پر چلتی ہوگی...... اس نے تو جب سے آنکھ کھولی تھی...... ایک ایک سکہ بھیک مانگ کر اپنے کشکول میں ڈالے تھے...... وہ تو ایسی بد قسمت تھی جسے نہ کبھی بھیک ڈھنگ کی ملی تھی...... نہ تن ڈھانپنے کے لئے اچھا کپڑا نصیب ہوا تھا اور نہ ہی پیٹ بھر کر روٹی...... کھانا کھا کر بھی بھوک اپنی جگہ باقی رہتی...... وہ بے بسی سے سوچتی چلی جا رہی تھی...... اور اچھو کے بتائے ہوئے راستے سے ہوتی ہوئی بالآخر اپنی جگی پہنچ گئی......

(۴)

انسانی جسم میں آنکھ انتہائی اہم اور پیچیدہ عضو ہے، جس کا تعلق بصیرت سے ہے۔ سامنے دیکھیں تو آنکھ کے اوپر سب سے نمایاں چیز Eye Brows ہیں جو آنکھ کو ایک خوبصورتی دیتے ہیں۔ اس کے بعد آنکھ کی پلکیں ہوتی ہیں جو خوبصورتی کے ساتھ آنکھ کی حفاظت کرتی ہیں، اور ڈسٹ (گرد) وغیرہ کو آنکھ میں جانے سے روکتی ہیں۔

Eye lids پھر پپوٹے ہوتے ہیں، آنکھ میں لیکریمل گلینڈز ہوتے ہیں جو میوکس اور واٹر چھوڑتے ہیں۔ آئی لڈز اس کو صاف کرتے ہیں اور ڈسٹ پارٹیکلز کو بھی آنکھ سے صاف کر دیتے ہیں۔

آنکھ کے دو حصے بہت نمایاں ہوتے ہیں ایک سفید اور دوسرا براؤن حصہ۔ یہ حصہ آئرس کہلاتا ہے جو کہ Muscular Tissues سے بنا ہوتا ہے۔ اس کا کلرفل ہونا ایک تو آنکھ کو خوبصورتی دیتا ہے، دوسرا اس کا کام آ کا موڈیشن آف لائٹ ہے یعنی آنکھ میں مناسب روشنی داخل کرنا اس کے درمیان میں ایک Pore ہوتا ہے جسے آنکھ کی پتلی بھی کہتے ہیں۔ اس سوراخ کے راستے روشنی آنکھ میں داخل ہوتی ہے۔ تیز روشنی میں آنکھیں چندھیا جاتی ہیں اور Pupil کے سکڑنے سے کم روشنی اندر جاتی ہے، جبکہ اندھیرے میں وہ پھیل جاتی ہے اور ایک خاص مقدار روشنی کی اندر جاتی ہے۔

سکلیرا: اس کی وجہ سے آنکھ کی وائٹ کوٹ شیپ برقرار رہتی ہے۔

کورائیڈ: یہ ایک لیئر ہے اس میں بلڈ وسلز ہوتی ہیں جو آنکھ کو خوراک مہیا کرتی ہیں۔

Ciliry Body: یہ آئرس کی کنٹریکشن کو کنٹرول کرتی ہیں اور آنکھ کے اندر آنکھ کا پانی مہیا کرتے ہیں۔ یہ پانی آنکھ کو نیوٹریشن مہیا کرتا ہے۔ لینز لائٹ کو ریٹینا پر فوکس کرتا ہے۔ یہ محدب عدسے کی ایک قسم ہے اور ویسا ہی کام سرانجام دیتا ہے۔

Vitrous انڈے کی سفیدی جیسا ہوتا ہے۔ آنکھ کی Shape برقرار رکھتا ہے۔ جیلی کی ساخت جیسا ہوتا ہے۔

Retina: میں لائٹ پاس ہو کر اس پر ایک الٹا امیج بناتی ہے۔ Visual Pathway ہے، اس پر بننے والے الٹے عکس کو لیکر آپٹک نرو کے ذریعے Oxipital Lobe میں لے جاتا ہے۔ اور وہاں آنکھ کا سیدھا امیج بنتا ہے۔ دماغ کے جس حصے میں امیج بنتا ہے جو اسے بنانے میں اہم کام کرتا ہے اسے Area 17 کہتے ہیں۔ اگر آپٹک نرو کسی طرح سے Damage ہو جائے تو وہ روشنی کو دماغ تک نہیں پہنچا سکتی اور آنکھ بظاہر ٹھیک ہونے کے باوجود دیکھ نہیں سکتی۔

ایک اندازے کے مطابق ایک چوتھائی دماغ کا حصہ ویژن بنانے کے عمل میں مدد کرتا ہے۔

کائنات میں ہر جانب بکھرے عجائبات، خوبصورت مناظر اور ہر سو پھیلی روشنیوں اور تجلیات کو آنکھ کی پتلی...... میں...... سمو کر۔ قدرت انسان کو ایسی بصارت عطا کرتی ہے...... جس کے ذریعے کائنات کی ہر ہر شے کو دیکھتے ہوئے وہ اپنے اندر ایسی روحانی بصیرت تشکیل دیتا ہے......

جس کا تعلق اس حقیقی اورازلی نور سے جوڑتا ہے...... یہ نور؛ کہاں سے آتا ہے اور اس سے بصارت اور بصیرت کیسے پیدا ہوتی ہے۔ انسان ابھی تک اس راز سے ناآشنا ہے۔

☆

باہر شدید دھند اور سردی تھی۔ صبح سویرے اکا دکا لوگ سڑک پر دکھائی دے رہے تھے۔ شیرے نے ابھی چولہا جلایا ہی تھی کہ سائیں مٹھا، پاؤں میں ٹوٹی جوتی، سبز چوغا پہنے، گلے میں رنگ برنگی منکوں کی کئی مالا، ہاتھوں میں کئی رنگوں کے چھوٹے بڑے نگینوں کی انگوٹھیاں، کلائیوں میں چوڑیاں نما چھن چھن کرتے کنگن گردسے اٹے بالوں کی لٹیں ادھر ادھر بکھیرے، گلے میں کشکول لٹکائے، ایک ہاتھ میں اک تارہ بجاتا ہوا شیرے کے کھوکھے میں داخل ہوا۔ شیرے نے حیرت سے سائیں کی طرف دیکھا۔

''سائیں جی...... آج بہت ٹھنڈ ہے...... آج تو بند جوتا پہن لیتے۔'' شیرے نے فکرمندی سے کہا اور چولہا جلانے کی کوشش کرنے لگا۔ کئی بار کی کوشش کے باوجود چولہا نہیں جل رہا تھا۔ سائیں مسکرایا اور اس کے قریب بیٹھ کر خاموشی سے اک تارہ بجانے لگا۔

''آج تو ٹھنڈ ہے آگ بھی نہیں جل رہی۔'' شیرا بڑبڑایا۔

''اوئے اندر سے انگیٹھی میں کوئلے ڈال کر لا...... وہی جلاؤں۔ سردی نے مت ماردی ہے۔'' شیرا بڑبڑایا اور ایک لڑکا انگیٹھی لے آیا۔ شیرا آگ جلانے لگا، دھوئیں سے اس کی آنکھیں سرخ ہونے لگیں اور ان سے پانی بہنے لگا۔ سائیں نے مسکرا کر اسے دیکھا اور کلام پڑھنے لگا۔

اکھیاں نوں میں پکی سمجھاواں ... نہ رو ڈھائیں، ڈھائیں ہو

دل نوں صبر قرار نہ آوے ... سمجھن دو وئیں ناہیں ہو

اندر بالن، اندرے دھواں ... اندرے بھڑکن بھائیں ہو

طالب ہاں دیدار دا باہو ... اپنا آپ وکھائیں ہو

شیرے نے چونک کر سائیں کی طرف دیکھا تو وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔

''اللہ والوں کی باتیں اللہ ہی جانے''۔ شیرے نے لمبی سانس کھینچ کر کہا۔

ماسٹر باسط علی تیز تیز چلتے ہوئے کھوکھے تک آ گئے۔ اچانک سامنے سائیں کو دیکھ کر ٹھٹکے۔ تو سائیں نے بھی بھرپور نگاہوں سے ان کی جانب دیکھا اور وہ نظریں جھکا کر اندر چلے گئے۔ ''ہا۔ ہا...... حق اللہ......'' سائیں نے نعرہ لگایا اور اپنا اک تارہ ایک جانب رکھ کر شیرے کی جانب دیکھنے لگا۔

''اچھا۔ بھائی...... چلتا ہوں......'' سائیں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''سائیں جی...... کہاں جا رہے ہو......؟ چائے تو پیتے جاؤ۔ چائے تیار ہے۔ آج بہت سردی ہے۔ دو گھونٹ پینے سے جسم گرم ہو جائے گا۔'' شیرے نے محبت سے کہا اور ایک کپ میں چائے ڈالنے لگا۔

''جسم گرم کر کے بھلا میں کیا کروں گا...... تھوڑی دیر گرم پھر مٹی ٹھنڈی ٹھار۔ بھلا مٹی بھی گرم ہوتی ہے...... جتنا مرضی آگ میں رکھو...... ڈھیری پھر ٹھنڈی کی ٹھنڈی ہوگی۔ سائیں نے کہا اور اپنا کشکول اور اک تارہ اٹھا کر نکل گیا۔ ٹوٹی جوتی میں سے آدھے پاؤں باہر آ رہے تھے۔ ایڑیاں سردی اور بہت چلنے کی وجہ سے پھٹ چکی تھیں اور پھٹی ہوئی جلد سے خون رس رس کر خشک ہو چکا تھا۔ اس نے سبز لمبے چوغے پر جا بجا پیوند لگا رکھے تھے مگر کوئی سویٹر یا گرم کپڑا نہیں پہن رکھا تھا۔ لمبے کھچڑی بالوں کی لٹیں ادھر اُدھر بکھری تھیں مگر سر پر کچھ نہ تھا...... اسے دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ اسے واقعی ہی سردی نہیں لگتی تھی۔

سائیں نے باہر جاتے ہوئے پھر ماسٹر باسط علی کی جانب بغور دیکھا۔

| | |
|---|---|
| نہ خدا مسیتے لبھدا | نہ خدا وچ کعبے |
| نہ خدا قرآن، کتاباں | نہ خدا نمازے |
| نہ خدا میں تیرتھ ڈٹھا | ایویں پینڈے جاگے |

ماسٹر باسط علی نے مضطرب ہو کر پہلو بدلا اور سائیں سے نظریں چرانے لگے۔ سائیں نے معنی خیز انداز میں بھرپور قہقہہ لگایا اور قہقہہ لگاتا ہوا کھوکھے سے باہر نکل گیا۔ سب حیرانگی سے اسے جاتے ہوئے دیکھنے لگے۔

''سائیں بھی کمال بندہ ہے...... آج تک میرے کھوکھے سے چائے کا گھونٹ نہیں پیا...... مگر ہر روز چکر ضرور لگائے گا...... بڑا ہی اللہ لوک ہے۔'' شیرے نے مسکرا کر اپنے آپ سے کہا۔

''اوئے جمالے...... الماری میں سے کپ پلیٹ لا...... ماسٹر صاحب کو چائے دینی ہے۔'' شیرے نے اونچی آواز سے کہا اور جمال جلدی سے الماری میں سے ایک اسپیشل پھولوں والی کپ پلیٹ لے آیا اور اپنے کندھے پر رکھے کپڑے سے اس کو صاف کر کے شیرے کے آگے رکھا۔ شیرے نے اس میں اسپیشل بنائی ہوئی چائے ڈالی اور چھوٹے سے ٹرے میں کپ پلیٹ رکھ کر ماسٹر صاحب کو چائے بھیجی۔ ماسٹر صاحب نے مسکرا کر جمالے کی جانب دیکھا اور آہستہ آہستہ چائے پینے لگے۔

ماسٹر صاحب نے سفید موٹے سوٹ کے اوپر بلیک موٹی جیکٹ اور سر پر گرم ٹوپی پہن رکھی تھی، وہ انتہائی بارعب اور جاذب نظر شخصیت لگ رہے تھے۔ ان کی عمر پچاس سال سے زیادہ تھی مگر ان کی اچھی صحت اور سرخ و سفید رنگت نے ان کی اصل عمر کو کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ ماسٹر صاحب کون تھے اور کہاں سے آئے تھے......؟ کوئی نہیں جانتا تھا...... مگر عرصہ دراز سے اس چھوٹے سے پہاڑی علاقے میں مقیم تھے۔ گاؤں کے لوگ ان کی بے حد عزت کرتے تھے اور ان سے والہانہ عقیدت بھی رکھتے تھے۔ کھوکھے میں ماسٹر صاحب تنہا بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ کیونکہ ابھی دن کا آغاز ہوا تھا اور باہر سردی بھی بہت تھی۔ پھر رفتہ رفتہ لوگ آنا شروع ہو گئے۔

ماسٹر صاحب چائے پیتے ہوئے مسلسل اس دیوار کی جانب دیکھ رہے تھے جہاں ایک چھوٹے سے کیلنڈر پر ایک حدیث قدسی لکھی تھی:

''اے ابن آدم...... ایک تیری چاہت ہے اور ایک میری چاہت ہے، ہوگا تو وہی جو میری چاہت ہے، پس اگر تو نے سپرد کر دیا اپنے کو،

اس کے، جو میری چاہت ہے تو وہ بھی میں تجھے دے دوں گا جو تیری چاہت ہے۔ اگر تو نے مخالفت کی اس کی، جو میری چاہت ہے تو میں تھکا دوں گا اس میں جو تیری چاہت ہے اور پھر ہو گا تو وہی جو میری چاہت ہے۔"

ہر لفظ پڑھتے ہوئے ماسٹر صاحب کے دل میں آہیں بلند ہو رہی تھیں۔ ہر روز ان کا یہی معمول تھا۔ وہ ہمیشہ چائے اس مخصوص کرسی میز پر بیٹھ کر پیتے تھے، جہاں سے یہ حدیث واضح طور پر پڑھی جا سکتی تھی اور ہر بار پڑھتے ہوئے ان کے ذہن میں نجانے کیا کیا خیالات آتے تھے۔

"السلام علیکم۔" "ماسٹر صاحب۔" گاؤں کے دو تین نوجوان کھوکھے میں داخل ہوئے اور چائے کا آرڈر دے کر اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ ایک نوجوان قدرے اونچی آواز میں ہر خبر پڑھ کر سنانے لگتا تو دوسرے اپنی اخبار چھوڑ کر اس کو سننے میں مصروف ہو جاتے۔

"یار...... یہ خبر سنو...... چار بچوں کی ماں اپنے آشنا کے ساتھ فرار......، اور......" ایک نوجوان پڑھتے ہوئے ایک دم رک گیا۔

"اور...... کیا......؟ دوسرے دونوں نے انتہائی تجسس سے پوچھا۔

"اور......" وہ آہستہ آہستہ اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔

اور...... یہ کہ...... موصوفہ کی پہلے شوہر سے بھی محبت کی شادی ہوئی تھی۔ اس نوجوان نے اخبار ایک جانب رکھتے ہوئے کہا ماسٹر صاحب بغور ان کی باتیں سن رہے تھے۔ ایک دم چائے کا کپ ان کے ہاتھ سے چھلکا اور انہوں نے کپ وہیں میز پر رکھ دیا۔

"یار...... یہ کیسی محبت ہے...... جو بار بار ہو جاتی ہے اور ہر بار اتنی طوفانی کہ پہلی محبت کی کوئی قدر نہیں رہتی...... ہو سکتا ہے کوئی تیسرا ملنے پر دوسرے کی محبت سے دل بھر جائے۔" دوسرے نوجوان نے کہا۔

"یار...... محبت ہی ہے نا...... کرنے دو...... جتنی بار کوئی کرنا چاہے...... کرے...... دوسروں کو کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہئے۔ تیسرے نے ہنستے ہوئے کہا۔

ماسٹر صاحب نے چائے کے پیسے پلیٹ کے نیچے رکھے اور خاموشی سے کھوکھے میں سے باہر نکل آئے۔

ماسٹر باسط علی کا دم گھٹنے لگا۔ انہیں یوں محسوس ہونے لگا جیسے اچانک انہیں کسی تاریک کمرے میں بند کر دیا گیا ہو۔ جہاں نہ کوئی روشنی کی کرن پہنچ رہی ہو اور نہ سانس لینے کو ذرا سی ہوا ہو...... ماسٹر صاحب کھوکھے سے باہر نکل آئے۔ باہر موسم خاصا ٹھنڈا ہو رہا تھا مگر ماسٹر صاحب کا پورا بدن بری طرح جل رہا تھا۔ انہیں اس شدید سردی میں پسینہ آنے لگا تھا وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے سڑک پر چلے جا رہے تھے۔ اونچی نیچی...... غیر ہموار سڑک ایک ویران راستے کی جانب جا نکلی۔ اس ویران راستے کی جانب بہت کم لوگ جاتے تھے مگر اس ویرانے کی طرف ماسٹر باسط علی کا مسکن تھا۔

سورج آہستہ آہستہ بادلوں کی اوٹ سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کوشش میں وہ جیسے ہی زمین کو اپنا جلوہ دکھاتا، زمین اس کی جھلک کا پرتپاک استقبال کرتی اور اس کے جلوے سے اس کا وجود دمکنے لگتا...... زمین جیسے ہی خوش ہوتی، سورج غائب ہو جاتا اور زمین پھر سرد آہیں بھر کر افسردہ ہونے لگتی اور اس پر ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگتیں۔ موسم بے حد خوبصورت ہو رہا تھا...... ارد گرد خوبصورت چیڑ، صنوبر اور سنبل کے درخت اپنی خوبصورتیوں کے جلوے دکھا رہے تھے۔ زمین اور آسمان کا ہر منظر خوبصورت اور دلفریب تھا مگر ماسٹر باسط علی کے دل میں ایسی آگ لگی تھی کہ انہیں کوئی

شے اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ ان کی آنکھوں کے گوشے تر ہو رہے تھے۔ حلق سوکھ رہا تھا، چہرہ پسینے سے تر تھا، دل اس قدر اداس اور پریشان تھا کہ بس شدت غم سے پھٹنے کو بے تاب تھا۔ وہ جلد از جلد اپنی کٹیا میں پہنچنا چاہتے تھے۔ ہر شے اور شخص سے بے خبر وہ اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھے۔

''تیرے نفس میں اتنا ملال کیوں ہے؟ اچانک پاس سے گزرنے والے فقیر سائیں مٹھا نے کہا تو ماسٹر باسط نے چونک کر اسے دیکھا تو سائیں مٹھا مسکراتا ہوا اور اسے گھورتا ہوا اس کے پاس سے گزر گیا۔ ماسٹر باسط علی کے دل میں پھر عجیب سی کیفیت پیدا ہونے لگی۔

سائیں مٹھا ہر بار اس کے دل کی چوری پکڑ لیتا تھا اور وہ نظروں ہی نظروں میں ماسٹر باسط علی سے اس کی ہمت اور جرأت بھی چھین لیتا تھا کہ وہ اس سے کوئی بات ہی پوچھ سکے۔ ماسٹر باسط علی کے دل میں اس لمحے واقعی بہت غم، دکھ اور ملال تھا۔ اور یہ صرف وہی جانتا تھا یا پھر اس کا خدا..... مگر سائیں مٹھا کیسے جان گیا۔ وہ بھی ایک نظر میں ماسٹر باسط علی کھڑا ہو کر اس راستے کی جانب دیکھنے لگا جس پر اب دور دور تک سائیں مٹھے کا کوئی پتا نہ تھا۔ گویا وہ بجلی کی سرعت سے اس کے پاس سے گزر گیا تھا۔

''سائیں..... ہر بار ہی..... میری ہر بات جان لیتا ہے..... اور مجھے بات کرنے کا موقع بھی نہیں دیتا۔ نجانے یہ شخص مجھ سے کیا چاہتا ہے اور ہر بار جب میں شدید اذیت میں ہوتا ہوں..... یہ اچانک میرے سامنے آجاتا ہے۔'' ماسٹر باسط علی چند لمحے پہلے والی قلبی اذیت بھلا کر سائیں مٹھے کے بارے میں سوچنے لگا۔

وہ اسی نیاسی سالہ مجذوب تھا۔ ہر وقت رنگ برنگی بڑے بڑے موتیوں والی مالا۔ اپنے گلے میں پہنے رکھتا تھا۔

سبز لمبے چوغے کے اوپر گرمی میں کبھی اکٹھے دو تین سوئٹر پہن لیتا اور کبھی انتہائی شدید سردی میں صرف خالی چوغہ پہنتا..... اس کے ہاتھ میں کبھی کشکول ہوتا اور کبھی اکتارہ اس کے ہاتھوں کی ساری انگلیاں مختلف پتھروں کی انگوٹھیوں سے پر ہوتیں..... اس کے کھچڑی بالوں کی لٹیں مٹی سے اٹ کر اپنی اصلی رنگت ہی کھو بیٹھی تھیں۔ وہ شاذ و نادر ہی نہاتا تھا۔ پاؤں میں مختلف قسم کی چھن چھن کرتیں جھانجھریں پہنتا اور ہاتھ میں کڑے موٹے سے ڈنڈے کے ساتھ رنگ برنگی کترنیں بندھی ہوتیں، جنہیں لوگ زبردستی اس کے ڈنڈے کے ساتھ اپنی مرادیں پوری ہونے کے لئے باندھ دیتے۔ وہ لوگوں کو گالیاں بکتا، مگر لوگ زبردستی کترنیں باندھنے لگتے تو وہ ڈنڈا غصے میں ان کے آگے پھینک دیتا۔ لوگ خوش ہو جاتے۔

''کچھ نہیں ہوتا..... چاہے کپڑے کے تھان اس کے ساتھ باندھ دو.....'' مگر لوگ اپنے اعتقاد میں بہت پختہ تھے۔ وہ کترنیں باندھ کر یوں مطمئن ہو جاتے جیسے اب ان کی مرادیں ہر صورت میں پوری ہو کر رہیں گی اور اکثر لوگ یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے کہ سائیں کے ڈنڈے کے ساتھ کترنیں باندھنے سے ان کی مرادیں پوری ہو گئیں..... سائیں بہت کم کسی سے بات کرتا تھا۔ بہت کم ہنستا تھا..... بہت کم روتا تھا۔ زیادہ تر خاموش رہتا تھا..... زیادہ تر صوفیانہ کلام پڑھتا رہتا تھا۔ لوگ اسے بلانے کی کوشش کرتے مگر وہ بہت کم جواب دیتا..... مگر ماسٹر باسط علی سے وہ خود بات کرتا تھا۔ ماسٹر باسط علی چونک کر اسے دیکھتا ہی رہ جاتا..... اور جب وہ سائیں سے بات کرنے کی کوشش کرتا تو سائیں منہ پھیر کر آگے نکل جاتا..... دونوں میں کئی سالوں سے یہ معمول جاری تھا۔

ماسٹر باسط علی نے لمبی آہ بھری اور اپنی کٹیا میں چلے گئے۔ جس میں ان کے علاوہ کبھی کوئی دوسرا نہیں رہتا تھا۔ ہر طرف گہری خاموشی تھی،

سورج بادلوں کو ہرا کر اب فاتحانہ انداز میں پوری آب وتاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ اس کی روشنی اور حدت سے سارا ماحول گرم اور روشن ہو رہا تھا۔ ماسٹر باسط علی نے اپنی گرم ٹوپی اتاری اور ایک چارپائی پر لیٹ گیا جس پر صاف ستھرا بستر بچھا تھا۔

''چار بچوں کی ماں...... اپنے آشنا کے ساتھ فرار......'' ماسٹر باسط علی نے کروٹ بدلی، دل اک انجانے بوجھ تلے دبنے لگا۔ یہ کیسی محبت ہے...... ہر بار اتنی طوفانی...... کہ پہلی محبت پر غالب آ گئی...... محبت ہی ہے نا...... کرنے دو......'' ملے جلے جملے ماسٹر باسط علی کے دل میں ایک طوفان برپا کرنے لگے۔ وہ بھی چھوڑ کر چلی گئی...... سب کچھ...... مجھے...... اور میری محبت کو...... اس نے بھی سب کچھ بھلا دیا...... ان سب لوگوں کو...... ان تکلیفوں کو...... ان آزمائشوں اور اذیتوں کو...... جو میں نے اسے پانے کے لئے اور اس نے مجھے پانے کے لئے برداشت کی تھیں...... ماسٹر باسط علی چارپائی پر لیٹ گیا اور اس کے سامنے ماضی کا ایک ایک لمحہ ایک فلم کی مانند چلنے لگا۔ وہ سب باتیں...... وہ سب لمحے اور وہ سب یادیں جو دل کے اندر کسی گہرے راز کی مانند پوشیدہ تھے اب ان میں ان کا ذہن اور شعور شریک ہو رہا تھا۔ وہ نازی سے جنون کی حد تک محبت کرتا تھا۔ انتہائی شدید محبت، طوفانی محبت...... جس کی خاطر وہ سب کچھ برداشت کرنے کو تیار تھا۔ نازنین بھی اس سے بہت محبت کرتی تھی...... دونوں ایک ہی حویلی میں پل بڑھ کر جوان ہوئے تھے۔ باسط علی حویلی میں کام کرنے والے مزارعے قادر علی کا بیٹا تھا، چار بہنوں کا اکلوتا، خوبصورت، کجیل نوجوان اس کے ماں باپ زمیندار حشمت خان کی زمینوں پر کام کرتے تھے اور بہنیں حویلی کے اندر کل وقتی ملازمائیں تھیں۔ باسط علی کو پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا، اس لئے قادر علی نے اسے اپنے ایک دوست کے پاس شہر کے ایک مدرسے میں بھیج دیا، جہاں وہ لکھنے پڑھنے لگا۔ کئی کئی ماہ بعد گھر آتا تو ماں اور بہنیں اس کے لاڈ اٹھاتی نہ تھکتی تھیں، اسے کوئی قدم زمین پر نہ رکھنے دیتیں۔ ماں دیسی گھی کے پراٹھے۔ حلوے اور مختلف پکوان پکا پکا کر اسے کھلاتی اور باپ کی محبت کا اپنا انداز تھا وہ اپنے کاموں سے فارغ ہو کر اسے اپنے گھوڑے پر بیٹھا کر خوب سیر کرواتا، مختلف کھیل تماشے اور میلے دکھانے اسے لے جاتا۔ باسط علی آٹھ، دس دن کے لئے گاؤں آتا اور وہ آٹھ دس دن کیسے گزر جاتے اسے خبر ہی نہ ہوتی۔ واپس شہر جاتے ہوئے وہ خوب آنسوؤں سے روتا تو ماں، بہنوں کا دل بری طرح کٹتا...... اس کی ماں بلقیس کئی بار قادر علی سے کہتی کہ وہ اسے شہر نہ جانے دے وہ اس کی جدائی برداشت نہیں کر سکتی، مگر قادر علی کو اس کا مستقبل عزیز تھا۔ وہ ان پڑھ تھا مگر تعلیم کی اور علم والوں کی بہت قدر کرتا تھا۔

''اری...... بے وقوف...... تو نہیں جانتی کہ علم کتنی بڑی دولت ہے...... ہمارے پاس زمینیں، جائیدادیں تو ہیں نہیں جو ہماری اولاد کا شملہ اونچا کر سکے گی۔ آ۔ جا۔ کے تعلیم ہی اس کو عزت دے سکتی ہے۔ کیا تو نہیں چاہتی کہ اس کا شملہ اونچا ہو۔ وہ عزت دار بنے۔ لوگ اس کے آنے پر اٹھ کھڑے ہوں۔ یہاں رہ کر وہ ہماری طرح مٹی میں مٹی ہو جائے گا۔ بلقیس اب یہ تجھ پر ہے کہ اپنے بچے کو مٹی بنائے یا سونا۔ قادر علی سرگوشیوں میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتا تو وہ اس کی باتیں سن کر خاموش ہو جاتی۔ قادر علی جو بھی کہتا تھا۔ ٹھیک کہتا تھا۔ وہ پچھلی کئی پشتوں سے حویلی کے مزارعے چلے آ رہے تھے۔ نسل در نسل مزارعے...... انہوں نے بھی اپنا بچپن، جوانی اور بڑھاپا زمینداروں کی خدمت کرنے میں گزار دی تھی۔ صبح سویرے وہ کھیتوں میں چلے جاتے اور شام کو گھر لوٹتے۔ زمینوں پر کام کرتے کرتے ان کی زندگیاں اب ختم ہونے کے قریب تھیں مگر نہ ان کے گھر میں خوشحالی آئی تھی اور نہ ہی عزت وہ جو کچھ تھے اس سے ایک انچ بھی آگے نہ بڑھے تھے۔ باسط علی کی صورت میں انہیں ایک امید کی کرن نظر آئی تھی اور قادر علی

نے اس کرن کو اپنے لئے غنیمت جانتے ہوئے......اسے آفتاب بنانے کی کوشش کی تھی۔ قادر علی کے دوست نے دوستی کا حق ادا کر دیا تھا اور باسط علی اسے اپنی اولاد کی طرح محبت کرتا تھا۔ بڑی توجہ سے اسے پڑھاتا تھا۔ اس کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی، باسط علی کی صورت میں اسے اولاد مل گئی تھی۔ باسط علی ہونہار تھا اور ماسٹر صدیق کی توجہ و محبت نے اس کے دل میں علم کا ذوق وشوق اور بڑھا دیا تھا۔ وہ ہر کلاس میں اول آتا تھا۔ جیسے ہی اس نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا اور کالج میں داخلہ لیا تو اس کا رنگ و روپ اور حلیہ ہی بدل گئے۔ ماسٹر صدیق نے اسے شہر کے بہترین کالج میں داخلہ دلوایا۔ اچھے کالج کے ماحول نے اس کی سوچ اور فکر کو بہت بدل دیا، وہ گاؤں آیا تو ہر گزرنے والا اسے مڑ مڑ کر دیکھتا۔ اونچا، لمبا، خوبصورت، وجیہہ نوجوان جو شکل سے ہی سلجھا ہوا اور تعلیم یافتہ لگتا تھا، انتہائی جاذب نظر شخصیت کا مالک بن رہا تھا۔ قادر علی اور اس کی بیوی اس کی بلائیں لیتے نہ تھکتے تھے۔ قادر علی کو اسے شہر بھیجنے کے فیصلے پر فخر محسوس ہوتا۔ اگر وہ گاؤں میں اس کے پاس رہتا تو اس کی طرح ایک مزارع ہی ہوتا۔

اب تو گاؤں کے ہر گھر میں اس کی چرچا ہونے لگی تھی۔ قادر علی کو محسوس ہونے لگا جیسے باسط علی کی وجہ سے اس کی عزت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے اور اس سوچ کے آتے ہی اس کا سر فخر سے بلند ہونے لگتا۔ فرط جذبات سے اس کی آنکھیں نم ہونے لگتیں اور وہ دل ہی دل میں بے حد خوش ہوتا۔

زمیندار حشمت خان کی تیسری بیٹی نازنین بھی شہر کے ایک کالج میں پڑھتی تھی۔ اتفاق سے دونوں چھٹیوں میں گھر آئے تو دونوں ایک دوسرے کی محبت کے اسیر ہو گئے۔ نازنین حسن و خوبصورتی کا مکمل پیکر تھی۔ اسے دیکھ کر کسی مصور کی خوبصورت پینٹنگ کا احساس ہوتا تھا۔ اس کی خوبصورت جھیل سی گہری آنکھیں۔ ستواں لمبی ناک، گہرے سیاہ ابرو۔ سفید گلابی رنگت، دراز قد اور سفید مرمریں جسم۔ اسے جو ایک بار دیکھتا، بار بار دیکھنے کی خواہش کرتا۔ اس جیسا حسن قدرت بہت کم کسی کو عطا کرتی ہے۔ وہ باسط علی کو اور باسط علی اسے دیکھ کر دل ہار گیا۔ ایک دوسرے کو دیکھے بغیر نہ دن کا آغاز ہوتا اور نہ رات کو الوداع کہا جاتا......نجانے کیسے قدرت نے ان کے دلوں کو محبت کے انتہائی جذبات سے بھر دیا تھا کہ انہیں خبر ہی نہ ہوئی۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے اور مسکراہٹوں کے ذریعے ہی محبت بھرے پیغامات ایک دوسرے کو پہنچا دیتے۔ وہ محبت کے پر لگائے اونچی اڑانیں بھرنے میں مصروف تھے، نازنین کی محبت اس کے دل کی دھڑکنوں میں ایسے سمائی تھی گویا ہر دھڑکن صرف اس کے نام کی وجہ سے زندہ تھی اور باسط علی کا نام نازنین کے دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کرنے کے لئے کافی ہوتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے بہت عجیب محبت کرنے لگے تھے۔ بہت خاموش مگر بہت شدید......وہ بہت کم ایک دوسرے سے بات چیت کرتے مگر تخیل میں ایک دوسرے کو باتوں سے ہی فرصت نہ ملتی۔ دونوں کی روحیں ایک دوسرے میں یوں مدغم ہو رہی تھیں جیسے وہ ایک دوسرے کے لئے ہی پیدا کی گئی ہوں۔ محبت کیسا عجیب جذبہ ہے، جو پل میں انسان کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیتا ہے۔ وہ شہر سے گاؤں آنے سے پہلے ایسے نہیں تھے، جب واپس شہر جانے لگے تو دونوں بہت بدل چکے تھے۔

''نازی......تمہارے بغیر......میں کیسے رہ پاؤں گا......یوں لگتا ہے......اب تو میری سانسیں بھی تمہارے قبضے میں ہیں۔'' باسط علی نے شہر جانے سے پہلے نازنین سے پہلی مرتبہ اپنے دل کی بات کہی۔

''اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے......جیسے میرے جسم میں میری سانسیں ہی باقی نہیں......'' نازی نے جواب دیا۔

"کیوں......؟ باسط علی نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"سانس کے لئے آکسیجن، زندگی ہے۔ اور میری زندگی تو تم ہو..... تمہارے بغیر تو زندگی ادھوری لگتی ہے...... تم نظر نہیں آتے...... تو کچھ بھی اچھا نہیں لگتا..... تم نظر آتے ہو تو یوں لگتا ہے جیسے مجھے ساری خوشیاں مل گئی ہوں۔ باسط علی...... تم نے مجھے کیا کر دیا ہے؟ نازی نے نم آنکھوں کے ساتھ بے بسی سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے خود بھی معلوم نہیں...... کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔ شاید قدرت نے ہم دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کی بہت محبت ڈال دی ہے...... ورنہ ہم نے بچپن بھی تو اسی حویلی میں گزارا ہے...... اور ہم ایک دوسرے سے کتنا جھگڑتے بھی تھے۔ ایک دوسرے سے بات کرنا پسند نہیں کرتے تھے اور اب ایک دوسرے کو دیکھے بغیر سکون نہیں ملتا...... ایک دوسرے کے لئے اتنی محبت اور چاہت نجانے کہاں سے پیدا ہو گئی ہے؟ باسط علی نے حیرت سے کہا۔

"ہاں میں بھی اکثر اس کے بارے میں سوچتی ہوں...... باسط علی...... مجھے زندگی کا حاصل تمہارے سوا اور کوئی نظر نہیں آتا...... تم ہو تو...... میں ہوں...... اور تم نہیں...... تو میں بھی نہیں۔" نازی نے آہ بھر کر اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"نازی...... تمہاری اتنی محبت سے مجھے ڈر لگتا ہے...... اگر ہماری محبت...... ؟ باسط علی نے اپنے دل میں چھپے خدشات کو ظاہر کرتے ہوئے کہا تو نازی نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

"باسط علی...... ہماری محبت ہمیں مل کر رہے گی...... کبھی بے یقینی کی باتیں نہ کرنا...... مجھے صرف اور صرف تم اور تمہاری محبت چاہئے...... اس کے علاوہ اور کچھ نہیں...... اور نہ ہی میں کسی اور کو قبول کروں گی...... تم بھی اپنے ذہن میں سے ہر سوچ کو نکال دو۔" نازی نے پرعزم لہجے میں جواب دیا۔

"مگر...... میرے اور تمہارے درمیان...... جو اتنا لمبا فاصلہ ہے...... جس کو میری کئی پشتیں بھی عبور نہیں کر سکیں...... وہ میں کیسے طے کروں گا......" باسط علی نے فکرمندی سے کہا۔

"اگر دلوں میں فاصلہ نہ ہو...... تو...... دنیا کے فاصلے کیا اہمیت رکھتے ہیں؟ نازی نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

"دل کی باتوں...... اور...... دنیا کی باتوں میں بڑا فرق ہے۔ دنیا تو محبت کو ہی نہیں مانتی......" باسط علی نے جواب دیا۔

"دنیا نہیں مانتی...... تو...... نہ مانے...... میں اور تم...... تو مانتے ہیں۔ ہمارے دل مانتے ہیں......" نازی نے قدرے اکڑ کر کہا...... نازی بہت خود سر اور ضدی تھی۔ بچپن سے ہی اپنی بات منوانے کی عادی تھی۔ حشمت خان نے اپنی تینوں بیٹیوں کو اس قدر لاڈ پیار سے پالا تھا کہ وہ قدرے خود سر ہو گئی تھیں۔ مہ جبیں جو سب سے بڑی تھی، اس کی شادی ہو چکی تھی۔ افشین کی منگنی اپنے ماموں زاد سے بچپن میں ہی طے ہو گئی تھی، صرف نازنین کے امتحانات کی وجہ سے اس کی شادی میں تاخیر ہو رہی تھی۔ نازنین کو پڑھائی کا بہت شوق تھا اور وہ شہر کے کالج میں گریجویشن کر رہی تھی۔ وہ دونوں بہنوں سے زیادہ خوبصورت تھی۔ پورے گاؤں میں حسن و جمال میں اس کے برابر کا کوئی نہیں تھا۔ اس کے حسن و خوبصورتی کو کسی کی نظر نہ لگ

جائے، اس لئے حشمت خان نے اسے پردے کی خاص تاکید کر رکھی تھی...... مگر باسط علی کی نگاہوں سے وہ بچ نہ سکی۔ باسط علی بھی اونچا، لمبا، جیلا نوجوان تھا۔ گاؤں کی بہت سی لڑکیاں اس پر مرتی تھیں...... مگر اس کا دل تو نازی پر مرمٹا تھا۔ اسے نازی جیسا کوئی اور دکھائی ہی نہیں دیتا تھا اور نازی کو باسط علی کے سوا کوئی اور نظر ہی نہیں آتا تھا۔ نازی دوسرے شہر چلی گئی اور باسط علی دوسرے۔ دونوں میں جدائی کیا پیدا ہوئی، دونوں مرنے کے قریب ہو گئے، نہ ایک دوسرے سے کوئی رابطہ ممکن تھا نہ ہی کوئی تعلق، نہ نازی کا دل پڑھائی میں لگتا تھا اور نہ ہی باسط علی کا۔ دونوں پڑھتے بیٹھتے تو مضطرب سوچوں کے ساتھ بس کتابوں کو گھورتے رہتے۔ باسط علی نے ایم ایس سی فزکس کے پیپرز دیئے اور جلدی جلدی گھر لوٹ آیا۔ نازی نے بھی انتہائی اداس دل کے ساتھ پیپرز دیئے اور گھر بھاگنے کی جلدی کی۔ نازی دوپہر کو حویلی پہنچی اور باسط علی شام کو۔ نازی نے جیسے ہی حویلی میں قدم رکھا تھا تب سے باسط علی کی بہن ثمینہ سے باتوں باتوں میں باسط علی کے بارے میں پوچھتی رہی اور جیسے ہی وہ گھر پہنچا تو اس کی جانب بے تاب نگاہوں سے یوں دیکھا جیسے برسوں سے کوئی پیاسی کسی صحرا میں ماری ماری پھرتی رہی ہو اور باسط علی کو دیکھتے ہی اس کی ساری پیاس بجھ گئی ہو......

باسط علی نے مسکرا کر اسے دیکھا اور نازی کو یوں لگا جیسے نازی کے دل کی ساری خوشیاں باسط علی کی مسکراہٹ میں چھپی ہوں اور باسط علی اسے دیکھ کر یوں مسرور ہوا جیسے کسی بیمار کو بہت دنوں بعد اچانک شفا مل گئی ہو۔ چند ماہ میں ان کی محبت، پہلے سے بالکل مختلف تاثرات لئے ہوئے تھی۔ پہلے محبت میں اضطراب اور انتظار تھا۔ اب محبت میں شدت اور بے باکی آتی جا رہی تھی۔ پہلے دو سوچیں مضطرب رکھتی تھیں اور اب جذبات بے قرار رکھتے تھے۔ پہلے محبت کی دبی دبی چنگاریاں اندر ہی اندر سلگتی رہتی تھیں اور اب ہر جانب شعلے بن کر بھڑکتے رہتے تھے۔ پہلے محبت پوشیدہ راز تھی، اب سرعام اقرار تھی۔ ان کی محبت کی خوشبو آہستہ آہستہ پھیلنے لگی تھی اور بہت سے لوگ اس راز میں شریک ہونے لگے تھے۔

قادر علی کو جب معلوم ہوا تو اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس کی پچھلی نسلیں حشمت خان کے آباؤ اجداد کے ٹکڑوں پر پلتی آ رہی تھیں۔ باسط علی ذرہ خاک تھا اور ماہتاب کو پانے کی تمنا کر رہا تھا، جو سنتا تھا حیران ہوئے بغیر نہ رہتا تھا۔ باسط علی کی عقل کہاں چلی گئی ہے...... باسط علی کی اتنی جرأت کہ فرش پر رہ کر عرش پر بیٹھنے کے خواب دیکھنے لگا ہے۔ ہر ایک کو باسط علی انتہائی گنہگار نظر آنے لگا۔ اس کی ماں کو خبر ملی تو دل پکڑ کر بیٹھ گئی۔ زبان دانتوں تلے دبالی۔ اپنے بیٹے کی سلامتی کی دعائیں کرنے لگی۔ حشمت خان کو اگر خبر مل گئی تو وہ اسے زندہ نہیں چھوڑے گا اور اس کے ساتھ ساتھ شاید اس کے پورے خاندان کو بھی...... حشمت خان کے جاہ و جلال اور رعب و دبدبے سے سب واقف تھے، اس کے سامنے کسی کو بولنے کی جرأت نہ تھی۔ وہ بے انتہا نڈر اور بے باک تھا۔ لوگوں کو راتوں رات غائب کرانا اور صفحۂ ہستی سے مٹانا اس کے لئے قطعی مشکل نہ تھا۔

''قادر علی...... میں اسی لئے کہتی تھی...... بیٹے کو مت پڑھا...... وہ اپنے آپ کو ''انسان'' سمجھنے لگے گا...... ہم لوگ ڈھور ڈنگر ہی رہیں تو ہی اچھا ہے...... بنا لیا تو نے اسے بڑا آدمی...... اب کیا کیا بھگتنا پڑے گا۔ یہ سوچ کر ہی میرا دل دہل جاتا ہے۔'' باسط علی کی ماں نے کہا تو قادر علی خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ اس کے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا۔ نجانے یہ سب کیسے ہو گیا تھا۔ اس نے تو باسط علی کے بارے میں ایسا کبھی نہیں سوچا تھا۔ نجانے انسان کی تقدیر میں کیا کچھ لکھا ہوتا ہے۔ اسے خبر ہی نہیں ہوتی۔ جب وہ ایک اٹل حقیقت بن کر سامنے آتی ہے تو انسان بوکھلا جاتا ہے۔ اسے کوئی راہ فرار نظر نہیں آتی۔ اس بوکھلاہٹ میں وہ کیا الٹے سیدھے قدم اٹھاتا ہے، اسے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ گل شہر میں نہیں کھلا تھا کہ وہ اس کی تعلیم

کو قصوروار ٹھہراتا۔ یہ تو آگ ان کے آنگن میں ہی بھڑکی تھی اور آنگن تو ان کی نظروں کے سامنے ہی تھا۔

حشمت خان اور اس کی بیوی حاکے کو بھی اس کی خبر مل گئی تھی۔ ان کے اندر آتش فشاں پھٹنے لگے۔ حشمت خان نے بیوی کو یہ بات راز میں رکھنے کو کہا اور چپکے چپکے نازی کا رشتہ اپنے ہی خاندان میں دور کے رشتے داروں میں کر دیا جو کبھی نہ تو ان کی حویلی آئے تھے اور نہ ہی یہ کبھی وہاں گئے تھے۔

شاہ زیب خان کے ساتھ شادی طے کر دی گئی۔ شاہ زیب خان والدین کا اکلوتا بیٹا تھا اور بہت زیادہ زمین و جائیداد کا مالک تھا۔ نازنین سے وہ دوگنی عمر کا تھا۔ انتہائی وجیہہ، خوبصورت اور بہت نیک دل انسان تھا۔ اس کی انسان دوستی اور لوگوں سے محبت و شفقت کی وجہ سے اپنے گاؤں اور اردگرد کے علاقے میں بہت عزت تھی۔ حشمت خان کو نازنین کے لئے اس سے بہتر کوئی رشتہ نظر نہ آیا۔ نازی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی اور حشمت خان نے انشین سے پہلے اس کی شادی طے کر دی۔ حشمت خان تو اس کی شادی فوراً کر دیتا مگر دونوں جانب فصلیں کٹائی کے لئے تیار کھڑی تھیں اس لئے انہیں تھوڑی سی تاخیر کرنی پڑی۔

نازی کو تھوڑا بہت اندازہ ہو چکا تھا کہ اس کے گھر والوں کو باسط علی سے اس کی محبت کی خبر مل چکی ہے، مگر کسی کا اس سے بات نہ کرنا انتہائی حیران کن تھا۔ اس کے دل میں وسوسے اور اندیشے سر اٹھانے لگے۔ وہ خود بھی بہت بے باک اور ضدی تھی۔ اپنے دل میں جنم لینے والے وسوسوں کو وہ خود ہی کچل دیتی...... میں باسط علی کے لئے سب کچھ کر سکتی ہوں...... اپنی جان بھی دے دوں گی، مگر باسط علی کو کبھی نہیں چھوڑوں گی۔" وہ اپنے دل میں مصمم ارادہ کرتے ہوئے سوچتی۔

قادر علی نے باسط علی کو تنہائی میں بہت سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ وہ خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا مگر کچھ نہ بولا۔

"باسط علی...... کیا تو نے کچھ سنا ہے...... جو میں نے تجھ سے کہا ہے۔" قادر علی اسے گم صم دیکھ کر بولا۔

باسط علی پھر خاموش رہا۔

"باسط علی...... تجھے کیا ہو گیا ہے...... تو ایسا...... تو...... ہرگز نہیں تھا۔ اور...... اب...... تو......؟" وہ اس کی جانب دیکھتے ہوئے آہ بھر کر بولا۔

"میں نے کیا...... کیا ہے؟" باسط علی نے مؤدبانہ انداز میں پوچھا۔

"تو...... اپنی اوقات بھول رہا ہے...... اور...... اس کی سزا ہم سب بھگتیں گے" قادر علی نے آہ بھر کر جواب دیا۔

"ابا جی...... میں نے اس بات کو یاد رکھنے کی ہمیشہ کوشش کی ہے...... مگر......" اس نے نم آنکھوں کے ساتھ باپ کی جانب دیکھا۔

"مگر...... کیا......؟ قادر علی نے حیرت سے پوچھا۔

"مگر...... کیسے بھول گیا...... مجھے سمجھ میں نہیں آیا......" باسط علی نے بھی بے بسی سے جواب دیا۔

"بیٹا...... اب بھی وقت ہے...... واپس لوٹ آ...... شہر چلا جا...... جب تک نازی کی شادی نہیں ہو جاتی۔" قادر علی نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"نازی کی شادی......" باسط علی نے گھبرا کر پوچھا۔

"ہاں...... بہت اندر کی بات ہے۔ نازی اور اس کے گھر والوں کو بھی نہیں پتا...... حشمت خان نے اس کی نسبت طے کر دی ہے اور فصل کی کٹائی کے بعد اس کی شادی ہے" قادر علی نے بتایا۔

"یہ...... ناممکن ہے۔" باسط علی نے جذباتی لہجے میں کہا۔

"بے وقوف...... مت بن...... یہی بہتر ہے کہ تو خاموشی سے شہر چلا جا...... مخمل میں ٹاٹ کا پیوند کبھی نہیں لگا...... اور...... اگر لگ بھی جائے تو کبھی نہیں بچتا۔" قادر علی نے اس کا بازو زور سے اپنی جانب کھینچتے ہوئے کہا۔

"ابّی...... زیادتی۔" باسط علی نے نم آنکھوں سے باپ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"بس...... اس سے زیادہ ایک لفظ نہ کہنا...... نازی کے ماں باپ اس کے لئے جو بہتر سمجھتے ہیں وہ کرنے کا انہیں پورا حق ہے...... تو...... کون ہوتا ہے...... انہیں کچھ کہنے والا...... اور خبردار...... تیری زبان سے اس راز کے بارے میں کوئی بات نکلی...... وہ تیری کچھ نہیں لگتی۔" قادر علی نے خفگی سے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"کچھ...... نہیں لگتی...... وہ...... میری...... جسے...... میں نے اپنا سب کچھ سونپ دیا ہے۔ دل...... جسم...... اور...... روح...... وہ کچھ نہیں لگتی۔" باسط علی نے باپ کی جانب حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا اور رونے لگا۔

"بکواس بند کر...... یہ شہری باتیں یہاں نہیں چلیں گی۔ یہاں عزت اور شرم و حیا کی باتیں ہوتی ہیں۔" قادر علی نے اسے ایک تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔

"کیا...... محبت...... کرنا بے حیائی ہے؟" باسط علی نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں...... اور اب مجھ سے اس کے بارے میں کوئی بات نہ کرنا میں نے جو تجھے سمجھانا تھا، سمجھا دیا ہے۔ اگر تو نے کوئی ایسا...... ویسا قدم اٹھایا...... تو...... اتنا سوچ لینا کہ تیری بہنوں کے ساتھ، کیا ہوگا۔" قادر علی نے افسردگی سے کہا تو باسط علی نے چونک کر باپ کی جانب دیکھا اور سر جھکا لیا۔

اگلے روز اسے شدید بخار ہو گیا۔ قادر علی اور بلقیس بے حد پریشان ہو گئے اور حکیم سے دوائیں لا لا کر اسے کھلاتے رہے، مگر بخار ٹوٹنے کو ہی نہیں آ رہا تھا۔ کئی روز گزر گئے تھے مگر بخار کسی طرح بھی کم نہ ہوا۔ باسط علی سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ نازی کو جب سے اس کے بخار کی خبر ملی تھی وہ بھی بے حد مضطرب تھی۔ اس کا دل تو چاہتا تھا کہ وہ سارا وقت باسط علی کے پاس بیٹھی رہے، مگر نہ بلقیس اسے اندر گھسنے دیتی تھی اور نہ ہی اس کی اپنی ماں اسے حویلی کے پچھواڑے میں جانے دیتی تھی، جہاں دو کچے کمروں میں قادر علی اور اس کے گھر والے رہتے تھے۔ وہ رات رات بھر اس کے لئے دعائیں مانگتی رہتی۔ ہر دوسرے تیسرے روز گاؤں میں موجود دو مزاروں پر جاتی اور اس کی صحت کے لئے دعا کرتی۔ شاید اس کی لگن تھی یا جذبات کی شدت کہ باسط علی کی صحت آہستہ آہستہ بہتر ہونے لگی، وہ ہر روز پانی دم کر کے باسط علی کی بہن کے ہاتھ اسے چپکے سے بھجواتی اور وہ خود اسے پلاتی، باسط علی رفتہ رفتہ صحت یاب ہونے لگا...... بلقیس...... اور باسط علی کی بہنیں نازی کی محبت کی قائل ہونے لگیں، مگر سب بہت بے بس تھیں۔

باسط علی نے صحت یاب ہو کر شہر جانے کا فیصلہ کر لیا...... نازی نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر وہ خاموش رہا۔

''تم...... مجھے چھوڑ کر کیوں جانا چاہتے ہو؟ نازی نے تڑپ کر پوچھا اور رونے لگی۔

''رزلٹ آنے والا ہے۔نوکری کی تلاش میں جارہا ہوں۔'' باسط علی نے اس کی جانب پشت کرتے ہوئے جواب دیا۔

''اگر یہ بات سچ ہے......تو......میری آنکھوں میں دیکھ کر اس کا جواب دو۔'' نازی نے اس کے سامنے آتے ہوئے کہا۔

''نازی......ہم دونوں کا ملاپ ممکن نہیں......ہم کبھی بھی ایک دوسرے سے مل نہیں پائیں گے......اس لئے بہتر یہی ہے کہ ہم...... ابھی......سے......'' باسط علی کے ہونٹ لرزنے لگے اور اس نے نازی کی طرف دیکھنے کے بجائے سر نیچے جھکا لیا۔

''باسط علی......یہ......تم کیا کہہ رہے ہو......کیا تم مجھ سے سچی محبت کرتے ہو؟'' نازی نے غصے سے پوچھا۔

''کیا تمہیں میری محبت میں شک ہے؟'' باسط علی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......'' نازی نے بے باکی سے جواب دیا۔

''کیا مطلب......؟'' باسط علی نے چونک کر پوچھا۔

''کونسا......سچا عاشق ہے جو......میدان چھوڑ کر بھاگا ہے......سچی محبت کی خاطر انہوں نے سر کٹانے کو قبول کر لیا مگر محبت سے دستبردار نہیں ہوئے......تم نے مجھ سے سچی محبت نہیں کی......محبت کے نام پر مجھے دھوکہ دیا ہے۔'' نازی چلاتے ہوئے بولی۔

''پکڑو......یہ چھری اور مجھے اپنے ہاتھوں سے قتل کر دو......اُف بھی کروں تو میرا نام باسط علی نہیں......'' باسط علی نے تیز دھار چھری اپنے کرتے کی جیب سے نکال کر اس کی جانب بڑھائی۔باسط علی نے بہادرانہ انداز میں کہا تو نازی اس کی طرف حیرت سے دیکھنے لگی۔

''پھر......یہ......سب کیا ہے......؟ کیوں مجھے چھوڑ کر جارہے ہو؟'' نازی فرط جذبات سے لبریز ہو کر اس کے سینے سے لگ کر بولی۔

''تمہاری اور تمہارے گھر والوں کی عزت کی خاطر۔'' باسط علی نے محبت سے اس کی پیشانی چومتے ہوئے کہا۔

''ہماری عزت کی خاطر......میری عزت......میری شان......میرا ایمان، میرا سب کچھ تو تم ہو۔'' نازی نے روتے ہوئے کہا۔

''لیکن......حشمت خان کی عزت تم ہو......اور میں نہیں چاہتا کہ تمہاری کسی حرکت کی وجہ سے ان کی عزت میں کمی آئے......'' باسط علی نے کہا۔

''ان کی عزت میں کیسے کمی آئے گی؟'' نازی نے حیرت سے پوچھا۔

باسط علی خاموش ہو گیا۔وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہ سکا۔وہ اس سے نظریں چرانے لگا۔

''باسط علی......تمہیں میری قسم......سچ سچ بتاؤ آخر بات کیا ہے؟'' نازی نے قدرے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''مجھ سے مت پوچھو......'' باسط علی نے منہ پھیرتے ہوئے کہا۔

''میں تم سے ہی پوچھوں گی اور تمہیں ہی بتانا پڑے گا۔کیونکہ ہم نے محبت کی ہے......چوری نہیں۔'' نازی نے کہا۔

''حشمت خان نے......شاید......تمہاری شادی......'' باسط علی......رک رک کر بولا۔

''میری شادی...... کیا مطلب؟'' اس نے چونک کر پوچھا۔

''کسی...... اور...... سے طے کر دی ہے۔'' باسط علی نے کہا۔

''کسی...... اور...... سے؟'' وہ چلاتے ہوئے بولی اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی...... باسط علی نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔

''باسط علی...... میری شادی کسی اور سے ہوتی ہے تو کیا تم دیکھتے رہ جاؤ گے؟ یہ تم کیسی محبت کرتے ہو؟ تمہاری محبت...... تمہاری آنکھوں کے سامنے چھن جائے اور تم دیکھتے رہ جاؤ گے۔ یہ محبت تو نہ ہوئی......'' نازی جذباتی ہو کر روتے ہوئے بولی۔

''میں تمہیں تماشا بنتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ کبھی نہیں چاہوں گا کہ لوگ تمہارے نام پر کبھی انگلی اٹھائیں۔'' باسط علی نے فکر مندی سے کہا۔

''مجھے کچھ معلوم نہیں...... اور میں کچھ نہیں جانتی...... مجھے صرف اپنی محبت...... اور تمہاری محبت چاہئے......'' نازی نے قدرے ٹھوس اور ضدی لہجے میں اس کے بازوؤں کو جھنجوڑتے ہوئے کہا۔

''نازی...... ہم کیا کر سکتے ہیں...... جب تک کہ تمہارے گھر والے رضامند نہ ہوں گے۔'' باسط علی نے کہا۔

''مجھے کسی کی کوئی پروا نہیں...... میری زندگی...... میری سانسیں...... میری خوشی تم ہو...... میں کیسے تمہارے بغیر رہ سکوں گی۔ مجھے بتاؤ...... انسان کے لئے زندگی ضروری ہے یا عزت...... سانسیں اہم ہوتی ہیں یا خوشی؟'' نازی نے آہ بھر کر کہا۔

''نازی یہ تمہاری اور میری سوچ تو ہو سکتی ہے، مگر ہمارے والدین کے لئے ان کی عزت، ہماری زندگیوں سے زیادہ اہم ہے۔'' باسط علی نے جواب دیا۔

''کیا...... تم یہ برداشت کر لو گے کہ میں کسی اور کی ہو جاؤں؟'' نازی نے حیرت سے پوچھا۔

''مجھ سے ایسے سوال مت پوچھو جن کے جوابات دینا میرے لئے بہت مشکل ہو جائے۔'' باسط علی نے بے بسی سے جواب دیا۔

''باسط علی...... محبت...... چاہت کی راہ ہے...... اور چاہت...... خواہش سے جنم لیتی ہے اور جہاں خواہش ہوتی ہے وہاں نہ سوالات ہوتے ہیں اور نہ جوابات...... میں صرف ایک بات جانتی ہوں...... محبت کی راہ بہت مشکل اور کٹھن ہوتی ہے...... اس پر چلنے کے لئے بڑا حوصلہ اور ہمت چاہئے، جو لوگ ہمت ہار دیتے ہیں وہ کبھی بھی محبت نہیں کر سکتے...... وہ اپنی قسمتوں پر صرف آنسو بہاتے ہیں اور اپنی کم ہمتی پر پچھتاتے رہتے ہیں...... باسط علی...... مجھے مایوس مت کرو...... میرے لئے ساری زندگی یہ اذیت بہت تکلیف دہ ہو گی کہ میں نے ایک کم ہمت انسان سے محبت کی...... محبت...... بہادروں کا کام ہے...... اور میں اپنی محبت پر فخر کرنا چاہتی ہوں۔'' نازی نے جذباتی انداز میں کہا تو اس کے الفاظ باسط علی کے دل میں ایک خنجر کی طرح پیوست ہو گئے۔ وہ سب کچھ بھولنے لگا۔ اس کی عزت نفس اور انا آڑے آنے لگی۔

''نازی کو اس کی محبت پر فخر کرنا چاہئے...... نہ کہ شرمندہ ہونا چاہئے۔'' اس کے جذبات مشتعل ہونے لگے۔

''ہماری زندگی کا مقصد ایک دوسرے کی محبت کو پانا ہے...... ہر حال میں...... ہر صورت میں۔'' نازی نے مصمم ارادے سے کہا

''ٹھیک ہے...... میں تمہاری اور اپنی محبت کی خاطر سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔'' باسط علی نے کہا تو وہ مسکرا دی اور محبت پاش نظروں سے

اس کی جانب دیکھتے ہوئے اس کے سینے سے لگ گئی۔

"میں اپنی اور تمہاری محبت کی کامیابی کے لئے ہر روز درگاہوں پر جاؤں گی۔ رات بھر دعائیں کروں گی...... خدا سے گڑگڑا کر تمہیں طلب کروں گی...... میں تمہیں...... اس سے اتنی شدت کے ساتھ طلب کروں گی کہ وہ مجھے تمہاری محبت سے ضرور نوازدے گا......" اس نے پریقین لہجے میں کہا۔

"کیا...... وہ...... ہمارے جذبات کی شدت دیکھ کر ہمیں...... ہماری محبت عطا کر دے گا؟" باسط علی نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں...... میرا یقین کامل...... مجھے ضرور کامیاب کرے گا۔" نازی نے کہا۔

"اگر تم...... مجھے...... اس قدر شدت سے طلب کرو گی...... تو میں اس سے کئی گنا چاہت اور محبت کی شدت سے تمہیں طلب کروں گا۔ یہ ہماری محبت...... ہمارے یقین اور ہمارے جذبات کی شدت کا امتحان ہوگا۔" باسط علی نے کہا۔

"اور...... ہم ضرور کامیاب ہوں گے۔" وہ پرذوق لہجے میں بولی اور باسط علی نے فرط جذبات سے لبریز ہو کر اسے اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔

☆

شام ہو رہی تھی۔ ماسٹر باسط علی کا دل بوجھل ہونے لگا وہ صبح سے ہی اپنی کٹیا میں بند اپنے ماضی کے دھندلکوں میں کھویا تھا اور اس کا ماضی اس کے لئے اتنا تکلیف دہ تھا کہ وہ اندر ہی اندر بے حد مضطرب اور پریشان ہو گیا وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا اور اونچے نیچے راستوں پر چلنے لگا۔ اچانک ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگی تھیں اور موسم بھی ابر آلود ہونے لگا تھا۔ صبح سورج اور بادلوں کی آنکھ مچولی میں سورج بازی لے گیا تھا اور بادل اس سے ہار گئے تھے۔ اب سورج کے غائب ہوتے ہی بادل سرد ہواؤں کے سنگ آسمان پر اٹھکیلیاں کرنے لگے، اب ان کے پاس کھلا آسمان تھا اور وہ مختلف ٹکڑیوں کی صورت میں تیرتے پھر رہے تھے۔ اور چاند، ستاروں کو وہ اپنے حصار میں لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ بارش برسنے کو بے تاب ہو رہی تھی۔ اتنی سخت سردی میں ماسٹر باسط علی کے وجود میں اک آگ سی لگی تھی۔ وہ اپنی ہی سوچوں میں مگن جا رہے تھے، جب پھر سائیں مٹھے سے ملاقات ہو گئی۔

سائیں مٹھے نے بغور اس کی جانب دیکھا۔

"تیرا نفس دکھی ہے او دل جل رہا ہے...... کاہے کو مارا مارا پھر رہا ہے...... جا چلا جا...... اس کے پاس...... تجھے سکون وہاں جا کر ہی ملے گا۔" سائیں مٹھے نے کہا۔

"کس کے پاس؟ نادانستہ ماسٹر باسط علی کے منہ سے نکلا۔

"وہی...... جس کا سب کچھ چھین کر تو یہاں آ گیا ہے۔ بڑا ہی خسارہ تو نے کمایا ہے...... تو نہیں جانتا وہ کون ہے؟ سائیں مٹھے نے کہا تو ماسٹر باسط علی کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ سائیں مٹھا چھن چھن کرتا اور کلام پڑھتا ہوا آگے نکل گیا۔

عاشق عشق ماہی دے کولوں بت پھرن ہمیشہ کھیوے ہو
جنہاں جیندیاں جان ماہی نوں دتی اوہ دوہیں جہانیں جیوے ہو
شمع چراغ جنہاں دل روشن اوہ کیوں بالن دیوے ہو

باسط علی حیرت سے اسے دیکھتا رہ گیا:

کیسے اس کا سامنا کر پاؤں گا.......؟ اس کے اندر شدید تاسف کے جذبات پیدا ہونے لگے...... دکھ اور ملال کے تاثرات اس کے چہرے پر نمایاں ہونے لگے۔

☆

نازی اور باسط علی نے قسمیں کھا رکھیں تھیں کہ وہ جب تک ایک دوسرے سے نہیں ملیں گے جب تک خدا ان کے حق میں فیصلہ نہ لکھ دے۔ باسط علی نجانے کن کن پیروں، فقیروں کے پاس جاتا۔ ان کے بتائے ہوئے وظائف پڑھتا رہتا، کبھی کوئی تعویز درخت کے ساتھ لٹکاتا، کبھی حشمت خان کے ڈیرے پر زمین میں دبا دیتا۔ رات رات بھر کھلے آسمان تلے بیٹھ کر دعائیں کرتا رہتا۔ اس کے اندر یہ یقین پختہ ہونے لگا تھا کہ خدا ضرور اس کی دعا سنے گا۔ وہ جب بھی نازی کے رشتے کے بارے میں سوچتا تو اس کے دل سے آواز آتی۔

"حشمت خان جو چاہے کر لے ..... نازی اسی کی ہے اور اسے ہی مل کر رہے گی۔" وہ اپنے دل کی آواز پر مطمئن ہو جاتا۔ اس کا یقین..... اس کا ایمان بنتا جا رہا تھا۔ وہ اس قدر مطمئن تھا کہ اب اسے کسی شے کی پرواہ نہیں تھی اور نازی بھی بہت پر اعتماد تھی، وہ بھی ساری ساری رات خدا کے حضور بیٹھ کر دعائیں کرتی نہ تھکتی تھی۔ رات رات بھر جاگنے سے اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نمایاں ہو گئے تھے۔ اس کی سرخ و سفید رنگت پیلی پڑ گئی تھی اور اس کا جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بنتا جا رہا تھا۔ باسط علی کی محبت میں وہ سنیاس لینے کو بھی تیار تھی۔ وہ سب کچھ کر گزرنے پر یقین رکھتی تھی، مگر سب سے زیادہ وہ اس بات پر یقین رکھتی تھی کہ خدا چاہے گا تو سب کچھ آسان ہو جائے گا اور وہ باسط علی کی خاطر...... خدا کو منانے کے چکروں میں تھی۔ ہر وقت اس کے حضور گڑگڑاتی رہتی۔

فصل کی کٹائی کا موسم آ گیا...... اور گزر بھی گیا...... مگر نازی کی شادی کا شوشہ نہ اٹھا۔ قادر علی نے تو بہت پر اعتماد لہجے میں کہا تھا کہ فصل کی کٹائی کے بعد اس کی شادی ہے...... شادی نہیں ہو رہی تو اس کا مطلب ہے...... خدا ان کی دعائیں سن رہا ہے اور ان کے لئے راہیں ہموار کر رہا ہے...... اس بات نے دونوں کو اتنا پر اعتماد بنا دیا تھا اور انہیں اپنی منزل بہت قریب دکھائی دینے لگی تھی۔ بس چند قدم کے فاصلے پر...... دونوں کے رزلٹ آ چکے تھے۔ نازی بری طرح فیل ہوئی تھی جبکہ باسط علی پاس ہو گیا تھا مگر سیکنڈ ڈویژن میں۔ قادر علی، بلقیس اور اس کی بہنیں بہت خوش تھیں...... مگر باسط علی نازی کے فیل ہونے سے بہت دکھی تھا۔ حشمت خان نے نازی کو بہت ڈانٹا تھا اور اب اس کے شہر جانے پر پابندی لگ گئی تھی ورنہ وہ بی اے کے بعد ایم اے میں داخلہ لینے کا سوچ رہی تھی۔ انہی دنوں افشین کی شادی کا شوشا اٹھا اور حشمت خان کو جلدی جلدی اس کی شادی کرنا پڑی کیونکہ افشین کے شوہر کو بیرون ملک اچھی نوکری مل گئی تھی۔

باسط علی کو شہر میں نوکری مل گئی تھی، اس لئے وہ شادی میں شرکت نہ کر سکا۔ نازی...... افشین کی شادی میں بہت خوش بھی تھی اور افسردہ بھی...... افشین کی رخصتی کے بعد بھی مہمان حویلی میں ہی تھے اور واپس اپنے گھروں کو جانے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ نازنین...... اٹھتی، بیٹھتی، بڑبڑاتی رہتی۔

چار روز بعد حشمت خان نے نازی کو اپنے کمرے میں بلایا وہ حیران تھی کہ باپ نے اسے اچانک کیوں بلایا ہے۔

''بیٹھو.....'' حشمت خان نے نازی کو اپنے بہت بڑے کھدائی والے پلنگ کے پاس کھڑے دیکھ کر کہا تو وہ خاموشی سے بیٹھ گئی.....

حشمت خان بغور اسے دیکھتا رہا''ابھی تمہاری بارات آرہی ہے.....تیار ہو جاؤ۔'' حشمت خان نے کہا۔

''کیا.....؟نازی گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور جیسے ہی کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا۔

''آواز مت نکالنا.....ورنہ ابھی زمین میں گاڑ دوں گا۔'' حشمت خان نے اپنی پستول کا رخ اس کی جانب کرتے ہوئے کہا۔

''ایسا کر دیں تو یہ میرے لئے زیادہ بہتر ہوگا۔اس کی نسبت.....جو کچھ آپ میرے ساتھ کرنے جا رہے ہیں۔''

نازی غصے سے بولی اور سسکنے لگی۔

''یہ بھی کر گزروں گا.....اگر تم نہ مانی.....تو.....؟'' حشمت خان نے پر مطمئن لہجے میں جواب دیا۔

''انتظار کس بات کا ہے.....چلائیں گولی.....'' نازی نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔

''حشمت خان.....اتنا بے وقوف نہیں.....جتنا تم سمجھ رہی ہو.....تمہیں اس وقت تک قتل نہیں کروں گا، جب تک تمہاری نظروں کے سامنے اس کو نہ قتل کر دوں، جس نے تجھے بہکایا ہے۔'' حشمت خان نے جواب دیا۔

''ک.....کس.....کو.....؟نازی نے گھبرا کر پوچھا۔

''باسط.....علی.....کو.....'' حشمت خان نے غصے سے کہا۔

نازی کا دل ڈرنے لگا اور وہ بلند آواز سے رونے لگی۔

''خدا کے لئے.....بابا.....اسے.....کچھ مت کہنا ہے.....آپ مجھے کہہ لیں۔'' نازی نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔

''حشمت خان.....معاف کرنے والوں میں سے نہیں.....میں صرف تمہیں اور باسط علی کو ہی نہیں.....اس کے سارے گھر والوں کو بھی نہیں چھوڑوں گا۔'' حشمت خان دانت کچکچا کر بولا۔

''خدا کے لئے.....ایسا مت کریں.....ان کا کیا قصور ہے؟ نازی باپ کے قدموں میں گڑ گڑا کر بولی۔

''میرا کیا قصور ہے.....کہ میری اولاد مجھے سر عام رسوا کرنے پر تلی ہے.....کیا تم مجھے اس بات کی سزا دے رہی ہو کہ میں نے تمہیں سب سے زیادہ پیار کیا.....تم نے جو خواہش بھی کی.....وہ سب سے پہلے پوری کی.....تم نے شہر پڑھنا چاہا.....میں نے تمہیں شہر بھیجا.....تم مجھے کس بات کی سزا دے رہی ہو.....بتاؤ.....کس بات کی.....میری محبت کی.....یا تم پر اعتماد کی۔'' حشمت خان رنجیدگی سے بولا تو نازی نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔اس کی آنکھوں سے آنسو شدت سے رواں ہو گئے۔

''بابا.....میں نے کبھی نہیں چاہا کہ آپ کو بے عزت کروں مگر.....'' وہ سسکیاں بھرنے لگی۔

''خاموشی سے چلی جاؤ.....شاہ زیب بہت اچھا انسان ہے.....تم نے اولاد ہو کر اپنا فرض بھلا دیا.....مگر میں باپ ہو کر اپنا فرض نہیں بھلا

پاپا...... میں نے ایک بہت اچھے انسان کو تمہارے لئے منتخب کیا ہے...... وہ تمہیں بہت خوش رکھے گا۔ جاؤ...... تیاری کرو...... بارات آنے والی ہے۔'' حشمت خان نے حکمانہ لہجے میں کہا اور وہ روتی ہوئی باہر نکل گئی۔

☆

ماسٹر باسط علی کھلے میدان میں، چمکیلی، خوشگوار دھوپ میں بچوں کو پڑھا رہے تھے۔ وہ بلیک بورڈ پر لکھنے لگے۔

''اللہ کی عبادت کرو...... ماں باپ سے پیار کرو۔''

''ماسٹر جی...... کیا اللہ کی صرف عبادت کرتے ہیں۔ اس سے پیار نہیں کرتے۔'' آٹھویں کلاس کے طالب علم نے کھڑے ہو کر سوال کیا۔

''ماسٹر باسط علی نے چونک کر اسے دیکھا۔

''ہم اللہ سے سب سے زیادہ پیار کرتے ہیں۔'' ماسٹر باسط علی نے جواب دیا۔

مگر...... اللہ تو نظر نہیں آتا اس سے کیسے پیار کر سکتے ہیں؟ لڑکے نے پھر پوچھا۔

''اللہ سے پیار اس طرح نہیں کرتے۔ جس طرح ہم چھوٹے بچوں سے کرتے ہیں، بلکہ اس طرح کرتے ہیں کہ جب ہم ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں اور پھر ایک دوسرے کی مدد کر کے ہمیں خوشی ہوتی ہے تو وہ خوشی ہمیں بتاتی ہے کہ اللہ ہم سے پیار کرتا ہے، ہم خوش ہو کر اور اچھے کام کرتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ اللہ کو ہمارے کام اچھے لگتے ہیں۔ ان باتوں سے اللہ سے پیار بڑھنے لگتا ہے''۔ ماسٹر باسط علی نے سب بچوں کو سمجھایا۔

''ماسٹر جی...... اگر کوئی کسی کی چیز چھیننے کی کوشش کرے...... اور پھر اسے چھین بھی لے تو...... کیا اللہ اس سے ناراض ہو جاتا ہے......''

ایک اور بچے نے پوچھا تو ماسٹر باسط علی کا دل زور سے کانپا اور وہ بری طرح گھبرا گئے، ان کے چہرے پر پسینہ آنے لگا ان کی طبیعت اچانک خراب ہونے لگی۔ وہ مضطرب ہو کر کرسی پر بیٹھ گئے۔ پیریڈ ختم ہو گیا اور بیل بجنے لگی۔

''تم لوگ جاؤ......'' ماسٹر باسط نے قدرے بے بسی سے کہا اور سب بچے اپنے بیگ اٹھا کر وہاں سے چلے گئے، مگر باسط علی وہیں بے دم بیٹھے رہے۔

''ماسٹر جی...... سارا سکول خالی ہو گیا ہے، کب تک یہاں بیٹھے رہیں گے......؟ گھر نہیں جانا...... کیا؟ ایک اور استاد نے ان سے آ کر پوچھا تو ماسٹر باسط علی ہڑبڑا گئے اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے سکول سے باہر آ گئے۔ ان کا دل گھر جانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ جب بھی گھبراتے اور پریشان ہوتے تو سکول کے پاس ایک سرسبز و شاداب میدان میں ایک پہاڑی کے اوپر جا بیٹھتے، جہاں سے بستی کے کچے پکے مکان اور ان کے آس پاس چلتے پھرتے لوگ دکھائی دیتے۔ اوپر دیکھتے تو نیلگوں آسمان پر اڑتے پھرتے پرندے نظر آتے۔ اس پہاڑی پر بیٹھ کر انہیں ایک عجیب سی خوشی اور سرشاری اپنے اندر سرایت کرتی ہوئی محسوس ہوتی۔ وہ پہاڑی پر بیٹھنے لگے تو سائیں مٹھا پہلے ہی وہاں بیٹھا دھوپ سینک رہا تھا۔ اس نے اپنا کشکول وہاں الٹا کر کے رکھا تھا اور اپنی جیبوں سے مختلف کاغذوں کے رنگ برنگی ٹکڑے، ادھ جلے بیڑی کے ٹوٹے، چند سکے اور مختلف قسم کے رنگ برنگی موتی

اور منکے نکال کر گن رہا تھا۔

ماسٹر باسط علی کو دیکھ کر مسکرانے لگا۔

''تو...... پھر آ گیا...... کاہے کو اپنا دشمن ہو رہا ہے۔ جس کی تجھے تلاش ہے نا...... وہ تجھے یہاں نہیں ملے گا، اپنا وقت ضائع نہ کر...... جا...... چلا جا......'' اس کے پاس سائیں نے غصے سے کہا تو ماسٹر باسط علی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا وہاں سے مڑ گئے اور سائیں بلند آواز میں پھر کلام پڑھنے لگا۔

ایمان سلامت ہر کوئی منگے، عشق سلامت کوئی ہو

منگن ایمان، شرماون عشقوں دل نوں غیرت ہوئی ہو

جس منزل نوں عشق پہنچاوے، ایمان نوں خبر نہ ہوئی ہو

میرا عشق سلامت رکھیں باہو، ایمان نوں دیاں دھروئی ہو

سائیں بلند آواز میں کلام پڑھتا رہا اور اس کی آواز سے پورے ماحول پر اک سحر سے طاری ہونے لگا۔ سائیں کی آواز کی بازگشت باسط علی کے کانوں میں نشتر چبھونے لگی۔

☆

شاہ زیب دولہا بنا کمرے میں داخل ہوا تو نازی نے نفرت سے منہ پھیر دیا وہ انتہائی خوبصورت، دراز قد اور پرکشش شخصیت کا مالک تھا اور وہ آج پہلے سے بھی کہیں زیادہ خوبصورت لگ رہا تھا۔ وہ نازی کے چہرے پر پھیلے تاثرات دیکھ کر حیران رہ گیا۔

''میری طبیعت ٹھیک نہیں۔'' شاہ زیب جیسے ہی نازی کے پاس بیٹھا تو وہ کراہت سے بولی۔

''طبیعت...... واقعی ٹھیک نہیں...... یا مجھے دیکھ کر خراب ہوئی ہے۔'' شاہ زیب نے معنی خیز انداز میں پوچھا، تو نازی نے چونک کر اس کی جانب پہلی بار دیکھا اور دیکھتی ہی رہ گئی۔ وہ بے حد خوبصورت لگ رہا تھا۔

''کیا میں اس بےزاری کی وجہ جان سکتا ہوں؟'' شاہ زیب نے پوچھا۔

''آپ مجھ پر زبردستی مسلط کیے گئے ہیں...... میں...... میں آپ سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔'' نازی نے قدرے نخوت سے کہا۔

''کیا آپ کسی اور سے شادی کرنا چاہتی ہیں؟ شاہ زیب نے اس کی جانب بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں......'' اس نے قطعیت سے جواب دیا۔

''کس سے...... ؟ شاہ زیب نے بمشکل تھوک نگلتے ہوئے پوچھا۔

''جس سے میں محبت کرتی ہوں۔'' وہ گہری سانس لے کر بولی۔

''کون ہے...... وہ......؟

''میری محبت...... میری چاہت اور میرا سب کچھ۔'' نازی نے کہا تو شاہ زیب نے اس کی جانب بغور دیکھا اور خاموش ہو کر اس کے بیڈ سے اٹھ کھڑا ہوا...... اور بیڈ روم سے ملحقہ کمرے میں چلا گیا۔

نازی فاتحانہ انداز میں مسکرائی۔ اس نے اپنی محبت کو کسی دوسرے کی محبت سے آلودہ ہونے سے بچالیا تھا۔

اس نے اپنی ہوشیاری اور دلیری سے باسط علی اور اس کے گھر والوں کو بھی بچالیا تھا اور اپنی محبت کو بھی۔ شاہ زیب کس اذیت میں سے گزر رہا تھا۔ اسے قطعی اس کی پروا نہیں تھی۔ اس کے لئے صرف اپنی محبت اور اپنی خوشیاں اہم تھیں۔۔۔۔۔ وہ باسط علی کو بتائے گی تو وہ کس قدر خوش ہوگا۔۔۔۔۔ وہ باسط علی کو جلد اپنے پاس بلالے گی۔

شاہ زیب بہت نیک دل انسان تھا۔ وہ ماں باپ کا بہت فرمانبردار تھا اور اپنے اردگرد کے لوگوں کی ضروریات اور حقوق کا بہت خیال رکھتا تھا۔ اس کے مزارعے اس کی بہت عزت کرتے تھے۔ اپنے علاقے میں اس کی بہت عزت وقدر تھی وہ جدھر جاتا لوگ اس کے لئے بہت دعائیں کرتے۔ وہ بہت کم غصے میں آتا تھا۔ مگر نازی کی باتیں سن کر اس کا دل بہت کٹا تھا۔ اس کی عزت نفس اور انا کو شدید دھچکا لگا تھا۔ وہ کتنا دکھی ہوا تھا، کسی کو خبر نہ ہوئی تھی۔ وہ قدرت کی اس آزمائش پر بہت زیادہ رنجیدہ ہوا تھا۔۔۔۔۔ وہ اس بات کا کسی سے ذکر کر کے نازی کی عزت اور اپنے مرتبے کو کم بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس کی حویلی کی ہی نہیں۔۔۔۔۔ پورے علاقے کی مالکن تھی۔ شاہ زیب کا ذرا سا تلخ رویہ اس کو اس کے مرتبے سے گرا سکتا تھا۔

نازی کے الفاظ بار بار اس کے ذہن میں گونجتے اور اس کے دل کو چوکے لگاتے۔

اس بات کے بعد شاہ زیب نازی کا سامنا کرنے سے کتراتا وہ جیسے ہی نظر آتی تو وہ راستہ بدل دیتا۔ اس کی ماں نازی کی بلائیں لیتے نہ تھکتی تھی۔ وہ اس کے ناز نخرے اٹھانے میں مصروف رہتی اور نازی دل ہی دل میں خوش ہوتی۔ اس نے باسط علی کو اپنے گاؤں میں آنے کا پیغام بھیج دیا تھا۔ وہ ہر وقت اس کی آمد کی منتظر رہتی۔ اس نے اسے سارا منصوبہ لکھ بھیجا تھا کہ وہ کس طرح وہاں آ کر رہے گا۔ نازی کا ایک ایک لمحہ انتظار میں گزرتا۔۔۔۔۔ اور اس کے لئے انتظار کرنا قدرے مشکل ہو رہا تھا۔

"بیٹی۔۔۔۔۔ کیا تیرا شاہ زیب سے کوئی جھگڑا ہوا ہے؟" اس کی ساس زیتون بانو نے شاہ زیب کی جانب اس کا سرد رویہ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔۔۔" اس نے بوکھلا کر جواب دیا۔

"پھر کیا بات ہے۔۔۔۔۔؟ نہ تو تم لوگ آپس میں ایک دوسرے سے کوئی بات کرتے ہو۔۔۔۔۔ نہ کھانا اکٹھے کھاتے ہو۔۔۔۔۔ نہ ہنستے بولتے ہو۔۔۔۔۔ لگتا ہی نہیں کہ تم لوگوں کی شادی ہوئی ہے؟" زیتون بانو نے پریشانی سے پوچھا۔

"اماں۔۔۔۔۔ جی۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔" اس کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اسے کیا جواب دے۔ اس کے چہرے پر پسینہ آنے لگا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ اگر ایسی کوئی بات ہو گئی ہے۔۔۔۔۔ جو تم مجھے نہیں بتانا چاہتی تو ایسی بات کو مٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ آج شاہ زیب آتا ہے تو میں تم دونوں سے بات کروں گی۔ تمہارے بابا بھی۔۔۔۔۔ تم لوگوں کی وجہ سے بہت پریشان ہو رہے ہیں۔" زیتون بانو نے فکرمندی سے کہا۔

"نہیں۔۔۔۔۔ اماں جان۔۔۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔۔۔ آپ۔۔۔۔۔ آپ شاہ زیب سے کوئی بات نہ کریں۔۔۔۔۔ میں خود ان سے صلح کر لوں گی۔" نازی نے گھبرا کر جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ خود ہی صلح کر لو۔۔۔۔۔ تو۔۔۔۔۔ بہتر ہے۔ ورنہ مجھے اور تمہارے بابا جان کو کچھ کرنا پڑے گا۔" زیتون بانو نے کہا۔

"نہیں۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ میں سب کچھ ٹھیک کر لوں گی۔" نازی نے جواب دیا۔

شام کو شاہ زیب گھر آیا تو نازی اس کے آگے پیچھے پھرنے لگی وہ اس کے بدلے ہوئے رویے پر حیران ہونے لگا۔ کبھی اس کے لئے کھانا لانے کو کہتی، کبھی چائے اور کبھی پھل...... اور وہ حیرت سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

رات کو وہ اس کے کمرے میں آیا تو نازی کا رویہ پھر بدل چکا تھا۔ وہ پہلے کی طرح تلخ ہو گئی تھی۔

''وہ...... سب کیا تھا......؟ شاہ زیب نے حیرت سے پوچھا۔

''اماں...... اور بابا کے سامنے کھیل کھیلنا پڑے گا۔ وہ لوگ ہماری وجہ سے بہت پریشان ہو رہے تھے اور میں انہیں اس پریشانی سے بچانے کے لئے وہ سب کر رہی تھی۔'' نازی نے سرد لہجے میں بتایا تو شاہ زیب کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔

''تم...... مجھے کس بات کی سزا دے رہی ہو...... میں نے تو تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی۔'' شاہ زیب نے بے بسی سے پوچھا۔

''اگر...... آپ کی جگہ...... کوئی اور بھی ہوتا...... تو میرا رویہ یہی ہوتا...... کیونکہ میں اس کے ساتھ بے ایمانی نہیں کر سکتی۔ میں نے اسے قول دیا ہے کہ میرا جسم اور میری روح صرف اس کی امانت ہے...... اور میں اس میں کسی قسم کی بددیانتی نہیں کروں گی...... آپ ہی بتائیے...... مجھے کیا کرنا چاہئے؟ نازی نے جان بوجھ کر آنسو بہانا شروع کر دیئے اور شاہ زیب کا دل نرم ہونے لگا۔

''تم بھی ٹھیک کہتی ہو......'' وہ آہ بھر کر بولا اور خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ نازی دل ہی دل میں مسکرانے لگی۔ ''تم...... مجھ تک کبھی نہیں پہنچ پاؤ گے......'' نازی نے مکارانہ انداز میں سوچا۔

شاہ زیب صاف گو اور صاف دل انسان تھا۔ لوگوں کے قول و قرار پر یقین کر لیتا...... مگر ان کے دلوں کے اندر چھپی بے ایمانی اور بدنیتی تک کبھی نہ پہنچ پاتا...... وہ اپنی سادہ لوحی میں نازی کے جذبات کی قدر کرنے لگا اور نازی اس کی نرمی اور سادہ لوحی کو اس کی کمزوری سمجھ کر اس کے جذبات کے ساتھ کھیلنے لگی۔ وہ چند روز میں بہت شاطر ہو گئی تھی۔

ایک شام شاہ زیب گھر آیا تو باسط علی اس کے ساتھ تھا۔ اسے دیکھ کر نازی پاگل ہی ہو گئی۔ خوشی سے پاگل وہ یوں چلنے لگی جیسے ہوا میں اچھل رہی ہو۔ اس کے انگ انگ سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔

''اماں جی...... یہ بابو شہر سے آیا ہے۔ بہت پڑھا لکھا ہے اور روزگار کی تلاش میں تھا۔ میں نے اسے زمینوں اور فصل کے حساب کتاب کے لئے منشی رکھ لیا ہے۔ شکل سے بہت شریف اور اچھا معلوم ہو رہا ہے۔'' شاہ زیب نے باسط کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

''کیوں...... پہلا منشی کہاں چلا گیا ہے؟'' اس کے باپ نے حیرت سے پوچھا۔

''ابا جی...... فضل بابا سے اب حساب کتاب ٹھیک نہیں ہوتا...... ان کی نظر بھی بہت کمزور ہو گئی ہے، اس لئے میں نے اس بابو کو رکھ لیا ہے۔'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

''مگر بیٹا وہ ہمارا پرانا خدمتگار تھا، کیا اسے فارغ کر دیا۔'' اس کے باپ نے پوچھا۔

''نہیں ابا جی...... میں نے کسی کو فارغ نہیں کیا...... یہ بابو...... ان کے ساتھ کام کرے گا۔'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

''پھر...... ٹھیک ہے...... یہ بابو اس حویلی میں ہی رہے گا...... کیونکہ ڈیرہ اس کے رہنے کے قابل نہیں...... یہ پڑھا لکھا انسان ہے......

اس کو..... اس کے مطابق ماحول ملنا چاہئے..... اس کے لئے اچھا سا کمرہ ٹھیک کرا دیں۔'' شاہ زیب نے مسکرا کر کہا۔

''نازی بیٹا..... کہاں ہو؟'' زیتون بانو نے آواز دی۔

''جی..... اماں جی'' نازی جلدی سے آئی۔ اس نے خوبصورت، کامدار، چمکیلا سوٹ اور ڈھیروں گہنے پہن رکھے تھے۔ دونوں کلائیاں سونے کے کنگنوں سے بھری تھیں۔ وہ کسی مہارانی کی طرح لگ رہی تھی۔ باسط علی نے ایک ٹک اس کی جانب دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں، نازی کا چہرہ گلنار ہونے لگا۔

''بیٹا..... یہ ہمارا مہمان ہے اور اس کے لئے دوسری منزل پر جو مہمان خانہ ہے وہ ٹھیک کرا دو۔ دو تین ملازماؤں کو ساتھ لے جاؤ اور صفائی ستھرائی کرا دو۔ اب اس مہمان کی ذمہ داری تم پر ہے۔ اسے ہم سے کوئی شکایت نہیں ہونی چاہئے۔'' زیتون بانو نے کہا تو نازی مسکرا دی۔

''اماں جی..... آپ فکر ہی نہ کریں..... آپ کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔'' نازی نے باسط علی کی جانب معنی خیز انداز میں دیکھتے ہوئے کہا اور اوپر چلی گئی۔

''باسط علی..... شکر ہے، تم آ گئے اور میرے بے قرار دل کو قرار مل گیا ہے..... تمہارے بغیر میں کتنی ادھوری، کتنی اداس اور تنہا تھی تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ یوں لگتا تھا میرا جسم روح کے بغیر حرکت کر رہا ہو۔ تمہارے آنے سے یوں محسوس ہو رہا ہے، جیسے میری روح، میرے جسم میں واپس آ گئی ہو۔'' نازی نے موقع دیکھ کر باسط علی کے قریب آ کر کہا۔

''نازی..... تم نے شادی کیسے کر لی..... تم نے تو قسم کھا رکھی تھی کہ تم میرے علاوہ کسی سے شادی نہیں کرو گی۔'' باسط علی نے حیرت سے پوچھا۔

''اور..... میں..... تمہارے علاوہ کسی سے شادی کروں گی بھی نہیں، وہ ٹھوس لہجے میں مسکرا کر بولی۔

''کیا مطلب.....؟ شاہ زیب سے.....؟'' باسط علی نے حیرت سے پوچھا۔

''صرف دنیا کی نظر میں..... میں اس کی بیوی ہوں۔'' میں نے اسے اپنے قریب نہیں آنے دیا.....'' نازی نے مسکرا کر جواب دیا۔

''کیا..... واقعی..... اور شاہ زیب.....؟

''ہاں..... وہ سیدھا..... اور سادہ طبیعت کا نرم دل انسان ہے۔ وہ میرے آنسوؤں سے اس قدر پریشان ہو جاتا ہے۔ وہ میرے ساتھ کیا زبردستی کرے گا۔'' مسکرا کر نازی نے جواب دیا۔

''پھر..... یہ رشتہ بنانے کی کیا ضرورت تھی؟ اس نے حیرت سے پوچھا۔

''تمہاری زندگی کی خاطر..... اور تمہارے گھر والوں کی خاطر، مجھے یہ سب کرنا پڑا۔ میری محبت، میری وفا، میرا سب کچھ تم ہو.....'' وہ اس کے بہت قریب آ کر بولی۔

''نازی..... اب تمہاری حیثیت پہلے جیسی نہیں رہی..... تم اس گھر کی عزت ہو..... کسی نے دیکھ لیا تو تمہاری بدنامی ہو گی۔'' باسط علی نے اسے پرے دھکیلتے ہوئے کہا۔

''میں صرف تمہارا انتظار کر رہی تھی..... اب میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی..... میرا وجود..... تمہاری محبت کے بغیر ادھورا ہے.....'' نازی

قدرے بے صبری سے بولی۔

''نازی...... ہم ملیں گے...... تو جائز طریقے سے...... خدا کی نظر میں گنہگار بن کر نہیں۔'' وہ دوٹوک لہجے میں بولا۔

''کونسا خدا......؟ کیا وہ ہماری سنے گا...... کبھی نہیں...... کتنا مان تھا مجھے اس پر...... میں نے اور تم نے کس قدر اس کی عبادت کی۔ ساری ساری رات میں اس کے سامنے گڑگڑا کر دعائیں مانگتی رہی۔ تمہیں طلب کرتی رہی، مگر اس نے ہماری ایک نہ سنی، وہی کیا، جو وہ چاہتا تھا۔ مجھے اب اس پر بالکل بھی اعتبار نہیں رہا...... میں نے اس کا ذکر کرنا چھوڑ دیا ہے۔ مجھے اپنی خوشیاں خود تلاش کرنی ہیں، جو مجھے اچھا لگے گا اور جو شے مجھے خوش کرے گی، میں وہی کروں گی۔'' وہ قطعیت سے بولی۔

''نازی...... یہ تم کیا کہہ رہی ہو...... تمہاری سوچ اس قدر بدل گئی ہے، مجھے یقین نہیں آ رہا۔'' باسط علی نے حیرت سے پوچھا۔

''تم ہی بتاؤ...... کیا ہم نے دعائیں مانگنے میں کوئی کسر چھوڑ رکھی تھی۔ اکیس دن میں دونوں درگاہوں پر ننگے پاؤں جا کر دعائیں مانگتی رہی، ہر روز کوئی نہ کوئی منت پوری کرتی، نیازیں دیتی، عبادت کرتی، کیا ہوا......؟ تم مجھ سے چھن گئے اور نجانے شاہ زیب کہاں سے آ گیا...... خدا نے مجھے بند گلی میں کھڑا کر دیا۔ بارات آنے سے چند گھنٹے پہلے ابانے مجھے، میری شادی کے بارے میں بتایا۔ اتنی دعاؤں کا ثمر یوں ملتا ہے...... مجھے تو افسوس ہوتا ہے...... میں نے اتنی دعائیں کیوں کیں، اگر میں نے اتنی دعائیں نہ کی ہوتیں اور میرے ساتھ یہ سب کچھ ہوتا تو شاید میں اتنی مایوس اور بددل نہ ہوتی۔ باسط علی...... میرے اندر...... میرا ایمان بکھر گیا ہے...... میرے دل میں خدا کے بارے میں جو بھی امید اور یقین تھا وہ سب ختم ہو گیا ہے۔ اب مجھے اس سے کچھ نہیں چاہئے اور نہ ہی میں اس سے کچھ طلب کروں گی۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولی تو باسط علی حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

''میری...... محبت / میری چاہت...... میرا عشق صرف اور صرف تم ہو......'' نازی نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

''عشق......؟'' باسط علی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں...... تمہارے سوا کچھ اور نظر ہی نہیں آتا...... تم دکھائی نہیں دیتے تو سب کچھ پھیکا۔ بے رنگ اور ادھورا لگتا ہے...... عشق اسی کو تو کہتے ہیں...... کیا تمہیں ویسا محسوس نہیں ہوتا...... جیسا مجھے ہوتا ہے۔'' نازی نے تجسس انداز میں پوچھا۔

''پہلے ہوتا تھا...... اور...... اب'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور اب کیا......؟'' نازی نے حیرت سے پوچھا۔

''اب میری سوچیں گڈمڈ ہو گئی ہیں۔ میرے دل میں اک انجانا سا خوف اور بوجھ پیدا ہونے لگا ہے۔ مجھے تمہاری باتوں سے ڈر لگنے لگا ہے۔ پتہ نہیں مجھے کیا ہو رہا ہے۔'' وہ انتہائی مضطرب ہو کر بولا۔

''کیا ہونے لگا ہے؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔ میں تمہارے لئے گرم دودھ لاتی ہوں۔'' نازی کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئی اور باسط علی بلند آواز میں رونے لگا۔

......❁......

# (۵)

شہیر کی برتھ ڈے تھی۔

اور روشنی نے اس کو مختلف انداز میں منانے کا آئیڈیا دیا تھا۔ فائیو سٹار ہوٹل میں لنچ کرنے کے بعد سب لوگ کیک کاٹنے دریا پر جا رہے تھے۔ چاکلیٹ، بلیک فارسٹ، ونیلا اور کافی کریم کیک کے علاوہ مختلف اقسام کی بیکری، کولڈ ڈرنکس اور بوتلے خریدے گئے۔ دریا کے کنارے شام کا منظر انتہائی خوبصورت لگ رہا تھا۔ ڈوبتے سورج کی نارنجی شعاعوں نے آسمان کی رنگت کو بھی قدرے سرخی مائل بنا دیا تھا اور اس نارنجی سورج کا عکس پانی کی لہروں کے ساتھ ہچکولے کھاتا انتہائی دلفریب لگ رہا تھا۔ سب لوگ کافی دیر ادھر ادھر ٹہلتے اور انجوائے کرتے رہے۔ اسامہ کی آواز بہت خوبصورت تھی۔ اس نے دو تین رومانٹک گانے سنائے...... ارسلان کے چٹکلے اور باتوں کی پھلجھڑیاں فضا میں ان کے گونجدار قہقہے سارا ماحول ہی انتہائی خوشگوار اور مسحور کن لگ رہا تھا...... شہیر گاہے بگاہے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے ژالے کی طرف محبت پاش نظروں سے اپنے دل کا پیغام پہنچانے کی کوشش کرتا...... اور وہ ان نظروں کا مطلب سمجھتے ہوئے چہرہ دوسری جانب پھیر دیتی...... روشنی کی شاعرانہ گفتگو اور بات بے بات شعر سنانے کی عادت غالباً آج زور پکڑ رہی تھی۔ وہ ان سب سے زیادہ ایکسائٹڈ دکھائی دے رہی تھی۔

شام کے ملگجے سائے ہر طرف پھیلنے لگے اور ماحول کو اپنے وجود میں سمیٹنے لگے...... اس سرمئی شام سے لطف اندوز ہونے کے لئے تو روشنی نے یہ سارا پروگرام بنایا تھا۔ دریا کے اطراف میں برقی قمقموں کی روشنیوں کا عکس دریا کے پانی میں نمایاں دکھائی دینے لگا...... سب ایک بڑی کشتی میں سوار ہو گئے...... درمیان میں چاروں کیک ایک قطار میں ایک ساتھ رکھے گئے اور ان کے اردگرد رنگ برنگی کینڈلز رکھی گئیں۔ عین دریا کے وسط میں جا کر کینڈلز کو روشن کر کے کیک کاٹا گیا۔ سارا منظر اس قدر دلفریب اور خوبصورت لگ رہا تھا کہ اردگرد گھومتے لوگ بھی رک کر انہیں دیکھنے لگے...... اور مسکرانے لگے۔

سب نے تالیوں کی گونج کے ساتھ "ہیپی برتھ ڈے...... ٹو...... یو...... ڈیئر شہیر" کورس کی صورت میں گا کر اسے وش کیا...... دریا کے کنارے پر موجود لوگ بھی ان کے سنگ تالیاں بجا رہے تھے اور دور کھڑے ہو کر وش کر رہے تھے...... سب لوگ بہت خوش ہو رہے تھے اور ان کے ساتھ بھرپور انجوائے کر رہے تھے...... شہیر کی خوشی دیدنی تھی...... اس کی آنکھوں سے اس کے اندر کی خوشی کا بھرپور اظہار ہو رہا تھا...... اسے قطعی معلوم نہ تھا کہ اس کے دوست اس کے لئے اتنے خوبصورت اور خوشی بھرے جذبات رکھتے ہیں...... یہ اس کی یادگار برتھ ڈے تھی...... اس نے ساری زندگی گھر میں اپنی فیملی کے علاوہ کبھی کسی اور کے ساتھ برتھ ڈے نہیں منائی تھی۔

کالج جاتے ہی اسے سب سے پہلے روشنی نے وش کیا تھا۔ پھر مریم اور اسامہ نے......

''برتھ ڈے پارٹی کہاں دے رہے ہو؟'' روشنی نے وش کرنے کے بعد پہلا سوال کیا۔

''کہیں بھی نہیں......'' شہیر نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

''کیا...... مطلب......؟ کیا تم ہم سے برتھ ڈے وشز مفت میں لے رہے ہو......'' روشنی نے منہ بنا کر کہا۔

''کیا مطلب......؟ تو کیا ان وشز کی حفاظت کروں؟'' شہیر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں...... وہ تو کرنی پڑے گی'' اسامہ نے جلدی سے کہا۔

''لگتا ہے...... تم لوگوں نے کچھ پلان کر رکھا ہے'' شہیر نے دونوں کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... بھئی...... پلاننگ اینڈ مینجمنٹ کا زمانہ ہے...... اس کے بغیر تو کوئی کام نہیں ہو سکتا...... اور ہم نے تمہاری برتھ ڈے منانے کا پلان کر لیا ہے'' روشنی نے مسکراتے ہوئے کہا اور شہیر کو ایک جانب لے جا کر آؤٹنگ کے بارے میں بتایا اور سختی سے منع کیا کہ وہ کسی کو کچھ نہ بتائے کہ وہ سب کہاں جا رہے ہیں۔

لیکن شہیر کو کیک کاٹنے کی اس خوبصورت اور اسپیشل تقریب کا خود بھی علم نہ تھا...... یہ سب روشنی، مریم اور اسامہ کی پلاننگ تھی جو وہ چپکے چپکے کر رہے تھے۔

اور شہیر کو بگ سرپرائز دینا چاہتے تھے۔

یہ بگ سرپرائز سب کو بہت پسند آیا تھا۔ زل اور ارسلان نے بھی خوب انجوائے کیا تھا۔ ان کے دلوں میں جو رنجشیں تھیں وہ سب ختم ہو گئی تھیں۔

کیک کاٹنے اور کھانے کی تقریب کے بعد کشتی نے دریا کے دوسرے کنارے تک ایک چکر لگایا۔ دریا کی لہروں سے اٹھتی نم ہوا نے مارچ کی خوبصورت شام کو مزید خوبصورت بنا دیا تھا۔

''تھینکس روشنی......'' کشتی سے اترتے ہوئے شہیر نے اسے کہا۔

''لیس...... آف کورس...... تمہیں تھینکس بولنا بھی چاہیے...... کیونکہ تم نے ایسا سرپرائز اور ایسی سیلیبریشن کبھی انجوائے نہیں کی ہوگی ہے نا۔'' روشنی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''تھینکس شہیر......'' ارسلان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بھئی...... سب لوگ تھینکس روشنی کو بولیں...... اس پارٹی کا سارا کریڈٹ اسے مریم اور اسامہ کو جاتا ہے'' شہیر نے مسکرا کر کہا تو زل سمیت سب لوگوں نے حیرت سے روشنی کی طرف دیکھا...... جس کی چمکتی آنکھیں خوشی سے مسکرا رہی تھیں۔

''بھئی اب واپسی کا کیا پروگرام ہے......؟ گھر پہنچتے ہوئے کافی ٹائم ہو جائے گا......'' اسامہ نے اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے جن لوگوں کے روٹس (راستے) میچ کر رہے ہیں...... وہ آپس میں پلان کر لیں...... ارسلان کے پاس بائیک ہے...... وہ چلا جائے گا۔ روشنی، فوزیہ، مریم اور نینا کو ڈراپ کر دے گی...... زل کو شہیر...... اور میں اسد کو ڈراپ کر دیتا ہوں......'' اسامہ نے سب کے بارے

میں بتایا۔

"او کے.....اب چلیں" شہیر نے زل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں.....کافی ٹائم ہو رہا ہے.....گھر سے کئی بار فون بھی آ چکا ہے" زل نے قدرے پریشانی سے کہا اور دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ان کے پیچھے روشنی، عمر، ارسلان اور اسامہ کی گاڑیاں تھیں۔

شہیر خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا جبکہ اس کا ذہن مسلسل زل کے بارے میں سوچ رہا تھا اور زل مکمل طور پر خاموش بیٹھی تھی۔ اس کے ذہن میں بہت سی باتیں، الجھنیں اور سوچیں تھیں..... وہ اپنی سوچوں میں اتنی گم تھی کہ اسے کئی بار شہیر کی موجودگی کا احساس ہی نہ رہا۔ جب وہ اچانک بریک لگاتا تو وہ چونک کر اسے دیکھتی۔

زل کے گھر سے چند فرلانگ کا فاصلہ تھا۔ جب شہیر نے معنی خیز نظروں سے زل کی طرف دیکھا۔

"زل....." وہ آہستہ آواز میں بولا۔

زل نے چونک کر شہیر کی طرف دیکھا۔

"زل.....میں بہت دنوں سے آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں مگر....." شہیر نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو زل نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔

"کیا آپ.....آج میری خوشی کے اس موقع پر مجھے ایک اور خوشی دے سکتی ہیں؟" شہیر نے استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔

"کیا مطلب.....؟" زل نے حیرت سے پوچھا۔

"کیا آپ مجھے اپنی محبت کا قیمتی تحفہ دے سکتی ہیں؟" شہیر نے مسکراتے ہوئے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

زل اس کی بات سن کر چونک گئی۔ اس کی آنکھوں اور چہرے پر حیرت کے گہرے آثار نمایاں ہونے لگے.....اس نے گہری سانس لی اور خاموش ہو گئی۔

"آپ خاموش کیوں ہو گئیں.....؟" شہیر نے حیرت سے پوچھا۔

"کیا آپ کو معلوم ہے.....آپ نے مجھ سے کیا ڈیمانڈ کی ہے؟" زل نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

"ہاں.....ایک تحفہ" شہیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تحفے کا کہہ کر آپ نے مجھے اپ سیٹ کر دیا ہے مگر آپ جو ڈیمانڈ کر رہے ہیں.....وہ کوئی معمولی شے نہیں.....وہ میرے لئے میری زندگی اور میری سانسوں سے بھی زیادہ قیمتی ہے.....اسے میں اس قدر آسانی سے تو نہیں دے سکتی....." زل نے انتہائی سنجیدہ لہجے میں جواب دیا تو شہیر حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"میں.....اس وقت کا انتظار کروں گا.....جب آپ یہ قیمتی تحفہ مجھے عنایت کریں گی.....اپنی مرضی سے.....خود فیصلہ کر کے....." شہیر

نے اسے اس کے عالیشان گھر کے سامنے ڈراپ کرتے ہوئے کہا۔

زل نے اس کی جانب دیکھا اور خاموشی سے گھر کے اندر داخل ہو گئی۔

☆

''شہیر.....تم اتنے لیٹ کیوں آئے ہو؟'' مسز تہمینہ فاخر نے شہیر کو دیکھتے ہوئے پوچھا جو ڈائننگ ٹیبل پر فاخر صاحب کے ساتھ بیٹھی کھانا کھا رہی تھیں۔

''دوستوں نے میری برتھ ڈے پارٹی ارینج کی تھی.....ان کے ساتھ بزی تھا'' شہیر نے سرد لہجے میں جواب دیا۔

''اور ہم بھی تمہارا انتظار کر رہے ہیں.....کہ آج کسی ہوٹل میں تمہاری برتھ ڈے سیلیبریٹ کرتے ہیں'' مسز فاخر نے کہا۔

''ممی.....پورے دن میں مجھے وش کرنا تو آپ کو یاد نہیں رہا.....مگر پارٹی کا آپ کو یاد رہ گیا تھا.....؟'' شہیر نے قدرے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''اسی لئے نہیں کیا تھا کہ میں تمہیں سرپرائز دینا چاہتی تھی.....اور میں تمہاری برتھ ڈے کیسے بھول سکتی ہوں۔ تمہارے لئے تو آج میں نے اپنی ایک اہم میٹنگ کینسل کی ہے.....'' مسز فاخر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''سوری.....میں نہیں جا سکتا.....میں بہت تھک گیا ہوں.....آپ لوگ کھانا کھا لیجئے.....'' شہیر نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''شہیر بیٹا.....سنو.....تو'' فاخر حسین نے پیچھے سے آواز دی مگر شہیر سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

''روز بروز اس میں بہت تبدیلیاں آ رہی ہیں.....کیا آپ نے آبزرو کیا ہے؟'' مسز فاخر نے بڑبڑاتے ہوئے شوہر سے کہا۔

''کیسی تبدیلیاں.....؟'' فاخر صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

''کیا آپ کو کچھ محسوس نہیں ہو رہا؟'' مسز فاخر نے حیرت سے اور قدرے طنزیہ لہجے میں فاخر حسین کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں آپ جتنا ذہین نہیں ہوں'' فاخر حسین نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''آپ طنز کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے'' تہمینہ غصے سے بولی۔

''اس میں طنز کی کیا بات ہے.....کیا یہ ضروری ہو چکا ہے کہ آپ ہر بات کا الٹا مطلب ہی لیں'' فاخر صاحب غصے سے وہاں سے اٹھتے ہوئے بولے۔

''ہاں.....کیونکہ میرا دماغ الٹا ہے.....اور.....میں آپ جیسا نہیں سوچ سکتا.....ہر سیدھی بات کا آپ الٹا ہی جواب دیتی ہیں اور پھر مجھ پر طنز کرتی ہیں'' فاخر صاحب غصے سے کہہ کر باہر نکل گئے اور مسز تہمینہ وہیں بیٹھی منہ بسورنے لگیں۔ انہیں شہیر اور فاخر حسین کے رویوں پر غصہ آنے لگا۔ انہوں نے غصے میں ہی سمیر کا نمبر ملایا۔

''ہاں.....بیٹا.....کب آ رہے ہو؟'' مسز فاخر موڈ کو اس قدر خوشگوار بناتے ہوئے بولیں کہ قطعی اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ چند ثانیے پہلے وہ کس قدر غصے میں تھیں۔

"میں شدت سے تمہارے آنے کا انتظار کر رہی ہوں...... تم نہیں جانتے...... میں تمہارے بغیر کس قدر اداس ہوں...... ایک ایک دن انتظار میں کاٹنا مشکل ہو رہا ہے" مسز تہمینہ نے فرط جذبات سے لبریز لہجے میں کہا...... شمیر کسی کام سے سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے آ رہا تھا...... مسز فاخر کی باتیں سن کر وہ وہیں رک کر انہیں دیکھنے لگا۔

"ہاں...... تمہاری کمپنی کی کیا بات ہے؟ میں اتنا کسی کے ساتھ انجوائے نہیں کرتی...... جتنا تمہارے ساتھ کرتی ہوں" مسز فاخر نے ہنستے ہوئے کہا تو شمیر کے چہرے پر مختلف قسم کے تاثرات نمایاں ہونے لگے۔ وہ مسز فاخر کی باتیں سن کر انہی قدموں پر واپس لوٹ گیا۔ اس کے اندر عجیب قسم کے جذبات پیدا ہونے لگے...... پہلی بار اس کے دل کے اندر ایسے احساسات وجذبات پیدا ہو رہے تھے جو اس کی اپنی سمجھ سے بھی باہر تھے ان احساسات وجذبات میں حسد کا پہلو نمایاں تھا...... اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ممی کو برا سمجھے یا سمیر کو...... دونوں کے ساتھ اس کا خونی رشتہ تھا۔ دونوں سے اختلافات رکھتے ہوئے بھی وہ انہیں بہت چاہتا تھا مگر اب اس چاہت میں ناپسندیدگی کا عنصر نمایاں ہو رہا تھا۔ وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں آ گیا۔ اسے اپنے دل میں بوجھ سا محسوس ہونے لگا۔

ممی کی سمیر سے شدید محبت نے اس کے دل کے اندر اضطراب پیدا کرنا شروع کر دیا۔ ایسی بے قراری اور بے چینی اس کے اندر پیدا ہونے لگی کہ اس کو اپنے دل کے اندر اک آگ سی جلتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔

"ممی مجھ سے محبت کرتی ہیں...... مگر اتنی نہیں جتنی سمیر سے...... اور سمیر...... ان کو مجھ سے زیادہ اچھا لگتا ہے کیوں......؟"

یہ کیسی باتیں ہیں......؟ یہ کیسے احساسات ہیں...... اور یہ سب کچھ کیا ہے...... جو میرے دل کو اتنا مضطرب، اتنا بے چین اور اتنا بے قرار کر رہا ہے......؟" شمیر جذبات سے مغلوب ہو کر نم آنکھوں کے ساتھ اپنے کمرے کی کھڑکیوں کے شیشے میں سے سیاہ آسمان کو دیکھنے لگا...... جہاں ستارے پوری آب وتاب سے چمک رہے تھے مگر ان جھلملاتے ستاروں میں کہیں کہیں ایسے ستارے بھی موجود تھے جن کی روشنی بہت کم تھی اور بہت مدہم لگ رہے تھے...... یوں جیسے بے دلی سے سب ستاروں کا ساتھ دینے پر مجبور ہوں...... جیسے ان کے دل بھی بے تاب ہوں جس طرح شمیر کا دل بھی بے تاب ہو رہا تھا......

☆

روشنی کی آنکھوں میں کل کی خوبصورت یادوں اور شمیر کے خراج تحسین سے پیدا ہونے والے خوبصورت نرم ولطیف احساسات اور ٹھنڈے جذبات سے پیدا ہونے والی سوچوں اور ان سے جنم لینے والے رنگوں کا عکس اس کی خوبصورت، جھلملاتی آنکھوں میں نمایاں تھا نجانے کیا ہوا تھا...... کہ...... بہت دنوں سے پیدا ہونے والے حسین خیالات کو شمیر کی باتوں سے ایسی لو ملی تھی کہ پارٹی سے واپس آنے کے بعد اس کے دل کی دنیا بدل چکی تھی...... شمیر جو پہلے بہت دور کھڑا دکھائی دیتا تھا...... اب اس کے بالکل قریب آ گیا تھا...... اور اس نے اپنے دل کے سارے دروازے اس کے لیے کھول دیئے تھے...... جن میں سے شمیر بلا روک ٹوک آ جا رہا تھا...... شمیر کے بارے میں سوچیں لہروں کی مانند ایک دم اس کے دل کا احاطہ کر لیتیں اور اگلے ہی لمحے غائب ہو جاتیں۔ کل سارا دن وہ شمیر کے قریب رہی تھی اور اس کی قربت نے اس کے دل کے اندر جو لطیف

احساسات پیدا کیے تھے......ان کو وہ "محبت" کا نام دے پائی تھی......شاید محبت اسے ہی کہتے ہیں......

ہاں......دل جس کے نام سے دھڑکنے لگے اور جس کو دیکھتے ہی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں......وہ......جو کہیں دور ہو مگر دل کے بہت پاس ہو......اور جس کی سوچ وخیالات سے دل کبھی بھی خالی نہ ہو......کان کچھ اور سنیں......مگر......دل کسی اور کی بات کرے......آنکھیں کسی اور طرف دیکھتی ہوں مگر دل کوئی اور منظر بیان کرے......کسی اور کو دیکھنے کے لئے مضطرب ہو......دماغ بہت سی باتیں سوچے مگر دل صرف ایک کے بارے میں کچھ خاص سوچنا چاہیے......ایسے لطیف احساسات کو 'محبت' ہی کہا جاسکتا ہے اور روشنی کے دل نے اس کو یقین دلا دیا تھا کہ شہیر صرف اور صرف اس سے محبت کرتا ہے......زل کے بارے میں وہ کچھ روز پہلے کنفیوژ ضرور ہوئی تھی مگر شہیر اور زل کو اس نے بارہا ایسی نظر سے دیکھا تھا......اور......اسے کچھ بھی ایسا محسوس نہیں ہوا تھا......اور پھر......اس کے پوچھنے پر زل کا حیرانگی سے چونکنا......زل کی آنکھوں میں شہیر کے لئے لاپرواہی اور شہیر کی آنکھوں میں زل کے لئے گہری خاموشی......روشنی کے دل نے اس کو یقین دلا دیا تھا کہ شہیر صرف اور صرف اس سے محبت کرتا ہے......شہیر کے دل میں صرف روشنی کی وجہ سے ہی 'روشنی' ہے......اور شہیر کی آنکھیں روشنی کی وجہ سے ہی روشن رہتی ہیں......اس کے اندر باہر صرف اور صرف روشنی ہے۔

روشنی ان خوشگوار سوچوں میں گم اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف جا رہی تھی جب اس نے اچانک شہیر کو سامنے آتے ہوئے دیکھا تو اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں......اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا......نجانے یہ کیسا احساس تھا......؟

جو اس کے دل پر حاوی ہو رہا تھا اور اس کا دل بے قابو ہو رہا تھا۔

شہیر نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا......

روشنی کی آنکھیں اسے دیکھ کر چمکنے لگیں......

"ہائے......روشنی......کیسی ہو؟" شہیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"فائن......" روشنی نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔

"میں تمہیں ہی تلاش کر رہا تھا......؟" شہیر نے کہا۔

"کیوں......؟" روشنی نے حیرت سے پوچھا۔

"میں تمہیں کل کی پارٹی کی مووی دکھانا چاہ رہا تھا......بہت مزے کی ہے" شہیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"رئیلی......" روشنی نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں......آؤ کینٹے ٹیریا میں چلتے ہیں" شہیر نے کہا۔

"کیا آج کلاسز نہیں ہو رہیں؟" روشنی نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں......مسز علیہ آج آف ہیں......اس لئے ان کا پیریڈ فری ہے" شہیر نے کہا تو وہ اس کے ساتھ چل پڑی۔

کینٹے ٹیریا میں ایک کارنر ٹیبل پر دونوں بیٹھے شہیر کے موبائل پر مووی دیکھ رہے تھے اور بہت ہنس رہے تھے۔ مووی میں روشنی ہر طرف

نمایاں تھی۔ روشنی کے ہر پوز اور ہر اینگل کو capture کیا گیا تھا۔ دونوں مووی دیکھتے ہوئے باتیں بھی کر رہے تھے اور باتیں کرتے ہوئے بے تحاشا ہنس رہے تھے۔ جب عمر مصطفیٰ، اسامہ، ارسلان اور زل کیفے ٹیریا میں داخل ہوئے۔۔۔۔ زل نے ایک ٹک شہیر کی طرف دیکھا تو شہیر کی نگاہوں نے بے تابی سے اس کی آنکھوں کا طواف کیا۔۔۔۔ اس کا دل اسے دیکھ کر مضطرب ہونے لگا اور دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو کر اس کے سینے کے اندر مچلنے لگیں۔

''زل۔۔۔۔ دیکھو۔۔۔۔ کیسی مزے کی مووی ہے'' روشنی نے کہا۔

''دکھاؤ۔۔۔۔ اور شہیر تم اکیلی کو مووی کیوں دکھا رہا ہے؟'' اسامہ نے مذاقاً شرارت سے کہا تو روشنی نے چونک کر اسے دیکھا۔۔۔۔ جیسے اس کی چوری اچانک پکڑی گئی ہو۔۔۔۔

''ن۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔ ایسی تو بات نہیں۔۔۔۔'' روشنی نے بوکھلاتے ہوئے کہا۔

''تو پھر کیسی بات ہے؟'' عمر نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔

''یار۔۔۔۔ تم لوگوں میں سے کوئی نظر نہیں آیا تو پھر میں نے روشنی کو دکھا دی۔۔۔۔'' شہیر نے کہا۔

''چلو۔۔۔۔ مووی دیکھو'' ارسلان نے کہا۔

اور سب مووی دیکھنے لگے۔۔۔۔ زل خاموش تھی اور کافی بے دلی سے مووی دیکھ رہی تھی۔ سب لوگ مووی دیکھتے ہوئے ان واقعات کو بھی ڈسکس کر رہے تھے جو ان کو کل وہاں پیش آئے تھے۔۔۔۔ شہیر گاہے بگاہے نظریں چرا کر زل کی طرف دیکھتا اور زل جان بوجھ کر اس سے نظریں ملانے سے احتراز کرتی۔

شہیر ہر بات میں روشنی کی تعریفیں کر رہا تھا اور روشنی کے چہرے پر قوس وقزح کے خوبصورت رنگ بکھر رہے تھے اور روشنی کا چہرہ ان رنگ برنگی کرنوں سے جگمگا رہا تھا۔ وہ مسکرا کر شہیر کی جانب دیکھتی اور ہر مسکراہٹ پر اس کا دل باغ باغ ہو جاتا۔

شہیر کی محبت نے اس کے دل کے اندر جو جوت جلائی تھی۔ اس نے روشنی کو ایسا مسرور کر دیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو آسمانوں پر اڑتے ہوئی محسوس کر رہی تھی۔

''کیا واقعی شہیر اس سے محبت کرنے لگا ہے؟'' وہ چونک کر اپنے آپ سے بار بار پوچھتی۔۔۔۔

''ہاں۔۔۔۔'' وہ خود ہی اپنے آپ کو جواب دے کر مسکرانے لگتی۔

''مگر۔۔۔۔ شہیر نے اظہار محبت تو نہیں کیا'' وہ دل میں اچانک اٹھنے والے وسوسے پر چونکی۔

''محبت کا اظہار اشاروں، کنایوں سے شروع ہوتا ہے اور شہیر کی ہر بات میں اس کے لئے واضح اشارہ ہے۔۔۔۔ وہ شاید اسے اس بات کے لئے ذہنی طور پر تیار کر رہا ہے'' وہ خود ہی مسکرا کر توجیہ پیش کرتی۔۔۔۔ اور خود بخود زیر لب مسکرانے لگتی۔۔۔۔ اس کا دل بھی مسکرا کر اس کی تائید کرتا۔

☆

شہیر کے لئے زل کی خاموشی اور نظروں کا چرانا بہت حیران کن تھا......

وہ گھبرا کر بیڈ پر لیٹے ہوئے...... پینٹنگ بناتے ہوئے...... ہر وقت ہر لمحہ صرف اور صرف اس کے بارے میں سوچتا۔ زل کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجتے۔

"تحفے میں جو آپ ڈیمانڈ کر رہے ہیں...... وہ کوئی معمولی شے نہیں...... وہ میرے لئے میری زندگی اور میری سانسوں سے بڑھ کر قیمتی ہے...... اسے میں اس قدر آسانی سے تو نہیں دے سکتی"

"اور میں اس وقت کا انتظار کروں گا...... جب آپ یہ تحفہ مجھے عنایت کریں گی...... اپنی مرضی سے...... خود فیصلہ کر کے" شہیر بار بار اپنے الفاظ یاد کرتا......

اس کے لئے ایک ایک لمحہ اور ایک ایک پل مشکل ہو رہا تھا۔ زندگی میں انتظار کتنا کٹھن ہے...... انسان ایسی رسی کے ساتھ لٹک رہا ہوتا ہے جسے نہ چھوڑ سکتا ہے اور نہ ہی اپنے ساتھ باندھنا چاہتا ہے۔ انتظار کا ایک ایک پل کتنا اذیت ناک ہوتا ہے...... اور یہ وہی شخص جانتا ہے جو انتہائی بے بسی سے، مصلحتوں کا شکار ہو کر خاموشی سے مناسب وقت اور قدرت کے فیصلے کا منتظر ہوتا ہے...... انتظار انسان کو جس اضطراری کیفیت میں مبتلا رکھتا ہے۔ اس کیفیت کو نہ تو کوئی نام دیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس سے فرار ممکن ہے......

شہیر بھی ایسی اضطراری کیفیت میں مبتلا تھا جیسے ہی اس کے موبائل پر کوئی کال آتی وہ مضطرب ہو کر جلدی سے موبائل پکڑتا اور زل کی بجائے کسی اور کی کال دیکھ کر گہری سانس لے کر خاموش ہو جاتا۔ کالج جاتا تو سارا راستہ زل کے بارے میں سوچتا رہتا...... اور توقع کرتا کہ شاید آج زل اسے کوئی خوشخبری سنائے گی...... اس سے وہ بات کہے گی...... جس کو سننے کے لئے وہ کس قدر بے تاب ہے...... مگر کالج میں زل کو خاموش دیکھ کر وہ اور مضطرب ہو جاتا......

وہ کوئی بات کیوں نہیں کہتی......؟

اور وہ خود اس سے کیا بات کرے......؟

اس سے کیا پوچھے......؟

وہی جو وہ ایک بار کہہ چکا ہے...... اور اس کا جواب بھی سن چکا ہے...... اب کچھ بھی کہنے کی باری زل کی ہے اور زل کچھ کہنے میں نجانے کیوں اتنا وقت لے رہی ہے نجانے وہ کیا کچھ سوچ رہی ہے......

اس نے کہا تھا...... اس کی 'محبت' اس کی زندگی کی سب سے قیمتی شے ہے اور...... اتنی قیمتی شے کسی دوسرے کو دینے کے لئے نجانے کئی بار سوچا جاتا ہے...... کتنے کٹھن مرحلوں میں سے انساں کو گزرنا پڑتا ہے...... شاید زل بھی ان مراحل میں سے گزر رہی تھی...... شاید اسی لئے وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔

وہ ساری ساری رات اس کے بارے میں سوچتا......

نجانے وہ کیا فیصلہ کرے گی.....؟

وہ جب اس سوال پر سوچتا.....تو اپنی ذات کو، اپنی شخصیت کو اور اپنے وجود کو تنقید کے ہر زاویے سے پرکھتا.....تو اس کا دل اس کو یہ کہہ کر مطمئن کرتا.....کہ اس میں وہ سب کچھ تو ہے جس کی خواہش ایک لڑکی کر سکتی ہے۔ خوبصورت، ہینڈسم، سمارٹ، ڈیسنٹ، امیر کبیر، ٹیلنٹڈ نوجوان...... کس چیز کی اس میں کمی تھی......اور سب سے بڑھ کر اس کا زل سے خود اظہار محبت......زل کو اور کیا چاہیے تھا......؟ وہ اپنے دل کی اس توجیہہ اور تسلی پر مطمئن ہو جاتا......اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیلنے لگتی.....دل خوشی سے جھوم اٹھتا......

اور وہ ان لمحوں کے بارے میں سوچتا...... جب زل اس سے اقرار محبت کرے گی...... وہ اس وقت کیا کرے گا؟ اس سے کیا کہے گا.....؟

اس کا ردعمل کیا ہوگا.....؟ وہ جواباً زل کو کیا کہے گا.....؟ وہ ان تمام باتوں پر سوچتا اور مطمئن ہو جاتا......

وہ دن اس کی زندگی کا سب سے زیادہ خوشی کا دن ہوگا جب زل اس سے اقرار محبت کرے گی......اور وہ اس کی محبت کے جواب میں کیا کہے گا؟ اس نے وہ سارے الفاظ اور جملے ترتیب دے لئے تھے اور ہر رات کو سونے سے پہلے وہ کئی کئی بار ان الفاظ اور جملوں کو دہراتا اور مطمئن ہو جاتا۔

اسے کامل یقین تھا کہ زل، آج...... یا...... کل...... یا پھر کسی روز ضرور اس سے اقرار محبت کرے گی......اس کی محبت کا جواب 'محبت' سے دے گی......اس کا دل اس کو یقین دلاتا اور وہ مطمئن ہو جاتا اور اس اطمینان سے اس کا چہرہ خوشی سے تمتمانے لگتا......

☆

زل عجیب کشمکش و پیچ میں مبتلا تھی......اسے شہیر سے اس بات کی توقع نہ تھی......کہ وہ اس سے یوں اظہار محبت کرے گا۔ وہ بظاہر خاموش، کم گو، سنجیدہ اور سوبر انسان تھا اور اسے قطعی امید نہ تھی کہ وہ اس کے لئے ایسے جذبات اپنے دل میں رکھتا ہے......اور اس کے بعد اس کا جب بھی شہیر سے آمنا سامنا ہوتا......تو شہیر کی آنکھوں میں گہرا استفہام ہوتا......وہ اس کی طرف یوں دیکھتا جیسے اس سے اپنے سوال کا جواب طلب کر رہا ہو اور وہ اس سے نظریں چراتی......اسے کیا کہتی......؟

وہ ذہنی طور پر بہت پریشان رہنے لگی تھی۔

پروفیسر رضا ربانی کی کلاس میں سب اسٹوڈنٹس موجود تھے اور وہ اے جی، لیونارڈو...... صادقین......اور استاد اللہ بخش کے اسٹائل آف آرٹ پر ڈسکشن کر رہے تھے اور تمام اسٹوڈنٹس بہت محو ہو کر سننے میں مصروف تھے جبکہ زل کا ذہن کہیں اور گم تھا......

''آرٹ میں سب سے اہم بات سبجیکٹ اور پھر ٹریٹمنٹ آف سبجیکٹ ہوتا ہے...... یہ آرٹسٹ کے ہاتھ میں ہوتا ہے کہ وہ عام اور معمولی سی شے کو بھی اپنے فن اور اسٹائل سے خاص اور یونیک بنا دے اور یہ بھی آرٹسٹ کے ہاتھ میں ہوتا ہے کہ وہ بہت خاص، خوبصورت اور یونیک چیز کو بگاڑ کر رکھ دے......'' پروفیسر ربانی نے کہا۔

''سر یہ کیسے ممکن ہے...... کہ ایک آرٹسٹ خود ہی خوبصورت اور یونیک چیز کو بگاڑ دے'' مریم نے حیرت سے پوچھا۔

''رائٹ...... یہ کوئسچن ذہن میں ضرور آتا ہے......اور اس کا جواب بھی میں آپ لوگوں سے سننا چاہوں گا......مریم کے اس سوال کا

جواب کون دے گا......؟" سر رضا ربانی نے ساری کلاس کے چہروں کی طرف بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"عمر...... آپ بتائیے......" سر رضا ربانی نے عمر سے پوچھا۔

"سر...... میرے خیال میں جان بوجھ کر تو کوئی نہیں بگاڑے گا...... ممکن ہے کہ اس آرٹسٹ کو وہ چیز اتنی خوبصورت نہ لگ رہی ہو...... جتنی وہ دوسروں کو لگ رہی ہو......" عمر نے جواب دیا تو سر رضا ربانی مسکرانے لگے۔

"کسی حد تک...... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں...... لیکن آپ نے وہ خاص بات پوائنٹ آؤٹ نہیں کی...... جو اس کی وجہ بن سکتی ہے......

ارسلان آپ بتائیے؟" پروفیسر رضا ربانی نے ارسلان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"سر...... وہ آرٹسٹ اتنا انٹیلی جنٹ نہیں ہوگا...... جتنا اسے دوسرے سمجھتے ہوں گے...... یہ تو اس کے آرٹ سے اس کا پول کھلے گا" ارسلان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تو ساری کلاس ہنسنے لگی...... سر ربانی نے بھی قہقہہ لگایا۔ زل نے ایک دم چونک کر سب کی طرف یوں دیکھا جیسے گہری نیند سے بیدار ہوئی ہو...... اس کے چہرے پر گہرا استفہام تھا۔

"ٹھیک ہے...... ارسلان کو بھی ٹھیک مانتے ہیں...... کیونکہ یہ تو یہ بھی آرٹسٹ......" پروفیسر ربانی نے مسکراتے ہوئے کہا تو ارسلان کھسیا گیا۔

"او کے...... آپ میں سے کون یہ سمجھتا ہے کہ وہ اس سوال کا بہتر جواب دے سکتا ہے......؟" پروفیسر ربانی نے سب اسٹوڈنٹس کے چہروں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

ہر طرف گہری خاموشی چھا گئی۔

"سر...... مے آئی......؟" شہیر نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"یس آف کورس" سر ربانی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"سر...... میرے خیال میں آرٹسٹ کا اینگل آف آبزرویشن، اس میں بہت matter کرتا ہے ہر آرٹسٹ چیزوں کو اپنے اپنے اس مخصوص زاویے سے دیکھتا ہے...... جو اسے قدرتی طور پر ملا ہے...... آئی مین گاڈ گفٹڈ ٹیلنٹ اور یہ ٹیلنٹ ہر انسان کو دوسرے سے مختلف ملا ہے...... مثال کے طور پر مجھے یہ سائیڈ پر رکھا statue بہت مختلف نظر آ رہا ہے اور جب آپ ساری کلاس سے باری باری پوچھیں گے تو سب کی آبزرویشن مختلف ہوگی...... اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آرٹسٹ اپنی ہی چیز کو خود ہی کیسے بگاڑتا ہے......؟

"خود کوئی بھی آرٹسٹ نہیں بگاڑتا...... یہ ہم دیکھنے والے کہتے ہیں کہ اس نے چیز بگاڑ دی ہے۔ ممکن ہے اس نے اس چیز کو نیا ٹچ دینے کے لئے کوئی نئی technique استعمال کی ہو...... جس کو ہمارا ذہن نہ تو سمجھ رہا ہو اور نہ ہی قبول کر رہا ہو...... اور ہم اسے کہتے ہیں کہ آرٹسٹ نے وہ چیز خود ہی بگاڑ دی ہے...... جبکہ آرٹسٹ اس کی بیوٹی کی 101 وجوہات بتا سکتا ہے...... یہ سب کچھ "اینگل آف آبزرویشن" ایکسپریشن اور ایکسپوژر پر depend کرتا ہے" شہیر نے بہت سنجیدگی اور خوبصورت انداز میں تفصیل بیان کی تو سب اس کی طرف پرستائش نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

"ویری گڈ...... بہت اچھے انداز میں شہیر نے سب کچھ explain کیا ہے...... یو آر اے جینئس......" سر ربانی نے مسکراتے ہوئے

اس کی تعریف کی تو سب شہیر کی طرف دیکھنے لگے...... زل کبھی سربانی کی طرف دیکھتی تو کبھی شہیر کے چہرے کی طرف...... جو سربانی کے ہر تعریفی جملے پر زل کی طرف دیکھتا اور زل آنکھیں جھکا لیتی۔

روشنی کے چہرے پر مسکراہٹ نمایاں ہونے لگی...... اور اس مسکراہٹ میں اس کے دل کا اطمینان اور خوشی شامل تھی...... اسے شہیر پر فخر محسوس ہونے لگا تھا...... نجانے کیوں وہ شہیر کے بارے میں بہت پوزیسو ہوتی جارہی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے شہیر صرف اور صرف اس کا ہی ہے...... اس کی ملکیت ہے اس کی اچھائی و برائی...... اس کی شہرت...... اس کی کامیابی...... اس کے پرابلمز اور غم و خوشی...... ہر بات کو شیئر کرنے کا حق صرف اور صرف روشنی کو ہے......

سب اسٹوڈنٹس کلاس کے بعد اپنے اپنے پریکٹیکلز میں مصروف ہو گئے...... زل کے دل پر عجیب سا بوجھ تھا...... ایسی مایوسی اور بے قراری تھی جس کی اسے سمجھ نہ آرہی تھی......

"تم کیوں اپ سیٹ لگ رہی ہو؟" ارسلان نے زل کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ خاص نہیں...... کبھی کبھی دل بلاوجہ اداس ہو جاتا ہے......" زل نے اسے ٹالنے کے انداز میں کہا۔

"لیکن ہر اداسی کی بھی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے" ارسلان نے اس کے چہرے کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"جس بات کی طرف تمہارا اشارہ ہے...... ایسی کوئی بات نہیں...... وہ بات ختم ہو چکی ہے" زل نے انتہائی سنجیدگی سے جواب دیا۔

"گڈ...... شکر ہے تم اس فیز سے نکلی...... یقیناً اب تمہیں میری باتوں پر یقین آگیا ہوگا......" ارسلان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں...... یقین...... آ...... تو جاتا ہے مگر بہت مشکل سے......" زل نے آہ بھر کر کہا۔

"کیا مطلب......؟" ارسلان نے چونک کر پوچھا۔

"ارسلان...... کسی کی بات...... یا...... دعوے پر یقین کرنے کے لئے کیا چیز ضروری ہوتی ہے؟" زل نے پوچھا۔

"آپ کے دل کا مطمئن ہونا......" ارسلان نے اس کے چہرے کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"اور دل کیسے مطمئن ہوتا ہے؟" زل نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"جب دل میں وسوسے اور خدشے نہ پیدا ہوں...... کیا تمہارا دل مضطرب ہو رہا ہے......؟" ارسلان نے اچانک پوچھا تو زل چونک کر اس کی جانب دیکھنے لگی۔

"ت...... تمہیں کیسے معلوم ہوا......؟" زل نے حیرت سے پوچھا۔

"تمہاری آنکھیں...... تمہارے دل کی کیفیت بیان کر رہی ہیں اور اس وقت تمہارا دل بہت مضطرب ہو رہا ہے...... کیا بات ہے...... کیا مجھ سے شیئر نہیں کرو گی؟" ارسلان نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"نہیں......" وہ دوٹوک لہجے میں بولی۔

''ٹھیک ہے......ایزیوش...... کچھ خوشیاں، کچھ غم...... کچھ راز صرف انسان کے اندر تک ہی محدود رہنے چاہئیں...... بعض اوقات ان کو شیئر کرنے سے ان کی کسک اور بڑھتی جاتی ہے...... باہر چلوگی......؟'' ارسلان نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں......'' وہ قطعیت سے بولی۔

''ٹھیک ہے...... میں جارہا ہوں......'' ارسلان کہہ کر وہاں سے چلا گیا اور زل اپنے پراجیکٹ پر کام کرنے لگی......

ارسلان ٹھیک کہتا ہے کسی پر یقین کرنے کے لئے...... دل کا مطمئن ہونا بہت ضروری ہے...... اور جب دل ہی بے قرار ہو...... تو وہ کسی پر کیا یقین کرے گا...... مجھے یقین کیوں نہیں آرہا......؟

میرا دل مضطرب کیوں ہے......؟

میں اپنے دل کو کیسے مطمئن کروں......؟

وہ بے بسی سے سوچنے لگی۔

☆

شہیر روشنی کو ڈراپ کرنے جا رہا تھا۔ روشنی کی گاڑی خراب ہوگئی تھی...... اور شہیر نے اسے کالج پارکنگ میں دیکھتے ہی ڈراپ کرنے کی آفر کی تھی...... جسے روشنی نے فوراً قبول کرلیا تھا۔ اس کے لئے شہیر کی قربت کے لمحات ہر شے سے بڑھ کر قیمتی ہوتے جا رہے تھے...... اس کے دل کے اندر شہیر کے لئے جو جذبات پیدا ہوئے تھے...... وہ اس کی قربت سے مزید پختہ ہو رہے تھے......

''شہیر...... تم نے آج سر رضا ربانی کی کلاس میں بہت اچھی اور Logical گفتگو کی......'' روشنی نے بات شروع کرتے ہوئے کہا۔

''اتنی Logical بھی نہیں تھی...... تم خواہ مخواہ امپریس ہو رہی ہو......'' شہیر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''کسی میں کوئی ایسی بات ضروری ہوتی ہے...... جو دوسروں کو متاثر کرتی ہے'' روشنی نے ذومعنی انداز میں کہا۔

''ہوتی ہوگی...... مگر مجھ میں نہیں'' شہیر مسکرا کر بولا۔

''تم اپنے آپ کو underestimate کیوں کرتے ہو؟'' روشنی نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں...... ایسا تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں...... البتہ...... overestimate کرتے ہوئے کئی بار سوچنا پڑتا ہے......'' شہیر نے کہا۔

''اب یہ مت کہنا...... کہ...... تم منفرد انسان نہیں ہو'' روشنی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تم کہتی ہو...... تو...... مان لیتا ہوں......'' شہیر شرارت سے مسکراتے ہوئے بولا۔

''کیوں......؟'' روشنی نے جان بوجھ کر معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''بھئی...... میں تمہیں ناراض نہیں کرسکتا'' شہیر مسکرا کر بولا۔

''کیا یہ مجھے خوش کرنے کے لئے کہہ رہے ہو؟'' روشنی نے پوچھا۔

''نہیں...... حقیقت بتا رہا ہوں...... روشنی تم بہت نائس ہو...... اور...... نائس لوگوں کو میں ناراض کرنا نہیں چاہتا......'' شہیر نے مسکراتے ہوئے کہا اور روشنی کو اس لمحے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ ہواؤں میں اڑ رہی ہو...... شہیر کی باتیں...... اس کا دیکھنا...... اسے اس کے وجود کا حسین احساس دلانا...... سب کچھ اس کے اندر ہمیشہ کے لئے امر ہوتا جا رہا تھا...... اس کا دل اس لمحے کیا کچھ محسوس کر رہا تھا...... یہ صرف وہی جانتی تھی...... وہ شہیر سے باتیں کر رہی تھی مگر اس کا دل نئے اور انوکھے جذبوں سے روشناس ہو رہا تھا...... شہیر کی ہر بات کو وہ اپنے دل کے اندر بہت گہرائی میں محسوس کر رہی تھی...... اور ان باتوں کا اثر کسی نقش کی صورت میں اس کے دل کے اندر ہمیشہ کے لئے کندہ ہو رہا تھا۔

شہیر اسے ڈراپ کر کے چلا گیا۔

مگر روشنی کہیں کھو گئی تھی......

☆

سمیر انگلینڈ سے آ رہا تھا......

مسز فاخر خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھیں...... کبھی گھر کا کوئی انتظام دیکھتی...... کبھی کوئی...... کبھی کچن میں جا کر کک کو مختلف ہدایات دیتیں...... کبھی maid کو گھر کے کونے کھدرے تک صاف کرنے کا حکم دیتی......

مسز فاخر کا پی۔اے بار بار انہیں فلائٹس کے بارے میں مختلف اطلاعات بہم پہنچا رہا تھا......

شہیر گھر پہنچا...... تو چوکیدار سے لے کر پی۔اے تک...... ہر شخص کو پھرکی کی طرح گھومتے دیکھا...... یوں لگ رہا تھا...... سمیر نہیں بلکہ کوئی وزیر اعظم آ رہا ہو...... اور ان سب سے بڑھ کر مسز فاخر کے چہرے پر خوشی کے نمایاں تاثرات کو دیکھ کر بری طرح چونکا۔

''شہیر...... آج شام کو سمیر آ رہا ہے...... تم کہاں تھے......؟'' مسز فاخر نے پوچھا۔

''وہ تو آپ کو دیکھ کر ہی اندازہ ہو رہا ہے...... کہ سمیر آ رہا ہے؟'' شہیر نے قدرے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب ہے؟'' مسز فاخر نے ایک دم چونک کر پوچھا۔

''دنیا میں سمیر کے علاوہ نہ تو کوئی اور آپ کو بہت عزیز ہے اور نہ ہی کوئی اور آپ کو اتنی خوشی دے سکتا ہے...... جتنی کہ سمیر......'' شہیر نے کہا۔

''تم یہ کیسی باتیں کر رہے ہو......؟'' مسز فاخر نے حیرت سے پوچھا۔

''کیا یہ حقیقت نہیں......؟'' شہیر نے مسز فاخر کی طرف بغور دیکھتے ہوئے پوچھا تو مسز فاخر اسے دیکھ کر خاموش ہو گئیں......

''ہر انسان اپنی قدر و منزلت خود اسٹیبلش کرتا ہے......'' وہ بھی قدرے توقف کے بعد بولیں۔

''اور...... جو...... لوگ ایسا کرنے میں ناکام ہو جائیں...... کیا انہیں نظر انداز کر دینا چاہیے یا پھر...... انہیں مزید در تھ لیس سمجھنا چاہیے......'' شہیر نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''میں آبزرو کر رہی ہوں...... تم کئی روز سے بہت عجیب باتیں کر رہے ہو...... تم پہلے تو ایسے نہیں تھے...... تمہیں کیا ہوتا جا رہا ہے......

دوسروں کے لئے اتنی ناپسندیدگی......اور وہ بھی اپنوں کے لئے......تمہارے دل میں کیوں پیدا ہو رہی ہے؟ تم بھی میرے بیٹے ہو......تمہارا برا نہ تو میں سوچ سکتی ہوں اور نہ ہی تمہیں نظر انداز کر سکتی ہوں" مسز فاخر نے نرم لہجے میں اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ممی......انسان میں کوئی تبدیلی اچانک نہیں آتی......سب کچھ انسان کے جینز میں موجود ہوتا ہے......اور جینز کے ذریعے اسے وراثت میں ملتا ہے......" شہیر نے جواب دیا۔

"تمہارا کہنے کا مطلب ہے کہ یہ نفرت......یہ منفی جذبے تمہیں والدین سے یعنی ہم سے وراثت میں ملے ہیں......" مسز فاخر نے حیرت سے کہا۔

"کچھ نہ کچھ......کسی نہ کسی حد تک تو ضرور ملتا ہے......اور کچھ والدین کا رویہ......انسان کو ایسا کچھ دیتا ہے......کچھ عرصہ پہلے میں ایسا نہیں تھا......کیونکہ میں نے آپ کو اس زاویے سے آبزرو نہیں کیا تھا......ممی......سمیر سے بات کرتے ہوئے آپ کا لب ولہجہ بالکل مختلف ہوتا ہے اور مجھ سے بات کرتے ہوئے بالکل اور ڈیڈی سے بات کرتے ہوئے آپ اور ہوتی ہیں......" شہیر نے جواب دیا۔

"تمہارے اندر جو نفرت پیدا ہو رہی ہے......کیا اس کی ذمہ دار میں ہوں......؟" مسز فاخر نے حیرت سے پوچھا۔

"معلوم نہیں......مگر میں آپ کی وجہ سے بہت ڈسٹرب ہو رہا ہوں" وہ قدرے صاف گوئی سے بولا۔

"میری وجہ سے ڈسٹرب......اوہ......تو......" مسز فاخر نے انتہائی حیرت سے اسے دیکھ کر پوچھا۔

"یس......آئی......ایم......" اس نے الفاظ پر زور دیتے ہوئے ماں کی طرف بغور دیکھا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ مسز فاخر حیرت اور تشویش سے اسے دیکھتی رہ گئیں......انہیں قطعی معلوم نہ تھا کہ وہ اس حد تک ماں کے بارے میں منفی باتیں سوچتا ہے......

اس کی سوچ روز بروز کیوں بدلنے لگی ہے......؟

اسے مجھ سے نفرت کیوں ہونے لگی ہے......؟

اور سمیر کو وہ کیوں ناپسند کرنے لگا ہے......؟

شہیر ایسا تو نہیں تھا......؟

وہ کیوں اتنا بدل رہا ہے......؟

☆

زل اور روشنی ایک منی ایچر پینٹنگ کے بارے میں ڈسکشن کر رہی تھیں جو زل نے بنائی تھی......مغلیہ دربار کا ایک سین تھا جس میں شہزادہ سلیم اور ملکہ نور جہاں دربار میں تخت شاہی پر بیٹھے تھے اور ان کے سامنے ایک نوجوان لڑکی کھڑی تھی......لڑکی کے چہرے پر تاثرات سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ کوئی فریاد لے کر دربار میں حاضر ہوئی ہے......

"کیا تم اس کے تاثرات دیکھ کر بتا سکتی ہو......کہ اس کا پرابلم کیا ہے؟" زل نے روشنی سے پوچھا۔

''یقیناً اس کا شوہر گرفتار ہوا ہوگا اور وہ فریاد کر رہی ہے'' روشنی نے جواب دیا۔

''اس کے علاوہ......اور......کچھ......؟'' زل نے پوچھا۔

''اس کے دل میں کوئی بہت painful بات ہے جو اس کے چہرے سے نمایاں ہے......تم خود ہی بتا دو'' روشنی جھنجھلا کر بولی۔

''یہ انار کلی ہے...... جو ملکہ نور جہاں کے سامنے فریاد لے کر آئی ہے......تم دیکھو......شہزادہ سلیم کی آنکھوں میں اداسی اور چہرے پر گھبراہٹ ہے......جبکہ نور جہاں قدرے غصے میں ہے اور انار کلی کے چہرے پر دکھ ہے'' زل نے کہا تو روشنی نے پھر پینٹنگ کو بغور دیکھا۔

''اوہ......ہاں......ریئلی......یہ بالکل ایسی ہی ہے جیسی تم بتا رہی ہو......تم منی ایچرز بنانے میں بہت skill رکھتی ہو......اور میرا اس میں انٹرسٹ نہیں......مجھے میورل آرٹ زیادہ اچھا لگتا ہے'' روشنی نے کہا۔

''ہاں......اپنی اپنی چوائس کی بات ہے......'' زل نے کہا۔

''میرا خیال ہے منی ایچر بنانا بہت مشکل ہے......'' روشنی نے کہا۔

''میورل بنانا بھی کوئی آسان نہیں'' زل نے جواب دیا۔

''ہاں......بات تو اپنے انٹرسٹ کی ہے......ویسے بھی میں نے آبزرو کیا ہے......تم چیزوں کو بہت depth (گہرائی) میں جا کر سوچتی ہو......جیسے شہیر......'' روشنی نے نادانستہ کہا تو زل نے ایک دم چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

''میرا نہیں خیال......کہ......میں......شہیر جیسی ہوں......یا شہیر کی سوچ میرے جیسی ہے......مجھ میں اور شہیر میں بہت فرق ہے'' وہ قدرے تھوس لہجے میں بولی۔

''ظاہر ہے......دو انسان کبھی بھی مکمل طور پر ایک جیسے نہیں ہو سکتے......کہیں نہ کہیں دونوں میں بہت فرق ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی......کہیں نہ کہیں......کسی نہ کسی نقطے پر دو انسانوں کی سوچ مل بھی سکتی ہے......تم دونوں کا چیزوں کو آبزرو کرنے کا انداز بہت ملتا جلتا ہے'' روشنی نے کہا۔

''بالکل بھی نہیں......یہ تمہاری سوچ ہو سکتی ہے......کیونکہ تم ہم دونوں کا موازنہ کرتے ہوئے یہ سوچ رہی ہو ورنہ مجھ سے اور شہیر سے بھی پوچھو گی تو وہ بھی یہی جواب دے گا'' زل نے جواب دیا۔

اسی لمحے شہیر کلاس روم میں داخل ہوا روشنی اور زل کو باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر ان کی طرف آ گیا۔ زل ایک دم چونک گئی۔

''کیا ڈسکشن ہو رہی ہے؟'' شہیر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''تمہیں ڈسکس کر رہے ہیں'' روشنی نے مسکرا کر جواب دیا۔

''مجھے......؟'' شہیر نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

''نہیں......یہ......یونہی کہہ رہی ہے'' زل جلدی سے بوکھلا کر بولی۔

''اگر میں یونہی کہہ رہی ہوں تو شہیر سے ہی پوچھ لیتے ہیں'' روشنی نے شہیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو زل کے چہرے پر پریشانی کے

تاثرات نمایاں ہونے لگے۔

''میں......زل سے کہہ رہی تھی کہ شہیر تمہاری طرح بہت گہرائی میں جا کر سوچتا ہے......مگر یہ مان نہیں رہی تھی......'' روشنی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''نہیں......میں تو یہ کہہ رہی تھی......کہ دو انسان کبھی بھی ایک جیسا نہیں سوچ سکتے......دونوں کی سوچ میں کہیں نہ کہیں اختلاف ضرور ہوتا ہے......'' زل نے جلدی سے جواب دیا۔

''ہاں......اب......تم بتاؤ......کیا زل ٹھیک کہہ رہی ہے یا میں......؟'' روشنی نے مسکرا کر پوچھا۔

''تم دونوں کسی حد تک......ٹھیک کہہ رہی ہو......انفرادی طور پر تو ہر ایک کی سوچ میں اختلاف ہوتا ہے مگر جب اجتماعی طور پر کسی نقطے پر متفق ہو کر سوچا جاتا ہے تو پھر اختلاف ختم ہو جاتے ہیں اور ایک سوچ پر عمل کیا جاتا ہے'' شہیر نے جواب دیا۔

''کیا......تمہیں کبھی محسوس نہیں ہوا کہ زل بھی اکثر چیزوں کو اس زاویے سے دیکھتی ہے جیسے تم......'' روشنی نے کہا۔

''ہاں......کبھی کبھی مجھے بھی محسوس ہوتا ہے'' شہیر نے کہہ کر معنی خیز انداز میں زل کی طرف دیکھا تو زل نے ایک ٹک اسی کی جانب دیکھا اور منہ دوسری جانب کر کے دیکھنے لگی......اور پھر اپنی چیزیں سمیٹنے لگی۔

روشنی کا موبائل اچانک بجنے لگا......اور......وہ فون سننے کے لئے کلاس سے باہر چلی گئی۔

''کیا......آپ کو میری کوئی بات بری لگی ہے؟'' شہیر نے زل کے چہرے پر گہری سنجیدگی کو دیکھ کر پوچھا۔

''نہیں......'' وہ کہہ کر کلاس روم سے باہر جانے لگی......

''زل......وہ......؟'' شہیر نے موقع دیکھ کر کچھ پوچھنا چاہا مگر پھر خاموش ہو گیا۔

زل نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا اور بغیر رکے کلاس روم سے باہر نکل گئی۔

☆

مسز فاخر اور سمیر ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے......سمیر بہت خوشگوار موڈ میں ممی کو اپنی باتیں بتا رہا تھا......اور وہ اس کی باتوں پر بھرپور قہقہے لگا رہی تھیں......شہیر کالج سے گھر پہنچا......تو سمیر اور ممی کو باتیں کرتے دیکھ کر ٹھٹکا......مسز فاخر ایک دم محتاط ہو گئیں......شہیر کے چہرے پر بہت عجیب سے تاثرات تھے۔

''آؤ......شہیر......ہم لوگ کھانے پر تمہارا ہی ویٹ کر رہے ہیں؟'' سمیر نے مسکرا کر اسے کہا۔

''کھانا تو آپ دونوں کھا چکے ہیں......رسمی جملہ کہنے کا شکریہ'' شہیر نے سنجیدگی سے معنی خیز انداز میں ممی اور سمیر کی پلیٹوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو تقریباً کھانا ختم کرنے والے تھے۔

''یار......ابھی کھانا ختم کہاں ہوا ہے؟ تمہارے ساتھ پھر شروع کر لیں گے......'' سمیر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تھینکس...... مجھے بھوک نہیں...... آپ انجوائے کریں" شہیر نے مسز فاخر کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھتے ہوئے کہا اور سیڑھیاں چڑھتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

"ممی...... یہ شہیر کو کیا ہو گیا ہے...... ؟ بہت cynic وے میں بات کر رہا تھا......" سمیر نے اس کے جانے کے بعد انتہائی حیرت سے پوچھا۔

"مجھے خود سمجھ نہیں آ رہا...... نجانے کیوں اتنا تلخ ہو رہا ہے......؟" مسز فاخر نے تشویش سے کہا۔

"تو...... آپ کو ریزن جاننے کی کوشش کرنی چاہیے تھی...... کوئی نہ کوئی ایسی بات تو ہو گی...... جو وہ یوں ری ایکٹ کر رہا ہے...... ورنہ شہیر تو بہت ڈیسنٹ تھا......" سمیر نے پریشانی سے کہا۔

"وہ مجھ سے کوئی بات بھی مکمل کر نہیں کرتا...... پچھلے کئی ماہ سے مجھ سے اس کی ہر بات تلخی پر ختم ہوتی ہے......" مسز فاخر نے بتایا۔

"کیا ڈیڈی سے بھی وہ اسی لہجے میں بات کرتا ہے؟" سمیر نے پوچھا۔

"یہ انہی کی شہ کا نتیجہ ہے...... اس کے سامنے بیٹھ کر میرے خلاف باتیں کرتے ہیں...... مجھے زچ کرنے کا کوئی موقع وہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے" مسز فاخر ایک دم مشتعل ہو کر بولیں۔

"ممی...... آپ اور ڈیڈی میں یہ clashes کب ختم ہوں گے......؟" سمیر نے بھی قدرے تلخی سے کہا۔

"میں کیا کہہ سکتی ہوں؟ مگر انہوں نے شہیر کو میرے خلاف بھڑکا کر میرے گھر کو آگ لگانے کی کوشش کی ہے" مسز فاخر جذباتی لہجے میں بولیں۔

"اوکے...... جسٹ لیو اٹ...... آپ اپ سیٹ نہ ہوں...... میں شہیر سے خود بات کروں گا اور جو بھی negative باتیں اس کے ذہن میں ہیں...... ان کو دور کرنے کی کوشش کروں گا......" سمیر نے ممی کا ہاتھ پکڑ کر انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"تھینکس...... مائی ڈیر...... تمہارے بغیر میں اپنے آپ کو کتنا lonely محسوس کرتی ہوں...... تمہیں اندازہ نہیں...... آئی مس یو ٹو مچ...... تھینکس گاڈ کہ میں بزی رہتی ہوں تو میرا ٹائم گزر جاتا ہے ورنہ گھر میں رہ کر تمہارے ڈیڈی اور شہیر کے attitude کی وجہ سے بیمار ہی ہو جاؤں" مسز فاخر نے پریشانی سے کہا۔

"اور...... میں آپ کو نہ کبھی تنہا رہنے دوں گا...... اور نہ ہی بیمار...... ممی...... میں آپ کو انگلینڈ میں بہت مس کرتا تھا...... باہر کی مکینیکل لائف میں آپ جیسی ایکٹو عورتیں ہی سروائیو کر سکتی ہیں...... آپ نے جس طرح مجھے groom کیا ہے...... اس نے مجھے وہاں بہت help کیا...... آپ نے مجھے بہت ڈسپلنڈ بنا دیا ہے......" سمیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اور مجھے خوشی ہے کہ تم میری expectation کے مطابق ہو، میں شہیر کو بھی ایسے ہی گروم کرنا چاہتی تھی...... تمہارے جیسا بنانا چاہتی تھی...... مگر وہ میری کوئی بات نہیں سنتا...... ہمیشہ irritate ہو جاتا ہے" مسز فاخر نے پریشانی سے کہا۔

شہیر سیڑھیاں اترتے ہوئے ان کی باتیں سن رہا تھا اور ان کی باتیں سن کر اس کے چہرے پر مختلف قسم کے اتار چڑھاؤ آ رہے تھے۔

"سمیر...... میں تم سے بہت خوش ہوں...... تم نے اپنی اسٹڈیز کے ساتھ اپنی پرسنالٹی کو بھی بہت maintain رکھا ہے" مسز فاخر نے کہا۔
شہیر ایک دم سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے آیا...... اور ان کی طرف دیکھے بغیر وہاں سے باہر چلا گیا۔ سمیر اور مسز فاخر حیرت سے اسے دیکھتے رہ گئے۔

☆

شہیر کا دل نت نئے جذبوں سے آشنا ہو رہا تھا...... اسے خود بھی حیرانگی ہوتی تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے...... وہ زل کی محبت میں بہت بے قرار رہنے لگا تھا...... اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی سوچوں کا محور زل ہو...... اس کا ذہن زل کے علاوہ کسی اور کو سوچنا ہی نہ چاہتا ہو...... دانستہ یا نادانستہ...... ہر بات...... اور ہر سوچ کا اختتام زل پر ہوتا...... اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا...... کہ زل کیسے اس کے لئے اتنی عزیز از جان ہو گئی تھی...... وہ اس سے اتنی محبت کرنے لگا تھا جسے وہ خود بھی کسی قسم کے پیمانے میں تول نہیں سکتا تھا......

زل کے بارے میں رات رات بھر سوچنا اسے اچھا لگتا تھا...... اور اس کے بارے میں باتیں کرنا اس سے بھی زیادہ اچھا...... اس کے دل نے اسے جو یقین دہانی کرائی تھی...... اس کے بعد اسے ہر پل یہی احساس ہوتا تھا کہ زل صرف اور صرف اس کی ہی ہے...... وہ تو بس زل کے "اقرار محبت" کا انتظار کر رہا تھا...... اور جس دن اس نے اقرار کر لیا...... سارا انتظار...... اور سارا اضطراب ختم ہو جائے گا...... اس بات کو سوچ کر وہ مسرور ہونے لگتا......

نجانے اسے کیا ہوتا جا رہا تھا...... سر بازار چلتے ہوئے کسی بھی شادی شدہ جوڑے کو دیکھتا تو چونک کر دیکھتا ہی رہ جاتا...... وہ تصور میں اپنے آپ کو زل کے ساتھ یوں گھومتے پھرتے، ہنستے مسکراتے، باتیں کرتے اور شاپنگ کرتے ہوئے دیکھتا...... گاڑی اگر کسی سگنل پر شام کو رکتی تو موتیے اور گلاب کے گجرے اور پھول بیچنے والوں سے ہر شام گجرے لے کر انہیں پکڑ کر دیکھتا...... اور...... پھر انہیں واپس کر دیتا...... وہ اپنے ساتھ والی خالی سیٹ کو دیکھتا تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے زل اس کے ساتھ بیٹھی ہو اور وہ اسے یہ گجرے اور پھول خرید کر دے رہا ہو مگر جب پھول والے کی آواز پر وہ چونک کر اسے دیکھتا تو بوکھلا کر پھول واپس کر دیتا۔

"لے...... لو...... نا...... صاب"

"ابھی نہیں......" وہ زیر لب مسکرا کر جواب دیتا اور گاڑی آگے بڑھا دیتا...... اس کا دل اک امید سے سرشار ہو جاتا۔ اس کا دل خواہش کرتا کہ کاش زل اسے جلد از جلد مل جائے۔ زل کو پانے کے لئے وہ ہر آزمائش سے گزرنے کے لئے تیار تھا...... ہر خوبصورت بات سوچتے ہوئے زل اس کے ذہن میں ہوتی وہ اس بات کو اپنے ذہن میں دہرا کر محفوظ کرتا کہ وہ یہ بات ضرور زل کو بتائے گا...... اور زل مسکرا کر اس کی جانب دیکھے گی۔ وہ زل کی ایک مسکراہٹ پر اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار تھا۔ اپنے لئے شاپنگ کرتے ہوئے وہ ان کلرز کا خیال رکھتا جو زل کو پسند تھے...... اور اکثر شاپنگ کرتے ہوئے کوئی لیڈیز پرس، ڈریس یا جیولری پسند آ جاتی تو وہ اسے پُرشوق نگاہوں سے یوں دیکھتا جیسے زل کو اسے پہنے ہوئے دیکھ رہا ہو...... صرف زل ایک بار "اقرار محبت" کر دے...... تو پھر وہ اس کے لئے ڈھیروں شاپنگ کرے گا......

اس کی ہر خواہش پوری کرے گا......

جو وہ کہے گی...... اس کی ہر بات مانے گا......

جو وہ سننا چاہے گی...... صرف وہی کہے گا......

وہ زنل کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار تھا...... اسے اپنا سب کچھ دینے کو تیار تھا...... اپنی بھرپور محبت...... چاہت...... اور سب کچھ جو وہ چاہے گی......

کاش وہ اپنا دل کھول کر زنل کے سامنے رکھ سکتا...... تو اسے اس کے دل کی ہر دھڑکن میں صرف زنل کا نام سنائی دیتا...... اس کے دل کے اندر صرف اور صرف اسے محبت نظر آتی...... وہ زنل کے بارے میں بہت پوزیسو ہوتا جا رہا تھا...... کالج میں اسے زنل دکھائی نہ دیتی تو وہ بے چینی سے ادھر ادھر دیکھتا رہتا اور جیسے ہی وہ نظر آتی تو وہ مطمئن ہو جاتا......

اچانک زنل کی کھنک دار ہنسی کی آواز سنتا تو ایک دم چونک کر پرشوق نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتا اور خود ہی زیر لب مسکرانے لگتا۔

زنل جب بھی کسی سے باتیں کر رہی ہوتی...... تو اس کی باتوں کو انتہائی توجہ سے سنتا...... مگر اس کی طرف دیکھنے سے گریز کرتا کیونکہ اسے احساس ہونے لگا تھا کہ زنل اس کی نظروں سے شاید جھینپ جاتی تھی اور اس سے نظریں ملانے سے احتراز کرتی تھی اور وہ اسے پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا...... وہ اس کی خوشی اور ناراضگی کا بہت خیال رکھنے لگا تھا...... کوشش کرتا کہ کوئی ایسی بات نہ کرے جس سے اس کے چہرے پر ناراضگی کے تاثرات نمایاں ہوتے تھے اسے دیکھ کر اس کی آنکھیں یوں چمکنے لگتیں جیسے وہ اس کی لو سے چمک رہی ہوں......

محبت کیسا جذبہ ہے......؟ جو آہستہ آہستہ دل کے اندر کیسی آگ لگائے رکھتا ہے جو نہ کسی طور ٹھنڈی پڑتی ہے اور نہ ہی ختم ہوتی ہے۔ دبی چنگاریوں کی طرح ہر وقت دل کے آتشدان کو دہکائے رکھتی ہے...... اور انسان کے لئے اس آگ سے کسی طرح بھی فرار ممکن نہیں ہوتی۔

محبت کس احساس کا نام ہے......؟

جو اندر ہی اندر دل کو اتنا مضطرب اور بے قرار رکھتا ہے...... کہ اس کے بغیر نہ سکون ملتا ہے اور نہ اس سے چھٹکارا۔

محبت کا حاصل کیا ہے......؟

کرب...... آزمائش...... یا...... پھر...... ؟......!

مکاں سے لامکاں کا سفر......!

حاصل سے لاحاصل کی تمنا......!

یا پھر فنا سے بقا کی جستجو......!

کیا محبت کے بغیر زندگی ممکن ہے......؟

کیا یہ وہ جذبہ ہے جو انسان کو ازل سے ودیعت کیا گیا ہے...... یا پھر انسان کی سرشت میں اہم عنصر محبت کو شامل کیا گیا ہے...... کیا انسان کا خمیر محبت کی مٹی سے اٹھا ہے...... کہ وہ دانستہ یا نادانستہ محبت کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے...... وہ چاہتے نہ چاہتے ہوئے...... دانستہ نادانستہ...... شعوری اور لاشعوری طور پر اس کے سحر میں مبتلا ہو جاتا ہے...... محبت کے بغیر اسے زندگی اور اس کا سفر ادھورا لگتا ہے...... جب تک انسان

اس احساس سے آشنا نہیں ہوتا..... جب تک کسی شے کی کمی اور نہ ہونے کا احساس اسے مضطرب رکھتا ہے..... دل کسی کو چاہے اور چاہے جانے کی تمنا کرتا ہے..... اور جب اس سے آشنا ہو جاتا ہے..... تب اسے پانے کی جستجو کرتا ہے اور جب کسی کو پالیتا ہے تو پھر کسی اور شے کی تمنا اسے مزید اضطراب سے دوچار کرتی ہے۔

محبت ایک گورکھ دھندہ ہے.....!

ایسا خوبصورت اور سنہری جال ہے..... جو دور سے بہت خوبصورت اور دلفریب نظر آتا ہے مگر قریب جانے پر جب یہ کسی کو اپنے سنہرے ریشوں میں ایک بار پھنسا لیتا ہے..... تب اس سے فرار ممکن نہیں ہوتی..... یہ آکٹوپس کی طرح اسے اپنے شکنجے میں ایسا جکڑتا ہے کہ فرار کی ساری راہیں بند نظر آتی ہیں۔

محبت ایسے کرب مسلسل کا نام ہے جو اندر ہی اندر دل کو ایسے درد سے آشنا کرتا ہے جس کا علاج ممکن نہیں..... ایسا درد جو بتلایا نہیں جا سکتا جو صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔

وہ محبت کے ہر پہلو پر سوچتا..... اس کے کرب کو..... اس کے درد کو..... اس کی اذیت کو..... اس کی خوشی کو..... اس کے لمس کو اور اس کے احساس کو اپنے رگ و پے میں محسوس کرتا..... اس کا دل محبت کے سحر میں بری طرح گرفتار ہو گیا تھا.....

'زل' سے وہ اتنی شدید محبت کرنے لگا تھا..... کہ اب اس کی محبت سے فرار ممکن نہیں تھا..... اس کے بغیر زندگی نامکمل تھی اس کے بغیر ہر سوچ ادھوری تھی.....

اور روشنی ''شہیر'' کے بغیر اپنی زندگی کو ادھورا سمجھتی تھی..... اس کی سوچوں کا محور شہیر تھا..... اس کے دل کی دنیا شہیر کے نام سے متحرک تھی..... وہ اس سے اتنی محبت کرنے لگی تھی..... شاید دنیا میں کوئی کسی سے نہ کرتا ہو..... دل کی دھڑکنیں ایک ہی نام سے بے ترتیب ہوتی تھیں..... ایک ہی شخص کو سوچ کر وہ خوشی اور سکون محسوس کرتی تھی اور ایک ہی شخص کے لئے وہ اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار تھی..... اپنی محبت..... اپنی چاہت..... اپنی خواہشات اور اپنا سب کچھ..... وہ صرف اس وقت کی منتظر تھی جب شہیر روشنی کی آنکھوں میں جھانک کر اس کے دل میں چھپے اس راز کو پالے..... جس راز کا ہر سرا شہیر سے جا کر ملتا تھا.....

کاش وہ دن جلد آئے..... جب شہیر اس سے اقرار محبت کرے..... روشنی سے کہے کہ وہ اس کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا..... اور وہ دن روشنی کے لئے سب سے قیمتی ہوگا..... تب روشنی اپنی محبت اور چاہت سے اس کے دل و دماغ کو منور کر دے گی.....

نجانے یہ انتظار کب ختم ہوگا.....؟

یہ انتظار کتنا اذیت ناک اور جان لیوا ہوتا ہے.....

کاش زندگی میں انتظار نہ ہوتا..... تو زندگی کتنی پرسکون ہوتی..... یہ انتظار کتنا مضطرب رکھتا ہے..... اندر ہی اندر دل اس قدر بے چین ہوتا ہے کہ نہ بیٹھے ہوئے سکون ملتا ہے..... نہ لیٹے ہوئے..... ہر وقت سوچیں، خیالات اور جذبات پراگندہ اور منتشر رہتے ہیں..... اور دنیا کا کوئی مرہم

اس کرب کا مداوا نہیں کر سکتا۔ روشنی مضطرب تھی...... اور منتظر بھی......

شہیر بھی منتظر تھا اور بہت بے قرار بھی......

اور زل منتظر تو نہیں تھی...... مگر مضطرب ان دونوں سے زیادہ تھی...... کیونکہ اسے ایک اہم فیصلہ کرنا تھا...... اور اس فیصلے تک پہنچنے کے لئے اسے کس قدر آزمائش، کرب اور کٹھن مراحل میں سے گزرنا پڑ رہا تھا...... یہ صرف وہی جانتی تھی......

وہ شہیر کے بارے میں کیا سوچتی تھی......؟

شہیر کے بارے میں حتمی فیصلہ کرتے ہوئے اسے کیا مسائل پیش آ رہے تھے...... یہ صرف وہی جانتی تھی...... اور وہ ایسے کرب سے گزر رہی تھی...... جس کو صرف وہی جانتی تھی...... اور وہ اسے کسی کے ساتھ بھی ڈسکس نہیں کرنا چاہتی تھی۔

☆

شہیر بہت بے چین تھا۔ کالج میں گرمیوں کی چھٹیاں ہو رہی تھیں۔ سب لوگ چھٹیوں کے پلانز بنا رہے تھے...... ایک ماہ بعد ایگزامز بھی ہونے والے تھے اور شہیر کے لئے یہ چھٹیاں کس قدر جان لیوا ثابت ہوں گی یہ صرف وہی جانتا تھا...... زل سے دور ہونے کا سوچ کر ہی وہ بے قرار ہو جاتا...... اتنے دن...... اتنے گھنٹے...... اتنے منٹ اور سیکنڈ وہ اس سے دور رہے گا...... اسے دیکھ نہیں پائے گا...... اس کی آواز نہیں سن پائے گا...... اسے ہنستا ہوا نہیں دیکھ سکے گا...... اس کی خوبصورت جھیل سی آنکھوں میں جھانک نہیں سکے گا...... اپنی آنکھوں کے ذریعے اپنے دل کا پیغام اسے پہنچا نہیں سکے گا۔

''اف یہ چھٹیاں کیوں ہو رہی ہیں......؟'' وہ جھنجلا کر کہتا تو سب کلاس فیلوز حیرت سے اس کی جانب دیکھتے...... تو وہ بوکھلا جاتا......

''میرا مطلب ہے...... اتنے زیادہ دن فرینڈز سے دور رہنا بہت مشکل ہے......'' وہ گھبرا کر جواب دیتا۔

''میں تمہارا مطلب سمجھ رہی ہوں......'' روشنی معنی خیز انداز میں اس کے جملے کا مسکرا کر جواب دیتی۔

''یس آف کورس...... تم لوگوں سے ہی تو میری زندگی میں روشنی ہے...... کیا اتنے دن میں اندھیرے میں رہوں گا؟'' شہیر مسکرا کر کہتا۔

''لیمپ جلا کر گزارا کرنا...... اگر وہ نہ ملے تو موم بتی جلا لینا...... اگر وہ بھی نہ ملے تو اپنی جیب میں لائٹر ضرور رکھنا......'' ارسلان ہنس کر کہتا۔

''کیوں......؟'' شہیر پوچھتا۔

''کم از کم لائٹر تمہیں یہ احساس تو دلائے گا...... کہ روشنی تمہارے پاس ہی ہے......'' ارسلان جواب دیتا تو روشنی اس کی بات پر کھلکھلا کر ہنستی اور اندر ہی اندر محظوظ ہوتی۔

☆

اس کے لئے پہلی چھٹی گزارنا ہی مشکل ہو رہا تھا...... ممی اپنے کاموں اور میٹنگز میں مصروف تھیں...... ڈیڈی ملک سے باہر گئے تھے اور سمیر اپنے دوستوں کے ساتھ آؤٹنگ کے لئے شہر سے باہر گیا تھا۔ وہ سارا دن گھر میں رہا۔ خاص طور پر اپنے کمرے میں بیڈ پر لیٹ کر زل کے بارے میں

سوچتا رہا...... آج اسے دیکھا نہ تھا...... اور اس کے بے قرار دل کو قرار نہیں مل رہا تھا...... اس نے کئی بار موبائل پر اس کا نمبر ملانا چاہا مگر کچھ سوچ کر موبائل آف کر دیتا...... سارا وقت وہ یہی کچھ کرتا رہا جب اچانک روشنی کا فون آ گیا۔ وہ اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی اور وہ اسے اپنی یونیورسٹی کے بارے میں بتاتا رہا...... وہ بہانے سے سب دوستوں کے بارے میں پوچھتا رہا وہ بھی سب کے بارے میں بتاتی رہی سوائے زل کے...... اور وہ زل کے ذکر کے بغیر سب کے بارے میں اس کی گفتگو لاپرواہی سے سنتا رہا۔

''شہیر...... تم......؟'' روشنی نے معنی خیز انداز میں کچھ کہنا چاہا اور پھر ایک دم خاموش ہو گئی۔

''ہاں...... کہو...... کیا بات ہے؟'' شہیر نے چونک کر پوچھا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر جیسے اپنے ہی سوال پر غور کر رہی ہو۔

''کہو...... کیا بات ہے؟'' شہیر نے دوبارہ پوچھا۔

''کچھ نہیں......'' روشنی مدہم لہجے میں بولی۔

''روشنی ہم اچھے دوست ہیں...... اور دوستی بہت انمول رشتہ ہے...... اور اچھے دوستوں سے ہم وہ سب کچھ شیئر کرتے ہیں جو بعض اوقات اپنے بہن بھائیوں سے بھی چھپاتے ہیں...... یو...... کین ٹرسٹ می (تم مجھ پر اعتبار کر سکتی ہو) اور اپنی ہر بات شیئر کر سکتی ہو......'' شہیر نے قدرے اپنائیت سے کہا تو روشنی کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی...... اس کا دل یوں خوشی سے سرشار ہو گیا جیسے بنجر زمین بارش کی پہلی پھوار پر مسرور ہوتی ہے اور اسے دل و جان کی گہرائیوں سے خوش آمدید کہتی ہے...... روشنی بھی چند لمحے پہلے بنجر زمین کی طرح مضطرب تھی...... کچھ کہنا اور سننا چاہتی تھی مگر اپنے دل کی بات اپنی زبان سے نہیں کہہ سکتی تھی...... نجانے شہیر کو خود بخود کیسے پتہ چل گیا...... یا محبت کرنے والے خود بخود دلوں تک رسائی پا لیتے ہیں اور بن کہے سب کچھ جان لیتے ہیں اور بن سنے سب کہہ دیتے ہیں۔ شہیر نے بھی روشنی کے کہے سنے بغیر اس کے دل کی بات جان لی تھی اور ایسی اپنائیت کا اظہار کیا تھا کہ وہ باغ باغ ہو گئی۔ اس کی آواز میں ایک دم کھنک سی پیدا ہو گئی...... اور...... مارے خوشی کے اس سے بولنا دشوار ہو گیا۔

''تھینک...... تھینک یو...... شہیر......'' وہ بمشکل بولی۔

''کس بات کا......؟'' شہیر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''اتنا اعتماد دینے کا...... اور اعتبار کرنے کا'' روشنی نے کہا۔

''کم آن...... فرینڈز میں یہ تھینکس وغیرہ نہیں ہونا چاہیے'' شہیر نے کہا اور دونوں کافی دیر باتیں کرتے رہے۔

☆

سمیرا آؤٹنگ سے گھر لوٹا تو گھر میں پھر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ کئی دنوں سے چھائی اداسی کے بادل چھٹ گئے...... کچھ لوگوں کو قدرت نے اتنا اہم بنایا ہوتا ہے کہ ان کے وجود کی برکت سے فضا بھی مہک اٹھتی ہے اور ماحول بھی پر رونق ہو جاتا ہے اس کی ذات میں ایسی مقناطیسی کشش ہوتی ہے کہ نہ چاہتے ہوئے بھی لوگ ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں...... انہیں سننا چاہتے ہیں...... ان سے کچھ کہنا چاہتے ہیں اور ان کی کمپنی انجوائے کرنا

چاہتے ہیں..... سمیر کی ہنستی مسکراتی شخصیت..... اس کی مزیدار کھٹی میٹھی باتیں ہر محفل کو کشتِ زعفران بنا دیتیں..... جو بھی اس سے ایک بار ملتا..... کبھی نہ بھولتا..... اور دوبارہ ملنے کی خواہش ضرور کرتا..... اس کی انسان دوستی اور ہمدردانہ رویہ اور ملنساری ہر ایک کو اسے چند لمحوں میں دوسروں کو اس کے قریب لے آتی..... شہیر کو کالج سے چھٹیاں تھیں اور وہ زیادہ تر اپنے کمرے میں..... یا اپنے اسٹوڈیو میں مصروف رہتا..... گھر میں اس کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ اکثر وہ کھانا بھی اپنے کمرے میں منگوا لیتا۔ اپنے کام سے اکتاتا تو کسی دوست کی طرف چلا جاتا ورنہ زل کی سوچوں کے ساتھ مصروف رہتا..... وہ اپنے کمرے میں ہوتا تو اسے یوں لگتا جیسے زل اس کے پاس بیٹھی اس سے باتیں کر رہی ہو..... وہ اسے اکثر باتیں کرتی ہوئی محسوس ہوتی..... خود ہی اچانک اسے کوئی جواب دیتا اور پھر خاموش ہو جاتا..... میں کیسی hallucination کا شکار ہونے لگا ہوں..... زل نے میرے دل، میری روح..... میری سوچوں اور جذبوں پر قبضہ کر لیا ہے..... زل کے بغیر ایک ایک پل..... ایک ایک لمحہ گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔

اس کے کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوتی تو وہ یوں چونکتا جیسے وہ دستک زل نے دی ہو..... وہ اس لمحے اسے یہ سوچ رہا تھا..... اس تک رسائی پانے کا کوئی راستہ سوچ رہا تھا..... اور اس کے ذہن میں بار بار روشنی آ رہی تھی..... ہاں روشنی یہ کام کر سکتی ہے، وہ سوچنے لگا۔

شہیر نے بیڈ پر سے چھلانگ لگا کر قدرے پرجوش انداز میں دروازہ کھولا..... سامنے سمیر کھڑا مسکرا رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک گفٹ پیک تھا۔

''اوہ..... آپ'' وہ ایک دم مایوس لہجے میں بولا۔

''شہیر..... تم کیوں چونکے ہو..... کیا کسی اور کو expect کر رہے تھے'' سمیر نے شوخ لہجے میں مسکراتے ہوئے کہا۔

''ن..... نہیں..... نہیں..... تو'' شہیر بوکھلا کر بولا۔

''یار..... لگتا ہے..... کوئی ہے'' سمیر نے چھیڑا۔

''نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں'' شہیر نے بوکھلا کر نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے..... اگر نہیں..... تو..... نہ سہی۔ اگر کوئی ہوتی تو تمہاری جان کو روگ ہی لگا دیتی..... اچھا ہے..... بچے ہوئے ہو.....'' سمیر نے ہنستے ہوئے کہا۔

شہیر کے چہرے پر سنجیدگی سی چھا گئی۔

''آپ سنائیں..... ٹرپ کیسا رہا؟'' شہیر نے بات کا رخ موڑا۔

''ونڈرفل..... بہت انجوائے کیا..... واپسی پر دو روز تیمور ماموں کے پاس ٹھہرا..... حرا..... حنا اور حارث کے ساتھ بہت مزا آیا..... کیا تم کبھی ان کی طرف گئے ہو؟'' سمیر نے پوچھا۔

''نہیں..... کافی عرصہ ہو گیا ہے..... شاید چھ سات سال یا اس سے بھی زیادہ..... ان لوگوں کی آج کل کیا ایکٹوٹیز ہیں؟'' شہیر نے پوچھا۔

''حرا میڈیکل مکمل کرنے کے بعد ایک ہاسپٹل میں ہاؤس جاب کر رہی ہے۔ حنا ماس کمیونیکیشن میں ماسٹرز کر رہی ہے اور حارث ایروناٹیکل انجینئرنگ کر رہا ہے...... ایئر فورس میں ہے...... اتفاق سے ان دنوں چھٹیوں پر گھر آیا تھا...... میرے فرینڈز تو واپس آگئے مگر میں وہیں رک گیا...... وہ لوگ مجھے آنے ہی نہیں دے رہے تھے...... میں بھی بہت عرصے بعد گیا تھا...... ان لوگوں نے اتنی محبت اور چاہت سے استقبال کیا کہ رکنا پڑ گیا...... اور...... یہ میں تمہارے لئے لایا ہوں'' سمیر نے اسے گفٹ پکڑاتے ہوئے کہا۔

''تھینکس...... اس کی کیا ضرورت تھی'' شہیر نے بے دلی سے پکڑ کر اسے ٹیبل پر رکھ دیا۔

''شہیر...... کیا زندگی محبت کے بغیر ممکن ہے؟...... '' سمیر نے قدرے سنجیدگی سے پوچھا۔

''کیا مطلب......؟'' شہیر نے چونک کر یوں پوچھا جیسے سمیر نے باتوں باتوں میں اس کے دل میں چھپی کوئی تصویر دیکھ لی ہو یا کوئی تحریر پڑھ لی ہو۔

''قدرت نے انسانوں کو محبت کے ذریعے جوڑا ہے زندگی میں محبت نہ ہو تو زندگی بے رونق ہو جائے...... اور کسی کو کسی کا احساس نہ رہے...... ہم دونوں کے درمیان فطری محبت ہے...... جو وقتی طور پر دب تو جائے گی...... مگر کبھی ختم نہیں ہوگی...... محبت کبھی ختم نہیں ہوتی...... انسان اس کو ختم کرنا بھی چاہے تب بھی اس کے نقوش کبھی مٹ نہیں پاتے...... اور...... ایسے تحائف محبت کو بڑھا دیتے ہیں...... تم چاہو یا نہ چاہو...... سمجھو یا نہ سمجھو...... ہمارے درمیان محبت بہت گہری ہے اور کبھی ختم نہیں ہوگی'' سمیر نے نرم لہجے میں قدرے محبت سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو شہیر خاموشی سے اسے دیکھنے لگا۔

''اس لئے...... تھینکس کہنے کی ضرورت نہیں...... بس اس محبت کو محسوس کرنا جو میں تم سے کرتا ہوں...... اور ممی بھی تم سے بہت محبت کرتی ہیں...... تم کبھی بھی منفی سوچ اپنے ذہن میں نہ لانا'' سمیر نے کہا تو شہیر نے چونک کر اسے دیکھا۔

''میں آپ کی محبت پر اعتبار کرتا ہوں مگر ممی کی محبت پر نہیں'' شہیر نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔

''کیا...... کہا؟ تمہیں ممی کی محبت پر اعتبار نہیں...... اپنی ماں کی محبت پر...... جن کے پاس ہم دونوں کے سوا اور کوئی اولاد نہیں...... ممی ہم لوگوں کے بارے میں کس قدر پوزیسو ہیں...... شاید تم جانتے نہیں'' سمیر نے حیرت سے کہا۔

''یہ سب کچھ آپ اپنے بارے میں تو کہہ سکتے ہیں مگر میرے بارے میں نہیں'' شہیر نے کہا۔

''کیوں......؟'' سمیر نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

''ممی کا رویہ...... ممی کی محبت...... مجھ سے ویسی نہیں جیسی آپ سے ہے...... اور مجھے وہ سب لمحے یاد ہیں جب ممی ہر بات میں آپ کی فیور کرتی تھیں...... یہ حقیقت ہے ممی کو آپ سے بڑھ کر دنیا میں اور کوئی عزیز نہیں......'' شہیر نے آہ بھر کر کہا۔

''پلیز...... شہیر ایسا مت سوچو...... یہ سب تمہاری غلط فہمی ہے'' سمیر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... پہلے میں بھی یہی سوچتا تھا مگر اب مجھے یقین ہو گیا ہے...... اور یہ یقین وقت کے ساتھ مزید پختہ ہو گیا ہے...... آپ خود اپنی

آنکھوں سے بھی اس کا مشاہدہ کر لینا..... "شہیر نے قدرے ٹھوس لہجے میں کہا تو سمیر خاموش ہو کر اس کے کمرے سے باہر نکل آیا مگر شہیر کی باتوں سے اس کا دل بہت مضطرب ہونے لگا۔

☆

شہیر کا دل انتہائی پریشان ہو رہا تھا اور وہ انتہائی بے قراری میں اپنے کمرے کا چکر لگا رہا تھا۔ نجانے اسے سوئے ہوئے کیا ہوا تھا کہ وہ نیند سے بیدار ہوتے ہی بے قرار ہو گیا تھا۔ دل بے قراری سے مضطرب ہو کر اس کے سینے سے باہر آنے کو مچل رہا تھا۔ زل اسے بہت یاد آ رہی تھی۔ اس نے اس کا نمبر ملانا چاہا مگر پھر ارادہ ترک کر دیا۔ وہ کیا کرے کہ کس طرح زل تک رسائی پا سکے اور اس سے اس کا جواب پوچھے۔ وہ انتظار کرتے کرتے تھک گیا تھا اور یہ انتظار اب ایسی بے قراری میں بدل رہا تھا جس نے اس کے دل ودماغ میں ایسی مدہم آگ سلگائی ہوئی تھی جو کسی بھی پل بجھ نہیں رہی تھی..... دبی چنگاریوں کی مانند اس کے دل کو سلگاتی رہتی اور اس مدہم آگ کا دھواں اس کے دماغ کو یوں مضطرب رکھتا جیسے بند کمرے میں کوئی چھوٹا سا سوراخ بھی نہ ہو بلکہ ہر طرف گھٹن ہی گھٹن ہو اور ایسی گھٹن میں سانس لینا محال ہو جائے..... اس کا دل ودماغ مسلسل سلگتے اور مضطرب رہتے..... دو ماہ ہو گئے ہیں..... مگر زل نے ابھی تک اس سے کوئی ایسی بات نہ کی تھی..... جس کو وہ سننے کے لئے بے تاب تھا..... مگر اس کا دل مطمئن تھا..... کہ زل اسے پسند کرتی ہے..... اگر وہ اسے ناپسند کرتی ہوتی..... تو..... اسی لمحے اسے مسترد کر دیتی..... وہ بھی اس سے محبت کرتی ہے..... شاید اپنی اہمیت جتلانے کے لئے اس نے اسے یوں انتظار میں رکھا ہے..... اس کا دل پھر اسے مطمئن کرتا..... اسے بہت ہی تسلیاں دیتا..... مگر اتنی تسلیوں کے باوجود تھوڑی دیر بعد وہ پھر بے قرار ہو جاتا۔

"جو بھی ہے..... اسے مجھ سے تو شیئر کرنا چاہیے..... آئی ایم سک آف دس ویٹ" اس نے گہری سانس لیتے ہوئے سوچا۔

ایک ایک لمحہ..... ایک ایک پل گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے تنگ آ کر روشنی کو فون کیا۔ کافی بیلز کے بعد اس نے فون اٹھایا۔

"ہائے شہیر..... کیسے ہو..... میں تمہیں ہی فون کرنے والی تھی..... یقیناً تمہیں بھی اس خبر کا پتہ چل گیا ہوگا..... "روشنی نے قدرے پر جوش آواز میں کہا۔ اس کی آواز میں بے انتہا خوشی کا عنصر نمایاں تھا۔

"کیسی خبر.....؟" شہیر نے حیرت سے پوچھا۔

"زل کی....." روشنی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"زل کی..... کیا ہوا زل کو.....؟" شہیر نے بے صبری سے پوچھا۔

"لو..... سب کو معلوم ہو گیا ہے..... اور..... تمہیں خبر ہی نہیں ہوئی" روشنی نے کہا تو وہ جھنجلانے لگا۔

"بھئی..... نہیں پتہ چلا نا..... اب تم ہی بتا دو" وہ خفگی سے بولا۔

"زل..... ارسلان سے شادی کر رہی ہے..... دونوں کی منگنی ہو گئی ہے" روشنی نے خوشی سے بتایا۔

شہیر کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی..... اور دل کی دھڑکن اس قدر تیز ہو گئی..... جیسے پورے کمرے میں سوائے دل کے دھڑکنے

کی.....کوئی.....اور آواز نہ ہو۔ روشنی.....ہیلو.....ہیلو.....کہتی رہی.....مگر دوسری جانب سے کوئی آواز نہ آرہی تھی.....اور نہ ہی فون بند ہوا تھا.....

''ہیلو.....ہیلو.....شہیر.....کہاں ہو.....کیا تم مجھے سن رہے ہو؟'' روشنی نے حیرت سے پوچھا مگر دوسری جانب سے کوئی آواز نہ آرہی تھی۔ اس نے کال آف کر کے اس کا نمبر ملایا مگر شہیر کا موبائل آف ہو چکا تھا۔

## (۲)

''ڈاکٹر دانش...... آج میں آپ کی زندگی یعنی آپ کی کامیابیوں اور آپ کی پرسنل لائف کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں......'' ڈاکٹر رابرٹ نے سیشن کے دوران بہت دوستانہ انداز میں ڈاکٹر دانش سے کہا جو بلیو کلر کے تھری پیس سوٹ کے اوپر بلیک لانگ کوٹ پہنے ان کے سامنے کرسی پر بیٹھے تھے۔

''کیوں......؟'' ڈاکٹر دانش نے قدرے خشک لہجے میں پوچھا۔

''یونہی...... مجھے لائق، ذہین اور کامیاب لوگوں کی جدوجہد کے بارے میں جاننا اور پڑھنا اچھا لگتا ہے'' ڈاکٹر رابرٹ نے ان کے بدلتے ہوئے موڈ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ کسی اچھی لائبریری میں چلے جایئے ...... آپ کو بہت سی کتابیں مل جائیں گی..... میرے پاس آپ کے لئے فضول ٹائم نہیں'' ڈاکٹر دانش غصے سے جاتے ہوئے بولے۔

''پلیز ڈاکٹر دانش...... آپ بیٹھیے...... آپ مجھے اپنا دوست سمجھئے'' ڈاکٹر رابرٹ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''دوست......؟ دنیا میں کوئی کسی کا دوست نہیں ہوتا اور مجھے کسی پر بھی ٹرسٹ (اعتبار) نہیں'' ڈاکٹر دانش نے کہا۔

''کیوں......؟'' ڈاکٹر رابرٹ نے پھر پوچھا۔

''آپ سوال بہت پوچھتے ہیں...... کیا آپ کسی سکول میں ٹیچر ہیں؟'' ڈاکٹر دانش انہیں غصے سے گھورتے ہوئے بولے۔

''ہاں...... ایسا ہی سمجھ لیجئے'' ڈاکٹر رابرٹ نے مفاہمت کے انداز میں کہا۔

''اگر آپ ٹیچر ہیں تو بہت ناکام ٹیچر ہیں...... '' ڈاکٹر دانش نے کہا۔

''کیا مطلب......؟'' ڈاکٹر رابرٹ نے ایک دم چونک کر پوچھا۔

''آپ میرے ہر سوال کا جواب واضح انداز میں نہیں دیتے''۔

''آپ ٹیچر ہیں یا نہیں......؟'' ایک بات کریں...... آپ نے کہا۔ ''ایسا ہی سمجھ لیجئے'' ویری نان سینس آنسر (بہت احمقانہ جواب ہے) ڈاکٹر دانش نے اپنی بارعب آواز میں انہیں قدرے ڈانٹتے ہوئے کہا تو ڈاکٹر رابرٹ بوکھلا گئے وہ بھی کم و بیش ان کے ہم عمر تھے۔ اپنے پیشے میں انہوں نے بہت نام اور عزت کمائی تھی۔ انتہائی بیمار اللہ بن مریض بھی ان سے اتنے بارعب اور تلخ لہجے میں بات نہیں کرتے تھے جس طرح ڈاکٹر دانش ان کو ان کی باتوں پر سرزنش کر رہے تھے۔

"مجھے بتائیے...... آپ ٹیچر ہیں یا نہیں؟" ڈاکٹر دانش نے پھر بارعب انداز میں پوچھا۔

"یس...... آئی ایم...... آئی ایم ٹیچر" ڈاکٹر رابرٹ نے بمشکل جواب دیا۔

ڈاکٹر دانش ان کی جانب بغور دیکھنے لگے۔ یوں جیسے کوئی بات یاد کر رہے ہوں یا پھر ان کے دماغ میں کوئی تبدیلی آ رہی ہو۔ ڈاکٹر رابرٹ بھی ان کی جانب بغور دیکھنے لگے۔ ان کے لئے ڈاکٹر دانش کی خاموشی اور چہرے پر ابھرتے مختلف تاثرات سے وہ مختلف اندازے لگانے کی کوشش کر رہے تھے۔

"ڈاکٹر رابرٹ...... میں نے بہت کوشش کی مگر ڈاکٹر دانش کے ماضی کے بارے میں ایک بات بھی نہیں جان سکا۔ وہ بہت ہوشیار انسان ہیں...... شاید میری باتوں سے ہی وہ میرا ارادہ بھانپ لیتے ہیں ...... مجھے یقین ہو گیا ہے میں ان سے کچھ بھی نہیں اگلوا سکوں گا۔" ہی از ویری ڈفرنٹ اینڈ ٹف مین (وہ بہت مختلف اور مشکل انسان ہیں)" علی موسیٰ نے ایک روز پہلے ڈاکٹر رابرٹ کو فون پر بتایا تھا اور اب ڈاکٹر رابرٹ کو بھی یقین ہونے لگا تھا کہ ان کے لئے بھی ڈاکٹر دانش تک پہنچنا بہت مشکل تھا۔

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ ایک ٹیچر کو کیسا ہونا چاہیے؟" ڈاکٹر دانش نے ڈاکٹر رابرٹ کی پرسنالٹی کا بغور جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"کیسا ہونا چاہیے...... ؟" ڈاکٹر رابرٹ نے آہستہ آواز میں پوچھا۔

"آپ جیسا بالکل بھی نہیں" ڈاکٹر دانش نے قدرے ترش لہجے میں انہیں دیکھ کر اپنے چہرے پر ناگواری کے تاثرات لاتے ہوئے کہا۔

"وہاٹ...... ڈو...... یو...... مین؟" ڈاکٹر رابرٹ بوکھلا کر بولے۔

"ایک ٹیچر کو بہت کونفیڈنٹ...... الرٹ...... انٹیلی جنٹ اور ویل انفارمڈ ہونا چاہیے۔ اسے اپنے اسٹوڈنٹس کی ہوشیاریاں، مکاریاں اور چوریاں موقع پر پکڑنی چاہئیں۔ آپ ایک ناکام ٹیچر ہیں...... آپ کو معلوم ہی نہیں ہوا اور میں نے ٹیبل سے آپ کا پن چرا لیا...... یہ لیجئے اپنا پن...... اور...... آئندہ مجھ سے ہوشیار رہیے گا بلکہ ہر کلاس میں جا کر الرٹ رہیے گا...... بلکہ میرا خیال ہے آپ کو ٹیچنگ سے فارغ کر دینا چاہیے...... آپ بہت ناکام ٹیچر ہیں مجھے آپ کے پرنسپل کو انفارم کرنا چاہیے...... آپ کیا اپنے اسٹوڈنٹس کو سکھائیں گے...... آپ کو خود ہی کچھ معلوم نہیں ہو پاتا" اور ڈاکٹر دانش اپنے کوٹ کی جیب میں سے ڈاکٹر رابرٹ کا پارکر کا پن ان کی طرف بڑھا کر کھلکھلا کر ہنسنے لگے اور ان کے تلخ و ترش ریمارکس سے ڈاکٹر رابرٹ تلملانے لگے۔ انہیں ڈاکٹر دانش پر غصہ آنے لگا تھا مگر وہ بہت مشکل سے اپنا غصہ ضبط کئے بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر رابرٹ کے چہرے پر غصے کے تاثرات نمایاں ہونے لگے تھے مگر وہ خاموش رہے۔

"پلیز ڈاکٹر دانش...... لیو اٹ (اسے چھوڑیے) اور مجھے اپنی کامیابیوں کے بارے میں کچھ بتائیے...... آپ نے نیورالوجی کی فیلڈ میں بہت ریسرچ کی ہے۔ سنا ہے آپ کچھ خاص قسم کی ویکسینیشن تیار کر رہے تھے...... کیا ہوا...... کیا آپ نے اپنی ریسرچ ادھوری چھوڑ دی؟" ڈاکٹر رابرٹ نے ان کے ریسرچ پیپرز کی فائل کو پڑھنے کے بعد سوال کیا تھا جو انہیں چند روز پہلے علی موسیٰ نے رازدارانہ انداز میں ڈاکٹر دانش کی چیزوں میں سے نکال کر دی تھی۔

''کونسی ریسرچ......اور کیسی ویکسینیشن......؟میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا اور نہ ہی کرنا چاہا تھا......آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے'' ڈاکٹر دانش نے حیرت سے انہیں دیکھتے ہوئے قطعی لاپرواہی کا اظہار کیا۔

''پلیز......ڈاکٹر دانش......آپ یاد کریں کہ ماضی میں آپ ایک ماہر اور کامیاب نیورو سرجن تھے......کیا آپ کو یاد آیا......؟'' ڈاکٹر رابرٹ نے بھی اپنی مضبوط آواز میں الفاظ چبا چبا کر کہا۔

''میں fake ڈاکٹر تھا جیسا کہ آپ fake نیچر ہیں'' ڈاکٹر دانش نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تو ڈاکٹر رابرٹ ان کا جواب سن کر زچ ہونے لگے۔

''ڈاکٹر دانش...... مجھے آپ کا تعاون چاہیے'' ڈاکٹر رابرٹ نے مفاہمت کے انداز میں کہا۔

''کیوں......؟'' ڈاکٹر دانش نے حیرت سے پوچھا۔

''آپ ایک ذہین اور لائق انسان ہیں۔آپ نے بہت مصروف زندگی گزاری ہے......میں چاہتا ہوں کہ آپ پہلے کی طرح نارمل زندگی گزاریں۔اپنی ٹھوس شخصیت کے ساتھ باعزت انداز میں'' ڈاکٹر رابرٹ نے جواب دیا۔

''ڈاکٹر......انسان کی کوئی عزت نہیں......کہیں بھی نہیں ہی از اے اسٹوپڈ......میڈ (پاگل) اینڈ ابنارمل ایوری ویئر (ہر جگہ ابنارمل ہے) آپ خود بھی نارمل نہیں......مجھے کیسے نارمل بنائیں گے؟'' ڈاکٹر دانش نے بھرپور قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تو ڈاکٹر رابرٹ پریشان ہو گئے۔

''ڈاکٹر......آپ کا بچپن کیسا گزرا......؟'' ڈاکٹر رابرٹ نے قدرے توقف کے بعد اپنے موڈ کو نارمل کرتے ہوئے پوچھا۔

''کیا آپ کا بچپن بندروں یا جانوروں جیسا گزرا ہے جو آپ مجھ سے یہ نان سینس سوال پوچھ رہے ہیں......؟ آپ کو کس نے سائیکاٹرسٹ بنایا۔آپ کا اپنا دماغ ٹھیک طرح سے کام نہیں کر رہا'' ڈاکٹر دانش نے طنزیہ انداز میں کہا تو ڈاکٹر رابرٹ غصے میں اپنی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''ڈاکٹر دانش کیا آپ ٹھیک نہیں ہونا چاہتے......مجھے یہ بات صاف صاف بتائیے؟'' ڈاکٹر رابرٹ نے ان کے قریب آ کر کہا۔

''آئی ایم ہنڈرڈ پرسنٹ آل رائٹ......اور......بائی دا وے......کیا آپ مجھے ٹھیک کریں گے......آپ......خود تو......'' ڈاکٹر دانش نے پھر ان کو زچ کرنا چاہا۔

''مجھے چھوڑیے......اپنی بات کیجئے......'' ڈاکٹر رابرٹ نے بھی قدرے سخت لہجے میں کہا۔

''میں بیمار ہو کر بھی آپ کے پاس آنا پسند نہیں کروں گا'' ڈاکٹر دانش نے ٹھوس لہجے میں کہا اور ڈاکٹر رابرٹ کی جانب بغور دیکھتے ہوئے اپنے لانگ کوٹ کے بٹن ٹھیک طریقے سے بند کیے اور ان کے کلینک سے باہر نکل گئے۔

''اوہ......مائی گاڈ......یہ کیسا انسان ہے......اس قدر عجیب انسان......میں نے آج تک نہیں دیکھا میں اس کا علاج کبھی نہیں کر پاؤں گا'' ڈاکٹر رابرٹ نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے انتہائی مایوسی سے سوچا اور آنکھیں بند کر کے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا دی۔

تھوڑی دیر کے بعد ان کا موبائل بجنے لگا...... کافی بیلز کے بعد ڈاکٹر رابرٹ نے موبائل کان سے لگایا۔ دوسری جانب علی موسیٰ تھے۔ ان کی آواز میں قدرے خوشی اور جوش تھا۔ "ڈاکٹر رابرٹ...... ایک گڈ نیوز ہے...... آج ڈاکٹر دانش کے موبائل پر ان کے ملک سے ایک کال ریسیو ہوئی ہے۔ کوئی ڈاکٹر محسن زیدی تھے ان کے دوست، وہ ڈاکٹر دانش کے بارے میں پوچھ رہے تھے...... میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر دانش کے کیس کے سلسلے میں وہ آپ کی مدد کر سکتے ہیں" علی موسیٰ نے کہا تو ڈاکٹر رابرٹ نے بھی تجسس ہو کر ان کی بات سنی۔ وہ چند لمحے قبل ڈاکٹر دانش کے رویے سے اس قدر متنفر اور بیزار ہو گئے تھے کہ انہوں نے ان کا کیس چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر اب علی موسیٰ کے بتانے پر وہ پھر متحرک ہو گئے تھے اور انہوں نے یکدم اپنا ارادہ بدل لیا تھا۔

"اب انہیں ضرور ڈاکٹر دانش تک جانے کا راستہ مل جائے گا......" انہوں نے سوچا اور مطمئن ہونے لگے۔

"آپ مجھے وہ نمبر لکھوایئے جس نمبر سے کال ریسیو ہوئی ہے" ڈاکٹر رابرٹ نے کہا تو علی موسیٰ نے انہیں جلدی سے وہ نمبر لکھوایا۔

"میں ڈاکٹر محسن سے بات کرتا ہوں" ڈاکٹر رابرٹ نے فون بند کرتے ہوئے کہا اور ڈاکٹر محسن زیدی کا نمبر ملایا اور ان سے باتیں کرنے لگے۔ ڈاکٹر زیدی، ڈاکٹر دانش کے بارے میں جان کر تاسف کا اظہار کرنے لگے۔ ان کے چہرے پر دکھ اور پریشانی کے تاثرات نمایاں ہونے لگے۔

"ڈاکٹر رابرٹ...... ہمیں ڈاکٹر دانش کو بچانا ہے۔ اگر ان کی خاطر مجھے انگلینڈ بھی آنا پڑا تو میں آؤں گا......" ڈاکٹر محسن زیدی نے انتہائی سنجیدگی سے جواب دیا۔ "ابھی تو مجھے ان کے بارے میں کچھ انفارمیشن چاہیے اگر ضرورت پڑی تو میں آپ کو ضرور انوائیٹ کروں گا" ڈاکٹر رابرٹ نے کہا۔

اور ڈاکٹر زیدی ان کو اس کیس کے بارے میں بتانے لگے جس کے بعد ڈاکٹر دانش ملک چھوڑ کر چلے گئے تھے اور پھر پلٹ کر نہیں گئے تھے۔

"آئی سی...... اٹس ویری ٹریجک...... مجھے اس کیس کے بارے میں تفصیلات چاہئیں اور کچھ ان کے فیملی بیک گراؤنڈ کے بارے میں بھی انفارمیشن چاہیے" ڈاکٹر رابرٹ نے کہا۔

"آف کورس...... میں آپ کو ضرور سب کچھ provide کروں گا" ڈاکٹر زیدی نے کہہ کر فون بند کر دیا۔

ڈاکٹر رابرٹ بہت خوش تھے...... انہیں ایسا شخص مل گیا تھا جس کے ذریعے وہ اس چیلنجنگ کیس کو اچھے طریقے سے ہینڈل کر سکتے تھے۔ وہ بہت گہرائی میں اس کیس کے بارے میں سوچنے لگے جس نے ڈاکٹر دانش کی زندگی کو بدل دیا تھا جس سے ان کی پرسنالٹی split ہو گئی تھی۔

☆

"میڈم...... مسٹر شیر افگن لائن پر ہیں...... ان سے بات کیجیے" ٹیلی فون آپریٹر نے فریحہ کو اطلاع دی اور اس کو آن لائن کیا۔

"ہیلو...... شیر افگن اسپیکنگ" شیر افگن نے مسکرا کر کہا۔

"ہیلو...... آئی ایم فریحہ درانی" فریحہ نے اپنا تعارف کرایا۔

"میں سیکرٹری پلاننگ اینڈ منیجمنٹ ڈیپارٹمنٹ سے بات کر رہا ہوں...... ایک نیشنل بلڈنگ کی مرمت کا کنٹریکٹ ہم آپ کی کمپنی کو دینا چاہتے ہیں۔ کروڑوں کا کنٹریکٹ ہے مگر کام تین ماہ کے اندر مکمل ہونا چاہیے۔ اگر آپ رضامند ہیں تو میرا پی اے آپ کے پاس کنٹریکٹ لے کر آ

جائے گا" شیر افگن نے کہا تو فریحہ چونک گئی۔

"میری کمپنی نے ابھی اتنے large scale (وسیع پیمانے) پر کام شروع نہیں کیا۔ ہم تو چھوٹے پراجیکٹس کرتے ہیں، آئی مین...... گھروں کے پراجیکٹس" فریحہ کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔

"میڈم...... ہمیں سب انفارمیشن ہے اور ہمارے پاس بہت بڑی کمپنیوں کے ٹینڈرز بھی موجود ہیں اور یہ پراجیکٹ حاصل کرنے کے لئے لوگ ہمارے پیچھے بھاگ رہے ہیں مگر یہ کام ایسا ہے جس میں بہت ایمانداری اور لگن چاہیے...... ہم نے آپ کے سارے پراجیکٹس کو اچھی طرح آبزرو کرنے کے بعد یہ پراجیکٹ آپ کو دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ ...... اس نیشنل بلڈنگ کا وقار بحال ہونے سے آپ کی کمپنی کتنی ترقی کرے گی...... شاید آپ کو اس کا اندازہ نہیں" شیر افگن نے شستہ لہجے میں کہا۔

"وہ تو سب ٹھیک ہے...... مگر اس کام کے لئے بہت پلاننگ، بہت وقت اور لیبر چاہیے...... آپ ٹائم بھی تھوڑا دے رہے ہیں اور کام بھی ہنڈرڈ پرسنٹ پرفیکٹ چاہتے ہیں...... ہماری اپنی limitation ہیں...... سب کو دیکھتے ہوئے مجھے اس پراجیکٹ کے بارے میں فیصلہ کرنا ہو گا" فریحہ نے بہت سنجیدگی سے جواب دیا۔

"میڈم پلاننگ اور لیبر کا فیصلہ آپ کو کرنا ہو گا...... البتہ ٹائم کے بارے میں میں آپ کو relaxation دے دوں گا...... اس کے علاوہ میں آپ کی ہر طرح سے مدد کروں گا۔ جو آپ کو کام کے سلسلے میں چاہیے ہو گی" شیر افگن نے کہا۔

"ٹھیک ہے...... میں ایک دو روز میں سوچ کر بتاؤں گی" فریحہ نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"ایک دو روز نہیں...... صرف ایک روز آپ کے پاس ہے، کل آپ نے مجھے اپنے فیصلے کے بارے میں بتانا ہو گا" شیر افگن نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

"رائٹ......" فریحہ نے زیر لب مسکرا کر جواب دیا اور فون بند کر دیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے عاصم گھومنے لگا۔ اس نے عاصم کی وجہ سے کبھی کسی بڑے پراجیکٹ کے بارے میں نہیں سوچا تھا ورنہ مارکیٹ میں اس کی کمپنی کو بہت اچھی شہرت تھی اور لوگ خود اس سے رابطے کرتے تھے مگر وہ ہر بڑے پراجیکٹ کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیتی کہ اس کے پاس وقت نہیں جبکہ اس کے کولیگز بھی اس پر اعتراض کرتے تھے مگر وہ خاموش رہتی۔ اس نے عاصم کے بارے میں بہت کم لوگوں کو بتا رکھا تھا۔ وہ جب بھی کسی سے عاصم کے بارے میں ذکر کرتی تو لوگ انتہائی حیرت اور قابل ترس نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتے اور ان لمحات میں اسے یوں محسوس ہونے لگتا جیسے وہ بہت بے بس اور مجبور ہو...... اور اپنی اس لاچاری اور بے بسی کا اس کے پاس کوئی جواز نہ ہو۔

وہ پریشانی سے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے ایک دو منزلہ کوٹھی کا بہت بڑا نقشہ پڑا تھا اور وہ اس کی کھڑکیوں، دروازوں کی ڈائریکشن کو انتہائی توجہ سے دیکھ رہی تھی۔ جب شیر افگن کا فون آیا تھا اور اس کے بعد اس کی سوچیں اور ذہن منتشر ہو گیا تھا۔

اس کا ایک سینئر اسسٹنٹ مرتضٰی بیگ اس کے آفس میں داخل ہوا اس نقشے کو دیکھتے ہوئے کچھ اور سوچتے ہوئے وہ حیرت سے اس کی

جانب دیکھنے لگا۔

''میڈم...... خیریت تو ہے...... سنا ہے...... ہماری کمپنی کو بہت بڑا پراجیکٹ مل رہا ہے...... مبارک ہو...... یہ تو بہت خوشی کی بات ہے'' مرتضیٰ بیگ نے خوش کن انداز میں کہا۔

''آپ کو کس نے بتایا ہے......؟'' فریحہ نے حیرت سے پوچھا۔

''میڈم مجھے ایک آرکیٹیکٹ کا فون آیا تھا...... وہ بتا رہے تھے کہ خبر ہے تو سیکرٹ...... مگر اندر ہی اندر سارے شہر میں پھیل چکی ہے...... وہ تو مجھے مبارکباد بھی دے رہا تھا'' مرتضیٰ بیگ نے خوش ہو کر کہا۔

''مگر...... میں نے تو ابھی کوئی رضامندی ظاہر نہیں کی'' فریحہ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''میڈم...... کیا مطلب...... کیا آپ یہ پراجیکٹ نہیں کریں گی......؟ شاید آپ کو معلوم نہیں کہ یہ پراجیکٹ کم...... ہماری ترقی اور شہرت کا پروانہ زیادہ ہے۔ اس پراجیکٹ کو کرنے سے ہماری کمپنی زمین سے آسمان پر جا پہنچے گی...... آپ اس کو چھوڑنے کا مت سوچیے گا...... یہ بہت بڑا نقصان ہوگا'' مرتضیٰ بیگ نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

''مرتضیٰ آپ صرف ترقی اور شہرت کی بات کر رہے ہیں۔ اس میں...... میں کس حد تک انوالو ہوں گی...... سائٹ وزٹس کے علاوہ کنسٹرکشن اور تمام ٹیکنیکل باتوں کا خیال رکھنا...... مجھے یہ بہت ناممکن نظر آ رہا ہے...... آپ تو سب جانتے ہیں۔ اس پراجیکٹ سے عاصم سب سے زیادہ متاثر ہوگا اور اب میری زندگی صرف عاصم سے وابستہ ہے۔ اس کو نظرانداز کر کے میں یہ پراجیکٹ کیسے کر سکتی ہوں۔ کام کرنا میرے لئے مشکل نہیں...... مشکل عاصم کو سمجھانا ہے۔ جس کو کھانا بھی صرف میں ہی کھلا سکتی ہوں۔ وہ پانی کا ایک گھونٹ بھی کسی دوسرے کے ہاتھ سے نہیں پیتا...... اور جب کبھی میں گھر دیر سے جاؤں تو وہ اس قدر خفا ہو جاتا ہے کہ اس کو منانا مشکل ہو جاتا ہے......'' فریحہ نے پریشان سے کہا۔

''میڈم...... مجبوریاں تو ہر انسان کے ساتھ ہی ہوتی ہیں۔ مجبوریوں کو ساتھ لے کر آگے بڑھنے میں ہی انسان کی کامیابی ہے...... اور یہ پراجیکٹ زیادہ سے زیادہ چار پانچ ماہ میں ختم ہو جائے گا...... اس عرصے کے لئے آپ کوئی ٹرینڈ اٹینڈنٹ عاصم کے لئے رکھ لیں...... بہت سے ایسے لوگ مل جاتے ہیں جن کا تجربہ بھی ہوتا ہے اور جن کو ضرورت بھی ہوتی ہے۔ آپ اخبار میں ایک چھوٹا سا اشتہار دے دیں'' مرتضیٰ بیگ نے کہا تو وہ سوچ میں پڑ گئی۔

''میڈم...... یہ پراجیکٹ ہاتھ سے نہیں جانا چاہیے...... آپ آج ہی سیکرٹری صاحب کو فون کر کے 'یس' کر دیں'' مرتضیٰ بیگ نے قدرے بے صبری سے کہا۔

''ایسی بھی کیا جلدی پڑی ہے کل تک سوچنے اور فیصلہ کرنے کا مجھے ٹائم ملا ہے......'' فریحہ نے کہا۔

''میڈم...... نو...... مور...... تھنکنگ...... جسٹ ڈیسائیڈ اٹ (مزید مت سوچیں...... بس فیصلہ کریں)'' مرتضیٰ بیگ نے کہا تو فریحہ مسکرا کر اس کی جانب دیکھنے لگی۔

عاصم کا قد زیادہ نہیں بڑھا تھا مگر جسم بہت صحت مند تھا۔ چہرے سے وہ نوجوان، صحت مند لڑکا دکھائی دیتا تھا۔ اس کا بھاری بھرکم جسم اماں سے بھی نہیں سنبھالا جاتا تھا اور خود اس سے بھی نہیں۔

وہ آفس سے واپس گھر گئی تو اماں کا موڈ پھر بگڑا ہوا تھا۔

''اماں..... آج کیا ہوا ہے؟ آپ پھر خفا دکھائی دے رہی ہیں'' فریحہ نے بیگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

''بی بی..... اب عاصم میاں کو سنبھالنا میرے بس سے باہر ہے..... آج تو اس نے حد ہی کر دی..... میں جوس پلانے گئی تو ہاتھ مار کر میرے سارے کپڑے خراب کر دیئے اور پھر غصے سے میرے چہرے پر تھپڑ مارنے لگا..... میں نے تو پاگل سمجھ کر برداشت کر لیا..... کوئی اور ہوتا تو ایک منٹ یہاں نہ ٹکتا..... بی بی..... اس کو پاگل خانے میں داخل کرا دو..... دن بدن بگڑتا ہی چلا جا رہا ہے'' اماں غصے سے بولتی رہی اور اماں کے بہت سے الفاظ پر اس کو غصہ بھی آ گیا مگر وہ خاموش رہی۔

''میں جلد کوئی اور بندوبست بھی کرتی ہوں..... مگر آپ یہاں سے جانے کے بارے میں مت سوچیے گا..... اماں..... اس گھر کو..... مجھے.....اور عاصم کو..... آپ کی عادت ہو گئی ہے'' فریحہ نے آہ بھر کر کہا تو اماں بھی اس کی بات سن کر خاموش ہو گئی۔

فریحہ نے اگلے روز آفس جا کر سب سے پہلے اپنے سٹاف کے ساتھ میٹنگ کی اور پراجیکٹ کے بارے میں ڈسکس کیا۔ سب پراجیکٹ کی فیور میں بولے اور سب سے مشورے کے بعد اس نے شیر افگن کو فون کر دیا۔

''میں اپنے اسسٹنٹ کے ساتھ اگریمنٹ سائن کرنے سے پہلے آپ کے ساتھ ایک میٹنگ کرنا چاہتا ہوں'' شیر افگن نے جواب دیا۔

اگلے روز شیر افگن اپنے اسسٹنٹ کے ساتھ سیاہ سرکاری گاڑی میں آیا۔ وہ 45 سالہ خوبصورت، دراز قد، ڈیسنٹ اور باوقار شخصیت کا مالک تھا۔ آفس میں موجود سب لوگ اسے پرستائش نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ بڑی شاہانہ چال چلتا ہوا فریحہ کے آفس میں داخل ہوا..... فریحہ نے بھی پرتپاک انداز میں اس کا استقبال کیا۔ وہ فریحہ کے بارے میں بالکل مختلف امیج لے کر آیا تھا مگر فریحہ بالکل مختلف شخصیت لیے ہوئے تھی۔ وہ دراز قد، سمارٹ، خوبصورت اور انتہائی پرکشش شخصیت کی مالک تھی۔ اس کے لمبے سلکی براؤن بالوں کی ڈھیلی ڈھالی چٹیا اس کی شرٹ سے بھی لمبی تھی۔ اس کی عمر 37 سال تھی مگر وہ اپنی عمر کی نسبت بہت جوان اور کم عمر دکھائی دیتی تھی۔ اس کی سفید بھوری رنگت پر براؤن آئی بروز اور گھنی براؤن خم کھاتی پلکیں، بڑی بڑی براؤن آنکھیں، ستواں ناک اور خوبصورت خم لیے قدرے بھرے بھرے ہونٹ..... وہ انتہائی گریس فل اور خوبصورت دکھائی دیتی تھی۔

فریحہ نے اپنے سینئر کولیگز کو اپنے آفس میں بلایا تھا اور سب شیر افگن سے بریفنگ لے رہے تھے اس کے مینرز اور انداز گفتگو سے اس کے بیک گراؤنڈ کا اندازہ ہو رہا تھا۔ اس کا تعلق پنجاب کے ایک زمیندار گھرانے سے تھا مگر اس نے ساری تعلیم انگلینڈ اور امریکہ سے حاصل کی تھی۔

فریحہ بہت پروفیشنل انداز میں پراجیکٹ کے تمام تکنیکی پہلوؤں کو ڈسکس کر رہی تھی۔ ریزننگ کے لئے وقت اور لیبر کے علاوہ وہ تمام نئی فنی اور آرٹسٹک ٹیکنیکس کے بارے میں بلڈنگ کی پیمائش اور رقبے کو مدنظر رکھتے ہوئے ان سے ڈسکس کر رہی تھی۔ شیر افگن اس کی ذہانت اور پروفیشنل رویے سے بہت متاثر ہو رہا تھا۔

دو گھنٹے کی میٹنگ کے بعد شیر افگن نے اپنے اسسٹنٹ کو اشارہ کیا اور اس نے ایگری منٹ فریحہ کی جانب بڑھایا۔

''ہمیں خوشی ہے کہ ہم نے اس پراجیکٹ کے لئے ٹھیک لوگوں کا انتخاب کیا...... آپ کی ٹیم سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے'' شیر افگن نے فریحہ کی جانب مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔

''تھینک یو......'' فریحہ نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔

''میڈم...... اب یہ آپ پر ہے کہ آپ نئے میٹریل کے ساتھ اولڈ آرٹسٹک ٹچ کو کیسے برقرار رکھتی ہیں'' شیر افگن نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیا یہ آپ کا چیلنج ہے......؟'' فریحہ نے پوچھا۔

''میں چیلنج کو چیلنج نہیں بلکہ توقعات (expectations) کو چیلنج سمجھ کر کام کرنے میں یقین کرتا ہوں...... اور مجھے امید ہے کہ آپ میرا مطلب اچھی طرح سمجھ گئی ہوں گی'' شیر افگن نے ذو معنی انداز میں کہا۔

اور میں چیلنج کو expectations نہیں بلکہ ایڈوینچر کے طور پر لیتی ہوں کیونکہ "Great expectations always go wrong" چاہے یہ توقعات پرسنل لائف میں ہوں یا پروفیشنل لائف میں...... ہمیشہ غلط ثابت ہوتی ہیں اور یہ میرا تجربہ ہے'' فریحہ نے ایگریمنٹ کی فائل پکڑتے ہوئے کہا۔

''انٹرسٹنگ...... میں آپ کی بات کو بھی ویلیو کرتا ہوں۔ بہر حال میں آپ کی پروفیشنل اپروچ سے بہت متاثر ہوا ہوں...... آپ کی سوچ بہت پریکٹیکل ہے اور قدرت نے آپ کو بہت ذہانت سے نوازا ہے...... امید ہے آپ کے ساتھ کام کرنے سے میرے علم اور تجربہ میں مزید اضافہ ہوگا'' شیر افگن نے شستہ انگریزی بولتے ہوئے کہا۔

''تھینکس......'' وہ گہری سانس لے کر قدرے سنجیدگی سے بولی۔

''پراجیکٹ کی آدھی رقم کا چیک کل آپ کو مل جائے گا اور باقی کام مکمل ہونے کے بعد...... اس پراجیکٹ کے لئے فنڈنگ بہت اسٹرونگ ہے۔ اگر ضرورت پڑی تو رقم کام کے دوران بھی مل سکتی ہے...... اس کے علاوہ تمام قسم کی مدد اور تعاون کے لئے میں حاضر ہوں'' شیر افگن نے اٹھتے ہوئے کہا اور فریحہ بھی اپنی پوری ٹیم کیساتھ انہیں رخصت کرنے کے لیے اٹھی۔ شیر افگن اور اس کے اسسٹنٹ کو دروازے تک چھوڑنے آئے۔

''مبارک ہو...... میڈم......'' مرتضیٰ بیگ نے انتہائی خوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا تو وہ مسکرا دی۔

''میڈم...... اس خوشی میں ڈنر ہونا چاہیے'' اس کے اسسٹنٹ شہریار نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''شیور...... لیکن ایک دو روز بعد...... ان دنوں میں ذاتی طور پر مصروف ہوں'' فریحہ نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔

''اوکے...... ایز یو وش'' مرتضیٰ بیگ اس کی ذاتی وجہ کو اچھی طرح جانتے ہوئے کہا۔

فریحہ نے عاصم کے لئے ایک تیس سالہ صحت مند آدمی ساجد کو ملازم رکھا تھا...... اس کے بیوی بچے گاؤں میں رہتے تھے اور وہ نیا نیا شہر آیا تھا...... فریحہ کو وہ بہت مناسب لگا کیونکہ اس کو ابھی شہر سے اتنی واقفیت نہیں تھی اور عاصم کے لئے ایسا ہی ملازم چاہیے تھا جو زیادہ وقت اس کے پاس

رہے۔ اسکے علاوہ ساجد زیادہ پڑھا لکھا بھی نہیں تھا اور دو بچوں کا باپ تھا۔ عاصم کے لئے ایسا ہی شخص چاہیے تھا جو اولاد کی محبت سے سرشار ہو۔ فریحہ نے بہت سوچ سمجھ کر اسے اس کی توقعات سے بھی زیادہ تنخواہ پر ملازم رکھا تھا اور وہ اتنی زیادہ تنخواہ اور تمام سہولتوں کے بارے میں سن کر بے حد خوش ہو گیا تھا۔

''ساجد......آؤ......میں تمہیں اپنے بیٹے سے متعارف کراتی ہوں'' فریحہ ساجد کو لے کر عاصم کے کمرے میں چلی گئی۔

ایک ویل فرنیشڈ کمرے میں ڈبل بیڈ پر ایک برائے نام زندہ وجود لیٹا تھا۔ وہ بے حس و حرکت پڑا منہ سے عجیب و غریب قسم کی آوازیں نکال رہا تھا۔ وہ کبھی اچانک چیختا تو سب ڈر جاتے ......اور کبھی خوش ہو کر گلے سے انتہائی غرغراہٹ کے ساتھ آوازیں نکالتا تو سننے والے گھبرا جاتے......وہ ہاتھ پاؤں کو بھی بہت عجیب انداز میں حرکات دے رہا تھا۔

''یہ میرا بیٹا عاصم ہے...... ساجد آپ اس کو اپنی اولاد کی نظر سے دیکھنا...... یہ صرف محبت کی زبان سمجھتا ہے۔ اس کو ذرا سختی سے بھی چھوا جائے تو یہ ناراض ہو جاتا ہے۔ یہ زبان سے بول نہیں سکتا مگر احساسات کی زبان بہت اچھی طرح سمجھتا ہے...... یہ میری کل کائنات ہے...... یہ میری زندگی کا مقصد ہے میں خود اس کی دیکھ بھال کرتی ہوں مگر کچھ ایسی مصروفیت آ گئی ہے کہ مجھے اس کے لئے ملازم رکھنا پڑ رہا ہے......اماں بھی اس کی دیکھ بھال کرنے میں آپ کی مدد کریں گی۔ وہ سولہ سال سے یہیں ہیں۔ بہت اچھی اور نیک خاتون ہیں۔ وہ آپ کو آپ کی ذمہ داریاں سمجھا دیں گی......میں نے آپ کے لئے سرونٹ کوارٹر صاف کرا دیا ہے آپ کل وہاں شفٹ ہو جائیں'' فریحہ نے قدرے ملائمت سے کہا۔

بیگم صاحبہ......کیا اس کو کھلانا پلانا بھی خود ہی پڑے گا؟'' ساجد نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......اور اس کی صفائی ستھرائی و دوسرے دیگر کام بھی آپ کو کرنے پڑیں گے'' فریحہ نے جواب دیا۔

ساجد کے چہرے پر عجیب سے تاثرات نمودار ہوئے۔

''بیگم صاحبہ...... میں نے تو کبھی اپنے بچوں کی ناک صاف نہیں کی......اس کی صفائی ستھرائی کے کام بھلا کیسے کر پاؤں گا......معاف کریں...... مجھے یہ ملازمت نہیں کرنی'' ساجد نے دوٹوک الفاظ میں کہا تو فریحہ کو جو آس و امید بندھی تھی وہ ایک دم ٹوٹ گئی۔ وہ بہت مایوس ہو گئی اور خاموشی سے ساجد کی جانب دیکھنے لگی مگر وہ اسے روکنا نہیں چاہتی تھی کیونکہ عاصم کی دیکھ بھال کوئی صاحب دل اور خدا خوف انسان ہی کر سکتا تھا۔

ساجد کے جانے کے بعد وہ بہت پریشان ہو گئی۔

''اگر......کوئی ملازم نہ ملا تو پھر میں کیسے سب کچھ manage کر پاؤں گی......اسے کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ رات بھر اس سے اسی پریشانی میں گزری۔

وہ صبح آفس پہنچی تو شیر افگن کے اسسٹنٹ کا فون آ گیا۔ وہ ایگریمنٹ کے بارے میں پوچھنے لگا۔

''میں معذرت چاہتی ہوں کہ میں یہ ایگریمنٹ سائن نہیں کر سکتی'' فریحہ نے آہستہ آواز میں کہا۔

''میڈم...... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں......کل تک تو سب کچھ ٹھیک تھا......پھر اچانک......آپ نے اپنا ارادہ کیوں بدل دیا؟'' اسسٹنٹ

نے حیرت سے پوچھا۔

''میری کچھ پرسنل پرابلمز ہیں'' فریحہ نے کہہ کر فون بند کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد شیر افگن کا فون آ گیا۔

''میڈم...... کیا میں آپ کا ارادہ بدلنے کی وجہ جان سکتا ہوں؟'' شیر افگن نے حیرت سے پوچھا۔

''میری کچھ ایسی ذاتی وجوہات ہیں جن کی بنا پر میں اس پراجیکٹ پر کام نہیں کر سکتی'' فریحہ نے جواب دیا۔

''کیا...... کل تک وہ پرابلمز موجود نہیں تھیں؟'' شیر افگن نے حیرت سے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

''وہ تو سولہ سال سے موجود ہے...... لیکن......'' فریحہ نے آہ بھر کر اداس لہجے میں کہا۔

''کیا میں وہ وجہ جان سکتا ہوں؟ سوری...... یہ ہے تو آپ کا ذاتی معاملہ...... مگر ممکن ہے کہ میں اس سلسلے میں آپ کی کچھ مدد کر پاؤں'' شیر افگن نے کہا۔

''نہیں...... آپ کوئی مدد نہیں کر سکتے'' فریحہ نے جواب دیا۔

''یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی مسئلے کا کوئی حل نہ ہو......'' شیر افگن نے کہا۔

''میں نے اس مسئلے کا حل ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی مگر ناکام رہی ہوں'' فریحہ نے جواب دیا۔

''میڈم...... آپ کا مایوس لہجہ مجھے مسئلے کی نوعیت بتا رہا ہے لیکن اس کے باوجود میں آپ کی پرابلم جاننا چاہتا ہوں...... پلیز...... ٹرسٹ می'' شیر افگن نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے...... پھر آج شام کو آپ میرے گھر تشریف لایئے...... میں انتظار کروں گی'' فریحہ نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔

آفس میں سارا اسٹاف منتظر تھا کہ فریحہ ایگریمنٹ کے سلسلے میں کوئی بات کرے گی مگر وہ مکمل طور پر خاموش رہی اور اس کی خاموشی سب کے لئے قدرے حیران کن تھی۔

شام کو شیر افگن اس کے گھر آیا تو اس کے گھر کی زبردست آرائش جدید اور قدیم آرکیٹیکچرل اسٹائل دیکھ کر حیران رہ گیا...... وہ ہر جانب پرستائش نظروں سے دیکھ رہا تھا گو کہ فریحہ نے عاصم کا استقبال اچھے انداز میں کیا مگر اس کا چہرہ اور آنکھیں بہت اداس تھیں۔

''آپ کا گھر بہت خوبصورت ہے کیا آپ نے اسے خود ڈیزائن کیا ہے؟'' شیر افگن نے متاثر کن لہجے میں پوچھا۔

''جی ہاں......'' اس نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''آپ بہت زبردست خاتون ہیں...... بہت لاجواب...... میں نے اپنی پوری زندگی میں حسن اور ذہانت کا اتنا خوبصورت امتزاج پہلے کبھی نہیں دیکھا...... یو...... آر...... رئیلی ونڈرفل'' شیر افگن نے مسکراتے ہوئے تعریفی لہجے میں کہا۔

''آپ چائے لیں گے یا کولڈ ڈرنک؟'' فریحہ نے اس کی تعریفی باتوں کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔

''چائے......'' وہ مسکرا کر بولا۔

فریحہ ڈرائنگ روم سے باہر چلی گئی اور اماں کو چائے لانے کو کہا۔

''کیا......اب میں وہ وجہ جان سکتا ہوں؟'' شیر افگن نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

''اماں چائے لا رہی ہیں......اس کے بعد'' وہ آہستہ آواز میں بولی اور خاموش ہو گئی۔

شیر افگن حیران ہو رہا تھا کہ وہ آفس میں بالکل مختلف شخصیت لیے ہوئے تھی اور گھر میں اس سے بالکل الٹ۔

آفس میں وہ بہت ذہین، ٹیلنٹڈ، ایکٹو اور پروفیشنل دکھائی دیتی تھی اور گھر میں بہت خاموش، گھریلو خاتون......اماں چائے لے کر آ گئی۔

چائے بہت پر تکلف تھی اور کراکری بھی بہت اسٹائلش اور نفیس تھی۔ چائے پینے کے بعد وہ اٹھی۔

''آپ آیئے میرے ساتھ'' فریحہ نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا اور وہ اس کے پیچھے چلنے لگا۔ پیچھے چلتے ہوئے وہ اس کے براؤن بالوں کی لمبی چٹیا کو انتہائی پر شوق نگاہوں سے دیکھ رہا تھا......اس کی شخصیت بہت پر کشش اور جاذب نظر تھی۔ شیر افگن اس کے ساتھ چلتے ہوئے ایک عجیب سے سرور کن سحر میں مبتلا ہو رہا تھا۔

وہ اس کے ساتھ عاصم کے کمرے میں داخل ہوئی۔ بیڈ پر ایک ابنارمل وجود کو لوٹ پوٹ ہوتے دیکھ کر شیر افگن چونک گیا۔ عاصم نے فریحہ کی جانب دیکھ کر عجیب سی بے ہنگم آوازیں نکالیں۔

''یہ......یہ......کون ہے؟'' شیر افگن بمشکل بولا۔

''میرا بیٹا......اور یہی میری مجبوری ہے......'' وہ آہ بھر کر بولی۔

''آئی......ایم......سوری......'' وہ رک رک کر بولی۔

قدرت کے فیصلوں پر افسوس کیسا؟ اس نے آہ بھر کر جواب دیا۔

شیر افگن پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس عجیب الخلقت بچے کو دیکھتا رہا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے......اسے کیسے تسلی دے۔ کیسے اس کی مدد کرے۔ وہ تو بہت مضبوط ارادے اور دعوے کے ساتھ آیا تھا۔

''آیئے......ڈرائنگ روم میں چلتے ہیں'' فریحہ نے اس کو خاموش دیکھتے ہوئے کہا اور عاصم فریحہ کو جاتے ہوئے دیکھ کر چلانے لگا۔

''میں ابھی آتی ہوں......'' فریحہ نے اس کے قریب جا کر اس کی پیشانی محبت سے چومتے ہوئے کہا اور اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا......

عاصم خاموش ہو گیا جیسے اس کی بات کا مطلب سمجھ گیا ہو۔ اس کی بھیگی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہونے لگی۔ شیر افگن حیرت سے دونوں کی جانب دیکھنے لگا۔ فریحہ کچھ کہے بغیر کمرے سے باہر نکل گئی۔

شیر افگن اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

''کیا یہ آپ کا اکلوتا بیٹا ہے؟'' شیر افگن نے ڈرائنگ روم میں صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''جی ہاں......''

''اور آپ کے شوہر......؟''

''وہ نہیں ہیں''

''کیا مطلب......؟'' شیر افگن نے حیرت سے پوچھا۔

''انہیں ہماری ضرورت نہیں تھی'' وہ آہ بھر کر بولی۔

''کیا ضرورت ہی رشتے کی بنیاد ہے؟'' شیر افگن نے پوچھا۔

''شاید ہاں......''

''اگر ایسی بات ہے تو پھر بے لوث محبت اور پر خلوص رشتے کہاں سے جنم لے سکتے ہیں...... میں ایسا نہیں سوچتا'' شیر افگن نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

''ہر انسان کی سوچ مختلف ہوتی ہے...... کوئی کسی کو کسی بات کے لئے مجبور نہیں کر سکتا'' فریحہ نے جواب دیا۔

''میڈم...... کیا آپ نے اس بچے کے لئے کوئی نرس...... آیا...... یا اٹینڈنٹ نہیں رکھا؟'' شیر افگن نے پوچھا۔

''کل تک اس کے بارے میں پر امید تھی کہ کوئی اٹینڈنٹ مل جائے گا مگر لوگ ایسے بچوں کو دیکھ کر فوراً خدا کو تو یاد کرتے ہیں مگر انہیں خدا کی مخلوق سمجھ کر وہ محبت اور پیار نہیں دیتے جو اس طرح کے انسان چاہتے ہیں۔ لوگوں کو ان پر حیرت کے ساتھ کراہت محسوس ہوتی ہے۔ وہ انہیں انسان کم بوجھ زیادہ سمجھتے ہیں...... اور دوسروں سے کیا شکوہ کریں...... جب بہت سے والدین بھی اپنی اولاد کو ایسا ہی سمجھتے ہیں'' فریحہ نے آہ بھر کر کہا۔

''کیا آپ اس بچے کی وجہ سے یہ پراجیکٹ نہیں کر رہیں؟'' شیر افگن نے پوچھا۔

''ہاں...... وہ میرے علاوہ کسی سے کھانا نہیں کھاتا...... اماں صرف اسے liquid پلا سکتی ہیں...... میں اس کی ماں ہوں...... کیسے برداشت کر پاؤں گی کہ میری اولاد بھوکی پیاسی رہے...... اور...... میں کام کر کے اس کے لئے پیسہ کماؤں...... اسے میرے پیسے کی نہیں...... میری محبت اور توجہ کی ضرورت ہے...... اس پوری دنیا میں صرف ایک میں ہی تو ہوں جو اس کو انسان اور اپنے وجود کا حصہ سمجھتی ہوں...... اور کون ہے اس کا...... میرے سوا......؟ فریحہ ایک دم سسکنے لگی۔ اسے خود بھی سمجھ نہیں آیا کہ وہ کیوں اتنا حوصلہ ہار بیٹھی ہے اور رونے لگی۔ شاید ابھی وہ ایک معذور و بے بس بچے کی ماں کی حیثیت سے اپنا دکھ بیان کر رہی تھی یا پھر ایسی مجبور و بے بس عورت کے...... جو کسی گرداب میں پھنسی تھی اور اسے کوئی راہ فرار نظر نہ آ رہی تھی۔

پلیز...... اپنے آپ کو کمپوز کیجئے...... ہم سب انسان کہیں نہ کہیں بہت بے بس اور مجبور ہوتے ہیں...... ظاہراً پہاڑوں جیسے طاقتور...... کبھی نہ جھکنے والے...... مگر اندر سے بہت بھربھرے گیلی ریت کی مانند لمحوں میں دب جانے والے...... میں آپ کی پرابلم کو بہت اچھی طرح سمجھ گیا ہوں...... آپ کے جذبات اپنے بچے کے لئے بہت اسٹرونگ ہیں۔ میں ان کی قدر کرتا ہوں اور آپ میرے لئے پہلے سے بھی زیادہ محترم ہو گئی ہیں۔ پہلے میں آپ کی عزت آپ کی ذہانت اور پروفیشنل اپروچ کی وجہ سے کرتا تھا لیکن اب ایک بہت اچھی انسان اور قابل قدر ماں کی حیثیت سے کرتا ہوں'' شیر افگن نے اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے قدرے نم آنکھوں سے کہا اس کی آنکھوں میں اس کے لئے خلوص اور آواز قدرے بھرائی ہوئی تھی۔

"تھینک یو...... میں کل آپ کو ایگریمنٹ واپس بھیج دوں گی" فریحہ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا اور شیر افگن اس کی بات سن کر خاموش ہو گیا۔

"میڈم...... یہ آپ نے کیا کیا...... پراجیکٹ کینسل کر دیا ہے...... کیا آپ کو معلوم ہے...... آپ کتنا بڑا نقصان کر رہی ہیں؟" مرتضیٰ بیگ اور اس کے دوسرے کولیگز نے کہا۔

"مسٹر مرتضیٰ جب کوئی پودا لگاتا ہے تو اسے پھلدار، تناور درخت بنانے میں کتنی جدوجہد کرتا ہے۔ اس کے سائے میں بیٹھنے والا کبھی بھی اس طویل جدوجہد کے بارے میں نہیں سوچتا...... میں نے اس کمپنی کو کس طرح اسٹیبلش کیا ہے اور آج میں دس سالوں کی محنت کے بعد جس مقام پر کھڑی ہوں...... مجھے سب اندازہ ہے آپ کامیابی اور ترقی کی بات کر رہے ہیں...... جو کامیابی آپ کسی کو روند کر یا کسی کے حقوق غصب کر کے حاصل کرتے ہیں کامیابی نہیں ہوتی خاک ہوتی ہے جو آپ اپنے سر میں ڈالتے ہیں...... میں بھی ترقی کرنا چاہتی ہوں...... آگے بڑھنا چاہتی ہوں مگر قدرت انسان کے گلے میں مجبوریوں کے ایسے طوق ڈالتی ہے کہ بعض اوقات اس طوق کو اتارنا مشکل ہو جاتا ہے...... میں بھی ایسی ہی مجبور ہوں" فریحہ نے دکھی مگر مضبوط لہجے میں یوں کہا جیسے اسے اپنے فیصلے پر کوئی پچھتاوا نہ ہو......

"تھینک یو ویری مچ...... آپ لوگ اپنا کام کیجئے" فریحہ نے کہا اور مرتضیٰ بیگ کی جانب دیکھا جو شاید اس کی بات کا مطلب اچھی طرح سمجھ گیا تھا اور اب اس کے پاس اسے قائل کرنے کو کچھ نہیں تھا...... سب خاموشی سے باہر چلے گئے اور فریحہ اپنی ریوالونگ چیئر کی پشت کے ساتھ سر لگا کر چھت کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی۔ کامیابی اور اس کے مواقع بھی قسمت سے ملتے ہیں...... ورنہ قسمت انسان کو ایسی مات دیتی ہے کہ ہر کھلا نظر آنے والا دروازہ بھی بند ہو جاتا ہے۔ اسے زندگی میں ترقی کرنے کے بارہا موقع ملے تھے مگر ہر بار اسے اپنا راستہ بدلنا پڑا تھا۔ قدرت ہر بار اس کے سامنے مجبوریوں کی ایسی دیواریں کھڑی کر دیتی کہ اسے ہر بار ہی واپس لوٹنا پڑا۔

سول انجینئرنگ میں اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کرنے پر اسے بیرون ملک اعلیٰ تعلیم کے لئے اسکالرشپ مل رہا تھا مگر جب اسکو پہلے بچے کی پیدائش متوقع تھی اور اس کا شوہر اس کی راہ میں رکاوٹ بن گیا۔ اسے اپنی اولاد عزیز تھی اس کا انتخاب ہو چکا تھا مگر اسے اپنی فیملی بچانے کے لئے اپنے مستقبل کو داؤ پر لگانا پڑا اور بچہ بھی پیدائش کے فوراً بعد فوت ہو گیا اور جس کی موت کا ذمہ دار اسے ٹھہرایا جاتا...... اس کا شوہر ہر وقت اسے tease کرتا...... ہرٹ کرتا رہتا...... اور وہ کسی زخمی پرندے کی طرح صرف پھڑپھڑاتی رہتی۔ اسے ملک کے نامور آرکیٹیکٹس نے اپنے ساتھ کام کرنے کی دعوت دی تھی مگر اس کا شوہر اسے کام کرنے سے تو نہ روکتا مگر اس طرح زچ کرتا اور ہر ایک میں یوں نقص نکالتا کہ وہ ان کے ساتھ کام کرنے سے انکار کر دیتی...... اس کے ساتھ کام شروع کرنے والے لوگ کہاں سے کہاں پہنچ گئے تھے اور وہ وہیں کھڑی تھی۔

"میں نے حسن اور ذہانت کا خوبصورت امتزاج آپ میں دیکھا ہے" شیر افگن کے الفاظ اچانک اس کے ذہن میں گونجے، طنزیہ زخمی مسکراہٹ سے اس نے اپنے ہونٹ سکوڑے۔

"تم اس قابل بھی نہیں کہ ایک صحت مند بچے کو جنم دے سکتی...... تم جیسی مخبوط الحواس اور سنکی عورتیں ہی ایسے عجوبے پیدا کرتی ہیں...... اس سے تو بہتر تھا کہ تم بانجھ ہی رہتیں......" اس کا شوہر اس کی تذلیل کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا اور عاصم کی پیدائش کے بعد تو وہ اس کے طنز

اور تنقید کا ایسا نشانہ بن گئی تھی جسے وہ ہر دم نشتر چبھوتا رہتا۔ نجانے عاصم ایسا کیوں پیدا ہوا تھا......؟ وہ یہ سوال اکثر تنہائی میں اپنے آپ سے پوچھتی۔

اس کی ابنارملٹی کا ذمہ دار اسے ٹھہرایا جاتا تھا......

کیا واقعی ہی وہ اس کی ذمہ داری تھی......؟

وہ جو انتہائی ذہین اور لائق سمجھی جاتی تھی۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے والدین اور دو بہن بھائی سب ڈاکٹر تھے۔ صرف اس نے ہی سول انجینئرنگ کی تھی اور وہ بھی اپنے انٹرسٹ کی وجہ سے سکول کالج اور یونیورسٹی میں ہمیشہ اسے وظائف ملتے رہے۔ بہت اچھی مقررہ بھی تھی...... وہ میتھس کے سوالات منٹوں میں حل کر لیتی تھی۔ اخبارات میں شائع ہونے والی پزلز (puzzles) حل کرنے میں اس کا جواب نہیں تھا اور شطرنج میں اسے شکست دینا بہت مشکل تھا۔ وہ اپنے دونوں بہن بھائیوں میں سب سے زیادہ لائق تھی اور اس کا شوہر اسے کند ذہن، مخبوط الحواس، احمق، نان سینسس اور نجانے کیا کیا کچھ کہتا تھا۔ ہر لمحے اس کی ذات کی نفی کرتا رہتا تھا...... جبکہ اس نے فریحہ سے شادی اس کی خوبصورتی اور ذہانت سے متاثر ہو کر کی تھی...... اس کا کمرا ٹرافیز، ایوارڈز، شیلڈز اور فریم شدہ سرٹیفکیٹس سے بھرا ہوا تھا اور تب وہ اس کی تعریفیں کرتا نہ تھکتا تھا...... اور اس نے اسے اپنا بہت بڑا قدردان پا کر اس سے شادی کے لئے ہاں کہہ دی اور شادی کے بعد وہی سب سے زیادہ اس کی بے قدری کرنے لگا۔

گزرے ہوئے ماضی کا ایک ایک لمحہ اذیتوں سے پر تھا...... اس کے پہلے بچے میں بھی جینیٹک پرابلمز تھیں اور اسی لئے وہ بھی زیادہ دیر زندہ نہیں رہ پایا تھا...... اور...... عاصم کو کنسیو کرنے سے لے کر اس کی پیدائش تک وہ شدید ذہنی دباؤ کا شکار رہی تھی...... اور عاصم کا سارا وجود ٹھیک تھا...... سوائے دماغ کے...... شاید قدرت جب اس کا دماغ تخلیق کر رہی ہو گی...... تب اس کا اپنا دماغ پر اس کے شدید ذہنی اضطراب اور اسٹریس میں تھا۔ اس کی بے ترتیب اور منفی سوچوں کا ردعمل عاصم کی صورت میں ظاہر ہوا تھا۔

اس کا شوہر اسے دھتکار کر چلا گیا تھا۔

"آئینہ وہی عکس دکھاتا ہے جیسا وہ اپنے سامنے دیکھتا ہے اور ماں بھی ویسے ہی بچے کو جنم دیتی ہے جیسی وہ اندر سے خود ہوتی ہے...... میں تمہیں دیکھ کر دھوکا کھا گیا...... مگر تم اندر سے کیسی ہو...... تمہارے اس بچے نے ظاہر کر دیا ہے...... تم نے ایسا بچہ پیدا کر کے مجھے سوسائٹی میں تضحیک کا نشانہ بنایا ہے۔ اسے گود میں اٹھا کر میں جہاں بھی جاؤں گا لوگ مجھ پر ہنسیں گے کہ اتنی اعلیٰ ذہانت رکھنے والے شخص کے ہاں ایسی اولاد پیدا ہوتی ہے...... تم نے اسے جنم دیا ہے اس لئے تم ہی اسے سنبھالو...... میرا تم دونوں سے کوئی تعلق نہیں" وہ اپنی ذات کے زعم میں نجانے کیا بڑے بڑے بول بولتا ہوا چلا گیا اور وہ اسے کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ اسے روک بھی نہ سکی...... کیسے روکتی وہ تو اس کی ذات، اس کی انا، اس کی عزت کو اپنے قدموں تلے روند کر چلا گیا اور قدرت نے اس کے گلے میں ڈالے طوق کو مجبوریوں کی گرہ سے اور مضبوط کر دیا۔ وہ اس طوق کو کبھی بھی خود اتار کر نہیں پھینک سکتی تھی۔ یہ طوق اس کے وجود کا حصہ بن گیا تھا...... اس سے چھٹکارا پانا اس کے لئے ناممکن تھا...... اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور وہ سسکنے لگی۔

اس کا موبائل بجنے لگا اس نے جلدی سے نمبر دیکھا اور گھبرا گئی۔

"اماں...... خیریت تو ہے؟" اس نے جلدی سے پوچھا۔

"بی بی...... عاصم بیٹا بیڈ پر سے گر گیا ہے اور مجھ بڑھیا سے اٹھایا بھی نہیں جا رہا۔ اس کی ناک اور منہ سے خون بہہ رہا ہے...... میں بہت پریشان ہوں" اماں نے گھبرا کر کہا۔

"اماں...... آپ اس کے پاس ہی رہیے...... میں گھر آ رہی ہوں" فریحہ نے موبائل آف کر کے جلدی سے اپنا بیگ کندھے پر ڈالا اور قدرے بھاگتی ہوئی آفس سے باہر نکلی۔

"یہ میڈم کو کیا ہوا ہے......؟" سٹاف نے ایک دوسرے سے پوچھا۔

"یقیناً...... کوئی سیریس پرابلم ہوگی...... جو وہ یوں بھاگتی ہوئی گئی ہیں" اس کی سیکرٹری نے کہا اور سب خاموش ہو گئے۔

عاصم بہت بے ہنگم طریقے سے رو رہا تھا اور انتہائی خوفناک آوازیں نکال رہا تھا...... اماں کاٹن سے اس کا خون صاف کرنے میں مصروف تھی جب فریحہ گھر پہنچی۔ وہ انتہائی بدحواس ہو رہی تھی...... وہ کارپٹ پر ہی پڑا تھا...... اور اماں اس کے پاس بیٹھی تھی۔

"اماں...... آیئے...... پہلے اس کو اٹھا کر بیڈ پر لٹائیں" فریحہ نے کہا اور اماں کے ساتھ مل کر بہت مشکل سے اس کو بیڈ پر لٹایا۔ اس کا بھاری وجود ڈھیلا پڑنے سے اور بھاری ہو گیا تھا۔ وہ دن بدن موٹا ہوتا جا رہا تھا اور سر پہلے سے بھی کئی گنا چھوٹا ہو گیا تھا۔ اس نے جلدی سے اس کی چینج وغیرہ کی ایسا ہر دوسرے تیسرے روز ہوتا تھا۔ اگر وہ بیڈ دیوار کے ساتھ لگاتی تو وہ سر دیوار کے ساتھ مار مار کر اسے زخمی کر لیتا اور اگر دیوار سے فاصلے پر اس کا بیڈ لگاتی تو وہ کروٹیں بدلتا ہوا نیچے گر جاتا اور پھر اسے اٹھانا مشکل ہو جاتا تھا۔ اگر کارپٹ پر میٹرس بچھا کر اسے لٹاتی تو وہ سارے کمرے میں لوٹتا اور اکثر سرواش روم کے دروازے کے ساتھ جا لگتا...... اس نے اپنی ہر کوشش کر دیکھی تھی مگر وہ اس کے سونے کا انتظام نہ کر پائی تھی...... روز بروز اس کی مشکلات میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ عاصم اس کے لئے ایک کڑی آزمائش بنتا جا رہا تھا اور ہر بار اس کو چوٹیں لگنے پر وہ اس کی بے بسی پر روتی رہتی۔

نجانے قدرت ایسے انسانوں کو کیونکر تخلیق کرتی ہے...... جنہیں دوسروں کی بہت ضرورت ہوتی ہے مگر ان کی کسی کو ضرورت نہیں ہوتی۔ جن کے ہونے نہ ہونے سے دنیا کو نہ کوئی کمی محسوس ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی فرق پڑتا ہے۔ جو دوسروں کے لئے بوجھ ہوتے ہیں مگر خود کسی کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے...... جنہیں نہ زندگی کا شعور ہوتا ہے اور نہ ہی اپنا...... وہ ہر بار کھانا کھلاتے ہوئے، سلاتے ہوئے اور اس سے محبت کرتے ہوئے اس کے ہاتھ پاؤں، اس کے بالوں، اس کی آنکھوں اور جسم کے ایک ایک حصے کو دیکھتی اور قدرت پر حیران ہوتی جس نے اس کے سب اعضاء کو ٹھیک پیدا کیا تھا۔ سوائے دماغ کے...... اور دماغ بھی ٹھیک تھا سوائے ایک حصے کے...... اس کی pregnancy میں damaged brain ہو گیا تھا اور اسے معلوم تھا وہ حصہ کب damage ہوا تھا۔ جب اس کے شوہر نے اسے غصے میں بیڈ سے دھکا دیا تھا اور وہ لڑکھڑا کر کارپٹ پر گر گئی تھی...... تب اس نے اپنے اندر ایک عجیب سا درد اور اذیت محسوس کی تھی جو چند گھنٹے گزرنے کے بعد خود بخود ٹھیک ہو گئی اور وہ بھی اس بات کو بھول گئی مگر عاصم کی ذہنی حالت نے اسے پھر سے وہ اذیت ناک لمحہ یاد دلا دیا تھا...... وہ ڈاکٹروں سے بار بار پوچھتی کیا اس کی وجہ وہ لمحہ تھا...... اور وہ بے یقینی سے جواب دیتے...... شاید...... ہاں...... شاید نہیں" یہ تو خدا کو ہی معلوم ہے جو جب چاہتا ہے اور جیسے چاہتا ہے...... تخلیق کرتا ہے...... وہ مایوسی اور نم آنکھوں سے عاصم کی جانب دیکھتی۔ ڈاکٹر صاحب کوئی امید......؟ وہ یہ سوال پوچھنے ملک کے تمام بڑے ڈاکٹروں اور ماہرین نفسیات کے پاس جاتی۔

''زندگی کے آخری لمحے تک امید کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔ جو خدا اسے یوں پیدا کر سکتا ہے وہ اسے ٹھیک بھی کر سکتا ہے'' ہر ایک کا یہی جواب ہوتا اور یہ جواب اس کی نا امید اور مایوس زندگی کو پھر سے پر امید بنا دیتا۔ وہ سولہ سالوں سے اس امید کے سہارے زندہ تھی۔ جب بھی عاصم میں کوئی مثبت تبدیلیاں دیکھتی تو خوشی سے پھولی نہ سماتی اور اس کی وہ حرکت اس کی امید کو اور مضبوط بنا دیتی......

قدرت ہر شے پر قادر ہے...... جو بے جان سے جاندار تخلیق کر سکتا ہے کیا وہ اس کے دماغ کو ٹھیک نہیں کر سکتا......؟

یقیناً ایک دن ایسا ہی ہوگا...... عاصم ٹھیک ہو جائے گا۔ دس سالوں کے بعد کبھی کبھار اس کے سہارے بیٹھنے لگتا مگر زیادہ دیر نہیں، پھر لڑھک جاتا تھا اور اچانک گرنے سے اسے چوٹیں آئی تھیں...... اور اس کی چوٹوں اور زخموں پر مرہم رکھتے ہوئے وہ کتنا روتی اور سسکتی رہتی تھی۔

نجانے قدرت اسے کیا معجزہ دکھانے پر تلی تھی......؟ وہ کتنی سخت آزمائش میں سے گزر رہی تھی...... یہ صرف وہی جانتی تھی...... قدرت نے اس کے دل کو عاصم کی محبت سے اس قدر سرشار کر دیا تھا کہ وہ اس کے لئے اس کی زندگی اور زندگی کی سب سے بڑی خوشی اور امید بن گیا تھا۔ وہ آفس میں جاتی تو اس کے ذہن میں وہی ہوتا...... ہر میٹنگ میں جانے سے پہلے اور واپس آ کر وہ فون کر کے اماں سے عاصم کے بارے میں پوچھتی رہتی۔ اس نے عاصم کی وجہ سے ہر بڑا پراجیکٹ لینے سے انکار کیا تھا۔ اس لئے اپنے اوقات کو صرف عاصم اور اپنے کام کے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔ وہ خود کہیں گم ہو چکی تھی۔

''بی بی...... اٹھو...... جا کر سو جاؤ'' اماں نے اسے سوتے ہوئے عاصم کے سر پر اپنا سر رکھ کر سوتے ہوئے دیکھ کر کہا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی......

''آج اس کی طبیعت ٹھیک نہیں...... میں ادھر ہی سو جاتی ہوں'' فریحہ نے جواب دیا۔

''دیکھ لینا...... وہ ہر روز رات کو بستر گیلا کر دیتا ہے'' اماں نے منہ بنا کر کہا۔

''میں نیچے میٹرس پر سو جاتی ہوں'' اور وہ بیڈ کے قریب میٹرس بچھا کر سو گئی......

☆

ڈاکٹر دانش انگلینڈ میں بیمار ہیں...... وہ سائیکو ہو چکے ہیں...... ان کی حالت کافی مایوس کن ہے'' ڈاکٹر محسن زیدی نے ڈاکٹر رمیض کو فکر مندی سے بتاتے ہوئے کہا۔

''کیا آپ کی ان سے بات ہوئی؟'' ڈاکٹر رمیض نے پوچھا۔

''نہیں...... ڈاکٹر رابرٹ سے ہوئی تھی وہ ان کا علاج کر رہے ہیں...... وہی بتا رہے تھے کہ ڈاکٹر دانش کی ذات بالکل بکھر گئی ہے...... اور وہ اپنے آپ کو کمپوز نہیں کر پا رہے'' ڈاکٹر زیدی نے آہ بھر کر کہا۔

''اٹس ویری سیڈ'' ڈاکٹر رمیض نے بھی تاسف کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''یقین نہیں آتا...... اس قدر جینئس...... اور ٹیلنٹڈ انسان یوں بھی بکھر سکتا ہے'' ڈاکٹر زیدی نے نم آنکھوں سے کہا۔

"سر...... خدا نے انسان کو بہت کمزور پیدا کیا ہے...... اور یہ دعویٰ بالکل سچ ثابت ہوتا ہے...... جب اتنی خوبیوں والے انسان منتشر ہو جاتے ہیں...... سر...... ہمیں ان کو بچانے کی کوشش کرنی چاہیے......" ڈاکٹر رمیض نے کہا۔

"ہاں...... میں ڈاکٹر رابرٹ سے رابطے میں ہوں اور جب میری ضرورت پڑے گی وہ مجھے بلا لیں گے......" ڈاکٹر زیدی نے کہا۔

"سر...... میں بھی آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہوں بلکہ اگلے ماہ میں ایک کانفرنس میں انوائیٹڈ بھی ہوں...... کیوں نا...... کانفرنس سے فارغ ہو کر میں ان سے ملنے چلا جاؤں" ڈاکٹر رمیض نے کہا۔

"ہاں...... یہ اچھا آئیڈیا ہے۔ مجھے بھی انویٹیشن لیٹر ملا ہے مگر میں ذاتی مصروفیات کی وجہ سے جا نہیں پاؤں گا...... بہتر ہے آپ ہی چلے جائیے" ڈاکٹر زیدی نے کہا۔

"سر...... آپ کے علاوہ اور بہت سے ڈاکٹر...... ڈاکٹر دانش کی بہت تعریف کرتے ہیں...... ان کی ذہانت اور ان کی ریسرچ کی۔ میں سوچتا ہوں...... کہ صرف اس ایک واقعے نے ان کی زندگی کو اتنا بدل دیا کہ ان سے ان کا سب کچھ چھین لیا...... ان کی کامیابیاں، ان کی عزت، شہرت اور ان کا کیریئر بھی" ڈاکٹر رمیض نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"ہاں انسان بہت عجیب ہے، کبھی کوئی ایک لمحہ اس کی زندگی سنوار دیتا ہے اور کبھی کوئی لمحہ اس سے اس کا سب کچھ چھین لیتا ہے...... " ڈاکٹر زیدی نے جواب دیا۔

"مجھے یہ سن کر انتہائی افسوس ہو رہا ہے کہ برین نیورانز کو سمجھنے اور ان پر اتنی ریسرچ کرنے والے شخص کا اپنا دماغ بکھر گیا...... اس کے اپنے نیورانز ڈسٹرب ہو گئے" ڈاکٹر رمیض نے آہ بھر کر کہا۔

"ضروری نہیں کہ جو کسی شے کو سمجھنے کا دعویٰ کرے تو وہ اس پر مکمل قدرت بھی رکھتا ہو...... اگر ایسا ہوتا تو زندگی کے فلسفے کو سمجھنے والے فلاسفر خود زہر کا پیالہ نہ پیتے...... زندگی بہت بڑا معمہ ہے اور انسان اس معمے کو حل کرنے والا ایسا خاموش ورکر ہے جسے اپنی ساری زندگی گزارنے کے باوجود بھی نہ کوئی سرا ملتا ہے نہ کوئی حل......" ڈاکٹر زیدی نے جواب دیا تو ڈاکٹر رمیض بھی خاموش ہو گئے...... کمرے میں گہرا سکوت چھا گیا اور دونوں کے ذہن الجھنے لگے......

☆

"میں...... کون ہوں......؟"

"میں...... کون ہوں......؟" ڈاکٹر رابرٹ آہستہ آہستہ سرگوشیوں کی صورت میں ڈاکٹر دانش کے قریب آ کر اپنے الفاظ دہرا رہے تھے اور ڈاکٹر دانش نیند اور بیداری کی درمیانی کیفیت میں آنکھیں بند کیے ایک نیم تاریک کمرے میں اسٹریچر پر لیٹے تھے۔ ڈاکٹر رابرٹ آہستہ آہستہ ان کا دماغ اپنے کنٹرول میں کر رہے تھے۔ جب علی موسیٰ کی انتہائی کوششوں کے باوجود بھی ڈاکٹر دانش انہیں ان کی زندگی کے بارے میں کچھ بھی جان نہیں پائے تھے تو ڈاکٹر رابرٹ نے انہیں ہپناٹائز کرنے کا پلان بنایا تھا اور انہیں کافی حد تک ڈاکٹر دانش کے بارے میں معلومات ڈاکٹر محسن زیدی نے دی

تھیں۔خاص طور پر شہزاد صدیقی کیس کے بارے میں......جس کی وجہ سے ڈاکٹر دانش کو جیل جانا پڑا تھا۔

ڈاکٹر رابرٹ اپنے الفاظ دہرا رہے تھے اور ڈاکٹر دانش پر ایسی کیفیت طاری ہو رہی تھی کہ جو انہیں......ان سے ملا رہی تھی......ان کا ماضی ان کے سامنے کھلنے لگا تھا......

''میں کون ہوں......؟'' ڈاکٹر رابرٹ نے الفاظ انتہائی سرگوشی کی صورت میں پھر دہرائے۔

ڈاکٹر دانش کے لب آہستہ آہستہ ہلنے لگے..... جیسے وہ کچھ کہنا چاہ رہے ہوں مگر آواز ان کے لاشعور سے نکلنے میں کچھ وقت لے رہی ہو......جیسے ان کا دماغ آہستہ آہستہ اس کیفیت میں جانے کے لئے ٹیون (tune) ہو رہا ہو......

☆

دن چڑھے نذیر حسین سرکس سے گھر واپس لوٹا تو سارے گھر میں بہت خاموشی تھی۔سب لوگ سو رہے تھے صرف زینب جاگ رہی تھی۔

''نذیر حسین تم آگئے ہو......؟'' زینب نے آواز دے کر پوچھا۔

''ہاں......'' نذیر حسین نے تھکی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''کیا اقبال حسین کا کچھ پتہ چلا......؟'' زینب نے پر امید لہجے میں پوچھا۔

''نہیں......'' اس نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''آج پھر نہیں......'' زینب نے ایک دم مایوسی سے جواب دیا۔

''زینب......چھوڑ دے اس کا انتظار......وہ کہیں گم نہیں ہوا......وہ ہمیں خود چھوڑ کر گیا ہے......اپنی مرضی سے......اور اپنی مرضی سے جانے والے کبھی لوٹ کر نہیں آتے'' نذیر حسین خفگی اور دکھ کے ملے جلے تاثرات سے بولا۔

''وہ ضرور ایک دن آئے گا......میرا دل کہتا ہے'' زینب نے اپنی آنکھوں کو بے سمت ادھر ادھر گھماتے ہوئے کہا۔

''ہمیں چھوڑ کر اسے گئے ہوئے پندرہ سال ہو گئے ہیں اور تو اس کے انتظار اور جدائی میں رو رو کر اندھی ہو گئی ہے مگر وہ نہیں آیا......'' نذیر حسین نے افسردگی سے کہا۔

''میری دعائیں اسے ضرور واپس لے آئیں گی'' زینب نے پھر پر امید لہجے میں کہا۔

''پتھر دل لوگوں پر دعائیں اثر نہیں کرتیں......کیا تو بھول گئی وہ الفاظ جو وہ ہمیں کہہ کر گیا تھا......''

''مجھے آپ لوگوں سے نفرت ہے......آپ لوگ میری ترقی اور کامیابی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔جب لوگ مجھے سرکس میں کام کرنے والے''جوکر'' کا بیٹا کہتے ہیں تو بے عزتی کے احساس سے میرے بدن پر چیونٹیاں رینگنے لگتی ہیں......مجھے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگتی ہے کہ میں آپ کے گھر کیوں پیدا ہوا......اتنے گندے اور غلیظ لوگوں کے گھر'' نذیر حسین سسکنے لگا۔

''تم تو خواہ مخواہ اس کی باتوں کو دل سے لگا بیٹھے ہو اولاد ناراض ہو کر ماں باپ سے ہی جھگڑتی ہے۔کیا ماں باپ بھی ان سے جھگڑنے لگے......ارے اللہ نے ماں باپ کے دلوں کو اس دنیا کی ساری چیزوں سے بڑا بنایا ہے......تم تو خواہ مخواہ بگڑ بیٹھے ہو اور اس کی باتوں کو دل سے لگا لیا

وہ بھی تو ٹھیک کہتا تھا...... میرا بیٹا...... اتنا قابل، لائق تھا...... اللہ نے ہمارے گھر میں اسے یوں پیدا کیا جیسے گدڑی میں لعل...... ہم اور ہمارا گھر واقعی اس کے قابل نہیں تھے...... ٹھیک کیا اس نے ہمیں چھوڑ دیا۔ بھلا اس گندے گھر اور بدبودار محلے میں رہ کر وہ کہاں ترقی کر سکتا تھا" زینب اپنے بیٹے کی حمایت میں بلا تکان بولتی گئی۔

"زینبے تجھے دیکھ کر یقین آتا ہے کہ مولا نے ماں کا دل بہت بڑا بنایا ہے...... سچ پوچھو تو میرے دل میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں...... نہ ہی مجھے اس کے آنے کی کوئی آس امید ہے اور نہ ہی اس کے لئے کوئی محبت باقی ہے" نذیر حسین نے غصے سے کہا۔

"نذیر حسین...... کیا ضروری ہے کہ تم اس کی بری باتوں کو ہی یاد کرتے رہو۔ اس کی اچھی باتوں کو بھی تو یاد رکھ سکتے ہو۔ وہ ہر کلاس میں فسٹ آتا تھا...... انعام کے بڑے بڑے کپ لاتا تھا...... اور جب اس نے دسویں میں سارے شہر کے لڑکے لڑکیوں سے زیادہ نمبر لیے تو اخبار میں اس کا فوٹو چھپا تھا حکومت نے اس کو انعام دیا، لوگ مجھے کہتے تھے۔

"زینبے...... تو اسے کیا کھلاتی رہی ہے۔ اتنا لائق بچہ ہے تمہارا اللہ نے اس کو بڑا ہی اچھا دماغ دیا ہے۔ فر فر سبق یاد کر لیتا تھا۔ سارے بچے بیٹھے رہتے تھے مگر وہ دو منٹوں میں یاد کر لیتا تھا اور جس دن وہ ڈاکٹر بنا تو ٹی وی والے بھی اس سے باتیں کرنے آئے...... اس کی فوٹو بنائیں، ہماری اتنی اوقات کہاں تھی کہ اسے ڈاکٹر بناتے۔ بس اللہ کا اس پر بڑا کرم تھا...... وہ تو مٹی میں بھی ہاتھ ڈالتا تھا تو وہ بھی سونا بن جاتی تھی...

"واہ ری قسمت...... مولا نے اس کا اتنا اچھا نصیب لکھ کر دنیا میں بھیجا۔ میرے سارے بچے...... بیچارے کچھ بھی نہ بن سکے۔ کسی نے کوئی ترقی نہ کی اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے آسمان پر اڑنے لگا" زینب نے خوش ہو کر کہا۔

"ہاں...... وہ آسمان پر اڑنے لگا اور ہم اسے کیڑے مکوڑے دکھائی دینے لگے گندے...... غلیظ...... رینگنے والے...... زینب...... خدا نے اس کو بہت کچھ دیا تھا، اچھا دماغ...... اچھی قسمت...... مگر اچھا دل نہیں دیا تھا...... وہ بڑا ہی تھڑدلا تھا اسے اپنے سوا کوئی دکھائی نہیں دیتا تھا...... غرور اور تکبر نے اسے سرکش بنا دیا تھا۔ اسے ہم اور ہماری محبتیں یاد نہیں رہی تھیں۔ اسے یاد رہا تھا تو ہماری غربت اور بس غربت سے ملنے والی محرومیاں زینبے...... میں نے اسے سب کچھ دینے کی کوشش کی تھی۔ مگر اسے تو مجھ سے اور میرے پیشے سے نفرت تھی۔ وہ مجھے جس حقارت سے دیکھنے لگا تھا، اس پر میرا دل کٹتا تھا...... میں رات رات بھر سرکس میں ان بچوں کی خاطر اپنے آپ کو تماشا بناتا۔ اپنی جان خطرے میں ڈالتا اور وہ مجھ سے نفرت کرنے لگا تھا...... اور سن زینبے وہ تو تجھ سے بھی محبت نہیں کرتا تھا۔ تم تو خواہ مخواہ اسے یاد کر کے ہلکان ہو رہی ہو...... اپنی آنکھیں سفید کر لیں...... اور...... وہ" نذیر حسین غصے سے بولا۔

"نہیں...... وہ مجھ سے کبھی بھی نفرت نہیں کرتا تھا" زینب پر وثوق لہجے میں بولی۔

"زینب...... کیا تجھے یاد نہیں...... اس نے تجھے بھی کیا کچھ بولا تھا......" نذیر حسین اسے بہت کچھ یاد دلانے لگا۔

"بس کر...... بس کر...... مجھے کچھ بھی یاد کرانے کی ضرورت نہیں مجھے بس اتنا یاد ہے کہ اقبال حسین میرا بیٹا ہے...... اور میں اس سے بہت محبت کرتی ہوں...... بس...... میرے لئے یہی کافی ہے......" زینب مسکرا کر بولی اور پھر سسکنے لگی، نذیر حسین حیرت سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

......❀......

# (۷)

شامو کے ہاتھ میں بڑی مہارت آ گئی تھی۔ وہ ہر قسم کی اسٹائلش کٹنگ ماہرانہ انداز میں کرتا، جو لوگ ایک بار اس سے کٹنگ کرواتے پھر دوبارہ اسی کے پاس آتے...... جمالا بھی اس کے فن کی بہت تعریف کرتا۔

''ابے...... تو...... تو...... مجھ سے بھی آگے نکل گیا ہے...... یار...... تیرا بڑا دماغ ہے اور لگتا ہے قدرت تجھ پر مہربان بھی ہے...... جو تجھے اس ہنر میں ڈال دیا، ورنہ تم لوگ تو ساری زندگی ناچ گانے میں ہی گزار دیتے ہو۔'' جمالے نے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

''استاد...... تیرے جیسے استاد بھی تو کسی کو نہیں ملتے نا......'' شامو نے جمالے کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

''یار...... تو...... کہتا ہے تو مان لیتا ہوں...... ورنہ...... اپنی اولاد تو نہ مجھے استاد مانتی ہے اور نہ میرے پیشے کو کچھ سمجھتی ہے...... اب میرا بڑا بیٹا یہ دکان بیچنے کو کہہ رہا ہے......'' جمالے نے افسردگی سے کہا تو شامو کو ایک دم دھچکا لگا۔

''استاد...... کیا...... کہہ رہا ہے؟ کیا تو...... یہ...... دوکان چھوڑ دے گا......؟'' شامو نے حیرت سے پوچھا۔

''پتا نہیں...... کیا ہوتا ہے...... وہ ملک سے باہر جانے کے چکروں میں ہے اور مجھے کہتا ہے کہ یہ دکان بیچ کر اسے پیسہ دوں۔ اولاد کی ضرورت پوری کرنے کے لئے ماں باپ سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں...... لگتا ہے...... مجھے یہ دکان بیچنی ہی پڑے گی۔'' جمالے نے رنجیدہ لہجے میں کہا تو شامو اس کی بات سن کر پریشان ہو گیا۔

''استاد...... میں...... میں...... کہاں جاؤں گا؟'' شامو نے پوچھا۔

''اللہ کی زمین بہت بڑی ہے...... کہیں چلے جانا۔'' جمالے نے جواب دیا۔

''اللہ کی زمین تو بہت بڑی ہے، مگر اللہ کے بندوں کے دل بڑے نہیں...... ہم جیسوں کو...... کون اپناتا ہے اور تیرے جیسے بندے بہت کم ہیں، اس دنیا میں۔'' شامو نے افسردگی سے کہا۔

''تو فکر نہ کر...... تیرا میں کچھ نہ کچھ بندوبست تو کروں گا۔ میرے ایک شاگرد اسلم نے دوسرے شہر میں بہت بڑا بیوٹی پارلر کھولا ہے۔ سنا ہے وہاں بڑے امیر گھرانوں کی عورتیں اور فلمی ایکٹریسیس آتی ہیں...... بڑا پیسہ کما رہا ہے۔ کل میں اس سے بات کروں گا...... دیکھو وہ کیا کہتا ہے...... تو فکر نہ کر۔'' جمالے نے اسے تسلی دی تو اس کا دل قدرے مطمئن ہو گیا...... مگر...... ساری رات اس نے اسی بے یقینی اور بے چینی میں گزاری کہ...... ہو سکتا ہے جمالے کا شاگرد اسے رکھ لے اور ہو سکتا ہے، وہ نہ رکھے...... اگر اس نے نہ رکھا تو پھر وہ کہاں جائے گا...... اسے وہ دن اور وہ رات ساری زندگی نہیں بھول سکتی تھی، جو اس نے بھوکے پیٹ سڑک پر ٹھٹھرتے ہوئے گزاری تھی...... اس کے اندر جتنے دکھ جمع تھے، ان میں سے یہ

ایک ایسا دکھ تھا، جسے وہ کبھی فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ساری رات اس نے دل ہی دل میں خدا سے گڑگڑا کر دعائیں کرتے ہوئے گزار دی۔

''تو تو سب کا رب ہے...... سب انسانوں کو چاہتا ہے...... ہمیں بھی تو تو نے انسان بنایا ہے...... اور لوگ کہتے ہیں...... انسان تجھے بڑا پیارا ہے...... اور تو ان کی دعائیں بھی سنتا ہے...... میں نے تجھ سے کبھی کوئی دعا ہی نہیں کی...... مجھے کبھی دعا کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی...... میں سوچتا تھا دعا تو وہ کرتے ہیں...... جسے کچھ چاہئے ہو...... اور...... مجھے تو کچھ بھی نہیں چاہئے تھا۔ زندگی بھی نہیں اور جسے زندگی ہی نہیں چاہئے...... وہ کسی اور بات کے لئے کیا دعا کر سکتا ہے'' ...... مگر اب اسے زندگی میں دلچسپی پیدا ہونے لگی تھی جب سے اس نے یہ کام شروع کیا تھا اسے محسوس ہوتا تھا کہ وہ دوسروں کی ضرورت بن گیا ہے اور جب کوئی دوسروں کی ضرورت بنتا ہے تو اس کی ذات اہم ہونے لگتی ہے اور جب سے اسے اپنی اہمیت کا احساس ہونے لگا تھا...... وہ اپنے دل میں قدرے اطمینان محسوس کرنے لگا تھا...... اب اسے اپنی زندگی کی ضرورت محسوس ہوتی تھی...... اس کا وجود پیچھے رہ گیا تھا۔ اس کا کام اور ہنر آگے نکل گیا تھا۔ لوگ اسے شامو نہیں شامی کہہ کر پکارتے تھے۔ پہلے شامو کہتے ہوئے لہجوں میں طنز اور مذاق ہوتا تھا، اب شامی کہتے ہوئے محبت اور تعریف کا اظہار ہوتا تھا۔ لوگ قطار میں بیٹھ کر اپنی باری کا انتظار کرتے تھے...... اور ان کے انتظار کرنے سے اسے اپنی اہمیت کا مزید احساس ہونے لگتا...... وہ خدا سے یہی دعا کرتا رہا کہ اس کے لئے ایسا ہی کوئی بندوبست کر دے...... جہاں اس کی نہیں اس کے فن اور ہنر کی قدر ہو۔

شاید دن اور رات میں کوئی ایسا لمحہ قبولیت کا ہوتا ہے، جب خدا بہت قریب سے انسان کے دل سے نکلنے والی دعاؤں کو سنتا ہے اور بہت سی دعاؤں میں سے کسی ایک کو قبولیت کی سند عطا کرتا ہے۔ اس کی بھی مانگی ہوئی دعا پوری ہو گئی...... اور جمالے نے اسے اگلے روز خوشخبری سنائی کہ اس کے شاگرد کو ایک کاریگر کی ضرورت ہے اور اس نے شامو کو بلایا ہے۔

''استاد...... تو...... نے...... اسے میرے بارے میں بتا دیا ہے نا......'' شامو نے رک رک کر پوچھا۔

''ہاں...... ہاں بتایا ہے...... کہ تو...... بڑا کاریگر ہے......'' جمالے نے مسکرا کر کہا۔

''اور کچھ نہیں بتایا؟'' شامو نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''یہ بھی بتایا ہے کہ لوگ تجھ سے کٹنگ کرانے دور دور سے آتے ہیں۔'' جمالے نے کہا۔

''اور...... کیا بتایا ہے؟'' شامو نے استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔

''یہی...... کہ...... تو...... مجھ سے بڑا کاریگر ہے۔'' جمالے نے تعریف کرتے ہوئے کہا۔

''استاد...... وہ...... بات......؟'' شامو نے آہ بھر کر آہستہ آواز میں کہا۔

''وہ...... تو...... میں بھول ہی گیا...... لیکن اس کو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے...... اس کو تو کام چاہئے۔'' جمالے نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''استاد یہ تو...... تو...... سوچتا ہے، ہر کوئی نہیں۔'' شامو نے کہا۔

''تیرا کیا مطلب ہے......'' کیا وہ یہ سن کر تجھے کام پر نہیں رکھے گا۔'' جمالے نے پوچھا۔

''معلوم نہیں......'' شامو آہستہ سے بولا۔

"ٹھیک ہے..... میں آج فون کر کے پوچھتا ہوں..... کیا کہتا ہے..... ٹھہر میں ابھی پی سی او سے فون کر کے آیا۔" جمالا کہہ کر باہر نکل گیا اور اس کا دل پھر ڈوبنے لگا..... نجانے کیا ہو.....؟ کہیں وہ منع ہی نہ کر دے.....اس نے دکھ بھرے لہجے میں پھر خدا سے التجائیں کرنا شروع کر دیں۔

تھوڑی دیر بعد جمالا مسکراتا ہوا آیا۔

"اس کے وہاں دو پارلر ہیں..... مردوں کے لئے بھی اور عورتوں کے لئے بھی..... جہاں وہ تجھے مناسب سمجھے گا..... رکھ لے گا، ٹھیک ہے.....کل ہی چلا جا....." جمالے نے اسے کہا۔

"استاد اتنی جلدی ....." شامو نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں ..... تجھے جانا تو ہے ہی..... کیوں نا کل ہی سہی..... جتنی جلدی وہاں جا کر سیٹ ہو جائے تو بہتر ہے۔" جمالے نے کہا تو شامو خاموش ہو گیا۔

جمالے کو چھوڑنے کا اسے بہت رنج تھا۔ جمالا اس کی زندگی میں آنے والا پہلا اچھا شخص تھا..... جو قدرے تلخ مگر دل کا بہت اچھا اور صاف انسان تھا..... اس ایک اچھے شخص نے اس کے سر پر دست شفقت کیا رکھا اس کی زندگی بدل گئی.....اس کی محرومیاں کم ہو گئیں.....اس کی بے وقعت ذات اہم ہو گی۔ وہ ناچیز سے انسان بن گیا.....اس کی ہمدردی اور پیار نے اس کے اندر کے مردہ انسان میں توانائی اور حرارت پیدا کر دی..... اس کے کمزور اور ناتواں ہاتھوں میں ہنر اور فن کے ہتھیار پکڑائے تو وہ اپنے آپ کو کارآمد محسوس کرنے لگا۔ ایک اچھا انسان دوسرے انسان کی زندگی کو کس حد تک بدل سکتا ہے اور اس پر اثر انداز ہو سکتا ہے، اسے جمالے سے مل کر پتا چلا تھا۔ اس نے صرف تین ماہ اس کے پاس لگائے تھے اور اس کی زندگی کے پچیس سالوں میں صرف تین ماہ اسے اہم محسوس ہوتے تھے۔ جمالے نے صرف اسے اپنا فن ہی نہیں دیا تھا، اسے بہت سی کارآمد باتیں سکھائی تھیں جو آئندہ زندگی میں اس کے کام آ سکتی تھیں۔ زندگی کو دیانتداری اور کسی مقصد کے تحت گزارنے کا سبق سکھایا تھا، جمالے نے اس کے اندر سے ہر وقت غم، دکھ اور رنج کے موجزن جذبات کی بجائے شکر، خوشی اور سکون کے احساسات و جذبات سے روشناس کرایا تھا.....شامو نے جمالے کے ہاں آنے کے بعد اپنے اندر بہت تبدیلی محسوس کی تھی.....اس نے یہاں زیادہ وقت مردوں کے سنگ گزارا تھا اور اس نے اچھے مردوں کو بھی قریب سے دیکھا تھا.....ورنہ اس سے قبل اسے آوارہ..... ٹھکو باز.....بیہودہ شوخ مزاج اور آوارہ مردوں سے پالا پڑا تھا.....اسے مردوں سے نفرت ہو گئی تھی..... نگرانی کی محبت کے لئے اسے مردوں کا روپ دھارنا پڑا، مگر رانی پھر بھی اسے چھوڑ گئی۔ جیسے اب اسے جمالے کو چھوڑ کر جانا پڑ رہا تھا۔

جمالے نے اسے گلے لگا کر رخصت کیا..... بہت سی دعائیں اور پیسے دیئے.....شامو اتنا رویا کہ شاید زندگی بھر اتنا کبھی نہ رویا تھا..... جمالا حیرت سے اسے چپ کراتا رہا۔ "پاگل.....تو..... کیوں رو رہا ہے؟ تو.....تو.....ترقی کرنے جا رہا ہے۔" جمالے نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"استاد.....زندگی میں کبھی کسی سے ایسا پیار نہیں ملا..... مجھے یوں لگتا ہے.....جیسے تو ہی میرا باپ ہو.....میں نے ماں باپ تو نہیں دیکھے، مگر تو باپ جیسا ہی لگتا ہے.....ہم تو ایسے بدقسمت لوگ ہیں، جن کو اللہ کسی رشتے میں ہی نہیں باندھتا..... پر..... تجھے باپ کہنے کو جی چاہتا ہے۔"

شامو اس کے گلے لگ کر رونے لگا۔

''ہاں.....تو..... میں تیرا باپ ہی ہوں..... جب دل چاہے تو میرے گھر آ..... میرے دل اور گھر کے دروازے تیرے لئے ہر دم کھلے ہیں.....تو اپنے آپ کو کبھی تنہا نہ سمجھنا.....اور سن اسلم بھی بہت اچھا ہے..... میں نے اسے سب کچھ سمجھا دیا ہے..... اس نے مجھے بہت تسلی دی ہے کہ وہ تیری ہر طرح سے مدد کرے گا۔'' جمالے نے شامو کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ شامو نے روتے ہوئے اس سے اجازت لی۔ جمالے نے بھی نم آنکھوں سے اسے رخصت کیا اور شامو بہت سی امیدوں اور وسوسوں کے ساتھ اس سے رخصت ہو گیا۔

☆

رانی کو نگار بیگم کا خبط ہو گیا تھا، اٹھتے بیٹھتے وہ ہر وقت نگار بیگم کے بارے میں سوچتی۔ نگار بیگم کیسے چلتی ہے..... نگار بیگم کیسے دیکھتی ہے وہ آنکھیں بند کرتی تو نگار بیگم اپنے مہندی سے نقش و نگار پاؤں کے ساتھ نوٹوں کے فرش پر چلتی نظر آتی..... اسے کبھی کبھی محسوس ہوتا جیسے وہ نگار بیگم ہو.....اور اسی طرح نوٹوں کے فرش پر چل رہی ہو..... لوگوں کا ایک ہجوم اس کے آگے پیچھے چل رہا ہو..... اس کے لئے نت نئی گاڑیوں کے دروازے کھل رہے ہوں..... اور وہ ان میں بیٹھ کر سفر کر رہی ہو..... وہ جدھر سے گزر رہی ہو..... لوگ اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے قطار میں کھڑے ہوں..... اور وہ بس ایک نظر مسکرا کر ان کی طرف دیکھ کر منہ موڑ لیتی ہو۔ یہ خواب کتنا خوبصورت، دلفریب اور دلنشین تھا..... وہ اپنے اس خواب میں نگار بیگم سے بھی آگے نکل گئی تھی۔ اس کے ذہن میں نگار بیگم ایک ایسا آئیڈیل بن چکی تھی، جس کے ساتھ دنیا کی ہر خوشی، سکون اور مسرت وابستہ ہو..... نگار بیگم، اس دنیا کی پری یا خیالی پیکر..... مگر..... ایک ایسے انسان کی صورت میں اس کے سامنے موجود تھی..... جس کو اس کی آنکھوں نے ایک حقیقت کی صورت میں دیکھا تھا اور وہ اس حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتی تھی۔ وہ حقیقت اس کی آنکھوں میں ایک سہانے خواب کی مانند ایسی رچ بس گئی تھی کہ اس کے سحر سے نکلنا اس کے لئے دشوار ہو گیا تھا۔ نادانستہ اس کے قدم ہر روز ان راستوں کی طرف اٹھ جاتے جو نگار بیگم کے مسکن کی طرف جاتا تھا۔ وہ گلی کے اندر نہ جاتی کہ کہیں اچھو پھر اسے وہاں دیکھ کر نہ ڈانٹے..... وہ سڑک کے باہر بھکارن کے روپ میں کھڑی بھیک مانگتی رہتی کہ کسی وقت نگار بیگم کہیں جائے اور اس کی جھلک اسے نظر آ جائے..... ہر روز صبح سے شام وہ وہیں ارد گرد منڈلاتی رہتی، مگر نگار بیگم کہیں نہ جاتی۔

ایک سہ پہر نگار بیگم بڑی سی گاڑی میں بیٹھنے لگی..... اس کے ارد گرد نوکروں کی بہت بڑی تعداد تھی، ڈرائیور نے آگے بڑھ کر گاڑی کا دروازہ کھولا، نگار بیگم نے نقاب کر رکھا تھا۔ وہ بڑی شان سے گاڑی میں بیٹھنے لگی۔ رانی بہت ہمت کر کے آگے بڑھی اور نگار بیگم کے سفید مرمریں، خوبصورت ہاتھ کو چھونے کی کوشش کی، نگار بیگم نے حیرت سے ایک ٹک اس کی جانب بغور دیکھا اور اپنا پرس کھول کر اسے پچاس کا نوٹ پکڑانے لگی تو رانی نے اس کے کھلے پرس میں ہزار، پانچ سو، سو اور پچاس کے نوٹوں کی گڈیاں دیکھیں۔ دس اور پانچ کے نوٹ وہاں تھے ہی نہیں۔ اس نے نوٹ رانی کو پکڑانے کے لئے اس کی طرف بڑھایا..... رانی نے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔

''بھیک نہیں چاہئے.....'' رانی نے ہمت کر کے کہا۔

''بھیک نہیں چاہئے.....تو..... پھر..... کیا چاہئے؟'' نگار بیگم نے بہت شستہ اور ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں حیرت سے پوچھا۔

''میں...... میں...... آپ کی خدمت کرنا چاہتی ہوں۔'' رانی نے بمشکل کہا...... تو...... نگار بیگم حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی...... اور اس کی طرف بغور دیکھنے لگی۔

''کیسی خدمت......؟'' نگار بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

''کوئی سی بھی......؟'' رانی نے قدرے خود اعتمادی سے جواب دیا۔

نگار بیگم اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ جیسے آنکھوں سے اس کے دل کی سچائی کو جاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس نے قدرے توقف کے بعد پوچھا۔

''کہاں رہتی ہو......؟'' نگار بیگم نے پوچھا۔

''جھگی میں...... نالے کے پاس...... شہر سے باہر۔'' وہ رک رک کر بولی۔

''کیا تم جانتی ہو...... میں...... یہاں...... کس جگہ رہتی ہوں؟ نگار بیگم نے پوچھا۔

''ہاں...... ہاں......'' رانی نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے...... کل صبح میرے پاس آنا...... پھر بات کروں گی۔'' نگار بیگم نے جواب دیا تو رانی کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا...... کہ نگار بیگم نے واقعی اس سے بات کی تھی...... اور...... یہ کہ نگار بیگم نے اسے کس قابل سمجھا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے قدرت اس پر مہربان ہو رہی ہو۔ اس کی قسمت کا ستارہ بدلنے والا ہو۔ رات بھر اس کو نیند نہ آئی۔ بار بار کروٹیں بدلتی رہی اور ہر کروٹ پر نگار بیگم کے الفاظ اسے یاد آتے۔ اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ نوٹوں کے فرش پر چل رہی ہو۔ اس کے پاؤں پر بھی مہندی کے ویسے ہی نقش و نگار ہوں جیسے نگار بیگم کے پاؤں پر تھے اور اس کے ہاتھوں میں بھی ویسی ہی انگوٹھیاں ہوں جیسے نگار بیگم کی انگلیوں میں تھیں...... رات کا ایک ایک پل اس پر بھاری ہو رہا تھا، نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی...... نجانے کل نگار بیگم اسے کیا کہے...... اس کے اندر ایسی امید کی شمع روشن ہوئی تھی، جو اس کی زندگی کی ساری تلخیاں بھلا رہی تھی۔ اتنے دنوں کی مایوسی اور تاریکی نے جو فضا پیدا کر رکھی تھی، اس فضا کا بوجھل پن اب ختم ہو رہا تھا۔ نگار بیگم روشنی کی کرن بن کر اس کے اندر کی تاریکی کو رفتہ رفتہ کم کر رہی تھی۔ وہ صبح سویرے ہی اٹھ گئی، باپ اور بچوں کو دھندے پر بھیج کر اس نے اپنا سب سے بہتر شوخ رنگوں والا، خستہ حال سوٹ پہنا، آج اس نے نہ کشکول پکڑی اور نہ ہی اپنا تھیلا اٹھایا، جھگی سے باہر نکلنے لگی تو برکتے نے چارپائی پر لیٹے لیٹے حیرت سے اس کی طرف دیکھا...... اسے رانی کے چہرے پر عجیب سی خوشی اور امید کی جھلک نظر آئی...... جو...... بہت دنوں بعد اس نے اس کے چہرے پر دیکھی تھی...... برکتے شش و پنج میں تھی...... مگر رانی سے کچھ پوچھتی...... اس سے قبل ہی وہ جھگی سے باہر نکل گئی...... اس کے ہر اٹھتے قدم میں امید چھپی تھی، اس کا دل مسرور ہو رہا تھا اور نت نئے خیالات کے تانے بانے بن رہا تھا...... کاش نگار بیگم اسے کوئی کام دے دیں...... اس سے کوئی خدمت کروا لیں...... تو وہ بھی اس کی طرح خوش نصیب ہو جائے گی...... کاش وہ بھی اس کی طرح کبھی نوٹوں کے فرش پر چلے...... اور بڑی بڑی گاڑیوں میں بیٹھے......!'' وہ پر امید ہو کر نیلے آسمان کی طرف دیکھتی ہوئی دعائیں کرنے لگی۔

''اللہ میاں جی...... تو...... تو...... سب کچھ کر سکتا ہے۔ مجھے ایسا کر مجھے بھی نگار بیگم بنا دے...... میں سڑکوں پر بھیک مانگ کر تھک گئی

ہوں..... اور..... بھیک میں ملتا بھی کیا ہے..... ایک روپیہ..... دو روپیہ..... پانچ روپیہ..... کیا ساری زندگی میں یونہی بھیک اکٹھی کرتی رہوں گی..... مجھے بھی بہت سارا پیسہ چاہئے..... اچھے کپڑے، زیور، نوکر، چاکر اور گاڑیاں..... میں بھی تو 'انسان' ہوں۔ نگار بیگم کی طرح..... پھر میں نگار بیگم کیوں نہیں بن سکتی۔

اگر میں نگار بیگم بن گئی..... تو اس شہر کی سب سے بڑی درگاہ پر پانچ سو..... نہیں..... ایک ہزار..... نہیں..... پانچ ہزار..... ہاں پورے پانچ ہزار روپے کی نیاز دوں گی.....'' اس نے دل ہی دل میں منت مانگی..... اور مطمئن ہو گئی..... وہ گلی میں داخل ہوئی تو اچھو بڑے اہتمام سے پھول پرو رہا تھا، اس نے رانی کی طرف حیرت سے دیکھا۔

''تو..... پھر آ گئی.....؟'' اچھو نے خفگی سے پوچھا

''نگار بیگم نے بلایا ہے..... اس سے ملنے جا رہی ہوں۔'' رانی نے بڑے انداز سے قدرے اکڑ کر جواب دیا۔

''کیا..... کیا..... کیا..... نگار بیگم نے تجھے بلایا ہے..... ذرا منہ دھو کر رکھ.....'' اچھو نے مذاق کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں یقین آ رہا..... تو..... تو..... اب اپنی آنکھوں سے دیکھ۔ میں اوپر جا رہی ہوں..... سیڑھیاں چڑھ کر۔'' وہ مڑ کر اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

''سن..... یہ..... مت کر..... ان سیڑھیوں پر قدم رکھنے والی لڑکیاں پھر ساری زندگی کہیں اور جانے کے قابل نہیں رہتیں۔'' اچھو نے معنی خیز انداز میں سمجھانا چاہا، مگر رانی کو اس کی بات کی سمجھ نہیں آئی یا..... پھر اس نے سمجھنے کی کوشش ہی نہ کی اور جلدی سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلی گئی، نوکروں نے اسے روکا.....

''نگار بیگم کو بول..... رانی آئی ہے..... اس نے مجھے بلایا ہے۔'' رانی نے قدرے اکڑتے ہوئے کہا۔

''اری چل..... بھلا نگار بیگم تجھے کیوں بلائے گی؟'' ایک ادھیڑ عمر آدمی نے کہا۔

''نہیں یقین آتا تو..... اندر جا کر اس سے پوچھ لے.....'' رانی نے کہا۔

''اس وقت وہ آرام فرما رہی ہیں..... اور ہماری کیا جرأت کہ ان کو پریشان کریں۔'' دوسرے آدمی نے جواب دیا۔

رانی مایوس ہونے لگی اور اس کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا۔ ''وہ..... وہ..... کب.....؟'' وہ بمشکل بولی۔

''پورے دو گھنٹوں بعد.....'' ادھیڑ عمر آدمی نے جواب دیا۔

''کیا..... میں..... یہاں انتظار کر سکتی ہوں؟'' رانی نے پوچھا، تو دونوں آدمیوں نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔

''ٹھیک ہے..... اگر تم انتظار کرنا چاہتی ہو..... تو یہاں سیڑھیوں کے ایک طرف بالکونی ہے..... وہاں بیٹھ کر انتظار کر لو..... اگر نگار بیگم نے تجھے بلایا نہ ہوتا تو ہم تجھے یہاں کبھی بھی نہ بیٹھنے دیتے۔'' دوسرے آدمی نے کہا اور رانی کو بالکونی میں ایک جانب بیٹھنے کو کہا۔ رانی سنگ مرمر کے ٹھنڈے فرش پر ایک کونے میں بیٹھ گئی۔ اس نے بھرپور نظروں سے جائزہ لیا۔ اسے ہر طرف کمرے اور بالکونیاں ہی نظر آئے..... کمروں میں رنگ برنگی شیشوں کی کھڑکیاں اور ان کے پیچھے سفید جالی اور ان کے آگے مخمل کے پردے نظر آئے۔ بالکونیوں میں بوگن ویلا اور منی پلانٹ کی بیلوں نے

بڑے خوبصورت انداز میں ان کو آراستہ کر رکھا تھا۔ اس نے بالکونی کی چھت کو دیکھا..... رنگ برنگی ٹائلوں اور خوبصورت نقش و نگار سے آراستہ چھت کے عین وسط میں خوبصورت جھومر لٹک رہے تھے۔ اس نے ابھی بالکونیاں ہی دیکھی تھیں اور بہت متاثر ہو رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ایک آدمی میٹھے چاولوں کی ایک پلیٹ لے کر آ گیا اور اسے پکڑائی۔

''یہ..... یہ..... کیا ہے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''نگار بیگم کا حکم ہے..... یہاں پر آنے والے کو کچھ کھلائے بغیر نہ رخصت کیا جائے؟'' اس آدمی نے جواب دیا۔

''نگار بیگم کب اٹھیں گی.....؟ رانی نے پلیٹ پکڑ کر بے صبری سے پوچھا۔

''ایک گھنٹے بعد.....'' اس آدمی نے جواب دیا۔

''اس کا مطلب ہے..... اسے یہاں آتے ہوئے ایک گھنٹہ ہو چکا ہے۔ وہ خاموشی سے چاول کھانے لگی۔ ایسے مزیدار اور خوش رنگ چاول اس نے کبھی نہیں کھائے تھے۔ بادام، پستے اور مختلف مربوں سے آراستہ چاول، وہ ایک ایک چمچ کھاتے ہوئے دل میں تعریفیں کر رہی تھی..... اور نگار بیگم کی عظمت کی قائل ہو رہی تھی۔ چاول کھا کر وہ پھر انتظار کرنا شروع ہو گئی..... کافی دیر بعد ادھیڑ عمر آدمی اسے بلانے آیا۔

''نگار بیگم تجھے بلا رہی ہیں۔'' اس آدمی نے کہا اور اسے اپنے ساتھ لے کر مختلف برآمدوں اور کمروں میں سے ہوتا ہوا ایک بڑے سے کمرے میں داخل ہو گیا۔ ہر طرف موتیوں اور جالیوں کے پردے لٹک رہے تھے۔ خوبصورت تازہ پھولوں کے گملے اور سنگ مرمر کے فرش پر جگہ جگہ قالین بچھے تھے۔ ان مخملیں قالینوں پر چلتے ہوئے اس کے پاؤں نرم و لطیف جذبات سے سرشار ہو رہے تھے۔ نگار بیگم ایک خوبصورت سفید جھولا نما مسہری پر بیٹھی تھی، جس پر سرخ مخمل کے کشن رکھے تھے۔ نگار بیگم آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔

''نگار بیگم.....'' اس آدمی نے گلا کھنکارتے ہوئے کہا۔ نگار بیگم نے آنکھیں کھول کر رانی کو دیکھا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ آدمی وہاں سے چلا گیا۔ رانی نے نگار بیگم کی طرف دیکھا اور دیکھتی ہی رہ گئی۔ وہ واقعی پری تھی، انتہائی خوبصورت، سفید جوان، دراز قد، خوبصورت جھیل سی سیاہ آنکھیں، لمبے، سیاہ و ریشمی بال..... اس نے انتہائی خوبصورت ریشمی لباس پہن رکھا تھا۔ قیمتی زیورات، چوڑیاں، انگوٹھیاں، پازیبیں..... اور ہاتھوں میں گلاب اور موتیے کے گجرے۔ وہ نگار بیگم کے ہوشربا حسن کی طرف دیکھتی ہی رہ گئی۔ اس نے تو اسے نقاب میں دیکھا تھا اور اب وہ پری اس کے سامنے کھڑی تھی۔ مکمل حسن و خوبصورتی کا پیکر..... مجسم خوبصورتی کا شاہکار۔

''کیا نام ہے تمہارا.....؟'' نگار بیگم نے قدرے رعب دار آواز میں پوچھا۔

''رانی.....'' وہ جلدی سے بولی۔

''تم کیوں ہماری خدمت کرنا چاہتی ہو؟'' نگار بیگم نے پوچھا۔

''آپ..... آپ.....؟'' رانی کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کہے۔

''کیا.....؟'' نگار بیگم نے حیرت سے اسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''آپ مجھے اچھی لگتی ہیں۔'' رانی نے اس کی طرف انکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم نے ہمیں کہاں دیکھا؟'' نگار بیگم نے پوچھا۔

''گاڑی میں بیٹھتے ہوئے۔'' رانی نے جواب دیا۔

''کل......؟''

''نہیں......اس سے پہلے بھی......''

''کتنی بار......؟''

''چار بار......''

''ہم تو پورے ماہ میں دن کے وقت صرف چار بار ہی نکلتے ہیں۔ کیا تم ایک ماہ سے ہمیں دیکھ رہی ہو؟'' نگار بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

''جی......جی......'' رانی نے جواب دیا۔

نگار بیگم نے حیرت اور پرستائش نظروں سے اس کی جانب دیکھا اور زیر لب مسکرانے لگی۔ جیسے کوئی بات یاد آ گئی ہو۔

''کیا اس جگہ کے بارے میں کچھ جانتی ہو؟'' نگار بیگم نے پوچھا۔

''نہیں......'' رانی نے جواب دیا۔

''نگار بیگم سوچ میں پڑ گئی......اور اس کی طرف بغور دیکھنے لگی۔ کیا عمر ہے تمہاری......؟'' اس نے رانی سے پوچھا۔

''معلوم نہیں......مجھ سے چھوٹے......سات......نہیں......آٹھ......نہیں سات بہن بھائی ہیں......'' رانی نے جواب دیا۔

''کیا ایک مر گیا......؟'' نگار بیگم نے اسے الجھن کا شکار دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''نہیں......ہاں......ہاں'' وہ بمشکل بولی۔

''کیا......یہاں......رہ سکو گی......مستقل......؟ تمہارے گھر والوں کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا......؟'' نگار بیگم نے پوچھا۔

''نہیں......نہیں......ان کو کیا اعتراض ہوگا؟'' رانی نے جواب دیا۔

''دن......رات......یہاں رہنا پڑے گا......سوچ لو......'' نگار بیگم نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''ٹھیک ہے......میں رہ لوں گی......میرے ماں باپ کے پاس بہت بچے ہیں......کسی ایک کے جانے سے انہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔'' رانی نے جواب دیا۔

''اور تمہیں......؟'' نگار بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

''مجھے......مجھے......بھی......نہیں'' رانی نے جلدی سے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے......جب چاہو......آ جاؤ......مگر ایک بار یہاں آ گئی تو پھر یہاں سے جانے نہیں دوں گی۔'' نگار بیگم ٹھوس لہجے میں بولی۔

رانی اس کی بات سن کر خاموش ہو گئی۔

''کیا اماں......ابے سے ملنے بھی نہیں جانے دیں گی؟ رانی نے حیرت سے پوچھا۔

''شاید وہ خود بھی تم سے ملنا نہیں چاہیں گے۔''

نگار بیگم نے معنی خیز انداز میں کہا تو رانی کو اس کی بات سمجھ میں نہ آئی۔

''اب تم جاؤ......اور جب دل چاہے......آ جانا۔'' نگار بیگم نے اسے سوچ میں گم دیکھتے ہوئے کہا اور رانی وہاں سے اٹھنے لگی تو نگار بیگم نے اپنے پرس میں سے سو کا نوٹ نکال کر اسے پکڑا دیا۔

''یہ......رکھ لو......'' نگار بیگم نے کہا اور رانی خاموشی سے وہاں سے چلی گئی۔ وہ سیڑھیاں اتر رہی تھی جب اچھو نے بغور اس کی جانب دیکھا۔

''اے......سن......'' اچھو نے آواز دی......مگر......رانی سنی ان سنی کرتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

وہ جھگی میں داخل ہوئی تو برکتے نے حیرانگی سے اس کی جانب دیکھا، رانی خاموش تھی، مگر آنکھوں میں ان گنت سوالات اور سوچ تھی۔

''کیا آج تو دھندے پر نہیں گئی......اور بھیک نہیں لائی؟'' برکتے نے حیرت سے اسے پوچھا۔

''لائی ہوں......'' رانی نے خاموشی سے سو کا نوٹ نکال کر اس کی جانب بڑھایا۔ برکتے اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

''یہ بھیک نہیں لگتی......تو کہاں گئی تھی؟'' برکتے نے حیرت سے پوچھا۔

''جہاں بھی گئی تھی......مگر پیسے تو لائی ہوں نا'' رانی نے جواب دیا۔

''سن......ہم در در مانگنے والے بھکاری ہیں، ہم اپنی عزتوں کے بدلے بھیک نہیں لیتے......بھیک ملی تو ٹھیک......نہ ملی تو نہ سہی......ایک ایک سکہ ہم اپنی محنت سے اکٹھا کرتے ہیں......بھیک لینے کے لئے ہم اپنے سر اور تن سے کپڑا نہیں اٹھاتے، اس لئے کوئی ایسا کام نہ کرنا کہ بھکاری بھی تجھ پر تھو تھو کریں۔''

برکتے نے اس انداز میں کہا کہ رانی چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ''میں نے بھی ایسا کوئی کام نہیں کیا......تو بے فکر رہ۔'' رانی کہہ کر جھگی سے باہر نکل گئی۔ برکتے خاموش تو ہو گئی، مگر اس کے جواب سے مطمئن نہ ہوئی۔

''نگار بیگم اچھی عورت ہے......اماں کو کیا پتا......؟ وہ تو ہر وقت جھگی کے اندر ہی رہتی ہے......یا پھر کبھی کبھار بھیک مانگنے چلی گئی......نگار بیگم جیسی عورت تو اس نے بھی زندگی بھر نہیں دیکھی ہوگی۔'' رانی نے اپنے دل کو تسلی دی اور روٹیاں بنانے لگی۔

''رات بھر وہ سوچتی رہی......نگار بیگم نے اس کے سامنے بھاری شرط رکھی تھی......مگر زندگی میں کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا بھی پڑتا ہے۔ جب ابا نے اس بچے کو کوڑے پر پھینک دیا......تو......اس کے لئے میں بھی اہم نہیں ہوں......اور......اتنے ڈھیر بچوں میں کسی کو میری کیا پروا۔ یہاں ساری زندگی سڑنے سے بہتر ہے میں نگار بیگم کے پاس چلی جاؤں، کم از کم پیٹ بھر کر کھانا تو نصیب ہوگا......اور......اسے وہ رنگ برنگی میٹھے چاول یاد آنے لگے تو اس کے منہ میں پانی بھرنے لگا۔

''ہمیں تو کبھی ایسا کھانا نصیب نہیں ہوا......اور......اس کے ہاں تو شاید ہر روز ایسے ہی کھانے پکتے ہوں گے......اور......جس انسان کو

پیٹ بھر کر کھانا نہ ملے......اسے تو جینا ہی نہیں چاہئے......مر جانا چاہئے۔" اس نے قدرے سرکش انداز میں سوچا......

یہاں بھوکے پیٹ سونے اور مرنے سے بہتر ہے...... میں نگار بیگم کے پاس چلی جاؤں......اس کے پاس جا کر میری زندگی بن جائے گی......اس کے کپڑے کتنے خوبصورت تھے......اور......زیورات......گھر......سب کچھ تو اس کے پاس ہے......اور مجھے بھی سب کچھ چاہئے......رنگ برنگے کھانے......خوبصورت کپڑے، زیور اور سب کچھ۔" اس نے پکا ارادہ کر لیا کہ وہ کل ہی نگار بیگم کے پاس چلی جائے گی۔ اس نے اردگرد دیکھا، ہر طرف اندھیرا تھا۔ سب سو رہے تھے، اس نے چپکے سے اپنے کپڑوں کی گٹھڑی بنائی، اس میں اپنی جمع شدہ چیزیں اکٹھی کی ہوئی چھوٹے چھوٹے بندے، ہار، چوڑیاں اور لوہے کے زیورات رکھے اور گٹھڑی چھپا کر رکھ دی۔

"رانی......اٹھ اٹھ......دن چڑھ گیا ہے......بچوں کو چائے پانی پکا دے......سب نے دھندے پر جانا ہے۔" برکتے نے رانی کو آوازیں دیں......مگر رانی نے کوئی جواب نہ دیا۔ برکتے گھبرا گئی اور ملکے کو اٹھایا۔

"ارے ملکے......اٹھ......بجو......مٹھو......اٹھو دیکھو......رانی یہاں نہیں ہے......دیکھو کہاں گئی ہے؟" برکتے کی آواز حلق سے نہیں نکل رہی تھی۔ وہ چیخنے لگی۔

سب بچے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے، جھگی کے اندر اور باہر اس کی تلاش شروع کر دی، مگر رانی غائب تھی۔

"وہ......وہ......یہاں نہیں ہے......کہیں بھی نہیں ہے......کہیں چلی گئی ہے......" بجو نے باہر سے آ کر گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"حرام خور......بھاگ گئی ہے......" ملکا آہ بھر کر بے بسی سے بولا۔

"برکتے بے سدھ ہو کر چارپائی پر گر گئی......اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

"تو......بڑی بدبخت عورت ہے......کیا اولاد جنی ہے......ایک رانی اور ایک وہ......؟ باقی نجانے کیا دن دکھائیں گے......؟" ملکے نے برکتے کو گالیاں دیتے ہوئے کہا تو برکتے کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے وہ بے بسی سے جھگی کے پھٹے چھت کو دیکھنے لگی، جس میں جگہ جگہ چھید تھے......اور......ان چھیدوں میں سے روشنی اندر آ رہی تھی......ان چھیدوں میں سے برکتے نے آسمان کی طرف دیکھا اور گہری سانس لے کر آہ بھری۔

☆

نرگس، فردوس اور جمی بچے کے پیچھے دیوانے ہو گئے تھے۔ اس کی چھوٹی چھوٹی باتوں اور حرکتوں پر دیر تک ہنستے رہتے۔ نرگس۔ اس کی ماں، فردوس۔ اس کی آیا اور جمی۔ ماموں تھا......وہ اتنے قریبی رشتوں کے ساتھ پل کر بڑا ہو رہا تھا، اس کی توتلی باتیں ان کو دن بھر خوش رکھتیں، ان کی زندگیوں میں گویا بہار کا خوشگوار جھونکا آ گیا تھا، جس نے ان کی افسردہ، مایوس اور مرجھائی ہوئی زندگیوں کو خوشگوار اور تر و تازہ کر دیا تھا۔ بچے کے لئے نت نئے کپڑے اور کھلونے خریدے جاتے، وہ کھیلنے لگا تو اس کے لئے گاڑیاں اور سائیکلیں خریدی گئیں۔ اس کے مستقبل کی منصوبہ بندی کی جاتی، اسے کس عمر میں کس سکول میں بھیجنا ہے۔ نرگس اسے بڑا افسر دیکھنا چاہتی اور فردوس اسے پولیس میں اور جمی اسے سٹیج ایکٹر بنانے کی تجویز دیتا تو نرگس اور فردوس اس کے پیچھے پڑ جاتیں۔

"سن رے جی ...... ہم اس کو ناچ گانا نہیں سکھائیں گی، یہ پڑھ لکھ کر بڑا افسر بنے گا یا پولیس والا ......" فردوس کہتی تو جی خاموش ہو جاتا۔

"تین سال کی عمر میں وہ اسے شہر کے بہترین سکول میں داخل کرانے کے لئے چلی گئیں۔ پرنسپل نے خاموش نظروں سے دونوں کی جانب دیکھا۔

"بچے کا نام کیا ہے......؟" پرنسپل نے پوچھا۔

"سلیم...... ہاں...... سلیم......" نرگس جلدی سے بولی۔

"سوری...... ہم اسے اپنے سکول میں داخل نہیں کر سکتے...... یہ لڑکیوں کا سکول ہے...... آپ اسے لڑکوں کے سکول میں داخل کرائیں۔" پرنسپل نے انہیں ٹالنے کے انداز میں کہا۔

"مگر...... ہم نے تو ...... یہاں لڑکوں کو بھی دیکھا ہے...... اسی لئے تو ادھر آئی ہیں۔" فردوس جلدی سے بولی۔

"پہلے ہم لڑکوں کو داخل کرتے تھے...... مگر اب نہیں......" پرنسپل نے دوٹوک لہجے میں کہا اور انہیں باہر کا راستہ دکھایا۔ وہ خاموشی اور بے بسی سے باہر نکل گئیں۔

بچے کا ہاتھ پکڑے وہ دوسرے سکول کی جانب چلی گئیں، مگر سارا راستہ خاموش رہیں...... اندر ہی اندر ان کے دل وسوسوں اور اندیشوں سے پریشان ہونے لگے۔

"فردوس...... اگر ہمارے بے بی کو کہیں داخلہ نہ ملا...... تو...... پھر کیا کریں گی...... اسے کہاں داخل کرائیں گی؟" نرگس نے پریشان ہو کر سوچا۔

"آپا...... فکر نہ کر...... کہیں نہ کہیں اسے ضرور داخلہ ملے گا......" فردوس نے اسے تسلی دی۔

"اب تم اس کا نام سعدیہ بتانا۔" نرگس نے ایک لڑکیوں کے سکول میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"پرنسپل ایک فیشن ایبل ادھیڑ عمر عورت تھی۔ اس نے فردوس، نرگس اور بچے کو حیرت اور ناگواری کے ملے جلے تاثرات سے دیکھا۔

"پرنسپل صاحب...... ہماری بچی بہت ذہین ہے...... ہم اسے آپ کے سکول میں داخل کرانے آئی ہیں۔" نرگس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مگر یہ تو لڑکوں کا سکول ہے...... ہم آپ کی بچی کو داخل نہیں کر سکتے۔" پرنسپل نے قدرے بے رخی سے جواب دیا۔

"مگر...... ہم تو باہر سے پوچھ کر آئی ہیں...... یہ لڑکیوں کا ہی سکول ہے۔" فردوس نے کہا۔

"اس سال سے ہم صرف لڑکوں کا داخلہ کریں گے۔" پرنسپل نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

"کیا ہمارے بچے کی وجہ سے آپ نے ایسا سوچا ہے؟" نرگس قدرے خفگی سے بولی۔

"آپ خاصی سمجھدار ہیں...... آپ اسے جہاں بھی لے کر جائیں گی...... آپ کو ایسا ہی جواب ملے گا...... کیونکہ والدین بھی اعتراض کر سکتے ہیں اور بچے بھی مسئلہ کریں گے۔" پرنسپل نے کہا۔

"کیا...... ہمارے بچے کہیں نہیں پڑھ سکتے...... ہمارا قصور تو بتائیں کہ ہم اپنے بچوں کو پڑھا بھی نہیں سکتے۔" نرگس نے نم آنکھوں سے کہا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں...... مگر ہم بھی مجبور ہیں۔" پرنسپل نے کہا تو، دونوں خاموش ہو گئیں اور بچے کو لے کر باہر آ گئیں۔ "فردوس......

ہم کتنی بد نصیب ہیں......جو......اپنے بچے کو پڑھا بھی نہیں سکتیں۔'' نرگس نے روتے ہوئے کہا۔

''ہاں......یہ......دنیا بڑی ہی ظالم ہے۔'' فردوس نے جواب دیا۔

گھر آ کر سارا دن وہ روتی رہیں، بین کرتی رہیں، بے بی حیرانگی سے ان کو دیکھتا رہا۔

''اماں......کیوں روتی ہے؟'' بے بی نے پوچھا۔

''کچھ نہیں......بس یونہی۔'' نرگس نے اسے اپنے سینے کے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔ جمی آیا تو اس کو بھی یہ خبر سنائی گئی۔

''اے ہائے......آپا......کاہے کو رو رہی ہے......باؤلی نہ ہو......تو......کیا ہوا......اگر......اسے کسی سکول میں داخلہ نہیں ملتا......ہم اسے ٹیوشن پڑھنے بھیج دیں گے، وہاں تو کوئی مسئلہ نہیں ہوگا اور دور کیوں جاتی ہو......میری خالہ کی بیٹی بچوں کو ٹیوشن پڑھاتی ہے، وہ اسے ٹیوشن پڑھا دے گی۔'' جمی نے کہا تو جیسے ان کو حوصلہ مل گیا۔

''سچ......جمی......تیری خالہ کی بیٹی اسے پڑھا دے گی......جتنی فیس کہے گی......میں اسے دوں گی۔ بس......میرے بے بی کو پڑھا دے......'' نرگس نے قدرے خوش ہو کر کہا۔

''ہاں......ہاں......کیوں نہیں......میں کل ہی اس سے بات کروں گا۔'' جمی نے کہا تو وہ خاموش ہو کر اسے دعائیں دینے لگیں۔

☆

''ہم نے تو بس شمی سے ہی کٹنگ کروانی ہے......اگر وہ ہے تو ہم بیٹھتی ہیں......ورنہ کل آ جائیں گی۔'' دو انتہائی ماڈرن لڑکیوں نے بیوٹی پارلر کی ریسپشنسٹ لڑکی سے کہا۔

''میم......وہ بہت بزی ہیں......آپ کسی اور سے کٹنگ کروا لیں۔'' لڑکی نے بتایا۔

''شمی ہے کہاں......؟ ہم نے سنا تھا......کہ......وہ آؤٹ آف کنٹری گیا ہے۔'' لڑکی نے پوچھا۔

''نہیں......وہ آ چکے ہیں اور اس وقت وہ کٹنگ میں ہی بزی ہیں......مگر بہت سی لیڈیز پہلے ہی ان کے انتظار میں بیٹھی ہیں......آپ کی باری رات کو آئے گی......ابھی شام کے پانچ بج رہے ہیں۔'' لڑکی نے بتایا۔

''تو ٹھیک ہے......ہم کل آ جائیں گی......آپ ہماری کل کی بکنگ کر لیں۔'' دوسری لڑکیوں نے کہا۔

''وہ کل بھی بزی ہیں......کل......اور پرسوں کی بھی بکنگ ہو چکی ہے۔'' لڑکی نے بتایا۔

''ٹھیک ہے......ہم اگلے ہفتے آ جائیں گی......اس کی بکنگ کر لیں۔'' ''اگلے ہفتے وہ سنگاپور جا رہے ہیں......ایک فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں۔ فلم کی ہیروئن کے میک اپ کے لئے اور شاید دو ہفتے بعد لوٹیں......یا......اس سے بھی زیادہ دن لگ سکتے ہیں۔'' لڑکی نے بتایا۔

''اف خدایا......یہ شمی کو کیا ہوتا جا رہا ہے......اس قدر بزی کیوں ہو رہا ہے......اب کیا کریں؟ کالج میں فنکشن اگلے ہفتے ہے اور مجھے ہر صورت میں اسی سے کٹنگ کرانی ہے۔'' لڑکی نے پریشانی سے دوسری کو کہا۔

''پلیز کسی طرح......کوئی ٹائم ہمیں دیں......ہم نے اسی سے کٹنگ کرانی ہے۔ ہمارے کالج میں بہت گرینڈ فنکشن ہو رہا ہے۔'' لڑکی نے پریشانی سے ریسپشنسٹ کو کہا۔

''اگر کوئی بکنگ کینسل ہوتی ہے......تو......پھر ہی ممکن ہوگا، ورنہ میں کیا کہہ سکتی ہوں۔'' لڑکی نے کہا۔

''ٹھیک ہے آپ ہمارا نمبر نوٹ کرلیں......اور ہم انتظار کریں گی۔'' لڑکیوں نے کہا اور نمبر نوٹ کروا کر چلی گئیں۔

شامو المعروف شمی بڑے شہر کے سب سے مشہور اور معروف بیوٹی پارلر کا سب سے مشہور اور ماہر بیوٹیشن تھا، خصوصی طور پر کٹنگ میں اس جیسا کوئی نہیں تھا۔ کالجز اور یونیورسٹیز کی لڑکیاں، فلمی ہیروئنز اور اپر کلاس کی ساری ماڈرن اور فیشن ایبل لڑکیاں صرف شمی سے ہی کٹنگ کرانے آتی تھیں۔ جمالے کے شاگرد اسلم نے اس کے ہاتھ میں ہنر دیکھ کر اسے لیڈیز پارلر میں شفٹ کر دیا تھا۔ اس کے مردانہ پن پر کچھ خواتین کو اعتراض ہوتا، مگر جلد ہی سب میں وہ "Gay" مشہور ہو گیا تو لڑکیاں جیسے مطمئن ہو گئیں۔ بلا جھجک اس کے پاس چلی آتیں اور شمی سے کٹنگ کرواتے ہوئے بہت ایزی محسوس کرتیں۔ اس نے جلد ہی بہت ترقی کر لی تھی۔ ......شہر کے اچھے علاقے میں اس نے اپنا گھر خرید لیا تھا اور گاڑی بھی بہت اچھی لی تھی، بینک بیلنس بھی بہت زیادہ تھا۔ اسلم کے پاس آنے سے اس کی قسمت کے وارے نیارے ہو گئے تھے۔ اس کے ہاتھ کا ہنر اس کے کام آ رہا تھا۔ اس کی شہرت بھی پورے شہر میں پھیل چکی تھی۔ سب کو اس کی ذات سے نہیں......اس کے ہنر سے واسطہ تھا......اس کی عزت اس کے ہنر کی وجہ سے تھی......

اور اپنی اس عزت و اہمیت پر شمی دلی طور پر بہت مطمئن ہو گیا تھا۔ اسلم اس کا بہت خیال رکھتا تھا اور اس سے بہت محبت و عزت سے پیش آتا، کیونکہ اسے اس کے استاد نے بھیجا تھا اور وہ اپنے استاد کی بہت قدر کرتا تھا۔ اسے یہاں آ کر بالکل اجنبیت محسوس نہ ہوئی۔ شروع شروع میں لوگ اس کو تنقید کا نشانہ بنانے کی کوشش کرتے، مگر اسلم کی حوصلہ افزائی اور مدد سے وہ ہر تنقید سے محفوظ رہتا۔ اسلم اس کے لئے ڈھال بن گیا تھا، جس کی پناہ میں آ کر وہ اپنے آپ کو ہر شر سے محفوظ سمجھتا تھا۔

''ہمیں شمی سے ملنا ہے......''

''مجھے شمی کا فون نمبر چاہئے......''

''شمی کب مل سکتے ہیں......؟''

''ہماری بکنگ صرف شمی کے لئے کریں......''

''پارلر میں آنے والی ہر خاتون کی زبان پر صرف شمی کا نام ہوتا اور شمی خوشی سے پھولا نہ سماتا، جب ہر کوئی شمی کے بارے میں پوچھتا۔

''یار شمی......تو......تو بڑے نصیب والا ہے......ہر کوئی تیرے بارے میں ہی پوچھتا ہے......مجھے تو......جیسے کوئی جانتا ہی نہیں۔ اسلم نے ایک روز شمی کو اپنے سیلون کے ویل فرنشڈ آفس میں بلا کر کہا۔

''اسلم بھائی......یہ تو انسان کو خود پتا ہوتا ہے......کہ وہ کتنے نصیب والا ہے......مگر آپ اور استاد جمالے جیسے اچھے لوگ دوسروں کی قسمتوں کو سنوار دیتے ہیں......'' شامو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں......انسان بھی بڑی عجیب مخلوق ہے...... جو کوئی اس کی مصیبت میں اس کے کام آتا ہے...... وہ ساری زندگی اس کا قرض دار ہو جاتا ہے جتنی ایک انسان کی اچھائی دوسرے انسان کے دل کو بدلتی ہے۔ دنیا کی کوئی اور شے نہیں بدل سکتی۔'' اسلم نے جواب دیا۔

''آپ لوگوں سے ملنے سے پہلے میں بھی سمجھتا تھا کہ اس دنیا کے سب انسان ایک جیسے ہی برے ہیں۔ دوسروں پر ہنسنے والے، انہیں تنقید، طنز اور مذاق کا نشانہ بنانے والے...... مگر...... اب یہ یقین ہونے لگا ہے کہ بہت سے ایسے لوگوں میں سے صرف چند ایک دوسروں کے دکھوں کو سمجھنے والے، ان کے زخموں پر مرہم رکھنے والے بھی ہوتے ہیں۔'' شامو نے کہا۔

''بس...... بھئی...... بس...... زیادہ تعریفیں نہ کرو...... کہیں ہم بھی برے نہ ہو جائیں۔'' اسلم نے ہنستے ہوئے کہا۔

''نہیں...... آپ برے نہیں ہو سکتے۔'' شامو نے مسکرا کر کہا۔

''کیوں......؟ انسان کو بھلا بدلتے دیر ہی کتنی لگتی ہے؟'' اسلم بولا۔

''نہیں...... اچھے انسانوں کے دل اللہ نے بڑے اچھے بنائے ہوتے ہیں۔ شاید کسی خاص چیز سے...... وہ ٹوٹ تو جاتے ہیں، مگر کبھی بے ایمان نہیں ہوتے اور نہ ہی بددیانتی کرتے ہیں۔'' شامو نے کہا۔

''تمہیں کیسے معلوم ہے......؟'' اسلم نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے استاد جمالے کے دل کو بہت دفعہ ٹوٹتے دیکھا...... اسے روتے دیکھا...... اس کے بیٹوں نے اسے بہت تنگ کر رکھا تھا، مگر اس نے کبھی ان کو برا نہیں کہا تھا۔ اسلم بھائی کیا یہ کم بات ہے کہ وہ اپنی روزی کا اڈا بھی ان کی خاطر بیچنے کو تیار ہو گیا تھا۔ مجھے اکثر استاد بڑا یاد آتا ہے۔'' شامو نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''شامو...... استاد جیسے لوگ واقعی اس دنیا میں بہت کم ہیں اور یہ کتنی بدقسمتی ہے کہ اپنے ہی لوگ ان کی قدر نہیں کرتے۔'' اسلم نے افسردگی سے کہا۔

''کیا مطلب......؟ شامو نے چونک کر پوچھا۔

''استاد بہت بیمار ہے...... آج کل...... کسی خیراتی ہسپتال میں ہے...... اس کا بیٹا تین سال پہلے لندن گیا تھا، اس نے کبھی پلٹ کر خبر نہ لی۔ استاد کی بیوی بیٹے کے غم میں مر گئی...... دو بیٹے اپنی بیویوں کے ساتھ دوسرے شہروں میں چلے گئے۔ استاد کی ایک ہی بیٹی ہے، مگر وہ بھی بہت غریب ہے۔ اس نے ہی مجھے استاد کے کہنے پر اطلاع دی ہے۔ میں تمہیں بتانا تو نہیں چاہتا تھا کہ کل تم سنگاپور جا رہے ہو...... اب تم نے استاد کا ذکر چھیڑا ہے تو میں نے سوچا...... تجھے بتا ہی دوں۔'' اسلم نے کہا۔

''استاد کو کیا ہوا ہے؟'' شامو نے حیرت سے پوچھا۔

''معدے میں کینسر ہے......'' اسلم آہستہ سے بولا۔

''اسلم بھائی...... کیا میرا سنگاپور جانا ملتوی ہو سکتا ہے؟'' شامو نے نم آنکھوں سے پوچھا۔

''نہیں یار...... فلم کی شوٹنگ کا مسئلہ ہے...... اور ہم ایڈوانس بھی لے چکے ہیں۔'' اسلم نے بتایا۔

''اسلم بھائی...... کسی طرح یہ ممکن ہوسکتا ہے...... کہ میں استاد کو بس ایک بار جا کر دیکھ آؤں...... '' شامو نے التجا کرتے ہوئے کہا۔

ٹھیک ہے...... میں پروڈیوسر سے بات کر کے دیکھتا ہوں۔'' اور اسلم نے فون نمبر ملا کر بات کی۔

''یار...... وہ کسی صورت نہیں مان رہا...... میں نے کسی اور ہیروئین کو بھیجنے کو کہا ہے، مگر وہ پھر بھی نہیں مانتا...... البتہ تم یوں کر سکتے ہو کہ ابھی چلے جاؤ اور صبح تک واپس آجاؤ۔ میں ایک دو روز کے بعد اسے ملنے جاؤں گا۔'' اسلم نے کہا۔

''مگر اسلم بھائی ...... میری ساری پیکنگ ہونے والی ہے۔'' شامو نے کہا۔

''تو...... فکر نہ کر...... میں نجی سے کہہ دیتا ہوں۔ وہ جا کر تمہاری پیکنگ کر دیتی ہے۔'' اسلم نے اپنی ایک اسسٹنٹ کے بارے میں کہا۔

''ٹھیک ہے...... میں گھر کی چابیاں نجی کو دے جاؤں گا۔'' شامو کہہ کر وہاں سے چلا گیا۔

رات کو وہ دیر سے استاد کی بیٹی کے گھر پہنچا تو ان کی غربت اور پسماندگی دیکھ کر وہ بہت پریشان ہوگیا...... استاد ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکا تھا...... اس کی حالت دیکھ کر شامو کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ رونے لگا۔

''استاد...... تو نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا...... کہ تو اتنا بیمار ہے۔ میں تجھے شہر کے سب سے بڑے ہسپتال میں لے جاتا...... یہ تو اسلم بھائی نے بتایا ہے...... اور...... میں کل سنگاپور جا رہا ہوں۔ اس لئے ابھی تجھ سے ملنے آگیا ہوں۔'' شامو نے جواب دیا۔

''اچھا کیا...... تو...... ملنے آگیا...... پتا نہیں...... تیرے آنے تک میں زندہ بھی رہتا ہوں...... یا نہیں۔'' جمالے نے آہ بھر کر کہا۔

''استاد......تو...... ایسی باتیں کیوں کر رہا ہے......؟ تو زندہ رہے گا......'' شامو نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

''شامو...... اب میری زندگی کی کسی کو ضرورت نہیں۔'' جمالے نے روتے ہوئے جواب دیا۔

''استاد...... مجھے تیری زندگی کی سب سے زیادہ ضرورت ہے تو نے کہا تھا نا...... تو میرا باپ ہے...... تو...... کیا...... تو مجھے یونہی چھوڑ کر چلا جائے گا۔'' شامو نے رنجیدگی سے کہا۔

''جانا تو ہے...... ہی......'' جمالے نے جواب دیا اور اس کی ہچکی بندھ گئی۔

''استاد...... ہمت کر...... تو ٹھیک ہو جائے گا...... یہ...... یہ کچھ پیسے ہیں، انہیں رکھ لے...... ان سے اپنا علاج کرانا...... میں جلد واپس آؤں گا...... اور آکر...... تجھے اپنے ساتھ لے جاؤں گا...... شہر کے بڑے ہسپتال سے تیرا علاج کراؤں گا۔'' شامو نے اسے ایک لفافہ پکڑاتے ہوئے کہا۔

''کتنے ہیں......؟'' جمالے نے پوچھا۔

''دو لاکھ......'' شامو نے جواب دیا۔

''کہاں سے لئے......؟'' جمالے نے حیرت سے پوچھا۔

"میری اپنی محنت کی کمائی کے ہیں...... اسی ہنر سے کمائے ہیں جو تو نے مجھے سکھایا...... ورنہ میرے پاس تو چائے کا کپ پینے کے لئے بھی پیسے نہیں تھے...... تجھے یاد ہے ناوہ دن۔" شامو نے اسے یاد دلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں...... اچھی طرح یاد ہے...... مگر یہ تیری محنت کے روپے ہیں انہیں تو اپنے پاس رکھ۔" میں نے زندہ تو بچنا نہیں۔ خواہ مخواہ تیری رقم برباد کروں...... اس بیماری سے کون بچ سکتا ہے۔" جمالے نے افسردگی سے کہا۔

"استاد ایسی باتیں مت کر...... اب اس بیماری کا علاج ممکن ہے...... تو حوصلہ نہ ہار...... تو علاج کرا...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔" شامو نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ نہیں شامو...... میری بیماری آخری سٹیج پر ہے، اب کوئی علاج ممکن نہیں...... بس دعا کرنا...... سکون سے مر سکوں۔" جمالے نے کہا تو شامو سسکیاں بھرنے لگا......

کیسے تیرے مرنے کی دعا...... کر سکتا ہوں...... یہ مجھے مت کہنا۔" شامو کی ہچکی بندھ گئی اور وہ نوٹوں کا لفافہ وہیں رکھ کر لوٹ آیا۔

☆

رانی گھر سے کیا بھاگی تھی۔ برکتے بستر سے لگ گئی تھی۔ ملکا اٹھتے بیٹھتے اسے لعن طعن کرتا رہتا اور وہ بے بسی سے اس کی باتیں سنتی رہی۔ جمو اور مٹھو بھی اسے گالیاں بکتے۔ البتہ چھوٹے بہن بھائی اسے محبت سے یاد کرتے، تو برکتے کی آنکھیں بھیگ جاتیں برکتے کو رانی سے بہت محبت تھی، مگر وہ اس سے اپنی بھرپور محبت کا اظہار کبھی کر نہیں پائی تھی...... وہ اس کی سب سے بڑی بیٹی تھی اور بڑی اولاد سے ماں باپ کو محبت بھی کچھ زیادہ ہوتی ہے۔ رانی کے ساتھ برکتے کو بہت محبت محسوس ہوتی تھی، مگر وہ ہر وقت اسے ڈانٹتی رہتی تھی۔ رانی اکثر برکتے سے خفا بھی رہتی تھی۔ دونوں میں تلخ کلامی بھی ہوتی تھی...... مگر...... دونوں ایک دوسرے کی محبت کو بہت محسوس کرتیں تھیں گو کہ خاموش رہتی تھیں۔ رانی قدرے سنجیدہ مزاج کم گو مگر حساس طبیعت کی تھی۔ وہ برکتے کی ڈانٹ سننے سے پہلے ہی گھر کا کام شروع کر دیتی تھی۔

برکتے کو یاد آتا تھا وہ اکثر رات کو برکتے کے ساتھ جاگتی رہتی اور بچے پالنے میں اس کی مدد کرتی...... گھر کے کام کاج میں اس کا ہاتھ بٹاتی اور سارا دن کام دھندے میں بھی گزارتی۔" پہلے اس کا بچہ چھن گیا تھا اور اب جوان بیٹی...... رانی کے صدمے نے تو اس کی کمر توڑ دی تھی۔"

"جمو...... جا اسے کہیں سے ڈھونڈ کر لا...... میں اس کے بغیر مر جاؤں گی۔" برکتے تنہائی میں جمو کا ہاتھ پکڑ کر روتے ہوئے التجا کرتی۔

"اماں...... تو سمجھتی کیوں نہیں...... وہ گھر سے بھاگ گئی ہے، اپنی مرضی سے گئی ہے...... اپنے کپڑے اور چیزیں لے کر...... میں اب اسے کہاں سے ڈھونڈ کر لاؤں...... خود ہی گئی ہے، خود ہی آ جائے گی۔" جمو منہ بنا کر جواب دیتا۔

"مٹھو...... تو ہی بہن کو ڈھونڈ لا......" برکتے تنہائی میں مٹھو کے آگے ہاتھ جوڑتی۔

"میں...... بھلا...... اسے کہاں سے ڈھونڈوں...... مجھے کیا پتا وہ کہاں گئی ہے؟" مٹھو قدرے معصومیت سے جواب دیتا۔

وہ اکثر ملکے کا موڈ بہتر دیکھ کر اس کے آگے ہاتھ جوڑتی۔ "ملکے...... اللہ کے واسطے...... میری دھی کو ڈھونڈ لا...... دیکھ میرا دل اس کے بغیر بڑا اداس ہے...... کلیجہ پھٹ گیا ہے......" برکتے رو رو کر اس کے آگے درخواست کرتی۔

''برکتے......اس کو بھول جا......وہ اپنے کسی یار کے ساتھ بھاگ گئی ہے، اب نہیں آنے کی۔'' ملکا غصے سے کہتا۔

''نہیں......میری رانی ایسی نہیں ہے......وہ ایسا نہیں کر سکتی۔'' برکتے نے اسے جھٹلاتے ہوئے کہا۔

''کر کیوں نہیں سکتی......عورت ذات کا کیا بھروسہ؟ وہ جو کرنا چاہے تو اسے کون روک سکتا ہے؟'' ملکے نے کہا۔

''ملکے......سچ بتا......کیا تیرا دل اس بات کو مانتے ہے کہ ہماری رانی کسی کے ساتھ بھاگ سکتی ہے۔'' برکتے نے حیرت سے پوچھا۔

''جب......تو......ہیجڑا پیدا کر سکتی ہے......تو......رانی بھی بہت کچھ کر سکتی ہے۔'' ملکے نے اسے طعنہ دیتے ہوئے کہا۔

''اللہ سے ڈر......یہ اس کے رنگ ہیں......وہ جو چاہے پیدا کرے......انسان کا اس میں کیا بس ہے؟'' برکتے نے بھی غصے سے جواب دیا۔

''اللہ جو چاہے......وہ......کرے......تو پھر بندہ بھی جو چاہے وہ کر سکتا ہے......تیری رانی نے بھی گھر سے بھاگنا چاہا تو بھاگ گئی......اس کو کس نے روک لیا؟ اس بے حیا......بے شرم کو ذرا سی بھی لاج نہ آئی......نہ تیرا کچھ سوچا نہ میرا......ہماری عزت کو داؤ پر لگا گئی......میں تو تھوکتا ہوں، اس منحوس کی شکل پر۔'' ملکا غصے سے دھاڑتا تو برکتے نے خاموش رہنے میں ہی عافیت سمجھی، مگر اس کا دل ہر وقت رانی کے لئے بے تاب رہتا......وہ اس کے غم میں روتی رہتی۔ اٹھتی بیٹھتی بڑبڑاتی رہتی جیسے اس سے کچھ کہہ رہی ہو......بس رانی کی باتیں اور اس کے الفاظ سنائی دیتے......رانی کہاں گم ہو گئی ہے......؟

''ہائے......رانی تو اپنی بوڑھی ماں کو چھوڑ کر کیوں چلی گئی......تجھے کہاں سے ڈھونڈ کر لاؤں۔

''یا اللہ! میری رانی کو میرے پاس بھیج دے......سوا روپے کی نیاز چڑھاؤں گی۔'' اس نے دل ہی دل میں پکی منت مان لی تھی۔

☆

میں پانچ ہزار روپے کی نیاز دوں گی......جس دن میں نگار بیگم کی طرح نوٹوں کے فرش پر چلوں گی۔'' وہ ہر رات کو آنکھیں بند کر کے اپنی اس منت کو یاد کرتی......اس کو ہر طرف رنگ برنگی نوٹوں کی گڈیاں اور بکھرے نوٹ نظر آتے......اس کے پاس اتنی دولت ہو گی کہ وہ اچھے اچھے کھانے کھائے گی......اچھے کپڑے پہنے گی اور زیورات......اچھا عالیشان گھر......گاڑی......اور نوکر......مجھے یہاں آئے تین سال ہو گئے ہیں......نگار بیگم کی خدمت کرتے ہوئے اس کے پاؤں دھوتے ہوئے......اس کے سر کی مالش کرتے ہوئے......اس کے کندھے اور جسم دباتے ہوئے......اس کے کمروں کی صفائی کرتے ہوئے......اس کے گندے مندے کام کرتے ہوئے......وہ جو خواب لے کر آئی تھی وہ پورا ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا......نگار بیگم اس کا یہاں آنے کا مقصد نہیں سمجھ رہی تھی۔ اس نے تو اسے نوکرانی بنا کر رکھ دیا تھا۔ وہ اسے اپنی اترن پہناتی۔ اسے بچا ہوا کھانا دیتی، مگر اس کی ہتھیلی پر ایک روپیہ نہ رکھتی......اس سے بہتر تو وہ بھکارن تھی......دن بھر اس کی کشکول میں سکے تو رہتے تھے۔ کبھی کبھار روپے بھی مل جاتے تھے اور یہاں آ کر تو وہ بھیک سے بھی گئی تھی......اور......اس پر مزید یہ کہ وہ اس کو کوٹھے سے نیچے بھی نہیں اترنے دیتی تھی۔ وہ تو سارا دن سڑکوں پر پھرنے والی تھی......اب وہ ہر وقت نگار بیگم کی خدمت میں ہی مصروف رہتی۔ اس کے لئے وہ کسی کو الزام نہیں دے سکتی تھی۔ یہ راستہ اس نے خود چنا تھا۔ اسے نگار بیگم ہی اپنی منزل نظر آتی تھی۔ بہت سی دولت حاصل کر کے اپنی زندگی کو بدلنے کا خواب اس کا اپنا تھا اور ہر انسان کو اپنی زندگی اچھی طریقے سے گزارنے کا حق ہے......وہ اچھے طریقے سے رہ رہی تھی۔ ایک بھکارن نہیں بلکہ ایک نوکر بن کر......وہ دن اسے اچھی طرح یاد تھا جب وہ اپنی جگی

سے صبح سویرے بھاگ کر نگار بیگم کے کوٹھے پر آئی تھی۔

"تم آج یہاں جس راستے پر چل کر آئی ہو......اس کو ہمیشہ کے لئے بھول جاؤ۔" نگار بیگم نے قدرے ٹھوس لہجے میں کہا۔ رانی نے حیرت سے نگار بیگم کی طرف دیکھا۔

"کیا نام ہے تمہارا......؟" نگار بیگم نے قدرے توقف کے بعد پوچھا۔

"رانی......" اس نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

"رانی نہیں......تم......"رینا" ہو......تم یہاں ہماری خدمت کے لئے آئی ہونا......ہم دیکھنا چاہتے ہیں......تم ہماری کتنی خدمت کر سکتی ہو......" نگار بیگم نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"جی......جی......ہاں" رانی بمشکل بولی۔

"چمن بیگم......" نگار بیگم نے آواز لگائی۔

ایک سینتالیس سالہ خوش لباس اور خوش شکل عورت قدرے موٹی عورت دوڑتی ہوئی آئی۔

"چمن بیگم......آج سے آپ کی ساری ذمہ داریاں......رینا بیگم سنبھالیں گی۔" نگار بیگم نے رانی کی طرف اشارہ کیا تو رانی حیرت سے دونوں کو دیکھنے لگی......چمن بیگم نے معنی خیز انداز میں رانی کو سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا۔

"آیئے......رینا بیگم......ہم آپ کو سب کچھ سمجھا دیتے ہیں۔"

چمن بیگم اس کو اپنے ساتھ لے کر باہر چلی گئی......اور اس روز سے لے کر آج تک وہ صبح سے لے کر رات تک نگار بیگم کی ساری ذمہ داریاں نبھاتی تھی۔ رانی جب سے "رینا بیگم" بنی تھی اس کا حلیہ بھی بدل گیا تھا اور طرز زندگی بھی......وہ خوش لباس ہو گئی تھی......اچھے کپڑے اور زیورات پہننے سے اس کی شکل وصورت میں واضح تبدیلی آ گئی تھی......اس کی رنگت نکھرنے لگی تھی اور چہرے کے نقوش مزید خوبصورت اور نمایاں ہونے لگے تھے۔ آنکھوں میں کاجل اور ابروؤں کو خمدار بنانے......بالوں کو مختلف انداز سے گوندھ کر چٹیا بنانے سے وہ بالکل ہی بدل گئی تھی۔ نگار بیگم کی قربت نے اس کو بہت کچھ سکھلا دیا تھا۔ وہ ان کے آداب گفتگو وطعام، نشست و برخاست، چلنے پھرنے اداؤں و ناز نخرے کا اچھی طرح مشاہدہ کرتی......وہ نگار بیگم کو لمحہ لمحہ اپنے اندر اتارتی......وہ ذہین تھی......کم گو......اور سنجیدہ مزاج بھی......نگار بیگم سے زیادہ گفتگو نہ کرتی......جو وہ حکم کرتیں خاموشی سے بجا لاتی......نگار بیگم خوش تھیں کہ اچانک انہیں قدرت نے ایسی باادب خدمت گار مہیا کی تھی۔

نگار بیگم کے کوٹھے پر ہر رات رقص وسرور کی محفل ہوتی۔ جب سے کوٹھے کی مالکہ کندن بیگم کا انتقال ہوا تھا......نگار بیگم نے کوٹھے کا سارا انتظام سنبھالا تھا......نگار بیگم کندن بیگم کی بیٹی تھی اور شروع سے ہی اس ماحول میں پرورش پانے کے باعث اس میں طوائف زادیوں کے سے نخرے، ادب وآداب اور دل لبھانے کی ادائیں اور نخرے پختہ ہو چکے تھے۔ اس کے ہاں دس طوائفیں رہائش پذیر تھیں، جو حویلی نما، کوٹھے کے پچھواڑے میں رہائش پذیر تھیں۔ نگار بیگم حویلی کے اگلے حصے میں رہتی تھیں......نگار بیگم اپنے اصولوں میں بہت سخت تھیں۔ رقص کی تربیت کے لئے استاد چندو خاں

اوران کے سازندے ہمیشہ مستعد رہتے۔ نگار بیگم نے ہر طوائف کی باری مقرر کر رکھی تھی، جو حویلی کے اگلے حصے میں آ کر نگار بیگم کی سرپرستی میں رقص کی تربیت لیتی...... صرف رقص کی تربیت حاصل کرنے والی رقاصہ ہال نما کمرے میں موجود ہوتی...... اور تربیت کے فوراً بعد وہ اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ طوائفوں کے پورشن میں کسی مرد کو جانے کی اجازت نہ ہوتی تھی۔ ہر روز دو طوائفیں مجرا کرتیں، رات گئے تک شباب و شراب، سرود و موسیقی کی محفل گرم رہتی......

نگار بیگم خود ہفتے میں ایک رات مجرا کرتی اور اس رات دور و نزدیک سے مہمان آتے...... ہال کھچا کھچ بھرا ہوتا...... اور وہ رات صبح تک ختم نہ ہوتی۔ نگار بیگم کے قدموں تلے فرش کا ایک چپہ تک نظر نہ آتا۔ اس کے مہندی بھرے پاؤں اور گھنگھروؤں کی جھنکار سے کوٹھے کے در و بام گونج اٹھتے۔ مہمان نشے میں دھت اس پر واری قربان ہوتے جاتے اور ہوئے اپنی جیبیں خالی کر کے ہی اٹھتے...... اس رات کے بعد نگار بیگم تھک کر چور ہو جاتی...... اور ریتا کبھی نیم گرم پانی میں اس کے پاؤں ڈبو کر ان کی تھکاوٹ دور کرنے کی کوشش کرتی۔ کبھی اس کے سارے بدن پر مساج کرتی...... سر میں تیل ڈالتی...... دو تین دن نگار بیگم یونہی بے سدھ پڑی رہتی اور ریتا اس کی خدمت میں لگی رہتی...... نگار بیگم کے مجرے کے بعد ریتا بہت مصروف ہو جاتی جیسے ہی نگار بیگم اپنے آپ کو توانا محسوس کرتی تو اگلے روز گاڑی میں بیٹھ کر وہ درگاہ پر حاضری دینے جاتی۔ ہر ہفتے اس کا یہی معمول تھا...... درگاہ سے آنے کے بعد اگلے روز وہ چاولوں کی دیگیں پکوا کر نیاز بانٹتی۔ نگار بیگم کا کوٹھا...... اس کا مجرا...... اور اس کی حویلی کی طوائفیں علاقے میں سب سے زیادہ مشہور تھیں۔ نگار بیگم بڑی تمکنت اور جاہ و حشمت والی بتیس سالہ عورت تھی، وہ طوائفوں پر بھی نظر رکھتی اور کارندوں پر بھی...... آنے والے مہمانوں پر بھی اور دل پھینک عاشقوں پر بھی...... کونسی طوائف...... کس وقت، کس مہمان کو پیش کی جائے گی، سب کچھ اس کے علم میں ہوتا...... اس کی مرضی کے بغیر اس کے کوٹھے پر کوئی چڑیا بھی پر نہ مار سکتی تھی۔ ریتا کا زیادہ تر وقت نگار بیگم کی خدمت میں ہی کٹتا، وہ کبھی کبھار کسی کام سے طوائفوں کے پورشن میں جاتی...... جب جاتی تو وہاں سے آنا ہی بھول جاتی۔ خوبصورت، پریوں جیسی گلبدن طوائفوں کو وہ کبھی مساج کرتے دیکھتی، کبھی بالوں کو ڈائی کرتے، کبھی فیشل کراتے اور مہندی لگواتے دیکھ کر وہ عجیب سی خوشی محسوس کرتی۔ چمن بیگم کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی، طوائفوں کی خدمت کے لئے مامور تھی۔ چمن بیگم کبھی ان کے بالوں میں تیل لگاتی، کبھی ان کے ملبوسات میں ان کی مدد کر رہی ہوتی...... وہ آنکھیں پھیلائے حیرت سے ایک ایک کی جانب دیکھتی رہ جاتی...... مگر اسے بہت کم کسی سے بات کرنے کا موقع ملتا...... نگار بیگم کا حکم یاد آتے ہی وہ فوراً واپس آ جاتی۔ نگار بیگم جب اس سے بہت خوش ہوتی تو سو یا دو سو کے نوٹ اسے پکڑا دیتی اور وہ ان نوٹوں کو مٹھی میں دبائے اپنے اس خواب کے بارے میں سوچتی رہتی جو وہ اپنی آنکھوں میں سجائے نگار بیگم کے کوٹھے پر آئی تھی...... مگر تین سالوں میں اس خواب کا ایک حصہ بھی پورا ہوتا دکھائی نہیں دیا تھا اور اپنی نامکمل آرزوؤں، تمناؤں اور خواہشوں پر وہ دل ہی دل میں کڑھتی رہتی۔

''کیا میں یہاں صرف نگار بیگم کی خدمت کرنے آئی ہوں...... ؟ کیا اس عورت کے لئے میں نے اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کو چھوڑا ؟ کیا میں اس کی کوئی خریدی ہوئی غلام ہوں کہ اس نے میرے باہر جانے پر بھی پابندی لگا دی ہے...... میں اپنی ماں سے بھی نہیں مل سکتی...... اپنے بہنوں اور بھائیوں سے بھی نہیں...... اکثر اپنے گھر والوں کو یاد کرتے ہوئے اس کی آنکھیں نم ہونے لگتیں...... اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی۔

''میں کب تک یونہی نگار بیگم کی خدمت کرتی رہوں گی...... مجھے کچھ کرنا چاہئے'' وہ قدرے باغیانہ انداز میں سوچتی۔

''اگر میں ساری زندگی یونہی اس کی خدمت کرتی رہوں گی...... تو میرے خواب کب پورے ہوں گے...... میں کب امیر ہوں گی...... کب میرے پاس دولت آئے گی...... ؟ کب میں نوٹوں کے فرش پر چلوں گی اور کب بڑی گاڑیوں میں بیٹھ کر سفر کروں گی؟'' وہ مضطرب ہو کر سوچتی اور اٹھ کر بیٹھ جاتی، پھر ساری رات اسے نیند نہ آتی...... کبھی اسے محسوس ہوتا کہ اپنی جگہ، اپنی دنیا، اپنی آزادی اور اپنے ماں باپ و بہن بھائیوں کو چھوڑ کر اس نے بہت بڑی غلطی کی ہے...... اس نے اپنی دنیا اور اپنے رشتے بدلنے کی کوشش کی تھی...... اور اس بدلی ہوئی دنیا میں وہ کہاں کھڑی تھی...... اور اس کا مستقبل کیا تھا، وہ سوچ سوچ کر پریشان ہو جاتی...... وہ بالکونی کے چھجے سے نیچے تنگ گلی میں جھانکتی جہاں ہر طرف مختلف دکاندار اپنی رنگ برنگی دکانیں سجائے نظر آتے۔ وہ راہ چلتے لوگوں کو کچھ دیر حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتی...... اور...... آہیں بھرتی...... اگر اچھو کی نظر اس پر پڑ جاتی...... تو وہ اسے نیچے آنے کو کہتا مگر وہ نفی میں سر ہلا دیتی۔ اچھو تاسف سے اس کی طرف دیکھتا رہ جاتا...... اس کی آنکھوں میں اس کے لئے ہمدردی اور دکھ کے تاثرات نمایاں ہونے لگتے۔ نگار بیگم نے جس روز درگاہ پر حاضری کے لئے جانا ہوتا تو صبح سے تیاریاں شروع ہو جاتیں۔ گلاب کے پھولوں کی پتیاں، ہار، رنگ برنگی گلدستے، اگربتیاں اور مختلف قسم کی چیزیں تبرک میں بانٹنے کے لئے وہ اپنے ساتھ لے کر جاتی۔ ایک گاڑی میں وہ خود اور ڈرائیور جاتے، دوسری گاڑی میں اماں حاجن، چمن بیگم اور دوسری ادھیڑ عمر عورتیں پھولوں، پھلوں اور سامان کے ساتھ بیٹھتیں۔ اماں حاجن کو نگار بیگم نے خصوصی طور پر اس کام کے لئے تنخواہ پر رکھا تھا کہ درگاہ پر جا کر وہ ختم پڑھتی۔ نگار بیگم آنکھیں بند کئے کافی دیر اسی کیفیت میں مست ہو کر اپنا تعلق خدا سے جوڑنے کی کوشش کرتی، پھر نگار بیگم اپنے ہاتھ سے تبرک لوگوں میں تقسیم کرتیں...... شام گئے وہ واپس لوٹتی اور اس دن کوٹھے پر نہ کوئی مجرا ہوتا اور نہ ہی کوئی مہمان آتا۔ نگار بیگم کئی گھنٹے اپنے کمرے میں خوبصورت نرم وگداز مخملیں بستر پر آنکھیں بند کئے، لیٹ کر کچھ سوچتی رہتی یا تصور میں کسی اور دنیا کی سیر کرنے نکل جاتی۔ اس رات کوئی بھی نگار بیگم کے کمرے میں نہ تو داخل ہوتا اور نہ ہی کسی کو اندر جانے کی اجازت ہوتی۔ اس رات رینا کو صرف ایک ہی کام ہوتا...... وہ چپکے سے استاد چندو خاں کے پاس چلی جاتی اور راگ، راگنیوں اور نئے زمانے کی موسیقی سے لطف اندوز ہوتی۔ نگار بیگم کو اس بات کی خبر مل چکی تھی، مگر انہوں نے کوئی توجہ نہ دی۔

''رینا بیگم...... آپ کب رقص سیکھنا شروع کریں گی؟'' استاد چندو نے ایک رات پوچھا۔

''میں اور رقص...... ؟ میں تو نہیں سیکھ سکتی......'' وہ بوکھلا کر بولی۔

''کیوں...... ؟''

''معلوم نہیں......''

''آپ تین سالوں سے یہاں ہیں...... اب تک آپ کو محفل میں آ جانا چاہئے...... آپ بہت سی دوسری طوائفوں سے بہت خوبصورت ہیں...... اور جہاں تک میرا خیال ہے...... آپ رقص بھی بہت عمدہ کریں گی...... پھر نگار بیگم آپ کو کیوں محفل میں نہیں لاتیں......'' استاد چندو نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''معلوم نہیں......'' وہ افسردگی سے بولی۔

''کیا نگار بیگم نے کبھی آپ سے رقص سیکھنے اور محفل میں آنے کی بات نہیں کی؟'' استاد چندو نے پوچھا۔

''ن......نہیں......تو'' وہ بمشکل بولی۔

''حیرت کی بات ہے......انہوں نے آپ سے کیوں بات نہیں کی......نگار بیگم بہت جہاندیدہ اور دور شناس عورت ہیں وہ تو نئی لڑکیوں کے ہاتھ پاؤں کی انگلیوں کی حرکات و سکنات سے بھانپ لیتی ہیں کہ وہ کیسا رقص کر سکتی ہیں......اور آپ کے ہاتھ پاؤں کی حرکات سے میں جان گیا ہوں۔ کہ آپ بہت اچھا رقص کر سکتی ہیں...... میرے خیال میں......آپ بہت جلد نگار بیگم سے آگے بھی نکل سکتی ہیں......اس وقت اگر اس کوٹھے پر رقص میں نگار بیگم کو کوئی مات دے سکتا ہے......تو وہ آپ ہوں گی۔'' استاد چندو نے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

''میں......میں......؟ مگر میں نے تو کبھی رقص کیا ہی نہیں......تو......پھر آپ کو کیسے معلوم ہوا؟'' اس نے بمشکل پوچھا۔

''ارے......بیٹا......ہم نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے۔ آپ ہمارے لڑکے کے ساتھ کھڑی ہو جائیں......وہ آپ کو کچھ اسٹیپس سکھاتا ہے۔......آپ اس کے ساتھ وہی کیجیے......آپ کو خود ہی معلوم ہو جائے گا......ہماری نظریں دھوکہ نہیں کھاتیں۔'' استاد چندو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''رقص......کہیں......نگار بیگم برا نہ منائیں۔'' وہ ڈرتے ہوئے بولی۔

''ارے......بیٹا......یہاں رہنے والی ہر طوائف کا مستقبل رقص میں ہی ہے......آپ رقص نہیں سیکھیں گی تو اور کیا کریں گی؟ آپ کو آج نہیں تو کل رقص ہی سیکھنا ہے......اور نگار بیگم کیوں برا منائیں گی؟ وہ تو خود چاہتی ہیں کہ یہاں رہنے والی ہر طوائف رقص میں بہتر ہو......چلیے......آپ رقص شروع کریں۔'' استاد چندو نے اسے قائل کرتے ہوئے کہا تو وہ خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ پندرہ سولہ سالہ نوجوان لڑکا ڈھولک کی تھاپ اور استاد چندو کے سازندوں کی سر تال پر پاؤں میں گھنگھرو باندھے رقص کرنا شروع ہو گیا، وہ حیرت سے کچھ دیر اسے دیکھتی رہی......

''اب آپ اس کے ساتھ قدم اٹھائیں......اس کے ہاتھوں کی حرکات دیکھیں......شاباش'' استاد چندو نے کہا۔

ریتا اس کے ساتھ، اس کو بغور دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ جھومنے لگی۔

''واہ......واہ......کیا کہنے......بیٹا......کچھ لوگوں کو خدا قدرتی طور پر فنکار بنا کر بھیجتا ہے......انہیں بس راستہ بتانے کی ضرورت ہوتی ہے......چوٹی پر وہ خود بخود پہنچ جاتے ہیں اور کچھ لوگوں کے ساتھ سر بھی پھوڑ دیا جائے تو ان کو نہ فن کی سمجھ آتی ہے اور نہ ہی فنکار بن پاتے ہیں۔ تم ان خوش نصیب لوگوں میں سے ہو......جن کو قدرت نے فن کی سمجھ بوجھ دی ہے......میرا تجربہ یہ کہتا ہے......کہ تم بہت جلد نام پیدا کرو گی......اپنا مقام بنا لو گی......پھر اس کوٹھے پر لوگ صرف نگار بیگم کا ہی نہیں......ریتا بیگم کا رقص دیکھنے آئیں گے......'' استاد چندو نے اس کی اتنی تعریف کی کہ وہ خوشی سے پھولی نہ سما رہی تھی۔

''کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں؟'' ریتا نے بے یقینی سے پوچھا۔

''لو......بھلا......ہم کیوں جھوٹ بولیں گے۔'' استاد چندو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اچانک چمن بیگم کا وہاں سے گزر ہوا۔ اس نے ریتا بیگم کو استاد چندو کے لڑکے کے ہمراہ رقص کرتے دیکھا تو خاموش، مگر معنی خیز نظروں سے دونوں کو دیکھتی ہوئی وہاں سے گزر گئی۔ ریتا کا دل ڈرنے لگا اور وہ وہاں سے چلی گئی۔

ساری رات خوف اور ملال میں کٹی...... نجانے نگار بیگم کیا کہیں گی......؟ وہ ساری رات سو نہ سکی اور گھبرائی رہی۔ مختلف خیالات کا تانا بانا بنتی رہی۔

وہ صبح ڈرتے ڈرتے نگار بیگم کے کمرے میں گئی...... تاکہ ان کا ہاتھ منہ دھلا سکے۔ مگر نگار بیگم اپنے کمرے میں موجود نہیں تھیں اور یہ بہت عجیب بات تھی کہ نگار بیگم اپنے کمرے میں موجود نہ ہوں۔ اس کے دل میں خوف اور وسوسے پیدا ہونے لگے...... وہ کمرے سے باہر نکل کر بالکونی کے پردے ہٹانے لگی، تاکہ صبح کی تازہ ہوا اور روشنی برآمدوں اور بالکونیوں میں سے ہوتی ہوئی حویلی کے کمروں کو تازہ اور نرم ہوا کے جھونکوں سے معطر کرے...... ریتا کے اٹھتے قدم اچانک رک گئے...... ایک کمرے میں سے سرگوشیوں کی آوازیں آ رہی تھیں...... اس نے کان لگا کر سنا...... آواز استاد چندو اور نگار بیگم کی تھی۔ اس نے کھڑکی کی اوٹ میں سے اندر جھانکا ...... نگار بیگم کچھ پریشان لگ رہی تھی۔

''نگار بیگم...... اس لڑکی میں بڑا لُن ہے۔ قدرت نے اس کولن سے مالا مال کیا ہے...... میں حیران ہوں، کہ آپ ابھی تک اسے رقص کی طرف کیوں نہیں لا رہیں۔'' استاد چندو نے حیرت سے پوچھا۔

''استاد صاحب...... ہم نے اسے اپنی خدمت کے لئے یہاں رکھا ہے، رقص سکھانے کے لئے نہیں...... وہ طوائف نہیں...... ایک بھکارن ہے اور...... بھوکے ننگے لوگوں کو جب اپنی اوقات سے زیادہ ملتا ہے تو وہ پھر اپنے آپ میں نہیں رہتے...... اور یہی ہمارا تجربہ بھی ہے اور اس دنیا کی بہت بڑی حقیقت۔'' نگار بیگم نے قدرے تلخ لہجے میں کہا تو ریتا کے دل میں آگ سی لگ گئی۔

''نگار بیگم...... یہ آپ کا خیال ہے...... اور میں اس سے اتفاق نہیں کرتا...... قدرت شاہوں کے گھر گدا اور گداؤں کے گھر بادشاہ پیدا کرتی ہے۔ وہ لڑکی بھی ایسی ہی ہے...... میرا تجربہ یہ کہتا ہے کہ اگر وہ رقص کی باقاعدہ تربیت حاصل کرلے تو وہ اس کوٹھے کی سب سے کامیاب طوائف بن سکتی ہے، بلکہ میرے خیال میں رقص میں اگر کوئی آپ کے ہم پلہ ہو سکتی ہے تو وہ...... یہ لڑکی ہو سکتی ہے۔'' استاد چندو نے کہا تو نگار بیگم کا چہرہ ایک دم اتر گیا...... اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہوئی...... چہرے پر ملے جلے تاثرات نمایاں ہونے لگے......

''اب آپ جا سکتے ہیں۔'' نگار بیگم نے اچانک کہا تو استاد چندو خاموشی سے وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔

اچانک نگار بیگم بھی ان کے پیچھے کمرے سے باہر نکلیں تو ریتا دروازے کی اوٹ میں کھڑی تھی...... اسے موقع ہی نہ ملا کہ نگار بیگم کے نکلنے سے پہلے ہی وہ وہاں سے چلی جاتی۔ نگار بیگم نے غضب ناک ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

''تم...... ہماری باتیں سن رہی تھی......'' نگار بیگم نے کہا۔

''ن...... ن...... نہیں......'' ریتا گھبرا کر بولی۔

''اب تم ہمارے ساتھ جھوٹ بولتی ہو......'' نگار بیگم نے غصے سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں......تو...... یہاں......'' ریتا ہکلاتے ہوئے بولی۔

''ریتا بیگم......ہم سب جانتے ہیں آپ استاد چندو خاں کے ساتھ ہماری گفتگو سن رہی تھیں...... ہمارے ہاں ایسی چوری کرنے والوں کو سزا ملتی ہے......اور تم بھی اس سزا سے نہیں بچ سکو گی......'' نگار بیگم نے غصے سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ریتا کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا......اور اس کی آنکھیں پتھرا گئیں، اس کی زبان جیسے گنگ ہو گئی تھی......اس کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔

''چمن بیگم......کہاں ہیں آپ......؟'' نگار بیگم نے قدرے اونچی آواز میں کہا تو چمن بیگم قدرے بھاگتی ہوئی نگار بیگم کے پاس آئی۔

''ریتا کو لے جایئے......اور انہیں اس وقت تک کمرے میں بند رکھیں جب تک ہم نہ کہیں...... تاکہ اس کی عقل ٹھکانے آجائے۔'' نگار بیگم نے غصے سے کہا اور چمن بیگم نے ریتا کو قدرے غصے سے دیکھتے ہوئے چلنے کو کہا۔ ریتا کے چہرے کی رنگت پیلی پڑ چکی تھی اور اس نے ڈر و خوف سے رونا شروع کر دیا۔ نگار بیگم نے ایک ٹک اسے غصے سے دیکھا اور وہاں سے چلی گئی۔

چمن بیگم نے اسے ایک تاریک کمرے میں بند کر کے تالا لگا دیا، وہ روتی، سسکتی رہی اور دروازہ پیٹتی رہی، مگر کسی نے اس کی ایک نہ سنی...... اس کا رو رو کر برا حال ہو گیا...... صبح سے دوپہر اور پھر شام ہو گئی تھی۔ اسے کھانے کو ایک لقمہ بھی نہیں دیا گیا تھا...... نہ پینے کو ایک قطرہ پانی...... بھوک سے اس کا برا حال ہو رہا تھا اس کا حلق خشک ہو رہا تھا اور ہاتھ پاؤں جیسے سن ہونے لگے۔ دماغ سست ہونے لگا اور خون کی گردش گویا رکنے لگی۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا......اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کی نبضیں رکنے لگی ہوں......اور اس کے سارے محسوسات، جذبات اور سوچیں ختم ہونا شروع ہو گئی ہوں۔ اسے کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کہاں ہے وہ بھوک سے نڈھال ہو کر فرش پر گر گئی اور آہستہ آہستہ بولنا شروع ہو گئی۔

''اماں...... مجھے روٹی دے...... مجھے بھوک لگی ہے......گڈی۔ مجھے تھوڑا سا پانی دے......اماں...... میں بھوک سے مر رہی ہوں...... اماں......میرے پیٹ میں کچھ ہو رہا ہے......میرا دل ڈوب رہا ہے......میں نے کل رات سے کچھ نہیں کھایا......اماں......اماں......اماں......'' وہ نقاہت سے بولنے لگی اور اس کی آواز ڈوبنے لگی......وہ یکدم بیٹھی بیٹھی گر گئی۔

☆

برکتے رات بھر نہ سو سکی......ہر طرف گہرا اندھیرا چھایا تھا۔ نجانے کیا ہوا تھا سارا شہر تاریکی میں ڈوب گیا تھا۔ آسمان پر بادلوں کی وجہ سے رات کی تاریکی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ نجانے کیا ہوا تھا...... برکتے کو بار بار رانی کا خیال آ رہا تھا۔ نجانے وہ کہاں ہے اور کن حالات میں ہو گی؟ اتنے سال ہو گئے ہیں، اس نے پلٹ کر خبر ہی نہ لی تھی۔

''رانی تجھے کبھی ماں کی یاد نہیں آئی...... تجھے کبھی ماں کا خیال نہیں آیا......تو نے ایک بار بھی نہیں سوچا کہ تیری ماں کا کیا حال ہے......وہ تیرے غم میں کتنا روتی اور تڑپتی رہتی ہے۔ تیرا دل کب سے پتھر کا ہو گیا ہے...... تجھے تو میں اپنے سارے بچوں میں سب سے زیادہ پیار کرتی تھی۔ تجھے اپنے قریب رکھتی تھی......تو کہاں چلی گئی ہے...... تیرے بغیر نہ کچھ کھانے کو دل چاہتا ہے......نہ نیند آتی ہے......اس بھیانک رات میں تو کہاں ہو گی۔'' رانی کے بارے میں سوچتے ہوئے برکتے رونا شروع ہو گئی۔ وہ ساری رات سسکتی رہی اور اپنے منہ میں اپنا دوپٹہ ٹھونستی رہی تاکہ اس کی آواز

کوئی سن نہ لے۔ اگر...... ملکا اس کی آواز سن لیتا تو اس کو بہت بے عزت کرتا، وہ اس کی زبان سے رانی کا نام بھی سننا نہیں چاہتا تھا...... رانی کے خیال میں ہی وہ سوگئی۔

''اماں اٹھ...... دن چڑھ گیا ہے...... بھوک لگی ہے۔'' اس کے چھوٹے بیٹے مجو نے برکتے کو ہلاتے ہوئے کہا۔

''برکتے اٹھ...... سب نے دھندے پر جانا ہے...... روٹی پانی کی فکر کر۔'' ملکے نے اونچی آواز میں کہا تو برکتے بڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور خاموشی سے مٹی کی انگیٹھی میں لکڑیاں ڈال کر انہیں جلانے لگی۔ پھونکوں سے آگ جلاتے ہوئے اس کی آنکھوں سے پانی رواں ہوگیا اور اس پانی میں اس کے بھرے دل کی آہیں اور سسکیاں تھیں اور ان آہوں کا دھواں، سلگتی لکڑیوں کے دھوئیں کے ساتھ مل کر اس کے دل کا غبار ہلکا کر رہا تھا۔ اس نے سب بچوں کے لئے روٹیاں پکائیں اور نادانستہ ایک روٹی زیادہ پکا دی۔

''اماں...... یہ روٹی کس کے لئے پکائی ہے؟'' مٹھو نے للچائی نظروں سے اس روٹی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہٹ...... یہاں سے...... یہ تیرے لئے نہیں۔'' اس نے روٹی کاغذ میں چھپا کر رکھتے ہوئے کہا...... سارے بچوں کے کان کھڑے ہو گئے...... وہ روٹی کس کے لئے ہے؟'' سب آدھے بھوکے پیٹوں سے اپنی اپنی کشکول اٹھا کر چلے گئے۔ مگر اس روٹی کا خیال سب کے ذہن میں تھا...... برکتے خود تو روٹی نہیں کھاتی تھی...... ملکا سب سے پہلے کھا کر چلا جاتا تھا...... پھر وہ روٹی کس کے لئے تھی......؟

اماں نے وہ روٹی سب سے چھپا کر رکھی تھی۔

برکتے کو کون اتنا عزیز تھا، جس کے لئے اس نے وہ روٹی چھپائی تھی۔

سب کے جانے کے بعد برکتے نے وہ روٹی نکالی اور اسے کاغذ پر اپنے سامنے پھیلا کر بیٹھ گئی۔

''رانی...... تو مجھے بہت یاد آرہی ہے...... یہ روٹی میں نے تیرے لئے پکائی ہے...... تجھے کیسے کھلاؤں......؟ ایک بار میرے پاس آجا...... میں تجھے اپنے ہاتھوں سے ایک ایک لقمہ کھلاؤں گی...... بس ایک بار تو آجا......'' برکتے روٹی کو سامنے رکھ کر بڑبڑاتی رہی اور روتی رہی۔

''اور مجھے وہ بھی بہت یاد آتا ہے...... جسے میرے دودھ کا ایک قطرہ بھی نصیب نہ ہوسکا...... وہ بھی کیسا بدقسمت انسان تھا...... اور...... رانی بھی...... دونوں نجانے کہاں گم ہو گئے ہیں۔ برکتے رونا شروع ہوگئی اور روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے چڑیوں کو ڈالے...... ایک دم کافی زیادہ چڑیاں اور کوے اکٹھے ہوگئے اور ان ٹکڑوں کو یوں کھانے لگے جیسے کب کے بھوکے ہوں۔ انہیں کھاتے دیکھ کر برکتے کی آنکھیں برسنے لگیں، اسے اپنے بچے یاد آنے لگے۔

''نجانے میرے بچوں کو بھی کچھ کھانے کو ملتا ہے یا نہیں...... رانی جب تک جھگی میں رہی...... اسے پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہیں ہوا...... اللہ جانے کہاں بھٹک رہی ہوگی...... بھوکی...... پیاسی...... اور منا...... اس بیچارے کو تو بھوکا، پیاسا ہی مجھ سے چھین لیا گیا۔ معلوم نہیں وہ زندہ بھی ہے یا......؟ سوچ کر اس کا دل لرزنے لگا۔

''یا اللہ! میرے بچوں کی حفاظت کرنا...... وہ اس مجبور بھکارن کے بچے ہیں...... میں تجھ سے ان پر کرم کی بھیک مانگتی ہوں۔ سنا ہے تو کسی

کو خالی ہاتھ نہیں لوٹاتا..... رانی کو بھی حفاظت سے رکھنا اور منے کو بھی..... " وہ دونوں ہاتھ باندھ کر کھلے آسمان کے نیچے کھڑی ہو کر آنکھیں بند کر کے سسکنے لگی اور آہیں بھرنے لگی۔

☆

تین دن سے بے بی کی طبیعت سخت خراب تھی۔ اسے پانی کا ایک قطرہ تک ہضم نہیں ہو رہا تھا، جو کھاتا پیتا وہ الٹ دیتا۔ بھوک اور پیاس سے اس کے ہونٹوں پر پپڑی سی بن گئی تھی۔ نرگس اسے ہر وقت گود میں لئے بیٹھی رہتی۔ اس کی حالت دیکھ دیکھ کر روتی اور بین کرتی جاتی۔ فردوس بھی پانی میں نمکول ڈال کر لاتی۔ کبھی حکیم سے لائے ہوئے رنگ برنگے شربت، کبھی گھریلو ٹوٹکے مگر اس کی حالت سنبھل ہی نہیں رہی تھی۔

"آپا..... کب تک اسے یونہی گود میں لئے بیٹھی رہو گی..... نہ حکیم کی دوا اثر کر رہی ہے اور نہ ہی کچھ اور..... بے بی کی حالت تو دیکھو کیسے بے سدھ پڑا ہے..... چل اسے کسی ہسپتال لے کر چلتے ہیں۔" فردوس نے تشویش سے کہا۔

"ہاں..... مجھ سے تو اس کی یہ حالت دیکھی نہیں جا رہی..... ہائے میرا بچہ کیسے بے ہوش پڑا ہے..... اسے دیکھ دیکھ کر تو میرا دل کٹ رہا ہے۔ کلیجہ منہ کو آ رہا ہے۔" نرگس نے دوپٹہ اپنے منہ میں ٹھونس کر اونچی آواز میں رونا شروع کر دیا۔

"آپا..... کاہے کو رو رہی ہے، باؤلی نہ ہو تو..... ابھی اپنے چندا کو ڈاکٹر کے پاس لے کر چلتے ہیں تو دیکھنا کیسے ٹھیک ہو جائے گا۔" فردوس نے اسے تسلی دی۔

نرگس نے بے بی کو اپنے کندھے کے ساتھ لگایا اور قریبی سرکاری ہسپتال میں پہنچ گئیں۔ وہاں پرچی بنوانے کے لئے طویل لائن میں کھڑا ہونا پڑتا تھا۔ بے بی کی حالت بہت بگڑ رہی تھی۔ نرگس بے بی کو لے کر بنچ پر بیٹھ گئی اور فردوس پرچی بنوانے چلی گئی۔

"ارے بھیا..... ہمارے بچے کی طبیعت بڑی خراب ہے..... ہمیں پہلے پرچی بنوا لینے دو۔" فردوس نے ایک آدمی کی منت کرتے ہوئے کہا جو لائن میں سب سے آگے کھڑا تھا، اس نے فردوس کو سر سے لے کر پاؤں تک مضحکہ خیز انداز میں دیکھا۔

"تمہارا بچہ..... کہاں ہے؟" اس آدمی نے مضحکہ خیز انداز میں پوچھا۔

"وہ..... دیکھو بنچ پر..... آپا..... اسے لئے بیٹھی ہے۔" فردوس نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔

"بچہ..... بیچارا بڑا ہی بیمار ہے..... تین دن سے اسے کچھ ہضم ہی نہیں ہو رہا، بڑی مہربانی ہو گی اگر تم اپنی باری دو۔" فردوس نے التجا کرتے ہوئے کہا۔

"اری چل..... کیسے تجھے اپنی باری دے دوں..... میں کب سے کھڑا ہوں....." آدمی نے منہ بنا کر غصے سے کہا۔

"مگر وہ بہت بیمار ہے" فردوس نے نم آنکھوں سے کہا۔

"یہاں سب بیمار ہی آتے ہیں..... چل جا اس لائن کے پیچھے لگ۔" اس آدمی نے غصے سے کہا تو وہ بے بسی سے لمبی لائن کو دیکھنے لگی اور نرگس کے پاس چلی گئی۔

''آپا...... یہاں تو لائن بڑی لمبی ہے......'' فردوس نے پریشانی سے کہا۔

''اچانک بے بی نے ایک بار پھر قے کر دی۔ سارا فرش گندا ہو گیا۔ ارد گرد کے لوگ غصے سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔

''اے...... ہے...... کتنی بدبو ہے...... یہ کم بخت نجانے کہاں سے آ گئے ہیں......'' پاس بیٹھی عورتوں نے بڑبڑاتے ہوئے اپنی اپنی ناکوں پر کپڑے رکھ لئے...... ہر طرف اک شور سا مچنے لگا۔ لوگ ناگواری کا اظہار کرنے لگے...... منہ بنانے لگے...... بڑبڑانے لگے، انہیں گالیاں دینے لگے۔

''ارے Sweeper (خاکروب) کو بلاؤ...... یہاں آ کر صفائی کرے۔'' کسی آدمی نے زور سے چلاتے ہوئے کہا...... فردوس اور نرگس اپنی جگہ شرمندہ ہونے لگیں...... بے بی کی حالت اور بگڑنے لگی۔

''چل فردوس اسے کسی اور ڈاکٹر کے پاس لے کر چلتے ہیں، یہاں تو شاید کوئی ہمارا علاج نہیں کرے گا۔'' نرگس نے بے بسی سے کہا۔

''اے پہلے یہاں سے یہ گند صاف کرو...... خاکروب کہیں نہیں مل رہا...... پتا نہیں کہاں چلا گیا ہے...... لوگ اس بدبو میں نہیں بیٹھ سکتے۔'' ہاسپٹل کی ایک نرس نے دونوں کو ڈانٹتے ہوئے کہا تو فردوس بے بسی سے نرگس کی طرف دیکھنے لگی۔

''فردوس...... اپنے دوپٹے سے ہی یہ جگہ صاف کر دے...... ہماری زندگیوں اور عزتوں سے زیادہ انہیں یہ جگہ پیاری ہے......'' نرگس نے روتے ہوئے کہا تو فردوس نے اپنا دوپٹہ اتار کر اس سے جگہ صاف کی...... اسے جگہ صاف کرتے دیکھ کر کتنے مردوں نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا...... اس کی لمبی چٹیا...... تنگ قمیص اور ٹائٹ کو للچائی نظروں سے دیکھ کر مذاق اڑانے کی کوشش کی...... فردوس فرش صاف کر کے دوپٹہ واش روم میں دھونے گئی تو خاکروب وہاں کھڑا سگریٹ پی رہا تھا اور کسی ملازمہ سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ فردوس کی طرف اس نے معنی خیز انداز میں دیکھ کر ملازمہ کو آنکھ ماری...... اور...... دونوں مسکرانے لگے...... فردوس دوپٹہ دھوتے ہوئے شدت سے رونے لگی۔

''یا اللہ! تو نے ہمیں کیا بنا کر اس دنیا میں بھیجا ہے...... ہمیں تو کوئی انسان سمجھتا ہی نہیں...... تو نے ہماری اتنی بے عزتی کرانی تھی تو...... کاہے کو ادھر بھیجا...... تجھے کچھ نہیں ہوتا جب تیرے یہ بندے ہمیں ذلیل کرتے ہیں۔'' فردوس پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور گیلے دوپٹے کو نچوڑ کر اور اسے پھیلا کر اپنے اوپر لیتے ہوئے باہر آ گئی۔

''آپا...... چل...... بے بی کو کسی پرائیویٹ ڈاکٹر کے پاس لے کر چلتے ہیں......'' فردوس نے نرگس سے کہا اور دونوں ہسپتال سے باہر نکل گئیں۔

''فردوس...... کیا ڈاکٹر کی فیس کے لئے ہمارے پاس پیسے ہیں؟'' نرگس نے اس سے پوچھا۔

''ہاں...... جی نے رات کو کچھ پیسے دیئے تھے...... وہ میرے پاس ہی ہیں۔'' فردوس نے اس سے کہا۔

''کب...... ؟ جی نے تو کئی دنوں سے کوئی پیسہ نہیں دیا۔'' نرگس نے حیرت سے پوچھا۔

''تو فکر نہ کر...... ہیں میرے پاس۔'' فردوس نے کہا...... تو...... نرگس نے خاموشی سے اس کی طرف دیکھا۔

''مجھے پرس دکھا......'' نرگس نے اس کے ہاتھ سے پرس لیتے ہوئے کہا اور اسے کھول کر دیکھا...... اس میں چند سو سو کے نوٹ تھے اور فردوس کی دو سونے کی انگوٹھیاں تھیں جو اس نے بہت پیسے جوڑ کر بنوائی تھیں اور بہت سنبھال کر رکھی تھیں...... خود اسے کتنی ہی ضرورت کیوں نہ پڑ جاتی

کبھی ان انگوٹھیوں کی طرف کسی کو دیکھنے نہ دیتی...... اور بے بی کے لئے وہ خود ہی انہیں لے آئی تھی...... نرگس نے اس کی طرف محبت بھری نگاہوں سے دیکھا اور اس کے سر اور چہرے پر ہاتھ پھیر کر رونے لگی۔

''شکر ہے...... جو ہم ایک دوسرے کا دکھ درد محسوس کرتے ہیں......'' نرگس نے کہا تو فردوس مسکرا کر اس کی جانب دیکھنے لگی۔ فردوس نے جلدی سے رکشہ کرایا اور ایک ڈاکٹر کے کلینک پر لے گئیں۔ ڈاکٹر مصروف تھا، انہوں نے ریسپشنسٹ کی بہت منت سماجت کی...... ان کے شور کی آواز سن کر ڈاکٹر خود اپنے کمرے سے باہر آیا۔

''کیا بات ہے...... شور کیوں ہو رہا ہے؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''ڈاکٹر صاحب...... ہمارا بچہ بہت بیمار ہے...... اسے ایک بار دیکھ لیں...... اسے تین دنوں سے کچھ ہضم نہیں ہو رہا۔'' نرگس نے التجا کرتے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر نے ایک نظر بچے کی طرف دیکھا۔

''ٹھیک ہے پہلے فیس جمع کراؤ...... اور...... پھر اندر آ جاؤ۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ انہوں نے خوش خوش فیس جمع کرائی اور ڈاکٹر کے کمرے میں چلی گئیں۔ ڈاکٹر نے بے بی کا اچھی طرح چیک اپ کیا۔

''اس کے جسم کا پانی ختم ہو گیا ہے...... حالت بہت نازک ہے۔'' ڈاکٹر نے قدرے مایوسی سے کہا تو دونوں گھبرا گئیں۔

''ڈاکٹر صاحب...... خدا کے لئے کچھ کریں...... ہمارے بے بی کو بچا لیں...... اسے کچھ ہو گیا تو ہم مر جائیں گی......'' دونوں نے روتے ہوئے کہا۔

''میں کوشش کرتا ہوں۔'' ڈاکٹر نے کہا اور بچے کو ایڈمٹ کر کے اسے انجکشن اور ڈرپ لگائی۔

''اگر...... ڈرپ ختم ہونے تک یہ کوئی قے نہیں کرتا تو یہ بہتر ہو جائے گا...... آپ دعا کریں۔'' ڈاکٹر نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

دونوں گڑگڑا کر اور رو رو کر خدا سے دعائیں کرنے لگیں۔ ان کی ایک نظر ڈرپ کے قطروں پر تھی اور ایک بے بی کے چہرے پر...... بے بی نے تھوڑی دیر کے بعد آنکھیں کھولنے کی کوشش کی، مگر نقاہت کے باعث کھول نہ سکا۔ آہستہ آواز میں بڑبڑانے لگا۔

''اماں......'' وہ آہستہ سے بولا۔

دونوں نے نم آنکھوں کے ساتھ خوش ہو کر بے بی کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

''اماں صدقے...... اماں قربان اپنی جان پر...... میرے چندا جلدی سے ٹھیک ہو جا...... اماں...... تیرے ٹھیک ہونے پر بچوں میں نیاز بانٹے گی...... درگاہ کے دیوں میں تیل ڈالے گی...... درگاہ پر چادر چڑھائے گی...... بس تو ٹھیک ہو جا...... آنکھیں کھول......'' نرگس نے والہانہ انداز میں اسے چومتے ہوئے کہا۔

بے بی نے پھر آنکھیں کھولنے کی کوشش کی......

''اماں...... آپا......'' وہ پھر بڑبڑایا۔

''ہائے...... میں...... واری جاؤں...... اپنے بے بی پر...... آپا کو اتنے پیار سے بلانے والے...... ارے تجھ پر تو آپا ساری کی ساری قربان...... تجھ پر یہ دنیا نچھاور دوں۔ اک بار شہزادی ٹھیک تو ہو جا...... پھر دیکھنا ہم کیا کیا کرتی ہیں۔'' فردوس نے بھی محبت سے کہا۔

''لگتا ہے آپا...... بے بی ٹھیک ہو رہا ہے میں ڈاکٹر کو بلا کر لاتی ہوں۔'' فردوس نے خوشی سے کہا اور وارڈ سے باہر نکل گئی۔

بے بی نے نرگس کی طرف دیکھا اور پھر ایک قے کی...... ڈرپ اس کے ہلنے سے جھولنے لگی...... اس کے سارے کپڑے لت پت ہو گئے۔ بستر بھی خراب ہو گیا، قے کرنے کے بعد وہ ایکدم نڈھال ہو گیا اور پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ ڈرپ رک گئی...... نرگس نے اسے بے سدھ پڑے دیکھا تو اس کی سانس چیک کرنے کی کوشش کی۔ رکی ڈرپ کی طرف دیکھا تو پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھتی رہ گئی...... اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

فردوس ڈاکٹر کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی...... ڈاکٹر نے جلدی سے بے بی کی نبض چیک کی۔ وہ اسے تھوڑی دیر چیک کرتا رہا۔ فردوس اور نرگس رکی سانسوں سے اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

''سوری...... بہت کوشش کے باوجود بھی میں اسے بچا نہیں سکا۔'' ڈاکٹر نے قدرے مایوسی سے کہا۔

''کیا...... ہمارا بے بی مر گیا ہے؟'' فردوس نے حیرت سے پوچھا تو ڈاکٹر نے گہری سانس لی اور وہاں سے چلا گیا۔

''چل آپا...... چلیں۔'' فردوس نے روتے ہوئے نرگس کی طرف دیکھا۔

''نہیں فردوس...... میں...... میں ایسے نہیں جاؤں گی...... میں اپنے بے بی کو زندہ یہاں لائی تھی...... مرے ہوئے کو کیسے لے جاؤں؟'' خدا کے لئے مجھ سے یہ مت کہنا...... کہ بے بی مر گیا ہے ورنہ میں بھی اس کے ساتھ مر جاؤں گی۔'' نرگس پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

فردوس نے آگے بڑھ کر اس کو اپنے گلے لگایا۔

''آپا...... ہم بے بس انسان کیا کر سکتے ہیں...... جو رب کی مرضی۔'' فردوس نے کہا۔

''رب کی مرضی...... رب کیوں ہمارے ساتھ ایسا کرتا ہے...... ہر بار ہر بار ایک خوشی دے کر دو گنا غم دے دیتا ہے...... فردوس ہم نے کیا گناہ کیا ہے...... کیوں وہ ہمارے ساتھ ایسا کرتا ہے...... کیوں کرتا ہے......؟'' نرگس پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور سسکیاں بھرنے لگی۔ ''آپا...... ہمت کر......'' فردوس نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''کہاں سے لاؤں ہمت...... میری ساری ہمت...... میری خوشیاں میرا حوصلہ تو میرا بچہ لے گیا...... ہائے کہاں سے ڈھونڈ کر لاؤں...... ہائے فردوس...... اسے مرا ہوا دیکھنے سے پہلے میں ہی کیوں نہ مر گئی...... رہا...... تو...... میری جان لے لیتا...... مگر میرے بچے کو تو زندہ رکھتا...... اس کے تو ابھی کھیلنے کے دن بھی پورے نہیں ہوئے تھے...... ابھی تو اس نے پڑھنا شروع کیا تھا...... اس نے تو بہت بڑا افسر بننا تھا...... اس نے تو ہمارے جنازوں کو کندھا دینا تھا۔ ہم اس کے جنازے کو کندھا نہیں دے سکتیں۔ فردوس مجھ سے یہ سب کچھ نہیں ہو گا۔ میرا بے بی مر نہیں سکتا......'' نرگس بدحواسی میں چلاتی ہوئی وہاں سے باہر نکل گئی اور فردوس اسے دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بڑی مشکل سے اس نے بے بی کے مردہ جسم کو چادر

میں لپیٹ کر اٹھایا..... اپنے کندھے کے ساتھ اسے لگاتے ہوئے وہ بری طرح بلکنے لگی۔ چار سالوں کی محبت ایکدم ختم ہوگئی تھی۔ اس کا سارا وجود بری طرح لرز رہا تھا..... اور اس کا دل جیسے اس کے قابو میں ہی نہیں تھا..... رشتے کتنے انمول ہوتے ہیں..... چاہے خون کے ہوں یا محبت کے..... ان کے ٹوٹنے پر دل تڑپتا ہے اور روح مضطرب ہو جاتی ہے..... آنکھیں برستی ہیں اور حوصلہ جواب دینے لگتا ہے۔

وہ بچے کو لے کر کلینک سے باہر نکلنے لگی..... تو اسسٹنٹ نے اسے آواز دی۔

"اے..... بل تو ادا کر کے جاؤ"

فردوس نے مڑ کر دیکھا..... آہ بھری اور اپنا پرس اس کے سامنے رکھ دیا، پرس میں انگوٹھیاں اور پیسے تھے۔ وہ پرس ٹٹولنے لگا..... اسسٹنٹ نے پرس ٹیبل پر الٹ دیا..... اچانک ڈاکٹر باہر نکلا..... اور اسسٹنٹ کو دیکھا..... پھر روتی ہوئی فردوس کو.....

"انہیں جانے دو....." ڈاکٹر نے کہا تو اسسٹنٹ نے سب کچھ پرس میں واپس رکھ دیا، مگر چپکے سے ایک انگوٹھی اپنی جیب میں ڈال لی۔

فردوس نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا اور باہر نکل گئی..... نرگس کلینک کی سیڑھیوں پر بیٹھی بری طرح رو رہی تھی۔ فردوس کو دیکھ کر اٹھی اور بے بی کو اس سے چھین کر اپنے ساتھ لگا لیا۔

"فردوس یہ بولتا کیوں نہیں..... یہ مت کہنا کہ میرا بچہ مر گیا ہے....." نرگس نے پھر کہا تو فردوس خاموش ہوگئی۔ نرگس اسے ہلاتی رہی اسے اپنے کندھے کے ساتھ لگایا تو اس کی گردن ایک طرف لٹک گئی..... نرگس نے زور سے چیخ ماری "فردوس میرا بے بی مر گیا ہے....." اس نے چیخ مار کر کہا اور بے ہوش ہو کر سڑک پر گر گئی۔ فردوس گھبرا گئی لوگ اکٹھے ہونے لگے..... اس نے جلدی سے رکشہ کرایا اور ان کو اس میں ڈال کر روتی ہوئی گھر آ گئی.....

## (۸)

دل دریا سمندروں ڈونگھے، کون دلاں دیاں جانے ہو
وچے بیڑے، وچے جھیڑے، وچے ونج مہانے ہو
چوداں طبق، دلے دے اندر، طمبو وانگوں تانے ہو
جو دل محرم ہووے باہو، سو یو رب پچھانے ہو

سائیں مٹھا گنگناتا ہوا سڑک پر جا رہا تھا۔ ماسٹر باسط علی سکول سے واپس آ رہے تھے۔ رک کر ایک ٹک سائیں کی جانب دیکھا اور گہری سانس لی۔

"من کے اندر لگی آگ یونہی نہیں بجھتی...... بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں...... اس ویرانے میں مارے مارے پھرنے سے کچھ نہیں ملے گا...... جا...... چلا جا...... اس کے پاس...... جا...... جاتا...... کیوں نہیں......؟" سائیں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے جانے کو کہا۔

"کیسے چلا جاؤں......؟ وہ بہت آہستہ آواز میں بڑبڑایا۔

"جیسے یہاں چلا آیا...... جا...... چلا...... جا...... جا...... جا" سائیں بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔

اور ماسٹر باسط علی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

☆

شاہ زیب...... باسط علی پر بہت اعتماد کرنے لگا تھا۔ اسے بھائیوں کی طرح چاہتا تھا۔ وہ خود زیادہ تعلیم یافتہ نہیں تھا، مگر علم والوں کی بہت قدر کرتا تھا اور باسط علی اسے اپنے سے بہت بہتر اور مرتبے والا انسان محسوس ہوتا تھا۔ شاہ زیب کے والدین بھی باسط علی کو اپنی اولاد کی طرح چاہنے لگے تھے۔ بہت جلد وہ ان کے گھر کا فرد بن گیا تھا۔ کبھی کبھی باسط علی کو اندر ہی اندر کوئی چیز بہت تکلیف دیتی...... اس کو اپنے دل کے اندر آرے سے چلتے ہوئے محسوس ہوتے کہ شاہ زیب جیسا اچھا انسان...... جو اس پر اندھا دھند اعتبار کر رہا تھا...... کس طرح اسی کے ہاتھوں دھوکہ کھا رہا تھا...... اسے اپنا آپ ایک زہریلے ناگ کی طرح محسوس ہوتا، جس کو دودھ پلا پلا کر توانا کیا جاتا ہے اور توانا ہو کر وہ ڈنگ مارنے سے باز نہیں آتا۔ کبھی اسے اپنا آپ مکار لومڑی جیسا محسوس ہوتا جو شیر کی کچھار میں اس کا شکار چھیننے کے لئے گھستی ہے اور کبھی اس گدھ جیسا جو دوسروں کے مارے ہوئے شکار پر اپنی بدنظر رکھتا ہے۔ وہ...... شاہ زیب کے ہاں آ کر اندر سے خوش نہیں تھا۔ شاہ زیب کو نازی دھوکہ دے رہی تھی اور وہ باسط علی کی وجہ سے اسے دھوکہ

دے رہی تھی۔ شاہ زیب کے ساتھ نازی کتنی بڑی زیادتی کر رہی تھی اور اس شخص نے اف بھی نہ کی تھی۔ کسی سے کوئی شکوہ بھی نہیں کیا تھا۔ وہ کسی سے تذکرہ کر کے نازی کا بھرم نہیں توڑنا چاہتا تھا۔ وہ نازی کو اپنی عزت سمجھتا تھا اور نازی اس کی عزت کو تار تار کرنے پر تلی تھی...... وہ خاموش تماشائی بنا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

باسط علی کے ساتھ شاہ زیب کی دوستی اور قربت بہت بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کے بہت قریب آنے پر باسط علی کو اکثر محسوس ہونے لگا تھا کہ اکثر باتیں کرتے ہوئے شاہ زیب کہیں کھو جاتا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گوشے نم ہونے لگتے تھے اور اس کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگتے تھے۔ ان لمحوں میں باسط علی اپنے آپ کو اس کا مجرم سمجھنے لگتا تھا

شاہ زیب...... باسط علی کو اپنی زمینیں دکھانے لے گیا، اس بار فصل بہت اچھی ہوئی تھی، مزارے بھی بہت خوش تھے، وہ ڈیرے پر پہنچا تو سب مزارے اکٹھے ہو گئے اور اسے مبارکباد دینے لگے۔

''سرکار...... لگتا ہے آپ کی گھر والی بڑے نصیب والی عورت ہے، آپ کے گھر میں قدم کیا رکھا ہے کہ...... آپ کی زمین سونا اگلنے لگی ہے۔'' ایک بوڑھے مزارے نے خوش ہو کر کہا تو شاہ زیب نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

''بابا...... یہ تو اللہ جانتا ہے کہ کس کے آنے سے...... کس کا نصیب کھلتا ہے...... اور کس کا بند ہوتا ہے۔'' شاہ زیب نے آہ بھر کر کہا تو باسط علی اس کی بات سن کر چونک گیا۔

''مبارک تو مجھے تم لوگوں کو دینی چاہئے...... جن کی محنت رنگ لائی ہے۔'' شاہ زیب نے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔

''سرکار...... محنت تو ہم ہر سال ہی کرتے ہیں...... مگر جب پھل، محنت سے زیادہ ملے تو پھر انسان کسی انہونی اور نئی بات کے بارے میں سوچنے لگتا ہے...... اور اس برس...... نئی بات تو آپ کی شادی ہی ہے۔'' مزارے نے مسکرا کر جواب دیا۔

''ٹھیک ہے...... بابا...... اگر تم ایسا سمجھ رہے ہو...... تو یہ سچ ہی ہو گا، مگر میں اس بار تم لوگوں کو بہت خوش کروں گا۔'' شاہ زیب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''سرکار ہم تو پہلے ہی آپ سے بہت خوش ہیں۔ آپ سے ہمیں کبھی بھی کوئی شکایت نہیں رہی...... آپ نے کبھی ہمارا حق نہیں مارا...... ہمارا...... اور ہمارے بچوں کا اتنا خیال رکھتے ہیں کہ شاید ہی کوئی اور زمیندار اپنے مزارعوں کا یوں خیال رکھتا ہو...... مولا نے آپ کو سچے موتی جیسا پاک دل دیا ہے...... اور وہ لوگ بڑے نصیب والے ہوتے ہیں، جن کو مولا ایسا دل دیتا ہے...... مولا آپ کو لمبی حیاتی دے...... اور بہت...... ساری نعمتیں اور خوشیاں دے۔'' بوڑھے مزارے نے خوش ہو کر اسے ڈھیروں دعائیں دیں۔ شاہ زیب مسکرانے لگا اور باسط علی کے اندر بہت کچھ ٹوٹنے لگا۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے ایک ایک لفظ اسے سنایا جا رہا ہو...... اور اس لفظ میں چھپے نشتر اس کے دل کو لہولہان کر رہے ہوں۔

''یہ لوگ عجیب ہی باتیں کرتے ہیں...... انہیں کیا معلوم...... کہ......؟'' شاہ زیب کچھ کہتے ہوا رک گیا اور معنی خیز انداز میں باسط علی کی جانب دیکھنے لگا۔

''نجانے کیوں..... تم پر اعتبار کرنے کو دل چاہتا ہے..... یوں لگتا ہے..... جیسے تم میرے دل کے بہت قریب ہو..... یار سمجھ میں نہیں آتا..... مجھے تم سے اتنی محبت کیوں ہو گئی ہے..... شاید تم بہت اچھے انسان ہو..... اس لئے.....'' شاہ زیب نے مسکرا کر کہا تو باسط علی بڑبڑا گیا، اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے شاہ زیب نے سرعام اس کی چوری پکڑ کر اسے طمانچہ مارا ہو..... اور وہ اس طمانچے سے گھبرا گیا ہو۔ اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔

''کیا وہ بھی اس کے لئے اتنے اچھے جذبات رکھتا ہے..... کیا واقعی شاہ زیب اس کے بارے میں دھوکہ کھا رہا ہے.....؟'' وہ گنگ سا اس کا منہ دیکھنے لگا۔

''تمہاری بھابھی نے میرے گھر میں رہنے کے باوجود مجھے قبول نہیں کیا..... بھلا وہ میرے لئے کس طرح خوش نصیب ہو سکتی ہے.....'' شاہ زیب نے آہ بھر کر کہا تو باسط علی حیرت سے اس کی جانب دیکھنے لگا، جس نے کبھی اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں ایک لفظ کسی سے نہیں کہا تھا۔ اپنی اتنی بڑی بات اس نے اسے کہہ دی تھی۔

''کیوں.....؟'' نادانستہ باسط علی کے منہ سے نکلا

''جب دل میں کوئی اور ہو..... تو سامنے والا کہاں نظر آتا ہے.....'' شاہ زیب نے آہ بھر کر نم آنکھوں سے جواب دیا۔

''کیا آپ اسے جانتے ہیں..... کہ وہ کون ہے؟ باسط علی نے متجسس لہجے میں پوچھا۔

''میں اسے جان کر کیا کروں گا..... جو موجود نہ ہو کر بھی ہر وقت مجھے اپنے ہونے کا احساس دلائے..... اس کے بارے میں..... میں اور کیا جانوں گا.....؟ شاہ زیب نے سنجیدگی سے کہا تو باسط علی اس کی بات سن کر چونک گیا۔ وہ عام سا، سیدھا، سادہ انسان تھا مگر اس کی بات میں کتنی گہرائی تھی، وہ حیرت سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔

''کیا آپ کو غصہ نہیں آتا.....؟'' باسط علی نے پوچھا۔

''کس پر.....؟ شاہ زیب نے پوچھا۔

''اس شخص پر..... جو..... آپ کے اور آپ کی بیوی کے درمیان ایک دیوار بن کر کھڑا ہے۔'' باسط علی نے پوچھا۔

''نہیں.....'' شاہ زیب نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''کیوں.....؟''

''معلوم نہیں..... شاید اس لئے بھی نہیں کہ وہ مجھ سے پہلے نازی کی زندگی میں آیا ہے..... اس میں اس کا کیا قصور ہے۔'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

''اور اگر..... آپ کے بعد ان کی زندگی میں آتا..... پھر بھی آپ غصہ نہ کرتے؟ باسط علی نے حیرت سے پوچھا۔

''معلوم نہیں..... تب میں کیا کرتا..... شاید..... تب بھی کچھ نہ کرتا۔'' شاہ زیب نے کہا۔

''آپ کا دل کتنا بڑا ہے......اور آپ کا ظرف اس سے بھی بڑا۔'' باسط علی نے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں......اور......شاید اسی لئے......ایسے لوگوں کے لئے آزمائش بھی بڑی ہوئی ہیں......قدرت انہیں دوسرے لوگوں سے زیادہ آزماتی بھی ہے اور نوازتی بھی ہے۔'' شاہ زیب نے جواب دیا اور کھلے آسمان کی جانب دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں کے گوشے مزید نم ہونے لگے۔

باسط علی کو وہ آسمان پر چمکتا ہوا اک درخشاں ستارہ دکھائی دینے لگا وہ اس کے سامنے ذرہ خاک تھا......ہوا میں اڑتا پھرتا......قدموں تلے روندے جانے کے قابل......بہت معمولی اور حقیر ذرہ۔ اس کا دل پھر نا آشنا بوجھ تلے آنے لگا۔ اندر شدید اضطراب جنم لینے لگا۔

وہ شاہ زیب کے سامنے بیٹھ کر اس کے ساتھ دھوکہ کر رہا ہے، اس کے اعتبار کو کرچی کرچی کر رہا ہے اور وہ شخص اس پر آنکھیں بند کر کے بھروسہ کر رہا ہے......باسط علی تم بہت بڑے گنہگار ہو......تم یہاں اپنی محبت پانے آئے تھے اور اپنا سب کچھ لٹا رہے ہو......جو شخص کسی کے اعتبار کے قابل نہ ہے......اور......جس تھالی میں کھائے......اس میں چھید کرے۔ وہ کیا محبت کر پائے گا......اور وہ کیسی محبت حاصل کر سکے گا......کیا وہ اس قابل تھا کہ اس کو اس کی محبت مل جائے......قدرت کا اصول تھا......ایسے کم ظرف انسانوں کو کیسے مل سکتا ہے......اسی لئے وہ یہاں آ کر اس محبت سے بیگانہ ہو رہا تھا، جس کی جستجو میں وہ اتنا لمبا سفر طے کر کے آیا تھا......اپنا سب کچھ چھوڑ کر آیا تھا، بہت کچھ پانے کے چکروں میں رفتہ رفتہ اپنا سب کچھ کھو رہا تھا۔ وہ بہت مضطرب اور دکھی ہونے لگا۔

شاہ زیب کسی کام سے گاؤں سے باہر گیا تھا، باسط علی اپنے کمرے میں چارپائی پر لیٹا تھا، وہ اپنی ہی سوچوں میں بہت مضطرب ہو رہا تھا۔ رات گہری ہو رہی تھی اور اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ پہلے وہ جب بھی تنہا ہوتا تو اسے نازی شدت سے یاد آنے لگتی۔ وہ اس کے دیدار اور قربت کے لئے بے قرار ہونے لگتا اور اب اسے نجانے کیا ہو گیا تھا کہ نازی اسے دور سے ہی دکھتی تو وہ راستہ بدل لیتا۔ نازی کی قربت اب اسے وہ لطف اور سکون نہ دیتی جو وہ پہلے محسوس کرتا تھا، وہ اس سے فرار چاہتا تھا، اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے......؟ وہ شاہ زیب کو دیکھتا تو مضطرب ہو جاتا اور نازی کو دیکھتا تو پریشان......اور اپنے آپ کو دیکھتا تو بے بس ہو جاتا۔

دروازہ کھلا اور نازی مسکراتی ہوئی اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

''اس......اس وقت؟'' وہ دروازے کی جانب گھبرا کر بولا۔

''ہاں......جب موقع ملتا تھا۔ جب ہی آتا تھا نا......اور تم نہیں جانتے......میں سارا دن......کس کس طرح تم سے ملنے اور دیکھنے کے بہانے ڈھونڈتی رہتی ہوں......باسط علی اب مجھ سے مزید انتظار نہیں ہو رہا......میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی......کچھ کرو......اور مجھے یہاں سے لے چلو۔'' وہ اس کے قریب بیٹھ کر بولی۔

''نازی......یہاں سے اٹھ جاؤ......اگر کسی نے دیکھ لیا تو بہت برا ہو گا......تمہاری عزت خاک میں مل جائے گی۔'' باسط علی جلدی سے کھڑا ہو کر بولا۔

''کوئی نہیں آئے گا......شاہ زیب دوسرے گاؤں گیا ہے کل آئے گا۔'' نازی اس کے ساتھ چمٹتے ہوئے بولی۔

''نازی...... یوں مت کرو...... یہ ٹھیک نہیں...... مجھے خدا سے ڈر لگتا ہے...... کہ......'' باسط علی اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے بولا۔

''اور مجھے خدا سے کوئی ڈر نہیں لگتا اور ڈر لگے بھی کیوں......؟ ڈر تو اس سے لگنا چاہئے جو کسی کے لئے کچھ کر سکے۔ جسے نہ ہماری خوشیوں کی پروا ہے اور نہ دکھوں کی...... جو نہ تو ہماری دعائیں سنتا ہے اور نہ ہمارا رونا...... سسکنا...... وہ ہم سے لاتعلق رہتا ہے تو پھر ہم کیوں اس سے ڈریں یا خوف کھائیں...... ہمیں بھی اس سے کوئی سروکار نہیں......'' نازی نے اس قدر بے باکی سے کہا تو باسط علی حیرت اور خوف سے اسے دیکھنے لگا۔ اسے قطعی یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی نازی ہے جو رات بھر خدا کے حضور جھکی رہتی تھی۔ درگاہوں پر نیازیں بانٹتی تھی، ذوق وشوق سے خدا کی عبادت کرتی تھی اور اب کیسے کافروں جیسی باتیں کر رہی تھی۔

''نازی...... تمہیں کیا ہو گیا ہے...... تم تو خدا سے بہت محبت کرتی تھی۔'' باسط علی نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں...... میں اس سے محبت نہیں...... بس اس کی عبادت کرتی تھی، محبت تو صرف میں تم سے کرتی ہوں۔'' نازی نے اکڑ کر جواب دیا۔

''یہ...... تم...... کیسی باتیں کر رہی ہو؟ تم اس قدر بدل گئی ہو مجھے یقین نہیں آ رہا، باسط علی نے حیرت سے پوچھا۔

''میں بالکل بھی نہیں بدلی...... میں نے تو تمہاری محبت حاصل کرنے کے لئے خدا کی عبادت شروع کی تھی...... جب تم نہیں ملے تو میں نے اس کی عبادت چھوڑ دی۔ اب مجھے اس کی کسی بات کی پروا نہیں...... میں وہی کروں گی، جو میرا دل چاہے گا...... اور تم مجھے اس سے ڈرنے کی باتیں مت سناؤ...... مجھے کسی سے ڈر نہیں لگتا، اگر ڈر لگتا ہے تو صرف اس بات سے کہ تم مجھے چھوڑ کر چلے نہ جاؤ۔'' وہ معنی خیز انداز میں مسکرا کر بولی۔

''نازی...... مجھے تمہاری ان بڑی بڑی باتوں سے ڈر لگ رہا ہے......'' باسط علی نے اس کی جانب بغور دیکھتے کہا۔

''میں تو ہمیشہ سے ہی ایسی باتیں کرنے کی عادی ہوں...... لگتا ہے تم نے میری باتوں کو اب توجہ سے سننا شروع کیا ہے۔'' نازی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ہاں...... مجھے بھی یہی لگ رہا ہے۔'' وہ قدرے مایوسی سے بولا۔

''چھوڑو...... ان باتوں کو...... اور اب یہاں سے نکلنے کا منصوبہ بناؤ...... ہم دونوں یہاں سے دور چلے جائیں گے اور اپنی محبت کی دنیا بسائیں گے اس دنیا میں صرف میں ہوں گی اور...... تم...... تیسرا کوئی نہیں، نازی پھر اس کے سینے سے لگتے ہوئے بولی۔

''ایسا مت کرو...... یہ ٹھیک نہیں...... شاہ زیب۔'' وہ زیر لب بڑبڑایا اور اس سے پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

''باسط علی...... مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ تم بدل گئے ہو...... تم وہ...... والے باسط علی نہیں لگ رہے، جس سے میں نے محبت کی ہے...... تم بہت ڈرپوک اور بزدل ہو گئے ہو، تمہیں کیا ہو گیا ہے...... تم ایسے تو نہیں تھے۔'' نازی نے قدرے خفگی سے کہا۔

معلوم نہیں...... لیکن مجھے بھی یوں محسوس ہو رہا ہے، جیسے میں بہت بدل گیا ہوں۔ میرے اندر کوئی بھونچال آنے والا ہے۔ نازی میرے دل پر ایک عجیب سا بوجھ اور خوف طاری رہتا ہے۔ پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔ بس دل چاہتا ہے کہ یہاں سے چلا جاؤں...... سب کچھ چھوڑ کر۔'' باسط علی نم آنکھوں سے بولا۔

''مجھے بھی......؟'' نازی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......'' اس نے آہ بھر کر جواب دیا۔

نازی نے غصے سے اس کی جانب دیکھا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆

ماسٹر باسط علی صبح سویرے چائے پینے کھوکھے میں چلے گئے تھے۔ آج موسم قدرے سرد تھا۔ اس لئے اکا دکا لوگ ہی کھوکھے میں بیٹھے تھے۔ آج ملازم بھی نہیں آئے تھے۔ کھوکھے کے مالک نے ماسٹر صاحب کے لئے خود چائے بنائی، الماری میں سے ولایتی چینی کا کپ نکالا اور اس میں چائے ڈال کر ان کے آگے رکھی، ماسٹر باسط علی بہت خاموش تھے اور چہرے سے بہت افسردہ اور رنجیدہ لگ رہے تھے۔

''کیا بات ہے...... ماسٹر صاحب...... طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' شیرے نے پوچھا۔

''بس...... یونہی......'' ماسٹر باسط علی نے بے دلی سے جواب دیا۔ ''کچھ تو بات ہے ورنہ آپ یوں پریشان دکھائی نہیں دیتے۔'' شیرے نے پھر پوچھا۔

اس سے قبل کہ ماسٹر باسط علی کوئی جواب دیتے سائیں مٹھا چھن چھن کرتا اندر داخل ہوا۔

''بسم اللہ...... سائیں جی...... آج کیسے یہاں صبح سویرے آ گئے...... چائے لاؤں۔'' شیرے نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''ارے...... ہمیں چائے...... پانی سے کیا کام......؟ فقیروں کو تو بس اللہ اور اس کے بندوں سے غرض ہوتی ہے۔ کیوں...... ماسٹر......؟'' سائیں مٹھا نے معنی خیز انداز میں ماسٹر باسط علی سے پوچھا تو وہ چائے پیتے ہوئے بڑبڑا گئے۔

''ہاں...... ہاں......'' ماسٹر باسط علی نے چونک کر دیکھا اور خاموش ہو گئے۔

''سائیں جی...... آج ماسٹر صاحب بہت خاموش ہیں، چہرے سے بھی اداس لگ رہے ہیں۔ آپ ہی ان سے پوچھیں...... کیوں پریشان ہیں...... میں آپ کے لئے بھی چائے لاتا ہوں۔'' شیرے نے کہا اور جا کر چائے بنانے لگا۔ سائیں نے قہقہہ لگا کر ماسٹر باسط علی کی جانب دیکھا۔

''یہ بھی بھلا ہے...... مجھے کہتا ہے...... تجھ سے پوچھوں کہ تو اداس کیوں ہے؟ کیا میں نہ تجھے بتاؤں کہ تو اداس کیوں ہے؟ اور آج ساری رات نہیں سویا تو سو بھی کیسے سکتا ہے...... جو کچھ تو نے کیا ہے...... کیا وہ تجھے سونے دے گا...... تجھے تو اک پل بھی چین نہیں آئے گا...... یہ دل اپنے ٹوٹنے پر تو دکھی ہوتا ہی ہے مگر بندہ جب کسی کا دل توڑتا ہے تو پھر اس کے اندر ایسی آگ بھڑکتی ہے جو چین نہیں لینے دیتی۔ کیوں ماسٹر؟''

مسجد ڈھا دے، مندر ڈھا دے
ڈھا دے، جو کچھ ڈھیندا ای
دل نہ کسی دا ڈھاویں
دلاں وچ رب رہیندا ای

تو نے تو اس نمانے کا دل ڈھایا ہے...... اور پناہ لینے یہاں آ گیا...... تیرے لئے اب کہیں ٹھکانہ نہیں، چاہے تو سیڑھی لگا کر آسمان پر چڑھ جائے۔ جا...... ایک بار...... اس سے جا کر مل...... جاتا کیوں نہیں...... یہاں رہ کر وقت ضائع کر رہا ہے۔'' سائیں خفگی سے بولا اور اسے گھورنے لگا۔

''کس منہ سے جاؤں...... اور اسے جا کر کیا کہوں؟'' ماسٹر باسط علی نے آہ بھر کر آہستہ آواز میں کہا۔

''اور اس ڈر سے تو اس کے پاس ہی نہیں جائے گا...... بڑا ہی بے وقوف ہے......'' سائیں نے غصے میں کہا۔

ماسٹر باسط علی نے سرد آہ بھری اور نم آنکھوں کے ساتھ سائیں کی جانب دیکھا۔

''اور یہاں رہ کر تو گیلی لکڑی کی طرح سلگ رہا ہے۔ اس کا کیا فائدہ ہے؟ کرما نوالے بڑے اونچے بندے ہوتے ہیں۔ مولا نے ان کو بڑے سوہنے دل دیئے ہوتے ہیں اور ان سوہنے دلوں میں بڑی سچی اور میٹھی سوچیں ہوتی ہیں۔ وہ بھی ایسا ہے...... تو...... گھبراتا کس بات سے ہے؟ سائیں نے حیرت سے پوچھا۔

''اونچے ظرف والوں کی اعلیٰ ظرفی سے۔'' ماسٹر باسط علی نے مغموم لہجے میں جواب دیا۔

''سائیں مٹھانے معنی خیز انداز میں اس کی جانب دیکھا اور خاموش ہو گیا۔ شیرا چائے کا کپ لے کر آ گیا...... اور سائیں کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ سائیں نے چائے کی جانب دیکھا اور ''حق اللہ'' کا نعرہ بلند کرتے ہوئے کھوکھے سے باہر نکل گیا۔ شیرا چائے کا کپ اٹھا کر باہر لے گیا۔

نازی کی ناراضگی نے باسط علی کو عجیب سی الجھن میں پریشانی میں ڈال دیا تھا۔ نازی کئی روز سے اس کے سامنے نہیں آئی تھی اور گھر میں چلتی پھرتی بھی دکھائی نہ دی تھی۔ ایک روز شاہ زیب کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ نازی کی طبیعت خراب ہے۔ اسے بیہوشی کے دورے پڑ رہے ہیں، بخار بھی آ رہا ہے اور اس کی بیماری کی وجہ سے شاہ زیب اور اس کے گھر والے بے حد پریشان تھے۔ شاہ زیب شہر سے ڈاکٹروں کو بلا رہا تھا اور ایک دو بار وہ خود نازی کو بھی شہر لے کر گیا تھا، مگر نازی کی طبیعت سنبھل نہیں پا رہی تھی اور اس بات نے باسط علی کو اندر ہی اندر بے حد پریشان کر رکھا تھا۔ وہ اس کی بیماری کی وجہ جانتا تھا۔ نازی کو بیہوشی نہیں بلکہ ڈپریشن کے دورے کیوں پڑ رہے تھے۔ وہ نازی کی خاطر یہاں آیا تھا اور نازی اس کی وجہ سے بیمار پڑ گئی تھی۔ اس نے نازی کو کیا دیا تھا ڈپریشن، بیماری اور مایوسی۔ اس نے اس کے لئے کتنی بڑی قربانی دی تھی۔ اس کی محبت کی خاطر اس نے اپنے شوہر کو اپنے قریب نہیں آنے دیا تھا اور اس نے اس کے احساسات اور جذبات کی ذرا بھر بھی پروا نہیں کی تھی۔ وہ تو اس کی خاطر سنیاس لینے کو بھی تیار تھی۔ کنویں میں کودنے کی باتیں کرتی تھی، زہر کھانے کے منصوبے بناتی تھی اور اس نے اس کی محبت کی کیا قدر کی تھی۔ اس قدر جذباتی اور حد سے گزر جانے والی لڑکی کے جذبات کو جب یوں ٹھیس لگے تو اس کا دل یونہی کرچی کرچی ہو جاتا ہے۔ نازی کا ردعمل قدرتی تھا۔ نازی بے حد مضطرب ہو گئی تھی۔ باسط علی کی باتوں سے اس کا دل بہت بری طرح ٹوٹا تھا۔ اس کی سوچیں منتشر ہو گئی تھیں اور اس کے آنسو نہ تھمتے تھے۔ زیتون بانو اس سے اس کے آنسوؤں کی وجہ پوچھتی، مگر اس کے پاس بتانے کو کچھ نہ تھا۔ انہوں نے شاہ زیب سے بھی وجہ جاننے کی کوشش کی تو وہ خاموش ہو گیا۔

''معلوم نہیں...... اماں جی...... اسے میری کونسی بات بری لگی ہے، ہو سکتا ہے۔ میں نے انجانے میں کوئی ایسی بات کہہ دی ہو، جس سے اس کا دل دکھی ہو گیا ہو...... میں اس سے پوچھ کر اسے منانے کی کوشش کرتا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔'' شاہ زیب نے ماں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

''ہاں...... بیٹا...... انجانے میں انسان سے بہت کچھ ہو جاتا ہے تو اس کو منا لے...... تو بہتر ہے...... وہ گھر میں ہنستی، مسکراتی، چلتی پھرتی اچھی لگتی ہے۔ جب سے بستر سے لگی ہے گھر کی رونق ہی ختم ہو گئی ہے، سچ...... مجھے تو اس سے اپنی سگی بیٹیوں جیسی محبت ہو گئی ہے۔'' زیتون بانو نے محبت بھرے لہجے میں کہا تو شاہ زیب کی آنکھیں نم ہونے لگیں اور اس نے حسرت سے ماں کی جانب دیکھا اور وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔

''کاش...... وہ مجھے کسی قابل تو سمجھے...... کاش...... وہ مجھ سے بات کرنا تو پسند کرے...... کاش...... وہ میرے دل کے اندر لگی آگ کو محسوس تو کرے...... کاش...... میرے جذبات کی شدت کا اسے کبھی اندازہ ہو سکے...... میں کس اذیت ناک تنہائی میں سے گزر رہا ہوں...... اور میں اپنے آپ کو کس کس طرح سمجھاتا ہوں...... کیسے اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہوں...... اسے تو کچھ بھی احساس نہیں ہوتا...... کبھی بھی نہیں...... ذرا بھر بھی نہیں۔'' شاہ زیب نے آہ بھر کر سوچا اور نازی کے کمرے میں چلا گیا، وہ بستر پر آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔

''نازی...... ''اس نے آہستہ آواز میں پکارا، نازی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ تھوڑا سا آگے بڑھا اور اس کے اوپر قدرے جھکتے ہوئے محبت بھرے انداز میں سرگوشی کی۔ نازی ہڑبڑا کر اٹھی اور حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

''میرے قریب مت آنا...... ''وہ قدرے خفگی سے بولی۔

شاہ زیب جہاں تھا، وہیں رک گیا...... اس نے نازی کی جانب حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس کو اپنی شدید بے عزتی کا احساس ہونے لگا۔ اس کا دل ایسے دکھ اور ذلت کے احساس سے دوچار ہونے لگا جس کو بیان کرنے کے لئے اس کے پاس الفاظ نہیں تھے۔ اس کے دل میں ایسی آگ سلگ رہی تھی جو کسی کو دکھائی نہیں دے رہی تھی، مگر جس کے شعلے اس کے دماغ کو بھی سلگا رہے تھے، اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں، جیسے آتش فشاں کے اندر کھولتے ہوئے لاوے کا منظر پیش کر رہی ہوں۔ اس نے نازی کے ساتھ ہمیشہ اچھا سلوک ہی کیا تھا۔ اس کی بے رخی کے باوجود اپنے گھر میں اسے مالکن کا مقام دیا تھا، مگر نازی نے ہمیشہ اسے دھتکارا تھا اور نظر انداز کیے جانے کا یہ احساس اس کی روح کو بھی سلگاتا رہتا تھا۔

شاہ زیب کے کمرے سے جانے کے بعد نازی رونا شروع ہو گئی، جس کو پانے کے لئے وہ اس شخص کو جھٹلا رہی تھی، وہ اس سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا...... وہ اسے چھوڑ کر جانا چاہتا تھا۔ نازی شاہ زیب اور باسط علی کا موازنہ کرنا شروع ہو گئی۔ شاہ زیب ہر لحاظ سے اچھا انسان تھا۔ شاید باسط علی سے بھی...... اگر وہ باسط علی سے پہلے نہ ملتی اور شاہ زیب سے پہلے مل چکی ہوتی تو وہ شاید باسط علی کی طرف دیکھنا بھی پسند نہ کرتی۔ شاہ زیب خوبصورت تھا، مالدار تھا، سخی تھا، صاحب دل اور اعلیٰ ظرف انسان تھا۔ سب لوگ اس سے محبت کرتے تھے۔ اس کے لئے دعائیں کرتے تھے۔ وہ سب کچھ ہونے کے باوجود بھی اس کے لیے کچھ نہیں تھا۔ وہ اس سے محبت نہیں کر پائی تھی اور باسط علی کی محبت کو اپنے دل سے کھرچ نہیں پائی تھی۔ وہ دو کشتیوں کی سوار تھی اور دونوں کشتیوں سے وہ پاؤں اٹھانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ عجیب مخمصے میں پڑ گئی تھی۔ شاہ زیب کی اعلیٰ خوبیوں کی قائل ہونے کے باوجود وہ اس کو اپنے قریب پا کر بوکھلا جاتی تھی۔ اسے اپنے دل کے اندر داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتی تھی اور باسط علی جہاں کھڑا تھا، وہیں کھڑا تھا۔ وہ آگے نہیں بڑھ رہا تھا، وہ کیا کرے......؟ اس نے تو یہی منصوبہ بنایا تھا کہ باسط علی کے آتے ہی وہ شاہ زیب سے طلاق لے کر یہاں سے چلی

جائے گی، مگر باسط علی تو بہت بدل گیا تھا۔ اس کی سوچ بدل گئی تھی۔ وہ تو اسے چھوڑ کر جانے کی باتیں کر رہا تھا، ایسے میں اس کا دل ٹوٹ کر کرچی کرچی نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ اس نے بری طرح مات کھائی تھی۔ اس کا مستقبل کیا ہوگا...... وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔ اگر باسط علی اسے چھوڑ کر چلا گیا تو وہ کہاں جائے گی؟ شاہ زیب اسے کیسے قبول کرے گا اور وہ شاہ زیب کو کیسے......؟ اس کا دل انجانے خوف و خدشات سے دوچار ہونے لگا وہ ہر پل...... بستر پر لیٹی بھی کچھ سوچتی رہتی۔ اسے ہر راستہ بند نظر آتا...... اسے ڈپریشن کے دورے پڑنے شروع ہو گئے۔ اس کی بیماری کی کسی کو سمجھ نہ آ رہی تھی، نہ ڈاکٹروں کو...... اور نہ ہی کسی اور کو......

"مجھے باسط علی سے ایک بار کھل کر بات کرنی چاہئے...... پھر اس کے بعد...... مجھے فیصلہ کرنا چاہئے۔" نازی نے سوچا مگر اس کی طبیعت سنبھل نہیں پا رہی تھی۔ اس نے کھانا پینا بھی بالکل چھوڑ رکھا تھا۔ نقاہت کی وجہ سے چند قدم چلنا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ شادی کے بعد وہ ایک بار بھی حشمت خاں کی حویلی نہیں گئی تھی اور نہ ہی ان لوگوں سے کسی قسم کا رابطہ رکھا تھا۔ زیتون بانو اکثر شاہ زیب سے کہتی کہ وہ نازی کو اس کے گھر والوں سے ملا لائے، مگر نازی جانے سے انکار کر دیتی۔ اب بھی زیتون بانو کی ایک ہی رٹ تھی کہ شاہ زیب...... اس کو چند روز کے لئے اس کے ماں باپ کے پاس لے جائے یا انہیں بلوالے...... نازی ان کے بغیر اداس ہو گئی ہے...... نازی نے سنا تو اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے...... اگر اس کے ماں باپ آ گئے تو باسط علی کو یہاں دیکھ کر وہ یقیناً طوفان کھڑا کر دیں گے۔ اس نے عافیت اس میں سمجھی کہ خود ہی ان سے ملنے چلی جائے۔ شاہ زیب نے اس کے کمرے میں جانا اور اس سے بات کرنا مکمل طور پر بند کر دیا تھا۔ مگر زیتون بانو کے بے حد اصرار پر وہ نازی کو خود اس کے گاؤں لے گیا۔ اتنا لمبا سفر دونوں نے خاموشی سے کاٹا۔ نازی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی مسلسل باہر دیکھتی رہی اور شاہ زیب ڈرائیور کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر خاموش بیٹھا رہا، کسی وقت ڈرائیور سے باتیں کرنے لگتا، مگر زیادہ تر خاموش ہی رہا۔

نازی مسلسل باسط علی کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے حشمت خاں کی حویلی جانے کی قطعی خوشی نہ تھی، بلکہ وہاں جاتے ہوئے اس کا دل گھبرا رہا تھا۔ اس کے باپ نے اس کے ساتھ جو زبردستی کی تھی وہ اس کی وجہ سے اس سے بہت متنفر ہو گئی تھی اور اس کی ماں نے بھی اس کا کوئی ساتھ نہیں دیا تھا، اس لئے وہ ماں سے بھی خائف تھی۔ ان سے ملنے جانا اس کی مجبوری تھی۔ حشمت خاں اور اس کی ماں اسے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ وہ بہت کمزور ہو چکی تھی۔ اس کی ماں اسے گلے لگا کر رونے لگی، مگر وہ خاموش رہی۔ حشمت خاں شاہ زیب کی پہلی بار اپنے ہاں آمد پر بے حد خوش ہوا اور اس کی خاطر تواضع میں لگا رہا...... شاہ زیب کے لئے حویلی کا سب سے بہترین کمرہ صاف کرایا گیا۔ اس کے لئے انواع و اقسام کے کھانے پکوائے گئے۔

قادر علی، بلقیس اور باسط علی کی بہنیں بھی اس سے ملنے آئیں اور اس کی حالت دیکھ کر بہت رنجیدہ ہوئیں۔ سب چلے گئے تو باسط علی کی بہن ثمینہ اس کے پاس بیٹھی رہی۔ نازی اس سے باسط علی کے بارے میں پوچھنا چاہتی تھی، اس لئے اس نے جان بوجھ کر اسے اپنے پاس روک لیا۔

"باسط علی کہاں ہے...... آج...... کل؟ نازی نے جان بوجھ کر پوچھا۔

"وہ...... سمندر پار چلے گئے ہیں، وہاں ان کو اچھی ملازمت مل گئی ہے۔" ثمینہ نے خوش ہو کر جواب دیا تو نازی نے چونک کر اس کی جانب دیکھا...... اس کے پاس مزید کچھ پوچھنے کو باقی نہ تھا۔ ثمینہ ادھر ادھر کی باتیں کر کے وہاں سے چلی گئی اور نازی کا دل بوجھ تلے دبنے لگا۔

''نازی.....شاہ زیب تمہارے ساتھ ٹھیک ہے نا؟'' نازی کی ماں نے پوچھا۔

''ہاں.....'' وہ آہستہ آواز میں بولی۔

''اور تمہاری ساس......؟''

''وہ بھی بہت اچھی ہیں؟'' نازی نے جواب دیا۔

''تمہارا دل وہاں لگ گیا ہے نا؟''

''ہاں.....''

''تم خوش ہونا......؟''

''ہاں.....'' اس نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''تمہاری آنکھوں میں اداسی کیوں ہے؟''

''کیا آپ کو یاب نظر آئی ہے؟'' نازی نے حیرت سے پوچھا۔اس کی ماں اس کی بات سن کر خاموش ہوگئی اور نازی وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔

وہ بمشکل ایک دن وہاں رہی اور اگلے روز واپس لوٹ آئی۔وہ پہلے سے بھی زیادہ مغموم، اداس اور پریشان ہوگئی تھی۔باسط علی نے اس کی خاطر اپنے گھر والوں کے ساتھ کتنا بڑا جھوٹ بولا تھا، وہ اس کے بیرون ملک جانے سے کس قدر خوش اور مطمئن تھے اور ان کا اطمینان دیکھ کر وہ پریشان ہوگئی تھی۔اس کی خاطر وہ شاہ زیب کو دھوکہ دے رہی تھی اور باسط علی اس کی وجہ سے اپنے گھر والوں کو......اور حاصل کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔اس کے اندر شدید اضطراب اور بے چینی بڑھنے لگی۔

''شاہ زیب.....حشمت خاں کی مہمان نوازی اور خاطر تواضع سے بے حد متاثر ہوا تھا۔نازی پہلے سے بھی زیادہ اداس اور پریشان لگ رہی تھی، کوئی شے اندر ہی اندر اس کے دل میں خنجر کی طرح پیوست ہوگئی تھی اور وہ بات کسی سے شیئر نہیں کرسکتی تھی۔اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ جاتے ہی باسط علی سے دوٹوک بات کر کے معاملے کو ختم کرے گی۔

وہ گھر لوٹے تو زیتون بانو نے بہت خوش دلی سے ان کا استقبال کیا۔حشمت خاں اور اس کی بیوی نے بے شمار تحائف دے کر انہیں رخصت کیا تھا کہ بیٹی پہلی بار میکے آئی تھی۔

نازی جب سے واپس آئی تھی بہت خاموش تھی۔ایک عجیب سا بوجھ اس کے دل و دماغ پر حاوی تھا۔باسط علی کی محبت نے اسے اس حد تک دیوانہ بنا رکھا تھا کہ وہ اس سے کسی بھی صورت میں دستبردار نہیں ہونا چاہتی تھی اور باسط علی کا بدلا ہوا رویہ اسے اندر ہی اندر خوفزدہ کر رہا تھا۔وہ کوئی ایسی بات سننے کو بھی تیار نہ تھی، جو اسے باسط علی سے دور لے جائے۔اٹھتے بیٹھتے......سوتے جاگتے......ہر وقت ذہن میں باسط علی رہتا......سامنے گھومتے پھرتے شاہ زیب کی جگہ اسے باسط علی دکھائی دیتا......وہ دن بدن شدید ذہنی انتشار کا شکار ہو رہی تھی۔وہ اپنی ہی سوچوں میں گم اور پریشان رہتی۔

شاہ زیب کو ڈیرے پر بہت کام تھا۔دوسرے گاؤں سے کچھ لوگ اس سے ملنے آئے تھے۔اس لئے وہ رات گئے تک گھر نہیں لوٹا تھا۔

سردیوں کی خنک رات میں ہر جانب ہو کا عالم تھا۔ سب اپنے اپنے کمروں میں سو رہے تھے، ملازمین بھی سو چکے تھے۔ نازی کو یہ موقع غنیمت لگا اور وہ اوپر باسط علی کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ میز پر بہت سے کاغذات پھیلائے کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ نازی کو کمرے میں دیکھ کر وہ ہڑبڑا گیا۔

''تم......اور......اس وقت......؟'' باسط علی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......میں......آج تم سے دوٹوک بات کرنے آئی ہوں۔ باسط علی......اب میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ تمہیں اب کس بات کا انتظار ہے......مجھ سے اب مزید انتظار نہیں ہوسکتا۔ تم نے مجھے کیوں اذیت میں ڈال رکھا ہے؟ نازی اس کی جانب محبت پاش نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی شدت جذبات سے مغلوب ہو کر اس کے سینے سے لگ گئی۔ باسط علی نے اسے اپنے سے پیچھے ہٹانا چاہا۔

''نہیں......باسط علی......آج نہیں......'' وہ ہٹ دھرمی سے بولی۔

''نازنین......'' شاہ زیب ایکدم پیچھے سے آ کر چلایا۔ باسط علی بری طرح گھبرا کر پیچھے ہٹا اور نازی بھی ایک دم گھبرا گئی۔ شاہ زیب کا چہرہ غصے سے سرخ ہونے لگا۔ وہ غصے سے باسط علی کو گھورنے لگا۔

''تم......؟'' وہ غصے سے چلانے لگا۔

''یہی......میری محبت ہے......'' نازی ایک دم اس کے سامنے اکڑ کر بولی۔

شاہ زیب کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے اور اس نے گہری سانس لے کر قدرے بے بسی سے نازی کی طرف دیکھا۔ ''میں سب جانتا ہوں۔'' شاہ زیب نے آہ بھر کر انتہائی کمزور لہجے میں جواب دیا اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگیں۔ باسط علی ایک مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔

''شاہ زیب......اچھا ہوا......آج تم نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا مجھے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں......بہتر یہی ہے کہ تم مجھے آزاد کر دو......میں باسط علی سے شادی کرنا چاہتی ہوں......اب میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔'' نازی نے فیصلہ کن لہجے میں شاہ زیب سے کہا تو باسط علی حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

''ہاں......اب تم دونوں کا ایک دوسرے سے مل جانا ہی بہتر ہے۔'' شاہ زیب نے شکستہ لہجے میں کہا تو باسط علی نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ نازی کے دل کی کلی کھل اٹھی......اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔

''میں آج ہی تمہیں......ابھی......اور......اسی وقت طلاق دیتا ہوں۔'' شاہ زیب نے تین بار جملہ دہرایا اور ہر بار وہ بری طرح سسکا، وہ جیسے جیسے الفاظ ادا کرتا باسط علی کے دل میں کوئی شے بری طرح ٹوٹتی۔ اس کا دل لرزنے لگتا۔ اس کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے بھرنے لگیں، مگر وہ اس کے ہر جملے پر خوش ہو رہی تھی۔

شاہ زیب اسے طلاق دے کر بری طرح سسکنے لگا اور سسکیاں بھرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ باسط علی حیرت زدہ نگاہوں سے اسے باہر جاتے ہوئے دیکھنے لگا۔ وہ ساکت کھڑا تھا۔ نازی نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا۔

''شکر ہے...... آج فیصلہ ہو گیا۔'' وہ مسکرا کر بولی۔

''بہت برا ہوا......'' باسط علی زیر لب بڑبڑایا۔

''کیا...... تم...... خوش نہیں ہوئے؟ نازی نے حیرت سے پوچھا۔ باسط علی نے چونک کر نازی کی جانب دیکھا اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ وہ اسے بچوں کی طرح بلکتے ہوئے دیکھ کر گھبرا گئی۔

''کیا...... ہوا...... تم رو کیوں رہے ہو؟'' نازی نے حیرت سے پوچھا۔

''تمہیں کس بات کا دکھ ہو رہا ہے؟ اس نے پھر پوچھا معلوم نہیں۔

''کیا...... تم شاہ زیب کے دکھی ہونے سے پریشان ہو رہے ہو...... یا...... پھر...... ؟'' نازی نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''میں کچھ نہیں جانتا...... کچھ نہیں جانتا...... اور مجھ سے مت پوچھو...... مجھے کچھ معلوم نہیں، مگر بہت برا ہوا ہے...... بہت برا......'' باسط علی نے پھر روتے ہوئے کہا تو نازی اس کی بات سن کر خاموش ہو گئی...... اور حیرت سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔

''تم...... خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو...... ہمیں تو خوش ہونا چاہئے کہ ہم اپنی محبت کی منزل کی جانب بڑھ رہے ہیں، اب ہم ایک دوسرے کی محبت کو پانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اب ہمارے راستے میں کوئی بھی نہیں ہوگا...... میرا باپ بھی نہیں...... اور تمہاری کوئی مجبوری بھی نہیں۔'' نازی نے خوش ہو کر کہا۔ باسط علی سسکتا رہا...... اور...... اپنی ہی سوچوں میں مگن رہا۔ اسے قطعی احساس نہیں ہو رہا تھا کہ نازی اس کے پاس بیٹھی ہے...... وہ اس کی ذات سے مکمل طور پر بے خبر ہو گیا تھا۔ اس کے اندر ایسی چبھن...... ایسی کسک...... اور ایسا درد تھا جو اس کی روح کو چھو کے لگ رہا تھا کہ اس سے سانس لینا مشکل ہو گیا تھا۔

''باسط علی...... تمہیں کیا ہو گیا ہے...... کیا تم اپنے حواسوں میں ہو؟'' نازی نے اسے یوں بے خبر دیکھ کر قدرے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

''تم...... اس وقت یہاں سے چلی جاؤ۔'' باسط علی نے قدرے جذباتی لہجے میں کہا۔ نازی نے اس کی طرف بغور دیکھا اور خاموشی سے اٹھ کر چلی گئی۔

شاہ زیب کہاں چلا گیا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا۔ صبح سویرے اس نے ماں کو طلاق کے بارے میں بتایا تھا اور زیتون بانو کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔

''طلاق...... کیوں...... اور...... کس وجہ سے؟ زیتون بانو نے حیرت سے پوچھا۔

''اماں...... میرا اور اس کا ساتھ ناممکن ہے...... اسے میرا ساتھ قبول نہیں اور اس کی بیماری کی وجہ بھی یہی ہے...... اس لئے میں نے اسے آزاد کر دیا ہے''۔ وہ آہستہ آواز میں بولا۔

''شاہ...... زیب...... یہ...... تو نے کیا کیا...... مجھے کچھ تو بتاتے...... میں اس سے بات کرتی...... تو نے اس کے ساتھ بہت ظلم کیا ہے...... وہ میری بہو نہیں...... بیٹی ہے۔ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی......'' زیتون بانو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

شاہ زیب نے چونک کر ماں کی جانب دیکھا۔اس کی آنکھیں رات بھر رونے سے سرخ ہو رہی تھیں۔ ماں کی ناراضگی پر وہ تڑپ گیا اور ......اور خاموشی سے گھر سے باہر نکل گیا...... زیتون بانو...... نازی کے کمرے میں گئی اور اسے اپنے گلے سے لگا کر بلند آواز میں رونے لگی۔ نازی...... قدرے حیران ہو رہی تھی۔

''اسے......میں......کبھی معاف نہیں کروں گی......اس نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے...... بہت ظلم'' زیتون بانو روتے ہوئے بولی تو نازی خاموشی سے سب کچھ سنتی رہی۔

''کاش! میرے بس......میں ہوتا......تو میں تمہیں......کبھی اس گھر سے جانے نہ دیتی......لیکن عدت تمہیں یہیں گزارنی ہوگی۔'' زیتون بانو نے کہا تو نازی نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

''نہیں......اب...... میں یہاں نہیں رہ سکتی ...... آپ مجھے یہاں سے جانے دیں۔'' نازی نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے......میں تمہارے گھر اطلاع بھجواتی ہوں تمہارے والدین آ کر تمہیں یہاں سے عزت سے لے جائیں۔'' زیتون بانو نے کہا۔

''نہیں...... ایسا......مت کیجئے گا...... ابا......مجھے جان سے ماردیں گے......'' نازی نے گھبرا کر کہا۔

''پھر......کہاں جاؤ گی؟'' زیتون بانو نے حیرت سے پوچھا۔

''شہر......میں......اپنی ایک سہیلی کے پاس......'' اس نے جواب دیا۔

''کیا مطلب......؟ تم اپنے گھر کبھی نہیں جاؤ گی؟'' زیتون بانو نے چونک کر پوچھا۔

''جاؤں گی...... مگر کچھ روز بعد......'' اس نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے......میں......تمہیں خود......تمہاری سہیلی کے پاس چھوڑ کر آؤں گی۔'' زیتون بانو نے کہا تو نازی پریشان ہو گئی۔اس کے پاس اب انکار کا کوئی جواز نہیں تھا۔وہ خاموش ہو گئی، مگر اندر ہی اندر وہ پریشان ہو گئی۔

چار پانچ روز گزر گئے تھے۔شاہ زیب گھر نہیں آیا تھا اور زیتون بانو نے بھی غصے میں اس کی کوئی خیریت نہ پوچھی تھی۔شاہ زیب کس ذہنی اذیت سے گزر رہا تھا کسی کو کانوں کان خبر نہ تھی اس کی وجہ سے باسط علی کو شدید رنج پہنچا تھا۔ایک عجیب قسم کا احساس گناہ اسے اندر ہی اندر پریشان کر رہا تھا۔شاہ زیب سے ملنے اور اس کا سامنا کرنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔وہ اس سے ملے بغیر...... بنا کچھ کہے اور بتائے زیتون بانو سے اپنی ذاتی مصروفیات کا بہانہ بنا کر چلا گیا تھا۔

ماسٹر باسط علی صبح سویرے ہی سکول پہنچ گیا۔موسم بے حد ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ہر طرف گہری دھند چھائی تھی کہ سامنے آتا شخص بمشکل دکھائی دے رہا تھا۔ ماسٹر باسط علی رات بھر نہیں سو پایا تھا۔ ماضی کی راکھ میں دبی چنگاریاں اس کے سینے میں ایسی آگ سلگائے رکھتی تھیں جو کسی پل بھی ٹھنڈی نہیں ہو پا رہی تھیں۔ ان سلگتی چنگاریوں سے شعلے بھڑک اٹھتے تو پھر سرد نہیں ہو پاتے تھے۔ وہ اپنے ماضی اور اس کی تلخ یادوں سے فرار پانے کے لئے وہ منہ اندھیرے سکول جا پہنچا۔سکول کا گیٹ بند تھا۔ چوکیدار اسے دیکھ کر چونکا۔

"ماسٹر صاحب...... آج تو سکول میں چھٹی ہے...... کیا آپ کو معلوم نہیں...... یا...... پھر......؟" چوکیدار نے معنی خیز انداز میں پوچھا تو ماسٹر باسط علی ایک دم بوکھلا گئے۔

"ہاں...... ہاں...... مجھے پتا ہے...... آج سکول میں چھٹی ہے۔ موسم بہت خراب ہو رہا ہے...... اس لئے میں دیکھنے آیا ہوں کہ یہاں سب خیریت تو ہے نا۔" ماسٹر باسط علی نے بات بدلتے ہوئے کہا تو چوکیدار نے بغور اس کی جانب یوں دیکھا جیسے اسے اس کی بات پر یقین نہ آ رہا ہو۔

"پہلے...... تو...... آپ کو کبھی خیال نہیں آیا۔" چوکیدار نے حیرت سے کہا اور خاموش ہو گیا۔

ماسٹر باسط علی خاموشی سے وہاں سے چل پڑے۔ انہیں اپنے آپ پر افسوس ہونے لگا۔ اب ان سے اکثر ایسی حرکات سرزد ہونے لگی تھیں، جن کی وجہ سے وہ دوسروں کی نظروں میں اپنے لئے حیرت اور تاسف کے تاثرات محسوس کرتے اور یہ بات ان کے لئے بہت تکلیف دہ تھی۔ وہ اپنے اندر ندامت محسوس کرتے ہوئے سڑک پر چلنے لگے۔ وہ اپنی سوچوں میں اس قدر مگن تھے کہ انہیں سامنے آنے والا سائیں مٹھا بالکل دکھائی نہ دیا۔ وہ اس کے ساتھ بری طرح ٹکرائے اور ہڑبڑا کر انہیں دیکھنے لگے۔

سائیں نے بلند آواز میں بے ہنگم قہقہہ لگایا اور کتنی ہی دیر ہنستا رہا۔ اس کا ہنس ہنس کر برا حال ہو رہا تھا۔ ہنسنے کی وجہ سے اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ ماسٹر باسط علی کو مزید ندامت محسوس ہونے لگی۔ سائیں ہنستے ہوئے بولا۔

"ماسٹر جی...... کاہے کو باؤلا ہو رہا ہے، نہ اپنی ہوش...... نہ من کی...... مارا مارا ادھر ادھر پھر رہا ہے...... کچھ نہیں ملنے کا...... پاگل ہو جائے گا...... دیوانہ......" سائیں نے سنجیدگی سے کہا۔

"وہی تو ہو گیا ہوں...... کچھ سمجھ نہیں آ رہا...... میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے......؟" ماسٹر باسط علی نے آہ بھر کر کہا۔

"شی......" سائیں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش ہونے کو کہا۔

ماسٹر باسط علی نے چونک کر اس کی طرف حیرت سے دیکھا۔

"اتنا علم پڑھ پڑھ کر پھر اندھیرے کی باتیں کر رہے ہو...... بڑے ہی نادان ہو...... کیا فائدہ...... اس علم کا جس نے تیرا من نہیں دھویا"۔ سائیں نے کہا تو وہ چونکے۔

"من نہیں دھویا کیا مطلب......؟" ماسٹر باسط علی نے حیرت سے پوچھا۔

| | |
|---|---|
| پڑھ قرآن تے حافظ ہویا | دور نہ ہویا پردا ہو |
| پڑھ پڑھ عالم فاضل ہویا | مڑوی طالب زردا ہو |
| لکھ ہزار کتاباں پڑھیاں | ظالم نفس نہ مردا ہو |
| باجھ فقیراں مردا ناہیں | باہو چور اندر دا ہو |

ماسٹر باسط علی یوں بوکھلا گئے جیسے سائیں نے ان کے اندر کا چور واقعی پکڑ کر انہیں دکھا دیا ہو......

زیتون بانو کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی تھی اور وہ نازی کو چھوڑنے خود شہر نہ جا سکی تھی۔ انہوں نے اسے ڈرائیور اور دو ادھیڑ عمر ملازماؤں کے ساتھ بھیج دیا۔ نازی مطمئن ہوگئی۔ زیتون بانو کا رو رو کر برا حال تھا۔ انہوں نے کئی روز سے کھانا نہیں کھایا تھا۔ نازی سے وہ بہت محبت کرنے لگی تھیں۔ نازی کو یوں اپنے سے جدا کرنا ان کے لئے بہت مشکل ہو رہا تھا۔ انہوں نے اسے اپنے بہت سے زیورات اور کپڑے دے کر رخصت کیا تھا۔ نازی جانے سے پہلے ان سے ملنے آئی تو انہوں نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کرلیا۔ وہ نازی کو یوں جاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ نازی کے جانے کے بعد انہیں دل کا دورہ پڑا تھا اور انہیں جلدی سے قریبی شہر لے جایا گیا تھا۔ شاہ زیب پھر بھی گھر نہیں آیا تھا، وہ نجانے کہاں چلا گیا تھا۔ نازی شہر میں کالج کی ایک دوست کے پاس آ کر بے حد خوش تھی۔ کچھ روز بعد باسط علی بھی اس سے ملنے آیا تھا مگر بہت اداس اور خاموش تھا۔

''باسط علی...... تم ابھی تک اداس ہو......؟'' نازی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......'' اس نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''کیوں......؟''

''معلوم نہیں...... مگر بہت مضطرب کرنے والی اداسی...... میری روح میں کہیں ٹھہری گئی ہے...... مجھے سمجھ میں نہیں آتا...... مجھے کیا ہو گیا ہے...... لیکن جو کچھ بھی ہوا ہے...... بہت......'' اس نے آہ بھر کر کچھ کہنا چاہا۔

''بہت اچھا ہوا ہے......'' نازی اس کا جملہ کاٹتے ہوئے بولی۔

''نہیں...... اچھا...... نہیں ہوا ہے......'' باسط علی نے افسردگی سے جواب دیا۔

''مت...... ایسی باتیں کرو...... تم صرف میرے بارے میں سوچو...... اپنی محبت کو پانے کے بارے میں......'' نازی نے مسکرا کر کہا۔

''محبت...... نجانے کہاں چلی گئی ہے؟'' باسط علی نے افسردگی سے جواب دیا۔

''باسط علی...... مجھے اپنی فضول باتوں سے پریشان مت کرو، تمہیں ذرا خیال نہیں آتا کہ میں نے تمہاری خاطر کیا کچھ کیا ہے......؟ شاہ زیب...... اس کی محبت...... اس کی حویلی سے ملنے والی عزت دولت۔ آن...... ہاں سب کچھ صرف اور صرف تمہارے لئے چھوڑ کر آئی ہوں...... اور وہ بھی تمہاری محبت کی خاطر...... اور اب تم کہہ رہے ہو...... کہ محبت نجانے کہاں چلی گئی ہے...... باسط علی...... میں یہ بات سننا ہی نہیں چاہتی...... مجھے...... تمہاری محبت اور چاہت کی تمنا ہے...... اور...... اب اگر تم نے مجھے چھوڑنے کی بات کی...... تو میں تمہیں اور اپنے آپ کو مار ڈالوں گی۔'' نازی نے غصے سے چلاتے ہوئے کہا تو باسط علی اس کی آنکھوں میں بے باکی اور غصے کے تاثرات دیکھ کر چونک گیا۔

''باسط علی...... اب مجھ سے فرار ممکن نہیں...... اس لئے بہتر یہی ہے کہ اپنا ذہن بدل لو...... ورنہ......'' نازی پھر دھمکی کے انداز میں بولی تو باسط علی نے پھر چونک کر اسے دیکھا۔

''ورنہ...... کیا......؟'' باسط علی نے حیرت سے پوچھا۔

''ورنہ...... ہم دونوں کے لیے بہت برا ہوگا۔'' نازی نے گہری سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

باسط علی خاموشی سے اس کی جانب دیکھنے لگا اور اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ نازی نے اس کی جانب دیکھا اور اس کے دل میں باسط علی کے لئے محبت کے جذبات مشتعل ہونے لگے۔

''تم ...... کیوں ایسی باتیں کرتے ہو...... جو مجھے غصہ دلاتی ہیں...... کیا تمہیں...... میں...... اور میری محبت نظر نہیں آتی؟'' نازی نے محبت بھرے لہجے میں اسے کہا اور شدت جذبات سے مغلوب ہو کر اس کے گلے لگ گئی۔ باسط علی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''اسی لئے...... تو میں کہتی ہوں...... کہ ہمیں ایک دوسرے کی محبت کی بہت ضرورت ہے...... باسط علی...... میرا دل...... میری روح...... اور میرا جسم...... تمہاری محبت کے لمس کے بغیر ادھورا ہے۔ میں جس محبت کے لئے تڑپ رہی ہوں...... مجھے اس کے لئے مزید بے قرار نہ کرو...... تم نہیں جانتے...... میں تمہارے بغیر کتنی ادھوری ہوں...... کتنی بے تاب...... وہ والہانہ انداز میں اس کے ہاتھ کو چومتے ہوئے بولی...... مگر...... باسط علی مٹی کا مادھو بنا خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا۔ اس کے اندر کوئی حرارت پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ وہ بے حس و حرکت اداس بیٹھا تھا۔

''باسط علی......'' نازی نے اسے زور سے جھنجوڑا۔ کیا تم مجھے محسوس کر رہے ہو......؟'' نازی نے اس کے کان میں محبت سے سرگوشی کی۔

''میری طبیعت ٹھیک نہیں...... تم اس وقت یہاں سے چلی جاؤ...... ابھی یہ سب کچھ مناسب نہیں...... شادی کے بعد'' وہ آہستہ آواز میں بولا۔

نازی نے اس کی جانب دیکھا اور خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ٹھیک ہے...... اب میں تم سے تب ہی ملوں گی......'' اس سے پہلے بالکل بھی نہیں......'' نازی کہہ کر چلی گئی۔ اور باسط علی خاموش نگاہوں سے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

زیتون بانو کی حالت روز بروز خراب ہو رہی تھی۔ انہیں دو بار دل کا دورہ پڑ چکا تھا۔ وہ ہاسپٹل میں ایڈمٹ تھیں جب شاہ زیب ان سے ملنے آیا۔ وہ بہت کمزور، پریشان اور دکھی لگ رہا تھا۔ زیتون بانو نے اسے دیکھ کر غصے سے منہ پھیر لیا اور سسکنے لگی۔

''اماں...... آپ جو کچھ سمجھ رہی ہیں...... وہ ٹھیک نہیں''۔ شاہ زیب نے آہستہ آواز میں کہا۔

''قدرت نے تجھے اختیار کیا دیا...... تم اپنے آپ کو خدا سمجھ بیٹھے......'' زیتون بانو نے غصے سے کہا۔

''میری اتنی اوقات کہاں......؟ وہ آہ بھر کر بولا۔

''پھر...... تو نے یہ سب کیوں کیا؟ زیتون بانو نے پوچھا۔

''یہ اس کی خواہش تھی۔''

''کیا......؟''

''ہاں...... وہ اپنی محبت کو پانا چاہتی تھی...... باسط علی کو''۔ شاہ زیب نے نم آنکھوں سے جواب دیا۔

''وہ...... وہ...... لڑکا......؟'' زیتون بانو نے بے یقینی سے پوچھا۔

''ہاں...... وہ...... اسی کی خاطر یہاں آیا تھا...... مجھے سب معلوم تھا...... اگر میں نازنین کو طلاق نہ دیتا تو شاید......؟ اس نے آہ بھر کر جملہ

ادھورا چھوڑ دیا۔

"کیا اس نے...... تمہارے ساتھ...... دھوکہ کیا ہے...... زیادتی کی ہے...... تمہارے گھر میں رہ کر......" زیتون بانو نے مایوسی اور بے بسی سے شاہ زیب کی جانب دیکھا اور رونے لگی۔

"مجھے معاف کر دے...... میں اسے کیا سمجھتی رہی...... اور...... وہ...... کیا تھی......؟ زیتون بانو نے پریشانی سے کہا۔

"اماں...... انسان کو سمجھنا بہت مشکل ہے......" شاہ زیب نے آہ بھر کر کہا۔

"میں...... اس کے ماں باپ کے پاس جا کر ان کو بتاؤں گی کہ ان کی بیٹی نے کس طرح ہمیں دھوکہ دیا۔ دن دیہاڑے وہ ہماری آنکھوں میں دھول جھونکتی رہی اور ہم بس دیکھتے ہی رہ گئے۔" زیتون بانو نے خفگی سے کہا۔

"اماں...... کسی کو کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں...... وہ غصے میں آ کر فساد ڈالیں گے اور نازی کی شادی پھر ساحل سے نہیں ہو سکے گی...... پہلے بھی حشمت خاں نے اس کے ساتھ زبردستی کی تھی۔" شاہ زیب آہستہ آواز میں بولا۔

زیتون بانو بغور اس کی جانب دیکھتی رہی۔

"مولا...... نے تجھے کتنا بڑا دل دیا ہے...... اتنا سب کچھ جان کر تم نے اپنے دل میں چھپایا...... اور ان کے ملاپ کی تمنا رکھتا ہے۔ بیٹا...... اتنی برداشت، صبر اور شکر والے لوگ بڑے قیمتی انسان ہوتے ہیں۔ نازنین بڑی بدقسمت نکلی جو تجھ جیسے انسان کو جان نہ سکی...... میں ٹھیک ہو جاؤں تو بہت اچھی لڑکی دیکھ کر تیری شادی کروں گی۔" زیتون بانو نے پرامید لہجے میں کہا۔

"نہیں...... اماں...... اب نہیں...... اب میں ساری زندگی شادی نہیں کروں گا...... کبھی بھی نہیں۔" شاہ زیب نے کہا۔

"کیوں......؟" زیتون بانو نے چونک کر پوچھا۔

"اماں...... میرے ٹوٹے دل میں اب اتنی ہمت نہیں رہی کہ اور دکھ اٹھا سکے...... بس...... اتنا ہی کافی ہے۔" شاہ زیب نے آنسوؤں سے بھری آواز سے کہا۔

"اور...... میں اپنے بیٹے کو یوں اداس اور تنہا نہیں دیکھ سکتی...... میں تیرے لئے ایسی لڑکی لاؤں گی...... جو تجھے خوش رکھے گی۔" زیتون بانو نے محبت سے اس کے سر پر پیار پھیرتے ہوئے کہا۔

"اماں...... اب مجھے دنیا کی کوئی شے خوش نہیں کر سکے گی...... اماں...... میں کبھی کبھی سوچتا تھا کہ وہ عورت دنیا کی خوش نصیب عورت ہوگی جو مجھ سے شادی کرے گی...... میں اسے اتنی محبت اور خوشیاں دوں گا...... شاید ہی دنیا کے کسی شوہر نے اپنی بیوی کو دی ہوں...... شاید...... مجھے اپنے بارے میں یہ خوش فہمی تھی یا گھمنڈ...... جسے مولا نے توڑ دیا...... اور میرے نصیب میں ایسی عورت لکھ دی جسے نہ میری محبت کی ضرورت تھی اور نہ میری خوشیوں کی تمنا اس نے مجھے اپنے قریب ہی نہیں آنے دیا...... شاید مجھے پا کر وہ اپنے آپ کو بدقسمت خیال کرتی تھی...... اس نے میری خوش فہمی اور گھمنڈ ایسا توڑا ہے کہ اب میرے اندر نہ کوئی امید رہی ہے اور نہ ہی کوئی خوشی...... میں اب بالکل خالی ہو گیا ہوں...... بالکل خالی......" وہ نم آنکھوں کے ساتھ شکستہ لہجے میں بولا۔

زیتون بانو خاموشی سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔ اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا...... شاہ زیب بھی خاموش بیٹھا سرد آہیں بھرتا رہا۔

زیتون بانو ٹھیک ہو کر حویلی آ گئی۔ حویلی بے حد اداس، ویران اور سونی سونی لگ رہی تھی زیتون بانو نے گھر کی ویرانی دور کرنے کے لئے شاہ زیب کے لئے لڑکی کی تلاش شروع کر دی...... وہ ہر دوسرے...... تیسرے دن...... شاہ زیب سے کسی نہ کسی لڑکی کا ذکر کرتی تو وہ خاموش ہو جاتا۔ وہ بہت اصرار کرتی تو وہ آہ بھر کر رہ جاتا۔

''اماں...... میرے لئے لڑکی کی تلاش چھوڑ دو...... مجھے اب کسی کی تمنا نہیں...... میرے دل میں اس قدر اضطراب اور بے چینی ہے...... جو کسی طرح بھی ختم نہیں ہوتی۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا...... کہ مجھے کیا ہو گیا ہے......؟ میرا دل بہت اداس اور پریشان رہتا ہے۔ میں شادی نہیں کر سکتا۔'' شاہ زیب نے آہ بھر کر کہا۔

''شادی ہو گی...... تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' زیتون بانو نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''نہیں...... اماں...... اب...... شادی ہو گی...... تو میں اس لڑکی کو خوش نہیں رکھ پاؤں گا...... کیونکہ نازنین کی وجہ سے جس طرح میرا دل ٹوٹا ہے، اسے اب کوئی نہیں جوڑ سکتا...... وہ لمحے...... وہ باتیں...... وہ یادیں...... میرے اندر ایسی اذیت بن کر ٹھہر گئی ہیں...... جو مجھے بہت تکلیف دیتی رہتی ہیں...... مجھے بہت مضطرب اور بے چین رکھتی ہیں۔'' شاہ زیب نے کہا۔

''کیا...... زندگی یونہی گزار دو گے؟'' زیتون بانو نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......'' اس نے آہ بھر کر جواب دیا اور نم آنکھوں سے ماں کی جانب دیکھنے لگا۔

''اور تمہاری یہ باتیں...... مجھے کتنی تکلیف دیتی ہیں، شاید تمہیں اس کا اندازہ نہیں۔'' زیتون بانو نے روتے ہوئے کہا۔

''اچھی طرح جانتا ہوں...... اسی لئے تو اپنے دل کی ساری باتیں...... صاف صاف تجھے بتا دی ہیں...... اماں...... ضروری تو نہیں کہ انسان جس بات کی تمنا کرے...... وہ پوری بھی ہو جائے...... اور جس شے کو اپنے لئے خوشی سمجھے وہ شے اسے خوشی بھی دے دے۔'' شاہ زیب نے کہا اور اٹھ کر چلا گیا۔

شاہ زیب بہت کم گھر آتا، زیادہ تر وقت وہ ڈیرے پر رہتا۔ اکثر راتوں کو بھی گھر نہیں آتا تھا۔ زیتون بانو کو اس کی بہت فکر لاحق رہتی۔ اسے کھانے بنا بنا کر بھیجتی اور گھر آنے کو کہتی، مگر وہ کبھی کبھار آتا...... ماں کا حال احوال پوچھ کر چلے جاتا...... نہ زیتون بانو اس سے زیادہ پوچھ گچھ کرتی نہ وہ بتاتا، مگر زیتون بانو کو ملازمین سب خبریں دیتے تھے کہ شاہ زیب کے ڈیرے پر کون آتا جاتا ہے...... اور شاہ زیب کیا کچھ کرتا رہتا ہے۔ وہ سارا وقت زمینداری میں اور مزارعوں کے ساتھ مصروف رہتا...... اور رات بھر وہ کھلے آسمان تلے کھیتوں، کھلیانوں میں پھرتا رہتا، تھک ہار کر ڈیرے پر آ کر سو جاتا، وہ دن بدن کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ چہرے پر ہر وقت تفکر اور سنجیدگی کے تاثرات نمایاں رہتے۔ اس کی خوبصورت سرخ و سفید رنگت بے رونق اور گندمی ہو رہی تھی۔ وہ بہت کم باتیں کرنے لگا تھا۔ ہر وقت کسی نہ کسی سوچ میں ڈوبا رہتا۔ زیتون بانو جو بھی پوچھتی...... اس کا ہاں یا ناں میں جواب دے کر خاموش ہو جاتا۔ اس کی حالت دیکھ کر زیتون بانو اندر ہی اندر کڑھتی رہتی۔ ان کا دل بھر آتا اور نادانستہ ان کے دل سے نازی کے لئے بد دعائیں نکلتیں۔

''جس محبت کی خاطر...... تو نے میرے بیٹے کی زندگی برباد کی ہے...... خدا کرے وہ محبت تمہیں کبھی نہ ملے...... اپنے دل سے نکلنے والی

صدا پر وہ خود ہی چونک اٹھتیں......

''یہ...... میں...... کیا سوچ رہی ہوں...... میں نے تو کبھی کسی کا برا نہیں چاہا...... پھر...... نجانے...... کیوں...... ؟ یا خدایا...... ! مجھے معاف کرنا...... میں اپنے بیٹے کی ایسی حالت دیکھ کر اپنے دل کو قابو میں نہیں رکھ پاتی...... اور...... اور...... اور'' وہ پریشان ہو کر سوچنے لگتی۔

نازی بہت خوش تھی۔ وہ اپنی سہیلی کے ساتھ مل کر شادی کی خریداری کرنے میں مصروف تھی۔ زیتون بانو نے اسے بہت سے زیورات اور روپے دے کر رخصت کیا تھا۔ اس کے پاس اپنے باپ کے دیئے ہوئے بھاری زیورات بھی موجود تھے۔ اس نے شہر میں گھر کرائے پر لیا تھا اور اس کی مکمل آرائش وسجاوٹ بھی خود کی تھی۔ وہ بہت محبت اور چاہت سے گھر کو سجا رہی تھی۔ ان کی شادی میں چند روز باقی تھے...... اس روز کے بعد وہ باسط علی سے نہیں ملی تھی۔ باسط علی کو ایک کالج میں نوکری مل گئی تھی اور اس کے ساتھ وہ کچھ ٹیوشنز پڑھانے لگا تھا اسے ہر ماہ گھر میں بھی اپنے ایک دوست کے ذریعے پیسے بھیجنے ہوتے تھے۔

شادی میں دو دن رہ گئے تھے۔ نازی کی سہیلی نے باسط علی کو نکاح کی تقریب اور انتظامات کے بارے میں معلومات پہنچا دی تھیں۔ باسط علی خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا۔

''آپ بہت خوش قسمت ہیں کہ آپ کو نازنین جیسی لڑکی مل رہی ہے...... وہ آپ سے محبت نہیں...... عشق کرتی ہے۔ میں نے بہت کم لڑکیوں کو...... کسی کے لیے اتنی تکالیف اٹھاتے ہوئے دیکھا ہے۔'' نازی کی سہیلی ثروت نے مسکرا کر اسے بتایا تو وہ خاموشی سے سنتا رہا۔

کیا...... آپ خوش نہیں؟ ثروت نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں...... ہوں......'' اس نے گہری سانس لیتے ہوئے سنجیدگی سے جواب دیا تو ثروت حیرت سے اس کی جانب دیکھنے لگی...... یہ کیسی خوشی ہے جس کا اظہار نہ اس کے لہجے سے ہو رہا تھا...... نہ آنکھوں سے...... نہ آواز میں خوشی کی رمق تھی...... نہ چہرے کے تاثرات میں...... اسے خوشی کا کوئی شائبہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے...... آپ وقت مقررہ پر پہنچ جائیے گا۔'' ثروت نے کہا تو جواباً وہ خاموش رہا۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا۔ باسط علی کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے اندر پھیلی بے چینی اور بے قراری میں مزید اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ کبھی اس کا دل چاہتا کہ سب کچھ چھوڑ کر کہیں بھاگ جائے...... نازی سے دور...... مگر اگلے ہی لمحے اس کا دل انکار کرتا۔

نہیں...... نازی نے میری خاطر بہت قربانیاں دی ہیں...... مجھے اس کی محبت کی خاطر...... اس سے شادی کرنا پڑے گی۔ فرار کا کوئی راستہ نہیں...... وہ چارپائی پر لیٹا کروٹیں بدلتا رہا اور سوچتا رہا اور اسی کشمکش میں اسے نیند آ گئی۔

ہر طرف گہری تاریکی چھائی تھی۔ باسط علی کسی تاریک راستے پر سرپٹ بھاگ رہا تھا اور انتہائی خوفزدہ تھا۔ اس کے پیچھے ایک شیر اسے مارنے کو آ رہا تھا اور اسے کوئی جائے پناہ نظر نہ آ رہی تھی...... نہ کوئی راستہ نہ کوئی منزل...... اچانک اسے اپنے سامنے گھوڑے پر سوار ایک شخص دکھائی دیتا ہے۔ باسط علی اسے رکنے کو کہتا ہے، سوار رکتا ہے۔ باسط علی بھاگتا ہوا اس کے پاس جاتا ہے اور روتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ اسے بچالے۔ سوار اپنے چہرے سے کپڑا ہٹاتا ہے تو وہ شاہ زیب ہے۔ اس کے چہرے سے سفید روشنی کی شعاعیں نکل رہی ہیں۔ باسط علی اسے دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتا

ہے۔شاہ زیب اپنی پستول سے شیر پر فائرنگ کرتا ہے۔اندھیرے میں شیر کے دھاڑنے کی آواز بند ہو جاتی ہے۔شاہ زیب...... باسط علی کی طرف خاموش نگاہوں سے دیکھتا ہے۔اس کی آنکھوں میں باسط کے لئے نفرت،غم اور غصہ ہے۔

''میں...... نے...... نازی......کو''باسط علی روتے ہوئے اسے کچھ بتانا چاہتا ہے مگر شاہ زیب اس کی بات نہیں سنتا اور گھوڑے کو ایڑ لگا دیتا ہے۔باسط علی اسے آواز دیتا رہ جاتا ہے۔

''شاہ زیب......خدا کے لئے......میری بات سنو...... مجھے معاف کر دو...... میں نے نازی کو نہیں بھگایا...... مجھے معاف کر دو...... میری طرف یوں مت دیکھو......''باسط علی اونچی آواز میں بڑبڑانے لگتا ہے۔اس کا چہرہ اور جسم پسینے سے تر ہو رہا ہے۔وہ ہڑبڑا کر اٹھ جاتا ہے۔وہ خواب تھا یا حقیقت......شکر ہے......وہ خواب تھا......وہ سر جھٹک کر سوچ میں پڑ گیا۔

نہیں......وہ حقیقت ہی تھی۔شاہ زیب نے جب اسے نازی کے ساتھ دیکھا تھا تو اس کی آنکھوں میں ویسے ہی تاثرات تھے......نفرت، غم وغصے اور حسرت سے بھرے تاثرات۔اس لمحے بھی اسے شاہ زیب کی آنکھوں سے ویسا ہی خوف آیا تھا،جیسے اب ایسے خواب میں اسے دیکھ کر وہ ڈر گیا تھا......وہ عجیب سی الجھن کا شکار ہو گیا تھا۔

نجانے کہاں غلطی ہوگئی ہے......نجانے شاہ زیب مجھے کیوں گنہگار سمجھ رہا ہے...... وہ سمجھتا ہے کہ میں نے اسے دھوکہ دیا ہے...... میں اسے کیسے سمجھاؤں کیسے بتاؤں کہ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا...... میں بے قصور ہوں...... میں نے کچھ نہیں کیا...... کچھ نہیں...... اس نے سوچا''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو...... کہ تم گناہگار نہیں......تم نازی کی محبت میں اندھے ہو گئے اور اس کی محبت کی خاطر......تم اس کے پاس چلے گئے...... شاہ زیب کو دھوکہ دیا......اس کے پاس ملازمت کی......اس نے تم پر اعتبار کیا،اپنے گھر میں مہمان ٹھہرایا،تمہیں اپنے گھر کا فرد سمجھا......اور تم نے اس سے غداری کی۔اس کی امانت میں خیانت کی۔اس کا سب کچھ لوٹ کر لے آئے......تم نے شاہ زیب جیسے اچھے انسان کے ساتھ بہت برا کیا...... بہت برا...... باسط علی تمہیں کبھی سکون نہیں ملے گا۔اس کا ضمیر اسے ملامت کرنے لگا۔باسط علی گھبرا گیا وہ اپنے ضمیر کی عدالت میں مجرم بنا کھڑا تھا اور اس کا ضمیر اس پر تازیانے برسا رہا تھا۔اس پر فرد جرم عائد کر رہا تھا۔اسے اس کی غلطیاں اور گناہ گن گن کر بتا رہا تھا اور باسط علی کے پاس اپنی حمایت میں بولنے کے لئے کوئی الفاظ نہیں تھے۔

''نہیں......میں......''باسط علی کے دل نے کچھ کہنا چاہا۔

''نہیں......باسط علی......تم ہی گنہگار ہو......تم نے شاہ زیب کے ساتھ غداری کی......اس کے ساتھ بے وفائی کی......اس کو دھوکہ دیا...... تم نے اس کے ساتھ زیادتی کی ہے...... ظلم کیا ہے،تم بہت ظالم ہو۔''اس کا ضمیر پھر اسے ملامت کرنے لگا۔

باسط علی کا دل گھبرانے لگا،وہ بے بسی سے بلند آواز میں رونے لگا۔اس کی سسکیاں آہستہ آہستہ بلند ہونے لگیں۔اس کے ضمیر نے اسے مجرم اور گنہگار ٹھہرا دیا تھا۔اب دنیا کی کوئی عدالت بھی اسے بری الذمہ قرار دیتی تو اسے سکون نہیں آ سکتا تھا۔اس کے ضمیر نے اسے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا کہ وہ مجرم اور گنہگار ہے اور اب اس فیصلے......کو وہ جھٹلا نہیں سکتا تھا۔وہ گھبرا کر رونے لگا اور اس کے دل پر بوجھ بڑھنے لگا۔

# (۹)

شہیر کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے دل نے کام کرنا بند کر دیا ہو۔ اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ روشنی کے الفاظ اس کے کانوں میں بار بار گونجتے......وہ خود ہی تردید کرتا......اس کی باتوں پر یقین نہ کرتا......

مگر اگلے ہی لمحے اپنے دل کو کوسنے لگتا......جس نے اسے دھوکہ دیا تھا، اسے ورغلایا تھا......اسے بہلایا تھا......اسے ہر طرح سے مطمئن کیا تھا......کہ زل صرف اور صرف اس کی ہے......اس کا جواب بہت جلد اسے 'ہاں' کی صورت میں ملے گا اور زل اس کے علاوہ کسی اور سے محبت کر ہی نہیں سکتی......

کیا کسی کا دل کسی کو اس قدر دھوکہ بھی دے سکتا ہے اور وہ کتنا بے وقوف تھا جو دل کی باتوں پر یقین کر گیا......اس نے جو سوچنا چاہا......دل نے ویسے ہی اس کو خواب دکھائے......جیسی میٹھی، محبت بھری باتیں وہ سننا اور کہنا چاہتا تھا۔ دل نے وہی کچھ کہا......اسے اتنی امیدیں دلائیں تھیں کہ وہ اپنے آپ کو زل کے قریب محسوس کرتا تھا۔ زل اس سے صرف چند قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی......اور دل اسے بہلاتا تھا کہ وہ بہت جلد اس کی دسترس میں ہوگی......اس کا دل اس کو کیسے کیسے بہلاتا رہا......اور اس کو بہکاتا رہا مگر سب کچھ بے ثمر نکلا۔

اب دل مکمل طور پر خاموش تھا۔ کچھ کہہ نہیں رہا تھا کچھ سن نہیں رہا تھا۔ اس کی برستی آنکھوں سے ٹپ ٹپ گرتے آنسوؤں کا دلدوز نغمہ خاموشی سے سن رہا تھا......اور خاموش تماشائی بن کر اس کی بے بسی کا تماشا دیکھ رہا تھا۔

"میں......کیوں دل کی باتوں میں آیا......میں نے کیونکر اس پر یقین کر لیا کہ زل صرف اور صرف میری ہے" وہ بار بار پچھتا کر اپنے آپ سے سوال کرتا مگر اب کی بار اسے کوئی جواب نہ ملتا......اس کا دل ہر الزام سے بری الذمہ تھا......یوں جیسے کہہ رہا ہو کہ نادان تو وہ خود تھا جو اس کی باتوں میں آیا......اور ویسے بھی اس نے یہ کب کہا تھا......کہ زل اس سے شادی کرے گی۔

ہو سکتا ہے وہ اس سے اب بھی محبت کرتی ہو......یہ ارسلان نجانے کہاں سے آ گیا......اور......ارسلان تو اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھا......نہ اچھی شکل وصورت نہ اچھا بیک گراؤنڈ......نہ مالی طور پر مستحکم......وہ ایک اسٹور کیپر کا بیٹا تھا......متوسط گھرانے سے اس کا تعلق تھا اور......اور......اس کے پاس کچھ بھی ایسا نہیں کہ زل جیسی اعلیٰ خاندان کی خوبصورت پری پیکر لڑکی ارسلان جیسے شخص کا انتخاب کرے۔ نجانے ارسلان نے اس کو کیا سبز باغ دکھائے ہیں......کہ......زل......؟ لیکن زل بے وقوف نہیں......کہ وہ ارسلان کی باتوں میں آ جائے......اور اس نے تو کہا تھا کہ اس کی محبت بہت قیمتی ہے اور اس نے اپنی قیمتی شے ایک ادنیٰ اور کمتر انسان کو دے دی......اور اسے مسترد کر دیا اس کی ذات کی نفی کر دی......

اسے کسی قابل ہی نہ سمجھا......

شطرنج کی یہ بازی ارسلان کیسے جیت گیا......؟

میں کیا کروں......؟ میرا دل نہیں مانتا کہ زل مجھے یوں مسترد کر سکتی ہے...... میرا دل مجھے دھوکہ نہیں دے سکتا...... اف خدایا! میں کیا کروں! وہ اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے زور زور سے رونے لگا...... اپنے ہاتھوں کو ایک دوسرے میں پیوست کر کے پوری شدت سے رو رہا تھا کہ اس کے رونے کی آواز باہر نہ جائے، کبھی ہاتھوں کی بند مٹھیوں کو زور زور سے بیڈ پر مارتا، اسے یقین نہیں آ رہا تھا......

کہ وہ محبت کی بازی ہار گیا ہے......

محبت کے میدان میں وہ کس شان سے نکلا تھا......

ایک بہادر اور متکبر شہسوار کی طرح پرعزم اور پراعتماد فتح کا علم بلند کرنے کی تیاری کر رہا تھا کہ اچانک کہیں سے ایک تیر اس کے سینے میں پیوست ہو گیا تھا......اور چند لمحے پہلے جیت کے جشن کا سوچنے والا اب ہار کے ساتھ ساتھ زخمی دل کی تکلیف سے بھی دوچار ہو گیا تھا...... یہی حالت اس کی ہو رہی تھی...... اس کا دل لہولہان ہو رہا تھا...... نجانے اس میں سے کس قدر خون بہہ نکلا تھا۔ کتنا باقی رہ گیا تھا...... وہ کچھ نہیں جانتا تھا صرف اتنا جانتا تھا کہ اس سے اس کا سب کچھ چھن گیا ہے...... اس کی زل...... اس کی پہلی محبت...... اور آخری چاہت...... وہ آئندہ زندگی میں کسی پر اعتبار نہیں کرے گا......

اس کی انا کو بھی شدید ٹھیس لگی تھی

اس نے کس قدر پراعتماد ہو کر اس سے اظہار محبت کیا تھا...... اور...... زل نے اس کی محبت کو دھتکار دیا تھا۔ اسے اس کی محبت نہیں چاہیے تھی...... اسے شہیر بھی نہیں چاہیے تھا...... اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ شہیر اس سے کتنی شدید محبت کرتا ہے...... جب اس نے اسے ہی مسترد کر دیا تو پھر محبت کی شدت اور تڑپ اس کے لئے کیا مفہوم رکھتی تھی...... وہ اس قدر شدت سے رو رہا تھا...... کہ پوری زندگی میں اتنا نہیں رویا تھا......

وہ جو اپنے آپ کو...... اپنی سوچوں کو...... اپنی باتوں کو ہمیشہ دوسروں سے چھپانے کا عادی تھا...... اسے زل نے کیسے سرعام رسوا کر دیا تھا......

اس سے کیا کچھ چھنا تھا......

اس کی محبت......!

اس کی انا......!

اس کی عزت نفس......!

اس کا اعتبار......!

سب کچھ تو چھن گیا تھا...... اب باقی کیا رہ گیا تھا...... سوائے کسک، تڑپ، دکھ، رنج و کرب کے......

وہ ساری رات روتا رہا...... کبھی بے قرار ہو کر کمرے میں چکر لگانے لگتا...... کبھی پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیتا...... تو کبھی اپنے آپ کو ختم کرنے کے منصوبے بناتا...... اس کی آنکھیں مسلسل رونے سے سرخ ہو گئی تھیں اور آنکھوں کے پپوٹے مسلسل رونے سے یوں سوج کر بھاری اور موٹے ہو گئے تھے جیسے کسی آشوب چشم میں مبتلا ہوں...... مسلسل رونے سے اس کا سر شدید درد سے پھٹ رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اگر

وہ چند لمحے نہ سویا تو بے خوابی اور درد سے مر جائے گا۔ اس نے سائیڈ ٹیبل کی دراز میں رکھی نیند کی دو گولیاں کھائیں۔ چند لمحوں کے لئے اسے غنودگی ہوئی مگر پھر وہ زیادہ بے خوابی اور درد میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے نہ پورا دن کچھ کھایا تھا نہ رات کو...... ممی اور سمیر شہر سے باہر کہیں گئے تھے اور ڈیڈی کئی ہفتوں سے بزنس ٹور کے سلسلے میں امریکہ گئے تھے۔ وہ بوجھل قدم اٹھاتا نیچے اترا...... پورے گھر میں سکوت طاری تھا...... صرف ٹیوب لائٹس آن تھیں...... جو گھر میں کسی کے ہونے کا احساس دلا رہی تھیں ورنہ ہر طرف ڈسنے والی خاموشی تھی۔ وہ چپکے سے ڈیڈی کے کمرے میں گیا اور ان کے کمرے میں موجود شیلف کے ایک خفیہ خانے سے شیمپئن کی ایک بوتل نکالی...... اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ڈیڈی اکثر ڈرنک کرتے ہیں اور وہ سب کچھ کہاں رکھتے ہیں۔ وہ بوتل نکال کر اپنے کمرے میں لے گیا...... مگر...... اس سے قبل اس نے کبھی ڈرنک تو کیا...... شراب کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا...... ممی اکثر ڈیڈی سے اس بات پر جھگڑتی تھیں...... اور سمیر کو وہ اس لئے بھی پسند کرتی تھیں کہ بیرون ملک جا کر بھی اس نے کبھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ شہیر کے لئے بھی یہ لمحہ بہت بھاری تھا...... وہ جانتا تھا...... کہ یہ ایک ایسی برائی ہے جس کو انسان ایک بار چھو لے...... تو یہ عمر بھر ساتھ نہیں چھوڑتی...... اس کو پینے والے اس کے حق میں چاہے کتنا ہی کیوں نہ بولیں مگر اس کو لعنت وہ بھی دل سے سمجھتے ہیں۔

شہیر کا ذہن بری طرح الجھ رہا تھا۔ اس لمحے وہ شدید ذہنی اذیت میں مبتلا تھا اور اس اذیت سے کسی نہ کسی طرح چھٹکارا پانا چاہتا تھا۔ شیمپئن گلاس میں ڈالتے ہوئے صرف ایک معمولی سی سوچ اس کے ذہن میں آئی جس نے اسے روکنا چاہا۔

''کیا وہ ٹھیک کر رہا ہے......؟''

اس نے ایک لمحے کو رک کر گلاس کی طرف دیکھا...... اور گہری سانس لی۔

''اور جو کچھ میرے ساتھ ہو رہا ہے...... کیا وہ ٹھیک ہے؟'' اس نے زخمی دل کے ساتھ سوچا۔ ایک گہری لمبی سسکی لی اور اس کے ساتھ ہی اس کی نم آنکھیں برسنے لگیں۔

''زندگی میں کچھ بھی اہم نہیں رہتا...... جب دل بے قرار ہو...... زخمی ہو...... اور...... تڑپ رہا ہو...... میں اس لمحے کچھ نہیں سوچنا چاہتا...... میرا دل پھٹ رہا ہے......'' اس نے غصے سے سوچا اور گلاس پکڑ کر منہ کو لگایا۔

اس لمحے اسے یوں محسوس ہوا...... جیسے کائنات ہل گئی ہو...... اس کے قدموں تلے زمین لرز رہی ہو...... اس کا دل اور دماغ سن ہو گئے ہوں...... اس کی زبان گنگ اور آنکھیں پتھرا گئی ہوں...... اس کے تمام احساسات...... جذبات...... و خیالات سب تھم گئے ہوں...... اس نے دو گلاس پیے...... اور نیم بیہوش ہو کر بیڈ پر گر گیا۔ روشنی۔ شہیر کو بار بار فون کر رہی تھی مگر اس روز زل کی منگنی کی خبر سنانے کے بعد شہیر کا موبائل مسلسل بند تھا...... روشنی حیران تھی کہ شہیر کو اچانک کیا ہو گیا تھا......

کیا وہ زل سے محبت کرتا ہے......؟

لیکن یہ کیسے...... ممکن ہے......؟

زل نے تو اس کی محبت کو جھٹلایا تھا...... اور...... اس نے ارسلان کو منتخب ہی اس لئے کیا ہے کہ وہ اس سے محبت کرتی تھی...... شہیر اور زل کے

درمیان ایسا کچھ بھی نہیں ہوسکتا......اس کے دل نے اس کو تسلی دی......مگر اس کے دل کے اندر کچھ ایسی بے قراری تھی کہ اس نے زل سے ملنے کا فیصلہ کیا۔

زل کا گھر......اس کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر وہ حیران رہ گئی......مگر زل نے کبھی بھی ظاہر نہیں کیا تھا کہ اس کا تعلق بہت امیر گھرانے سے ہے۔اس کے اندر نمود و نمائش بالکل بھی نہیں تھی......زل......روشنی سے مل کر بہت خوش ہوئی۔

''زل......میں تمہیں مبارک دینے آئی ہوں......'' روشنی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تھینک یو......'' زل نے مسکرا کر جواب دیا......اور اس کے لئے چائے کا آرڈر دیا۔

تھوڑی دیر بعد نوکر پر تکلف چائے لے آیا......اور چائے بنا کر دونوں کو پکڑائی۔

''زل ......ہم سب بہت حیران ہیں ......کہ......یہ سب......کیسے اچانک ہوگیا......؟ روشنی نے حیرت سے پوچھا۔

''کیا......؟'' زل نے جان بوجھ کر حیرت سے پوچھا۔

''تم......اور......ارسلان ...... کیا ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے......؟ مگر......کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی'' روشنی نے انتہائی حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب......؟ تم لوگوں کو خبر دے کے میں اپنا اسکینڈل بنواتی......'' زل نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

''مگر......پھر بھی......یہ کیسے ہوگیا......؟ اور وہ بھی ایگزامز سے پہلے......سب لوگ پیپرز کی تیاریاں کر رہے ہیں اور تم لوگوں نے منگنی کر لی''۔روشنی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......بس حالات ہی کچھ ایسے ہوگئے تھے......ارسلان نے پر پوز کیا......تو مجھے فیصلہ کرنا پڑا......کیا ارسلان اچھا نہیں......؟'' زل نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''ن......ن......نہیں......یہ بات نہیں......وہ بہت اچھا ہے......اور میرا خیال ہے تم لوگوں کی زندگی بہت اچھی گزرے گی......ارسلان بہت خوش مزاج ہے'' روشنی نے کہا۔

''ہاں......مگر......میں نے صرف اس کی ایک بات کو بہت شدت سے محسوس کرتے ہوئے یہ فیصلہ کیا......کہ......وہ دوسروں کے دکھ اور ان کے احساسات کو اپنے دل میں ہی نہیں......اپنی روح میں بھی محسوس کرتا ہے......اور میرا خیال ہے کہ جس میں اتنی بڑی خوبی ہو......وہ کسی کو ہرٹ نہیں کرسکتا......ارسلان خوبصورت نہیں مگر وہ خوبصورت انسان ہے......وہ امیر نہیں......مگر اس کا دل بہت امیر ہے......'' زل نے پر امید لہجے میں مسکرا کر کہا تو روشنی بھی مسکرا دی۔

''یہ بات سن کر سب بہت خوش ہوئے ہیں......شہیر کو بھی میں نے بتایا......تو......'' روشنی رک رک کر بولی۔

''تو......؟'' زل نے انتہائی حیرت سے چونک کر پوچھا۔

''تو......وہ......بھی......'' روشنی پھر رکی۔

''کیا......وہ بھی جان کر خوش ہوا؟'' زل نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

''معلوم نہیں......اچانک اس کا فون disconnect ہو گیا اور اس کے بعد میری اس سے بات نہیں ہوئی'' روشنی نے قدرے سنجیدگی سے جواب دیا تو زل بھی چند ساعتوں کے لئے خاموش ہو گئی۔

''اور......سب دوستوں کا کیا حال ہے؟'' زل نے بات کا رخ موڑتے ہوئے کہا۔

''سب ٹھیک ہیں......اب کالج کھلنے میں ایک ماہ تو رہ گیا ہے......تم سے اور ارسلان سے تب ٹریٹ لیں گے'' روشنی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''یس......آف کورس......'' زل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''زل......شبیر......؟'' روشنی کچھ کہتے ہوئے رکی۔

''ہاں......کیا ہوا......شبیر کو......؟'' وہ ایک دم پھر چونکی۔

''کچھ......نہیں......کچھ نہیں'' وہ ہونٹ چباتے ہوئے بولی۔

''روشنی......کیا تم شبیر کو پسند کرتی ہو؟'' زل نے اچانک پوچھا تو روشنی نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا......اس کی آنکھیں چھلکنے لگیں......اور وہ بغیر کچھ کہے وہاں سے نکل گئی۔زل حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی......

☆

''ممی......ممی......ایمبولینس کو جلدی کال کریں......شبیر کمرے میں بے ہوش ہے......اور......اور......اس کی حالت بہت خراب ہے'' سمیر چلاتا ہوا سیڑھیاں اترتے ہوئے بولا۔

مسز تہمینہ اور فاخر حسین جلدی سے اپنے بیڈروم سے باہر نکلے......اور شبیر کے کمرے کی طرف بھاگے......وہ کارپٹ پر گرا ہوا تھا اور اس کی ٹیبل پر ایش ٹرے میں جلے ہوئے سگریٹوں کے ٹکڑے، نیند کی گولیوں کی شیشی اور شیمپین کی بوتلیں رکھی تھیں۔

''اوہ......نو......'' مسز تہمینہ حیرت اور صدمے سے گھبرا کر بولیں۔

''اوہ......گاڈ......یہ......یہ......یہاں کیسے؟'' ڈیڈی نے شیمپین کی بوتل ہاتھ میں پکڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

''ممی......ہاسپٹل میں فون کریں......'' سمیر نے انہیں جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

مسز تہمینہ نے بمشکل اپنے حواس پر قابو پایا اور موبائل پر ہاسپٹل کا نمبر ملایا۔تھوڑی دیر بعد ایمبولینس آ گئی اور شبیر کو ہاسپٹل لے جایا گیا۔

سمیر، ممی اور ڈیڈی بھی ہاسپٹل پہنچ گئے......اسے ایمرجنسی روم میں لے جایا گیا۔

''ڈاکٹر صاحب اسے کیا ہوا ہے'' فاخر حسین نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

''انہوں نے suicide (خودکشی) کرنے کی کوشش کی ہے اور شیمپین کے ساتھ سلیپنگ پلز کھائی ہیں۔

''یہ شکر ہے کہ آپ وقت پر انہیں ہاسپٹل لے آئے......ورنہ ان کو بچانا بہت مشکل ہو جاتا......ہم نے ان کا معدہ واش کر دیا ہے مگر ابھی

کچھ روز انہیں ہاسپٹل میں رہنا پڑے گا......اب فکر کی بات نہیں" ڈاکٹر نے مسکرا کر تسلی دیتے ہوئے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔

"شہیر نے ایسا کیوں کیا......؟ اف خدایا......! وہ اس حد تک ہائپر ہو سکتا ہے......وہ تو بہت خاموش اور سنجیدہ انسان ہے" سمیر نے حیرت سے کہا......

مسز فاخر نے اس کی بات سن کر رونا شروع کر دیا۔

"ممی......پلیز......ایسا مت کریں......وہ اب ٹھیک ہے" سمیر نے ماں کو اپنے ساتھ لگا کر تسلی دی......مگر ہاسپٹل کے کوریڈور میں ان کی سسکیوں اور آہوں کی آواز واضح طور پر سنائی دینے لگی۔

☆

سمیر شہیر کے بیڈ روم میں گیا اور اس کے کمرے کی تلاشی لینے لگا......اس نے اس کا موبائل آن کیا جو نجانے کتنے روز سے بند تھا......شہیر نے سکرین سیور پر لکھا ہوا تھا "لو یو زل" سمیر چونکا، اس نے سارا موبائل چیک کیا اس میں ایک میسج saved تھا۔

"زل......میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا......لو......یو......شہیر"

سمیر کی آنکھیں حیرت سے پھیلنے لگیں......پوری سکرین پر یہی الفاظ بار بار لکھے گئے تھے......سمیر سوچ میں پڑ گیا......اور اسی لمحے روشنی کا فون آ گیا......سمیر نے جیسے ہی ہیلو کہا......تو وہ ایک دم بول پڑی۔

شہیر......تم کہاں ہو؟ میں کب سے فون کر رہی ہوں مگر تمہارا فون آف تھا......موبائل کیوں آف تھا......؟"

"میں سمیر بات کر رہا ہوں......شہیر کا بڑا بھائی" سمیر نے جلدی سے تعارف کرایا۔

"آئی ایم سوری......" روشنی نے کہا۔

"کوئی بات نہیں......دراصل شہیر ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہے......وہ بہت بیمار ہے" سمیر نے اسے بتایا۔

"ک......کک......کیا ہوا اسے؟" روشنی نے گھبرا کر پوچھا۔

"کچھ خاص نہیں......stomach کچھ اپ سیٹ ہے......" سمیر نے ٹالتے ہوئے کہا......روشنی نے کچھ تفصیلات پوچھیں اور موبائل بند کر دیا۔

"کم از کم......اسے تو خبر کرنی چاہیے جس کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا ہے......" سمیر موبائل کو ہاتھ میں پکڑ کر سوچنے لگا اور کافی دیر سوچنے کے بعد زل کا نمبر ملایا......" زل نے ہیلو کہا۔

"آئی ایم سمیر......شہیر کا بڑا بھائی......کیا آپ زل ہیں؟" سمیر نے پوچھا۔

"جی......ہاں......" زل نے جواب دیا۔

"شہیر......ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہے......" سمیر نے بتایا۔

"کیوں......کیا ہوا......اسے؟" وہ قدرے سرد لہجے میں بولی۔

"میرا خیال ہے...... کہ جب کوئی suicide کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کی reasons کیا ہو سکتی ہیں"

"suicide"؟ زل نے حیرت سے چونکتے ہوئے کہا۔

"ہاں......اس نے attempt کی ہے......مگر شکر ہے بچ گیا ہے ابھی ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہے......" سمیر نے کہا۔

"کیا......اس نے میرے بارے میں آپ کو......؟" زل نے پوچھنا چاہا۔

"نہیں......اس کے موبائل میں ایک میسج دیکھ کر میں نے آپ کو فون کیا ہے......کہ آپ کو بھی اس کا علم ہونا چاہیے کہ وہ آپ کی محبت میں کس حد تک جا سکتا ہے" سمیر نے سنجیدگی سے کہا۔

"ہم......میں......ایسی کوئی بات نہیں تھی......" زل بمشکل بولی۔

"ٹھیک ہے......آپ کہتی ہیں تو میں مان لیتا ہوں......مگر......شاید......شہیر اس بات کو نہ مانے......" شہیر نے کہہ کر فون بند کر دیا۔

زل سمیر کی باتیں سن کر پریشان ہو گئی......اسے قطعی امید نہیں تھی کہ شہیر اس کی محبت میں اس قدر دیوانہ بھی ہو سکتا ہے......وہ تو اس کی محبت کو یونہی اس کی دل لگی سمجھتی رہی......اور انتہائی کوشش کے باوجود بھی اس کے دل نے شہیر کو ایک لمحے کے لئے بھی قبول نہیں کیا......وہ جب بھی اپنے دل سے پوچھتی......تو اس کو جواب نفی میں ملتا......

نہیں......شہیر وہ شخص نہیں......جس کے نام وہ اپنی محبت، چاہت اور زندگی کر دے اس نے کئی بار اپنے دل سے پوچھا......بار بار پوچھا......مگر جواب نفی میں ملتا......میں شہیر سے کبھی بھی محبت نہیں کر پاؤں گی......" اس کا دل جواب دیتا۔

"مگر اب یہ سب کیا ہو گیا تھا......ارسلان کو اس کے گھر والوں نے کتنی مشکل سے قبول کیا تھا......یہ وہی جانتی تھی......اس نے اپنی زندگی کو ختم کرنے کی دھمکیاں دی تھیں......اور......شہیر نے اس کی خاطر خودکشی کر لی تھی۔ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے......؟ میں کس الجھن کا شکار ہو رہی ہوں......مگر......جو کچھ بھی ہوا ہے وہ بہت شاکنگ ہے......مجھے......شہیر کو دیکھنے......اور اسے تسلی دینے کے لئے ہاسپٹل جانا چاہیے......" اس نے سنجیدگی سے سوچا......اور گھر سے باہر چلی گئی۔

☆

شہیر کی بیماری کی خبر سن کر روشنی بے تاب ہو گئی......اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کے دل پر کسی نے نشتر چلا دیا ہو......شہیر کسی تکلیف میں مبتلا ہو......اور اسے خبر ہی نہ ہو......یہ کیسے ممکن ہے؟

جس روز سے شہیر سے اس کا رابطہ منقطع ہوا تھا اس کا دل بری طرح بے چین اور بے قرار ہو رہا تھا......اور اسے اس بے قراری کی وجہ صرف اور صرف شہیر معلوم ہوتا تھا مگر شہیر اس سے بات کیوں نہیں کر رہا تھا......اس کی وجہ جان کر وہ زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑانے لگی اور گاڑی کی چابی لے کر سمیر کے بتائے ہوئے ہاسپٹل کی طرف چل پڑی۔

شہیر کو میری محبت اور توجہ کی ضرورت ہے...... میں کب تک اپنی انا کو اپنی محبت پر ترجیح دیتی رہوں گی...... میں آج اس سے خود اظہار محبت کروں گی......وہ اس وقت بیمار ہے اور میری محبت...... میری چاہت اس کی بیماری میں مرہم کا کام کرے گی......اس نے پر عزم ہو کر سوچا......اس لمحے اس کے ذہن میں صرف شہیر اور اس کی زندگی اہم تھی......اس کی عزت اور انا، اب پس منظر میں چلی گئی تھی۔

وہ ہاسپٹل میں داخل ہوئی تو ریسپشنسٹ سے شہیر کے روم کا پوچھ کر کوریڈور میں داخل ہوئی......اس نے کمرے کا مطلوبہ نمبر پڑھا......دروازہ تھوڑا سا کھلا تھا......وہ دستک دینے لگی مگر ایکدم ٹھٹھک گئی......وہ کمرے میں زل کی جھلک دیکھ کر چونکی۔اس کے چہرے پر حیرت اور تشویش کے آثار نمایاں ہونے لگے......وہ دروازے سے ہٹ کر کھڑی ہوگئی اور بغور سننے لگی۔

''شہیر...... میں کیسے بتاؤں...... میرے پاس الفاظ نہیں...... جو میرے دل کی حالت بتا سکیں کہ میں کس قدر اذیت میں سے گزری ہوں...... میں نے بہت کوشش کی...... اپنے آپ کو سمجھانے کی...... مگر میں اپنے دل کو قائل نہ کر سکی...... میرے دل میں تمہارے لئے محبت پیدا نہیں ہو سکی......'' زل نے بمشکل کہا......تو...... روشنی کی آنکھیں حیرت سے پھیلنے لگیں......اس کا دل زور سے دھک دھک کرنے لگا اور زمین اسے قدموں تلے سرکتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''مجھے...... میرا قصور بتاؤ...... جو تمہارے علاوہ کسی سے محبت کا سوچ بھی نہیں سکتا''شہیر نے سسکتے ہوئے کہا۔

روشنی کے چہرے پر پسینے کے قطرے نمودار ہونے لگے......اسے دل کی دھڑکن ڈوبتی ہوئی محسوس ہوئی......

''آئی ایم سوری...... شہیر...... پلیز...... مجھے معاف کر دو...... میں نہیں جانتی تھی کہ...... تم...... میری خاطر خودکشی بھی کر سکتے ہو......'' زل نے نم آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''میں...... تمہیں کبھی بھی بھلا نہیں سکتا...... پلیز مجھے یہ مت کہو کہ میں تم سے محبت نہ کروں...... میں مرتے دم تک یہ نہیں کر سکوں گا......'' شہیر نے کہا۔

''پھر...... میری وجہ سے اپنی زندگی کو یوں برباد مت کرو...... میں گناہ کے اس احساس کے ساتھ کبھی بھی زندہ نہیں رہ سکوں گی......اور ضروری تو نہیں کہ ہم جس کو چاہیں......اور جس سے محبت کریں......وہ ہمارا نصیب بھی بنے......زندگی میں بہت کچھ ہمیں اپنی خواہشات کے مطابق نہیں ملتا......'' زل نے کہا۔

''تم ارسلان سے محبت کرتی ہو......اور......اس کو پا بھی لیا......تمہاری تو خواہش پوری ہوگئی'' شہیر نے آہ بھر کر کہا تو زل خاموش ہوگئی......

کمرے میں سکوت طاری ہوگیا......صرف شہیر کے سسکنے کی آوازیں آنے لگیں......وہ بیڈ پر لیٹا زل کو دیکھ رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو مسلسل گر رہے تھے......روشنی سے وہاں رکنا محال ہوگیا......اور وہ......وہیں سے باہر لوٹ آئی......جلدی سے گاڑی ہاسپٹل کے گیٹ سے باہر نکالی اور انتہائی تیزی سے چلاتی ہوئی سڑک پر آگئی......اس کا دل پھٹنے کو بے تاب ہو رہا تھا......اس کی آنکھیں آنسوؤں کو ضبط کرنے کی وجہ سے سرخ ہونے لگی تھیں اور دل و دماغ میں ابال اٹھنے کی وجہ سے آنکھیں جل رہی تھیں اس کا رواں رواں دل میں لگی آگ سے سلگ رہا تھا......وہ اتنی تیز

ڈرائیونگ کر رہی تھی کہ کئی بار اس نے سگنلز توڑے..... مگر اس کو گردوپیش کی کوئی خبر نہ تھی.....

گھر پہنچ کر وہ سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی اور دروازہ بند کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی......

"یہ..... یہ سب کیا ہو گیا ہے.....؟ وہ کسی اور سے محبت کرتا رہا.....اور..... میں خود فریبی میں مبتلا رہی..... میرے دل نے مجھے کیسے امید دلائی......اور کیسے بہلاتا رہا..... کہ وہ مجھ سے ہی محبت کرتا ہے...... میں کیسے دھوکہ کھا گئی۔

روشنی تم اتنا بڑا دھوکہ کھا گئی.....اپنے آپ سے.....اپنے دل سے..... شبیر کی باتوں کو اپنے لئے سمجھتی رہی اس کے لفظوں سے اپنے لئے مفہوم اخذ کرتی رہی...... وہ تو اس وقت کی منتظر تھی جب شبیر خود اس سے اقرار محبت کرے گا.....اور..... وہ اس دن کے انتظار میں ایک ایک پل بے قراری سے گزار رہی تھی...... وہ اس قدر شدت سے رو رہی تھی کہ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی سانس سینے میں بند ہو رہی ہوں.....اور.....اسے کہیں سے آکسیجن نہ مل رہی ہو.....

"روشنی..... محبت نے تمہیں کتنا بڑا فریب دیا ہے..... تم سے تمہارا سب کچھ چھین لیا ہے..... میں کیسے اس احساس کے ساتھ زندہ رہوں گی..... کہ میں نے اپنی یکطرفہ محبت سے دھوکہ کھایا ہے روشنی ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی..... وہ ایسے درد میں مبتلا تھی..... جس کا کوئی علاج نہ تھا اور ایسے دکھ سے دوچار ہو رہی تھی جس کا کوئی مداوا نہ تھا..... روشنی کا محبت پر سے اعتبار اٹھنے لگا تھا.....

کہتے ہیں دل کو دل سے راہ ہوتی ہے..... جس کے لئے دل میں محبت اور چاہت محسوس کی جائے..... وہ بھی ویسے ہی لطیف احساسات اس شخص کے لئے اپنے دل میں محسوس کرتا ہے..... مگر روشنی کے معاملے میں یہ بات بھی غلط ثابت ہوئی تھی.....

اسے زندگی بے معنی اور بے کار لگنے لگی تھی.....

جیسے شبیر کو زیل کے بغیر نامکمل اور ادھوری لگ رہی تھی..... روشنی کو شبیر کے بغیر سانسیں لینا بھی محال لگ رہا تھا.....اور شبیر کو زیل کے بغیر.....

محبت ہمیشہ دکھ دیتی ہے.....ایک بار دل میں گھر کر لے.....تو اس دل کو برباد کر کے رکھ دیتی ہے.....اور روشنی کے دل کی دنیا مکمل طور پر برباد ہو گئی تھی۔

شبیر کے نام نے آکٹوپس کی طرح اس کے دل کو اپنی زہریلی ٹانگوں میں جکڑا تھا.....اور اب یوں چھوڑا تھا کہ اس کا دل مردہ ہو چکا تھا.....

☆

"ممی..... شبیر کا دل بری طرح ٹوٹا ہے..... اس لئے پلیز..... آپ کو اپنا رویہ اس کے ساتھ بدلنا ہوگا..... ڈاکٹر کہہ رہا تھا وہ ایک بار attempt کر چکا ہے..... دوبارہ بھی کر سکتا ہے ہمیں اس کی زندگی کی خاطر..... اسے خوش رکھنا ہے..... اسے زندگی کی طرف واپس لانا ہے..... ممی..... وہ زندگی کی امید چھوڑ چکا ہے..... ہمیں اس کے اندر یہ امید دوبارہ پیدا کرنی ہے....." سمیر نے بہت سنجیدہ لہجے میں مسز فاخر سے باتیں کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں..... ہمارے لئے اس کی زندگی سب سے اہم ہے....." مسز فاخر نے بھی سنجیدگی سے جواب دیا۔

شہیر کو کئی روز بعد ہاسپٹل سے گھر شفٹ کیا گیا..... مسز فاخر نے اس کا بیڈ روم نیچے شفٹ کر دیا تا کہ وہ اور گھر کے دوسرے افراد ہر وقت اس کی دیکھ بھال کر سکیں اور اس کے پاس آتے جاتے رہیں۔

شہیر گھر آنے کے بعد مکمل طور پر خاموش رہتا تھا..... وہ نیچے بیڈ روم میں اپنے آپ کو اجنبی محسوس کرتا تھا اس لئے پھر اوپر شفٹ ہو گیا......

کالج کھل چکے تھے..... مگر اس نے کالج جانا بھی چھوڑ دیا تھا..... دوستوں کی فون کالز اس کے موبائل پر آتیں تو ان سے چھٹکارا پانے کے لئے اس نے نمبر بدل لیا۔ اس کا ہر ایک سے رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔ سمیر اس کے ساتھ بہت محنت کر رہا تھا..... وہ اس کو لے کر باہر گھومنے جاتا..... اس کے ساتھ باتوں میں مصروف رہتا..... مسز فاخر نے بھی اپنا رویہ بہت بدل لیا تھا..... وہ شہیر کی کسی بات کا الٹا جواب نہ دیتیں..... فاخر حسین کے ساتھ بھی شہیر کی موجودگی میں بالکل نہ جھگڑتیں.....

بظاہر وہ نارمل ہوتا جا رہا تھا..... مگر جو آگ اس کے دل میں لگی تھی..... وہ کسی بھی پل نہ بجھتی..... وہ ہر وقت اندر ہی اندر سلگتا رہتا..... اندر کی سلگتی آگ کو وہ اپنے سگریٹوں کے دھوئیں سے اڑانے کی کوشش کرتا..... وہ کثرت سے شراب نوشی اور سگریٹ نوشی کرنے لگا تھا کہ ان کے بغیر اسے کسی پل چین نہ آتا۔ دن کا آغاز وہ سگریٹ سے کرتا اور رات کا آغاز شراب نوشی سے.....

''شہیر..... پلیز..... ڈرنک کرنا چھوڑ دو..... اس سے تمہاری صحت بہت خراب ہو رہی ہے'' ڈیڈی اور سمیر نے ایک روز اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''والدین اپنی بہت سی عادتیں..... اولاد کو منتقل کرتے ہیں اور مجھے یہ عادت آپ سے ملی ہے..... جب آپ چھوڑیں گے تو میں بھی چھوڑ دوں گا'' شہیر نے قدرے طنزیہ انداز میں کہا کہ ڈیڈی نظریں چرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگے..... سمیر نے دونوں کی طرف دکھ بھرے انداز میں دیکھا۔

''کیا یہ ضروری ہے کہ والدین کی بری عادتیں ہی اپنائی جائیں.....'' سمیر نے خفگی سے کہا۔

''یہ تو جینز پر منحصر ہے..... کہ وہ کیا دیتے ہیں..... والدین کی خوبیاں یا خامیاں.....'' شہیر نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

سمیر نے ڈیڈی کی طرف ایسی نظر سے دیکھا جس میں بہت مفہوم اور شکوے تھے..... اس نے گہری سانس لی اور وہ بھی کمرے سے باہر نکل گیا.....

☆

ایگزامز شروع ہو گئے تھے مگر روشنی اور شہیر ایگزامز بھی نہیں دے رہے تھے..... سنا تھا کہ روشنی بیرون ملک اپنے والد کے پاس چلی گئی تھی..... اور..... شہیر بیمار ہونے کی وجہ سے پیپرز نہیں دے رہا تھا.....

مگر زنل بخوبی جانتی تھی کہ وہ ایگزامز کیوں نہیں دے رہا تھا..... صرف اور صرف زنل کی وجہ سے.....

اس نے ہاسپٹل میں اس سے کہا تھا.....

''میں کوشش کروں گا کہ زندگی میں کبھی تمہارا سامنا نہ کروں..... ورنہ.....'' اس نے منہ موڑتے ہوئے کہا اور زنل کے کانوں میں اس کے

الفاظ بار بار گونجتے تھے جب وہ ہر روز کالج جاتی تھی...... کالج جاتے ہوئے...... کالج میں پڑھائی کے دوران...... اور کالج سے واپسی پر...... ہر لمحہ...... ہر پل...... اس کا ذہن الجھا رہتا...... ارسلان سے منگنی کے بعد وہ بہت بجھی بجھی رہتی...... ارسلان اس سے پوچھتا رہتا...... مگر وہ کوئی جواب نہ دیتی۔

''کیا...... تم مجھ سے منگنی کر کے پچھتا رہی ہو؟'' ارسلان کبھی کبھی اس سے دبے الفاظ میں احتجاج کرتے ہوئے کہتا۔

''نہیں......'' وہ آہ بھر کر جواب دیتی۔

اس کا دل بہت مضطرب رہنے لگا تھا...... وہ اپنے آپ کو بارہا سمجھاتی...... مگر کوئی شے اندر ہی اندر اسے کسی چبھن کی طرح تکلیف میں مبتلا رکھتی......

''شہیر...... میں اپنے دل کو تمہاری محبت کے لئے مجبور نہیں کر پائی...... تمہارے اظہار محبت کے بعد میں نے تمہارے بارے میں بہت سوچا...... مگر تمہارے لئے نرم احساسات پیدا نہیں ہو سکے۔ اپنے دل کو کسی کی محبت کے لئے قائل کرنا بہت مشکل کام ہوتا ہے میں کیا کروں...... ؟'' وہ جھنجھلا کر سوچتی...... مگر جتنا زیادہ سوچتی اتنا ہی مضطرب رہنے لگی تھی۔ ارسلان کو پانے کی خوشی کو وہ صرف چند روز سے زیادہ انجوائے نہیں کر پائی تھی...... یوں لگتا تھا...... اس کی خوشی کہیں کھو گئی ہو...... غم دل میں ٹھہر گیا ہو اور اداسی نے اس کی خوبصورت جھیل سی آنکھوں کی رنگت کو ملگجا کر دیا ہو۔

''ارسلان...... ہم شادی کب کریں گے؟'' ایک روز زل نے انتہائی مضطرب ہو کر اس سے سوال کیا۔

''زل...... کم آن...... یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ ابھی ہمارے فائنل ایگزامز نہیں ہوئے...... میں نے ابھی جاب تلاش کرنی ہے...... میرے حالات اس قابل نہیں کہ ہم شادی کر سکیں...... اور تمہیں یہ اچانک کیا سوجھی ہے...... تم تو صرف منگنی کا کہتی تھی...... شادی کے بارے میں...... تم نے کوئی پلاننگ نہیں کی تھی...... پھر...... یہ سب کیوں......؟'' ارسلان نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

''میں تمہارے ساتھ ہر قسم کے حالات میں گزارہ کرلوں گی...... مگر پلیز...... شادی کے بارے میں سوچو'' زل نے التجائیہ انداز میں کہا۔

''کب تک......؟'' ارسلان نے حیرت سے پوچھا۔

''اسی ماہ...... یا...... اگلے ماہ'' زل نے قطعیت سے جواب دیا۔

''اتنی جلدی...... کیا تم مجھے اس کی وجہ بتا سکتی ہو؟'' ارسلان نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''پلیز...... مجھ سے کچھ مت پوچھو...... بس گھر کے حالات کچھ ایسے ہو گئے ہیں کہ مجھے یہ فیصلہ کرنا پڑا ہے......'' زل نے سنجیدگی سے جواب دیا تو ارسلان خاموش ہو گیا۔

''ٹھیک ہے...... میں کچھ سوچتا ہوں...... مگر میری مالی حالت اتنی مستحکم نہیں...... کہ......'' ارسلان نے کہا۔

''مجھے کچھ نہیں چاہیے...... اور نہ ہی میری خواہشات اتنی زیادہ ہیں...... کہ تمہیں کسی بات کے لئے مجبور کروں......'' زل نے جواب دیا تو ارسلان اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

☆

سمیر کے بہت قائل کرنے پر شہیر نے ڈرنک کم کر دی تھی...... وہ رات دیر تک اس کے کمرے میں بیٹھا اس سے باتیں کرتا رہتا...... کبھی اس کے ساتھ chess کھیلتا...... کبھی کیرم...... کبھی اسے ڈنر کے لئے باہر لے کر جاتا...... سمیر نے اس کی خاطر اپنی ساری سرگرمیاں ختم کر دی تھیں...... اس کی اسٹڈیز مکمل ہو چکی تھی اور وہ انگلینڈ میں ہی جاب کرنے کا ارادہ رکھتا تھا...... مگر شہیر کی خاطر اس نے واپس جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا...... مسز فاخر کو اس بات کا بخوبی احساس تھا اور وہ سمیر کی اور قدر دان ہو گئیں تھیں...... ایک شام اسامہ اور ارسلان شہیر سے ملنے آئے...... تو شہیر کو دیکھ کر چونک گئے...... اس کی سانولی رنگت کالی ہو چکی تھی اور وہ بے حد کمزور لگ رہا تھا۔ سرخ آنکھوں میں ٹھہری نمی اور اداسی اس کے ویران دل کی عکاس تھی۔

''ہم تمہیں انوائیٹ کرنے آئے ہیں......'' اسامہ نے اسے شادی کا کارڈ پکڑاتے ہوئے کہا۔

''کیا تم شادی کر رہے ہو؟'' شہیر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''یار...... میری قسمت اتنی تیز کہاں...... ؟ یہ ارسلان اور ژنل کی شادی کا کارڈ ہے'' اسامہ نے کہا...... تو شہیر کی سانس ایک دم رکنے لگی...... اس نے حسرت بھری نگاہوں سے ارسلان کی طرف دیکھا۔ نجانے کہاں سے نمی آنکھوں میں بھر گئی۔

''مبارک ہو......'' وہ جلدی سے یوں بولا...... کہیں اس کی آواز میں اس کی آنکھوں کی نمی اور دل کی کپکپاہٹ نہ شامل ہو جائے۔

''تھینکس...... اور تمہیں ضرور آنا ہے......'' ارسلان نے مسکراتے ہوئے کہا...... شہیر نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس اس کی طرف یوں دیکھتا رہا...... جیسے اس کی قسمت پر رشک کر رہا ہو۔ ان کے جانے کے بعد اس کا دل اس قدر بے تاب ہونے لگا کہ اس کی سانس گھٹنے لگی...... شدید غم کو ضبط کرنے کی ناکام کوشش کے باوجود اس کی آنکھیں بری طرح برسنے لگیں اس کے سینے میں ایک دم شدید درد اٹھا...... اور پھر اسے ہوش نہ رہی...... کہ وہ کہاں ہے؟

جب ہوش آئی تو وہ cardiac ہاسپٹل کے ICU میں انتہائی گھمبیر خاموشی سے بستر پر لیٹا تھا۔ اسے آکسیجن لگی تھی...... اس نے نظریں دوڑا کر ارد گرد دیکھا...... تو ہر طرف ژنل اور ارسلان کی شادی کا کارڈ نظر آ رہا تھا اور ان کے سنگ ارسلان کا مسکراتا چہرہ...... ژنل کی خوبصورت جھیل سی آنکھیں......

''میں پھر کیوں بچ گیا ہوں؟'' اس نے دکھ بھرے انداز میں سوچا...... جب اسے معلوم ہوا کہ اسے انجائنا کا اٹیک ہوا تھا......

☆

''نجانے کیوں...... شہیر...... اس لڑکی کے بارے میں اس قدر سیریس ہو گیا ہے...... میرا تو دل چاہتا ہے...... ایک بار اسے ملوں اور پوچھوں کہ میرے بیٹے نے کیا قصور کیا ہے جو تم اس کی جان کے درپے ہو...... کیا ضرورت تھی اسے شادی کا کارڈ بھیجنے کی......'' مسز فاخر غصے سے بول رہی تھیں۔ فاخر حسین اور سمیر بھی کامن روم میں بیٹھے اس بات کو ڈسکس کر رہے تھے۔ شہیر گھر آ چکا تھا اور اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔

''میرا خیال ہے...... ہم بھی شہیر کی شادی کر دیتے ہیں...... ہو سکتا ہے اس کا بھی غم کچھ کم ہو جائے......'' فاخر حسین نے اچانک رائے دی تو سمیر اور تہمینہ نے حیرت سے فاخر حسین کی طرف دیکھا...... اور سب ایک لمحے کے لئے خاموش ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

''ہاں...... ڈیڈی ٹھیک کہہ رہے ہیں...... اس وقت وہ بہت ڈسٹرب ہے...... اور اسے کسی ایسے ہمدرد کی ضرورت ہے جو ہر وقت اس کے ساتھ ہو'' سمیر نے مشورہ دیا۔

''ٹھیک ہے..... میں تیمور بھائی سے بات کرتی ہوں..... ویسے تو میں نے بچپن سے ہی حرا کو تمہارے لئے..... اور حنا کو شہیر کے لئے سوچ رکھا ہے..... ان سے بات کر کے تم دونوں کی ہی شادی کر دیتی ہوں..... تمہارا کیا خیال ہے؟'' مسز فاخر نے سمیر سے پوچھا۔

''ٹھیک ہے..... جیسے آپ کی مرضی'' سمیر نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

''شہیر کی طبیعت بھی کچھ بہتر ہو جائے تو اس سے پوچھ کر تیمور بھائی سے بات کروں گی'' مسز فاخر نے کہا تو سمیر اور فاخر حسین خاموش ہو گئے......

☆

شہیر کی میڈیسنز کا ٹائم ہو رہا تھا اور وہ ابھی تک سو رہا تھا۔ سمیر اسے خود مقررہ اوقات پر دوائیں کھلاتا تھا..... وہ اس کے بیدار ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔

''شہیر..... اٹھو..... میڈیسنز کا ٹائم ہو رہا ہے'' سمیر نے اسے ہلاتے ہوئے کہا مگر وہ نیم بیہوشی میں تھا..... آنکھیں کھول کر پھر سو گیا..... سمیر صوفے پر بیٹھ کر اس کے اٹھنے کا انتظار کرنے لگا اور ممی کی باتوں پر غور بھی کرنے لگا۔ اسے حرا شروع سے ہی بہت پسند تھی..... اور جب سے مل کر آیا تھا۔ تب سے اس کے ساتھ رابطے میں تھا۔ وہ اسے بہت حد تک اپنی ہم مزاج لگتی تھی۔ وہ اسی کی طرح خوش مزاج، ہنس مکھ اور زندگی کو انجوائے کرنے والی تھی جبکہ حنا سنجیدہ مزاج اور بہت سوبر تھی..... مطلب کی بات کرتی ورنہ زیادہ تر خاموش رہتی..... سمیر ممی کی بات سن کر بہت خوش ہوا تھا..... وہ جلد از جلد حرا کو یہ خبر سنانا چاہتا تھا..... مگر اپنے کمرے میں جا کر..... لیکن کمرے میں جانے سے پہلے شہیر کو دوائیں کھلانا بہت ضروری تھا......

اچانک اس کا موبائل بجنے لگا..... حرا کا فون تھا..... شہیر موبائل کی تیز رنگ ٹون سے جھنجھلا کر بیدار ہو گیا اور آنکھیں کھول کر سمیر کی طرف دیکھنے لگا۔ سمیر خوشی سے حرا کو آہستہ آہستہ ساری بات بتا رہا تھا۔ شہیر آنکھیں بند کر کے سننے لگا..... اسے صرف ایک جملہ سنائی دیا۔

''حرا..... آئی لو یو ٹو مچ'' اور سمیر نے فون آف کر دیا۔

وہ جملہ بار بار شہیر کے ذہن میں گونجنے لگا۔

''زِل..... آئی لو یو ٹو مچ''..... آئی لو یو..... زِل..... ''زِل..... آئی لو یو ٹو مچ'' شہیر آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگا۔

سمیر نے اس کی سرگوشیوں کی آواز سنی اور اس کی طرف بڑھ کر آواز دی۔

''شہیر..... پلیز اٹھو..... میڈیسنز کا وقت ہو رہا ہے'' سمیر نے قدرے ملائمت سے کہا تو وہ آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھنے لگا اور خاموشی سے اٹھ بیٹھا..... سمیر نے اسے دوائیں کھلائیں اور اسے لٹا کر کمرے سے باہر نکل گیا......

شہیر کا سر بوجھل ہو رہا تھا اور بہت زیادہ سونے سے آنکھیں کھل نہیں رہی تھیں..... اس کی غنودگی ابھی بھی ختم نہیں ہو رہی تھی..... اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا دماغ گھڑی کی سوئیوں کی مانند ٹک ٹک بج رہا ہو..... اس نے آنکھیں کھول کر بے بسی سے چھت کی طرف دیکھا..... اور بغیر پلکیں جھپکائے اسے دیکھتا ہی رہا..... آنسو اس کی پتھرائی آنکھوں سے گر گر کر تکیے میں جذب ہونے لگے۔

☆

''بیٹا...... میں سوچ رہی ہوں۔ آج تمہارے ماموں تیمور سے حرا اور حنا کے لئے بات کروں...... لیکن اس سے پہلے شہیر کی رائے جاننا بھی ضروری ہے...... اب شہیر کی طبیعت بھی پہلے سے بہتر ہے...... کیوں نا اس سے بات کر لی جائے'' مسز فاخر نے سمیر کو دیکھ کر کہا جو شہیر کے کمرے سے باہر نکل کر ان کے پاس لاؤنج میں آیا تھا۔

''ہاں...... ٹھیک ہے...... میں اس کو بلاتا ہوں'' سمیر نے کہا اور واپس جا کر اسے اپنے ساتھ لے کر آیا۔

''آؤ بیٹا...... اب کیسے ہو؟'' مسز فاخر نے محبت بھرے انداز میں شہیر سے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں......'' اس نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

''یہاں بیٹھو...... میرے پاس۔ آج میں نے تم سے ایک اہم بات کرنی ہے'' مسز فاخر نے کہا تو شہیر نے چونک کر انہیں دیکھا اور ان کے پاس بیٹھ گیا۔

''ہم سب سوچ رہے ہیں...... تمہاری شادی کر دی جائے'' مسز فاخر بولتے ہوئے رک کر اس کی جانب دیکھنے لگیں۔

''شادی......؟'' اس نے حیرت سے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔

''ہاں...... اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟'' مسز فاخر نے کہا۔

''مجھے شادی نہیں کرنی......'' وہ آہ بھر کر بولا۔

''کیوں......؟ اور کس کی خاطر......؟'' مسز فاخر نے پوچھا۔

''کسی کی خاطر نہیں'' وہ آہستگی سے بولا۔

''کوئی کام نہ کرنے کی...... کوئی وجہ بھی تو ہونی چاہیے...... محض ایک سوچ کی خاطر پوری زندگی کو داؤ پر لگانا کہاں کی عقلمندی ہے'' مسز فاخر نے کہا۔

''شہیر...... شادی کرنے سے تمہیں ایک ایسا ہمدرد ساتھی مل جائے گا...... جو تمہارے دکھ کو سمجھے گا......'' سمیر نے کہا۔

''بس میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ حنا کے ساتھ تمہاری شادی کر دوں......'' مسز فاخر نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

شہیر ان کی بات سن کر چونکا اور اس کے کانوں میں سمیر کے الفاظ گونجنے لگے۔

''حرا...... آئی لو یو ٹو مچ''

شہیر کچھ دیر سوچتا رہا...... سمیر اور مسز فاخر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

''تمہارا کیا خیال ہے......؟'' مسز فاخر نے پھر پوچھا۔

''حرا...... کیوں نہیں......؟'' شہیر نے ایک دم کہا تو مسز فاخر اور سمیر دم بخود رہ گئے...... انہیں اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا...... مسز فاخر ہونٹ چبانے لگیں اور بے بسی سے سمیر کی طرف دیکھا...... جو کبھی سے حرا کے بارے میں کئی بار بات کر چکا تھا...... اور وہ اس کی پسندیدگی کو اچھی

طرح جانتی تھیں۔ سمیر کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا...... وہ لمحہ اس پر کتنا بھاری ہو رہا تھا...... یہ صرف وہی جانتا تھا...... اس کی محبت...... اس کی چاہت...... کو کوئی اور چھین رہا تھا...... اور چھیننے والا اس کا اپنا بھائی تھا...... وہ بھائی...... جسے وہ بہت چاہتا تھا اور جس کو زندگی کی طرف واپس لانے کے لئے اس نے کتنی بھاگ دوڑ کی تھی...... اب وہ خود ہی اسے کیسے اس دلدل کی طرف دھکیل دیتا...... جس کی زندگی کے لئے وہ دن رات اس کی تیمارداری کرتا تھا...... وہی اس سے اس کی محبت چھین رہا تھا...... جس کی چاہت میں اس نے اپنی جاب اور اپنا مستقبل داؤ پر لگایا تھا...... وہ اس سے اس کی چاہت طلب کر رہا تھا...... حرا اس سے محبت کرتی تھی...... اور...... وہ حرا سے...... مگر یہ کیسا مشکل مرحلہ آ رہا تھا...... قدرت نے اس کے لئے کیسی آزمائش تیار کر رکھی تھی...... کہ اس کی حرا...... اس سے دور جا رہی تھی......

ہر طرف گھمبیر خاموشی طاری ہو گئی...... مسز فاخر سمیر کے فیصلے کی منتظر تھیں...... اور سمیر اپنے آپ سے جنگ کرنے میں مصروف تھا...... اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا...... اس کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں۔

شہیر معنی خیز انداز میں کبھی ممی کی طرف دیکھنے لگا...... کبھی سمیر کی طرف...... جیسے دل ہی دل میں خوش ہو رہا ہو...... انہیں آزمائش میں ڈال کر وہ اندر ہی اندر اس صورت حال سے لطف اندوز ہو رہا تھا...... سمیر کے چہرے سے وہ اس کے دل کی کیفیت کو جان رہا تھا...... اور اسے سمیر کے الفاظ...... اور اس کے چہرے کی بدلتی رنگت اسے حرا سے اس کی محبت کی داستان سنا رہی تھی...... اسے ایک لمحے کے لئے بھی سمیر کی محبتوں...... اس کی قربانیوں کا احساس نہیں ہو رہا تھا...... اس کے ذہن میں صرف ایک ہی بات تھی......

''اگر مجھے میری محبت نہیں ملی...... تو...... پھر...... کسی اور کو کیوں ملے؟ جب کسی کی محبت چھنتی ہے...... تو کیسا احساس ہوتا ہے...... وہ اپنی نظروں سے دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے اندر انتقامی جذبے اتنی قوت اور شدت سے سر ابھار رہے تھے کہ وہ اس صورت حال سے ایک مخصوص سی لذت محسوس کر رہا تھا وہ لمحے جب کوئی کسی دوسرے پر حاوی ہونے کی کوشش کرتا ہے اور دوسرا اپنی کوشش کے باوجود مدافعت نہیں کر پاتا...... اور اس کی کمزوری پہلے کی طاقت بننے لگتی ہے...... اور وہ اس طاقت سے اپنے اندر ایک عجیب سی سرشاری محسوس کرتا ہے تو اس وقت وہ تمام نازک احساسات، جذبے اور رشتے بھول جاتا ہے...... اور وہ اس طاقت کو تقویت دینے کے لئے مزید انتقامی کارروائیوں پر اتر آتا ہے...... اسے تو اپنے دل کی تسکین چاہیے ہوتی ہے......

''ممی...... شہیر کو حرا پسند ہے تو آپ حرا سے ہی اس کی شادی کر دیں......'' سمیر بمشکل بول پایا...... اس کی آواز میں چھپی آنسوؤں کی نمی...... نمایاں تھی...... جسے مسز فاخر محسوس کیے بغیر نہ رہ سکیں۔

''مگر......'' مسز فاخر نے کچھ کہنا چاہا......

''مگر...... وگر...... کچھ نہیں...... ہمیں تو شہیر کی زندگی اور اس کی خوشی عزیز ہے...... اگر شہیر کو حرا پسند ہے...... تو حرا کے ساتھ ہی اس کی شادی ہونی چاہیے'' فاخر نے کہا۔

شہیر نے فاتحانہ انداز میں سمیر کی طرف دیکھا اور مسکرانے لگا۔

"ٹھیک ہے.....میں کل ہی تیمور بھائی سے بات کرتی ہوں" مسز فاخر نے بہت آہستہ اور مایوس کن لہجے میں کہا۔

"شہیر اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

"یہ.....یہ.....تم نے کیا کیا.....؟ تم حرا کو پسند کرتے ہو.....اور وہ تم سے محبت کرتی ہے.....تم.....سمیر.....تم کیسے برداشت کر پاؤ گے.....کہ.....وہ اس گھر میں تمہارے سامنے.....اوہ نو....." مسز فاخر خفگی اور دکھ بھرے لہجے میں بولیں۔

"ممی.....آپ سوچ نہیں سکتیں.....کہ میں نے یہ فیصلہ کس قدر مشکل سے کیا ہے.....مگر شہیر کی زندگی کی خاطر مجھے یہ فیصلہ کرنا پڑا..... اس کا دل پہلے ہی ٹوٹ چکا ہے.....اور میں نہیں چاہتا.....کہ اس بار پھر وہ ٹوٹے.....اور اس کا ذمہ دار میں ہوں.....ممی.....شہیر نے جان بوجھ کر مجھے آزمائش میں ڈالا ہے.....میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ حرا سے محبت نہیں کرتا.....وہ صرف اور صرف زل سے محبت کرتا ہے.....وہ مجھے اور آپ کو آزمانا چاہتا ہے.....کہ ہم اس سے کتنی محبت کرتے ہیں مگر وہ یہ نہیں جانتا کہ محبت کرنے والے تو پہلے ہی آزمائش میں سے گزر رہے ہوتے ہیں..... میں حرا کو سمجھا دوں گا.....اور میں حرا سے شادی نہیں کر سکتا.....میں شہیر کی شادی کے بعد انگلینڈ واپس چلا جاؤں گا" سمیر نے اپنا فیصلہ سنایا تو مسز فاخر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں.....ورنہ وہ بہت کم روتی تھیں.....وہ ایک بہادر اور حوصلہ مند عورت تھیں۔

"ممی.....پلیز.....ایسا مت کریں.....ورنہ میرا حوصلہ ٹوٹ جائے گا.....دعا کریں.....ہماری یہ کوشش رائیگاں نہ جائے اور شہیر ٹھیک ہو جائے.....محبت.....تو شاید پھر کبھی نہ کبھی.....کسی نہ کسی موڑ پر.....مل جائے گی.....شہیر کو پھر کچھ ہو گیا.....تو ہم اسے دوبارہ کہاں سے لیں گے" سمیر نے نم آنکھوں سے کہا تو مسز فاخر والہانہ انداز میں اس کو چومنے لگیں.....سمیر نے انہیں اپنے ساتھ لگایا اور وہ بھی بے بس ہو کر رونے لگا۔

"مجھے فخر ہے.....کہ میں نے تم جیسے بیٹے کو جنم دیا" ممی نے اسے چومتے ہوئے کہا تو سمیر سسکیاں بھرنے لگا.....

ہر طرف دونوں کی دبی دبی سسکیوں کی آواز سنائی دینے لگی۔

☆

مسز فاخر نے تیمور سے بات کی تو وہ خاموش ہو گئے۔ حرا کو جیسے ہی خبر ملی.....اس نے سمیر کو فون کیا.....وہ اس لمحے شہیر کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھا اسے زبردستی کھانا کھلا رہا تھا۔ اس نے اس کی کال رنجیکٹ کی اور فون آف کر دیا۔ شہیر نے اپنے دل میں اک خوشی سی محسوس کی۔ شہیر کو کھانا کھلا کر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا اور حرا کو فون کیا.....سمیر کے لہجے میں بہت سنجیدگی اور ٹھہراؤ تھا۔ حرا رو رہی تھی۔

"حرا.....پلیز.....کسی کی زندگی کی خاطر.....کوئی سوال مت کرنا....." سمیر نے کہا۔

"سمیر.....آپ مجھے ہی قربانی کا بکرا کیوں بنا رہے ہیں۔ اس سے بہتر ہے میں ساری زندگی شادی نہ کروں.....کیا آپ کو معلوم ہے.....آپ میرے ساتھ کتنا بڑا ظلم کر رہے ہیں" حرا نے روتے ہوئے کہا۔

"نہیں.....میں تو اپنے آپ پر ظلم کر رہا ہوں.....شہیر کی زندگی کی خاطر.....حرا کیا تم میرے احساسات کو سمجھ سکتی ہو.....؟ میں اس لمحے کس عذاب سے گزر رہا ہوں.....شاید تم اندازہ بھی نہیں کر سکتی.....محبت کرنے والے تو ایسے مراحل سے اکثر گزرتے ہیں.....ہر دور میں آزمائش

ان کا مقدر رہی ہیں...... شاید ہم دونوں کا بھی یہی مقدر ہے...... حرا...... وعدہ کرو...... اس فیصلے پر کبھی نہ پچھتانا...... زندگی میں جب پچھتاوے شامل ہو جاتے ہیں تو زندگی...... زندگی نہیں رہتی...... نہ ختم ہونے والا عذاب بن جاتی ہے" سمیر نے کہا تو حرا سسکنے لگی...... جواباً سمیر اس کو کچھ بھی نہ کہہ سکا نہ کوئی تسلی دے سکا...... اور نہ ہی امید دلا سکا، بس خاموشی سے حرا کی سسکیاں سنتا رہا اور کچھ کہے، سنے بغیر روتے ہوئے فون بند کر دیا۔

☆

زل اور ارسلان کی شادی کو چند روز ہو گئے تھے...... ارسلان اور اس کے گھر کے ماحول میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ عرش سے فرش پر آ گئی ہو...... مگر اس فرش پر مخمل کا بچھونا ہو...... جو ارسلان کا دل تھا...... ارسلان اس کی جتنی پذیرائی کر سکتا تھا...... اس سے بڑھ کر کی تھی...... وہ جتنی محبت کی توقع اس سے کر سکتی تھی...... ارسلان نے اس سے بڑھ کر اس کو دی تھی...... اپنی ساری تمنائیں، چاہتیں اس کی خوشیوں پر نچھاور کیں تھیں وہ اپنی خوش مزاجی سے اس کے دل کی دنیا کو خوش رکھنے کی بھرپور کوشش کرتا...... اسے اپنی خامیوں اور گھریلو پسماندگی کا اچھی طرح احساس تھا مگر وہ ہر ممکن طریقے سے زل کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا مگر نجانے کہاں کمی تھی کہ زل کا دل کسی بھی پل مطمئن نہیں ہو پا رہا تھا...... محبت پا کر بھی وہ خوش نہیں تھی اور محبت سے سیراب ہو کر وہ اور پیاسی ہو گئی تھی...... بظاہر کسی شے کی کمی نہ تھی مگر یوں محسوس ہوتا تھا جو محبت اسے ملی ہے وہ ادھوری ہے...... ارسلان جو چاہے اس پر نچھاور کرتا رہے...... مگر اس میں کوئی کمی تھی...... شدید قسم کا احساس زیاں اسے ہر لمحہ، ہر پل اندر ہی اندر کچوکے لگاتا......

محبت کا یہ کیسا المیہ ہے......؟

جب نہیں ملتی...... تب بھی دکھ دیتی ہے۔

اور جب مل جاتی ہے تو بھی مطمئن نہیں کرتی......

ارسلان کا انتخاب اس نے خود کیا تھا...... اس کو پانے کی تمنا کی تھی......

یا پھر محبت میں جدوجہد کا بہت عمل دخل ہوتا ہے...... جو محبت بغیر کسی جدوجہد کے مل جاتی ہے...... اس میں وہ لطف اور اطمینان شامل نہیں ہوتا جو بہت جدوجہد اور کٹھن مراحل سے گزرنے کے بعد نصیب ہوتا ہے۔ کہیں نہ کہیں وہ 'کمی' اس کے دل کو مضطرب رکھتی...... جب بھی ارسلان کی موجودگی میں اسے اچانک شمیر یاد آ جاتا...... تو وہ یوں بے قرار ہو جاتی جیسے بند پنجرے کا پنچھی...... جس کے سامنے کھانے پینے کا سارا سامان رکھا ہو مگر وہ مضطرب ہو کر پنجرے کی سلاخوں کے ساتھ پھڑ پھڑاتا پھر رہا ہو...... اس کی گھبراہٹ، بے قراری اور اضطراب کی نہ سمجھ آنے والی وجہ خود اس کو بھی پریشان کر دیتی...... ارسلان اکثر اس سے اس اضطراب کی وجہ پوچھتا مگر وہ خاموش رہ جاتی...... ارسلان کو محسوس ہوتا کہ وہ اس کے گھر کے ماحول سے غیر مطمئن ہے...... اس لئے وہ زیادہ نہ کریدتا۔

زل اور ارسلان دونوں کالج بھی باقاعدگی سے جاتے۔ فائنل ایگزامز میں صرف چند ہفتے رہ گئے تھے اور انہیں اپنی تعلیم ہر صورت میں مکمل کرنا تھی۔ کالج کے اساتذہ اور کلاس فیلوز اکثر انہیں چھیڑتے کہ آخر شادی سے انہیں کیا فائدہ ہوا ہے......؟

ارسلان مسکرا کر زل کی طرف دیکھتا اور جواب میں زل خاموش ہو جاتی......

واقعی جس مقصد کے لئے اس نے شادی میں جلدی کی تھی وہ تو اسے بالکل حاصل نہیں ہوا تھا......

وہ تو اس اضطراب سے چھٹکارا پانا چاہتی تھی...... جو دن رات اسے کسی نہ کسی طرح...... کسی گناہ کا احساس دلاتا تھا...... مگر وہ اضطراب تو اس کے دل کے اندر جوں کا توں موجود تھا۔اس میں ایک فیصد بھی کمی نہ آئی تھی......

☆

حرا حجلۂ عروسی میں شمیر کے سامنے دلہن بنی بیٹھی تھی...... حرا کو وہ بہت عرصے بعد دیکھ رہا تھا۔وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔شمیر اسے دیکھتا ہی رہ گیا...... دونوں خاموش تھے۔حرا منتظر تھی کہ وہ کوئی بات کرے...... اور وہ خاموش تھا...... کہ وہ کیا کہے...... اس نے اپنے تصور میں سوائے زل کے کسی اور کو دلہن کے روپ میں نہیں دیکھا تھا۔

''زل...... تمہارے ہونٹ کے پاس ایک تل تھا...... وہ کہاں ہے؟'' اچانک وہ بولا تو حرا کو یوں لگا جیسے اسے کسی نے زمین پر پٹخ دیا ہو...... اس کو اپنے دل کی دھڑکنیں رکتی ہوئی محسوس ہونے لگیں اور آنکھیں جیسے پتھرا گئی ہوں۔

''میں...... میں...... حرا ہوں'' وہ بمشکل اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے بولی۔

''کون حرا......؟ میرے دل میں تو صرف زل ہے...... کیا تم زل نہیں ہو...... پھر تم کون ہو؟'' شمیر نے اس انداز سے کہا تو وہ خاموشی سے بیڈ سے اٹھی اور برستی آنکھوں کے ساتھ واش روم میں چلی گئی۔اپنا ایک ایک زیور نوچتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی...... اس کی ذات کی ایسی نفی ہو رہی تھی۔جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا...... اور وہ شخص جس کے لئے نجانے کتنے لوگوں نے قربانیاں دی تھیں...... وہی اس کو رسوا کر رہا تھا...... سمیر کی خوشی کی خاطر اس نے کس کس طرح اپنے دل کو منایا تھا...... کیسے کیسے سمجھایا تھا...... اب اس کے ارمان، خون کے آنسوؤں کی صورت میں بہہ نکلے تھے......

''سمیر...... تم نے میرے ساتھ بہت ظلم کیا ہے'' اس کو سمیر سے اپنے کہے ہوئے الفاظ بار بار یاد آئے۔

''ہم اپنی قسمتوں کے ہاتھوں مجبور ہیں...... محبت خطا کرتی ہے اور سزا زیادہ دیتی ہے اور وہ ہمیشہ سے محبت کا تاوان دیتا آیا ہے'' سمیر کی باتیں یاد کر کے وہ رونے لگی۔

واش بیسن میں چہرہ دھوتے ہوئے آنکھوں کے چشمے شدت سے پانی اُلیتے رہے...... اور وہ کتنی ہی دیر ان کو صاف کرتی رہی۔کمرے میں واپس آئی تو شمیر صوفے پر بیٹھا ڈرنک کر رہا تھا...... وہ حیرت سے کبھی شمیر کو...... اور کبھی بوتل کو دیکھتی رہی...... یوں لگتا تھا...... جیسے آج کی رات اس پر انکشافات منکشف ہونے کے لئے منتخب ہوئی تھی...... وہ خاموشی سے بیڈ پر بیٹھ گئی...... دکھ اور کرب کے شدید احساس سے اس کا دل لہولہان ہو رہا تھا اور آنکھیں سرخ اور متورم...... شمیر کی موجودگی سے اسے کراہت سی محسوس ہونے لگی...... وہ جو اپنے دل کو بہت مشکل سے قائل کر کے...... بہت منا کر اس کی سیج تک لائی تھی۔وہ دل اب اس شخص کے کمرے میں موجود ہونے کے احساس سے مضطرب ہو رہا تھا۔شمیر شدید نشے میں اس کے

ساتھ لپٹ رہا تھا...... اور اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ مٹی کا مجسمہ ہو...... جس کے سینے میں نہ دل ہو...... نہ جسم میں حرکت اور حرارت...... وہ ایک ڈمی تھی...... جس سے وہ دل بہلا رہا تھا اور وہ خاموشی سے اس کے ہاتھوں میں کھلونا بنی ہوئی تھی۔ وہ نشے میں مدہوش بار بار اسے "زل...... آئی لو یو ہنی" کہہ کر پکارتا...... وہ ہر بار چونکتی اور ہر بار اس کے دل پر چوٹ سی پڑتی...... ہر بار دل ڈوبنے لگتا...... ہر بار آنکھوں کے بہاؤ میں اور شدت آ جاتی۔ مگر محبت کا کھیل جاری رہا......

ٹوٹے دلوں کے ساتھ......

بہتے اشکوں کے ساتھ......

ادھورے جذبوں کے ساتھ......

اور زخمی دل کے ساتھ......

شاید محبت اپنا تاوان وصول کر رہی تھی...... جذبوں کو کچل کر...... اور احساسات کو روند کر......

☆

سمیر دو روز کے بعد انگلینڈ واپس جا رہا تھا...... اس میں حرا کا سامنا کرنے کی ہمت نہ تھی...... حرا سے جب بھی سامنا ہوتا وہ نظریں چرا لیتا...... اپنے آپ کو اس کا مجرم سمجھتا...... حرا کی آنکھوں میں بے شمار شکوے اور دکھ کے اداس رنگ دیکھ کر مضطرب ہو جاتا...... صرف دو روز میں حرا مرجھا کر رہ گئی تھی...... اس کی آنکھیں ایسی سونی ہو گئی تھیں جن میں نہ زندگی کی رمق باقی تھی اور نہ ہی جینے کی کوئی امید...... لبوں پر مسکراہٹ یوں غائب تھی جیسے خزاں رسیدہ پتوں سے تازگی اور شگفتگی...... چہرے کی پژمردگی سے یوں معلوم ہوتا جیسے اس کی رگوں میں گردش کرنے والا خون باسی ہو گیا ہو...... یا اس کی سرخی غائب ہو گئی ہو......

سمیر جانے سے پہلے اس کے پاس آیا...... تو حرا نے اسے دیکھ کر منہ موڑ لیا۔

"حرا...... پلیز......" سمیر التجائیہ انداز میں بولا۔

"پلیز...... کچھ مت کہنا...... میں تمہیں ہرگز معاف نہیں کروں گی...... تم نے بھائی کی زندگی بچانے کے لئے...... میری زندگی داؤ پر لگا دی...... تم جانتے تھے...... نا...... کہ وہ ڈرنک بھی کرتا ہے...... اور...... اس کے دل میں سوائے 'زل' کے اور کوئی نہیں سما سکتا...... پھر بھی تم لوگوں نے میرے ساتھ جان بوجھ کر زیادتی کی" حرا روتے ہوئے بولی۔

سمیر شرمندگی سے ہونٹ چبانے لگا۔ اسے قطعی امید نہ تھی کہ شہیر اس سے زل کی باتیں کرے گا۔

"کیا...... زل کے بارے میں شہیر نے تمہیں بتایا ہے؟" سمیر نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ مدہوشی میں مجھے زل سمجھتا ہے اور ہوش میں مجھ سے دور بھاگتا ہے" حرا نے انکشاف کیا تو سمیر کے قدموں تلے سے زمین نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''اوہ.....گاڈ.....تم اس قدر اذیت میں ہو.....اور.....اور میں یہی سمجھتا رہا کہ وہ......'' سمیر نے انتہائی حیرت سے کہتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''اور مجھے.....زندگی کے جہنم میں جھونک کر تم جا رہے ہو.....میرا تماشا تو اچھی طرح دیکھتے......'' حرا نے آہ بھر کر کہا۔

''آئی.....ایم.....رئیلی......'' وہ بمشکل بولا۔

''سوری.....مت کہنا.....اس لئے کہ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی......'' حرا کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئی اور سمیر کا دل کسی شدید صدمے کے احساس سے دوچار ہونے لگا۔ اسے قطعی امید نہ تھی کہ حرا اس قدر اذیت سہہ رہی ہوگی اور شہیر اس کے ساتھ کیسا سلوک کرے گا.....وہ تو پرامید تھا کہ حرا شہیر کو سنبھال لے گی.....اس کی محبت اور دیکھ بھال اس کے دل سے زل کا غم دور کر دے گی مگر وہ تو زل کو نہ بھول پایا تھا.....اور نہ ہی اس کی جگہ کسی اور کو دے رہا تھا.....وہ تو حرا کی ذات کی نفی کر رہا تھا.....وہ تو اس سے اس کی شناخت بھی چھین رہا تھا۔ وہ کیسے اور کب تک نام نہاد شادی کے بندھن کو نبھائے گی.....اور.....میری اتنی بڑی قربانی رائیگاں گئی.....میں اس کو زندگی دینا چاہتا تھا.....اور وہ سب سے زندگی کی امیدیں چھین رہا تھا۔

سمیر کو گہری تشویش ہونے لگی۔ اس کا دل کٹنے لگا اور کسی بھاری بوجھ کے احساس سے اسے گھٹن سی محسوس ہونے لگی۔ اس سے وہاں رکنا محال ہو گیا۔

''میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی'' حرا کے الفاظ اس کے دل میں کسی نشتر کی طرح پیوست ہو گئے تھے.....اور اس نشتر کی چبھن سینے میں کسی درد کی طرح ٹھہر گئی تھی.....اور اس درد سے نجات پانا اس کے بس سے باہر تھا......

''یہ کیسے ممکن ہے.....کہ کسی کی بہتری کے لئے کیا گیا فیصلہ.....خود انسان کے لئے وبالِ جان بن سکتا ہے.....کیا انسان کی نیت کو نہیں دیکھا جاتا.....کیا اس نیت میں پوشیدہ سچائی اور دیانت کو نہیں جانچا جاتا.....پھر انسان کیوں ناحق اتنی اذیت سہتا ہے......'' سمیر کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے فیصلے پر پچھتائے یا مطمئن ہو جائے.....سب کچھ بکھر گیا تھا.....اس کا سکون اور اضطراب کہیں کھو گیا تھا.....اور وہ مایوسیوں کی تاریک راہوں کی طرف جاتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔

☆

حرا نے ایک ہاسٹل جوائن کر لیا تھا.....اور وہ ہاسٹل جانے کے لئے تیار ہو رہی تھی.....شہیر نیند سے بیدار ہوا تو نشے کا خمار قدرے کم تھا.....اس نے حرا کی طرف بغور دیکھا۔

''آپ کہاں جا رہی ہیں؟'' شہیر نے حیرت سے پوچھا۔

''ایک ہاسٹل جوائن کیا ہے'' اس نے جواب دیا۔

''کب سے......؟''

''آج سے......''

''میں ڈراپ کر دوں......''

''نہیں......میں خود چلی جاؤں گی''

شہیر خاموش ہو گیا......اور واش روم میں چلا گیا۔

حرا تیار ہو کر کمرے سے باہر جا چکی تھی......وہ واش روم سے باہر آیا اور ناشتہ کرنے نیچے چلا گیا......یہی ایک ماہ سے ہو رہا تھا......وہ جب بھی ہوش میں ہوتا تو حرا سے یوں بات کرتا جیسے دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہوں اور دونوں میں بہت فاصلہ ہو......ہمیشہ چند جملوں پر بات چیت کرتے......اور اس کے علاوہ کچھ نہیں......شہیر اس سے یوں مخاطب ہوتا جیسے وہ کوئی بہت محترم ہستی ہو......اور اس کے ساتھ زیادہ بات چیت ادب کے تقاضوں کے خلاف ہو......ان کے رشتے میں ایسی اجنبیت اور سرد مہری تھی کہ حرا خود ہی چونک جاتی......ابتداء میں تو اس کا ذہن ہر وقت الجھنوں کا شکار رہتا......اس نے ایسے رشتے کے بارے میں کبھی کسی سے نہ سنا تھا......اس کا شوہر اسے مجبوریہ سمجھ کر محبت کرتا......اور بیوی کے روپ میں اسے قبول نہ کرتا......حرا کا دل ہر وقت ایک شدید غم کے احساس زیاں سے دوچار رہتا......شہیر کبھی اس سے کھل کر بات نہ کرتا......اپنے دل کا کوئی حال نہ کوئی اپنا راز......نہ اپنی نفرت، نہ اپنی محبت......نہ اپنے خیالات کچھ بھی اس سے شیئر نہ کرتا......شاید وہ اسے اس قابل ہی نہ سمجھتا یا پھر اس سے کچھ بھی کہتے ہوئے جھجھکتا......

''شہیر تم بھی اب کوئی کام شروع کرو......تم نے اپنی اسٹڈیز بھی مکمل نہیں کی......اگر زندگی میں کوئی mishap ہو جائے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انسان ساری زندگی اس کا سوگ مناتا رہے......اور سارے کام چھوڑ کر بیٹھ جائے۔ زندگی میں حرکت کرنا بہت ضروری ہے'' ڈیڈی نے اسے ایک شام سمجھاتے ہوئے کہا۔

''کیا کروں......؟ مجھے تو کسی بھی کام کا کوئی تجربہ نہیں'' شہیر نے بے دلی سے جواب دیا۔

''تجربہ کام کرنے سے آتا ہے......گھر بیٹھے کبھی تجربہ نہیں آتا......میں چاہتا ہوں تم کل سے میرا آفس جوائن کرلو......میری فیکٹری کے کاموں میں میری مدد کرو......'' ڈیڈی نے کہا تو وہ کچھ سوچنے لگا۔

''ٹھیک ہے......جیسا آپ کہتے ہیں'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''گڈ......ویری گڈ'' ڈیڈی نے خوش ہو کر جواب دیا۔

☆

کالج میں فیئرویل تھی۔ سارے اسٹوڈنٹس کالج سے رخصت ہو رہے تھے۔ سب کی آنکھوں میں مستقبل کی امیدیں تھیں اور بے شمار امیدیں تھیں۔

''آج اس موقع پر میں اپنے دو ٹیلنٹڈ اسٹوڈنٹس شہیر اور روشنی کو بہت مس کر رہا ہوں......شہیر بہت ٹیلنٹڈ تھا۔ اس کے آرٹ میں ایک یونیک ٹچ تھا اور میں اس کے مستقبل کے بارے میں بہت پرامید تھا کہ وہ آرٹ کی دنیا میں نام پیدا کرے گا......ہو سکتا ہے وہ دوبارہ بھی آرٹ کی طرف لوٹ آئے مگر اس کی ادھوری تعلیم کا مجھے ہمیشہ دکھ رہے گا'' پروفیسر رضا ربانی نے ساری کلاس کو خدا حافظ کہتے ہوئے کہا تو سب خاموش ہو

گئے...... زل کو یوں احساس ہونے لگا جیسے پروفیسر ربانی اسے احساس دلا رہے ہوں کہ شہیر کی ناکامی اور ادھوری تعلیم کی ذمہ دار وہ ہے..... چند لمحے قبل وہ سب کے ساتھ کھڑی مسکرا رہی تھی...... اب اس کے چہرے پر ایسی اداسی چھا گئی کہ وہاں رکنا اس کے لئے محال ہو گیا۔

''ہاں...... وہ بہت ٹیلنٹڈ تھا...... اور ٹیلنٹڈ اسٹوڈنٹس ہمیشہ اساتذہ کے ذہن میں رہتے ہیں'' مسز عطیہ نے کہا۔

''سر اس نے شادی کر لی ہے'' اسامہ نے بتایا۔

''گڈ...... یہ تو خوشی کی خبر ہے...... چلو ایک اچھا کام تو کیا'' پروفیسر ربانی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''سر شادی تو زل اور ارسلان نے بھی کی ہے...... مگر انہوں نے تعلیم ادھوری نہیں چھوڑی...... اس کا مطلب ہے انہوں نے دو اچھے کام کئے'' عمر مصطفیٰ نے شوخ لہجے میں کہا۔

''ہاں...... بالکل...... شادی کے ساتھ پڑھائی جاری رکھنا بہت مشکل کام ہے...... اور یہ دونوں بہت بہادر ہیں'' پروفیسر رضا نے ہنستے ہوئے جواب دیا تو سب ہنسنے لگے۔

ارسلان اور زل نے مسکرا کر ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔

''تھوڑی دیر کے لئے مما اور پاپا سے ملنے کے لئے چلے جائیں......'' زل نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا گاڑی اسے پاپا نے شادی پر گفٹ کی تھی...... اور اسے صرف وہی چلاتی تھی کیونکہ ارسلان اس کے ماں باپ کی دی ہوئی چیزوں کو بہت کم استعمال کرتا تھا زل کے مجبور کرنے پر بھی کبھار وہ اس کی چیزوں کو استعمال کرتا تو اس کے اندر ایک شدید احساس کمتری کا احساس ہوتا۔

''ٹھیک ہے...... جیسے تمہاری مرضی'' ارسلان نے جواب دیا۔

اور زل گاڑی ڈرائیو کرنے لگی۔

گھر پہنچنے پر مما پاپا اسے بہت تپاک سے ملے...... البتہ ارسلان سے ہاتھ ملاتے ہوئے پاپا کے چہرے پر مایوسی اور شرمندگی کے تاثرات نمایاں ہونے لگے۔ ارسلان نے کئی بار پہلے بھی ان کے رویے کو محسوس کیا تھا مگر زل سے اس کا ذکر نہیں کیا تھا کہ وہ اس کی خاطر اپنے گھر والوں سے متنفر نہ ہو جائے۔ زل کے بھائی بھی اسے کسی قابل نہ سمجھتے تھے...... اور اکثر اس کی موجودگی میں آپس میں طنزیہ گفتگو کرتے۔ ارسلان ان کے رویے سے ہرٹ ہوتا مگر خاموش رہتا۔

''آج تم لوگ بہت دنوں کے بعد آئے ہو...... خیریت تو تھی'' پاپا نے پوچھا۔

''ہاں...... آج کالج میں ہمارا آخری دن تھا...... فیئر ویل تھی...... سوچا آپ سے ملتے جائیں'' زل نے جواب دیا۔

''اوہ...... آئی...... سی...... اس کے بعد کیا کرنے کا ارادہ ہے؟'' پاپا نے زل سے پوچھا۔

''فی الحال تو ایگزامز کی تیاری کریں گے...... اس کے بعد میں اور ارسلان آرٹ اکیڈمی کھولنے کا ارادہ رکھتے ہیں'' زل نے جواب دیا۔

''زل زندگی میں ترقی کرنے کے لئے اپنے پاؤں کے ساتھ پہیے باندھنے پڑتے ہیں...... اور ذہن کو آسمان کی اونچائی تک لے کر جا کر

سوچنا پڑتا ہے..... مگر تم پر افسوس ہے..... جو ہمیشہ اپنے لئے لولی، لنگڑی بیساکھیاں منتخب کرتی ہو......" پاپا نے ارسلان کی طرف دیکھتے ہوئے اس قدر ترش لہجے میں کہا کہ ارسلان سمیت، زل بھی ان کے طنز کی چبھن کو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی..... اور خاموش ہو گئی۔

"آرٹ اکیڈمی سے تمہیں کیا ملے گا..... ؟نان سینس آئیڈیا" پاپا خفگی سے بولے۔

"مگر پاپا..... ہم وہی کام کریں گے نا..... جو ہمارے taste کے مطابق بھی ہو..... اور جسے کرتے ہوئے ہم انجوائے بھی کریں..... اس کے علاوہ ہم اور کیا کر سکتے ہیں؟" زل نے آہستہ آواز میں کہا۔

"میں تو پہلے دن سے ہی تمہارے اس آرٹ کے خلاف تھا..... اوپر سے..... تم مزید غلطیوں پر غلطیاں کرتی گئی..... بہر حال اب پروفیشن کا انتخاب سوچ سمجھ کر کرنا..... زندگی میں غلطیوں کو دہرانے کی گنجائش نہیں ہوتی اور جو لوگ بار بار غلطیاں کرتے ہیں..... They are considered big failure" پاپا نے الفاظ چبا چبا کر کہا تو زل کے لئے مزید وہاں ٹھہرنا مشکل ہو گیا۔

"ارسلان..... چلیں..... کافی ٹائم ہو رہا ہے" زل نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"بیٹھو..... بیٹا....." مما نے اسے روکنا چاہا۔

"نہیں..... گھر پر سب انتظار کر رہے ہوں گے....."

زل نے کہا اور ارسلان کی طرف دیکھا..... دونوں خاموشی سے باہر نکل آئے۔

"آئی ایم سوری....." زل نے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے کہا۔

ارسلان خاموش رہا۔

"مجھ سے خفا ہو....." زل نے انکھیوں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں....." ارسلان گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔

"پھر خاموش کیوں ہو؟" زل نے پوچھا۔

"مجھے کس بات کا احساس دلانا چاہتے ہیں..... میری غربت کا..... یا..... پھر احساس کمتری کا" ارسلان نے آہ بھر کر جواب دیا۔

"سب لوگ اسٹیٹس کونشس ہیں؟..... اور یہ mania بہت مشکل سے ذہنوں سے جاتا ہے..... اب میں دوبارہ تمہیں کبھی بھی وہاں لے کر نہیں جاؤں گی..... میرے لئے تم..... اور تمہاری عزت سب لوگوں کی عزت سے بڑھ کر ہے....." زل نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

"تھینک یو..... تم نے میری خاطر بہت قربانی دی ہے....." ارسلان نے مسکرا کر جواب دیا۔

"نہیں..... ارسلان..... میں نے کچھ بھی نہیں کیا..... جو کچھ تم نے میری خاطر کیا ہے..... مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے..... جس روز شہیر میرا پورٹریٹ بنا رہا تھا اور میں بہت اپ سیٹ تھی..... کیونکہ میرے کزن نے مجھے کینیڈا سے ڈائیورس بھیجی تھی..... وہ بہت اذیت ناک دن تھا..... اور تم مجھے console کرتے ہوئے اس حد تک چلے گئے تھے کہ تم نے مجھے یہاں تک کہہ دیا..... دیکھو زل..... آج کے بعد مت رونا..... اگر تمہیں محبت کھونے کا دکھ ہے تو میں تمہیں اتنی محبت دوں گا..... کہ تم سارے غم بھول جاؤ گی..... اور اگر تمہیں اپنے گھر کے اجڑنے کا دکھ ہے تو میں

تمہارا گھر بساؤں گا...... ارسلان اس روز تم نے تو مجھے اپنا سب کچھ دے دیا تھا...... مگر مجھے افسوس ہے کہ میں تمہیں اپنے گھر والوں کی نظر میں وہ مقام نہیں دلا سکی جو ان کو تمہیں دینا چاہیے تھا...... آئی ایم سوری...... ریئلی سوری......" زل نم آنکھوں اور شرمندگی سے بولی۔

"ہم نے زندگی کی خوشیاں، دکھ، سکھ ایک دوسرے کے ساتھ نبھانے کا عہد کیا ہے...... مجھے ان کا رویہ برا لگتا ہے مگر تم اپنے رویے سے ساری تلخیاں مٹا دیتی ہو...... وعدہ کرو...... زل تم مجھے کبھی ایسی نظروں سے نہ دیکھنا...... جیسے تمہارے گھر والے دیکھتے ہیں"۔ ارسلان نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"ارسلان میں نے تم سے محبت کی ہے...... پلیز تم بھی میری محبت پر کبھی شک مت کرنا" زل نے جذباتی لہجے میں جواب دیا۔

"مجھے تمہاری محبت پر اپنی ذات سے بھی زیادہ اعتبار ہے" ارسلان نے مسکرا کر کہا تو وہ بھی مسکرا دی۔

"آئس کریم کھاؤ گے......" زل نے پوچھا۔

"ہاں...... اس وقت آئس کریم کھانا بہت ضروری ہے...... دل کی جلن کو ٹھنڈا کرنے کے لئے" ارسلان نے جواب دیا۔

زل نے ایک آئس کریم پارلر کے سامنے گاڑی روکی اور دونوں آئس کریم کھانے لگے...... وہ آئس کریم کھاتے ہوئے ایک دوسرے کی جانب مسکرا کر دیکھتے ہوئے باتیں کر رہے تھے...... جب اچانک شہیر نے گاڑی میں گزرتے ہوئے دونوں کو ہنستے مسکراتے ہوئے دیکھا اس کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا...... وہ تقریباً ایک سال بعد دونوں کو دیکھ رہا تھا اور دونوں کس قدر خوش تھے...... اس کا مطلب ہے دونوں خوشگوار میرڈ لائف گزار رہے ہیں...... اس کی نظریں مسلسل ارسلان پر تھیں...... اس کا خوشی سے مسکراتا ہوا چہرہ...... اس کی نظروں میں کھٹکنے لگا......

ارسلان زل کے ساتھ خوش ہے...... دونوں ایک دوسرے سے خوش ہیں...... اس کا مطلب ہے دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہیں...... شہیر کا دل نفرت و کدورت کے شدید احساس سے بے قرار ہونے لگا...... اسے ارسلان سے شدید نفرت محسوس ہونے لگی...... نجانے کہاں سے کینہ، بغض اور حسد اس کے دل کے خانوں میں خون کی بجائے گردش کرنے لگا تھا اور شاید ان کی گردش، خون کی گردش سے بھی تیز تھی...... غم و غصے کی شدید لہریں اس کے دماغ میں ابھرنے لگیں...... اور اس کا دل کھولنے لگا۔

"ارسلان...... تم نے مجھ سے زل کو چھینا ہے...... اور تم خوش ہو...... مگر میں تمہیں خوش نہیں رہنے دوں گا...... میں تم سے تمہارا سکون، تمہاری خوشیاں اور تمہارا سب کچھ چھین لوں گا......" انتقامی جذبات سے اس کا دل پھٹنے کو بے قرار ہو رہا تھا...... غصے سے اس کی ناک کے نتھنے پھڑ پھڑانے لگے...... اور وہ اپنے ہاتھوں کی مٹھیوں کو اسٹیئرنگ پر زور زور سے مارنے لگا۔

نفرت، کدورت، عداوت، دشمنی، کینہ، بغض، حسد...... کونسا جذبہ تھا...... جو وہ ارسلان کے لئے محسوس نہیں کر رہا تھا......

ارسلان اور زل خوش ہو رہے تھے کہ قدرت نے ان کے دلوں کو ایک دوسرے کے لئے محبت سے بھر دیا ہے اور انہیں دیکھ کر شہیر کا خون غصے سے کھول رہا تھا......

# (۱۰)

ٹھیک ہے...... نہیں نا کچھ یاد...... تو پھر سوجا" نذیر حسین غصے سے چارپائی پر لیٹتے ہوئے بولا اور زینب بھی اپنی چارپائی پر لیٹ گئی۔ مگر اسے نیند کہاں آرہی تھی۔ وہ جب بھی چارپائی پر لیٹتی تو اقبال حسین کے الفاظ اس کو انتہائی اذیت دیتے۔ اسے کچوکے لگاتے، وہ سسکیاں بھرتی...... دبی دبی آواز میں آہیں بھرتی، کہیں نذیر حسین اس کی آوازیں سن کر بیدار نہ ہو جائے اور جس رنج اور دکھ کو وہ اپنے اندر چھپاتی آرہی تھی اس پر ظاہر نہ ہو جائے۔ اقبال حسین کے الفاظ اسے اندر ہی اندر کیسے نشتر چبھوتے تھے یہ صرف وہی جانتی تھی۔ وہ کتنا چوکی تھی اور کتنا روئی تھی جب اس نے انتہائی غصے میں ماں کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"اماں...... تو نے گندگی کے ڈھیر پر بیٹھ کر صرف گندگی ہی اکٹھی کی ہے۔ ایسی گندی اولاد سے تو بانجھ ہی رہتی تو اچھا تھا...... مجھے تم سب سے بو آتی ہے...... اگر میں زیادہ دیر تم لوگوں کے درمیان رہا تو میرا دماغ اس بو سے پھٹ جائے گا" اقبال حسین کراہت سے ماں، باپ اور ان کے آٹھ بچوں کو دیکھ کر بولا۔ سب اس کی بات سن کر تلملانے لگے اور اس سے جھگڑنے لگے۔ مگر زینب آگے بڑھ کر اسے بچاتی رہی۔

"ٹھیک ہے بیٹا...... تو یہاں سے چلا جا...... مجھے تو بس تیری سلامتی چاہیے...... تو جہاں رہے...... خوش رہے، بہت ترقی کرے" زینب نے اس کا بازو کھینچ کر اسے اپنے ساتھ لگا کر سسکتے ہوئے کہا اور پھر وہ ایسا گیا دوبارہ لوٹ کر نہ آیا۔ زینب تب سے اب تک اس کا غم اپنے دل میں چھپائے اس کے لئے زندہ تھی۔ وہ اس کا سب سے بڑا بیٹا تھا اور پورے نو عدد بچوں میں سب سے زیادہ عزیز اور پیارا تھا۔ اس نے اس کے جتنے لاڈ اٹھائے تھے کسی اور کے نہیں اٹھائے تھے۔ اس سے جتنی محبت کی تھی کسی اور سے نہیں کی تھی۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر اس کا خیال رکھتی اسے اس پر فخر ہوتا کہ وہ سب سے زیادہ لائق تھا۔ اس کی ساری اولاد میں سے صرف وہی پڑھا لکھا تھا اور وہ خود ان پڑھ تھی مگر پڑھے لکھے لوگوں کی بڑی عزت اور قدر کرتی تھی۔ اقبال حسین جب کالج جانا شروع ہوا تو وہ اسے تم اور تو سے آپ کہنے لگی۔ شوہر سے زیادہ بیٹے کی عزت اور خدمت کرنے لگی۔ باقی ساری اولاد اس سے جھگڑتی مگر وہ مسکرا دیتی...... اس نے اپنی اٹوٹ محبت میں نفرت کی گنجائش کہیں نہیں رکھی تھی نجانے وہ اقبال حسین سے اتنی شدید محبت کیوں کرتی تھی۔ اسے آج تک یہ بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اس نے تو ایک روپیہ بھی اپنی کمائی کا اس کی ہتھیلی پر نہیں رکھا تھا اور اس نے تو وہ عزت بھی اسے نہیں دی تھی جو ایک عام مہذب انسان اپنی ماں کو بحیثیت ماں دیتا ہے جبکہ اس کی دوسری اولاد ماں کی عزت بھی کرتی تھی اور اسے کمائی بھی دیتی تھی پھر وہ کیوں اس سے اتنی محبت کرتی تھی...... اس کی جدائی میں رو رو کر وہ نابینا ہو گئی تھی...... مگر اس کے لئے دن رات دعائیں کرتی نہ تھکتی تھی...... اور ہر روز نذیر حسین سے باتیں کرتے ہوئے اس کی حمایت میں بولتی تھی۔ نذیر حسین اس کی محبت کے سامنے ہار جاتا تھا...... مگر وہ نہیں ہارتی تھی۔ اس کے باقی آٹھ بچے اپنے اپنے گھروں میں اچھے سیٹ ہو گئے تھے۔ دو بیٹوں کی دکانیں تھیں۔ دو سعودیہ چلے گئے تھے۔ ایک ان کے پاس تھا...... جو

کباڑیا تھا وہ اپنی بیوی اور چار بچوں کے ساتھ اس گھر میں رہتا تھا۔ تینوں بیٹیاں بھی اپنے گھروں میں ٹھیک تھیں۔ نذیر حسین پہلے سرکس میں جوکر اور رنگ ماسٹر تھا...... کبھی کبھی سائیکلنگ بھی کرتا تھا مگر اب وہ بوڑھا ہو چکا تھا۔ اب اس سے زیادہ کام نہیں ہوتا تھا اس لئے وہ گیٹ پر جوکر کا لباس پہن کر بچوں کا دل بہلاتا۔ بچے خوشی میں اسے سکے دیتے اور وہ تمام جمع شدہ سکوں میں سے آدھے سرکس کے مالک کو دے کر آدھے اپنے حصے کے لئے لے کر صبح سویرے گھر آ جاتا اور پھر دن بھر سوتا رہتا۔ زندگی کی گاڑی چل رہی تھی۔ ہر دوسرے تیسرے مہینے سب بچے اور ان کی اولادیں اکٹھی ہوتیں۔ وہ ماں باپ سے ملنے آتے مگر کوئی بھی اقبال حسین کا ذکر نہ کرتا مگر زینب سارا وقت اسے یاد کرتی رہتی نجانے وہ کہاں ہوگا......؟

ان سب بچوں کو دیکھ کر وہ مجھے کتنا یاد آتا ہے.... مگر زینب اس کا اظہار کسی سے نہ کرتی کیونکہ نذیر حسین سمیت تمام بچے بھی اس کا ذکر سننا پسند نہیں کرتے تھے۔

''جب اسے ہماری ضرورت نہیں ..... تو ہمیں بھی اس سے ملنے کی کوئی خواہش نہیں'' سب بہن بھائی غصے سے بولتے۔ زینب اس کی حمایت میں کچھ بولنا چاہتی مگر اس کے لئے سب کی نفرت دیکھ کر خاموش ہو جاتی اور ٹھنڈی آہیں بھرتی رہتی اور خدا سے دن رات ایک ہی دعا کرتی رہتی۔

''بس ایک بار اس سے ملا دے..... مجھے اور زندگی میں کچھ نہیں چاہیے'' وہ رات بھر کروٹیں بدلتی، روتی، سسکتی خدا کے حضور اس کے لئے گڑگڑا کر دعائیں مانگتی ..... مگر چندرہ سالوں سے اس کی دعائیں قبول نہیں ہو رہی تھیں..... اس کے اندر ایک امید تھی جو اسے مایوس نہیں ہونے دیتی تھی..... اور وہ امید اس کا خدا تھا..... جس نے اقبال حسین جیسے بچے کو چار سال بعد اس کے ہاں پیدا کیا تھا..... بہت سی دعاؤں اور منتوں، مرادوں کے بعد وہ پیدا ہوا تھا۔ تب بھی اس کی دعائیں رائیگاں نہیں گئی تھیں اور اب بھی رائیگاں نہیں جائیں گی۔ اس کا اسے پورا یقین تھا اور اس یقین نے اس کو اندر سے مرنے نہیں دیا تھا۔

☆

شہزاد...... صدیقی کون تھا؟ ڈاکٹر رابرٹ سرگوشی کے انداز میں ڈاکٹر دانش کے انتہائی قریب ہو کر یہ الفاظ دہرا رہے تھے۔ ڈاکٹر دانش ان کے نیم تاریک کیبن میں بیڈ پر لیٹے تھے۔

ڈاکٹر رابرٹ انہیں ہپناٹائز کر کے اس ٹرانس میں لے گئے تھے جہاں ان کا ذہن اور لاشعور ان کے کنٹرول میں تھا۔ علی موسیٰ اور ڈاکٹر رابرٹ کی انتہائی کوششوں کے باوجود بھی ڈاکٹر دانش اپنا کوئی راز بھی ان سے شیئر کرنے پر رضامند نہیں تھے۔ ڈاکٹر رابرٹ، ڈاکٹر محسن زیدی کے تعاون سے اس اہم بات تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے جس نے ڈاکٹر دانش کی زندگی کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔

''شہزاد صدیقی...... کون تھا؟ ڈاکٹر رابرٹ الفاظ بار بار دہرانے لگے۔ ڈاکٹر دانش کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے۔ وہ آنکھیں بند کیے نیم بیداری کی حالت میں لیٹے تھے۔ ان کا جسم ڈھیلا ہو گیا تھا اور لاشعور متحرک ہو گیا تھا۔

''ڈاکٹر دانش کے لب آہستہ آہستہ ہلنے لگے...... پھر رک گئے وہ پھر بڑبڑائے..... شہزاد..... صدیقی......'' ڈاکٹر رابرٹ کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ انتہائی آہستہ آواز میں بڑبڑا رہے تھے۔ شہزاد...... صدیقی......

ڈاکٹر رابرٹ نے پھر الفاظ دہرائے۔

''اس کو میں نے قتل نہیں کیا...... وہ حادثے میں زخمی ہوا تھا...... ڈاکٹر ثاقب نے میرے خلاف سازش کی...... وہ مجھ سے حسد کرتا تھا۔ اس نے شہزاد صدیقی کو میرے سامنے زہر کا انجکشن دیا اور آپریشن تھیٹر سے چلا گیا...... شہزاد کو میں نے قتل نہیں کیا مگر الزام مجھ پر لگا...... ڈاکٹر دانش رکے...... پھر کچھ بڑبڑانے لگے ان کی آہوں اور سسکیوں سے کیبن کی خاموشی میں دراڑیں پیدا ہونے لگیں۔

''ڈاکٹر دانش...... آپ بے گناہ ہیں...... آپ نے کسی کو قتل نہیں کیا...... شہزاد صدیقی کو بھی نہیں...... آپ اپنے آپ پر اعتماد کریں...... آپ بہت لائق ڈاکٹر ہیں۔ بہت اچھے انسان ہیں...... اور...... لوگوں کو آپ کی ضرورت ہے'' ڈاکٹر رابرٹ آہستہ آہستہ سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔

ڈاکٹر دانش خاموشی سے انہیں سنتے رہے...... جیسے ان کے ایک ایک لفظ کو اپنے اندر جذب کر رہے ہوں...... صرف ان کے چہرے کے تاثرات بدل رہے تھے...... اور...... ان تاثرات سے ڈاکٹر رابرٹ ان کے شعور میں جنم لینے والے اضطراب کا بغور مشاہدہ کر رہے تھے۔

''ڈاکٹر دانش...... آپ قاتل نہیں...... بی کونفیڈنٹ...... ساری دنیا کو بتائیں...... کہ آپ قاتل نہیں'' ڈاکٹر رابرٹ نے پھر سرگوشی کی۔

ڈاکٹر دانش نے اپنی بند آنکھوں کو عجیب انداز میں حرکت دی۔ گویا انہیں کھولنے اور بند کرنے کی کوشش کی...... مگر وہ انہیں کھول نہ سکے، ان کا لاشعور...... ان کے شعور پر حاوی تھا...... وہ آہستہ آواز میں بڑبڑائے۔

''ہاں...... میں...... قاتل نہیں...... میں قاتل نہیں'' ڈاکٹر دانش نے سرگوشی کی۔

''کیا آپ سب کو یہ بات بتائیں گے؟'' ڈاکٹر رابرٹ نے پوچھا۔

''ہاں......'' ڈاکٹر دانش نے جواب دیا۔

''کیا آپ اتنے اسٹرونگ ہیں کہ سب کو یہ بات بتا سکیں گے؟''

''ہاں......''

''کیا آپ اپنی ریسرچ دوبارہ شروع کرنا چاہتے ہیں؟''

''ہاں''

''کیا آپ کو اپنا پروفیشن پسند ہے؟''

''ہاں......''

''گڈ...... ڈاکٹر دانش لوگوں کو آپ کی ضرورت ہے...... آپ کی ریسرچ لوگوں کو بہت فائدہ پہنچا سکتی ہے...... اپنے ذہن سے تمام خوف، شکوک وشبہات، غصہ اور رنج کے جذبات ختم کر دیں۔ ایک بار پھر اپنی زندگی کو اسی جوش اور جذبے کے ساتھ گزاریں جس طرح آپ گزارتے آئے ہیں۔ آپ اپنا مشن جاری رکھیں'' ڈاکٹر رابرٹ نے آہستہ آہستہ ایک ایک لفظ یوں بولا جیسے ان کے دماغ کے خلیاتی دیواروں پر کندہ کر رہے ہوں۔

ڈاکٹر دانش کے چہرے کے تاثرات پھر بدلنے لگے۔انہوں نے اپنی بھنوؤں کو جنبش دی جیسے کوئی بات سننے والا بغور کسی کی بات سنتا ہے اور اپنی بھنوؤں کو سکیڑتا اور پھیلاتا ہے۔

''ڈاکٹر دانش آپ ایک کامیاب ڈاکٹر ہیں......آپ کو اپنا پروفیشن دوبارہ شروع کرنا ہے۔.....کیا آپ بھی ایسا چاہتے ہیں؟ ڈاکٹر رابرٹ نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔

''ہاں......'' ڈاکٹر دانش نے بڑبڑاتے ہوئے جواب دیا۔

ڈاکٹر رابرٹ ان کے دماغ کو رفتہ رفتہ اس نقطے پر لے آئے تھے جو ان کا مقصد تھا......اب ان کا ذہن ڈاکٹر رابرٹ کے مکمل قبضے میں تھا اور اب وہ......ویسے ہی ری ایکٹ کر رہا تھا جیسا وہ چاہتے تھے۔ڈاکٹر رابرٹ کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیلی......ڈاکٹر رابرٹ بغور ان کے چہرے کی جانب دیکھتے رہے۔

ڈاکٹر دانش آہستہ آہستہ بڑبڑا رہے تھے۔

''ہاں......میں اپنا پروفیشن دوبارہ شروع کروں گا......میں ضرور کروں گا......ضرور......ضرور......'' ڈاکٹر دانش آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگے یہاں تک کہ ان کی آواز کہیں گم ہونے لگی۔ان کے لب ساکت ہو گئے اور ان کے چہرے پر سکون سا پھیلنے لگا۔سیشن اوور ہو گیا تھا ڈاکٹر رابرٹ نے مسکرا کر ان کی جانب دیکھا۔وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے تھے۔خوشی سے ان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

☆

ڈاکٹر رمیض کو اپنی مصروفیت سے جیسے ہی فرصت ملی،انہوں نے ڈاکٹر رابرٹ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی وہ جب بھی ان کو فون کرتے۔ ان کا موبائل آف ملتا......اور اگر آن ہوتا تو کوئی لڑکی یہ جواب دے کر فون بند کر دیتی کہ ڈاکٹر رابرٹ بزی ہیں''

ڈاکٹر رمیض کو بہت مایوسی ہونے لگی۔ملک واپس جانے میں صرف تین دن باقی تھے اور وہ ڈاکٹر دانش سے ملے بغیر جانا نہیں چاہتے تھے۔انہوں نے ڈاکٹر محسن زیدی سے رابطہ کیا اور ان کو صورت حال سے آگاہ کیا۔

''آپ فکر نہیں کریں......میں ڈاکٹر رابرٹ سے ڈسکس کر کے آپ کو فون کرتا ہوں'' ڈاکٹر محسن زیدی نے کہا اور ڈاکٹر رمیض ان کی کال کا انتظار کرنے لگے۔

اگلے روز ڈاکٹر رمیض نے ڈاکٹر محسن زیدی کے فون کے بعد ڈاکٹر رابرٹ سے بات کی اور ڈاکٹر دانش کے بارے میں پوچھنے لگے۔

آپ ان سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟ ڈاکٹر رابرٹ نے پوچھا۔

''وہ ہمارے ملک کا قابل قدر سرمایہ ہیں'' ڈاکٹر رمیض نے جواب دیا۔

''آپ ان کے کیا لگتے ہیں؟'' ڈاکٹر رابرٹ نے پھر سوال کیا۔

''کیا ایک انسان رشتہ داری کے بغیر دوسرے انسان سے نہیں مل سکتا؟'' ڈاکٹر رمیض نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

میں نے یہ بات اس لئے پوچھی ہے کہ ڈاکٹر دانش کے سب خیر خواہ اجنبی اور غیر لوگ ہیں۔ علی موسیٰ ان کے روم میٹ ان کو میرے پاس علاج کے لئے لائے اور آپ...... بھی یقیناً ان کو پہلی بار ملنے جا رہے ہیں...... مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ان کے اپنے لوگ کہاں گئے...... وہ ان کے لئے ایسی تڑپ کیوں نہیں رکھتے جیسے اجنبی لوگ رکھتے ہیں ان کی فیملی کہاں ہے؟ کیا ان کو ڈاکٹر دانش کی ضرورت نہیں؟ ڈاکٹر رابرٹ نے حیرت سے سوال کئے۔

''سوری...... میں ان کی فیملی لائف کے بارے میں کچھ نہیں جانتا......'' ڈاکٹر رمیض نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے...... میں آپ کو ان کا ایڈریس دیتا ہوں...... لیکن پلیز ان سے گفتگو میں بہت احتیاط کیجئے...... آئی مین ان کے ماضی سے متعلقہ کوئی منفی بات نہ کیجئے گا...... اس سے ان کو ڈپریشن ہونے لگتا ہے...... میں بہت مشکل سے ان کو ٹریک پر لے کر آیا ہوں...... ورنہ وہ تو بہت منتشر ہو چکے تھے۔ ان کا ذہن اور شخصیت بری طرح متاثر ہوئے تھے اب وہ قدرے بہتر ہو رہے ہیں۔ آپ ان سے پر امید باتیں کیجیے...... امید...... مایوس دلوں میں نئی زندگی اور حرارت پیدا کرتی ہے...... انسان ذہنی طور پر تب بیمار اور مردہ ہونے لگتا ہے جب اس کے اندر سے امید ختم ہو جاتی ہے...... ناامیدی...... انسان کو زندگی میں ہی موت سے ہمکنار کرتی ہے اور امید...... مردہ دلوں کو پھر سے زندہ کر دیتی ہے...... امید...... ڈاکٹر دانش کو دوبارہ زندگی کی طرف لا سکتی ہے اس وقت انہیں صرف اور صرف امید دلانے کی ضرورت ہے'' ڈاکٹر رابرٹ نے نرم لہجے میں ڈاکٹر رمیض کو سمجھایا۔

''تھینک یو...... ڈاکٹر رابرٹ...... آپ نے ڈاکٹر دانش کا بہت خیال رکھا اور مجھے بھی گائیڈ کیا...... ڈاکٹر...... امید کا دوسرا نام ہوتا ہے...... اور ڈاکٹر وہی ہوتا ہے جو بیمار جسموں کو ہی نہیں...... بیمار دلوں اور ذہنوں کا بھی علاج کرتا ہے'' ڈاکٹر رمیض نے خوشگوار لہجے میں جواب دیا۔

''آپ کی بات سن کر مجھے خوشی ہوئی ہے...... آئی ایم شیور اب ڈاکٹر دانش بالکل ٹھیک ہو جائیں گے'' ڈاکٹر رابرٹ نے پر امید لہجے میں جواب دیا اور مسکراتے ہوئے فون بند کر دیا۔

☆

''آپ...... کون......؟ علی موسیٰ نے دروازہ کھول کر اپنے سامنے ایک خوبصورت سمارٹ نوجوان سے حیرت سے پوچھا'' کیا ڈاکٹر دانش یہیں رہتے ہیں۔

''جی ہاں...... مگر آپ کون ہیں؟'' علی موسیٰ نے پوچھا۔

''میں ڈاکٹر رمیض ہوں، ان سے ملنے آیا ہوں۔ ڈاکٹر رابرٹ سے مل کر آ رہا ہوں''

''آئی...... سی...... اندر تشریف لائیے'' علی موسیٰ نے اپنے لہجے کو قدرے خوشگوار بناتے ہوئے کہا اور اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔ ڈاکٹر رمیض حیرت سے اپارٹمنٹ کو دیکھتے ہوئے ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔

''میں ابھی ڈاکٹر دانش کو انفارم کرتا ہوں...... لیکن ان سے بات چیت کرتے ہوئے آپ کو کتنا محتاط ہونا پڑے گا...... اس کے بارے میں یقیناً ڈاکٹر رابرٹ نے آپ کو بریف کیا ہو گا'' علی موسیٰ نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔

''جی...... ہاں'' ڈاکٹر رمیض نے شستہ لہجے میں جواب دیا۔

علی موسیٰ ایک کمرے میں چلے گئے اور تھوڑی دیر بعد باہر آئے۔ان کے ساتھ بلیک تھری پیس سوٹ میں قدرے ادھیڑ عمر شخص تھا۔ڈاکٹر رمیض کو دیکھ کران کے چہرے پر حیرانگی اور ناآشنائی کے تاثرات نمایاں ہوئے۔

''السلام وعلیکم..... میں ڈاکٹر رمیض ہوں..... یقیناً آپ ڈاکٹر محسن زیدی کو جانتے ہوں گے..... ہمارے ملک کے ٹاپ کلاس نیورو سرجن''ڈاکٹر رمیض نے تعارف کرانا چاہا۔

''ہاں..... میرے بعد وہ ٹاپ کلاس ہوگا..... ورنہ میری موجودگی میں تو وہ.....''ڈاکٹر دانش طنزیہ مسکراہٹ سے بولے۔ان کے جملے نے ڈاکٹر محسن زیدی کی حیثیت واضح کردی تھی۔

''خیر..... بتایئے..... آپ کون ہیں اور کیوں مجھ سے ملنے آئے ہیں؟''ڈاکٹر دانش نے قدرے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''میں بھی نیورو سرجن ہوں اور برین نیورانز پر ریسرچ کررہا ہوں۔ڈاکٹر رمیض میرا نام ہے اور ڈاکٹر محسن زیدی کو اپنا استاد سمجھتا ہوں۔انہوں نے آپ کے بارے میں بتایا تو آپ سے ملنے کا شوق پیدا ہوا..... میں یہاں ایک کانفرنس میں شرکت کے لئے آیا ہوں..... سوچا..... آپ سے بھی مل لوں''ڈاکٹر رمیض نے جواب دیا۔

''ڈاکٹر محسن زیدی نے آپ کو میرے بارے میں کیا بتایا ہے؟''ڈاکٹر دانش نے قدرے مشکوک انداز میں پوچھا اور ایک دم ان کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے۔

''یہی..... کہ آپ بہت قابل، لائق اور مشہور ڈاکٹر ہیں۔نیورالوجی کی فیلڈ میں آپ کا بہت نام ہے''ڈاکٹر رمیض نے مسکرا کر جواب دیا۔

''میرا نام تھا..... مگر اب نہیں''ڈاکٹر دانش نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''سر..... ذہانت اور عقل اللہ کی عطا ہے۔وہ کچھ خاص انسانوں کو بہترین صلاحیتوں سے نوازتا ہے اور جن کو عطا کرتا ہے ان کو تھوڑی بہت آزمائشوں میں بھی ڈالتا ہے اور یہ آزمائش انسان سے اس کی صلاحیتیں کبھی چھینتی نہیں..... بلکہ انسان کو پھر سے مضبوط اور توانا بناتی ہیں..... سر نے مجھے شہزاد صدیقی کیس کے بارے میں بتایا تھا..... لیکن آپ اس میں قطعی قصوروار نہیں تھے۔یہ تو ایک حادثہ تھا اور حادثہ کسی کے ساتھ بھی ہوسکتا ہے لیکن اس حادثے کی خاطر اپنی ساری زندگی اور مستقبل داؤ پر نہیں لگانا چاہیے..... کل بھی آپ کا بہت نام اور عزت تھی اور آج بھی آپ کو بہت عزت سے ہی یاد کیا جاتا ہے..... اس لئے تو میں آپ سے ملنے آیا ہوں اور چاہتا ہوں کہ آپ ملک واپس آ جائیے..... میں آپ کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہتا ہوں..... ایک محترم اور لائق استاد کی حیثیت سے میں آپ کی رہنمائی چاہتا ہوں''ڈاکٹر رمیض نے قدرے مودبانہ انداز میں کہا تو ڈاکٹر دانش کی آنکھیں خوشی کے احساس سے چمکنے لگیں..... بہت عرصے بعد کوئی ان کو یوں عزت دے رہا تھا..... ورنہ گمنامی کے ان سالوں میں ان کی ذات کی جس طرح نفی ہوئی تھی اور وہ جس شدید ذہنی بحران میں سے گزرے تھے اس نے ان کی شخصیت کو منتشر کردیا تھا..... ڈاکٹر رمیض کے الفاظ انہیں ہمت اور دلاسا دے رہے تھے وہ تو منتظر تھے کہ کوئی ان کو ایک بار باعزت طریقے سے بلائے اور وہ فوراً ملک واپس چلے جائیں۔

''سر..... ہم سب لوگ آپ کی بہت عزت کرتے ہیں..... ہمارے ملک کو اور اس کے لوگوں کو آپ کی ضرورت ہے..... آپ جیسے ذہین

لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں...... آپ دوسرے لوگوں کے لئے کتنا بڑا سرمایہ ہیں...... شاید آپ کو اس کا اندازہ نہیں" ڈاکٹر رمیض نے ان کی تعریف کرتے ہوئے کہا تو ڈاکٹر دانش تعریفی الفاظ سن کر مسکرانے لگے۔ان کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے اور چہرے کی رنگت سرخ ہونے لگی جوان کے بدلتے جذبات کی عکاس تھی۔ان کا دل خوشی سے لبریز ہونے لگا اور آنکھیں فرط جذبات سے چھلکنے لگیں۔

ڈاکٹر رمیض ان کے تاثرات سے ان کے دل کی کیفیت کا اندازہ لگا رہے تھے اور انہیں خوشی ہو رہی تھی کہ وہ ایک ٹوٹے دل اور مایوس انسان کا حوصلہ بندھا رہے ہیں۔

"سر...... سارا ملک آپ کا منتظر ہے۔پلیز آپ جلد واپس آنے کی کوشش کریں...... ڈاکٹر رمیض نے کہا تو ڈاکٹر دانش مسکرانے لگے۔

علی موسیٰ ان کے لئے کافی لے کر آئے اور ڈاکٹر دانش کو پہلی بار مسکراتے دیکھ کر قدرے حیران ہوئے۔

"کیا آپ نے میرے ریسرچ پیپرز پڑھے ہیں؟" ڈاکٹر دانش نے خوش ہو کر پوچھا۔

"نہیں...... ابھی اتفاق نہیں ہوا......" ڈاکٹر رمیض نے جواب دیا۔

"ٹھہریے...... میں ابھی آپ کو دکھاتا ہوں" اور ڈاکٹر دانش اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔

"تھینکس گاڈ...... آج میں نے پہلی بار ان کو اتنا خوش اور نارمل دیکھا ہے...... ورنہ وہ ہر وقت اپ سیٹ رہتے ہیں" علی موسیٰ نے کافی کا کپ ڈاکٹر رمیض کو پکڑاتے ہوئے کہا۔

"آپ...... ڈاکٹر دانش کو کیسے جانتے ہیں؟" ڈاکٹر رمیض نے کافی پیتے ہوئے پوچھا۔

"ان کا دوست ہوں......" علی موسیٰ نے مختصر جواب دیا۔

ڈاکٹر دانش ایک بڑا سا بیگ اٹھا کر لے آئے اور ڈاکٹر رمیض کو اپنی فائلز کھول کھول کر دکھانے لگے...... ڈاکٹر رمیض بھی انتہائی دلچسپی سے ان کی فائلز کو دیکھنے لگے۔

"واؤ...... ایکسیلنٹ...... سر...... یو آر...... رئیلی اے جینئس" ڈاکٹر رمیض نے ڈاکٹر دانش کی بھرپور انداز میں تعریف کرتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر دانش کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا اور وہ خوش ہو کر انہیں مزید فائلیں دکھانے لگے۔

"تھینک یو...... ویری مچ...... آپ سے ملاقات بہت اچھی رہی۔مجھے آپ سے مل کر کس قدر خوشی ہو رہی ہے۔آپ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے...... مجھے آپ جیسے انسان کی ہی تلاش تھی۔مجھے امید ہے کہ آپ کی مدد اور تعاون سے میں بھی اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں گا" ڈاکٹر رمیض نے کہا۔

"کیسا مقصد......؟" ڈاکٹر دانش نے چونک کر پوچھا۔

"اپنی ریسرچ کا مقصد......" ڈاکٹر رمیض نے بے یقینی سے کہا۔

"آپ کیسا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں؟"

''ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا مگر جب آپ میری لیب میں آئیں گے تو پھر...... شاید میں آپ کو کچھ بتانے کے قابل ہو جاؤں گا...... میں آپ کی آمد کا شدت سے منتظر رہوں گا'' ڈاکٹر رمیض نے مسکرا کر پرجوش انداز میں کہا۔

''آئی...... ول...... سی یو ویری سون (میں بہت جلد آپ سے ملوں گا)'' ڈاکٹر دانش نے خوش ہو کر کہا اور مسکراتے ہوئے ڈاکٹر رمیض کو رخصت کیا۔

☆

دو روز سے اماں کی طبیعت بہت خراب تھی اور اس وجہ سے فریحہ آفس میں نہیں جا سکی تھی۔ عاصم کی ساری ذمہ داری اس پر آن پڑی تھی ورنہ اماں نے اس کی آدھی سے زیادہ ذمہ داریاں اٹھا رکھی تھیں۔ اماں سرونٹ کوارٹر میں ہی رہتی تھی اور اماں کی دیکھ بھال کے لئے اس نے ایک کولیگ کی ملازمہ کو چند روز کے لئے بلایا تھا مگر عاصم کی ساری ضروریات اسے خود پوری کرنی پڑتی تھیں۔ عاصم اب کتنا ڈیمانڈنگ ہو رہا تھا اور کس قدر تنگ کرنے لگا تھا یہ اسے دو دن میں ہی اندازہ ہو گیا تھا۔ اسے اماں کی باتوں پر اب یقین آنے لگا تھا جو ہر روز اس سے شکایت کرتی تھیں کہ اب عاصم ان سے سنبھالا نہیں جاتا...... اور...... وہ نئے ملازم کو ڈھونڈنے کا کہہ کر خاموش ہو جاتی۔

عاصم کوئی بھی liquid پیتے ہوئے سارا اپنے کپڑوں پر بھی گرا لیتا اور پلانے والے پر بھی۔ پہلے وہ اس کا ڈریس چینج کرتی پھر اپنا...... بڑی مشکل سے اسے کھانا کھلا کر فارغ ہوتی تو وہ بیڈ گیلا کر دیتا۔ اسے پھر اپنے اور اس کے کپڑے تبدیل کرنے پڑتے۔ وہ تو الجھ کر رہ گئی تھی اور بار بار خدا کا شکر ادا کر رہی تھی کہ اماں اس کے پاس موجود ہے اس لئے اسے اتنی تکالیف نہیں اٹھانی پڑتیں۔ عاصم کی وجہ سے وہ سارا وقت مصروف رہتی۔ اس کا موبائل بجتا رہتا مگر وہ کوئی کال ریسیو نہ کرتی۔

عاصم سو رہا تھا اور وہ بھی اسے سلاتے ہوئے سو گئی تھی۔ جب گیٹ بیل بجی اور چوکیدار نے اسے شیر افگن کے آنے کی اطلاع دی۔ وہ چونک گئی اور حیرت سے کلاک کی جانب دیکھا۔ رات کے آٹھ بج رہے تھے اس نے اپنا حلیہ ٹھیک کیا اور ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔

شیر افگن آف وہائٹ تھری پیس سوٹ میں انتہائی گریس فل لگ رہا تھا۔ وہ کشمیری کڑھائی کی بلیک شال کندھوں پر اوڑھے، قدرے نیم بیدار آنکھوں کے ساتھ پہلے سے بھی زیادہ پرکشش لگ رہی تھی۔

''آپ کیسے؟'' فریحہ نے انتہائی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''میں آپ کے موبائل پر کال کر رہا تھا مگر آپ کال اٹینڈ نہیں کر رہی تھیں...... مجھے فکر ہونے لگی سوچا...... کہیں آپ......؟'' شیر افگن نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا۔

''اماں آج بیمار ہیں...... اور عاصم کی دیکھ بھال وہی کرتی ہیں اس لئے مجھے عاصم کی وجہ سے گھر پر ہی رہنا پڑ رہا ہے'' فریحہ نے جلدی سے بتایا۔

''کیا اماں...... آپ کی کوئی عزیزہ ہیں؟'' شیر افگن نے پوچھا۔

''نہیں...... مگر کبھی کبھی کوئی غیر بھی اپنوں سے بڑھ کر ہوتے ہیں...... رشتے تو وہی ہوتے ہیں جو دکھ سکھ میں کام آئیں...... اور اماں......

میرے لئے میرے اپنوں سے بھی بڑھ کر ہیں......" فریحہ نے جواب دیا۔

" آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں...... بات تو احساس، محبت اور ہمدردی کی ہوتی ہے...... جس کی وجہ سے ایک انسان کو دوسرے انسان کی ضرورت ہوتی ہے" شیر افگن نے جواب دیا۔

" آپ کیا لیں گے...... چائے یا کافی......؟" فریحہ نے پوچھا۔

" کافی...... باہر خاصی ٹھنڈ ہو رہی ہے" شیر افگن نے کہا۔

" آئی ایم سوری...... مجھے یاد ہی نہیں رہا کہ ہیٹر آن کر دیتی......" اور فریحہ نے اٹھ کر آتشدان میں رکھا انتہائی سٹائلش ہیٹر آن کیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ٹرے میں کافی اور دوسرے لوازمات لے آئی۔

" آئی ایم سوری...... آپ کو میں نے تکلیف میں ڈال دیا" شیر افگن نے کہا۔

" کوئی بات نہیں...... مجھے بھی کافی کی بہت طلب ہو رہی تھی۔ عاصم کو سلاتے ہوئے وہیں سو گئی" فریحہ نے ٹرے اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

" مسز فریحہ اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو کیا ہم وہاں ہیٹر کے پاس بیٹھ کر کافی پی سکتے ہیں؟" شیر افگن نے ڈرائنگ روم کے اس کونے کی جانب اشارہ کیا جہاں ہیٹر آن تھا۔ وہ انتہائی منفرد اور اسٹائلش انداز میں ڈیکوریٹ کیا گیا تھا۔ آتشدان کے سامنے انتہائی خوبصورت ایرانی کارپٹ بچھا تھا اور اس کے ارد گرد فلور کشنز اور صوفہ کشنز رکھے تھے۔ ارد گرد کین (Cane) کی صوفہ نما کرسیاں تھیں جن پر سرخ ویلوٹ کے کشنز رکھے تھے۔ ارد گرد انتہائی خوبصورت ڈرائی فلاورز اور بینز جمنسس پڑی تھیں۔ اس کارنر کو جس جمالیاتی ذوق کے ساتھ ڈیکوریٹ کیا گیا تھا وہ انسان کی نفسیات پر گہرا اثر ڈالتا تھا۔ آتشدان کے پاس بیٹھ کر انسان خود بخود کسی رومانٹک ورلڈ کی طرف قدم بڑھانے لگتا تھا۔ اس گوشے میں اسٹائلش بلب آن تھے۔ فریحہ اور شیر افگن کافی کے کپ لیے کین کے صوفوں پر بیٹھ گئے۔

" کافی بہت اچھی ہے" شیر افگن کافی کا سپ لیتے ہوئے بولا۔

" تھینکس......" اس نے زیر لب مسکرا کر جواب دیا۔

" مسز فریحہ...... میں نے آپ جیسی عورت پوری زندگی میں نہیں دیکھی یو...... آر...... اے جینئس...... ونڈرفل...... اینڈ امیزنگ ویمن" شیر افگن قدرے محبت پاش نظروں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

" نتھنگ از اسپیشل ودمی...... آئی ایم ویری نارمل پرسن" فریحہ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

" یو...... آر...... ویری ہمبل اینڈ ڈاؤن ٹو ارتھ...... آپ اس قدر ذہین...... اور سپرب عورت ہیں...... کہ میں تو آپ کا مداح ہو گیا ہوں...... سوچتا ہوں اگر آپ کو بچے کی مجبوری نہ ہوتی تو اس وقت آپ کتنی اچیومنٹس حاصل کر چکی ہوتی...... آپ میں کس قدر پوٹینشل ہے...... اور آپ کہاں تک جا سکتی ہیں...... شاید آپ کو اس کا اندازہ نہیں" شیر افگن انتہائی شستہ الفاظ میں اس کی تعریف کرتے ہوئے بولا۔

''شیر افگن صاحب..... مجھے نہ تو اپنے بارے میں کوئی زعم ہے اور نہ ہی میں کوئی بڑا دعویٰ کرنا چاہتی ہوں..... مگر اتنا جانتی ہوں کہ جب انسان کو مات ہوتی ہے تو اسے اپنی قدر و قیمت کا بہت اچھا اندازہ ہو جاتا ہے.....'' فریحہ نے کافی کا سپ لیتے ہوئے کہا۔

''آپ ایک عام عورت نہیں'' شیر افگن نے کہا۔

''عورت بس عورت ہوتی ہے..... خاص اور عام..... اسے دیکھنے والی نظر بناتی ہے'' فریحہ نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''کیا زندگی میں کوئی بہت تلخ تجربہ ہوا ہے؟'' شیر افگن نے پوچھا۔

''زندگی بذات خود بہت تلخ ہے..... کیا آپ کو اس کا ابھی تک کوئی تجربہ نہیں ہوا.....؟'' فریحہ نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''ہاں..... کم و بیش ویسا ہی..... جیسا آپ کو ہو چکا ہے'' شیر افگن نے کافی کا مگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا مطلب.....؟'' فریحہ نے حیرت سے پوچھا۔

''مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے ہم دونوں ایک ہی گاڑی میں سوار ہوں..... آپ نے اپنے شوہر کو کیوں چھوڑا.....؟'' شیر افگن نے ایک دم پوچھا۔

''میں نے نہیں..... انہوں نے ہمیں چھوڑا.....''

''کیوں.....؟''

''انہیں زندگی میں ایک چیز بہت عزیز تھی ''کامیابی'' اور وہ اپنی کامیابی کے راستے میں حائل ہر شے کو ٹھوکر مار کر گزرنا چاہتے تھے۔

''آپ کوئی شے تو نہیں تھیں؟'' شیر افگن نے حیرت سے پوچھا۔

''کاش میں کوئی شے ہوتی..... جسے دکھ تو نہ ہوتا'' اس نے کرب سے کہا اور خاموش ہو گئی..... اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

''آئی ایم سوری..... میرا مقصد آپ کو ہرٹ کرنا نہیں..... آپ کا دکھ شیئر کرنا ہے'' شیر افگن نے ملائمت سے کہا۔

''محض باتوں سے دکھ شیئر نہیں ہوتے..... دکھ تو انسان کے دل کی دیواروں کے ساتھ چپٹے ہوتے ہیں۔ اس کے اندر خون کی طرح گردش کرتے رہتے ہیں۔ جونک کی طرح چپٹے ہوئے دکھ خالی باتوں سے کس طرح انسان کے وجود کو چھٹکارا دلا سکتے ہیں۔'' فریحہ نے آہ بھر کر کہا اور آنکھوں کی نمی میں مزید اضافہ ہونے لگا۔

''آپ کے شوہر نے کب آپ کو چھوڑا.....؟'' شیر افگن نے پوچھا۔

''دس سال ہو گئے ہیں'' فریحہ نے جواب دیا۔

''کیا طلاق ہو گئی؟''

''نہیں.....''

''کیوں.....؟''

''معلوم نہیں''

''کیا آپ انہیں مس کرتی ہیں؟''

''نہیں''

''کیوں.....؟''

''کسی کو مس کرنے کے لئے اس کے ساتھ اچھی یادوں کا وابستہ ہونا ضروری ہوتا ہے''

''کیا وہ اچھے شوہر نہیں تھے؟''

''کاش وہ اچھے انسان ہوتے!''

''پھر آپ نے ان سے شادی کیوں کی؟''

''تقدیر انسان کے فیصلوں اور ارادوں پر حاوی ہوتی ہے''

''کیا اب پچھتاتی ہیں؟''

''پچھتاوے تو ازل سے انسان کے مقدر میں ہیں.....کیا آپ کبھی نہیں پچھتائے؟''

''ہاں.....اکثر پچھتاتا ہوں.....کہ میں نے زہرہ اور نازلی سے شادیاں کیوں کیں؟''

''کیا دونوں شادیاں ناکام ہو گئیں.....؟''

''ہاں.....''

''کیوں.....؟''

''جب سوچ.....ذہن کا.....اور ذہن.....جسم کا ساتھ نہ دے تو پھر کامیابی ناکامی میں تبدیل ہو جاتی ہے''۔

دونوں خاموش ہو گئے اور ہیٹر کی لو میں اضافہ ہونے لگا۔

''مجھے خوبصورت اور کامیاب عورتیں پسند ہیں.....آپ جیسی.....''شیر افگن اس کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ کر بولا۔

''پلیز.....کسی بھی نازک جذبے کو اپنے دل میں جنم دینے سے پہلے یہ ضرور سوچ لینا کہ میری طرف آنے والے تمام راستے بند گلی میں ختم ہوتے ہیں''

''اور بند گلی کو بھی سورج ضرور روشن کرتا ہے''

''اس بند گلی کو سورج کی روشنی کی ضرورت نہیں''

''سورج اپنی روشنی پھیلانے میں آزاد ہوتا ہے''شیر افگن نے فرط جذبات سے مغلوب ہو کر اس کے قریب آ کر کہا۔ وہ اس کی گرم سانسوں اور بدن سے پھوٹنے والی مخصوص مہک کے حصار میں مقید ہونے لگی۔ شیر افگن نے صوفے کی پشت پر پھیلائے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھنا چاہا۔

''میری limitations مجھے اس کی اجازت نہیں دیتیں...'' فریحہ نے اپنا ہاتھ چپکے سے اس کے ہاتھ کے نیچے سے نکال لیا۔

''کیا ایک دوست کے ناتے سے بھی نہیں......؟'' شیر افگن نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''نہیں......'' اس نے گہری سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

''آپ مجھے الجھا رہی ہیں''

''میں خود اپنے لیے ایک الجھن ہوں''

''آپ نے اپنی زندگی کو اتنا بنجر اور ویران کیوں بنا رکھا ہے... زندگی اور اس کی خوشیوں پر آپ کا بھی حق ہے''

''یہ پرامید باتیں میرے لئے بے معنی ہیں''

''اتنی ناامیدی کیوں......؟''

''اور خوش فہمیوں کا فائدہ......؟''

''زندگی یوں تو نہیں گزارتے......''

''یہاں زندگی گزار کون رہا ہے......؟ کیا آپ ویسی ہی زندگی گزار رہے ہیں جیسی آپ چاہتے ہیں؟'' فریحہ نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

شیر افگن نے اس کی جانب دیکھا، گہری سانس لی اور خاموش ہو گیا۔

ڈرائنگ روم میں پھر گہرا سکوت چھا گیا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش تھے... مگر دونوں کے ذہنوں میں ان گنت سوالات جنم لے رہے تھے۔

''اب میں چلتا ہوں......'' شیر افگن اٹھتے ہوئے بولا۔

وہ بھی خاموشی سے اٹھی اور اس کے ہمراہ چلتی ہوئی کوریڈور کے دروازے تک آئی۔

''آپ بہت مختلف عورت ہیں...... میں اب پہلے سے بھی زیادہ آپ کی عزت اور احترام کرنے لگا ہوں......'' شیر افگن نے بھرپور نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔ فریحہ نے گہری سانس لی اس کی جانب دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔

''اور......'' وہ قدرے توقف سے بولا۔

فریحہ نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔

''شاید......محبت بھی......'' شیر افگن نے مضبوط لہجے میں سرگوشی کے انداز میں کہا۔

فریحہ اس کی طرف دیکھتی رہ گئی اور اس کا دل بہت سالوں بعد ایک بار پھر بری طرح دھڑکنے لگا تھا۔ وہ جا چکا تھا مگر وہ کسی سحر میں گرفتار ہو چکی تھی۔

اس نے پہلے بھی 'محبت' کے نام پر دھوکہ کھایا تھا اور اب پھر محبت اس کے دل کے دروازے پر دستک دے رہی تھی جبکہ اس نے اپنے دل کے دروازے کو سختی سے بند کر رکھا تھا۔

"شیر افگن سے محبت...... یا...... شیر افگن کی اس سے محبت" وہ سر تھام کر بیٹھ گئی۔ اس کے خیالات منتشر ہونے لگے اور دل بے قابو ہونے لگا۔

"نہیں...... مجھے ایسا کچھ نہیں سوچنا چاہیے" اس نے تمام خیالات کو جھٹک کر سوچا اور عاصم کے کمرے میں چلی گئی۔

شیر افگن دن میں کئی کئی بار اس کا نمبر ملاتا اور پھر فون بند کر دیتا...... شادیوں کے بعد وہ پھر تنہا تھا اور اسے کسی ایسی عورت کی تلاش تھی جو اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل سکے۔ اس نے زہرہ سے شادی اس کے مربعوں کی وجہ سے کی...... اس کے دو مربعے فروخت کر کے اس نے شہر میں اپنی انڈسٹری بنالی۔ باقی دو کو بیچنے لگا تو زہرہ کے بھائیوں نے جھگڑا شروع کر دیا اور اسے خاموش ہونا پڑا۔ زہرہ گاؤں کی حویلی میں اپنے دو بچوں کے ساتھ تنہا زندگی گزارنے پر مجبور تھی۔ شیر افگن مہینے میں ایک بار اس کے پاس جاتا اور ہر بار ملاقات شکوؤں، شکایات کی نذر ہو جاتی...... جھگڑا ہوتا اور اگلے روز وہ واپس شہر آجاتا۔

نازلی...... شوبز کی کامیاب ادارکارہ تھی۔ بہت نام اور پیسے والی خوبصورت عورت تھی شوبز میں اس کے پائے کی اداکارہ نہیں تھی۔ نازلی سے شادی کے بعد اس کے پیسے سے انگلینڈ میں ایک ریسٹورنٹ شروع کیا۔ جب وہ بزنس اچھی طرح اسٹیبلش ہو گیا تو دونوں میں اختلافات شروع ہو گئے...... نازلی نے اپنا پیسہ واپس لینے کی ہر ممکن کوشش کی مگر شیر افگن کی چالاکیوں سے وہ ہار گئی۔ اب اسے کسی اور ایسی عورت کی تلاش تھی جو اس کی کامیابیوں میں مزید اضافہ کر سکے اور اس کے لئے ایسا مہرہ ثابت ہو جو اسے بہت اوپر لے جائے...... اور وہ فریحہ سے بہت متاثر ہوا تھا۔ اس کے ماں باپ بہن بھائی سب امریکہ میں مقیم تھے اور بہت امیر تھے۔ فریحہ خود بہت ذہین اور چارمنگ لیڈی تھی۔ اس جیسی عورتیں ترقی کے زینے پر قدم رکھتے ہی بلندیوں کے سفر پر گامزن ہو جاتی ہیں...... فریحہ نے اب تک ترقی کیوں نہیں کی تھی اور وہ اس کی وجہ جان کر بہت مایوس ہوا تھا...... اور اس سے بھی زیادہ تب ہوا تھا جب فریحہ نے اپنے دل کے دروازے پر اس کی دستک کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی...... مگر وہ عورت کے دل کو اچھی طرح جانتا تھا اسے کیسے کیسے ورغلایا جا سکتا ہے اس فن سے بھی وہ بخوبی آگاہ تھا...... وہ ظاہراً کچھ اور تھا...... اور...... اندر سے کچھ اور تھا...... وہ ہر لمحہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والا انسان تھا...... وہ اپنی خوبصورت پرکشش شخصیت اور متاثر کن گفتگو سے دلوں کو لبھانے کا گر جانتا تھا...... فریحہ اسکا ٹارگٹ تھی۔

وہ صبح آفس جانے سے پہلے اسے مس کال کر دیتا...... آفس پہنچ کر اسے فون کرتا۔ اس سے عاصم کی خیریت اور اس کی گھریلو پریشانیوں کے بارے میں پوچھتا اور بہت سی باتوں کے بعد کسی نہ کسی طریقے سے اس تک اپنے دل کی بات پہنچاتا کوئی ایسی بات کہتا جسے سن کر وہ چونک جاتی اور خاموش ہو جاتی...... رفتہ رفتہ اس کا ذہن اس کی باتوں کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ اس کا مٹھاس بھرا لب ولہجہ اس کے اندر کی تلخی کو نگلنے لگا تھا۔ اس کے اندر پھیلے ویران اور بنجر چٹیل میدان میں کہیں کہیں پھول کھلنے لگے تھے۔ جس روز وہ فون نہ کرتا تو وہ انتظار کرتی رہتی...... اور مضطرب ہونے لگتی۔

"یہ مجھے کیا ہونے لگا ہے...... میں کیوں بہک رہی ہوں...... کیوں...... اس شخص پر اتنا اعتماد کرنے لگی ہوں...... کیوں اس کی باتیں سننے کے لئے بے تاب رہنے لگی ہوں...... کیا...... میں اپنا پہلا تجربہ بھول رہی ہوں...... وہ شخص بھی تو میری بہت تعریفیں کرتا تھا...... میری کامیابیاں اسے اچھی لگتی تھیں اور پھر وہ مجھ سے اور میری کامیابیوں سے حسد کرنے لگا...... مجھے ہرگز شیر افگن پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے......" وہ اپنے آپ کو سمجھاتی...... مگر...... پھر مضطرب ہونے لگتی...... شیر افگن سے دستبردار ہونا اسے ناممکن نظر آتا...... زندگی میں کسی نہ کسی پر تو اعتبار کرنا پڑتا ہے ورنہ زندگی کا ایک لمحہ

بھی گزارنا مشکل ہو جاتا ہے......زندگی...... پہلے بھی تو گزر رہی تھی...... شیر افگن کے بغیر" ذہن سوال کرتا اور وہ خود ہی تردید کرتی۔

"ہاں......" وہ آہ بھرتی۔

"پھر......اب کیا ہو گیا ہے؟" ذہن پھر سوال کرتا۔

"معلوم نہیں......شاید میں بدلنے لگی ہوں......یا...... شیر افگن نے میرے دل کو بدل دیا ہے......اس نے میری ساکن زندگی میں ایسا پتھر پھینکا ہے جس نے مجھے مضطرب کر دیا ہے" وہ شدید الجھن کا شکار ہونے لگی تھی۔ وہ جس قدر اپنے آپ کو اس کی سوچوں اور خیالات سے روکتی وہ اتنا ہی اس پر حاوی ہونے لگتا۔ وہ اکثر اس کی کالز ریجیکٹ کر دیتی یا پھر فون آف کر دیتی مگر ان سب باتوں کے باوجود وہ خود کو اس کے سحر سے آزاد نہیں کر پائی تھی۔

"میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں" شیر افگن نے ایک رات اس سے کھل کر اپنے دل کی بات کہی تو وہ چونک گئی۔

"پلیز......میں ایسی کوئی بات سننا نہیں چاہتی" وہ خفگی سے بولی۔

"کیوں......؟"

"میں شادی شدہ عورت ہوں"

"ایسی نام نہاد شادی کے بندھن میں آپ کب تک جکڑی رہیں گی؟"

"جب تک میرا بچہ میرے ساتھ ہے"

"میں اسے بھی اپنانے کو تیار ہوں"

"اس کا اپنا باپ اسے نہیں اپنا سکا......کسی اور کے دل میں اس کے لئے نرم جذبات کہاں سے پیدا ہوں گے"

"کیا آپ سب کو ایک ہی نظر سے دیکھتی ہیں؟"

"ہاں......اندر سے سب انسان کہیں نہ کہیں ایک جیسے ہی ہوتے ہیں"

"یہ آپ کی بہت بڑی غلط فہمی ہے"

"نہیں یہ میرا تجربہ ہے"

"ہر انسان کا تجربہ مختلف ہوتا ہے"

"جو آپ چاہتے ہیں......وہ ممکن نہیں"

"سب ممکن ہے......بشرطیکہ آپ اپنی سوچ کو بدلیں"

"پلیز...... مجھے مت الجھائیں......"

"اور آپ...... نے مجھے الجھا دیا ہے"

"میں......تو......خود......" وہ بے بسی سے بولی۔

"میں آپ کو خوش دیکھنا چاہتا ہوں جب سے آپ سے ملاقات ہوئی ہے..... ایک بار بھی آپ کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں دیکھی...... آپ کی آنکھوں میں اس قدر اداسی ہے کہ مجھے دکھ ہوتا ہے...... اتنی خشک اور ویران زندگی کو میں بدلنا چاہتا ہوں......"

"کیوں......؟" اس نے گہری سانس لیتے ہوئے پوچھا۔

"دیکھنا چاہتا ہوں کہ آپ مسکراتی ہوئی کیسی دکھائی دیں گی...... یقیناً بہت اچھی لگیں گی...... خوشی سے چمکتی آنکھوں کے ساتھ مسکراتی ہوئی...... میرے دل میں اتر جائیں گی...... آپ میں ایسا ہی سحر ہے...... کیا آپ یہ جانتی ہیں؟" شیر افگن سرگوشی کے انداز میں بولا۔

"نہیں...... میں کچھ نہیں جانتی" اس نے گھبرا کر فون آف کر دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"کس پر یقین کروں......؟ اس شخص پر...... یا اس پر...... جس نے مجھے پانے کے لئے اپنے گھر والوں کو چھوڑ دیا...... وہ بھی میرے بارے میں بہت پوزیسو تھا...... اور پھر میرے وجود سے ہی اسے نفرت ہونے لگی۔ شیر افگن اپنی دو بیویوں سے مطمئن نہیں ہو سکا...... تو...... مجھ سے کیسے ہو پائے گا......؟ وہ سوچ میں پڑ گئی۔

شیر افگن...... سمجھدار انسان ہے وہ ہر بات سوچ سمجھ کر کرنے کا عادی ہے...... وہ اس کی جن خوبیوں سے متاثر تھا وہ یقینی طور پر اس میں موجود تھیں صرف شیر افگن ہی نہیں ہر کوئی اس کی پرکشش شخصیت سے ضرور متاثر ہوتا تھا۔ وہ بہت سی باتیں سوچ کر مضطرب ہو جاتی...... اور بہت سی باتیں اسے مطمئن بھی کر دیتیں...... تمام الجھنوں کے باوجود وہ اپنے دل سے شیر افگن کے لئے نرم جذبات کو ختم نہ کر سکی۔

☆

ڈاکٹر محسن زیدی نے انتہائی توجہ سے ڈاکٹر رمیض کی ڈاکٹر دانش سے ملاقات کی کہانی سنی اور ان کی آنکھوں میں آنسو بھرنے لگے...... چہرے پر تفکر کے تاثرات نمایاں ہونے لگے۔

"ڈاکٹر دانش کے بارے میں جان کر مجھے بہت تکلیف ہو رہی ہے...... اس قدر جینئس اور لائق انسان زندگی کے کس فیز (دور) میں سے گزر رہا ہے...... زندگی بھی انسان کو کس قدر عجیب و غریب حالات سے دوچار کرتی ہے کہ یقین ہی نہیں آتا...... انسانی برین پر ریسرچ کرنے والے کا اپنا برین اتنا ڈسٹرب ہو گیا ہے کہ...... وہ......" ڈاکٹر محسن زیدی نے آہ بھر کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور پریشانی سے ڈاکٹر رمیض کی جانب دیکھنے لگے۔

"سر...... انسانی دماغ کتنا بڑا معمہ ہے...... اس بات کی حقیقت پر تب یقین آتا ہے جب پریکٹیکل لائف میں اس کی صلاحیتیں ہم پر آشکار ہوتی ہیں...... ڈاکٹر دانش اب بہت بہتر ہیں۔ ڈاکٹر رابرٹ نے بہت توجہ اور محنت سے ان کا علاج کیا ہے...... ڈاکٹر دانش مجھ سے کونٹیکٹ میں ہیں...... اور...... وہ اگلے ہفتے ملک واپس آ رہے ہیں......" ڈاکٹر رمیض نے مسکرا کر بتایا۔

"رئیلی...... اٹس اے گڈ نیوز......" ڈاکٹر محسن زیدی خوش ہو کر بولے۔

"سر...... میں نے تو سوچا تھا کہ آپ کو سرپرائز دوں گا جب ان کو اپنے ساتھ لے کر آپ کے آفس میں آؤں گا مگر آپ ان کے بارے میں جان کر اتنے ڈسٹرب ہو گئے کہ مجھے پہلے ہی بتانا پڑا" ڈاکٹر رمیض نے مسکراتے ہوئے بتایا تو ڈاکٹر محسن زیدی بھی خوش ہو کر مسکرانے لگے۔

''ڈاکٹر رمیض..... یہ خبر سنا کر آپ نے میرا سارا ڈپریشن دور کر دیا ہے..... پلیز آپ ایک اور اہم کام کیجئے کہ ان کی فیملی سے ضرور رابطہ کیجئے۔ اتنے کرائسس کے بعد فیملی کا ایسے مریض کے ساتھ فرینڈلی ہونا بہت ضروری ہے کیونکہ انسان کے اندر کے جذبات کو فیملی زیادہ اچھے طریقے سے سمجھ سکتی ہے'' ڈاکٹر محسن زیدی نے سنجیدگی سے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''یو..... آر..... رائٹ سر..... لیکن فیملی سے کونٹیکٹ کیسے ممکن ہے..... میرا مطلب ہے ان کا ایڈریس.....؟'' ڈاکٹر رمیض نے استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔

''میں کچھ ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو ان کی وائف کو اچھی طرح جانتے ہیں..... میں ایک دو روز میں آپ کو ان کا ایڈریس دوں گا..... میں چاہتا ہوں آپ خود ان کی مسز سے جا کر ملیں اور ڈاکٹر دانش کا پر جوش استقبال کرنے میں ہمارے ساتھ ان کی فیملی بھی شامل ہو..... اس کا ان کے ذہن پر اچھا اثر پڑے گا'' ڈاکٹر محسن زیدی نے کہا۔

''رائٹ سر..... میں ضرور ان سے ملنے جاؤں گا.....'' ڈاکٹر رمیض نے اٹھتے ہوئے کہا تو ڈاکٹر محسن زیدی نے مسکرا کر ان کی جانب دیکھا اور پر تپاک انداز میں ان سے ہاتھ ملا کر انہیں رخصت کیا۔

☆

چھٹی کا دن تھا اور فریحہ گھر پر ہی تھی۔ وہ ہر چھٹی کے دن عاصم کو گاڑی میں اماں کے ساتھ بٹھا کر باہر آؤٹنگ پر جاتی کہ اس کی صحت کے لئے اسے باہر لے جانا بہت ضروری تھا مگر پچھلے دو تین ماہ سے ایسا ہو رہا تھا کہ وہ جیسے ہی اسے کسی پارک میں لے کر جاتی تو بچوں کے علاوہ مرد اور عورتیں بھی عاصم کے گرد یوں اکٹھے ہو جاتے جیسے وہ کوئی عجوبہ ہو..... سب اس کی طرف حیرت اور خوف سے دیکھتے پھر فریحہ کی طرف رحم بھری نگاہوں سے دیکھتے تو اس کا دل بری طرح کٹنے لگتا۔ اس کا وہاں بیٹھنا مشکل ہو جاتا اور وہ اسے گاڑی میں ڈال کر جلدی سے گھر لے آتی اور گھر آ کر دیر تک روتی رہتی۔ اماں اسے تسلیاں دیتی، اس کی ہمت بندھاتی مگر اس کا دل بہت پریشان رہتا۔

رفتہ رفتہ اس نے عاصم کو آؤٹنگ کے لئے لے کر جانا ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ عاصم کی وارڈروب میں سے کپڑے نکال کر ٹھیک کر رہی تھی جب شیر افگن کا فون آ گیا۔ وہ رفتہ رفتہ اس کے قریب آنے کی بہت کوشش کر رہا تھا۔ وہ ہر روز صبح آفس جانے سے پہلے اسے فون کر کے اس کی خیریت پوچھتا۔ آفس میں لنچ بریک میں، شام کو گھر واپس آنے پر رات کو سونے سے پہلے..... اس سے مختلف موضوعات پر بات چیت کرتا۔ گویا وہ اسے اپنا عادی بنا رہا تھا۔ نفسیاتی طور پر اس کی سوچوں کو اپنے سحر اور حصار میں جکڑ رہا تھا۔ اس کی ویران اور تنہا زندگی میں اپنے ہونے کا احساس دلا کر اس کی سوچوں کا زاویہ بدلنا چاہتا تھا۔ پچھلے ایک ماہ سے جاری اس روٹین نے فریحہ کی سوچوں کو مضطرب کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اپنے آپ سے الجھنے لگی تھی۔ ذہن ہر وقت گہری سوچوں میں غوطہ زن رہتا۔ اتنا سوچنے سے وہ خود ہی پریشان رہنے لگی تھی۔ شیر افگن اتنی خوبصورت زندہ دل اور سحر انگیز شخصیت لیے ہوئے ہر وقت اس کے ذہن پر چھایا رہتا۔ وہ کبھی کبھی نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی فون کال کی منتظر رہتی..... شیر افگن اپنے مقصد میں کامیاب ہو رہا تھا۔ فریحہ کو اپنا منتظر پا کر وہ اندر ہی اندر فاتحانہ انداز میں مسکراتا۔

لاؤنج میں ٹیلی فون کی گھنٹی زور زور سے چلا رہی تھی۔اماں کچن میں مصروف تھی۔فریحہ تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد کمرے سے باہر نکلی اور ریسیور کان سے لگایا اس نے دو منٹ بات کی اور فون بند ہو گیا۔وہ گہری سوچ میں ڈوب گئی۔کون اس سے ملنے آ رہا تھا۔فون کرنے والے نے صرف ایڈریس پوچھا تھا اور اس کے شوہر کے بارے میں......وہ......؟ کون ہے اور......کیوں......مجھ سے ملنا چاہتا ہے؟" اس نے حیرت سے سوچا۔

آدھے گھنٹے بعد گیٹ بیل بجی۔چوکیدار نے اس کو انٹر کام پر آنے والے کا نام بتایا اور اندر بھیج دیا۔

"السلام وعلیکم!......ڈاکٹر رمیض نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا اور قدرے حیرت سے فریحہ کی جاذب نظر اور دلکش شخصیت کی جانب دیکھنے لگا۔

آیئے تشریف لایئے۔فریحہ اسے ڈرائنگ روم میں لے کر چلی گئی اور اسے صوفے پر بیٹھنے کو کہا۔

ڈاکٹر رمیض نے پرستائش نگاہوں سے ارد گرد دیکھا۔

"میں اماں کو چائے کا کہہ کر آتی ہوں" وہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئی اور ڈاکٹر رمیض حیرت سے اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہ گئے۔

وہ تھوڑی دیر بعد کمرے میں دوبارہ واپس آئی۔"جی......فرمایئے......آپ کس سلسلے میں مجھ سے ملنا چاہتے تھے؟" فریحہ نے ڈاکٹر رمیض کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"مسز دانش......میں......" ڈاکٹر رمیض نے کچھ کہنا چاہا۔

"میرا نام فریحہ ہے......جس ریفرنس سے آپ مجھے بلا رہے ہیں......مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں" فریحہ نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔

"میں نہیں جانتا کہ اس صورت حال میں کیا کہنا مناسب ہے اور کیا نہیں......لیکن......کیا آپ مجھے تھوڑی دیر کے لئے اس بات کی اجازت دیں گی کہ میں ڈاکٹر صاحب کے بارے میں کچھ بات کر سکوں" ڈاکٹر رمیض نے اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا تو فریحہ نے چونک کر ڈاکٹر رمیض کی جانب دیکھا اور خاموش ہو گئی۔

اماں چائے کی ٹرالی لے کر آئی اور فریحہ نے چائے بنا کر کپ اس کے سامنے رکھا۔

"تھینک یو......" ڈاکٹر رمیض نے چائے کا کپ پکڑتے ہوئے کہا اور اس کی جانب استفہامیہ انداز میں دیکھنے لگا۔

"میڈم......کیا آپ کو معلوم ہے کہ ڈاکٹر صاحب کہاں ہیں اور کن حالات میں ہیں؟" ڈاکٹر رمیض نے آہستہ آواز میں پوچھا۔

"نہیں......اور نہ ہی میں جاننا چاہتی ہوں" فریحہ نے جواب دیا۔

فریحہ کی گفتگو سے ڈاکٹر رمیض کو اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ دونوں کے تعلقات خوشگوار نہیں تھے اور فریحہ ان کے ذکر سے ہی بیزار نظر آ رہی تھی۔

"میڈم......ڈاکٹر صاحب کو ہماری......آئی مین......آپ کی کیئر اور مدد کی بہت ضرورت ہے......میں ان سے انگلینڈ میں ملا تھا۔وہ بہت مشکل میں ہیں......بہت کرائسس میں ہیں۔ہم ان کو زندگی کی طرف واپس لانا چاہتے ہیں؟" ڈاکٹر رمیض نے قدرے ٹھہر ٹھہر کر کہا اور اس لمحے ان

کو اپنے ہی الفاظ بڑے بے وزن معلوم ہو رہے تھے کیونکہ فریحہ کے لئے وہ بہت غیر اہم اور معمولی تھے۔ وہ ان کو سننا ہی نہیں چاہتی تھی۔

''سوری...... میں اس سلسلے میں آپ کی کچھ بھی مدد نہیں کر سکتی...... وہ شخص میرے لئے مر چکا ہے اور ہم اس کے لئے'' فریحہ غصے میں بولی۔

''میڈم...... آپ کے اختلافات کی نوعیت کیا ہے...... مجھے معلوم نہیں...... اور نہ ہی میں جاننا چاہتا ہوں۔ صرف انسانیت کے ناتے آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ بیمار ہیں اور......'' ڈاکٹر رمیض نے مزید کچھ کہنا چاہا۔

''اور...... میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ اس کو سنبھالوں...... پلیز...... آپ انہیں کسی ہاسپٹل میں ایڈمٹ کرا دیں تو بہتر ہے...... آپ مجھے اس شخص کے لئے کسی طرح بھی کنونس نہیں کر سکتے'' فریحہ نے دوٹوک لہجے میں کہا اور ڈاکٹر رمیض نے انتہائی مایوسی سے اس کی جانب دیکھا اور کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر پریشانی اور اداسی کے تاثرات نمایاں ہونے لگے فریحہ کو اس کی مایوس آنکھیں پریشان کرنے لگیں۔

''آپ دانش کے بارے میں کتنا جانتے ہیں؟'' فریحہ نے اچانک سوال کیا۔

''کچھ خاص نہیں...... بس اتنا کہ وہ ہمارے ملک کے قابل فخر ڈاکٹر اور بہت جینئس سرجن ہیں...... ایک حادثے نے ان کو شدید ذہنی دھچکا لگایا اور ان کی پرسنالٹی damage ہونے لگی...... میں اور ڈاکٹر محسن زیدی چاہتے ہیں کہ وہ دوبارہ ملک واپس آ کر نارمل زندگی گزاریں۔ وہ ایسے لائق انسان ہیں جس سے انسانیت کو بہت فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ ایسے انسان بہت نایاب اور قیمتی ہوتے ہیں۔ ان کی فیملی کو اور اردگرد کے لوگوں کو ان کی قدر کرنی چاہیے'' ڈاکٹر رمیض نے قدرے جذباتی انداز میں کہا۔

''آپ نے کبھی بہت خوبصورت اور عالیشان عمارت کی چھت کو موسم کی پہلی طوفانی بارش میں گرتے دیکھا ہے؟'' فریحہ نے معنی خیز انداز میں سوال کیا۔

''کیا مطلب......؟'' ڈاکٹر رمیض نے چونک کر پوچھا۔

''وہ چھت اندر سے مضبوط نہیں ہوتی...... اس میں استعمال ہونے والا میٹریل ناقص ہوتا ہے اور وہ موسم کی پہلی سختی ہی برداشت نہیں کر پاتی، گر جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ساری عمارت تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ کچھ انسان بھی اندر سے ایسے ہی ناقص ہوتے ہیں...... ظاہری طور پر بہت شاندار اور پرکشش مگر اندرونی طور پر...... بہت......'' فریحہ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''کیا ڈاکٹر دانش......؟'' ڈاکٹر رمیض نے کچھ کہنا چاہا۔

''آپ ایک اچھے انسان معلوم ہوتے ہیں جو ایک اجنبی انسان کے لئے دل میں بہت نرم گوشہ اور نازک احساسات رکھتے ہیں...... آپ ان کی مجھ سے بہتر انداز میں کیئر کر سکتے ہیں'' فریحہ نے سنجیدگی سے کہا۔

''کیا آپ کے دل میں ان کے لئے کوئی نرم گوشہ نہیں'' ڈاکٹر رمیض نے پوچھا۔

''نہیں......'' اس نے قطعیت سے جواب دیا۔

''جس شخص سے اتنی قربت رہی ہو...... کیا اس سے اتنی نفرت بھی کی جا سکتی ہے؟'' ڈاکٹر رمیض نے حیرت سے پوچھا۔

''کیا آپ کی شادی ہو گئی ہے؟'' فریحہ نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''جی...... ہاں...... دو ماہ قبل......''

''آپ نے اپنی وائف کو کیسا پایا؟''

''بہت اچھا......''

''کیا آپ ان سے جدا ہونا چاہیں گے؟''

''کبھی بھی نہیں'' ڈاکٹر رمیض نے جواب دیا۔

''کیوں......؟'' فریحہ نے حیرت سے پوچھا۔

''اس لئے کہ میں ورد یہ سے بہت محبت کرتا ہوں''

''کیا صرف محبت کی خاطر...... آپ انہیں چھوڑنا نہیں چاہیں گے؟'' فریحہ نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......''

اور اگر یہی دل محبت کی بجائے نفرت سے بھر جائے تو......؟

''یہ ناممکن ہے......''

''سب کچھ ممکن ہے...... دلوں کو اور ذہنوں کو بدلتے ذرا بھی دیر نہیں لگتی...... خدا کرے ایسا کبھی نہ ہو...... لیکن اگر آپ کو زندگی میں کسی ایسے مرحلے کا سامنا کرنا پڑا تو مجھے ضرور یاد کیجئے گا...... کہ جس کے دل میں صرف ایک شخص کے لئے محبت کی بجائے نفرت بھری ہے...... اگر محبت طاقتور ہوتی ہے تو نفرت بھی شدید تر ہوتی ہے...... اس سے بھی فرار ممکن نہیں'' فریحہ نے جواب دیا۔

ڈاکٹر رمیض نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا اور خدا حافظ کہہ کر لوٹ آیا۔ اس کا ذہن بہت الجھ گیا تھا۔ فریحہ اسے بہت سمجھدار اور باوقار عورت نظر آئی تھی...... اس کی باتوں میں وزن اور پختگی تھی اور ایسے لوگ محض نظریات کی بنیاد پر باتیں نہیں کرتے ان کی باتوں میں تجربہ کی جھلک نمایاں ہوتی ہے اور اس کو اتنا تلخ تجربہ ہوا تھا کہ وہ ایک لمحے کے لئے بھی ڈاکٹر دانش کے لئے نرم لب و لہجے میں نہیں بولی تھی۔

''کیا ڈاکٹر دانش اس سے مختلف انسان ہیں جو وہ نظر آتے ہیں'' وہ وسوسوں کا شکار ہونے لگا تھا۔ وہ ڈاکٹر دانش کو کہاں رکھے گا......؟ کیا ایک انسان اپنے بیوی بچوں کے لئے اتنا ناقابل قبول بھی ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر دانش کے آنے میں صرف دو دن باقی تھے اور ڈاکٹر محسن زیدی نے کس قدر مشکل سے ان کی بیوی کا ایڈریس لے کر اسے دیا تھا اور وہ بہت پر امید ہو کر ان سے ملنے آئے تھے مگر فریحہ کے رویے سے مایوس ہو کر لوٹ رہے تھے۔ وہ ڈاکٹر محسن کو کیسے بتائیں گے کہ ان کی بیوی تو ان کا ذکر بھی سننا نہیں چاہتی...... وہ کس قدر مشکل میں پھنس گئے تھے۔ وہ اپنی ہی سوچوں میں گم گاڑی ڈرائیو کر رہے تھے جب ڈاکٹر محسن زیدی کا فون آ گیا اور وہ مسز دانش کے بارے میں پوچھنے لگے۔ ڈاکٹر رمیض نے ان کو ساری صورت حال کے بارے میں بتایا تو وہ بھی پریشان ہو گئے۔

"آپ رات کو میرے ہاسپٹل آ جائیے...... پھر بات کریں گے" ڈاکٹر محسن زیدی نے کہہ کر فون آف کر دیا۔

"یہ مسئلہ تو بہت گھمبیر ہے...... ڈاکٹر دانش پہلے ہی شدید ذہنی اذیت میں مبتلا رہے ہیں...... اور اگر ان کی فیملی بھی ان کو نہیں اپنائی تو وہ مزید مضطرب ہو جائیں گے کہیں وہ پھر بکھر نہ جائیں" ڈاکٹر محسن زیدی نے فکر مندی سے کہا۔

"میں بھی یہی سوچ کر پریشان ہو رہا ہوں" ڈاکٹر رمیض نے جواب دیا۔

"کیا آپ نے ان کی مسز کو ان کی بیماری کے بارے میں تفصیل سے نہیں بتایا؟" ڈاکٹر زیدی نے پوچھا۔

"سر...... ان کی زندگی میں ڈاکٹر دانش کے لئے ذرا سی بھی گنجائش نہیں......" ڈاکٹر رمیض نے کہا۔

"یہ تو بہت پریشان کن بات ہے...... انسان کے دکھ اور تکلیف کا سب سے زیادہ اثر اس کے اپنوں پر ہوتا ہے۔ اس کو اذیت میں دیکھ کر وہ سارے شکوے اور رنجش بھول جاتے ہیں اور جو پھر بھی نہیں بھول پاتے وہ ضرور اس کی کوئی اسٹرونگ وجہ ہوتی ہے...... بہر حال یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے...... ہم کیسے ان کو مجبور کر سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ اپنے ہاسپٹل کی انیکسی میں ان کے لئے کوئی جگہ دیکھیں جہاں وہ بہتر طریقے سے قیام کر سکیں...... ان کو ہماری توجہ کی بہت ضرورت ہو گی" ڈاکٹر زیدی نے ہمدردانہ انداز میں کہا۔

"سر...... میں اپنے گھر میں ایک کمرہ ان کے لئے صاف کرا لیتا ہوں...... ہمارے گھر میں ایک گیسٹ روم بھی ہے" ڈاکٹر رمیض نے کہا۔

"یہ تو بہت اچھا ہے...... اس سے بہتر انتظام کہیں اور نہیں ہو سکتا۔ ان کی فلائٹ کا کیا ٹائم ہے؟" ڈاکٹر زیدی نے پوچھا۔

"پرسوں رات بارہ بجے" ڈاکٹر رمیض نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے میں اپنے چند ڈاکٹر دوستوں کے ساتھ ایئر پورٹ پر جاؤں گا۔ ہم ڈاکٹر دانش کا بھرپور استقبال کریں گے" ڈاکٹر زیدی نے مسکرا کر کہا تو ڈاکٹر رمیض بھی مسکرانے لگے۔

......❁......

## (11)

نگار بیگم نے رینا کو جو سزا دی تھی اس نے اس کے ذہن پر بری طرح اثر کیا تھا۔ وہ نگار بیگم کے بارے میں منفی سوچنا شروع ہو گئی تھی...... اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ نگار بیگم کی اتنی خدمت رائیگاں گئی تھی۔ وہ جو خواب آنکھوں میں سمائے نگار بیگم کے پیچھے آئی تھی...... وہ خواب چکنا چور ہو رہے تھے...... وہ مایوسی کے عالم میں رات کو اپنے کمرے میں بیٹھی گزشتہ دنوں کے واقعات کے بارے میں سوچ رہی تھی...... آج نگار بیگم کا مجرا تھا اس لئے سب لوگ سر شام ہی اس خاص محفل کے اہتمام میں لگے تھے اور آج مہمان شخصیت بھی کوئی خاص آدمی تھا...... جو بیرون ملک سے آیا تھا...... اور اس کے کسی کزن نے جو کہ ایک وفاقی وزیر تھا۔ اس خاص محفل کا اہتمام کروایا تھا اس لئے تیاریاں بھی خاص ہو رہی تھیں...... محفل اپنے عروج پر تھی...... اور وہ اپنے کمرے میں بیٹھی ان تمام واقعات کے بارے میں سوچ رہی تھی جو جونک کی مانند اس کے دماغ کے اندرونی خلیوں سے چمٹ گئے تھے اور جن کو کھرچ کر نکالنا اس کے بس سے باہر تھا...... اسے اپنی بے عزتی کا احساس چین نہیں لینے دے رہا تھا...... بار بار اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے نمودار ہو رہے تھے...... اسے وہ رات یاد آ گئی تھی...... جب وہ بھوک اور پیاس سے نڈھال ہو کر فرش پر گر گئی تھی...... اور اس کا سر کمرے میں رکھی شیشے کی ٹیبل سے بری طرح ٹکرایا تھا اور وہ خون میں لت پت ہو گئی تھی۔ اگلے روز چمن بیگم اسے اٹھانے آئی تو اس کی حالت دیکھ کر گھبرا گئی اور اسے فوراً ہسپتال لے جایا گیا...... دو دن وہ ہسپتال میں رہی۔ سر میں کئی ٹانکے لگے اور نگار بیگم اسے دیکھنے ایک بار بھی ہسپتال نہیں گئی تھی اور اس بات نے رینا کے دل میں نگار بیگم کے لئے منفی احساسات پیدا کر دیئے تھے...... اور جب وہ ٹھیک ہو کر واپس آئی تو نگار بیگم نے اسے دیکھ کر منہ موڑ لیا۔

"یہ سزا تمہاری زندگی میں پہلی اور آخری ہونی چاہیے...... بہتر یہی کہ تم اس سے سبق سیکھ لو...... ہمارے ہاں نہ سزائیں دینے کا رواج ہے اور نہ ہی چوری کرنے کا...... اور اگر کبھی کبھار کوئی ایسا جرم کر لیتا ہے تو پھر وہ ہماری سزا سے نہیں بچ سکتا" نگار بیگم نے گویا اسے واشگاف الفاظ میں دھمکی دے دی تھی اور اس کے بعد وہ مزید محتاط ہو گئی تھی...... استاد چندو خان جب بھی نظر آتے وہ راستہ بدل لیتی...... چمن بیگم کی نظروں سے بھی بچنے کی ہر ممکن کوشش کرتی...... نگار بیگم کے کام پہلے جس توجہ اور لگن سے کرتی تھی اب اس کے اندر سے وہ دلچسپی اور شوق ختم ہو رہا تھا۔ وہ نگار بیگم کی نظروں سے خائف رہنے لگی تھی...... اس کے اندر بہت تلخی اور مایوسی پیدا ہو گئی تھی اور یہ مایوسی اسے کچھ کرنے پر ابھار رہی تھی کہ وہ وہاں سے بھاگ جائے مگر اسے یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ وہاں سے بھاگنا نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی آسان...... وہ اپنے چھوٹے سے کمرے کو بغور دیکھنے لگی جس میں صرف ایک پلنگ کی جگہ تھی...... اور اس کے ساتھ چھوٹا سا باتھ روم...... نہ کوئی کھڑکی نہ کوئی روشن دان...... اکثر اس کا دم وہاں پر گھٹتا تھا مگر وہ کسی سے کچھ نہ کہتی...... نگار بیگم کو سب خبر تھی...... اور انہوں نے خود ہی اس کے لئے یہ کمرہ منتخب کیا تھا، یہ کمرہ نگار بیگم کے اپنے بیڈ روم سے قدرے ہٹ کر چند

کمروں کے پیچھے تھا..... رینا جہاں کہیں بھی جاتی نگار بیگم کی نظریں اس پر ہوتیں اور نگار بیگم کی نظروں سے بچ کر کہیں جانا اس کے لئے ممکن نہیں تھا..... صرف اس رات جب وہ درگاہ سے ہو کر آتی تھی..... جب کمرے کا دروازہ بند ہوتا تھا..... ورنہ کھلا ہی رہتا یا پھر جب کوئی خاص مہمان شب گزاری کے لئے آتا تو تیسری منزل پر ایک خاص مہمان خانے میں اسے ٹھہرایا جاتا..... اور نگار بیگم اس رات اپنے کمرے سے غائب ہوتیں..... نگار بیگم اپنے مخصوص کمرے میں کبھی کسی مہمان کو نہ لاتیں..... اور نہ ہی کسی کو اجازت ملتی کہ وہ کبھی اس کمرے کی طرف رخ بھی کرے۔ رات گہری ہو رہی تھی۔ گھنگھروؤں کی جھنکار اور نگار بیگم کی رقص و سرور کی محفل عروج پر تھی۔ رینا کا دل بہت پریشان ہو رہا تھا۔ وہ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ ہر طرف گہری تاریکی تھی ..... اور اس تاریکی کو گھنگھروؤں کی جھنکار بری طرح جھنجھوڑ رہی تھی۔ اس کا دل کسی سے بات کرنے کو چاہ رہا تھا اپنے دل کی باتیں اور غم بتانے کو..... وہ پیچھے بالکونی میں جا کر کھڑی ہو گئی اور طوائفوں کے کمروں کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگی ایک کونے میں دو تین طوائفیں باتیں کر رہی تھیں..... وہ بالکونی میں سے کھسکتی ہوئی اس کونے میں پہنچ گئی جہاں لان میں کھڑی طوائفوں کی باتیں سنی جا سکتی تھیں..... اسے ان کے چہرے واضح طور پر نظر نہیں آ رہے تھے۔

''آج کی رات تو نگار بیگم کے وارے نیارے ہو جائیں گے..... سنا ہے امریکہ سے خاص مہمان آیا ہے..... خاص طور پر نگار بیگم کا رقص دیکھنے کے لئے'' ایک نے کہا۔

''نگار بیگم کے یہاں ہوتے ہوئے کوئی خاص مہمان، بھلا کہیں اور جانے کی جرأت بھی کر سکتا ہے.....'' دوسری نے جواب دیا۔

''کیا مطلب.....؟'' تیسری نے حیرت سے پوچھا۔

''شیریں بائی..... جیسے تم تو جانتی نہیں..... نگار بیگم کہاں یہ برداشت کرتی ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے کوئی اور طوائف آگے نکل جائے..... جانتی نہیں نغمہ بائی کا انجام..... واہ کیا رقص کرتی تھی۔ اٹھارہ سال کی عمر میں اس نے اس کوٹھے کا نام روشن کر دیا تھا..... بڑے بڑے لوگ اس کا رقص دیکھنے کے لئے خاص طور پر آتے تھے۔ کندن بیگم زندہ تھیں..... نگار بیگم، نغمہ بائی سے خائف رہنے لگی تھیں..... اور پھر اچانک نغمہ بائی کہیں گم ہو گئی آج تک کسی کو معلوم نہیں ہو سکا وہ کہاں گئی..... ؟ مر گئی یا اسے زمین کھا گئی۔ نگار بیگم کسی اور کو اپنے سے بڑھتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی..... سنا نہیں..... استاد چندو نے رینا کی تعریف کی..... تو..... نگار بیگم نے اسے کتنی سزا دی۔ بیچاری..... مجھے تو اس پر ترس آتا ہے..... نجانے کیوں وہ یہاں آ گئی..... ؟ اس سے تو وہ بھکارن ہی بہتر تھی.....'' تیسری نے کہا۔

''کاش ہم سے پوچھتی تو ہم اسے بتاتے..... کہ..... یہاں کیا کچھ ہوتا ہے..... یہاں ریشمی پردوں اور رنگ برنگی شیشوں کے پیچھے کیسے زندہ لاشیں بکتی ہیں..... کسی کو کیا معلوم.....؟'' پہلی نے نم آنکھوں کے ساتھ کہا۔

''ہم تو نجانے کن گناہوں کی سزا یہاں بھگت رہی ہیں..... زخمی دل لیے جسموں پر خوبصورت پوشاکیں پہنے، میک اپ کی تہوں کے نیچے نجانے کتنے غم چھپائے رکھتی ہیں..... کاش کوئی ہمارے دلوں کے اندر جھانک سکے..... ہماری روحیں کتنا سسکتی رہتی ہیں..... کاش کوئی ان کی آہوں اور سسکیوں کو سن سکے.....'' دوسری طوائف نے کہا اور رونا شروع ہو گئی.....

''چپ کرو...... فضہ بائی...... ہم اپنی قسمتوں سے لڑ تو نہیں سکتے...... اور لڑیں بھی...... تو...... کس بنیاد پر...... نہ ہمارے پاس گھر ہیں...... نہ رشتے اور...... نہ ہی......'' شیریں بائی نے آہ بھر کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''ہماری بنجر، سوکھی اور ویران زندگیوں میں کبھی ایسی دستک نہیں ہوئی...... جس کے انتظار میں ہم زندگی کے یہ تلخ لمحات گزارنے پر مجبور ہیں......'' تیسری طوائف نے کہا۔

''ہم بہت بے بس ہیں...... جیسے کسی بھنور میں پھنس گئے ہوں...... نہ اس بھنور سے نکل پاتی ہیں...... اور...... نہ ہی کوئی بچانے آتا ہے۔ نہ منزل نظر آتی ہے اور نہ ہی کوئی نشانِ منزل ہے'' شیریں بائی افسردگی سے بولی۔

''اور ہمیں زیادہ بے بس نگار بیگم نے بنا دیا ہے...... کسی اور کے کوٹھے پر طوائفوں پر ایسی سختیاں نہیں کی جاتیں جیسی...... ہم پر...... اس نے تو ہمارے ہاتھ پاؤں کاٹ رکھے ہیں...... سننے میں یہ بھی آیا ہے کہ نغمہ بائی کا کسی سے چکر تھا...... وہ نغمہ بائی سے شادی کرنا چاہتا تھا...... اور...... نگار بیگم نے کندن بیگم کے ایسے کان بھرے کہ اسے قتل کروا دیا...... اس کے بعد نغمہ بائی غائب ہو گئی...... کوئی کہتا ہے...... وہ خود ہی چلی گئی...... کوئی کہتا ہے کہ نگار بیگم نے اسے ٹھکانے لگوا دیا......'' فضہ بائی نے بتایا۔

''نگار بیگم...... اتنی مرد بیزار کیوں ہے......؟'' تیسری طوائف نے حیرت سے سوال کیا۔

''معلوم نہیں...... ہو گی...... کوئی وجہ......'' فضہ بائی نے کہا۔

''میں نے کئی بار سوچا...... یہاں سے چلی جاؤں مگر...... پورے علاقے میں نگار بیگم اور اس کی طوائفوں کی جو عزت ہے وہ کہیں اور نہیں۔ یہ بات تو ماننی پڑے گی کہ نگار بیگم نے اپنے اس فن اور پیشے میں نام بنا رکھا ہے...... وہ نہ تو طوائفوں کو اتنا بکاؤ مال بناتی ہے اور نہ خود بنتی ہے......'' فضہ بائی نے کہا۔

ریبنا نے اپنے پیچھے قدموں کی چاپ سنی تو اس کا دل دہل گیا اور وہ دبک کر ایک اندھیرے کونے میں بیٹھ گئی...... اس کا دل ڈوبنے لگا اور سانس تیز ہونے لگی...... قدموں کی چاپ جیسے ہی کم ہوئی وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے چپکے سے اپنے کمرے میں آ گئی...... اپنے کمرے میں آ کر اس نے سکون کی سانس لی اور آنکھیں بند کر کے بستر پر لیٹ گئی۔

☆

بے بی کے مرنے کے بعد نرگس کا برا حال تھا...... وہ ہر دم روتی رہتی تھی...... فردوس اور جمی اسے چپ کراتے...... اسے تسلیاں دیتے مگر وہ کسی طرح بھی مطمئن نہ ہوتی۔

''آپا...... اب حوصلہ کر...... ہمت کر...... رب کو یہی منظور تھا...... ہم کیا کر سکتے ہیں...... کیوں رو رو کر ہلکان ہو رہی ہے...... تو بھی مر گئی...... تو پھر ہم کیا کریں گے؟'' فردوس نے نرگس کے آنسو اپنے دوپٹے سے پونچھتے ہوئے کہا۔

''اے...... فردوس...... کیسے چپ کروں...... رب کو میری ایک خوشی نہ بھائی...... اس نے میری گود ہی اجاڑ دی...... مجھے یوں لگتا تھا جیسے

بے بی میری ہی اولاد ہو...... میں نے ہی اس کو پیدا کیا ہو...... ہائے کیسے بھولوں...... اپنے ان ہاتھوں سے اس کو کھلاتی رہی...... وہ کیسی پیاری پیاری باتیں کرتا تھا...... آئے...... ہائے...... میں...... مر جاؤں...... اس کے بغیر تو مجھے سانس لینا بھی اچھا نہیں لگ رہا...... اے فردوس دیکھ...... یہاں ادھر...... میری گود میں سوتا تھا...... میرے سینے سے لگتا تھا...... میرے ساتھ سوتا تھا...... میں تو اپنے سارے غم بھول گئی تھی...... جب سے وہ ملا تھا...... یوں لگتا تھا...... رب نے ہمیں بڑھاپے کا سہارا دے دیا ہو...... مگر رب نے خوشی دے کر چھین لی...... اگر اس نے اسے مجھ سے چھیننا ہی تھا...... تو پھر دیا ہی کیوں؟ فردوس تو نہیں جانتی...... اس کے بغیر مجھے کچھ سوجھتا ہی نہیں...... یوں لگتا ہے جیسے وہ مجھے بلا رہا ہو...... مجھے کتنے پیار سے بلاتا تھا...... سارے صحن میں اماں، اماں کرتے دوڑتا پھرتا تھا...... ابھی تو اس کے کھلونے بھی نہیں ٹوٹے...... اور...... وہ خود چلا گیا......'' نرگس دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

''آپا...... بس کر...... ہمت کر...... رب کے سامنے ہم سب بے بس ہیں۔ ہم کیا کر سکتے ہیں...... قسم...... تیری جان کی...... اگر میرے بس میں ہوتا تو میں اپنا سب کچھ بیچ کر اسے تیرے پاس لے آتی...... مگر وہ گیا ہی ادھر ہے...... جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا...... تو پھر ہم کیا کر سکتے ہیں...... سوائے چپ رہنے کے'' فردوس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''فردوس...... صبر ہی تو نہیں آتا...... کیا کروں......؟ تم سب میرے پاس تب آئے تھے جب جوان تھے...... شامو پندرہ برس کا تھا...... میں نے تو بچے کی محبت دیکھی ہی نہیں تھی...... اس نے تو میرے اندر ممتا جگا دی...... فردوس تو کیا جانے...... ماں کا دکھ...... ماں کا کلیجہ کتنا پھٹتا ہے جب اس کے بچے کو تکلیف ہوتی ہے...... ارے میرا بچہ تو میرا دل ہی چیر گیا ہے...... کیا کروں...... کیسے اپنے پھٹے کلیجے کو سیوں...... ہائے...... صبر نہیں آتا'' نرگس اپنے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے بین کرنے لگی۔

''آپا...... اس کی اصل ماں کو بھی تو دیکھ...... جس نے اس کو جنم دے کر کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیا...... دیکھ اس میں بھی تو کتنا حوصلہ تھا......'' جمی نے منہ بنا کر قدرے شاکی لہجے میں کہا۔

''ارے جمی...... پہلے میں بھی اس کی ماں کو گالیاں دیتی تھی...... مگر اب سوچتی ہوں...... وہ ضرور مجبور ہوگی...... دنیا کی کوئی ماں بھی اپنے بچے کو یوں نہیں پھینک سکتی...... اور اس ماں نے تو اسے اتنے مہینے اپنے پیٹ میں رکھ کر پالا...... وہ...... کیسے اس کی دشمن ہو سکتی ہے...... وہ مجبور ہوگی...... ہائے...... تم کیا جانو...... ماں کے دل کو'' نرگس اونچی آواز میں واویلا کرنے لگی۔

''اب...... ایسا کب تک چلے گا...... زندگی تو گزارنی ہے...... نا۔ ہمیں اپنے دھندے پر بھی جانا ہے...... اس کے بغیر ہم کیسے زندہ رہ سکتے ہیں'' فردوس نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''فردوس...... میرا بچہ مر گیا ہے...... اور...... تو مجھے ناچ گانے پر جانے کو کہہ رہی ہے...... نہ...... مجھ سے یہ سب نہیں ہوتا...... اری مجھ میں تو ہمت ہی نہیں رہی...... اس نے تو میری کمر توڑ کر رکھ دی ہے...... میں کیسے دوسروں کے بچوں کو لوریاں دینے جاؤں...... کیسے کسی شادی شدہ جوڑے کو اولاد کی خوشیوں کی مبارکباد دوں...... نہ...... فردوس میں یہ نہیں کر سکتی'' نرگس آہ بھر کر بولی۔

''آپا...... بے بی کو مرے دو ماہ ہو گئے ہیں...... اور...... تو آج بھی اسی طرح رو رہی ہے...... جیسے وہ آج مرا ہے...... میں تو یہ کہہ رہی ہوں اب اپنے آپ کو ٹھیک کر...... ہمارا کون والی وارث ہے جو ہمیں بٹھا کر کھلائے گا...... ہمیں اپنے پیٹ کا ایندھن خود ہی کمانا پڑتا ہے...... میں اور جمی کہاں تک کام کریں...... شامو بھی چلا گیا ہے...... اس نے بھی کبھی مڑ کر خبر نہ لی کہ ہم کس حال میں ہیں...... بڑا ہی بے غیرت نکلا...... خود غرض...... بے وفا...... بد لحاظ......'' فردوس اسے کوسنے لگی۔

''اری...... فردوس اسے کاہے کو گالیاں بک رہی ہے...... ہم نے کونسا اس کے ساتھ اچھا کیا...... جھٹ اسے گھر سے نکال دیا یہ بھی نہ دیکھا کہ رات کتنی ٹھنڈی ہے وہ کہاں جائے گا...... شاید مجھے شامو کی ہی بددعا لگ گئی ہو...... اور...... میرا بے بی مر گیا ہے...... وہ بے بی کو بہت ناپسند کرتا تھا...... اس لئے کہ میں بے بی کو بہت چاہتی تھی۔ بے بی سے پہلے تو شامو ہی میرا سب کچھ تھا۔ وہ بے بی کے آنے کے بعد مجھ سے بہت الجھنے لگا تھا...... نجانے کیوں مجھے یہ لگتا ہے کہ شامو نے بے بی کو کوئی بددعا دی ہو گی اسی لیے وہ مر گیا ہے......'' نرگس کسی الجھن کا شکار ہو کر بولنے لگی۔

''نہیں آپا...... یہ تیرا وہم ہے...... بھلا شامو کیوں بے بی کو بددعائیں دے گا...... شامو ہر گز ایسا نہیں ہو سکتا...... اور تو اپنے ذہن پر بوجھ مت ڈال...... شامو چلا گیا...... اور...... بے بی بھی چلا گیا ہے کسی دن میں...... تم...... اور جمی بھی چلے جائیں گے......'' فردوس نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''فردوس...... خدا کے لئے اب کسی کے جانے کی بات نہ کر...... اب میں...... ہر گز یہ برداشت نہیں کر سکوں گی...... مر جاؤں گی...... اب کوئی گیا...... سنا...... تو نے'' نرگس نے مشتعل ہو کر اپنے سر کے بالوں کو نوچنا شروع کر دیا۔

''آپا...... کیا کر رہی ہو...... باؤلی نہ ہو...... تو...... ہم تمہیں چھوڑ کر بھلا کہاں جا سکتے ہیں......؟ میں تو رب کی بات کر رہی تھی...... اس نے بلایا...... تو...... پھر...... تو جانا ہی پڑے گا'' فردوس نے کہا۔

''نہیں اب میں رب کے پاس بھی کسی کو نہیں جانے دوں گی...... اب وہ پہلے مجھے بلائے گا...... پھر کسی اور کو...... اب میرے دل اور کلیجے میں کسی کی جدائی برداشت کرنے کی طاقت نہیں'' نرگس پھر رونے لگی تو فردوس نے اس کو اپنے گلے کے ساتھ لگا لیا۔

''آپا...... چپ کر...... کوئی کسی کو چھوڑ کر نہیں جائے گا...... تو بے فکر رہ'' فردوس نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''اور...... نہیں...... تو...... کیا...... سب اکٹھے ہی دریا میں کود کر مر جائیں گے...... کیوں فردوس...... ٹھیک کہہ رہا ہوں نا'' جمی نے قدرے مسکراتے ہوئے کہا تو دونوں اس کو دیکھ کر مسکرانے لگیں۔

''یہ ہوئی نا...... بات...... ایسی بات پر ایک دھمال ہو جائے...... اٹھ فردوس...... آج ایسا بھنگڑا ڈالیں گے کہ آپا بھی ہمارے ساتھ بھنگڑا ڈالنا شروع ہو جائے گی'' جمی نے فردوس کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... جمی...... یہ تو نے ٹھیک کہا...... ہو...... جا شروع...... سن کوئی ڈسکو گانا...... بولنا...... آپا کو ڈسکو گانے بڑے پسند تھے......'' فردوس نے ہنستے ہوئے کہا۔

اور دونوں نرگس کے گرد ناچنا شروع ہو گئے...... فردوس اپنی زنانہ مردانہ آواز میں لہک لہک کر گانا گاتے ہوئے ڈانس کرنے لگی اور جمی

گلے میں ڈھول ڈال کر اسے بے ہنگم انداز میں بجانے لگا......ان کی الٹی سیدھی حرکتیں دیکھ کر نرگس کی ہنسی نکل گئی اور اسے ہنستا دیکھ کر وہ اور جوش سے ناچنے اور گانے لگے......

''ارے بس......کرو......کیوں مجھے مارنے کا ارادہ ہے......'' نرگس نے لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے کہا۔

''آپا......ہم تو تمہیں ہرگز مرنے نہیں دیں گے......'' جمی نے چھیڑنے کے انداز میں کہا۔

''چل......نامراد......کیسی باتیں کر رہا ہے......شامو بھی اکثر ایسی چھیڑ خانی اور ہنسی مذاق کرتا تھا......'' نرگس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''آج تجھے شامو بہت یاد آ رہا ہے......خیر تو ہے'' فردوس نے دوپٹے سے اپنا چہرہ صاف کرتے ہوئے کہا جو بہت ناچنے کی وجہ سے تر ہو رہا تھا۔

''ہاں......نجانے کیوں......؟ آج وہ مجھے بڑا ہی یاد آ رہا ہے......فردوس کہیں سے اس کا پتہ تو کر......کہاں گیا ہے وہ......جب سے اس گھر سے گیا ہے......لوٹ کر ہی نہیں آیا......'' نرگس نے کہا۔

''یہاں سے جانے کے بعد سنا تھا......کہ......اس نے نائیوں کا کام شروع کیا تھا......کسی حجام کے ہاں ملازمت کرتا تھا'' جمی نے بتایا۔

''ہیں......یہ کیا کہہ رہے ہو اور تجھے کس نے بتایا؟'' نرگس نے حیرت سے پوچھا۔

''ایک لڑکے نے بتایا تھا وہ بھی اسی حجام کے پاس کام کرتا تھا......مگر میں نے اس کی بات دھیان سے نہ سنی کہ ہمیں اب اس سے کیا لینا دینا......'' جمی نے کہا۔

''کتنا بے وقوف نکلا......اپنا پیشہ چھوڑ کر دوسرا کام کرنے لگا......باؤلا......بڑا ہی سر پھرا نکلا......ہمیشہ اپنی من مانیاں کرتا تھا......جمی کسی طرح پتہ تو لگا کہ وہ گیا کہاں ہے......کیا اسی حجام کے پاس ابھی بھی کام کرتا ہے یا کہیں اور......؟'' نرگس نے التجائیہ انداز میں جمی سے کہا۔

''ٹھیک ہے......میں پتہ لگانے کی کوشش کروں گا......بس تو وعدہ کر......اب روئے دھوئے گی نہیں......'' جمی نے کہا۔

''ٹھیک ہے......تم لوگوں کے سامنے نہیں روؤں گی......اکیلے میں رونے سے تو منع نہ کر......سن جمی......مجھے بے بی بہت یاد آتا ہے......وہ پورے چار سال کا ہو کر مرا ہے......چار سالوں کو دو منٹوں میں کیسے بھلا دوں......بڑا ہی پیارا بچہ تھا......خود تو چلا گیا......مگر میرا اندر خالی کر گیا......کیسے بتاؤں......تم نہیں سمجھ سکو گے'' نرگس آہ بھر کر بولی۔

''ٹھیک ہے......تجھے اکیلے میں رونے سے منع نہیں کرتے مگر ہمارے سامنے مت رونا......بہت دل کٹتا ہے'' جمی نے کہا۔

''اچھا......مگر......تو نے اب اپنا وعدہ نہیں بھولنا......بس شامو کو ڈھونڈ نکال......میں اس سے معافی مانگنا چاہتی ہوں......میں نے اس کا دل دکھایا اور رب نے میرا دل دکھا دیا......بس مجھے وہم سا ہو گیا ہے......اور......جب تک شامو سے معافی نہیں مانگوں گی مجھے چین نہیں آئے گا'' نرگس نے کہا۔

''تو فکر نہ کر......فردوس آج اچھا سا کھانا بنا......بہت دنوں بعد آپا کا موڈ اچھا ہوا ہے......آج کی رات ہم جشن منائیں گے'' جمی نے

مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں......ٹھیک ہے......" فردوس نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا اور نرگس دونوں کو خوش دیکھ کر مسکرانے لگی۔

☆

برکتے پورے ایک ماہ سے مسلسل بخار میں جل رہی تھی...... بخار کا زور کسی طرح بھی کم نہیں ہو رہا تھا وہ چارپائی پر پڑی نظر ہی نہ آتی تھی۔ بخار اور کمزوری نے اس کو بدحال کر دیا تھا۔ جسم بخار کی تپش سے جلتا اور دل رانی اور منے کی جدائی میں تڑپتا رہتا...... اندر اور باہر ایسی آگ لگی ہوئی تھی جو کسی طرح بھی ٹھنڈی نہیں ہو رہی تھی۔ ملکا کسی وقت کہیں سے کوئی بخار کی گولی لے آتا تو اسے کھلا دیتا...... تھوڑی دیر کے لئے بخار کا زور ٹوٹتا پھر ویسے ہی بخار ہو جاتا۔ اتنے پیسے کسی کے پاس نہ ہوتے کہ اس کے لئے کسی ڈاکٹر سے دوا لاتے۔ سارے بچے دھندے پر چلے جاتے۔ ایک دن گڈی دھندے پر نہ جاتی اور اگلے دن شبو نہ جاتی...... گھر رہ کر وہ ماں کی دیکھ بھال کرتیں۔ برکتے چارپائی سے اٹھ کر ایک قدم بھی چل کر کہیں نہیں جا سکتی تھی۔

موسم بہت گرم ہو رہا تھا۔ سورج یوں آگ برسا رہا تھا جیسے سوا نیزے پر کھڑا ہو۔ جھگی کے اندر بلا کی گرمی اور تپش تھی۔ برکتے چارپائی پر لیٹی تڑپ رہی تھی...... مگر اس کی آنکھیں مسلسل جھگی کے دروازے پر تھیں...... گڈی کہیں سے پانی کا گھڑا بھر کر لائی......

"رانی...... تو...... آ گئی......؟" برکتے نیم بے ہوشی میں بولی۔

"اماں...... رانی...... کہاں سے آئے گی...... میں ہوں گڈی" دس سالہ گڈی نے کہا۔

"کون گڈی...... میری دھی کا نام تو رانی ہے...... تو...... کون ہے؟" برکتے نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"اے...... اماں...... تو بھی اچھا بولے ہے...... اب مجھے بھی بھول گئی...... کل کو ہم اور منو کو بھی بھول جانا...... مگر تو اسے نہیں بھولے گی...... جو تجھے چھوڑ کر چلی گئی" گڈی منہ بنا کر بولی۔

"کہاں چلی گئی......؟" برکتے نے آہ بھر کر پوچھا۔

"مجھے کیا پتہ......؟ آئے گی تو پوچھ لینا...... بتا اب کیا کھائے گی...... روٹی کھانی ہے تو پکا دوں......" گڈی نے پوچھا۔

"مجھے بھوک نہیں...... رانی کے لئے روٹی پکا دے...... اور...... سن منے کے لئے بھی دودھ بنا دیتا...... وہ بھی بھوکا ہے...... رو رہا تھا...... گڈی اس کو بھی دودھ ڈال دے...... دونوں ہی بھوکے ہیں...... رانی بھی اور منا بھی" برکتے نیم بے ہوشی میں بڑبڑاتی رہی۔

"اماں...... بخار نے تو تجھے پاگل ہی کر دیا ہے۔ پتہ نہیں کیا کیا بولے جا رہی ہے...... جا...... بولتی رہ...... میں تو سونے لگی ہوں...... ساری رات مچھر نہیں سونے دیتے اور صبح کو تیری باتیں......" گڈی مزاج کی تلخ تھی۔ بڑبڑا کر بولی اور نیچے فرش پر ایک پھٹا پرانا کپڑا بچھا کر سو گئی مگر برکتے کو نہ نیند آتی تھی اور نہ ہی چین...... وہ ہر سانس پر ہائے ہائے کرتی رانی اور منے کو یاد کرتی۔ اچانک بادلوں کا لشکر ٹکڑوں کی صورت میں سورج کے آگے پیچھے طواف کرنے لگا۔ بادلوں کی اوٹ میں چھپا سورج چمک کر اپنے ہونے کا احساس دلا رہا تھا اور بادل اس کی روشنیوں کے در پے تھے...... بادلوں اور سورج کی آنکھ مچولی سے زمین والے مسرور ہو رہے تھے کیونکہ آسمان پر بادلوں کی موجودگی خوش آئند تھی جو شعلے برساتے سورج کی

ہولناکی کو کچھ کم کرے گی...... دیکھتے ہی دیکھتے گرجتے بادل چھم چھم برسنے لگے...... سوکھی، بنجر اور تپتی زمین نے بارش کی پھوار پر سکھ کا سانس لیا۔ گرمی سے جھلسے ہوئے چہرے، سوکھے درخت اور پیاسے پرندوں نے فرحت محسوس کی...... سب نے سکون کا سانس لیا...... ہر طرف خوشی کی لہر دوڑ گئی...... مگر...... برکتے کے تپتے وجود نے آہ بھر کر آسمان کی طرف دیکھا۔ جگی کے چھیدوں میں سے برستے آسمان کو دیکھ کر سوچ میں پڑ گئی...... اگر...... نالہ بھر گیا...... تو...... ہم کہاں جائیں گے......؟ جگی کا فرش برستی بارش میں کیچڑ ہو گیا تھا جہاں قدم رکھتے تھے...... وہیں زمین سرکنے لگتی تھی اور مضبوط قدم بھی پھسلنے لگتے تھے...... گڈی بھی گھبرا کر اٹھ گئی۔ بادو باراں کا طوفان اس قدر شدید تھا کہ جگی کا کپڑا ہی اڑ گیا ان کا سارا سامان یوں بکھرا اور بھیگا پڑا تھا جیسے کوئی قافلہ سرعام لوٹ لیا گیا ہو...... اور بچا کھچا فالتو سامان چھوڑ دیا گیا ہو...... برکتے نے ایسی لٹی پٹی حالت دیکھ کر گھبراہٹ میں چیزوں کو سمیٹنے کی کوشش کی کہ اچانک پاؤں اس قدر زور سے پھسلا کر وہ تیورا کر زمین پر گر پڑی اور کراہنے لگی...... گڈی لپک کر اسے بچانے کو بھاگی اور بڑی مشکل سے اسے چارپائی پر لٹایا۔ وہ بے بسی سے ادھر ادھر دیکھنے لگی...... کوئی بندہ بشر، کوئی مسافر، کوئی ہمدرد، کوئی مددگار کہیں نظر نہ آیا۔ برکتے اونچی آواز میں درد سے بلبلانے لگی اور گڈی اپنی اور ماں کی لاچاری دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

وہ اس لمحے کس قدر بے بس اور مجبور تھیں...... یہ وہ جانتی تھیں...... انسان کس قدر کمزور اور بے بس ہے...... جب اپنے آپ کو لٹتے اور بکھرتے دیکھتا ہے تو کچھ کر نہیں پاتا...... وہ برستے آسمان تلے خاموشی سے کراہ رہی تھیں سوائے رونے کے ان کے پاس کرنے کو اور کچھ نہیں تھا...... اوپر آسمان ان کی بے بسی پر رو رہا تھا اور نیچے زمین اپنے آنسوؤں کا سیلاب اگل رہی تھی۔

''یا اللہ! میں کیا کروں...... ابے کو بھیج دے...... مٹھو اور جگو کو ہی بھیج دے'' اچانک گڈی کے دل سے دعا نکلی...... برکتے مسلسل کراہ رہی تھی...... تھوڑی دیر بعد بارش تھمنے لگی...... اور شام گئے ملکا، مٹھو، جگو اور دوسرے بچے گھر لوٹے...... اجڑی ہوئی جگی دیکھ کر سب گھبرا گئے...... برکتے کی کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی وہ درد سے چلا رہی تھی۔ ادھر سے نالے کا گندا بدبودار پانی اچھل اچھل کر ان کی جگی کی طرف آ رہا تھا۔

''ابا...... کیا کریں...... یہ تو بڑی مصیبت آ گئی ہے...... اور یہاں ہماری مدد کرنے کو بھی کوئی نہیں...... وہاں بستی تو اپنی تھی۔ ذرا سی بات ہوتی تھی سب دوڑے آتے تھے...... اور یہاں مدد تو کیا...... کوئی پوچھنے کو نہیں آتا......'' جگو غصے سے بولا۔

''تیرا کیا مطلب ہے...... ہم واپس چلے جائیں'' ملکے نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......'' جگو قدرے رعب سے بولا۔

''تو...... پاگل ہو گیا ہے...... ساری بستی کے لوگ منہ پر تھوکیں گے کہ پھر واپس آ گئے......'' ملکا غصے سے بولا۔

''ابا یہاں مرنے سے بہتر ہے کہ وہاں جا کر باتیں سن لیں...... یہاں مر گئے تو جنازہ پڑھنے بھی کوئی نہیں آئے گا......'' جگو نے کہا تو ملکا اس کی بات سن کر خاموش ہو گیا۔

''اور اگر سب نے پوچھا کہ رانی کہاں گئی ہے...... تو کیا کہیں گے؟'' ملکے نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

''کہہ دینا...... مر گئی ہے...... سینے سے مر گئی ہے...... وہ کون سا آ کر دیکھ لیں گے'' جگو نے غصے سے منہ بنا کر کہا۔

''مٹھو..... تو..... کیا کہتا ہے؟'' ملکے نے اس سے مشورہ چاہا۔

''ابا..... مجھو ٹھیک ہی کہتا ہے..... یہ بڑا حال تو دیکھ رہا ہے..... کوئی جگہ نہیں کہ رات کو کہیں سو سکیں..... وہاں ہوتے..... تو بستی کے سارے لڑکے مدد کو آ جاتے..... یہاں اماں بھی رانی کو ہی یاد کرتی رہتی ہے..... وہاں جا کر اس کا دل بھی کچھ بہل جائے گا'' مٹھو نے کہا۔

''مگر اس کو لے کر کیسے جائیں گے..... اس سے تو ایک قدم بھی چلا نہیں جا سکے گا'' ملکے نے کہا۔

''اس کو چارپائی پر اٹھا کر لے جائیں گے'' مٹھو نے رائے دی اور انہوں نے اسی وقت سامان اکٹھا کیا..... کراہتی درد سے بلبلاتی برکتے کو چارپائی پر ڈالا اور کچرے والے ایک ٹرالر کی منت سماجت کی جو ان کے شہر کی طرف جا رہا تھا۔ سب اس پر بیٹھ کر بستی میں واپس آ گئے۔ بستی میں ہر طرف ان کے واپس آنے کا شور مچ گیا..... سارے لوگ اکٹھے ہو گئے اور ان سے یوں ملنے آنے لگے جیسے وہ کسی ملک کا دورہ کر کے واپس آ رہے ہوں۔

''رانی کہاں ہے..... ؟ نظر نہیں آ رہی'' ہر ایک کی زبان پر یہی سوال تھا۔

''وہ..... وہ..... مر گئی ہے'' ملکا جواب دیتا تو درد سے کراہتی برکتے چونک کر اس کی طرف دیکھتی۔

''نہیں..... نہیں..... یہ جھوٹ بول رہا ہے..... میری رانی نہیں مر سکتی'' برکتے ایک دم چلانے لگی۔

''صدمے نے اس کے دماغ پر اثر کیا ہے..... وہ اسے بھول نہیں پائی.....'' ملکا جلدی سے جواب دیتا.....

''کیا اسے وہیں دفنا دیا.....؟''

''ہاں.....'' ملکا جواب دیتا۔

''رانی کا سن کر بہت افسوس ہو رہا ہے..... یقین نہیں آتا کہ وہ مر گئی ہے..... وہ تو بہت اچھی تھی..... سب سے بہت پیار کرتی تھی..... اسے کیسے بھولیں.....'' ہر کسی کی زبان پر رانی کے لئے دکھی الفاظ تھے..... سب رانی سے محبت اور ہمدردی کا اظہار کر رہے تھے اور ملکے کا خون غصے سے کھولنے لگا..... اس کے اندر غم و غصے کی لہر دوڑنے لگی..... وہ اندر ہی اندر رانی کو گالیاں بکتا.....

''کاش وہ مر ہی جائے تو بہتر ہے'' وہ دل میں اسے بددعا دیتا..... اور نم آنکھوں کے ساتھ آسمان کی طرف دیکھتا جو شاید اس کا پیغام رانی کے دل تک پہنچا رہا تھا۔

☆

رینا کا دل بری طرح بے تاب ہو رہا تھا۔ برسات کی اس رم جھم میں سب طوائفیں رنگ برنگے دوپٹے اوڑھے لان کی سرسبز گیلی گھاس پر ننگے پاؤں ایک دوسری کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر ناچ گا کر برسات کی آمد کی خوشیاں منا رہی تھیں..... برستی بارش میں ان کے کپڑے اور اوڑھنیاں بھیگ کر ان کے جسموں کے ساتھ چپٹ گئی تھیں..... گیلے بالوں کو کھول کر سکھایا جا رہا تھا.....

نگار بیگم نے برسات کی پہلی بارش کی خوشی میں باورچن کو خصوصی پکوان بنانے کو کہا تھا..... مختلف کھانوں کی سوندھی سوندھی خوشبو نے ساری حویلی کی فضا کو مہکا کر رکھ دیا تھا۔ نگار بیگم اپنے کمرے کی بالکونی میں سے نیچے طوائفوں کو ہنستے گاتے اور رقص کرتے دیکھ کر خوش ہو رہی تھی.....

حویلی کے سب مکین خوب خوشیاں منا رہے تھے...... چمن بیگم تو خوشی سے ادھر ادھر یوں اڑتی پھر رہی تھیں جیسے ان کے پاؤں میں کوئی پھرکی لگی ہو...... سب سے مسکرا مسکرا کر یوں بات کر رہی تھیں جیسے ان کی کوئی بڑی سی لاٹری نکل آئی ہو۔ سب ہی خوش تھے اور موسم سے لطف اندوز ہو رہے تھے مگر......

ریتا کا دل بہت گھبرا رہا تھا...... جیسے جیسے بارش تیز ہو رہی تھی۔ اسے اپنی جھگی یاد آ رہی تھی...... نجانے ہماری جھگی اپنی جگہ قائم بھی رہی ہو گی یا نہیں...... کہیں وہ نالے کے گندے پانی سے بھر نہ گئی ہو...... اگر ایسا ہوا ہوگا...... تو...... اماں کیا کرے گی...... بچے کہاں سوئیں گے اور ابا اپنے اپاہج وجود کو کہاں تک گھسیٹتا ہوگا...... گھر والوں کی یاد آتے ہی اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں...... اور...... اس کے دل سے دعائیں نکلنے لگیں۔

''یا اللہ! میرے گھر کو خیر سے رکھنا...... اماں...... ابے اور بچوں کو...... اتنی تیز بارش سے بچانا کہیں یہ ان...... کو...... برباد ہی نہ کر دے...... ان کو سیلاب کے پانی سے بچا......'' وہ بالکونی کی دیوار کے ساتھ ٹکٹکی باندھے آسمان کو دیکھتے ہوئے دل سے دعائیں کرتی رہی اور اندر ہی اندر ایک ایک دعا کے ساتھ آہیں بھرتی رہی......

''رانی...... تجھے کیا ملا...... سارے رشتے...... ناتوں کو توڑ کر تو اس جگہ آ گئی...... تجھے تیرے لالچ نے اندھا کر دیا...... یا...... تیرے خوابوں نے تجھے جینے نہیں دیا...... نہ تو تیرے خواب پورے ہوئے ہیں نہ ہی کچھ اور حاصل ہوا ہے...... کب تک یونہی بھٹکتی رہے گی...... اس سے بہتر تھا تو وہیں رہتی...... اپنے خون کے رشتوں کے سنگ جیتی اور مرتی...... یہاں مر جائے گی تو شاید کوئی قبر میں بھی نہ ڈالے...... نہ یہاں زندگی سانس لیتی ہے اور نہ ہی موت کہیں نظر آتی ہے...... یہاں تو صرف رنگ برنگے چہرے ہیں...... جو ابھی تو ہیں کب غائب ہو جائیں...... کسے معلوم ہے......؟ اس نے آہ بھر کر سوچا...... اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگیں...... اسے اپنے پیچھے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے گھبرا کر پیچھے دیکھا تو بھری آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو گالوں پر بہہ نکلے...... اس کے پیچھے نگار بیگم کا ایک نوجوان کارندہ دلبر کھڑا تھا...... ریتا کو روتے دیکھ کر وہ چونکا۔

''خیر تو ہے...... ریتا بیگم آپ کیوں رو رہی ہیں؟ کیا کسی سے کوئی جھگڑا ہوا ہے؟ اور نگار بیگم کہاں ہیں...... میں ان سے ملنے آیا تھا بلکہ انہوں نے مجھے بلایا تھا......'' دلبر جلدی سے بولا۔

''معلوم نہیں وہ کہاں ہیں'' ریتا نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھے مگر آپ کیوں رو رہی ہیں...... کیا برستے آسمان کو دیکھ کر آپ بھی......'' اس نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا۔

''ن...... ن...... نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں'' ریتا جلدی سے بولی۔

''تو...... پھر...... کیا بات ہے......؟'' دلبر نے قدرے ملائمت سے پوچھا۔

''کچھ نہیں...... یونہی'' ریتا نے آہ بھر کر کہا۔

''ریتا بیگم...... آپ مجھ پر آنکھیں بند کر کے اعتبار کر سکتی ہیں......'' دلبر نے کہا تو ریتا نے حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے اسے دیکھا۔

''ہاں...... میرے دل میں آپ کے لئے خاص جگہ ہے...... کئی بار سوچا آپ سے کبھی دل کی بات کروں...... اور...... آج مجھے موقع مل

گیا...... مجھے آپ شروع سے ہی بہت اچھی لگتی ہیں...... یاد ہے جس روز آپ یہاں آئیں...... تو...... سب سے پہلے میں ہی آپ کو ملا تھا...... میں سیڑھیاں اتر رہا تھا...... آپ کے چہرے پر اک معصومیت سی تھی...... مجھے آپ کے یہاں آنے کا افسوس تھا...... آپ یہاں کیوں آ گئیں......؟ مگر اب آپ آ ہی گئی ہیں تو پھر مجھے محسوس ہوا کہ آپ یہاں کی ہر طوائف سے مختلف ہیں...... آپ کبھی بھی دوسروں جیسی نہیں ہو سکتی......" دلبر اسے سب کچھ بتاتا رہا اور وہ حیرت سے سنتی رہی۔

"ریتا بیگم...... یہاں ہر ایک کا کوئی نہ کوئی ہمراز ہے...... کیونکہ یہاں پر رہنے والوں کے دل اتنے رازوں سے آشنا ہو جاتے ہیں...... کہ انہیں ہمراز بنانے پڑتے ہیں...... آپ بھی مجھے اپنے دل کی بات بتا سکتی ہیں...... بتایئے آپ کیوں رو رہی تھیں......" دلبر نے اس کے قریب آ کر محبت سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ زندگی میں پہلی بار کسی مرد نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا تھا...... اس کے بدن میں ایک برقی لہری دوڑ گئی اس نے جھرجھری سی لی اور گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی...... اور دیوار کے ساتھ چپٹ کر کھڑی ہو گئی۔ دلبر آگے بڑھا اور اس کے گرد اپنے دونوں بازوؤں کو پھیلا کر دیوار پر یوں ہاتھ رکھے جیسے وہ کسی شکنجے میں آ گئی ہو۔

"ریتا بیگم...... میری طرف دیکھیے...... کیا ان آنکھوں میں آپ کو محبت نظر نہیں آتی......" دلبر نے اس کے چہرے کے بہت قریب آ کر سرگوشی کی۔ ریتا کا دل زور زور سے دھک دھک کرنے لگا۔ اس کا چہرہ سرخ پڑنے لگا اور اس نے آنکھیں جھکا لیں۔

آپ کی اسی شرم و حیا نے تو ہمارا دل ہم سے چرا لیا ہے...... کہیں تو اپنا دل آپ کو دکھا دیں...... دکھا تو نہیں سکتے مگر آپ کو اس دل کی آواز سنا سکتے ہیں اور دلبر نے آگے بڑھ کر اسے اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ ریتا کے لئے یہ سب کچھ بالکل اچانک تھا...... محبت کا ایسا والہانہ اظہار پا کر وہ بے قابو ہو گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی...... وہ محبت سے اسے چمکارنے لگا...... وہ روتی رہی...... اور وہ اسے بہلاتا رہا...... بہلاتا رہا۔

"کیا میرے دل کی دھڑکنوں میں کوئی آواز سنائی دی......؟"

دلبر نے مسکراتے ہوئے اسے اپنے آپ سے علیحدہ کرتے ہوئے کہا تو وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے ہلکا سا مسکرا دی۔

"ہاں...... تو اب بتایئے کیوں رو رہی تھی......؟" دلبر نے پوچھا۔

لمحوں میں ریتا کی دنیا بدل گئی تھی...... وہ جو چند لمحے پہلے اس کے لئے بالکل اجنبی تھا...... جس پر وہ اعتبار کرتے ہوئے ڈر رہی تھی...... جس کی نہ باتوں پر یقین آ رہا تھا اور نہ ہی آنکھوں پر اب وہ شخص اس کے لئے سب سے زیادہ قابل اعتماد بن گیا تھا...... اب اسے اس کی ہر بات پر یقین آ گیا تھا...... اس کے دل میں اس نے سب سے بڑا مقام پا لیا تھا۔ وہ اس کے لئے سب سے اہم ہو گیا تھا...... اجنبیت، محبت میں بدل گئی تھی...... اور...... محبت نے سارے فاصلے مٹا دیئے تھے۔ اس کی قربت نے اسے اتنا اعتماد بخشا تھا کہ وہ سب کچھ بھول گئی تھی۔ صرف یاد تھا تو دلبر اور...... اس کی محبت......

"ہاں...... تو بتائیں...... آپ کیوں رو رہی تھیں؟" دلبر نے پھر پوچھا۔

"مجھے اپنے گھر والے بہت یاد آ رہے ہیں...... اس برستی بارش کو دیکھ کر میں ڈر گئی ہوں...... کہیں ہماری جھگی ڈوب ہی نہ گئی ہو۔ میرے

ماں باپ، بہن بھائی کسی مصیبت میں نہ ہوں" وہ اسے بتاتے ہوئے سسکنے لگی۔

"آپ کی جھگی کہاں ہے......؟" دلبر نے پوچھا۔

"بڑے نالے کے پاس......" اور وہ اسے راستہ سمجھانے لگی۔

"دلبر کی جان...... آپ فکر ہی نہ کیجئے...... میں رات کو آپ کو ساری خبر دوں گا...... مگر وعدہ کریں اب آپ روئیں گی نہیں...... آپ کے رونے سے دلبر کے دل کو بہت تکلیف ہوتی ہے۔ دلبر نے محبت بھرے لہجے میں اسے کہا تو وہ مسکرا کر اس کی طرف دیکھنے لگی...... اس کی آنکھوں میں امید اور خوشی کے جگنو جگمگانے لگے۔

"اب میں چلتا ہوں...... دلبر کی جان...... اپنا بہت خیال رکھیے گا" دلبر نے مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر انہیں چومتے ہوئے کہا تو وہ بھی مسکرا دی...... وہ چلا گیا اور وہ کھڑی مسکراتی رہی۔

"محبت بھی کیا عجیب جذبہ ہے...... لمحوں میں ویران دلوں میں بہار لے آتا ہے اور بے نور آنکھوں میں زندگی کی رمق...... ان میں خوشیوں اور امید کے جگنو مسکرانے لگتے ہیں۔ ناامیدی کو آس اور امید میں بدل دیتا ہے...... محبت مہکاتی ہے...... مسکراتی ہے...... لہلہاتی ہے...... جگمگاتی ہے تو ساری کائنات میں زندگی کی لہر دوڑنے لگتی ہے...... وہ بھی ایسے ہی جذبے سے دوچار ہو رہی تھی...... یاسیت اور عجیب قسم کی بے چینی نے اس کے دل کو جتنا مضطرب کر رکھا تھا...... اب سب کچھ غائب ہو چکا تھا...... اب اس کے اندر اطمینان...... یقین...... اور امید پیدا ہو چکی تھی...... وہ دلبر سے قربت کے لمحوں کو یاد کر کے زیر لب مسکرانے لگی...... وہ جو چند لمحے پہلے اپنے مرنے کی دعا کر رہی تھی...... اب اس کے اندر جینے کی امنگ پیدا ہو رہی تھی...... دلبر کی محبت نے اسے ایسے جذبوں سے ہمکنار کیا تھا کہ اب اسے سب کچھ اچھا لگنے لگا تھا...... نیلا آسمان...... برستی بارش...... لہلہاتے، جھومتے درخت...... جل تھل فرش، گاتی، گنگناتی، جھولے جھولتیں طوائفیں...... ادھر ادھر گھومتے پھرتے لوگ...... پکوانوں کی خوشبو...... ہر شے اچھی لگ رہی تھی اس کا دل بھی مسکرانے اور گنگنانے لگا......

دلبر نے اس کے دل کو اپنی محبت سے بھر دیا تھا...... اور وہ محبت اور امید سے دلبر کا انتظار کرنے لگی ایک ایک لمحہ دلبر کے انتظار کی نذر ہو رہا تھا...... شام ہوتے ہی نگار بیگم اچانک کسی مہمان کی آمد کی وجہ سے تیسری منزل پر بنے مہمان خانے میں جا چکی تھیں...... اور...... ریتا دلبر کے انتظار میں برآمدے کے چکر لگا رہی تھی۔ رات گہری ہونے لگی تھی مگر دلبر ابھی تک نہیں آیا تھا...... وہ جتنی دیر کر رہا تھا...... ریتا اتنا ہی مضطرب ہو رہی تھی...... اس کا دل بے چینی اور بے قراری سے پریشان ہونے لگتا...... رات گئے دلبر آیا تو اس کا چہرہ کچھ پریشان تھا۔

"ک...... کک...... کیا ہوا......؟" ریتا نے گھبرا کر پوچھا۔

"کچھ نہیں......" وہ آہستہ آواز میں بولا۔

"کیا...... میرے گھر والے آپ کو ملے......؟" ریتا نے بے صبری سے پوچھا۔

"نہیں...... وہاں تو کوئی جھگی ہی نہیں...... ہر طرف نالے کا گندا پانی پھیلا ہوا ہے اور اس میں اتنی بدبو ہے کہ وہاں دو منٹ بھی کھڑا ہونا

مشکل ہے...... میں نے ارد گرد کے لوگوں سے بھی پوچھنے کی کوشش کی...... مگر...... کسی کو بھی کچھ معلوم نہیں" دلبر نے بتایا تو رینا کی سانس جیسے بند ہونے لگی...... اس کی آنکھیں پتھرا سی گئیں...... اور وہ دم بخود کھڑی دلبر کی طرف دیکھتی رہی۔

"کیا ہوا......؟ آپ پریشان مت ہوں" دلبر نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"کیا وہ سب پانی میں بہہ گئے ہیں؟" وہ خود ہی بڑبڑانے لگی...... دلبر خاموش رہا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی......

"ہو سکتا ہے...... وہ بارش کی وجہ سے کہیں اور چلے گئے ہوں۔ میں شہر سے باہر جتنی بھی جھگیاں ہیں...... وہاں سے پتہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں...... بس آپ فکر نہ کریں......" دلبر نے کہا تو اس نے چونک کر اس کی جانب دیکھا جیسے اس کے اندر امید کے دیئے پھر سے روشن ہو گئے ہوں...... دلبر کی بات سن کر وہ پھر سے پر امید ہو گئی......

"آپ مجھ پر اعتبار کریں...... اس شہر میں وہ لوگ جہاں بھی ہوں گے...... میں پتہ کرا لوں گا...... آپ پر امید رہیے" دلبر نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا تو اس نے خاموشی سے سر جھکا لیا...... دلبر نے مسکرا کر اسے دیکھا اور کچھ کہے بغیر وہاں سے چلا گیا......

صبح نگار بیگم بہت خوش تھیں...... بات بے بات مسکرا رہی تھیں...... رینا چاندی کے بڑے سے باؤل میں پانی لائی تھی جس میں تازہ گلاب کی پتیاں بھگوئی ہوئی تھیں۔ ان کے بیڈ روم میں داخل ہوئی تو نگار بیگم اس کی جانب دیکھ کر مسکرانے لگیں...... رینا نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

"کیسی ہیں آپ......؟" نگار بیگم نے اچانک پوچھا...... تو وہ چونک گئی اور حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

"ٹھیک...... ٹھیک ہوں" وہ بمشکل بولی۔

نگار بیگم کے انگ انگ سے خوشی پھوٹ رہی تھی اور آنکھوں میں عجیب سرشاری اور خوشی تھی...... بدن سے پھوٹنے والی ملی جلی خوشبوؤں نے گرد و پیش کی فضا کو معطر کر رکھا تھا۔ رینا نے ان کے غسل کے لئے نیم گرم پانی کے ٹب میں گلاب کی پتیوں والے پانی کو مکس کیا اور مختلف باڈی واش اس پانی میں مکس کیے......

"آپ غسل کر لیجئے......" رینا نے کہا اور نگار بیگم غسل کرنے چلی گئیں...... وہ حیرت سے نگار بیگم اور ان کی خوشی کے بارے میں سوچنے لگی...... مگر کسی سے پوچھنے کی جرأت اس میں نہیں تھی۔

نگار بیگم غسل کر کے باہر نکلیں تو رینا کو دیکھ کر مسکرانے لگیں رینا پھر چونک گئی......

"ہم نے آپ کے لئے اپنے کچھ نئے کپڑے رکھے ہیں...... وہ چمن بیگم آپ کو دے دیں گی" نگار بیگم نے کہا تو وہ پھر چونک گئی۔

"آج ہم ناشتہ نہیں کریں گے...... آپ صرف جوس لے آیئے۔ نگار بیگم نے کہا تو وہ خاموشی سے وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ان کے لئے چاندی کی خوبصورت سی نقش و نگار والی ٹرے میں جوس کا گلاس لے کر آئی...... نگار بیگم تیار ہو رہی تھیں اور گنگنا رہی تھیں...... رینا نے استفہامیہ انداز میں ان کی جانب دیکھا۔

"اب آپ جایئے...... جب ضرورت ہوگی ہم بلا لیں گے" نگار بیگم نے کہا تو وہ خاموشی سے چلی گئی...... وہ سارا دن اپنے کمرے میں

بیٹھی انتظار کرتی رہی مگر نگار بیگم نے اسے نہ بلایا.....اور ایسا کبھی بھی نہیں ہوا تھا......نگار بیگم تو ہر چھوٹے سے چھوٹے کام کے لئے اس کو بلاتی رہتی تھی اور انہوں نے پورے دن میں اس کو ایک بار بھی نہیں بلایا تھا......اور اس کے لئے یہ بہت حیرانگی کی بات تھی وہ خود ہی شام کو ان کے کمرے کی جانب گئی مگر وہ بند تھا.....اسے اچانک چمن بیگم مل گئیں۔

''چمن بیگم.....نگار بیگم.....؟'' اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا پوچھے......

''وہ باہر گئی ہیں.....'' چمن بیگم نے بتایا۔

''کیوں.....؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''ایک فلم والے نے ان کو بلایا ہے.....'' چمن بیگم نے بتایا۔

''کیا نگار بیگم فلم میں کام کریں گی.....؟'' ریتا نے حیرت سے پوچھا۔

''معلوم نہیں.....شاید.....ہاں.....'' چمن بیگم نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا تو ریتا خاموشی سے ان کا منہ دیکھنے لگی۔

نگار بیگم رات کو دیر سے لوٹیں تو تھکاوٹ سے چور تھیں.....کھانا کھائے بغیر ہی وہ آرام کے لئے چلی گئیں.....ریتا فوراً ان کے کمرے میں پہنچ گئی اور ان کا جسم دبانے لگی.....اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ان سے پوچھے.....کیا وہ فلم میں کام کریں گی؟ اس کے اندر عجیب سا تجسس پیدا ہو رہا تھا.....بھیک مانگتے ہوئے جب کبھی وہ کسی سینما گھر کے پاس سے گزرتی تو فلمی ایکٹرسز کے بڑے بڑے پوسٹرز کو حیرانگی سے کھڑی دیکھتی ہی رہتی تھی.....ان کو دیکھ کر وہ گہری سوچ میں گم ہو جاتی تھی.....انہیں وہ کسی دوسری دنیا کی اعلیٰ مخلوق نظر آتی تھیں.....وہ انہیں دیکھ کر عجیب احساس اور سرشاری اپنے اندر محسوس کرتی تھی.....اور.....اب اسے نگار بیگم.....ان فلمی ہیروئنز کی طرح ایک بڑی قد آور شخصیت نظر آ رہی تھی جس کے ہاتھ پاؤں وہ دبا رہی تھی.....اسے ایک فخر سا محسوس ہونے لگا تھا.....اسے یاد آنے لگا جب وہ راہ چلتے زمین پر سے کسی فلمی ہیروئن کا رنگین صفحہ اٹھا کر اپنے تھیلے میں ڈالتی اور جھگی میں جا کر اسے الٹاتی تو سب بچے جھپٹے مار کر اس کاغذ کو چھیننے کی کوشش کرتے.....سب نے اپنے اپنے پسندیدہ فلمی اداکاروں کی تصویریں اپنے پاس جمع کر رکھی تھیں۔

جب نگار بیگم بہت مشہور ہو جائیں گی تو وہ منو، بجو، گڈی اور شبو کو بتائے گی کہ وہ اس ہیروئن کے پاس رہتی تھی، اس کے ہاتھ پاؤں کی مالش کرتی تھی۔ اس کے بالوں کی کنگھی کرتی تھی.....تو سب سن کر کتنے حیران ہوں گے.....اس بات کو سوچتے ہوئے ہی وہ زیر لب مسکرانے لگی.....لیکن اگر وہ مر گئے ہوئے تو وہ کس کو بتائے گی.....اس بات کو سوچتے ہوئے اس نے گہری سانس لی اور افسردگی کے سائے اس کے چہرے پر لہرانے لگے۔

''ریتا.....کیا چمن بیگم نے آپ کو ہمارے کپڑے دے دیے ہیں.....ہم نے ان کو بولا تھا.....ان کی سلائی بھی ٹھیک کر دیں'' نگار بیگم نے پوچھا۔

''جی.....ہاں.....سب ٹھیک ہیں'' وہ سر جھکا کر پھر انہیں دبانے لگی۔ اس کا ذہن ادھر ادھر بھٹک رہا تھا۔ کبھی وہ نگار بیگم کے بارے میں سوچنا شروع کر دیتی تو کبھی اپنے بہن بھائیوں کے بارے میں پھر اچانک دلبر بھی یاد آنے لگتا اور اس کی میٹھی میٹھی محبت بھری باتیں.....اور.....ان کو

سوچ کر اس کا دل دھڑکنے لگتا اور لب مسکرانے لگتے۔

اس نے جب سے محبت کی دہلیز پر قدم رکھا تھا۔ اسے اپنے آپ سے پیار ہونے لگا تھا۔ خواہ مخواہ بجنے سنورنے کو دل چاہتا...... نگار بیگم کے دیے ہوئے کپڑے پہن کر وہ کئی کئی گھنٹے آئینے کے سامنے کھڑی اپنے آپ کو دیکھتی رہتی۔ نگار بیگم کے بالوں جیسے اسٹائل بناتی...... ان کی طرح میک اپ کرنے کی کوشش کرتی...... وہ روز بروز نکھرنے لگی تھی...... وہ جان بوجھ کر ان راستوں سے ہو کر گزرتی جہاں دلبر کی اس پر نظر پڑتی اور دونوں کی نظریں ملتے ہی وہ مسکرانے لگتے...... محبت اور چاہت کی خوشبو نے اس کے انگ انگ کو معطر اور سرشار کر دیا تھا...... وہ آئینے میں اپنے آپ کو دیکھتی تو اسے یوں لگتا جیسے دلبر اس کے پیچھے کھڑا اس کو سراہ رہا ہو...... اس سے محبت بھرے لہجے میں سرگوشیاں کر رہا ہو...... ہر کوئی اس میں واضح تبدیلی محسوس کر رہا تھا۔ وہ تین سالوں سے وہاں رہ رہی تھی مگر حلیے سے ہی غریب نوکرانی نظر آتی تھی مگر اب ایک دم اس نے جو حلیہ بدلا تو وہ دیکھنے میں ساری طوائفوں سے آگے نظر آتی تھی۔ محبت کی شفق نے اس کے گالوں کو تمتمانا شروع کر دیا تھا۔ نجانے کیسی ست رنگی شعاعیں اس کے چہرے سے پھوٹنے لگی تھیں جو دیکھنے والوں کو متاثر کرتیں...... دلبر سانولا، سلونا، دراز قد، بھرے جسم والا، عام شکل وصورت کا گھبرو جوان تھا...... وہ بھی بہت اسٹائل سے رہنے لگا تھا۔ وہ نگار بیگم کا خاص کارندہ اور باڈی گارڈ تھا۔ ہر وقت پستولوں کو لوڈ کرنے میں ہی لگا رہتا...... کسی نہ کسی بہانے سے نگار بیگم کے کمرے کے چکر لگاتا رہتا...... نگار بیگم بھی حیرانگی سے اسے دیکھ کر پوچھتیں ''کہ ابھی تو وہ یہ بات پوچھ کر گیا ہے...... پھر پوچھنے آ گیا ہے'' وہ بڑبڑا جاتا اور مختلف بہانے بنانے لگتا۔

دونوں تنہائی میں ملتے تو ایک دوسرے کو دیکھ کر بے قرار ہونے لگتے...... دلبر کسی نہ کسی بہانے اسے اپنے قریب کر لیتا اور وہ اس قربت کے نشے سے سرشار ہو کر سارا وقت مست انداز میں گھومتی پھرتی رہتی۔

چمن بیگم اسے معنی خیز انداز میں سر سے لے کر پاؤں تک گھورتی رہتی...... اور...... اس کے نکھرنے، بننے وسنورنے کا راز جاننے کی کوشش کرتی۔

نگار بیگم بھی بہت اونچی ہواؤں میں اڑ رہی تھیں...... یوں محسوس ہوتا تھا...... جیسے ان کی حویلی پر جت کی دیوی مہربان ہو گئی ہو...... ان کے بھی شب وروز خاص رنگینیوں کی نذر ہونے لگے تھے...... جب سے امریکہ سے آئے مہمان ''نوازش علی'' نے ان کا رقص دیکھا تھا وہ ان پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ وہ ایک فلم بنانے یہاں آیا تھا اور اپنی فلم کے لئے اسے نگار بیگم سے بڑھ کر کوئی حسین دلربا نظر ہی نہیں آ رہی تھی۔ وہ خود بہت خوبصورت، سمارٹ، اعلیٰ تعلیم یافتہ چالیس سالہ امیر کبیر شخص تھا...... جس کے پاس کسی بھی شے کی کوئی کمی نہ تھی...... وہ گفتگو بھی بہت شستہ انداز میں کرتا اور کسی کو داد وتحسین سے رجھانے کا فن بھی اسے خوب آتا تھا...... وہ ذہین بھی تھا اور موقع شناس بھی...... نگار بیگم کی عمر بتیس برس ہو گئی تھی اور اس نے پندرہ سال کی عمر میں اپنی ماں کندن بیگم کی سرپرستی میں رقص کرنا شروع کیا تھا۔ جب سے لے کر اب تک کوئی ایسا شخص نظر نہیں آیا تھا جو نوازش علی کے ہم پلہ ہوتا۔ بڑے بڑے رئیس زادے، اس کے قدموں پر جان اور روپیہ نچھاور کرنے والے، اس کی اداؤں پر مر مٹنے والے، نوازش علی کے سامنے پانی بھرتے نظر آتے...... نگار بیگم کو بائیس برس کی عمر میں ایک نوجوان شاکر علی سے عشق ہو گیا تھا...... شاکر علی یونیورسٹی کا طالب علم تھا اور ایک روز دوستوں کے ساتھ اس کا رقص دیکھنے آیا...... وہ بہت گھبرایا ہوا اور پریشان نظر آتا تھا وہ کسی اچھے خاندان سے تعلق رکھتا تھا...... اس نے ایک بار بھی نگار بیگم کی طرف سر اٹھا کر نہ دیکھا۔ سارا

وقت سر جھکائے بیٹھا رہا جیسے اپنے آنے پر شرمندہ ہو رہا ہو..... سب کے جانے کے بعد نگار بیگم نے اسے روک لیا اور اس سے اس کی پریشانی کی وجہ پوچھی تو وہ رونے لگا..... وہ ایک اچھے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اسے احساس ندامت ہونے لگا کہ وہ ایک عورت کے رقص کو دیکھنے آیا ہے جبکہ اس کے خاندان میں تو عورت کا بہت احترام اور عزت سکھائی جاتی ہے..... اس نے بتایا کہ یہ رات اس کی زندگی کی سیاہ ترین رات ہے اور وہ خود کو بہت گناہگار محسوس کر رہا ہے..... نگار بیگم اس سے بہت متاثر ہوئی اور اس کی عظمت کو سلام کرنے کے لئے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بوسہ دینا چاہا تو وہ بوکھلا گیا اور وہاں سے ایسا گیا پھر واپس نہ آیا..... اس کے دوستوں نے بعد میں بتایا کہ وہ شہر ہی چھوڑ گیا تھا......

نگار بیگم کے لئے وہ رات بہت اہم تھی۔ شاکر علی اور وہ رات اس کے اندر کہیں ٹھہر گئے تھے..... اس شخص نے جس عزت کی نگاہ سے اسے دیکھا تھا..... اس پر فریفتہ ہو گئی تھی وہ ہر ہفتے اس خاص دن کو درگاہ پر جاتی اور رات کو اپنے کمرے میں بند ہو کر اس کو یاد کرتی ..... اور اپنی گندی زندگی میں گناہ سے آلودہ ان لمحوں کو یاد کرتی جو اسے ایک سیاہ لمبی تاریک رات کی مانند دکھائی دیتے اور اس سیاہ رات میں شاکر علی ایک چمکتے جگنو کی مانند اسے دکھائی دیتا..... جس کے اندر کی پاکیزگی نے نگار بیگم کی تاریک رات میں روشنی کر دی تھی۔ اس سے قبل اور بعد میں آنے والا کوئی ایک شخص بھی اس جیسا نظر نہیں آیا تھا۔ بڑے بڑے سورما، شوقین مزاج، دل پھینک، نامور خاندانوں کے چشم و چراغ اس کے کوٹھے پر آئے تھے مگر شاکر علی جیسا کوئی بھی نہیں آیا تھا..... اس کو یاد کر کے اس کی آنکھیں نم ہونے لگتیں اور وہ اس کو تصور کر کے اس سے محبت کرتی..... اس کی زندگی اور لمبی عمر کے لئے دعائیں کرتی..... شاکر علی کے بعد کوئی شخص اسے اس قابل نظر ہی نہ آیا کہ وہ اس کی طرف محبت بھری نگاہوں سے دیکھتی..... وہ پیشہ ور عورت تھی اور اپنے فن سے دوسروں کا دل لبھاتی، رات کے ساتھ ہی اس کا کھیل ختم ہو جاتا..... مگر نہ کسی سے محبت ہو پائی..... نہ کوئی اس کے دل تک پہنچ پایا.....

اب پونے دس برس بعد نوازش علی نے اس کے دل پر دستک دی تھی۔ نوازش علی بہت حد تک اسے شاکر علی جیسا دکھائی دیا..... نوازش علی کافی پر اعتماد اور بے باک قسم کا انسان تھا مگر وہ شاکر علی کی طرح اسے بہت مختلف لگا وہ اسے اس طرح نہیں دیکھتا تھا جس طرح دوسرے مرد دیکھتے تھے..... اس کی نظروں میں ہوس اور زبان پر خوشامدی جملے نہیں تھے..... نہ ہی وہ چرب زبان تھا اور نہ ہی خواہ مخواہ تعریفوں کے پل باندھتا تھا..... وہ بہت واضح انداز میں دوٹوک بات کرتا تھا۔ نگار بیگم حیرت سے اسے دیکھتی اور اس کی باتیں سنتی رہتی..... اس کے بولنے کا انداز اس قدر دلنشین تھا کہ وہ اپنا آداب گفتگو بھول جاتی اور اس کے لہجے کی مٹھاس کو اپنے دل کی گہرائیوں تک محسوس کرتی۔ وہ نوازش علی کی اسیر ہو رہی تھی..... اور اسے فلمیں بنانے کا شوق تھا..... وہ ایک دو کامیاب فلمیں پہلے بنا بھی چکا تھا اور اب تیسری کے لئے اسے نئے چہرے کی ضرورت تھی..... کوئی اور ہوتا تو نگار بیگم فوراً انکار کر دیتی مگر نوازش علی کو وہ انکار نہ کر سکی..... اس کے نزدیک فلم اہم نہیں تھی..... اس کو تو نوازش علی سے محبت ہو گئی تھی اور اس کی محبت کی خاطر وہ ہر آگ میں کود جانے کو تیار تھی۔ نوازش علی سے اس کی بڑھتی ہوئی ملاقاتیں اخبارات کی سرخیاں بن رہی تھیں مگر اسے کسی اسکینڈل کی پرواہ نہیں تھی۔ اسے دن میں کئی کئی فون آتے جو اس سے نوازش علی کے بارے میں پوچھتے تو وہ مسکرا کر اس انداز میں ٹالتی کہ سب مطمئن ہو جاتے۔ جب سے نوازش علی نے اس کے دل میں گھر کیا تھا..... اس کے کمرے کے دروازے خود بخود اس کے لئے کھل گئے تھے..... حویلی کے سب لوگ مرد و زن حیران تھے کہ نگار بیگم کیسی دیوانی ہو چلی ہیں کہ انہوں نے اپنے تمام اصول خود ہی توڑ دیئے ہیں..... ان کے کمرے تک کسی مہمان کو آنے کی جرأت نہ تھی اور اب وہ

اس مہمان کو خود ہی اپنے کمرے میں بلا لیتی تھیں...... نگار بیگم اور نوازش علی کے بارے میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئی تھیں، خائف طوائفوں کو شہ مل رہی تھی۔ جب نگار بیگم محبت کر سکتی ہیں تو ہم کیوں نہیں......"

"نگار بیگم...... حویلی میں بڑی گڑبڑ ہو رہی ہے...... سب لوگ کھسر پھسر میں مصروف ہوتے ہیں...... آپ......؟" چمن بیگم نے بلاواسطہ انداز میں سمجھانے کی کوشش کی۔

"چمن بیگم آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟" نگار بیگم نے چونک کر چمن بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نگار بیگم...... سرکار نوازش علی کا یہاں آنا...... حویلی کی طوائفوں کے لئے بہت مسئلے پیدا کر رہا ہے......" چمن بیگم نے ڈرتے ہوئے کہا۔

"کیسے مسئلے...... اور کسی کو اس بات سے کیا مطلب؟ ہم تو ان کی ایک فلم میں کام کر رہے ہیں" نگار بیگم نے کہا۔

"نگار بیگم...... جانتی ہیں...... کسی طوائف کا زوال کب شروع ہوتا ہے جب وہ اپنے دل اور کمرے کے دروازے کسی کے لئے بے دھڑک کھول دیتی ہے......" چمن بیگم نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

"چمن بیگم...... ہمارے خیال میں تو طوائف کا زوال اسی دن شروع ہو جاتا ہے جب وہ پہلی بار پاؤں میں گھنگھرو باندھ کر مجرا کرتی ہے...... آپ کس زوال کی بات کر رہی ہیں؟" نگار بیگم نے اس کی جانب بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ عام طوائف نہیں......" چمن بیگم نے جلدی سے کہا۔

"اور ہم اتنے خاص بھی نہیں" اس نے آہ بھر کر جواب دیا۔

"آپ کا اپنا مقام ہے" چمن بیگم نے قطعیت سے کہا۔

"ہمیں تو عورت کی حیثیت سے کوئی مقام نہیں ملا...... طوائف زادی بن کر کیا مقام ملے گا...... چمن بیگم ہم اپنی ذات پر کتنے ہی خول چڑھا کر اپنا مرتبہ بلند کرنے کی کوشش کریں...... مگر ہم وہی رہیں گے...... "طوائف" بازاری عورت...... کون ہمیں گھر کی زینت بناتا ہے...... کون ہمیں وہ عزت دیتا ہے جو عام گھر کی ایک عام سی عورت کو اس کے گھر والے دیتے ہیں...... ہمارے گلے میں تو قدرت نے پہلے ہی ایک طوق ڈال دیا ہے...... جس کو نہ ہم اتار کر پھینک سکتے ہیں جبکہ وہ ہمارے گلے کو بہت تکلیف بھی دیتا ہو...... چمن بیگم ہم اتنی کھوکھلی زندگیاں گزارتے ہیں...... کہ...... اس کا کھوکھلا پن ہمارے دلوں اور روحوں کو بھی کھوکھلا کر دیتا ہے...... چمن بیگم کب تک ہم اپنے گھنگھروؤں کی جھنکار، دلفریب اداؤں اور آواز کے جادو سے لوگوں کے دلوں کو لبھاتے رہیں گے...... اتنی کھوکھلی زندگی میں کیا ہمارے لئے کچھ بھی نہیں...... کوئی خوشی کے لمحے ہمارے نہیں ہو سکتے...... کوئی ایسی گھڑیاں جن کے سہارے ہم اپنا بڑھاپا گزار سکیں...... چمن بیگم ہمارے دل کے بند خانوں میں کچھ تو ایسا محفوظ ہونا چاہیے جس کی حفاظت میں ہی ہم آنے والے ماہ و سال گزار سکیں" نگار بیگم نے افسردگی سے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں...... میں نے بھی عمر کا ایک بہت بڑا حصہ یہاں گزارا ہے...... سب کچھ اچھی طرح جانتی ہوں...... کہاں اور کب کب دل ٹوٹتے ہیں...... کیسے کیسے کرچیاں اکٹھی کرتے ہمارے دل زخمی ہو جاتے ہیں...... مگر جذبات کی رو میں بہہ کر کیے جانے والے فیصلے

انسان کے مسائل اور بڑھا دیتے ہیں...... نہ تو آپ اپنی شناخت بدل سکتی ہیں...... اور...... نہ ہی اس کوٹھے سے اپنا ناتا...... نوازش علی بہار کا ایک جھونکا ہیں...... اور...... کچھ نہیں...... ہم نے ایک زمانہ دیکھا ہے۔ آپ سے عمر میں بھی بڑی ہیں...... ہماری نظریں کچھ اور دیکھ رہی ہیں...... مگر...... نجانے آپ کو کچھ اور کیوں نظر نہیں آ رہا...... یا...... پھر آپ دیکھنا ہی نہیں چاہتیں" چمن بیگم نے قدرے صاف گوئی سے کہا۔

"کیا مطلب......؟ کیا نوازش علی آپ کو دوسرے مردوں سے مختلف نظر نہیں آتے؟" نگار بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

"ہر مرد اندر سے ایک سا ہوتا ہے...... کوئی بھی دوسرے سے مختلف نہیں ہوتا" چمن بیگم نے طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

"نہیں...... ایسی بات نہیں...... ہمارا تجربہ کچھ اور کہتا ہے...... ہماری آنکھوں نے بھی ہر رنگ کے مرد دیکھے ہیں...... مگر ہم انہیں بہت مختلف بھی دیکھتے ہیں...... اور ہمیں اپنی بصارت پر پورا بھروسہ ہے" نگار بیگم کی آنکھوں کے سامنے شاکر علی کا چہرہ آ گیا اور وہ زخمی مسکراہٹ سے چمن بیگم کی طرف دیکھنے لگیں۔

"نگار بیگم...... اپنی آنکھوں کو محبت کی پٹی سے آزاد کریں اور صرف یہ یاد رکھیں کہ یہ دنیا مرد اور عورت کے رشتے کے بارے میں ہمیشہ مشکوک رہی ہے...... خون کے رشتوں کے علاوہ ہر رشتہ کمزور اور بودا ہوتا ہے...... عورت ہر رشتہ کے بارے میں جذباتی ہو کر سوچتی ہے جبکہ مرد ایسا نہیں سوچتا۔ وہ رشتوں کے بارے میں اتنا جذباتی نہیں ہوتا...... اس لئے آپ بھی اس قدر جذباتی نہ ہوں...... کہ...... یہ کوٹھا اس کی آن بان...... اور آپ کی عزت و مرتبہ سب اس کی نذر ہو جائیں" چمن بیگم نے سنجیدگی سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"کیا ہم نوازش علی کو چھوڑ دیں؟" نگار بیگم نے قدرے توقف کے بعد پوچھا۔

"نہیں...... مگر اس کی محبت پر اتنا اعتبار مت کریں...... کہ...... آپ کو اپنا سب کچھ نہ کھونا پڑے...... مرد کی محبت...... مرد کی طرح ہی بے اعتبار ہوتی ہے...... عورت جس کے لئے جان کی بازی لگا دیتی ہے...... وہ اس کے لئے معمولی بات ہوتی ہے...... وہ محبت کو بھی اس نظر سے نہیں دیکھتا جس نظر سے عورت دیکھتی ہے...... اگر آپ کو وہ سر بازار رسوا کر کے بھوکا ننگا چھوڑ جائے تو کون آپ کو سہارا دے گا......؟ طوائف کا کوئی خاندان اور کوئی آگے پیچھے نہیں ہوتا...... جو اس کو سہارا دے...... اسے اپنا سہارا خود ہی بننا ہوتا ہے...... اس لئے...... جب تک یہ کوٹھا ہے...... آپ ہیں...... جب یہ نہیں ہوگا...... آپ بھی نہیں ہوں گی" چمن بیگم نے واشگاف الفاظ میں کہا تو نگار بیگم خاموش ہو گئیں۔

چمن بیگم ان کی طرف دیکھتی رہی اور پھر کمرے سے باہر نکل گئیں ان کے جانے کے بعد نگار بیگم پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع ہو گئی۔

"ہم کتنی بے بس اور مجبور عورتیں ہیں...... جن کو قدرت نہ رشتوں سے نوازتی ہے نہ محبت سے...... ہمارے دل بھی اجڑے رہتے ہیں اور کوکھ بھی...... نہ کوئی ہم کو محبت کرنے کا پورا حق دیتا ہے اور نہ ہی ہم کسی کو یہ حق دے سکتے ہیں...... ہم کتنے ادھورے لوگ ہیں...... جو ادھوری زندگیاں گزار کر مر جاتے ہیں...... چمن بیگم نے جو بھی کہا ہے...... ٹھیک کہا ہے اور ہم بھی جانتے ہیں وہ سچ کہہ رہی تھیں...... مگر اس دل کا کیا کریں جو ہمیں ہر پل بہکاتا ہی رہتا ہے...... کیا ہم دنیا میں اس لئے بھیجے گئے ہیں کہ لوگوں کے ساتھ جھوٹی محبتوں کے کھیل رچا کر انہیں خوشیاں دیتے رہیں...... کیا زندگی کی سچی خوشیوں میں ہمارا کوئی حصہ نہیں" نگار بیگم نے روتے ہوئے سوچا اور ان کی ہچکی بندھ گئی۔

ہمیں جلد نوازش علی کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا ہوگا......اس سے پہلے کہ یہ سب کچھ ختم ہو جائے۔

''نگار بیگم......نوازش علی تشریف لائے ہیں'' دلبر نے نگار بیگم کے کمرے کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے کہا۔

''ان کو اندر بھیج دیجئے'' نگار بیگم نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا......دلبر چلا گیا......اور......نوازش علی نگار بیگم کے کمرے میں داخل ہو گئے۔

☆

رات گہری ہو رہی تھی جب دلبر نے اپنی ٹارچ کی روشنی ریتا کے کمرے کے روشندان کے ذریعے پیغام کی صورت میں اندر بھیجی......ریتا ایک دم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ وہ سر شام ہی اس روشنی کا انتظار کرتی رہتی تھی اور جیسے وہ روشنی دلبر کا پیغام اس تک پہنچاتی وہ بھاگ کر اس مخصوص بالکونی میں پہنچ جاتی جس کو انہوں نے ملاقات کے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔ ریتا نظریں چرا کر ادھر پہنچ گئی۔ دلبر اس کا منتظر تھا۔ ریتا قدرے گھبرائی ہوئی تھی۔ وہ اسے لے کر بالکونی کے تاریک گوشے میں چلا گیا۔

''دلبر......کیا کوئی خبر ملی......؟'' ریتا نے اس کی بانہوں میں آتے ہی پہلا سوال کیا۔

''نہیں......میں نے شہر کے ہر علاقے کی جھگیاں کھنگال ڈالی ہیں......ان کی کوئی خبر نہیں ملی'' دلبر نے اسے کہا۔

''اس کا مطلب ہے......وہ سارے سیلاب کے پانی میں بہہ گئے ہیں۔ وہ کہہ کر اس کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور وہ اسے تسلیاں دیتا رہا۔ وہ کافی دیر سسکتی رہی اور وہ اسے سہلاتا رہا۔

''میں اس وقت کو کوستی ہوں جب میں انہیں چھوڑ کر یہاں آئی'' اس نے بہتے آنسوؤں اور رندھے ہوئے گلے کے ساتھ کہا۔

''تم......کیوں یہاں آئی......؟'' دلبر نے پوچھا۔

''میری آنکھوں نے اک خواب دیکھ لیا تھا اور اس خواب نے مجھے پاگل کر دیا تھا......'' وہ آہ بھر کر بولی۔

''کیسا خواب......؟'' دلبر نے چونک کر پوچھا۔

''نگار بیگم بننے کا......'' اس نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

''کیا......؟'' دلبر نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......اس خواب نے مجھے اندھا کر دیا تھا......مجھے نگار بیگم کے علاوہ کچھ سوجھتا ہی نہ تھا......اور میں بھٹک گئی......میرے اندر کی اس شدید خواہش نے مجھے بے بس کر دیا تھا......میں اگر نگار بیگم کے پاس نہ آتی تو شاید پاگل خانے پہنچ جاتی'' وہ آہ بھر کر بولی۔

''تم نے کیوں ایسی خواہش کی......؟ کیا تمہیں اس جگہ اور نگار بیگم کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا'' دلبر نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں......میں کچھ نہیں جانتی تھی......بس نگار بیگم اور اس کے ٹھاٹ دیکھ کر یہ تمنا کر بیٹھی......اور......اس تمنا نے مجھے اپنوں سے دور کر دیا'' ریتا سسکنے لگی اور دلبر اسے اپنے ساتھ لگائے محبت سے چپ کراتا رہا۔

''کیا تم اب بھی نگار بیگم بننا چاہتی ہو......؟'' دلبر نے پوچھا۔

''معلوم نہیں......'' اس نے آہ بھر کر جواب دیا۔

وہ رات گئے تک دلبر کی گود میں سر رکھے اپنے دل کی باتیں اس سے کرتی رہی۔

''اب میں چلتا ہوں...... صبح ہونے کو ہے'' دلبر کہہ کر چلا گیا اور وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں آ گئی...... کمرے کی خاموش اور ساکت دیواروں کے اندر اسے اپنی تنہائی اور ماں باپ سے جدا ہونے کا غم سخت دکھ دینے لگا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اسے اماں یاد آنے لگی...... جس سے وہ لڑتی بھی تھی...... اول فول بکتی رہتی تھی مگر اماں سے اسے پیار بھی بہت تھا...... اماں اپنے دل کی ہر بات اس کے ساتھ کرتی تھی...... مٹھو، جگو، پپو، گڈی، شبو...... ابا سب لوگ اس سے دور چلے گئے تھے...... وہ تو یہی سوچتی تھی...... کسی روز یہاں سے فرار ہو کر وہ واپس چلی جائے گی مگر اب کس کے پاس جائے گی...... اس کے پاس کوئی ایسی جگہ نہیں رہی تھی جہاں وہ جا سکتی...... اسے پکا یقین تھا کہ اس کے گھر والے کبھی واپس نہیں گئے ہوں گے کیونکہ وہ بستی والوں کی باتوں اور اپنی عزت کے ڈر سے تو یہاں آئے تھے۔ وہ واپس کبھی نہیں گئے ہوں گے وہ یقیناً مر چکے ہوں گے...... اور وہ ان سے بچھڑ کر زندہ بچ گئی تھی۔ کاش وہ بھی ان کے ساتھ ہوتی تو سب اکٹھے ہی مر جاتے...... اب بھری دنیا میں اس کا کوئی بھی باقی نہیں بچا تھا...... سوائے دلبر کے...... جو اس سے محبت کا دعویٰ کرتا تھا...... اور وہ اس کے دعوے جھٹلا کر اس آخری سہارے کو بھی چھوڑنا نہیں چاہتی تھی...... وہ اس پر اندھا اعتبار کرتی تھی۔ اس کی محبت کو اپنے لئے زندگی سمجھتی تھی...... اور...... اس زندگی کی سانسیں دلبر کے دم سے قائم تھیں۔

وہ ساری رات روتی رہی...... اور اپنے گھر والوں کو یاد کرتی رہی۔ وہ ایک لمحے کے لئے بھی سو نہ سکی تھی جیسے ہی آنکھیں بند کرتی سب اپنی اپنی کشکول اٹھائے اس کی نظروں کے سامنے گھوم جاتے تو وہ پھر رونا شروع کر دیتی۔

''میں...... کیسے ان کے بغیر زندہ رہوں گی؟'' وہ اپنے آپ سے سوال کرتی۔

''اس کا مطلب ہے...... اب یہ حویلی اور نگار بیگم میرا مقدر ہیں۔ میں یہاں سے کہیں نہیں جا سکوں گی...... ان دیواروں میں قید رہوں گی...... اگر مجھے یہاں ہی رہنا ہے...... تو کیا ساری زندگی نگار بیگم کی غلامی کرنا ہوگی...... اس کی اترن پہننی ہوگی...... اس کا بچا کھچا کھانا پڑے گا...... میرا خواب کہاں گیا......؟'' میں...... اور...... نگار بیگم......؟ دونوں کہاں کھڑے ہیں...... کیا میری زندگی یونہی گزر جائے گی؟'' وہ مایوسی سے سوچنے لگی۔

صبح بیدار ہوئی تو چاندی کے برتن میں گلاب کی پتیوں والا پانی لے کر نگار بیگم کے کمرے میں چلی گئی...... کمرے کا دروازہ تھوڑا سا کھلا تھا...... وہ اندر چلی گئی...... نگار بیگم کمرے میں نہیں تھی۔ ایک خوبصورت سمارٹ شخص ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا بالوں کو کنگھی کر رہا تھا جیسے وہ کہیں جانے کی تیاری کر رہا ہو۔ ریتا اسے دیکھ کر انتہائی حیرت سے چونکی...... حیرت اور خوف سے اس کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

''وہ...... ن...... نگار بیگم کہاں ہیں؟'' اس نے بمشکل پوچھا۔

نوازش علی نے اس کی طرف دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا...... وہ اسے سر سے لے کر پاؤں تک گھورنے لگا۔ ریتا اس کی نظروں سے خائف ہونے لگی۔

''گھبراؤ نہیں...... کیا تم میری فلم میں کام کرو گی؟ میں تمہارے جیسے چہرے کی تلاش میں تھا...... صرف تمہارا رنگ سانولا ہے باقی تم ویسی

ہی ہو...... جیسی ہیروئن میں چاہتا ہوں" نوازش علی نے کہا اور اسی لمحے نگار بیگم کمرے میں داخل ہوئیں...... انہوں نے نوازش علی کی بات سن لی تھی۔ ان کے چہرے کے تاثرات بگڑنے لگے۔ ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہونے لگا۔

"نگار بیگم...... آپ نے یہ ہیرا کہاں چھپا کر رکھا تھا...... بھئی مجھے تو ایسے ہی چہرے کی ضرورت ہے...... میں اس کو اپنی فلم میں کاسٹ کروں گا......" نوازش علی نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

نگار بیگم نے شعلہ برساتی آنکھوں سے رینا کی جانب دیکھا۔

"تم یہاں کیوں آئی ہو......؟" نگار بیگم نے غصے سے کہا۔

"وہ...... میں...... پانی دینے آئی تھی" رینا نے گھبرا کر جواب دیا۔

"کیا ہم نے تمہیں پانی لانے کو کہا تھا؟" نگار بیگم غصے سے بے قابو ہو کر دھاڑ رہی تھیں۔

"نگار بیگم...... آپ کیوں خفا ہو رہی ہیں؟ اس کا یہاں آنا اچھا ہوا...... کہ...... میں نے اسے دیکھ لیا......" نوازش علی مسکراتے ہوئے بولا۔

"یہ ہماری نوکرانی ہے...... ہمارے پاؤں دھوتی ہے...... کیا آپ اس کو فلم کی ہیروئن بنائیں گے؟" نگار بیگم نے اس قدر طنزیہ لہجے میں کہا کہ رینا کو اپنی ذلت کا شدید احساس ہونے لگا۔

"اب...... تم...... جاؤ...... یہاں سے" نگار بیگم نے غصے سے کہا اور رینا وہاں سے روتی ہوئی چلی گئی۔

"آپ بھی کمال کرتے ہیں...... انسان کی اوقات دیکھ کر بات کرتے ہیں...... کیا وہ ہے اس قابل...... کہ...... اسے آپ فلمی ہیروئن بنائیں" نگار بیگم نے خفگی سے کہا۔

"نگار بیگم...... ٹیلنٹ کسی شے کا محتاج نہیں ہوتا...... قسمت عام سے انسان کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہے...... میں نے لوگوں کو خاک سے آفتاب بنتے دیکھا ہے...... آپ کا یہ رویہ میری سمجھ سے باہر ہے...... میں تو آپ کو بہت مختلف عورت سمجھتا تھا...... مگر آپ کے اندر کی عورت بھی اتنی ہی حاسد ہے جتنی کہ ایک عام گھریلو عورت ہوتی ہے...... میرا خیال ہے انسان جس قدر زمانے کی تلخیوں کو جھیلتا ہے...... اس کا نقطہ نظر وسیع ہوتا جاتا ہے۔ اس میں لوگوں کو ان کی خامیوں سمیت قبول کرنے کی زیادہ استطاعت پیدا ہوتی جاتی ہے مگر آپ نے بہت عامیانہ باتیں کر کے اپنے آپ کو میری نظر سے گرا لیا ہے" نوازش علی قدرے خفگی سے بولا۔

نوازش علی کے الفاظ نگار بیگم کے سینے میں خنجر کی مانند پیوست ہو گئے۔ اپنی توہین کے احساس سے وہ تلملانے لگی...... اس نے بہت مشکل سے اپنے آپ پر قابو پانا چاہا...... مگر نوازش علی کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات اس کے غصے کو ہوا دینے لگے۔

"آپ اس نوکرانی کی حمایت کر رہے ہیں...... اس کی حیثیت اس کا مرتبہ ہمارے سامنے کیا معنی رکھتا ہے......؟" نگار بیگم نے کہا۔

"نگار بیگم...... آپ بھی اپنی حیثیت مت بھولیے...... معاشرے میں آپ کیا مقام رکھتی ہیں۔ وہ آپ بھی اچھی طرح جانتی ہیں اور میں بھی...... میں جا رہا ہوں...... اور دوبارہ کبھی آپ سے ملنے نہیں آؤں گا......" نوازش علی اس کے جذبوں، اس کی محبت، اس کی انا، خودداری، مقام و

مرتبے کی پرواہ کیے بغیر چند لمحوں میں اس کی عزت قدموں تلے روند کر چلا گیا اور وہ مبہوت سی کھڑی تلملانے لگی...... گزشتہ کئی ہفتوں سے محبت کا جو کھیل کھیلا جا رہا تھا وہ آن واحد میں ختم ہو گیا...... اس نے نوازش علی کو بہت مختلف مرد سمجھا تھا...... شاکر علی کی طرح...... مگر...... چمن بیگم نے ٹھیک کہا تھا۔ سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں...... وہ رشتوں کو جذبات کی نہیں عقل کی بنیاد پر پرکھتا ہے...... نگار بیگم نے اسے بہت چاہا تھا...... اس کے اچانک آنے سے اس کی زندگی میں بہار آ گئی تھی...... وہ گیا تو بہار کے سارے رنگ بھی اپنے ساتھ لے گیا...... خزاں کی ساری پژمردگی اور پت جھڑ کی ساری ویرانی اپنے پیچھے چھوڑ گیا تھا...... نگار بیگم ایسی ٹوٹی تھی کہ سنبھل نہیں پا رہی تھی...... نہ اسے رات کو چین آ رہا تھا نہ دن کو قرار...... اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے دل میں ہر وقت کانٹے چبھتے ہوں...... سینے میں کوئی چیز اٹک گئی ہو اور اس سے سانس لینا مشکل ہو رہا ہو۔ وہ بار بار شراب پیتی...... مگر...... شراب کا نشہ بھی اسے اس کی توہین نہیں بھولنے دیتا تھا...... ہر سوچ کے ساتھ ریتا کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے آتا تو اس کی بے چینی اور بڑھ جاتی...... اس نے ریتا کو اپنے کمرے میں بلایا۔ رات گہری ہو رہی تھی۔ ریتا کا دل دہل گیا...... اس سے قدم اٹھانا مشکل ہو رہے تھے۔ وہ ڈرتی ہوئی نگار بیگم کے کمرے میں داخل ہوئی...... نگار بیگم نے اسے گھور کر دیکھا۔

''آ...... آ...... آپ نے مجھے بلایا ہے'' ریتا بمشکل بولی۔

''تم...... تم...... یہاں کیا کرنے آئی ہو...... کیا نگار بیگم کی جگہ لینے...... یا اسے ذلیل کرنے...... یا پھر اسے اس کی نظروں سے گرانے...... یا پھر اس سے اس کا سب کچھ چھیننے...... یا پھر اس کا سب کچھ تباہ کرنے...... یا پھر اسے ہی برباد کرنے...... بتاؤ...... تمہیں کس نے یہاں بھیجا ہے؟''

نگار بیگم نے غصے سے انتہائی اونچی آواز میں چلاتے ہوئے کہا۔

''ن...... ن...... نہیں...... نگار بیگم'' وہ بمشکل تھوک نگلتے ہوئے بولی۔

''جھوٹ مت بولو...... تم نے مجھ سے میرا سب کچھ چھیننے کی کوشش کی ہے'' نگار بیگم شعلہ برساتی آنکھوں کے ساتھ اونچی آواز میں چلائی۔

''کسی نے بھی نہیں......'' ریتا نے بھی آواز میں جواب دیا۔

''مت بولو...... جھوٹ......'' نگار بیگم نے آگے بڑھ کر زور سے ایک تھپڑ اس کے چہرے پر مارا...... ریتا بوکھلا گئی...... اسے قطعی امید نہ تھی کہ نگار بیگم اس کے ساتھ یہ سلوک بھی کر سکتی ہیں...... تھپڑ اس قدر زوردار تھا کہ اس کا سر چکرانے لگا۔

''نگار بیگم...... میں جھوٹ نہیں بولتی'' ریتا نے روتے ہوئے کہا۔

''بدزبان...... ہمارے آگے زبان چلاتی ہو...... ہم تمہاری کھال ادھیڑ دیں گے اور تمہارے منہ سے تمہاری زبان کاٹ کر پھینک دیں گے...... تو نے ہمیں جیتے جی مار ڈالا ہے......'' نگار بیگم نے آگے بڑھ کر کمرے کے دروازے کو چٹخنی لگائی۔ ریتا ڈر گئی...... نگار بیگم نے اپنے کپڑوں کی الماری میں سے ایک کوڑا نکالا اور ریتا پر زور زور سے برسانے لگی...... وہ چیخنے چلانے لگی...... اپنی مدد کے لئے کسی کو پکارنے لگی...... مگر نگار بیگم کے حکم کے بغیر کوئی بھی اس کے کمرے کی طرف نہیں آ سکتا تھا۔ اس نے اس کو ایسی مار ماری تھی کہ اس کی کھال کا کوئی حصہ سلامت نہیں رہا تھا جس میں سے خون نہ رس رہا ہو...... وہ نگار بیگم کے قدموں میں گر گئی تھی...... اس کی منتیں کر رہی تھی۔ رو رو کر اور ہاتھ جوڑ کر اس سے معافی مانگ رہی تھی مگر نگار بیگم کو اس پر رحم ہی نہیں آ رہا تھا۔ اس کے اندر تو ایسا آتش فشاں پھٹ پڑا تھا جو لاوا اگلنے کے بعد بھی کسی طور ٹھنڈا نہیں پڑ رہا تھا بلکہ اس کی شعلہ فشانی میں

مزید اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ نگار بیگم بھی اس پر یونہی تازیانے برسا رہی تھی...... وہ تڑپ رہی تھی...... رو رہی تھی...... سسک رہی تھی...... گڑگڑا رہی تھی مگر نگار بیگم اس پر صرف گرج رہی تھی...... اسے نہ اس کی خدمت یاد تھی...... نہ اطاعت شعاری اور نہ ہی کوئی رفاقت وہ تو ایک وحشی درندے کی مانند اس کی چیر پھاڑ میں مصروف تھی۔ ریتا کی آنکھیں رو رو کر سرخ ہوگئی تھیں اور جسم و چہرہ کوڑے کے نشانات سے پر ہو گیا تھا۔ نگار بیگم بالکل بھول چکی تھی کہ وہ بھی ایک انسان ہے اور کس بے دردی سے ایک انسان کو مار رہی ہے...... ریتا اتنی مار کھا کر نڈھال ہو کر فرش پر گر گئی تھی...... اس کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے اور ان پھٹے کپڑوں سے نظر آتے جسم سے خون رس رس کر کپڑوں کو تر کر رہا تھا...... وہ بے ہوش ہو چکی تھی...... نگار بیگم نے چمن بیگم کو بلایا کہ وہ اسے اس کے کمرے میں چھوڑ آئے۔ اتنی مار مارنے کے باوجود بھی اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ اس کی اپنی سانس پھولنے لگی تھی اور چہرہ تمتما رہا تھا...... وہ کیسی ظالم اور جابر بن گئی تھی...... صرف نوازش علی کی خاطر...... جس کے ساتھ اس نے چند روز محبت کی تھی اور جس کے ساتھ چند راتیں گزاری تھیں...... وہ تو اسے اپنا سب کچھ دے بیٹھی تھی اور وہ بدلے میں اسے کیسی کسک اور چبھن دے کر گیا تھا...... جس سے کسی پل قرار ممکن نہیں تھی...... وہ اسے پچھتاوؤں کی ایسی آگ میں جھونک گیا تھا جس کا ہر شعلہ اس کی روح کو جلا رہا تھا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار کسی سے ایسی محبت کی تھی جس کو اپنا سب کچھ پیش کر دیا تھا...... اور بدلے میں اسے کیا ملا تھا...... توہین...... بے عزتی...... ذلت اور...... ذات کی نفی...... اس شخص نے ایک لمحے کے لئے بھی اس کے بارے میں اس کی محبت کے بارے میں نہیں سوچا تھا اور وہ کس قدر بے رخی سے اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا...... اور...... یہی بات اسے دکھ دے رہی تھی...... اسے تڑپا رہی تھی...... نگار بیگم نے اس رات سب سے زیادہ شراب پی اور مدہوش ہو کر گر گئی۔

ریتا کو مارنے کی خبر ساری حویلی میں پھیل چکی تھی...... ایسی مار کے بارے میں سن کر ہر کوئی حیران ہو رہا تھا اور تاسف کا اظہار کر رہا تھا۔ دلبر کو بھی خبر مل چکی تھی اور اسے بھی بہت دکھ ہوا تھا...... وہ کسی نہ کسی طرح اس کے کمرے میں پہنچنے میں کامیاب ہو گیا...... ریتا خون سے لت پت فرش پر بے ہوش پڑی تھی...... اس نے اس کے رستے زخموں پر مرہم لگائی جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ گرم دودھ میں ہلدی ڈال کر اسے پلائی اور رات بھر وہ اس کے پاس ٹھہرا رہا...... زخموں سے چور بدن کو سہلاتا رہا۔ صبح ہونے سے پہلے وہ اس کے کمرے سے چلا گیا۔

نگار بیگم اتنی مدہوش تھی کہ پورا دن اس کی آنکھ نہ کھلی...... نہ کسی نے نگار بیگم کی خبر لی اور نہ ہی ریتا کی...... دونوں اپنے اپنے زخموں سے نڈھال ہو کر بے ہوش پڑی رہیں۔

دن گزرتے گئے اور ریتا کی طبیعت سنبھلنے لگی...... دلبر اس کا بہت خیال رکھتا...... اس کی دلجوئی کرتا...... دبے دبے الفاظ میں نگار بیگم کے خلاف بولتا...... ریتا خاموش اور پتھرائی آنکھوں سے سب کچھ سنتی رہتی...... اس کی کسی بات کا جواب نہ دیتی...... دلبر اس سے پوچھتا رہتا کہ کس بات پر نگار بیگم نے اس کو مارا تھا۔ مگر وہ کوئی جواب نہ دیتی...... دلبر اس سے پوچھ پوچھ کر تھک گیا تھا مگر وہ خاموش رہتی......

”ریتا...... کچھ تو کہو...... کچھ تو بتاؤ...... کوئی تو بات کرو...... میں کئی روز سے پوچھ پوچھ کر تھک گیا ہوں...... تم کوئی جواب کیوں نہیں دیتی......“ دلبر پوچھ پوچھ کر جھنجلانے لگتا مگر وہ خاموش رہتی جیسے وہ اس کی کوئی بات ہی نہ سنتی ہو۔ جیسے اسے سکتہ ہو گیا ہو...... وہ خود ہی بول بول کر تھک جاتا اور پھر غصے میں وہاں سے چلا جاتا۔

نگار بیگم کی ساری ذمہ داری پھر چمن بیگم نے سنبھال لی تھی...... نگار بیگم بھی کئی روز گزرنے کے باوجود بھی سنبھل نہیں پا رہی تھی...... وہ

نوازش علی کو بھول نہیں پا رہی تھی...... کئی دنوں سے اس نے اپنی باری کے مخصوص دنوں میں بھی رقص نہیں کیا تھا کئی مہمان اس کی خاطر آئے اور چلے گئے...... چمن بیگم نے خود ہی کوٹھے کا انتظام سنبھال لیا تھا...... نگار بیگم کا دل ہر بات سے اچاٹ ہو گیا تھا...... جیسے اسے نہ اپنی زندگی میں دلچسپی رہی تھی اور نہ ہی کوٹھے کی زندگی سے...... وہ ہر وقت نشے میں دھت پڑی رہتی۔ چمن بیگم اسے سمجھاتی رہتی مگر اس کا دل کسی بھی بات کو سننے کو تیار نہیں تھا۔ اسے کوئی بھی بات اچھی نہیں لگتی تھی...... نگار بیگم کے یوں ٹوٹنے سے حویلی ٹوٹ رہی تھی...... ان کا کاروبار ٹھنڈا پڑنے لگا تھا...... اور...... کوٹھے پر رہنے والے ہر شخص کے لئے یہ تشویش کی بات تھی...... نگار بیگم نے جو کچھ کمایا تھا اب خود ہی اپنے ہاتھوں سے برباد کر رہی تھی...... اس نے بڑی محنت سے کندن بیگم کے بعد اپنے پیشے میں نام کمایا تھا اور اب وہی نام ڈوب رہا تھا۔

رینا کی طبیعت بہت بہتر ہو چکی تھی مگر وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ بیٹھی سوچتی رہتی...... اپنی اس خواہش کے بارے میں...... جس کی تکمیل نگار بیگم کے ذریعے ممکن تھی اور اب سب کچھ چکنا چور ہو گیا۔ اس نے اس کے خواب بھی اس کی آنکھوں سے نوچ لیے تھے...... اور اس سے معصومیت بھی...... اس کی شرافت بھی...... اور اس کا تقدس بھی...... اس کا گھر بھی چھین لیا تھا اور گھر والے بھی۔ وہ کہیں کی نہیں رہی تھی...... اجڑ گئی تھی...... برباد ہو گئی تھی اس کا سارا کچھ تباہ و برباد ہو گیا تھا۔ اس کا وجود راکھ کا ڈھیر بن گیا تھا اور اس راکھ میں دبی چنگاریاں ہر وقت سلگتی رہتی تھیں۔

رینا صبح اٹھ کر کچن میں گئی...... چمن بیگم بڑے اہتمام سے نگار بیگم کے لئے جوس بنا رہی تھی...... وہ ہال نما کچن میں جا کر کرسی پر بیٹھ گئی اور خاموشی سے چمن بیگم کی طرف دیکھنے لگی...... جیسے کسی موقع کی منتظر ہو۔ چمن بیگم جوس بناتے ہوئے کسی کام سے کمرے سے باہر نکلی...... کچن میں کوئی بھی موجود نہ تھا وہ خاموشی سے اٹھی اور اپنے دوپٹے کے پلو سے ایک پڑیا نکالی جس میں چوہے مار گولیوں کو پیس کر سفوف بنایا گیا تھا۔ وہ اکثر چوہے مار گولیاں اپنے کمرے میں رکھتی تھی...... کیونکہ اس کے کمرے میں اکثر بہت چوہے ہوتے تھے اور دلبر نے اسے یہ گولیاں لا کر دی تھیں۔ اس نے جلدی سے سفوف جوس میں ڈال کر چمچ ہلائی اور اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گئی۔ چمن بیگم جلدی جلدی کچن میں آئی اور جوس اٹھا کر لے گئی۔ رینا کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیلنے لگی۔

ہر لمحہ...... ہر پل...... ہر ساعت وہ منتظر رہی...... حویلی میں ایک دم کہرام مچنے لگا......

نگار بیگم نے زہر کھا لیا ہے...... اس کی حالت خطرناک ہے...... اسے ہاسپٹل لے جایا جا رہا ہے...... مگر...... ہاسپٹل جانے سے پہلے ہی وہ دنیا...... حویلی...... اپنی جنت...... اور اس کی ساری رنگینیاں چھوڑ کر جا چکی تھی...... ہر آنکھ اشکبار تھی...... ہر کوئی رو رہا تھا...... بین کر رہا تھا...... اور حویلی کا مستقبل سوچ سوچ کر لرز رہا تھا۔

''نگار بیگم کی موت کی خبر ابھی حویلی سے باہر جانے نہ پائے یہی بہتر ہے'' چمن بیگم نے سارے کارندوں کو بلا کر کہا۔ سب خاموش ہو گئے...... نگار بیگم کے دکھ میں ہر دل دکھی اور افسردہ تھا...... مگر...... رینا کا دل بہت خوش تھا۔ اس نے اپنی سب سے بڑی دشمن پر فتح پالی تھی...... یہ اس کی کامیابی کا دن تھا...... وہ اپنے آپ کو مبارک باد دے رہی تھی۔

# (۱۲)

نازی کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ دلہن بنی...... باسط علی کی منتظر تھی۔ پھولوں سے سجی سیج اور خوشبوؤں سے معطر کمرے میں اس کا خوبصورت...... پری پیکر وجود کسی پرستان کا ہوشربا منظر کا عکاس تھا۔ نازی نے اس کمرے کو اپنی پسند کے مطابق آراستہ کیا تھا اور وہ کس قدر خوش تھی۔ اس کا اندازہ کوئی بھی نہیں لگا سکتا تھا۔ شاید وہ خود بھی نہیں...... وہ آنے والے حسین اور پر کیف لمحوں کا تصور کر کے ہی خوش ہو رہی تھی۔ باسط علی کو چاہنا اس کی محبت کو پانا...... اور اس کے حصول میں کامیابی تک اس کو کتنے مشکل مراحل میں سے گزرنا پڑا تھا یہ صرف وہی جانتی تھی۔ اگر اس کی جگہ کوئی کمزور اعصاب کی لڑکی ہوتی تو کب کی ہار مان چکی ہوتی مگر نازی نے اپنے اور باسط علی کے راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو اپنے مصمم ارادے سے دور ہٹایا تھا اور آج وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے پوری کائنات کو فتح کر لیا ہو...... باسط علی کو پانا اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش بن گئی تھی اور اس خواہش کی خاطر اس نے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ عبادت دعائیں اور ہر ممکن جدوجہد اور کوشش کی تھی...... اور آج اس کی خواہش...... تمنا...... آرزو پوری ہونے جا رہی تھی۔

"باسط...... علی" اس نام کو سوچتے ہی اس کا دل خوشی سے جھوم اٹھتا...... اس کے لبوں پر مسکراہٹ سی پھیل جاتی اور اس کا چہرہ تمتمانے لگتا۔

وہ ایک ایک لمحہ...... ایک ایک پل انتہائی اضطراب میں گزار رہی تھی۔

باہر باسط علی بہت بے قرار تھا۔ وہ جیسے ہی نازی کے پاس جانے کے لئے اٹھتا...... اندر سے کوئی شے...... اسے بری طرح روکتی...... کافی وقت گزر گیا تھا اور باسط علی سخت الجھن کا شکار ہو رہا تھا۔

"باسط...... علی...... نازی کی محبت کی یوں توہین مت کرو...... اس نے تمہاری خاطر...... اپنا سب کچھ ختم کر ڈالا اور اب تم" باسط علی کے دل سے صدا بلند ہوئی اور وہ اپنی ہمت یکجا کر کے اٹھا اور نازی کے پاس گیا۔ اس نے دروازہ کھول کر ایک تنگ کمرے کی جانب دیکھا...... اچانک اس کے دل کی حالت بدلنے لگی۔ ایک خوبصورت، پر لطیف اور مسحور کن احساس اس کے رگ و پے میں سرایت کرنے لگا۔ اس کے دل میں نرم و گرم جذبات پیدا ہونے لگے۔ اس کا اضطراب کم ہونے لگا اور پر جوش جذبات سر اٹھانے لگے۔ اس کا دل خوشی کے جذبات سے لبریز ہو کر دھڑکنے لگا...... اس نے بیڈ پر بیٹھی نازنین کی جانب دیکھا اور مسکرا کر اس کی طرف بڑھا۔ اس کے پاس بیٹھ کر محبت پاش نگاہوں سے اس کی جانب دیکھنے کی کوشش کی۔

اسی لمحے شاہ زیب کی نفرت، غم و غصے حسرت اور آنسوؤں سے بھری آنکھیں اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم گئیں۔ اس نے گھبرا کر نازی کی جانب دیکھا۔ اس کا گھونگھٹ اٹھانے کے لئے اس نے اپنے ہاتھ بلند کیے تھے وہ وہیں تھم گئے اس کا دل ایک دم اضطراب سے بھرنے لگا۔ اس کے اندر شدید اداسی سی چھانے لگی۔ اس کا سارا جسم کپکپانے لگا اور پسینے سے تر ہونے لگا۔

''کیا ہوا......؟'' نازی نے اس کی ایک دم بدلتی حالت دیکھ کر قدرے گھبرائے ہوئے پوچھا۔

''معلوم نہیں......'' اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔

''آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی...... آپ یہاں لیٹ جائیں'' نازی نے نرم وگداز مخملیں تکیہ اس کے سر کے نیچے رکھتے ہوئے کہا۔

باسط علی نے پھر نازی کے چہرے کی جانب دیکھنے کے لئے نظریں اٹھائیں تو شاہ زیب کی آنکھیں پھر اسے گھورنے لگیں۔ وہ خوفزدہ ہونے لگا۔

''نہیں ...... یہاں نہیں'' وہ گھبرا کر اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ نازی حیرت سے اسے باہر جاتے ہوئے دیکھتی رہ گئی۔ اس کے جذبات کو شدید ٹھیس لگی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جس محبت کو پانے کی خاطر اس نے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ اس منزل تک پہنچنے کے لئے اس نے کیا کیا تکلیفیں نہیں اٹھائی تھیں۔ اس منزل پر پہنچ کر وہ پھر خالی ہاتھ کھڑی تھی۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ تشنہ اور مضطرب ہوگئی تھی۔ جیسے پیاسا کنوئیں کے پاس جا کر بھی پیاسا رہ جاتا ہے...... مگر پیاس مزید بڑھ جاتی ہے...... اس کے مشتعل جذبات سلگنے لگے۔ وہ ہچکیاں لینے لگی اور سسکیاں بھرنے لگی۔ باسط علی کی حالت اس کے سامنے تھی...... نجانے وہ کیوں اتنا بدل گیا ہے...... اور اس حد تک بدل جائے گا اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

وہ اسے کیا کہے...... اور اب کیا کرے......؟ وہ عجیب دوراہے پر کھڑی تھی۔ سخت مخمصے اور الجھن کا شکار ہو رہی تھی۔ اسے شاہ زیب یاد آنے لگا جو انتہائی محبت سے اس کی جانب بڑھا تھا اور اس نے اس کا محبت بھرا ہاتھ بری طرح جھٹک دیا تھا۔ شاید اس کا دل بھی یونہی ٹوٹا ہوگا...... اسی طرح کرچی کرچی ہوا ہوگا...... وہ رونے لگی...... کبھی کبھی قدرت کس قدر خاموشی سے انتقام لیتی ہے کہ انسان کو خود بھی خبر نہیں ہو پاتی اور وہ بری طرح بوکھلا جاتا ہے۔ ''شاہ زیب......'' وہ زیر لب آہستہ آہستہ بڑبڑائی اور رونے لگی......

باسط علی نیند کی گولی کھا کر سو گیا۔ اگلے روز اس کی حالت قدرے سنبھلی تو وہ نازنین کے پاس آیا۔ نازی کا چہرہ بہت مرجھایا ہوا اور آنکھیں بہت اداس تھیں۔ جن میں تیرتی ہوئی نمی واضح دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ہر دم پھیلی مسکراہٹ، خوشی اور شادابی کہیں گم ہوگئی تھی۔

''اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟'' نازی نے باسط علی کی جانب دیکھتے ہوئے آہستہ آواز میں پوچھا۔

''ٹھیک ہوں......'' باسط علی نے جواب دیا۔

دونوں کے درمیان گہری خاموشی چھا گئی۔ یوں...... جیسے ایک دوسرے کو کچھ کہنے کے لئے الفاظ ختم ہوگئے ہوں...... کسی کے پاس نہ کہنے کو بات رہی ہو اور نہ پوچھنے کو سوال مگر دونوں کے مضطرب دل اندر ہی اندر بری طرح تلملا رہے تھے۔

''مجھے معاف کر دو......'' باسط علی بہت دیر نظریں جھکائے ہوئے بولا۔

نازی جواباً خاموش رہی...... اور...... اس کی جانب حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتی رہی۔

''نازی...... تم'' باسط علی نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے اسے پکارا نازی نے کوئی جواب نہ دیا...... اور سرد آہیں بھرنے لگی۔

''نازی...... تم...... کچھ بول کیوں نہیں رہی؟'' باسط علی نے مضطرب ہو کر کہا اور اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھوں کو اپنے

ہاتھوں میں لیتے ہوئے وہ نم آنکھوں سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔

نازی پھر بھی خاموش رہی۔۔۔۔۔اور اس کی خاموشی باسط علی کے دل کو مضطرب کرنے لگی۔۔۔۔۔نازی نے خاموشی سے نظریں جھکائیں اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ کرنے لگے۔ وہ سسکیاں بھرنے لگی۔

نازی۔۔۔۔۔میں۔۔۔۔۔تم سے بہت۔۔۔۔۔وہ رکا اور نازی کی تھوڑی کو اپنے ہاتھ سے اوپر کر کے اس کا چہرہ بغور دیکھنے لگا۔ نازی کی خوبصورت بھیگی پلکیں، اس کے اندر شدید جذباتی کیفیت پیدا کرنے لگیں، اس کا دل بے قابو ہونے لگا۔

''میری طرف دیکھو۔۔۔۔۔'' اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا تو نازی نے آہستہ آہستہ اپنی نم آنکھیں کھول کر اس کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھیں رونے کی وجہ سے سرخی مائل ہو رہی تھیں اور ان آنکھوں میں نمی کے ساتھ ساتھ بے حد اداسی اور حسرت دکھائی دے رہی تھی۔ ویسی ہی حسرت۔۔۔۔۔اور۔۔۔۔۔ویسا ہی دکھ۔۔۔۔۔ جو شاہ زیب کی آنکھوں میں دکھائی دیتا تھا۔

اس کے سامنے نازی کی غمگین۔۔۔۔۔اور آنسوؤں سے بھری آنکھیں تھیں۔۔۔۔۔ مگر وہ ان آنکھوں میں شاہ زیب کی آنکھوں کا عکس دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک دم گھبرا گیا۔۔۔۔۔

نازی سے پیچھے ہٹ گیا۔ نازی کی طرف دیکھتے ہوئے اسے خوف آنے لگا اس کا چہرہ اور جسم پھر پسینے سے تر ہونے لگے۔۔۔۔۔وہ اسے چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ نازی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔۔۔۔۔سب کچھ بہت عجیب اور انوکھا ہو رہا تھا۔۔۔۔۔اس کی آہیں اور سسکیاں کمرے کی فضا میں بلند ہونے لگیں مگر ان کو سننے والا کوئی نہیں تھا۔

☆

کئی روز سے برفباری کا سلسلہ بند ہو گیا تھا مگر ہوا میں شدید خنکی تھی۔ یخ بستہ ہواؤں نے ساری بستی کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ سر شام ہی لوگ اپنے گھروں میں دبک کر بیٹھ جاتے۔ بہت کم لوگ ادھر ادھر چلتے پھرتے نظر آتے۔ باسط علی کو چائے کی شدید طلب ہو رہی تھی۔ وہ چائے پینے کے لئے شیرے کے کھوکھے کی جانب چل پڑا۔ آہستہ آہستہ رات کے تاریک سائے ہر جانب پھیلنے لگے تھے۔ باسط علی سویٹر اور کوٹ کے اوپر ایک لمبا برساتی کوٹ پہنے سڑک پر جا رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے یخ جھونکے اس کے ہاتھ پاؤں کو سن کر رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے ہاتھ پاؤں میں جان اور حرارت ہی نہ ہو۔ اچانک اسے دور ایک درخت کے نیچے آگ کے شعلے بلند ہوتے دکھائی دیے۔ آگ کو دیکھ کر اس کے اندر شدید تمنا پیدا ہوئی کہ وہ فوراً اس آگ تک پہنچ جائے وہ لمبے لمبے قدم اٹھاتا، اس آگ تک پہنچ گیا۔ آگ کے پاس سائیں منا گھٹنوں میں سر دبائے بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ ٹھنڈی یخ زمین پر یونہی آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ میلا کچیلا پھٹا ہوا کمبل اس نے اپنے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ باسط علی اسے دیکھ کر ٹھٹکا۔

''آ۔۔۔۔۔گئے۔۔۔۔۔تم۔۔۔۔۔؟ مجھے پتہ ہے۔۔۔۔۔تم۔۔۔۔۔کیوں بار بار میرے پاس آتے ہو۔۔۔۔۔میرے پاس کچھ نہیں۔۔۔۔۔کچھ نہیں ملے گا۔۔۔۔۔ یہاں سے۔۔۔۔۔اس کے پاس چلے جاؤ، سب کچھ اس کے پاس ہے۔۔۔۔۔ میرے پاس کچھ نہیں۔۔۔۔۔کچھ نہیں۔۔۔۔۔'' سائیں نے خفگی سے کہا۔

باسط علی خاموشی سے اسے دیکھنے لگا "تو اپنے دل کو اس سے چھپائے چھپائے پھرتے ہو...... نا...... مگر اسے سب خبر ہے...... یہ پاک صاف نہیں ہوگا...... جب تک کر تو اسے اس پانی سے نہ دھوئے...... ماسٹر کا ہے کو خوار ہو رہا ہے۔ تو بھی سچی بات جانتا ہے اور وہ بھی۔ کیا تیرے اندر اک آگ نہیں جلتی رہتی......؟" ماسٹر نے چونک کر سائیں کو دیکھا، وہ مسکرانے لگا اور بلند آواز میں کلام پڑھنے لگا۔

سچ آکھ منا کیوں ڈرنا اے

اے سچ پچھے توں ترنا اے

سچ صدا آبادی کرنا اے

سچ دست اپنجا آئی اے

گل لوکاں روکے پائی اے

پُٹھو آکھاں تے کجھ بیچ اے

سچ آکھاں بھانبڑ مچدا اے

جی دوہاں گلاں تو پچدا اے

سچ سچ کے جیہا کہندی اے

منہ بات نہ آئی رہندی اے

ماسٹر باسط سے وہاں رکنا مشکل ہو گیا۔ انہوں نے وہاں سے جانے میں ہی عافیت جانی۔ سائیں ہنسنے لگا۔

☆

نازی رفتہ رفتہ شدید ڈپریشن کا شکار ہونے لگی تھی۔ ان کی شادی کو تین ماہ گزر گئے تھے اور باسط علی نے ایک بار بھی اس کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دیا تھا۔ وہ جب بھی اس کے قریب آتا۔ نجانے اسے کیا ہو جاتا اور اس کی حالت بہت عجیب ہونے لگتی۔ دل گھبرانے لگتا اور جسم پسینے سے تر ہو جاتا...... وہ بہت چاہتے ہوئے بھی ایک قدم اس کی جانب بڑھ نہیں پایا تھا۔ ہر دفعہ دونوں کے درمیان شاہ زیب آ کر کھڑا ہو جاتا تھا لیکن یہ بات صرف باسط علی جانتا تھا۔ نازی اس بات پر یقین نہیں کرتی تھی ایک دو بار باسط علی نے اسے شاہ زیب کی مداخلت کے بارے میں بتایا تو وہ غصے میں آ گئی۔

"باسط علی...... اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کے لئے...... کسی اور کو مت الزام دو...... شاہ زیب بھلا کیوں ہماری زندگیوں میں مداخلت کرے گا" نازی نے غصے سے بپھرے ہوئے جواب دیا۔

"نازی...... میں...... سچ کہہ رہا ہوں...... وہ...... ہر بار...... میرے اور تمہارے درمیان آ جاتا ہے" باسط علی نے نم آنکھوں سے جواب دیا۔

"اس کا...... کیا مطلب ہے؟" نازی نے اسے غصے سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"معلوم نہیں...... میں کچھ نہیں جانتا" باسط علی نے جواب دیا۔

"جب تم کچھ جانتے نہیں..... تو اس بات کا ذکر ہی بے معنی ہے..... میں نے تم سے محبت..... شاہ زیب سے پہلے کی..... تمہاری خاطر میں نے اسے جھٹلایا..... میرا اور اس کا رشتہ تم سے زیادہ قریبی اور ٹھوس تھا۔ جب اس نے مجھے کچھ نہیں کہا..... تو..... تمہیں وہ کیسے کہے گا" نازی نے غصے سے کہا۔

"نجانے کیوں..... مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ میں نے شاہ زیب کے ساتھ کچھ غلط کیا ہے" باسط علی نے آہ بھر کر کہا۔

"اور..... میرے ساتھ..... جو کچھ تم کر رہے ہو..... اس کے لئے تمہیں کوئی افسوس..... کوئی دکھ..... کوئی پچھتاوا نہیں ہو رہا....." نازی نے دکھی لہجے میں پوچھا۔

"ہوتا..... ہے..... مگر....." باسط علی نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"مگر..... شاید..... تم کسی قابل نہیں" نازی نے تلخ لہجے میں کہا تو باسط علی نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

"کیا مطلب.....؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

"میں نے تمہاری محبت اور چاہت کی خاطر کیا کچھ نہیں کیا۔ عزت، دولت، شان و شوکت..... سب کچھ داؤ پر لگا دیا مگر تمہاری محبت کے لمس اور احساس سے ابھی تک محروم ہوں..... ایک عام..... نارمل مرد..... بھی محبت کے احساس کو ضرور اپنے اندر محسوس کر کے اس کا اظہار کرتا ہے اور ان تین مہینوں میں تم ایک بار بھی میرے لئے اپنے اندر محبت کی وہ آگ نہیں سلگا سکے جس کی تمنا میں..... میں نے اتنا کچھ کیا ہے۔ تم جب بھی میرے پاس آتے ہو..... گیلی سلگتی ہوئی لکڑی کی طرح آتے ہو اور میرے اندر سرد راکھ کی ٹھنڈک بھر دیتے ہو..... باسط علی اگر تم اس قابل نہیں تھے..... تو..... پھر میرے ساتھ یہ کھیل..... کیوں کھیلا..... پہلے..... میرے اندر اتنی آگ بھڑکائی کہ میں باہر کی ہر آگ میں کود جانے کو تیار ہو گئی اور اتنی آگ بھڑکا کر اب اس پر خود ہی پانی ڈال رہے ہو..... کیا تم میرے ساتھ ظلم نہیں کر رہے..... تمہیں احساس ہی نہیں ہو رہا کہ تم میرے اندر کیسا دھواں بھر رہے ہو..... تم مجھے بنجر بنا رہے ہو..... میرا سب کچھ چھین رہے ہو..... تم..... مجھ سے وہ محبت چھین رہے ہو جس کو پانے کے لئے میں نے سب کچھ کیا..... مجھے اب تم سے محبت نہیں..... نفرت ہونے لگی ہے" نازی روتے ہوئے غصے سے بولی۔

باسط علی نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ اس کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔ اسے ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ نازی یوں شدید ردعمل کا اظہار کرے گی۔

"مجھ سے..... نفرت.....؟" باسط علی نے حیرت سے بوکھلائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"ہاں..... تم سے نفرت..... اور یہ نفرت بھی..... اس محبت کی طرح دن بدن شدید ہونے لگی ہے..... جو میں کبھی تم سے کرتی تھی" نازی نے غصے سے پھنکارتے ہوئے کہا تو باسط علی کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔

"یہ..... تم..... کیا کہہ رہی ہو؟" باسط علی نے بے یقینی سے پوچھا۔

"وہی..... جو..... تم..... سن رہے ہو" اس نے اکڑ کر جواب دیا۔

''ایسا.....مت کہو.....تم.....مجھ سے نفرت نہیں کر سکتی.....'' باسط علی نے پریشانی سے کہا۔

''کیوں نہیں کر سکتی.....اگر میں تم سے محبت کر سکتی ہوں.....تو.....نفرت بھی کر سکتی ہوں.....اور یہ میرے بس میں ہے'' وہ الفاظ چبا کر بولی۔

''کیا.....تم.....واقعی مجھ سے.....نفرت کرنے لگی ہو؟'' باسط علی نے گھبرا کر پوچھا۔

''ہاں.....'' اس نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

باسط علی کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگیں اور وہ روتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ نازی بھی سسکنے لگی۔

یہ سب کیا ہو گیا تھا.....اور.....کیا ہو رہا تھا.....انہوں نے ایسا تو بالکل بھی نہیں چاہا تھا.....انہوں نے تو اپنی محبت کو نبھانے کے خواب دیکھے تھے محبت کی خوبصورت راہوں پر چلنے کے.....محبت کا امرت رس پینے کے.....محبت کے سنگ زندگی گزارنے کے.....محبت کی خوشبو میں بسی سانسوں کو محسوس کرنے کے.....محبت کے میٹھے اور خوشگوار لمس کے سنگ جینے کے.....مگر.....سب کچھ الٹ ہو گیا تھا.....وہ محبت کی خوشبو.....اس کا احساس اور اس کا لمس کیسے محسوس کر پاتے.....محبت ہی ان کی زندگیوں سے کہیں غائب ہو گئی تھی جیسے چاند بادلوں کے پیچھے اپنا چہرہ ایک بار دکھا کر کہیں غائب ہو جاتا ہے۔ ویسے ہی محبت اپنی خوبصورتی دکھا کر کہیں غائب ہو گئی تھی.....شاید ہمیشہ کے لئے.....سارے خواب چکنا چور ہو گئے تھے۔ سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ بس اب راکھ باقی تھی.....اور وہ اس راکھ میں سے دبی چنگاریوں کو تلاش کرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔

باسط علی رو رہا تھا.....نازی رو رہی تھی.....مگر دونوں ایک دوسرے کے غم کو دور نہیں کر سکتے تھے۔ نازی کے دل میں پیدا ہونے والی نفرت کو باسط علی اپنی محبت سے نہیں بدل سکتا تھا.....کیونکہ اس کی محبت میں اب نہ طاقت باقی تھی نہ شدت اور نہ ہی حدت.....نازی اس سے بہت دور جا چکی تھی اور وہ نازی کی طرف قدم بڑھانے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا دونوں مضطرب تھے اور پریشان تھے.....دونوں کے دل آہستہ آہستہ محبت کے اس جذبے سے خالی ہو رہے تھے جس سے کبھی ان کے دل بہت سرشار تھے۔

☆

شہر کے بہت بڑے ہسپتال میں شاہ زیب کی آنکھوں کا آپریشن ہوا تھا۔ اس کا آپریشن بہت پیچیدہ اور مشکل تھا۔ ڈاکٹر بھی بہت پریشان تھے اور قبل از وقت کچھ نہیں بتا سکتے تھے۔ زیتون بانو کا رو رو کر برا حال ہو گیا تھا۔ تمام دوست واحباب، مزارع اور ملازمین اس کے لئے دعا گو تھے۔ اچانک کیا ہو گیا تھا۔ نازی کے جانے کے بعد شاہ زیب بے حد پریشان اور مضطرب رہتا تھا۔ اپنی ہی سوچوں میں گم رہتا.....اس نے کسی سے بات چیت کرنا بھی چھوڑ دی تھی۔ رات رات بھر جاگتا رہتا، نیند تو گویا اس سے روٹھ گئی تھی اور اس کے اندر کی حالت کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس کا دل ہر وقت بے قرار اور مضطرب رہتا۔ کسی پل چین نصیب نہ ہوتا۔ سوتے میں بھی اور جاگتے میں بھی نازی اس کی آنکھوں سے اوجھل نہ ہوتی۔ کسی سے بات کرتے ہوئے اچانک اس کی آنکھیں نم ہونے لگتیں اور تنہائی میں اس کی آنکھوں سے ہر وقت آنسو گرتے رہتے۔ اس نے اپنے دل کو سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی مگر دل اس کی کوئی بات سننے اور سمجھنے کو تیار ہی نہیں تھا۔ انہی دنوں اس سے بہت عجیب وغریب حرکتیں سرزد ہونے لگیں۔ کبھی سوتے ہوئے وہ اچانک اٹھ کر چلنے لگتا اور کبھی سب دوستوں کے درمیان بیٹھے ہوئے اور باتیں کرتے ہوئے اچانک اٹھ کر چلا جاتا۔ سب اس کی حرکتوں پر

حیران ہونے لگتے۔ کبھی اپنے کیے کام خود ہی بگاڑ دیتا اور کبھی برسوں سے بھولے ہوئے کام اچانک کرنے لگتا۔ اس کے اردگرد رہنے والے لوگ اور قریبی ملازمین بھی اس کی حرکتوں اور اس میں آنے والی تبدیلیوں کو جان کر پریشان ہو جاتے...... ایسی ہی ایک حرکت اس نے چند روز پہلے کی تھی۔ آدھی رات کو نجانے اسے کیا ہوا تھا۔ اس نے ڈیرے سے اپنی گاڑی نکالی اور بہت تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا نامعلوم منزل کی جانب چل پڑا ورنہ اس سے قبل وہ ہمیشہ اپنے ڈرائیور کے ساتھ جاتا تھا۔ ڈرائیور ڈیرے پر ہی سو رہا تھا مگر اس نے اسے اٹھانا مناسب نہ سمجھا......

ڈرائیونگ کرتے ہوئے نازی اور باسط علی مسلسل اس کی آنکھوں کے سامنے تھے۔ اس کی آنکھوں میں بار بار نمی آ رہی تھی۔ اچانک اسے اپنی گاڑی کے سامنے کوئی جانور بھاگتا ہوا نظر آیا۔ اس نے اسے ہارن دے کر بچانے کی کوشش کی۔ اندھیرے میں...... نم آنکھوں کے ساتھ اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا کہ اس کی گاڑی کے سامنے کیا ہے۔ اس نے بریک لگانے کی کوشش کی مگر سڑک پر گہرا کھڈا دکھائی نہ دیا اور گاڑی بری طرح اچھلتی ہوئی سڑک کے کنارے ایک بہت بڑے درخت سے بری طرح ٹکرائی۔ گاڑی کے شیشے ٹوٹ کر اس کے چہرے اور آنکھوں میں گھس گئے۔ سارا چہرہ خون سے تر ہو گیا۔ وہ چلاتا رہا مگر اس کی آواز سننے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ تڑپ تڑپ کر بے ہوش ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک ٹریکٹر وہاں سے گزرا تو اس کو فوراً ہسپتال پہنچایا اور اس کے گھر میں اطلاع دی گئی۔

ڈاکٹروں نے فوراً اس کی آنکھوں کا آپریشن کیا مگر وہ کچھ زیادہ پر امید نہیں تھے۔ آپریشن کے بعد جب اس نے آنکھیں کھولیں تو ہر طرف اسے تاریکی چھائی ہوئی دکھائی دے رہی تھی...... وہ رونے لگا۔

''میں کچھ نہیں دیکھ سکتا...... کچھ بھی نہیں...... اپنے ہاتھ بھی نہیں...... اپنا جسم بھی نہیں...... کچھ بھی نہیں...... مجھے ہر طرف اندھیرا نظر آ رہا ہے......'' وہ شدت جذبات سے روتا ہوا چیخنے چلانے لگا۔

کمرے میں موجود اس کی ماں اور سب دوست احباب اس کی حالت دیکھ کر رونے لگے۔

''ڈاکٹر صاحب...... اللہ کے واسطے کچھ کریں...... میرے بیٹے کو میری آنکھیں لگا دیں......'' زیتون بانو نے روتے ہوئے ڈاکٹر کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ باندھ کر کہا۔

''کاش...... کچھ ممکن ہوتا تو ہم ضرور کرتے...... مگر ہم بے بس ہیں...... خدا سے دعا کریں کہ وہ اپنا کرم کر دے'' ایک ادھیڑ عمر ڈاکٹر نے کہا تو زیتون بانو ان کی بات سن کر بچوں کی طرح بلکنے لگی۔ اس کے خوبصورت جواں سال بیٹے کی دنیا اندھیر ہو گئی تھی۔ شاہ زیب سے بھی یہ صدمہ برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ کئی روز کے علاج کے بعد جب وہ گھر آیا تو اسے شدید ڈپریشن ہونے لگا۔ اس کے لئے ہر جگہ تاریک تھی۔ گھر کے اندر بھی اور باہر بھی نجانے روشنیاں کہاں گم ہو گئی تھیں...... جیسے اس کی خوشیاں...... وہ دیواروں کو ٹٹول ٹٹول کر چلتا تو زیتون بانو اسے دیکھ کر رونے لگتی۔ اچانک اسے ٹھوکر لگتی اور وہ گرنے لگتا تو زیتون بانو تڑپ اٹھتی اگرچہ ڈاکٹر نے اس کے ہاتھ میں چھڑی تھمائی تھی مگر چھڑی پکڑنے کی اسے عادت ہی نہیں تھی۔ چھڑی کو زمین سے اٹھا کر چلتا تو گرنے لگتا۔ دن میں کئی بار اسے یاد نہ رہتا کہ اب وہ دیکھ نہیں سکتا اور ہڑبڑا کر بستر سے اٹھ کر کھڑا ہوتا اور اچانک ہی پاس رکھی کسی شے سے بری طرح ٹکرا کر گرنے لگتا۔ زیتون بانو یا پاس کھڑے ملازمین بھاگ کر اس کو سہارا دیتے اور ان کے سہارے چلتے پر وہ بے

حد بے بسی محسوس کرتا۔ بیڈ پر لیٹے ......اٹھتے بیٹھتے...... ہر لمحہ...... ہر پل وہ آہیں بھرتا رہتا...... سسکیاں لیتا رہتا اور آنسو گراتا رہتا۔

''شاید......اب یہ ٹھوکریں ہی میرا مقدر ہیں'' وہ آہ بھر کر سوچتا اور اپنی بے بسی پر آنسو بہاتا رہتا۔

''میرے مولا......تو نے میرے بیٹے کو یہ کیسی سزا دی ہے......اتنی بڑی آزمائش میں ڈال دیا ہے جس شخص کی آنکھیں نہ ہوں......تو اس کے پاس......باقی......کیا رہ جاتا ہے۔ نہ دنیا دکھائی دے اور نہ دنیا کے لوگ......نہ اپنا آپ نظر آئے اور نہ ہی کوئی اور......یہ کیسی ادھوری زندگی ہے اگر اس کا باپ زندہ ہوتا تو صدمے سے ہی مر جاتا'' زیتون بانو روتے ہوئے سوچتی۔

''اماں جی......اب میں زمینوں کی دیکھ بھال کرنے کے قابل نہیں رہا......میرا خیال ہے آپ سب کچھ بیچ دیں'' شاہ زیب نے ایک روز ماں سے کہا جب مزارعے اس کے پاس اس کے منشی کی شکایتیں لے کر آئے۔

''شاہ زیب......یہ تم کیا کہہ رہے ہو......میں پشتوں سے سونا اگلتی زمینوں کو بیچ دوں......جانتے ہو......تمہارے باپ دادا نے کتنی محنت سے ان کو آباد کیا......یہ زمینیں ہماری شان اور عزت ہیں......ہم اپنی عزت کو بیچ دیں......یہ ناممکن ہے'' زیتون بانو نے کہا۔

''تو......پھر......کیا کریں......؟'' شاہ زیب نے آہ بھر کر پوچھا۔

''اگر کوئی قابل اعتبار شخص مل جائے......تو......'' زیتون بانو کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

''قابل اعتبار......کہاں سے ملے گا؟ جس پر سب سے زیادہ اعتبار کرنے کی کوشش کی وہی سب سے بڑا بے اعتبار نکلا'' شاہ زیب نے باسط علی کے بارے میں سوچتے ہوئے جواب دیا۔

''دنیا میں صرف وہی قابل اعتبار نہیں تھا......غلطی ہماری بھی تھی جو ہم نے بغیر جانچے پرکھے اس پر اعتبار کیا'' زیتون بانو نے جواب دیا۔

''میں نے سب کچھ جاننے کے باوجود بھی......کر لیا؟'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

''کیا تم باسط علی کے بارے میں سب کچھ جانتے تھے؟'' زیتون بانو نے حیرانگی سے پوچھا۔

''ہاں......'' وہ آہستہ آواز میں بولا۔

''پھر بھی تم نے اس پر کیوں بھروسہ کیا؟''

''وہ نازی کی خوشی تھا......اور......وہ اس کی خاطر یہاں آیا تھا......اس کے بلانے پر......میں نے بھی سوچا کہ اگر قدرت نے میرے نصیب میں خوشیاں نہیں لکھیں تو اس میں کسی کا کیا قصور......دوسروں کو ان کی خوشیاں ملنی چاہئیں......'' شاہ زیب نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''یہ......ساری آگ نازی نے ہی لگائی ہے......اگر وہ کسی اور سے دل لگی نہ کرتی تو آج تیرا گھر بسا ہوتا......تیری اولاد ہوتی......اور مجھے تیری کوئی فکر نہ ہوتی'' زیتون بانو نے غصے سے کہا۔

''اماں جی شاید قدرت کو نازی کی خوشیاں بہت عزیز تھیں......اگر آج وہ میرے پاس ہوتی تو میری آنکھوں کی تاریکی اسے مجھ سے دور لے جاتی......پھر شاید میرے لئے یہ بات بہت تکلیف دہ ہوتی......اگر میری بیوی مجھے اس حالت میں چھوڑ کر چلی جاتی'' شاہ زیب نے کچھ سوچتے

ہوئے جواب دیا تو زیتون بانو نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

''اماں جی..... قدرت کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے شاید اس نے میرا بھرم رکھا..... یا..... پھر نازی کا'' شاہ زیب نے پھر کہا تو زیتون بانو خاموشی سے اس کی جانب دیکھنے لگی، اس کی باتوں میں چھپی سچائی نے زیتون بانو کو خاموش کر دیا۔

''اماں جی..... پہلے میں خدا سے شکوہ کرتا تھا کہ اس نے نازی کو مجھ سے کیوں چھینا..... اب آنکھیں چھن جانے کے بعد میں نے یہ شکوہ کرنا چھوڑ دیا ہے..... جانتی ہیں..... کیوں.....؟'' شاہ زیب نے گہری سانس لیتے ہوئے پوچھا۔

''کیوں.....؟'' زیتون بانو نے حیرت سے پوچھا۔

''نازی..... میرے دل کی خوشی تھی اور آنکھیں سب سے بڑی نعمت ..... نعمت..... خوشی سے زیادہ ضروری ہے..... جب نعمت نہ رہے تو خوشی کا کیا کرنا..... شاید انسان کو خوشی کبھی نہ کبھی ..... کہیں نہ کہیں مل جاتی ہے مگر نعمت ایک بار چھن جائے تو پھر کبھی نہیں ملتی'' شاہ زیب نے آہ بھر کر کہا تو زیتون بانو حیرانگی سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔

''کیا تم..... خاموش بیٹھ کر یہی باتیں سوچتے رہتے ہو؟'' زیتون بانو نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں..... اللہ سے اپنے بارے میں بہت کچھ پوچھتا ہوں'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

''کیا مطلب.....؟'' زیتون بانو نے چونک کر پوچھا۔

''بہت سی باتیں بہت سے سوال..... بہت کچھ..... جو..... شاید میں اپنی روشن آنکھوں سے اس سے کبھی نہ پوچھتا..... اب وہ سب پوچھتا ہوں'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

''شاہ زیب..... بیٹا..... یہ تم کیسی باتیں کرنے لگے ہو؟ کیا تم جانتے ہو..... تم کیا کہہ رہے ہو؟'' زیتون بانو نے بے یقینی سے پوچھا۔

''ہاں..... کیا آپ کو یقین نہیں آ رہا؟'' شاہ زیب نے بھی حیرت سے پوچھا۔

''معلوم نہیں.....'' زیتون بانو نے آہ بھر کر جواب دیا۔

شاہ زیب خاموش ہو گیا اور زیتون بانو اس کی بے نور آنکھوں کی جانب حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

''تو..... جو کچھ مرضی کہہ..... مگر اس نے تیرے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے..... خدا اس کو کبھی سکھ نہ دے..... وہ کبھی خوش نہ رہے..... جس کو پانے کے لئے اس نے تجھے چھوڑا ہے کبھی اس کو نہ ملے.....'' زیتون بانو نے نم آنکھوں سے آہ بھر کر کہا۔

''نہ..... اماں جی..... یوں..... اس کو بددعا نہ دیں.....'' شاہ زیب نے گھبرا کر کہا۔

''کیوں نہ دوں..... تجھے دیکھ کر میرا دل کتنا دکھی ہوتا ہے..... کتنا روتا ہے..... اور نہ چاہتے ہوئے بھی میرے دل سے اس کے لئے بددعائیں نکلتی ہیں اور تم دیکھنا..... وہ کبھی بھی خوش نہیں رہے گی'' زیتون بانو نے روتے ہوئے کہا۔

''اماں..... جی..... ایسا مت کہیں..... اللہ ناراض ہو جائے گا.....'' شاہ زیب اپنی چھڑی کے سہارے ٹک ٹک کرتا ہوا اماں کے پاس

صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔

''اور...... جو...... کچھ اس نے تمہارے ساتھ کیا...... اللہ اس سے ناراض نہیں ہوگا؟'' زیتون بانو نے غصے سے پوچھا۔

''پتہ نہیں ہوتا وہ کس سے کس بات پر ناراض ہو جائے...... اور...... اگر وہ ناراض ہو گیا...... تو...... پھر......'' شاہ زیب نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''پھر...... کیا......؟'' زیتون بانو نے حیرت سے پوچھا۔

''پھر...... انسان جیتے جی مر گیا...... اس کے پاس کچھ بھی نہیں رہتا...... اس کی کشتی ڈوب جاتی ہے......'' شاہ زیب نے دیوار کی جانب اپنی نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے جواب دیا۔

''شاہ زیب...... ہم...... دنیا دار انسان ہیں...... ہمیں انسان ہی رہنے دو...... یہ لمبی چوڑی اللہ والی باتیں مت کرو...... ہمیں غصہ بھی آتا ہے اور ہم دکھی بھی ہوتے ہیں ہم خوش بھی ہوتے ہیں اور ناراض بھی...... ہم عام انسان ہیں...... ہم ایک وقت اللہ سے شکوے اور دوسرے لمحے اس کا شکر بھی ادا کرنے والے معمولی انسان ہیں...... میں نہیں جانتی...... تم کیا کچھ سوچتے رہتے ہو مگر...... میں جو سوچتی ہوں...... وہی کہوں گی۔ اس لڑکی سے میں نے بھی بہت محبت کی۔ اسے اپنا جگر کا ٹکڑا سمجھا اور وہ مجھے ہی دھوکہ دیتی رہی...... مجھے بھی احساس ہی نہیں ہونے دیا کہ وہ مجھے بھی دھوکہ دے رہی ہے اور مجھے بے وقوف بناتی رہی...... میرا دل کتنا جلتا ہے میں تمہیں بتا نہیں سکتی'' زیتون بانو غصے سے بولیں۔ شاہ زیب ان کی باتیں سن کر خاموش ہو گیا۔

زیتون بانو اسے گھورتی ہوئیں کمرے سے باہر نکل گئیں۔

☆

ماسٹر باسط علی شیرے کے کھوکھے میں بیٹھا چائے پینے میں مصروف تھے۔ اخبار ان کے سامنے پڑا تھا اور وہ اس پر طائرانہ نظریں دوڑا رہے تھے۔

''ماسٹر صاحب کوئی نئی تازی خبر سنائیں؟'' شیرے نے مسکرا کر ان کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کوئی خاص خبر نہیں......'' ماسٹر باسط علی نے سرسری سا جواب دیا۔

''ماسٹر جی...... یہ کیا بات ہوئی...... پورے اخبار میں کوئی خبر ہی نہیں......؟'' شیرے نے حیرت سے پوچھا۔

''وہی پرانی خبریں ہیں...... کوئی نئی نہیں'' ماسٹر باسط علی نے منہ بنا کر جواب دیا اور چائے پینے لگے۔

''کیسر آتا ہے...... وہ تو...... بڑی مزے دار خبریں سناتا ہے...... آپ کہتے ہیں...... تو مان لیتا ہوں......'' شیرے نے بے یقینی سے کہا اور باہر جا کر چائے بنانے لگا۔

سائیں مٹھا اپنے موٹے ڈنڈے کو چھن چھن کرتا شیرے کے پاس سے گزرا۔

''ارے...... اس سے کیا خبریں پوچھتا ہے...... جسے اپنی خبر نہیں......'' سائیں نے ہنس کر کہا۔

"سائیں جی...... آپ کو کیسے پتہ چلا میں تو یہ بات کھوکھے کے اندر کر رہا تھا اور آپ تو ابھی آئے ہیں......" شیرے نے حیرت سے پوچھا۔

"تو......اس بات کو چھوڑ......بتا...... تو...... کیا خبر سننا چاہتا ہے......اور کس کی؟" سائیں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"میں تو...... میں...... تو......؟" شیرا گھبرا گیا اور آنکھیں پھاڑے سائیں کی جانب دیکھنے لگا۔

"چل...... تو...... ماسٹر سے پوچھ...... بچوں کو پڑھا پڑھا کر پاگل ہو رہا ہے......اور اپنی کتاب کھول کر نہیں پڑھتا۔ ماسٹر ایک دم بوکھلا گیا"

سائیں نے قہقہہ لگایا اور بلھے شاہ کا کلام مست ہو کر اونچی آواز میں پڑھنے لگا۔

علموں بس کریں او یار، علم نہ آوے وچ شمار

اکو الف تیرے درکار، جاندی عمر دا نئیں اعتبار

علموں بس کریں او یار، پڑھ پڑھ علم لگاویں ڈھیر

قرآن، کتاباں، چار چوفیر

کردے چانن وچ ہنیر

باجوں رہبر، نہ سار

علموں بس کریں او یار

پڑھ پڑھ ملا ہوئے قاضی

اللہ مسلماں باجے راضی

ہوئے حرص دنوں دن تازی

نفع نیت وچ گزار

علموں بس کریں او یار

پڑھ پڑھ مسلے روز سناویں

کھانا شک شبہے دا کھاویں

دسیں ہور، تے ہور کماویں

اندر کھوٹ باہر سچیار

علموں بس کریں او یار

سائیں پڑھتا رہا اور ماسٹر باسط علی گھبرا کر وہاں سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور باہر چلے گئے۔ شیرا حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔ سائیں بے ہنگم قہقہے لگانے لگا۔

☆

نازی کو ڈپریشن کے شدید دورے پڑنے لگے تھے۔ وہ باسط علی سے سخت نفرت کرنے لگی تھی۔ اس کی طرف دیکھتے ہی منہ دوسری جانب پھیر لیتی۔۔۔۔۔۔ تنہائی میں روتی رہتی۔ اپنے آپ کو کوستی۔۔۔۔۔۔ اپنے کیے پر پچھتاتی اور اپنی قسمت پر آنسو بہاتی رہتی۔

باسط علی کو ایک کالج میں سرکاری ملازمت مل گئی تھی۔ وہ زیادہ تر وقت کالج میں مصروف رہتا۔ شام کو ٹیوشنز پڑھا کر گھر آتا تو نازی کھانا اس کے سامنے رکھ کر اپنے کمرے میں جا کر دروازہ اندر سے بند کر لیتی شاید اس امید پر کہ باسط علی کبھی نہ کبھی تو اس کے دروازے پر دستک دے گا۔۔۔۔۔۔ اور وہ اس کے لئے دروازہ کھول کر اس کے لئے اپنی نفرت کا اظہار کرے گی۔۔۔۔۔۔ اپنے غصے کا اظہار کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکالے گی مگر باسط علی نے اسے ایسا موقع نہ دیا تھا۔ وہ منتظر رہتی اور۔۔۔۔۔۔ وہ اسے مضطرب رکھتا۔

ان کی شادی کو پانچ ماہ گزر گئے تھے۔۔۔۔۔۔ اور ان پانچ مہینوں کا ایک ایک لمحہ اضطراب۔۔۔۔۔۔ بے قراری۔۔۔۔۔۔ بے چینی اور اذیت سے پر تھا۔۔۔۔۔۔ ایک لمحے کے لئے بھی دونوں کو سکون میسر نہیں آیا تھا۔۔۔۔۔۔ جس خوشی کو پانے کے لئے انہوں نے ایک دوسرے سے محبت کی تھی وہ خوشی کہیں کھو گئی تھی۔ انہیں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے خوشیاں ان سے روٹھ گئی ہوں۔۔۔۔۔۔ بس وہ زندگی گزار رہے تھے۔ سانسیں لے رہے تھے۔ دن پورے کر رہے تھے۔ ایک دوسرے سے بےزار۔۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔۔ متنفر۔۔۔۔۔۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ باسط علی لاؤنج میں رکھے صوفے پر نیم دراز تھا اور آنکھیں بند کر کے سونے کی ناکام کوشش کر رہا تھا مگر اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ اچانک نازی کے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ ننگے پاؤں چیختی چلاتی ہوئی گیٹ کی جانب بھاگی۔ باسط علی نے چونک کر اس کی جانب دیکھا اور اس کے پیچھے لپکا۔۔۔۔۔۔ آگے بڑھ کر اس کے بازو کو مضبوطی سے پکڑا۔

''چھوڑ۔۔۔۔۔۔ دو۔۔۔۔۔۔ مجھے۔۔۔۔۔۔ مر جانے دو۔۔۔۔۔۔ مجھے۔۔۔۔۔۔ میں زندہ نہیں رہنا چاہتی۔۔۔۔۔۔ چھوڑ دو مجھے۔۔۔۔۔۔'' نازی نے غصے سے چلاتے ہوئے کہا اور اپنے بازو کو چھڑانے کی کوشش کی۔

''اندر۔۔۔۔۔۔ چلو۔۔۔۔۔۔ رات کے۔۔۔۔۔۔ اس وقت۔۔۔۔۔۔ کہاں۔۔۔۔۔۔ جا رہی ہو؟'' باسط علی نے بمشکل کہا اور اس کو بازو سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے اندر لایا۔

''تم۔۔۔۔۔۔ کون ہوتے ہو۔۔۔۔۔۔ مجھے روکنے والے۔۔۔۔۔۔ چھوڑو۔۔۔۔۔۔ مجھے'' نازی نے پھر بازو چھڑانے کی کوشش کی۔

''نازی۔۔۔۔۔۔'' وہ غصے سے چلایا۔

نازی نے چونک کر اس کی جانب دیکھا اور زور زور سے رونے چلانے لگی۔

''کیا تم مجھے مار ڈالو گے۔۔۔۔۔۔ قتل تو۔۔۔۔۔۔ تم مجھے پہلے ہی کر رہے ہو۔۔۔۔۔۔ اب میری لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر دو گے۔ میں نے تمہارے ساتھ نہیں رہنا۔۔۔۔۔۔ چھوڑو۔۔۔۔۔۔ مجھے'' نازی نے پھر بازو چھڑا کر باہر کی جانب بھاگنا چاہا۔

''نازی۔۔۔۔۔۔ چپ ہو جاؤ۔۔۔۔۔۔ اور اندر چلو'' وہ اسے زبردستی اندر لے کر آیا اور اسے صوفے پر دھکا دے کر دروازے کو لاک لگا دیا۔ نازی بلند آواز میں چلانے لگی۔۔۔۔۔۔ اپنے بال نوچنے لگی۔۔۔۔۔۔ اپنے چہرے پر تھپڑ مارنے لگی۔

''یہ۔۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔۔ کیا کر رہی ہو؟'' باسط علی نے اس کے ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''میں زندہ نہیں رہنا چاہتی.....تم نے میری زندگی عذاب میں ڈال رکھی ہے.....میں مرجانا چاہتی ہوں.....زندہ نہیں رہنا چاہتی.....''
نازی چیختے چلاتے اور سینہ کوبی کرتے ہوئے بولی۔

''میں.....میں.....تم.....سے'' باسط علی کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے.....وہ مایوسی اور شرمندگی سے نظریں جھکائے اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

''تم دنیا کے سب سے زیادہ ظالم اور کمینے انسان ہو.....تم نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا ہے'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ اس قدر شدت سے رو رہی تھی کہ باسط علی اس کے رونے سے گھبرا گیا۔

اس کو پھر ابال اٹھا اور وہ پھر باہر کی جانب بھاگنے لگی۔ باسط علی نے پھر اس کو پکڑا اور اپنے سینے کے ساتھ لگا کر رونے لگا۔ وہ بھی سسکنے لگی۔ جیسے اچانک تپتی دھوپ میں کسی شجر سایہ دار کے نیچے آ کر پرسکون ہوگئی ہو۔ وہ اسے پیار سے سہلاتا رہا۔

''میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا'' باسط علی نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

''اور.....میں.....تمہاری محبت کے بغیر.....مر جاؤں گی'' نازی نے سسکتے ہوئے جواب دیا۔

باسط علی اس کی بات سن کر خاموش ہوگیا۔

''تم میں کیا خامی ہے.....جو تمہارے اور میرے درمیان حائل ہو رہی ہے'' نازی نے اپنا موڈ بدل کر نم آنکھوں سے قدرے نرم لہجے میں پوچھا۔

''شاہ زیب.....'' ''میں جب بھی تمہارے قریب آتا ہوں اور تمہیں چھونے کی کوشش کرتا ہوں.....نجانے وہ کہاں سے آ جاتا ہے اور میری طرف غم و غصے اور حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا ہے کہ میں خوفزدہ ہو جاتا ہوں.....نازی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے.....جیسے ہمیں شاہ زیب کی بددعا لگ گئی ہے۔ ہم ایک دوسرے کے پاس اور اتنے قریب ہو کر بھی ایک دوسرے کو نہیں پا سکتے'' باسط علی نے صاف گوئی سے اسے بتا دیا۔

''بددعا.....اور.....شاہ زیب.....نہیں.....کبھی نہیں.....وہ کبھی ہمیں بددعا نہیں دے گا.....وہ ایسا انسان نہیں تھا'' نادانستہ نازی کے منہ سے نکلا۔

''ہاں.....اور.....ایسے انسانوں کا بدلہ خدا.....خود لیتا ہے.....نازی.....تم.....میری بات کا یقین کرو.....ہمارے ساتھ ضرور کچھ ایسی بات ہو رہی ہے کہ.....'' باسط علی الجھتے ہوئے بولا۔

''ایسا.....کچھ بھی نہیں.....میں نہیں مانتی.....مجھے ایسا کچھ محسوس نہیں ہوتا.....یہ صرف تمہارا وہم ہے اپنے ذہن سے سب کچھ نکال دو.....آج صرف تم اور میں.....صرف ہم دونوں.....آج ہم ایک دوسرے کو محسوس کریں گے.....ایک دوسرے کا محبت بھرا لمس.....'' نازی نے محبت سے اس کے سینے کے ساتھ لگ کر کہا۔ نازی کی محبت بھری میٹھی باتوں اور سرگوشیوں سے باسط علی کے اندر برقی روسی دوڑنے لگی۔ اس کا اندر متحرک ہونے لگا اور اس کے جذبات رفتہ رفتہ بیدار ہونے لگے۔ اس نے محبت سے نازی کی پیشانی پر اپنے لب رکھ دیئے۔ وہ مسکرانے لگی جیسے برستی پھوار سے لطف اندوز ہو رہی ہو۔ نازی نے اپنی بند آنکھیں آہستہ آہستہ کھول کر اس کی جانب مسکرا کر محبت بھرے انداز میں کہا۔

''تمہاری محبت کا لمس کتنا میٹھا ہے'' نازی نے سرگوشی کی۔

باسط علی نے بھی مسکرا کر اس کی جانب دیکھا اور پھر دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ اسے نہیں...... شاہ زیب کی آنکھوں کو دیکھ رہا تھا...... وہ ایک دم گھبرا گیا اور پسینے سے تر ہونے لگا۔ اس کا جسم بری طرح کانپنے لگا۔

''وہ...... پھر......'' وہ کہہ کر بجلی کی سی سرعت کے ساتھ نازی کے پاس سے اٹھا اور باہر بھاگنے لگا۔

''آج...... تم...... یوں...... نہیں جا سکتے...... مجھے...... تشنہ چھوڑ کر......'' نازی نے چلاتے ہوئے اس کا بازو پکڑا۔

''میں...... نہیں...... جانتا...... مجھے کیا ہو رہا ہے'' باسط علی بے بسی سے بولا۔

''باسط...... علی...... اپنی کمزوریوں پر پردے مت ڈالو...... تم...... میرے جذبات کے ساتھ کھیل رہے ہو...... اگر...... آج...... تم...... مجھے چھوڑ کر چلے گئے...... تو...... پھر...... دوبارہ کبھی میری طرف نہیں آ سکو گے...... کبھی بھی نہیں'' نازی نے خونخوار آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے دھمکی دی اور تن کر اس کے آگے کھڑی ہو گئی۔ باسط علی غصے کا شکار ہو گیا۔

''تم...... سمجھتی کیوں نہیں؟'' وہ بے بسی سے بولا۔

''میں...... کچھ نہیں سمجھنا چاہتی'' اس نے قطعیت سے جواب دیا۔

''کیا...... تمہیں...... مجھ پر یقین نہیں رہا؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں''

''اور...... میری محبت پر بھی نہیں......؟''

''تم نے اس کا اظہار کب کیا ہے...... جس پر میں یقین کروں'' نازی نے خفگی سے جواب دیا۔

''میں...... بہت...... مجبور ہوں...... کوئی شے اندر سے مجھے تمہاری طرف آنے سے روکتی ہے'' باسط علی نے نم آنکھوں سے جواب دیا۔

''کب تک ایسا ہوتا رہے گا......؟'' نازی نے غصے سے پوچھا۔

''معلوم...... نہیں'' وہ آہ بھر کر بولا۔

''ٹھیک ہے...... میں اب تمہارا انتظار نہیں کروں گی...... باسط علی اب ہم دونوں ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ ہمیں ایک دوسرے کو چھوڑنا پڑے گا'' نازی نے رک رک کر کہا۔

''چھوڑنا...... پڑے گا...... یہ...... یہ...... تم کیا کہہ رہی ہو......؟ خدا کے لئے...... ایسی باتیں مت سوچو'' باسط علی نے گھبرا کر کہا۔

''میں سوچ نہیں رہی...... اب ایسا کر کے دکھاؤں گی'' وہ قدرے جذباتی انداز میں بولی۔

''کیا...... تم...... مجھے چھوڑ دو گی؟'' باسط علی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......'' اس نے قطعیت سے جواب دیا۔

''کیا......تم جانتی ہو......تم کیا کہہ رہی ہو؟ کیا تم......؟'' باسط علی حیرت سے بولا۔

''ہاں......میں......تمہیں چھوڑ دوں گی......اور تمہارے بغیر زندہ بھی رہوں گی......عورت اگر کسی سے شدید محبت کرتی ہے تو وہ اس سے کہیں زیادہ نفرت بھی کر سکتی ہے اور......اب تم میرے دل سے نکل چکے ہو......میں تم سے نفرت کرتی ہوں......مجھے تم سے طلاق چاہیے'' نازی نے اس کی طرف دیکھ کر......آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''طلاق......'' وہ چلایا۔

''ہاں......طلاق......آج......ابھی......اور اسی وقت......'' وہ جذباتی انداز میں بولی۔

''نہیں......میں......تمہیں طلاق نہیں دے سکتا'' باسط علی نے سسکتے ہوئے کہا۔

''اب......میں......مزید کوئی بات نہیں سنوں گی......میں نے تمہاری خاطر بہت کچھ کیا......مگر تم بہت بے قدرے نکلے......تم نے میری محبت اور میری قربانیوں کی ذرا بھر قدر نہیں کی......میں اب تم سے محبت کی مزید بھیک نہیں مانگ سکتی......تم نے مجھے......میری ہی نظروں میں بے وقعت کر دیا ہے......میری عزت اور انا کو بری طرح کچل دیا ہے......اب مجھے تم پر اعتبار نہیں رہا......تم بہت بے قدرے......کم ظرف......حقیر اور ظالم انسان ہو'' نازی نے قدرے چلاتے ہوئے کہا۔

''نازی......خدا کے لئے......طلاق کا ذکر مت کرو......ہم......بہت......جلد......'' باسط علی نے پھر کچھ کہنا چاہا۔

''نہیں......اب کچھ بھی ممکن نہیں......مجھے ابھی طلاق چاہیے'' وہ پر زور الفاظ میں بولی۔

''کیا......کوئی راستہ......؟'' باسط علی نے پھر کچھ کہنا چاہا۔

''کچھ بھی ممکن نہیں......اب......مجھے مزید مت آزماؤ......میں تم سے نجات چاہتی ہوں......میں تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی......مجھے تم سے نفرت ہے......شدید نفرت......اتنی نفرت کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے......اس محبت سے کئی گنا زیادہ نفرت......جو میں نے تم سے کی......اور شاید جو میری بہت بڑی بھول تھی'' نازی غصے سے نفرت بھرے لہجے میں بولی۔

''ٹھیک ہے میں تمہیں طلاق دیتا ہوں......میں تمہیں طلاق دیتا ہوں......میں تمہیں طلاق دیتا ہوں'' وہ بمشکل بولا......اور کہہ کر جلدی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

نازی بلند آواز سے رونے لگی......چلانے لگی......ماتم کرنے لگی......اپنی قسمت پر نوحہ خوانی کرنے لگی......جب انسان کچھ پانے کے لئے آخری حد تک کوشش کرتا ہے......اور اسے بری طرح مات ہوتی ہے تو وہ کتنا تلملاتا ہے......کتنا تڑپتا اور کتنا روتا ہے۔ اپنے آپ کو کتنا بے بس اور بے وقعت پاتا ہے......اس پر اس کی حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے......تب اسے اپنی حیثیت اور اوقات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے......کہ......وہ کیا ہے......؟ اور کیا نہیں......؟ اپنی بے وقعتی اور کم مائیگی کا احساس اسے شدت سے دلاتا ہے۔ جس خواہش اور امید کے بھروسے پر وہ بہت کچھ کر گزرنے کے خواب دیکھتا ہے اور اس خواب کو حقیقت کا رنگ دینے کے لئے اپنی ہر ممکن کوشش کرتا ہے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیتا ہے......اور جب وہ خواب ٹوٹتا ہے......حقیقت بے رنگ ہو جاتی ہے......خواہش اور امید......مایوسی و نا امیدی میں بدل جاتی ہے......تب اس کا اندر ذرہ ذرہ خاک میں بدل جاتا

ہے۔۔۔۔۔سب کچھ ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔۔۔۔۔نازی کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔اس نے اپنی محبت کو پانے کے لئے ہر طرح کی جدوجہد اور قربانی دی تھی مگر منزل تک پہنچ کر وہ بالکل خالی ہو گئی تھی۔اس کے ہاتھ میں سوائے راکھ کے کچھ نہیں آیا تھا۔۔۔۔۔اور یاسر علی کا بھی سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔۔۔۔۔وہ بھی اپنی محبت میں بہت پرجوش تھا اور نازی کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار تھا۔اس کی خاطر اس نے ملک میں ہوتے ہوئے دیس نکالا منظور کیا تھا۔اپنے ماں باپ اور بہنوں سے جدائی برداشت کی تھی۔۔۔۔۔وہ بھی نازی کی طرح پرعزم تھا مگر اس کے ہاتھ بھی کچھ نہیں آیا تھا۔شاید دونوں کو کسی کی بری نظر لگ گئی تھی یا پھر کوئی بددعا۔۔۔۔۔دونوں کا سفر رائیگاں گیا تھا۔۔۔۔۔دونوں کی جدوجہد اکارت گئی تھی اور دونوں نامراد ٹھہرے تھے۔دونوں کے پاس سوائے تاسف۔۔۔۔۔دکھ اور مایوسی کے کچھ باقی نہیں رہا تھا۔

☆

شاہ زیب ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا۔اس نے بہت عجیب خواب دیکھا تھا۔اس نے یاسر علی اور نازی کو روتے ہوئے دیکھا تھا۔وہ پریشان ہو گیا اور اپنی چارپائی سے اٹھنے لگا۔چارپائی کے ساتھ رکھی اپنی چھڑی ٹٹولنے لگا مگر وہ ہاتھ نہ آئی تو مایوسی سے پھر بیٹھ گیا۔

نجانے رات کا کون سا پہر تھا۔اب اسے کچھ اندازہ نہیں ہوتا تھا دن کا پتا اسے پرندوں کی آوازوں اور لوگوں کی باتوں سے ہوتا تھا۔۔۔۔۔اور رات کا تعین وہ اس کی خاموشی اور گیدڑوں کی آوازوں سے لگاتا۔

وہ کئی راتوں سے یہ خواب دیکھ رہا تھا۔کبھی نازی کو پریشان دیکھتا تو کبھی یاسر علی کو۔۔۔۔۔اور اب دونوں کو روتے ہوئے دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا تھا۔

"یہ۔۔۔۔۔ناممکن ہے۔۔۔۔۔ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہیں۔۔۔۔۔اور نازی نے اس کی محبت کو پانے کے لئے مجھے جھٹلایا۔۔۔۔۔مجھے اپنے قریب نہ آنے دیا۔۔۔۔۔اپنا سب کچھ اس کی خاطر چھوڑ دیا میرا یہ خواب جھوٹا ہے۔" شاہ زیب نے اپنے دل میں سوچا۔

"مگر۔۔۔۔۔" وہ اگلے ہی لمحے سوچ میں پڑ گیا۔۔۔۔۔اس کے ساتھ کچھ عرصے سے ایک عجیب معاملہ ہو رہا تھا۔وہ اکثر ایسے خواب دیکھنے لگا تھا جو اگلے ہی دن یا اس سے اگلے دن سچ ثابت ہو جاتے تھے۔وہ بہت چونکنے لگا تھا۔۔۔۔۔اور اس نے ڈرتے ہوئے اس بات کا ذکر کسی سے نہیں کیا تھا۔۔۔۔۔یا۔۔۔۔۔یوں ہونے لگا تھا۔۔۔۔۔کہ جیسے ہی اس کے ذہن میں کوئی بات آتی۔۔۔۔۔آئندہ چند گھنٹوں میں وہ بات ویسے ہی سچ ثابت ہو جاتی۔۔۔۔۔ایسا اس کے ساتھ اس کی بصارت کے زائل ہونے کے تھوڑے عرصے بعد ہونا شروع ہو گیا تھا اور اسے اپنے آپ پر بہت تعجب اور حیرانگی ہونے لگی تھی۔وہ اپنے آپ سے الجھنے لگا تھا۔

زیتون بانو نے اپنے ایک بھانجے بہرام خان کو دوسرے گاؤں سے اپنی زمینوں کی دیکھ بھال کے لئے بلایا تھا۔بہرام خان ایف اے پاس سنجیدہ مزاج اور سلجھا ہوا انسان تھا۔اس کے ساتھ اس کی بیوی اور چھ سالہ بیٹا خرم خان بھی آ گئے تھے۔ان لوگوں کے آنے سے حویلی میں بہت رونق ہو گئی تھی۔شاہ زیب کا دل خرم کے ساتھ بہت زیادہ لگ گیا تھا۔بہرام خان روزانہ شاہ زیب کو ڈیرے پر لے جاتا اور ہر بات میں اس سے صلاح و مشورہ کرتا۔مزارعوں کے مسائل اور زمینوں و فصلوں کے بارے میں ساری ہدایات شاہ زیب کی مانی جاتیں۔بہرام خان بہت ایماندار اور نیک دل انسان تھا۔اس کے آنے سے زیتون بانو اور شاہ زیب دونوں پرسکون ہو گئے تھے۔

شاہ زیب بہت رنجیدہ ہو رہا تھا۔ وہ نازی اور باسط علی کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا۔ رات کو وہ نیند سے بیدار ہوا تھا اور اب سہ پہر ہو رہی تھی مگر اسے چین نہیں آ رہا تھا۔ اسے نازی اور باسط علی یاد آ رہے تھے۔......اس کا دل چاہ رہا تھا وہ کسی سے ان کے بارے میں پوچھے مگر......کس سے؟ کسی کو بھی ان کے بارے میں کوئی خبر نہ تھی......

''شاہ زیب بھائی......آپ اتنے اداس کیوں بیٹھے ہیں؟'' بہرام خان شاہ زیب کے پاس چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''کچھ نہیں......یونہی......'' شاہ زیب نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''کیا......آپ......اپنی آنکھوں کی وجہ سے پریشان ہیں؟'' بہرام خان نے پوچھا تو شاہ زیب کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

''نہیں......اپنی......بے بسی پر'' شاہ زیب نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''کاش......کچھ ممکن ہوتا'' بہرام خان نے افسردگی سے جواب دیا۔

''ہاں......لیکن کچھ باتیں ممکن ہوتے ہوئے بھی ناممکن ہو جاتی ہیں......انسان تو ہر معاملے میں بے بس ہے نا......سانسوں سے لے کر......اپنی قسمت تک......ہر اک بات میں'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

''ہاں......آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں......لیکن آپ یوں اداس مت ہوں......خوش رہا کریں......زندگی کو بھرپور طریقے سے گزاریں۔ بزرگوں سے سنا ہے کہ جب خدا اپنے بندوں سے کوئی ایک نعمت چھینتا ہے تو اس کے بدلے میں اسے......اس سے بڑی نعمت سے نوازتا ہے......ہو سکتا ہے......اللہ آپ کو اپنے کسی بہت بڑے کرم سے نواز دے'' بہرام خان نے کہا۔

''ہاں......وہ......نواز رہا ہے......میں بھی یہ محسوس کر رہا ہوں'' نادانستہ شاہ زیب کے منہ سے نکلا۔

''کیا مطلب......؟'' بہرام خان نے چونک کر پوچھا۔

''کچھ نہیں......'' شاہ زیب بوکھلا گیا......مگر اس کا چہرہ اس کی زبان کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔

''شاہ زیب......بھائی......بتائیں......آپ کیا بات محسوس کر رہے ہیں؟'' بہرام خان نے اصرار کرتے ہوئے پوچھا۔

''بہت عجیب......سی......باتیں......میں اکثر جو کچھ سوچتا ہوں وہ اسی طرح پورا ہو جاتا ہے......اور جو خواب دیکھتا ہوں وہ حقیقت بن جاتے ہیں......اور......وہ رکا اور......کیا......؟'' بہرام خان نے متجسس ہو کر پوچھا۔

''اور......جب کسی بات کی خواہش اچانک دل میں پیدا ہو جائے تو وہ فوراً پوری ہو جاتی ہے......اور......ذہن میں کوئی سوال اٹھتا ہے......تو......اللہ......مجھے وہ سب کچھ سمجھا دیتا ہے......مختلف عجیب نہ سمجھ آنے والے سوالات کی شکلیں اور تصویریں میرے ذہن میں آنے لگتی ہیں۔ بہرام خان میں بہت حیران ہونے لگا ہوں......اس سے پہلے......کبھی میرے ساتھ ایسا نہیں ہوا تھا......جب سے میری آنکھیں چلی گئی ہیں......تب سے ایسا ہونے لگا ہے'' شاہ زیب نے کہا۔

''واہ......شاہ زیب بھائی......یہ تو بڑی ہی عجیب باتیں ہیں......شاید دنیا والوں کی نظر میں یہ کوئی اہمیت نہ رکھیں......مگر......اللہ والوں کی نظر میں یہ اللہ کا آپ پر بہت بڑا کرم اور اس کا انعام ہے......'' بہرام خان نے فرط جذبات سے لبریز آواز کے ساتھ کہا۔

"بہرام خان.....ان باتوں کا ذکر کسی سے نہ کرنا.....نجانے کیوں مجھے بہت ڈر لگتا ہے" شاہ زیب نے جواب دیا۔

"آپ....فکر نہ کریں.....آپ مجھے اپنا ہمراز سمجھیں....." بہرام خان نے محبت سے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کہا تو وہ مسکرا دیا۔

بہرام خان رفتہ رفتہ اس کی پہلے سے بھی زیادہ عزت اور احترام کرنے لگا تھا۔ وہ اسے یوں کھڑا ہو کر ملتا جیسے وہ کوئی بہت معزز اور قابل احترام ہستی ہو.....صبح اس سے.....رات کو دیکھنے والے خواب کے بارے میں پوچھتا اس کے ذہن میں اچانک ابھرنے والی سوچوں اور خیالات کے بارے میں پوچھتا ہر کام کرنے سے پہلے اس کی دعائیں لیتا.....اور اس کو دیکھتے ہوئے بہت سے کارندے اور مزارعے بھی اس سے دعائیں کرنے کو کہتے.....اور وہ ہر بار صرف مسکرا دیتا۔

☆

الف اللہ چنبے دی بوٹی مرشد من وچ لائی ہو

نفی اثبات دا پانی ملیا ہر رگے ہر جائی ہو

اندر بوٹی مشک مچایا جان پھلن پر آئی ہو

جیوے مرشد کامل باہو جنہیں ایہہ بوٹی لائی ہو

سائیں مٹھا.....سڑک کے عین وسط میں بلند آواز میں صوفیانہ کلام پڑھتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ اس نے اپنی کشکول کو رسی سے باندھ کر گلے میں لٹکا رکھا تھا اور ہاتھ میں اکتارہ پکڑا ہوا تھا۔ کبھی رک کر وہ دھمال ڈالنے لگتا اور کبھی بلند آواز میں کلام پڑھنا شروع کر دیتا۔

ماسٹر باسط علی نے اسے دور سے دیکھا تو سائیں کی پرسوز آواز کے سحر سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا.....اور اس کے قدم خود بخود اس کی جانب اٹھنے لگے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب آ گیا.....سائیں نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا اور پھر کلام پڑھنے لگا۔

عاشق ہوویں تے عشق کماویں

دل رکھیں وانگ پہاڑاں ہو

لکھ لکھ بدیاں ہزار الا ہے

کر جائیں باغ بہاراں ہو

منصور جیے چک سولی دتے

جیہڑے واقف کل اسراراں ہو

"ماسٹر جی.....کاہے کو وقت ضائع کر رہا ہے میں تجھے بار بار کہہ رہا ہوں.....جا.....چلا جا.....اگر نہ گیا تو ساری زندگی ہاتھ ملتا رہ جائے گا.....وقت گزر جائے تو پھر واپس نہیں آتا.....وہ بھی چلا گیا.....تو پھر واپس کبھی نہیں آئے گا.....تو اسے ڈھونڈتا رہ جائے گا.....ساری زندگی" سائیں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"کیسے جاؤں......اور......کس منہ سے جاؤں......ہمت نہیں کر پاتا......میں بہت کمزور انسان ہوں......بہت کمزور" ماسٹر باسط علی نے آہ بھر کر جواب دیا۔

"ارے......انسان تو......ہے......ہی......کمزور......پر......ہمت کرے تو......پہاڑ سے بھی زیادہ ہمت اس میں آجاتی ہے......مولا سے مدد مانگ......یہاں......ادھر......ادھر......پھرتا رہتا ہے......وقت ضائع کرتا ہے......اس کے پاس چلا جا......تجھے سکون آجائے گا......" سائیں نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"ڈر لگتا ہے......" باسط علی نے آہستہ آواز میں کہا۔

"کس بات سے......؟" سائیں نے حیرت سے پوچھا۔

"اگر......اس نے مجھے دھتکار دیا......تو......پھر......کہاں جاؤں گا......پھر......میں......برداشت نہیں کر پاؤں گا" ماسٹر باسط علی نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

"تو......اسے جانتا نہیں......اس کا دل سمندر ہے......"

دل، دریا سمندروں ڈونگے

کون دلاں دیاں جانے ہو

"ہمت کر......کوشش کر......مرد بن......کاہے کو پاگل ہو رہا ہے یوں وقت ضائع کرتا رہا تو ایک دن یہیں مر جائے گا......پاگل نہ بن" سائیں نے خفگی سے کہا اور پڑھنے لگا

رات اندھاری مشکل پینڈا اسے نے آون تھوڑے ہو

"اچھا......دیکھتا ہوں" ماسٹر باسط علی نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

"تو......بڑا ہی بزدل ہے......جا دفع ہو......مر یہاں سے......" سائیں نے ایک دم غصے سے کہا اور اسے گھورتے ہوئے سڑک پر لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

ماسٹر باسط علی تاسف سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔

"سائیں ٹھیک کہتا ہے......مجھے......ہمت کرنی چاہیے۔اس سے ایک بار ملنے کی کوشش کرنی چاہیے" ماسٹر باسط علی نے پہلی بار اپنے دل کو سمجھانے کی کوشش کی اور آگے بڑھ گیا۔

☆

نازی......ثروت کے گھر......دو دنوں سے بے ہوش پڑی تھی۔اس کا بخار کسی طرح کم نہیں ہو رہا تھا......وہ تھوڑی دیر کے لئے آنکھیں کھولتی......پھر رونا شروع کر دیتی......ہچکیاں بھرتی، کبھی سسکیاں لیتی اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی۔ثروت مسلسل اس کی تیمارداری کر رہی تھی۔اسے بہت سمجھاتی مگر وہ تو گویا ثروت کی کوئی بات سننے کو تیار ہی نہ تھی۔ثروت بولتی رہتی اور وہ اس کی جانب یوں دیکھتی جیسے اس کی کوئی بات سن ہی نہ

رہی ہو...... یا...... پھر چھت کو گھورتی رہتی۔

''نازنین...... میں سوچ رہی ہوں...... کیوں...... نا تمہیں ہاسپٹل ایڈمٹ کرا دوں...... کیونکہ تمہارا بخار تو کسی طرح کم ہی نہیں ہو رہا'' ثروت نے تھرمامیٹر سے اس کا بخار چیک کرتے ہوئے کہا۔

نازی مسلسل چھت کو گھور رہی تھی۔

''تمہیں نجانے کیا ہو گیا ہے...... ہاسپٹل جانے سے تمہیں کیوں خوف آتا ہے...... وہاں ڈاکٹرز کی کیئر میں رہو گی...... مجھ سے...... تو تم...... دوائی بھی نہیں کھاتی...... اور یہ بخار اسی لئے کم نہیں ہو رہا...... کیونکہ تم میڈیسن نہیں لیتی......'' ثروت نے قدرے خفگی سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ نازی کی آنکھوں سے آنسو مسلسل بہہ بہہ کر اس کے تکیے میں جذب ہو رہے تھے۔ اس نے ثروت کی کسی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ بس چھت کو گھور رہی تھی اور آنسو اس کی آنکھوں سے مسلسل بہہ رہے تھے۔

''کب تک...... کب تک...... تم یونہی پڑی رہو گی؟'' ثروت نے اس کے قریب کرسی پر بیٹھ کر اس کا گرم، تپتا ہوا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے قدرے نرمی سے کہا، نازی نے کوئی جواب نہ دیا۔

''نازنین...... تم...... کچھ تو کہو...... جس روز سے تم یہاں آئی ہو...... ایک بار بھی مجھ سے بات نہیں کی...... مجھے کچھ تو بتاؤ...... باسط علی کہاں ہے......؟ میں اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہی ہوں...... مگر وہ کہیں نہیں مل رہا...... وہ کہاں چلا گیا ہے؟'' ثروت نے حیرت سے پوچھا تو باسط علی کا نام سن کر اس کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے اور وہ پھر ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع ہو گئی۔

''کیا بات ہے...... تم رو کیوں رہی ہو؟ کیا باسط علی سے کوئی جھگڑا ہوا ہے؟'' ثروت نے اس کے چہرے پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

نازی کی ہچکیوں میں اضافہ ہونے لگا۔

''خدا کے لئے...... نازنین...... کچھ تو بتاؤ...... نہ تم کچھ بتا رہی ہو...... اور...... نہ ہی اس سے رابطہ ہو رہا ہے...... پھر مجھے کیسے پتہ چلے گا...... کہ...... تم لوگوں کی پرابلم کیا ہے......؟'' ثروت نے پھر نرم لہجے میں اسے کہا۔

نازی پھر خاموش رہی...... اور کوئی جواب نہ دیا۔

ثروت حیرت سے اس کے چہرے کی جانب دیکھتی رہی۔

''ٹھیک ہے...... تم نے کچھ نہیں بتانا...... تو...... نہ بتاؤ...... میں ہاسپٹل میں فون کرتی ہوں کہ وہ ایمبولینس بھیج دیں...... اور...... اب میں تمہیں زبردستی ہاسپٹل میں ایڈمٹ کراؤں گی'' ثروت نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

نازی کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے اور اس نے گھبرا کر ثروت کی جانب دیکھا۔

''مجھے...... مر جانے دو...... میں زندہ نہیں رہنا چاہتی'' نازی ایک دم چلاتے ہوئے بولی۔

''کیوں...... زندہ نہیں رہنا چاہتی؟'' ثروت نے چونک کر پوچھا۔

''اس نے مجھے دھوکہ دیا ہے...... بہت بڑا دھوکہ'' نازی اسے بتا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''کس نے...... کیا ساحل نے......؟'' ثروت نے پھر چونک کر پوچھا۔

''ہاں...... جس کی خاطر...... میں نے سب کو چھوڑا...... سب کچھ قربان کیا...... سب کچھ......'' وہ رونے لگی اور اپنے سر کے بال اپنے ہاتھوں کی مٹھیوں میں بھر کر انہیں نوچنے لگی۔

''کیسا...... دھوکہ......؟ کیا...... وہ کسی اور میں دلچسپی لینے لگا ہے؟'' ثروت نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں...... اس نے میری محبت کو جھٹلایا ہے...... مجھے...... مجھے دھتکارا ہے......'' وہ پھر رونے لگی۔

''کیا...... کیا ہے...... اس نے...... مجھے ٹھیک طرح سے بتاؤ'' ثروت نے جھنجھلا کر کہا۔

''اس نے مجھے طلاق دے دی ہے'' نازی نے کہا اور پھر شدت سے روتے چلاتے ہوئے بے ہوش ہو گئی۔

''طلاق......'' ثروت حیرت سے بڑبڑانے لگی۔ اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

''اوہ...... نو...... نازنین...... اٹھو...... اٹھو......'' وہ گھبرا کر اسے ہلانے لگی۔

''تیمور...... تیمور...... جلدی آؤ......'' ثروت نے دروازے کی جانب کھڑے ہو کر بلند آواز میں کسی کو بلایا۔

ایک انتہائی خوبصورت نوجوان قدرے تیزی سے کمرے میں داخل ہوا۔

''کیا بات ہے......؟'' اس لڑکے نے حیرانگی سے پوچھا۔

''جلدی سے ہاسپٹل فون کر کے ایمبولینس بلاؤ...... آج نازنین بار بار بے ہوش ہو رہی ہے'' ثروت نے پریشانی سے کہا تو لڑکا باہر نکل گیا۔

اور ثروت...... نازی کو ہوش میں لانے کی کوشش کرتی رہی مگر وہ آنکھیں ہی نہیں کھول رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ایمبولینس ان کے گھر کے پورچ میں داخل ہوئی اور نازی کو ہاسپٹل لے جایا گیا۔

''میں بھی ہاسپٹل چلتا ہوں...... شام ہو رہی ہے، میری ضرورت پڑ سکتی ہے'' تیمور نے کہا۔

''ہاں...... ٹھیک ہے...... چلو...... آؤ......'' ثروت نے اپنی گاڑی کی چابی پکڑتے ہوئے کہا۔

''امی...... نازی کی طبیعت بہت خراب ہے...... میں اور تیمور ہاسپٹل جا رہے ہیں...... یہ موبائل پاس رکھ لیں...... میں فون کرتی رہوں گی...... فقیر حسین کچن میں ہے اور کرم علی گیٹ پر...... آپ پریشان مت ہونا'' ثروت نے وہیل چیئر پر بیٹھی اپنی ادھیڑ عمر معذور ماں کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''میری فکر نہ کرو...... تم جاؤ......'' مسز وقار نے پریشان ہو کر کہا۔

''چلو...... تیمور'' ثروت نے تیمور کی جانب دیکھتے ہوئے کہا اور دونوں باہر نکل گئے۔

......❁......

(۱۳)

روشنی چار سال بعد ملک واپس لوٹی تھی۔۔۔۔۔ اس نے پیرس میں اپنے بڑے بھائی اور باپ کے پاس قیام کر کے آرٹ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔۔۔۔۔ وہاں وہ ایک یونیورسٹی میں لیکچر بھی دیتی تھی۔۔۔۔۔ جاب کے علاوہ اس کا ذاتی اسٹوڈیو بھی تھا۔۔۔۔۔ اس کی پینٹنگز اچھا بزنس کرتی تھیں۔۔۔۔۔ مگر اس کا دل ہر وقت مضطرب رہتا۔۔۔۔۔ اس کی دو چھوٹی بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں اور اس کی ماں ہر وقت اس کے بارے میں پریشان رہتی۔۔۔۔۔ انہوں نے روشنی کے باپ اور بھائی کو اصرار کر کے روشنی کو ملک واپس بھیجنے کو کہا۔۔۔۔۔ تاکہ وہ اس کی شادی کر سکیں۔۔۔۔۔ ملک واپس لوٹتے ہی ماضی کا ایک ایک لمحہ کسی فلم کی مانند نظروں کے سامنے گھومنے لگا۔۔۔۔۔ شہیر۔۔۔۔۔ اور شہیر سے وابستہ یادیں۔۔۔۔۔ اور باتیں۔۔۔۔۔ وہ تو کسی بھی بات کو وہاں رہ کر نہیں بھول پائی تھی۔ شہیر تو ہر لمحہ۔۔۔۔۔ ہر پل اس کے اندر اس کے خون کے ساتھ گردش کرتا تھا۔۔۔۔۔ شہیر کو بھلانا اس کے بس سے باہر تھا۔ ہر صبح کا آغاز ہوتے ہی وہ یاد آتا تھا اور رات کو نیند کی وادی میں جانے سے پہلے وہ اس کی آنکھوں میں خواب کی صورت سما جاتا۔۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔۔ وہ اسے کبھی نہیں مل پائے گا۔۔۔۔۔ اس کا اسے یقین تھا۔۔۔۔۔ اور اس سے کبھی ملاقات ہو پائے گی۔۔۔۔۔ اس کی اسے امید نہیں تھی۔۔۔۔۔ وہ اپنی یادوں کے ساتھ پیرس میں شب و روز گزار رہی تھی۔۔۔۔۔ شہیر سے یکطرفہ محبت کے سنگ۔۔۔۔۔ اس کا زندگی سے اعتبار اٹھ چکا تھا۔۔۔۔۔ اور اس سے بڑھ کر محبت پر سے۔۔۔۔۔ اسے ہمیشہ یہ یقین رہا تھا۔۔۔۔۔ کہ جذبوں کی شدت اور سچائی قدرت کے فیصلوں کو بھی بدل سکتی ہے مگر قدرت نے اس کے جذبوں کی سچائی کو کوئی اہمیت نہ دی اور اس کے لئے کچھ بھی نہ بدلا۔۔۔۔۔ نہ اس کی قسمت۔۔۔۔۔ نہ اس کی زندگی۔۔۔۔۔ وہ کس طرح کسی پر اعتبار کرتی۔۔۔۔۔ اس کا دل ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو گیا تھا۔

وہ کتنا روئی تھی۔۔۔۔۔ رات رات بھر۔۔۔۔۔ مگر کسی کو اس کے آنسوؤں پر رحم نہ آیا تھا۔۔۔۔۔ وہ بے سود بہتے رہے اور وہ بے کار انہیں بہاتی رہی۔

وہ رات رات بھر خدا سے فریاد کرتی رہی۔۔۔۔۔ گڑگڑاتی رہی۔۔۔۔۔ مگر کسی نے پلٹ کر اسے کوئی جواب نہ دیا۔۔۔۔۔ اس کی محبت اتنی کمزور نکلی کہ وہ کسی کے دل میں نہ اپنی جگہ بنا سکی۔۔۔۔۔ نہ کسی کے دل کو اپنی طرف مائل کر سکی۔۔۔۔۔ وہ اس قدر بے وقعت ثابت ہوئی کہ شہیر نے نظر بھر کر بھی اس کی طرف دیکھنا گوارا نہ کیا اور اس کی محبت کو روند کر چلا گیا۔۔۔۔۔ مگر وہ پھر بھی ایک انمٹ نقش اس کے اندر چھوڑ گیا۔۔۔۔۔ وہ اس کی یاد کو اپنے نگار دل کے خانوں میں محفوظ کرتی رہی۔۔۔۔۔ شب تنہائی میں اپنی آہوں اور سسکیوں سے اس کو تازہ کرتی رہتی۔۔۔۔۔ مگر اتنے شکوے اور شکایتیں کرنے کے باوجود بھی محبت اس کے دل سے نہ تو مر سکی اور نہ ہی مٹ سکی۔۔۔۔۔

روشنی کے گھر آتے ہی اس کی ماں کو اس کی شادی کی فکر لاحق ہو گئی۔۔۔۔۔ مگر روشنی کسی بھی رشتے کے لئے راضی نہیں تھی۔۔۔۔۔ اس کی ماں اور اس کے درمیان اختلافات بڑھنے لگے۔

''میں وجہ جاننا چاہتی ہوں کہ تم شادی سے کیوں انکار کر رہی ہو؟'' اس کی ماں نے ایک روز تنگ آ کر پوچھا۔

''میں شادی کی ذمہ داریاں نہیں نبھا سکتی'' اس نے بات ٹالنا چاہی۔

''کیا تمہیں قدرت کے بنائے ہوئے اصولوں سے اختلاف ہے'' اس کی ماں نے پوچھا۔

''معلوم نہیں..... شاید قدرت بھی یہی چاہتی ہے'' اس نے نم آنکھوں سے جواب دیا۔

''قدرت کبھی ایسا نہیں چاہ سکتی..... تم اپنی بے معنی اور بے سروپا باتوں کو قدرت کے کھاتے میں مت ڈالو'' اس کی ماں خفگی سے بولیں۔

''دلوں میں محبت اور نفرت کون ڈالتا ہے؟'' اس نے پوچھا تو اس کی ماں خاموش ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

''کیا تم کسی سے محبت کرتی ہو.....؟'' اس کی ماں نے قدرے توقف کے بعد پوچھا۔

روشنی نے بے بسی سے ماں کی طرف دیکھا..... اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی مگر وہ زبان سے کچھ نہ بولی۔

''اگر تم اس سے شادی کرنا چاہتی ہو..... تو اس سے بات کرو..... میں تمہاری شادی اس سے کردوں گی'' ماں نے کہا جواباً وہ پھر خاموش رہی۔

''تم کوئی جواب کیوں نہیں دیتی.....؟'' ماں غصے سے بولی۔

''کسی کے دل کو محبت کے لئے مجبور نہیں کیا جا سکتا'' اس نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''روشنی..... تم کیسی باتیں کر رہی ہو.....؟ کسی سے محبت بھی کرتی ہو اور اسے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی'' ماں نے زچ ہو کر کہا۔

''کیا بات کروں؟ کیا اس سے یہ کہوں کہ وہ مجھ سے محبت کرے اور جواب میں وہ یہ کہے کہ نہیں..... میں تمہاری عزت تو کر سکتا ہوں..... مگر..... محبت نہیں..... پھر میرے پاس کہنے کو کیا رہ جائے گا..... میرا بھرم ٹوٹ جائے گا..... میری عزت نفس اور میری انا سب کچھ ختم ہو جائے گی'' روشنی سسکیاں بھرنے لگی۔

''اگر تم یہ سب کچھ نہیں کر سکتی..... تو پھر مجھے کچھ کرنے دو..... میں اپنی مرضی سے جہاں چاہوں تمہاری شادی کردوں'' اس کی ماں نے قطعیت سے کہا۔

''یہ..... بھی ناممکن ہے..... میرا دل اس کے سوا کسی اور کو قبول نہیں کرے گا'' وہ بے بسی سے بولی۔

''یہ وقتی باتیں ہیں..... جب انسان کسی رشتے بندھن میں بندھ جاتا ہے تو پھر اسے بہت سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں..... رشتے نبھانے کے لئے وہ خود بخود ناممکن کو ممکن بنا لیتا ہے'' اس کی ماں نے اس کو سمجھایا۔

''میں کسی سے بھی شادی نہیں کر سکتی اور پلیز آپ مجھے اس کے لئے مجبور مت کریں..... میں آپ کو کبھی بھی کسی بھی بات کے لئے الزام نہیں دوں گی..... میں نے ایک یونیورسٹی میں جاب کے لئے اپلائی کیا تھا..... مجھے جاب مل رہی ہے، ایک ہفتے تک میں یہاں سے چلی جاؤں گی.....'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

''کہاں.....؟'' اس کی ماں نے حیرت سے پوچھا۔

''دوسرے شہر میں.....'' آپ سے دور..... مگر اسی ملک میں'' اس نے آہ بھر کر جواب دیا..... تو اس کی ماں بے بسی اور خاموش نگاہوں سے اسے دیکھنے لگیں۔

☆

حرا اور شہیر کی شادی کو تین سال ہو گئے تھے...... مگر دونوں کا رشتہ ایک انچ آگے نہیں بڑھ پایا تھا...... وہ حرا سے نہ نفرت کرتا تھا...... اور...... نہ ہی محبت...... اور...... حرا بھی اس سے نہ محبت کر پائی تھی اور نہ نفرت...... کیونکہ حرا اور شہیر کے درمیان "سمیر" حائل تھا جبکہ شہیر اور حرا کے درمیان "زل" ہر لمحہ...... ہر وقت موجود رہتی تھی...... دونوں کے درمیان کوئی بھی شبیہ ایک انچ پیچھے نہ ہٹی تھی...... اور نہ ہی شاید وہ خود انہیں ہٹانا چاہتے تھے دونوں کو ایک دوسرے کے قریب آنے کے لئے کسی نہ کسی شبیہ کو اپنے درمیان سے ہٹانا پڑتا تھا...... مگر دونوں کے تعلقات ان ہیولوں سے اتنے گہرے اور مضبوط تھے کہ ان کا رشتہ کمزور ہو گیا تھا......

سمیر نے حرا کی وجہ سے شادی نہیں کی تھی...... وہ شادی کر کے حرا کو مزید دکھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ حرا کی آنکھوں میں یہ شکوہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا کہ اسے جہنم میں ڈال کر وہ خود خوشحال زندگی گزار رہا ہے...... ممی...... اسے کئی بار مجبور کرتیں مگر وہ کوئی جواب نہ دیتا...... ممی نے ایک دو بار حرا سے کہا کہ وہ اسے شادی کے لئے کہے مگر اس نے صاف انکار کر دیا...... کہ وہ کسی کو...... کسی بھی بات کے لئے مجبور نہیں کر سکتی...... ہر ایک کی اپنی زندگی ہے...... اور جیسے وہ چاہتا ہے...... اپنی زندگی گزارے...... ممی اس کی بات سن کر خاموش ہو جاتیں...... مگر حرا کا دل اندر سے مطمئن تھا...... اور وہ یہ بات بخوبی جانتی تھی کہ سمیر شادی کیوں نہیں کر رہا...... وہ شادی کر کے حرا کو ذہنی اذیت نہیں دینا چاہتا...... اور اسے ایسا ہی کرنا چاہیے" وہ مطمئن ہو کر سوچتی...... اسے شہیر سے دو باتوں کا شکوہ تھا...... ایک اس کی شراب نوشی اور دوسری...... اس کی ذات کی نفی کا...... اس نے جب حرا کو قبول ہی نہیں کیا تھا تو وہ اس سے کیا شکوہ کرتی...... شکوہ کرنے کے لئے بھی اپنی اپنائیت اور دوسرے کی چاہت کو دیکھنا پڑتا ہے...... اور جہاں نہ اپنائیت ہو...... نہ چاہت نہ محبت...... نہ کوئی وابستگی تو وہاں شکوہ کرنا بے معنی ہے...... سوائے الفاظ کے زیاں کے...... اور...... کچھ نہیں...... اس لئے وہ نہ تو اس سے کوئی شکوہ کرتی...... نہ کوئی اظہار...... نہ کوئی اقرار...... بس خاموش رہتی۔

شہیر کے دل میں یہ احساس پیدا ہو گیا تھا...... کہ اس کے اور زل کے درمیان ارسلان حائل ہے...... اگر ارسلان نہ ہوتا تو زل اس سے ضرور شادی کرتی...... وہ ارسلان سے شدید نفرت کرنے لگا تھا...... زل کا کسی بھی بات میں کوئی قصور نہیں...... اب بھی اگر ارسلان ان دونوں کے درمیان سے ہٹ جائے تو زل اس کی ہو گی...... زل کی محبت کو وہ کسی بھی پل اپنے دل سے فراموش نہیں کر پایا تھا...... وہ ہمیشہ کی طرح اس کے اندر ہر لمحہ ہر پل موجود رہتی...... وہ تنہائی میں اس سے سرگوشیاں کرتا...... اپنے دل کی ہر بات اس سے کہتا اور حرا کو زل سمجھ کر مدہوشی کے عالم میں اس سے جی بھر کر پیار کرتا...... حرا کو محبت کسی اور کی وساطت سے...... کسی اور کے صدقے میں مل رہی تھی...... اور شہیر کو تسکین کہ زل اب بھی اس کے پاس ہے۔

دونوں ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے بہت دور تھے...... اور یہ دوری ختم نہیں ہو رہی تھی...... کیونکہ دونوں کے درمیان ان کے دل حائل تھے مگر دلوں میں یادیں کسی اور کی تھیں...... ان یادوں میں اتنی طاقت تھی اور انہوں نے ان کے دل کی دیواروں کو اتنا سخت اور مضبوط بنا دیا تھا کہ وہ ان دیواروں کو توڑ کر کہیں نہیں جا سکتی تھیں...... اور وہ خود اتنے طاقتور نہیں تھے کہ ان دیواروں کو توڑ کر ان یادوں کو خود وہاں سے ہٹا دیتے...... اس لئے ان کا رشتہ ایسی سرد مہری کا شکار تھا...... جس میں حرارت یا تپش کے کہیں سے داخل ہونے کے کوئی امکانات نہ تھے...... جو ان کی سرد مہری کو ختم کر سکتے......

زندگی اپنی ڈگر پر چل رہی تھی......

شب و روز کا معمول جاری تھا......

مگر وہ اپنی اپنی ذات میں......

اتنے ہی تنہا اور بے خبر تھے......

جتنی سیاہ راتوں میں تاریک راہیں......

☆

روشنی یونیورسٹی جانے سے پہلے شاپنگ کے لئے ایک قریبی ڈیپارٹمنٹل سٹور میں گئی.... شاپنگ کے دوران اس کی ملاقات اسامہ سے ہو گئی......دونوں یک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوئے......روشنی سب کلاس فیلوز کے بارے میں باری باری پوچھتی رہی۔

''زل......کیسی ہے......اور......ارسلان؟'' روشنی نے پوچھا۔

''دونوں نے شادی کر لی ہے......خوب مزے میں ہیں...... آج کل ایک آرٹ اکیڈمی چلا رہے ہیں'' اسامہ نے بتایا۔

''اور عمر......مریم......وغیرہ......'' روشنی نے پوچھا۔

''عمر انگلینڈ میں ہے...... مریم ایک کالج میں لیکچرار ہے اور باقی سب لوگ بھی اپنی اپنی زندگیاں گزار رہے ہیں'' اسامہ نے بتایا۔

''کیا مطلب......؟'' روشنی نے چونک کر پوچھا۔

''شہیر نے بھی شادی کر لی ہے......اس کی بیوی ڈاکٹر ہے......اور میں بھی شادی کا سوچ ہی رہا تھا......کہ تم مل گئیں'' اسامہ نے معنی خیز انداز میں ہنستے ہوئے کہا مگر روشنی شہیر کی شادی کا سن کر ایک دم خاموش ہو گئی۔ کوئی چیز چھناکے سے اس کے اندر ٹوٹ گئی۔

''تم کیا کر رہی ہو......؟'' اسامہ نے اچانک پوچھا۔

''ایک یونیورسٹی جوائن کی ہے......اگلے ہفتے یہاں سے جا رہی ہوں'' روشنی نے جلدی جلدی بتایا وہ جلد از جلد وہاں سے جانا چاہتی تھی۔

''مجھے اپنا کونٹیکٹ نمبر دو......کسی روز پلان کر کے زل اور ارسلان کی اکیڈمی چلتے ہیں'' اسامہ نے کہا۔

''ٹھیک ہے......'' روشنی نے اسے اپنا نمبر دیا اور وہاں سے چلی گئی......

ڈرائیونگ کرتے ہوئے اس کا دل اس قدر بے چین ہو رہا تھا کہ نادانستہ وہ ایک جگہ گاڑی روک کر شدت سے رونے لگی......ہچکیاں بھر کر روتے ہوئے اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس بات پر رو رہی ہے......

کیا شہیر کی شادی کا سُن کر......؟

یا پھر......یہ جان کر کہ شہیر خوش گوار زندگی گزار رہا ہے۔

انسان اندر سے کس قدر کمزور مخلوق ہے...... بلند و بانگ دعوے کرنے والا...... پہاڑوں سے مضبوط اور آسمان جیسا بلند حوصلہ رکھنے

والا..... کیسے لمحوں میں ٹوٹ پھوٹ کر بکھر جاتا ہے..... اس قدر کمزور اور شکستہ ہو جاتا ہے کہ ریت کے ذروں سے بھی ہلکا ہو جاتا ہے..... جب اس کو محبت کا جواب محبت سے نہیں ملتا.....

جب اس کی چاہت کو جھٹلایا جاتا ہے.....

جب اس کی ذات کی نفی کی جاتی ہے.....

جب اس کے جذبوں کو روندا جاتا ہے.....

تب اس کی سوچیں اور خیالات منتشر ہو جاتے ہیں.....

تمام احساسات، جذبات اور محسوسات کہیں کھو جاتے ہیں..... وہ ایک دم کمزور ہو کر مٹی کا بے وقعت اور حقیر ذرہ بن جاتا ہے۔

روشنی لمحہ لمحہ بکھر رہی تھی..... ٹوٹ رہی تھی..... اور اس کی روشنی دم توڑ رہی تھی..... اسے ہر طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آ رہی تھی..... اس کا دل تمام مثبت سوچوں اور جذبوں سے خالی ہو رہا تھا اور اس کی جگہ منفی خیالات اور سوچیں اس کے دل و دماغ پر حاوی ہو رہی تھیں..... انسان کس قدر کمزور ہے..... جو دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر سب کچھ کھونے پر تیار ہو جاتا ہے..... اور دل اسے مجبور بھی کرتا ہے اور بے قصور بھی۔

☆

زنل..... روشنی کو زبردستی اپنے ساتھ اپنے گھر لے آئی..... اسامہ اور ارسلان اکیڈمی میں ہی رک گئے..... روشنی زنل کا گھر دیکھ کر حیران رہ گئی..... دو بیڈ روم اور ایک نارمل سائز کا ڈرائنگ روم اور چھوٹے سے لاؤنج پر محیط گھر زنل کا کیسے ہو سکتا ہے..... روشنی کو یقین نہیں آ رہا تھا..... وہ زنل کے والدین کا گھر دیکھ چکی تھی..... جس کا لان ہی زنل کے اس پورے گھر سے بڑا تھا..... زنل کی ساس ایک بوڑھی عورت تھی..... ایک چھوٹا دیور اور سسر کراکری سٹور چلاتے تھے روشنی کی آنکھیں اس کے گھر کو دیکھ کر حیرت سے پھیلنے لگیں۔

"تم حیران کیوں ہو رہی ہو؟ کیا میرا گھر دیکھ کر.....؟" زنل نے روشنی کے چہرے پر حیرانگی کے تاثرات دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیا تم یہاں ایڈجسٹ ہو گئی ہو.....؟" روشنی نے حیرت سے پوچھا۔

"جب دلوں میں محبت ہو تو چھوٹا سا آشیانہ بھی محل لگتا ہے اور اگر دل نفرتوں اور کدورتوں سے بھرے ہوں تو شیش محل بھی تنگ و تاریک سرنگیں نظر آتی ہیں..... جہاں ہر وقت دم گھٹتا رہتا ہے" زنل نے مسکرا کر جواب دیا۔

"کیا تم ارسلان سے بہت محبت کرتی ہو....." روشنی نے پوچھا۔

"ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت خوش ہیں" زنل مسکرائی۔

"اس لئے کہ تم دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہو؟" روشنی نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں..... اور..... اس لئے بھی کہ ہم دونوں ایک دوسرے کی عزت اور احساسات کا بہت خیال رکھتے ہیں..... روشنی اگر محبت کے ساتھ عزت نہ ہو..... تو وہ محبت بے معنی اور بے اثر ہو جاتی ہے اور جہاں صرف عزت ہو..... اور..... محبت نہ ہو..... تو وہ عزت بھی بہت بد مزہ اور پھیکی محسوس

ہوتی ہے.....شروع شروع میں، میں کچھ دیر اپ سیٹ رہی.....پھر بہت ساری باتوں پر کمپرومائز کر لیا تو دل مطمئن ہونے لگا.....اب ایڈجسٹمنٹ پرابلم نہیں.....بہت جلد ہم اپنے نئے گھر میں شفٹ ہونے والے ہیں جو میں نے اور ارسلان نے مل کر بنایا ہے" زل نے خوش ہو کر بتایا۔

"ریئلی.....اٹس گڈ" روشنی بھی خوش ہو گئی۔

"تم شادی کیوں نہیں کر رہیں؟" زل نے اچانک اس سے پوچھا۔

"بس.....یونہی" روشنی نے ٹالنا چاہا۔

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی.....کوئی وجہ تو ہو گی" زل نے پوچھا۔

"کچھ خاص نہیں.....جیسے ہی کوئی دل کو بھا گیا تو شادی بھی کر لوں گی" اس نے بے دلی سے جواب دیا.....وہ زل کے اس سوال سے چھٹکارا پانا چاہتی تھی۔

"زل.....ایک بات پوچھوں" روشنی نے اپنا حوصلہ یکجا کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں.....پوچھو....." زل نے پھل کاٹتے ہوئے کہا۔

"زل.....ارسلان کی تمہیں کیا بات پسند آئی.....کہ تم نے اس سے شادی کر لی.....شہیر.....شہیر بھی تو تم سے محبت کرتا تھا اور ارسلان کے مقابلے میں ساؤنڈ بھی تھا" روشنی کو ایک سوال ہمیشہ سے کھٹکتا تھا.....اور آج اس نے موقع دیکھ کر پوچھ لیا۔

"کیا یہ محبت کی بات تمہیں شہیر نے بتائی تھی؟" زل نے چونک کر پوچھا۔

"جس نے بھی بتائی ہو.....کیا اس میں حقیقت نہیں" روشنی نے پوچھا۔

"ہاں.....اس نے مجھ سے اظہار محبت ضرور کیا تھا.....مگر میں جواب میں اقرار محبت نہ کر سکی" زل نے سنجیدگی سے کہا۔

"کیوں.....؟" روشنی نے حیرت سے پوچھا۔

"اپنے دل کو کسی کی محبت کے لئے مجبور نہیں کیا جا سکتا.....محبت کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں.....محبت کا پودا اسی زمین میں نشوونما پاتا ہے جو زرخیز ہو.....بنجر زمین پر محبت کا پھول کبھی نہیں کھلتا.....دل بھی محبت کرنے کے لئے بہت کچھ مانگتا ہے....." زل نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"کیا مطلب.....؟" روشنی نے حیرت سے پوچھا۔

"دل بہت زیادہ ڈیمانڈنگ ہوتا ہے.....اسے ایسے شخص کی محبت چاہیے ہوتی ہے جو محبت کے ساتھ ساتھ اظہار کا فن بھی جانتا ہو.....دل میں چھپی محبت.....خاموش زبان، خشک لب اور روکھے لہجے.....دل ایسی محبت کو کبھی قبول نہیں کرتا انسان ایسی محبت کو پا کر ہمیشہ تشنہ رہتا ہے.....شہیر کی محبت بھی ایسی ہی تھی.....وہ بہت خاموش، سنجیدہ اور unpredictable پرسنالٹی تھا.....اس کی محبت کا اپنا انداز تھا مگر میں نہ تو ایسی محبت کی قائل ہوں اور نہ ہی میرا دل ایسے شخص کو قبول کر سکتا ہے.....میں نے شہیر کے بارے میں بہت سوچا مگر میرے دل نے ہر بار "نفی" میں ہی جواب دیا.....میں اپنے دل کو اس کی محبت کے لئے مجبور نہیں کر سکتی تھی.....کوئی کسی کے درد کا علاج نہ کرے تو کیا صرف لفظوں سے بہلا سکتی ہے.....جبکہ

ارسلان اس کے مقابلے میں مجھے بہت پازیٹو لگا...... وہ جسمانی اور مالی طور پر اس سے بہت کم ہے..... مگر اس نے میرے ٹوٹے دل کو سنبھالا...... میری آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کو اپنی مٹھی میں بند کر لیا...... روشنی میں اپنے خالہ زاد کے ساتھ منسوب تھی...... ہم دونوں کا نکاح ہو گیا ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے...... وہ کینیڈا چلا گیا مگر وہاں سیٹلڈ ہونے کے لئے اسے ایک کینیڈین لڑکی سے شادی کرنا پڑی...... اس بات پر فیملی میں clashes بڑھنے لگے اور اس نے مجھے ڈائیورس بھیج دی...... میرے لئے یہ صدمہ نا قابل برداشت تھا...... کیونکہ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو چاہتے تھے میرے سارے خواب بکھر گئے ایک روز میں شہیر کے سامنے بیٹھی تھی اور وہ میرا پورٹریٹ بنا رہا تھا...... اس روز نجانے کہاں سے آنسو میری آنکھوں میں امڈ امڈ کر آ رہے تھے...... شہیر میری طرف دیکھتا اور خاموشی سے پورٹریٹ بنانے لگتا...... اس نے ایک بار بھی مجھ سے میرے آنسوؤں کے بارے میں نہ پوچھا...... میں بے بس ہو کر کیفے ٹیریا میں چلی گئی...... وہاں ارسلان تھا...... جانتی ہو ارسلان نے کیا کہا......؟" ژل نے رک کر روشنی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس نے مجھے بہت تسلی دی اور کہنے لگا...... میں تم سے شادی کروں گا...... اگر تمہیں پسند ہو تو...... روشنی وہ لمحہ بہت مختصر مگر بہت ڈیمانڈنگ ہوتا ہے...... جب آپ بری طرح ٹوٹ رہے ہوتے ہیں اور کوئی آگے بڑھ کر آپ کے آنسو پونچھنے کی کوشش کرتا ہے...... مجھے ارسلان سے ایسی توقع نہیں تھی...... وہ اگر عام حالات میں مجھے یہ بات کہتا تو شاید میں اس پر سیریس نہ ہوتی...... لیکن اس وقت وہ میرے لئے زیادہ سے زیادہ بھی کر سکتا تھا...... میرا گھر ٹوٹا تھا اور وہ مجھ کو اپنی صورت میں سائباں دے رہا تھا...... اس وقت اس کے ذہن میں میری دولت، میرا اسٹیٹس نہیں تھا...... اس وقت صرف "میں" اور "میرا دکھ" اور "میرا ٹوٹا دل" تھا اور اس نے مجھے وہی کچھ دینے کی کوشش کی تھی جو مجھے چاہیے تھا...... وہ میرا وہی نقصان پورا کرنا چاہتا تھا...... جس کے دکھ میں میں رو رہی تھی...... روشنی تم ہی بتاؤ...... میں کس کو اہمیت دیتی...... شہیر کو...... یا...... ارسلان کو......؟ جانتی ہو...... شہیر تھوڑی دیر بعد کیفے ٹیریا میں ہمارے پاس آیا مگر اس نے پھر بھی نہ مجھ سے کچھ پوچھا...... کوئی تسلی نہ دی...... پھر میں کیسے اس کو اپنا ٹوٹا دل دے دیتی...... جس پر مرہم تو کوئی اور رکھ رہا تھا...... جسے تسلی تو کوئی اور دے رہا تھا...... مجھے 'مسیحا' کی ضرورت تھی...... نام نہاد محبوب کی نہیں اس لئے میں اس کی محبت کو قبول نہ کر سکی" ژل قدرے جذباتی لہجے میں بولتی رہی پھر خاموش ہو گئی۔

"مگر...... تم نے اپنی ڈائیورس اور نکاح کا کبھی ذکر نہیں کیا؟" روشنی نے حیرت سے پوچھا۔

"میں اپنی پرسنل باتیں دوسروں کے ساتھ شیئر کرنا پسند نہیں کرتی...... صرف ارسلان کے ساتھ کیں...... اور وہی میرا نصیب بن گیا" ژل نے آہ بھر کر کہا اور پھر مسکرانے لگی۔

روشنی اس کی طرف دیکھتی رہ گئی......

"میں تمہارے لئے چائے بنا کر لاتی ہوں" ژل اٹھتے ہوئے بولی۔

روشنی گہری سوچ میں ڈوب گئی...... ژل کے دل نے شہیر کو قبول نہیں کیا...... اس کے نزدیک وہ کوئی قابل قدر شخصیت نہیں تھا...... مگر روشنی کا دل بہت مختلف تھا...... وہ ژل سے اتنا کچھ سننے کے باوجود بھی شہیر سے نفرت نہ کر سکا...... وہ اپنی محبت میں ایک انچ بھی پیچھے نہ ہٹا...... اس کی

وجہ کیا تھی؟ کیا روشنی کا دل کسی اور شے سے بنا تھا...... یا پھر زل کے مطابق اس کے دل کی ڈیمانڈز اور تھیں...... اس کا دل تو کچھ بھی مطالبہ نہیں کرتا تھا...... اس نے تو شہیر سے کچھ بھی نہیں طلب کیا تھا...... وہ تو بس محبت کرنے پر مجبور تھا جیسے کوئی بن دیکھے...... بن سنے...... کسی پر یقین کامل کر لیتا ہے...... اپنی چاہتوں اور محبتوں میں اسے سرفہرست رکھتا ہے...... بدلے میں اس سے کچھ بھی نہیں مانگتا...... محبت کے دو بول بھی نہیں...... پسندیدگی بھی نہیں...... کچھ بھی نہیں...... اور اسکی خوشی پر اپنی ساری خوشیاں، اس کی محبت پر اپنی ساری محبتیں...... اور چاہتیں قربان کرنے پر تیار ہو جاتا ہے......

کیا اس دل میں زیادہ زرخیزی ہوتی ہے؟ یا وہ زیادہ حساس نہیں ہوتا...... یا پھر اس میں جذبات کی کمی ہوتی ہے یا پھر اس کی شکل یا ساخت دوسروں سے مختلف ہوتی ہے......

یہ کیسا معمہ ہے...... جو سمجھ میں نہیں آتا......

دل محبت کرتا ہے...... پھر خود فریبی کے جال بنتا ہے......

سارے جذبوں کو جال میں جکڑ کر خود تنفر ہو جاتا ہے......

انسان کی روح کو بے قرار اور بے چین کر دیتا ہے...... اور پھر بھی بری الذمہ رہتا ہے۔

''میں شہیر سے نفرت نہیں کر سکتی...... جیسے زل اس سے محبت نہیں کر سکی...... اور...... شہیر مجھ سے محبت نہیں کر پایا جس طرح وہ زل سے کر پایا ہے......'' روشنی نے آہ بھری اور چائے کا کپ بے دلی سے رکھ کر لوٹ آئی۔

☆

''شہیر جانتے ہو...... پچھلے دنوں روشنی پیرس سے آئی تھی'' اسامہ نے شہیر کو فون پر بتایا۔

''کیا مطلب...... کیا وہ آئی تھی؟'' شہیر نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں...... اور اب وہ دوسرے شہر شفٹ ہو چکی ہے...... اس نے کوئی یونیورسٹی جوائن کر لی ہے......'' اسامہ نے بتایا۔

''کیا اس کی شادی ہو گئی؟'' شہیر نے لاپروائی سے پوچھا۔

''نہیں...... اور...... شاید کرنے کا ارادہ بھی نہیں رکھتی...... اس کی باتوں سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا'' اسامہ نے بتایا۔

''کیوں......؟'' شہیر نے پوچھا۔

''معلوم نہیں......''

''اچھا سوچتی ہے...... شادی کرنے سے ملتا بھی کیا ہے...... انسان اور الجھ کر رہ جاتا ہے'' شہیر مایوسی سے بولا۔

''ایسی بھی بات نہیں...... زل اور ارسلان بہت خوش ہیں بلکہ ایسے کپل کو دیکھ کر رشک آتا ہے کہ دنیا میں اتنے خوش نصیب میاں بیوی بھی ہو سکتے ہیں...... دونوں میں بہت محبت اور انڈرسٹینڈنگ ہے'' اسامہ خوشی سے بتانے لگا...... تو...... شہیر کا دل ایک دم گھٹن کا شکار ہونے لگا...... اسے یہ باتیں سن کر نجانے کیوں افسوس سا ہونے لگا...... اس کے دل میں نفرت، کینہ اور حسد کے جذبے زور پکڑنے لگے۔

''وہ آج کل کیا کر رہے ہیں؟'' شہیر نے بمشکل اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

''زل اور ارسلان ایک آرٹ اکیڈمی چلا رہے ہیں...... اس کے علاوہ انٹیریئر کرتے ہیں...... ارسلان اکثر اپنی پینٹنگز کی ایگزبیشن لگاتا ہے۔ سچ ان کو دیکھ کر رشک آتا ہے...... دونوں نے مل کر خوبصورت سا گھر بھی بنایا ہے...... میں تمہیں کسی روز ان کی اکیڈمی لے کر چلوں گا'' اسامہ نے مسکرا کر کہا تو شہیر انکار نہ کر سکا۔

وہ کئی سالوں کے بعد اس زل کو دیکھنا چاہتا تھا جو اس کے دل میں رہتی تھی...... وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ واقعی ان میں محبت ابھی باقی تھی اور یہ کہ دنیا میں کوئی اندر سے بھی خوش ہے وہ ان کے چہروں پر خوشی کے رنگ دیکھنا چاہتا تھا...... اس لئے کچھ سوچتے ہوئے اس نے اسامہ کے سامنے مثبت میں سر ہلایا......

☆

زل اور ارسلان، شہیر کو اسامہ کے ہمراہ اپنے آفس میں اچانک دیکھ کر حیران رہ گئے...... زل کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا وہ ساکت کھڑی اسے دیکھتی رہی...... شہیر کے کہے ہوئے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔

''وعدہ کرو...... زندگی میں میرے سامنے کبھی مت آنا''

اور اب وہ خود ہی اس کے آفس میں، اس کے سامنے کھڑا تھا۔ زل پلکیں جھپکائے بغیر شہیر کو حیرانگی سے دیکھتی رہی...... وہ پہلے سے بے حد کمزور ہو چکا تھا اور شکل سے بیمار اور کملایا ہوا لگ رہا تھا...... کنپٹیوں اور سر کے بال کافی زیادہ سفید ہو چکے تھے...... آنکھیں گہری نیند کے خمار سے سرخ ہو رہی تھیں۔

''آؤ...... بھئی...... آج تو...... شہیر نے یہاں آ کر ہمیں زبردست سرپرائز دیا ہے...... تم سے مل کر بہت خوشی ہو رہی ہے...... اسامہ ایسے ہی امیزنگ کام کرتا ہے۔ پچھلے ہفتے روشنی کو لایا...... اور آج شہیر کو......'' ارسلان بہت تپاک سے اسے گلے لگاتے ہوئے بولا۔

''اسامہ نے بتایا...... کہ آپ لوگوں نے بہت پراگریس کی ہے...... آرٹ اکیڈمی کھولی ہے اور یہ کہ بہت خوش ہیں......'' خوش پر زور دے کر شہیر نے معنی خیز انداز میں زل کی طرف بغور دیکھ کر کہا...... تو زل نے بھی اس کی طرف بغور دیکھا اور منہ دوسری طرف پھیر دیا۔

''میں نے سوچا...... آپ سے مل کر آپ کی خوشیوں کا راز پوچھنا چاہیے'' شہیر نے پھر معنی خیز انداز میں زل کی طرف دیکھ کر کہا...... زل کا چہرہ خون کی تیز گردش سے تمتمانے لگا...... وہ اپنے جذبات کو کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''ارے...... اسامہ تو ایسے ہی مذاق کرتا رہتا ہے'' ارسلان نے ہنستے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب...... تم لوگ خوش نہیں ہو...... کیا میرے سامنے خوش ہونے کا ڈرامہ کرتے ہو'' اسامہ نے منہ بنا کر کہا۔

''نہیں...... نہیں...... شکر ہے...... ہم واقعی بہت خوش ہیں...... لیکن اتنا ہی...... جتنا کہ ایک نارمل میرڈ کپل کو ہونا چاہیے...... اسامہ کچھ مبالغہ آرائی سے کام لیتا ہے'' ارسلان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''زل......آپ......بھی......خوش ہیں نا......؟'' شہیر نے معنی خیز انداز میں زل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

''اور......ہاں'' اس نے بوکھلا کر جواب دیا۔

''زل یار......چائے وغیرہ منگواؤ......پرانے یار دوست آئے ہیں......'' ارسلان نے زل سے کہا......تو وہ اٹھ کر باہر چلی گئی......وہ عجیب مخمصے کا شکار ہو گئی تھی......شہیر کا اسے دیکھنے کا انداز اور اس کی معنی خیز باتیں......اسے عجیب سی کوفت محسوس ہو رہی تھی......شہیر بار بار ان کے خوش ہونے کا تذکرہ کیوں کر رہا ہے......؟ کیا وہ اپنی زندگی سے خوش اور مطمئن نہیں......؟ وہ ارسلان کو بھی عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا......یہ میرا وہم ہے......یا......پھر شہیر کا لوگوں کو دیکھنے کا انداز بدل گیا ہے......اس کی آنکھوں میں کتنی حسرت، بے چینی، اداسی اور بے بسی ہے......'' زل ٹی روم میں چائے کی ٹرے تیار کرتے ہوئے گہری سوچ میں ڈوبی تھی......سب کو روم میں چائے پیش کی گئی......چائے پینے کے دوران......اور باتیں کرتے ہوئے شہیر زل کو یوں دیکھتا جیسے برسوں کے بعد کوئی پیاسا، پانی کے کنوئیں کو حسرت اور بے بسی سے دیکھتا ہے مگر کنوئیں تک پہنچ نہیں پاتا......زل اس کی نظروں سے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگتی......باتوں کا سلسلہ پھر سے شروع ہو جاتا......کالج کی باتیں......کلاس فیلوز اور اساتذہ کی باتیں......بیتے دنوں کی خوبصورت باتیں......باتوں کا رخ گھوم پھر کر......کالج لائف کی طرف مڑ جاتا اور کالج لائف میں شہیر کی بُرتھ ڈے......کو سب یاد کرتے......اور ایک ایک واقعے کو یاد کر کے خوب ہنستے رہے......مگر اس دن ایک اور اہم واقعہ بھی ہوا تھا......جس کا علم صرف شہیر اور زل کو تھا......اس لئے شہیر بار بار سب کو ڈراپ کرنے کا ذکر کرتا......تاکہ زل کو اظہار محبت یاد آئے......وہ جب بھی ایسی بات کا ذکر کرتا......زل نظریں چرانے لگتی......

''آج کا دن بھی......اس شام کی طرح ہمیشہ یاد رہے گا'' شہیر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''یار......تم آج کل کیا کر رہے ہو؟'' ارسلان نے پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں......کبھی کبھار ڈیڈی کی فیکٹری چلا جاتا ہوں......لیکن بزنس میرا انٹرسٹ نہیں......'' شہیر اکتاہٹ سے بولا۔

''یار......تم جیسا ٹیلنٹڈ شخص اپنا ٹیلنٹ یوں ضائع کر رہا ہے یہ افسوس کی بات ہے......تم ہماری اکیڈمی کیوں نہیں جوائن کر لیتے'' ارسلان نے اچانک کہا تو زل انتہائی حیرت سے ارسلان کی طرف دیکھنے لگی۔

''ہاں......شہیر......یہ اچھی آفر ہے......تمہارا دل بھی بہل جائے گا اور کام کرنے کا موقع بھی ملے گا'' اسامہ نے کہا تو شہیر نے مسکرا کر زل کی طرف دیکھا۔

''ہاں......بات تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو......میں اس پر ضرور سوچتا ہوں'' شہیر نے زل کی طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔

''یار سوچنے کی کیا بات ہے......بس تم کل سے ہی جوائن کرو'' ارسلان نے کہا تو شہیر زل کی طرف انکھیوں سے دیکھ کر مسکرانے لگا۔

''تھینکس......تم لوگوں کو جوائن کر کے مجھے بھی خوشی ہوگی'' شہیر ارسلان سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا اور اسامہ کے ساتھ خدا حافظ کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

''ارسلان......یہ تم نے کیا کیا؟ ہمارے پاس کوئی ایکسٹرا ویکنسی نہیں......'' زل نے بہانہ بناتے ہوئے کہا۔

''زل...... شہیر بہت ڈسٹرب ہے...... اسامہ نے مجھے بتایا تھا...... اس کے اپنی بیوی کے ساتھ ٹرم اچھے نہیں...... اسے ہماری مدد اور سپورٹ کی ضرورت ہے...... اسامہ اس کو اسی لئے یہاں لایا تھا...... ہم دونوں نے پہلے ہی پلان کر لیا تھا۔ زل دوست واحباب پریشان ہوں تو ان کی پریشانی دور کرنا...... ان کے دکھ شیئر کرنا ہمارا فرض ہے'' ارسلان نے نرم لہجے میں کہا تو زل خاموش ہو گئی۔

''کیا تمہیں کوئی اعتراض ہے؟'' ارسلان نے پوچھا۔

''نہیں...... میں تو یونہی......'' زل کے پاس بات کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

''زل انسان کو اپنا دل ہر ایک کے لئے کھلا...... اور...... ظرف بڑا رکھنا چاہیے...... اتنا بڑا کہ اس میں ہر ایک کا دکھ درد سما سکے...... اور...... زل...... جانتی ہو...... ان لوگوں پر قدرت بہت مہربان ہوتی ہے...... جنہیں ایسے ظرف سے نوازتی ہے'' ارسلان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اچھی طرح جانتی ہوں...... تم قدرت کے خاص الخاص بندوں میں سے ایک ہو...... جس کے دل کے چار نہیں...... بارہ خانے ہیں...... کیونکہ ان خانوں میں سارے جہان کا درد چھپا ہوا ہے'' زل نے مسکراتے ہوئے جواب دیا...... تو...... ارسلان بھی اس تعریف پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

☆

حرا ہاسپٹل سے گھر لوٹی تو ہر طرف گہرا سکوت تھا...... گھر پر کوئی بھی نہیں تھا...... شہیر نے جب سے اکیڈمی جوائن کی تھی وہ بہت لیٹ گھر آتا تھا...... وہ گھر میں ہونے کے باوجود بھی نہیں ہوتا تھا...... اس نے کبھی حرا کو اپنے ہونے کا احساس نہیں دلایا تھا...... ممی اور ڈیڈی کی اپنی اپنی سرگرمیاں تھیں...... ہر کوئی دوسرے سے الگ تھلگ اور منتشر تھا...... حرا اس تنہائی اور وحشت ناک سناٹے سے تنگ آ گئی تھی...... یہاں سب کچھ اس کے مزاج کے برعکس تھا...... وہ اپنے والدین کے گھر جتنی خوش اور آزاد تھی...... یہاں آ کر وہ اتنی ہی سنجیدہ اور آزمائشوں میں جکڑی ہوئی تھی...... اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ اس گھر سے اور شہیر سے کہیں دور چلی جائے اور پھر کبھی لوٹ کر نہ آئے...... صبح ہوتے ہی ہاسپٹل چلے جانا اور شام کو دیر سے لوٹنا...... اکثر نائٹ ڈیوٹی کر کے صبح کو لوٹنا...... شہیر کو نہ اس کے دن کی کوئی فکر تھی...... نہ رات کی...... اور جب سے اس نے خود آرٹ اکیڈمی جوائن کی تھی...... اس کو ایسی مصروفیت مل گئی تھی...... جس میں حرا کی گنجائش بالکل ہی ختم ہو کر رہ گئی تھی...... حرا بھی مشین کا ایسا پرزہ بن گئی تھی جو ہر وقت متحرک رہتا ہے۔

آج وہ ہاسپٹل سے جلدی لوٹ آئی تھی...... صبح سے شدید ڈپریشن میں مبتلا تھی...... ایک آپریشن کے دوران ماں اور بچے کی موت ہو گئی تھی...... اور اس صدمے کا اس کے ذہن پر گہرا اثر ہوا تھا۔ وہ ہاسپٹل میں بھی بیٹھ کر روتی رہی...... ایسے کیسز نجانے کتنے اس نے زندگی میں دیکھے تھے مگر اس کیس نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ لڑکی اس کی ہم عمر تھی اور خود بھی ڈاکٹر تھی...... اور یہ اس کا پہلا بچہ تھا...... اس کے شوہر نے بیوی اور بچے کی موت کا اتنا صدمہ لیا تھا کہ وہ اپنے حواس کھو بیٹھا تھا اور سکتے میں چلا گیا تھا۔

حرا کو یہ سب کچھ دیکھ کر شدید ڈپریشن ہوا تھا۔ اگر اسے کچھ ہو جائے...... تو شہیر کو ذرا سا بھی فرق نہیں پڑے گا...... اس کی زندگی میں حرا کی اتنی اہمیت بھی نہیں تھی کہ وہ اس کی یاد میں چند آنسو بھی بہائے گا...... وہ کیسی بے وقعت زندگی گزار رہی تھی...... جس شخص کے لئے اس نے اپنا سب کچھ قربان کیا تھا...... اس سے اسے دو آنسوؤں کی بھی امید نہ تھی۔

وہ لاؤنج میں صوفے پر نیم دراز لیٹی یہی باتیں سوچنے میں مصروف تھی جب ٹیلیفون کی بیل نے اسے اٹھنے پر مجبور کیا۔ اس نے بے دلی سے ریسیور اٹھایا اور ہیلو کہا دوسری جانب "سمیر" تھا...... بہت ماہ بعد اس سے بات ہو رہی تھی"۔

"کون......؟" حرا نے چونک کر پوچھا۔

"تمہارا گنہگار......" سمیر نے اس کی آواز پہچانتے ہوئے آہ بھر کر کہا۔

"اوہ......تم......" حرا نے بے دلی سے جواب دیا۔

"کیسی ہو......؟" سمیر نے پوچھا۔

"تم کیا سننا چاہتے ہو؟" حرا نے بھی آہ بھر کر کہا۔

"کچھ اچھا ہی سننا چاہتا ہوں" سمیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اچھا......ان لوگوں کی زندگی میں ہوتا ہے...... جو اچھی زندگی گزار رہے ہوتے ہیں......اور جنھیں زندگی گھسیٹ رہی ہوتی ہے...... وہ نہ تو زندہ ہوتے ہیں اور نہ ہی مردہ...... وہ کیا اچھا سنائیں گے؟" حرا نے نم آنکھوں سے جواب دیا۔

"کیا بات ہے......؟ کیا کوئی ڈپریشن ہے؟" سمیر نے پوچھا۔

"کچھ نہیں......بس......یونہی......" حرا نے کپکپاتی آواز کے ساتھ جواب دیا۔

"حرا......پلیز......کچھ تو کہو......کچھ تو بتاؤ۔ کوئی شکوہ ہی کرو۔" سمیر نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"کیا یہ پوچھوں کہ جس قید با مشقت کی سزا کا طوق تم نے میرے گلے میں ڈالا ہے......اس کی مدت کیا ہے؟ کیا یہ سزا ختم ہو گی کہ نہیں......یا......پھر مجھے اپنی موت تک اسی سزا کو بھگتنا ہو گا......" حرا بات کرتے ہوئے رونے لگی۔

"حرا......پلیز......پلیز......مت روؤ......میں بھی تو تمہارے ساتھ وہی سزا بھگت رہا ہوں......کیا میں خوش ہوں......تم ہر پل...... ہر لمحہ......ہر وقت میرے ساتھ ہوتی ہو......میرے دل و دماغ میں اور میری روح میں تم سمائی ہو......" سمیر نے کہا۔

"کیا فائدہ......ایسی محبت کا......" حرا سسکی لیتے ہوئے بولی۔

"حرا اگر محبت صرف انسان کی اپنی ذات تک محدود ہو جائے......تو وہ انسان کو خودغرض بنا دیتی ہے......اور...... جب دل میں سب کے لئے محبت اور ان کا دکھ درد شامل ہوتا ہے......تو......وہ محبت "مسیحائی" کا روپ دھار لیتی ہے......اور......حرا......قدرت نے تمہیں مسیحا بنایا ہے...... پلیز اپنے آپ کو کمپوز کرو۔" سمیر نے اس کی دلجوئی کرتے ہوئے کہا۔

"ٹوٹ......تو......چکی ہوں......اب......بکھر بھی جانے دو" حرا نے روتے ہوئے کہا۔

"اگر تم بکھر گئی......تو......پھر......مجھے کون سمیٹے گا" سمیر نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"مت کرو......ایسی......باتیں......تم......ہمیشہ اپنی باتوں سے مجھے فریب دیتے آئے ہو" حرا غصے سے چلاتے ہوئے بولی۔

''فریب تو وہ دیتے ہیں...... جو اپنا آپ چھپاتے ہیں...... اور...... میں نے تو...... تم...... سے کچھ بھی نہیں چھپایا...... نہ اپنا دل...... نہ اپنا آپ......'' سمیر گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔

حرا جواب میں اونچی آواز میں سسکیاں بھرتی رہی۔

''سمیر...... اب میں...... میرا...... حوصلہ ٹوٹ رہا ہے...... اب...... مزید...... نہیں......'' حرا روتے ہوئے بے ربط انداز میں بولی۔

''پلیز...... حرا...... شہیر...... زندہ ہے...... اس لئے کہ تم اس کے پاس ہو...... اگر تم نہ ہوتی تو وہ زندہ نہ رہتا......'' سمیر نے کہا۔

''سمیر...... تم کس خوش فہمی میں مبتلا ہو...... میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ میں...... اس کے پاس کبھی بھی نہیں رہی...... وہ زندہ ہے کیونکہ زل اس کے دل کے اندر موجود ہے اور اب اس نے زل کی اکیڈمی جوائن کرلی ہے'' حرا نے اسے بتایا۔

''ک...... کک...... کیا؟'' سمیر بے یقینی سے بولا۔

''کبھی کبھی ہم چیزوں کو اپنے اپنے زاویے سے دیکھ کر ٹھیک کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ وہ ٹھیک ہونے کی بجائے اور بگڑ گئی ہیں...... یہی تم نے میرے ساتھ کیا ہے...... تم نے میرے ذریعے شہیر کی زندگی کو ٹھیک کرنے کی کوشش کی...... مگر تم نے میری بھی زندگی بگاڑ دی'' حرا آہ بھرتے ہوئے بولی۔

''مجھے...... اس بات کا قطعی اندازہ نہیں تھا......'' سمیر مایوسی سے بولا۔

''مگر...... تم یہ تو اچھی طرح جانتے تھے کہ میں اس کی زندگی میں کہیں بھی فٹ نہیں بیٹھوں گی...... پھر بھی تم نے اپنا مفروضہ مجھ پر آزمایا......'' حرا غصے سے بولی اور فون بند کردیا...... روتے ہوئے اس نے مڑ کر دیکھا...... تو...... شہیر اس کے پیچھے کھڑا سب باتیں سن رہا تھا...... حرا اس کو دیکھ کر گھبرا گئی۔

''ک...... کک...... آپ کب...... آئے؟'' حرا بمشکل بول پائی۔

''ابھی...... چند لمحے پہلے...... فکر نہیں کرو...... میں نے تمہاری ساری باتیں نہیں سنیں...... مگر جتنی سنی ہیں...... وہ سن کر مجھے افسوس نہیں ہوا...... کیونکہ مجھے پہلے ہی اندازہ تھا...... کہ تم اور سمیر ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو'' شہیر نے کہا۔

''اگر جانتے تھے...... تو پھر...... ہم دونوں کو کیوں آزمایا...... کیا تم جانتے ہو...... کہ اس نے تمہاری خاطر کتنی بڑی قربانی دی اور ابھی تک دے رہا ہے...... وہ شادی نہیں کررہا...... کیونکہ میں...... اس کی وجہ سے اس اذیت میں ہوں'' حرا غصے سے بولی۔

''ٹھیک ہے...... تم...... مجھے...... چھوڑ کر اس سے شادی کرلو'' شہیر نے آہستگی سے جواب دیا۔

''یہ...... یہ...... تم...... کہہ رہے ہو...... مجھ سے...... اپنی بیوی سے...... تم یہ کہہ رہے ہو...... کس قدر گھٹیا سوچ رکھتے ہو...... تمہاری کوئی ویلیوز ہیں بھی کہ نہیں...... جب انکار کرنے کا وقت تھا...... تب تم نے مجھے...... اس...... سے چھین لیا...... اور اب مجھے اس کی طرف دھکیل رہے ہو...... جبکہ تم نے میرے جسم کے ساتھ ساتھ میری روح کو بھی مسخ کردیا ہے...... تم بہت......'' وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر اسے غصے سے گھورتی ہوئی اپنے

کمرے میں چلی گئی۔۔۔۔۔۔

یہ پہلا جھگڑا تھا جو پانچ سالوں میں ان کے درمیان ہوا تھا۔۔۔۔۔۔رینگتا ہوا رشتہ اب اچانک سانپ کی طرح پھنکارنے لگا تھا۔۔۔۔۔۔شہیر اس کی باتیں سن کر تلملانے لگا۔۔۔۔۔۔اسے سیرا اور حرا سے نفرت محسوس ہونے لگی۔۔۔۔۔۔اسے دونوں کی قربانیاں یکسر بھول گئی تھیں۔۔۔۔۔۔یاد رہی۔۔۔۔۔۔تو صرف ان کی محبت۔۔۔۔۔۔دونوں نے اس کے ساتھ ڈرامہ کیا ہے۔۔۔۔۔۔اسے بیوقوف بنا کر اس کا تماشا دیکھا ہے۔۔۔۔۔۔اس کا خون غصے سے کھولنے لگا۔۔۔۔۔۔حرا۔۔۔۔۔۔جو پہلے ہی اس کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔۔۔۔۔۔اب بالکل ہی دل سے خارج ہو گئی تھی۔

☆

ارسلان اور زل چھٹی کا دن اپنے نئے گھر میں گزارتے۔۔۔۔۔۔اس کے در و دیوار کو اپنے ہاتھوں سے سجانے میں مصروف رہتے وہ اپنے گھر کو ایسے آرٹسٹک انداز میں سجانا چاہتے تھے کہ ہر دیکھنے والی نظر ان کے فن کی معترف ہو جائے۔۔۔۔۔۔وہ اس گھر کا چپہ چپہ اس قدر خوبصورت انداز میں سجا رہے تھے کہ اسے دیکھتے ہی ان کے ذہن اور ذوق کو داد دینے کو جی چاہتا۔

''ارسلان۔۔۔۔۔۔میرا خیال ہے۔۔۔۔۔۔ایک ماہ میں ہم یہاں شفٹ ہو جائیں گے۔۔۔۔۔۔بس تھوڑا سا کام رہ گیا ہے'' زل نے ڈرائنگ روم کی کھڑکی بلائنڈز پر پینٹنگ کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔۔۔۔۔۔اتنا ٹائم تو لگ ہی جائے گا۔۔۔۔۔۔'' ارسلان ڈرائنگ روم کی بڑی سی دیوار کے لئے ایک زبردست سی abstract پینٹنگ بنا رہا تھا۔

''ارسلان۔۔۔۔۔۔مجھے تو اس دن کا شدت سے انتظار ہے جب ہم اپنے اس خوبصورت گھر میں۔۔۔۔۔۔شفٹ ہوں گے۔۔۔۔۔۔'' زل پر امید لہجے میں بولی۔

''تھینک یو۔۔۔۔۔۔تم نے میرے ساتھ بہت ٹف ٹائم گزارا ہے۔۔۔۔۔۔ہر مشکل میں میرا ساتھ دیا ہے۔۔۔۔۔۔زل۔۔۔۔۔۔مجھے بہت خوف تھا کہ تم کس طرح محل سے جھونپڑی میں رہ سکو گی۔۔۔۔۔۔مگر تم نے مجھے کسی بھی لمحہ یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ تم جھونپڑی میں رہ رہی ہو'' ارسلان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں جھونپڑی میں نہیں۔۔۔۔۔۔میں تو تمہاری محبت کے سنگ تمہارے دل میں رہ رہی ہوں۔۔۔۔۔۔'' زل نے مسکرا کر جواب دیا۔

''ارسلان کا موبائل بجنے لگا۔۔۔۔۔۔اس نے موبائل دیکھا۔۔۔۔۔۔'' شہیر کا فون تھا۔۔۔۔۔۔

''ہائے۔۔۔۔۔۔شہیر۔۔۔۔۔۔کیسے ہو؟ ہاں۔۔۔۔۔۔ہاں۔۔۔۔۔۔ادھر ہی آ جاؤ۔۔۔۔۔۔ہمارے نئے گھر میں'' ارسلان اسے ایڈریس سمجھانے لگا اور زل کا موڈ آف ہونے لگا۔

''شہیر آ رہا ہے۔۔۔۔۔۔'' ارسلان نے موبائل آف کرتے ہوئے کہا۔

''اُفوہ۔۔۔۔۔۔اس کو ادھر بلانے کی کیا ضرورت تھی۔۔۔۔۔۔ایک چھٹی کا دن ہوتا ہے وہ۔۔۔۔۔۔اکیڈمی۔۔۔۔۔۔میں بھی سر پر سوار رہتا ہے اور اب یہاں بھی'' زل بڑبڑاتے ہوئے بولی۔

''زل......پلیز......ایسے ری ایکٹ مت کیا کرو......نجانے کیوں تم اس سے خائف رہتی ہو؟'' ارسلان نے ملائمت سے زل کو سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ خاموش ہوگئی۔

تھوڑی دیر بعد شہیر آ گیا......ان کے گھر......اس کی در و دیوار کو دیکھ کر ان کے ذوق کی تعریفیں کرتا رہا۔

''تم لوگ باتیں کرو......آج میں تمہارے لئے چائے بناتا ہوں'' ارسلان کچن کی طرف جاتے ہوئے بولا......تو......شہیر مسکرانے لگا۔

زل کو ارسلان پر غصہ آنے لگا کہ وہ اسے کیوں تنہا چھوڑ کر جا رہا ہے۔

''آپ کا گھر بہت خوبصورت ہے......اور......پرسکون بھی......یہاں آ کر خوشی کا احساس ہوتا ہے......جیسے آپ کے قریب آ کر'' شہیر زل کے قریب آ کر بولا۔

زل نے خفگی سے اس کی جانب دیکھا اور پیچھے ہٹ گئی۔

''آپ کو میرا خیال کبھی نہیں آیا؟'' شہیر نے معنی خیز انداز میں پوچھا اور زل کی طرف بغور دیکھنے لگا۔

''نہیں......'' وہ دوٹوک لہجے میں بولی۔

''کیوں؟'' اس نے پوچھا۔

''اس لئے......کہ مجھے جس کا خیال رکھنا ہوتا ہے......وہ میرے پاس ہوتا ہے......'' زل ٹھوس لہجے میں بولی۔

''کون......ارسلان؟'' شہیر نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......''

''آپ کو......اس سے کیسے اتنی محبت ہوگئی؟'' شہیر نے پوچھا۔

''جیسے......آپ سے نہیں ہو پائی'' وہ قدرے سخت لہجے میں بولی۔

''اور......اگر......ارسلان ہمارے درمیان نہ ہوتا......تو کیا آپ تب بھی مجھ سے محبت نہ کرتیں'' شہیر نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے پوچھا۔

''معلوم نہیں'' اس نے گہری سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

ارسلان ٹرے میں چائے کے کپ اور بسکٹ رکھ کر لایا......شہیر جلدی سے اس کی طرف بڑھا اور اس کے ہاتھ سے ٹرے پکڑی۔

''ارے بھئی......یہ کیا کر رہے ہو؟ تم ہمارے مہمان ہو'' ارسلان نے شائستگی سے کہا۔

''دوستوں میں تکلف نہیں ہوتا'' شہیر نے جواب دیا اور ٹرے زل کے آگے کی۔ اس نے کپ پکڑا اور خاموشی سے چائے پینے لگی۔ وہ اپنے غصے کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی......اس لئے بلائنڈز کی طرف منہ کر کے یوں کھڑی ہوگئی......جیسے اپنی پینٹنگ کو تنقیدی نگاہ سے دیکھ رہی ہو۔

''کیا تم لوگ چھٹی کا دن یہاں گزارتے ہو؟'' شہیر نے پوچھا۔

''ہاں......'' ارسلان نے جواب دیا۔

''مگر......اگلی بار نہیں'' ژل نے مڑ کر جلدی سے جواب دیا۔

''کیوں......ژل؟'' ارسلان نے حیرت سے پوچھا۔

''ارے بھئی......آپ اپنا پروگرام کینسل مت کریں......میں اگلے ہفتے نہیں آؤں گا......'' شہیر نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ارے......نہیں......نہیں......ژل تمہاری وجہ سے نہیں کہہ رہی......ضرور ہماری کوئی کمٹمنٹ ہوگی'' ارسلان نے جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے کہا تو ژل خاموش ہوگئی۔

شہیر تھوڑی دیر بعد اجازت لے کر چلا گیا۔

''ارسلان......پلیز آئندہ اسے یہاں مت بلانا......سارا موڈ آف کر کے رکھ دیا ہے'' ژل خفگی سے بولی۔

''کیا مطلب؟'' ارسلان نے حیرت سے پوچھا۔

''بس......یونہی......ڈپریشن کی باتیں کرتا ہے......اس کے آنے سے پہلے ہم لوگ کتنے خوش تھے اور میں بہت جلدی کام کر رہی تھی۔ اب میرا کام کرنے کو بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا......چلو......واپس چلتے ہیں'' ژل نے برتن ٹرے میں رکھتے ہوئے کہا تو ارسلان خاموش ہوگیا۔

☆

شہیر اور حرا کے درمیان گہری خاموشی چھا گئی تھی......وہ دیر سے گھر آتا......کھانا کھائے بغیر......ڈرنک کرنا شروع کر دیتا......پہلے بھی وہ حرا سے زیادہ باتیں نہیں کرتا تھا مگر اس کی طرف دیکھتا ضرور تھا......ڈرنک کرنے کے بعد اس کے پاس ضرور جاتا تھا مگر اب وہ نہ تو اس کی طرف دیکھتا تھا......نہ اس کے پاس جاتا تھا......صرف ڈرنک کرتا تھا......اور گہری سوچوں میں گم رہتا تھا......اس کے چہرے سے یوں لگتا جیسے وہ کسی شدید الجھن کا شکار ہو......اور حرا سمجھی کہ وہ سمیرا اور حرا کی باتیں سن کر دلبرداشتہ ہو کر پہلے سے زیادہ ڈرنک کر رہا ہے......وہ کبھی اپنے آپ کو قصور وار سمجھتی......تو کبھی اسے......کبھی اسے ظالم کہتی......تو کبھی اسے......اس پر رحم آتا......جب وہ اس کے پاس آتا تھا تو اسے اس سے نفرت اور کراہت محسوس ہوتی تھی......اب وہ اس کے پاس نہیں آتا تھا تو اسے تشنگی کا احساس ہوتا تھا......دونوں کے درمیان بہت ہی عجیب رشتہ تھا......محسوسات پر مبنی......مگر جذبات سے عاری......حرا اس کی طرف خاموش نگاہوں سے دیکھتی رہتی......اور اس کی نظریں تخیل میں کسی اور کی جانب مرکوز رہتیں......وہ تھک کر سو جاتی......اور شہیر کسی اور کو سوچتے ہوئے جاگتا رہتا......اور اس وقت تک ڈرنک کرتا رہتا جب تک اس کی آنکھیں بند نہ ہونے لگتیں......اور اس لمحے اسے محسوس ہوتا کہ ژل اس کے پاس موجود ہے......اور اس کے ساتھ سرگوشیوں میں باتیں کر رہی ہے......وہ مسکراتا ہوا اس کی طرف دیکھتا رہتا......اور اسی حالت میں سو جاتا......

☆

ارسلان اور زنل اپنے آفس میں کسی بات پر قہقہہ لگا رہے تھے جب شہیر ان کے آفس میں داخل ہوا.....ان کو ہنستے دیکھ کر وہ ٹھٹھکا اور حیرت وحسرت کے ملے جلے تاثرات سے انہیں عجیب انداز میں گھورنے لگا.....زنل اس کی نظروں سے خائف ہونے لگی۔

"آؤ شہیر......کیسے ہو.....اکیڈمی میں تمہارا دل لگ گیا ہے نا" ارسلان نے شہیر کی جانب مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں......یہاں آکر بہت اچھا محسوس کرتا ہوں" شہیر نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"میں نے کچھ اسٹوڈنٹس کے پراجیکٹس دیکھنے ہیں....." زنل نے آفس سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

شہیر ارسلان کے سامنے بیٹھ گیا......اور ایک پراجیکٹ ڈسکس کرنے لگا۔

"ارسلان ......کیا تم اپنی زندگی سے مطمئن ہو؟" باتیں کرتے ہوئے شہیر نے اچانک پوچھا۔

"ہاں......بالکل......زنل میری زندگی میں ایسی بہار لے کر آئی ہے.....کہ.....میں اپنے سارے کمپلیکس بھول گیا ہوں......اس نے مجھے ہر خوشی دی ہے......بہت اعتماد......بہت سکون......اور بہت محبت......زنل سے ملنے سے پہلے میں زندگی میں بہت تشنگی محسوس کرتا تھا......تم میرا فیملی بیک گراؤنڈ تو جانتے تھے میں ایک مڈل کلاس گھرانے سے تعلق رکھتا تھا......آرٹ کی تعلیم حاصل کرنا میرا شوق تھا اور اس شوق کو پورا کرنے کے لئے میں کالج کے بعد رات گئے تک ٹیوشنز کرتا تھا......میری زندگی بہت محدود اور قدرے بے رنگ تھی......زنل نے اپنی محبت، اعتماد اور چاہت سے میری زندگی میں قوس وقزح کے رنگ بھر دیے ہیں......زنل بہت اچھی ہے اور میں بہت خوش قسمت ہوں جسے زنل ملی" ارسلان محبت بھرے لہجے میں بولا۔

"کیا تم زنل کو ڈیزرو کرتے تھے؟" شہیر نے معنی خیز انداز میں پوچھا اور ارسلان کی طرف دیکھنے لگا۔

"سچ بتاؤں......بالکل بھی نہیں" وہ ہر ہر بات میں مجھ سے بہت بہتر ہے حسن وخوبصورتی، اچھائی، امارت، نفاست اور اچھے ذوق میں اس کا کوئی ثانی نہیں" ارسلان نے بتایا۔

"مجھے.....تم دونوں پر بہت رشک آتا ہے" شہیر نے کہا۔

"رشک ضرور کرنا یار......مگر حسد نہ کرنا" ارسلان نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کیوں؟" شہیر نے حیرت سے پوچھا۔

"حسد سے خوشیوں کو نظر لگ جاتی ہے" ارسلان نے جواب دیا تو شہیر مسکرانے لگا۔

"تم نے کبھی اپنی بیوی اور میریڈ لائف کے بارے میں نہیں بتایا......کبھی اپنی بیوی سے تو ملاؤ" ارسلان نے کہا۔

"جب ایک کو دوسرے سے ملوایا جاتا ہے......تو اس کی ذات کا حوالہ دینا پڑتا ہے......اور میں اپنی بیوی کو کس طرح تعارف کراؤں...... اس کا تو کوئی حوالہ ہی نہیں" شہیر نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"کیا مطلب......؟" ارسلان نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

"وہ نہ میرے لئے اہم ہے......اور نہ ہی میں اس کے لئے......ہم اپنی اپنی زندگیاں گزار رہے ہیں......اور......بس" شہیر اداس لہجے میں بولا۔

''ویری سیڈ......پھر ایسے رشتے کا کیا فائدہ......؟تم نے اس سے شادی کیوں کی......'' ارسلان نے کہا۔

''ہاں......یہی میں بھی سوچتا ہوں'' شہیر نے جواب دیا۔

''تم نے کسی ایسی لڑکی سے شادی کیوں نہ کی جسے تم محبت کرتے'' ارسلان نے سنجیدگی سے کہا۔

''کیسے کرتا......وہ کسی اور سے محبت کرتی تھی......اور اس نے اس سے شادی کر لی'' شہیر نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''اوہ......ویری سیڈ......پھر تم نے اس سے کیوں نا شادی کی......جو تم سے محبت کرتی'' ارسلان نے کہا۔

''میں نے اس کے علاوہ کسی اور کے بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں...... مجھے کیسے علم ہوتا کہ کوئی اور بھی مجھ سے محبت کر سکتی ہے......'' شہیر نے جواب دیا۔

''اور......تمہاری بیوی......؟ کیا وہ تم سے محبت نہیں کرتی؟''

''نہیں......وہ......بھی کسی اور سے محبت کرتی ہے'' شہیر نے جواب دیا۔

''اوہ گاڈ......اٹس ویری ٹریجک......لیکن یار کب تک زندگی ایسے گزرے گی......تمہیں اپنی زندگی کو بدلنے کے لئے اپنے دل کو سمجھانا پڑے گا......تم اپنی پرانی سوچوں میں سے نکل آؤ......اور......اس کو دیکھو جو تمہارے سامنے ہے......'' ارسلان نے دوستانہ انداز میں سمجھایا۔

''میں کیا کروں......مجھے اس کے سوا کوئی اور نظر ہی نہیں آتا......مجھے اپنی بیوی کے چہرے میں بھی وہ ہی دکھائی دیتی ہے......میرے دل کے ہر خانے میں وہ سمائی ہے......میں جس لڑکی کو بھی دیکھتا ہوں مجھے وہی دکھائی دیتی ہے'' شہیر نے بے بسی سے جواب دیا۔

''تم......اس سے محبت نہیں......دیوانگی کی حد تک عشق کرتے ہو......اور عشق میں انسان ایسے ہی بے بس ہو جاتا ہے۔عشق بہت جان لیوا ہوتا ہے'' ارسلان نے جواب دیا۔

''ارسلان......اس عشق نے مجھے بہت بے چین اور مضطرب کر دیا ہے......میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا......تم ہی بتاؤ......میں کیا کروں......؟وہ اپنے شوہر سے بہت محبت کرتی ہے۔میں کیا کروں......کہ......وہ مجھ سے محبت کرنے لگے'' شہیر نے اس سے مشورہ چاہا۔

''یار......تم اس کے دل کو کیسے بدل سکتے ہو......اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ خوشگوار زندگی گزار رہی ہے تو تم کیسے اسے مجبور کر سکتے ہو......کہ وہ سب کچھ چھوڑ کر تمہارے پاس آجائے......اور......تم سے محبت کرنے لگے......بہتر یہی ہے کہ تم اس کا خیال اپنے دل سے نکال دو......اور اپنی بیوی کے ساتھ ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کرو'' ارسلان نے سمجھایا۔

''میں......نہیں......کر سکتا......مجھے اس کے علاوہ کوئی اور نظر نہیں اتا......تو کچھ اور کیسے سوچوں......وہ میری محبت اور عشق کی انتہا ہے......اس کے بعد کوئی اور نہیں......کوئی بھی نہیں......کبھی بھی نہیں......'' وہ جذباتی انداز میں بولا۔

اسی لمحے زُنل آفس میں داخل ہوئی......شہیر نے اس کی طرف بے بسی سے دیکھا اور آفس سے باہر نکل گیا۔

''اسے کیا ہوا......؟'' زُنل نے حیرت سے پوچھا۔

”بیچارے کے ساتھ بہت برا ہوا ہے......اپنی محبت کی کہانی سنا رہا تھا......“ ارسلان نے جواب دیا۔

”ک......کک......کیا......کیا بتایا......؟“ ژل نے حیرت سے پوچھا۔

”یہی کہ یہ جس سے محبت کرتا تھا......اس کی شادی کہیں اور ہو گئی......مگر یہ بے وقوف شخص ابھی تک اس کے سحر میں مبتلا ہے......ژل......شہیر......اس لڑکی سے عشق کرتا ہے......اور وہ بھی دیوانگی کی حد تک......مجھے تو ڈر ہے......یہ واقعی اس کے عشق میں دیوانہ نہ ہو جائے......“ ارسلان نے تاسف سے کہا۔

”کون ہے......وہ......لڑکی......؟“ ژل نے نادانستہ پوچھا۔

”معلوم نہیں......نہ ہی میں نے پوچھا......اور نہ ہی اس نے بتایا“ ارسلان نے آہ بھر کر کہا۔

”گھر چلیں......کافی ٹائم ہو رہا ہے“ ژل نے آفس کی دیوار پر لگے کلاک کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں......“ ارسلان چیزیں سمیٹتے ہوئے بولا اور اس کے ہمراہ باہر نکل آیا۔

ژل کا ذہن بری طرح الجھ چکا تھا۔ ڈرائیونگ کرتے ہوئے بھی ارسلان کی باتیں اس کے ذہن میں گونج رہی تھیں۔

”شہیر اس لڑکی سے عشق کرتا ہے......اور وہ بھی دیوانگی کی حد تک عشق کرتا ہے......دیوانگی کی حد تک......دیوانگی کی حد تک“ ان الفاظ کی بازگشت سے وہ فرار چاہتی تھی مگر شاید اب فرار ممکن نہیں تھا۔

☆

مسز فاخر پچھلے کئی ماہ سے اپنی پبلک لائف میں بہت مصروف تھیں گھر اور گھر کے معاملات سے وہ بالکل ہی بے خبر ہو گئی تھیں۔ گھر میں کیا ہو رہا ہے......؟ گھر میں کون آتا ہے......کون جاتا ہے انہیں قطعی اس کا علم نہیں تھا...... شہیر اور حرا جس طرح کی زندگی گزار رہے تھے انہیں علم تو تھا مگر اب دونوں کس حد تک ایک دوسرے سے متنفر ہو چکے تھے اور بالکل ہی ایک دوسرے سے بے خبر ہو گئے تھے۔ انہیں اس کی بالکل بھی خبر نہیں تھی۔

کئی ماہ بعد انہوں نے گھر میں ایک دن گزارا تو وہ شہیر اور حرا کی روٹین دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ فاخر حسین بھی اس روز گھر پر موجود تھے۔ مسز فاخر نے حرا اور شہیر کو بلایا تاکہ وہ دونوں بھی ان کے ساتھ ڈنر کریں...... ملازمہ گئی اور واپس آ گئی۔

''میڈم......دروازے پر کئی بار دستک دی ہے مگر کوئی دروازہ ہی نہیں کھولتا......'' ملازمہ نے پریشانی سے جواب دیا۔

''فاخر...... میرا خیال ہے آپ بلا لائیے'' مسز تہمینہ نے کہا۔

''آپ خود کیوں نہیں چلی جاتیں...... مجھے بہو کے کمرے پر دستک دینا پسند نہیں...... آپ ساس کی حیثیت سے جا سکتی ہیں'' فاخر حسین نے قدرے منہ بنا کر طنزیہ لہجے میں کہا۔

تہمینہ نے شوہر کی طرف قدرے خفگی سے دیکھا اور اوپر چلی گئیں۔ کافی بار دستک دی...... مگر جواب نہ ملا۔ انہوں نے اپنے موبائل سے اندر شہیر اور حرا کے موبائلز پر کال کی۔ شہیر کا موبائل بند تھا حرا نے بمشکل ہیلو کہا۔

''حرا بیٹے......دروازہ کھولو...... کیا بات ہے......؟ کیا تم سو رہی ہو؟'' مسز تہمینہ نے پریشانی سے کہا۔

حرا نے بمشکل دروازہ کھولا...... اور دروازہ کھولتے ہی گر پڑی۔ مسز فاخر پریشان ہو کر اسے اٹھانے لگیں۔

''حرا بیٹے ہوش کرو...... یہ......تمہیں کیا ہوا ہے؟'' مسز فاخر پریشانی سے بولیں اور اسے بمشکل سہارا دے کر بستر پر لٹایا۔ حرا کو شدید بخار تھا......اور بخار کی شدت اور جسمانی نقاہت سے وہ گر کر بے ہوش ہو گئی تھی۔

شہیر صوفے پر نشے میں دھت بے ہوش پڑا تھا اسے کچھ خبر نہ تھی...... کمرے میں کیا ہو رہا ہے......کون کمرے میں آیا ہے اور حرا کی کیا حالت ہے......اس کے پاس ٹیبل پر وسکی اور بیئر کی بوتلیں رکھی تھیں...... ہر بوتل میں سے اس نے شراب پی ہوئی تھی وہ اس قدر کثرت سے شراب نوشی کرنے لگا تھا......انہیں جان کر شدید صدمہ ہوا، مسز فاخر نے فاخر حسین کو موبائل پر فون کر کے اوپر بلایا۔ وہ بھی شہیر کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ وہ ان سے دس گنا زیادہ شراب نوشی کرنے لگا تھا۔

''فاخر......یہ......کب تک ایسے چلے گا......شہیر کا علاج بہت ضروری ہے......ورنہ......یہ......؟'' وہ رونے لگیں۔

فاخر حسین نے ہاسپٹل میں فون کر کے ایمبولینس بلائی اور شہیر کو ہاسپٹل میں ایڈمٹ کرایا۔ وہ خود اس کے ساتھ ہاسپٹل چلے گئے۔

مسز فاخر حرا کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گئیں...... دو دن کی بے ہوشی کے بعد اس کی طبیعت کچھ سنبھلی تھی......شہیر کے بارے میں جان کر وہ خاموش ہو گئی......

''حرا......یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ تم لوگ ایک دوسرے سے اتنے دور ہو گئے ہو......کہ......ایک دوسرے کی کوئی خبر ہی نہیں'' مسز فاخر نے

حیرت سے پوچھا۔

''آنٹی......ہم ایک دوسرے کے پاس ہی کب تھے...... جواب دور ہو گئے'' حرا نے نم آنکھوں سے جواب دیا۔

''پلیز......شبیر کو سمجھنے کی کوشش کرو......وہ بہت تکلیف میں ہے......'' مسز فاخر نے کہا۔

''اور......میں؟ کیا میں خوش ہوں؟'' حرا نے آہ بھر کر پوچھا۔

''میں سب جانتی ہوں......مگر......شبیر کی زندگی کی خاطر......پلیز......اس کا ساتھ دو'' مسز فاخر نے التجائیہ انداز میں کہا۔

''کیسے ساتھ دوں......؟ وہ میرا ساتھ چاہتا ہی نہیں......مجھے قبول کرتا ہی نہیں......تو......پھر کیسے......؟'' حرا نے کہا۔

''تم جانتی ہو اس کی بلڈ رپورٹس ٹھیک نہیں آئیں......'' مسز فاخر نے پریشانی سے کہا۔

''ک......کیا......ہوا؟'' حرا نے ایک دم گھبرا کر پوچھا۔

''ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ بہت زیادہ ڈرنک کرنے سے اس کے گردے بری طرح متاثر ہو رہے ہیں اور گردے ٹھیک طرح سے خون فلٹر (صاف) نہیں کر رہے جس کی وجہ سے خون میں یوریا کی مقدار بڑھتی جا رہی ہے......جو دل کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے'' مسز تہمینہ نے پریشانی سے بتایا۔

''حرا کے چہرے پر بھی پریشانی کے تاثرات نمایاں ہوئے اور وہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئی۔

''بیٹا......میں جانتی ہوں......شبیر تمہارے ساتھ زیادتی کر رہا ہے مگر اس کی زندگی کی خاطر کیا تم دونوں آپس میں اختلافات ختم نہیں کر سکتے'' مسز تہمینہ نے نرم لہجے میں کہا۔

''آنٹی اختلافات تب ہوتے ہیں جب آپس میں کوئی بات چیت یا کوئی تعلقات ہوں......اور ہمارے درمیان ایسا کچھ بھی نہیں'' حرا نے آہ بھر کر صاف گوئی سے بتایا۔

''حرا......تم آگے بڑھ کر اس دوری کو ختم کرو'' مسز تہمینہ نے کہا۔

''آنٹی......میں آپ کو کیسے سمجھاؤں......وہ میری ذات سے......میرے وجود سے بالکل بے خبر ہے......میں اس کے سامنے ہوتی ہوں مگر وہ کسی اور کو دیکھ رہا ہوتا ہے......اگر وہ مجھے پکارتا ہے تو اس کے نام سے......اور......اگر میرے پاس آتا ہے تو اس کو سمجھ کر......میں اس کو نہ تو دکھائی دیتی ہوں......اور نہ ہی وہ مجھے محسوس کرتا ہے......وہ اس لڑکی سے دیوانوں کی طرح محبت کرتا ہے'' حرا نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''اوہ......نو......'' مسز فاخر پریشانی سے ہونٹ کاٹنے لگیں۔

حرا کو مزید کچھ کہنا بے کار تھا......اس لئے وہ خاموشی سے باہر نکل گئیں۔

☆

شہیر کچھ روز ہاسپٹل میں ایڈمٹ رہنے کے بعد گھر شفٹ ہو گیا...... حرا اس کے رویے اور اس کی باتوں کو بھول کر اس کی خدمت میں لگ گئی...... اس نے چند روز کے لئے ہاسپٹل سے چھٹی لی تھی اور وقت پر اس کو خوراک اور دوائیں دیتی...... مسز فاخر نے زبردستی اس کے کمرے سے ساری شراب کی بوتلیں ہٹا دی تھیں...... ڈیڈی گاہے بگاہے آ کر اسے سمجھاتے اور وہ خاموشی سے ان کی باتیں سنتا رہتا...... کبھی آتیں تو اسے ہدایات دیتیں...... وہ ان کی باتیں سنتا رہتا...... حرا کچھ نہ کہتی...... مگر وہ اس کو بھی سمجھتا مگر زبان سے کچھ نہ کہتا...... بس ہر وقت گہری سوچ میں ڈوبا رہتا...... جیسے کسی شدید الجھن کا شکار ہو...... جیسے اس کے اندر کوئی جنگ جاری ہو۔

''بہتر یہی ہے...... کہ...... تم اس کا خیال اپنے دل سے نکال دو...... اور اپنی بیوی کے ساتھ ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کرو'' ارسلان کے الفاظ بار بار اس کے ذہن میں گونجتے...... وہ...... حرا کی طرف دیکھتا...... اپنے ذہن میں وہ نازک خیالات اور جذبات لانے کی کوشش کرتا...... جیسے وہ زل کو دیکھتے ہوئے محسوس کرتا...... انتہائی کوشش کے باوجود بھی اس کے اندر وہ احساسات پیدا نہیں ہو رہے تھے...... زل کے قریب جانے سے اس کے دل کی دھڑکنیں جس طرح بے ترتیب ہوتی تھیں...... حرا کے قریب جا کر بھی دل ایسی کیفیت سے دوچار نہیں ہوتا تھا...... زل کو دیکھ کر اس کی آنکھیں جس طرح چمکتی تھیں...... حرا کو دیکھ کر ہمیشہ سونی ہی رہتی تھیں...... زل دور سے ہی اس کی رگ رگ میں ایسی سرشاری بھر دیتی تھی...... جو...... حرا کے بہت قریب جانے پر بھی وہ کبھی محسوس نہیں کرتا تھا۔

''شہیر...... پلیز...... اپنی زندگی کو یوں تباہ مت کرو...... اپنے آپ میں جینے کا حوصلہ پیدا کرو'' حرا اپنے آپ کو بہت سمجھا کر اس کے قریب آئی اور اس کے نخ ہاتھ کو اپنے نرم و گرم ہاتھوں میں مضبوطی سے دباتے ہوئے کہا۔ شہیر نے اس کی جانب دیکھا...... اور دیکھتا ہی رہ گیا......

''کیا دیکھ رہے ہو؟'' حرا نے چہرے پر مسکراہٹ لا کر پوچھا۔

اسے یوں لگا جیسے وہ رفتہ رفتہ زل کے سحر سے نکل کر اس کی جانب آ رہا ہو...... اس کا دیکھنا اسے خوش آئین لگا۔

''شہیر...... ہمیں اگر قسمت نے ایک دوسرے سے ملایا ہے...... تو ہمیں قسمت کے فیصلے کو قبول کر کے ایک دوسرے کو قبول کر لینا چاہیے......'' حرا نے قدرے ملائمت سے کہا۔

شہیر توجہ سے اس کی باتیں یوں سننے لگا...... جیسے ایک ایک لفظ کو اپنی حافظے میں محفوظ کر رہا ہو...... وہ حیرت سے حرا کی جانب یوں دیکھنے لگا جیسے پہلی بار اسے بولتے ہوئے سن کر حیران ہو رہا ہو...... اور اس حیرانگی کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھوں میں حرا کی باتوں کے لئے پسندیدگی بھی نمایاں ہو رہی تھی...... حرا کو اپنی باتوں کا ردعمل دیکھ کر کچھ اطمینان سا محسوس ہونے لگا۔

''پلیز اپنی زندگی کو یوں ضائع مت کرو...... تم بہت ٹیلنٹڈ انسان ہو...... تم زندگی میں بہت کچھ کر سکتے ہو...... جانتے ہو تمہیں قدرت نے جتنا ٹیلنٹ دیا ہے...... وہ بہت کم لوگوں کو ملتا ہے...... یو...... آر...... اے جینئس...... تم اپنی فیلڈ میں بہت نام پیدا کر سکتے ہو...... پلیز اپنے آپ میں ہمت پیدا کرو......'' حرا نے اس کے ردعمل سے حوصلہ پا کر قدرے جذباتی انداز میں اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے اپنے لب اس کے ہاتھ پر رکھ دیے...... شہیر حیرت سے اس کی طرف دیکھتا رہا...... مگر...... اس کے وجود میں کوئی حرکت اور حرارت پیدا نہ ہوئی۔

''شہیر...... پلیز...... کچھ تو کہو...... میں تمہارے دل کی آواز سننا چاہتی ہوں...... تمہاری باتیں سننے کو میرا دل چاہتا ہے...... تم میرے بارے میں کیا محسوس کرتے ہو...... میں سب جاننا چاہتی ہوں......'' حرا رفتہ رفتہ جذباتی ہو کر اس کے قریب آ رہی تھی...... شہیر نے حیرت سے اس کی طرف یوں دیکھا جیسے استفہامیہ انداز میں پوچھ رہا ہو۔ ''کیوں؟'' حرا نے اس کی آنکھوں میں لکھا سوال پڑھ لیا۔

''اس لئے...... شہیر...... کہ...... میں تمہاری بیوی ہوں...... اور تم سے محبت کرتی ہوں'' حرا نے محبت بھرے انداز میں کہا۔

''محبت'' کا لفظ اس کے منہ سے سن کر شہیر نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں سے یوں نکالا جیسے کوئی بے رخی سے کسی کو دیکھ کر منہ پھیر لیتا ہے...... اور اس نے کروٹ بدل لی۔ حرا کا دل اس کے اس رویے پر دل برداشتہ ہو گیا...... اسے اپنی توہین اور ذلت سی محسوس ہونے لگی۔ وہ واش روم میں جا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''یہ شخص اپنی محبت میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہے جو ایک انچ بھی اپنی جگہ سے ہٹنے کو تیار نہیں...... تمہاری محبت، چاہت، خدمت، خلوص، پیار، ایثار، کچھ بھی اس کو ریت کی دیوار نہیں بنا سکتی...... اور اسی دیوار سے سر پھوڑ پھوڑ کر تم خود لہولہان ہو جاؤ گی...... مگر یہ تمہیں اپنے دل میں کبھی جگہ نہیں دے گا......'' حرا نے روتے ہوئے سوچا اور واش روم سے باہر نکل کر کمرے میں آئی...... وہ کمرے میں موجود نہیں تھا...... اس نے حیرت سے ادھر ادھر دیکھا اور کہیں نہ پا کر گھبرا گئی...... وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی تو وہ کہیں نہیں تھا...... اس نے گھبرا کر ملازمہ سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ گاڑی لے کر باہر چلا گیا ہے مگر کہاں؟ اس کی تو حالت بہت خراب تھی...... وہ کیوں باہر گیا اور کس لیے......؟ کیا اہم کام ہو سکتا ہے؟ اس نے پریشان ہو کر اس کے موبائل پر کال کی مگر دو بیلز کے بعد اس نے حرا کی کال ریجکیٹ کر دی...... اس نے دوبارہ نمبر ٹرائی کیا تو اس نے موبائل ہی آف کر دیا...... حرا بے چین ہونے لگی اور اس کا دل گھبرانے لگا۔ اس نے گھبرا کر فاخر حسین اور مسز فاخر کو فون کر کے بتایا تو وہ بھی پریشان ہو گئے۔

''ڈاکٹروں نے اسے بیڈ ریسٹ کا کہا ہے...... اور...... وہ کیوں باہر چلا گیا......؟'' مسز فاخر گھر آ کر پریشانی سے بولیں۔

''حرا بیٹے...... آپ کہاں تھیں؟ آپ کو تو سب معلوم تھا...... پھر آپ نے اسے کیوں جانے دیا؟'' فاخر حسین نے حرا سے کہا۔

''انکل میں واش روم میں تھی اور جب میں کمرے میں آئی تو وہ جا چکے تھے......'' حرا نے آہستہ سے جواب دیا۔

مسز فاخر اور فاخر حسین اپنے اپنے موبائلز پر مختلف لوگوں سے رابطہ کر رہے تھے وہ کسی کو شہیر کے بارے میں بتا رہے تھے اور کسی کو پوچھ رہے تھے۔

اچانک شہیر کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا...... سب گھبرا کر باہر گیٹ کی جانب لپکے...... شہیر گاڑی سے اترا تو مسز فاخر گھبرا کر اس سے پوچھنے لگیں۔

''شہیر...... تم کہاں گئے تھے......؟ جانتے ہو ہم سب تمہارے لئے کتنے پریشان ہو رہے تھے...... اور...... تم کیوں گئے؟ ڈاکٹر نے تمہیں بیڈ ریسٹ کا کہا ہے......'' مسز فاخر پریشانی سے پوچھنے لگیں۔

''ایک ضروری کام تھا......'' اس نے لاپروائی سے جواب دیا۔

کونسا ایسا کام تھا کہ تمہیں خود جانا پڑا...... تم ہمیں بتا دیتے...... ہم کر دیتے...... میر اپنا اے ہر وقت یہاں موجود رہتا ہے......'' مسز فاخر نے کہا۔

''وہ کام مجھے ہی کرنا تھا'' وہ پراطمینان لہجے میں بولا اور کہہ کر سیڑھیاں چڑھتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ سب لوگ حیرانگی سے اسے دیکھتے رہ گئے۔

☆

ارسلان اور زل چھٹی کا دن اپنے نئے گھر میں گزارنے آئے تھے۔ گھر کا کام کافی حد تک مکمل ہو چکا تھا نیا فرنیچر بھی آ گیا تھا...... نئے پردے بھی لگ گئے تھے۔ ہر کمرے میں میچنگ کارپٹ بھی بچھ گئے تھے۔ ڈرائنگ روم اس قدر خوبصورت لگ رہا تھا کہ قدم رکھتے ہی ان کے ذوق اور فن کو خراج تحسین پیش کرنے کو جی چاہتا۔ کلر سکیم اور ڈیزائننگ میں ہر چیز منفرد اور جاذب نظر تھی...... انہوں نے زیادہ تر نیچرل چیزوں پر پینٹنگز کیں تھیں...... پام کے بڑے بڑے چوڑے پتوں پر، لکڑی کی logs پر...... فیبرک پر...... پردوں پر...... ڈرائنگ اور ڈائننگ روم کے درمیان گلاس وال پر...... ہر چیز بہت خوبصورت انداز میں اپنی جانب متوجہ کرتی تھی۔

''ارسلان...... ہمارا گھر کتنا خوبصورت لگ رہا ہے...... اتنا خوبصورت گھر تو میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا......'' زل نے ڈرائنگ روم کے وسط میں کھڑے ہو کر گول چکر میں گھومتے ہوئے قدرے پرجوش انداز میں کہا۔

''اس لئے کہ اسے ہم نے خود خوبصورت بنایا ہے، ورنہ تمہارے پیرنٹس کا گھر اس سے بھی زیادہ خوبصورت اور بڑا تھا'' ارسلان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''نہیں...... میرا گھر زیادہ خوبصورت ہے......'' زل پراصرار لہجے میں بولی۔

''ٹھیک ہے بھئی...... تم کہتی ہو...... تو مان لیتے ہیں'' ارسلان نے ہتھیار ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

''جانتے ہو...... یہ کیوں خوبصورت ہے......'' زل نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''کیوں......؟'' ارسلان نے مسکرا کر پوچھا۔

''اس لئے...... کہ...... یہ تمہاری اور میری چاہتوں کا ''محبت کدہ'' ہے...... اور محبت تو ہمیشہ خوبصورت ہی ہوتی ہے نا......'' زل نے مسکرا کر محبت بھرے لہجے میں کہا۔

''مگر میں تو خوبصورت نہیں......'' ارسلان نے مذاق کرتے ہوئے کہا۔

''کبھی میری نظر سے اپنے آپ کو دیکھو...... پھر تمہیں معلوم ہوگا...... تم کتنے خوبصورت ہو'' زل اس کے قریب آ کر اسے محبت پاش نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی۔

''تم کہتی ہو تو مان لیتا ہوں ورنہ سامنے دیوار پر لگا آئینہ تو کچھ اور ہی کہتا ہے'' ارسلان نے اسے اپنے ساتھ لگا کر دیوار پر لگے قد آدم آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''حور کے پہلو میں...... ڈیش لگ رہا ہوں نا'' ارسلان نے قہقہہ لگا کر کہا۔ زل بھی ہنسنے لگی۔

"بہت بری بات...... میرے شوہر کے بارے میں ایسا کہنے کا تمہیں کوئی حق نہیں...... آئندہ محتاط رہنا" زل نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

"اوکے...... بیگم صاحبہ...... محتاط رہوں گا" اور دونوں ہنسنے لگے۔

اچانک گیٹ بیل بجی...... دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔

"یہاں کون آ گیا ہے......؟" زل نے حیرت سے پوچھا۔

"شبیر ہوگا......؟" وہ پھر منہ بناتے ہوئے بڑبڑائی۔

"ارے نہیں...... وہ تو بیچارا بیمار ہے...... اور ڈاکٹر نے اسے بیڈ ریسٹ کہا ہے...... ٹھہرو...... میں دیکھتا ہوں" ارسلان کہہ کر باہر چلا گیا اور زل ایک پینٹنگ کو مختلف دیواروں پر لگا کر دیکھنے لگی۔ اچانک اسے عجیب سی آواز سنائی دی۔ وہ گھبرا کر باہر گئی۔ گیٹ کھلا تھا...... اور...... اور...... وہ...... دیکھتی ہی رہ گئی...... پھٹی پھٹی نگاہوں سے...... اس کا چہرہ ایک دم زرد پڑنے لگا...... اس کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی...... ارسلان کی لاش آدھی گیٹ کے اندر تھی آدھی باہر...... کسی نے اسے گولی ماردی تھی۔

زل اونچی آواز سے چلانے لگی...... گھر کے در و دیوار اس کی چیخوں اور رونے کی آواز سے بری طرح لرزنے لگے اور لوگ جمع ہونے لگے۔

## (۱۴)

ڈاکٹر محسن زیدی نے ایک فائیو سٹار ہوٹل میں ڈاکٹر دانش کے اعزاز میں پرتکلف عشائیے کا اہتمام کیا تھا۔ عشائیے سے قبل ایک چھوٹی سی پریس کانفرنس بھی کی گئی تھی جس میں ڈاکٹر محسن زیدی کے علاوہ ملک کے نامور سرجن ڈاکٹروں نے ڈاکٹر دانش کی خدمات کو بھرپور انداز میں خراج تحسین پیش کیا تھا۔ کئی وزراء کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر دانش اسٹیج پر بیٹھے تھے اور اپنے بارے میں بھرپور تعریفی کلمات سن کر ان کے چہرے پر انتہائی خوشی کے تاثرات نمایاں ہو رہے تھے۔ ان کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں اور ان کا سر فخر سے تن رہا تھا۔ ان کے اندر شدید احساس برتری کے جذبات جنم لے رہے تھے۔ اس وقت انہیں اپنے جیسا پوری دنیا میں کوئی اور دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اپنے بارے میں اتنی بڑائی اور اتنی تعریف سن کر وہ خوشی سے پھولے نہ سما رہے تھے۔ میڈیا سے وابستہ لوگ بڑی تعداد میں موجود تھے۔ ہر کیمرہ مین نے ڈاکٹر دانش کے چہرے پر کیمرہ فوکس کر رکھا تھا اور وہ مختلف زاویوں سے ان کی تصاویر لے رہے تھے۔ مگر کسی بھی صحافی کو ڈاکٹر دانش سے کسی بھی قسم کا سوال کرنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی تاکہ کوئی سوال انہیں ذاتی طور پر پریشان نہ کر دے اور ڈاکٹر زیدی ان کی ذہنی صحت کے بارے میں بہت کونشس تھے۔ ڈاکٹر زیدی، ڈاکٹر رمیض اور ڈاکٹر دریہ رمیض اس پریس کانفرنس میں صحافیوں کے مختلف سوالات کے جوابات دے رہے تھے اور سب کو یہی بتایا گیا کہ ڈاکٹر دانش اتنا عرصہ انگلینڈ میں ایک ریسرچ کے سلسلے میں مصروف رہے۔ صحافی اس ریسرچ کے بارے میں جاننا چاہتے تھے مگر ڈاکٹر زیدی نے یہ کہہ کر سب کو مطمئن کر دیا کہ وہ کسی اور وقت اسپیشل کانفرنس میں اس ریسرچ کے بارے میں بتائیں گے۔ ابھی کچھ بھی کہنا مناسب نہیں۔

ڈاکٹر دانش کو بھرپور پروٹوکول دیا گیا۔ ان کی بہت عزت افزائی کی گئی اور کھانے کے دوران سب ان کو ان کی کامیابیوں پر بھرپور مبارکباد دیتے رہے۔ ڈاکٹر دانش بہت خوش تھے اور ان کو خوش دیکھ کر ڈاکٹر رمیض اور ڈاکٹر زیدی بہت خوش ہو رہے تھے کہ ان کی اتنی جدوجہد رنگ لا رہی تھی۔ وہ ایک ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ایک مایوس شخص کو زندگی کی طرف واپس لائے تھے۔

ٹی وی نیوز میں اس پریس کانفرنس کی کوریج دکھائی جا رہی تھی۔ اچانک فریحہ نے ٹی وی آن کیا تو ڈاکٹر دانش کے بارے میں نیوز رپورٹ بتائی جا رہی تھی۔ فریحہ کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ وہ ڈاکٹر دانش کے چہرے کی طرف بغور دیکھنے لگی جو خوشی سے چمک رہا تھا ان کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ ان کی خوشی کو ظاہر کر رہی تھی۔

''مکار شخص......'' فریحہ نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور ٹی وی آف کر کے ریموٹ غصے سے صوفے پر پھینکا۔

''کیا ہوا بی بی...... تم نے ٹی وی کیوں بند کر دیا...... کون آ رہا ہے ٹی وی پر...... جسے دیکھ کر تم غصے میں آ گئی ہو'' اماں نے حیرت سے پوچھا۔

''کوئی نہیں......'' اور فریحہ نے دوبارہ ٹی وی آن کر دیا، نیوز ابھی تک جاری تھی۔

''ملک کے تمام نامور ڈاکٹروں نے ڈاکٹر دانش کی خدمات کو بھرپور خراج تحسین پیش کیا اور ان کی ملک واپسی کو خوش آئند قرار دیا اور کہا کہ ملک وقوم کو ان جیسے قابل فخر ڈاکٹر اور سائنسدان کی بہت ضرورت ہے۔ ان کی خدمات انسانیت کے لئے ناقابل فراموش ہیں'' فریحہ کا خون غصے سے کھولنے لگا اور وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

''کاش کوئی مجھ سے پوچھے کہ یہ انسان کس قدر کریہہ اور مکار ہے...... جس کے سینے میں دل نہیں...... پتھر ہے...... جو اپنے بیٹے کو انسان نہیں سمجھتا وہ دوسروں کو کیا سمجھے گا...... جس کو لالچ، ہوس اور حسد نے اندھا کر دیا ہو...... وہ انسانیت کی کیا خدمت کرے گا، کیسے ان کے درد کو محسوس کرے گا۔

''کاش...... کوئی تو اس کے بدصورت چہرے سے نقاب ہٹائے'' فریحہ سوچتی رہی اور اندر ہی اندر کرب سے بلبلاتی رہی...... اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور وہ بری طرح سسکنے لگی۔

☆

ڈاکٹر دانش پر اچانک قسمت مہربان ہوئی تھی۔ ان کے حالات ایک دم بدل گئے تھے۔ ملک میں واپس آتے ہی انہیں اتنی پذیرائی ملی تھی کہ ڈاکٹر دانش کو اس کی بالکل ہی توقع نہ تھی۔ وہ انگلینڈ میں جتنا عرصہ مقیم رہے تھے انتہائی ڈپریشن اور ذہنی اذیت نے ان کو بہت مایوس اور بددل کر دیا تھا۔ زندگی میں انتہائی جدوجہد سے حاصل کی گئی کامیابیاں انہیں انتہائی ارزاں محسوس ہونے لگی تھیں۔ اپنی ہر خوبی اور صلاحیت بے وقعت لگتی تھی۔ ہر چیز بے معنی ہو گئی تھی۔ انہیں یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے وہ زندگی کے آخری ایام انتہائی بے بسی سے گزارنے پر مجبور تھے۔ انہیں نہ زندگی میں دلچسپی رہی تھی اور نہ ہی اس کی سرگرمیوں سے...... مگر...... ملک واپس آتے ہی ان کے حالات ایسے بدلے تھے کہ وہ ایک بار پھر ایک ہی جست میں بہت اوپر بلندیوں پر پہنچ گئے تھے۔ میڈیا نے ان کو ایسی زبردست کوریج دی تھی کہ وہ خود بھی بوکھلا گئے تھے۔ انہوں نے بڑی محنت اور جدوجہد سے ایک مایہ ناز سرجن کی حیثیت سے نام بنانے کی کوشش کی تھی اور اب قدرت نے ان کی سوچوں سے بھی زیادہ ان کو وہ مقام عطا کر دیا تھا جس کا انہوں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا...... انہیں ایک ہیرو کی طرح خوش آمدید کہا گیا تھا۔ ڈاکٹر رابرٹ اور علی موسیٰ کی کوششوں نے ان کو اس قابل بنایا تھا کہ وہ دوبارہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے اور ڈاکٹر محسن زیدی و ڈاکٹر رمیض نے ان کے لئے ایسی ہموار زمین تیار کی تھی جس پر اب وہ سرپٹ بھاگ رہے تھے۔ ڈاکٹر محسن زیدی نے انہیں اپنے ہاسپٹل میں اعزازی جاب دی تھی اور ڈاکٹر رمیض کے گھر وہ زبردست پروٹوکول کے ساتھ ایک مہمان کی حیثیت سے رہ رہے تھے۔ وہ بہت خوش تھے۔ سارا دن ہاسپٹل میں لوگ ان سے ملنے آتے۔ ان کی کامیابیوں کی تعریفیں کرتے۔ دوبارہ ریسرچ شروع کرنے کے لئے ان کی حوصلہ افزائی کرتے۔ وہ سارا وقت اپنے بارے میں تعریفیں سن سن کر پھولے نہ سماتے۔ خوبصورت پھولوں کے گلدستے، مٹھائیاں، کیک اور کارڈز سے ان کا کمرہ بھرا رہتا اور وہ سب کچھ دیکھ کر مسکراتے رہتے۔

''میں یہ سب کچھ ڈیزرو کرتا تھا مگر ان لوگوں کو بہت دیر سے احساس ہوا ہے...... انہیں مجھ جیسا اور کوئی ٹیلنٹڈ انسان بھلا کہاں سے مل سکتا تھا'' ڈاکٹر دانش کے ذہن میں اپنے بارے میں ایسی ایسی باتیں آتیں جن کو سوچ کر وہ خود ہی مسکرا دیتے......

ڈاکٹر محسن زیدی، ڈاکٹر رمیض اور چند دوسرے نیورو سرجنز ڈاکٹر دانش کے کمرے میں موجود تھے اور ان سے ان کے فیوچر پلانز کے بارے میں ڈسکشن کر رہے تھے۔

"ڈاکٹر دانش...... سنا ہے انگلینڈ میں آپ ایک ریسرچ کے سلسلے میں بہت مصروف تھے...... اور ڈاکٹر زیدی نے ایک خاص پریس کانفرنس میں اس ریسرچ کے بارے میں انکشاف کرنے کو کہا ہے...... کیا وہ بہت خاص قسم کی ریسرچ ہے؟" ایک سینئر ڈاکٹر مجتبیٰ نے پوچھا۔

"ہاں...... وہ...... ہے...... میں...... میں...... جلدی" ڈاکٹر دانش ایک دم بوکھلا گئے۔

"یہ ایک سیکرٹ ہے...... ابھی آپ اس کے بارے میں ڈسکس نہ کریں تو بہتر ہے" ڈاکٹر زیدی نے ڈاکٹر دانش کی بوکھلاہٹ بھانپتے ہوئے کہا۔

"آئی...... سی...... لیکن آپ نے کس کو فوکس کیا ہے؟" ڈاکٹر مجتبیٰ نے پھر پوچھا۔

"برین کے ابنارمل پارٹس کو...... جو کسی نہ کسی وجہ سے damage ہو جاتے ہیں اور انسان میں ابنارملٹی کا باعث بنتے ہیں" ڈاکٹر رمیض نے جلدی سے اپنی ریسرچ کے بارے میں بتایا تو ڈاکٹر دانش نے ڈاکٹر رمیض کو غصے سے دیکھا اور خاموش ہو گئے۔

"ویری گڈ...... یہ تو بہت زبردست ریسرچ ہو گی اگر آپ نے کچھ ایسا کر دیا تو آپ انسانیت کی بہت بڑی خدمت کریں گے...... روز بروز ابنارمل بچوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے...... لٹ ول بی اے ونڈرفل اچیومنٹ (یہ ایک زبردست کامیابی ہو گی) ڈاکٹر مجتبیٰ نے تعریفی لہجے میں کہا۔

"میرا خیال ہے اب ہمیں چلنا چاہیے...... کافی ٹائم ہو گیا ہے" ڈاکٹر مجتبیٰ نے اپنے اسسٹنٹ ڈاکٹر شاہد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور وہ اجازت لے کر چلے گئے۔

"آپ لوگ مجھے دوسروں کے سامنے کیوں بے عزت کرنا چاہتے ہیں...... مجھے شک ہونے لگا ہے کہ آپ لوگوں نے میرے بارے میں کوئی خاص سازش کی ہے...... میرے لئے اتنا کچھ کیا ہے...... ضرور اس کے پیچھے آپ لوگوں کا کوئی فائدہ ہے...... ورنہ یونہی تو کوئی کسی کے لئے اتنا کچھ نہیں کرتا...... ہر انسان مفاد پرست ہے" ڈاکٹر دانش نے غصے سے ڈاکٹر زیدی اور ڈاکٹر رمیض کی جانب دیکھ کر قدرے تلخ لہجے میں کہا تو وہ دونوں چونک گئے اور حیرت سے ان کی جانب دیکھنے لگے۔

"ڈاکٹر دانش...... یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں...... ہمیں بھلا آپ سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے...... ہم تو...... آپ کو......" ڈاکٹر زیدی نے حیرت سے کہا۔

"میں سب جانتا ہوں...... زیدی تم کیا تھے اور اب کہاں کھڑے ہو......؟ یہ سب کچھ تم نے یونہی تو حاصل نہیں کر لیا......" ڈاکٹر دانش نے خفگی سے کہا تو ڈاکٹر زیدی کے چہرے پر ایک دم پسینہ آ گیا اور شرمندگی سے اُن کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔

"سر...... پلیز...... ڈاکٹر زیدی بہت مخلص انسان ہیں اور آپ ان کی نیت پر شک نہ کریں" ڈاکٹر رمیض نے ڈاکٹر زیدی کو شرمندہ ہوتے دیکھ کر کہا۔

''تم کون ہوتے ہو مجھے سمجھانے والے...... اور...... تمہاری اوقات ہی کیا ہے...... میرے سامنے...... جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں ڈاکٹری سیکھے ہوئے اور اپنی بے کار ریسرچ کا کریڈٹ مجھے دے رہے ہو...... ڈاکٹر دانش کا یہ calibre نہیں کہ وہ تمہاری معمولی ریسرچ کا سہارا لے کر دنیا میں اپنا نام پیدا کرے...... ڈاکٹر دانش کو کسی معمولی نام اور سہارے کی ضرورت نہیں...... تم لوگ میرے ساتھ کوئی کھیل کھیلنا چاہتے ہو...... مگر...... میں...... میں......'' ڈاکٹر دانش غصے سے بے قابو ہو کر ایک دم کرسی پر گر گئے۔ ان کے منہ سے رال بہنے لگی، کندھے اور جسم اکڑنے لگا۔ وہ اپنے ہاتھوں کی مٹھیوں کو کھولنے اور بند کرنے لگے۔

''اوہ...... مائی گاڈ...... ڈاکٹر رمیض ان کا کوٹ اتاریں اور انجکشن لے کر آئیں...... جلدی جائیں'' ڈاکٹر زیدی نے جلدی سے ڈاکٹر دانش کی نبض چیک کی اور ان کا بلڈ پریشر چیک کیا۔

ڈاکٹر رمیض نے جلدی سے ان کا کوٹ اتارا اور انجکشن لگایا...... ڈاکٹر دانش آہستہ آہستہ کرسی کی پشت پر سر لگا کر ریلیکسڈ ہونے لگے اور آنکھیں موند لیں۔ ڈاکٹر زیدی نے ہمدردانہ انداز میں ڈاکٹر دانش کی جانب دیکھا۔

''ڈاکٹر رمیض...... یہ ابھی بھی بیمار ہیں...... ہمیں بہت محتاط ہو کر ان کے سامنے بات چیت کرنی ہوگی'' ڈاکٹر زیدی نے کہا۔

''رائٹ سر...... ورنہ کچھ دیر پہلے مجھے بھی ان پر غصہ آ رہا تھا...... لیکن اب......'' ڈاکٹر رمیض نے آہ بھر کر کہا اور خاموش ہو گئے۔

''انہیں ریسٹ کی ضرورت ہے...... آپ انہیں روم میں شفٹ کر دیں...... ہوش آنے پر میں انہیں ڈرائیور کے ساتھ گھر بھیج دوں گا'' ڈاکٹر زیدی نے کہا تو ڈاکٹر رمیض خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گئے۔

☆

نذیر حسین خلاف معمول رات کو جلد گھر لوٹ آیا تو زینب اس کی آواز سن کر چونک گئی۔ جلدی سے چارپائی سے اٹھی اور دیواروں کو ٹٹول ٹٹول کر کمرے سے باہر نکلی۔ دروازے کا ایک پٹ بند تھا اور ایک کھلا تھا۔ وہ بری طرح بند دروازے سے ٹکرائی۔ نذیر حسین نے آگے بڑھ کر اس کو تھاما۔

''تو...... کیوں باہر آ گئی...... میں تیرے پاس ہی آنے لگا تھا'' نذیر حسین قدرے خفگی سے بولا۔

''تم...... آج...... جلدی کیوں آ گئے...... ؟ کیا اس کی کوئی خبر ملی ہے؟'' زینب نے جلدی سے پرامید لہجے میں پوچھا۔

''ہاں...... ہاں بتاتا ہوں...... پہلے تو...... ادھر چارپائی پر بیٹھ'' نذیر حسین نے اس کا بازو تھام کر اسے چارپائی پر بٹھایا۔

''جلدی سے بتا...... وہ کہاں ہے؟'' زینب خوش ہو کر بولی۔

''یہ میں اخبار لایا ہوں...... اس میں اس کی فوٹو چھپی ہے...... بڑے شہر میں...... بہت بڑا ڈاکٹر بابو بن گیا ہے۔ اللہ نے اس کو بڑی عزت دی ہے...... بہت بڑا آدمی بن گیا ہے...... سنا ہے...... باہر کے کسی ملک چلا گیا تھا...... اب واپس آیا ہے...... کاش تو دیکھ سکتی تو اس اخبار کو دیکھتی اس کی کتنی بڑی تصویر اس میں لگی ہے'' نذیر حسین فرط جذبات سے خوش ہو کر بولا۔

''لا...... مجھے...... دکھا...... کدھر ہے...... اس کی تصویر...... میں اپنے دل کی آنکھوں سے دیکھوں گی'' زینب نے نذیر حسین کے ہاتھوں کو

ٹٹولتے ہوئے کہا۔

نذیر حسین نے اپنے ہاتھ میں پکڑے اخبار کو کھولا اور اس کی تصویر پر زینب کے ہاتھ رکھ دیئے۔ زینب نے اپنے ہاتھ اس کی تصویر پر پھیرے اور خوش ہو کر اس کی تصویر کو چوما اور اپنی آنکھوں سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ نذیر حسین کی آنکھیں بھی بھرنے لگیں۔

"نذیر حسین...... مجھے اپنے بیٹے کے پاس جانا ہے...... خدا کے لئے مجھے مرنے سے پہلے ایک بار اس سے ملا دو...... میں صرف ایک بار اسے اپنے گلے سے لگا کر پیار کرنا چاہتی ہوں" زینب نے ایک ہاتھ سے اس کی تصویر کو اپنے سینے کے ساتھ لگایا اور دوسرے ہاتھ سے نذیر حسین کا ہاتھ پکڑ کر التجا کرنے لگی۔

"اچھا...... اچھا...... جاؤں گا...... کسی روز" نذیر حسین نے یوں کہا...... جیسے وہ ظاہری طور پر نہ جانا ہو مگر اندرونی طور پر خود بھی اس سے ملنے کے لئے بے تاب ہو۔

"کسی روز...... نہیں...... کل...... صبح ہی اس سے ملنے جاؤ...... میں اب اور جدائی برداشت نہیں کر سکتی...... تمہیں کیسے اپنا دل کھول کر دکھاؤں...... تم اس کو جا کر بتانا کہ اس کی جدائی میں اس کی ماں کی آنکھیں سفید ہو گئی ہیں...... ایک بار وہ ملنے آ جائے گا...... تو وہ ٹھیک ہو جائیں گی" زینب نے خوش ہو کر کہا۔

"اچھا...... کہا نا...... چلا جاؤں گا...... ہاتھ میں چار پیسے تو آ جائیں...... بڑے شہر میں کرائے پر ہی بہت زیادہ خرچ ہو جاتا ہے" نذیر حسین نے اداس لہجے میں کہا۔

"یہ...... میرے سرہانے کے نیچے کچھ پیسے ہیں...... آج چھوٹو آیا تھا...... کہنے لگا اماں...... تیرے علاج کے لئے کمیٹی ڈالی تھی۔ آج ہی نکلی ہے تو تجھے دینے آیا ہوں" زینب نے چارپائی پر سرہانہ ٹٹول کر نیچے سے پیسے نکال کر نذیر حسین کو پکڑائے۔

"کتنے ہیں؟" نذیر حسین نے پیسے گنتے ہوئے پوچھا۔

"دو...... ہزار......" اس نے پیسے گن کر کہا۔

"تو...... ان پیسوں سے شہر چلا جا...... میں علاج پھر کرا لوں گی" زینب نے جلدی سے کہا۔

"زینب...... تو...... نہیں جانتی...... چھوٹو نے یہ پیسے کتنی مشکل سے اکٹھے کیے ہیں...... قدرت نے اس کے ساتھ بھی عجیب مذاق کیا ہے اس کو اتنا چھوٹا وجود دیا ہے...... جس کو سر عام ذلیل کیا جاتا ہے...... سارا دن سرکس کے پنجرے میں وہ بند رہتا ہے۔ اس پر سرکس کے مالک نے ٹکٹ لگائی ہوئی ہے لوگ اس کے پنجرے کے پاس آ کر قہقہے لگاتے ہیں۔ آوازیں کستے ہیں...... اس کا مذاق اڑاتے ہیں اور وہ الٹی سیدھی حرکتیں کر کے ان کو ہنساتا ہے اور پھر رات کو مالک اسے چند روپے دیتا ہے۔ ان روپوں سے اس نے کمیٹی ڈالی تھی...... یہ اس کی بڑی محنت کی کمائی ہے...... میں کیسے یونہی کرائے میں اسے اڑا دوں" نذیر حسین اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کے بارے میں انتہائی دکھ بھرے لہجے میں بولا۔

"چھوٹو...... سرکس میں یہ سب کرتا ہے...... تو نے پہلے تو کبھی نہیں بتایا...... یہی کہتا تھا کہ وہ سرکس میں کام کرتا ہے...... میرا بچہ اتنی مشکل

سے پیسہ کماتا ہے" زینب سسکنے لگی۔

"شاید...... آج بھی نہ بتاتا...... اگر وہ تجھے یہ پیسے نہ دے کر جاتا...... زینب میں نے اسے رات رات بھر آہستہ آہستہ چپکے چپکے روتے اور سسکتے ہوئے سنا ہے...... مجھے اکثر کہتا ہے...... ابا...... سچ بتا...... تو نے مجھے کہاں سے اٹھایا...... تیری ساری اولاد تو ٹھیک ٹھاک ہے پھر میں ہی ایسا کیوں ہوں...... میں اسے کیا جواب دوں...... کیا کہوں......؟ کہ تو رب کی نشانی ہے اور اس کے فیصلوں میں تیرا...... میرا...... کیا دخل؟ وہ جو چاہتا ہے اور جسے چاہتا ہے...... پیدا کرتا ہے...... انسان کی اس کے سامنے اوقات ہی کیا ہے؟ مگر وہ میری باتوں کو نہیں سمجھتا...... روتا ہی چلا جاتا ہے" نذیر حسین ان پیسوں کو اپنی آنکھوں کے ساتھ لگا کر سسکنے لگا۔

"ہاں...... مولا کے بھی عجیب ہی رنگ ہیں...... ایک کو ساری اولاد میں اتنا عقلمند اور بڑا آدمی بنا دیا کہ وہ بھی ہم سے پوچھتا ہے کہ ہم نے اسے کہاں سے لیا...... اور...... چھوٹو کو اتنا چھوٹا بنا دیا ہے کہ وہ بھی یہی سوال کرتا ہے...... ہم تو 'سوال' ہی بن کر رہ گئے ہیں" زینب نے تاسف سے کہا اور دونوں رونے لگے۔

"نذیر حسین...... خدا کے لئے تو چھوٹو کو ان پیسوں کے بارے میں مت بتانا...... بس کہنا کہ علاج کے لئے سنبھال کر رکھے ہیں...... مگر تو اس کو ملنے چلا جا...... صبح سویرے ہی نکل جا" زینب نے جلدی سے کہا۔

"مگر...... میں اتنے بڑے شہر میں اسے کہاں ڈھونڈوں گا؟" نذیر حسین نے ایک دم پریشان ہو کر کہا۔

"لے...... یہ بھی کوئی مشکل کام ہے...... تو اخبار لے کر کسی بھی بڑے اسپتال چلے جانا...... وہاں کسی کو میرے بیٹے کی فوٹو دکھانا...... سب تجھے اس کے بارے میں بتا دیں گے...... وہ اتنا بڑا آدمی بن گیا ہے...... ہر کوئی اسے پہچانتا ہوگا" زینب نے قدرے مسکرا کر فخریہ انداز میں کہا تو نذیر حسین کو اس کی تجویز پسند آئی اور وہ مسکرانے لگا۔

"ہاں...... یہ تو نے ٹھیک کہا ہے...... میں کل ہی چلا جاؤں گا" نذیر حسین نے خوش ہو کر جواب دیا۔

"سن...... وہ نیا سوٹ پہن کر جانا...... جو تو نے عید پر سلایا تھا" زینب نے رائے دی۔

"ارے...... وہ تو بہت پرانا لگتا ہے...... دیکھتا ہوں جو ٹھیک لگتا ہے وہی پہن جاؤں گا" نذیر حسین اٹھ کر ایک پرانے لوہے کے صندوق میں سے کپڑے نکالنے لگا۔

"دیکھنا...... اچھا جوڑا پہن کر جانا...... تو بہت بڑے آدمی سے ملنے جا رہا ہے...... اللہ کرے وہ بس ایک بار تیرے ساتھ آ جائے...... نذیرے...... اس کو ساتھ لے کر ہی آنا...... اس کے بغیر مت آنا......" زینب نے کہا۔

"تو بھی پاگل ہے...... وہ بڑا آدمی ہے...... اور اس کے اپنے بڑے کام کاج ہوں گے...... ان کو چھوڑ کر وہ کیسے آئے گا......؟" نذیر حسین نے ایک جوڑا نکال کر اسے اچھی طرح دیکھتے ہوئے کہا۔

"لو...... بھلا...... کام کاج اسے 'ماں' سے بڑھ کر پیارے ہوں گے...... اس کو کہنا...... سب کام چھوڑ...... اور...... ماں کو ملنے چل......" زینب

نے قدرے بارعب انداز میں کہا۔

نذیر حسین رک گیا اور ٹھٹھک کر اس کی جانب دیکھنے لگا۔ اسے کچھ یاد آنے لگا۔ آخری بار جب وہ ان سے ملنے آیا تھا۔

"میرا...... تم لوگوں سے کوئی تعلق نہیں...... مجھے ہمیشہ اپنے اور تمہارے رشتے سے نفرت محسوس ہوتی ہے...... تم لوگ میرے لئے مر چکے ہو...... اور...... میں تمہارے لئے" اس کے تلخ الفاظ نذیر حسین کے کانوں میں گونجنے لگے۔

اس نے کپڑے صندوق میں واپس رکھے اور زینب کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ اور اسے پیسے پکڑائے۔

"یہ کیا ہے...... تم مجھے پیسے کیوں واپس کر رہے ہو؟" زینب نے گھبرا کر پوچھا۔

"میں نہیں جا رہا" نذیر حسین نے بمشکل کہا۔

"کیوں......؟" زینب نے غصے سے کہا۔

"ہم اس کے لئے مر چکے ہیں...... اس نے آخری بار یہی کہا تھا...... کیا یاد نہیں تمہیں......؟" نذیر حسین سسکنے لگا اور روتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ زینب اسے آوازیں دیتی رہ گئی مگر وہ جا چکا تھا زینب بھی رونے لگی اس کے کانوں میں بھی وہی الفاظ گونجنے لگے۔

"تم میرے لئے مر چکے ہو...... اور...... میں تمہارے لئے" زینب پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع ہو گئی۔

☆

ڈاکٹر دریہ اور ڈاکٹر رمیض اپنے اپنے کلینک سے فارغ ہو کر رات کو بہت دیر سے گھر لوٹتے تھے۔ ڈاکٹر دریہ کا شمار شہر کی بہترین گائناکالوجسٹ میں ہونے لگا تھا اور ڈاکٹر رمیض نے نیورالوجی کی فیلڈ میں بہت کم عرصے میں زبردست شہرت اور کامیابی حاصل کر لی تھی۔ دونوں کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جن پر قدرت خاص طور پر مہربان ہوتی ہے۔ وہ جہاں قدم رکھتے ہیں۔ وہیں پھول کھلنے لگتے ہیں جس شے کو ہاتھ لگاتے ہیں وہی سونے کی بن جاتی ہے۔ دولت وشہرت کے ساتھ ساتھ ان کی عزت میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر رمیض بہت نیک، خدا ترس اور انسانیت کی خدمت کرنے والے انسان تھے۔ ڈاکٹر دریہ بھی انہی خیالات کی مالک تھی اور ڈاکٹر رمیض کی کولیگ تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے میں سوچ کی ہم آہنگی پا کر ایک دوسرے کو اپنانے کا فیصلہ کر لیا اور دونوں اپنے اس فیصلے پر بہت خوش تھے۔ دونوں میں بہت محبت تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے جذبات کا بہت خیال رکھتے تھے اور دونوں کو آئیڈیل کپل سمجھا جاتا تھا گو کہ دونوں بے حد معروف زندگی گزار رہے تھے مگر پھر بھی دونوں ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح سمجھتے تھے۔ ڈاکٹر رمیض کے والدین گاؤں شفٹ ہو گئے تھے اور ڈاکٹر رمیض نے گاؤں میں ایک ویلفیئر ٹرسٹ قائم کیا تھا جس کا نگران انہوں نے اپنے والد کو بنایا تھا اور پندرہ دن بعد دونوں میاں بیوی گاؤں چلے جاتے اور وہاں کے غریب مریضوں کا مفت علاج کرتے...... ڈاکٹر دانش ان کے گھر میں ایک بہت باعزت مہمان کے طور پر رہ رہے تھے اور ان کی ضروریات کا بھرپور خیال رکھا جاتا تھا۔ ان کے لئے خصوصی طور پر ایک نوجوان ملازم ساجد رکھا گیا تھا جو ان کا بہت خیال رکھتا۔ گھر میں شیف کے علاوہ اور دو تین ملازم رکھے گئے تھے۔ ڈاکٹر رمیض...... ڈاکٹر دانش سے بہت محتاط انداز میں گفتگو کرتے۔ ان کی صحت اور آرام کا ہر طرح سے خیال رکھتے۔ ڈاکٹر دانش زیادہ تر اپنے ریسرچ

پیپرز اور کمپیوٹر پر کام کرنے میں مصروف رہتے۔ رات کو کلینک سے واپس آ کر ڈاکٹر رمیض ...... ڈاکٹر دانش کے ساتھ اپنی ریسرچ کے بارے میں ڈسکشن کرتے۔ ڈاکٹر رمیض نے اپنے اس نئے گھر کی انیکسی میں اپنی ریسرچ لیب بنا رکھی تھی جہاں وہ اپنے فارغ وقت میں بیٹھ کر ریسرچ کرتے۔

ڈاکٹر دریہ اور ڈاکٹر رمیض کھانا کھانے میں مصروف تھے اور دونوں کھانا کھاتے ہوئے ایک دوسرے کو محبت پاش نظروں سے دیکھ رہے تھے اور مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہے تھے۔ ڈاکٹر دانش اچانک اپنے کمرے سے باہر نکلے اور دونوں کو باتیں کرتے دیکھ کر ایک دم چونک گئے...... دونوں قدرے بے تکلفانہ انداز میں کھانا کھا رہے تھے ان کو دیکھ کر ڈاکٹر دانش کے اندر ایک دم کوئی چیز چھناکے سے ٹوٹی اور دونوں کو ایک دوسرے کے بہت قریب دیکھ کر ان سے حسد محسوس ہونے لگا۔ نفرت اور حسد سے ایسا اضطراب جنم لینے لگا جس سے ان کے دل و دماغ میں اک آگ سی بھڑکنے لگی۔ وہ بہت بے قرار ہونے لگے اور دروازہ بند کر کے اپنے کمرے میں واپس چلے گئے۔ انہیں فریحہ یاد آنے لگی۔ وہ بھی ان سے محبت کے دعوے دار تھی مگر وہ بہت بے وفا نکلی تھی۔ شادی کے دو سال بعد ہی اسے ان سے نفرت ہونے لگی تھی...... وہ ان کی صورت سے، ان کی باتوں اور ان کے وجود سے نفرت کرنے لگی تھی...... یقیناً اس کے دل میں کوئی اور بس گیا تھا۔

''عورت بہت بے وفا ہوتی ہے...... اس پر کبھی بھی اعتبار نہیں کرنا چاہیے...... شوہر کو خبر ہی نہیں ہوتی اور وہ کسی دوسرے مرد کے ساتھ دل لگا بیٹھتی ہے...... وہ شوہر کو کس قدر آسانی سے دھوکہ دیتی ہے'' ڈاکٹر دانش نے نفرت سے فریحہ کے بارے میں سوچا اور ان کا دماغ غصے سے کھولنے لگا۔

باہر سے دریہ اور ڈاکٹر رمیض کے قہقہوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ وہ کسی بات پر بھرپور قہقہے لگا رہے تھے۔ ڈاکٹر دانش کو غصہ آنے لگا۔ ان کے قہقہے ان کے کانوں میں کسی نشتر کی طرح چبھنے لگے۔ قہقہوں کی آوازیں بلند تر ہوتی جا رہی تھیں اور ڈاکٹر دانش کا پارہ ہائی ہو رہا تھا۔

''آپ کے یہ بے ہنگم قہقہے مجھے کتنا ڈسٹرب کر رہے ہیں کیا آپ کو اس کا اندازہ ہے؟'' ڈاکٹر دانش نے کمرے سے باہر نکل کر انتہائی غصے میں اونچی آواز سے چلاتے ہوئے کہا تو ڈاکٹر رمیض اور دریہ ایک دم ساکت ہو گئے اور انتہائی حیرت سے ان کی جانب دیکھنے لگے...... دونوں یوں خاموش اور پریشان ہو گئے جیسے اچانک کسی چوری کے پکڑے جانے پر کوئی حیران و پریشان ہو جاتا ہے...... دونوں چور نگاہوں سے ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے۔

''سوری...... سر......'' ڈاکٹر رمیض نے ان کے قریب آ کر کہا تو ڈاکٹر دانش نے انہیں انتہائی خونخوار نگاہوں سے دیکھا اور کمرے میں واپس چلے گئے۔

''رمیض...... یہ سب کیا ہے؟'' دریہ نے حیرانگی سے پوچھا۔

''غلطی ہماری ہی ہے...... ہمیں خیال ہی نہیں رہا کہ اس گھر میں ایک مہمان بھی رہتا ہے...... جو بیمار بھی ہے اور......'' ڈاکٹر رمیض نے قدرے شرمندگی سے کہا۔

''رمیض...... کیا ہم اپنے گھر میں اپنی مرضی سے ہنس بول بھی نہیں سکتے...... سارا دن مریضوں کے ساتھ سر کھپا کر گھر آئیں تو گھر میں چند لمحے بھی اپنی مرضی سے نہ گزار پائیں تو پھر ہم کہاں جائیں...... اوہ...... مائی گاڈ......'' دریہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھامتے ہوئے کہا اور سسکنے لگی۔

"چلو...... اپنے بیڈروم میں چلتے ہیں...... اٹھو...... سویٹ ہارٹ" ڈاکٹر رمیض نے محبت سے دریہ کے ہاتھ کو تھامتے ہوئے کہا اور وہ ان کے ساتھ چل پڑی۔ ڈاکٹر رمیض نے دریہ کو محبت سے سمجھا بجھا کر نارمل کیا اور ڈاکٹر دانش سے ایکسکیوز کرنے ان کے کمرے میں چلے گئے۔

ڈاکٹر دانش کمپیوٹر پر کچھ کام کر رہے تھے۔ ڈاکٹر رمیض نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلا پا کر وہ اندر چلے گئے۔ ڈاکٹر دانش نے خشمگیں نگاہوں سے ڈاکٹر رمیض کی جانب دیکھا۔

"آئی ایم سوری...... سر...... آپ ہماری وجہ سے ڈسٹرب ہوئے" ڈاکٹر رمیض نے شائستہ لہجے میں قدرے ادب سے کہا۔

"اٹس آل رائٹ" ڈاکٹر دانش نے قدرے درشت لہجے میں جواب دیا ڈاکٹر رمیض کو ان کے رویے سے دکھ سا محسوس ہونے لگا۔

"سر...... آپ...... ؟" ڈاکٹر رمیض نے مزید کچھ کہنا چاہا۔

"ادھر بیٹھیے ڈاکٹر رمیض......" ڈاکٹر دانش نے اپنی نظر کی عینک اتارتے ہوئے کہا اور انہیں اپنے قریب صوفے پر بیٹھنے کو کہا۔ ڈاکٹر رمیض بیٹھ گئے اور قدرے حیرت سے ان کی جانب دیکھنے لگے۔

"ڈاکٹر رمیض...... عورت پر کبھی بھروسہ نہ کریں...... وہ بہت چالاک اور مکار ہوتی ہے۔ اس کے دل میں کوئی اور ہوتا ہے...... اور...... محبت کے دعوے وہ کسی اور سے کرتی ہے...... وہ اپنے شوہر کے ساتھ کبھی بھی مخلص نہیں ہوتی...... اس کا شوہر اس کے لئے محض دل بہلاوا ہے اور کچھ نہیں...... شوہر کو خبر ہی نہیں ہوتی اور وہ کسی اور سے دل لگا بیٹھتی ہے...... آپ کی بیوی بھی آپ کے ساتھ مخلص نہیں...... اور میں آپ کو اس کا ثبوت بھی دے سکتا ہوں" ڈاکٹر دانش نے اس قدر وثوق سے کہا تو ڈاکٹر رمیض چونک گئے۔

"کیسا ثبوت...... ؟" ڈاکٹر رمیض نے حیرت سے پوچھا۔

"آپ سے بے وفائی کا...... وہ آپ کے ساتھ محض دل بہلا رہی ہیں۔ اچھا وقت گزار رہی ہیں...... آپ ان کے لئے کچھ بھی نہیں...... صفر ہیں بالکل......" ڈاکٹر دانش نے معنی خیز انداز میں طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو ڈاکٹر رمیض کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور چہرے پر نجانے کتنے سائے لہرانے لگے۔

"دریہ...... ایسی نہیں...... وہ ایسا نہیں کر سکتی" ڈاکٹر رمیض نے قدرے روہانسی آواز میں کہا۔

"فریحہ بھی ایسی نہیں تھی...... مگر وہ بھی ویسی ہی نکلی" ڈاکٹر دانش زیر لب بڑبڑائے۔

"کیا مطلب...... ؟" ڈاکٹر رمیض نے چونک کر پوچھا۔

"وہ محبت کا دعویٰ مجھ سے کرتی تھی اور اولاد کسی اور کی پیدا کی...... جانتے ہو...... اس نے ایک ابنارمل بچے کو جنم دیا...... کیا تم سوچ سکتے ہو کہ مجھ جیسے جینئس انسان کا بچہ بھلا ابنارمل ہو سکتا ہے...... ؟ امپاسبل...... اس نے مجھے دھوکہ دیا...... اور قدرت نے اس کو عذاب میں ڈالا...... میں نے اس کو چھوڑ دیا...... وہ اسی قابل تھی" ڈاکٹر دانش غصے سے بولے۔

"مگر...... وہ...... تو...... بہت حساس اور سمجھدار معلوم ہوتی تھیں" نادانستہ ڈاکٹر رمیض کے منہ سے نکلا۔

"کیا تم فریحہ سے ملے تھے؟" ڈاکٹر دانش نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں......"

"کیوں......؟"

"یونہی......آپ کی آمد کی اطلاع دینے گیا تھا......"

"نان سینس......تم بہت نان سینس انسان ہو......مجھ سے ایک بار تو پوچھ لیتے کہ میں اس سے ملنا بھی چاہتا ہوں کہ نہیں......" ڈاکٹر دانش غصے سے ڈانٹتے ہوئے بولے۔

"آئی ایم سوری......" ڈاکٹر رمیض آہستہ آواز میں بولے۔

"تم اس قدر بیوقوف ہو سکتے ہو......مجھے اندازہ نہیں تھا۔ نجانے تم کیسے ڈاکٹر بن گئے۔ عقل تو تم میں رتی بھر نہیں" ڈاکٹر دانش نے اس قدر طنزیہ انداز میں کہا تو ڈاکٹر رمیض حیران رہ گئے، انہیں ایک دم غصہ آ گیا۔

"سر......عقل......کسی کی میراث نہیں ہوتی......یہ قدرت کی عطا ہوتی ہے......جسے چاہے نواز دے" ڈاکٹر رمیض نے خفگی سے کہا۔

"ہاں......اسی بات پر تو حیرانگی ہوتی ہے کہ بعض لوگ جو ظاہری طور پر بہت کامیاب نظر آتے ہیں مگر ان کا دماغ عقل سے بالکل خالی ہوتا ہے......انہیں معمولی باتوں کی بھی سمجھ بوجھ نہیں ہوتی" ڈاکٹر دانش نے پھر طنزیہ لہجے میں کہا۔

"اور جن کو عقل مند ہونے کا زعم ہوتا ہے......وہ کتنے خود بین اور متکبر ہوتے ہیں......شاید انہیں خود بھی اندازہ نہیں ہو پاتا......کیونکہ انہیں اپنے سوا کوئی اور نہ تو اہم لگتا ہے نہ اس قابل دکھائی دیتا ہے" ڈاکٹر رمیض نے بھی سخت لہجے میں کہا۔

"ڈاکٹر رمیض......یہ کمتر اور بے وقوف لوگوں کا حسد ہوتا ہے جو ایسے عقلمند لوگوں کو متکبر کہتے ہیں۔ دراصل وہ اس طرح کی باتیں کر کے اپنے کومپلیکسز چھپا رہے ہوتے ہیں......عام اور معمولی لوگوں کے کومپلیکسز بھی تو بہت ہوتے ہیں نا" ڈاکٹر دانش نے پھر کہا۔

"کتنی حیرت کی بات ہے کہ بہت سے کومپلیکسڈ لوگوں کو اپنے کومپلیکسز نظر نہیں آتے مگر دوسروں کا معمولی پن کتنی جلدی دکھائی دیتا ہے......یہ تکبر نہیں تو اور کیا ہے؟" ڈاکٹر رمیض نے غصے سے جواب دیا۔

"کم عقل لوگوں کو بات سمجھانا دنیا کا مشکل ترین کام ہے......ان کے دماغ میں اتنی صلاحیت ہی نہیں ہوتی کہ وہ اعلیٰ درجے کی بات کو قبول کر سکیں، عام، کند ذہن لوگوں کے بارے میں ٹھیک کہا گیا ہے۔ to cast pearl before the swine (بھینس کے آگے بین بجانا)......مسٹر رمیض......آپ جسے تکبر سمجھتے ہیں وہ اعلیٰ درجے کے انسان کی elevation ہوتی ہے جسے آپ جیسے لوگ سمجھ نہیں پاتے۔ آپ جایئے اور اپنی بے وفا......مکار بیوی کے ساتھ محبت کا ڈرامہ رچایئے......وہ آپ کا دل بہلائے اور آپ اس کا......مگر اس ڈرامے کو محبت نہ سمجھ لیجئے گا......وہ بہت شاطر عورت ہے اس کا ذہن آپ سے زیادہ تیز اور متحرک ہے۔ گڈ نائٹ" ڈاکٹر دانش نے کمرے کا دروازہ کھول کر ڈاکٹر رمیض کو باہر جانے کو کہا۔

ڈاکٹر رمیض نے غصے سے ان کی جانب دیکھا اور کمرے سے باہر نکل آئے۔ ان کے دل و دماغ میں آتش فشاں ابل رہا تھا اور لاوا پھٹنے کو بے قرار ہو رہا تھا۔ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے نم ہونے لگیں اور دل انتہائی توہین اور بے عزتی کے احساس سے سلگنے لگا وہ اسٹڈی روم میں چلے گئے اور وہاں جا کر کرسی پر بیٹھ گئے۔ نجانے کہاں سے آنسوان کی آنکھوں سے لاوے کی طرح بہنے لگے" ڈاکٹر دانش کس قدر کریہہ انسان ہیں...... انہیں اب یقین آنے لگا تھا۔ فریحہ نے ٹھیک کہا تھا...... وہ ایک مکار انسان ہے" مگر اب انہیں یقین ہونے لگا تھا کہ مکار ہی نہیں انتہائی رذیل انسان بھی ہیں۔ اس قدر زعم، تکبر، خود بینی اور خود غرضی انہوں نے آج سے قبل کسی انسان میں نہیں دیکھی تھی...... وہ انہیں کیا سمجھتے تھے اور وہ حقیقت میں کیا تھے...... دریہ کو انہوں نے بے وفا کہا تھا اور ان کے پاس اس کا ثبوت بھی تھا کیسا ثبوت؟ اور ان کے پاس کہاں سے ثبوت آ گیا؟ کیا دریہ واقعی ہی ایسی تھی؟ وہ اس کے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ دونوں نے چند ماہ اکٹھے جاب کی تھی اور دونوں میں انڈر سٹینڈنگ ہو گئی تھی اور دونوں نے شادی کر لی۔ شادی کے بعد دونوں خوش تھے۔ ڈاکٹر دانش نے اتنی بڑی بات کیسے کہہ دی۔ ہر بات کی کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے..... ضرور اس کے پیچھے بھی کوئی بات ہو گی۔ ڈاکٹر رمیض کا ذہن مختلف شکوک و شبہات کا شکار ہونے لگا۔ وہ اس قدر شدید الجھن کا شکار ہونے لگے کہ انہیں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ انہیں کیا ہو رہا ہے...... وہ ساری رات یونہی بے چین اور بے قرار رہے۔ ایک لمحے کے لئے بھی انہیں نیند نہ آئی۔

دریہ اپنے بیڈروم میں سو رہی تھی۔ رات کو وہ خاصی ٹینشن میں تھی اور بے حد تھکی ہوئی بھی تھی اس لئے جلدی سو گئی۔ اچانک اس کی آنکھ کھلی تو ڈاکٹر رمیض کو کمرے میں نہ پا کر وہ چونکی اور انہیں تلاش کرنے کے لئے کمرے سے باہر نکلی۔ وہ نیم بیداری کے عالم میں تھی۔ ڈاکٹر رمیض کو ایک کمرے سے دوسرے میں تلاش کرتی ہوئی وہ لاؤنج میں آئی اور اچانک ڈاکٹر دانش کے ملازم ساجد سے بری طرح ٹکرائی جو ان کے لئے چائے بنانے کچن میں جا رہا تھا۔ ساجد نیچے گر گیا اور ڈاکٹر دریہ نے گھبرا کر اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھانا چاہا۔ ڈاکٹر دانش نے مسکرا کر اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے دونوں کو دیکھا اور اپنے موبائل میں ان کی تصویر بنالی۔

"زیادہ چوٹ تو نہیں لگی؟" ڈاکٹر دریہ نے ساجد سے نرم لہجے میں پوچھا۔

"نہیں...... ٹھیک ہوں" اس نے اٹھنا چاہا مگر کمر میں درد کی وجہ سے وہ کراہنے لگا۔

تم یہاں لیٹ جاؤ۔ ڈاکٹر دریہ نے اسے سہارا دے کر صوفے پر لٹایا اور اس کے لئے دودھ گرم کرنے لگی...... اس نے اسے گرم دودھ پلانے کے بعد میڈیسن دیں۔ وہ اس کی تیمارداری میں اتنی مصروف رہی کہ ڈاکٹر رمیض اس کے ذہن سے نکل گئے۔ دن طلوع ہونے کو تھا جب ڈاکٹر رمیض اپنے کمرے سے باہر نکلے اور دریہ کو ساجد کے اوپر جھکے ہوئے دیکھا۔ وہ انتہائی مہین نائٹ ڈریس میں تھی، ڈاکٹر رمیض کو اس پر غصہ آ گیا۔

"دریہ...... یہ سب کیا ہے؟" ڈاکٹر رمیض غصے سے چلائے اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔

"ساجد گر گیا تھا...... اسے چوٹ لگی ہے...... اور......" ڈاکٹر دریہ نے کمرے میں آ کر کچھ بتانا چاہا۔

"گھر میں اس کی تیمارداری کے لئے کوئی اور نہیں؟" تم نے اپنے آپ کو دیکھا ہے تمہیں شرم آنی چاہیے" ڈاکٹر رمیض نے کمرے میں آ کر انتہائی غصے سے کہا۔

''آئی ایم سوری، مجھے خیال ہی نہیں رہا۔'' دریہ نے اچانک اپنے آپ کی جانب دیکھا اور شرمندگی کا اظہار کرنے لگی۔

''عورت پر کبھی بھروسہ نہ کریں وہ بہت چالاک اور مکار ہوتی ہے.....شوہر کو خبر ہی نہیں ہوتی اور وہ کسی دوسرے کے ساتھ دل لگا چکتی ہے'' ڈاکٹر دانش کے الفاظ ڈاکٹر رمیض کے کانوں میں گونجنے لگے اور انہوں نے گھور کر دریہ کو دیکھا۔ وہ شرمندہ ہو کر واش روم میں ڈریس چینج کرنے چلی گئی۔

''یہ محض اتفاق تھا.....دریہ ایسی نہیں'' ڈاکٹر رمیض نے سوچا۔

''عورت بہت بے وفا ہوتی ہے.....آپ کی بیوی بھی آپ کے ساتھ مخلص نہیں اور میں آپ کو اس کا ثبوت دے سکتا ہوں'' ڈاکٹر رمیض کے دل میں دریہ کے بارے میں شک پیدا ہونے لگا۔

''وہ آپ کے ساتھ محض دل بہلا رہی ہے'' ڈاکٹر رمیض کا دل بری طرح بے قرار ہونے لگا۔

''اس کا مطلب ہے دریہ ان کی آنکھوں میں دھول جھونک رہی ہے.....محبت کا ڈرامہ کر رہی ہے'' ڈاکٹر رمیض نے غصے سے سوچا اور ان کا خون کھولنے لگا۔

دریہ واش روم سے باہر نکلی اور معذرت خواہانہ انداز میں ڈاکٹر رمیض کی جانب دیکھا.....اور آنکھیں جھکا لیں.....ڈاکٹر رمیض نے خفگی سے منہ دوسری جانب پھیر لیا۔

''پلیز.....رمیض.....آئی.....ایم سوری.....مجھے بالکل ہی خیال نہیں رہا تھا'' دریہ ڈاکٹر رمیض کے قریب آئی اور محبت سے ان کا ہاتھ تھامنا چاہا۔

''آئی کانٹ ٹرسٹ یو (میں تم پر اعتبار نہیں کر سکتا)'' ڈاکٹر رمیض کی زبان سے نادانستہ جملہ نکلا ڈاکٹر دریہ کی آنکھیں حیرت سے پھیلنے لگیں۔

''کیا.....آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں رہا؟'' ڈاکٹر دریہ کے لئے یہ انتہائی صدمے کی بات تھی۔

''ہاں.....مجھے تم پر اعتبار نہیں'' ڈاکٹر رمیض نے اپنی سرخ آنکھوں سے اس کی جانب دیکھ کر غصے سے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئے۔

دریہ حیرت سے انہیں باہر جاتے ہوئے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور وہ سسکیاں بھرنے لگی۔ بہت زیادہ رونے سے اس کے سر میں شدید درد ہونے لگا تھا اور آنکھیں بے حد سرخ ہو رہی تھیں۔ اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ ڈاکٹر رمیض ہاسپٹل جا چکے تھے اور اسے بار بار ہاسپٹل سے فون آ رہا تھا۔ اس نے طبیعت کی خرابی کا بتا کر چھٹی لینا چاہی مگر ایک ایمرجنسی کیس کی وجہ سے اسے ہاسپٹل جانا پڑا۔ وہ بمشکل تیار ہوئی اور ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر چائے پینے لگی۔ چائے پیتے ہوئے نجانے کتنے آنسو اس کی آنکھوں سے مسلسل گر رہے تھے۔

''جس شخص کو اس نے بہت چاہا تھا.....ساری دنیا میں اس کو اپنے لئے منتخب کیا تھا۔ اس پر اعتبار کیا تھا اور اس پر جان چھڑکتی تھی اس کو ہی.....اس پر اعتبار نہ رہا تھا.....وہ اسے بے اعتبار کہہ کر چلا گیا تھا.....'' اس کی آنکھوں سے سیلاب سا رواں تھا۔

''خیریت تو ہے مسز رمیض.....آپ کیوں رو رہی ہیں؟'' ڈاکٹر دانش اس کے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بولے۔

''کچھ نہیں.....یونہی.....طبیعت ٹھیک نہیں'' دریہ نے ٹالنا چاہا۔

"لگتا ہے..... آپ میں اور ڈاکٹر رمیض میں کوئی جھگڑا ہوا ہے" ڈاکٹر دانش نے معنی خیز انداز میں کہا تو دریہ نے چونک کر ان کی جانب دیکھا۔

"دراصل عورت بہت معصوم ہوتی ہے..... بہت وفادار..... بہت مخلص..... اپنے شوہر کو ہی سب کچھ سمجھ لیتی ہے..... مگر اس معصوم کو یہ خبر نہیں ہوتی کہ اس کا شوہر کس قدر مکار اور بے وفا ہوتا ہے..... لمحوں میں اپنی وفاداریاں بدل لیتا ہے..... مرد کو گرگٹ کہا جاتا ہے..... پل میں کچھ پل میں کچھ..... مفاد پرست، خود غرض اور بے وفا..... عورت اس پر اعتبار کر لیتی ہے اور وہ اسے ایکسپلائٹ کرتا ہے..... ہے نا یہی بات؟" ڈاکٹر دانش نے معنی خیز انداز میں پوچھا تو دریہ نے چونک کر ان کی جانب دیکھا اور اس کی آنکھوں سے مزید آنسو بہنے لگے۔

"آپ بہت مخلص اور باوفا ہیں لیکن ڈاکٹر رمیض بہت کم ظرف اور معمولی انسان ہیں..... اور اس میں شاید ان کا بھی قصور نہیں..... انہیں یہ ساری چیزیں جینز سے ملی ہیں آپ کو ان کا بیک گراؤنڈ تو معلوم ہوگا..... انتہائی غریب، کم ذات گھرانے سے ان کا تعلق ہے اور ایسا معمولی بیک گراؤنڈ رکھنے والے لوگ کبھی بھی اعلیٰ ظرف نہیں ہو سکتے..... ان سے اچھی توقعات بے معنی ہیں..... نجانے آپ نے کیوں ان سے شادی کر لی..... آپ خوبصورت ہیں، ٹیلنٹڈ ہیں..... کیا آپ کو یہی شخص ملا تھا..... اپنی زندگی خراب کرنے کے لئے؟" ڈاکٹر دانش نے اس قدر بے باکی سے کہا تو دریہ نے حیرانگی سے ان کی جانب دیکھا۔

"مسز رمیض..... آپ اس شخص پر جتنا بھی اعتبار کر لیں اور جتنی محبت بھی کر لیں..... سب بے کار ہے..... آپ کو اس سے کچھ نہیں ملے گا..... نہ محبت نہ وفا..... میں اپنی زندگی کے تجربے کی بنا پر یہ بات کہہ رہا ہوں" ڈاکٹر دانش نے کہا۔

"کیوں.....؟" دریہ نے بمشکل پوچھا۔

"اس کا کیریکٹر اسٹرونگ نہیں..... اس نے آپ سے شادی بہت سے مفادات کی خاطر کی..... اور شاید محبت بھی کسی اور سے کرتا ہے..... اور میں آپ کو اس کا ثبوت بھی دے سکتا ہوں" ڈاکٹر دانش نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

"کیسا ثبوت؟" دریہ کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔

"آپ سے بے وفائی کا....." ڈاکٹر دانش نے مسکرا کر کہا۔

"ک.....ک..... کیسے؟" دریہ نے گھبرا کر پوچھا۔

دریہ کا موبائل بجنے لگا۔ ایک ایمرجنسی کیس کے سلسلے میں اسے ہاسپٹل بلایا جا رہا تھا وہ کرسی سے اٹھی۔

"ڈاکٹر دانش ثبوت کے بغیر بات نہیں کرتا..... آپ مجھ پر اعتبار کریں وہ شخص آپ کے قابل ہی نہیں..... جتنی جلدی ہو..... اس سے چھٹکارا پا لیں" ڈاکٹر دانش نے کہا تو اس نے حیرت سے ڈاکٹر دانش کی جانب دیکھا اور حیرت و خوف کے تاثرات اس کے چہرے پر نمایاں ہونے لگے۔ دریہ اپنا بیگ اٹھا کر گھر سے باہر چلی گئی اور ڈاکٹر دانش مسکرانے لگے۔

رات کو ڈاکٹر رمیض بہت پریشان اور تھکے ہارے گھر لوٹے تو دریہ ابھی تک ہاسپٹل سے نہیں آئی تھی۔ گھر میں اک عجیب سا سناٹا چھایا تھا۔ ڈاکٹر رمیض نے ملازموں کو آوازیں دیں مگر کوئی بھی موجود نہ تھا سوائے شیف کبیر علی کے..... سب لوگ کہاں ہیں..... اور....." ڈاکٹر رمیض

نے دریہ کے بارے میں پوچھنا چاہا۔

"صاب...... ڈاکٹر دانش صاب یہ گھر چھوڑ کر شام کو کہیں چلے گئے ہیں اور بیگم صاب ابھی تک نہیں آئیں" کبیر علی نے بتایا۔

"ڈاکٹر دانش گھر چھوڑ کر چلے گئے ہیں...... کہاں......؟" ڈاکٹر رمیض نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

"معلوم نہیں...... کہہ رہے تھے...... اب دوبارہ یہاں نہیں آئیں گے...... اپنا سارا سامان اور کاغذ بھی لے گئے ہیں" کبیر علی نے بتایا تو ڈاکٹر رمیض ایک دم فکر مند ہو گئے۔ وہ کہاں چلے گئے ہیں...... اور کہاں جا سکتے ہیں؟ اپنے گھر...... نہیں...... نہیں...... شاید میری کوئی بات انہیں بری لگی ہے اس لئے انہوں نے یہ گھر چھوڑ دیا ہے...... اوہ...... مائی گاڈ...... یہ میں نے کیا کیا......؟ نجانے مجھے کیوں غصہ آ گیا اور میں بھول گیا کہ وہ تو بیمار انسان ہیں...... مجھے ان سے معافی مانگنی چاہیے...... کاش وہ مجھے مل جائیں" ڈاکٹر رمیض کا ضمیر انہیں پریشان کرنے لگا۔ وہ پہلے ہی دریہ کی وجہ سے پریشان تھے...... سارا دن وہ ہاسپٹل میں بھی بہت اپ سیٹ رہے۔ انہیں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اچانک انہیں کیا ہو گیا تھا۔ وہ تو بہت ٹھنڈے مزاج کے انسان تھے۔ کیسے اتنے ہائپر ہو گئے اور دریہ سے بھی تلخ کلامی پر اتر آئے۔ سارا دن دل و دماغ پر ایک بوجھ سا چھایا رہا۔ اک عجیب سی پریشانی اور مایوسی نے انہیں انتہائی بےچین اور مضطرب رکھا کہ کسی مریض کا بھی چیک اپ کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

"دریہ ان سے بےوفائی کر رہی ہے...... اور انہیں خبر ہی نہیں ہو پائی تھی"

ڈاکٹر دانش کے تلخ و طنزیہ جملے بار بار ان کے ذہن میں گونجتے اور ان کے اندر اک آگ سی لگا دیتے...... اور ڈاکٹر دانش بھی دل برداشتہ ہو کر کہیں چلے گئے تھے۔ ڈاکٹر رمیض نے پریشان ہو کر ڈاکٹر محسن زیدی کو فون پر بتایا تو وہ بھی پریشان ہو گئے۔

"یہ تو بہت برا ہوا...... ہماری اتنی محنت ضائع گئی...... ڈاکٹر دانش کو نجانے کیا ہو گیا ہے...... شاید بیماری نے ان کے ذہن پر ایسا اثر کر دیا ہے...... لیکن جو بھی ہوا بہت برا ہوا...... ہمیں انہیں تلاش کرنا چاہیے...... کہیں وہ اپنی مسز کے پاس تو نہیں چلے گئے؟" ڈاکٹر محسن زیدی نے اچانک پوچھا۔

"نہیں...... سر...... وہ...... وہاں تو بالکل ہی نہیں جا سکتے...... ان کی مسز ان کا نام سننا بھی پسند نہیں کرتی" ڈاکٹر رمیض نے پریقین لہجے میں کہا۔

"آئی...... سی...... پھر وہ کہاں جا سکتے ہیں......؟" ڈاکٹر محسن زیدی نے پریشان ہو کر کہا۔

"میں...... بہت اپ سیٹ ہوں...... رات کو میری ان سے تلخ کلامی ہو گئی تھی" ڈاکٹر رمیض نے پریشانی سے گلوگیر آواز میں بتایا۔

"اوہ...... اٹس ویری سیڈ" ڈاکٹر محسن زیدی نے پریشانی سے کہا تو ڈاکٹر رمیض کے اندر احساس گناہ مزید بڑھنے لگا۔ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگیں۔

"آپ فکر نہیں کریں...... میں آپ کو اچھی طرح جانتا ہوں آپ ایسے انسان نہیں...... یقیناً صورت حال گھمبیر ہو گئی ہو گی۔ ڈاکٹر دانش اکثر ایسی تلخ باتیں کرتے ہیں کہ سننے والا ایک دم ہائپر ہو جاتا ہے...... اینی وے...... آپ اپ سیٹ نہ ہوں...... خدا بہتر کرے گا...... میں بھی انہیں تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہوں" ڈاکٹر زیدی کے الفاظ نے کسی حد تک ڈاکٹر رمیض کو تسلی دی اور وہ تھوڑے سے مطمئن ہو گئے۔

دریہ رات کو گھر واپس نہیں آئی تھی۔ اس نے جان بوجھ کر نائٹ ڈیوٹی لگوائی تھی وہ ڈاکٹر رمیض سے اتنی خائف ہو گئی تھی کہ ان کی شکل بھی

نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ اسے ڈاکٹر دانش کی باتیں سارا دن اندر ہی اندر کچوکے لگاتی رہیں ایک ایک لمحہ اس نے انتہائی اذیت میں گزارا...... ڈاکٹر رمیض اندر سے کیسا انسان تھا...... اسے خبر ہی نہیں ہو پائی تھی۔ وہ اس قدر خود غرض...... لالچی اور مفاد پرست شخص ہوگا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس نے تو اس کی شخصیت کا اچھا پہلو ہی دیکھا تھا۔ ان کی شادی کو صرف چند ماہ ہوئے تھے اور آپس میں ملاقات ہوئے صرف ایک سال...... اور ایک سال میں کوئی کسی کو کتنا جان پاتا ہے...... اور انسان کو اندر سے کون جان پاتا ہے۔ شاید وہ خود بھی نہیں...... ڈاکٹر رمیض کی ہر بات اسے مشکوک لگنے لگی۔ یہاں تک کہ اس کی پوری شخصیت بھی...... ڈاکٹر دریہ کا اسٹرونگ فیملی بیک گراؤنڈ تھا۔ وہ ہاسپٹل کے ایم ایس کی بیٹی تھی اور چار بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ اس کے چاروں بھائی انجینئرز اور ڈاکٹرز تھے۔ جہیز میں اسے خوبصورت بنگلہ، گاڑی اور بینک بیلنس دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر رمیض کو دس لاکھ سلامی دی گئی تھی۔ وہ اس شادی سے فرش سے عرش پر جا پہنچے تھے۔ ان کا سوشل اسٹیٹس ایک دم ہائی ہو گیا تھا۔ دریہ کے دونوں بھائی امریکہ اور انگلینڈ میں تھے جو ڈاکٹر رمیض کو بھرپور اسپورٹ کرتے۔ دریہ خود بھی ماہر گائنا کالوجسٹ تھی۔ بہت کم عرصے میں اس نے بہت شہرت کمائی تھی۔ دریہ سے شادی ڈاکٹر رمیض کے لئے ہر طرح سے انتہائی فائدہ مند ثابت ہوئی تھی۔

''ڈاکٹر رمیض کسی اور سے محبت کرتا ہے...... کوئی اور اس کے دل میں ہے......'' اور دریہ اتنی بے وقوف نکلی تھی کہ اسے اس کی بھنک ہی نہیں ہونے پائی تھی۔ وہ تو پورے یقین اور سچائیوں کے ساتھ ڈاکٹر رمیض پر اندھا اعتماد کرتی تھی۔ انہیں دل و جان سے چاہتی تھی...... اور وہ ان کے لئے کچھ بھی نہیں تھی۔ انہوں نے تو ایک جملہ کہہ کر اس کی ذات کی نفی کر دی تھی کہ انہیں اس پر اعتبار نہیں...... اور جس رشتے میں اعتبار ہی نہ ہو...... وہ کب تک قائم رہ سکتا ہے۔ کھوکھلے اور بے اعتبار رشتے ہمیشہ ختم ہو جاتے ہیں...... ڈاکٹر دانش کی باتیں سن کر اس قدر نا امید اور بددل ہو گئی تھی کہ اسے ڈاکٹر رمیض سے شدید نفرت محسوس ہونے لگی تھی۔

''آپ...... اس شخص سے جتنی جلدی چھٹکارا پالیں...... یہ آپ کے لئے اچھا ہے'' ڈاکٹر دانش کے الفاظ اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتے...... ڈاکٹر دانش کی باتیں اسے ٹھیک لگ رہی تھیں۔ وہ جتنا زیادہ ان کے بارے میں سوچتی...... ڈاکٹر رمیض اتنا ہی زیادہ مشکوک نظر آنے لگتے...... وہ شخص اب اس قابل نہیں رہا تھا کہ اس کے ساتھ مزید زندگی گزاری جاتی...... اگر وہ ڈاکٹر دانش کے بارے میں مشکوک ہو کر سوچتی...... تو...... ڈاکٹر رمیض کی زبان سے نکلے الفاظ کو جھٹلا نہ پاتی۔ وہ الفاظ اسے کسی نشتر کی طرح کانوں میں چبھتے رہتے۔

''مجھے تم پر اعتبار نہیں......''

ڈاکٹر رمیض کے الفاظ نے اسے بے حد دکھی کر دیا تھا مگر ڈاکٹر دانش کے انکشافات نے اس کے دل میں ڈاکٹر رمیض کے لئے بے انتہا نفرت بھر دی تھی۔ اتنی نفرت کہ اب وہ اس شخص کے بارے میں کچھ بھی مثبت نہیں سوچنا چاہتی تھی۔ اس کی ہر سوچ...... انتہا کی نفرت پر ختم ہونے لگی تھی۔

لمحوں میں کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ ایک دوسرے سے بے انتہا محبت کرنے والے...... ایک دوسرے کو چاہنے والے...... ایک دوسرے کی خاطر قربان ہونے والے محض ایک شخص کی وجہ سے ایک دوسرے سے اتنے دور ہو گئے۔ اپنے درمیان موجود محبت سے جنم لینے والے تمام نازک جذبات، لطیف احساسات اور خوبصورت رشتے کو ختم کرنے کے درپے تھے۔

☆

رات گہری ہو رہی تھی جب فریحہ آفس سے تھکی ہوئی لوٹی۔ اس نے بیگ اور گاڑی کی چابیاں ٹیبل پر رکھیں اور انتہائی تھکے ہوئے انداز میں صوفے پر بیٹھ گئی۔

اماں......ایک گلاس پانی لے آئیں" فریحہ نے شکستہ لہجے میں کہا تو اماں ٹرے میں پانی کا گلاس رکھ کر لے آئی۔

"بی بی......ڈرائنگ روم میں کوئی شخص آپ کا انتظار کر رہا ہے" اماں نے خالی گلاس ٹرے میں واپس رکھتے ہوئے کہا۔

"کون ہے......اور آپ نے کس کو اندر بٹھایا ہے؟" فریحہ نے حیرت اور خفگی سے پوچھا۔

"بی بی......وہ......وہ......اپنے آپ کو......آپ کا شوہر بتا رہے تھے......اور......میں کون ہوتی ہوں ......گھر کے مالک کو......گھر سے باہر نکالتی" اماں نے رک رک کر کہا۔

"گھر کا مالک......مائی فٹ ......" اور فریحہ انتہائی غصے سے ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئی۔

ڈاکٹر دانش صوفے پر نیم دراز سگریٹ کے گہرے کش لگانے میں مصروف تھے۔ فریحہ کو غصے میں دیکھ کر مسکرائے۔

"تم ...... یہاں ...... کیوں آئے......اور تمہاری جرأت کیسے ہوئی......میرے گھر میں آنے کی......ابھی باہر نکلو ......میں تمہیں ایک منٹ بھی اپنے گھر میں برداشت نہیں کر سکتی" فریحہ غصے سے چلائی۔

"یہ الفاظ تم مجھے کہہ رہی ہو......کیا کسی نیک اور شریف عورت کو زیب دیتے ہیں کہ وہ اپنے شوہر سے یہ سب کہے" ڈاکٹر دانش نے معنی خیز انداز میں پوچھا اور اپنی کوٹ کی جیب میں موبائل پر ریکارڈنگ شروع کر دی۔

"نہیں ہوں......میں شریف اور نیک عورت......میں بہت بری اور بدکار عورت ہوں......یہی سننا چاہتے ہو نا......تو سن لو......میں بار بار کہوں گی......میں بہت بری اور بدکار عورت ہوں" ڈاکٹر دانش نے موبائل آف کر دیا۔

"اب جاؤ یہاں سے......" فریحہ نے غصے سے کہا۔

"پلیز......فریحہ ڈارلنگ......میں یہاں ہمیشہ کے لئے رہنے کے لئے نہیں آیا......میرا یقین کرو......میں صرف چند دن کے لئے آیا ہوں......اور وہ بھی اپنے بیٹے کی خاطر......میں نے بہت ریسرچ کے بعد ایک ویکسین تیار کی ہے اس سے اس کی ابنارملٹی ختم ہو جائے گی......دیکھو فریحہ وہ ہماری زندگی کی آخری امید ہے......پلیز مجھ سے میری امید نہ چھینو......" ڈاکٹر دانش نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا اور فریحہ کے آگے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ فریحہ نے چونک کر اس کی جانب دیکھا اور اس کا دل نرم پڑنے لگا۔

"مجھے انگلینڈ جا کر اپنی غلطی کا شدید احساس ہوا اور یقین کرو......میں عاصم کی وجہ سے انتہائی ذہنی اذیت میں سے گزر رہا ہوں......تم سے کی گئی زیادتیوں نے مجھے شدید ذہنی اذیت میں مبتلا رکھا......پلیز مجھے معاف کر دو......اور مجھے اپنے بیٹے کا علاج کرنے دو......" ڈاکٹر دانش نے فریحہ کے آگے اپنے دونوں ہاتھ جوڑے اور پھر ایک دم اس کے قدموں میں گر گئے۔ فریحہ نے حیرت سے انہیں دیکھا اور ایک دم پیچھے ہٹی۔

"یہ......یہ......آپ کیا کر رہے ہیں؟" فریحہ نے پریشان ہو کر کہا۔

''میں تمہارا گنہگار ہوں اور ہر گنہگار اسی قابل ہوتا ہے کہ وہ گڑگڑا کر اس سے معافی مانگے جس کے ساتھ وہ کوئی زیادتی کرتا ہے'' ڈاکٹر دانش نے پھر اس کے پاؤں کو چھوتے ہوئے کہا۔

''پلیز...... ایسا مت کریں'' اور فریحہ نے پریشان ہو کر انہیں اٹھا کر صوفے پر بٹھایا۔

''تھینک یو...... اس عزت افزائی کا بہت شکریہ'' ڈاکٹر دانش نے مسکرا کر کہا اور اس لمحے ان کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیلنے لگی۔ فریحہ کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے اور کیا کہے......؟ وہ اس شخص کو دیکھنا تو کجا اس کا نام سننا بھی پسند نہیں کرتی تھی اور اب لمحوں میں ساری صورت حال بدل گئی تھی۔ اس نے اس شخص کو معاف بھی کر دیا تھا اور اسے اپنے گھر میں رہنے کی اجازت بھی دے دی تھی ...... شاید عاصم کی خاطر...... ایک موہوم سی امید کی کرن اس کے اندر جگمگائی تھی۔ اسے ڈاکٹر دانش کی ذہانت اور ٹیلنٹ پر کوئی شک نہیں تھا۔ اس کی قابلیت کی وہ قائل تھی اس لئے ویکسین کے نام پر وہ چونک گئی تھی۔ ہو سکتا ہے عاصم میں کچھ بہتری آ جائے...... ڈاکٹر دانش نے ماضی میں اسکے ساتھ جو کچھ کیا تھا وہ عاصم کی خاطر یکسر بھول گئی تھی۔ وہ انکھیوں سے ڈاکٹر دانش کی جانب دیکھنے لگی وہ اس شخص کو دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی مگر عاصم کی خاطر اسے قبول کر رہی تھی۔ اس کے لئے کتنا مشکل ہو رہا تھا...... ذہن اس شخص کو قبول نہیں کر رہا تھا مگر دل کہہ رہا تھا کہ ایک بار اعتبار کر لو...... اپنے بیٹے کی خاطر......'' وہ خاموش اپنی سوچوں میں گم رہی۔

''میں اپنے بیٹے کو دیکھنا چاہتا ہوں کیسا ہے وہ؟'' ڈاکٹر دانش نے سکوت کو توڑا۔

''آیئے...... میرے ساتھ'' فریحہ اٹھ کر اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولی اور دونوں عاصم کے کمرے میں چلے گئے۔ وہ کارپٹ پر بچھے میٹرس پر بری طرح لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ خود ہی ہنس رہا تھا، بے ہنگم قہقہے لگا رہا تھا اور مسلسل چھت کو گھور رہا تھا۔

''یہ کتنا بڑا ہو گیا ہے...... اور......'' ڈاکٹر دانش نے حیرت اور کراہت سے عاصم کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''سولہ سال کا ہو گیا ہے''

''تم اسے کس طرح manage (سنبھالتی) کرتی ہو؟'' ڈاکٹر دانش نے حیرت سے پوچھا۔

''بہت مشکل سے، لیکن یہ میری زندگی ہے...... میری زندگی کی امید ہے...... میرے لئے...... میری سانسوں کی طرح ضروری ہے...... میں اپنی زندگی اور وجود کو اس کے بغیر خالی سمجھتی ہوں...... اور...... زندگی تو خود بخود اپنے آپ کو manage کر لیتی ہے...... انسان چاہے یا نہ چاہے'' فریحہ نے جواب دیا۔

''ہاں...... یہ...... تو ہے...... لیکن میں اس کو بالکل ٹھیک کر دوں گا...... میں نے بہت جدوجہد سے ایک ویکسین تیار کی ہے اور مجھے یقین ہے کہ عاصم اس سے بالکل ٹھیک ہو جائے گا'' ڈاکٹر دانش نے اسے امید دلاتے ہوئے کہا۔

''کیا یہ ویکسین آپ نے کسی اور پر بھی استعمال کی ہے؟'' فریحہ نے پوچھا۔

''ہاں...... ہاں...... ایک مریض پر...... انگلینڈ میں...... اور وہ بالکل صحت یاب ہو گیا تھا...... اور جانتی ہو...... ٹھیک ہونے کے بعد وہ پہلے

سے بھی زیادہ ایکٹو ہو گیا" ڈاکٹر دانش نے کمال صفائی سے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

"کیا وہ مریض...... عاصم کی طرح پیدائشی ابنارمل تھا؟" فریحہ نے تجسس ہو کر پوچھا۔

"نہیں...... ایک حادثے میں اس کا برین damage ہو گیا تھا مگر میرے علاج سے وہ بالکل ٹھیک ہو گیا...... اور جانتی ہو...... میڈیا...... میری اس ویکسین کے بارے میں جاننے کے لئے کتنا تجسس ہو رہا ہے۔ پریس کانفرنس کے دوران میری ریسرچ موضوع بحث بنی رہی۔ ہر کوئی اس کے بارے میں جاننا چاہتا تھا مگر میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ کسی اور کانفرنس میں اس کے بارے میں تفصیل سے بتاؤں گا......" ڈاکٹر دانش نے فخریہ انداز میں کہا۔

"کیوں......؟" فریحہ نے حیرت سے پوچھا۔

"لوگ ہمیشہ دوسروں کی کامیابیوں سے حسد کرتے ہیں اور کامیاب لوگوں کی راہ میں رکاوٹیں ڈالنا چاہتے ہیں۔ اگر کوئی میری ویکسین پر تنقید کرنا شروع کر دیتا یا اس کا فارمولا چوری کر لیتا تو میری اتنے سالوں کی محنت ضائع ہو جاتی...... اور میں نے تو یہ سب کچھ اپنے بیٹے کے لئے کیا ہے...... اور تمہارے لئے......" ڈاکٹر دانش نے قدرے خوشامدانہ انداز میں کہا۔

"میرے لئے......؟" فریحہ نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں...... تم عاصم سے بہت محبت کرتی ہو...... شاید اپنے آپ سے بھی زیادہ...... تم میری اولاد کی جس محبت سے پرورش کر رہی ہو...... میرے پاس تمہارا شکریہ ادا کرنے کو الفاظ نہیں...... یو...... آر...... رئیلی گریٹ" ڈاکٹر دانش نے قدرے خوشامدانہ انداز میں کہا تو فریحہ کا دل ایک دم موم ہو گیا۔

وہ شخص پہلی بار اس کے سامنے اعتراف کر رہا تھا کہ وہ اس کی اولاد کی اچھے طریقے سے پرورش کر رہی ہے ورنہ وہ تو عاصم کو فریحہ کے گناہوں کی سزا کہا کرتا تھا۔ اسے اپنی اولاد کہتے ہوئے اسے شرمندگی اور بے عزتی محسوس ہوتی تھی اور اب وہ خود ہی اسے اپنی اولاد کہہ رہا تھا۔ ڈاکٹر دانش میں کتنی تبدیلی آ گئی ہے...... ممکن ہے وہ جس کرائسس میں سے گزرے ہیں اس نے ان کی سوچ بدل دی ہو اور ان کے اندر نفرت کی جگہ محبت بھر دی ہو...... فریحہ کے لئے ڈاکٹر دانش کا یوں بدل جانا بہت غیر متوقع تھا...... مگر...... انسان تو ہر لحہ بدلنے والی مخلوق ہے۔ وہ کب کیا کرے؟ اسے خود بھی معلوم نہیں ہوتا۔ فریحہ بھی حیرت سے آنکھیں کھولے ڈاکٹر دانش کی جانب دیکھتی رہی۔

"عاصم...... بیٹے...... کیسے ہو؟" ڈاکٹر دانش نے نیچے جھک کر عاصم کے ہاتھ کو محبت سے پکڑنا چاہا۔ عاصم نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی مگر ڈاکٹر دانش نے اسے اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے جکڑ رکھا تھا۔ عاصم نے زور سے ہاتھ کھینچا اور اپنے اوپر جھکے ہوئے ڈاکٹر دانش کے چہرے پر زور سے تھپڑ مارا۔ عاصم کو قطعی احساس نہیں تھا کہ اس نے کسی کو تھپڑ مارا ہے۔ ڈاکٹر دانش ایک دم بوکھلا گئے اور ایک دم سیدھے کھڑے ہو گئے...... فریحہ بھی حیران رہ گئی اور پریشان ہو گئی۔

"کوئی بات نہیں...... اس بیچارے کو کیا معلوم کہ وہ کیا کر رہا ہے؟" ڈاکٹر دانش نے اپنا گال سہلاتے ہوئے کہا تو فریحہ خاموش ہو گئی۔

اسی لمحے لاؤنج میں رکھے ٹیلی فون کی بیل سنائی دی اور تھوڑی دیر بعد اماں کمرے میں آئی۔

"بی بی......وہ......آپ کا فون ہے......شیر افگن صاب کا" اماں نے آہستہ آواز میں کہا۔

فریحہ بوکھلا گئی اور ایک دم کمرے سے باہر نکل گئی۔ ڈاکٹر دانش کے کان ایک دم کھڑے ہو گئے اور انہوں نے حیرت سے آنکھیں گھماتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔

"یہ شیر افگن کون ہے؟" ڈاکٹر دانش نے کمرے سے باہر نکلتی اماں سے پوچھا۔

"ایک صاب......بی بی سے ملنے آتے ہیں" اماں جلدی سے کہہ کر کمرے سے باہر نکلی اور ڈاکٹر دانش کا چہرہ ایک دم سرخ ہونے لگا۔

# (۱۵)

جمی بہت خوش تھا جب وہ گھر میں داخل ہوا۔ نرگس صحن میں چارپائی پر لیٹی کراہ رہی تھی۔ بے بی کے مرنے کے بعد وہ زیادہ تر بیمار ہی رہتی تھی اور فردوس وجمی کے ساتھ بھی بہت کم جاتی تھی۔ فردوس کمرے میں بیٹھی ایک نئے سوٹ کے دوپٹے پر ستارے لگانے میں مصروف تھی جو اس نے رات کو ایک شادی پر پہن کر جانا تھا۔

''ارے...... جمی کیا ہوا...... ؟ کاہے کو بھاگتا ہوا آرہا ہے...... خیر تو ہے۔'' نرگس نے چارپائی سے قدرے اٹھتے ہوئے کہا۔

''ارے...... آپا...... تیرے لئے خوشخبری ہے'' جمی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''جمی...... کیسی خوشی...... اور...... کہاں کی خوشخبری...... میری ساری خوشیاں تو میرا بے بی اپنے ساتھ ہی لے گیا...... اب تو صرف غم ہے......اور میرے آنسو'' نرگس نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''آپا...... تو خبر سنے گی تو خود بخود خوش ہو جائے گی۔'' جمی نے مسکرا کر کہا۔

کیسی خبر...... ؟ نرگس نے حیرت سے پوچھا۔

''فردوس کہاں ہے؟'' جمی نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''وہ اندر کمرے میں کچھ سی رہی ہے۔'' نرگس نے جواب دیا۔

''فردوس...... اری...... او...... فردوس...... کہاں ہو...... ؟ باہر آ کر بات تو سنو۔'' جمی نے زور سے آواز لگاتے ہوئے کہا تو فردوس دوپٹہ پکڑے باہر آ گئی۔

''اے جمی کیا...... تیری کوئی لاٹری نکل آئی ہے...... جو اتنا خوش ہو رہا ہے۔''

''بات ہی ایسی ہے...... تو بھی سنے گی تو خوش ہو جائے گی۔'' جمی نے جواب دیا۔

''اب بتا بھی دے......'' نرگس نے بیزاری سے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''شامو کا پتہ چل گیا ہے......'' جمی نے خوشی سے بتایا۔

''سچ...... کہاں ہے وہ...... ؟ فردوس نے خوش ہو کر پوچھا۔

''بڑے شہر میں...... ایک بہت بڑے بیوٹی پارلر میں کام کرتا ہے...... اس کا اپنا ایک بہت بڑا گھر ہے...... گاڑی ہے......اور وہ بہت امیر ہو گیا ہے...... افسر بن گیا ہے...... اس کے پاس بڑا پیسہ آ گیا ہے۔'' جمی نے مزے لے لے کر بتایا تو نرگس اور فردوس کی آنکھیں حیرت سے پھیلنے

لگیں...... انہیں یقین نہیں آرہا تھا۔

''کیا تو سچ کہہ رہا ہے...... اور...... تجھے کس نے یہ سب بتایا؟ نرگس نے حیرت سے پوچھا۔

''آپا...... سو...... فیصد سچ بتا رہا ہوں میں نے استاد جمالے کے گھر سے پتہ کروایا ہے...... استاد جمالے سے اس نے ہال کا نا سیکھے تھے۔ سنا ہے، استاد جمالے کے مرنے سے پہلے وہ اس سے ملنے آیا تھا...... کسی دوسرے ملک جا رہا تھا...... اور...... اس نے استاد کو دو لاکھ روپے علاج کے لئے بھی دیئے۔'' جمی نے حیرت سے کہا۔

''دو...... لا...... کھ...... دونوں نے انتہائی حیرت سے کہا۔

''ہاں...... وہ...... بہت بدل گیا ہے...... بہت کما رہا ہے...... اس کی شہر میں بڑی عزت ہے اور بڑا مشہور بھی ہو گیا ہے۔'' جمی نے کہا تو وہ خوش ہونے کے ساتھ ساتھ حیران بھی ہونے لگیں۔

''واقعی...... یقین نہیں آرہا...... اس نے اتنی ترقی کر لی ہے......'' فردوس نے کہا۔

''اچھا ہوا...... ادھر سے چلا گیا...... ورنہ ہماری طرح آج وہ بھی غم اور دکھوں سے مر رہا ہوتا...... ویلوں کے پیسے اکٹھے کر رہا ہوتا...... اس کا نصیب کہیں اور جا کر چمکنا تھا...... وہ یہاں کیسے رہ سکتا تھا......؟'' نرگس نے افسردگی سے کہا۔

''رب کے رنگ بھی نرالے ہیں...... دینے پر آتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے اور چھیننے پر آتا ہے تو آخری لقمہ بھی چھین لیتا ہے۔ فردوس نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''جمی...... تو جا کر اس سے مل...... پتہ نہیں...... اب وہ ہم سے ملنا بھی پسند کرے گا یا نہیں'' نرگس نے کہا۔

''اری...... آپا...... تُو بھی کمال کرتی ہے...... اب وہ بڑا امیر بندہ بن گیا ہے...... یہاں...... ہمارے ٹوٹے پھوٹے گھر میں کہاں آنا پسند کرے گا...... اور وہ بھی ہم سے جنھوں نے اسے اتنی ٹھنڈی رات میں گھر سے نکالا تھا......'' فردوس نے کہا۔

''فردوس مجھے بار بار نہ یاد دلا...... میرے دل کو بڑی تکلیف ہوتی ہے...... مجھے لگتا ہے مجھ سے بڑا گناہ ہو گیا ہے...... پتہ نہیں...... رب مجھے معاف بھی کرے گا یا نہیں......'' نرگس نے نم آنکھوں سے کہا تو فردوس شرمندہ ہونے لگی۔

''آپا...... میرا یہ مطلب نہیں...... مگر...... سچ تو یہی ہے نا......'' فردوس نے کہا۔

''اب تو کیا کہتی ہے......؟'' نرگس نے فردوس سے پوچھا۔

''میرے خیال میں ہمیں استاد جمالے کے گھر سے اس کا ایڈریس لے کر اسے خود جا کر ملنا چاہئے۔ اگر وہ ناراض ہوگا...... تو اس سے معافی بھی مانگ لیں گے......'' فردوس نے رائے دی۔

''ہاں...... کہہ...... تو...... تو...... ٹھیک رہی ہے...... جمی...... تو اس کا ایڈریس لے لے اور ہم کل ہی اس سے جا کر ملتی ہیں۔ نرگس نے کہا تو جمی فوراً ہی اٹھ کر باہر جانے لگا۔

''میں ابھی جا کر ایڈریس لاتا ہوں۔'' جمی کہہ کر گھر سے باہر نکل گیا اور نرگس جلدی سے چارپائی سے اٹھی اور منہ دھونے چلی گئی......

فردوس حیرت سے اسے دیکھنے لگی......نرگس بھاگم بھاگ کبھی کوئی کام کرتی کبھی کوئی......اس کے اندر ایسی امید پیدا ہوئی تھی جس نے اسے زندہ کر دیا تھا......وہ ہر بات میں شامو کا ذکر کرتی۔

''فردوس......شامو کو ملنے کیا خالی ہاتھ جائیں گے؟'' نرگس نے فردوس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا مطلب......؟'' فردوس نے چونک کر پوچھا۔

''اب وہ بڑا آدمی بن گیا ہے اور ہم نے اسے مبارکباد دینے جانا ہے......اور......مبارکباد خالی ہاتھ تو نہیں دی جاتی نا؟ نرگس نے مسکراتے ہوئے کہا تو فردوس مسکرا دی۔

''ہاں......ہاں......مٹھائی لے کر جائیں گے۔'' فردوس نے کہا۔

''تیاری شروع کر دو......ہم کل صبح ہی اس سے ملنے جائیں گے......اور......سن......میرے صندوق میں کپڑوں کے نیچے کچھ پیسے رکھے ہیں......وہ نکال کر جمی کو دینا......شامو کے لیے مٹھائی لے آئے۔'' نرگس نے خوشی سے کہا۔

''ٹھیک ہے......'' فردوس کہہ کر کمرے میں چلی گئی۔

رات کو جمی شامو کا ایڈریس لے آیا۔ فردوس اور نرگس نے کپڑے، جوتے اور دوسری چیزیں نکال کر رکھی تھیں۔ فردوس نے جمی کو پیسے دیئے کہ وہ مٹھائی لے آئے۔

''آپا......صبح ہی لے آؤں گا......یا پھر اس کے شہر سے لے لیں گے بڑے شہروں میں اچھی مٹھائیاں ملتی ہیں۔'' جمی نے جواب دیا۔

''ہاں......تم بھی ٹھیک کہہ رہے ہو......وہیں سے لے لیں گے۔'' نرگس نے جواب دیا۔ خوشی سے وہ ساری رات نہ سو سکیں، کبھی کوئی کام کرتیں تو کبھی کوئی کام۔

وہ صبح سویرے ہی گھر سے نکل گئیں جمی ان کے ساتھ تھا۔ انہوں نے اہتمام سے نئے کپڑے پہنے......اپنے آپ کو خوب بنایا، سنوارا اور مطلوبہ ایڈریس پر پہنچ گئیں......وہ ایک بہت بڑے بیوٹی پارلر کا ایڈریس تھا۔ جمی اندر گیا اور ریسپشنسٹ لڑکی سے شامو کے بارے میں پوچھا۔

''یہاں تو اس نام کا کوئی بھی نہیں'' لڑکی نے جواب دیا۔

جمی کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔

''شامو......میرا دوست ہے، دوسرے شہر سے آیا ہے۔'' جمی نے ہاتھوں کو ادھر ادھر چلاتے ہوئے کہا۔

لڑکی نے اس کی جانب بغور دیکھا۔

''آپ شمی کی بات تو نہیں کر رہے؟'' لڑکی نے استفہامیہ لہجے میں پوچھا......تو جمی کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

''شاید......وہی......یہاں آ کر شامو سے شمی بن گیا ہوگا۔'' جمی نے جواب دیا۔

"ایک منٹ...... میں ان سے پوچھتی ہوں...... آپ کا نام......؟ لڑکی نے استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔

"جمی...... میں جمی ہوں...... اسے بتانا...... فردوس اور نرگس بھی میرے ساتھ ہیں۔" جمی نے خوش ہو کر بتایا۔

لڑکی نے انٹرکام پر نمبر ملا کر جمی کے بارے میں بتایا۔

"وہ آ رہے ہیں...... آپ تشریف رکھیں۔" لڑکی نے کہا تو جمی ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ ارد گرد بیٹھی لڑکیوں نے حیرت سے اسے دیکھا، کچھ اسے دیکھ کر مسکرائیں...... اور کچھ نے معنی خیز انداز میں آنکھوں کو گھمایا۔

تھوڑی دیر بعد شمی لاؤنج میں آیا...... اس نے جینز اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی...... بوائے کٹ ہیئر اسٹائل کے ساتھ اس نے کلائیوں پر مختلف قسم کے بینڈز پہن رکھے تھے۔ جمی اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا...... شمی مسکرا کر اسے گلے ملا۔ باہر نرگس اور فردوس بھی گاڑی میں بیٹھی ہیں۔" جمی نے اس کے کان میں سرگوشی کی...... تو...... شمی نے لڑکی کی طرف دیکھا جو دونوں کی طرف حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

"مس ہما...... میں ابھی آیا۔" اور وہ جمی کا ہاتھ پکڑ کر باہر چلا گیا۔ نرگس اور فردوس اسے دیکھ کر گاڑی سے نکلیں اور اسے سر سے لے کر پاؤں تک دیکھنے لگیں۔

"ارے شامو...... میرے بچے تو اتنا بدل گیا ہے...... تُو مجھے معاف کر دے۔ میں تجھ سے معافی مانگنے آئی ہوں۔" نرگس نے نم آنکھوں سے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

"آپ لوگ گھر چلیں...... میں رات کو گھر آ کر بات کروں گا۔" اور اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو اپنے گھر کا ایڈریس سمجھا کر جیب میں سے روپے نکال کر ٹیکسی ڈرائیور کو کرایہ ادا کیا اور گھر میں ملازم کو فون کیا کہ اس کے مہمان آ رہے ہیں۔

"جمی...... تم ان کو لے کر گھر جاؤ...... اور آرام کرو...... میں جلدی آنے کی کوشش کروں گا۔" شمی نے کہا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے ان کو مطلوبہ گھر کے سامنے اتارا...... گھر انتہائی عالیشان دو منزلہ کوٹھی پر مشتمل تھا۔

"ارے یہ ہمیں کہاں اتار رہے ہو......؟" نرگس نے حیرت سے گھر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہی...... ان صاحب کا گھر ہے...... اور مجھے یہی ایڈریس بتایا گیا ہے۔ ٹھہرو میں بیل بجاتا ہوں۔" ڈرائیور نے باہر نکل کر بیل پر ہاتھ رکھا...... تھوڑی دیر بعد ایک نوجوان لڑکا باہر نکلا۔

"آپ شمی صاحب کے مہمان ہیں نا" لڑکے نے پوچھا۔

"ہاں......" جمی نے جواب دیا۔

"اندر تشریف لے آئیے۔" وہ لڑکا ان کو لے کر کوٹھی کے اندر داخل ہوا...... رنگ برنگی ٹائیلوں کے فرش پر چلتے ہوئے پھسلنے کے ڈر سے وہ ایک دوسرے کے ہاتھوں کو پکڑنے لگیں۔ چاروں طرف لکڑی کی کھدائی کے خوبصورت بڑے بڑے دروازے اور ستون نصب تھے...... شیشے کی خوبصورت بڑی بڑی کھڑکیاں اور دروازے...... گھر کی آرائش، فرنیچر اور ڈیکوریشن پیسز، ہر شے خوبصورت اور منفرد تھی۔ تینوں حیرت سے آنکھیں

کھول کھول کر گھر کو دیکھنے لگے۔

''یقین نہیں آتا...... کہ یہ شامو کا گھر ہے۔'' فردوس نے حیرت سے پوچھا۔

''شامو نہیں...... شمی'' جمی نے دونوں کے کانوں میں سرگوشی کی۔

''ہاں...... ہاں...... شمی صاب'' فردوس نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔ لڑکے نے تینوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ وہ نرم و گداز جدید طرز کے صوفوں، ٹیبلو اور ڈرائنگ روم کو دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

''میں ابھی آتا ہوں ......'' لڑکا کہہ کر باہر جانے لگا۔

''تمہارا کیا نام ہے......؟ جمی نے پوچھا۔

''ناصر......'' لڑکے نے جواب دیا...... اور...... مسکراتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔

''آپا سچ یقین نہیں آرہا...... رب نے شمی پر اتنا کرم کر دیا ہے...... ایسا گھر...... ایسے ٹھاٹ باٹ اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھے ہوں گے...... رب کے رنگ ہیں...... بندے کو کہاں سے کہاں لے جاتا ہے۔'' فردوس نے حیرت سے کہا۔

''اور رب کے رنگ بڑے نرالے ہیں...... بندہ حیران ہی رہ جاتا ہے۔'' نرگس نے بھی اس کی ہاں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

جمی حیرت سے ایک ایک چیز کو ہاتھ لگا کر دیکھ رہا تھا۔ اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا...... کیا کہے......؟ اسے شامی کی قسمت کہے یا قدرت کا معجزہ یا پھر شمی کی محنت......؟

تھوڑی دیر بعد ناصر خوبصورت گلاسوں میں ان کے لئے پیپسی ڈال کر لے آیا...... گلاس اٹھاتے ہوئے ان کے چہرے خوشی سے دمکنے لگے...... انہوں نے جلدی جلدی گلاس ختم کیے۔

''آیئے میں آپ لوگوں کو آپ کا کمرہ دکھا دوں...... آپ لوگ فریش ہو جایئے...... اتنی دیر میں، میں کھانا لگواتا ہوں۔'' ناصر نے کہا تو تینوں اپنے بیگ اٹھا کر اس کے ساتھ چل دیے۔

''سنو...... اس کو وہ مٹھائی تو دو...... جو ہم شمی کے لئے لائے ہیں۔'' فردوس نے جمی سے کہا۔

نرگس نے فردوس کے بازو کو جھٹکا دیا اور نفی میں سر ہلایا تو دونوں خاموش ہو گئے۔

ناصر ان کو ایک خوبصورت ویل فرنیشڈ بیڈ روم میں لایا۔ تینوں حیرت سے کمرے کو گھورنے لگیں۔

''اس کے ساتھ ایک اور بیڈ روم ہے...... آپ میں سے ایک وہاں رہ سکتا ہے۔'' ناصر نے کہا۔

نہیں...... نہیں...... ہم تینوں کے لئے یہ کافی ہے۔'' نرگس نے کہا۔

''ٹھیک ہے...... آپ فریش ہو جائیں...... میرا مطلب ہے ہاتھ منہ دھولیں...... میں ابھی آتا ہوں۔'' ناصر کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ تینوں اٹھ کر کمرے کی چیزوں کو ہاتھ لگا لگا کر دیکھنے لگیں...... کبھی وہ بیڈ شیٹ کو ہاتھ لگاتی، کبھی ٹیبل لیمپس کو...... کبھی پنکھا چلا کر دیکھتیں...... کبھی

لائٹوں کو آن آف کرتیں...... ہر ہر چیز کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتیں۔

''جمی کتنا نصیب والا ہے......'' فردوس نے کہا۔

''ہاں......'' جمی نے آہ بھر کر کہا۔

''آپا...... تو نے مٹھائی دینے سے کیوں روکا؟'' فردوس کو دیکھ کر یاد آیا تو اس نے نرگس سے پوچھا۔

''فردوس...... تو بھی بڑی باؤلی ہے...... اتنی مہنگی مٹھائی ہم شامو کے لئے لائے ہیں اور تو اس لڑکے کو دینے کو کہہ رہی تھی...... پاگل اگر وہ بیچ میں سے کھا لیتا تو ہم شامو کو کیا بتاتے کہ ہم تو پورے دو کلو مٹھائی لائے ہیں.... تمہارا نوکر کھا گیا ہے......'' نرگس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

''ہاں...... تو...... ٹھیک کہہ رہی ہے۔'' فردوس اور جمی نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''جا...... فردوس...... جا کر ہاتھ منہ دھولے......'' نرگس نے کہا تو فردوس اپنا پرس پکڑ کر واش روم میں چلی گئی۔

اتنے بڑے ویل فرنیشڈ واش روم کو دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں...... وہ حیرت سے ایک ایک ٹونٹی کو چیک کرنے لگی...... کسی سے ٹھنڈا پانی نکلا تو کسی سے گرم، وہ واش بیسن کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے چہرے کو ادھر سے ادھر گھما کر ہر زاویے سے چیک کرتی رہی۔ اس نے ہاتھ منہ دھو کر ٹاول سے خشک کر کے اپنے پرس میں سے اپنا میک اپ نکال کر دوبارہ میک اپ کیا...... واش روم میں رکھی پرفیوم اور باڈی سپرے اپنے اوپر چھڑکیں...... مسکرا کر اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا اور خوشی سے ٹونٹیوں کو کھولنے اور بند کرنے لگی۔ ایک دم چھت سے پانی اس کے اوپر گرنا شروع ہو گیا، وہ اونچی آواز میں چلانے لگی۔

''ہائے...... مرگئی...... کس کمبخت نے میرے اوپر پانی پھینک دیا ہے...... اوئے...... جمی اندر آ...... دیکھ تو سہی۔'' فردوس چلائی تو نرگس اور جمی واش روم کی طرف بھاگے۔ فردوس پر شاور سے پانی گر رہا تھا اور اس کے سارے کپڑے بھیگ گئے تھے۔

''فردوس تو بھی پاگل ہے...... بھلا اس کو کھولنے کی کیا ضرورت تھی۔'' جمی نے شاور کی ٹونٹی بند کرتے ہوئے کہا۔

''ارے...... مجھے کیا پتا...... یہاں چھت پر بھی نلکا لگا ہے۔

جا اب میرے کپڑے بیگ میں سے نکال کر لا۔'' فردوس نے کہا تو جمی کمرے میں چلا گیا اور بیگ لا کر اسے تھما دیا۔

''خود ہی نکال لو...... جو تم نے پہننے ہیں...... مجھے کیا معلوم اب تم کونسا جوڑا پہنو گی۔'' جمی نے منہ بنا کر کہا اور وہاں سے چلا گیا...... اور ...... فردوس کپڑے بدل کر باہر نکلی تو ناصر آ گیا۔

''آ جائیے...... کھانا تیار ہے۔'' ناصر نے کہا۔

''ابھی آتے ہیں...... پہلے ہم ہاتھ تو دھو لیں۔'' جمی نے نرگس کی طرف دیکھتے ہوئے خفگی سے کہا۔

تھوڑی دیر بعد تینوں ڈائننگ روم میں پہنچیں تو انواع واقسام کے کھانے خوبصورت کرسٹل کے برتن دیکھ کر حیرانگی اور خوشی کے ملے جلے تاثرات سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔

''ایسے برتنوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔'' فردوس نے آہستہ سے سرگوشی کی۔

''اری......ہم نے تو زندگی بھر ایسے برتنوں کو ہاتھ نہیں لگایا......ڈر تو لگے گا ہی نا......کیوں جمی؟'' نرگس نے آہ بھر کر کہا۔

''اور نہیں تو کیا......؟'' جمی نے جواب دیا۔

''صاحب کا حکم ہے......ٹھیک طرح سے کھانا کھایئے......اور اسے اپنا ہی گھر سمجھئے۔'' ناصر نے کہا۔

''وہ خود کب آئے......گا......گی......'' فردوس الجھتے ہوئے بولی۔

''وہ رات کو دیر سے آئیں گے......مگر کہہ رہے تھے کہ جلد آنے کی کوشش کریں گے۔'' ناصر نے جواب دیا۔

''آپ لوگ آرام سے کھانا کھائیں......جس چیز کی ضرورت ہو یہ بیل بجا دیجئے گا......میں حاضر ہو جاؤں گا۔ ناصر نے ایک بیل میبل پر رکھتے ہوئے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

''یہ ہمیں اتنی عزت دے رہا ہے کہ حیرانگی ہو رہی ہے......سچ......آج تک تو ہمیں کسی نے عزت سے بلایا ہی نہیں......'' فردوس نے آہ بھر کر کہا۔

''چل......کھانا کھا......خوامخواہ دکھی نہ ہو۔'' نرگس نے خفگی سے کہا۔

''ہائے اللہ......اتنا کچھ ہے......کیا کھاؤں۔ کیا نہ کھاؤں......'' فردوس نے ایک دم موڈ بدلتے ہوئے خوشگوار لہجے میں کہا۔

''اری......سب کچھ ہی کھالے......مگر......اتنا نہ کھانا کہ تیرا پیٹ ہی پھٹ جائے......'' نرگس نے ہنستے ہوئے کہا اور تینوں کھانا کھانے میں مصروف ہو گئیں۔

رات کا ایک بج گیا تھا مگر شمی ابھی تک نہیں آیا تھا اور وہ اس کے انتظار میں جمائیاں لینے لگیں۔

''پتہ نہیں......شمی کب آئے گا......مجھے تو بہت نیند آ رہی ہے۔'' جمی نے جمائی لیتے ہوئے کہا......اور بستر پر لوٹنے لگا۔

''ہائے......ایسا نرم بستر تو زندگی بھر نصیب نہیں ہوا......آپا......یہاں آ کر یوں محسوس ہونے لگا ہے......کہ ہمیں تو خدا نے کچھ بھی نہیں دیا۔ نہ ڈھنگ کی زندگی......نہ اچھا کھانا پینا نہ اچھا پہننا اوڑھنا۔'' فردوس نے آہ بھر کر کہا۔

''اور......نہ ہی اچھا نصیب......'' نرگس نے آہ بھر کر کہا۔

گیٹ بیل بجی......تو تینوں اٹھ کر بیٹھ گئیں اور اپنے کپڑے ٹھیک کرنے لگیں۔ شمی اندر داخل ہوا تو تینوں مسکرا کر کھڑے ہو گئیں۔

''آپ لوگ تھک تو نہیں گئے۔'' شمی نے مسکرا کر پوچھا۔

''ارے ہماری ساری تھکاوٹ تو تجھے دیکھ کر ہی ختم ہو گئی......صدقے جاؤں میرے بچے نے اتنی ترقی کر لی ہے۔ ٹھہر میں تیری نذر تو اتار لوں۔'' نرگس نے جلدی سے کھڑی ہو کر اپنے پرس میں سے پیسے نکال کر اس پر وارے۔

''بس......یہ تم لوگوں کی دعائیں ہیں......'' شمی نے مسکرا کر جواب دیا۔

''شمی......کیا یہ......سب تیری کمائی کا ہے؟'' فردوس نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......میری محنت کی کمائی کا......آپا......محنت کی کمائی میں بڑی برکت ہوتی ہے......بس انسان کو شروع میں بڑی تکلیفیں اٹھانی پڑتی ہیں......پھر آہستہ آہستہ ٹھیک ہوتا جاتا ہے۔'' شمی نے کہا۔

''تم پر اللہ نے بڑا کرم کیا ہے۔'' جمی نے کہا۔

''ہاں......بس کسی نے راہ دکھائی......اور میرے دل نے اس کی بات کو مان لیا......'' شمی کی آنکھوں کے سامنے رانی گھوم گئی۔

''ارے کس نے تجھے راہ دکھائی......کچھ مجھے بھی تو بتا۔'' جمی نے متجسس ہو کر پوچھا۔

''تھا......کوئی......جو میرے ناچ گانے کی کمائی کا چاکلیٹ بھی نہیں لیتا تھا......کہتا تھا......مجھے تیری حرام کی کمائی کا کچھ نہیں کھانا......بس میرے دل نے اس کی بات مان لی، پھر استاد جمالا مل گیا......وہ تو اک فرشتہ تھا......اس نے نہ صرف مجھے اپنا ہنر سکھایا بلکہ مجھے اپنی سگی اولاد سے بڑھ کر چاہا......اگر استاد جمالا میری زندگی میں نہ آتا تو میں آج سڑکوں پر آوارہ پھر رہا ہوتا یا کب کا مر کھپ گیا ہوتا......وہ مر گیا ہے......تو لگتا ہے جیسے میری زندگی خالی ہو گئی ہو......اس دنیا سے روشنی ختم ہو گئی ہو۔ میری زندگی بنانے والا وہ شخص تھا......میں اس کو کبھی نہیں بھول پاؤں گا......وہ ہر قدم پر مجھے یاد آتا ہے......اس کی باتیں......اس کی محبت......اس کا پیار......تم سوچ نہیں سکتیں وہ کیا تھا......اچھا......نیک......اور صاف گو انسان۔ اللہ کا کتنا بڑا تحفہ ہے، جو وہ دوسرے انسانوں کو دیتا ہے......ایسے انسانوں سے دنیا چمکتی ہے......مگر ان کے اپنے لوگ ہی ان کی قدر نہیں کرتے......استاد کے بیٹے بھی بڑے نافرمان نکلے......اپنے باپ کی قدر نہ کر سکے......اور......وہ ان کا غم کلیجے میں چھپائے مر گیا۔'' شمی سسکنے لگا تو نرگس، فردوس اور جمی کی آنکھیں بھی نم ہونے لگیں۔

''اور وہ انسان تو بہت ہی بڑے ہوتے ہیں جو ہم جیسوں کو اپنے جیسا سمجھ کر اپنے سینے سے لگاتے ہیں......ہمارا دکھ محسوس کرتے ہیں......ہماری کمیوں اور خامیوں کا ذمہ دار ہمیں نہیں ٹھہراتے......ایسے انسان بہت کم ہیں......سونے سے بھی زیادہ قیمتی۔'' فردوس نے آہ بھر کر کہا۔

''شمی......ہمارے دلوں میں چھلنی سے زیادہ چھید ہیں......ان سوراخوں سے غم اور دکھوں کا لہو کیسے کیسے نکلتا ہے......ہمارے دلوں پر لوگ کیسے چھریاں چلاتے ہیں......کسی کو کیا خبر......شمی تجھے کیا بتائیں......ہمارے بے بی کے بیمار ہونے پر ظالموں نے ہمارے ساتھ کیسا سلوک کیا......میرے پرس سے تو سونے کی انگوٹھی بھی چرا لی۔'' فردوس نے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔

''وہ......وہ......بچہ......کیا ہوا اسے......؟'' شمی نے ایک دم آنسو پونچھ کر حیرت سے پوچھا۔

''پتہ نہیں شمی اسے کیا ہو گیا......شاید اسے تیری ہی بددُعا لگ گئی اور وہ مر گیا......میرا بچہ......مجھ سے بچھڑ گیا......میری گود اجاڑ گیا......'' نرگس بین کرنے کے انداز میں بولی۔

''آپا......میری بددُعا......تو نے یہ کیسے سوچا......میں بھلا اسے کیوں بددُعا دوں گا......'' شمی نے حیرت سے کہا۔

''میں نے اس رات تجھے گھر سے نکالا......تو......تو نے کہا تھا......کہ تجھے اب پتہ چل گیا ہے نا......اس لئے مجھے نکال رہی ہو......'' نرگس

نے جواب دیا۔

''آپا...... اگر تم مجھے گھر سے نہ نکالتی تو آج میرے پاس یہ گھر نہیں ہوتا...... ہم لوگ بھی بڑے ناشکرے ہیں...... اللہ کے رازوں کو نہیں سمجھتے اور شکوے کرتے ہیں۔ استاد جمالے نے مجھے یہی سکھایا...... کہ...... شامو...... رب سے کبھی شکوہ نہ کرنا...... تو کچھ نہیں جانتا...... مگر...... وہ سب کچھ جانتا ہے۔ آپا اس ایک بات پر عمل کرنے سے میرے دل کے اندر سے سارے دکھ، سارے شکوے، ساری پریشانیاں ختم ہو گئیں۔ ورنہ میں اٹھتے بیٹھتے رب سے یہی شکوہ کرتا تھا کہ اس نے مجھے کیوں ایسے پیدا کیا...... استاد کی کس کس بات کو یاد کروں؟'' شمینے آہ بھر کر جواب دیا۔

''یہ تو سچ ہے...... تیرا یہ گھر اور تیری شان دیکھ کر ہمیں تو یقین ہی نہیں آیا...... کہ...... یہ سب کچھ تیرا ہے......'' جمی نے حیرت سے کہا۔

''میرا نہیں...... سب کچھ اوپر والے کا ہے۔'' شمی نے کہا۔

''شمی تو...... تو...... بڑا اللہ والا بن گیا رے...... پہلے...... تو...... تو......؟'' فردوس نے کہتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''میری کیا اوقات...... بس زندگی کو بڑے قریب سے دیکھا ہے...... پیٹ کی خاطر بڑی ذلت سہی ہے اور اپنے بے آسرا وجود کے لئے پناہ ڈھونڈنے میں بڑے دھکے کھائے ہیں...... جب انسان بڑی مشکلوں سے گزرتا ہے تو پھر اسے کوئی شے نہ تو خوش کرتی ہے اور نہ سکون دیتی ہے۔ سکون تو بس قدرت کے فیصلوں پر شکر کرنے میں ہے۔'' شمی نے کہا تو سب حیرت سے آنکھیں پھیلا کر اسے دیکھنے لگے۔

''شمی...... تو خود ہی بڑا نہیں ہوا...... تو بڑی بڑی باتیں بھی کرنے لگا ہے...... ارے تو نے کہاں سے ایسی باتیں سیکھیں؟'' فردوس نے حیرت سے پوچھا۔

''استاد جمالے سے...... اور...... خود اپنے آپ سے۔'' شمی نے مسکرا کر جواب دیا۔

''ارے شمی...... تو نے مجھے معاف کر دیا ہے نا۔'' نرگس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے پوچھا۔

''آپا...... تو...... کیا کر رہی ہے...... ارے...... تو نے تو مجھے ماں جیسا پیار دیا ہے...... بھلا میں تجھ سے کیوں ناراض ہوں گا......؟'' شمی نے اس کے قریب بیٹھ کر اس کے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے لگاتے ہوئے کہا تو نرگس فرطِ جذبات سے سسکنے لگی تو شمی نے محبت سے اپنا بازو پھیلا کر اس کے کندھے پر رکھ کر اس کو اپنے ساتھ لگایا تو وہ سسک سسک کر رونے لگی۔ فردوس اور جمی بھی رونے لگے۔

''آپا...... یہ گھر بار...... سب تیرا ہے...... اب تم سب یہاں رہو گے۔'' شمی نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگا کر کہا۔

''یاد آیا...... اے...... جمی...... وہ مٹھائی کا ڈبہ تو دے...... جو ہم شمی کے لئے لائے ہیں۔'' نرگس نے آنسو پونچھتے ہوئے جمی سے کہا تو وہ بھاگ کر بیگ میں سے مٹھائی کا ڈبہ لے آیا۔'' نرگس نے اسے ڈبہ پکڑایا۔

''اس کی کیا ضرورت تھی......؟ اپنے گھر کو دیکھنے کے لئے کیا مٹھائی کی ضرورت ہوتی ہے؟ شمی نے محبت سے کہا۔

''تم جو مرضی کہو...... مٹھائی تو ہمیں لانی ہی تھی۔'' نرگس نے مسکراتے ہوئے کہا تو شمی نے ڈبہ پکڑ لیا۔

''شکریہ۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تجھے خوش دیکھ کر دل بڑا خوش ہو رہا ہے۔" جمی نے مسکرا کر جمائی لیتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے اب آپ لوگ سو جائیں...... جمی کو بہت نیند آ رہی ہے...... صبح بات کریں گے۔" شمی اٹھتے ہوئے بولا تو سب اس کے جانے کے بعد آلتی پالتی مار کر سو گئے۔

☆

آپریشن کے بعد برکتے کا کولہا بڑی مشکل سے جڑا تھا..... کتنی منتوں سے سرکاری ہسپتال میں درخواستیں دے دے کر آپریشن کرایا گیا تھا۔ اس کے بعد کوئی اسے ہسپتال نہیں لے کر گیا۔ وہ ہر وقت چارپائی پر لیٹی کراہتی رہتی، روتی اور منے کو یاد کرتی رہتی۔ ملکا دن شروع ہونے سے رات گئے تک اسے کوستا رہتا اور گالیاں دیتا رہتا..... اس کے لیے اب وہ ایک ناکارہ وجود تھی..... جس نے اس کی جگی میں نحوست پھیلا رکھی تھی..... اسے ہر وقت برکتے پر غصہ آتا رہتا جو اب اس لئے کسی کام کی نہیں رہی تھی..... اس کا بس نہیں چلتا تھا کسی طرح اسے جگی سے باہر نکال پھینکتا..... اور جس سے ہمیشہ کے لئے اس کی جان چھوٹ جاتی..... جس طرح اس بچے سے چھوٹ گئی تھی۔ ملکے کو کبھی اپنے کئے پر نہ رنج ہوتا نہ شرمندگی۔ وہ اپنے آپ کو یہ تسلی دے کر بری الذمہ قرار دیتا..... کہ اس نے ان کے ہاں بھوکا پیاسا رہ کر مرنا تھا..... اور اس نے اسے کب جان سے مارا تھا جو اللہ اس کو جرم وار ٹھہرائے گا..... اس نے بچے کو پھینکا ہی تھا نا..... قتل تو نہیں کیا تھا..... اور..... برکتے جو اس کو اللہ کے عذاب سے ڈراتی تھی اب بستر پر پڑی کراہتی رہتی تھی۔ اس کے لئے زندگی مصیبت بنی ہوئی تھی وہ ایک قدم اٹھ کر نہیں چل سکتی تھی۔ اس کی چارپائی کو درمیان سے کاٹ دیا گیا تھا۔ کوئی اسے صاف نہ کرتا۔ سارا دن اس کے پاس سے بدبو آتی رہتی..... گڈی کا دل چاہتا تو اسے صاف کر دیتی ورنہ منہ اور ناک پر کپڑا رکھے ادھر ادھر پھرتی رہتی..... اور بڑبڑاتی رہتی۔ بچے ماں کی بیماری سے تنگ آ چکے تھے..... پہلے وہ سارا دن جگی سے باہر رہتے..... اب رات کو بھی جگی میں نہ گھستے..... ہر وقت منہ بنائے بڑبڑاتے رہتے۔

"ابا..... اس کا کچھ کر..... کیا مصیبت ہمارے پلے ڈال دی ہے۔ جگی میں اک پل نہ بیٹھا جائے۔" مجو غصے سے بولتا۔

"ارے کہاں..... اس گند کے ڈھیر کو پھینکوں..... میں تو خود اس سے بڑا تنگ ہوں......" ملکا منہ بنا کر غصے سے بولتا ہوا جگی سے باہر نکل گیا، مجو، منو، گڈی اور شبو بھی اس کے پیچھے باہر نکل گئے۔

"ابا..... تو دوسری جگی کیوں نہیں لگا لیتا..... اس کو یہیں پڑا رہنے دے..... روٹی پانی ادھر ہی دے جائیں گے۔" منو نے رائے دی تو ملکا اور مجو سوچ میں پڑ گئے۔

"نئی جگی پر بڑا خرچا آئے ہے..... اور..... پھر زمین بھی کہاں ہے......" ملکے نے سوچتے ہوئے کہا۔

"ابا..... زمین میں نے دیکھ لی ہے..... اور ہم نے جگی بنانی ہے، کوٹھی نہیں بنانی..... کہ اس پر بڑا پیسہ لگے..... بس کل سے ہم جگی ڈال لیں گے..... رات بھر نیند نہیں آتی..... اماں ساری رات بولتی رہتی ہے..... پھر اس کی بو نے..... دماغ خراب کر کے رکھ دیا ہے..... جان مصیبت میں ڈال دی ہے۔" مجو غصے سے بولا۔

"ٹھیک ہے رے..... کا ہے کو غصہ کرے ہے..... کل ڈال لینا جھگی..... بلا لانا اپنے یار بیلیوں کو..... میں خود اس مصیبت سے تنگ ہوں..... اتنے لوگ ہر روز مر جاتے ہیں..... پر اس کو اللہ نہیں اٹھاتا..... اللہ جانے اس نے کیا کھایا ہے..... جو مرتی ہی نہیں....." ملکا غصے سے اسے کوسنے لگا تو سب بچے خاموشی سے اسے سننے لگے۔

سب بچوں اور دوستوں نے مل کر نئی جھگی ڈال لی اور ایک ایک چیز اٹھا کر وہاں سے لے گئے..... سوائے برکتے کی چارپائی اور اس کے ٹوٹے وجود کے۔

"ارے..... مجھ نصیب جلی کو بھی ساتھ لے جاؤ..... یہاں اکیلی کو کس کے سہارے چھوڑ کر جا رہے ہو..... تم جیسی اولاد سے تو میں بے اولاد رہتی تو اچھا تھا..... تمہارا ناس ہو..... کوئی تو مجھے پوچھے..... یہ سب ملکے کے کہنے میں آ گئے ہیں۔ بڑا ہی ہرجائی ہے..... جب اس کی ٹانگ بس کے نیچے آئی تھی تو میں کس طرح اس کی خدمت کرتی تھی۔ ساری ساری رات جاگتی رہتی تھی اس کا ہر کام خود کرتی تھی اور اب میں اس کے لئے بوجھ بن گئی ہوں۔ مجھے دیکھ کر ناک منہ چڑھاتا ہے۔ مجھ سے اسے بو آتی ہے..... میرا ہائے ہائے کہنا اس کو برا لگتا ہے۔ ہر وقت مجھے یوں گالیاں دیتا ہے جیسے میں نے یہ سب کچھ اپنی مرضی سے کیا ہے..... اور..... ان بچوں کو دیکھو..... مر جانے..... سب کچھ بھول گئے..... کس طرح میں نے ان کو پالا..... گرمی، سردی سے بچاتی..... خود بھوکی رہتی مگر ان کے لئے روٹی پکاتی..... خود انہیں کھلاتی..... آج ان کو ماں بری لگے ہے..... ہائے میری رانی کہاں چلی گئی۔ وہ آج یہاں ہوتی تو کوئی میرے ساتھ یوں نہ کرتا....." برکتے اونچی آواز میں رونے لگی اور بین کرنے لگی مگر اس کی بات سننے کو کوئی بھی نہیں تھا۔

"اے اللہ! تو مجھے کونسا دن دکھانا چاہتا ہے جو ابھی تک مجھے نہیں اٹھا رہا..... کاہے کو اتنی لمبی زندگی دے دی ہے..... کہ..... اس کا بوجھ اٹھانا مشکل ہو گیا ہے..... ہائے..... میری رانی کو ہی بھیج دے وہ آ کر اپنی ماں کو ایک نظر دیکھ لے..... ربا..... مجھے اس سے ایک بار ملا دے....." برکتے آنسو بہاتی رہی اور ہائے ہائے کرتی رہی۔

نئی جھگی میں آ کر سب بہت خوش تھے۔ ملکا بھی اور بچے بھی..... سب بچے اچھلتے، کودتے، چھلانگیں لگاتے، شور مچاتے..... انہیں کوئی منع کرنے والا نہیں تھا۔ گڈی کی عمر چودہ برس ہو گئی تھی اس نے اچھا قد کاٹھ نکالا تھا۔ قدرے بھرے بھرے جسم کے ساتھ وہ اپنی عمر سے بڑی لگتی تھی۔ شبو اس سے چھوٹی تھی۔ پپو اور مجو کی عمریں چار پانچ برس ہو رہی تھیں۔ مٹھو، بجو اور مجو کے ساتھ مل کر وہ ادھم مچاتے کہ خدا کی پناہ..... پہلے تو برکتے انہیں منع کرتی رہتی تھی..... وہ ان کے شور سے تنگ آ کر ان کو گالیاں دیتی تھی۔ اب برکتے نہیں تھی تو سب خوش تھے۔ آزاد تھے، کوئی نہ کوئی تھوڑی دیر کے بعد برکتے کے پاس ایک چکر لگا آتا اور اپنا فرض پورا کر دیتا۔ گڈی جا کر اسے روٹی پانی دے آتی۔ شبو اور گڈی دن میں ایک بار جا کر اس کی گندگی صاف کرتیں..... ملکا بس جھگی کا پردہ اٹھا کر حال پوچھتا اور وہیں سے لوٹ جاتا۔

نوری کی نکیلی بھاگی 25 سالہ، جوان صحت مند، خوش باش لڑکی بہانے بہانے سے گڈی سے ملنے اس کی جھگی میں آتی جاتی رہتی۔ دھندے سے واپس آنے کے بعد وہ شام کو چکر لگاتی پھر کھانا کھا کر رات گئے تک گڈی کے پاس بیٹھی ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہتی۔ گڈی سے اس کی دوستی دن بدن زیادہ ہوتی جا رہی تھی۔ وہ جیسے ہی جھگی میں آتی تو ملکا ادھر ادھر اس کے آس پاس منڈلاتا رہتا..... گڈی کو بہانے سے کبھی برکتے کو دیکھنے

کو بھیج دیتا تو کبھی روٹی پکانے کو......اور......موقع دیکھ کر بھاگی سے مزے لے لے کر باتیں کرتا...... بھاگی پہلے سے زیادہ جچنی میں آنے لگی تھی اور ملکا اب اپنا بہت خیال رکھنے لگا تھا۔ بالوں کو کالے رنگ سے سیاہ کر کے وہ اپنے اندر نوجوانوں جیسی چستی اور جوانی محسوس کرتا۔ اپنے کپڑوں پر گلاب اور موتیے کا عطر چھڑکتا۔ کبھی اپنے کانوں میں موتیے کی کلیاں اُڑستا اور جیسے ہی بھاگی تنہائی میں ملتی اسے کلیاں پیش کرتا۔ بھاگی شرما کر کلیاں اپنے کانوں کے سوراخوں میں ڈال دیتی۔

''اے...... بھاگی......اب میں تیرے بغیر نہیں رہ سکتا......کب تیرے رشتے کے لئے تیری اماں سے بات کروں؟'' ملکے نے موقع دیکھ کر اسے کہا۔

''جب مرضی بھیج......'' اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

''سچ...... لے...... آج ہی بھیجتا ہوں۔'' ملکے نے خوشی سے کہا۔

''مگر اماں ایویں تو تجھے میرا رشتہ نہیں دے گی۔'' بھاگی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب......؟'' ملکے نے حیرت سے پوچھا۔

''تیرے سامنے ڈھیر سارے بچے ہیں...... ان کا تو پہلے کچھ کر۔'' بھاگی نے کہا تو ملکے نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''بچوں کا کیا کرنا ہے...... بھلا بچوں کو میں...... مار تو نہیں سکتا......نا'' ملکے نے کہا۔

''گڈی کی سادی کر دے...... شبو اور دوسرے بچوں کو برکتے کے پاس چھوڑ دے۔ اس جچنی میں صرف تم...... اور میں رہیں گے۔'' بھاگی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''گڈی کی سادی...... کہاں کروں...... اور وہ بھی اتنی جلدی۔'' ملکے نے حیرت سے سوال کیا۔

''اماں کی نظر میں اک بندہ ہے...... اس کی پہلی بیوی کے بچے نہیں...... تو گڈی سے اس کی سادی بنا دے...... وہ تجھے اس کے پیسے بھی دے گا......'' بھاگی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''پیسے......؟ کون پیسے دے گا؟'' ملکے نے حیرت سے پوچھا۔

''رمضو......'' اس نے آہستہ آواز میں کہا۔

''وہ...... بدمعاش...... نشئی...... نہ...... نہ...... میں گڈی کی سادی اس سے نہیں بناؤں گا۔'' ملکے نے غصے سے کہا۔

''ارے...... پاگل ہو رہا ہے...... سارے مرد یہی تو کرتے ہیں۔ کون نشہ نہیں کرتا...... تو بھی تو اکثر بھنگ پیتا ہے نا...... وہ سوٹا لگا لیتا ہے تو کیا ہو گیا...... سن...... اگر تو نے گڈی سے اس کی سادی نہ کی...... تو میری اماں...... میری سادی اس سے کر دے گی...... پھر تو کس سے سادی کرے گا۔ کیا تو میرے بغیر رہ لے گا؟ اپنی بھاگی کے بغیر......''

بھاگی نے بڑے لاڈ سے منہ بنا کر بچوں کی طرح منمناتے ہوئے کہا۔

''اری...... تیرے بغیر ہی تو اب نہیں رہ سکتا۔'' ملکے نے بھی لاڈ سے اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

''گڈی کی تو نے سادی تو کسی نہ کسی کے ساتھ بنانی ہے نا...... اگر رمضو کے ساتھ کر دیتا ہے تو...... میں...... تجھے مل جاؤں گی...... سن...... وہ پیسے بھی دے گا...... اس نے اماں سے پورے دو ہزار کی بات کر رکھی ہے...... گڈی مجھ سے جوان ہے...... میں اماں کو بولوں گی...... قیمت بڑھا...... تین ہزار تو وہ دے ہی دے گا۔'' بھاگی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تین...... ہزار......'' ملکے کے منہ میں پانی بھر آیا۔

''ہاں...... اور...... ان تین ہزار سے ہم موج مستی کریں گے...... تو مجھے نئے کپڑے بنا کر دینا...... زیور اور بہت ساری چیزیں لے کر دینا......'' بھاگی نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''تو...... کیا...... تیری اماں...... مجھ سے پیسہ نہیں لے گی۔'' ملکے نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں لے گی...... وہ تین ہزار تو مجھے ہی دے گی نا...... تیرے پیسے...... میرے پاس آ جائیں گے اور اس سے ہم عیش کریں گے...... عیس'' بھاگی نے ہنستے ہوئے کہا تو ملکا مسکرا کر اسے دیکھنے لگا۔

''ٹھیک ہے...... رمضو سے بات کر لو...... تو...... میں گڈی کو اس سے بیاہ دیتا ہوں۔'' ملکے نے کہا۔

''مگر گڈی کی سادی سے پہلے اپنی سادی کا ذکر نہ کرنا...... کہیں گڈی لڑائی نہ ڈال دے...... ایک دو بار رمضو نے اسے چھیڑا تھا تو گڈی نے اسے بہت گالیاں دی تھیں۔ وہ رمضو کو پسند نہیں کرتی۔'' بھاگی نے سوچتے ہوئے کہا۔

''تجھے کس نے یہ سب بتایا؟'' ملکے نے حیرت سے پوچھا۔

''خود...... گڈی نے بتایا...... گڈی نے تو اس کے منہ پر تھوکا بھی تھا......'' بھاگی نے اسے بتایا تو ملکا خاموش ہو گیا۔

''تو...... غم نہ کر...... اماں رمضو کو سمجھا دے گی...... وہ ٹھیک ہو جائے گا۔'' بھاگی نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

گڈی کو پتہ چلا تو اس نے وہ رونا پیٹنا ڈالا کہ خدا کی پناہ۔

''ابا...... میں...... اس بدشکلے سے بیاہ نہیں کروں گی...... وہ بہت برا آدمی ہے......'' گڈی روتے ہوئے بولی۔

''حرام خور...... بدشکلا ہے تو کیا ہوا...... آدمی تو ہے نا...... انسان کی اولاد ہے نا کسی جن بھوت کی اولاد تو نہیں نا...... بڑی آئی باتیں بنانے والی...... تجھ سے تو اچھا ہے۔'' ملکے نے غصے سے کہا۔

''ابا...... تو...... تو...... اس کی بات ایسے کر رہا ہے جیسے تو میرا نہیں اس کا باپ ہو......'' گڈی غصے سے بولی۔

''زیادہ...... باتیں نہ کر...... بس میں نے تیرا رشتہ اس کے ساتھ پکا کر دیا ہے...... اس کی پہلی بیوی کے بچے نہیں ہوا۔ کیا ہے جو وہ دوسری سادی بنالے گا...... ارے بستی کی اچھی اچھی لڑکیاں اس پر مرتی ہیں...... تو...... تو نصیب والی ہے...... جس سے سادی بنانے کو وہ راضی ہو گیا۔'' ملکا منہ بنا کر بولا۔

''کونسی اچھی......اچھی......ذرا مجھے بھی تو بتا......سب تو اس کے منہ پر تھوکتے ہیں......کمبخت......بدماس......نسئی میرے لئے تجھے وہی ملا ہے......میں بتائے دیتی ہوں......اگر تو نے جبر دستی کی تو میں بھی رانی کی طرح تجھ سب کو چھوڑ کر کہیں بھی چلی جاؤں گی۔'' گڈی نے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

''کیا بولا تو نے......تیری زبان گدی سے نکال کر کاٹ ڈالوں گا......تیرے اتنے ٹوٹے کروں گا کہ چیل کوؤں کو بھی کھانے کو نہیں ملیں گے......کبھی تو......میں نے جو کہہ دیا......سو......کہہ دیا۔ تیری سادی رمضو سے ہی ہوگی۔'' ملکے نے اس کی چٹیا زور سے پکڑ کر اسے دو تین گھونسے مارے وہ زور زور سے چلانے لگی۔

''خبردار......جو......تیری آواز باہر نکلی......جان سے ماردوں گا......کل رمضو کے ساتھ تیری سادی ہے......اور باہر نکلنے کی کوشش بھی نہ کرنا......میں باہر ہی بیٹھا ہوں۔'' ملکے نے اسے دھمکی دیتے ہوئے کہا تو گڈی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

رمضو......ملکے کی عمر کا تھا۔ انتہائی کالا......بدشکل، گھنگھریالے بالوں والا، کانوں میں سونے کی بالیاں ڈالی رکھتا۔ راہ چلتے لوگوں کو چھریاں چاقو دکھا کر روپے پیسے لوٹتا......لڑکیوں کو چھیڑتا......اور اپنی بیوی کی ہر روز پٹائی کرتا۔ دونوں میں ہر وقت لڑائی جھگڑا ہوتا رہتا۔ وہ بڑا ہی بدنام آدمی تھا......اور......گڈی کو اس سے بڑی نفرت تھی۔ بھاگی بھی اس کو سخت ناپسند کرتی تھی، اگر وہ ملکے کو اپنی چالوں سے نہ پھنساتی تو اس کی اماں اس کی شادی رمضو سے ہی کر دیتی......اسے ملکا بہت بہتر لگا......اور اس نے اپنی جگہ گڈی کو پھنسا دیا۔ گڈی اپنے نصیبوں کو روتی رہ گئی اور ملکے نے روتی چلاتی گڈی کی سادی رمضو سے کر دی، رخصت ہونے سے پہلے وہ برکتے سے ملنے آئی تو اس کے سرہانے بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''اماں......تو بھی میرے لئے کچھ نہیں کر سکی......ابا بڑا ظالم نکلا بستی کے سب سے گندے مرد کے ساتھ تیری دھی کو بیاہ دیا۔ اماں......کیا میں اتنی بری ہوں......کہ......اس نے مجھے اس بدماس کے ساتھ بیاہ دیا ہے......اماں......بول......بتا......مجھے......؟'' گڈی دلہن بنی رونے لگی۔

''اری......تیرے باپ کے سینے میں دل نہیں پتھر ہے......اس نے ایک دن کے بچے کو کہیں پھینک دیا......اسے اس پر ترس نہ آیا......تجھ پر کیسے آتا......ہائے......میں کیا کروں......چارپائی پر مٹی کی ڈھیری بنی ہوں......وہ مجھے کیا سمجھے ہے......بڑا ہی ظالم ہے......مجھے معاف کر دینا......تیری اماں تیرے لئے کچھ نہ کر سکی......ہائے......ری......کیا کروں؟'' برکتے نے گہری سانس لے کر آہ بھری اور سسکنے لگی......گڈی نے ماں کے سینے پر اپنا سر رکھ دیا......

''پچھ نہیں اماں......میرا کیا بنتا ہے......رمضو اتنا جالم ہے......مجھے اس سے بڑا ڈر لگے ہے......اماں......مجھے لگتا ہے وہ مجھے مار ڈالے گا......اماں......مجھے اس کے ساتھ نہ بھیج۔'' وہ ہچکیاں لینے لگی۔

''اری......باہر بھی آجا......دولہا تیرا انتظار کر رہا ہے......'' ملکے نے جگی کا پردہ اٹھا کر کہا تو گڈی روتی، سسکتی ماں کی طرف بے بسی سے دیکھتی ہوئی رخصت ہوگئی۔

گڈی کی رخصتی کرنے کے بعد ملکا رمضو سے تین ہزار لے کر بھاگی کی جگی پہنچ گیا۔ وہ پہلے ہی تیار بیٹھی تھی۔ مولوی سے نکاح پڑھوایا اور

ہنستی، مسکراتی بھاگی کے ساتھ اپنی جھگی میں آ گیا۔ بچے حیران و پریشان رہ گئے...... بھاگی دلہن بنی، بجی سنوری، مسکرا مسکرا کر ملکے کی طرف دیکھ دیکھ کر شرماتی تو ملکے کا دل باغ باغ ہو جاتا......

''ابا...... یہ تو نے کیا کیا......؟ تو نے اپنی سادی کر لی......؟ بجو نے غصے سے باپ کے سامنے اکڑتے ہوئے کہا۔

''ابے...... چل...... آیا...... مجھ سے پوچھنے والا...... میں جتنی مرضی سادیاں کروں تو کون ہوتا ہے مجھ سے پوچھنے والا...... کیا تیری ماں ہے اس قابل جو میرے کام کر سکے...... گڈی کے جانے کے بعد کسی نے روٹی تو پکائی تھی نا...... اس لئے بھاگی کو لے آیا ہوں۔'' ملکے نے غصے سے اپنی ایک بیساکھی سے بجو کو دھکا دیتے ہوئے کہا۔

''شبو روٹی پکا لیتی...... تو اب بہانے نہ بنا...... یہ اس لئے ہماری جھگی کے چکر لگاتی تھی اس کو ذرا بھی سرم نہ آئی۔ گڈی کی سہیلی ہو کر اس کے ابے سے سادی بنالی......'' بجو غصے سے بھاگی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''ارے...... کس سے منہ ماری کرے ہے...... تیری ماں لگوں ہوں...... چل...... چپ کر...... اور نکل جا یہاں سے...... ورنہ اک جھانپڑ دوں گی...... میرا نام بھی بھاگی ہے...... تم لوگوں کو ٹھیک کر کے رکھ دوں گی...... بد جبان ہیں...... سارے کے سارے'' دلہن بنی بھاگی نے مکا لہرا کر بجو کی قمیض کا کالر زور سے پکڑ کر دھمکی دیتے ہوئے کہا تو ملکے سمیت سب حیران رہ گئے۔ بچے حیران پریشان ہو کر دیکھنے لگے۔

''اری...... چل...... چل...... بڑی آئی...... ہماری ماں...... اری...... پہلے شکل تو دیکھ سیسے میں...... تیرے ہاتھ نہ توڑ دوں تو پھر کہنا...... یہ ہماری جھگی ہے...... نکل یہاں سے۔'' بجو نے اسے زور سے دھکا دیتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... یہ جھگی...... ہم نے بنائی ہے...... اپنے یاروں کے ساتھ مل کر...... نکل یہاں سے۔'' مٹھو نے بھی غصے سے کہا۔

''اوئے...... حرام خورو...... کیا کر رہے ہو...... تمہیں ذرا سرم نہیں آتی۔ باپ کے سامنے...... ماں سے بدجبانی کر رہے ہو۔'' ملکے نے غصے سے اپنی بیساکھی سے دونوں کے سینوں پر چبھو کر انہیں دھکا دیا۔ دونوں کو غصہ آ گیا اور ملکے کی بیساکھیاں کھینچ کر اسے چارپائی پر زور سے دھکا دیا۔

''سن...... ابا...... تیرا لحاظ کر رہے ہیں...... ہماری اس جھگی میں تیری یہ نئی دلہن نہ رہ سکے گی...... جہاں دل چاہے اسے لے جا ہمیں نہ تیری ضرورت ہے نہ اس کی......'' بجو نے ملکے کو دھمکی دیتے ہوئے کہا تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ تو بچوں کو چھوٹا ہی سمجھ رہا تھا...... اسے یہ خیال ہی نہیں آیا تھا کہ بجو اور مٹھو اتنے بڑے ہو گئے ہیں کہ اس کے ساتھ ہاتھا پائی کر سکتے ہیں۔ ملکے نے بے بسی سے بھاگی کی طرف دیکھا

''چل...... بھاگی دوسری جھگی میں چلتے ہیں۔'' ملکے نے اسے کہا۔

''اُس میں...... وہاں تو بو کرتے ہے......'' بھاگی نے ناک چڑھاتے ہوئے کہا۔

''بو کرتے ہے تو کیا...... ہوا......؟ تجھے کھا تو نہیں جائے گی نا...... چل ادھر......'' ملکے نے کہا تو وہ اس کے ساتھ چل پڑی۔

''تم لوگوں کو میں بعد میں دیکھوں گا۔'' ملکے نے باہر نکلتے ہوئے بجو اور مٹھو کو دیکھتے ہوئے گویا دھمکی لگائی۔

''دیکھی جائے گی......'' بجو نے اکڑ کر جواب دیا۔

برکتے کی جگی میں دیا سا جل رہا تھا۔ بہت کم روشنی تھی اور وہ بستر پر پڑی رو رہی تھی۔ رانی کو یاد کر کے تڑپ رہی تھی۔ گڈی کے نصیبوں پر ماتم کر رہی تھی...... اپنی بے بسی اور لاچاری پر سسک رہی تھی۔ جب اچانک ملکا اور بھاگی جگی میں داخل ہوئے وہ انہیں دیکھ کر چونکی، بھاگی دلہن بنی چھن چھن کرتی ہنستی مسکراتی اندر داخل ہوئی۔ برکتے نے حیرانگی سے ملکے کی جانب دیکھا۔

''ملکے...... یہ...... یہ...... تو...... اسے یہاں کیوں لایا ہے؟'' برکتے نے حیرت سے پوچھا۔

''اسے بیاہ کر کے لایا ہوں...... اب تو...... تو...... کسی کام کی نہیں رہی...... اور مجھے اس کی ضرورت تھی......'' ملکے نے بھاگی کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا تو برکتے کے مردہ بدن میں آگ لگ گئی وہ چارپائی پر لوٹنے لگی۔

''ارے...... تو...... کتنا ظالم ہے...... بیٹی کو کھوہ میں دھکا دے کر خود اپنی سادی رچا بیٹھا ہے...... واہ...... رے، تجھ جیسا باپ رب کسی کو نہ دے...... بڑا ہی ظالم ہے...... تو پتھر دل......'' برکتے غصے سے بڑبڑائی۔

''چل...... چپ کر کے سو...... زیادہ بڑبڑ نہ کر...... خوامخواہ بدشگونی نہ پھیلا۔'' ملکے نے غصے سے کہا اور آگے بڑھ کر دیا بجھا دیا۔

برکتے کے دل پر خنجر چلنے لگے وہ سسکیاں بھرنے لگی...... مرد ذات بڑی ہی بے وفا ہے۔ اسے ذرا بھی میرا خیال نہیں آیا اور اسے میرے سامنے لے آیا...... مجھے دکھ دینے کو رہا ابھی کتنے اور دکھ باقی ہیں...... دیکھنے کو'' برکتے کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اٹھ کر یا تو اپنے آپ کو مار لیتی یا ملکے اور بھاگی کو۔ جن کی دبی دبی سرگوشیوں اور بھاگی کی ہنسی کی آواز سن کر اس کے دل کے ٹکڑے ہو رہے تھے۔ دل یوں تڑپ رہا تھا جیسا ابھی پھٹنے کو بے تاب ہو۔

ہر طرف گہرا اندھیرا تھا...... اور ایک جگی میں تین وجود اپنی اپنی سانسیں لے رہے تھے۔ دو خوشی اور مستی سے سرشار ایک دوسرے میں جذب ہو رہے تھے...... اور تیرا ان کی خوشیوں اور ملن پر ماتم کر رہا تھا...... دو ہنس رہے تھے اور دبے دبے قہقہے لگا رہے تھے اور ایک سسک رہا تھا۔ تڑپ رہا تھا مگر کوئی اس کو سننا ہی نہیں چاہتا تھا...... دو اپنی فتح کا جشن منا رہے تھے اور تیسرا اپنی ہار پر آنسو بہا رہا تھا۔ اس کھیل میں فاتح کون تھا......؟

مرد یا عورت......؟

یا

صرف عورت......؟

عورت، عورت کو ہرا کر خوش ہوتی ہے یا۔

مرد کو مہرہ بنا کر عورت پر فتح حاصل کر کے...... یا

مرد عورت کو بے وقوف بنا کر...... یا

مرد، عورت کے ہاتھوں خود بے وقوف بن کر......؟

☆

رمضو نے گڈی کو پہلی رات ہی ایسی مار ماری تھی کہ اس کا پورا جسم زخموں سے چور ہو گیا تھا۔ رمضو نے شراب کے نشے میں دھت اسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا تھا۔

''اری...... گڈی...... دیکھ تو سہی...... میں تیرے لئے لڈو لایا ہوں...... بڑے اکوسل ہیں...... تو نے ساری زندگی ایسے لڈو نہیں کھائے ہوں گے۔'' رمضو اس کے قریب چارپائی پر بیٹھ کر بولا۔ وہ اتنا بدصورت لگ رہا تھا کہ گڈی نے نفرت سے منہ دوسری جانب پھیر دیا۔

''مجھے نہیں کھانے...... یہ...... لڈو۔'' گڈی نے غصے سے کہا۔

''اری...... اکڑتی کس بات پر ہے...... تجھ سے سادی بنا کر لایا ہوں...... وہ بھی پورے تین ہزار میں۔'' رمضو نے مسکرا کر کہا۔

''کس نے لئے...... تین ہزار......؟'' گڈی نے حیرت سے پوچھا۔

''تیرے باپ ملکے نے...... اور کس نے......؟'' رمضو نے جواب دیا۔

''تو...... تو...... جھوٹ بول رہا ہے۔'' گڈی کو اس کی بات سن کر رونا آ گیا۔

''میں کاہے کو جھوٹ بولوں گا...... یقین نہیں آتا...... تو سویرے جا کر اس سے پوچھ لینا...... اری اس نے تجھے میرے ہاتھ بیچا ہے...... اس لئے اب زیادہ نخرے مت کر...... اور میرے پاس آ جا......'' رمضو نے مست آنکھوں سے مدہوش ہوتے ہوئے کہا۔

''میں...... تھوکتی ہوں تجھ پر...... میں تیرے پاس نہیں رہوں گی...... ابے نے میرے ساتھ دھوکہ کیا ہے......'' گڈی نے رونا شروع کر دیا۔

''اری...... تجھ سے میں نے سادی بنائی ہے...... اب...... آ...... جا میرے پاس......'' وہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔ گڈی نے اسے زور سے دھکا دیا تو وہ فرش پر جا گرا۔ رمضو کی بیوی نجو جھگی کے باہر بیٹھی رمضو اور گڈی کی باتیں سن رہی تھی۔ رمضو کے گرنے کی آواز سن کر جھٹ اندر آ گئی اور گرے ہوئے رمضو پر کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

''تو...... نے...... اس کا ٹھیک علاج کیا...... یہ ہے ہی اسی قابل۔'' نجو نے ہنستے ہوئے گڈی سے کہا تو رمضو نے غصے سے دونوں کو دیکھا اور بمشکل زمین سے اٹھا۔

''تم دونوں کو تو میں ابھی پوچھتا ہوں۔'' اور اپنی چھڑی سے دونوں کو پیٹنا شروع کر دیا۔ نجو تو ایک چھڑی کھا کر ہی باہر بھاگ گئی مگر گڈی پکڑی گئی...... اس نے اس کو ایسی مار ماری کہ وہ اٹھنے کے قابل نہ رہی...... اس نے مار مار کر اس کا بھرکس نکال دیا۔

''حرام خور...... بدجبان...... رمضو کے سامنے جبان چلاتی ہے...... ایسی مار ماروں گا...... کہ یہاں ہی مر جائے گی...... تو رمضو کو جانتی نہیں...... بڑی آئی بیگم صیب...... اری تجھ پر تو میں ہجار دفعہ خود تھوکوں......'' وہ بڑبڑاتا ہوا اور گالیاں بکتا ہوا جھگی سے باہر چلا گیا۔ گڈی ساری رات زخموں کی تکلیف اور چوٹوں کے درد سے کراہتی رہی۔ تڑپتی رہی۔ مگر کوئی پرسان حال نہ تھا۔

''ربا...... تو نے ہمارے نصیب ایسے کیوں بنائے ہیں...... ہم تو جنوروں سے بھی برے انسان ہیں...... وہ تو اپنے بچوں کو بیچتے نہیں ہوں گے...... جس طرح ہمارے ماں باپ بیچتے ہیں......

یا اللہ! تو نے ہمیں کیوں پیدا کیا ہے.....؟

اماں تڑپ تڑپ کر سانسیں گن رہی ہے۔

اور

رانی.....نجانے کہاں ہو گی؟

زندہ بھی ہے یا نہیں۔

گڈی کو رانی بہت یاد آنے لگی جو اس سے بہت پیار کرتی تھی، جو اس کی بہن ہی نہیں سہیلی بھی تھی.....جس کے ساتھ وہ لڑتی بھی تھی...... مگر..... پیار بھی بہت کرتی تھی.....رانی تم کہاں ہو.....؟ مجھے ایک بار تو آ کر دیکھو.....آ کر دیکھو..... رجو جالم نے مجھے کتنا مارا ہے.....دیکھو ابے نے میرے ساتھ کتنا بڑا دھوکہ کیا ہے۔ ابے نے بڑا جلم کمایا ہے۔

میں کیا کروں.....؟

کہاں جاؤں.....؟

کس کو اپنے زخم دکھاؤں.....؟

کس کو سب کچھ بتاؤں.....؟ رانی تو..... میری بات سنتی تھی..... مجھے دیکھنے ایک بار آ جا.....'' گڈی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور اسے یاد کرنے لگی۔

☆

رینا بیگم پہلی بار مجرے میں رقص کرنے جا رہی تھی۔ چمن بیگم صبح سے اس کی تیاریوں میں مصروف تھی۔ اس کے لیے اچھو سے خاص قسم کے موتیے اور گلاب کے پھولوں کے گجرے اور پھولوں کے ہار منگوائے گئے۔ چمن بیگم نے خصوصی طور پر انتہائی قیمتی اور دیدہ زیب سرخ رنگ کا لباس، اس کے لیے منگوایا۔ شیریں بائی اور فضہ بائی نے سر شام ہی اسے تیار کرنا شروع کر دیا۔ اس کے ہاتھوں اور پاؤں میں مہندی سے خوبصورت نقش و نگار بنائے گئے۔ نئے لباس کے ساتھ ویسی ہی چوڑیاں، انگوٹھیاں جھمکے، ہار اور پازیبیں پہنائی گئیں۔ شیریں بائی نے طوائفوں کے مخصوص اسٹائل کے مطابق اس کی چٹیا بنائی اور ساری چٹیا میں موتیے کے ہار پروئے۔ میک اپ مکمل ہونے کے بعد اس نے اپنے سراپے کو آئینے میں دیکھا تو خود ہی حیران رہ گئی۔ وہ اس قدر حسین لگ رہی تھی کہ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ چمن بیگم آئی تو وہ بھی اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔

''ماشاء اللہ.....چشم بدور..... رینا بیگم آپ نے تو سب کو ہی مات دے ڈالی..... استاد چندو خان کی نظریں واقعی بڑی دور بین ہیں...... انہوں نے آپ کے اندر چھپی طوائف کو دیکھ لیا۔ جو ہم نہ دیکھ سکے.....سچ.....آج اگر نگار بیگم یہاں موجود ہوتیں تو خود آپکی نظر اتارتیں.....مگر یہ کام بھی مجھے ہی کرنا ہو گا۔'' چمن بیگم نے مسکرا کر پانچ سو اور ہزار روپے کے نوٹ اس پر وارے اور انہیں علیحدہ رکھ دیا۔

رینا خود بھی بہت خوش تھی۔ وہ جو خواب اپنی آنکھوں میں سجائے اس کوٹھے پر آئی تھی وہ آج پورا ہو رہا تھا۔ اس کا دل اس قدر خوش تھا کہ

اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کسے بتائے کہ اس نے جو خواہش کی تھی۔ وہ آج پوری ہونے جا رہی تھی۔
نگار بیگم کی طرح نوٹوں کے فرش پر چلنا اس کا خواب تھا اور نگار بیگم پر پھولوں کی پتیوں کی بجائے نوٹوں کو نچھاور ہوتے دیکھ کر وہ اپنے تخیل میں ہی کتنا خوش ہوتی تھی۔ آج نگار بیگم کی طرح اچھے کپڑے اور زیورات پہنے وہ کھڑی تھی۔ اس کے لئے نگار بیگم کے گھنگھرو لائے گئے جنہیں چمن بیگم نے خود اپنے ہاتھوں سے اس کے پاؤں میں باندھا، گھنگھروؤں کے ساتھ روپے لگا کر ان کا صدقہ اتارا۔
"ریتا بیگم...... آج آپ کا پہلا مجرا ہے...... ایسا کمال کا رقص کرنا کہ لوگ نگار بیگم کو بھول جائیں...... نگار بیگم ابھی تک لوگوں کے ذہنوں میں ہیں...... ان کے جانے کے بعد بھی لوگ ان کو بھول نہیں پا رہے...... اب یہ آپ پر ہے...... آپ کیسے نگار بیگم کا نقش ان کے ذہنوں سے صاف کرتی ہیں۔" چمن بیگم نے اسے تیسری منزل پر بڑے ہال کمرے میں بھیجنے سے پہلے کہا۔
"ہم آپ سے رقص کے بعد بات کریں گے۔" ریتا بیگم نے بڑی ادا سے کہا اور چھن چھن کرتی سیڑھیاں چڑھ کر تیسری منزل کے ہال کمرے میں پہنچ گئی...... نگار بیگم کی زندگی میں اسے تو کیا کسی طوائف کو اس کمرے میں نگار بیگم کی مرضی کے بغیر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ سیڑھیوں میں ہی ایک دربان بیٹھا رہتا تھا جو کسی کو بلاوجہ وہاں جانے نہیں دیتا تھا۔ صرف وہی طوائف جاتی جس کی رقص کی باری ہوتی یا جو کسی مہمان کے ساتھ شب گزاری کے لئے مخصوص ہوتی۔ اس نے آج تک نگار بیگم کو ناچتے نہیں دیکھا تھا...... نہ نوٹوں پر چلتے دیکھا تھا، بس سن ہی رکھا تھا...... اور باقی اس کے ذہن نے خود ہی سب کچھ سوچ لیا تھا...... اس نے ہال کمرے میں قدم رکھا تو چونک گئی۔ اتنا بڑا کمرہ بھانت بھانت کے مردوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ سب شکلوں سے نہ تو شریف لگتے تھے اور نہ ہی عزت دار...... سب کے آگے شراب کے جام...... نوٹوں کی گڈیاں اور پھولوں کے ہار پڑے تھے...... ارد گرد رنگ برنگی شمعیں مخصوص انداز میں روشن تھیں۔ کمرے میں پھولوں اور عطر کی بھینی بھینی خوشبو پھیلی تھی...... وہ جیسے ہی ہال کمرے میں داخل ہوئی ہر آنکھ نے اسے خاص زاویے اور بھرپور نگاہوں سے دیکھا۔ اس کا دل اندر ہی اندر گھبرانے لگا۔ بھیک دیتے ہوئے جب کوئی بری نظر اس پر ڈالتا تھا تو وہ اسے ہزار گالیاں بکتی تھی اور اب ہر کوئی اسے ایسی ہی گندی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ چمن بیگم اس کے پیچھے آ گئیں...... اور...... سب سے اس کا تعارف کرانے لگیں۔
"یہ ریتا بیگم ہیں۔ نگار بیگم کے مرنے جانے کے بعد استاد چندو خان اور ہم سب نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ نگار بیگم سے بڑھ کر کوئی اور گوہر نایاب آ کر اس حویلی میں موجود ہے تو وہ ریتا بیگم ہیں...... استاد صاحب نے ان کو رقص کی خصوصی تربیت دی ہے...... آپ ان کا رقص دیکھ کر بہت کچھ بھول جائیں گے...... استاد صاحب شروع کیجئے......" چمن بیگم نے مسکرا کر استاد صاحب کو کہا۔
"ریتا بیگم آپ کے قدم تھمنے نہ پائیں...... آج کی رات کو یادگار بنا دیں۔" چمن بیگم نے ریتا بیگم سے کہا تو اس نے گہری سانس لی۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ ہر قدم جس خوشی سے اٹھا رہی تھی وہ خوشی نجانے کہاں غائب ہو گئی تھی...... استاد چندو خان اور ان کے سازندوں نے خصوصی طور پر اس رات کے لئے تیار کی گئی غزل شروع کی......
ریتا بیگم نے دھڑکتے دل کے ساتھ حاضرینِ محفل پر نظر ڈالی، اس کا دل بدکنے لگا...... کوئی چہرہ ایسا نظر نہ آ رہا تھا جس کو دیکھ کر محفل کے

تقدس کا یقین آتا۔

"ریتا بیگم شروع کیجئے......" چمن بیگم نے کہا۔

اسے چمن بیگم کے الفاظ یاد آنے لگے۔

"ایسا رقص کرنا...... کہ لوگ نگار بیگم کو بھول جائیں۔" اور اس نے یہ چیلنج خود قبول کیا تھا۔ اسے اپنے الفاظ یاد آنے لگے۔ "ہم آپ سے رقص کے بعد بات کریں گے۔"

اس نے آنکھیں بند کیں...... پھر انہیں کھولا اور گہری سانس لی اور ہال کے عین وسط میں کھڑی ہو کر رقص شروع کر دیا۔ مہمان اس کی اداؤں اور رقص پر قربان ہونے لگے۔ شراب کے جام چلنے لگے...... اس پر نوٹوں کی بارش ہونے لگی...... نوٹوں میں پھول لپیٹ کر اس پر نچھاور کیے جانے لگے۔ وہ ناچتی ہوئی ادھر ادھر جاتی تو چمن بیگم آنکھوں ہی آنکھوں میں مخصوص مہمان کی جانب جانے کو اشارہ کرتیں جب وہ اس کے پاس جاتی تو وہ رقص کے دوران اس کے بدن کو چھونے کی کوشش کرتا...... اور پھر اس پر دل کھول کر نوٹ نچھاور کرتا۔ ہال کمرے کا فرش نوٹوں سے بھر گیا اور وہ ان نوٹوں پر رقص کرتی انہیں اپنے قدموں تلے روندتی جاتی...... نوٹ اس کے مہندی والے پاؤں کے ساتھ ادھر ادھر اڑتے، رات گئے تک محفل جاری رہی...... نہ دیکھنے والے تھک رہے تھے اور نہ وہ رقص کرتی ہوئی تھک رہی تھی...... محفل اپنے عروج پر تھی، سارے مہمان نشے میں دھت ادھر ادھر پڑے تھے...... عجیب مدہوشی کا عالم تھا......

"واہ...... واہ...... کیا رقص کیا ہے...... برسوں سے اس کوٹھے پر آ رہے ہیں مگر جو لطف آج آیا ہے۔ اس سے قبل کبھی نہیں آیا۔ ریتا بیگم نے تو نگار بیگم کو بھی مات دے دی ہے۔" ایک ادھیڑ عمر موٹا شخص بولا جس کی توند بے ہنگم طریقے سے اس کی قمیض میں پھنسی ہوئی تھی، رنگ سیاہ، بالکل گنجا اور چہرہ انتہائی کریہہ و بد شکل تھا۔ چمن بیگم نے اس کے منہ سے تعریف سن کر بڑے فخریہ انداز میں ریتا بیگم کی طرف دیکھا جو تھک کر چور ہو گئی تھی...... اور جس کے پاؤں سے خون رسنے لگا تھا۔

"کہیے چمن بیگم...... ہم نے آپ سے ریتا بیگم کے بارے میں ہی کہا تھا نا۔" استاد چندو نے مسکرا کر اپنے موسیقی کے ساز سمیٹتے ہوئے کہا۔

"جی...... حضور نے بالکل سچ فرمایا تھا...... اور...... بندی نے بھی تو آپ کی رائے کو سب سے مقدم سمجھا تھا...... آپ تو جانتے ہیں...... آپ کے اور ہمارے فیصلے کی کتنی مخالفت کی گئی تھی کہ ریتا بیگم کہاں رقص سیکھ سکیں گی...... انہیں تو رقص، سر اور تال کی الف، ب کی بھی سمجھ نہیں۔" چمن بیگم نے مسکرا کر استاد چندو سے کہا۔

"چمن بیگم...... یہ گوہر نایاب آپ نے اتنے دنوں سے کہاں چھپا کر رکھا تھا......" موٹے آدمی نے پھر پوچھا۔

"سرکار...... یہ یہیں کی پروردہ ہیں...... بس ہیرے کو تراشنے میں وقت تو لگتا ہے نا...... ویسے ہی آپ کے سامنے پیش کر دیتے تو آپ ہی کہتے...... یہ کوئلہ کہاں سے اٹھا لائی......؟" چمن بیگم نے خاص کندن بیگم کے سٹائل میں ہاتھوں کے اشاروں، ناک اور بھنوؤں کو مخصوص انداز میں حرکت دیتے ہوئے کہا۔

''چمن بیگم...... ریتا بیگم نے تو ہمارا دل لوٹ لیا ہے...... فرمائیے...... کیا آپ ہمیں مہمان نوازی کا شرف بخشیں گی......'' موٹے آدمی نے بڑی ادا سے ریتا بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

لگتا ہے آج سرکار کی جیبیں ابھی تک نوٹوں سے بھری ہیں...... مگر سرکار یہ بھی سوچ لیجئے کہ ہیرا بالکل خالص ہے...... سیپ میں بند سچے موتی کی طرح...... کیا اس موتی کی قیمت آپ ادا کر پائیں گے؟ چمن بیگم نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

ریتا بیگم حیرت سے ان کی گفتگو سن رہی تھی اور اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیسی گفتگو ہو رہی ہے...... اس کے چہرے پر حیرت کے ملے جلے تاثرات نمایاں ہو رہے تھے۔ چمن بیگم نے اس کی طرف دیکھا اور تالی بجائی۔ ایک خوش لباس ادھیڑ عمر عورت اندر داخل ہوئی۔

''کریمن بی...... ریتا بیگم کو مہمان خانے میں لے جائیے اور انہیں تازہ دم کیجئے ...... بہت تھک گئی ہیں۔'' چمن بیگم نے کہا تو کریمن بی ریتا بیگم کو مہمان خانے میں لے گئی۔ وہ اس مہمان خانے میں پہلی مرتبہ داخل ہو رہی تھی۔ بہت خوبصورت آراستہ کمرہ تھا۔ جس کے عین وسط میں لکڑی کی خوبصورت کھدائی والا بیڈ لگا تھا۔ شیشے کی کھڑکیوں پر مخمل کے دبیز پردوں کے نیچے سفید جالی کے پردے لٹک رہے تھے۔ کمرے میں مدہم روشنیوں کے خوبصورت فانوس لٹک رہے تھے اور خوشبوؤں کی ملی جلی مہک سے کمرہ بہت معطر ہو رہا تھا۔ شیشے کی میزیں اور بیڈ کی سائیڈز پر خوبصورت کرسٹل کے ٹیبل لیمپس رکھے تھے۔ اتنا خوبصورت اور رومانوی سا ماحول تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی ساری تھکاوٹ دور ہو گئی وہ تھکے وجود کے ساتھ بیڈ پر لیٹ گئی۔

''ریتا بیگم...... کھانے کو کچھ لاؤں......'' کریمن بی نے پوچھا۔

''نہیں...... میرے پاؤں دبا دیجئے...... میں بہت تھک گئی ہوں۔'' اس نے کہہ کر آنکھیں بند کر لیں اور کریمن بی اس کے پاؤں دبانے لگی۔ چمن بیگم موٹے آدمی سے بحث وتمحیص میں مشغول رہیں۔

''سرکار آپ برسوں سے اس کوٹھے پر آ رہے ہیں...... اور آپ کو یہاں کی روایات کا بھی بخوبی علم ہوگا...... تین لاکھ میں اصل اور سچا ہیرا کہاں سے ملے گا......؟'' چمن بیگم نے اپنے سامنے نوٹوں کا کھلا بریف کیس بند کرتے ہوئے کہا۔

''ہم ساڑھے تین لاکھ دے دیتے ہیں۔'' ایک درمیانی عمر کا شخص نشے میں دھت بولا۔

''ہم چار لاکھ دیتے ہیں۔'' ایک اور آدمی نے مری ہوئی آواز میں کہا اور نشے سے مدہوش ہو کر گر گیا۔ سب نے بھرپور قہقہہ لگایا۔

''چمن بیگم...... پانچ لاکھ...... اب آپ اس سے زیادہ کی بات نہیں کریں گی...... پرانے مہمانوں کا خاص خیال رکھنا چاہئے۔'' موٹے آدمی نے کہا اور اپنی جیبیں خالی کر کے اس کے سامنے رکھ دیں۔

''ٹھیک ہے...... سرکار...... آپ کا حکم سر آنکھوں پر...... چمن بیگم نے اتنے نوٹوں کی جانب للچائی نظروں سے دیکھا اور مسکرانے لگی۔

''سرکار اوپر تشریف لے جائیے......'' چمن بیگم نے اسے اشارہ کیا اور وہ خوشی و نشے سے جھومتا ہوا وہ جھوم جھوم کر گنگناتے ہوئے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

رینا بیگم سو رہی تھیں جب وہ شخص مہمان خانے میں داخل ہوا، اسے دیکھتے ہی کریمن بی کمرے سے باہر نکل گئیں۔اس نے دروازہ بند کیا اور ہوس بھری نظروں سے رینا بیگم کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے اس کے اوپر جھکا، وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی......

''ک......کون ہیں......آپ......؟ اور......یہاں......ہمارے کمرے میں کیوں......؟'' رینا بیگم نے گھبرا کر بیڈ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''حضور......ایسی بھی کیا لاعلمی......ہم آپ کے مہمان ہیں اور آپ کو ہماری مہمان نوازی کا شرف بخشا گیا ہے۔'' وہ بے ہنگم ہنسی، ہنستے ہوئے بولا۔

''کیا مطلب......؟'' اس نے چونک کر پوچھا۔

''کیا رات یونہی سوال و جواب کرتے گزر جائے گی......حضور محبت کی باتیں کب کریں گے......؟'' وہ آدمی بولا۔

''شرم کیجئے......آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں......اور......آپ نے ہمارے کمرے میں آنے کی جرأت کیسے کی......؟ ابھی نکلئے یہاں سے......میں آپ کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی......'' رینا بیگم غصے سے چلانے لگیں۔

''ثابت ہو گیا......ہیرا اصلی ہے......حضور......چلائیے مت ہم آپ کے قدر دان ہیں......آپ سے محبت کی کلیاں چننے کے پورے پانچ لاکھ ادا کئے ہیں......آپ کی خاطر تو آج اپنا سارا کچھ لٹا دیا ہے......یہ دیکھیے ہماری خالی جیبیں......'' وہ مسکرا کر اپنی خالی جیبیں دکھانے لگا۔

رینا بیگم کے ہوش اڑنے لگے......اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا......کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا......اس آدمی نے آگے بڑھ کر اسے بیڈ پر گرایا اور قہقہے لگانے لگا۔اس کے منہ سے شراب کی بدبو آ رہی تھی اور اس کے گندے پیلے دانتوں پر پان نے سرخ رنگ کے نشانات چھوڑ رکھے تھے۔ اس نے چیخنا چاہا مگر اگلے ہی لمحے اس کی آواز جیسے گلے میں پھنس گئی......وہ رات بھر اس کے ساتھ محبت کا کھیل کھیلتا رہا اور وہ خون کے آنسو بہاتی رہی۔وہ اسے یوں نچوڑتا رہا جیسے کتا گوشت لگی ہڈی کو نچوڑتا ہے۔صبح ہونے تک وہ نیم بے ہوش ہو چکی تھی۔اگلے روز شام کو اسے ہوش آئی تو اس کا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔رقص کی محفل......وہ......رات......وہ شخص......اور اس کی کریہہ شکل، باتیں و حرکات اس کے ذہن میں جونک کی مانند چمٹ گئیں تھیں......وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی......اس کے آنسو تھمنے کو نہیں آ رہے تھے......اسے نگار بیگم بری طرح یاد آنے لگی......جس کی حالت بھی اس کی طرح ہوتی تھی اور جو اٹھتی بیٹھتی سسکتی رہتی تھی۔آہیں بھرتی تھی کیا نگار بیگم بھی میری طرح اس صورتحال سے دوچار ہوتی تھی۔نگار بیگم کی طرح رقص کرنا، نوٹوں پر چلنا اور اس کی طرح بنی ٹھنی رہنا اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی اور اس کی خواہش کے لئے اس نے سب کچھ چھوڑا تھا۔اس خواہش نے اس سے اس کا سب کچھ چھین لیا تھا۔عزت، شرافت، معصومیت، شرم و حیا، پاکیزگی اور تقدس......بدلے میں اسے کیا ملا تھا۔ذلت، رسوائی، ضلالت اور دولت......''

انسان کتنا نادان ہے، ان دیکھی منزلوں نا تمام خواہشوں اور ان دیکھے خوابوں کے پیچھے دیوانہ وار بھاگتا ہے......اپنی زندگی کا مقصد اپنی خواہشات کی تکمیل میں گزار دیتا ہے مگر خواہش اس صورت میں پوری ہوتی ہے کہ تمام خوشیاں اور آرزوئیں گم ہو جاتی ہیں۔

کبھی کبھی اپنی خواہشوں کو پورا کرنے کیلئے انسان کو اتنی بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے کہ ساری زندگی کی کمائی بھی اس قیمت کو ادا نہیں کر پاتی۔

اس نے کیا کھویا تھا اور کیا پایا تھا......؟

جو کھویا تھا وہ سب کچھ کتنا قیمتی تھا......

اور جو پایا تھا وہ سب کتنا کریہہ تھا اور ارزاں بھی۔

رو رو کر اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں مگر دل کا غبار کسی طرح کم نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اتنا ٹوٹ چکی تھی کہ سنبھل نہیں پا رہی تھی۔ ایک طوائف کی زندگی کتنی بھیانک اور کریہہ ہوتی ہے یہ اسے اب معلوم ہوا تھا جب اس کے ساتھ سب کچھ بیتی تھی۔ وہ تو نگار بیگم کو اپنا 'آئیڈیل' بنا کر آئی تھی۔ مگر وہ آئیڈیل اس کی اپنی خواہش اور لالچ تھا اور اس لالچ نے اس کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔ اب اسے بھکارن کی حیثیت سے زندگی اچھی لگ رہی تھی...... جس کا کشکول تو خالی ہوتا تھا مگر جس کے پاس سب کچھ تھا...... بس وہ نادان تھی۔ سمجھ نہ سکی کہ آسمان پر اڑتے پرندوں کو لمبی اور اونچی اونچی اڑانیں بھرنے کے لئے کتنے کٹھن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس نے بھی زمین کے ننگے فرش پر ننگے پاؤں کھڑی ہو کر آسمان پر اڑتی نگار بیگم بننے کی 'خواہش' کی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ نوٹوں پر چلنے کے لئے نگار بیگم کو کن مراحل سے گزرنا پڑا تھا۔ اسے کیا معلوم کہ نگار بیگم کو اپنی شان و شوکت اور حمکنت کی کتنی بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی تھی۔ اسے کیا معلوم کہ جسے وہ پری سمجھتی تھی...... وہ کیا نکلی تھی...... اسے اپنے وجود سے نفرت ہونے لگی تھی۔ اپنے آپ پر غصہ آنے لگا تھا۔ وہ ان لمحوں کو کوسنے لگی تھی...... جب وہ یہاں آئی تھی اسے اچھوکی باتیں یاد آنے لگی تھیں جب وہ اس حویلی کی سیڑھیاں چڑھنے لگی تھی...... اس کی آنکھوں پر پٹی بندھ گئی تھی...... لالچ کی، ہوس کی...... اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا...... سوائے ماتم اور گریہ کرنے کے۔ اسے دلبر یاد آنے لگا...... جس نے اس کے طوائف بننے اور نگار بیگم کی جگہ لینے کی سب سے زیادہ مخالفت کی تھی...... اسے وہ رات اچھی طرح یاد تھی جب نگار بیگم کے بعد چمن بیگم نے استاد چندو خان، شیریں بائی اور ریتا، دلبر اور حویلی کے تمام سمجھدار بزرگ لوگوں کو اکٹھا کیا تھا اور ان سے رائے مانگی تھی کہ نگار بیگم کی جگہ کس طوائف کو لینی چاہئے...... چمن بیگم نے خود کندن بیگم کی جگہ سنبھال رکھی تھی اور اب وہ کوٹھے کے تمام امور کی نگران بن بیٹھی تھی...... وہ کندن بیگم کی ملازمہ خاص تھی۔ نگار بیگم اس کے ہاتھوں میں پروان چڑھی تھی۔ طوائفوں کو کوٹھے کے تمام آداب سکھانے کی وہ ذمہ دار تھی اور اب وہ مالکہ بن گئی تھی۔ نگار بیگم بھی اسے خاص اہمیت دیتی تھی۔

''نگار بیگم کے بعد اب کسی ایسی طوائف کی ضرورت ہے جو اس حویلی کا چاند بن کر چمکے...... اور...... اس چاند کی چمک دیکھنے کے لئے مہمان جھوم جھوم کر آئیں۔'' چمن بیگم نے سب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں نے نگار بیگم کو ان کی زندگی میں ہی کہا تھا کہ اگر ان کی جگہ کوئی لے سکتا ہے تو وہ ریتا بیگم ہیں...... ان کے اندر کتنا فن ہے اس کو خود بھی معلوم نہیں...... یہ اس کوٹھے کے لئے ہی پیدا ہوئی ہیں...... تھوڑی سی محنت ان کو اس حویلی کی ہی نہیں اس پورے چاندنی بازار کی چندا بنا سکتی ہے۔'' استاد چندو خان نے کہا تو ریتا بیگم مسکرا دی۔

''نہیں...... وہ طوائف نہیں...... اور کوٹھے کو ایک طوائف ہی چلا سکتی ہے۔'' دلبر نے قدرے سخت لہجے میں کہا تو ریتا نے غصے بھری نگاہوں سے دلبر کی طرف دیکھا۔

''آج کی رینا کو دیکھ کر کون یہ بتا سکتا ہے کہ یہ کہاں سے آئی ہے۔۔۔۔۔اور۔۔۔۔۔کل کو جب یہ رینا بیگم بن کر اس کوٹھے کو چمکائے گی تو کون پوچھے گا۔۔۔۔۔کہ یہ یہاں کی طوائف نہیں۔'' چمن بیگم نے جواب دیا۔

''ایک ملازمہ کو آپ کوٹھے کا جھومر کیسے بنا سکتی ہیں؟

دلبر نے کہا تو رینا بیگم نے پھر غصے سے دلبر کی طرف دیکھا۔

''فن قدرت کی عطا ہے۔۔۔۔۔اور وہ جب کسی کو کوئی خوبی یا فن عطا کرتی ہے تو اس کا خانوادہ نہیں دیکھتی۔۔۔۔۔وہ اس بندے پر اپنی عنایت کرتی ہے۔۔۔۔۔اس کو اپنے کرم سے نوازتی ہے۔میاں تم وہ کچھ نہیں دیکھ رہے۔۔۔۔۔جو ہم دیکھ رہے ہیں۔۔۔۔۔اس بچی میں بہت صلاحیت ہے۔۔۔۔۔چمن بیگم آپ ہماری بات کا یقین کریں اور رینا بیگم کو نگار بیگم کا جانشین مقرر کر دیں۔۔۔۔۔''استاد چندو خاں نے کہا۔

''شیریں بائی۔۔۔۔۔آپ کا کیا خیال ہے؟ چمن بیگم نے سب طوائفوں کی نمائندہ شیریں بائی سے پوچھا۔

''آپ سب اپنی اپنی رائے دے رہے ہیں۔۔۔۔۔کوئی رینا بیگم سے بھی تو پوچھے۔۔۔۔۔کہ۔۔۔۔۔یہ کیا چاہتی ہیں؟ شیریں بائی نے قدرے نخوت سے جواب دیا۔

''ہاں۔۔۔۔۔رینا بیگم کی رائے جاننا بھی ضروری ہے۔''استاد چندو خاں نے کہا۔

''رینا بیگم۔۔۔۔۔کیا آپ ''نگار بیگم'' بننا پسند کریں گی؟'' چمن بیگم نے پوچھا تو رینا بیگم کو اپنی سماعتوں پر یقین نہ آیا۔اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں اور آواز فرطِ جذبات سے کپکپانے لگی۔

''نگار بیگم'' وہ بڑبڑائی۔

''ہاں۔۔۔۔۔'' چمن بیگم نے مسکرا کر پوچھا۔

یہ لمحہ اس کے لئے کتنا انمول تھا۔۔۔۔۔قدرت اس کو وہ کچھ عطا کر رہی تھی جو اس نے چاہا تھا۔اس کی خواہش پوری ہونے جا رہی تھی۔اس نے جس بات کی تمنا کی تھی وہ آرزو پوری ہونے لگی تھی۔وہ کس قدر خوش نصیب تھی۔قدرت اس پر کتنی مہربان تھی۔۔۔۔۔اس پر کرم کر رہی تھی۔۔۔۔۔اسے نواز رہی تھی۔۔۔۔۔عطا کر رہی تھی۔۔۔۔۔اور اس عطا پر وہ خوشی سے پھولی نہ سما رہی تھی۔۔۔۔۔اس نے دلبر کی طرف بالکل نہ دیکھا۔۔۔۔۔اسے اپنی آنکھوں کے سامنے نگار بیگم۔۔۔۔۔زیورات میں لدی۔۔۔۔۔شان و تمکنت سے قدم اٹھاتی بڑی بڑی گاڑیوں میں بیٹھی۔۔۔۔۔رنگ برنگی نوٹوں پر چلتی نظر آئی۔۔۔۔۔اس کے لب مسکرانے لگے۔۔۔۔۔

''ہاں۔۔۔۔۔رینا بیگم۔۔۔۔۔کہئے آپ کا کیا خیال ہے؟'' چمن بیگم نے پھر پوچھا۔

''میں۔۔۔۔۔میں۔۔۔۔۔'' وہ خوشی سے پھولی نہ سما رہی تھی

''ہاں۔۔۔۔۔اپنے دل کی بات کریں۔۔۔۔۔اپنی مرضی بتائیں۔''استاد چندو نے پوچھا۔

''میں۔۔۔۔۔نگار بیگم۔۔۔۔۔؟ وہ بمشکل بول پائی۔

''ہاں......آپ کی لگن اور ہماری محنت آپ کو نگار بیگم بنا دے گی۔'' استاد چندو نے کہا تو وہ مسکرا دی۔

''مجھے خوشی ہوگی......'' اس نے مسکرا کر جواب دیا تو دلبر نے غصے سے اسے دیکھا۔

''مبارک ہو......مبارک ہو۔'' چمن بیگم سب کو مبارکباد دینے لگی......جلدی سے مٹھائی منگوائی گئی اور سب کا منہ میٹھا کرایا گیا......چمن بیگم نے نگار بیگم کے گھنگھرو منگوائے اور اپنے ہاتھوں سے اسے گھنگھرو پہنائے......اس کی نذر اتارنے اور نیاز بانٹنے کا حکم دیا......

دلبر کی آنکھوں میں نمی سی اتر آئی......اس کی آنکھوں میں دکھ اور غصہ تھا......وہ اٹھ کر باہر چلا گیا۔

''نجانے کیوں......دلبر......ریتا بیگم کی مخالفت کر رہا تھا......خدا جانے......اس کو ان سے کیا حسد ہونے لگا ہے......میری بچی کو حاسدین کی نظر بد سے بچائے۔'' چمن بیگم نے ریتا بیگم کا ماتھا چومتے ہوئے کہا تو ریتا بیگم مسکرا دی۔ اس کے بعد دلبر نہ اس سے ملنے آیا......اور......نہ اس سے بات کی......وہ جب گھنگھرو پہن کر استاد چندو خاں سے رقص سیکھ رہی ہوتی تو اس طرف آتے ہوئے اسے دیکھ کر وہ دوسری جانب نکل جاتا......وہ بہت خاموش رہنے لگا تھا۔ ریتا بیگم کو نگار بیگم کا کمرہ مل گیا تھا......اس کا بستر......اس کی چیزیں......اس کے زیورات......اس کے کپڑے......اس کا سب کچھ......ریتا بیگم بہت توجہ سے رقص سیکھ رہی تھی اور اس نے بہت جلدی رقص کرنا سیکھ لیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں دلبر کے خلاف ہو گئی تھی جو اس کی کامیابیوں کے خلاف تھا......اس نے اسے اپنے خواب کے بارے میں بتایا بھی تھا اور اس کا خواب پورا ہونے پر اس نے مبارکباد کی بجائے اس کی مخالفت کی تھی۔ وہ اس سے محبت نہیں......حسد کرتا تھا......اور ایسے حاسد سے نظریں بچانا ہی بہتر ہے......وہ بھی دلبر کو دیکھ کر منہ پھیر دیتی، اسے دلبر کے الفاظ......اس کی محبت......اس کی محبت کے دعوے سب جھوٹے لگے تھے۔

ریتا بیگم کے پہلے مجرے کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں، مگر دلبر ریتا بیگم کو کہیں نظر نہ آیا، وہ اندر ہی اندر منتظر رہی کہ وہ ایک بار اسے دیکھنے آئے کہ وہ بنی سنوری کس قدر حسین لگ رہی ہے......جیسے کوئی نئی نویلی دلہن......وہ منتظر رہی......مگر وہ نہ آیا......اس نے بھی پروا نہ کی......

مگر ہوش میں آنے کے بعد اسے دلبر بہت یاد آ رہا تھا۔ شاید دلبر نگار بیگم کی زندگی کے بارے میں جانتا تھا......شاید وہ اندر کی باتیں جانتا تھا۔ شاید اسے معلوم تھا کہ ایک طوائف کی زندگی کیسی ہوتی ہے......؟ اسے شاید یہ بھی معلوم تھا کہ طوائف کی تو سانسیں بھی بکی ہوتی ہیں......طوائف تو سر بازار ناچنے والی وہ تتلی ہے جس سے سب دل تو بہلاتے ہیں......مگر جس کو نہ محبت سے دیکھتے ہیں اور نہ عزت سے۔ دلبر اس سے محبت کرتا تھا......جب وہ ملازمہ تھی......جب سے وہ ریتا بیگم بن کر حویلی میں اٹھلاتی پھرتی تھی وہ اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔

کاش......! دلبر تم مجھے بتاتے کہ ایک طوائف کی اندر کی زندگی کیسی ہوتی ہے؟

کاش! میں تمہاری باتوں پر یقین کرتی......تمہاری مخالفت کو سمجھ لیتی۔

کاش......! میں تمہیں اور تمہاری محبت کو غلط سمجھتی......کاش......! میں یہاں نہ آئی ہوتی......اور نگار بیگم کو دیکھ کر اس جیسی بننے کی تمنا نہ کی ہوتی......

کاش......! مجھ میں حرص و لالچ......اور......ہوس نہ پیدا ہوتا......

کاش...... امیرے اندر کی بھوک...... مجھے اتنا مضطرب نہ کرتی اور میں اپنا سب کچھ نہ چھوڑتی......

کاش...... امیں بھکارن ہی رہتی...... دردر مانگنے والی...... وہ سسکنے لگی...... اس کے آنسو اس قدر شدت سے رواں ہو گئے کہ تھم ہی نہ رہے تھے۔ اس کا دل اور کلیجہ پھٹنے کو بے تاب تھے وہ اتنا زیادہ تو اپنی جھگی میں بھی نہیں روئی تھی...... جس میں ڈھنگ سے بیٹھنے کو جگہ نہ تھی...... جس کے کپڑے میں نجانے کتنے سوراخ تھے مگر جس نے اس کے جسم کو چھپا کر رکھا تھا...... جس نے اسے سر بازار کھڑا نہیں کیا تھا...... جس کی طرف آتے ہوئے کوئی اجنبی مرد کئی بار سوچتا تھا...... اسے یہ اتنی بڑی رنگ برنگی شیشوں والی حویلی اس کے بڑے بڑے کمرے، لمبی لمبی راہداریاں رنگ برنگی ٹائلوں والے فرش، خفیہ کمرے، خوبصورت آراستہ بالکونیاں...... آرام دہ مہمان خانے...... سب کچھ زہر لگ رہا تھا۔ یہ حویلی اس کی عزت کی پاسدار نہیں بن سکی تھی...... اسے تحفظ نہ دے سکی تھی...... اس کی چھت اس کے لئے سائباں نہیں بنی تھی...... اس حویلی کی شان وشوکت نے اس کی زندگی اجاڑ دی تھی...... اسے ویران کر دیا تھا اور اب وہ اجڑی بیٹھی رو رہی تھی......

دروازے پر دستک ہوئی اس نے اپنے آنسو پونچھے اور مڑ کر دیکھا چمن بیگم کمرے میں داخل ہوئی...... وہ بہت خوش تھی اور خوشی کا رنگ اس کے چہرے کو گلنار بنا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بھی خوشی سے مسکرا رہی تھیں۔

''ارے...... یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟ ریحانہ بیگم آپ کو تو خوش ہونا چاہئے کہ خدا نے آپ کے پہلے مجرے میں ہی اتنی برکت ڈال دی...... اور آپ کو وہ عزت دی...... جو بہت کم طوائفوں کو نصیب ہوتی ہے۔'' چمن بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''عزت'' کے نام پر اس نے چونک کر چمن بیگم کو دیکھا......

کیسی عزت......؟ اور...... کتنی عزت......؟ وہ نادانستہ بولی...... اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس نے چمن بیگم سے کیا پوچھا تھا۔

''خدا نے آپ کو بہت 'عزت' سے نوازا ہے...... ہر مہمان آپ کے بارے میں فون کر کے پوچھ رہا ہے...... لگتا ہے اگلے مجرے پر پہلے سے بھی زیادہ رونق ہوگی......'' چمن بیگم نے خوش ہو کر کہا۔

''اگلا مجرہ......'' آدھا جملہ اس کے حلق میں پھنس گیا...... اور اس نے بمشکل پوچھا۔

''یوں لگ رہا ہے...... جیسے آپ کا مجرہ تو ہر روز ہوگا...... آپ پر تو قسمت بڑی مہربان ہے...... صرف آپ کے مجرے کے بارے میں ہی لوگ پوچھ رہے ہیں......'' چمن بیگم نے مسکرا کر کہا تو اس کا رنگ فق ہو گیا۔

''آپ کو تو خوش ہونا چاہئے...... جتنا دس طوائفیں ایک رات میں کماتی ہیں...... آپ اکیلی ان سے زیادہ کما لیں گی...... طوائف کا کوٹھا بھرا رہے اسی میں اس کی کامیابی ہے۔'' چمن بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا تو اس کا دل کٹنے لگا...... اس کو چمن بیگم کے بار بار ''طوائف'' کہہ کر بلانے سے چڑ ہونے لگی تھی۔

''یہ آپ کی پہلی کمائی ہے......'' چمن بیگم نے چند ہزار روپے اس کی ہتھیلی پر رکھے تو وہ چونکی...... اسے شامو سے کہے ہوئے اپنے الفاظ یاد آنے لگے۔

''اچھی طرح جانتی ہوں تجھے.......ناچ......گا کر حرام کی کمائی کھاتا ہے۔'' اس نے روپوں کو دیکھا اور پیچھے ہٹ گئی......

''کیا ہوا......؟ یہ آپ کی محنت کی کمائی ہے۔'' چمن بیگم نے کہا۔

''محنت کی کمائی......'' وہ آہستہ آواز میں بڑبڑائی۔

''ہاں......'' چمن بیگم معنی خیز انداز میں مسکرائی۔

''ارے تو محنت کرکے روٹی کمائے تو پھر تجھے پتہ چلے کہ محنت کی کمائی کیا ہوتی ہے، اسے شامو سے کہے اپنے الفاظ پھر یاد آنے لگے اس کا جسم لرزنے لگا......اور دل ڈوبنے لگا۔ کیا محنت کی کمائی ایسی ہوتی ہے......؟ اس کے دل نے سرگوشی کی......

''نہیں......'' وہ اپنے آپ سے بڑبڑائی۔

''کیا مطلب......کیا آپ یہ پیسے نہیں لیں گی......؟ چمن بیگم کے لہجے میں انجانی سی خوشی اور امید تھی۔

''میں......میں......اتنے روپوں کا کیا کروں گی؟ وہ ان روپوں سے چھٹکارا پانا چاہتی تھی۔

''آپ ان سے جو چاہیں......کریں......اپنے لئے ملبوسات، زیورات بنوایئے......نذر و نیاز دیں، غریبوں میں بانٹیں۔'' چمن بیگم نے کہا تو اسے اپنی منت یاد آنے لگی۔

''میں پانچ ہزار روپے درگاہ پر نیاز کے لئے دوں گی......جب میں نگار بیگم کی طرح......'' اس سے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکی۔ اس کا چہرہ پسینے سے تر ہونے لگا۔

''منت ضرور پوری کرنی چاہئے اس کے دل نے کہا۔''

''رکھ لیجئے......انسان کی بہت ضرورتیں ہوتی ہیں۔'' چمن بیگم نے روپے اس کے حوالے کئے اور اس نے ان میں سے صرف پانچ ہزار روپے رکھے باقی چمن بیگم کو واپس کر دیئے۔ چمن بیگم کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ وہ تو بہت سے اندیشے دل میں لئے اس کے پاس آئی تھی کہ دینا بیگم چند ہزار روپے دیکھ کر لاکھوں کا حساب پوچھیں گی مگر وہاں تو معاملہ ہی الٹا تھا۔

''ماشاء اللہ......کیا قناعت پسند طبیعت پائی ہے......اللہ نظر بد سے بچائے۔'' اور چمن بیگم نے پانچ ہزار کا نوٹ اس کے سر سے وار کر علیحدہ رکھا۔

''اب آپ آرام کیجئے......میں چلتی ہوں......جب مجرہ ہوگا......تو اطلاع دے دوں گی......تیار رہیے گا۔'' چمن بیگم کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئی اور وہ منت کے پیسے دیکھ کر اونچی آواز میں رونے لگی۔

''میں نے کیوں ایسی منت مانی تھی......جو اتنی جلدی پوری ہوگئی......کاش میں ایسی منت نہ مانتی......کاش! میں پھر سے وہی بھکارن بن جاؤں......کاش! میری یہ دعا پوری ہو جائے......تو میں پانچ لاکھ کی نیاز درگاہ پر دوں گی۔'' اس کے دل نے پھر دعا کی۔

''رانی......کیوں اپنے آپ کو دھوکے پر دھوکے دیئے جا رہی ہو......؟ جب کہ تم یہ اچھی طرح جانتی ہو......کہ اب تمہارا اس زندگی کی

طرف لوٹنا ناممکن ہے...... کون تمہیں وہاں قبول کرے گا...... "جو یہ سیڑھیاں ایک بار چڑھتا ہے...... وہ پھر مر کر ہی اترتا ہے......" اچھو کے الفاظ اسے یاد آنے لگے۔

اس نے گہری سانس لی اور سونی آنکھوں سے کمرے کے در و دیوار کو دیکھنے لگی۔ نگار بیگم کے بستر پر لیٹتے ہوئے اس کا جسم بری طرح ٹوٹنے لگا......

گناہ کا احساس...... کہیں سے سر اٹھانے لگا اور اس کا دل ڈولنے لگا۔ نگار بیگم کا قتل کس نے کیا تھا...... یہ صرف وہی جانتی تھی مگر یہ بات حویلی کے مکینوں نے دبا دی تھی...... کیونکہ حویلی کی بدنامی کا خطرہ تھا اور الزام چمن بیگم پر ہی آنا تھا کیونکہ جوس کا گلاس وہی اس کے لئے لے کر گئی تھی اور سب چمن بیگم کو بچانا چاہتے تھے۔ اگر معاملہ پولیس میں جاتا تو حویلی پر کب کا تالا لگ چکا ہوتا۔ تفتیش سب سے ہوتی۔ اس لئے نگار بیگم کو رات کے اندھیرے میں ہی حویلی کے ایک خفیہ کمرے میں دفنا دیا گیا اور یہ مشہور کر دیا گیا کہ وہ شادی کر کے امریکہ چلی گئی ہیں...... لوگ مشکوک انداز میں سوال کرتے مگر جواب ایک ہی ملتا...... کہ وہ امریکہ چلی گئی ہیں...... کب لوٹیں گی...... کوئی نہیں جانتا۔"

اور یہ راز صرف وہی جانتی تھی...... جس نے نگار بیگم کو قتل کیا تھا...... انتقام کی خاطر...... یا...... اپنی خواہش پوری کرنے کے لئے...... اس کا کمرہ...... اس کی چیزیں...... اس کے ملبوسات سب اس سے یہی سوال کرتے...... کہ وہی نگار کی قاتلہ ہے نا......؟" اور وہ ذہنی اذیت کا شکار ہونے لگی۔

شروع کے دن تو نگار بیگم کی جانشین بننے کی خوشی میں ہی گزر گئے۔ اب جو ہوش آئی تو نگار بیگم ایک بھوت بن کر کمرے کے ہر کونے میں، ہر جگہ میں، بستر پر، واش روم میں اس کے سامنے کھڑی ہوتی اور اس کی طرف غصیلی نگاہوں سے دیکھتی...... وہ اپنے آپ سے بھاگنے کی کوشش کرتی تو کبھی تو نگار بیگم خوفناک آنکھوں سے اس کی جانب دیکھتی۔ اس نے چمن بیگم سے کہہ کر اپنا کمرہ تبدیل کروالیا اور اس کمرے کو تالا لگوا دیا۔ وہ دلبر کی تلاش میں تھی اور وہ کئی روز سے اسے نظر نہیں آ رہا تھا۔ چمن بیگم اس کے کمرے میں آئیں۔

"دلبر کہاں ہے؟ کئی روز سے نظر نہیں آ رہا۔" رینا بیگم نے پوچھا۔

"یہاں حویلی میں ہی ہوتا ہے...... کیا آپ کو اس سے کوئی کام ہے...... کیا اسے بھیجوں......؟ چمن بیگم نے پوچھا۔

"ہاں......" وہ آہستہ آواز میں بولی۔

چمن بیگم کے جانے کے بعد وہ پورا دن منتظر رہی کہ دلبر کب آتا ہے......؟ وہ شام کو اس کے کمرے میں آیا......

"آپ نے مجھے بلایا تھا......" دلبر نگاہیں نیچی کر کے مؤدبانہ انداز میں بولا۔

"رینا بیگم اس کی طرف بغور دیکھتی رہی اور پھر اس کے قریب آئی۔

"کیا مجھ سے ناراض ہو؟" رینا بیگم نے پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"اس بے رخی کی وجہ جان سکتی ہوں......؟" رینا بیگم نے پوچھا۔

''میں آپ کا خادم ہوں...... آپ جو حکم دیں گی اسے بجالاؤں گا۔'' اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''تو پھر ہماری طرف دیکھو......'' ریتا بیگم نے اپنی نگاہیں اس کے چہرے پر گاڑتے ہوئے پوچھا۔

دلبر نے ایک ٹک اسے دیکھا اور پھر نگاہیں پھیر لیں۔

''تم بہت بدل گئے ہو......'' ریتا بیگم نے پوچھا۔

''نہیں...... وقت بدل گیا ہے۔'' اس نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''ہم سے خفا کیوں ہو؟'' ریتا بیگم نے آہ بھر کر پوچھا۔

''میری اتنی اوقات کہاں...... کہ...... آپ سے خفا ہوں۔'' وہ گہری سانس لے کر بولا۔

''کیا وہ باتیں...... وہ محبت...... وہ ملاقاتیں سب کچھ بھول گئے ہو؟'' ریتا بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......'' اس نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

''کیوں......؟'' ریتا بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

''اب ان کی ضرورت نہیں رہی......''

''کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں رہی......؟'' ریتا بیگم نے اس کے چہرے کی طرف بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اب آپ کو 'محبت' کی ضرورت نہیں رہی۔'' دلبر کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

''کیا میں انسان نہیں رہی...... کیا میرے جسم میں دل دھڑکنا بند ہو گیا ہے...... کیا میرے اندر سے تمام جذبے، خواہشات ختم ہو گئی ہیں؟ ریتا بیگم نے جذباتی لہجے میں پوچھا۔

''کیا آپ کا جسم...... آپ کا اپنا ہے؟ کیا اب آپ کی محبت صرف کسی ایک کے لئے ہے...... یا...... سب کے لئے؟'' دلبر نے معنی خیز انداز میں کہا تو ریتا بیگم کو لگا جیسے اس نے سر بازار اس کے چہرے پر طمانچہ مارا ہو...... وہ غصے سے تلملانے لگی۔

''آپ کو زندگی میں اپنی خوشیاں اور خواہشات عزیز تھیں، آپ جو چاہتی تھیں...... وہ سب کچھ آپ کو مل گیا ہے۔ اب آپ کو کسی کی ضرورت نہیں...... محبت کی بھی نہیں۔'' دلبر نے کہا تو ریتا بیگم خاموشی سے اس کی جانب دیکھتی رہیں۔

''اس سے پہلے کہ تم ہمیں...... اپنی زندگی سے نکالو...... ہم تم کو نکالتے ہیں...... نکل جائے یہاں سے! ہمارے کمرے سے...... اور دوبارہ ہمیں اپنی شکل مت دکھانا۔'' ریتا بیگم غصے سے چلانے لگیں تو دلبر خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد ریتا بیگم سسکنے لگی۔ کمرے کی چیزوں کو توڑنے لگی۔ اپنے بال نوچنے لگی اور اپنے چہرے پر تھپڑ مارنے لگی...... اسے ہر طرف خسارہ نظر آنے لگا...... اس نے سب کچھ کھو دیا تھا۔ اک محبت کی آس تھی۔ اب وہ بھی روٹھ گئی تھی...... ایک چیز کو پانے کے لئے اس نے اپنا سب کچھ کھو دیا تھا...... وہ خالی ہاتھ...... ٹوٹے دل اور کھوکھلے وجود کے ساتھ کھڑی تھی...... دلبر اس کے ان دنوں کی محبت تھا جب وہ کچھ بھی نہیں تھی...... اب وہ بہت کچھ تھی مگر محبت نہیں رہی تھی۔ اسے

امید تھی کہ دلبر صرف ناراض ہے اور وہ اسے منا لے گی...... مگر دلبر کی باتوں اور رویے سے اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ اس کی نظروں سے گر چکی ہے اور اس سے محبت کی بھیک نہ وہ مانگ سکتی ہے اور نہ ہی وہ دینے کو تیار تھا۔ وہ بے بس کھڑی تھی۔ ذلیل و خوار...... وہ کتنی ہی دیر روتی اور تڑپتی رہی...... سسکتی رہی...... اور پچھتاوے کے آنسو بہاتی رہی۔

☆

چمن بیگم نے ساری طوائفوں میں بیٹھ کر بڑی جز باتی تھی کہ رینا بیگم نے اپنی ساری کمائی اسے دے دی ہے اور صرف پانچ ہزار روپے رکھے ہیں۔ وہ بلا واسطہ انداز میں ان طوائفوں کو طنزاً یہ سب کچھ سنا رہی تھی جو مجرا ختم ہونے کے بعد سب سے پہلے پوری کمائی میں سے آدھا حصہ وصول کرتی تھیں اور پھر کوئی دوسری بات کرتی تھیں۔

"چمن بیگم...... آپ یہ ساری باتیں ہمیں کیوں سنا رہی ہیں؟" شیریں بائی نے قدرے تلخ لہجے میں کہا۔

"میں تو...... یونہی بتا رہی تھی...... کہ...... وہ...... بڑی...... دل والی ہیں۔" چمن بیگم کھسیا کر بولیں۔

"آپ کا جو بھی مطلب ہے وہ ہمیں سمجھ میں آ گیا ہے، مگر آپ ہم سے ایسی کوئی توقع مت رکھیں...... کہ ہم میں سے کوئی آپ کو اپنا حصہ دے گی......" شیریں بائی نے کہا۔

"میرا یہ مطلب ہرگز نہ تھا۔" چمن بیگم نے کہا۔

"چمن بیگم...... اگر آپ ہماری جگہ ہوتیں تو کیا کرتیں...... وہی...... جو کچھ ہم کر رہی ہیں...... یا...... وہ جو رینا بیگم نے کیا ہے...... اتنی ذلت کے بعد پیسہ بھی ہاتھ نہ آئے تو لعنت اس پیشے پر......" فضہ بائی نے تلخی سے کہا تو چمن بیگم منہ بنا کر وہاں سے چلی گئی۔

"رینا بیگم سے ایسی حماقت کی توقع نہیں تھی...... ایسی سخاوت اور شاہ خرچیاں کب تک چلیں گی...... انہیں شاید معلوم نہیں کہ جب کوئی انسان تر نوالہ بنتا ہے تو ہر کوئی اسے حلق سے اتارنے کی کوشش کرتا ہے...... احمق کہیں کی۔" شیریں بائی نے منہ بنا کر کہا۔

"ہمیں...... انہیں سمجھانا چاہیے...... ورنہ یہ بڑھیا سب کچھ ہڑپ کر جائے گی اور ہر طوائف کے پاس اپنے بڑھاپے کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور محفوظ ہونا چاہیے۔" فضہ بائی نے کہا۔

"ہاں...... موقع دیکھ کر ہم اسے بتانے کی کوشش کریں گے۔" شیریں بائی نے جواب دیا۔

☆☆☆

"رینا بیگم آج رات آپ کا مجرا ہے...... آپ کے رقص کی خوب دھوم مچی ہے...... دور دور سے مہمان آ رہے ہیں اور آج کچھ خاص قسم کے سرکاری افسر بھی آ رہے ہیں...... آپ تیار ہو جائیے...... میں نینا بائی اور فضہ بائی کو بھیجتی ہوں آپ کو تیار ہونے میں مدد دیں گی۔" چمن بیگم کہہ کر نکل گئیں اور اس کا دل ڈوبنے لگا...... پھر بہت سے مہمان...... جن کو دیکھ کر ہی اسے کراہت محسوس ہوتی تھی...... اور...... ابھی دو روز قبل تو اس نے مجرا کیا تھا اب پھر اتنی جلدی...... نگار بیگم تو پورے ہفتے میں صرف ایک بار مجرا کرتی تھیں اور وہ ہر دوسرے روز ابھی تو پاؤں اور بدن پہلے مجرے کی

تھکاوٹ سے چور تھے کہ اب دوسرا مجرا تیار تھا.....اسے الجھن سی ہونے لگی۔

سہ پہر کو ہی نینا بائی اور فضہ بائی اس کے کمرے میں پہنچ گئیں، دونوں جواں سال، خوبصورت اور فیشن ایبل طوائفیں تھیں جن کی بات چیت اور حرکات وسکنات سے ناز ونخرے اور ادائیں دوسروں کو ان کی طرف متوجہ کرتی تھیں۔ چمن بیگم نے فیروزی اور پنک کلر کا خوبصورت اور قیمتی لباس اس کے لئے منگوایا تھا۔ میچنگ زیورات اور میک اپ پھولوں کے ہار اور گجرے، دونوں نے اس کو تیار کیا۔ وہ ان کے سامنے خاموش بت بنی بیٹھی رہی، جسے وہ سجاتی سنوارتی رہیں۔ اس میں پہلے دن کی خوشی اور جوش وجذبہ نہیں تھا۔ اس کا دل بجھا ہوا اور آنکھیں نم تھیں.....ٹوٹے دل سے بار بار آہیں بلند ہوتی تھیں۔ فضہ بائی نے اس میں یہ واضح تبدیلی محسوس کی تھی۔ اس نے نینا بائی کو کسی کام سے اپنے کمرے میں بھیجا.....اور اس کی طرف بغور دیکھنے لگی۔

''کیا بات ہے.....رینا بیگم آپ کچھ اداس نظر آرہی ہیں۔'' فضہ بائی نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں.....یونہی'' اس نے آہ بھر کر جواب دیا اور خاموش ہوگئی۔

''سنا ہے.....آپ نے پہلے مجرے میں ہی بہت کمائی کی ہے۔'' فضہ بائی نے موقع دیکھ کر اس موضوع کو چھیڑنا چاہا، وہ خاموش رہی اور کوئی جواب نہ دیا، جیسے اس کی بات سنی نہ ہو۔

''آپ کو کتنا حصہ ملا ہے.....؟'' فضہ بائی نے پھر پوچھا۔

''کیسا حصہ.....؟'' اس نے چونک کر پوچھا۔

''آپ شاید جانتی نہیں کہ آپ کا کتنا حصہ بنتا تھا.....کم از کم وہ پانچ لاکھ تو آپ کو ملنے چاہئیں تھے.....جس کے بدلے میں.....؟'' اس نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا۔ ریبنا بیگم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''میرا مطلب ہے.....کہ جب آپ نے اس پیشے کو اپنا ہی لیا ہے تو پھر اس کمائی کو بھی جائز سمجھیں.....ایک طوائف اپنا سب کچھ لٹا کر بھی خالی ہاتھ اور خالی جیب رہے تو اتنی ذلت بھری زندگی گزارنے کا کیا فائدہ؟ جب اس کے پاس پیسہ ہی نہ ہو۔'' فضہ بائی نے کہا۔

''کیا پیسہ ہی سب کچھ ہوتا ہے؟ نادانستہ اس کے منہ سے نکلا۔

''ہاں.....ہم طوائفوں کی زندگی میں پیسہ ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ اس کے لئے ہی تو ہم کیا کیا عذاب اور ذلت سہتی ہیں.....آپ چمن بیگم کو نہیں جانتی.....بہت لالچی بڑھیا ہے۔ ان سے اپنا پورا حصہ گن کر لیں.....چاہے وہ غریبوں کو بانٹ دیں.....اور ان کو بھی کیوں دیں.....اپنے پاس رکھیں.....بڑھاپے میں آپ کے کام آئے گا.....اس وقت جب طوائف کا کوئی بھی ساتھ نہیں دیتا.....نہ یہ در و دیوار.....اور نہ ہی یہ گھنگھرو.....'' اس نے قریب پڑے گھنگھروؤں کو اٹھا کر دکھاتے ہوئے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

ریبنا بیگم گھنگھروؤں کو ہاتھ میں پکڑ کر دیکھنے لگی اور سسکنے لگی۔

''تمہیں پہننا کتنا تکلیف دہ ہے.....کاش مجھے معلوم ہوتا تمہاری جھنکار سے لوگوں کے دل جھوم اٹھتے ہیں مگر تم کو پہننے والی طوائف کس قدر اذیت سے گزرتی ہے شاید تم بھی کبھی نہ جان سکو۔ تمہاری چھن چھن سے میرا دل کتنا کٹتا ہے.....تمہارے شور کی آواز میرے کانوں کو پگھلے سیسے کی طرح تکلیف دیتی ہے اور تمہارے بوجھ سے میرے پاؤں لہولہان ہونے لگتے ہیں.....جب ایک طوائف گھنگھرو باندھ کر سرعام رقص کرتی ہے تو

اس کے دل پر کیا گزرتی ہے، کوئی نہیں جان سکتا......تم اس کے لئے ذلت اور رسوائی لاتے ہو......تمہاری جھنکار سن کر لوگ طوائف پر پیسہ لٹاتے ہیں......تم طوائف کی بربادی کا ذریعہ ہو" اور اس نے اٹھا کر گھنگھروز مین پر دے مارے اور سسکنے لگی......

"آپ جو کچھ چاہتی تھیں وہ سب کچھ آپ کو مل گیا ہے......اب آپ کو کسی کی ضرورت نہیں۔" دلبر کے الفاظ اس کے کانوں میں نشتر چبھونے لگے۔وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"رینا بیگم......تشریف لے آیئے......مہمان آپ کا رقص دیکھنے کو بے تاب ہو رہے ہیں۔" چمن بیگم نے اس کے کمرے میں آ کر مسکراتے ہوئے کہا تو اس نے جلدی سے اپنی نم آنکھوں کو صاف کیا اور اس کے ساتھ باہر جانے لگی۔

"یہ کیا......گھنگھروؤں کے بغیر؟ طوائف کا رقص گھنگھروؤں کے بغیر کیسے ممکن ہے......ان کی جھنکار سے تو طوائف کے پاؤں میں جنبش رہتی ہے یا سے تھکنے نہیں دیتے......مہمان ان کی جھنکار پر ہی تو فدا ہوتے ہیں......انہیں پہن لیجئے۔" چمن بیگم نے کہا تو اس نے خاموشی سے گھنگھرو اٹھائے انہیں ایک ٹک دیکھا اور بڑی مشکل سے انہیں پہنا......انہیں پہنتے ہوئے اس کا دل کتنا تڑپا......کتنا رویا......چمن بیگم کو بھی خبر نہ ہوئی......اس نے چپکے سے دو آنسو گرائے......اب یہی اس کا مقدر ہیں......اور مقدر سے فرار ممکن نہیں......وہ چھن چھن کرتی باہر نکل گئی......مگر اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔

☆☆☆

# (۱۶)

باسط علی ایک بس سے اترتا تو دوسری پر سوار ہوتا، وہ چلنے لگتی تو اس سے اتر جاتا۔ پھر بس اسٹینڈ پر کھڑے ہو کر اور بس کا انتظار کرتا۔ وہ آتی تو اس میں سوار ہو جاتا۔ وہ چلنے لگتی تو اس سے بھی اتر جاتا۔ ہر روز اس کا یہی معمول تھا۔ وہ ہر روز اپنے گاؤں جانے والی بس میں سوار ہوتا مگر خوف، وہم اور وسوسے اسے اتنا تنگ کرتے کہ وہ پھر اتر جاتا۔ اس میں جرأت اور ہمت پیدا نہیں ہو پا رہی تھی کہ وہ گاؤں جا کر اپنے ماں باپ اور بہنوں کا سامنا کرتا اور سب سے زیادہ اسے حشمت خان سے ڈر لگتا تھا۔ اگر اسے نازی کے بارے میں کچھ معلوم ہو گیا تو وہ اسے اور اس کے گھر والوں کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔

نازی نے جب سے اس سے طلاق لی تھی، وہ مخبوط الحواس ہو گیا تھا۔ اس کا اپنی ذات پر یقین اور اعتماد ختم ہو گیا تھا۔ وہ اس قدر ٹوٹ چکا تھا کہ ہر وقت اس کی آنکھیں نم رہتیں اور منہ سے سسکیاں و آہیں نکلتی رہتیں۔ اس کا دل بری طرح ٹوٹ چکا تھا۔ اسے رنج تھا تو یہی کہ نازی اس سے محبت کا دعویٰ تو کرتی تھی مگر اسے سمجھ نہیں پائی تھی۔ وہ اپنے حصے کی محبت کی طلب گار تھی مگر اس کے دل و دماغ میں جو جنگ اور کشمکش جاری تھی، اس تک نہیں پہنچ پائی تھی وہ اسے جھوٹا، مکار اور دھوکے باز سمجھتی تھی مگر سچ کیا تھا۔ نہ اس نے جاننے کی کوشش کی تھی اور نہ ہی ماننے کی۔ محبت کے اس کھیل میں اسے صرف خسارہ ملا تھا اور خسارہ بھی اتنا شدید تھا جس کا نعم البدل کوئی نہیں تھا۔ نازی کے الفاظ اس کے دماغ میں ہتھوڑے برساتے رہتے تھے اور شاہ زیب کی آنکھیں اسے شدید رنج و ملال اور پچھتاوے میں جتلا رکھتی تھیں۔ اس نے شاہ زیب سے اس کی محبت چھینی تھی اور قدرت نے اس سے محبت کے ساتھ ساتھ اس کا سکون بھی چھین لیا تھا۔ وہ ایسی آگ میں جتلا رہا تھا جس کی خبر نہ نازی کو ہو پائی تھی اور نہ ہی کسی اور کو۔ وہ خود بھی اس سے بھاگنا چاہتا تھا مگر فرار ممکن نہیں تھی۔ کیا اسے محبت کرنے کی سزا ملی تھی؟ یا...... محبت چھیننے کی......؟ اس نے کیا کیا تھا کہ اسے اتنے خسارے ملے تھے، اپنے گھر والوں سے جدا ہوئے کئی ماہ گزر گئے تھے ان سے ملنے کو اس کا دل تڑپتا تھا مگر وہ ان کو ملنے نہیں جا سکتا تھا۔ وہ کالج کی نوکری چھوڑ کر شہر چلا گیا تھا۔ تنگدستی اور افلاس نے اس کی زندگی عذاب میں ڈال رکھی تھی۔ کئی کئی دن اور راتیں بھوکا رہتا۔ نہ رہنے کو ٹھکانہ نہ سونے کو بستر...... نہ کھانے کو کھانا...... اور نہ ہی جسم ڈھانپنے کو کوئی کپڑا...... وہ ریلوے اسٹیشن پر سوتا اور قریبی مزار سے کھانا کھا لیتا۔ کوئی ضرورت مند دکھائی دیتا تو اس کا سامان اٹھا کر چند روپے وصول کر لیتا۔ زندگی اسے عجیب رنگ دکھا رہی تھی۔ اتفاق سے ایک نوجوان کی وساطت سے اسے ایک سکول میں نوکری مل گئی۔ اس سے اس نے کرائے پر ایک کمرہ لیا اور وہیں رہنے لگا مگر نہ شاہ زیب اس کے ذہن سے نکلتا اور نہ ہی نازی...... نہ ہی ماں باپ اور نہ ہی بہنیں۔

وہ ہر روز سکول سے چھٹی کے بعد بس اسٹینڈ پر کھڑا ہو جاتا اور اپنے گاؤں جانے کی کوشش کرتا مگر وہاں جانے کی ہمت نہ کر پاتا اور یونہی واپس لوٹ آتا۔ وہ ہر وقت پریشان، سوچوں میں گم اور بوکھلایا ہوا پھرتا۔ وہ قابل انسان تھا مگر اس کی بے انتہا سنجیدگی اور خاموشی سے سکول کی

انتظامیہ خوش نہیں تھی اور کئی بار اسے وارننگ مل چکی تھی۔ وہ بہت زیادہ پریشان رہتا تھا۔

نجانے قدرت نے اس سے کیسا انتقام لیا تھا کہ اس کو...... اس کی محبت دے کر اس سے چھین لی تھی۔ نازی اس سے بے انتہا محبت کرتی تھی۔ شاید ہی کوئی اور عورت اس سے زندگی میں اتنی محبت کر پائے گی۔ جتنی کہ نازی نے اس سے کی تھی۔ اور وہ بھی اس سے ایسی ہی محبت کرتا تھا کہ نازی کے علاوہ کسی اور عورت کا...... اس کی زندگی میں داخل ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہو سکتا تھا۔

نازی کے علاوہ اور کوئی نہیں اس کا دل صاف انکار کر دیتا۔

دونوں ایک دوسرے سے شدید محبت کرتے تھے مگر ایک دوسرے کی محبت کو نہیں پا سکے تھے۔ یہ کتنی عجیب اور ناممکن بات تھی۔

نازی اس سے نفرت کرنے لگی تھی۔ یہ اس سے بھی زیادہ عجیب بات تھی۔

اور وہ نازی سے شدید محبت کرنے کے باوجود بھی محبت کا اظہار نہیں کر پایا تھا۔ یہ کتنی حیران کن بات تھی اور نازی سے جدا ہونے کے بعد...... اسے طلاق دینے کے باوجود بھی وہ اس سے نفرت نہیں کر پایا بلکہ پہلے سے بھی زیادہ محبت کرنے لگا تھا اور یہ سب سے زیادہ حیران کن بات تھی۔ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا...... اور کیا...... ہو رہا تھا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ جتنا سلجھنے کی کوشش کرتا، اتنا ہی الجھتا چلا جاتا۔

یہ سب "کیوں" ہوا تھا......؟ وہ اکثر اس پر سوچتا تو پریشان ہو جاتا...... 'شاہ زیب!' اس کی حسرت بھری نمناک آنکھیں...... اسے بے وفا...... غدار اور بے اعتبار ہونے کا شدید احساس دلاتیں اور یہ احساس اس کے اندر اس قدر ندامت اور تاسف پیدا کرتا کہ وہ محبت کے لطیف جذبات کو بھول جاتا۔ اس کے اندر کوئی شے بری طرح ٹوٹنے لگتی۔ اسے یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی کسی تیز دھار آلے سے اس کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر رہا ہو۔ اس سے سانس لینا محال ہو جاتا۔ اس کا دکھ کوئی نہیں جانتا تھا۔ نازی بھی نہیں جان پائی تھی اور اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔

نجانے...... اسے...... کسی کی بددعا لگ گئی تھی...... کس کی؟ وہ گہری سوچ میں ڈوب جاتا۔

شاید...... شاہ زیب کی...... ہاں...... اس کے علاوہ اور کس کی لگ سکتی تھی۔ اسی کا تو سب کچھ۔ اس نے چھینا تھا اور شاہ زیب نے اس سے شکوہ تک نہیں کیا تھا۔ کوئی الزام نہیں دیا...... ڈاکو اس کا گھر لوٹنے آیا اور اس نے خود ہی سارے دروازے کھول دیئے۔ ڈاکو لوٹ کر چلا گیا اور وہ دکھ اور حسرت بھری نگاہوں سے اسے لوٹ مار کے سامان کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھتا رہ گیا۔ وہ کس قدر حوصلہ مند اور اعلیٰ ظرف انسان تھا۔ اور وہ کتنا کم ظرف، کمینہ اور حقیر...... نازی کے بلانے پر وہاں چلا گیا۔ شاہ زیب جیسے وفادار، مخلص دوست کے بھیس میں اسے لوٹنے کے منصوبے بناتا رہا...... اور پھر لوٹ کر چلا آیا، کاش...... وہ خالی ہاتھ لوٹ آتا۔

کاش...... وہ وہاں نہ جاتا۔

کاش......! وہ یہ سب نہ کرتا۔ تو...... آج اس کا اندر یوں مضطرب اور بے قرار نہ ہوتا۔ اس نے نازی اور شاہ زیب دونوں کو دکھ دیا تھا۔ ایک کی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے اور ایک کی آنکھوں میں حسرت۔ اب اس کی اپنی آنکھوں میں بھی ہر وقت سرخی اور آنسو ٹھہرے رہتے جن سے فرار ممکن نہیں تھی۔

☆

''نازی..... آپ، کب تک یوں اداس اور غمگین رہیں گی۔ ایک شخص کے جانے سے زندگی ختم تو نہیں ہو جاتی ''۔ تیمور نے دس کنال پر محیط کوٹھی کے وسیع و عریض لان میں خوبصورت سیمنٹ کے بنے پرپیچ راستوں پر نازی کے ساتھ واک کرتے ہوئے کہا۔

کاش..... یہ زندگی ختم ہو جاتی'' نازی نے مایوسی سے جواب دیا۔

کیا..... آپ اس شخص سے اتنی محبت کرتی تھیں کہ اسے اپنی زندگی سے بھی اہم سمجھتی تھیں؟ تیمور نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں.....''نازی نے آہستہ آواز میں جواب دیا اور اس کی آواز میں اس کے آنسوؤں کی آمیزش سنائی دینے لگی۔

یہ کیسے ممکن ہے..... کہ جس سے اس قدر شدید محبت کی جائے اور پھر اسے چھوڑ دیا جائے۔ آپ بتاتی ہیں کہ آپ نے طلاق بھی خود ہی لی۔

پھر ایسا کیوں کیا؟

تیمور نے حیرانگی سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''سب کچھ ممکن ہے، محبت بھی..... اور..... نفرت بھی۔''نازی نے آہ بھر کر جواب دیا۔

کیا..... آپ..... اب بھی اس شخص سے محبت کرتی ہیں؟ تیمور نے پوچھا۔

'معلوم نہیں..... مگر میں اس سے نفرت بھی نہیں کر سکی'

نازی نے ڈوبتے نارنجی سورج کی جانب نم آنکھوں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''آپ..... بہت عجیب انسان ہیں..... اور.....''تیمور کچھ کہتے ہوئے رکا اور اس کے خوبصورت چہرے کی طرف بغور دیکھنے لگا۔ اور.....

کیا.....؟ نازی نے چونک کر پوچھا۔

''بہت..... خوبصورت.....''تیمور نے مسکرا کر جواب دیا۔

''سب کچھ بے معنی ہے.....''نازی نے افسردگی سے جواب دیا۔

کیوں.....؟

''میری خوبصورتی..... میرا وجود..... میری محبت اسے کبھی نظر نہیں آئی''نازی نے دکھی لہجے میں جواب دیا۔

''یہ..... کیسے ہو سکتا ہے۔ کیا وہ شخص اندھا تھا۔ جسے آپ دکھائی نہیں دیں۔ آپ تو اندھیرے میں بھی بیٹھی دکھائی دیتی ہیں''تیمور شوخ لہجے میں بولا۔

شاید اس کی آنکھوں میں کوئی اور سما گیا تھا؟ نازی نے کہا۔

'کیا..... کوئی اور..... عورت؟ تیمور نے حیرت سے پوچھا۔

نہیں.....

'پھر..... کون.....؟ تیمور نے چونک کر پوچھا'

تھا.....کوئی......؟ نازی نے آسمان کی جانب بھرپور نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا جہاں پرندے ادھر اُدھر پھر رہے تھے شاید اپنے گھونسلوں کی جانب لوٹ رہے تھے۔

''مجھے تو وہ شخص پاگل لگتا ہے جس نے آپ کو چھوڑ دیا......'' تیمور نے کہا۔

''شاید......میں پاگل تھی'' نازی نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''کیا آپ اپنے فیصلے پر پچھتا رہی ہیں؟'' تیمور نے پوچھا۔

''معلوم نہیں ......'' نازی نے جواب دیا۔

''پھر......اتنی افسردہ کیوں رہتی ہیں؟''

''یقین نہیں آتا......کہ یہ سب کیسے ہو گیا......'' نازی نے تیمور کے ساتھ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے کہا۔

''جو......ہونا تھا......وہ......ہو چکا......ممکن ہے......زندگی پھر آپ پر خوشیوں کے دروازے کھول دے'' تیمور نے کہا۔

''مجھے......اب......کوئی امید نہیں رہی اور نہ ہی میں اس کی منتظر ہوں'' نازی نے جواب دیا۔

''ہر......مایوس انسان یہی کہتا ہے......مگر جب زندگی خود اسے رنگین راستوں پر ڈالتی ہے تو انسان کی سوچ بدل جاتی ہے'' تیمور نے مسکرا کر کہا۔

نازی اس کی بات سن کر خاموش ہو گئی اور دونوں آہستہ آہستہ واک کرنے لگے۔

تیمور بہت محبت، چاہت اور محنت سے اسے آہستہ آہستہ زندگی کی جانب لا رہا تھا۔ وہ ثروت کا جڑواں بھائی تھا۔ ثروت اپنے والد کی وفات کے بعد ان کی گارمنٹس کی فیکٹری بہت کامیابی سے چلا رہی تھی اور وہ بہت زیادہ معروف رہتی......تیمور کو بزنس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ کمپیوٹر انجینئر تھا۔ زیادہ تر امریکہ میں رہا تھا اور نازی کے آنے سے چند روز پہلے وہ واپس آیا تھا۔ اتنے بڑے محل نما گھر میں ثروت، اس کی ماں، تیمور اور چند ملازمین رہتے تھے۔ ثروت......نازی کی کالج فرینڈ تھی اور اس پر بہت اعتماد کرتی تھی۔ باسط علی سے شادی کرانے میں ثروت نے اس کی بہت مدد کی تھی اور باسط علی کو چھوڑنے کے بعد بھی اسے ثروت کے علاوہ کوئی اور اپنا ہمدرد نظر نہ آیا جس کے پاس وہ دوبارہ جاتی۔ وہ گاؤں میں اپنی حویلی میں نہیں جانا چاہتی تھی کیونکہ اس کے پاس ان کے سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا اور ممکن تھا کہ حشمت خان اسے گولی سے ہی اڑا دیتا۔ ثروت نے اس کا بہت خیال رکھا، اس کی ہر طرح سے دلجوئی کی اور سب سے زیادہ تیمور نے......اسے نازی کے حالات سن کر بہت دکھ ہوا تھا۔ وہ بہت سادہ مزاج اور پرخلوص انسان تھا۔ اس میں عام لڑکوں جیسی مکاریاں اور چالاکیاں نہیں تھیں۔ وہ ہر بات بہت صاف گوئی سے دوستانہ انداز میں کرتا......بعض اوقات نازی کو وہ......ثروت سے بھی زیادہ پرخلوص اور ہمدرد لگتا۔ اس لئے وہ اس کے ساتھ ہر بات کھل کر کرتی تھی۔ تیمور نے اس کا ہاسپٹل میں بھی بہت خیال رکھا تھا اور ہاسپٹل سے گھر واپس آنے پر بھی وہ اس کی خوراک، واک اور میڈیسنز کے بارے میں بہت محتاط رہتا اس کی چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھتا۔ اس کی بھرپور دلجوئی کرتا، اسے محبت بھرے......سلجھے ہوئے نرم لہجے میں بہت کچھ سمجھاتا وہ کبھی خاموشی سے اس کی باتیں سنتی

رہتی تو کبھی اس کی باتوں کو نظر انداز کر دیتی۔

"نازی...... کیوں نا...... آئس کریم کھانے چلیں" تیمور نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں...... میرا کہیں بھی جانے کو دل نہیں چاہتا" اس نے جواب دیا۔

"آپ کے دل کے لئے کیا کیا جائے کہ وہ پھر کچھ چاہنے لگے۔ میرا مطلب ہے...... وہ دوبارہ زندہ ہو جائے" تیمور نے کہا۔

"شاید...... اب یہ کبھی نہیں ہو سکے گا"۔

"چیلنج مت کریں...... میں آپ کے دل کو پھر سے زندہ کر سکتا ہوں" تیمور نے مسکرا کر کہا تو نازی نے چونک کر اس کی جانب حیرت سے دیکھا۔

"اپنی...... محبت سے" وہ سرگوشی کے انداز میں بولا۔

"خدا کے لئے...... محبت کا نام مت لو...... مت لو" وہ ایک دم چلانے لگی اور چلاتے ہوئے بھاگتی ہوئی تیز تیز سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی اور بیڈ پر گرتے ہی سسکنے لگی۔ تیمور اس کے پیچھے بھاگتا ہوا آیا اور دروازہ کھول کر اس کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔

"نازی...... میرا یقین کریں...... میں آپ سے بہت محبت کرنے لگا ہوں......" تیمور نے محبت سے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

"خدا کے لئے...... خدا کے لئے...... اب محبت کا نام مت لینا...... میں پہلے ہی بہت ٹوٹ چکی ہوں۔ اب مجھ میں اور ہمت نہیں۔ نازی نے اس کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔

"تیمور...... آپ کو ٹوٹنے نہیں دے گا......" تیمور نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ اس کی آنکھوں میں چمک اور امید تھی۔

"نہیں...... اب میں کسی کو آزمانا نہیں چاہتی...... میں جیسی ہوں ٹھیک ہوں...... آپ یہاں سے چلے جائیں" نازی نے روتے ہوئے کہا۔

"کیسے چلا جاؤں...... آپ کو تنہا چھوڑ کر...... اب ہم ہر راستے پر اکٹھے چلیں گے" تیمور نے پر عزم لہجے میں کہا۔

"میری آنکھوں نے خواب دیکھنا چھوڑ دیئے ہیں" وہ بولی۔

"اور میں آپ کی آنکھوں کو خواب بھی دکھاؤں گا اور ان خوابوں میں حقیقت کا رنگ بھی بھروں گا" تیمور نے جواب دیا۔

"اتنے بڑے دعوے مت کریں...... میں نے اپنے دعوؤں کو خود ذرہ ذرہ خاک ہوتے دیکھا ہے...... تیمور...... آپ کے اور میرے راستے جدا جدا ہیں...... میں آپ سے کبھی نہیں مل پاؤں گی اور نہ ہی ملنا چاہتی ہوں۔ میں کل ہی آپ کے گھر سے چلی جاؤں گی" نازی نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے پر عزم لہجے میں کہا۔

"اگر آپ میری لاش پر سے گزر کر جا سکتی ہیں تو ضرور چلی جایئے گا......" تیمور نے پر عزم لہجے میں کہا تو نازی حیرت سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔

"آپ...... کیوں مجھ پر میری زندگی تنگ کر رہے ہیں؟"

"نہیں...... میں تو آپ کو زندگی کی جانب لانا چاہتا ہوں۔ آپ کو پر اعتماد زندگی گزارتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں...... کیونکہ آپ زندگی

کے بارے میں بہت مایوس ہو چکی ہیں اور مایوس انسان کے اندر زندگی کی خواہش پیدا کرنا بہت بڑا کام ہے" تیمور نے جواب دیا۔

"کیا آپ مجھ پر ترس کھا رہے ہیں؟" نازی نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں......شاید......اسے آپ ہمدردی، ترس، رحم، محبت اور پیار بھی کہہ سکتی ہیں......اور یہ سب کچھ آپ کے لئے میرے دل میں ہے"۔ تیمور نے جواب دیا۔

"خدا کے لئے مجھے اتنا ذلیل مت کریں" نازی نے روتے ہوئے کہا۔

"ذلیل......؟ کون آپ کو ذلیل کر رہا ہے......کیا انسان......انسانوں سے محبت، پیار اور ہمدردی نہیں کرتے۔ کیا ایک دوسرے پر ترس کھانا بری بات ہے؟ آپ مجھ پر بھی تو ترس کھا سکتی ہیں...... اور میں کبھی بھی برا نہیں مناؤں گا" تیمور نے صاف گوئی سے کہا تو نازی حیرت سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔

"میں بہت پریشان ہوں......آپ یہاں سے چلے جایئے"۔ نازی نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تو وہ خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا اور نازی حیرت سے اسے جاتے ہوئے دیکھنے لگی۔

زندگی کیسے رخ بدل رہی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ شاہ زیب...... باسط علی اور اب تیمور...... اُف خدایا۔ یہ سب میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ میں نے تو صرف ایک شخص کی تمنا کی تھی اور اتنے بہت سے لوگ کہاں سے آ گئے۔ باسط علی کی خاطر میں نے شاہ زیب کو چھوڑا اور اب تیمور...... مجھے باسط علی کے بدلے میں مل رہا ہے...... یہ کیسا گورکھ دھندا ہے......میں......یہ نہیں چاہتی......میں محبت کا کھیل دوبارہ نہیں کھیل سکتی......اب مجھے اس سے بہت ڈر لگتا ہے......بہت زیادہ خوف آتا ہے۔

یا اللہ! مجھے محبت کے شر سے بچا......وہ سسکنے لگی اور دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کر بلند آواز سے رونے لگی۔

☆

ماسٹر باسط علی سکول کی گراؤنڈ میں بچوں کی کلاس کو پڑھا رہے تھے۔ آج موسم بہت خوشگوار تھا۔ سنہری، چمکیلی دھوپ نے بہت دنوں سے چھائی دھند کو نگل لیا تھا اور ہر طرف پھیلی دھندلاہٹ چھٹ گئی تھی اور نکھرے نکھرے صاف شفاف نیلے آسمان تلے ہر چیز واضح اور صاف دکھائی دے رہی تھی۔

ماسٹر باسط علی نے کتاب سے سبق پڑھانا شروع کیا۔

"اللہ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس کی تمام مخلوق سے محبت کرتے ہیں......اور اپنے جیسے انسانوں کی عزت کرتے ہیں......انہیں دھوکا نہیں دیتے......اور......انہیں کوئی تکلیف نہیں دیتے۔" ماسٹر باسط علی نے جیسے ہی الفاظ ادا کیے ان کا دل کسی بھاری بوجھ تلے دبنے لگا......اور اس بوجھ کی وجہ سے اضطراب ان کے اندر پھیلنے لگا۔

"ماسٹر صاحب......اگلی لائن بھی تو پڑھائیں" ایک ہونہار طالب علم نے ماسٹر صاحب کو اچانک خاموش دیکھ کر پوچھا۔

"ہاں......وہ......" انہوں نے کتاب کی جانب دیکھا مگر انہیں الفاظ دکھائی نہ دیئے۔ ان کی آنکھوں میں اچانک دھند سی بھر گئی تھی......نمی

سی ابھرنے لگی تھی۔

''آج...... اتنا ہی کافی ہے۔تم لوگ اسی سبق کو دہراؤ، ماسٹر باسط علی نے کہا اور بچے اسی سبق کو دہرانے لگے مگر ماسٹر باسط علی کا یہ فیصلہ اپنے لیے ہی وبال جان بن گیا۔ بچوں کا ان لائنوں کو بلند آواز میں بار بار دہرانا اور ان الفاظ کی بازگشت ان کے سر میں ہتھوڑوں کی طرح برسنے لگی...... وہ گھبرانے لگے...... اور ان کا چہرہ پسینے سے تر ہونے لگا...... وہ ان الفاظ کی بازگشت سے فرار چاہتے تھے ان کا دل انتہائی بے قراری سے بے قابو ہونے لگا۔ اس کا مطلب ہے ''جو انسان دوسروں کو دھوکا دیتا ہے اللہ اس سے محبت نہیں کرتا''۔ ماسٹر باسط علی نے سوچا اور کھلے آسمان کی طرف بغور دیکھنے لگے۔ ان کی آنکھوں میں نمی سی تیرنے لگی۔

''یا اللہ! میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا تھا...... پھر...... نجانے کیوں مجھ سے یہ سب ہو گیا...... شاید میں نے کتنا بڑا گناہ کیا ہے جس کی سزا مجھے مل رہی ہے''۔ ماسٹر باسط علی نے آہ بھر کر سوچا اور ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگیں۔ چھٹی کی گھنٹی بجی اور سب بچے اپنی کتابیں اور بستے اٹھا کر بھاگ کھڑے ہوئے اور ماسٹر باسط علی کرسی پر بیٹھے مسلسل آسمان کو دیکھتے رہے۔

''ماسٹر جی...... چھٹی ہو گئی ہے، ایک چھوٹا لڑکا ان کے قریب آ کر بہت معصومیت سے بولا تو ماسٹر صاحب ہڑبڑا گئے۔'' ہاں...... ہاں...... میں جا رہا ہوں'' ماسٹر باسط علی نے بوکھلا کر جواب دیا۔

اور وہاں سے اٹھ کر سکول سے باہر چلے گئے۔ ان کی طبیعت بہت بوجھل ہو رہی تھی۔ ان کا دل چاہ رہا تھا کہ کوئی ایسا خاموش اور پرسکون گوشہ ملے جہاں وہ چند ساعتوں کے لیے بیٹھ سکیں۔

ہر طرف لوگوں کی چہل پہل تھی۔ خوشگوار موسم کی وجہ سے لوگوں کی اکثریت گھروں سے باہر آ گئی تھی اور اپنے اپنے کام نمٹانے میں مصروف تھی۔ آبادی سے کافی دور پہاڑوں کے درمیان ایک آبشار بہتی تھی۔ وہ علاقہ بہت خوبصورت سرسبز وشاداب اور پرسکون تھا۔ نادانستہ ماسٹر باسط علی کے قدم اس آبشار کی جانب اٹھ گئے اور وہ آبشار کے قریب جا کر بیٹھ گئے۔ آبشار سے تھوڑا تھوڑا پانی نکل رہا تھا۔ ماسٹر باسط علی اس کے قریب پتھروں پر بیٹھ گئے اور آسمان کی طرف بغور دیکھنے لگے۔

''یا اللہ! میرے اندر کی بے چینی کو کم کر دے۔ نجانے کیوں میرا دل اتنا پریشان رہتا ہے؟'' ماسٹر باسط علی نے دل میں سوچا۔

''اس سے جو...... تو...... پوچھ رہا ہے...... نا...... اس کا جواب بھی وہی ہے...... جو...... میں تجھ سے کہتا ہوں...... کاہے کو وقت برباد کر رہا ہے...... جا...... ایک بار اس سے مل...... سائیں مٹھا ایک دم اس کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا اور اسے بتانے لگا۔ ماسٹر باسط علی ایک دم چونک گئے اور بوکھلا کر انہیں دیکھنے لگے۔ ان کے چہرے کی رنگت بدل گئی یوں جیسے کسی نے اچانک ان کی چوری پکڑ لی ہو۔''

''ماسٹر...... گھبرا کیوں رہے ہو؟ ارے...... میں سب جانتا ہوں...... جو کچھ تیرے دل میں ہوتا رہتا ہے۔ اگر تو بولے...... تو...... سب بتا دوں'' سائیں نے قہقہہ لگا کر سرگوشی کے انداز میں کہا۔

''آ...... آپ کو کیسے پتہ چل گیا؟'' ماسٹر باسط علی نے حیرت سے پوچھا۔

''کیا...... پوچھ رہے ہو۔ کیسے...... کیسے......؟ پتہ چل جاتا ہے...... ویسے ہی جیسے آنکھ دیکھ کر بتا دیتی ہے کہ سامنے کیا ہے؟'' سائیں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

''آنکھ......؟'' ماسٹر باسط علی نے چونک کر پوچھا۔

''ارے...... ماسٹر جی ہے تو...... تو...... ماسٹر مگر بالکل ان پڑھ...... کاہے کو کتابیں پڑھ پڑھ کر ڈھیر لگایا، بس ایک کلمہ ہی پڑھ لیتا تو تیرا کام ہو جاتا''۔

''کلمہ...... وہ تو میں روز ہی پڑھتا ہوں'' ماسٹر باسط علی نے آہ بھر کر کہا۔

''صرف پڑھتے ہی ہو...... کیا اس طرح بھی پڑھا ہے؟''

اندر کلماں کل کل کردا ، عشق سکھایا کلماں ہُو
چودہ طبق ئیں کلمے اندر ، چھوڑ کتاباں کلماں ہُو
کانے کپ کپ قلم بناون، لکھ نہ سکن کلماں ہُو
کلماں مینوں پڑھایا باہُو، ذرا نہ رہیاں المّاں ہُو

''ماسٹر...... ایسا کلمہ کبھی پڑھا ہے...... یا کسی نے تجھے پڑھایا ہے؟'' سائیں نے پوچھا تو ماسٹر باسط علی گھبرا کر اس کی جانب دیکھنے لگے۔

''ماسٹر...... جب دل کی آنکھ کھلتی ہے نا تو سب کچھ صاف نظر آنے لگتا ہے...... چاہے وہ شے سات پردوں میں چھپی ہو...... تو ہی بتا...... بھلا کیا مجھے تیرا دل نظر نہیں آتا۔ تیرے دل کے اندر کیا کیا جنگ ہو رہی ہے مجھے سب معلوم ہے...... اسی لئے تو کہتا ہوں...... جا...... اس کے پاس چلا جا...... پھر...... دیکھنا...... تجھے اس کے پاس سے کیا کچھ ملے گا''۔ سائیں نے مسکرا کر کہا۔

''سائیں جی...... آپ ہی بتاؤ...... کیا میں نے اس کے ساتھ کوئی دھوکہ کیا ہے......؟ میں نے کیا گناہ کیا ہے؟ جس کی اتنی بڑی سزا مجھے مل رہی ہے۔ نہ دن کو چین آتا ہے اور نہ رات کو نیند...... پچھلے کئی سالوں سے میں رات بھر نہیں سویا...... میرا دل ہر وقت پریشان رہتا ہے...... میں کیا کروں......؟ وہ سسکنے لگا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔''

''ماسٹر...... رب کے راز، رب ہی جانتا ہے...... اور...... رب بھی یہی چاہتا ہے کہ تو اس کے پاس چلا جا...... تو...... نہیں جانتا...... کہ وہ...... کون ہے......؟'' سائیں نے آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں...... اسے جا کر کیا کہوں......؟ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر وہ مجھ سے روٹھ گیا...... تو پھر...... کہاں جاؤں گا؟'' ماسٹر باسط علی نے آہ بھر کر کہا۔

''ارے...... ماسٹر...... کبھی دنیا کو دل کی آنکھ سے بھی دیکھنے کی کوشش کر...... ان آنکھوں میں کیا رکھا ہے......؟ یہ تجھے کیا دکھائیں گی...... دیکھنا ہے...... تو...... اس آنکھ سے دیکھ...... پھر...... تو...... خود ہی حیران رہ جائے گا۔ جو کچھ وہ تجھے دکھائے گی''۔ سائیں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے

آسمان کی وسعتوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"سائیں......جی......میرے لئے دعا کریں......کہ......" ماسٹر باسط علی نے افسردہ لہجے میں کہا۔

"نہ......بابا......دعا......تو اللہ والے لوگ کرتے ہیں......ہم فقیر تو بھیک مانگنے والے لوگ ہیں......رذیل......کمینے......ہماری دعائیں کہاں پوری ہوتی ہیں......جا......اس کے پاس......تیری سب دعائیں پوری ہو جائیں گی"۔ سائیں نے اپنی کشکول اٹھا کر کلام پڑھنا شروع کر دیا۔

اول حمد، ثنا الٰہی، جو مالک ہر ہر دا
اس دا نام چتارن والا، ہر میدان نہ ہردا
رحمت دا مینہ پا خدایا، باغ سُکا کر ہریا
بوٹا آس، امید میری دا ، کر دے میوے بھریا
رب جبار قہار سنیدا، خوف، بھلا اس بابوں
ہے ستار، غفار ہمیشہ، رحم، امید جنابوں

(میاں محمد بخش)

اور وہ ہنستا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ ماسٹر باسط علی حیرت سے اسے جاتے ہوئے دیکھنے لگے۔

☆

بہرام خان...... اناج سنبھال لو...... بہت تیز آندھی آنے والی ہے" شاہ زیب نے صبح سویرے بہرام خان کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

"اوہ...... گٹھے تو سارے کھیتوں میں پڑے ہیں...... میں ابھی جاتا ہوں" بہرام خان گھبرا کر اٹھا۔

"اور...... سنو...... خرم خان کو آج سکول مت جانے دینا" شاہ زیب نے کہا تو بہرام خان نے رک کر اسے دیکھا۔

"کیوں...... کیا...... کوئی......؟" بہرام خان نے پریشان ہو کر پوچھا۔

ہاں...... کہہ دیا نا، شاہ زیب نے اس کا جملہ کاٹتے ہوئے جواب دیا تو بہرام خان بہت کچھ سمجھ گیا اور جلدی سے حویلی کے گیٹ پر پہنچا جہاں ڈرائیور کھڑا گاڑی صاف کر رہا تھا۔

"آج...... خرم خان سکول نہیں جائے گا" بہرام خان نے ڈرائیور سے کہا۔

"کیوں...... خان جی......" ڈرائیور نے حیرت سے پوچھا۔

"کہہ دیا نا......" بہرام خان نے کہا اور جلدی سے اندر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ شہر بانو...... خرم خان کو سکول کے لئے تیار کر رہی تھی۔

"شہر بانو...... آج خرم خان کو سکول نہیں بھیجنا" بہرام خان نے بیوی سے کہا۔

"کیوں...... آج تو اس کا پہلا پرچہ ہے" شہر بانو نے حیرت سے پوچھا۔

"کہا...... نا......" بہرام خان نے پرزور الفاظ میں کہا۔

"مگر...... کیوں...... کوئی وجہ بھی تو ہونی چاہیے...... بچے کے امتحان شروع ہو رہے ہیں...... اور آپ اسے سکول جانے سے روک رہے ہیں" شہر بانو نے خفگی سے کہا۔

"شہر بانو...... میں نے ایک بار کہہ دیا...... نا...... کہ خرم خان سکول نہیں جائے گا تو وہ نہیں جائے گا، بحث مت کرو"۔ بہرام خان غصے سے بولا۔

"کوئی...... وجہ بھی تو ہونی چاہیے اس کے سالانہ امتحان ہیں، پرچہ نہ دیا تو فیل ہو جائے گا" شہر بانو نے غصے سے کہا۔

"ہو...... جائے...... فیل...... مگر میں اسے سکول نہیں جانے دوں گا" بہرام خان انتہائی غصے سے چلاتے ہوئے بولا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ اور ڈرائیور کے ساتھ ڈیرے پر چلا گیا۔ شہر بانو کو بھی انتہائی غصہ آ گیا...... اور اس نے زبردستی خرم خان کو تیار کر کے ڈرائیور کے ساتھ بھیج دیا۔ ڈرائیور پریشان ہو گیا اور خرم خان کو ڈیرے پر بہرام خان کے پاس لے گیا۔ اس نے خرم خان کو ڈیرے پر ہی روک لیا اور اسے سکول نہ جانے دیا۔ اور خود گندم کو گوداموں میں بھیجنے لگا...... ابھی وہ کام سے فارغ ہوا تھا کہ انتہائی تیز آندھی چلنے لگی۔ گرد و غبار کا طوفان اٹھنے لگا۔ کئی درخت جڑوں سے اکھڑ گئے۔ بجلی کے کھمبے گر گئے۔ پورا گھنٹہ انتہائی زوردار آندھی چلتی رہی۔ اس نے سارا کچھ درہم برہم کر دیا، کھڑی فصلیں تباہ ہو گئیں۔ اس کے بعد انتہائی تیز بارش شروع ہو گئی۔ تمام مزارع اور کارندے بہرام خان کو سراہنے لگے۔

"خان جی...... آپ نے بڑا اچھا کیا۔ اناج سنبھال لیا ورنہ بہت زیادہ نقصان جاتا" سب مزارع بہرام خان کی تعریفیں کرنے لگے اور وہ

خاموشی سے سنتا رہا اور خدا کا شکر ادا کرتا رہا۔

وہ شاہ زیب کا کوئی حکم نہیں ٹالتا تھا کیونکہ اس نے اس بات کا بہت اچھی طرح مشاہدہ کر لیا تھا کہ جو کچھ وہ اپنی باطنی آنکھوں سے دیکھ کر بتاتا ہے اس میں کبھی جھوٹ نہیں ہوتا اور وہ اس کا بہت بڑا عقیدت مند ہو گیا تھا۔ اس کی ہر بات کو بہت توجہ سے سنتا اور حکم بجالاتا۔

شہر بانو بہت پریشانی سے ساری حویلی کا چکر لگا رہی تھی۔ کبھی کسی ملازم کو بلاتی کبھی کسی کو......

"بیٹی کیا بات ہے......؟ کیوں پریشان ہو رہی ہو؟" اچانک زیتون بانو نے اپنے کمرے میں سے اسے یوں چکر لگاتے دیکھا اور باہر آ کر پوچھا۔

"خالہ جان...... خرم خان کے سکول کی چھت گر گئی ہے اور بہت بچے اس کے نیچے آ گئے ہیں۔ خرم خان کا کچھ پتہ نہیں چل رہا...... مجھے بہرام خان نے صبح بہت روکا تھا کہ اسے سکول نہ بھیجوں مگر میں نے زبردستی بھیج دیا۔ میرا دل بہت گھبرا رہا ہے" شہر بانو بلند آواز میں رونا شروع ہو گئی۔

"اللہ...... خیر کرے گا...... تم فکر نہ کرو...... میں ابھی شہباز کو سکول بھیجتی ہوں" زیتون بانو نے ڈرائیور کے بارے میں کہا۔

"شہباز...... بھی...... نجانے کہاں چلا گیا ہے۔ اس سے رابطہ نہیں ہو رہا" شہر بانو نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"کیا ہوا......؟" شاہ زیب اپنی لاٹھی کے سہارے چلتا ہوا ادھر آیا اور شہر بانو کے رونے کی آواز سن کر بولا۔

"خرم...... خان......" وہ پھر سسکنے لگی۔

"وہ بالکل ٹھیک ہے...... آپ پریشان مت ہوں" شاہ زیب نے پرسکون لہجے میں کہا تو زیتون بانو اور شہر بانو حیرانگی سے اس کی جانب دیکھنے لگیں۔

"آپ...... کو...... کس نے بتایا ہے......؟ شہر بانو نے حیرت سے پوچھا۔

"میں نے کہا...... نا...... آپ پریشان مت ہوں...... وہ ٹھیک ہے" وہ کہہ کر پھر اپنے کمرے میں چلا گیا اور دونوں حیرت سے اس کی جانب دیکھنے لگیں۔

تھوڑی دیر بعد خرم خان ڈرائیور کے ساتھ گھر آ گیا تو شہر بانو نے خدا کا شکر ادا کیا۔ وہ خرم خان سے سکول کی چھت اور بچوں کے بارے میں سوال کرنے لگی۔

"میں تو بابا کے پاس ڈیرے پر تھا...... بابا نے مجھے سکول جانے ہی نہیں دیا تھا" خرم خان نے مسکرا کر جواب دیا تو شہر بانو حیرانگی سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔

بہرام خان شام کو گھر آیا تو اسے بھی سکول کے بارے میں جان کر بہت حیرت ہوئی۔

"شاہ زیب بھائی...... آج تو اللہ کا بڑا کرم ہو گیا۔ اناج بھی بچ گیا اور ہمارا بچہ بھی...... اگر اناج تباہ ہو جاتا تو ہمارا بہت زیادہ نقصان ہو جاتا اور اگر خرم خان کو کچھ ہو جاتا تو شاید ہم میاں بیوی جیتے جی ہی مر جاتے" بہرام خان نے نم آنکھوں سے کہا۔

''بہرام خان...... یہ اللہ کی نظر کرم ہے، جب وہ کسی کو بچانا چاہتا ہے تو سمندر کی گہرائیوں اور زمین کی تہوں سے بچا لاتا ہے''۔ شاہ زیب نے مسکرا کر جواب دیا۔

''شاہ زیب...... بھائی...... آپ کو اس بات کی خبر کیسے ہوگئی؟'' بہرام خان نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔

''جب وہ کچھ بتانا چاہتا ہے تو اس کے پاس ہزاروں ذریعے ہیں......'' شاہ زیب نے مسکرا کر جواب دیا۔

''آپ...... کیا کرتے ہیں کہ اللہ آپ کو ایسی باتوں کی خبر دے دیتا ہے...... کیا خوابوں کے ذریعے...... یا پھر؟'' بہرام خان نے متجسس ہو کر پوچھا۔

''بہرام خان...... راز چھپے رہیں...... تو...... راز رہتے ہیں۔ ظاہر کر دیں تو وہ باتیں بن جاتی ہیں اور ایسی باتیں کسی کی سمجھ میں آتی ہیں اور کسی کی نہیں...... اور جب سمجھ میں نہیں آتیں تو لوگ مشکوک ہو کر پریشان ہو جاتے ہیں۔ اس لئے راز کو راز ہی رہنے دو'' شاہ زیب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اللہ کا آپ پر بہت کرم ہے'' بہرام خان نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... اس کے کرم کی کوئی حد نہیں'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

''میں نے اس سے پہلے کبھی ایسے معجزے نہیں دیکھے'' بہرام خان نے حیرت سے کہا۔

''بہرام خان...... انسان...... خود اس دنیا کا بہت بڑا معجزہ ہے...... مگر ہم اپنے آپ کو ہی نہیں جان پاتے...... اور اپنے اردگرد کے معجزوں کی میں رہتے ہیں'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

''ہاں...... آپ ٹھیک کہتے ہیں......'' بہرام خان نے جواب دیا اور خاموش ہوگیا۔

شہربانو...... خوش ہونے کے ساتھ ساتھ بہت حیران بھی تھی۔ خرم خان کے ساتھ جو واقعہ رونما ہوا تھا۔ وہ کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ خرم خان کے واپس آنے کے بعد وہ مسلسل اس کے بارے میں سوچتی رہتی۔ رات کو بہرام خان کمرے میں آیا تو وہ استفہامیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔

''کیا بات ہے......؟ ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟'' بہرام خان نے اس کی آنکھوں میں استفہام دیکھ کر پوچھا۔

''مجھے یوں لگتا ہے...... جیسے آپ کو سکول کی چھت گرنے کی پہلے ہی خبر ہوگئی تھی...... اسی لئے آپ خرم خان کو سکول جانے نہیں دے رہے تھے'' شہربانو نے حیرت سے پوچھا۔

''اب...... کیا...... مسئلہ ہے؟'' بہرام خان نے پوچھا۔

''بہرام...... آپ کو کیسے پتہ چل گیا تھا کہ......'' شہربانو نے پھر پوچھا۔

''مجھے خواب آیا تھا'' وہ زچ ہو کر بولا۔

''واقعی......'' شہربانو ایک دم بیڈ سے اُچھل کر بیٹھ گئی۔

''بھئی...... مذاق کر رہا ہوں...... میں نے تو یونہی روکا تھا۔ بس میرا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ سکول جائے۔ کبھی کبھی اللہ تعالیٰ آنے والی مصیبت کے بارے میں دل اور دماغ کو پہلے ہی خبر دے دیتا ہے'' بہرام خان نے جواب دیا۔

''وہ...... کیسے......؟شہر بانو نے چونک کر پوچھا۔

''انسان کی چھٹی حس...... اس کے خواب اور...... بہت سی ایسی باتیں اسے یہ سب بتا دیتی ہیں'' بہرام خان نے منہ بنا کر جواب دیا۔

''میں...... خدا کا بہت شکر ادا کر رہی ہوں۔ اگر آپ خرم خان کو سکول جانے سے نہ روکتے...... تو نجانے کیا ہو جاتا...... میں تو مر ہی جاتی'' شہر بانو نے افسردہ لہجے میں کہا۔

''اور...... میں...... بھی'' بہرام خان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''کیا......؟''شہر بانو نے چونک کر پوچھا۔

''خدا کا شکر ادا کر رہا ہوں کہ بہت اناج تباہ ہونے سے بچ گیا اور خرم خان بھی محفوظ رہا'' بہرام خان نے کہا۔

''ہاں......'' شہر بانو نے آہستہ آواز میں کہا اور خاموش ہو گئی۔ بہرام خان بھی کمرے کی چھت کو دیکھنے لگا جس میں اسے شاہ زیب کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔

''شاہ زیب...... بیٹا...... میں سوچ رہی ہوں کہ تمہاری شادی کر دوں۔ شہر بانو کی چھوٹی بہن مہر بانو...... بہت اچھی اور نیک لڑکی ہے...... شہر بانو کی بہت خواہش ہے کہ تمہاری شادی اس کے ساتھ کر دی جائے......'' زیتون بانو نے رات کو شاہ زیب سے کہا تو وہ چونک گیا اور خاموش ہو گیا۔

''تمہارا کیا خیال ہے......؟'' تم نے کوئی جواب نہیں دیا؟ زیتون بانو نے کافی دیر انتظار کرنے کے بعد پوچھا۔

''اماں جان...... میں سوچ میں پڑ گیا ہوں کہ آپ کو کیا جواب دوں......؟ کیا آپ نہیں جانتی کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے......؟ جب میں ٹھیک تھا...... اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتا تھا۔ کسی کا محتاج نہیں تھا...... تو اس نے مجھے تب قبول نہیں کیا اور اب میں کتنا بے بس اور محتاج ہوں۔ آپ مجھے ایک بار پھر ایسی آزمائش میں ڈالنا چاہتی ہیں''۔ شاہ زیب نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''مہر بانو...... تمہارے بارے میں سب جانتی ہے۔ اسے کوئی اعتراض نہیں'' زیتون بانو نے کہا۔

''مگر مجھے بہت اعتراض ہے...... میں اپنی بے بسی اور معذوری کا بوجھ کسی دوسرے پر نہیں ڈال سکتا۔ ویسے بھی اب مجھے شادی کی نہ خواہش ہے نہ ضرورت......'' شاہ زیب نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''کیا...... تم ساری زندگی...... یونہی......؟'' زیتون بانو نے نم آنکھوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''زندگی ہے...... ہی...... کتنی؟'' شاہ زیب نے آہستہ آواز میں کہا۔

''اور...... جتنی ملتی ہے...... اسے ہر صورت میں گزارنا پڑتا ہے'' زیتون بانو نے جواب دیا۔

''ہاں...... آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں'' شاہ زیب نے کہا۔

"اسی لئے کہتی ہوں کہ اگر کسی کا اچھا ساتھ مل جائے تو زندگی اچھی گزر سکتی ہے۔ مہرالنساء بہت نیک لڑکی ہے"۔ زیتون بانو نے کہا۔

"وہ یقیناً اچھی ہوں گی...... اور اچھے انسانوں کو اچھی چیزیں اور اچھے انسان نہ ملیں تو وہ بہت دکھی ہو جاتے ہیں...... مجھ جیسا محتاج انسان ان کے دکھوں میں اضافہ ہی کرے گا...... اماں جی...... میں نہیں چاہتا کہ وہ تنہائی میں آہیں بھرے اور یہ سوچے کہ خدا نے اس کے ساتھ ایسا کیوں کیا ہے۔ اماں جی...... آپ مانیں یا نہ مانیں۔ اس کے دل میں ضرور یہ خیالات پیدا ہوں گے...... میری محتاجی کو بہت سے لوگوں کی حسرت اور دکھ مت بنائیں" شاہ زیب نے آہ بھر کر کہا تو زیتون بانو اس کی باتیں سن کر خاموش ہو گئی۔

شاہ زیب کی آنکھوں میں نمی سی تیرنے لگی۔ زیتون بانو کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے...... انہیں نازی یاد آنے لگی، اگر وہ شاہ زیب کو یوں دھوکہ دے کر نہ جاتی تو آج شاہ زیب کی زندگی بہت مختلف ہوتی اس کا گھر بسا ہوتا...... اور اس کے بچے ہوتے...... اس کی محرومی...... بے بسی اور محتاجی نے اسکے چہرے کے تاثرات کو ہی بدل کر رکھ دیا تھا۔

"خدا کرے...... تم کبھی خوش نہ رہو...... تمہارے چہرے پر بھی ایسے دکھوں کا رنگ نظر آئے...... تم ہی اس کی بربادی کی ذمہ دار ہو......" زیتون بانو نے دکھ بھرے انداز میں سوچا اور ان کے دل سے نازی کے لئے بددعائیں نکلنے لگیں۔

☆

نازی...... تیمور کی والہانہ اور شدید محبت سے پریشان ہونے لگی تھی۔ وہ اپنی محبت میں اس قدر جنونی ہو رہا تھا کہ بعض اوقات نازی کو اس سے خوف آنے لگتا...... وہ جس محبت کی باسط علی سے توقع رکھتی تھی اور جس کی شدید خواہش اس کے اندر طوفان برپا رکھتی تھی ویسی ہی محبت کا طوفان تیمور کے اندر برپا رہتا اور وہ اس سے چھپی رہتی۔ تیمور اس کا اس قدر دیوانہ ہو گیا تھا کہ بعض اوقات ثروت کو بھی اس پر شک اور حیرت ہونے لگتی۔

"نازی...... یہ تیمور کو کیا ہوتا جا رہا ہے......؟ یہ ایسا تو ہرگز نہیں تھا، اب بہت اسٹوپڈ حرکتیں کرنے لگا ہے"۔ ثروت نے ایک شام نازی کے ساتھ تیمور کے بدلتے ہوئے رویے کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے کہا تو نازی ایک دم بوکھلا گئی۔

"کیوں...... کیا ہوا ہے؟" نازی نے گھبرا کر پوچھا۔

"معلوم نہیں...... لیکن کچھ گڑبڑ ضرور ہے، کبھی کھویا کھویا رہتا ہے اور کبھی ایک دم بڑبڑا جاتا ہے...... پہلے تو بہت سوشل تھا۔ اب اپنے آپ میں اور اپنے کمرے میں گم سم رہتا ہے...... میں تو بزنس کی وجہ سے بہت مصروف رہتی ہوں...... نازی...... تم معلوم کرنا...... کہ تیمور کے ساتھ مسئلہ کیا ہے...... امی بھی بہت پریشان ہیں" ثروت نے کہا تو نازی خاموش ہو گئی۔

"آج کل...... میں بہت مصروف ہوں...... کام بہت زیادہ ہے، میرے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ میں اس سے تفصیلاً بات کر سکوں۔ ایک دو بار میں نے کوشش بھی کی ہے مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نجانے اسے کیا ہوتا جا رہا ہے" ثروت نے فکرمندی سے کہا۔

نازی خاموش رہی اور کوئی جواب نہ دیا۔

"اب...... میں چلتی ہوں...... امی کو ڈاکٹر کے پاس بھی لے کر جانا ہے۔ تیمور سے اتنی بار کہا ہے کہ امی کو ہی ڈاکٹر کے پاس لے جائے مگر

اس نے کوئی جواب ہی نہیں دیا۔اب میں کتنی ذمہ داریاں پوری کروں۔اسے ذرا بھی خیال نہیں آتا" ثروت نے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔

"نازی کو یوں محسوس ہوا جیسے ثروت اس سے شکایت کر رہی ہو......یا پھر جیسے اسے کوئی خبر مل گئی ہو"۔

"تم......اس سے ضرور بات کرنا......مجھے یوں لگتا ہے جیسے وہ تمہاری بات سنتا ہے" ثروت نے معنی خیز انداز میں اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"مم......میری......" نازی نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں......" ثروت نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

نازی کے چہرے پر پسینہ آنے لگا۔اسے ثروت کے الفاظ سے شرمندگی محسوس ہونے لگی۔اسے یوں لگا جیسے ثروت بلاواسطہ انداز میں اسے تیمور کے یوں بدلنے کا ذمہ دار ٹھہرا رہی ہو۔نازی کو غصہ آنے لگا۔اسے اپنی تذلیل سی محسوس ہونے لگی۔وہ بلا کی ضدی اور ہٹ دھرم تھی۔حشمت خان کی حویلی میں کسی کو جرأت نہ تھی کہ کوئی اس سے اونچی آواز میں بات کرتا اور وہ کسی کی تلخ بات سن کر خاموش ہو جائے وہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی عادی تھی۔ثروت کے الفاظ اس کے کانوں میں سیسے کی طرح چبھ رہے تھے،غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا اور وہ قدرے مشتعل ہو کر تیمور کے کمرے میں گئی۔وہ بیڈ پر لیٹا چھت کو گھور رہا تھا۔اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی اور حلیہ بھی بے حد بگڑا ہوا تھا ورنہ وہ بہت خوش لباس اور باذوق انسان تھا۔گھومنے پھرنے اور زندگی سے بھرپور لطف اٹھانے کا شوقین۔

نازی کو یوں اپنے کمرے میں اچانک دیکھ کر وہ چونک گیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"تیمور......تم نے یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے" نازی نے غصے سے کہا۔

"کونسا......تماشا؟" تیمور نے حیرت سے پوچھا۔

"گھر والوں سے تمہارا رویہ کیوں خراب ہو رہا ہے......اور جانتے ہو......اس کا ذمہ دار مجھے سمجھا جا رہا ہے" نازی نے شکایتی لہجے میں کہا۔

"جس نے بھی یہ سمجھا ہے۔ٹھیک سمجھا ہے" تیمور نے کہا۔

"کیا......کیا......؟میں......؟" نازی غصے سے بولی۔

"ہاں......تم......اور......صرف تم اس کی ذمے دار ہو......تم جب تک میری محبت کو قبول نہیں کرو گی......میں یونہی پڑا رہوں گا" تیمور نے آہ بھر کر کہا۔

"ٹھیک ہے......میں یہاں سے جا رہی ہوں" نازی نے غصے سے کہا اور واپس مڑنے لگی۔

"پھر میری موت کی ذمہ دار تم ہو گی" تیمور اونچی آواز سے بولا۔

"دھمکی لگا رہے ہو؟" نازی نے خفگی سے کہا۔

"نہیں......حقیقت بتا رہا ہوں" اس نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔

"تم......چاہتے کیا ہو؟" نازی نے غصے سے پوچھا۔

''تم کو پانا چاہتا ہوں...... میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا'' تیمور اٹھ کر اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

''میرے بارے میں سب کچھ جاننے کے باوجود بھی؟'' نازی نے اس کی جانب دیکھ کر سرگوشی کے انداز میں کہا۔

''میں کچھ بھی نہیں جاننا چاہتا...... صرف تمہیں پانا اور محسوس کرنا چاہتا ہوں۔ تم سوچ بھی نہیں سکتی کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں...... کاش میں تمہیں اپنا دل کھول کر دکھا سکتا'' تیمور نے محبت پاش نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے قدرے جذباتی انداز میں کہا اور اسے اپنے بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔ نازی اس کے سینے کے ساتھ لگ کر سسکنے لگی۔

''میں...... بہت تھک گئی ہوں'' وہ سسکتے ہوئے بولی۔

''میں تمہارے سارے غم سمیٹ کر تمہیں پرسکون کر دوں گا'' وہ اس کی پیشانی پر اپنے لب رکھتے ہوئے بولا۔

''مجھے کسی آزمائش میں مت ڈالنا'' نازی نے روتے ہوئے کہا۔

''میں تم پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے'' تیمور نے محبت سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

نازی اس سے سرگوشیاں کرتی رہی اور وہ وعدے کرتا رہا۔

نازی کی محبت کو پا کر تیمور بہت پرسکون ہو گیا تھا۔ اس کا دل ہر وقت سرشار رہتا۔ اس کے انگ انگ سے خوشی پھوٹتی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہونے لگی تھی۔ ایک شریر سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر مچلتی رہتی۔ وہ نازی کو دیکھ دیکھ کر جیتا۔ وہ نظر آتی تو یوں مسکرانے لگتا جیسے خوبصورت پھول کو دیکھ کر کسی کے اندر خوشی اور طراوت کا حسین احساس پیدا ہونے لگتا ہے۔ وہ جس طرف جاتی ...... اس کی نگاہیں اس کا طواف کرتی رہتیں۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ کھل گیا تھا...... اور نازی بھی ایسی ہی جنونی اور طوفانی محبت کی خواہشمند تھی۔ جس کی تپش کو وہ دور سے ہی محسوس کر پائے۔ محبت بھری نگاہوں سے جھلسا دینے والی چنگاریاں دور سے ہی بھسم کر دیں...... اور اس کے جادوئی سحر کا طلسم کبھی ٹوٹ نہ پائے۔ وہ اکثر اپنے آپ پر...... اپنی قسمت پر اور قدرت پر حیران ہوتی تھی۔ وہ جس کی محبت کے پیچھے دیوانہ وار بھاگ رہی تھی اور جسے اپنا سب کچھ بیٹھی تھی، اس کے چھن جانے پر اپنی جان کو ختم کر دینے کی دعائیں کرتی تھی۔ وہ محبت اب کہیں گم گئی تھی۔ وہ شخص اسے اجنبی اور بے وفا محسوس ہوتا تھا۔ اس نے بھی نہیں سوچا تھا کہ باسط علی کے علاوہ کبھی کوئی اور شخص بھی اسکی زندگی میں آئے گا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ اس سے محبت کرنے لگے گی۔ اور وہ شخص باسط علی سے بھی زیادہ شدید محبت اس سے کرے گا...... کیسے سب کچھ بدل گیا تھا۔ شاہ زیب اور باسط علی اس کی زندگی میں آئے اور چلے بھی گئے...... پھر تیمور نجانے کہاں سے آ گیا اور اس کے دل کے اندر سما گیا۔ تیمور کی محبت اسے ان دونوں سے زیادہ منفرد اور قیمتی محسوس ہونے لگی۔ شاہ زیب کی محبت میں نرمی، لطافت اور ٹھہراؤ تھا۔ باسط علی کی محبت میں جذباتیت غالب تھی اور تیمور کی محبت میں ہر جذبہ اور احساس اپنے عروج پر تھا...... اور وہ ایسی ہی محبت کو پانا چاہتی تھی...... اور قدرت اب اس کی خواہش پوری کر رہی تھی۔ اسے نواز رہی تھی۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے قدرت اس کے ساتھ دکھوں اور غموں کا ازالہ کر رہی ہو۔ اس کے ساتھ جتنی زیادتیاں ہوئی ہیں ان کا نقصان پورا کر رہی ہو اور محبت کا یہ احساس اسے روز بروز پرسکون کر رہا تھا۔ وہ مسرور بھی ہو رہی تھی اور مغرور بھی...... اس کے اندر ہر جانب تیمور چھا گیا تھا...... اور تیمور کے اندر نازی......

تنہائی میں بھی تیمور کے لبوں سے نازی کا نام نکلتا اور وہ خود ہی اس سے سرگوشیاں کر کے مسکراتا رہتا...... نازی اسے اپنے تصور میں...... اپنے بہت قریب پا کر مسکراتی رہتی...... محبت کے خوبصورت اور پر لطیف احساس نے دونوں کو اپنے سحر میں بری طرح جکڑ رکھا تھا۔ باسط علی کی محبت کو پانے کے لئے وہ جتنا تڑپتی رہتی تھی...... تیمور سے بن مانگے وہ محبت مل رہی تھی وہ اس کی محبت کو پا کر سرشار اور شاداں ہو گئی تھی۔

☆

تیمور کے چچا اچانک گاؤں سے آئے تھے۔ وہ انتہائی امیر اور بارعب زمیندار تھے۔ ان کے ساتھ محافظوں سے بھری ایک پوری جیپ آئی تھی جو جدید اسلحے سے لیس تھی۔

''بھابھی جان...... تیمور بیٹا آیا ہوا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ شہزادی اور تیمور کی شادی جلد از جلد کر دی جائے'' اس کے چچا دبیر الحسن نے بارعب انداز میں کہا۔

تیمور ان کی بات سن کر چونک گیا۔ ثروت، مسز وقار، تیمور اور دبیر الحسن ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ نازی اپنے کمرے میں موجود تھی بلکہ ثروت نے ہی اسے نیچے آ کر کھانا کھانے سے منع کیا تھا۔

''ہاں...... ہمیں تو کوئی اعتراض نہیں...... وہ تیمور کی بچپن کی منگیتر ہے...... تیمور کے والد نے ہی یہ رشتہ طے کیا تھا...... ہمیں تو خوشی ہو گی کہ شہزادی میری بہو بن کر اس گھر میں آتی ہے'' مسز وقار نے مسکرا کر کہا تو تیمور کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔

''لیکن...... میں ابھی شادی نہیں کر سکتا''۔ وہ بمشکل بولا۔

''کیوں......؟'' دبیر الحسن نے حیرت سے پوچھا۔

''مجھے...... ابھی واپس جا کر کچھ ادھورے کام مکمل کرنے ہیں'' وہ بہانہ بناتے ہوئے بولا۔

''مگر...... بھابھی جان اور ثروت تو بتا رہیں تھیں کہ تم تعلیم مکمل کر کے آئے ہو۔ اب وہاں کیا کام ہے؟'' اس کے چچا نے قدرے تشویش سے پوچھا۔

''میرے کچھ پراجیکٹس ہیں'' اس نے جلدی سے کہا۔

''وہ کام بھی ہوتے رہیں گے۔ شادی کے بعد چلے جانا، شہزادی کی ماں کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی...... اب میں مزید انتظار نہیں کر سکتا'' دبیر الحسن نے خفگی سے کہا۔

''تو...... پھر...... آپ کہیں اور اس کی شادی کر دیں'' تیمور نے بھی غصے سے جواب دیا

''کیا...... کیا، کیا کہا......؟ تم اپنی بچپن کی منگیتر کے بارے میں یہ کہہ رہے ہو۔ تم کس قدر بے غیرت ہو گئے ہو۔ تمہیں یہ بات کرتے ہوئے شرم آنی چاہیے'' چچا نے غصے سے کہا۔

''اس میں شرم کی کیا بات ہے...... آپ کو شادی کی جلدی ہے تو آپ کہیں اور کر لیں...... مجھے فی الحال شادی نہیں کرنی'' تیمور نے غصے سے کہا۔

''ان باتوں کا مطلب کیا ہے......؟ کیا تم شہزادی سے شادی کے لئے انکار کر رہے ہو......یا پھر......؟'' دبیر الحسن نے اس کی جانب بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''آپ اس کا جو مطلب بھی سمجھیں'' تیمور نے بے پروائی سے جواب دیا۔

''تیمور......یہ کیسی باتیں کر رہے ہو؟'' مسز وقار نے غصے سے کہا۔

''جو سچ ہے......وہی ان کو بتا رہا ہوں'' تیمور نے جواب دیا۔

''تیمور......یہ رشتہ بابا نے طے کیا تھا'' ثروت بھی غصے سے بولی۔

''اور......بابا......اب اس دنیا میں نہیں......مگر میں اس دنیا میں ہوں......اور مجھے اپنی پسند کی زندگی گزارنے کا پورا حق ہے'' تیمور غصے سے اٹھا اور سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر چلا گیا۔

سب حیرت سے اسے اوپر جاتے ہوئے دیکھتے رہ گئے۔

''دبیر بھائی......آپ فکر نہ کریں۔ میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتی ہوں'' مسز وقار نے پریشانی سے کہا۔

''یہ......سمجھ جائے تو اچھا ہے......ورنہ'' چچا اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے باہر نکل گیا۔

ثروت اور مسز وقار سر تھام کر بیٹھ گئیں۔

''ثروت......تیمور کو کیا ہو گیا ہے۔ جاؤ......تم ہی اسے سمجھاؤ......کہ یہ شادی کتنی ضروری ہے۔ ورنہ دبیر الحسن ہم سب کو تباہ و برباد کر دے گا۔ اگر تیمور رشتہ توڑتا ہے تو دبیر......شہریار سے تمہارا رشتہ توڑ دے گا۔ یہ گھر......اس کی شان و شوکت......دبیر الحسن کی وجہ سے ہی تو ہے'' مسز وقار نے روہانسی آواز میں کہا۔

''امی......تیمور سب جانتا ہے۔ اسے کس بات کی خبر نہیں......کیا وہ شہزادی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا یا پھر اسے یہ معلوم نہیں کہ شہریار سے میرا نکاح ہو چکا ہے'' ثروت نے غصے سے کہا۔

''خدا کے لئے......اسے کچھ تو سمجھاؤ'' مسز وقار نے کہا تو ثروت ان کے کہنے پر سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر چلی گئی۔

☆

''نازی میں شادی کروں گا تو صرف تم سے......میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا'' تیمور نے نازی سے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

''اچھا ہے......اس کے لئے تمہیں بھاری قیمت ادا کرنی پڑے؟'' نازی نے معنی خیز انداز میں سوال کیا۔

''میری جان سے بڑھ کر قیمتی شے تو کوئی نہیں نا......میں وہ بھی قربان کرنے کو تیار ہوں۔ تمہاری خاطر'' تیمور نے کہا تو دروازے کے ساتھ کھڑی ثروت غصے سے اندر داخل ہوئی۔

''اچھا......تو......اس کی خاطر......تم سب کو تباہ و برباد کرنے پر تلے ہو......مجھے پہلے ہی شک تھا......مگر یقین نہیں آتا تھا کہ کوئی اس قدر

بھی احسان فراموش ہوسکتا ہے۔ تم اتنی ذلیل بھی ہو سکتی ہو...... مجھے یقین نہیں آرہا" ثروت نے غصے سے نازی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"خبردار...... ثروت...... جو نازی کو کچھ کہا...... نازی میری محبت ہے اور میں اس کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہوں" تیمور نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔

"تیمور...... تمہارا دماغ اس نے خراب کر دیا ہے...... شاید تمہیں معلوم نہیں کہ محبت کے جس جال میں اس نے تمہیں پھنسایا ہے یہ اس کا مشغلہ ہے" ثروت نے انتہائی طنزیہ لہجے میں کہا۔

"ثروت...... یہ...... تم...... کیسی باتیں کر رہی ہو؟" نازی نے چلاتے ہوئے کہا۔

"شاید...... تیمور تمہاری حیثیت سے واقف نہیں...... کہ تم کس کس طرح محبت کے کھیل کھیلتی رہی ہو...... جو عورت اپنے شوہر کے گھر میں رہ کر اس سے غداری اور بے وفائی کرتی رہی ہو...... اور اس کے ہی گھر میں رہ کر محبوب پر محبت نچھاور کرتی ہو وہ کتنی قابل اعتماد ہو سکتی ہے" ثروت نے غصے سے کہا۔

"ثروت...... میں نازی کے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں...... تمہیں کچھ بھی بتانے کی ضرورت نہیں" تیمور ٹھوس لہجے میں نازی کا دفاع کرتے ہوئے بولا۔

"تیمور...... اس نے تمہیں پاگل کر دیا ہے۔ تمہاری آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے...... یہ گرگٹ ہے...... تمہارا خون چوس لے گی...... اور پھر تمہیں کہیں کا نہیں رہنے دے گی" ثروت غصے سے چلاتی رہی۔

نازی اس کی باتیں سن کر تلملاتی رہی اور روتی ہوئی پاؤں پٹختی ہوئی وہاں سے بھاگ گئی۔

"ثروت...... اگر نازی میری زندگی سے چلی گئی تو میں کسی کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا" وہ قدرے جذباتی انداز میں بولا اور نازی کے پیچھے بھاگا۔ نازی اپنے کپڑوں کا بیگ لے کر نیچے چلی گئی اور تیمور بھی اس کے ساتھ باہر نکل گیا۔ گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور دونوں گھر سے چلے گئے۔

"ثروت...... یہ کیا ہو گیا ہے؟" مسز وقار نے اپنی وہیل چیئر کو تیزی سے چلاتے ہوئے...... قدرے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"امی...... وہ سب کچھ لوٹ کر چلی گئی ہے" ثروت نے روتے ہوئے جواب دیا۔

"کون...... نازی......؟" مسز وقار نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں......" ثروت نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

"یہ کون لڑکی ہے...... اور تم اسے کہاں سے لے آئی۔ اف خدایا......! یہ ہم پر کیسا عذاب نازل ہو گیا ہے۔ ہم نے تو اس پر ترس کھا کر اسے پناہ دی...... اور اس نے ہمیں یہ صلہ دیا" مسز وقار نے روتے ہوئے کہا۔

"ہم کیسے کیسے دھوکے کھاتے ہیں...... جن لوگوں پر اعتبار کرتے ہیں وہی ڈس لیتے ہیں" ثروت نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''ثروت...... کچھ کرو...... تیمور کو گھر واپس لاؤ...... ورنہ سب کچھ تباہ ہو جائے گا'' مسز وقار نے کہا۔

''ہاں...... میں بھی اسے نہیں چھوڑوں گی'' ثروت کی آنکھوں میں انتقام کے شعلے چمکنے لگے۔

☆

''نازی میں تمہیں کبھی تنہا نہیں چھوڑوں گا...... یہ میرا وعدہ ہے'' تیمور نے نازی سے کہا۔

''مجھے تمہاری محبت پر پورا اعتماد ہے مگر ثروت میرے بارے میں بہت بدگمان ہو گئی ہے۔ میں کبھی نہیں چاہتی کہ وہ......'' نازی نے پریشان ہو کر کہا۔

''تم اس کی فکر چھوڑو...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہمیں صرف اپنی محبت کو پانا ہے...... تمہارے ساتھ جو کچھ ہو چکا ہے...... میں اس کو دہرا کر تمہیں کوئی تکلیف نہیں دینا چاہتا......'' تیمور نے کہا۔

''تم بہت اچھے انسان ہو...... اب مجھے اپنی قسمت پر رشک آنے لگا ہے کہ مجھے تم جیسے خوبصورت انسان کی محبت ملی ہے'' نازی نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

''اور...... میں اپنے آپ کو کتنا خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ تم جیسی خوبصورت عورت میری زندگی میں آئی۔ نازی میں تم کو اتنی محبت دوں گا کہ تم سوچ بھی نہیں سکتی'' تیمور نے بہت محبت سے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔

''مجھے تم پر پورا یقین ہے...... مگر ہم کب تک تمہارے دوست کے گھر رہیں گے......؟ ہم کب شادی کریں گے؟'' نازی نے فکرمندی سے پوچھا۔

''بس چند روز کی بات ہے...... میں نے دوسرے شہر میں نوکری کے لئے درخواست دی ہے جیسے ہی نوکری ملتی ہے ہم وہاں چلے جائیں گے اور وہیں جا کر کورٹ میرج کر لیں گے'' تیمور نے مسکرا کر کہا۔

''دوسرے شہر میں......؟'' نازی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں...... یہاں شادی کرنا اور پھر اسی شہر میں رہنا مناسب نہیں'' تیمور نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

''کیوں......؟'' نازی نے چونک کر سوال کیا۔

''کچھ نہیں...... چھوڑو...... اس بات کو...... کوئی اور بات کرتے ہیں'' تیمور نے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب......؟'' نازی نے مسکرا کر معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''محبت کی باتیں...... مستقبل کی باتیں...... خوشیوں سے بھرے دنوں کی باتیں...... جب میں...... اور تم خوب ہنسیں گے...... ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ پائیں گے'' تیمور نے مسکرا کر کہا۔

''وہ...... تو...... ہم ایک دوسرے کے بغیر اب بھی نہیں رہ پاتے'' نازی نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔

''ہاں...... مگر یہاں تو مجھے تم سے ملنے کے لئے بہت تھوڑا وقت ملتا ہے۔ شعیب کے گھر والے ہمارا یوں ملنا پسند نہیں کرتے۔ شعیب نے مجھے جلد شادی کا مشورہ دیا ہے اور اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ ہم یہاں سے جلد چلے جائیں'' تیمور نے نازی کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے کہا۔

''کیا ثروت نے کوئی رابطہ کیا؟'' نازی نے اچانک پوچھا۔

''نہیں......'' تیمور نے جواب دیا۔

''یہ کیسے ممکن ہے...... اس روز تو ثروت بہت ہنگامہ کر رہی تھی...... اور اب اتنے روز گزر گئے ہیں۔ اس نے کوئی خبر ہی نہیں لی۔ کیا تمہارے چچا نے بھی کوئی......'' نازی نے حیرت سے پوچھا اور جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''نہیں......'' تیمور نے آہ بھر کر جواب دیا اور نازی سے نظریں چرانے لگا۔

''کیا بات ہے......؟ کیا مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو؟'' نازی نے اس کی جانب بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''جب کہنے کو کچھ نہیں...... تو...... کیا بتاؤں؟'' تیمور نے جواب دیا تو نازی خاموش ہو گئی مگر تیمور کی سوچ میں ڈوبی آنکھیں اور چہرے پر پھیلے تاثرات اسے بہت کچھ بتا رہے تھے۔

''تیمور...... تم مجھ سے شادی کر کے کبھی پچھتاؤ گے...... تو نہیں؟'' نازی نے قدرے توقف کے بعد سوال کیا۔

''تم سے شادی نہ کر کے ساری زندگی ضرور پچھتاتا'' تیمور نے جواب دیا۔

''کبھی کبھی بہت بڑے بڑے دعوے بھی ریت کی دیوار ثابت ہوتے ہیں'' نازی نے کہا۔

''دعوے وہ کرتے ہیں جنہیں اپنے آپ پر یقین نہیں ہوتا اور مجھے اپنے آپ پر بہت یقین اور اعتماد ہے'' تیمور نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

''کیسا اعتماد...... اور...... کیسا یقین؟'' نازی نے حیرت سے سوال کیا

''جب میں کوئی کام کرنے کا ارادہ کرتا ہوں تو پھر دنیا کی کوئی طاقت میرا راستہ نہیں روک سکتی'' تیمور نے قدرے جذباتی انداز میں کہا۔

''کیا...... خدا بھی نہیں......؟'' نازی نے حیرت سے سوال کیا۔

''شاید نہیں......'' تیمور نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔

''تم اپنی سوچ، ارادے اور عمل میں اس قدر پختہ ہو سکتے ہو...... مجھے یقین نہیں آ رہا'' نازی نے حیرت سے پوچھا۔

''کیا...... تمہیں ابھی تک یقین نہیں آیا...... میں نے زندگی میں جو کچھ حاصل کرنا چاہا...... حاصل کر کے رہا...... جو خواہش کی...... وہ پوری ہوئی...... کیا تمہیں یاد نہیں کہ تم مجھ سے کتنی متنفر تھی اور میری محبت پر یقین ہی نہیں کرتی تھی مگر میں تمہیں اپنی محبت کا یقین دلانے میں کامیاب ہوا...... اور تمہیں پانے کے لئے چچا دبیر الحسن جیسے بارعب اور جاہ و جلال والے انسان کے سامنے ڈٹ گیا۔ تیمور کسی سے نہ ڈرنے والا ہے اور نہ پیچھے ہٹنے والا، تیمور کے مقابلے میں جو آیا...... اسے ہمیشہ شکست ہی کھانا پڑی ہے'' تیمور نے قدرے فخریہ انداز میں کہا تو نازی اس کے ارادے اور عزم کی قائل ہو گئی۔

''میں نے تم جیسا انسان پہلے کبھی نہیں دیکھا'' نازی نے مسکرا کر کہا۔

''اور میں نے بھی تم جیسی خوبصورت نازنین کبھی نہیں دیکھی'' تیمور نے محبت سے اسے اپنی آغوش میں لیتے ہوئے کہا تو وہ مسکرا دی۔

''تم...... جب میرے اتنے قریب ہوتی ہو تو یوں لگتا ہے جیسے کائنات کا سارا حسن سمٹ کر میری آغوش میں آ گیا ہو اور رفتہ رفتہ میرے وجود میں سما رہا ہو'' تیمور نے محبت سے اس کا سر سہلاتے ہوئے کہا۔

''اور...... تم نے کبھی میرے دل کا حال نہیں پوچھا'' نازی نے سرگوشی کی۔

''وہ...... میں جانتا ہوں'' تیمور نے مسکرا کر جواب دیا۔

''کیا......؟'' نازی نے چونک کر پوچھا۔

''ابھی نہیں...... پھر کبھی بتاؤں گا'' اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

''نہیں...... تم...... کبھی نہیں بتا سکتے'' نازی نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''اور...... اگر...... میں بتا دوں...... تو......؟'' تیمور نے معنی خیز انداز میں سوال کیا۔

''تو......؟ تو...... ؟نہیں...... تم بتا ہی نہیں سکتے'' نازی نے الجھتے ہوئے جواب دیا۔

''کیوں......؟'' تیمور نے حیرت سے پوچھا۔

''ایک انسان کبھی بھی دوسرے انسان کے دل تک نہیں پہنچ سکتا۔ انسان چاہے ہزار کوشش کر لے'' نازی نے جواب دیا۔

''مجھے چیلنج مت کرو...... چیلنج کرنے والے کبھی مجھ سے جیت نہیں سکتے'' تیمور نے جواب دیا۔

''اچھا...... تو...... بتاؤ...... کیا ہے میرے دل میں؟'' نازی نے پوچھا۔

''میں...... اور میری محبت'' تیمور نے جواب دیا۔

''اور......'' نازی نے پھر حیرت سے پوچھا۔

''اور......؟'' تیمور نے کچھ کہنا چاہا...... کہ اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔ تیمور نے صوفے سے اٹھ کر جلدی سے دروازہ کھولا، اس کے سامنے شعیب کھڑا تھا۔

''یار...... تم لوگ کہیں اور شفٹ ہو جاؤ۔ میرے والدین بہت ناراض ہو رہے ہیں'' شعیب نے قدرے شرمندگی سے کہا۔

''کیا...... اس وقت......؟ شام ہو رہی ہے......'' تیمور نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں...... اسی وقت...... آئی ایم سوری'' شعیب کہہ کر چلا گیا اور تیمور نے دروازہ بند کر کے نازی کی جانب دیکھا۔

''کیا ہوا......؟'' نازی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہمیں اسی وقت یہاں سے جانا پڑے گا'' تیمور نے جواب دیا۔

''کیا...... اس وقت؟'' نازی نے چونک کر پوچھا۔

''ہاں......'' تیمور نے جواب دیا اور دونوں اپنی چیزیں سمیٹنے لگے۔

# (۱۷)

''ارسلان کو کسی نامعلوم شخص نے گولی ماردی ہے......اورزل......کومے میں رہی ہے'' اسامہ نے شہیر کو بتایا۔

''کب......؟'' شہیر نے چونک کر پوچھا۔

''پچھلے ہفتے......وہ اپنے نئے گھر گئے تھے......وہیں کسی نے ارسلان کو گیٹ پر بلا کر گولی ماردی۔ اٹس ویری ٹریجک، ارسلان بہت اچھا انسان تھا۔ بہت پیارا...... جانتے ہو، جب میں نے اسے تمہاری ڈسٹربڈ میریڈ لائف کے بارے میں بتایا تو وہ بہت پریشان ہو گیا۔ مجھے کہنے لگا...... اسامہ......شہیر کو میرے پاس لاؤ......اسے ہماری محبت اور ہمدردی کی ضرورت ہے۔ وہ ہر ایک سے پیار کرنے والا......سب کا ہمدرد اور بہت انسان دوست تھا۔ انسانیت سے محبت کرنے والا......ایسے لوگ دنیا میں بہت کم ہوتے ہیں۔ نجانے کیوں قدرت انہیں جلد اپنے پاس بلا لیتی ہے......ایسے انسانوں کی دنیا والوں کو بھی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ سچ مجھے تو یقین ہی نہیں آرہا......کہ......ارسلان ہم کو چھوڑ کر چلا گیا ہے......اتنا خوبصورت دل رکھنے والا انسان کیسے آناً فاناً سب کو چھوڑ کر چلا گیا ہے......میں تو سوچتا ہوں زل اس کے بغیر کیا کرے گی...... ؟ وہ تو اس سے بے انتہا محبت کرتی تھی......اور......وہ......Pregnant بھی ہے''۔

اسامہ نے بتایا تو شہیر کے چہرے کے تاثرات بننے لگے۔

''کب......؟ مجھے تو نہیں معلوم......'' نادانستہ شہیر کے منہ سے نکلا۔

''کسی کو بھی نہیں معلوم تھا۔ شاید ارسلان کو بھی نہیں۔ زل اب ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہوئی ہے تو ڈاکٹر نے ابھی بتایا ہے، اٹس ویری شاکنگ......تم نہیں جانتے انہوں نے کتنی محبت اور چاہت سے اپنا گھر بنایا ہے مگر......افسوس......!'' اسامہ نے تاسف کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''کیا یہ معلوم ہو سکا......کہ......کس نے ارسلان کو گولی ماری ہے؟'' شہیر نے پوچھا۔

''نہیں......FIR تو لکھوائی ہے......مگر یہی لگتا ہے کہ کسی نے پلاننگ سے یہ سب کیا ہے......مگر......ارسلان کی کسی کے ساتھ کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔ اس بات پر یقین نہیں آتا'' اسامہ پریشانی سے بولا۔

''کیا......کہا جا سکتا ہے۔ مجھے تو خود یہ سب کچھ جان کر بہت افسوس ہوا مگر میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لئے کسی سے کوئی رابطہ بھی نہیں ہو سکا'' شہیر نے افسردگی سے کہا۔

''ہاں......میں نے تمہیں فون کیا تھا مگر تمہارا فون آف تھا'' اسامہ نے کہا۔

''زیادہ تر میڈیسن کھا کر سویا رہتا ہوں۔ اس لئے موبائل بھی آف رکھتا ہوں......'' شہیر نے کہا۔

''ٹھیک ہے....تم.....ریسٹ کرو.....پھر ملیں گے'' اسامہ اٹھتے ہوئے بولا۔

''زل.....اب کیسی ہے؟ گھر میں ہے......یا ہاسپٹل میں؟'' شہیر نے پوچھا۔

''اب تو گھر شفٹ ہو چکی ہے.....مگر ہر وقت خاموش رہتی ہے یا پھر روتی رہتی ہے'' اسامہ نے بتایا۔

''میں کچھ بہتر ہو جاؤں تو پھر اس سے ملنے جاؤں گا'' شہیر نے اسامہ کو رخصت کرتے ہوئے کہا اور وہ خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔

زل کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی دنیا خالی ہو گئی ہو۔ اس کا گھر کسی نے توڑ دیا ہو......اس کے سر سے چھت چھین لی ہو۔ اس کا دل ہر وقت شدت غم سے پھٹنے کو بے تاب رہتا.....اور آنکھیں ہر وقت برسنے کو تیار.....ارسلان ہر لمحہ، ہر پل اس کی آنکھوں کے سامنے رہتا......اور وہ بے بسی سے اسے دیکھتی رہتی۔

''میں تمہیں کہاں سے ڈھونڈ کر لاؤں.....ارسلان.....نجانے کس کی نظر ہماری خوشیوں کو کھا گئی ہے.....ہماری محبت کی زندگی اتنی مختصر کیوں نکلی.....ہم نے تو بہت سے دن.....بہت سے لمحے اور بہت سا وقت اپنے گھر میں ایک ساتھ گزارنا تھا۔ ہمارا ''محبت کدہ'' تو ہمارے وہاں جانے سے پہلے ہی ''ماتم کدہ'' بن گیا....'' وہ اپنے دل میں ہی اس سے باتیں کرتی رہتی، اس سے شکوے کرتی.....اور جب بہت بے تاب ہو جاتی تو سسکیاں بھرنے لگتی۔

اس کے والدین اس کو اپنے ساتھ لے جانے کے لئے آئے تھے مگر اس نے جانے سے انکار کر دیا۔ اسے اس گھر سے ارسلان کے وجود کی، اس کی محبت کی خوشبو آتی تھی۔ اس گھر میں گزارا ایک ایک پل اس کے لئے قیمتی سرمایہ تھا.....اور وہ اپنے قیمتی سرمائے کو کسی بھی طرح چھوڑنے کو تیار نہیں تھی۔

اس گھر کو چھوڑنے کا مطلب ارسلان کو چھوڑنا تھا۔

اور اس کے پاس ارسلان کی نشانی بھی تھی۔ وہ اسے کیسے چھوڑ سکتی تھی۔ اس لئے اس نے ماں باپ کے ساتھ جانے سے صاف انکار کر دیا۔

روشنی بہت دنوں کے بعد اپنی ماں سے ملنے گھر آئی تو اس نے اسامہ کو فون کیا۔ اسامہ کے منہ سے ارسلان کی موت کا سن کر وہ شاکڈ رہ گئی۔ ارسلان اور زل کی محبت کو دیکھ کر وہ رشک کرتی تھی۔ زل کی قسمت پر حیران ہوتی تھی جس کو قدرت نے ہر شے فراوانی سے دی تھی۔ نجانے دونوں کو کس کی نظر لگ گئی تھی۔

روشنی زل سے ملنے اس کے گھر گئی تو زل کی حالت دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ ایک مرجھایا ہوا زرد پتہ لگ رہی تھی جس پر خزاں نے بری طرح حملہ کیا تھا اور اس کی شادابی کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا تھا۔ اسامہ بھی روشنی کے ہمراہ تھا۔ اسامہ نے شہیر کو بھی فون کیا تو وہ بھی تھوڑی دیر بعد وہاں پہنچ گیا.....زل ایک مجسمے کی مانند ان کے سامنے بیٹھی آہیں بھرتی رہی اور روتی رہی.....روشنی، شہیر کو دیکھ کر حیران رہ گئی.....وہ بہت بیمار پژمردہ اور بوڑھا لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں گہری اداسی اور ویرانی تھی۔ وہ روشنی کو دیکھ کر ہلکا سا مسکرایا، جواب میں روشنی نے سرد آہ بھری.....اس کے بعد دونوں میں کوئی بات چیت نہ ہوئی۔ روشنی ارسلان کی باتیں کرتی رہی اور زل خاموشی سے سن کر روتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد سب اٹھ کر وہاں سے چلے گئے۔

روشنی، شہیر کو دیکھ کر بری طرح ڈسٹرب ہو گئی تھی۔ اس کا دل پھر بے چین ہونے لگا تھا۔ شہیر کی حالت دیکھ کر اسے شدید صدمہ ہوا تھا۔ اور...... اپنا دل اسے کھول کر نہ دکھانے کا رنج......

ہم دونوں ایک ہی آگ میں جل رہے ہیں...... روشنی نے افسردگی سے سوچا اور اپنی نم آنکھوں کو ملنے لگی۔

"ہماری کیا خطا ہے......؟ یہ...... کہ ہم ایسی محبتوں میں گرفتار ہوئے...... جو ہمارے مقدر میں نہیں لکھی گئیں......" روشنی سوچتی رہی اور روتی رہی۔

شہیر سے محبت نہ کرنے پر اس کا دل تیار نہیں تھا۔ نجانے اس کے دل نے اس کو کسی خوش فہمی میں مبتلا کر رکھا تھا کہ اس کی محبت ایک نہ ایک دن ضرور کامیاب ہو گی اور شہیر اس کا ہوگا...... جب سے اسے معلوم ہوا تھا کہ شہیر کی اپنی بیوی کے ساتھ تعلقات ٹھیک نہیں...... تو اس کے دل نے پھر اس کی امید کو یقین میں بدل دیا تھا وہ ضرور میرا ہوگا...... اور وہ اس دن کی آس میں نجانے کیا کیا سوچتی رہتی۔

☆

زل کو بہت مشکل سے اسامہ اور ارسلان کے گھر والوں نے آرٹ اکیڈمی جانے پر اصرار کر کے منایا تھا تاکہ وہاں جا کر اس کا دل بہل جائے۔ ورنہ وہ سارا وقت گھر میں بیٹھ کر روتی رہتی۔

"ارسلان کے بغیر کیسے اس آفس میں بیٹھوں گی؟" زل نے روتے ہوئے اسامہ سے کہا۔

"اکیڈمی چلانا...... ارسلان کا خواب تھا...... کیا تم اس کے خوابوں اور خواہشوں کو ادھورا چھوڑ دو گی...... ارسلان جیسے اچھے انسان کا نام تم نے روشن کرنا ہے...... اس کے خوابوں کو تم نے پورا کرنا ہے...... وہ تو تاریکی میں امید کی کرن تھا...... کیا تم اس کی کرنوں سے دنیا کو روشن نہیں کرو گی......؟" اسامہ قدم قدم پر اسے سمجھاتا۔ اس کی مدد کرتا، اس کو حوصلہ دیتا...... بہت لوگوں کے قائل کرنے پر اس نے اکیڈمی جانا شروع کر دیا تھا۔ وہاں بھی اس کا دل نہیں لگتا تھا۔ ارسلان ہر پل یاد آتا...... اس کی باتیں ہر موقع پر یاد آتیں تو وہ سب کچھ چھوڑ کر ان گزارے ہوئے لمحوں کو یاد کرنے میں مصروف ہو جاتی جو اس نے ارسلان کے سنگ گزارے تھے۔

شہیر کی طبیعت سنبھلنے لگی تو اس نے بھی اکیڈمی جانا شروع کر دیا۔ زل کو اس کا آنا ناگوار لگتا تھا مگر اسے ارسلان کی بات بار بار یاد آتی کہ شہیر کو ہماری مدد کی ضرورت ہے۔ ارسلان کے کہے کو وہ ٹال نہ سکی تھی اس لئے شہیر کے آنے پر خاموش رہتی۔ ارسلان کو فوت ہوئے تین ماہ گزر چکے تھے مگر نہ تو اس کے قاتل پکڑے گئے تھے اور نہ ہی ان کا کوئی سراغ ملا تھا۔ شہیر آفس میں زیادہ تر وقت زل کے ساتھ گزارنے کی کوشش کرتا۔ بات بے بات اس سے مشورہ کرنے کیلئے کافی دیر بیٹھ کر ارسلان کو ڈسکس کرتا۔ زل اور ارسلان کی تعریفیں کرتا، زل کو ہر بات میں حوصلہ دیتا...... زل اس کے رویے میں گہری تبدیلی محسوس کر رہی تھی۔ ارسلان کی زندگی میں وہ اکثر اس سے اپنی کھوئی ہوئی محبت کا ذکر کرتا...... اکثر دلبرداشتہ ہو کر مایوسی سے باتیں کرتا مگر ارسلان کے جانے کے بعد وہ قدرے محتاط انداز میں گفتگو کرتا...... بات کرتے ہوئے زل کے تاثرات دیکھتا...... انہیں محسوس کرتا اور پھر بات آگے بڑھاتا...... زل رفتہ رفتہ نارمل ہونے لگی تھی...... اور شہیر پر پہلے سے زیادہ بھروسہ کرنے لگی تھی...... شہیر اکثر گھر آنے لگا تو اس کے

سسرال والوں نے اس بات پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

''شہیر...... پلیز آپ گھر مت آیا کریں۔ میرے سسر آپ کے آنے جانے کو پسند نہیں کرتے'' ایک روز زل نے اسے آفس میں کہا۔

''کیوں......؟ کیا انہیں معلوم نہیں...... کہ میں ارسلان کا بھی دوست تھا۔'' شہیر نے حیرت سے پوچھا۔

''جانتے ہیں...... مگر اب ارسلان اس دنیا میں نہیں'' زل نے آہ بھر کر کہا۔

شہیر بغور اس کی جانب دیکھنے لگا۔

''شکر ہے آج آپ نے اس بات کا اقرار اپنی زبان سے کیا۔ کوئی اور کہتا تو شاید آپ اس کی بات نہ مانتیں'' شہیر نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''کیا مطلب......؟'' زل نے حیرت سے چونک کر پوچھا۔

''زل...... ارسلان اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ آپ کے پاس صرف اس کی یادیں ہیں اور یادوں کے سہارے کب تک زندگی گزاری جا سکتی ہے'' شہیر اس کی طرف دیکھتے ہوئے رکا۔

''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟'' زل نے حیرت سے پوچھا۔

''زل...... میری زندگی میں جو خلا ہے...... جو کمی ہے...... وہ آپ کی وجہ سے ہے...... میں نے بہت کوشش کی کہ آپ کی محبت کو اپنے دل سے نکال سکوں...... مگر یہ محبت ہر روز بڑھتی جاتی ہے۔ اب یہ محبت نہیں...... عشق ہے...... میں آپ سے کتنی محبت، کتنا عشق کرتا ہوں...... کاش آپ جان سکیں......'' شہیر بے بسی سے رونے لگا۔

پلیز...... آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں......؟'' زل گھبرا کر بولی۔

''میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں...... کہ...... میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتا...... میری زندگی...... میری سانسیں...... آپ کے بغیر ادھوری ہیں...... میرا دل آپ کے بغیر اداس اور بے چین رہتا ہے اور روح پیاسی...... میں کیا کروں......؟ کیا میں اتنا برا ہوں کہ آپ نے مجھے کبھی اس قابل ہی نہیں سمجھا...... کہ میرے بارے میں سوچتیں...... کیا میری محبت اتنی گھٹیا ہے کہ آپ اسے کوئی اہمیت نہیں دیتیں...... کیا میں واقعی اس قابل نہیں کہ آپ کی زندگی میں کبھی آ نہیں سکتا، زل...... میں...... میں...... آپ کے بغیر نہیں رہ سکتا...... اور اگر آپ نہ ملیں تو میں مر جاؤں گا'' شہیر بے بسی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ زل اس کی باتیں سن کر گھبرانے لگی۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اسے کیا کہے...... اس کے بہتے آنسوؤں کی صداقت کو جھٹلائے یا اس کے کہے ہوئے الفاظ کی سچائی پر یقین نہ کرے...... وہ غصے کا شکار ہونے لگی۔

''شہیر...... اب یہ ممکن نہیں......'' وہ آہستہ آواز میں بولی۔

''کیوں ممکن نہیں......؟'' شہیر نے حیرت سے پوچھا۔

''ارسلان ایک بہت بڑی ذمہ داری مجھ پر ڈال گیا ہے۔ مجھ پر اس کی ہونے والی اولاد کی ذمہ داری ہے۔ پلیز آپ ایسا سوچنا چھوڑ دیں'' زل نے اسے ٹالنے کے انداز میں کہا۔

"میں آپ سے کچھ نہیں چھیننا چاہتا۔ میں جو چاہتا ہوں وہ صرف آپ ہی مجھے دے سکتی ہیں۔ میں ارسلان کی اولاد کو اپنے سینے سے لگا کر پالوں گا۔ پلیز آپ مجھے اس قابل تو سمجھیے" شہیر بے بسی سے التجائیں کرنے لگا تو زل خاموش ہو گئی۔ اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا...... وہ اس کی طرف خاموش نگاہوں سے دیکھتی رہی اور وہ اس خاموشی سے پرامید ہونے لگا...... زل شدید الجھن کا شکار ہو گئی تھی۔ قدرت اسے کسی آزمائش میں ڈال رہی تھی۔ نہ تو وہ ارسلان کی محبت سے دستبردار ہونا چاہتی تھی...... اور...... نہ ہی شہیر کے ٹوٹے دل کو مزید توڑنا چاہتی تھی۔ اس کے دل میں شہیر کے لئے نرم گوشہ پیدا ہو رہا تھا۔ وہ اسے دیوانوں کی طرح چاہتا تھا۔ اس کی محبت نے اسے پاگل بنا دیا تھا۔ وہ کالج کے زمانے کے شہیر اور آج کے شہیر کا موازنہ کرتی تو چونک جاتی۔ وہ اس شہیر جیسا بالکل بھی نہیں لگتا تھا۔ اس کی مبہم سی شبیہ لگتا تھا...... اس کا پیار...... مضمحل عکس...... اس کی نیم مردہ تصویر...... وہ اس کی وجہ سے بیمار ہوا تھا۔ اس کے دل کو روگ اس نے لگایا تھا...... اس کی زندگی سے خوشیاں اور اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ اس نے چھینی تھی...... اس کو اتنا مضطرب کر دیا تھا کہ اسے کسی پل بھی سکون نہیں آتا تھا۔ جو اس کی نام نہاد شادی شدہ زندگی میں تھوڑا سا سکون لے آئے۔" زل نے اس کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا۔ وہ اپنے دل پر بہت حیران ہوتی۔ جب شہیر نے پہلی بار اس سے اظہار محبت کیا تھا تو اس کا دل شہیر کے نام سے ہی بدکتا تھا اور اب وہ جیسے جیسے اس کے بارے میں مثبت ہو کر سوچتی تو دل بھی اس کی ہاں میں ہاں ملاتا۔ وہ دل کی دوغلی پالیسی پر حیران ہوتی تھی...... مگر جو بھی تھا اب دل شہیر کے بارے میں اسے مثبت جواب دے رہا تھا۔

"زل...... ہم کب شادی کریں گے؟" ایک روز شہیر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"آف کورس...... بے بی کے بعد......" زل نے مسکرا کر جواب دیا۔

"زل...... اور وہ دن...... میری زندگی کا سب سے زیادہ خوشی کا دن ہوگا جب تم میری زندگی میں آؤ گی۔ میرا دل چاہتا ہے میں تمہارے قدموں تلے اتنے پھول بچھاؤں...... کہ...... تمہارا کوئی قدم زمین پر نہ پڑے...... تمہاری آنکھوں کو خوشی کے جگنوؤں سے بھر دوں...... زل تم سوچ نہیں سکتی...... کاش تم میرا دل کھول کر دیکھ سکتی......" شہیر فرط جذبات سے بولا۔

"اس میں ہر طرف خون ہی خون نظر آئے گا" زل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں...... آپ کی محبت کے زخم کھا کر خون کے آنسو روتا ہے" شہیر نے مسکرا کر جواب دیا۔

"کیا ابھی بھی روتا ہے......؟" زل نے مسکرا کر معنی خیز انداز میں پوچھا۔

نہیں...... اب تو بہت خوش ہے...... بات بے بات مسکراتا رہتا ہے۔ نجانے محبوب کی نظر میں کیا جادو ہوتا ہے کہ دل قابو میں ہی نہیں رہتا...... محبوب کے اک جلوے پہ سب کچھ قربان کرنے کو جی چاہتا ہے...... آپ کو اس دل کی کیا کیا خرابیاں بتاؤں؟ شہیر شوخ لہجے میں بولا۔

"بس...... بس...... اب سارا الزام دل کو مت دو......" زل نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

"کیا آپ کو واقعی یقین نہیں آتا کہ دل کیا کیا چار سو بیسیاں کرتا ہے...... محبوب روٹھ جائے تو یہ بیمار...... محبوب خوش تو یہ خوشی سے دیوانہ...... اور...... اگر محبوب کوئی تمنا کرے تو آسمان کے تارے اس پر قربان...... محبوب کی ابرو کے اشارے پر جان فدا اور تخت و تاج محبوب کے

قدموں پر نچھاور...... آپ نہیں جانتی...... یہ دل کس حد تک مجبور اور بے بس کر دیتا ہے مگر پھر بھی بے گناہ...... بندے کو پھنسا کر...... خود معصوم بن کر لاتعلق ہو جاتا ہے...... سب کو چھوڑ دیے...... مجھ سے پوچھیں...... مجھ پر کیا بیتی...... ساری دنیا ویران اور سونی لگتی تھی...... اور اب تو جھاڑیوں میں بھی پھول کھلے نظر آتے ہیں...... پہلے مسکراتے لوگوں کو دیکھ کر بھی غصہ آتا تھا اور اب خود بخود مسکراہٹ لبوں پر پھیلتی ہے......'' شہیر مسکراتے ہوئے بولا۔

''کیا مطلب......؟'' زل نے جان بوجھ کر پوچھا۔

''مطلب واضح ہے...... یہ محبت کا اثر ہے...... اور...... جو اس کا اسیر ہو جاتا ہے وہ اسی طرح دیوانہ ہو جاتا ہے...... اسی لئے تو کہتے ہیں...... محبت چھپائے نہیں چھپتی...... اس میں کسی کو ڈیل کرنے کے کافی سے زیادہ چانسز ہوتے ہیں'' شہیر ہنسا...... تو اسے خود محسوس ہوا جیسے وہ برسوں بعد دل سے ہنس رہا ہو۔

''زل...... میں پورے پانچ سالوں بعد آج ہنس رہا ہوں...... اور یہ ہنسی...... یہ مسکراہٹ آپ کی وجہ سے ہے...... ورنہ...... ہم تو سوکھے پھول کی طرح جھڑتے ہی رہتے تھے'' شہیر نے کہا تو زل اس کی بات سن کر مسکرا دی۔

☆

حرا...... شہیر میں واضح تبدیلی محسوس کر رہی تھی۔ اس نے ڈرنک کرنا تقریباً چھوڑ دیا تھا اور موڈ بھی قدرے خوشگوار رہتا...... حرا سے کوئی قریبی تعلق تو نہیں تھا...... لیکن اب حرا سے وہ خود ہی کوئی نہ کوئی بات کرنا شروع ہو گیا تھا...... کبھی اس کی مصروفیت کا پوچھتا...... کبھی ہاسپٹل کا...... کبھی اس کی جاب کا...... کبھی اس کو اپنی صحت کا خیال رکھنے کو کہتا تو وہ چونک کر اس کی جانب حیرانگی سے دیکھتی تو دیکھتی ہی رہ جاتی۔

شہیر اب زندگی کی طرف لوٹ رہا ہے...... اسے میں نظر آنے لگی ہوں...... وہ مجھ سے باتیں کرنے لگا ہے...... اس کا مطلب ہے اس کا دل میری طرف مائل ہو رہا ہے...... وہ خوش بھی رہنے لگا ہے...... اور...... اس کی آنکھوں میں ٹھہری اداسی اور نمی بھی کم ہونے لگی ہے۔ وہ کمرے میں لیٹ کر چھت کو گھورتا نہیں رہتا...... وہ اچھا میوزک سننے لگا ہے اور کئی سالوں کے بعد اس نے اپنے اسٹوڈیو میں جا کر پینٹنگز بنانا شروع کی ہیں......

اسے شہیر کی ہر بات اور ہر حرکت پر حیرانگی ہوئی مگر اس کے ساتھ خوشی کا گہرا احساس اس کا دل سرشاری سے بھر دیتا...... اسے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے اس کی اذیت کے دن ختم ہونے والے ہوں جب یمیر کو شہیر کے بارے میں معلوم ہوگا تو وہ کس قدر خوش ہوگا...... اس نے مجھے جس آزمائش میں ڈالا تھا میں اس آزمائش میں سرخرو ہو جاؤں گی...... وہ شہیر کی صحت مند زندگی تو چاہتا تھا...... اسے نارمل زندگی گزارتے ہوئے دیکھنا چاہتا تھا۔ یمیر یہ سب جان کر کتنا خوش ہوگا۔ حرا شہیر کے بارے میں مثبت سوچ کر خوش ہو جاتی۔

حرا شام کو ہاسپٹل سے لوٹی تو شہیر اپنے سٹوڈیو میں ایک پینٹنگ بنانے میں مصروف تھا۔ چائے، کباب اور فرنچ فرائز بنا کر اس کے اسٹوڈیو میں لے گئی۔ شہیر اسے دیکھ کر مسکرانے لگا، حرا نے ٹرے اس کے قریب ٹیبل پر رکھا اور چائے بنانے لگی۔

''چائے پی لیں......'' حرا نے مسکرا کر اسے کہا۔

شہیر اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ کر چائے پینے لگا۔

''تھینک یو.....اس وقت بہت دل چاہ رہا تھا.....آپ خود ہی چائے لے آئیں.....'' شہیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مجھے معلوم تھا.....آپ کو چائے کی طلب ہو رہی ہوگی'' حرا نے مسکرا کر جواب دیا۔

''کیسے.....آپ کو کیسے پتہ چلا.....؟'' شہیر نے حیرت سے پوچھا۔

''جن کے قریب رہتے ہیں.....ان کی بہت سی باتوں کا خود بخود پتہ چل جاتا ہے'' حرا نے مسکرا کر معنی خیز انداز میں جواب دیا۔

شہیر اس کی بات سن کر ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

''چائے بہت اچھی ہے'' وہ بات کا رخ بدلتے ہوئے بولا۔

''تھینک یو..... جب انسان کا دل مطمئن اور خوش ہوتا ہے تو ہر چیز اچھی لگتی ہے'' حرا نے جواب دیا۔

''آپ ہاسپٹل سے کب آئیں؟'' شہیر نے پوچھا۔

''ایک گھنٹہ ہو گیا ہے..... شیف چائے بنا رہا تھا.....تو میں اس کے ساتھ بنانے لگی اور آپ کے لئے اوپر لے آئی..... شہیر.....ایک بات پوچھوں.....'' حرا نے بہت ہمت کر کے پوچھا۔

''ہاں.....'' شہیر نے استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔

''آج کل آپ بہت خوش لگ رہے ہیں.....کیا.....؟'' حرا نے سوال ادھورا چھوڑا تا کہ وہ خود جواب دے۔

''ہاں.....یونہی.....ایسی کوئی بات نہیں'' اس نے بات گول کی اور خاموش ہو گیا۔

حرا کو محسوس ہوا جیسے وہ اس کا جواب نہ دینا چاہتا ہوں.....اس لئے اس نے مزید پوچھنا پسند نہ کیا اور برتن ٹرے میں رکھ کر باہر نکل آئی'' شہیر اپنی پینٹنگ بنانے میں پھر مصروف ہو گیا۔

☆

زل اپنے نئے گھر کو بیچنا چاہ رہی تھی.....اس نے اس کا ایک ایک کونہ ارسلان کے ساتھ مل کر ڈیکوریٹ کیا تھا۔ اس میں رہنے اور بسنے کا خواب دونوں نے اکٹھے دیکھا تھا۔ مگر اب ارسلان کے بغیر وہ گھر اسے اچھا نہیں لگتا تھا..... گیٹ پر قدم رکھتے ہی اسے ارسلان کی لاش نظر آتی تھی.....ارسلان کے قتل کے بعد وہ دوبارہ کبھی اس گھر کی طرف نہیں گئی تھی۔ اس کے ساس سسر اس کو بہت سمجھاتے مگر وہ کوئی دوسری بات سننے کو تیار نہیں تھی.....شہیر نے بھی اسے بہت سمجھایا.....شہیر یہ گھر اس سے خرید کر اسے ہی گفٹ کرنا چاہتا تھا مگر وہ کسی بات پر نہیں مانتی تھی۔

''نہیں.....شہیر.....میں وہاں نہیں رہ سکوں گی'' زل نے قدرے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''کیوں.....؟'' شہیر نے حیرت سے پوچھا۔

''وہاں.....مجھے ارسلان بہت یاد آئے گا.....اور.....میں شدید ذہنی اذیت میں مبتلا ہو جاؤں گی.....'' زل بے بسی سے بولی۔

شہیر اس کی بات سن کر خاموش ہو گیا۔

''میں کبھی نہیں چاہوں گا.....کہ.....میرے اور تمہارے درمیان کوئی تیسرا آئے''شہیر نے دل میں سوچا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں.....انسان کا ماضی.....اس کے حال اور مستقبل کو بھی اذیت ناک بنا دیتا ہے.....اور میں آپ کو کسی قسم کی اذیت میں دیکھنا نہیں چاہوں گا.....''شہیر نے جواب دیا تو زل بھی خاموش ہو گئی۔

''شہیر.....شادی کے بعد ہم کہاں رہیں گے؟''اچانک زل نے پوچھا تو شہیر نے چونک کر اسے دیکھا۔

''میرے گھر میں.....''شہیر نے بے ساختہ جواب دیا۔

''اور آپ کی بیوی.....کیا وہ بھی وہاں رہے گی؟''زل نے پوچھا۔

''میں نے اس کے بارے میں کچھ نہیں سوچا.....''شہیر نے جواب دیا۔

''کیا مطلب.....؟''آپ نے ابھی تک کچھ فیصلہ نہیں کیا۔

''بے بی کی برتھ نزدیک آ رہی ہے.....''زل نے کہا تو شہیر سوچ میں پڑ گیا۔

''آپ کیا چاہتی ہیں.....کیا حرا اس گھر میں رہے یا پھر آپ کسی اور گھر میں شفٹ ہونا پسند کریں گی.....''شہیر نے پوچھا۔

''کیا آپ اس شادی کے بارے میں حرا کو بتائیں گے؟''زل نے حیرت سے پوچھا۔

''میرا خیال ہے اس کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا.....کیونکہ وہ جیسی زندگی میرے ساتھ گزار رہی ہے.....اس سے بہت بہتر وہ تنہا زندگی گزار سکتی ہے''شہیر نے کہا تو زل خاموشی سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا.....اسے کیا کہے.....اور کس موضوع پر.....؟

☆

''ڈاکٹر صاحبہ.....ایک ایکسیڈنٹ کیس ہے۔وہ ایمرجنسی روم میں ہے''سٹاف نرس نے ڈاکٹر حرا کو آ کر گھبراہٹ میں بتایا۔

حرا جلدی سے اٹھی.....اور اس کے ہمراہ چلی گئی۔

مریضہ کی حالت بہت خطرناک تھی.....حرا نے اسے چیک کیا۔

''اس کا آپریشن بہت ضروری ہے.....اس کی فیملی کہاں ہے.....ان کو جلدی سے بلاؤ.....''حرا نے جلدی جلدی کہا۔

ایک نرس نے پیپرز تیار کیے اور زل کی ساس اور سسر کو بلا لائی اس کے پیرنٹس ابھی تک نہیں پہنچے تھے۔

''مریضہ کا کیا نام ہے.....؟''حرا نے جلدی سے پوچھا۔

''زل.....زل.....ارسلان''اس کا سسر بولا۔

حرا کو جھٹکا لگا.....اس کا پین لکھتے لکھتے رک گیا.....اس نے چونک کر حرا کی ساس کی طرف دیکھا۔

''یہ کیا کرتی ہیں؟''حرا نے تصدیق کرنے کے لئے پوچھا۔

''تصویریں بناتی ہے.....''اس کی بوڑھی ساس بولیں۔

''آرٹ اکیڈمی میں کام کرتی ہے'' اس کے سسر نے کہا۔

''اور ان کے شوہر کہاں ہیں......؟'' حرا نے پوچھا۔

''اب وہ اس دنیا میں نہیں......'' اس کے سسر نے بتایا۔

''اوہ......ویری سوری......زل کی حالت بہت خطرناک ہے ان کا آپریشن ہوگا......لیکن ایک بات بتانا بہت ضروری ہے......کہ مریضہ کی جو حالت ہے......اس کے پیش نظر یا بچے کی جان بچائی جا سکتی ہے......یا......ماں کی......آپ لوگوں کا کیا خیال ہے......'' حرا نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

زل کی ساس اور سسر نے ایک دوسرے کو دیکھا اور خاموش ہو گئے۔

''میرے بیٹے کی نشانی......؟'' ساس نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا اور رونا شروع ہو گئی۔

''ڈاکٹر......کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ دونوں کو بچا لیں......'' اس کے سسر نے پوچھا۔

''ظاہر ہے......میں اپنی پوری کوشش کروں گی مگر......کچھ کہہ نہیں سکتی'' حرا نے کہا۔

''آپ جو مناسب سمجھیں'' اس کے سسر نے کہا۔

''ٹھیک ہے......یہاں دستخط کر دیں'' حرا نے پین اور کاغذ اس کے سسر کو تھماتے ہوئے کہا۔ انہوں نے خاموشی سے دستخط کر دیئے۔ حرا کاغذات لے کر اندر چلی گئی۔

اس کا ذہن بری طرح الجھ گیا تھا......زل کو آپریشن تھیٹر میں لایا گیا۔ اس دوران حرا اپنے آپ سے الجھتی رہی۔ اس کا دل بری طرح لرز رہا تھا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور چہرے پر پسینہ آ رہا تھا......اس نے زل کی طرف دیکھا، سوچا اور ملحقہ کمرے میں چلی گئی۔

''یہ وہ ہے......جس کی وجہ سے شہیر مجھ سے دور ہے اور مجھے محبت، ہمیشہ اس کے صدقے میں ملی ہے......اگر یہ ہم دونوں کے درمیان نہ ہو......تو......شہیر میرے قریب آ سکتا ہے......وہ آہستہ آہستہ میرے قریب آ رہا ہے......اگر یہ نہ ہو......تو......تو......؟'' حرا نے ایک لمحے کے لئے سوچا۔

''ڈاکٹر صاحبہ......آ جایئے......آپریشن تیار ہے'' سٹاف نرس نے آ کر اسے اطلاع دی۔

''قدرت مجھے کیسے کیسے آزما رہی ہے......کیا کروں......؟ مجھے کیا کرنا چاہیے......میرے ہاتھ میں کسی ایک کو بچانے کا اختیار دے کر مجھے اس نے کس قدر ذہنی اذیت میں ڈال دیا ہے'' آپریشن تھیٹر میں داخل ہوتے ہوئے اس نے سوچا۔

اس نے زل کی طرف بھرپور نگاہوں سے دیکھا اور اس کے دل میں اس کے لئے کوئی اچھے جذبات نہیں تھے۔ اس نے بچے کو بچانے کا سوچ لیا تھا۔

اس نے آپریشن شروع کیا......تو دوا بیریشن پر آن اس کا موبائل بجا......اس نے چونک کر موبائل کی طرف دیکھا......جو ایک نرس کے پاس تھا۔

''کس کا فون ہے؟'' حرا نے پوچھا۔

''کسی سمیر صاحب کا فون ہے'' نرس نے دیکھ کر جواب دیا۔

''فون آف کر دو'' حرا نے کہا۔

''سمیر نے مجھے اس وقت کیوں فون کیا ہے......؟ اس نے تو کبھی مجھے فون نہیں کیا...... پھر...... کیوں؟'' وہ چونکی مگر اس کے خیال کو جھٹک کر آپریشن کرنے میں مصروف ہو گئی۔

''محبت انسان کو خود غرض بنا دیتی ہے۔ جب وہ صرف اپنی ذات، اپنی خوشیوں اور تمناؤں کے بارے میں سوچتا ہے اور جب اس کی محبت میں سب کا دکھ، درد شامل ہوتا ہے تو وہ مسیحا بن جاتا ہے...... حرا تم خوش قسمت ہو...... قدرت نے تمہیں مسیحا بنایا ہے'' سمیر کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔ وہ الجھنے لگی...... اس کا دل پریشان ہونے لگا...... مگر وہ آپریشن کرنے میں مصروف رہی۔

''کیا ہے......؟'' نرس نے پوچھا۔

''بے بی...... بچائے'' حرا نے سرگوشی کی۔

سب نے حرا کی طرف دیکھا۔ سب کی نظروں میں استفہام تھا...... حرا کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات نمایاں ہو رہے تھے۔ اس کے اندر شدید کشمکش جاری تھی۔

''تم...... مسیحا ہو...... تم خوش قسمت ہو...... الفاظ پھر گونجے''۔ حرا کو اچانک اپنا ارادہ بدلنا پڑا...... اس نے جو سوچا پھر اس پر مطمئن ہو گئی۔

اس نے زل کو بچا لیا...... اس کے ذہن سے بوجھ اتر گیا۔ اسے یوں لگا جیسے سمیر نے اسے اس خاص مقصد کے لئے فون کیا تھا۔

سمیر کے فون میں کوئی پراسرار حکمت موجود تھی۔ سمیر کے فون کے بعد حرا نے اپنا ذہن بدلا تھا۔ اور سمیر نے کبھی بھی اسے ہاسپٹل کے اوقات میں فون نہیں کیا تھا۔ پھر آج کیوں......؟ اور اس وقت ہی کیوں......؟ شاید اس کو معلوم ہو گیا تھا کہ میں کیا کرنے جا رہی تھی...... اور وہ یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ میں نے کبھی اس کا کہا نہیں ٹالا۔ وہ آپریشن تھیٹر سے باہر نکلی۔ زل کے والدین بھی پہنچ چکے تھے۔ سب نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

''بچے کو بچانا ممکن نہیں تھا...... ماں ٹھیک ہے'' وہ جلدی سے کہہ کر اپنے کمرے میں گئی...... اور تھکے ہوئے انداز میں کرسی کی پشت کے ساتھ سر لگا کر چھت کی طرف دیکھنے لگی...... اس کا دل سرشار بھی تھا اور مضطرب بھی۔ مطمئن بھی...... اور...... بے قرار بھی...... جیسے کوئی صاحب دل اپنی پلیٹ میں پڑا سارا کھانا خیرات میں دیتا ہے...... یہ سوچتے ہوئے کہ مانگنے والے کو اس کھانے کی زیادہ ضرورت ہے اور سب کچھ دے کر اس کا دل خوش بھی ہوتا ہے مگر اسے اپنی بھوک کی بھی فکر ہوتی ہے...... یہی حال اس کا بھی تھا۔ وہ مطمئن بھی تھی مگر دل کے بچ جانے کی صورت میں بہت سے خدشات اور وسوسے بھی تھے۔ اس نے آہ بھری۔

نرس اس کا موبائل لے کر اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔

''ڈاکٹر صاحبہ...... آپ اپنا موبائل آپریشن تھیٹر میں بھول آئیں'' نرس نے اسے موبائل پکڑاتے ہوئے کہا۔

''تھینک یو......'' اس نے موبائل پکڑ کر آن کیا۔ نرس کمرے میں سے باہر نکل گئی۔ اسی لمحے اس کا موبائل بجنے لگا۔ اس نے موبائل دیکھا، سمیر کا فون تھا۔

''ہیلو......'' حرا نے آہستہ آواز میں کہا۔

''حرا...... کیسی ہو......؟ تم ٹھیک ہونا......'' سمیر قدرے گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''ہاں...... کیوں...... کیا بات ہے؟'' حرا نے پوچھا۔

کل رات میں نے تمہیں خواب میں بہت پریشان دیکھا۔ اس وقت سے میں بہت اپ سیٹ ہوں...... اور تمہارا نمبر ملا رہا ہوں...... مگر کال ہی نہیں مل رہی تھی'' سمیر نے بتایا۔

''تھینکس فار یور کال...... آئی ایم فائن'' وہ آہستہ آواز میں بولی۔

''شہیر تو ٹھیک ہے نا...... وہ تمہارے ساتھ'' سمیر نے پوچھا۔

''ہاں...... سب ٹھیک ہے'' حرا نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''اپنا خیال رکھنا'' سمیر نے کہہ کر فون بند کر دیا۔

اور وہ موبائل کو پکڑے گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

محبت بھی کیسا عجیب رشتہ ہے...... جس میں دل ایک دوسرے سے برقی تاروں سے بھی زیادہ مضبوطی سے جڑے ہوتے ہیں...... جو اَن کہی باتیں...... اَن دیکھے دکھ اور ان کہے خیالات ایک دوسرے تک بغیر کسی رکاوٹ اور ذریعے کے پہنچا دیتے ہیں...... سمیر ایک روز پہلے ہی جان گیا کہ آج کا دن میرے لئے بہت مشکل ہوگا اور ان بھاری لمحوں میں اس کا فون آنا...... اور میرے ارادے کو بدلنا...... اسے سب کچھ بہت پراسرار لگا۔

''محبت بہت پراسرار ہوتی ہے...... پیاز کے مہین چھلکوں کی مانند پرت در پرت اسراروں سے مزین...... ہر پرت خوبصورت، نازک اور جاذب نظر آتا ہے مگر اس کے کھلنے پر ایک اور پرت...... ایک اور اسرار سے آشنائی ہوتی ہے۔ محبت بہت عجیب کھیل ہے...... جس میں جیت کر بھی ہار کی سی کیفیت ہوتی ہے اور ہار کر جیت کا لطف ملتا ہے'' وہ اپنی ہی سوچوں میں گم تھی کہ اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔

''ڈاکٹر صاحب...... باہر آپ کا ڈرائیور کافی دیر سے انتظار کر رہا ہے'' انٹر کام پر اسے کسی نے اطلاع دی اور وہ اپنا بیگ اٹھا کر باہر نکل گئی۔

☆

زل کی حالت اب خطرے سے باہر تھی۔ وہ ہوش میں تھی اس کے پاس اس کی ماں اور ساس تھیں۔ جب حرا راؤنڈ پر آئی تو اس کے آنے سے پہلے نرس نے سب لوگوں کو کمرے سے باہر بھیجا۔ حرا کمرے میں داخل ہوئی...... اور زل کی جانب مسکرا کر دیکھا۔

''کیسی ہیں آپ......؟'' حرا نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں......'' زل آہستہ آواز میں بولی۔

حرا اس کا چیک اپ کرنے لگی۔

''ڈاکٹر صاحب.....کیا واقعی آپ میرے بچے کو نہیں بچا سکیں؟'' زل نے نم آنکھوں سے پوچھا۔

''نہیں.....میں نے ہر ممکن کوشش کی.....مگر ایک کو ہی بچایا جا سکتا تھا.....آپ کو.....یا.....آپ کے بچے کو'' حرا نے جواب دیا۔

''تو.....آپ اسے بچا لیتیں.....وہ میرے شوہر کی محبت کی نشانی تھی.....'' زل روتے ہوئے بولی۔

''آپ پریکٹیکل ہو کر سوچیں.....بن ماں باپ اولاد کا جو حال ہوتا ہے.....وہ شاید آپ نہیں جانتی.....اور.....آپ کے شوہر کی محبت کی نشانی وہ صرف آپ کے لئے ہوتا.....اور کسی کے لئے نہیں.....اس لئے ذہن پر بوجھ مت ڈالیں.....جو قدرت کو منظور ہوتا ہے.....وہی ہوتا ہے'' حرا نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ زل اس کی باتیں سن کر خاموش ہو گئی مگر اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے.....حرا کو اس سے ہمدردی محسوس ہونے لگی۔

''حوصلہ رکھیں.....انسان کبھی جذبوں کی وجہ سے آزمایا جاتا ہے اور کبھی رشتوں کی وجہ سے.....کبھی محبت، کٹھن راہ بن جاتی ہے اور کبھی خون کے رشتے وبال جان بن جاتے ہیں.....پلیز آپ پریشان مت ہوں.....ہر بات کے پیچھے ایک گہرا راز ہوتا ہے.....'' حرا نے اسے محبت بھرے لہجے میں سمجھایا۔

اسی لمحے شہیر خوبصورت سا بوقے لے کر کمرے میں داخل ہوا.....حرا کو زل کے پاس کھڑے دیکھ کر وہ بری طرح چونکا۔ حرا نے ایک نظر اسے اور پھر بوقے کو دیکھا.....اور خاموشی سے باہر نکل گئی۔

''یہ.....یہ.....تم سے کیا کہہ رہی تھی؟'' شہیر نے جلدی سے بولا۔

''کون.....؟'' زل نے حیرت سے پوچھا۔

''یہ.....حرا تھی.....'' شہیر مزید کچھ نہ کہہ سکا۔

''تمہاری بیوی.....؟'' زل نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

''ہاں.....'' شہیر آہستہ آواز میں بولا۔

زل بری طرح چونکی اور پھر خاموش ہو گئی۔

''تم کیسی ہو.....؟'' شہیر نے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں.....'' وہ آہستہ آواز میں بولی۔

''تمہارے بے بی کا جان کر بہت افسوس ہوا'' شہیر نے کہا۔

''ڈاکٹر بتا رہی تھی کہ کسی ایک کو بچایا جا سکتا تھا.....مجھے یا اسے.....اور.....اس نے مجھے بچا لیا'' زل کہہ کر خاموش ہو گئی اور شہیر کی طرف دیکھنے لگی۔

شہیر اس سے یوں نظریں چرانے لگا جیسے اس نے کسی جرم کا ارتکاب کیا ہو۔ کمرے میں گہرا سکوت چھا گیا۔ دونوں کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا.....سوائے خاموشی کے۔

☆

حرا...... شہیر کو زل کے کمرے میں دیکھ کر بہت پریشان ہو گئی تھی...... اسے پچھلے کئی ماہ سے شہیر کے بارے میں جو خوش فہمی ہوئی تھی...... اس کی وجہ وہ اب جان گئی تھی...... اس کا دل کرچی کرچی ہونے لگا۔ ان کے نام نہاد رشتے میں جو جان پیدا ہونے لگی تھی۔ اب وہ نیم جان رشتہ پھر دم توڑنے کے قریب تھا...... اسے بار بار شہیر کا چہرہ یاد آ رہا تھا۔ جب وہ بوتے پکڑے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر انجانی سی خوشی تھی۔ جو صرف حرا کو ہی نظر آئی۔

''میں کچھ بھی کرلوں...... شہیر میرے لئے وہ جذبات کبھی بھی نہیں محسوس کر سکتا جو وہ زل کے لئے کرتا ہے'' حرا نے آہ بھر کر سوچا اور اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

''اب مجھے فیصلہ کرنا ہوگا...... اب شہیر اور زل کے درمیان مجھے نہیں آنا چاہیے...... میں پہلے بھی اس کی زندگی میں ایکسٹرا تھی...... اب بھی ہوں...... اور شاید ہمیشہ رہوں گی۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ خاموشی سے اس کی زندگی سے نکل جاؤں۔ حرا نے سوچتے ہوئے اپنے سامان کی پیکنگ شروع کر دی اور ہاسپٹل سے کچھ روز کی چھٹی لے لی...... مسز تہمینہ کو اس نے فون کر کے بتا دیا کہ وہ ایمرجنسی میں اپنے والدین کے پاس جا رہی ہے...... وہ بھی مزید کچھ نہ پوچھ سکیں۔ کیا تم نے شہیر کو بتایا ہے؟ مسز تہمینہ نے پوچھا۔

''ان کو بتانے یا نہ بتانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا......'' حرا نے کہا تو مسز تہمینہ خاموش ہو گئی۔

شہیر رات کو دیر سے گھر لوٹا تو حرا کمرے میں موجود نہیں تھی...... اسے اس کا بیگ، گاڑی کی چابیاں، موبائل کچھ بھی نظر نہ آیا۔ اس نے اپنی رسٹ واچ دیکھی۔ رات کے بارہ بج رہے تھے۔ وہ عموماً اس وقت آ جاتی ہے...... اگر نائٹ ڈیوٹی ہو تو وہ ملازمہ کے ذریعے اسے انفارم کر دیتی تھی لیکن اب شہیر نے ملازمہ سے بھی پوچھا تھا اور اس نے یہی بتایا تھا کہ وہ اپنا ایک بیگ لے کر گئی ہے۔ شہیر نے مسز تہمینہ کو فون کر کے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ وہ ایمرجنسی میں اپنے والدین کے پاس چلی گئی ہے...... شہیر کے دل میں وسوسے پیدا ہونے لگے...... وہ صبح والے واقعہ پر غور کرنے لگا اور اسے یقین ہونے لگا کہ حرا...... اس کے اور زل کے بارے میں سب کچھ جان گئی ہے...... اسی لئے وہ گھر چھوڑ کر چلی گئی ہے...... شہیر کے دل میں اک عجیب سا احساس پیدا ہونے لگا...... کسی غلطی کا احساس یا کسی جرم کا...... یا کچھ اور......؟ اسے کچھ نہیں آ رہا تھا...... مگر اسے کمرہ بہت سونا اور خالی محسوس ہو رہا تھا...... یا پھر وہ حرا کو اس کمرے میں دیکھنے کا عادی ہو چکا تھا...... گو کہ اسے اس کی ذات اور اس کے وجود سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ کبھی بھی اس کے لئے اہم نہیں تھی...... اس نے کبھی اسے کسی بات پر ناراض ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ اور اگر وہ کسی بات پر خفا بھی ہوتی تو اس نے کبھی اس کی ناراضگی اور خوشی کی پرواہ نہیں کی تھی...... اس نے کبھی اسے نہیں منایا تھا...... کبھی خوش کرنے کے لئے کوئی جملہ نہیں کہا تھا...... اس نے تو کبھی اس کے موبائل پر کوئی میسج یا کال نہیں بھیجی تھی...... وہ ہے، تو ٹھیک ہے، نہیں...... تو...... نہ سہی اگر وہ اپنی مرضی سے جاتی تو شاید اسے کوئی خلش محسوس نہ ہوتی مگر اب اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے حرا اس سے ناراض ہو کر گئی ہے......''اب اگر وہ چلی گئی ہے تو میں اسے جانے سے کیسے روک سکتا ہوں''...... وہ اپنے دل کو تسلی دیتا...... مگر...... پھر تھوڑی دیر کے بعد کوئی اور احساس اس کے دل کو مضطرب کرنے لگتا اور وہ بے چین ہونے لگتا...... لیکن زل کا خیال آتے ہی وہ پرسکون ہونے لگتا...... زل کے بارے میں وہ اب بہت پرامید ہونے لگا تھا۔ اگر اس کا بچہ زندہ رہتا تو ممکن ہے اس کے

سسرال والے اس سے بچہ چھیننے کی دھمکی دے دیتے......اور زل مجبور ہو کر شادی نہ کرتی......مگر......اب تو قدرت نے خود بخود اس کے لئے سارے راستے صاف کر دیے تھے۔اب زل کے پاس انکار کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہوگی......اسے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے قدرت اس پر نظر کرم کر رہی ہے......اس کے لئے ساری رکاوٹیں دور کر رہی ہے......اب زل اور اس کے درمیان تیسرا کوئی نہیں......نہ ارسلان......نہ حرا......نہ ارسلان کا بچہ......صرف زل......اور......وہ......''وہ مطمئن ہونے لگا۔

زل کی حالت قدرے بہتر ہو گئی تھی۔ہاسپٹل میں جتنے روز وہ رہی......حرا کی بجائے ڈاکٹر مہوش ڈیوٹی پر آتی رہی......اس نے ایک دو بار نرس سے پوچھا تو اسے یہی بتایا گیا کہ ڈاکٹر حرا چھٹی پر ہیں......اور شہر سے باہر گئی ہیں......زل سن کر بے چین ہو گئی تھی......اور اس کے دل میں بھی عجیب سا احساس پیدا ہونے لگا تھا......کہ کہیں وہ شہیر اور اس کے بارے میں کچھ جان تو نہیں گئی......زل نے اس سے قبل حرا کے بارے میں کبھی نہیں سوچا تھا۔وہ اسے اپنے اور شہیر کے درمیان کبھی بھی اتنا اہم اور اس قابل نہ سمجھی کہ اس کے بارے میں کچھ سوچتی یا شہیر سے ڈسکس کرتی......مگر......اب...... وہ اچانک اتنی 'اہم' ہو گئی تھی کہ زل کے ذہن میں ہر وقت سمائی رہتی اور وہ اس کی وجہ سے شدید الجھن کا شکار رہتی۔

انسان بھی بہت عجیب ہے......جب کسی کو اہمیت نہیں دیتا تو اس کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتا......اور جب اچانک کسی کو اہمیت دیتا ہے تو پھر تمام سوچوں پر وہی حاوی ہو جاتا ہے......زل اس کی وجہ سے الجھ رہی تھی۔

جس روز ہاسپٹل سے ڈسچارج ہو کر گھر آئی تو اسے ڈاکٹر حرا بہت یاد آ رہی تھی......اسے حرا کے کہے ہوئے الفاظ بار بار یاد آ رہے تھے ''پلیز آپ اپنے ذہن پر بوجھ مت ڈالیں۔ہر بات کے پیچھے گہرا راز ہوتا ہے''زل نے گہری سانس لی۔زل ہاسپٹل سے اپنے سسرال چلی گئی تھی......وہ ارسلان اپنے بچے......اور حرا کی وجہ سے اپنے اندر جو خالی پن محسوس کر رہی تھی......ارسلان کے گھر جا کر وہ اپنے اندر پیدا ہونے والے اضطراب سے نجات پانا چاہتی تھی......شہیر اس کی صحت یابی کا منتظر تھا......اور اس موقع کا جب وہ اس کے ساتھ مستقبل کی پلاننگ کرے۔

شہیر جب بھی زل کو فون کرتا......تو......اس موضوع پر بات کرتے کرتے رک جاتا......زل بھی اس کے ادھورے جملوں اور ان کہے الفاظ کا مطلب سمجھ کر خاموش رہتی۔زل نے تین چار ماہ کے بعد آرٹ اکیڈمی جانا شروع کر دیا تھا......اور......شہیر اسی بات کا منتظر تھا۔جب وہ آرٹ اکیڈمی جوائن کرے اور وہ اس سے کھل کر بات کرے۔''زل......جو کچھ بھی ہوا......مجھے افسوس ہے......مگر ہمیں اب مستقبل کا بھی سوچنا ہے......''شہیر نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''کیا انسان کو وہی ملتا ہے......جو......وہ سوچتا ہے''زل نے گہری سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا مطلب......؟''شہیر نے حیرت سے پوچھا۔

''انسان کی زندگی لمحوں میں بدل جاتی ہے......اور انسان کو کیا معلوم کہ اگلے لمحے اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟''زل نے جواب دیا۔

''ان باتوں میں حقیقت ہے......مگر یہ بھی تو حقیقت ہے کہ مستقبل کے لئے پلاننگ کرنا پڑتی ہے......کچھ بننے کے لئے بچپن سے ہی ذہن بنانا پڑتا ہے......زل......پلیز......اب میں تم سے زیادہ دور نہیں رہ سکتا......میں کب......ممی اور ڈیڈی سے بات کروں......تم جیسے کہو گی......میں

ویسے ہی کروں گا.....مگر اب مجھ سے زیادہ انتظار نہیں ہوتا" شہیر جذباتی لہجے میں بولا۔

"ٹھیک ہے..... مجھے کچھ سوچنے دو..... لیکن..... پلیز..... اب تم یہاں مت آیا کرو..... جیسے ہی حالات سازگار ہوتے ہیں..... میں اپنے والدین سے بات کرکے تمہیں انفارم کروں گی..... میں کچھ روز تک اپنے پیرنٹس کے ہاں شفٹ کر رہی ہوں" زل نے بتایا۔

"کیوں.....؟" شہیر نے حیرت سے پوچھا۔

"میں بے بی کی ڈیتھ کے بعد یہاں ایزی فیل نہیں کرتی..... اس لئے میں نے یہی فیصلہ کیا ہے کہ ممی پاپا کے پاس چلی جاؤں" زل نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا تو شہیر اس کی بات سن کر خاموش ہو گیا۔

"ٹھیک ہے..... میں انتظار کروں گا..... مگر..... پلیز..... مجھے جلدی انفارم کرنا..... میں بہت اپ سیٹ ہوں" شہیر نے اٹھتے ہوئے کہا..... تو..... زل اس کی بات سن کر خاموش ہو گئی۔

☆

ممی اور ڈیڈی بے حد پریشان تھے جب شہیر گھر لوٹا تو ان کو افسردہ دیکھ کر چونک گیا..... انہیں دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی اہم بات ہوئی ہے۔

"شہیر..... ادھر آؤ....." ڈیڈی نے اسے اپنے پاس بلایا۔

شہیر ان کی طرف آیا اور دونوں کی طرف حیرانگی سے دیکھنے لگا۔

"حرا..... اور..... تمہارے درمیان کیا بات ہوئی ہے.....؟ کیا کوئی جھگڑا ہوا ہے.....؟" ڈیڈی نے پوچھا۔

"نہیں..... ایسی تو کوئی بات نہیں ہوئی" شہیر نے جواب دیا۔

"پھر..... ایسی کیا بات ہوئی ہے..... کہ..... وہ طلاق مانگ رہی ہے....." ڈیڈی نے رک رک کر کہا تو شہیر نے ایک دم چونک کر انہیں دیکھا..... ممی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا مگر وہ خاموش رہیں۔

"آپ سے کس نے کہا ہے.....؟ کیا حرا نے.....؟" شہیر نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں..... منصور کا فون آیا تھا..... اور..... اس نے کہا تھا کہ حرا کا یہی فیصلہ ہے..... وہ اب شہیر کے ساتھ نہیں رہ سکتی" ممی غصے سے بولیں۔

"ٹھیک ہے..... اگر..... وہ نہیں رہنا چاہتی..... تو اسے کون مجبور کر سکتا ہے..... میں اسے طلاق بھیج دوں گا" شہیر قدرے پرسکون لہجے میں بولا۔

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے نا..... اتنی اچھی لڑکی کو تم نجانے کس بات کی سزا دے رہے ہو..... اس نے ہر مشکل وقت میں تمہارا ساتھ دیا..... تمہاری بیماری میں تمہاری بے حد خدمت کی..... اور..... اب تم یہ بات کر رہے ہو..... شہیر تم نے ایک بار بھی اس کے بارے میں نہیں سوچا" ممی پھر غصے سے بولیں۔

"ممی..... اگر وہ میرے ساتھ مزید نہیں رہنا چاہتی تو میں کیسے اسے مجبور کر سکتا ہوں" شہیر نے کہا۔

''شہیر......وہ......تمہاری بیوی ہے......اور میاں بیوی میں اکثر تلخیاں پیدا ہو جاتی ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ رشتہ ہی ختم کر دیا جائے......بہتر یہی ہے کہ تم حرا کو منا کر لے آؤ'' ڈیڈی نے اسے نرم لہجے میں سمجھاتے ہوئے کہا۔

''میں نہیں جاؤں گا......'' شہیر نے دوٹوک لہجے میں کہا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ممی اور ڈیڈی حیران ہو کر اسے دیکھتے رہے۔

سمیر کو جب سے حرا کے فیصلے کے بارے میں اطلاع ملی تھی۔ وہ بھی بے حد پریشان ہو گیا تھا۔ وہ بار بار حرا کو فون کر رہا تھا مگر وہ اس کی کال ریسیو نہیں کر رہی تھی۔ سمیر نے تنگ آ کر تیمور ماموں کے موبائل پر فون کیا اور ان سے کہا کہ وہ حرا سے اس کی بات کرائیں......حرا ان کی بات سن کر چونکی اور موبائل پکڑ کر بات کرنے لگی۔ منصور ماموں کمرے سے نکل گئے۔

''کہو......کیا بات ہے؟'' حرا نے تنک کر پوچھا۔

''تم گھر کیوں چھوڑ آئی ہو......؟'' سمیر نے پوچھا۔

''کون سا گھر......اور......کس کا......؟'' حرا نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔

''تمہارا گھر......اور......کس کا......؟'' سمیر نے کہا۔

''کس ناتے سے......وہ میرا گھر ہے؟'' حرا نے پوچھا۔

''وہ تمہارے شوہر کا گھر ہے......اس ناتے سے'' شہیر نے کہا۔

''سمیر......وہ گھر......اس ناتے کی طرح بہت کمزور ہے......نہ وہ گھر مجھے پناہ دے سکتا ہے اور نہ شوہر'' حرا نے نم لہجے میں جواب دیا۔

''کیا تم طلاق مانگ رہی ہو؟'' سمیر نے گھبرائے لہجے میں پوچھا۔

''ہاں......اس لئے کہ اب مزید وہاں رہ کر میں اپنے آپ کو تماشا نہیں بنا سکتی......شہیر بہت جلد زل سے شادی کر لے گا......'' حرا نے کہا تو سمیر چونک گیا۔

''یہ......یہ......تم کیا کہہ رہی ہو؟ تمہیں ضرور غلط فہمی ہوئی ہے۔ زل اس سے کیسے شادی کر سکتی ہے......شاید وہ......'' سمیر الجھتے ہوئے بولا۔

''اس کے شوہر کا قتل ہو گیا ہے......اور......اب......وہ......'' حرا کہہ کر خاموش ہو گئی۔

''حرا......تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے......تمہیں کسی نے غلط بتایا ہو گا......پلیز کسی پر یقین مت کرو'' سمیر نے اسے سمجھایا۔

''میری آنکھیں......مجھے تو دھوکہ نہیں دے سکتیں......سمیر اب کچھ کہنا سننا بیکار ہے......رشتے تبھی قائم رہ سکتے ہیں جب ہم دل سے انہیں قائم رکھنا چاہیں......جب ہم......انہیں اپنے پاؤں کی زنجیر سمجھنے لگتے ہیں......تب وہ ہمیں صرف کھینچتے ہیں......اور......پھر تنگ آ کر ٹوٹ جاتے ہیں'' حرا افسردگی سے بولی۔

''پلیز......کوئی ایسا اسٹیپ مت لینا جو......''

''جو......کیا......؟'' حرا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

''جو...... ہمیں مزید آزمائش میں ڈال دے'' سمیر نے آہ بھر کر کہا۔

حرا نے فون بند کر دیا...... اور...... رونے لگی......

''میں...... کس دوراہے پر کھڑی ہو گئی ہوں...... سمیر مجھے اس کے ساتھ رہنے پر مجبور کرتا ہے اور شہیر نے مجھے یوں بے بس اور مجبور کر دیا ہے کہ میں اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔

☆

حرا کی طرف سے شہیر کو قانونی نوٹس کورٹ کی جانب سے بھجوا دیا گیا تھا...... مسز فاخر اور فاخر حسین تو سر پکڑ کر بیٹھ گئے...... مسز فاخر رونا شروع ہو گئیں...... شہیر گھر پر نہیں تھا...... انہوں نے فون کر کے شہیر کو گھر بلایا اور اسے نوٹس دکھایا۔

''اسے کورٹ میں جانے کی کیا ضرورت تھی...... مجھے فون کرتی میں خود اسے طلاق بھیج دیتا......'' شہیر لاپروائی سے بولا۔

''یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو......؟ اور تمہیں اپنے گھر ٹوٹنے کا کوئی دکھ نہیں ہوگا'' مسز فاخر نے کہا۔

''جو گھر بسا ہی نہیں...... تو اس کے ٹوٹنے کا کیا دکھ ہوگا...... اور ویسے بھی میں زل سے شادی کرنے والا ہوں'' اس نے دوٹوک لہجے میں بتایا تو دونوں چونک گئے۔

''کون زل......؟'' مسز فاخر نے حیرت سے پوچھا۔

''میری کلاس فیلو...... میں اس سے بہت محبت کرتا ہوں'' شہیر نے بتایا اور زل کے نام پر اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''اگر محبت کرتے تھے تو پہلے ہی اس سے شادی کر لیتے'' مسز فاخر خفگی سے بولیں۔

''تب میں نے اس سے شادی کیوں نہیں کی......؟ بات یہ نہیں...... بات اب واضح اور کلیئر ہے...... کہ میں اس سے جلد شادی کرنے والا ہوں......'' شہیر نے قدرے ٹھوس لہجے میں الفاظ چبا چبا کر کہا۔

''تم ابھی حرا کو طلاق نہیں بھیجو گے...... پہلے میں زل سے ملنا چاہوں گی'' مسز فاخر نے کہا۔

''تاکہ آپ اسے حرا کے بارے میں بتائیں...... اور......''

''نہیں...... میں تمہاری موجودگی میں ہی یہ دیکھنا چاہوں گی...... کہ وہ کتنی شدت سے تمہیں محبت کرتی ہے...... یا پھر تم خواہ مخواہ اس کے پیچھے دیوانے ہو رہے ہو'' مسز فاخر نے معنی خیز انداز میں کہا تو شہیر خاموش ہو کر انہیں دیکھنے لگا۔

''ٹھیک ہے میں زل سے بات کر کے آپ کو انفارم کرتا ہوں'' شہیر کہہ کر اپنے کمرے میں چلا گیا...... اور زل کا نمبر ملانے لگا۔ زل کا موبائل آف تھا۔ وہ بار بار نمبر ملا کر تھک گیا تھا مگر کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔

''زل فون کیوں نہیں اٹینڈ کر رہی...... کہیں اس کی طبیعت خراب نہ ہو......'' شہیر نے پریشانی سے سوچا۔

رات بھر بھی وہ اس کا نمبر ٹرائی کرتا رہا مگر کوئی جواب نہ ملا۔ اگلے روز اس نے اٹھتے ہی اسے فون کیا تو اس کا نمبر مل گیا۔

"شکر ہے..... تمہارا نمبر مل گیا..... تم کہاں چلی گئی تھی..... میں کتنا پریشان ہو رہا تھا..... تم سوچ بھی نہیں سکتی" شہیر بہت بے صبری سے بولا۔

"کیوں..... ایسی کیا بات ہو گئی ہے؟" زل نے پوچھا۔

"زل..... ممی..... تم سے ملنا چاہتی ہیں....." شہیر نے بتایا۔

"کیوں.....؟" زل نے حیرت سے پوچھا۔

"یونہی..... مگر آج..... یا کل....." شہیر نے بتایا۔

"نہیں..... ابھی ممکن نہیں..... میں دو دن بعد تمہیں بتاؤں گی....." زل نے کہا۔

"او کے..... میں انتظار کروں گا" شہیر نے کہا اور فون رکھ دیا۔

"ممی..... زل دو دن بعد انفارم کرے گی" شہیر نے مسز فاخر کو بتایا۔

"کیوں.....؟ کیا وہ بزی ہے؟" ممی نے حیرت سے پوچھا۔

"معلوم نہیں..... ہو بھی سکتی ہے" شہیر نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے..... جب اس کا فون آئے تو مجھے بتا دینا" ممی نے کہا اور شہیر 'او کے' کہہ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

☆

شہیر کے لئے ایک ایک پل گزارنا مشکل ہو گیا تھا...... ایک ایک لمحہ، ایک ایک ساعت...... اس پر یوں بھاری ہو رہی تھی جیسے مجرم عدالت کے کٹہرے میں کھڑا جج کے فیصلے کا منتظر ہو...... اور گھڑی کی ٹک ٹک کے ساتھ اس کے دل کی دھڑکنیں بھی ہم آواز ہو کر بے قراری سے اذن کی منتظر ہوں۔ وہ بھی دل کی گہرائیوں سے گڑگڑا کر زِل کے حصول کے لئے دعائیں کرتا...... کبھی پر امید ہو کر مستقبل کے خواب دیکھتا، کبھی بے چین ہو کر موبائل کی طرف بڑھتا مگر پھر رک جاتا...... دوسرا دن بھی انتہائی بے چینی کی نذر ہو گیا...... ہر آنے والے لمحے کے بارے میں وہ پر امید ہوتا کہ ابھی کوئی پیغام آنے والا ہے...... ابھی زِل فون کرے گی...... مگر دوسری رات بھی گزر گئی...... زِل کا کوئی فون نہ آیا اور منتظر لمحے کسی قیامت سے کم ثابت نہ ہو رہے تھے۔

زِل نے فون کیوں نہیں کیا؟

کیا زِل مصروف ہے......؟

کیا اس کی طبیعت ٹھیک ہے......؟

ان تین سوالوں کے علاوہ کوئی اور سوال اس کے ذہن میں نہ آتا۔ وہ کسی اور بات کے بارے میں سوچنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اگلی صبح اس کے اٹھنے سے پہلے کوریئر مین ایک TCS خط اسے دے کر گیا۔ شہیر اس وقت سو رہا تھا مگر نیند میں بھی وہ زِل کا ہی منتظر تھا...... اس نے اپنے کمرے میں جا کر خط کھولا اور بے صبری سے پڑھنے لگا۔

''شہیر...... مجھ میں تمہارا سامنا کرنے کی ہمت نہیں اس لئے خط لکھ رہی ہوں...... پلیز...... جذباتی مت ہونا اور ٹھنڈے دل و دماغ سے بات کو سمجھنے کی کوشش کرنا...... میں نے پچھلی بار کی طرح اس بار بھی بہت کوشش کی کہ فیصلہ تمہارے حق میں کروں مگر قدرت نے انسان کو 'قسمت' کے ہاتھوں بڑا مجبور و بے بس کر دیا ہے...... اور...... بعض اوقات چاہتے ہوئے بھی انسان بہت سی مصلحتوں اور مجبوریوں کی خاطر وہ فیصلہ نہیں کر پاتا جس کی وہ آرزو کرتا ہے...... پچھلی بار میں دل کے ہاتھوں مجبور تھی...... میرا دل تمہیں قبول نہیں کرتا تھا...... اب دل نے قبول کیا...... تو...... ایک اور بہت بڑی مصلحت آڑے آ گئی...... میں نہیں جانتی کہ ہر بات میں خدا کا کیا راز اور کیا مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے۔ جو انسان کو اس وقت تو سمجھ میں نہیں آتی مگر بہت وقت گزرنے کے بعد اس کو تھوڑی بہت سمجھ آتی ہے جب سے میں حرا سے ملی ہوں...... میں بہت بے چین ہو گئی ہوں...... وہ بہت اچھی ہے مگر تمہیں اس کی اچھائی میری وجہ سے نظر نہیں آ رہی...... تم اس میں میرا عکس دیکھتے ہو اور بے قرار ہو جاتے ہو...... شہیر...... اس سے مل کر میں بہت پریشان ہو گئی ہوں اور سوچتی ہوں...... کہ محبت ایسی خود غرض تو نہیں ہوتی جو کسی کا گھر اجاڑ کر اپنا بسانے کی کوشش کرے...... محبت تو وفا، ایثار اور قربانی کا نام ہے...... اور جو لوگ یہ کچھ نہیں کر سکتے وہ محبت نہیں کرتے...... حرا ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے رہتی ہے...... محبت کا فلسفہ اس کے راز اور اس کے داؤ پیچ سمجھ سے باہر ہیں۔ میں اپنے کزن سے منسوب تھی...... ہمارا نکاح ہو چکا تھا مگر اس کو کاغذات کے حصول کے لئے کینیڈا میں شادی کرنا پڑی۔ اس بات کو میرے گھر والوں نے برا سمجھا اور مجھے طلاق ہو گئی...... جس روز تم میرا پورٹریٹ بنا رہے تھے...... میں اسی دکھ میں رو رہی تھی...... کیونکہ ہم دونوں بچپن سے ہی ایک دوسرے سے منسوب تھے ہم نے ایک ساتھ زندگی گزارنے کے بہت خواب اور منصوبے بنائے تھے...... مگر اچانک سب کچھ بکھر گیا...... میں ایسی ٹوٹی اور بکھری کہ مجھ سے اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس مشکل وقت میں ارسلان نے میرا ساتھ دیا۔ اس نے تم سے پہلے مجھے شادی

کی آفر کی...... اور...... یہ آفر محبت کی وجہ سے نہیں تھی میرا دکھ شیئر کرنے کی وجہ سے تھی...... وہ بہت حساس اور اچھا انسان تھا...... مجھے یوں محسوس ہوا کہ زندگی کے ساتھی میں ارسلان جیسی خوبیاں ضرور ہونی چاہئیں۔ میرا دل اس کا معترف ہو گیا اور جب تم نے 'اظہار محبت' کیا تو تمہاری محبت ارسلان کی دلجوئی کے سامنے ہار گئی...... اس نے میرے ٹوٹے دل اور کرچی کرچی وجود کو سہارا دیا...... میں اسے کیسے نظر انداز کر سکتی تھی۔

ارسلان کو میں کبھی بھی نہیں بھول پاؤں گی...... وہ ایسا انسان تھا جس پر انسانیت حقیقی معنوں میں فخر کرتی ہے۔ اس کے جانے کے بعد میں نے سوچا تھا کہ...... میں ساری زندگی ارسلان کی یادوں کے سنگ گزار دوں گی مگر اپنے لئے تمہاری شدید محبت کو دیکھ کر مجھے اپنی سوچ بدلنی پڑی...... مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم مجھے دیوانگی کی حد تک چاہتے ہو...... تمہارے دل کی حالت دیکھتے ہوئے میں نے تم سے شادی کا فیصلہ کیا...... مگر قدرت کا نظام بہت عجیب ہے...... وہ انسان کو خود مشاہدہ کروا کے پھر اس سے فیصلہ کرواتا ہے...... میں ایکسیڈنٹ کے بعد اس ہاسپٹل میں لائی گئی جہاں حرا ڈاکٹر تھی...... اور حرا کے پاس اختیار تھا...... کہ...... یا وہ مجھے بچاتی یا...... میرے بچے کو...... مگر اس نے مجھے بچایا...... شہیر...... تم ہی بتاؤ...... جس مسیحا نے میری جان بچائی...... میں اس کی زندگی کیسے اذیت میں ڈال دیتی...... شہیر...... جب تم بوتے لے کر میرے کمرے میں آئے تھے تو حرا کے چہرے پر یاسیت اور آنکھوں میں ایسی ویرانی اتر آئی تھی جس نے مجھے اس کے دل کی ساری حالت بتا دی...... ہر انسان دوسرے کے چہرے سے اس کے دل کی کیفیت پڑھ سکتا ہے...... قدرت نے نجانے دل میں کیا چھپا رکھا ہے کہ اس کے راز تو عیاں ہوتے چلے جاتے ہیں مگر کبھی ختم نہیں ہوتے...... ہر لمحہ...... ہر پل...... بدلتا دل...... انسان کو کیسی سوچوں اور جذبوں سے سرشار کرتا ہے...... کوئی نہیں جانتا...... ہر انسان کے دل کی اپنی کتھا ہے مگر ہر دل محبت کرتا ہے اور نفرت بھی...... بغض...... کینہ اور حسد بھی مگر...... جب ان سارے جذبوں پر محبت حاوی ہوتی ہے تو وہ دل خدا کا گھر بن جاتا ہے...... تمہاری بیوی کا دل خدا کا گھر ہے...... اس کے تقدس کو پامال نہ کرو...... اس کو وہ عزت دو...... جس کی وہ حقدار ہے...... میں اس کشمکش و پیچ میں تھی کہ کیا فیصلہ کروں...... مگر خدا نے 'نیت' کو بھی کہیں دل کے کسی خانے میں چھپا کر رکھا ہے...... کچی نیت جب بے لوث محبت سے ہوتی ہے تو اس محبت کے در و دیوار روشن ہونے لگتے ہیں۔ اس کے اندر دریچے کھلنے لگتے ہیں...... اس محبت کے سہارے انسان آہستہ آہستہ سفر کرتا ہوا اس خدا کی محبت پالیتا ہے...... جو حقیقت میں "دیار محبت" ہے۔ پچھلے چند دن جس اذیت میں گزرے تم ان کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے...... ایک ایک لمحہ میرے لئے کسی اذیت سے کم نہیں تھا...... شہیر...... سچ مانو...... محبت بہت بڑی آزمائش ہے...... اور...... وہ لوگ بڑے بہادر ہوتے ہیں جو اس آزمائش سے سرخرو ہو کر گزرتے ہیں۔ اچانک میرا کزن کینیڈا سے آ گیا اور وہ ہم سے ملنے آیا...... اس کو ارسلان اور میرے بچے کے بارے میں جان کر افسوس ہوا تھا۔ وہ اپنے کیے پر نادم بھی تھا اور سب گھر والوں کے سامنے اس نے پھر مجھے پرپوز کیا۔ میرے سامنے دو راستے تھے...... ایک راستہ تمہاری طرف جاتا تھا...... مگر جس پر حرا کھڑی تھی اور مجھے حرا کو روند کر تم تک پہنچنا تھا۔ دوسرے راستے پر میرا کزن تھا جو تنہا تھا اور اپنی کینیڈین بیوی کو طلاق دے چکا تھا...... اور ہم دونوں کے درمیان ہمارا بچپن اور ہماری محبت تھی...... مجھے اس کی طرف لوٹنا زیادہ آسان لگا...... میں حرا کو روند کر نہیں گزر سکتی۔ میں نہیں جانتی کہ خدا کا پہلے ہم دونوں کو جدا کرنے میں کیا راز تھا؟ پھر ارسلان سے شادی کرانے میں کیا حکمت تھی اور پھر ارسلان کے بعد پھر اس شخص سے ملانے میں کیا اسرار ہے...... یہ صرف وہی جانتا ہے ہم تو حیران ہو کر قدرت کی طرف دیکھتے رہ جاتے ہیں...... جو ہمیں لمحہ بہ لمحہ آزماتا

رہتا ہے۔۔۔۔۔شہیر۔۔۔۔۔قدرت کو ہم دونوں کا ساتھ منظور نہیں۔۔۔۔۔یہی اس کا فیصلہ ہے اور ہمیں اس فیصلے کو ماننا ہوگا۔۔۔۔۔جب تمہیں یہ خط ملے گا۔۔۔۔۔میں تم سے بہت دور جا چکی ہوں گی۔۔۔۔۔یہ مت پوچھنا کہاں۔۔۔۔۔؟

تم حرا کے ساتھ خوشگوار زندگی گزارنے کی کوشش کرنا۔۔۔۔۔یہی سوچ کر کہ محبت جہاں اذیت دیتی ہے وہاں سکون بھی دیتی ہے۔۔۔۔۔حرا کی محبت تمہیں سکون دے گی۔۔۔۔۔مجھے اس بات کا پورا یقین ہے۔ ہو سکے تو مجھے بھلا کر معاف کر دینا کہ میں ہمیشہ تمہارے لئے ذہنی اذیت کا باعث بنی۔

فقط زنل

شہیر خط پڑھ کر زار و قطار رونے لگا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ زنل اس سے دور چلی گئی ہے۔۔۔۔۔زنل اس کو پھر چھوڑ کر چلی گئی ہے۔۔۔۔۔اس کی محبت کا کاسہ پھر خالی رہ گیا ہے۔۔۔۔۔اس نے زنل کی محبت کو پانے کے لئے کیا کیا جتن نہیں کئے تھے۔۔۔۔۔اس نے ارسلان کو قتل کرایا کہ جب تک ارسلان زندہ رہے گا، زنل اسے نہیں مل پائے گی۔ اس کی محبت اتنی خود غرض ہو گئی کہ اسے ارسلان جیسے عظیم شخص کی اچھائیاں نظر ہی نہ آئیں۔۔۔۔۔وہ تو اسے رقیب کی صورت میں ہی نظر آتا رہا۔ اس نے اس کو قتل کرانے کے لئے کتنی بھاری رقم ادا کی تھی یہ وہی جانتا تھا۔۔۔۔۔کسی کو معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ ارسلان کو کس نے قتل کر دیا۔۔۔۔۔سوائے اس کے۔۔۔۔۔کیونکہ وہی اصل مجرم تھا، وہ اس بات کا پکا یقین کر بیٹھا تھا کہ ارسلان کے قتل کے بعد زنل، اس کی ہوگی مگر وہ یکسر بھول گیا کہ انسان کی تقدیر کو بدلنا اور اس پر حاوی ہونا انسان کے اپنے بس میں نہیں۔۔۔۔۔قدرت نے اسے ایسی شکست دی تھی کہ وہ چاروں شانے چت زمین پر آ گیا تھا۔۔۔۔۔جس رازداری سے اس نے ارسلان کو قتل کرایا تھا۔۔۔۔۔ویسی ہی خاموشی اور رازداری سے قدرت نے زنل کو پھر اس سے چھینا تھا۔۔۔۔۔اسے ارسلان ہر طرف نظر آ رہا تھا۔۔۔۔۔کبھی روتا ہوا۔۔۔۔۔کبھی مسکراتا ہوا۔۔۔۔۔پہلے وہ صرف زنل کی جدائی کا صدمہ سینے میں چھپائے پھرتا تھا اب ارسلان کے قتل کا راز بھی اسے چھپانا تھا۔۔۔۔۔وہ دوہری اذیت میں مبتلا تھا اس کا رو رو کر برا حال ہو گیا تھا۔۔۔۔۔ممی اور ڈیڈی گھر پر نہیں تھے۔۔۔۔۔وہ ڈیڈی کے کمرے میں گیا اور ان کے خفیہ خانے کو چیک کیا۔ آج وہاں کوئی وسکی، شیمپئن نہیں تھی۔۔۔۔۔وہ ایک فائیو سٹار ہوٹل میں گیا اور شیمپئن واڈکا اتنی زیادہ مقدار میں پی کہ اسے اپنی ہوش نہ رہی۔

کئی ماہ سے جس بیماری کا خطرہ ٹل گیا تھا۔۔۔۔۔اس بیماری نے پوری قوت سے اس پر حملہ کر دیا۔

☆

''حرا بیٹے۔۔۔۔۔جلدی آؤ۔۔۔۔۔تہمینہ کا فون ہے۔۔۔۔۔وہ تم سے بات کرنا چاہتی ہے'' منصور علی نے فون کا ریسیور حرا کو پکڑاتے ہوئے کہا۔ حرا کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات نمایاں ہوئے مگر اگلے لمحے اس نے اپنے آپ کو قدرے نارمل کیا۔

''جی آنٹی۔۔۔۔۔'' وہ آہستہ آواز میں بولی۔

''بیٹا۔۔۔۔۔جلدی گھر آ جاؤ۔۔۔۔۔شہیر کو شدید قسم کا ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔۔۔۔۔وہ ہاسپٹل میں ہے اس کی حالت بہت خراب ہے۔۔۔۔۔معلوم نہیں کیا ہوگا۔۔۔۔۔؟'' مسز تہمینہ روتے ہوئے بولیں۔

''کب۔۔۔۔۔یہ کب ہوا۔۔۔۔۔اور۔۔۔۔۔کیسے۔۔۔۔۔؟'' حرا ایک دم پریشان ہو کر بولی۔

''کل رات کو ہمیں خبر ملی...... ہم لوگ گھر پر نہیں تھے اور...... وہ......؟ بس تم جلدی آ جاؤ، میں بہت پریشان ہوں...... شہیر کو تمہاری ضرورت ہے'' مسز تہمینہ نے بے بسی سے کہا تو حرا سوچ میں پڑ گئی۔

''کیا سوچ رہی ہو......؟'' منصور علی نے حرا سے پوچھا۔

''شہیر ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہے......اور؟'' حرا نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

''تو...... کیا تم جاؤ گی......؟'' حرا کی ماں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......'' اس نے جواب دیا۔

''حرا...... تمہارا دماغ ٹھیک ہے...... ایک طرف تم کورٹ کے ذریعے اس سے طلاق مانگ رہی ہو......اور...... دوسری جانب تم پھر وہاں جانا چاہتی ہو......'' اس کی ماں نے غصے سے کہا۔

''مما...... آنٹی بہت پریشان ہیں...... شہیر کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے'' حرا نے آ و بھر کر کہا تو سب گھر والے خاموش ہو گئے۔

حرا شام تک ہاسپٹل پہنچ گئی...... شہیر ICU میں تھا۔

''تھینک یو بیٹا...... کہ...... تم...... آ گئیں'' مسز فاخر نے اسے ملتے ہوئے کہا۔

''اب کیسی طبیعت ہے......؟'' حرا نے پوچھا۔

''بہت خطرناک ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ ڈاکٹرز بہت پریشان ہیں......'' مسز فاخر اسے بتاتے ہوئے رونا شروع ہو گئیں۔

''لیکن یہ سب کیسے ہوا......؟ کیا گھر پر کوئی جھگڑا ہوا تھا؟'' حرا نے پوچھا۔

''نہیں......'' مسز فاخر خاموش ہو گئیں جیسے وہ اسے بتانا نہ چاہ رہی ہوں...... حرا نے بھی مزید کریدنا پسند نہ کیا۔

''سمیر آ رہا ہے...... میں اس کے بغیر اپنے آپ کو بہت تنہا محسوس کر رہی تھی......'' مسز فاخر نے بتایا۔

''کب......؟'' حرا نے حیرت سے پوچھا۔

''صبح تک یہاں پہنچے گا......''

حرا ان کی بات سن کر خاموش ہو گئی۔

☆

مسلسل دو راتیں جاگنے سے حرا کی طبیعت بہت خراب ہو رہی تھی۔ اس کا سر چکرانے لگا تھا۔ شہیر کی طبیعت اب قدرے سنبھلی تھی...... تو مسز فاخر نے اسے گھر بھیج دیا۔ اپنے کمرے میں گئی تو ہر شے یونہی بے ترتیب پڑی تھی۔ اس نے کچھ بھی نہ اٹھایا اور بیڈ پر لیٹ گئی...... لیٹتے ہی سو گئی۔

آنکھ کھلی تو طبیعت کافی بہتر تھی...... نہا دھو کر فریش ہوئی اور دوبارہ ہاسپٹل جانے کے لئے تیار ہونے لگی۔ اس نے بیڈ روم کی دراز سے اپنی فون کی ڈائری نکالنا چاہی تو وہاں ذل کا خط پڑا تھا...... وہ چونک گئی اور اسے پڑھنے لگی...... اس کا دل تیز تیز دھڑکتا رہا...... خط پڑھ کر وہ پریشان

بھی ہو گئی اور گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

"تو شہیر اس کی وجہ سے بیمار ہوا ہے...... اس بار اسے ژل نہیں ملی...... اور اس کی وجہ میں بنی ہوں...... شہیر مجھے قصوروار سمجھتا ہو گا" حرا کا دل پریشان ہونے لگا۔

اس کا موبائل بجنے لگا...... مسز فاخر کا فون تھا...... وہ اسے ہاسپٹل میں کچھ ضروری چیزیں لانے کو کہہ رہی تھیں۔ وہ سمیر کے ساتھ واپس چلی گئی۔ سمیر جب سے آیا تھا، مسلسل ہاسپٹل میں ان کے ساتھ تھا...... ڈاکٹروں کے ساتھ ساری ڈسکشن بھی وہی کرتا...... ڈیڈی آتے اور چلے جاتے...... ممی، حرا اور سمیر ہر وقت ہاسپٹل میں رہتے۔ حرا گاڑی میں بیٹھی تو بہت پریشان تھی۔ اس کے ذہن میں ژل کے لکھے ہوئے الفاظ گونج رہے تھے۔

"میرے سامنے دو راستے تھے...... ایک تمہاری طرف جاتا تھا...... مگر اس پر حرا کھڑی تھی اور مجھے اس کو روند کر تم تک پہنچنا تھا...... میں حرا کو نہیں روند سکتی"

ژل کے الفاظ مسلسل اس کے تعاقب میں تھے...... اور وہ ان سے فرار چاہتی تھی۔

"کیا بات ہے...... ؟ تم اپ سیٹ لگ رہی ہو؟" سمیر نے اس سے پوچھا۔

"کچھ نہیں......" وہ کہہ کر خاموش ہو گئی۔

"کیا مجھ سے ناراض ہو؟" سمیر نے پوچھا۔

"نہیں"

"بتانا نہیں چاہتی؟" شہیر نے پوچھا۔

حرا خاموش ہو گئی اور اسے کوئی جواب نہ دیا، سمیر اس کی طرف گہری نظروں سے دیکھتا رہا اور پھر خاموش ہو گیا۔

حرا کو خوف پیدا ہو گیا تھا کہ شہیر اسے دیکھ کر کہیں ہائپر نہ ہو جائے اور اسے اپنی بیماری اور ساری اذیتوں کا ذمہ دار نہ ٹھہرائے۔ وہ اس سے نظریں نہیں ملانا چاہتی تھی...... وہ کئی روز بعد روم میں شفٹ ہوا تھا...... مسلسل خاموش اور سب کی طرف یوں دیکھتا جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو...... مگر کہہ نہ پا رہا ہو...... اس نے حرا کی طرف دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا...... حرا کو اس کی نظروں سے خوف محسوس ہونے لگا...... اسے لگا وہ اس کے ان گنت سوالوں کا کوئی جواب نہ دے پائے گی...... کافی دیر دیکھنے کے بعد اس نے منہ موڑ لیا...... حرا پریشان ہو گئی۔ سمیر اس کے ساتھ بہت محبت سے پیش آیا...... مگر وہ اس کی کسی بھی بات کا کوئی جواب نہ دیتا۔

"شہیر سب سے کچھ خفا خفا لگتا ہے" سمیر نے علیحدگی میں حرا اور ممی سے پوچھا۔

"معلوم نہیں...... جھگڑا تو کسی سے نہیں ہوا" ممی نے بتایا سب لوگ پھر خاموش ہو گئے۔

☆

شہیر کی حالت قدرے بہتر ہوگئی تھی...... کچھ روز بعد وہ گھر شفٹ ہو گیا تھا۔ حرا اس کا بہت زیادہ خیال رکھ رہی تھی...... وہ یہ سوچ کر آئی تھی کہ شہیر ٹھیک ہو کر گھر شفٹ ہوگا تو وہ والدین کے پاس گھر چلی جائے گی مگر جب سے اس نے زل کا خط پڑھا تھا اس نے اپنا فیصلہ بدل لیا تھا...... اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی اس بربادی کی ذمہ دار وہ ہے اس نے واپس جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا...... وہ دن بھر کی تھکی ہوئی تھی...... شہیر بھی دوائیں کھا کر سو رہا تھا جب وہ بھی بیڈ پر ٹیک لگا کر بیٹھی اور وہیں سو گئی۔

اچانک اسے عجیب سی آواز سنائی دی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی...... اور ادھر ادھر دیکھنے لگی...... شہیر صوفے پر گرا تھا اور اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا...... وہ بری طرح رو رہا تھا...... حرا گھبرا گئی اور اس کے ہاتھ سے ریوالور چھینا۔

''یہ...... یہ...... آپ کیا کر رہے ہیں؟'' حرا نے خفگی سے کہا۔

''میں جینا نہیں چاہتا......'' وہ روتے ہوئے بولا۔

''اس لئے کہ زل چلی گئی ہے...... '' حرا نے پوچھا۔

شہیر نے اس کی طرف بغور دیکھا اور خاموش ہو گیا۔

''کیا...... آپ کی زندگی میں صرف زل ہے...... اور کوئی نہیں...... ہمیں...... ممی اور ڈیڈی'' حرا نے پوچھا۔

تو شہیر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''زل...... تو...... ارسلان کے مرنے کے بعد بھی زندہ ہے...... اس لئے کہ وہ جینا چاہتی ہے...... شہیر انسان تب تک زندہ رہتا ہے...... جب تک خدا چاہے...... انسان مرنے کی لاکھ کوشش کرے...... مگر وہ مر نہیں سکتا...... جب تک خدا نہ چاہے...... پلیز پازیٹو ہو کر سوچیں...... زل نہ تو آپ کی زندگی ہے اور نہ ہی آپ کے بغیر اس کی زندگی ادھوری ہے...... جب وہ آپ کے بغیر زندہ ہے تو آپ کو بھی اس کے بغیر زندہ رہنا ہے...... اپنے اردگرد کے لوگوں کے لئے...... جو آپ سے محبت کرتے ہیں...... اور...... آپ کو زندہ، صحت مند اور خوش دیکھنا چاہتے ہیں'' حرا نے اسے نرم لہجے میں سمجھایا۔

''اسی لئے تو میں مرنا چاہتا ہوں...... میرا بیمار وجود ان کے لئے اذیت بنتا جا رہا ہے'' شہیر نے نم آنکھوں سے کہا۔

''اگر آپ جیسی سوچ ہر بیمار شخص کی ہو جائے...... تو...... پھر کوئی بیمار ٹھیک نہ ہو...... شہیر آپ کو ٹھیک ہونا ہے...... اپنی will power کو مضبوط بنائیں...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں آپ کے ساتھ ہوں......'' حرا نے قدرے جذباتی لہجے میں کہا۔

''ایک بیمار شخص کے ساتھ کہاں تک چل پاؤ گی...... پلیز...... تم اپنی زندگی کے بارے میں سوچو...... تم نے divorce مانگی تھی...... میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم اس اذیت بھری زندگی سے دور چلی جاؤ...... اپنے مستقبل اور اپنی خوشیوں کے بارے میں سوچو...... میں تمہیں کچھ نہیں دے سکا...... اور...... نہ ہی دے پاؤں گا......'' شہیر نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''کیا میں نے آپ سے کبھی کچھ مانگا ہے......؟'' حرا نے پوچھا۔

''نہیں......'' وہ آہستہ آواز میں بولا۔

''بے فکر رہیے.....اب بھی کچھ نہیں مانگوں گی.....محبت بھی نہیں'' حرا نے آہ بھر کر معنی خیز انداز میں کہا اور شہیر کی طرف دیکھنے لگی۔ شہیر کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے..... جیسے اچانک کوئی کسی سے اس کی سب سے قیمتی چیز مانگے.....اور دینے والا نہ اسے دینا چاہے اور نہ ہی انکار کرنا چاہے.....سوال سن کر شش و پنج میں پڑ جائے۔ حرا اس کی طرف استفہامیہ نگاہوں سے دیکھتی رہی اور وہ نظریں چرانے کی کوشش کرنے لگا.....

حرا اس سے کچھ سننے کی توقع کر رہی تھی.....مگر وہ کچھ بھی کہنا نہیں چاہتا تھا۔

حرا نے گہری سانس لی.....اس کی طرف دیکھتی رہی اور پھر خاموشی سے کمرے سے باہر جانے لگی۔

''حرا.........'' شہیر نے بمشکل کہا۔

حرا نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا اور سوالیہ انداز میں اس کی جانب دیکھا۔

''آئی.....ایم.....سوری..... شہیر اس کے قریب آ کر بولا اور نظریں جھکا لیں۔ شہیر نے بمشکل اپنے آنسو روکے مگر آنسو بہت کوشش کے باوجود بھی اس کی آنکھوں سے نکل پڑے۔ شہیر ہماری زندگیوں اور قسمتوں کے فیصلے اوپر ہوتے ہیں.....اور ہمیں ان فیصلوں کو ماننا پڑتا ہے.....ہم چاہیں یا نہ چاہیں.....'' حرا نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے نم آنکھوں سے کہا تو شہیر اس کی جانب دیکھ کر سسکنے لگا اور حرا کو اپنے گلے کے ساتھ لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ وہ بھی شدت سے رونے لگی۔ آج وہ حرا کو پہلی بار محسوس کر رہا تھا۔ آج حرا اور اس کے درمیان زل نہیں تھی۔ صرف وہ دونوں تھے.....اور دونوں ایک دوسرے کے دلوں کی دھڑکنیں سن رہے تھے ان کے دلوں کا غبار آنسوؤں کی صورت میں خارج ہو رہا تھا۔ ایک دوسرے کو پانے میں انہیں بہت کٹھن سفر طے کرنا پڑا تھا۔

.....❁.....

## (۱۸)

نذیر حسین صبح سویرے ہاسپٹل میں ڈاکٹر دانش کے کمرے کے سامنے بنچ پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ وہ دو روز سے ڈاکٹر دانش کی تلاش میں کئی ہاسپٹلز میں اخبار پکڑے مارا مارا پھرتا رہا تھا۔ وہ رات کو بہت دیر سے مطلوبہ ہاسپٹل میں پہنچا مگر سکیورٹی گارڈ نے اسے گھسنے نہ دیا اور صبح آنے کو کہا۔ وہ ساری رات ہاسپٹل کے باہر لان میں بیٹھا رہا اور صبح سویرے اندر داخل ہوا۔ خاکروب ابھی صفائیاں کر رہے تھے اور اسے بار بار بنچ سے اٹھاتے۔ کبھی وہ ایک بنچ سے اٹھ کر دوسرے پر بیٹھتا اور کبھی زمین پر بیٹھ جاتا۔ اسے کئی باتوں پر غصہ آ رہا تھا مگر بیٹے کی محبت اور سب سے زیادہ زینب کی پر امید دعاؤں کی خاطر آنا پڑا تھا۔ زینب کی سفید بوڑھی آنکھیں صرف ایک ہی امید سے روشن تھیں کہ اس کا بیٹا کب اس سے آ کر ملے گا۔ زینب نے کس طرح رو رو کر نذیر حسین کو منایا تھا کہ وہ پچھلی ساری تلخ باتوں کو بھول جائے اور بیٹے کو منا کر گھر لے آئے۔ وہ ضرور آ جائے گا......اور اس کی یقین دہانی پر نذیر حسین اسے دوسرے شہر ڈھونڈنے آ گیا تھا۔ بے شمار وسوسوں اور خدشات کے علاوہ اس کے اندر ایسی امید بھی تھی جو اسے ہمت نہ ہارنے دے رہی تھی۔ وہ بہت تھکا ہوا تھا اور اس نے پیٹ بھر کر کھانا بھی نہیں کھایا تھا لیکن اسے امید تھی کہ جیسے ہی اس کا بیٹا اسے گلے ملے گا اس کی ساری تھکن اور بھوک مٹ جائے گی۔ وہ کیسے اسے ملے گا......؟ اسے دیکھ کر کیا کہے گا......؟ کیسے اسے بتائے گا کہ اس کی ماں اس کی جدائی میں کس قدر بے تاب اور بیمار ہو گئی ہے۔ اتنی بہت سی باتوں کے خود ہی جوابات دے کر وہ مسکرانے لگتا۔ اس کے اندر امید اور خوشی کے دیئے اور روشن ہونے لگتے۔ وہ گھر سے دھلا ہوا سفید جوڑا پہن کر نکلا تھا مگر دو روز سے وہ جگہ جگہ خوار ہو رہا تھا اور اس کا سفید جوڑا گندا ہو گیا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے اور چہرے کی سلگتی رنگت سیاہ ہو رہی تھی۔ تھکن کے آثار اس کے چہرے پر نمایاں ہو رہے تھے۔ اس نے ایک رومال میں اخبار کو اچھی طرح لپیٹ کر اپنے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ آہستہ آہستہ لوگوں کی آمد میں اضافہ ہونے لگا۔ وہ بار بار کاؤنٹر پر جا کر ڈاکٹر دانش کے بارے میں پوچھتا کہ ڈاکٹر صاحب کب آئیں گے......؟

''کون ڈاکٹر دانش......؟'' ریسپشنسٹ پوچھتی تو وہ سوچ میں پڑ جاتا۔

''ہاں......'' وہ جلدی سے بوکھلا کر کہتا۔

''وہ بہت دیر سے آتے ہیں......انہوں نے صرف چند مریض چیک کرنے ہوتے ہیں......اور......آپ......؟'' ریسپشنسٹ لڑکی نے حیرت سے اسے دیکھ کر پوچھا۔

''کیا آپ ان کی فیس دے سکتے ہیں......ان کی فیس بہت زیادہ ہے......اور غریب لوگوں کا وہ مفت علاج نہیں کرتے'' لڑکی نے رک رک کر کہا۔

''میں......میں......مریض نہیں ہوں...... مجھے ان سے ذاتی کام ہے'' نذیر حسین نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ٹھیک ہے آپ انتظار کریں لڑکی نے کہا تو نذیر حسین مایوسی سے بیچ پر بیٹھ گیا۔

''اس نے تو ہمارا رکھا ہوا نام بھی بدل لیا ہے......اسے تو ہم سب سے نفرت تھی......نجانے کیوں اس کے دل میں ہمارے لئے اتنی نفرت بھر گئی۔ اتنی نفرت تو ہم سے چھوٹو، نے بھی نہیں کی جس کو ہم ڈھنگ سے پال نہیں سکے۔ زلیخے نے اپنی ساری محبت اس پر نچھاور کر دی......خود نہ کھایا اور اسے کھلایا......رات رات بھر اس کی خاطر جاگتی رہتی تھی مگر اس نے تو زلیخے کی محبت کو بھی اہمیت نہ دی......ہو سکتا ہے اب وہ بدل گیا ہو......اب تو وہ بھی بوڑھا ہو رہا ہے......امید و ناامیدی کی باتیں سوچ سوچ کر اس کا دماغ تھک گیا تھا۔

ڈاکٹر دانش دن ڈھلے بلیک تھری پیس سوٹ میں ملبوس ہاسپٹل تشریف لائے۔ رنگت اور نقوش ویسے ہی تھے مگر اچھے لباس نے شخصیت کو نکھار دیا تھا۔ نذیر حسین انہیں دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا مگر انہوں نے اس کی جانب ایک بار بھی نہ دیکھا۔ نذیر حسین فرط جذبات میں لبریز ان کے پیچھے ہی ان کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ ایک نوجوان لڑکے نے اسے روکنا چاہا مگر وہ زبردستی اندر گھس گیا۔

ڈاکٹر دانش نے مڑ کر حیرت سے نذیر حسین کی جانب دیکھا، ''کون ہیں آپ؟'' ڈاکٹر دانش نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''اقبال حسین......میں ہوں......تمہارا باپ......کیا تم نے مجھے نہیں پہچانا......اپنے باپ کو نہیں پہچانا؟'' نذیر حسین نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

''کون اقبال حسین......میں نہ آپ کو جانتا ہوں اور نہ ہی کسی اقبال حسین کو، میں ڈاکٹر دانش ہوں، صرف ڈاکٹر دانش، ڈاکٹر دانش نے بے رخی سے جواب دیا تو نذیر حسین کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔

''کیا تم اپنی ماں زلیخے کو بھی بھول گئے ہو......جو تمہاری جدائی میں رو رو کر اندھی ہو گئی ہے؟'' نذیر حسین نے آہ بھر کر پوچھا۔

''آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔ میرے والدین تو بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے'' ڈاکٹر دانش نے قدرے بے باکی سے کہا تو نذیر حسین نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے ان کی جانب دیکھا۔

کوئی چیز چھناکے سے اس کے اندر ٹوٹ گئی۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر اس کے لب ساکت ہو گئے۔ اس نے پتھرائی نگاہوں سے ڈاکٹر دانش کی جانب دیکھا اور اس کی آنکھوں میں نمی بھرنے لگی۔

''اب آپ جا سکتے ہیں......میرا وقت بہت قیمتی ہے......میرے مریض میرا انتظار کر رہے ہیں'' ڈاکٹر دانش نے قدرے ترش لہجے میں کہا تو نذیر حسین کو اپنی انتہائی بے عزتی محسوس ہوئی اور وہ اپنی نم آنکھوں کو اپنی ہتھیلیوں سے رگڑتے ہوئے باہر نکلنے لگا اور بے بسی و حسرت سے ڈاکٹر دانش کی جانب آخری بار دیکھا۔

''اور......بیٹے......کسی سے تعلق بنانے سے پہلے اپنی اوقات ضرور یاد رکھا کریں'' ڈاکٹر دانش نے انتہائی کراہت سے نذیر حسین کو سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا اور ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''انسان اپنی اوقات ہی تو بھول جاتا ہے'' نذیر حسین نے انتہائی ضبط کرنے کے بعد مجبوراً کہا۔

''اگر یہاں آنے سے پہلے آپ اپنی حیثیت یاد رکھتے تو آپ کے لئے بہت بہتر ہوتا'' ڈاکٹر دانش نے خفگی سے کہا۔

''غلطی ہوگئی.......میں بھول گیا کہ میں سرکس میں کام کرنے والا جوکر.......کس کو ملنے جارہا ہوں.......اتنے بڑے انسان کو.......جسے صرف اپنی حیثیت اور اوقات کا پتہ ہے.......باقی سب اس کے سامنے رینگنے والے کیڑے مکوڑے ہیں.......معاف کرنا صاب غلطی ہوگئی'' نذیر حسین نے اس کے آگے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا اور بے ساختہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ ڈاکٹر دانش نے نخوت سے اس کی جانب دیکھا اور دروازہ کھول کر اسے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ نذیر حسین نے آخری بار اس کی جانب دیکھا اور رومال میں لپٹی اخبار کو نکال کر اس کے پرزے پرزے کرکے وہاں سے چلا گیا۔ ڈاکٹر دانش نے اخبار کے ایک پرزے کو اٹھا کر دیکھا، اس میں اپنی تصویر دیکھی اور گہری سانس لی۔

''ربش'' وہ زیر لب بڑبڑائے اور باہر بیٹھے ایک سوئپر کو بلایا کہ وہ کمرے کی صفائی کردے اور جیب میں سے سگار نکال کر اسے سلگایا اور اس کے گہرے کش لگانے لگے۔ نذیر حسین کا دل بری طرح ٹوٹ چکا تھا۔ اس کے اندر امید کے سارے دیئے بجھ چکے تھے۔ بیٹے سے ملنے کی آس اور خوشی دم توڑ چکی تھی۔ اس کا دل ایسے غم اور دکھ سے بھر گیا تھا جس کو برداشت کرنا اس کے بس میں نہیں رہا تھا.......اس کی آنکھیں مسلسل برس رہی تھیں۔ وہ اپنی ہچکیاں روکنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا مگر ایک دم اس کے منہ سے چیخ سی بلند ہوتی اس کا کلیجہ شدت غم سے پھٹ رہا تھا۔ ایسی تذلیل.......اور وہ بھی اپنی سگی اولاد کے ہاتھوں.......اس سے برداشت نہیں ہورہی تھی۔ میری ہی غلطی تھی.......میں یہاں کیوں چلا آیا.......زینب کی باتوں میں آ گیا اور بھول گیا کہ وہ یہی الفاظ آج سے کئی سال پہلے بھی ان سے کہہ چکا تھا.......پھر بھی وہ پر امید رہا.......؟ اس نے کیوں امید باندھی.......؟

اقبال حسین بالکل بھی نہیں بدلا تھا.......وہ پہلے کی طرح ہی بدلحاظ، اکھڑ اور ترش رو تھا.......اس نے پہلے بھی ماں باپ کا کوئی لحاظ نہ کیا تھا اور نہ ہی اب بھی.......نجانے کیوں وہ ایسا تھا؟ انہوں نے تو اسے ساری اولاد سے بڑھ کر چاہا تھا۔ اس کی بدتمیزیاں برداشت کی تھیں۔ اس کے سامنے ماضی کے وہ دن گزرنے لگے.......جب وہ بچپن میں ہر کلاس میں فرسٹ آیا کرتا تھا اور انعامات لے کر آتا تھا تو زینب اور وہ اس کی تعریفیں کر کر کے اسے اپنے سر پہ بٹھاتے تھے۔

''اقبال حسین تو ہماری اولاد ہی نہیں لگتا.......نجانے کیوں قدرت نے اسے ہمارے گھر پیدا کردیا.......اتنا سمجھدار.......عقل والا.......پڑھنے لکھنے والا.......ہم غریبوں کے گھر.......جیسے گدڑی میں لعل'' زینب چپکے چپکے نذیر حسین کو کہتی اور دونوں نظریں چرا کر اسے دیکھتے اور وہ اکثر ان کی باتیں سن کر انہیں حیرت سے دیکھتا.......جب کبھی دوسرے بہن بھائیوں کے ساتھ لڑائی جھگڑا کرتا تو ماں باپ ہمیشہ اس کی طرف داری کرتے.......رفتہ رفتہ اس میں سرکشی اور ضدی پن آ گیا تھا۔ وہ بہن بھائیوں اور ماں باپ پر حکم چلانے لگا تھا.......ذرا ذرا سی بات پر ماں باپ کی بے عزتی کردیتا اور وہ خاموش ہوجاتے۔ جوں جوں وہ جوان ہوتا گیا۔ قدرت اس پر مہربان ہوتی گئی اس پر کامیابیوں کے دروازے کھلنے لگے.......پہلے اسے اپنے باپ کے پیشے سے نفرت ہونے لگی پھر ماں باپ اور بہن بھائیوں سے.......اس کا سوشل اسٹیٹس بڑھنے لگا اور اپنی فیملی اس کی نظروں میں بے وقعت اور حقیر ہونے لگی.......جیسے ہی وہ ڈاکٹر بنا.......اس نے گھر چھوڑ دیا اور جب شادی کی تو ماں باپ اور گھر والوں سے سارے تعلقات توڑ دیئے۔ اسے ان کے جسموں سے بدبو آتی تھی اور ان کے وجود سے کراہت محسوس ہوتی تھی۔ ان کے پیشے سے اسے بے عزتی محسوس ہوتی تھی اور ان سے نسبت باعث

ذلت ورسوائی تھی۔ اس میں خود بینی، تکبر اور خود نمائی نے تمام نرم جذبات اور دوسروں کے لئے لطیف احساسات چھین لئے تھے۔ اسے نہ دوسروں کا دکھ درد محسوس ہوتا تھا اور نہ اپنوں سے جدائی کا احساس کبھی تکلیف دیتا تھا...... اسے صرف اپنی ذات اور اپنی خوشیاں عزیز تھیں...... نہ وہ کسی کا سہارا بن سکا تھا اور نہ ہی اسے کسی کی ضرورت تھی...... وہ اپنی زندگی...... اپنے لئے جیو کے فارمولے پر عمل پیرا تھا۔

نذیر حسین کا سارا سفر روتے ہوئے کٹا...... اسے سب سے زیادہ اسی بات کا دکھ ہو رہا تھا کہ اس کے علم والے، نام اور شہرت والے بیٹے نے کس طرح اسے ذلیل کیا تھا...... اور یہ سوچ سوچ کر اسے مزید پریشانی ہو رہی تھی کہ وہ اس کی ماں کو کیا بتائے گا...... جو پندرہ سالوں سے اس کے انتظار میں ایک ایک لمحہ کتنی اذیت سے کاٹ رہی ہے...... جس کی زندگی میں صرف ایک ہی 'امید' ہے اور وہی 'امید' اسے زندہ رکھے ہوئے ہے...... بیٹے سے ملنے کی امید...... وہ کیسے اس 'امید' کو توڑ پائے گا اور زینب کیسے یہ سب کچھ سہہ پائے گی...... میں کیسے اسے بتا پاؤں گا...... ؟ مجھے اسے نہیں بتانا چاہیے ورنہ وہ مر جائے گی...... اور اگر زینب مرگئی تو میں اس کے بغیر کیسے زندہ رہ پاؤں گا...... ؟

''نہیں مجھے اسے کچھ نہیں بتانا چاہیے'' نذیر حسین نے ہچکی لی اور اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ بلند ہوئی۔ اس نے جلدی سے اپنا رومال اپنے منہ پر رکھ لیا اور چور نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ کتنی ہی آنکھوں نے اسے حیرت سے گھورا...... اس نے بے بسی سے بس کی کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا...... وہ خیالات کا تانا بانا بننے لگا...... وہ رات کو دیر سے گھر پہنچا تو زینب اس کی منتظر تھی۔ وہ دو راتوں سے بالکل بھی نہ سوئی تھی۔ یہی سوچ کر...... کہ...... اگر اقبال حسین اچانک آ گیا تو اسے سوتا ہوا پا کر اسے انتظار نہ کرنا پڑے...... یا...... پھر...... اسے سویا ہوا دیکھ کر واپس ہی نہ چلا جائے...... وہ...... تھا...... بھی جلد باز اور اکھڑ...... زینب کی اپنی سوچیں تھیں اور وہ سوچ سوچ کر زیر لب مسکراتی۔ ذرا سی آہٹ پر اس کا دل دھڑکنے لگتا...... اسے نظر کچھ نہ آتا تھا مگر وہ دروازے کی طرف چہرہ کر کے بیٹھی رہتی۔

اقبال حسین آئے گا...... تو اس کے گلے لگ کر بہت روئے گا...... اور...... وہ بھی بہت روئے گی۔ وہ اسے کہے گا کہ اماں میں تیرے بغیر بہت اداس تھا اور میں بھی اسے بتاؤں گی کہ اس کے انتظار اور جدائی میں تو ایک رات بھی سکون سے نہیں سوئی...... کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔ کبھی ہنس کر کسی سے بات نہیں کی۔ اس کے انتظار میں کبھی گھر سے باہر قدم نہیں رکھا...... میں اس کو وہ سب باتیں بتاؤں گی جو میں اسے یاد کر کے سوچتی رہتی ہوں۔ زینب کا دماغ اتنے سوالات اور جوابات سوچ سوچ کر تھک گیا تھا۔

دروازہ کھلا، نذیر حسین دبے قدموں سے گھر میں داخل ہوا مگر زینب اس کے قدموں کی چاپ پہچانتی تھی۔

''نذیر حسین کیا تم آ گئے...... ؟ وہ دیوار کے ساتھ ٹٹول ٹٹول کر دروازے تک جانے لگی۔ اسے دروازے کی چوکھٹ سے ٹھوکر لگی اور ہر بار اسے ٹھوکر لگتی تھی مگر وہ اس کی عادی نہ ہو پا رہی تھی۔ نذیر حسین نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے تھام لیا۔

''اقبال حسین...... میرا بیٹا کہاں ہے...... اور...... تم اتنے خاموش کیوں ہو؟ اس نے نذیر حسین کے چہرے پر اپنا ہاتھ مارنے کی کوشش کی۔ نذیر حسین نے بڑی مشکل سے اپنے آنسو ضبط کر رکھے تھے۔ زینب اس کی خاموشی سے گھبرا رہی تھی۔

تم بولتے کیوں نہیں...... ؟ کیا ہوا ہے...... ؟ دیکھو سچ بتانا...... وہ تمہیں ملا ہے کہ نہیں؟'' زینب نے گھبرا کر پوچھا۔

''نہیں.....'' نذیر حسین نے آہ بھر کر کہا۔

''نہیں..... یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے..... تم دو دن بڑے شہر میں رہ کر آئے ہو..... اور وہ تمہیں نہیں ملا..... میں نہیں مانتی..... تم جھوٹ بول رہے ہو.....'' زینب نے غصے سے کہا۔

''رات بہت ہو گئی ہے..... تم سو جاؤ'' نذیر حسین نے اسے بوسیدہ چارپائی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

''پندرہ سالوں سے میں نہیں سوئی..... اور..... آج کیسے سو جاؤں..... تم مجھے بتاؤ..... اس نے کیا کہا؟ کیا تم نے اسے میری آنکھوں کے بارے میں بتایا اور یہ ..... کہ..... میں اسے کتنا یاد کرتی رہتی ہوں'' زینب نے پر امید لہجے میں پوچھا۔

''نہیں .....'' وہ آہستہ آواز میں بولا۔

''کچھ بھی نہیں بتایا..... تو..... پھر تم وہاں کیا کرنے گئے تھے'' زینب غصے سے منہ بنا کر بولی۔ نذیر حسین اس کی بات سن کر خاموش رہا اور ٹکٹکی باندھ کر اس کی بے نور آنکھوں کو دیکھنے لگا جس میں آس اور امید کے جگنو ٹمٹما رہے تھے۔

''کیسے بتاؤں تجھے..... کیسے تجھ سے تیری امید چھین لوں..... کیسے اس انتظار کو ختم کر دوں جو تو ہر وقت اس کا کرتی رہتی ہے..... کیسے سب .....؟ نذیر حسین پریشانی سے اپنا ہونٹ چبانے لگا۔

''تم بولتے کیوں نہیں.....؟ مجھے صاف صاف بتاؤ..... اس نے کیا کہا..... کیا وہ بہت مصروف تھا..... اس لئے تمہارے ساتھ نہیں آیا''

''وہاں وہ بہت بڑا آدمی بن گیا ہے۔ اس کے پاس وقت کہاں ہوگا؟'' زینب نے خود ہی سوالات گھڑنے شروع کر دیئے۔

''ہاں..... وہ بہت مصروف تھا'' نذیر حسین نے آہ بھر کر کہا۔

''پر..... میں نہیں مانتی..... کیا تو نے اسے میرے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا تھا..... دیکھ..... سچ سچ بتانا..... یہ..... یہ..... اپنا ہاتھ میرے سر پر رکھ..... تجھے میرے سر کی قسم..... مجھے سچ بتا'' زینب نے اس کا ہاتھ ٹٹول کر مضبوطی سے پکڑا اور اسے اپنے سر پر رکھ لیا۔ نذیر حسین گھبرا گیا اور ہاتھ چھڑانا چاہا مگر زینب نے دونوں ہاتھوں سے گرفت مضبوط کر لی۔ نذیر حسین کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

''بول..... اس نے کیا کہا تھا.....؟'' زینب نے گھبرا کر پوچھا۔

نذیر حسین نے بے بسی سے اس کی جانب دیکھا اور اپنی ہچکی کو روکنا چاہا۔

''تو..... بولتا کیوں نہیں'' زینب نے غصے سے کہا اور ایک ہاتھ سے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا..... اس کے ہونٹوں پر اور پھر اس کی آنکھوں پر..... اسے روتا ہوا محسوس کر کے اس کا دل بے قرار ہونے لگا۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کی سانس بند ہونے لگی ہو۔

''وہ بتا..... جو..... اس نے کہا..... تجھے میری قسم..... ورنہ میں مر جاؤں گی'' زینب نے انتہائی مضطرب ہو کر کہا۔

''اس نے کہا..... کہ..... کہ.....'' نذیر حسین رکا۔

''کیا.....؟'' زینب کی سانس گویا تھمنے لگی۔

''اس کے ماں باپ بچپن میں ہی مر گئے ہیں'' نذیر حسین نے ہچکیاں بھرتے ہوئے کہا اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ زینب کی گرفت اس کے ہاتھ پر ڈھیلی پڑ گئی۔ اس کا دل اور سانسیں اچانک تھم گئیں۔ اس کی پتھرائی آنکھوں سے آنسو اک جھڑی کی مانند بہنے لگے۔ لب خاموش ہو گئے...... جسم میں گویا نہ حرکت رہی نہ حرارت...... وہ جیسے پتھر کی ہو گئی۔

نذیر حسین سسکیاں بھرتا رہا اور روتا رہا...... زینب کے اندر کیا کچھ ہو رہا تھا۔ اس کی اسے خبر نہ تھی۔ اس کے اندر کئی سالوں کی 'امید' ختم ہو رہی تھی۔ آس کے ٹمٹماتے جگنو دم توڑنے لگے تھے۔ انتظار کی طویل گھڑیاں ختم ہو گئی تھیں۔ آس امید...... ملنے کی خوشی...... دید کی تڑپ...... انتظار کا کرب، وصل کی بے قراری سب کچھ اس کے اندر دم توڑ رہا تھا۔ اس کا دل، دماغ سے سب کچھ رفتہ رفتہ ختم ہو رہا تھا۔ اس کا اندر خالی ہو رہا تھا...... وہ محض مٹی کا بے جان مجسمہ بنی بیٹھی تھی...... ساکت...... خاموش...... بے زبان...... اور نیم مردہ......

جب انسان کے اندر سے 'امید' کا آخری دیا بھی بجھ جاتا ہے تو...... وہ ایسا ہی ہو جاتا ہے۔

نذیر حسین رو رہا تھا...... سسک رہا تھا...... آہیں بھر رہا تھا...... سانس لے رہا تھا...... اور سوچ رہا تھا...... مگر اس کے وجود میں حرکت بھی تھی اور حرارت بھی تھی...... اسے اقبال حسین سے ایسی ہی 'امید' تھی...... وہ جانے سے پہلے امید اور ناامیدی کی وجہ سے اتنا مضطرب نہیں ہوا تھا جتنا زینب کو دیکھ کر اب ہو رہا تھا۔

زینب کچھ نہ بولی...... خاموشی سے نذیر حسین کی سسکیاں سنتی رہی اور ان سسکیوں سے اس کے اندر کیا کچھ ٹوٹتا رہا...... کیا کچھ ختم ہوتا رہا...... وہ نذیر حسین کو نہ بتا سکی...... شاید وہ خود بھی نہیں جانتی تھی...... شاید کوئی انسان بھی نہیں جانتا کہ کس طرح...... اس کے اندر سے کیا کچھ کیسے ختم ہوتا جاتا ہے۔

☆

ڈاکٹر رمیض کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا اور وہ ہاسپٹل میں ایڈمٹ تھے...... ڈاکٹر محسن زیدی خصوصی طور پر ان کا علاج کر رہے تھے...... ڈاکٹر رمیض کے ماں باپ گاؤں سے آ گئے تھے اور اپنے جوان، قابل فخر بیٹے کو یوں بیمار پڑے دیکھ کر ہر وقت روتے رہتے تھے...... ڈاکٹر رمیض اوپر تلے دو انتہائی گہرے صدموں سے دوچار ہوئے تھے۔

دریہ نے ان سے طلاق لینے کا فیصلہ کر لیا تھا اور وہ اس پر کسی بھی قسم کا کمپرومائز کرنے کو تیار نہیں تھی...... دو ماہ سے دلوں میں جو ذہنی تناؤ اور ایک دوسرے میں جتنا فاصلہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس کے بعد دلوں میں پہلی جیسی محبت اور چاہت کی امید نہ رہی تھی۔ دریہ ہر وقت گہری سوچوں میں گم رہتی...... اس کی آنکھیں اندر ہی اندر کتنے آنسو پیتی رہتیں اور دل ہر وقت مضطرب اور پریشان رہتا...... ایک جملہ اس کے تن بدن میں ہر وقت آگ لگائے رکھتا۔

''مجھے تم پر اعتبار نہیں رہا''

دریہ کے منہ سے آہیں بلند ہوتیں...... کاش ڈاکٹر رمیض کوئی اور بات کہتے تو میں اس پر کمپرومائز کر لیتی...... اس کو بھلا دیتی...... مگر جس

رشتے کی بنیاد ہی اعتبار پر ہو...... وہی ختم ہو جائے تو پھر کیسا رشتہ باقی رہ جاتا ہے؟

دریہ اندر ہی اندر سلگتی رہتی...... ڈاکٹر رمیض نے کئی بار اسے منانے کی کوشش کی مگر دریہ کے ایک سوال پر وہ ہر بار خاموش ہو جاتے۔

''جب اگر میری ذات ہی آپ کے لئے نا قابل اعتبار ٹھہری ہے تو پھر کسی بات پر کیسے رضامند کروں؟

دونوں میں روز بروز شدید تناؤ پیدا ہونے لگا تھا...... ڈاکٹر دانش نے ایسی آگ لگائی تھی جس نے ان کے محبت بھرے آشیانے کو آگ لگا دی تھی۔ دونوں کو ایک دوسرے کے بارے میں اتنا مشکوک کر دیا تھا کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے بارے میں بدول ہو گئے تھے...... اور...... پھر دریہ نے پکا فیصلہ کر لیا تھا...... اور ڈاکٹر رمیض سے طلاق مانگی تھی...... ڈاکٹر رمیض کو اس بات کی قطعی توقع نہ تھی۔ ان کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔

''دریہ...... یہ تم نے کیسے سوچ لیا...... کہ میں تمہیں طلاق دوں گا...... ہرگز نہیں'' ڈاکٹر رمیض نے پریشان ہو کر کہا۔

''کیوں...... طلاق نہیں دیں گے...... ایسے بے اعتبار رشتے کو ہم کب تک کھینچیں گے...... کچے دھاگے سے بھی کمزور اس رشتے کا ختم ہو جانا ہی بہتر ہے'' دریہ نے قطعیت سے جواب دیا۔

''پلیز...... ایسا مت کرو...... میرا سب کچھ ختم ہو جائے گا......'' ڈاکٹر رمیض نے کہا تو دریہ نے چونک کر ان کی جانب دیکھا۔

''ڈاکٹر رمیض نے تم سے شادی مفادات کی خاطر کی ہے...... جتنی جلدی ممکن ہو اس سے پیچھا چھڑا لو......'' ڈاکٹر دانش کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے اور اسے ان کی باتوں پر یقین آنے لگا۔

''میرے پاس اس کا ثبوت ہے'' ڈاکٹر دانش کے الفاظ نے اسے مضطرب کر دیا۔

''میں تمہیں ہرگز نہیں جانے دوں گا...... تمہارے بغیر میری زندگی ادھوری ہے...... پلیز......'' ڈاکٹر رمیض اس کے سامنے گڑگڑائے۔

''اب کچھ بھی ممکن نہیں'' دریہ نے آہ بھر کر کہا۔

''کیوں......؟'' ڈاکٹر رمیض نے حیرت سے پوچھا۔

''ہم دونوں کے دل ایک دوسرے سے دور ہو گئے ہیں...... ان میں محبت کی جگہ نفرت اور شکوک وشبہات نے لے لی ہے اور جن دلوں میں ایک دوسرے کے لئے شک پیدا ہوتا ہے وہ کبھی بھی ایک دوسرے سے 'سچی محبت' نہیں کر پاتے...... وہ ہمیشہ دور ہی رہتے ہیں۔ اس لئے ہم دونوں کا ایک دوسرے سے جدا ہو جانا ہی بہتر ہے......'' دریہ نے دوٹوک الفاظ میں کہا اور اپنا سامان پیک کرنے لگی۔

''مجھے طلاق کے کاغذات جلدی بھجوا دیجئے گا...... ورنہ مجھے کورٹ جانا پڑے گا...... اور...... یہ...... نہ آپ کے لئے بہتر ہو گا نہ میرے لئے'' دریہ نے رخصت ہوتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر رمیض نے اسے روکنا چاہا مگر روک نہ سکے...... بہت کچھ کہنا چاہا مگر کہہ نہ سکے...... بہت سی باتیں سمجھانا چاہیں مگر کچھ بھی نہ سمجھا سکے۔

دریہ چلی گئی...... ہمیشہ کے لئے انہیں چھوڑ کر...... کتنی محبت اور چاہت سے دونوں نے اس گھر کو سجایا تھا...... دونوں کتنی محبت سے رہتے

تھے...... دونوں کے دل ایک دوسرے کی چاہت اور محبت سے سرشار تھے...... کیسے سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ دریہ نے ٹھیک کہا تھا جب دل ایک بار دور ہو جائے تو پھر رشتے کیسے قائم رہ سکتے ہیں۔

''تمہاری بیوی بھی بہت بے وفا ہے...... اور میرے پاس اس کا ثبوت ہے'' ڈاکٹر دانش نے کتنے پر اعتماد لہجے میں اسے یقین دلایا تھا اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ان الفاظ کے حصار سے نہیں نکل پائے تھے...... دریہ انہیں واقعی ہی مشکوک لگتی وہ جیسے ہی اس کے پاس جاتے۔ ڈاکٹر دانش کے الفاظ کی بازگشت انہیں دریہ کے قریب نہ آنے دیتی...... واقعی دونوں کے رشتے میں ایسی دراڑ پیدا ہو گئی تھی جو انہیں ایک دوسرے سے ملنے نہیں دیتی تھی ...... دریہ نے ٹھیک فیصلہ کیا تھا...... ایسے رشتے کا ختم ہو جانا ہی بہتر ہے...... اور انہوں نے بہت ٹوٹے دل اور بہت سے آنسوؤں کے ساتھ طلاق کے کاغذات پر سائن کر کے انہیں دریہ کو بھجوا دیئے تھے۔ ان کی زندگی میں ایسا بھیانک اور تکلیف دہ موڑ آیا تھا جس نے انہیں اندر سے جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ زندگی میں بہت کچھ کر گزرنے کا جذبہ ماند پڑ گیا تھا۔ ہر قدم پر کامیابیاں سمیٹنے والا انسان زندگی کی سب سے بڑی بازی ہار گیا تھا...... دریہ کے جانے سے ان کی زندگی خالی ہو گئی تھی ...... کبھی کبھی نہ چاہتے ہوئے بھی انسان کو وہ کام کرنے پڑتے ہیں جو اس کے وجود کو اندر سے خالی کر دیتے ہیں...... اور انسان ساری زندگی اس خالی پن کی کسک اپنے اندر کس کس طرح محسوس کرتا ہے یہ صرف وہی جانتا ہے۔ کبھی دنیا کی نعمت اور ہر شے پاس ہوتے ہوئے بھی دنیا خالی لگتی ہے...... کبھی ساری جدوجہد بے معنی اور فضول لگتی ہے...... اور کبھی...... خوشیوں سے خالی مسکراہٹیں...... اس خالی پن کی چبھن میں مزید اضافہ کر دیتی ہیں۔

ڈاکٹر محسن زیدی کی کوششوں اور ڈاکٹر رمیض کے والدین کی دعاؤں اور خدمت نے انہیں جلد صحت یاب کر دیا۔ ڈاکٹر محسن زیدی کی حوصلہ افزا باتوں نے ان کی بہت ہمت بندھائی۔ ان کی دلجوئی نے انہیں بہت سہارا دیا۔ ڈاکٹر رمیض انہیں اپنا دکھ بتاتے ہوئے اکثر رو دیتے...... اور وہ بھی ان کی باتیں سن کر پریشان ہو جاتے...... مگر وہ رفتہ رفتہ قدرے نارمل ہو گئے تو ڈاکٹر محسن زیدی نے انہیں زندگی کو دوبارہ اسی جذبے اور جوش سے گزارنے کی تلقین کی۔ انہیں اپنی ریسرچ پر مزید کام کرنے کو کہا تو انہیں ڈاکٹر دانش یاد آ گئے جو وہ کسی لمحہ بھی ان کے ذہن سے محو نہیں ہوتے تھے۔

کیا ڈاکٹر دانش کی کوئی خیریت معلوم ہوئی ہے......؟ وہ آج کل کہاں ہیں...... اور کس کے پاس؟ ڈاکٹر رمیض نے پوچھا تو ڈاکٹر زیدی نے گہری سانس لی اور اس کی جانب دیکھنے لگے۔ ''اپنی بیوی کے پاس'' انہوں نے آہ بھر کر کہا۔

''بیوی...... کے...... پاس...... امپاسبل'' ڈاکٹر رمیض اپنی سیٹ سے قدرے اچھلتے ہوئے بولے۔

''لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟'' ڈاکٹر رمیض بڑبڑائے۔

''ویسے ہی ممکن ہے جیسے ڈاکٹر دانش کا...... ڈاکٹر جالب کے ہاسپٹل میں جاب کرنا'' ڈاکٹر زیدی نے اپنے حریف ڈاکٹر جالب کے بارے میں بتایا جن کے ساتھ سرد جنگ جاری رہتی تھی۔

''ڈاکٹر جالب کے پاس...... او...... تو......'' ڈاکٹر رمیض پھر چونکے۔

''ہاں......'' ڈاکٹر رمیض نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''آئی ڈونٹ بلیواٹ...... کیا ڈاکٹر دانش سب کچھ بھول گئے کہ آپ نے...... اور میں نے کس کس طرح ان کے لئے......'' ڈاکٹر رمیض جملہ ادھورا چھوڑ کر پریشانی سے ڈاکٹر زیدی کی طرف دیکھنے لگے۔

''اپنی ذات کے زعم میں محصور انسان سب کچھ بھول جاتا ہے، اسے صرف اپنا نفس...... اپنی خواہشات اور اپنے مفادات عزیز ہوتے ہیں......'' ڈاکٹر زیدی نے کہا۔

''لیکن ڈاکٹر دانش کو کچھ تو یاد رکھنا چاہیے تھا'' ڈاکٹر رمیض نے سنجیدگی سے کہا۔

''انسان بہت عجیب مخلوق ہے...... وہ اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کو تو یاد رکھتا ہے اور جو زیادتیاں وہ دوسروں کے ساتھ کرتا ہے، اس کی justifications کے لئے 101 جواز دے گا۔ ڈاکٹر دانش نے اپنی ذہانت اور قابلیت سے زیادہ تر دوسروں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہے...... وہ بہت آسانی سے دوسروں کے دلوں، زندگیوں اور جذبات کو ٹھیس پہنچانے کے عادی ہیں......'' ڈاکٹر زیدی نے آہ بھر کر کہا تو ڈاکٹر رمیض گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ دریا اور ان کی زندگی میں دراڑ پیدا کرنے والے بھی وہی تھے۔ ڈاکٹر رمیض کا دل دھڑکنے لگا۔ کاش...... انہیں معلوم ہو سکے کہ انہوں نے دوسروں کا کتنا نقصان کیا ہے؟ ڈاکٹر رمیض نے نم آنکھوں سے کہا اور ایک دم خاموش ہو گئے۔

''بہت سے انسان کتنی آسانی سے دوسروں کی زندگیوں سے امیدیں، خوشیاں اور سکون چھین لیتے ہیں اور انہیں اس بات کا ذرا سا احساس بھی نہیں ہوتا'' ڈاکٹر زیدی نے بھی گہری سانس لے کر کہا۔

ڈاکٹر دانش کا کریہہ چہرہ ڈاکٹر رمیض کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا جب وہ دریا اور انہیں ہنستے ہوئے دیکھ کر کمرے سے باہر نکلے تھے اور ان پر چلانے لگے تھے۔

''اوہ...... مائی گاڈ'' ڈاکٹر رمیض کے منہ سے نادانستہ نکلا۔

''ڈاکٹر رمیض...... ہم انسان کی سرشت...... اور اس کی فطرت نہیں بدل سکتے...... اس کا خمیر کس مٹی سے گندھا ہے اور اس کے خمیر میں کیا کچھ شامل کیا گیا ہے...... کوئی نہیں جانتا'' ڈاکٹر زیدی نے کہا تو ڈاکٹر رمیض ان کی بات سن کر افسردہ ہو گئے۔

''ڈاکٹر رمیض...... زندگی میں قدم قدم پر ایسے کردار ملتے ہیں...... جو اپنی ذات کے زعم اور انا کے حصار سے باہر نہیں نکلتے...... جنہیں اپنے سوا کوئی اور دکھائی ہی نہیں دیتا جو جیتے ہیں تو اپنے لئے...... اور...... جب مرجاتے ہیں تو خاک میں مل کر خاک ہو جاتے ہیں...... ہمیشہ کے لئے...... ہمیں غلط فہمی ہوئی تھی کہ وہ انسانیت کی فلاح کے بارے میں سوچنے والے عظیم انسانوں میں سے ایک ہیں...... جو شخص اپنے خیر خواہوں کے خلاف سازشوں کا جال بچھانے میں مصروف رہے وہ کس طرح انسانیت کا خیر خواہ ہو سکتا ہے...... ڈاکٹر رمیض آپ اپنی ریسرچ پر دوبارہ کام شروع کریں...... میں آپ کی بھرپور مدد کروں گا...... کرائسس زندگی کا حصہ ہوتے ہیں مگر ان کو روند کر گزر جانے والے ''پرعزم'' اور ایسے لوگوں پر آنے والی نسلیں بھی فخر کرتی ہیں...... آپ اپنی ہمت کو یکجا کیجئے...... حوصلہ بلند رکھیے...... کامیابیاں آپ کی منتظر ہیں'' ڈاکٹر محسن زیدی نے انتہائی محبت سے ڈاکٹر رمیض کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے ان کی حوصلہ افزائی کی تو ان کے رگ و پے میں ایسی لہر دوڑ گئی جس نے ان کے خون کی گردش کو تیز کر دیا۔

انہیں اپنے اندر کوئی برقی توانائی سی محسوس ہونے لگی جس نے ان کے پریشان اور مردہ دل کو ایک بار پھر متحرک کر دیا۔ کچھ کرنے کا جذبہ پھر سے جوش پکڑنے لگا۔ ڈاکٹر رمیض کی آنکھیں خوشی سے چمکیں اور انہوں نے مسکرا کر ڈاکٹر محسن زیدی کی جانب دیکھا۔

''یس مائی ڈیئر..... میں ان آنکھوں میں 'امید' کی چمک دیکھنا چاہتا ہوں..... آپ بہت کچھ کر سکتے ہیں..... آپ جیسے انسان سالوں میں نہیں صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں..... قدرت آپ پر بہت مہربان ہے جس نے آپ کو عقل سلیم اور قلب سلیم عطا کیے ہے..... اور جن انسانوں میں یہ خصوصیات موجود ہوں وہ لوگ قدرت کے شاہکار اور خاص منظور نظر ہوتے ہیں۔ انہیں معلوم نہیں ہوتا کہ ان کے پروردگار نے ان کو کیا معجزاتی قوتیں عطا کی ہیں..... مگر ارد گرد کے صاحب نظر لوگ ان کو سراہے بغیر نہیں رہ سکتے کیونکہ ان خصوصیات کی کشش انہیں ان کا گرویدہ بنا دیتی ہے..... مجھے آپ سے بہت اچھی امیدیں ہیں..... آئی ایم شیور..... آپ میری اور بہت سے لوگوں کی امیدوں کو پورا کریں گے'' ڈاکٹر محسن زیدی نے ڈاکٹر رمیض کی بھرپور حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا تو وہ مسکرانے لگے۔

''تھینک یو..... سر..... آپ کی باتوں نے میرے مایوس دل میں پھر سے زندگی کی حرارت پیدا کر دی ہے..... تھینک یو ویری مچ'' ڈاکٹر رمیض نے ڈاکٹر محسن زیدی کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں مضبوطی سے تھام کر مشکورانہ انداز میں کہا اور فرط جذبات سے ان کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

''بیسٹ آف لک..... مائی ڈیئر'' ڈاکٹر زیدی نے ان کے کندھے کو ایک بار پھر تھپتھپایا تو وہ مسکرا گئے۔

انہوں نے گھر آ کر نئے جذبے، نئے عزم اور نئے جوش کے ساتھ اپنے تمام ریسرچ پیپرز نکالنے چاہے مگر ان کی اہم دستاویزات اور تمام ریسرچ پیپرز غائب تھے..... وہ گھبرا گئے..... کمپیوٹر آن کر کے تمام data چیک کرنے کی کوشش کی مگر سارا data ڈیلیٹ کر دیا گیا تھا۔ کمپیوٹر خالی تھا اور ان کی لیب کے خفیہ خانے نکلے پڑے تھے۔ ان کی اتنے سالوں کی کاوش..... تجربوں، ریسرچ کا نچوڑ غائب تھا۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے..... ان کی سانسیں رکنے لگیں۔

''کیا دریہ نے یہ سب کیا ہے؟'' وہ اس قدر ظالم بھی ہو سکتی ہے کہ میری اتنے سالوں کی محنت کو آگ لگا گئی.....'' ڈاکٹر رمیض کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''آپ کی بیوی بہت بے وفا عورت ہے'' ڈاکٹر دانش کے الفاظ ان کے کانوں میں گونجے۔

''کیا..... کوئی اس حد تک بھی بے وفائی کر سکتا ہے کہ کسی سے اس کی زندگی کی 'امید' بھی چھیننے کی کوشش کر سکتی ہے۔ ان کا سارا جوش و جذبہ ماند پڑنے لگا۔ دل ڈوبنے لگا..... آسمان پر اڑنے والے پرندے کی طرح جس کی امید اور خوشی کو اس کے پر کاٹ کر ختم کر دیا جائے تو وہ کتنا دکھی اور مغموم ہوتا ہے..... یہ صرف وہی جانتا ہے اور ڈاکٹر رمیض بھی ایسی کیفیت میں سے گزر رہے تھے۔ وہ زندگی کی ایک بازی پہلے ہار گئے تھے اور اب دوسری نے بھی انہیں بری طرح مات دی تھی۔ انہوں نے ڈاکٹر زیدی کو فون کیا اور انہیں ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔

''اوہ..... تو..... ڈاکٹر دانش اس حد تک.....'' ڈاکٹر زیدی نے انتہائی تاسف سے کہا اور خاموش ہو گئے۔

''کیا یہ سب ڈاکٹر دانش نے کیا ہے؟'' ڈاکٹر رمیض نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......'' ڈاکٹر زیدی نے وثوق سے جواب دیا۔

''آپ...... کیسے یہ سب...... جانتے ہیں؟'' ڈاکٹر رمیض نے حیرت سے پوچھا۔

''آج کی نیوز کی اہم خبر یہی تھی کہ ڈاکٹر دانش بہت جلد اپنی latest ریسرچ کے سلسلے میں پریس کانفرنس کرنے والے ہیں اور ہم دونوں اچھی طرح جانتے ہیں کہ ڈاکٹر دانش کسی بھی ریسرچ پر کام نہیں کر رہے تھے...... اور کوئی بھی ریسرچ چند دنوں میں نہیں ہو سکتی......'' ڈاکٹر زیدی نے کہا تو ڈاکٹر رمیض کو انتہائی شدید جھٹکا لگا اور اس کا فون بند ہو گیا۔ ڈاکٹر زیدی پریشان ہو گئے اور بار بار ان کا نمبر ملاتے رہے مگر ان کے موبائل پر بیلز ہوتی رہیں...... کسی نے بھی فون اٹینڈ نہیں کیا...... ڈاکٹر زیدی گھبرا گئے اور جلدی سے ان کے گھر پہنچنے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر رمیض اپنے کمرے کے فرش پر اوندھے منہ گرے تھے اور بے ہوش ہو چکے تھے۔ ڈاؤن ہو گیا تھا...... ڈاکٹر زیدی نے بہت کوشش اور توجہ سے ان کا علاج کیا...... وہ چند روز بعد قدرے بہتر ہو گئے تھے مگر وہ ایسے خاموش ہوئے تھے کہ کچھ بھی نہ بولتے تھے ان کے لب گویا سل گئے تھے یا ان کے پاس کہنے سننے کو کچھ نہ رہا تھا۔ ڈاکٹر زیدی بھی بہت افسردہ تھے...... وہ انہیں دبے دبے الفاظ میں دلاسا دینے کی کوشش کرتے ان کی ہمت بندھاتے تو ڈاکٹر رمیض یوں خالی نظروں سے ان کی جانب دیکھتے جیسے انہیں ان کی کسی بات پر بھی یقین نہ رہا ہو...... ان کی آنکھیں ایسی نا امید اور سونی ہو گئی تھیں جیسے ان سے ان کی زندگی کا نور ہی چھین لیا ہو...... دل اور دماغ خالی ہو گئے تھے۔ ہر طرف 'خالی پن' دکھائی دے رہا تھا اور اس 'خالی پن' سے جنم لینے والی کسک اندر ہی اندر انہیں کتنا تڑپا رہی تھی اس کی کسی کو خبر نہ تھی۔ پرعزم زندگی گزارنے والے جب 'خالی پن' کا شکار ہوتے ہیں تو کس طرح یاسیت ان کو مضطرب رکھتی ہے...... یہ کوئی نہیں جان پاتا۔

☆

ڈاکٹر دانش نے ڈاکٹر رمیض کے ریسرچ پیپرز کی مدد سے ایسی ویکسین تیار کر لی تھی جس سے معمولی ابنارمل بچوں کے damaged برین سیلز کو متحرک کرنے کی کوشش کی گئی تھی جو کسی چوٹ کے نتیجے میں ذہنی طور پر مفلوج ہو گئے تھے۔ یہ تجربہ کسی حد تک کامیاب رہا تھا اور چند بچے ٹھیک بھی ہو گئے تھے۔ اس ویکسین نے ایک تہلکہ سا مچا دیا تھا۔ ایسے بچوں کے والدین کے اندر امید کی شمع روشن ہو گئی تھی اور وہ بے حد خوش تھے مگر پیدائشی طور پر ابنارمل بچوں کے بارے میں یہ ویکسین اتنی کارگر ثابت نہیں ہوئی تھی اور اس بات کا علم صرف ڈاکٹر دانش کو ہی تھا لیکن وہ اس کا بھی دعویٰ کر رہے تھے۔ پوری دنیا سے انہیں مبارکباد کے فون آ رہے تھے ان کی شہرت کا ڈنکا ہر جانب بج رہا تھا۔ ان کی تحقیق کو بے حد سراہا جا رہا تھا۔ ان پر فخر کیا جا رہا تھا۔ ان کے لئے ایوارڈز کا اعلان کیا جا رہا تھا۔ اس ریسرچ نے ان کو ہیرو بنا دیا تھا فخر و غرور نے ڈاکٹر دانش کا دماغ ساتویں آسمان پر پہنچا دیا تھا۔ پریس کانفرنس کے بعد تو ہر گھر میں ان کی تعریفیں ہو رہی تھیں۔

''میں نے یہ کام دکھی انسانیت کی خدمت کے لئے کیا ہے'' ڈاکٹر دانش نے ایک انٹرویو میں کہا اور ڈاکٹر محسن زیدی دانت پیس کر رہ گئے۔

''اتنا جھوٹ...... اتنا دھوکہ...... اور...... اتنی ایکسپلائیٹیشن...... انسان اس حد تک بھی کمینہ ہو سکتا ہے...... کس قدر آسانی سے دوسروں کے حق پر ڈاکہ ڈال کر کتنا مطمئن اور پرسکون ہوتا ہے'' ڈاکٹر زیدی کو ان کا انٹرویو سن کر غصہ آ گیا اور ان سے شدید نفرت محسوس ہونے لگی۔

کاش...... ڈاکٹر رمیض کے پاس کچھ تو ثبوت ہوتا...... اور ان کے جو ریسرچ پیپرز شائع ہوئے تھے۔ وہ اس ویکسین سے متعلقہ نہیں تھے۔ ویکسین پر کام انہوں نے بعد میں کیا تھا لیکن وہ کام ابھی ادھورا تھا اس پر مزید ریسرچ باقی تھی اور اس کام کو مکمل کر کے ڈاکٹر دانش نے سارا کریڈٹ خود لے لیا تھا۔ ڈاکٹر رمیض کی ساری محنت اکارت گئی تھی۔ ان کے ہاتھ میں کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا...... دریہ کے جانے سے ان کا اندر خالی ہو گیا تھا اور اتنی محنت چھن جانے سے ان کا جذبہ ماند پڑ گیا تھا۔

☆

ان کی کامیابی سے فریحہ بہت خوش تھی...... کیونکہ اس کے اندر امید کی کرن چمکی تھی...... اتنے بہت سے ڈاکٹروں سے چیک اپ کے بعد سب نے عاصم کے لئے انکار کر دیا تھا کہ اس کے برین کا ایک اہم حصہ پیدائشی طور پر damage ہے اور اس کا ٹھیک ہونا ناممکن ہے...... بشرطیکہ قدرت چاہے اور ناممکن کو ممکن بنا دے...... اور وہ ہر وقت دل ہی دل میں خدا سے کسی معجزے کی دعا کرتی رہتی جو اس کے عاصم کو ٹھیک کر دے...... زیادہ نہیں تو...... اتنا ہی...... کہ وہ خود چل پھر سکے...... خود کچھ کھا پی سکے...... اس کی معذوری دیکھ دیکھ کر اس کا دل کرلاتا رہتا تھا...... وہ ماں تھی اس کے لئے کوئی ایسی بات بھی نہیں سوچ سکتی تھی جو اس کے لئے مزید اذیت کا باعث بنے...... عاصم سے جدائی کا دکھ اور صدمہ وہ کبھی بھی برداشت نہیں کر پائے گی۔ اب وہ منتظر تھی کہ کب ڈاکٹر دانش عاصم کو اس ویکسین کے لئے ہاسپٹل لے کر جاتے ہیں۔ وہ ایک ایک دن اس امید میں گزار رہی تھی اور اس کے اندر اتنی امید پیدا ہو چکی تھی جو اس کو اندر ہی اندر مسرور رکھتی...... وہ ان دنوں بہت خوش تھی...... اور ڈاکٹر دانش اس کی خوشی اور اطمینان دیکھ کر مشکوک ہو جاتے فریحہ نے عاصم کی خاطر ان کو اپنے گھر میں انیکسی دی تھی۔ ان کے آرام اور ضروریات کا خیال رکھا تھا مگر انہیں اپنی ذاتی زندگی میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اس نے پہلے روز سے ہی ان کے قیام کا انتظام انیکسی میں کیا تھا...... اور اس بات نے ڈاکٹر دانش کو اندر ہی اندر اس کا مزید دشمن بنا دیا تھا...... شیر افگن کا فون اس کا فریحہ سے ملنے آنا انہیں بری طرح کھٹکتا تھا۔ شیر افگن کے بارے میں سن کر ان کے تن بدن میں آگ لگ جاتی تھی مگر وہ خاموش رہتے تھے...... رفتہ رفتہ شیر افگن نے فریحہ...... کو فون کرنا بھی بند کر دیا تھا اور اس سے میل جول بھی تقریباً ختم کر دیا تھا...... ورنہ وہ فریحہ کے بارے میں بہت پوزیسو ہو گیا تھا اور کئی بار اس کو شادی کی آفر کی تھی...... فریحہ اس کی بات سن کر پہلے تو انکار کر دیتی مگر آہستہ آہستہ وہ اس کی محبت کی اسیر ہونے لگی۔ اس کی محبت اس کے اندر کے سوئے ہوئے پن کو جھنجوڑنے لگی۔ اس کا سکون تہہ و بالا کرنے لگی اسے شیر افگن کی ضرورت شدت سے محسوس ہونے لگی۔ اس نے شیر افگن کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیا تھا کہ وہ بہت جلد ڈاکٹر دانش سے طلاق لے کر اس سے شادی کر لے گی...... دونوں مطمئن ہو گئے تھے اور پھر اس موضوع پر بات نہ کرتے...... نجانے اچانک کیا ہو گیا تھا کہ شیر افگن بہت مصروف ہو گیا تھا وہ فریحہ کو نہ تو صبح سویرے وش کرتا...... نہ آفس میں لنچ بریک میں اسے فون کرتا اور نہ ہی رات کو اسے گڈ نائٹ کہتا...... فریحہ کے لئے یہ بہت حیرانگی کی بات تھی...... اس نے ایک دو بار اس سے وجہ دریافت کی اور وہ مصروفیت کا بہانہ بنا کر ٹال گیا۔ فریحہ نے بھی اسے مزید کریدنا مناسب نہ سمجھا۔ فریحہ کو دو اہم پراجیکٹس ملے تھے اور وہ اس میں بہت مصروف رہتی تھی۔ اس نے اپنی فیلڈ میں بہت شہرت حاصل کر لی تھی اور ڈاکٹر دانش اس کو یوں مصروف، مشہور اور مطمئن دیکھ کر اپ سیٹ ہو جاتے...... انہوں نے تو اسے ہر طرح سے مفلوج کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی زندگی...... اس کا کیریئر...... اس کی خوشیاں اور سکون چھیننے کی بہت کوشش کی تھی۔ کس کس طرح

اس کی عزت نفس مجروح نہ کی تھی اور وہ پھر بھی زندہ تھی...... مطمئن تھی اور پُرسکون بھی تھی...... فریحہ کی کامیابیاں اور اس کی شہرت انہیں ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں۔انہیں کامیاب عورتوں سے نفرت تھی...... وہ عورت کی کامیابی کو مرد کی ناکامی تصور کرتے تھے...... مرد کی کامیابیوں کے سامنے عورت کی کامیابی کیا معنی رکھتی ہے اور شادی کے بعد انہوں نے ہر ممکن طریقے سے اس کی ذات کی نفی کرنے کی کوشش کی تھی اس کے لئے زندگی کا ہر لمحہ اذیت ناک بنا کر وہ خوش ہوتے تھے اور انہی سب باتوں کے باوجود وہ پہلے سے بھی زیادہ مضبوط اور مطمئن تھی اور اس کے پیچھے کون تھا وہ اچھی طرح جان گئے تھے، شیر افگن اس کی خوشی تھا اور عاصم اس کی زندگی کی امید اور سہارا تھا...... عاصم کے وجود سے اس کی زندگی متحرک تھی اس کے نیم مردہ وجود سے اسے زندگی میں جدوجہد کرنے کی خواہش پیدا ہوئی تھی۔اس کے ہونے سے اسے حوصلہ ملتا تھا۔

جب سے ڈاکٹر دانش کی ویکسین کی کامیابی کا چرچا ہر جانب ہو رہا تھا اسے سب کچھ بھول گیا تھا...... اگر یاد تھا تو صرف عاصم...... اور...... وہ اس دن کی شدت سے منتظر تھی جب عاصم بھی ٹھیک ہو جائے گا۔عاصم کے بارے میں سوچ سوچ کر اس کا دل کتنی خوشی اور امید سے بھر جاتا اس کا احساس اسے پہلی بار ہو رہا تھا۔وہ ان دنوں شیر افگن کو بالکل بھول چکی تھی۔اگر یاد تھا تو صرف عاصم......

''آپ...... عاصم کو کب ہاسپٹل لے کر جائیں گے؟'' فریحہ نے کئی دنوں کے انتظار کے بعد ڈاکٹر دانش سے پوچھا۔

''بہت جلد......'' انہوں نے جواب دیا۔

''کیا آپ کو امید ہے کہ وہ ٹھیک ہو جائے گا'' فریحہ نے بے صبری سے پوچھا۔

''ٹھیک...... کیوں نہیں ہوگا...... میں نے اتنی محنت...... اتنی جدوجہد صرف اس کے لئے ہی تو کی ہے...... مجھے بھلا کیا ضرورت پڑی تھی کہ دوسروں کے لئے اتنی محنت کروں...... اتنا سر کھپاؤں...... میں نے تو یہ سب کچھ صرف اپنے بیٹے کے لئے ہی کیا ہے......اور تمہارے لئے...... کیوں کہ تم اس سے بہت محبت کرتی ہو......'' ڈاکٹر دانش نے معنی خیز انداز میں مسکرا کر کہا۔

''تم اس سے محبت کرتی ہو......نا؟'' ڈاکٹر دانش نے پوچھا۔

''ہاں......اپنی زندگی سے کون محبت نہیں کرتا ہوگا......؟'' فریحہ نے مسکرا کر جواب دیا۔

''کیا دنیا میں تمہیں صرف وہی عزیز ہے......اور......کوئی نہیں؟'' ڈاکٹر دانش نے استفہامیہ نگاہوں سے پوچھا۔

فریحہ نے چونک کر ان کی جانب دیکھا کیونکہ ایک سوال میں مضمر اور بہت سے سوالات اس سے پوچھے گئے تھے۔

''نہیں'' فریحہ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''میں جانتا تھا...... عاصم تمہاری زندگی ہے...... تمہاری امید...... خوشیاں اور سب کچھ ہے...... میں ضرور اسے ٹھیک کرنے کی کوشش کروں گا......بس ایک دو روز میں میں اسے ہاسپٹل لے جاؤں گا......'' ڈاکٹر دانش نے کچھ سوچتے ہوئے کہا تو فریحہ خوش اور پُرسکون ہوگئی۔

ڈاکٹر دانش کا شاطر ذہن نت نئے منصوبے بنانے لگا۔

☆

''کل صبح میں عاصم کو ہاسپٹل لے کر جاؤں گا.....تم اسے تیار کر دینا'' ڈاکٹر دانش نے دو روز بعد فریحہ کو کہا۔

''کیا میں اس کے ساتھ نہیں جاؤں گی؟'' فریحہ نے حیرت سے پوچھا۔

''کوئی خاص ضرورت نہیں.....میں ہاسپٹل سے ایمبولینس منگوالوں گا'' ڈاکٹر دانش نے جواب دیا۔

''لیکن.....عاصم کبھی بھی میرے بغیر کہیں نہیں گیا.....'' فریحہ نے افسردگی سے کہا۔

''تمہارے ہونے یا نہ ہونے سے اسے کیا فرق پڑتا ہے.....اسے تو کسی بھی بات کا شعور نہیں'' ڈاکٹر دانش نے فریحہ کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''کسی کو محسوس کرنے کے لئے شعور کی نہیں.....محبت بھرے لمس کی ضرورت ہوتی ہے.....وہ میرے ہاتھوں کے لمس کو محسوس کرتا ہے..... جب میں اسے چھوتی ہوں تو محبت سے اس کی آنکھیں چمکنے لگتی ہیں اور وہ اپنی محبت کا اظہار مجھے اپنے انداز سے چھو کر اور اپنے منہ سے مخصوص آوازیں نکال کر کرتا ہے۔ دانش ان سالوں میں.....میں نے اس میں ایسی ایسی باتیں آبزرو کی ہیں کہ میں قدرت پر اور اس کے معجزوں پر حیران ہو گئی ہوں.....انسان ہر صورت میں اس کا بہت بڑا معجزہ اور شاہکار ہے'' فریحہ نے فرط جذبات سے لبریز بھرائی آواز کے ساتھ کہا۔

''یہ سب تمہارا وہم ہے.....ہر چیز اور ہر تخلیق سائنس کا کرشمہ ہے اور اس میں تبدیلیاں آنا نیچرل ہے۔ نیچرل فزکس بھی نہیں بدلتے.....وقیانوسی ذہن ایسی تبدیلیوں کو قدرت کے معجزوں سے تعبیر کرتے ہیں اور ہم جیسے ویل ایجوکیٹڈ لوگ ان معجزوں پر یقین نہیں کرتے۔ ہر ایکشن کا ری ایکشن ہونا نیچرل ہوتا ہے۔ اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ''سائنس'' ہے.....انسان کے نارمل یا ابنارمل ہونے کی بھی سائنسی وجوہات ہوتی ہیں، برین سیلز یا ٹشوز کے damage ہونے کی بھی وجوہات ہوتی ہیں.....اگر ایسا نہ ہوتا تو میری ویکسین کارگر نہ ہوتی.....مردہ برین سیلز اس ویکسین سے کبھی بھی ایکٹو نہ ہوتے۔ اس کا مطلب بالکل واضح ہے، برین سیلز کسی وجہ سے damaged ہوئے اور سائنسی طریق علاج یعنی میڈیسنز سے وہ متحرک ہو گئے.....اب اس میں قدرت اور معجزے کی بات کہاں سے آ گئی.....ایک بیماری کا علاج کیا گیا اور وہ ٹھیک ہو گئی.....'' ڈاکٹر دانش نے اس قدر مدلل انداز میں کہا تو فریحہ خاموش ہو گئی.....کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس نے ڈاکٹر دانش کے ساتھ جب بھی کسی ٹاپک پر مدلل بحث کرنے کی کوشش کی.....وہ زچ ہو کر ہائپر ہو جاتے.....اور ہر دفعہ بحث کو انتہائی برے انداز سے ختم کرنا پڑتا۔ فریحہ خاموش نظروں سے اسے دیکھنے لگی جس کی سوچیں اور خیالات اس سے کتنے مختلف تھے.....وہ قدرت کی مناعیوں اور اس کی کرشمہ سازیوں کی قائل تھی.....اور وہ سائنس کی کرشمہ سازیوں کا مداح تھا.....اسے معجزوں پر یقین تھا اور وہ ان کا منکر.....وہ سوچ اور عمل کی قائل تھی اور وہ عمل ور دعمل کے جواز پر یقین رکھتا تھا.....وہ صرف خدا ہے اور باقی سب کچھ سائنس کا مرہون منت ہے.....اس سوچ نے اس کی ذات سے قدرت کے لئے مخصوص جذبات ختم کر دیئے تھے وہ اپنی کامیابیوں، ذات کے زعم اور انانیت کی چاہت میں اس حد تک آگے چلا گیا تھا کہ اس نے رفتہ رفتہ قدرت کی نفی کر دی تھی.....سوچ سے نہیں مگر اپنے عمل سے.....فریحہ اس کی باتوں کو انتہائی حیرت سے سنتی اور ان کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان ہوتی.....وہ شخص واقعی اس سے بہت فاصلے پر تھا اور وہ اس سے بہت دور.....اگلے روز وہ عاصم کو ہاسپٹل لے جانے لگے تو.....فریحہ نے عاصم کو جی بھر کر پیار کیا۔ عاصم کی

آنکھوں میں عجیب سی حسرت تھی......وہ کتنی ہی دیر اسے چومتی رہی...... پیار کرتی رہی......

''پلیز...... مجھے بھی اس کے ساتھ جانے کی اجازت دے دیجئے'' فریحہ نے بے تابی سے ڈاکٹر دانش کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''تمہارا وہاں جانا بے کار ہے...... آپریشن تھیٹر کے باہر یونہی پریشان بیٹھی رہوگی'' ڈاکٹر دانش نے کہا۔

''میں یہاں بھی تو بیٹھ کر پریشان ہوں گی......تو...... وہاں بیٹھ کر انتظار کرلوں گی'' فریحہ نے بے صبری سے کہا۔

''پروسیس کافی لمبا ہوگا......تم دو گھنٹے بعد آجانا'' ڈاکٹر دانش نے کچھ سوچتے ہوئے کہا تو فریحہ خاموش ہوگئی۔

''کیا...... پروسیس رسکی ہے؟'' فریحہ نے ڈرتے دل کے ساتھ پوچھا۔

''کچھ نہیں کہا جاسکتا...... ہو بھی سکتا ہے...... سب انسانوں کے جسم میں میڈیسنز کا ری ایکشن ایک سا نہیں ہوتا...... کچھ نارمل رہتے ہیں اور کچھ اور سینکڑوں لوگوں میں ردعمل بہت شدید ہوتا ہے۔ عاصم کا جسم کیسے ری ایکٹ کرے گا...... یہ میں بھی نہیں جانتا'' ڈاکٹر دانش نے تفصیلاً اسے بتا کر مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ فریحہ خاموش ہوگئی اور نم آنکھوں کے ساتھ عاصم کو ایمبولینس میں جاتے ہوئے دیکھنے لگی۔

''اب میں بھی چلتا ہوں، خدا حافظ'' ڈاکٹر دانش کہہ کر گاڑی میں بیٹھے اور ڈرائیور کو چلنے کو کہا۔

فریحہ کا دل بری طرح بے تاب ہونے لگا۔ وہ برآمدے کی سیڑھیوں میں بیٹھ کر رونے لگی۔

''بی بی...... مرو...... کیوں رہی ہو...... اس کے لئے دعا کرو...... خدا اس پر کرم کرے گا'' اماں نے فریحہ کو روتے دیکھ کر کہا۔

''اماں...... نجانے کیوں...... میرا دل بہت گھبرا رہا ہے...... اماں کہیں میں نے اپنا بچہ اس شخص کے حوالے کر کے کوئی غلطی تو نہیں کی...... میں نے تو اس پر کبھی اعتبار کرنے کا سوچا بھی نہیں تھا'' فریحہ نے اپنے دل میں جنم لینے والے خدشات کا ذکر اماں سے کیا۔

''بی بی...... تم غم نہ کرو...... وہ اس کا باپ ہے...... اور خون میں بڑی کشش ہوتی ہے...... اپنے بچے کو تکلیف میں کون سے ماں باپ دیکھ سکتے ہیں...... تو فکر نہ کر...... بس دعا کر......'' اماں نے اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا اور وہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔

اس نے عاصم کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جھانکا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کا خالی کمرہ اس کے نہ ہونے کے احساس سے اسے دوچار کر رہا تھا اور یہ احساس اس کے لئے بہت جان لیوا تھا۔ عاصم کبھی اس سے جدا بھی ہوگا...... یہ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ وہ تو ابھی تک اس کی آغوش میں سر رکھ کر سوتا تھا اور اسے اپنے سینے کے ساتھ لگا کر اسے جو ٹھنڈک...... سکون اور خوشی ملتی تھی۔ پوری کائنات میں اس کا نعم البدل کوئی نہ تھا۔ عاصم اس کی تنہائیوں کا ہمراز تھا۔ اس کے وجود کا حصہ تھا۔ اس کی ممتا کی تسکین تھا۔ عاصم اس کی زندگی کی سب سے بڑی امید اور سہارا تھا۔ وہ عاصم کے لئے کیا محسوس کرتی تھی۔ دنیا کا کوئی دوسرا شخص کبھی بھی محسوس نہیں کرسکتا تھا۔ وہ اس کی کل کائنات تھی۔ دوسروں کے لئے وہ ایک بے کار وجود تھا...... ناکارہ انسان...... جس کی زندگی میں کوئی contributions نہیں تھیں...... ایک نیم مردہ رینگتا ہوا کیڑا...... جسے خود بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ اس کے لئے کیا حیثیت رکھتا ہے...... اس کی زندگی کسی کے لئے اہم ہے بھی یا نہیں...... اس کی نہ موت سے کسی کو فرق پڑتا ہے اور نہ ہی زندگی سے...... مگر پھر بھی زندگی کے phenomenon میں اس کی کہیں نہ کہیں ضرورت ضرور ہوتی ہے...... عاصم بھی فریحہ کی زندگی کے لئے

بہت ضروری تھا۔ اسے دیکھ کر...... اسے چھو کر اور اسے محسوس کر کے...... فریحہ کا اندر متحرک ہو جاتا تھا...... اس کے اندر زندہ رہنے کی امید اور لگن پیدا ہونے لگتی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے عاصم کی زندگی کا ایک ایک پل گزرنے لگا...... اور اس کی آنکھوں سے آنسو شدت سے رواں ہونے لگے۔ اس کی نظریں لاؤنج کی دیوار پر لگے کلاک پر تھیں۔ وہ دو گھنٹوں کے گزرنے کا شدت سے انتظار کر رہی تھی...... اس سے تو چند منٹ گزارنے مشکل ہو رہے تھے...... دو گھنٹے کیسے گزار پائے گی دو گھنٹے...... ڈاکٹر دانش نے دو گھنٹوں کا اسے کیوں کہا تھا...... دو گھنٹوں میں کیا خاص بات تھی؟ ایک دم اس کا ذہن متحرک ہو کر سوچنے لگا...... اور وہ بے حد پریشان ہونے لگی...... اس کے دل میں وسوسے جنم لینے لگے...... وہ جتنا زیادہ اس کے بارے میں سوچتی اتنی ہی زیادہ پریشان ہونے لگی......

''اماں...... میں باسپٹل جا رہی ہوں...... میں مزید انتظار نہیں کر سکتی...... میرا دل بہت گھبرا رہا ہے'' فریحہ نے اپنا بیگ کندھے پر ڈالا اور گاڑی کی چابیاں لے کر باہر نکل گئی۔

اماں حیرت سے اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہ گئی۔

عاصم کے برین کو senseless کیا گیا تھا اور وہ بے حس و حرکت ان کے سامنے آپریشن تھیٹر میں اسٹریچر پر پڑا تھا۔ ڈاکٹر دانش نے تمام سٹاف کو وہاں سے بھیج دیا تھا اور سب حیران بھی ہو رہے تھے۔

''ڈاکٹر دانش...... میرا خیال ہے یہ پہلا مریض ہے جو پیدائشی ابنارمل ہے اور جس پر آپ پہلی بار اپنی ویکسین ٹرائی کریں گے...... کیا اس کے لئے اس کے ٹیسٹ لینے ضروری نہیں؟ ڈاکٹر دانش کے اسسٹنٹ ڈاکٹر ماجد نے عاصم کے معصوم چہرے کی جانب حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ...... میرا بیٹا ہے اور اس کے ٹیسٹ میں کر چکا ہوں...... آپ بھی باہر جائیے...... مجھے بہتر معلوم ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ مجھے اپنے کام میں نہ تو کسی کی مداخلت پسند ہے اور نہ ہی مجھے کسی کے مشورے کی ضرورت ہوتی ہے'' ڈاکٹر دانش نے قدرے روکھائی سے کہا تو ڈاکٹر ماجد خاموش نگاہوں سے ان کی جانب دیکھتے ہوئے باہر چلے گئے۔

ڈاکٹر دانش نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور عاصم کی جانب دیکھنے لگے...... اور...... پھر کلاک کی جانب...... اس کے برین کو senseless کیے کافی ٹائم گزر گیا تھا۔ انہوں نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ عاصم کی جانب دیکھا اور مختلف انجکشنز سے ایک ویکسین تیار کی اور اپنی تیار کردہ ویکسین میں اس کو مکس کر کے اسے انجکشن کے ذریعے لگا دی۔

عاصم نے ایک دو بار جھٹکے لیے...... ڈاکٹر دانش بغور اس کی جانب دیکھتے رہے...... اس کے جھٹکوں میں اضافہ ہونے لگا...... اور اس کے اندر عجیب سا اضطراب پیدا ہونے لگا...... اس کے بے حس و حرکت وجود میں حرکت سی پیدا ہونے لگی۔ عاصم نے نیم بیہوشی میں اپنے ہاتھ پاؤں مارے اور اس کے چہرے اور جسم پر پسینہ آنے لگا۔ ڈاکٹر دانش کی نظریں کلاک پر تھیں۔

فریحہ بے تابی سے آپریشن تھیٹر کے باہر کھڑی ڈاکٹر دانش کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔

''اندر جانا منع ہے...... ڈاکٹر صاحب آپریشن تھیٹر میں مصروف ہیں...... آپ باہر بیٹھ کر انتظار کریں'' ایک نرس نے اسے قدرے درشت

لہجے میں کہا۔

''انتظار......'' اس نے بے بسی سے کہا اور نم آنکھوں کے ساتھ دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔

''کتنا مشکل ہوتا ہے انتظار کرنا...... ایک ایک لمحہ اور ایک ایک پل اذیت بن جاتا ہے...... نجانے ہم انسانوں کی زندگیوں میں اتنا انتظار کیوں لکھ دیا گیا ہے...... انتظار سے کس قدر اضطراب جنم لیتا ہے...... یہ تو انتظار کرنے والے کو معلوم ہوتا ہے...... یہ کتنا روح فرسا اور تکلیف دہ ہوتا ہے...... نجانے کب میں اپنے بیٹے کو دوبارہ دیکھ سکوں گی۔ اس نے انتہائی مضطرب اور بے قرار ہو کر سوچا۔ اس کا دل عجیب اضطراری کیفیت سے دو چار ہو رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بہت بے بس محسوس کر رہی تھی اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ کچھ کرے۔ ایسا کرے جو اس کے دل کو سکون دے...... وہ سب کو دروازے پرے دھکے دے کر آپریشن تھیٹر کے اندر جانا چاہتی تھی وہ ایسا کرنا چاہتی تھی مگر وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی کیونکہ وہ بہت مجبور اور بے بس تھی...... اور ایسے مجبور لمحوں کی بے بسی انسان پر اس کی اوقات ظاہر کرتی ہے...... اسے اپنی حیثیت بتاتی ہے کہ وہ کتنا لاچار ہے اور اپنے لئے بہت کچھ چاہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ انتہائی بے بسی سے اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے اور اس نے آہ بھر کر کھڑکی سے باہر کھلے آسمان کی طرف دیکھا...... وسیع نیلگوں آسمان کی جانب دیکھتے ہی اندر کے پھپھولے پھٹ گئے اور وہ سسکیاں بھرنے لگی۔

''دلوں کا درد...... ذہنوں کی اذیتیں...... اور جسموں کی تکلیفوں سے صرف تو آشنا ہے۔ میرے پریشان اور مضطرب دل کی آواز سن لے...... اور...... میرے عاصم کو......'' اس کی سوچ ادھوری رہ گئی اور ایک دم آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا۔ اک کھلبلی سی مچ گئی۔ فریحہ بھاگ کر دروازے کی جانب لپکی۔ اس کے اوسان خطا ہونے لگے اور چہرہ زرد پڑنے لگا۔ اس کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔ ایک مردہ اسٹریچر اس کے پاس سے گزرا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اسے اپنی سانسیں رکتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ اس نے کسی سے کچھ پوچھنا چاہا مگر اس کے لب یوں جامد ہو گئے جیسے ان میں کوئی حرکت ہی نہ ہو...... وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے لاش کی جانب دیکھنے لگی جس کا سارا چہرہ اور جسم سفید چادر سے ڈھکے ہوئے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر دانش آپریشن تھیٹر سے باہر نکلے۔ فریحہ نے بے قراری سے ان کی جانب دیکھا۔

''دانش...... عاصم...... ک...... ک...... کہاں...... ہے؟'' وہ بے قراری سے اٹک اٹک کر بولی۔

''سوری...... ہی...... از...... نو...... مور...... ویکسین کا اس کے جسم پر بہت برا اثر ہوا...... مجھے بہت امید تھی...... مگر......'' ڈاکٹر دانش نے کندھے اچکائے۔ ان کے چہرے پر کوئی دکھ اور ملال نہیں تھا۔

''کیا...... میرا عاصم اب اس دنیا میں نہیں؟'' اس نے انتہائی حیرت سے چونک کر پوچھا۔

''نہیں'' ڈاکٹر دانش نے گہری سانس لے کر جواب دیا۔

''تم...... جھوٹ بولتے ہو...... تم جھوٹے ہو...... تم نے جان بوجھ کر اسے مارا ہے...... میرا دل کہتا ہے...... تم جھوٹے، کمینے، مکار اور دھوکے باز انسان ہو...... میں تم سے دھوکہ کھا گئی جو تم پر اعتبار کیا'' وہ چلانے لگی...... اور سسکنے لگی۔

''اس میں تمہاری غلطی ہے میری نہیں'' ڈاکٹر دانش نے مسکرا کر معنی خیز انداز میں جواب دیا تو فریحہ کا خون غصے سے کھولنے لگا اس کے

اندر گویا آگ سی لگ گئی۔ اس نے پاس پڑی کرسی اٹھا کر زور سے ڈاکٹر دانش کے سر پر دے ماری۔ وہ وہیں فرش پر گر گئے اور ان کے سر سے خون بہنے لگا۔ ہاسپٹل کا سارا اسٹاف وہاں اکٹھا ہو گیا مگر فریحہ سب کو چھوڑ کر عاصم کی لاش کے پاس پہنچ گئی جو بالکل بے یار و مددگار پڑی تھی۔ کوئی بھی اس کے پاس نہیں تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ چادر اس کے چہرے سے ہٹائی۔ اس کا چہرہ نیلا ہو رہا تھا اور آنکھیں بالکل بند تھیں۔

''عاصم......'' وہ زور سے چیخ مار کر اس کے ساتھ لپٹ گئی اور سسکیاں بھرنے لگی...... اس کی زندگی کا سہارا اس کی امید اس کی زندگی کا محرک سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔

''میں...... میں...... تمہارے بغیر کیسے زندہ رہوں گی...... تم مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے......'' فریحہ کا رو رو کر برا حال ہو گیا تھا۔ اس نے عاصم کا پوسٹ مارٹم کرایا تو رپورٹ میں واضح طور پر لکھا تھا کہ اس کو زہر کا انجکشن لگایا گیا تھا۔ اس کا مطلب وہ اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ اس شخص نے اس ابنارمل اور نیم مردہ انسان کو موت کے گھاٹ اتار کر فریحہ کو زندہ درگور کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اس کے لئے اس کی زندگی ہے اس کی امید ہے...... اس کی خوشی ہے اور زندگی کی حرارت ہے...... اور اس نے فریحہ سے جان بوجھ کر سب کچھ چھین کر اسے خالی کر دیا تھا......

اس نے ڈاکٹر دانش کے خلاف مقدمہ درج کرانا چاہا مگر وہ خود ہاسپٹل میں پڑے تھے۔ کرسی سر پر لگنے سے ان کے دماغ کا انتہائی حساس آپریشن ہوا تھا...... اور ابھی وہ بے ہوشی کے عالم میں تھے۔ ڈاکٹر ان کی ذہنی حالت کے بارے میں کچھ بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتے تھے۔ ان کی زندگی بھی خطرے میں تھی...... اور یہ مقدمہ فریحہ کے خلاف بھی درج کرایا جا سکتا تھا اس لئے اسے خاموش رہنے کا مشورہ دیا گیا۔

عاصم کے چلے جانے سے اس کی زندگی میں گہرا خلا پیدا ہو گیا تھا۔ زندگی جیسے رک سی گئی تھی...... کچھ کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا...... اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے عاصم کے چلے جانے سے اسے بالکل فراغت مل گئی ہو...... کرنے کو کوئی کام نہ رہا ہو...... وہ سارا وقت خاموش بیٹھی آنسو بہاتی رہتی...... اس کا دل کتنا روتا...... کتنا تڑپتا...... کسی کو بھی احساس نہ ہوتا رو رو کر اس کی آنکھوں میں سوزش پیدا ہو گئی تھی اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے گہرے ہو گئے تھے...... اس نے کھانے کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ اماں اسے بہت سمجھاتی...... مگر وہ خاموشی سے سب کچھ سنتی رہتی۔ اس کا کسی سے کوئی بھی بات کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ وہ ہر وقت عاصم کے کمرے میں گھسی اس کے کپڑوں کو بار بار نکال کر تہہ لگاتی۔ پھر انہیں وارڈ روب میں رکھتی پھر نکالتی...... پھر انہیں خراب کرتی اور پھر انہیں تہہ لگاتی...... سارا وقت یہی کچھ کرتی رہتی۔ اماں اسے دیکھ دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ امریکہ سے فریحہ کے والدین آئے اور اسے کچھ روز کے لئے ہاسپٹل ایڈمٹ کرا دیا۔ عاصم کے جانے کے بعد وہ ایک رات بھی نہیں سوئی تھی۔ مسلسل جاگنے سے اس کا ذہن بہت اپ سیٹ ہو گیا تھا اور وہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگی تھی...... ڈاکٹروں نے اسے آرام کا مشورہ دیا تھا اور گھر میں ہر طرف اسے عاصم دکھائی دیتا رہتا...... اس لئے انہوں نے اسے ہاسپٹل میں ایڈمٹ کرا دیا۔ چند روز وہ ہاسپٹل میں رہی۔ ڈاکٹروں نے اسے نیند کے انجکشن دے کر سلایا تھا......

کچھ روز بعد وہ ہاسپٹل سے گھر آئی تو قدرے بہتر تھی...... مگر بہت خاموش...... حیرت سے ہر شے کو دیکھتی رہتی...... اس کے ماں باپ اس کی بہت دلجوئی کرتے اور دونوں نے اسے زبردستی آفس بھیجا تاکہ اس کا کام میں دل لگے۔ وقت آہستہ آہستہ اس کے زخم کو مندمل کرنے لگا۔ عاصم ایک یاد بن کر اس کی روح میں سرایت کر گیا...... درد بن کر دل میں ٹھہر گیا تھا...... جس سے فرار ممکن نہیں تھی۔

ایک ماہ بعد اس کے ماں باپ واپس امریکہ چلے گئے ...... وہ قدرے بہتر ہو گئی تھی ...... اس نے کچھ نئے پراجیکٹس بھی لینے کا سوچا تھا۔ زندگی اپنے معمول پر آنے لگی تھی مگر اس سارے عرصے میں شیر افگن ایک بار بھی اس کو ملنے نہیں آیا تھا ...... نہ کوئی فون کیا تھا اسے اس کے رویے پر حیرت بھی ہوتی اور پریشانی بھی ...... عاصم کے بعد شیر افگن اس کے دل میں بسا تھا جس نے اس سے محبت کے بہت دعوے کئے تھے ...... جس کو کامیاب عورتیں پسند تھیں ...... اور جن کا وہ بہت معترف ہوتا تھا ...... وہ فریحہ کی صلاحیتوں کا دل وجان سے مداح تھا مگر اب وہ کہیں غائب ہو گیا تھا۔

فریحہ آفس میں بیٹھی اخبار کھول کر اسے پڑھنے میں مصروف تھی ...... اچانک ایک خبر پر اس کی نظر ٹک گئی اور اس سے ہٹنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ وہ حیران کن نگاہوں سے خبر پڑھنے میں مصروف تھی۔

''شیر افگن نے ڈاکٹر دریہ سے شادی کر لی تھی'' اس کا دل پھٹنے کو بے تاب تھا۔ اس نے اخبار لپیٹ کر رکھی پھر اسے کھولا ...... اور ...... پھر پڑھنے لگی ...... اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے ...... ایک بار پھر اسے شدید دھچکا لگا تھا۔ ایک بار پھر اس کا سب کچھ چھن گیا تھا ...... وہ کافی دیر سسکتی رہی ...... اور پھر ہمت کر کے شیر افگن کو فون کیا ...... ایک بیل جانے کے بعد اس نے فون بند کر دیا ......

''اسے کیا کہوں ...... کہ ...... اس نے ...... مجھے ......''

''نہیں ...... میں اپنی اتنی تذلیل برداشت نہیں کر سکتی ......'' اس نے آوبھر کر سوچا۔ تھوڑی دیر بعد شیر افگن کا فون آ گیا۔

''مجھے معلوم تھا ...... تم ضرور فون کرو گی ...... بہت کچھ جاننے کے لئے فریحہ ...... میں ایک بدکار عورت کے ساتھ کبھی شادی نہیں کر سکتا تھا ...... سوری'' شیر افگن نے قدرے حقارت سے کہا۔

''بدکار عورت ......'' وہ حیرت سے بڑبڑائی۔

''ہاں ...... یہ سنو ...... اور اس کے علاوہ بھی تمہارے خلاف بہت سے ثبوت میرے پاس ہیں''

''ہاں ...... یہ سنو ...... اپنے الفاظ'' اور شیر افگن نے ریسیور کے ساتھ موبائل آن کر کے لگایا۔ اس میں اس کے اپنے کہے ہوئے الفاظ کی بازگشت تھی جو اس نے ڈاکٹر دانش سے کہے تھے جب وہ اس کے گھر پناہ لینے آئے تھے۔

''ہاں ...... میں بدکار عورت ہوں'' اپنے الفاظ سن کر اس نے گھبرا کر ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

''تم ...... اس قدر گھٹیا ...... کمینے اور سازشی ذہن کے انسان بھی ہو سکتے ہو ...... جس نے مجھے ہر طرح سے تباہ کرنے کی کوشش کی ہے ...... مجھے اندر سے خالی کر کے رکھ دیا ہے'' وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی ...... اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کے اندر سے سارے لطیف جذبے، احساسات، محسوسات، محبتیں اور چاہتیں ختم ہو رہی ہوں۔ وہ بالکل کھوکھلی ہو گئی ہو ...... اندر سے بالکل خالی ...... خالی پن کا احساس اسے اندر ہی اندر ختم کرنے لگا جیسے وہ کوئی مردہ ہو۔ ایک کھوکھلا مٹی کا مجسمہ جس میں نہ حرارت ہو اور نہ ہی حرکت اور یہ سب کچھ اس سے اس شخص نے چھینا تھا جس پر اس نے اعتبار کر کے اپنا سب کچھ اسے سونپا تھا۔ انسان اس قدر گھٹیا بھی ہو سکتا ہے اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

......❁......

# (۱۹)

''جمی، فردوس اور نرگس آٹھ دن شمی کے پاس رہ کر آئے تھے۔ شمی نے ان کی بہت خاطر مدارت کی...... اس کے ڈرائیور نے انہیں پورے شہر کی خوب سیر کرائی۔ وہ اپنی مصروفیت کی وجہ سے ان کے ساتھ تو نہ جاسکا مگر رات کو دیر تک وہ ان سے باتیں کرتا رہتا۔ وہ ان کو واپس جانے نہیں دے رہا تھا مگر نرگس کا دل اپنے گھر سے اداس ہونے لگا تھا اور اسے مجبوراً انہیں اجازت دینا پڑی۔ وہ جب سے گھر واپس آئیں تھیں جمی کا مزاج ان سے اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ وہ بات بے بات فردوس سے الجھنے لگتا...... چھوٹی سی بات سے بحث شروع ہوتی جو تو تکرار اور جھگڑے پر ختم ہو جاتی۔ نرگس درمیان میں آ کر صلح کراتی تو بات ختم ہوتی اور دونوں ایک دوسرے کو گھور کر رہ جاتے۔ جمی غصے میں گھر سے باہر نکل جاتا اور فردوس اسے گالیاں دیتی رہ جاتی۔ فردوس اور جمی رات کو ایک محفل سے دیر سے لوٹے تھے۔ کسی کی شادی پر گانے بجانے کی محفل رات دیر تک گرم رہی۔ پو پھٹنے کے قریب تھی جب وہ گھر لوٹے اور آتے ہی سو گئے۔

''اے جمی...... اٹھ رے...... جا کر دودھ لا...... چائے بنا کر پیوں...... کمبخت ماری...... سر کی درد چین نہیں لینے دے رہی'' فردوس نے جمی کو اٹھاتے ہوئے کہا۔

''جا...... جا کر خود لے آ...... تجھے کون سا راستہ نہیں آتا...... میں تم لوگوں کا نوکر نہیں ہوں'' جمی غصے سے بولا۔

''اے...... جمی تو کیسی باتیں کرنا شروع ہو گیا ہے کمبخت......'' نرگس نے غصے سے کہا۔

''ہاں...... تم میری ذمہ داریاں نہیں ہو...... جاؤ جا کر اپنا کام کرو...... اگر میں یہاں رہتا ہوں اور کھاتا ہوں تو کما کر بھی دیتا ہوں...... مفت میں تم لوگ مجھے کچھ نہیں دیتیں...... سمجھی تم......'' جمی غصے سے بولا۔

''نامراد...... یہ تو کیسی زبان بولنا شروع ہو گیا ہے...... تجھے کیا ہو گیا ہے...... ارے تیری نظریں کیوں بدل رہی ہیں۔ میں دیکھ رہی ہوں...... ہم جب سے شامو سے مل کر آئے ہیں تو بڑا اکھڑنے لگا ہے...... ارے...... کیا ہوا ہے تجھے؟'' نرگس نے خفگی سے کہا۔

''ہاں...... بدمزاج ہو گیا ہوں...... وہ تم لوگوں سے جا کر اچھا ہو گیا...... اس کے ٹھاٹ بن گئے...... وہ باؤ بن گیا...... تم لوگوں کے پاس رہتا تو میری طرح تم لوگوں کی جوتیاں ہی اٹھا رہا ہوتا...... تم لوگوں کے ناز نخرے اٹھا رہا ہوتا۔ اس کی قسمت اچھی تھی جو یہاں سے چلا گیا'' جمی غصے سے بولنے لگا۔

''ارے...... تو کہنا کیا چاہتا ہے......؟ کمبخت بول کیا کہنا چاہتا ہے کہ ہم منحوس ہیں...... ہمارے سائے سے دور گیا تو وہ ترقی کر گیا...... مجھے لگ رہا ہے تو ہم سے اکتا گیا ہے جو تیرے دل میں ہے صاف صاف بتا دے'' نرگس نے کہا۔

”ٹھیک ہے....... تو سنو....... کمائی میں اور فردوس کریں....... تو مزے سے گھر بیٹھ کر اپنا حصہ لے لے....... میں کوئی تمہارا نوکر ہوں جو تمہیں بھی کھلاؤں....... میں نے کوئی تمہارا ٹھیکہ نہیں لے رکھا....... میں یہاں سے جا رہا ہوں....... مجھے نہیں رہنا تمہارے ساتھ....... میں بھی شامو کی طرح ترقی کرنا چاہتا ہوں“ جمی نے انتہائی بے رخی سے ترش لہجے میں کہا۔

فردوس اور نرگس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، نرگس اس کی بات سن کر رونا شروع ہو گئی۔

جمی کمرے میں گیا اور اپنا سامان پیک کرنے لگا۔ رات کی کمائی کا آدھا حصہ اپنی جیب میں ڈالا اور بیگ پکڑ کر صحن میں آ گیا۔ اس نے روتی ہوئی نرگس اور فردوس کی طرف دیکھا۔

”میں جا رہا ہوں.......“ وہ کہہ کر باہر نکل گیا۔

نرگس پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”اری فردوس....... یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ میں کتنی بد نصیب ہوں جسے چھوڑ کر سب جا رہے ہیں۔ پہلے شامو چلا گیا....... پھر میرا بچہ اور اب جمی....... بھی چلا گیا....... کیا تو بھی جانا چاہتی ہے؟ تو بھی بتا دے“ نرگس نے روتے ہوئے کہا۔

”ارے آپا....... کیسی باتیں کر رہی ہے....... میرا جینا مرنا تیرے ساتھ ہے میں تجھے چھوڑ کر بھلا کہاں جاؤں گی....... اچھا ہوا یہ جمی نامراد چلا گیا....... ہر روز جھگڑنے لگا تھا....... آپا اس نے چلے ہی جانا تھا....... یہ سب اس نے بہانہ بنایا ہے....... جب سے یہ شامو کے گھر سے آیا ہے....... اس کی دولت دیکھ کر اس کے پیٹ میں خواہ مخواہ مروڑ اٹھنے لگے ہیں....... تو نے دیکھا نہیں....... کیسے کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا....... دفع کر....... تو فکر نہ کر....... میں ہوں نا تیرے پاس“ فردوس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے تسلی دی تو نرگس اونچی آواز میں رونے لگی۔

”فردوس....... انسان کا دکھ انسان ہی سمجھ سکتا ہے....... مگر ہمارا دکھ کوئی نہیں سمجھتا سوائے ہمارے.......“ نرگس نے آہ بھر کر کہا اور اپنے میلے کچیلے دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھنے لگی۔

”پتہ نہیں آپا....... ہم ادھورے انسانوں کی اس دنیا کو بھلا کیا ضرورت تھی....... پتہ نہیں....... دنیا کا کونسا خانہ ہم نے پر کرنا ہوتا ہے جو رب ہمیں دنیا میں بھیج دیتا ہے۔ لوگوں کا مذاق سہنے کو....... دھکے اور ٹھوکریں کھانے کو“ فردوس نے آہ بھر کر کہا اور اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

”میں بھی یہی سوچتی رہتی ہوں....... مگر جواب کوئی نہیں ملتا.......“ نرگس نے کہا تو دونوں خاموش ہو گئیں۔

”میرا بے بی زندہ ہوتا....... تو....... مجھے اس جمی کے جانے کا ذرا دکھ نہ ہوتا....... ابھی تو میں بے بی کو بھول نہیں پا رہی....... اس کمبخت کو کیسے بھولوں....... فردوس اس نے ہمارے مشکل وقتوں میں بڑا ساتھ دیا۔ پتہ نہیں اسے اچانک کیا ہو گیا....... کیسے بدل گیا....... ہمیں چھوڑ کر جانے کا اسے ذرا بھی دکھ نہیں ہوا....... اور جاتے ہوئے مڑ کر بھی نہیں گیا.......“ نرگس نے تاسف کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”آپا تم ٹھیک کہہ رہی ہو....... اچھا بھلا تھا....... پتہ نہیں کیوں بدل گیا خیر تو اب فکر نہ کر....... کسی جانے والے کو بھلا کون سے روک سکتا ہے....... میرے سر میں تو پہلے ہی بہت درد ہو رہی ہے....... میں دودھ لے کر آتی ہوں....... رونا مت....... ٹھیک ہے اگر وہ ہمیں چھوڑ کر چلا گیا تو ہمیں

بھی اس کی کوئی پرواہ نہیں" فردوس کہہ کر گھر سے باہر نکل گئی اور نرگس چارپائی پر لیٹ گئی...... نیلے آسمان کو دیکھتے ہی اس کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔

"ربا...... تو...... آہستہ آہستہ سب کو مجھ سے کیوں چھین رہا ہے؟ تو نے ہم بدنصیبوں کو کیسا انسان بنایا ہے...... جن کو کوئی نہیں اپناتا ہمارے اندر تو...... تو نے رشتوں کی بھوک ڈال دی مگر اس بھوک کو مٹانے کا کوئی سامان نہیں کیا۔ ہم کٹی پتنگوں کی طرح ماری ماری ادھر ادھر پھرتی رہتی ہیں...... جس کے ہاتھ پتنگ آئی اس نے اس سے دل بہلایا اور پھر پھاڑ کر پھینک دیا...... رشتوں کے بغیر بھی بھلا کوئی زندگی ہوتی ہے۔ کتنا دل تڑپتا ہے ہمارا بھی کوئی اپنا ہو...... جو ہمارا دکھ اپنے سینے میں محسوس کرے...... کسی کے خون میں ہمارے لئے کشش ہو...... کوئی ہمارے بڑھاپے کا سہارا بنے ...... کوئی ہمیں اولاد کی طرح پیار کرے اور کسی کو ہم اولاد جیسی محبت دیں ...... رشتوں کا دکھ سکھ محسوس کریں ...... مگر ہمیں تو تو نے بڑا ہی محروم رکھا ہے ہم تو تیری دنیا میں مجرم بن کر زندگیاں گزارتے ہیں...... پتہ نہیں کونسا جرم کیا ہے جس کی اتنی کڑی سزا تو نے ہمیں دے دی ہے......

ربا تو نے کیوں ایسا کیا......؟ نرگس کے دل میں ابال سا اٹھا اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی...... تجھے ہمارے آنسوؤں پر ذرا ترس نہیں آتا ...... تجھے ذرا دکھ نہیں ہوتا ...... جب لوگ ہمیں دھکے مارتے ہیں...... جب ہمارا مذاق اڑاتے ہیں...... کیا تو بھی ہم پر ہنستا ہے ...... تو کیسا رب ہے...... جو ہمارے دکھ کو ذرا بھی محسوس نہیں کرتا......" نرگس گھٹنوں پر سر رکھ کر سسکنے لگی اور خدا سے شکوے کرنے لگی۔ وہ کتنی ہی دیر روتی رہی اور پھر اٹھ کر کمرے کے اندر چلی گئی۔ ایک بوسیدہ سے پلنگ پر بجی کی ایک دو پرانی قمیصیں پڑی تھیں وہ انہیں ہاتھ میں پکڑ کر دیکھنے لگی ...... اور انہیں چوم کر اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔

"بجی کو بھی میں اپنے بچوں کی طرح پیار کرتی تھی......" وہ بھی مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔

"اسے بے بی یاد آنے لگا اور وہ لوہے کے ٹرنک میں سے بے بی کے کپڑے اور کھلونے نکال کر دیکھنے لگی۔ انہیں والہانہ انداز میں چومنے لگی...... اس کی آنکھوں سے آنسو شدت سے رواں ہونے لگے...... اس کی ہچکی بندھ گئی۔ اسے اپنے پیچھے سے ہلکی سی آواز آئی......

"اماں...... اماں"

"اماں صدقے...... واری...... میرا بچہ...... میرا بے بی...... کہاں ہے تو......؟" وہ فرط جذبات سے لبریز آنکھوں اور آواز کے ساتھ دروازے کی طرف بھاگی۔

"بے بی...... بے بی...... میرے بچے...... کہاں ہے تو......؟" وہ پکارتی ہوئی ادھر ادھر دیکھتی ہوئی صحن میں رکھی لوہے کی سیڑھی سے ٹکرائی اور لڑکھڑا کر زمین پر گری تو سیڑھی اس کے اوپر گر گئی۔ سیڑھی کا ٹوٹا ہوا ڈنڈا اس کے سر پر لگا اور ایک دم خون کا فوارا سا نکلنے لگا۔ اس کا سر چکرانے لگا اور اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

"بے بی...... تو کہاں ہے...... جانا مت...... میں...... میں...... آرہی ہوں" وہ آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگی اور بے ہوش ہو گئی۔

تھوڑی دیر بعد فردوس دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔

"آج شہر میں دودھ کی ہڑتال تھی، بڑی مشکل سے ایک دکان سے ملا ہے" فردوس دروازے کی کنڈی چڑھاتے ہوئے خود ہی بولتی جا

رہی تھی۔ ایک دم اس نے اپنے قدموں کے پاس بہتے خون کو دیکھا اور خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئی...... پیچھے مڑ کر دیکھا اور چلانے لگی۔

''آپا..... آپا..... یہ..... تجھے کیا ہوا ہے.....؟'' اور جلدی سے سیڑھی ہٹا کر پیچھے کی۔

''ہائے..... میری آپا..... تجھے کیا ہو گیا ہے؟ اس نے اس کی سانس محسوس کی اور ہمسایوں کی منت سماجت کر کے اسے ہسپتال لے گئی۔

ڈاکٹر نے بتایا کہ اس کی حالت بہت خطرناک ہے.....اس کا خون بہت بہہ چکا ہے.....فردوس نے جلدی سے شامو کو اس کے موبائل پر فون کر کے بتایا اور اس سے پہنچنے کو کہا.....فردوس کا دل چاہ رہا تھا کہ جمی کو بھی اطلاع دے مگر کہاں.....؟ اس سے رابطہ ممکن نہیں تھا..... فردوس اکیلی ادھر ادھر بھاگتی رہی.....نرگس کے لئے دوائیں اکٹھی کرتی رہی۔

''انہیں خون کی اشد ضرورت ہے.....؟'' ڈاکٹر نے کہا۔

''خون.....؟'' اس کا چہرہ زرد پڑنے لگا۔

''ہاں.....ان کا بہت زیادہ خون بہہ چکا ہے.....اور انہیں خون کی بہت ضرورت ہے'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔

''آ..... پ..... میرا خون لگا دیں..... سارے کا سارا'' وہ بدحواس ہو کر بولی۔

''ٹھیک ہے آپ چیک کرالیں۔ اگر آپ کا بلڈ گروپ ملتا ہے تو یہ اچھی بات ہوگی'' ڈاکٹر نے کہا۔

مگر اس کا بلڈ گروپ نرگس کے بلڈ گروپ سے نہیں ملتا تھا۔ وہ سن کر پریشان ہو گئی۔

''اب..... کیا ہوگا؟'' اس نے پریشانی سے پوچھا۔

ہم کوشش کر رہے ہیں.....جیسے ہی کوئی بلڈ دینے پر آمادہ ہوتا ہے.....ہم ان کو بلڈ لگا دیں گے'' ڈاکٹر کے لہجے میں مایوسی تھی۔ ہمیں کون اپنا خون دے گا.....ہمارے تو سائے سے لوگ دور بھاگتے ہیں'' اس نے آہ بھر کر سوچا اور دل ہی دل میں گڑگڑا کر خدا سے دعائیں کرنے لگی۔

ایک دو نوجوان بلڈ دینے کے لئے آئے مگر جب ان کو معلوم ہوا کہ ان کا خون کسی ہیجڑے کو لگنا ہے تو وہ منہ بسورتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔ ڈاکٹر نے بھی بہت سے لوگوں کو قائل کرنے کی کوشش کی مگر کوئی بات سننے کو ہی تیار نہیں تھا۔ فردوس نے ان کی منتیں کیں مگر وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر چلے گئے.....فردوس روتی رہی..... سسکتی رہی اور شامو کو فون کیا۔ وہ پہنچنے والا ہی تھا۔ اس نے اس کو بہت تسلیاں دیں۔ نرگس کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر مایوسی کے عالم میں ادھر ادھر پھر رہا تھا۔ اپنی طرف سے پوری کوشش کر رہا تھا مگر نرگس کی سانس اکھڑنے لگی.....فردوس گھبرا گئی کبھی ہسپتال سے باہر بھاگ کر شامو کو دیکھنے جاتی کبھی اندر جا کر نرگس کو دیکھتی۔

شامو آیا.....تو وہ اسے لے کر اندر آئی.....مگر نرگس دم توڑ چکی تھی۔ فردوس شامو کے گلے لگ کر شدت سے رونے لگی۔

''میرا بلڈ گروپ.....آپا سے ملتا تھا.....کاش وہ میرا انتظار کر لیتی'' شامو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ لوگ ان کے گرد جمع ہونے لگے جیسے کوئی تماشا دیکھ رہے ہوں۔

نرگس کو دفنانے کے بعد شامو ایک دن وہاں رہا۔ اس گھر میں بیٹھ کر فردوس کے ساتھ پرانی یادوں کو تازہ کرتا رہا۔ اس نے فردوس کو اپنے

ساتھ چلنے کو کہا مگر وہ نہ مانی پرانے شہر میں آ کر کئی یادیں تازہ ہو گئیں۔ اسے رانی یاد آنے لگی جو اس کے ناچ گانے کو پسند کرتی تھی۔ اس کی کمائی کو حرام سمجھتی تھی اور جس کی چاہت میں اس نے ناچ گانا چھوڑ کر محنت کا راستہ اپنایا تھا...... اور آج اس مقام تک پہنچا تھا کہ کئی لوگ اس کو رشک بھری نگاہوں سے دیکھتے تھے۔

نادانستہ اس کے قدم رانی کی بستی کی طرف اٹھ گئے۔ چار پانچ سالوں میں جھگیوں کی تعداد میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ حلیے سے امیر نوجوان لگتا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ رانی کہاں رہتی ہو گی۔ اس نے ایک لڑکے سے پوچھا تو اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ نوری ادھر سے گزری تو اس نے اس سے پوچھا۔

"رانی تو مر چکی ہے......" نوری نے کہا تو شامو کے قدموں کے نیچے سے زمین سرکنے لگی۔

"ک...... کب......؟" وہ بمشکل بولا۔

"معلوم نہیں...... اس کی ماں سے پوچھ لے" اور نوری اسے برکتے کے پاس اس کی جھگی میں لے گئی۔

"یہ...... رانی کا پوچھ رہا ہے" نوری نے شامو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جھگی میں برکتے کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔

"رانی کا نام سن کر برکتے کی آنکھیں چمکنے لگیں...... نوری جھگی سے باہر نکل گئی اور برکتے مسکرا کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"کیا تجھے...... میری رانی نے بھیجا ہے؟" برکتے نے پرامید لہجے میں پوچھا۔

"کیا...... وہ زندہ ہے؟" شامو نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

"ہاں......" وہ آہستہ آواز میں بولی۔

"تو...... پھر کہاں ہے؟" شامو نے حیرت سے سوال کیا۔

"معلوم نہیں...... میری رانی کہاں چلی گئی ہے...... مجھے چھوڑ کر" برکتے رونا شروع ہو گئی۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے......؟ وہ کہاں چلی گئی؟" شامو نے پوچھا۔

"ملکا...... کہتا ہے وہ کسی کے ساتھ بھاگ گئی...... مگر میرا دل نہیں مانتا، میری رانی ایسی نہیں تھی...... پتہ نہیں کہاں گم ہو گئی ہے" برکتے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع ہو گئی اور اسے اپنے دکھ اور پریشانیاں بتاتی رہی۔ شامو نے جیب میں سے پانچ ہزار روپے نکال کر اسے تھمائے کہ وہ ان روپوں سے اپنا علاج کرا لے...... اور ضرورت ہوئی تو وہ اور بھیج دے گا۔ اس نے اپنا کارڈ نکال کر اسے دیا کہ وہ اس کے نمبر پر فون کر سکتی ہے۔ وہ دکھی دل کے ساتھ وہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔ اسے رانی کے کھو جانے کا بہت صدمہ ہوا تھا۔ اسے یوں لگا تھا جیسے اس کا بہت کچھ چھن گیا ہو...... نرگس...... رانی...... اور استاد جمالا...... وہ لوگ جن سے وہ بہت محبت کرتا تھا...... مگر وہ ساری محبتیں اب اس سے روٹھ چکی تھیں۔ وہ ٹوٹے دل اور نم آنکھوں کے ساتھ اپنے گھر واپس لوٹ آیا۔

☆

رمضو اور گڈی کے درمیان ہر روز جھگڑا ہوتا تھا۔ گڈی اسے اپنے قریب نہیں آنے دیتی تھی اور طنزیہ انداز میں رمضو پر ہنستی تھی۔ رمضو کو غصہ آ جاتا اور وہ گڈی کی پٹائی شروع کر دیتا۔ شادی کے کئی ماہ بعد بھی دونوں کا یہی معمول تھا۔ گڈی اسے طلاق کو کہتی اور وہ تین ہزار واپس کرنے کو کہتا جو ملکے نے اس سے لیے تھے اور ان تین ہزار روپوں میں ملکے اور بھاگی نے جی بھر کر عیش کی تھی۔ وہ پیسہ انہوں نے کھانے پینے، گھومنے پھرنے اور بھاگی نے اپنے کپڑے اور رنگ برنگی زیورات بنانے میں خرچ کیا تھا۔ گڈی موقع دیکھ کر ملکے کے پاس آتی اور وہ پیسہ واپس کرنے کو کہتی تاکہ اس کی جان چھوٹے مگر ہر بار ملکا اور بھاگی اسے ڈانٹ ڈپٹ کر اور ذلیل کر کے نکال دیتے۔ وہ اپنی زندگی سے سخت تنگ آ گئی تھی اور اٹھتے بیٹھتے بھاگی اور رمضو کو گالیاں بکتی رہتی جن کی ملی بھگت سے وہ زندگی کا یہ عذاب سہہ رہی تھی۔

رمضو نے پھر رات کو اس کی پٹائی کی تھی اور وہ صبح سویرے روتی ہوئی ملکے کے پاس آ گئی وہ اور بھاگی بیٹھے چائے پی رہے تھے، اسے دیکھ کر غصے سے بڑبڑانے لگے۔

''اے...... تو پھر آ گئی ہے...... جب تیری ایک بار سادی بنادی پھر کا ہے کو یہاں کے چکر لگاتی ہے...... اپنے سوہر کے گھر ٹک کر رہ'' ملکے نے غصے سے کہا۔

''ابا...... تیرے جیسا جالم باپ بھی رب کسی کو نہ دے...... اس کلموئی چڑیل کے بہکاوے میں آ کر تو نے اپنی بیٹی کو بیچ دیا۔ ارے...... تو نے میری سادی نہیں بنائی تو نے مجھے بیچا ہے...... ابا میں کوئی بھیڑ بکری تھی...... یا کوئی ٹوٹی چارپائی تھی جسے تو نے بیچ دیا...... آج میں پیسے لے کر جاؤں گی...... وہ موہ مجھے تب ہی طلاق دے گا...... جب میں اس کے پیسے دوں گی......'' گڈی نے بھاگی کی طرف غصے سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اری بے سرم...... باپ کے سامنے طلاق کا نام لیتی ہے...... اری...... تیری جیسی دھی مر جائے تو بہتر ہے'' بھاگی نے گڈی کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''اے...... ہے...... بڑی آئی مجھے سب بتانے والی...... تو نے ہی سارے پیسے ہجم کیے ہیں...... اسی لئے بڑ بڑ بول رہی ہے...... ابے کی آنکھوں پر تو نے ہی پٹی باندھ دی ہے...... اسے تو کچھ ٹھیک نجر ہی نہیں آتا......'' گڈی بھی اکڑ کر بولی۔

''آ...... ہا...... تیرا ابا پچے کا کا ہے نا...... جسے میں انگلی پکڑ کر چلا رہی ہوں...... اری زمانے بھر کا چالاک ہے تیرا ابا...... خود ہی میرے پیچھے پڑا تھا...... بتا...... ملکے...... اب بتاتا کیوں نہیں...... تو نے ہی بولا تھا نا کہ بھاگی میں اب تیرے بغیر نہیں رہ سکتا'' بھاگی نے منہ چڑاتے ہوئے کہا تو ملکا کھسیا گیا۔

''اری...... حرام خورو...... بس کرو...... کیا بک بک کر رہی ہو...... اے گڈی...... چل جا اپنے گھر واپس...... نہیں ہیں میرے پاس پیسے...... جب ہوئیں گے...... رمجو کو دے کر تجھے لے آؤں گا...... سویرے سویرے میرا مغج خراب نہ کر'' ملکا ٹالنے کے انداز میں خفگی سے بولا۔

''نہ ابا...... آج تو نہیں میں جانے کی...... جتنی مار رات کو اس نے مجھے ماری ہے نا...... اس کے بعد تو نہیں جاؤں گی'' گڈی نے کہا۔

''تو...... نہ...... جا...... تیری مرجی......'' بھاگی نے کہا۔

''ابے نے سارا پیسہ تجھے کھلایا ہے...... ہر روز رنگ برنگی بوتلیں تجھے پلاتا تھا...... میٹھی میٹھی قلفیاں، جلیبیاں، مٹھیائی تو ہی کھاتی تھی نا اب دیکھ......میں کیا کرتی ہوں......'' گنڈی نے کہہ کر قریب پڑا ڈنڈا زور سے بھاگی کے سر پہ مارا......وہ تڑپنے لگی اور واویلا کرنے لگی۔ ملکا زمین پر بیٹھا تھا اپنی بیساکھیوں کو سیدھا کر کے کھڑا ہونے لگا مگر اتنی دیر میں اس نے بھاگی کو ایک اور ڈنڈا مارا۔ مگر بھاگی نے ڈنڈا پکڑ کر اسے مارنا چاہا مگر گنڈی نے اس کا ہاتھ مروڑ دیا وہ تڑپنے لگی۔ ملکا غصے میں آ گیا اور اپنی بیساکھی سے گنڈی کو مارنے کی کوشش کی مگر گنڈی صحت مند تھی اس نے بیساکھی سے باپ کو پیچھے دھکیلا وہ نیچے گر گیا۔

''ٹھہر جا......تو......حرام خور......باپ پر ہاتھ اٹھاتی ہے، بے شرم......تجھے کیڑے پڑیں......'' ملکا اسے گالیاں بکنے لگا۔ بھاگی ہائے ہائے کر کے فرش پر گری تھی اسے توقع نہیں تھی کہ گنڈی اسے مار بھی سکتی ہے۔ اچانک مار کھا کر وہ بوکھلا گئی۔ اس کا سر چکرا رہا تھا اور اب سر کو پکڑے بیٹھی تھی۔

''ابا......اب میں جا رہی ہوں......کل پھر آؤں گی اور اگر تو نے پیسے نہ دیئے تو تجھے، تیری جھگی اور بھاگی کو آگ لگا کر جاؤں گی......سمجھا تو......'' وہ غصے سے کہہ کر نکل گئی اور ملکا حیران و پریشان اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہ گیا۔

''حرام جادی......کتنی ہاتھ چھٹ ہو گئی ہے......یہ تو ایسی نہ تھی......رجو نے اسے بھی بدماش بنا دیا ہے'' ملکا غصے سے بولا۔

''ارے......میرا تو کچھ کر......میرے سر کو کچھ ہو رہا ہے'' بھاگی غصے سے بولی۔

''تیرا کیا کروں......تو نے ہی سارے پیسے خرچ کرا دیئے......تیری فرمائشیں ہی ختم نہیں ہوتی تھیں......اب کل کی فکر کر......وہ کل آ کر آگ لگا گئی تو کیا ہوگا......اپنی نئی جھگی میں تو مشو اور جو پہلے ہی نہیں گھسنے دیتے......برکتے کو بھی تو نے ادھر سے نکال دیا......اگر وہ جھگی کو آگ لگا گئی تو کہاں جائیں گے......؟'' ملکے نے ڈرتے ہوئے انداز میں کہا کیونکہ گنڈی کے تیور اسے ٹھیک نہیں لگ رہے تھے۔

''ارے فکر کیوں کرتا ہے......استاد فیقا بھکاریوں کے بچوں کو ٹھیکے پر خریدتا ہے......تیرے اتنے ڈھیر بچے ہیں جا پپو اور جگو کو ٹھیکے پر دے آ۔ اس بلا کو تو سر سے ٹال......'' بھاگی نے کہا تو ملکے نے حیرت سے چونک کر اسے دیکھا۔

''تو کیا چاہتی ہے......تو کیا کہہ رہی ہے؟'' ملکے نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں اچھی طرح جانتی ہوں......ویسے بھی تو تیرے بچے بھیک ہی مانگتے ہیں۔ استاد فیقے سے پیشگی رقم لے لینا......'' بھاگی نے کہا۔

''استاد فیقا کتنا ظالم ہے......بچوں کو کتنا مارتا پیٹتا ہے......ان سے جس جس طرح بھیک منگواتا ہے تو نہیں جانتی......میرا جگو تو ابھی بہت چھوٹا ہے'' ملکے نے کہا۔

''اور جو میرے پیٹ میں کاکا ہے......اس کو تیری گنڈی آگ لگا جائے تو تجھے منظور ہے......تجھے اپنے بچوں کی فکر ہے......میرے کی نہیں......ارے میرا تو یہ پہلا بچہ ہے......تیرے پاس تو پہلے ہی بہت ڈھیر ہے......کیا ہے جو اس میں سے دو چلے جائیں گے''۔ بھاگی نے منہ بسورتے ہوئے کہا تو ملکا سوچ میں پڑ گیا۔

وہ شام کو جھگی میں گیا تو بچے اسے دیکھ کر حیران رہ گئے اب وہ بہت کم بچوں کے پاس آتا تھا۔ برکتے چارپائی پر پڑی تھی۔ اسے دیکھ کر اس

نے منہ پھیر لیا۔

''اے...... برکتے کیسی ہے تو؟'' ملکے نے اس کے قریب کھڑے ہو کر پوچھا۔

''تیری بلا سے...... تو...... تو اپنی دلہن کے ساتھ گلچھرے اڑا رہا ہے نا...... جالم...... تیرے جیسے باپ کو تو اللہ ہی پوچھے...... نہ بچوں کی فکر...... نہ بیوی کی...... اس عمر میں سادی بنالی...... بڈھا کھوسٹ......'' برکتے غصے سے بولی۔

''اے...... آج تجھے بڑی جبان لگ گئی ہے...... خیر تو ہے'' ملکا منہ بنا کر بولا۔

''چل ہٹ...... میں تیرے منہ نہ لگوں'' اور برکتے نے منہ پھیر لیا۔

''ارے تم لوگ کیسے ہو؟ جمو...... مٹھو پپو اور مجو کہاں ہیں'' ملکے نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''باہر کھیل رہے ہیں'' شبو نے جواب دیا۔

''میں ان کو باہر گھمانے لے کر جا رہا ہوں'' ملکا کہہ کر باہر نکل گیا۔

''یہ آج ابے کو کیا ہو گیا ہے...... پپو اور مجو پر بڑا پیار آ رہا ہے......؟'' مٹھو نے حیرت سے کہا۔

''ہو گا...... کوئی لالچ...... ہمارے ابے جتنا کمینہ بندہ اور کوئی نہیں ہو گا...... جہاں روپیہ نظر آتا ہے اسکے منہ سے پانی گرنے لگتا ہے......'' جمو غصے سے بولا۔

صبح گڈی نے ابے سے بہت لڑائی کی کہ مجو کے تین ہجار واپس کرے...... پھر وہ گھر واپس آئے گی'' مٹھو نے بتایا۔

''کیا گڈی یہاں آ جائے گی؟'' شبو نے خوش ہو کر پوچھا۔

''نہ تین ہجار ابے کے پاس ہوں گے اور نہ وہ آئے گی'' جمو نے طنزاً کہا۔

برکتے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ اسے اپنے پاس پڑے پانچ ہزار یاد آئے۔

''تو...... کل گڈی کو بلا کر لانا......'' برکتے نے جلدی سے کہا۔

''کیا...... تو اسے پیسے دے گی؟'' مٹھو نے ہنستے ہوئے کہا تو برکتے خاموش ہو گئی۔

''ہاں...... میں اپنی دھی کو اس جالم سے چھڑواؤں گی'' برکتے نے دل میں سوچا اور مطمئن ہو گئی۔

☆

''استاد...... اپنے دو بچوں کو لایا ہوں...... ٹھیکے پر دینا ہے'' ملکا استاد فیقے کے اڈے پر جا کر بولا۔

''کیوں...... کوئی نئی سادی بنائی ہے؟'' استاد فیقا قہقہہ لگا کر بولا۔

''نہیں استاد...... بچے دھندا ٹھیک طرح سے نہیں کر رہے...... اور گھر میں بھوک ننگ بہت ہے...... روٹی بھی کھانے کو نہیں ملتی...... اتنے بچوں کو پالنا مشکل ہو رہا ہے'' ملکے نے مایوس کن لہجے میں کہا۔

''ماں تو دکھا......'' استاد فیقے نے کہا تو ملکا باہر سے بچوں کو لے آیا۔ بچے بہت سہمے ہوئے تھے۔ پپو پانچ سال کا اور مجو چھ سال کا تھا۔ وہ ڈر کر ملکے کے پیچھے چھپ گئے۔

استاد فیقے نے انہیں پکڑ کر ٹٹولا۔

''سکوں سے ہی بھکاری لگتے ہیں..... چلیں گے..... بول کتنا لے گا......؟'' استاد نے ملکے سے پوچھا۔

''تو کتنا دے گا؟'' ملکے نے پوچھا۔

''1 ہجار مہینے کا...... پانچ پانچ سو...... دونوں کا'' استاد نے کہا تو ملکا سوچ میں پڑ گیا۔

''ٹھیک ہے...... تین ہجار پیشگی دے دے..... بڑی سخت ضرورت ہے......'' ملکے نے کہا۔

استاد نے اس کی طرف بغور دیکھا اور تین ہزار تکیے کے نیچے سے نکال کر اس کو دے دیے۔

''سکریہ......'' ملکے نے خوشی سے پیسے جیب میں رکھے۔

''اما..... اما..... ہمیں چھوڑ کر نہ جا.....'' بچے بلکنے لگے۔ استاد نے ان کے ہاتھ زور سے پکڑے وہ رو رو کر چھڑانے کی کوشش کرنے لگے۔ استاد نے دونوں کو ایک ایک تھپڑ مارا...... اور وہ سہم کر بیٹھ گئے اور اپنی آوازیں روک کر سسکنے لگے...... ملکے نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا اور خوشی خوشی بھاگی کے پاس آ گیا۔

''کام ہو گیا؟'' بھاگی نے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں......'' ملکے نے کہا اور جیب میں سے پیسے نکال کر اسے پکڑا دیے۔

''رات کو رجو آئے گا تو اسے دوں گا...... انہیں سنبھال کر رکھ'' ملکے نے کہا اور جھگی سے باہر نکل گیا۔

تین ہزار روپے پکڑ کر بھاگی کے منہ میں پانی آ گیا...... اس کے اندر کی ہوس اور لالچ سے اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ کچھ سوچ کر جھگی سے باہر نکل گئی اور پانچ سو کا نوٹ اپنے دوپٹے کے پلو میں باندھ کر اسے اپنی مٹھی میں دبا لیا۔

وہ نجو کی تلاش میں ادھر ادھر پھرتی رہی۔ نجو جھگیوں سے باہر اپنی بکری کو گھاس چرا کر لا رہی تھی۔

بھاگی اسے ایک طرف لے گئی اور اس کے کان میں کھسر پھسر کرنے لگی اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے رازداری سے اسے پانچ سو کا نوٹ تھما دیا اور خوش خوش واپس لوٹ آئی۔

☆

''نجو...... پپو اور مجو ابھی تک نہیں لوٹے...... میرے دل کو کچھ برا لگ رہا ہے...... جا...... جا کر دیکھ، وہ کہاں ہیں؟'' برکتے نے پریشانی سے کہا۔

''اماں...... ابے کے ساتھ گئے ہیں...... کسی اور کے ساتھ تو نہیں...... جو تو فکر کر رہی ہے'' نجو نے جواب دیا۔

''پر...... دیر بہت ہو گئی ہے...... وہ ان کو کہاں لے گیا ہے...... میرا دل ڈوب رہا ہے...... جا...... جا کر بھاگی سے پوچھ کر آ...... اس کو پتہ

ہوگا" برکتے نے کہا۔

"میں نہیں جا رہا....." نجو منہ بنا کر لیٹا گیا۔

"شبو.....جا.....تو..... پوچھ کر آ، برکتے نے شبو سے کہا تو وہ خاموشی سے باہر نکل گئی۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا۔ برکتے کا دل ڈوب رہا تھا۔ وسوسے اور اندیشے اس کے دل کو ڈرا رہے تھے۔

"اللہ خیر کرے....." اس نے دل ہی دل میں دعا کی۔ شبو بھی ابھی تک نہیں آئی تھی۔

"مٹھو.....شبو بھی نہیں آئی..... جا دیکھ..... وہ کہاں رہ گئی۔ پپو اور مجو بھی نہیں آئے" برکتے نے پریشانی سے کہا۔

"آ جاتے ہیں.....کہاں جانا ہے؟" مٹھو بھی منہ بناتے ہوئے بولا۔ شبو گھبرائی ہوئی جھگی میں داخل ہوئی۔

"اماں.....اماں.....وہ.....ابا کہہ رہا ہے..... پپو اور مجو گم ہو گئے ہیں" شبو بدحواسی کے عالم میں اٹک اٹک کر بولی۔

برکتے گھبرا گئی اور سینے پر ہاتھ مارنے لگی۔

"ہائے.....میں مر گئی..... میرے بچے کہاں گم ہو گئے..... ملکا جھوٹ بول رہا ہے..... وہ جھوٹ بول رہا ہے" برکتے چارپائی پر لیٹی زور زور سے ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے بولی۔ اونچی آواز میں رونے اور چلانے لگی۔

"اماں حوصلہ کر..... میں ابے سے پوچھ کر آتا ہوں" نجو کہہ کر باہر نکل گیا۔

"شبو جا تو گڈی کو بتا کر آ..... وہ رمضو سے کہہ کر انہیں ڈھونڈ لے گی..... جا..... میری دھی..... ورنہ میں مر جاؤں گی..... رات ہو رہی ہے اور میرے بچے تو کبھی بھی رات کو باہر نہیں گئے" برکتے روتے ہوئے بولی تو شبو گھبرائی ہوئی باہر نکل گئی اور گڈی کی جھگی کی طرف گئی۔

اس کے قدم جہاں تھے وہیں رک گئے.....گڈی کی جھگی میں آگ لگی تھی۔ ہر طرف شعلے بلند ہو رہے تھے۔ نجو لوگوں کے ساتھ مل کر پانی کی بالٹیاں آگ پر ڈال رہی تھی مگر آگ اور بھڑک رہی تھی۔

"گڈی.....گڈی کہاں ہے؟" شبو نے بمشکل پوچھا۔

"ارے اس نے ہی تو اپنے آپ کو آگ لگائی ہے..... اندر ہی سڑ..... مر گئی ہوگی" نجو غصے سے بولی۔

"کیا گڈی نے خود کو آگ لگائی ہے؟" شبو نے روتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں.....اس نے اپنے آپ کو بھی آگ لگائی اور جھگی کو بھی..... ہر روز رمضو سے لڑتی تھی۔ وہ اس کی مار کٹائی کرتا تھا..... کمبخت نے خود کو بھی آگ لگائی اور میرے گھر کو بھی....." نجو پانی کی بالٹی ڈالتے ہوئے بولی۔

شبو کی سانس جیسے رکنے لگی اور آنسو شدت سے بہنے لگے..... وہ برکتے کو واپس جا کر کیا بتائے گی جو پہلے ہی پپو اور مجو کے لئے رو رہی ہے۔ شبو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی.....اور اسے ہر طرف گڈی کی چیخیں سنائی دینے لگیں۔

"گڈی.....گڈی....." وہ بدحواس ہو کر چلاتی ہوئی آگ کی طرف بڑھنے لگی۔ لوگوں نے بڑی مشکل سے اسے وہاں سے پیچھے ہٹایا۔

☆

رینا بیگم کے رقص کی دھوم دور دور پھیلنے لگی تھی۔ وہ نگار بیگم سے زیادہ جلدی میں ترقی کا زینہ طے کر رہی تھی۔ اس میں وہی رعب، شان و شوکت اور حکمت کا رنگ نمایاں ہونے لگا تھا جو نگار بیگم میں دیکھ کر وہ مرعوب ہوتی تھی۔ رفتہ رفتہ اس میں طوائفوں کی ساری خصلتیں، باتیں اور رکھ رکھاؤ آنے لگا تھا۔ شروع کے چند ماہ اسے اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ ہر رات مجرا کرنے سے پہلے وہ دیر تک بیٹھی روتی رہتی تھی اور کسی مہمان کے ساتھ شب گزاری کے بعد وہ اپنے آپ کو کوستی اور ملامت کرتی رہتی تھی۔ سارا دن وہ دکھ اور غم سے نڈھال پڑی رہتی تھی مگر قدرت نے انسان کی فطرت میں یہ بات رکھی ہے کہ وہ جلدی ہی اپنے ماحول اور اس کی روایات کا عادی ہونے لگتا ہے۔ رو رو کر اور غم کر کے وہ تھک چکی تھی۔ اس کے پاس نہ کوئی راہ فرار تھی اور نہ ہی کوئی اور راستہ۔ سارے راستے اس بند گلی میں جا کر ختم ہو جاتے تھے جہاں وہ رہتی تھی۔ اور...... وہ اس بدنام زمانہ حویلی کی رہائشی تھی...... جہاں عورت محض کٹھ پتلی ہوتی ہے...... اور لوگوں کو اپنا تماشا دکھا کر خوش کرتی ہے...... اس کے وجود سے جیسے ہی شرافت، عزت اور عصمت رخصت ہوتی ہے اس کی طرف دیکھنے والی ہر آنکھ بے باک ہو جاتی ہے...... اور ہر زبان بدلحاظ...... رات ختم ہونے کے ساتھ ہی کھیل تماشا ختم ہو جاتا...... اور...... وہ اپنے بکھرے وجود کی کرچیوں کو سمیٹتی رہتی مگر کب تک ان کرچیوں سے اپنے وجود کو لہولہان کرتی...... عزت، شرافت اور عصمت کے لبادے وہ پہلے ہی اتار چکی تھی...... اب وہ بھی پیشہ ور عورتوں کی طرح منہ پھٹ، بدلحاظ اور بدگو ہو گئی تھی۔ اس نے چمن بیگم کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا اور کوٹھے کا سارا انتظام خود سنبھال لیا تھا۔ کس کو کتنا حصہ دینا ہے یہ...... اس کی مرضی سے طے ہوتا...... وہ...... اپنے ہر مجرے کی منہ مانگی قیمت لیتی۔ دوسری طوائفوں سے بھی اپنا حصہ وصول کرتی...... شراب نوشی، تمباکو نوشی اور اعلیٰ مہمانوں کے ساتھ جوا کھیلنے میں وہ عار محسوس نہ کرتی تھی۔

نگار بیگم کی طرح اسے بھی بڑی بڑی گاڑیاں لینے آتی تھیں۔ امیر خاندانوں کے لوگ اسے شادی بیاہ پر خصوصی رقص کے لئے بلواتے...... اور جب وہ نت نئی، جدید ماڈل کی گاڑیوں پر بیٹھنے کے لئے نگار بیگم کی طرح چادر اوڑھ کر اچھو کے پاس سے گزرتی تو ہر بار ٹھٹھک کر ایک ٹک اچھو کی طرف ضرور دیکھتی جو اس کی طرف حیران کن نگاہوں سے دیکھتا جیسے خدا کی قدرت اور شان پر حیران ہو رہا ہو...... اور...... وہ اس کے پاس سے گزر جاتی۔

دلبر اس کو چھوڑ کر جا چکا تھا بلکہ اس نے اس کا شہر ہی چھوڑ دیا تھا۔ نجانے وہ کہاں چلا گیا تھا...... کسی کو کچھ خبر نہ تھی وہ اسے اور حویلی کو چھوڑ کر کیوں چلا گیا تھا۔ کوئی نہیں جانتا مگر یہ صرف وہی جانتی تھی...... جب وہ شدت غم سے نڈھال ہو جاتی تو دلبر کو رات کی تنہائیوں میں بلاتی...... اور اسے اپنے قریب آنے کو کہتی جس طرح وہ محبت سے اس کے پاس آتا تھا جب وہ ایک ملازمہ تھی۔ نگار بیگم نے جب مار مار کر اس کا برا حشر کر دیا تھا تو دلبر اس کے زخموں پر مرہم لگاتا تھا۔ وہ ان لمحوں کو یاد کرتی جب دلبر اس کو محبت سے چھوتا...... اور اسے اپنے ساتھ لگاتا تھا۔ مہمانوں کی مہمان نوازیاں اور ان سے جھوٹی محبت جتلاتے...... کھوکھلے تعریفی الفاظ سن کر اور بناوٹی دل لگی کر کے وہ تھک چکی تھی۔ اسے دلبر کی محبت ستانے لگی تھی...... اس کے لمس اور چھونے کے احساس کے لئے دل تڑپنے لگتا...... وہ دلبر کی محبت کی خوشبو اس کی سانسوں سے محسوس کرتی مگر اب وہ محبت کھو چکی تھی...... دلبر روٹھ گیا تھا...... اور اسے دلبر کی ضرورت تھی...... اس کی محبت اور چاہت کی تڑپ اسے مضطرب رکھتی تھی۔ نگار بیگم کی جگہ لینے کے بعد وہ اسے جب بھی بلاتی وہ بہانہ بنا کر کھسک جاتا...... اور...... وہ اپنی جگہ پر بیٹھی تلملانے لگی۔ دلبر کی بے رخی پر اسے غصہ آنے لگتا...... اس کی اکڑ پر وہ حیران ہوتی...... مگر اسے چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کہہ سکتی اس رات کے بعد اچانک وہ غائب ہو گیا...... کسی سے کچھ کہے بنا ایسا گیا پھر لوٹ کر نہ آیا...... آدھی رات کو اس نے

دلبر کو اپنے کمرے میں بلایا تھا۔ اس رات وہ شدید مضطرب اور بے چین تھی۔ دلبر آیا تو منہ موڑے کھڑا تھا...... وہ اس کے قریب آئی اور اس کی طرف بے بسی سے دیکھنے لگی۔

''دلبر...... مجھے...... تمہاری محبت چاہیے...... وہ محبت جو تم مجھ سے کرتے تھے......'' وہ نم آنکھوں سے بولی۔

''وہ میری بھول تھی اور آپ بھی اسے بھول جائیے'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''کیا کچھ بھولوں...... یہ...... کہ تم میری زندگی میں آنے والے پہلے مرد ہو...... اور یہ کہ مجھے محبت کے لمس اور اس کے احساس سے تم نے آشنا کیا ہے...... اور...... اب تم مجھے کہہ رہے ہو کہ میں بھول جاؤں...... میں کیسے سب کچھ بھلاؤں...... دلبر مجھے پہلے کی طرح ایک بار اپنی بانہوں میں لو...... مجھے سینے سے لگا کر میرے دل کی دھڑکنوں میں اپنا نام لکھو اور میرے اندر کے سارے دکھوں اور غموں کو کان لگا کر سنو...... دلبر...... میں تمہارے بغیر بہت تنہا ہوں۔ تمہاری بے رخی مجھے بہت اذیت دیتی ہے...... میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اور وہ قدرے جذباتی ہو کر اس کے سینے کے ساتھ لگ گئی...... دلبر اس سے یوں پیچھے ہٹا جیسے اسے کوئی کرنٹ لگی ہو...... دلبر نے اس کی طرف بھرپور نگاہوں سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی سی تیرنے لگی اور وہ کچھ کہے سنے بغیر کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ حیران کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ پھر اس کے پیچھے بھاگی مگر وہ جا چکا تھا...... نجانے وہ کہاں گم ہو گیا تھا کہ پھر دوبارہ کبھی لوٹ کر نہ آیا۔ اس کو گئے ہوئے پورا سال گزر گیا تھا اور وہ ہر شب تنہائی میں اس کو یاد کر کے آنسو بہاتی...... دلبر جیسی محبت اس سے کوئی نہیں کر سکے گا اور شاید وہ بھی کسی کے لئے وہ احساسات محسوس نہ کر سکے گی جو وہ دلبر کے لئے کرتی تھی۔ دلبر کے جانے کے بعد اس کے اندر واضح تبدیلی آئی تھی۔ وہ بہت تلخ اور ترش رو ہو گئی تھی۔ اس کے دل سے جیسے نرمی ختم ہو گئی تھی۔ اس کا رویہ دوسری طوائفوں اور کوٹھے کے ملازموں و کارندوں کے ساتھ قدرے تلخ ہو گیا تھا۔ اس نے قلیل عرصے میں بہت زیادہ پیسہ اکٹھا کر لیا تھا...... اکثر محفلوں میں رقص کرنے جاتی تو نوٹوں سے بیگ بھر کر لاتی۔ کوٹھے کی تمام دوسری طوائفیں اسے حسد بھری نگاہوں سے دیکھتیں...... روز بروز ریتا بیگم کی شان اور تفاخر میں اضافہ ہونے لگا۔ وہ اپنے آپ کو سب سے منفرد اور اعلیٰ سمجھنے لگی۔

ایک فلم پروڈیوسر سکندر علی، ریتا بیگم پر بری طرح مرمٹا تھا۔ اس نے اسے اپنے ایک دوست کی حویلی میں رقص کی محفل میں دیکھا تھا...... اور اس کے بعد اس کا دل اس کے قابو میں نہیں رہا تھا۔ وہ اس کا رقص دیکھنے خصوصی طور پر اس کی حویلی آیا اور اسے اپنی ایک فلم میں ہیروئن کا کردار ادا کرنے کی پیش کش کی۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ اس کی تصویریں پورے ملک کے اخبارات میں شائع ہوں گی اور بڑے سینما گھروں کے باہر اس کے رنگ برنگے پوسٹرز آویزاں ہوں گے۔ وہ پورے ملک میں مشہور ہو جائے گی۔ فلم سٹار ریتا اس سے بڑھ کر اسے اور کیا بننا تھا......؟ اس نے جو خواب کبھی دیکھے تھے وہ سب پورے ہو رہے تھے۔ اس نے جس جس بات کی تمنا کی تھی۔ قدرت اسے عطا کر رہی تھی اسے اپنی سوچ سے بڑھ کر مل رہا تھا۔ وہ نگار بیگم سے کہیں آگے کھڑی تھی۔

اس کے فلم میں کام کرنے پر چمن بیگم سمیت سب لوگوں نے پھر اعتراض کیا مگر اس نے نگار بیگم کا حوالہ دے کر سب کو خاموش کر دیا۔ رفتہ رفتہ اس کی توجہ مجروں سے ہٹنے لگی اور وہ اپنا زیادہ وقت فلم کی شوٹنگ میں صرف کرنے لگی۔ وہ اخبارات کی خبروں میں نمایاں ہونے لگی تھی۔ سکندر علی

کی خصوصی توجہ اور دلچسپی نے اس کی قدر و منزلت میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ ہر طرف فلمسٹار 'ریتا' کا چرچا ہونے لگا۔ ایک فلم کی کامیابی کے بعد فلمسازوں کی لائنیں لگ گئیں مگر وہ کسی کو بھی سکندر علی کی مرضی کے بغیر سائن نہ کرتی۔ سکندر علی اور ریتا ہر ٹی وی پروگرام میں اکٹھے دکھائی دیتے تھے۔ ریتا کا ستارہ عروج پر جا رہا تھا۔ سکندر علی کے لئے وہ صرف ایک ہیروئن ہی نہیں تھی بلکہ "بہت کچھ" تھی۔ دونوں میں دن بدن بہت محبت پیدا ہو رہی تھی۔ سکندر علی ایک منٹ بھی اس کے بغیر نہ گزارتا۔ اگر وہ شوٹنگ میں مصروف ہوتی تو وہ اسے وہاں فون کرتا رہتا۔

"ریتا بیگم...... اب آپ کے بغیر سانس لینا بھی ممکن نظر نہیں آتا ہے" سکندر علی نے ایک روز محبت سے کہا۔

"یہ تو بہت خطرے کی بات ہے" وہ مسکرا کر بولی۔

"ہاں...... خطرہ تو ہے اب آپ کا اس علاقے میں رہنا مناسب نہیں" سکندر علی نے سنجیدگی سے کہا تو وہ چونک گئی۔

"کیا مطلب......؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"اب آپ مشہور ہو چکی ہیں۔ آپ کی پہچان بدل گئی ہے...... آپ بہت سے لوگوں کی آئیڈیل ہیں...... اور جب انہیں معلوم ہوگا کہ ان کی آئیڈیل کہاں سے تعلق رکھتی ہے تو اس کا بہت برا اثر آپ پر پڑے گا...... آپ کی شہرت متاثر ہوگی اور آپ کو فلموں میں کام ملنا بند ہو جائے گا" سکندر علی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"وہ تو سب ٹھیک ہے...... لیکن ہماری حویلی ہی ہمارا گھر ہے، ہم اور کہاں جا سکتی ہیں؟" ریتا بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

"شہر کے سب سے قیمتی اور ماڈرن علاقے میں، میں آپ کو بہت بڑا بنگلہ خرید دیتا ہوں۔ میرے خیال میں آپ کا وہاں شفٹ ہو جانا بہتر ہے......" سکندر علی نے کہا۔

"کیا ہم یہ حویلی...... اور یہ پیشہ سب کچھ چھوڑ دیں؟" ریتا بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں......" وہ قطعیت سے بولا۔

"مگر......" اس کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کہے۔

"میں آپ کو سب کچھ دوں گا...... گھر...... عزت...... اور تحفظ" سکندر علی نے کہا تو 'عزت' پر اس کا ذہن اٹک گیا...... اس نے سب کچھ پایا تھا مگر 'عزت' کھوئی تھی اور اب قدرت اسے سکندر علی کے ذریعے عزت واپس لوٹا رہی تھی۔ وہ واقعی خوش قسمت تھی۔ عزت کتنی بڑی نعمت اور عطا ہے جو قدرت اپنے بندوں کو عطا کرتی ہے مگر انسان اپنی بداعمالیوں سے اسے خود ہی گنوا بیٹھتا ہے یا پھر قدرت اس سے چھین لیتی ہے...... پھر وہ ساری زندگی سر پٹختا رہتا ہے مگر کھوئی ہوئی عزت نہیں پا سکتا۔ ریتا بیگم نے گھر، دولت، شہرت اور دنیا کی ہر شے پالی تھی۔ اگر کچھ نہیں پا سکی تو وہ عزت تھی۔ وہ اس کی بات سن کر مسکرانے لگی۔

"کیسی عزت؟" ریتا بیگم نے جان بوجھ کر پوچھا۔

"کیا آپ مجھ سے شادی کریں گی؟" سکندر علی نے مسکرا کر پوچھا تو ریتا مسکرا دی۔ اس کے گال خوشی سے تمتمانے لگے۔

''شادی......'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......اب ہم دونوں کو شادی کر ہی لینی چاہیے کیونکہ اخبارات ہر روز مصالحہ دار خبریں اخبارات میں لگا کر ہمارے اسکینڈلز بنانا چاہتے ہیں جس کا ہم دونوں کو نقصان ہوگا......'' سکندر علی نے کہا تو وہ سر جھکا کر مسکرانے لگی۔

''لیکن......ایک بات ہے......وہاں جانے کے بعد آپ مڑ کر اس حویلی کو نہیں دیکھیں گی......آپ کو ساری کشتیاں جلا کر میرے ساتھ جانا ہوگا'' سکندر علی نے کہا تو وہ خاموش ہو کر سوچنے لگی۔

''ہمیں منظور ہے'' وہ قدرے توقف کے بعد بولی۔

''ٹھیک ہے......میں ایک دو روز بعد آ کر آپ کو لے جاؤں گا، تیار رہیے گا'' سکندر علی نے کہا تو وہ مسکرا دی۔

مستقبل کے سنہرے خوابوں اور امیدوں نے اسے مسرور کر دیا۔ حویلی چھوڑنے کی خبریں ہر جانب گردش کرنے لگیں تو سب کے چہروں پر حیرت کے ساتھ ساتھ گہرا استفہام نمایاں ہوتا۔

''زینا بیگم......کیا آپ حویلی......یہ نام......یہ شان و شوکت سب کچھ چھوڑ کر جا رہی ہیں'' چمن بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......'' وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔

''مگر......کیوں......؟''

''اب ہمارا یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں......ہم نے شادی کرنے کا ارادہ کر لیا ہے'' وہ بڑی ادا سے بولی۔

''زینا بیگم......کیا آپ 'نگار بیگم' کو بھول گئیں......نوازش علی نے کیسے ان کو دو منٹ میں چھوڑ دیا......ایسے لوگوں کی محبتیں ہوا کے سنگ اڑتے پھرتے رنگ برنگی کاغذوں جیسی ہوتی ہیں۔ آج یہاں......تو......کل وہاں......ہر طوائف کی زندگی میں کوئی نہ کوئی 'نوازش علی' اور 'سکندر علی' آتا ہے مگر انجام کیا ہوتا ہے آپ اچھی طرح جانتی ہیں'' چمن بیگم نے اسے سمجھانا چاہا۔

''سکندر علی ایسے مرد نہیں'' وہ پر یقین لہجے میں بولی۔

''ہر مرد ایک سا ہوتا ہے......اور......ہر طوائف......ہر بار دھوکہ کھاتی ہے اور ہر بار اس پر یقین کر کے خوار ہوتی ہے۔ زینا بیگم......ہر طوائف کی زندگی کوٹھے سے شروع ہو کر کوٹھے پر ہی ختم ہوتی ہے اور جب وہ اپنا راستہ بدلنے کی کوشش کرتی ہے تو وہ اجنبی راستے اس کو قبول نہیں کرتے۔ وہ ہر ایک کی ٹھوکر سے لڑکھڑاتی رہتی ہے'' چمن بیگم نے کہا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں......مگر ہم کب تک یونہی لوگوں کے سامنے رقص کر کے ان کا دل بہلاتے رہیں گے......ہماری اپنی زندگی ہماری اپنی خوشیاں کہاں ہیں......کیا ہمارا ان پر کوئی حق نہیں......کیا ہمیں گھر......اور عزت نہیں مل سکتی؟'' اس نے چمن بیگم سے پوچھا۔

''اس وقت آپ سے بحث فضول ہے......آپ کے سر پر سکندر علی کی محبت کا بھوت سوار ہے......ٹھیک ہے آپ جا سکتی ہیں مگر جب وہاں سے لوٹ کر آئیں گی تو یہ حویلی آپ کو اس طرح قبول نہیں کرے گی جس طرح اب آپ جا رہی ہیں'' چمن بیگم نے کہا تو اس نے قدرے طنزیہ انداز

میں چمن بیگم کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔

''یہاں دوبارہ آئے گا کون......؟'' اور وہ اپنا سامان سمیٹنے لگی۔

چمن بیگم نے اس کی طرف بغور دیکھا اور وہاں سے چلی گئی۔

☆

جمی اور نرگس کے جانے کے بعد فردوس بہت تنہا رہ گئی تھی۔ گھر اس کو کھانے کو دوڑتا...... اس میں شامو، جمی، نرگس اور بے بی کی رچی بسی یادیں اسے ہر وقت تنگ کرتی رہتیں۔ جب دل تنگ پڑنے لگتا تو وہ گھر سے باہر نکل جاتی اور باہر جاتی تو گلی محلے کے لڑکے اس سے چھیڑ خانیاں کرتے۔ کوئی آوازیں کستا تو کوئی چٹکی کاٹتا...... وہ گالیاں بکتی تو لوگ چڑ کر اسے اور تنگ کرتے...... وہ بڑبڑاتی، گالیاں بکتی گھر لوٹ آتی...... زندگی روز بروز مشکل ہوتی جا رہی تھی...... نہ گھر میں سکون ملتا تھا نہ باہر چین...... تنہائی اور اجنبیت نے اس کو ذہنی طور پر بہت پریشان کر دیا تھا۔ کوئی ایسا انسان نہ ملتا جس سے وہ اپنے دل کی بات کرتی۔ اس سے اپنی بے تابیوں اور بے چینیوں کا ذکر کرتی...... نہ کوئی حال پوچھنے والا تھا اور نہ ہی کوئی تسلی دینے والا...... اور ہر زندہ انسان کو زندگی میں دوسروں کی تسلی و تشفی اور دلاسے کی کتنی ضرورت ہوتی ہے اس کا اندازہ تنہائی کی اذیت سہنے والا انسان ہی جانتا ہے۔ نرگس کے ساتھ وہ اپنے دل کی ہر بات کر لیتی تھی اور وہ اسے بھی تسلیاں دیتی تو کبھی دونوں مل کر اپنی بے بس اور مجبور زندگی کے دکھ ایک دوسرے کے ساتھ بیان کرتیں تو دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا مگر اب تو یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے دل کسی بھاری پتھر تلے آ گیا تھا یا غبارے کی مانند جو غموں، سسکیوں اور آہوں سے پھولا چلا جا رہا تھا۔ وہ دن میں کتنی بار روتی...... آنسو پونچھتی اور پھر گھر سے باہر چلی جاتی۔ جب گھر لوٹتی تو دل اور بھی چکنا چور ہو جاتا۔

جمی تھا تو وہ اس سے لڑتی جھگڑتی مگر اس کا خیال بھی بہت رکھتی تھی مگر جمی کے جانے کے بعد وہ اسے بھی بہت یاد کرتی۔ کوئی ایسا رشتہ پاس نہیں تھا جس کے ساتھ وہ محبت کے بول بولتی۔ جس کو پیار کرتی...... جس سے کچھ کہتی یا سنتی...... وہ اپنے آپ سے تنگ آنے لگی تھی...... اور چڑچڑی ہو گئی تھی...... محلے والوں سے ہر روز ایک نیا جھگڑا تیار ہوتا۔ کبھی کوئی جان بوجھ کر اس کے صحن میں پھلوں کے چھلکے پھینک دیتا تو وہ گالیاں بکنے لگتی۔ کبھی کوئی دیوار پھلانگ کر اس کی چیزیں اور کپڑے چرا کر لے جاتا تو اس پر گالیاں شروع کر دیتی...... کوئی چھیڑ جاتا تو اس پر بگڑ جاتی...... محلے والے بھی اس کی بدزبانی اور جھگڑنے سے تنگ آ گئے تھے۔ وہ بھی جان بوجھ کر رات کو دیر تک اونچی آواز میں گانے لگا دیتی تو لوگ اس کی موسیقی سمیت اسے لعن طعن کرتے۔ اسے گالیاں دیتے...... ہر وقت میدان جنگ کا ماحول بنا رہتا۔ لوگ اس سے تنگ تھے اور وہ لوگوں سے......

وہ کئی سالوں سے نرگس کے ساتھ اس بوسیدہ اور کھنڈر نما گھر میں کرائے پر رہتی تھی۔ لوگوں نے مالک مکان سے کہہ کر اس کا سامان گلی میں پھنکوا دیا۔ وہ روتی چلاتی اپنا سامان سمیٹ کر ادھر ادھر بھٹکنے لگی۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کہاں جائے۔ اس تاریکی میں شامو ہی اک جگنو کی مانند چمکا اور وہ اس کے شہر چلی آئی۔ شامو اسے تپاک سے ملا اور اسے اپنے گھر ٹھہرنے کو کہا۔ پہلے وہ وہاں نرگس اور جمی کے ساتھ گئی تھی اور وہ آٹھ دن سب نے بہت عیش میں گزارے تھے۔ سب نے بہت لطف اٹھایا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ان کی زندگی میں صرف وہی آٹھ دن خوشی کے دن تھے۔ باقی سب دن تو بس روز و شب کا آنا جانا تھا اور کچھ نہیں...... کوئی ایک دن بھی زندگی میں اہم نہ گزرا تھا اور کوئی شب بھی ایسی اہم نہ گزری تھی

جب اپنے ادھورے وجود کے احساس نے اسے نہ رلایا ہو..... مگر ان آٹھ دنوں میں وہ اپنے آپ کو بھول گئے تھے۔ اپنے وجود کو فراموش کر چکے تھے۔ اگر یاد تھا تو صرف یہی کہ وہ سب شامو کے مہمان تھے۔

اپنے 'انسان' ہونے پر انہیں جو دکھ ہر لمحہ..... ہر وقت آہستہ آہستہ اندر ہی اندر کچوکے لگاتا رہتا تھا..... 'مہمان' بن کر آنے پر وہ ہر غم بھول چکے تھے۔

مگر اب شامو کے پاس آ کر اسے بہت عجیب لگ رہا تھا..... وہ صبح لیٹ اٹھتا اور دوپہر کے قریب پارلر چلا جاتا..... رات کو دیر سے لوٹتا۔ کبھی کبھار اس سے بات ہوتی۔ اسے یہاں آ کر محسوس ہونے لگا تھا جیسے وہ اس پر بوجھ ہو..... یا کوئی فالتو چیز..... جس کے ہونے یا نہ ہونے سے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا..... گھر کے ملازمین اسے وقت پر کھانا دے دیتے اور اپنے کاموں میں مصروف رہتے۔ کوئی اس کے ساتھ زیادہ بات چیت نہ کرتا وہ تو اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے تو یہاں آئی تھی مگر دل اور بوجھل ہونے لگا تھا۔

ایک شام شامو جلدی گھر لوٹ آیا۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور اسے بخار محسوس ہو رہا تھا۔ وہ آتے ہی اپنے بیڈ روم میں چلا گیا..... اس نے اس کے پاس جانا چاہا تو ناصر نے اسے روک دیا۔

''صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں..... آپ انہیں ڈسٹرب نہ کریں تو بہتر ہے'' ناصر نے کہا۔

''ارے چل..... تو کون ہوتا ہے مجھے روکنے والا..... یہ دیکھ میں..... اندر جا رہی ہوں..... جب وہ پہلے کبھی بیمار ہوتا تھا تو میں ہی اس کا سرہانی تھی'' فردوس نے کہا اور اندر چلی گئی۔ شامو بیڈ پر آنکھیں موندے لیٹا تھا۔ فردوس نے جوتا اتارا اور جھٹ اس کے بیڈ پر چڑھ گئی۔ شامو نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''آپا..... تم.....؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''میں تمہارا سرہانی ہوں'' وہ اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

''نہیں..... نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں'' اس نے اس کا ہاتھ ہٹانا چاہا۔

''تو چپ کر..... بھول گیا وہ وقت جب میں ہی تیرا سرہانی تھی اور اب تو بڑا صاحب بن گیا ہے..... تجھے..... میری ضرورت نہیں رہی'' فردوس منہ بنا کر بولی اور اس کا سر دبانے لگی۔

''معلوم نہیں آپا..... زندگی میں کس کو کس کی ضرورت ہوتی ہے..... شاید جس کی ضرورت ہوتی ہے، وہ کبھی نہیں ملتا'' شامو نے آہ بھر کر کہا۔

''تو کس کی بات کر رہا ہے.....؟'' فردوس نے حیرت سے پوچھا۔

''اپنی بات کر رہا ہوں.....'' اس نے ٹالنے کے انداز میں کہا۔

''اچھا..... چپ کر..... تیرے سر میں درد ہے..... باتیں کرنے سے سر اور بھاری ہوگا'' وہ محبت سے اس کا سر دبانے لگی..... اور وہ آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔

اچانک شامو کے چہرے پر اس کے آنسو گرے۔ شامو نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں...... اور حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"آپا...... کیا تم...... رو رہی ہو" شامو نے حیرت سے پوچھا۔

"ن...... نہیں...... تو...... بس یونہی...... تجھے دیکھ کر پرانی باتیں یاد آنے لگیں...... شامو...... ہمارے پاس تو کوئی ہمارا اپنا بھی نہیں ہوتا جس کو ہم جی بھر کر پیار کر سکیں...... ارے شامو...... دل ہر وقت کتنا ٹوٹا رہتا ہے...... تجھے کیا بتاؤں...... ؟ سوچتی ہوں...... ہم جیسے انسان دنیا میں کیا لینے آتے ہیں...... ادھورے انسان، بھلا کسی کے کیا کام آ سکتے ہیں...... ہمیں تو نہ شناخت ملتی ہے...... نہ محبت...... نہ رشتے...... اور نہ ہی عزت...... ہمارے پاس ہے کیا؟ ہم کس کے لئے جئیں...... اور کیوں جئیں...... ؟ پھر بھی جینا پڑتا ہے...... نجانے کیوں...... ؟ وہ آہ بھر کر بولی تو شامو اس کی طرف حیرت اور تاسف سے دیکھنے لگا۔

"آپا...... تمہارے کسی سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں...... کیونکہ یہی سوال میں بھی اپنے آپ سے کرتا ہوں مگر جواب نہیں ملتا......" شامو نے بھی تاسف سے کہا اور خاموش ہو گیا۔

"شامو...... میں نے تجھ سے ایک بات کہنی تھی...... موقع ہی نہیں مل رہا تھا...... آج تم جلدی آ گئے...... تو...... سوچا ہے...... آج ہی کہے دیتی ہوں" فردوس نے کہا تو شامو نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔

"کیسی بات...... ؟" شامو نے پوچھا۔

"میں یہاں سے جانے کا سوچ رہی ہوں" فردوس نے کہا۔

"کیوں...... ؟ کیا تمہیں یہاں کوئی تکلیف ہے؟" شامو نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں...... مگر...... میں یہاں کب تک مہمان بن کر رہوں گی...... مجھے لگتا ہے...... میں تم پر بوجھ ہوں" فردوس نے افسردگی سے کہا۔

"آپا...... بوجھ...... ! یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟" شامو نے کہا۔

"نہیں شامو...... مجھے یہاں رہنا اچھا نہیں لگ رہا...... تم مجھے کوئی کام دلا دے...... ؟" اس نے آہستہ سے کہا۔

"کیسا کام...... ؟" شامو نے حیرت سے پوچھا۔

"کسی کے گھر صفائی، ستھرائی کا کام...... کسی کے بچے کی آیا بھی بن سکتی ہوں اور کپڑے دھونے کا کام بھی میں کر سکتی ہوں...... بس تو کوئی کام دلا دے...... میرا بھی دل چاہتا ہے...... کہ میں بھی محنت کر کے کھاؤں......" فردوس نے فرط جذبات سے لبریز لہجے میں کہا۔

"اچھا...... ٹھیک ہے...... میں کسی سے بات کر کے بتاؤں گا...... اب تم جا کر آرام کرو" شامو نے کہا تو وہ خوش ہو کر کمرے سے باہر نکل گئی اور شامو بھی دوائی کھا کر سو گیا۔

شامو کے پاس بڑے بڑے اعلیٰ گھروں کی بیگمات آتی تھیں اور اکثر گھر کے مسائل بھی اس کے ساتھ ڈسکس کرتی تھیں...... ایک بزنس مین کی بیگم صاحبہ کو اپنے چھ ماہ کے بچے کے لئے آیا کی ضرورت تھی۔ اس نے کچھ روز پہلے شامو سے ذکر کیا تھا۔ شامو نے اس کو فون کر کے فردوس کو وہاں بھیج دیا۔ بیگم صاحبہ نے اس کا بھرپور انٹرویو کیا اور اچھی طرح جانچنے کے بعد اس نے اسے انکار کر دیا اور شامو سے فون کر کے بہت شکوہ کیا کہ

اس نے ایک ہیجڑے کو کیوں اس کے گھر بھیجا ہے......وہ تو ایسے لوگوں کا سایہ بھی اپنے بچے پر نہیں پڑنے دیتی......فردوس کا دل بہت ٹوٹ گیا تھا۔ شاموں نے اسے کسی کے گھر ملازم کے طور پر رکھوایا چند روز اس نے وہاں بہت دل لگا کر کام کیا...... بھاگ بھاگ کر ہر کام کرتی، شروع میں تو وہ لوگ بہت خوش تھے مگر بعد میں جب انہیں نیا ملازم ملا تو انہوں نے اسے کام سے نکال دیا۔ شاموں نے ایک دو جگہ پر اسے ملازم رکھوایا مگر جب لوگوں کو اس کے بارے میں معلوم ہوتا تو وہ اسے نکال دیتے۔ وہ اتنی دلبرداشتہ ہوگئی تھی کہ اٹھتے بیٹھتے روتی تھی کہ لوگ اس کے کام کو نہیں دیکھتے......اس کے ادھورے پن کو دیکھتے ہیں......ان کی نظروں میں انسان کی عزت کام سے نہیں ہے......لوگوں کا عجیب دوغلا پن تھا جو اسے ذہنی طور پر شدید ڈسٹرب کر رہا تھا......اور وہ ایک صبح شاموں کے اٹھنے سے پہلے اس کا گھر چھوڑ کر چلی گئی۔ شاموں کو جب معلوم ہوا تو اسے بہت دکھ ہوا......اس نے اسے تلاش کرنے کی بھی کوشش کی مگر نجانے وہ کہاں کھو گئی تھی۔

☆

برکتے کا رو رو کر برا حال ہو چکا تھا۔ اسے گڈی کی سڑی ہوئی لاش نہیں بھولتی تھی۔ اس کا چہرہ جل کر سیاہ ہو چکا تھا اور جسم کا کوئی حصہ سلامت نہیں تھا...... وہ مرنے سے پہلے برکتے کے پاس چارپائی پر لائی گئی اس کا چہرہ اور جسم چادر سے ڈھانپا گیا تھا۔ صرف اس کی آنکھیں جلنے سے بچی تھیں۔ برکتے اسے دیکھ کر پیٹنا شروع ہو گئی...... گڈی کی آنکھیں آگ اور دکھ کے غبار سے سرخ ہو رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں سے مسلسل پانی بہہ رہا تھا اور ان بہتی آنکھوں میں شکوے ہی شکوے تھے۔ وہ بول نہیں سکتی تھی مگر اس کی آنکھیں بول رہی تھیں...... برکتے واویلا کر رہی تھی اپنی جوان بیٹی کو اپنے سامنے مرتے ہوئے دیکھ کر تڑپ رہی تھی۔ ملا جھلی کے اندر آیا...... تو گڈی نے اسے دیکھ کر منہ موڑ دیا اور اس کی جان نکل گئی...... وہ سڑے ہوئے مردہ وجود کے ساتھ پڑی تھی۔ سب بہن بھائی رو رہے تھے سوائے مجو اور پپو کے جو کل سے گم تھے اور جن کا کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا...... برکتے ان کے غم میں پہلے ہی نڈھال ہو رہی تھی کہ گڈی بھی اسے چھوڑ کر چلی گئی رانی کی طرح...... پہلے وہ رانی اور منے کو نہیں بھول پا رہی تھی اور اب گڈی بھی چلی گئی...... پپو اور مجو کا بھی کوئی پتا نہ تھا...... نجانے اس کے بچوں کو کس ظالم کی نظر لگ گئی تھی کہ اس کی جھلی خالی ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے بچے اس سے بچھڑ رہے تھے اور وہ بچوں کے غم میں پاگل ہو رہی تھی...... گڈی کو دفنا دیا گیا...... رمضو غائب ہو گیا تھا کہ کہیں اس پر گڈی کے قتل کا الزام نہ آ جائے اور ملا پولیس میں رپورٹ نہ لکھوا دے مگر ملا اندر ہی اندر مطمئن تھا کہ رمضو کے بھاگ جانے سے اور گڈی کے مر جانے سے وہ روز روز کی چخ چخ سے بچ گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ تین ہزار واپس کر کے پپو اور مجو کو لے آئے گا مگر بھاگی نے پانچ سو مجو کو دے کر ڈھائی ہزار بچا لیے تھے اور وہ ان ڈھائی ہزار روپوں سے اپنے کاکے کے لئے بہت کچھ خریدنا چاہتی تھی...... اسے پپو اور مجو کی کیا فکر تھی؟

کئی روز ہو گئے تھے مگر پپو اور مجو کا کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا اور برکتے کا رو رو کر برا حال تھا۔ اس نے نجو اور مٹھو کے سامنے ہاتھ جوڑے کہ وہ کسی طرح اس کے بچوں کو ڈھونڈ لائیں اور وہ دونوں ان کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ اچانک ایک روز نجو کو شہر سے باہر ایک بازار میں پپو بھیک مانگتا نظر آ گیا۔ اس کی آدھی ٹانگ کٹی ہوئی تھی اور مرہم پٹی نہ کرنے کے باعث زخم میں پیپ پڑ چکی تھی وہ سڑک کے کنارے کپڑا بچھا کر لیٹا کراہ رہا تھا...... اس کے پاس کشکول پڑی ہوئی تھی۔ وہ درد سے کراہ رہا تھا اور لوگ اس کی حالت دیکھ کر اس پر رحم کھاتے ہوئے اس کے کشکول میں پیسے ضرور ڈال کر جاتے اور اسکی طرف دکھ اور رحم بھری نظروں سے دیکھتے۔ نجو اس کو دیکھ کر گھبرا گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''پپو...... پپو...... میرے بھائی...... یہ...... یہ تجھے کیا ہوا ہے؟'' نجو نے اس کا سر اپنی گود میں رکھتے ہوئے کہا تو پپو نے ایک دم آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور اس کے سینے کے ساتھ چمٹ کر رونے لگا......

''نجو...... مجھے یہاں چھوڑ کر نہ جانا...... استاد مجھے بہت مارتا ہے...... اس نے میری ٹانگ کاٹ دی ہے'' پپو رونے لگا۔

''کون استاد......؟'' نجو نے حیرت سے پوچھا۔

''استاد فیقے نے...... ابا مجھے اور مجو کو وہاں چھوڑ کر چلا گیا...... پھر کبھی نہیں آیا...... استاد ہمیں بہت مارتا ہے......'' پپو کے چہرے پر خوف اور ڈر تھا...... اس کی آواز بار بار گلے میں اٹک رہی تھی۔ اس کے آنسو تھم نہیں رہے تھے۔

''اور...... مجو...... کہاں ہے؟'' نجو نے پوچھا۔

''اس کا ہاتھ اس نے کاٹ دیا ہے روز اسے کسی مزار پر چھوڑ آتا ہے......بجو......وہ ہمیں کھانے کو بھی نہیں دیتا......بجو مجھے اماں کے پاس جانا ہے......مجھے گڈی اور شبو کے پاس جانا ہے...... مجھے اماں بہت یاد آتی ہے'' وہ منمنا کر رونے لگا۔

''میں......میں...... تجھے اپنے ساتھ لے کر چلتا ہوں'' اور بجو اسے اٹھا کر جانے لگا تو ایک موٹا تازہ آدمی اس کے پاس آیا اور بجو کو گریبان سے پکڑ کر کھینچنے لگا۔

''اوئے......تو اس کو لے کر کہاں جا رہا ہے؟'' موٹے آدمی نے کہا۔

''یہ......یہ......میرا بھائی ہے اور میں اس کو لے کر ہی جاؤں گا'' بجو نے بھی اکڑتے ہوئے کہا۔

''واہ......بڑی اکڑ ہے تجھ میں......تو......لا......وہ پیسے جو تیرا باپ، استاد فیقے سے لے کر گیا ہے'' موٹے آدمی نے بجو کو دھکا دیتے ہوئے کہا۔

''کیسے پیسے؟'' بجو نے حیرانگی سے پوچھا۔

''اوئے......تیرا باپ......ان کو استاد کے ہاتھ بیچ کر گیا ہے......یہ نہیں اس نے تجھے بتایا......جا......پہلے پیسے لا......اور پھر استاد سے بات کر'' موٹے آدمی نے کہا تو بجو کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وہ الٹے قدموں پر واپس لوٹا۔

شام ہونے کے قریب تھی وہ بھاگی کی جھگی میں گیا۔ وہ اور ملکا بیٹھے کھانا کھا رہے تھے اور ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ بجو نے قریب پڑا ڈنڈا اٹھایا اور باپ کی طرف لپکا۔

''ابا......پپو اور مجو کہاں ہیں؟'' بجو نے پوچھا۔

''وہ گم ہو گئے ہیں'' ملکے نے منہ پھیر کر کہا۔

بجو نے اٹھا کر ڈنڈا باپ کی کمر میں مارا...... بھاگی کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''ارے......مر جائے......تو......باپ کو مار رہا ہے......تجھے کیڑے پڑیں......'' بھاگی چلائی۔

''اری......چپ کر تو......ساری آگ تو نے لگائی ہے......یہ باپ مر جائے تو اچھا ہے......اس نے پپو اور مجو کو بیچ دیا ہے۔ استاد فیقے کے ہاتھ بول......ابا وہ رقم کہاں ہے؟ بول......ورنہ'' بجو نے پھر ڈنڈا مارنے کو اٹھایا۔ ملکا اور بھاگی گھبرا گئے۔

''م......میں نے کوئی پیسے نہیں لیے'' ملکے نے کہا۔

''جھوٹ مت بول......اگر تو سچا ہے تو چل میرے ساتھ استاد فیقے کے پاس......اور......اس کے سامنے یہ بات کہہ'' بجو نے غصے سے کہا۔

''چل......چل......تو......کون ہوتا ہے......باپ کو وہاں لے جانے والا......پپو اور مجو اس کی ہی اولاد ہے......جو چاہے کرے'' بھاگی نے غصے سے کہا تو بجو نے ڈنڈا زور سے اس کی کمر میں مارا......وہ وہیں اپنے پیٹ کو پکڑ کر تڑپنے لگی۔

''ہائے......میں......مر گئی......میرا بچہ......'' وہ چلائی۔

''اللہ کرے......مر جائے......تو......اور تیرا بچہ بھی'' بجو نے غصے سے کہا۔

''سن ابا...... مجو اور پپو کو واپس لے کر آ...... ورنہ میں تیری بوٹی بوٹی کردوں گا'' ممو غصے سے دھمکی لگا کر چلا گیا۔ ملکے کے ہوش اڑ گئے وہ بھاگی کو سنبھالنے لگا۔ جلدی سے نوری کو بلا کر لایا۔ بھاگی کی حالت بہت خراب ہوگئی تھی...... اسے ہسپتال لے جایا گیا۔ اس نے واویلا کر کے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ صبح تک اس کے ہاں بچی پیدا ہوئی مگر وہ پیدا ہوتے ہی مر گئی...... بھاگی...... ممو کو گالیاں دیتی...... اس نے نرس کو کہہ کر پولیس کو بلوایا اور ممو کو گرفتار کروا دیا...... وہ پیسے جو اس نے اپنے ہونے والے بچے کی چیزوں کی خریداری کے لئے رکھے تھے۔ وہ ہسپتال میں دواؤں پر خرچ ہو گئے تھے...... ممو نے ملکے کو دھمکی دی تھی کہ وہ اسے اور بھاگی کو ہرگز نہیں چھوڑے گا۔ برکتے کا رو رو کر برا حال ہو گیا تھا۔ اس نے ملکے سے کہا کہ وہ بچوں کو واپس لے کر آئے...... مگر اس کے پاس پیسے کہاں تھے...... جو وہ انہیں لے کر آتا...... برکتے نے تنگ آ کر اپنے پاس پانچ ہزار روپے اسے دیئے تو وہ چونک گیا۔

''یہ...... یہ...... تیرے پاس کہاں سے آئے؟'' ملکے کی آنکھیں حیرت سے نکل گئیں۔

''کسی نے دیئے ہیں......؟'' وہ آہ بھر کر بولی۔

''کون ہے...... وہ......؟ جس نے تجھے اتنے روپے دیئے'' ملکے نے پوچھا۔

''تھا...... اللہ کا بندہ...... تو جلدی سے میرے بچوں کو گھر واپس لے کر آ'' برکتے نے اس کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

ملکا پانچ ہزار روپے لے کر استاد کے پاس گیا اور بچوں کو واپس کرنے کو کہا...... پہلے تو استاد مان نہیں رہا تھا مگر اس کی منت سماجت پر وہ مان تو گیا مگر اس نے تین کی بجائے پانچ ہزار روپے وصول کیے۔ جب بچوں کو اس کے سامنے لایا گیا تو وہ خود بھی انہیں دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ پپو کی کٹی ٹانگ اور مجو کا کٹا ہاتھ دیکھ کر وہ رونے لگا۔

''استاد...... یہ...... یہ تو نے کیا کیا...... میں تو صحیح سلامت بچے لایا تھا اور تو نے ان کے ساتھ......'' ملکا بے بسی سے بولا۔

''میں نے ان سے بھیک منگوانی تھی...... سیریں نہیں کروانی تھیں اور بھیک لینے کے لئے بھکاریوں کو بہت کچھ کرنا پڑتا ہے...... لوگ بڑے سیانے ہو گئے ہیں...... ایویں ہی ٹھیک ٹھاک بچوں کو کوئی بھیک نہیں دیتا...... چل...... دفعہ ہو یہاں سے...... میرا اتنا نقصان کر دیا ہے'' استاد غصے سے بولا۔

''استاد...... تو...... بڑا ظالم انسان ہے'' ملکا آہ بھر کر بولا۔

''اوئے...... یہ مجھے کہنے سے پہلے اپنے آپ کو کہہ...... میں ان کا باپ نہیں ہوں...... اور تو نے تو باپ ہو کر ان کو بیچ ڈالا...... بول...... ظالم تو ہے کہ میں؟'' استاد نے غصے سے کہا تو ملکا شرمندہ ہو گیا اور بچوں کو لے کر باہر آ گیا۔

بچے اتنے سہمے ہوئے تھے کہ ملکے کے ساتھ جاتے ہوئے بھی ڈر رہے تھے...... پپو اور ملکا دونوں اپنی اپنی بیساکھیوں کے سہارے چل رہے تھے اور مجو اپنے کٹے ہوئے ہاتھ کے ساتھ روتا ہوا جا رہا تھا...... وہ دونوں بہت کمزور ہو چکے تھے۔ برکتے بچوں کو دیکھ کر بلک بلک کر رونے لگی اور ملکے اور بھاگی کو گالیاں دینے لگی...... بچے ماں کے سینے سے لگ کر کافی دیر سسکتے رہے...... مٹھو نے ملکے کو جھگی سے باہر نکال دیا کہ وہ اب ان کی جھگی میں کبھی نہ آئے ورنہ وہ اس کے ٹکڑے کر دے گا۔

☆

''شمی...... آج بہت اہم اپائمنٹ ہے...... فلمسٹار ریناؔ آ رہی ہیں...... ان کے پروڈیوسر کا فون آیا ہے۔ وہ ایک فلم میں برائیڈ کا رول ادا کریں گی ان کا ہیر اسٹائل اور میک اپ آپ نے کرنا ہے''۔ ریپشنسٹ نے انٹرکام پر اطلاع دی۔

''اوکے...... ٹائم کیا ہے......؟'' شمی نے پوچھا۔

اسے ٹائم بتایا گیا اور شمی نے کلاک کی طرف دیکھا...... دو بج رہے تھے اور رینا کا بکنگ ٹائم شام چھ بجے کا تھا...... اس نے اپنی ڈائری دیکھی اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا...... شام چھ بجے سے پہلے وہ فارغ ہو چکا تھا...... فلمسٹار رینا جیسے ہی پارلر میں داخل ہوئی۔ ہر طرف کھلبلی مچ گئی۔ خواتین میک اپ اور فیشل کرواتے ہوئے اسے مڑ مڑ کر دیکھنے لگیں۔ اس کا سر فخر سے اکڑنے لگا اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ اس کے ساتھ اس کی ایک اسسٹنٹ بھی تھی جس نے اس کا برائیڈل ڈریس، جیولری اور دوسری چیزیں ایک بیگ نما سوٹ کیس میں اٹھا رکھی تھیں۔ رینا بڑی ادا سے شمی کے کیبن میں داخل ہوئی جو خصوصی طور پر اس کے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔ رینا لمبے بالوں اور ٹراؤزر شرٹ میں بڑی ماڈرن لگ رہی تھی۔ اسسٹنٹ اس کا سامان رکھ کر چلی گئی۔

''ہیلو'' رینا نے شمی سے کہا جو کچھ کمبس کرنے میں مصروف تھا۔ شمی نے مڑ کر اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اسے چہرہ بہت شناسا محسوس ہوا۔ وہ چہرہ جو اس کے دل کے اندر ہمیشہ سے بستا تھا...... اور جس کو وہ اکثر تنہائی کے لمحوں میں اپنے سامنے بٹھا کر گفتگو کرتا تھا...... مگر...... اس کا حلیہ اور اب اس کا مقام و مرتبہ اس کو پریشان کر رہے تھے۔ شمی خود بھی بہت بدل چکا تھا۔ اس کا جسم قدرے بھاری اور چہرے کے نقوش بھی موٹے ہو گئے تھے۔ رینا کی آنکھوں میں بھی شناسائی کی چمک آئی مگر اگلے ہی لمحے اس نے اپنے آپ کو نارمل کیا۔

''آپ کا چہرہ کچھ شناسا سا لگ رہا ہے؟'' شمی نے ہمت کر کے پوچھا۔

''دنیا میں بہت سے لوگوں کے چہرے ایک دوسرے سے ملتے ہیں یقیناً آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے'' رینا نے بڑی ادا سے کہا۔

آواز وہی تھی مگر انداز گفتگو میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ شمی الجھنے لگا۔

''کیا آپ کسی شامو کو جانتی ہیں......؟ میں...... وہی شامو ہوں'' شمی نے واضح انداز میں اپنا تعارف کرانا چاہا۔

''کون شامو......؟ آپ ہمیں الجھائیے مت...... اور اپنا کام شروع کیجئے۔ ہمیں وقت پر شوٹنگ کے لئے پہنچنا ہے'' اور اسی لمحے سکندر علی کا فون آ گیا اور وہ بہت ناز و اداؤں سے اس کا فون سننے لگی...... اس کی باتیں چونکا دینے والی تھیں اور اس کا انداز انتہائی دل لبھانے والا...... اس کا چہرہ پرکشش دل میں اتر جانے والا تھا دل اس کی لمبی زلفوں کا اسیر بننے کو دل مچلنے لگتا تھا۔ شمی اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ مگر اس کا دل بہت مضطرب رہا۔ اس نے بہت الجھن میں اس کو دلہن بنایا...... جس کی محبت میں وہ بری طرح گرفتار رہا تھا۔ اس نے اس کو پہچاننے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کی نظریں دھوکہ نہیں کھا سکتی تھیں...... اس کا دل بھی رینا بیگم کے الفاظ کو نہیں مان رہا تھا...... اس نے اس کے ایک ایک نقش کو اپنے ہاتھوں سے سنوارا...... اسے بہت محبت سے دلہن بنایا...... وہ واقعی خوبصورت لگ رہی تھی کہ وہ خود بھی اپنے آپ کو آئینے میں دیکھ کر مسکرانے لگی اور پرس میں سے پانچ ہزار کا نوٹ نکال کر اسے انعام دیا۔

سکندر علی خود اسے لینے آیا تھا...... اور اسے دیکھ کر وہ کتنا دیوانہ ہو رہا تھا یہ وہی جانتا تھا۔

شمی سے کوئی کام نہیں ہو رہا تھا۔ وہ بہت مضطرب اور پریشان ہو گیا تھا۔ وہ الجھا ہوا باہر نکلا......

کچھ خواتین آپس میں گفتگو کر رہی تھیں۔

"یہ فلسٹار رہ چکی تھی...... آج کل سکندر علی کے ساتھ اس کے اسکینڈلز کی خبریں پڑھنے اور سننے کو مل رہی ہیں......" ایک خاتون نے کہا۔

"ان لوگوں کو اسکینڈلز کی کیا پرواہ......؟ ویسے بھی اس کا تعلق بازار حسن سے ہے...... سنا ہے...... وہاں کی بہت مشہور طوائف تھی...... سب کچھ چھوڑ کر سکندر علی کے ساتھ آ گئی......" دوسری نے جواب دیا۔

"کیا دونوں نے شادی کر لی ہے؟" پہلی نے پوچھا۔

"کہاں......؟" دوسری نے طنزاً کہا۔

شمی سے مزید نہ سنا گیا اور وہ پارلر سے باہر نکل آیا۔ اس کے دل پر جو بھاری پتھر تھا وہ ہٹ گیا تھا......

رانی...... طوائف نہیں ہو سکتی...... وہ تو ناچ گانے کی کمائی کو حرام سمجھتی تھی...... ہمیں بہت نفرت سے دیکھتی تھی...... وہ خود بھی یہ کام نہیں کر سکتی...... میرے دل کو اس بات پر پکا یقین ہے" وہ خود بخود مسکرانے لگا اور مطمئن ہو گیا۔

☆

شوٹنگ کے بعد سکندر علی اسے ایک ریسٹ ہاؤس میں لے گیا جہاں ان دونوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ ایک کمرے کو خوبصورت تازہ پھولوں سے بھرپور انداز میں سجایا گیا تھا۔ وہ اتنی تیاری دیکھ کر چونکی۔

"یہ سب کیا ہے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"دلہن کا کمرہ......" وہ مسکرا کر بولا۔

"مگر...... یہاں تک آنے کے لئے جن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے...... وہ سب...... میرا مطلب ہے نکاح خواں اور لوگ جن کی شرکت شادی میں ضروری ہوتی ہے" وہ بولی۔

"وہ سب کچھ بعد میں بھی ہوتا رہے گا...... آج صرف ہم دونوں ہوں گے...... ان خوشبوؤں اور مہکتے پھولوں کے سنگ...... محبت کے سفر پر...... محبت سے قدم رکھیں گے" وہ اس کے قریب آیا اور اس کے گرد اپنے بازوؤں کا دائرہ تنگ کرتے ہوئے بولا۔

"مگر آپ نے ہمیں کچھ بھی نہیں بتایا تھا......" اس نے شکوہ کیا۔

"اگر زندگی میں سرپرائز ختم ہو جائے تو زندگی کا کیا مزا......؟ یہ سرپرائز ہے صرف آپ کے لئے" وہ مسکرا کر بولا۔

اور پھر اسے مزید سوالات کرنے کا موقع نہ دیا۔

وہ اپنے ساتھ جو جمع پونجی لائی تھی۔ سکندر علی نے کمال ہوشیاری سے اس کا سارا پیسہ ایک فلم بنانے میں لگوا دیا تھا۔ اس نے سکندر علی کے

ساتھ جتنی فلمیں کیں تھیں وہ کامیاب رہیں تھیں اور اس نے نئی فلم کے کامیاب ہونے کا بھی اسے یقین دلایا تھا۔ وہ ظاہراً خود ہی فلم کی پروڈیوسر، ہیروئن اور ڈائریکٹر تھی۔ مگر حقیقت میں سکندر علی اسے دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہا تھا۔ اسے فلم بنانے کا کوئی تجربہ نہ تھا وہ تو ہر بات میں سکندر علی پر اندھا اعتماد کرتی تھی اور سکندر علی اس اعتماد سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔ اس نے اس کی فلم کے بجٹ میں سے اپنی دو فلمیں بنالیں تھیں اور اس کی دونوں فلمیں کامیاب ہوئیں تھیں جبکہ ریتا کی اپنی فلم بری طرح ناکام ہوئی تھی..... سکندر علی کے ساتھ اس کے اسکینڈلز سے اخبارات بھرے ہوئے تھے..... اور سکندر علی ان خبروں سے لطف اٹھاتا تھا..... جبکہ وہ سب کچھ لٹانے کے باوجود بھی صرف ایک بات پر اصرار کرتی تھی کہ وہ اس سے شادی کرلے..... وہ انکار بھی نہیں کرتا تھا اور شادی کرنے کے لئے ٹالتا رہتا تھا۔

وہ دو ماہ سے اس کے ساتھ بنگلے میں رہ رہی تھی۔ وہ شادی کے لئے اصرار کرتی تھی اور وہ انکار کرتا تھا۔ سکندر علی اپنی نئی فلم کے سلسلے میں اچانک بیرون ملک چلا گیا تھا۔ ریتا اس کے یوں چلے جانے پر بے حد پریشان تھی۔ مگر اسے روک نہ سکی۔

اگلی صبح سکندر علی کی خوبصورت، جواں سال بیوی اپنے چار بچوں کے ساتھ اس کے بنگلے میں آئی اور آتے ہی اس نے توڑ پھوڑ شروع کر دی۔ ریتا نے اس کو روکنے کی کوشش کی مگر اس نے اسے بھی مارا اور دھکے دے کر اسے بنگلے سے نکال کر گیٹ بند کر دیا..... ریتا بہت پریشان ہوئی اور جلدی سے سکندر علی کا نمبر ملایا..... اور اس کی بیوی کے بارے میں بتایا۔

''وہ میری قانونی بیوی ہے..... اور اسے حق حاصل ہے کہ وہ اپنے گھر اور شوہر کو بچانے کے لئے جو چاہے..... کرے.....'' سکندر علی مسکراتے ہوئے بولا۔

''اور..... میں.....؟ میں کون ہوں؟'' ریتا نے حیرت سے پوچھا۔

''یہ سوال تم اپنے آپ سے پوچھو تو بہتر ہے'' اس نے جواب دیا۔

''دھوکے باز..... مکار..... میں تمہارے خلاف پریس کانفرنس کروں گی..... تمہیں ذلیل و رسوا کروں گی..... تمہارے سارے پول کھولوں گی'' وہ اسے دھمکی دیتے ہوئے بولی۔

''جو چاہو..... تم بھی کرلو..... مگر ثبوت کے بغیر تمہاری بات کون سنے گا..... رہی بات رسوائی کی..... تو میں اس سے نہیں ڈرتا..... ایسے کھیل میں بہت کھیل چکا ہوں..... اور تمہاری بات سنے گا کون..... تم کوئی شریف زادی نہیں ہو جس کے حقوق کے تحفظ کے لئے این جی اوز اٹھ کھڑی ہوں گی۔ تمہارا تعلق جس پیشے سے ہے..... اس میں نہ رشتے بنتے ہیں اور نہ رشتے داریاں نبھائی جاتی ہیں..... اس لئے بہتر یہی ہے کہ جہاں سے آئی ہو..... وہیں واپس چلی جاؤ'' سکندر علی نے اسے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

''کیسے چلی جاؤں..... تمہاری خاطر میں ساری کشتیاں جلا کر آئی تھی'' وہ بے بسی سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''کہیں نہ کہیں چور دروازہ بھی ہوتا ہے اس چور دروازے سے پھر داخل ہونے کی کوشش کرو..... اب تمہارے پاس کچھ نہیں..... نہ پیسہ..... نہ پیشہ..... لیکن اپنے پیشے سے پھر پیسہ بنانے کی کوشش کرو.....'' سکندر علی نے کہہ کر فون بند کر دیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس نے

کتنا بڑا دھوکہ کھایا تھا...... اس شخص پر اندھا اعتماد کیا تھا۔

ثمن بیگم کی ساری باتیں اس کے ذہن میں گونجنے لگی تھیں۔ سب نے کتنا سمجھایا تھا مگر وہ کچھ بھی سننے کو تیار نہ تھی...... محبت اور گھر کے تحفظ کے لئے اس نے اپنا سارا کچھ داؤ پر لگایا تھا اور اس کے ہاتھ کچھ بھی نہیں آیا تھا۔

وہ کہاں جائے گی......؟

کون اسے پناہ دے گا......؟

کون اسے ساتھ لگائے گا......؟

کون اسے تحفظ دے گا......؟

جگی یا کوثر......؟

جگی اور جگی والے تو خود کہیں گم ہو گئے تھے......

اب صرف کوثر باقی تھا......

اور اس کے بارے میں سوچ کر اس کا دل لرزنے لگا......

حوصلہ ٹوٹنے لگا...... اس کا وجود کرچی کرچی ہونے لگا۔

☆

شمی بہت مصروف تھا جب اس کا موبائل بار بار بج رہا تھا...... وہ نمبر دیکھتا تو کوئی غیر معروف نمبر تھا۔ وہ کال ریجیکٹ کر دیتا۔ پھر فون بجتا...... وہ ہیلو کہتا تو کال ڈراپ ہو جاتی۔ اس نے تنگ آ کر موبائل ہی بند کر دیا۔

برکتے کو اس کڑے وقت میں کوئی آسرا نظر نہیں آ رہا تھا جو مجو کو پولیس سے چھڑا کر لاتا۔ مجو اور بپو کا علاج کرانے میں اس کی مدد کرے۔ عجیب بے بسی کا عالم تھا۔ اس نے رازداری سے مٹھو کو شمی کا کارڈ دے کر اسے فون کرنے کو کہا تھا اور وہ مسلسل اسے فون کر رہا تھا مگر جب شمی نے موبائل بند کر دیا تو اس کی رہی سہی امید بھی دم توڑ گئی۔ برکتے بھی مایوس ہو گئی۔

''اماں...... پتہ نہیں وہ کون ہے؟ اور وہ بھلا ہماری مدد کیوں کرے گا......؟ ہمارے سگے باپ نے بچوں کا یہ حال کر دیا...... تو وہ غیر ہو کر ہمارے بارے میں کیوں سوچے گا؟ اماں تو بھی پاگل ہو رہی ہے'' مٹھو نے کہا تو برکتے نے اس کی طرف دیکھا اور پھر کچھ سوچنے کے بعد بولی۔

انسان کے دل میں جب دوسروں کے لئے ہمدردی، پیٹ اور آنکھوں میں کسی قسم کی بھوک نہ ہو تو وہ سب کے لئے فرشتہ ہوتا ہے۔ میرا دل کہتا ہے...... کہ وہ بھوکا اور کمینہ انسان نہیں...... تیرے باپ کی طرح...... وہ ضرور ہماری مدد کرے گا...... سن تو کل صبح اسے پھر فون کرنا'' برکتے نے مٹھو کو کہا تو وہ خاموش ہو گیا۔

بھاگی جب سے ہسپتال سے واپس آئی تھی اس نے واویلا مچا رکھا تھا۔ ملکے اور اس کے بچوں کو گالیاں بکتی...... مجو کو بددعائیں دیتی جس

نے اس کے بچے کو پیدا ہونے سے پہلے ہی مار دیا تھا۔ ملکا خاموش تھا۔ اس کے پاس کسی کے سوال کا کوئی جواب نہ تھا...... وہ غصے میں بپھری برکتے کے پاس گئی اور اس سے بھی لڑ جھگڑ کر اس کے چھوٹے بچوں کو مار پیٹ کر آئی۔ ہر وقت ہنگامہ برپا رکھتی......

مٹھو نے دوبارہ شمی کو صبح کے وقت فون کیا تو اس نے فون اٹھالیا...... مٹھو نے اس سے بات کی اور اپنی ماں کا حوالہ دیا تو شمی سوچ میں پڑ گیا۔

''کیا تم رانی کے بھائی ہو؟'' شمی نے پوچھا۔

''ہاں...... ہاں...... وہی......'' مٹھو نے خوش ہو کر جواب دیا۔

''ٹھیک ہے میں تمہارے بھائی کو چھڑانے کی بات کرتا ہوں اور تم اپنے بھائیوں کو لے کر میرے پاس آجانا...... میں ان کا علاج کرا دوں گا...... اماں کو بولنا فکر نہ کرے سب ٹھیک ہو جائے گا'' شمی نے اسے تسلی دی تو مٹھو خوش ہو گیا اور اگلے روز ہی وہ بھائیوں کو لے کر اس کی کوٹھی چلا گیا۔ اس نے شہر کے سب سے اچھے ہسپتال میں ان کو اپنے ڈرائیور کے ساتھ بھیجا...... پپو کی کٹی ٹانگ کا آپریشن کیا گیا اس کا زخم بہت بگڑ چکا تھا اور مجو کے کٹے ہاتھ کا بھی علاج کیا گیا...... چند روز بعد دونوں کی حالت کافی بہتر ہو گئی۔ ڈاکٹروں نے مصنوعی اعضاء ان کے جوان ہونے پر لگانے کو کہہ کر انہیں مطمئن کر دیا۔ مٹھو، بھائیوں کے ساتھ جتنے روز ہسپتال رہا۔ اس نے ان کے علاج اور کھانے پینے کا خرچا اٹھا رکھا تھا۔ جمو کو بھی جیل سے چھڑایا اور جب مٹھو واپس جانے لگا تو اس نے اسے روپے دیئے کہ وہ جا کر برکتے کا بھی علاج کرائے اور وہ چند روز تک ان سے ملنے آئے گا۔ ان کے جانے کے بعد اس نے عجیب طرح کی سرشاری اپنے اندر محسوس کی...... اسے یوں لگا جیسے اس نے رانی کا کچھ قرض ادا کر دیا ہو...... رانی نے اس کی زندگی بدلی تھی اور وہ بہت سے مجبور و بے بس لوگوں کی زندگیاں بدلنا چاہ رہا تھا...... وہ بہت سی سماجی تنظیموں کو فنڈ دیتا...... اور جو کوئی مجبور و بے آسرا و بیمار اس کے پاس مدد کے لئے آتا تو وہ کسی کو انکار نہ کرتا۔

ایسے وقت اسے استاد جمال بہت یاد آتا جس نے اس کے اندر انسانیت سے ہمدردی اور پیار کی شمع روشن کی تھی جس نے اسے 'نفس کشی' سکھائی تھی۔ اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتا...... دوسروں کی خوشیوں اور دکھوں کی پرواہ کرتا...... وہ مزاج کا سخت تھا مگر اس کا دل موم سے بھی زیادہ نرم تھا۔ شمی کو افسوس تھا کہ وہ استاد کے لئے کچھ بھی نہ کر سکا تھا۔ جب وہ سنگاپور سے واپس آیا تو اسلم نے اس کو اطلاع دی کہ اس کے جانے کے چند روز بعد ہی استاد کا انتقال ہو گیا تھا اور جو دو لاکھ روپے اس نے استاد کو دیئے تھے وہ امانت استاد نے مرنے سے پہلے اسلم کو دے دی تھی جب اسلم استاد سے آخری بار ملنے گیا تھا۔ استاد نے اس کی دی ہوئی رقم میں سے کوئی پیسہ بھی خرچ نہیں کیا تھا۔ اس نے شمی کا کسی طرح بھی احسان نہیں لیا تھا اس نے اسلم کے ذریعے بس اس کو ایک پیغام پہنچایا تھا۔

''قدم قدم پر تمہیں مجھ سے زیادہ پریشان اور دکھوں کے مارے لوگ ملیں گے...... بس ان کے دکھ کو اپنے اندر محسوس کرنا...... ممکن ہو سکے تو ایسے لوگوں کی مدد کرنا''

استاد کے پیغام کو اس نے اپنے دل کے ہر خانے میں محفوظ کر لیا تھا۔ وہ جب کسی ایسے بے بس انسان کو دیکھتا تو ضرور اس کی مدد کرنے کی کوشش کرتا اور بدلے میں دو چہرے اسے مسکرا کر دیکھتے اور وہ ان کی مسکراہٹ سے ہی خوش ہو جاتا...... ایک چہرہ رانی کا ہوتا اور دوسرا استاد جمالے

کا...... کبھی کبھار وہ شخص بھی ضرور اس کے ذہن میں آتا جس نے انتہائی بھوک کے عالم میں اسے دس روپے دیئے تھے۔ اس وقت وہ دس روپے اس کے لئے کتنی بڑی نعمت ثابت ہوئے تھے۔ اس کی قدر اس کا دل ہی جانتا تھا۔ وہ دس روپے حقیقت میں اس مشکل وقت میں اس کے اندر کی بھوک کو مٹانے میں کتنی بڑی مدد ثابت ہوئے تھے جو اس کے اندر کی تسکین کا باعث بنے تھے۔ ان روپوں نے اس کے دل میں اس شخص کی قدر و منزلت بڑھائی تھی اور اس کے اندر تشکر کا احساس پیدا کیا تھا۔ اس کے اندر تمام مردہ امیدوں اور آس کی دبی چنگاریوں کو دیئے کا کام دیا تھا۔ جب کوئی کسی کو مشکل وقت میں کچھ دیتا ہے تو اسے یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ دوسرے کے اندر کی دنیا میں کیا کردار ادا کر رہا ہے...... وہ لوگ جو بھکاری نہیں ہوتے اور جو اپنے بھرم کی خاطر خاموش رہتے ہیں مگر جن کی بے بسی ان کی آنکھوں سے ٹپکتی ہے اور یاسیت سے چہرے مرجھائے ہوتے ہیں...... وہ ایسی خاموش مدد سے اپنے اندر کیا کچھ محسوس کرتے ہیں۔ یہ صرف وہی جانتے ہیں...... جن کے اندر اس مدد سے بہت کچھ ٹوٹتا بھی ہے اور بہت کچھ پیدا بھی ہوتا ہے...... احساسات مجروح بھی ہوتے ہیں اور تشکرانہ احساسات جنم بھی لیتے ہیں...... وہ وقت اور وہ مدد اسے ساری زندگی نہیں بھولتے...... یاد آنے پر وہ دکھی بھی کرتے ہیں اور سرشار بھی...... انسان عجیب کیفیتوں سے گزرتا ہے...... وہ کسی کو بتانا بھی چاہتا ہے مگر بہت کچھ چھپانا بھی چاہتا ہے...... اور بہت کچھ چھپا کر وہ اپنا آپ اس میں چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ عجیب سی حالت ہوتی ہے...... شامو کو نہ وہ دس روپے کبھی بھولے...... نہ اس شخص کا چہرہ...... نہ استاد جمالا...... اور نہ ہی اس کی محبت...... نہ رانی...... اور نہ ہی وہ چاکلیٹ......" سب کچھ اس کے اندر محفوظ تھا...... ان احساسات نے اس کو اور بہت سے احساسات سے روشناس کرایا تھا مگر وہ پھر بھی اپنی جگہ جوں کے توں قائم تھے...... اسے جب بھی وقت ملتا ماضی کی بہت سی تلخ یادیں اسے ستانے لگتیں...... جب وہ نرگس، فردوس اور جمی کے ساتھ ناچتا تھا اور اس ناچ گانے کے دوران کتنی ذلت سہتا تھا...... لوگوں کی چھیڑ خانیاں اور بدتمیزیاں سہتا مگر ان تلخ یادوں میں صرف تین لوگوں سے وابستہ خوبصورت اور مثبت یادوں کو وہ اپنی زندگی کا کل سرمایہ سمجھتا۔ یہ یادیں اس کے لئے امید تھیں...... اس کے جینے کا سہارا تھیں...... اس کے لئے خوشی کا پروانہ تھیں...... اس کی سوچ کو مثبت رکھنے میں بنیاد ثابت ہوئیں تھیں...... ورنہ اس کی زندگی کا مقصد کیا تھا...... اس کے پاس اپنی ذات سے وابستہ نہ تو زندہ رہنے کی کوئی وجہ تھی اور نہ ہی وہ کسی کو اپنی زندگی کے لئے کوئی وجہ بنا سکتا تھا...... نہ بیوی...... نہ بچے...... نہ کوئی رشتے دار مگر بہت سے وقتی دوست...... جو اس کے ہنر کی وجہ سے اس کی عزت بھی کرتے تھے اور اس کے ساتھ دوستی بھی بناتے تھے...... اس کے پاس اپنا تو کچھ بھی نہیں تھا...... سوائے تین چہروں اور ان کی یادوں کے...... اس کے سامنے کوئی منزل نہیں تھی...... وہ بس چلا جا رہا تھا جب تک زندگی ساتھ دے گی...... اور اس نامعلوم منزل تک پہنچنے میں اسے جس عزم، حوصلے اور ہمت کی ضرورت تھی وہ اسے اپنے اندر ان چہروں سے ملتی تھی۔

☆

برکتے اس کے لئے دن رات دعائیں کرتی...... اٹھتے بیٹھتے اس کی سانسوں سے بھی شامو کے لئے دعائیں نکلتیں...... بھاگی نے جمو کے رہا ہونے پر بہت شور مچایا تھا۔ ملکے سے جی بھر کر لڑی تھی...... اور جمو کے ساتھ پھر مار کٹائی کی کوشش کی تھی۔ مٹھو، برکتے کو خود ہسپتال لے کر گیا اور اس کا علاج کروانا شروع کیا۔ اس کی حالت بھی بہتر ہونے لگی تھی وہ چھڑی کے سہارے چلنا شروع ہو گئی تھی۔ اس کی شدید خواہش تھی کہ وہ ایک بار شامو

سے ضرور ملے......اور اس سے پوچھے کہ وہ ان سے اتنی ہمدردی کیوں کرتا ہے......اس نے ان کا اتنا ساتھ کیوں دیا ہے؟ وہ رانی کا پوچھنے آیا تھا...... نجانے وہ رانی کو کیسے جانتا تھا......شاید وہ رانی کی خاطر سب کچھ کر رہا تھا......مگر اس نے کچھ بھی نہیں بتایا تھا......رانی کتنی بدقسمت ہے جو اس نے اتنے ہمدرد انسان کو کھو دیا......اور پھر خود بھی کہیں گم ہو گئی......نجانے کہاں......؟

برکتے کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے......گڈی کو قبر میں اتار کر وہ دکھی تھی مگر مطمئن بھی تھی......لیکن رانی کو کھو کر وہ بہت بے چین اور مضطرب تھی......رانی کا سوچ کر وہ پریشان اور بے قرار ہو جاتی......

نجانے کہاں چلی گئی ہے......؟

کاش! وہ ایک بار آ جائے......

وہ دل ہی دل میں گڑگڑا کر دعا کرتی اور روتی رہتی۔

''مٹھو...... یہ دیکھ، اس فلمی لڑکی کی شکل ہماری رانی سے کتنی ملتی ہے'' شبو نے اخبار کا ایک چرمرایا ٹکڑا مٹھو اور جمو کے آگے کرتے ہوئے کہا۔ جو فلمسٹار رینا کے ایک فلمی کلوز اپ کا تھا۔

''شکل ملتی ہے...... پر...... یہ وہ نہیں'' مٹھو نے منہ بنا کر کہا۔

''ہاں......وہ تو پتہ نہیں کہاں چلی گئی......کبھی کبھی مجھے سوتے میں خواب آتا ہے......جیسے اسے کسی بڑے سے مگرمچھ نے کھا لیا ہو'' شبو نے معصومیت سے کہا۔

''ہاں......تو کھا ہی لیا ہوگا......ورنہ واپس نہ آ جاتی'' مٹھو جواب دیتا تو وہ خاموش ہو جاتی اور اس چرمر کاغذ کو سنبھال کر اپنی چیزوں کے ساتھ رکھ دیتی......جن کو وہ کسی کو بھی ہاتھ نہیں لگانے دیتی تھی۔

''رانی مر چکی ہے اور اب کبھی واپس نہیں آئے گی'' ملکے نے سب بچوں کے ذہن میں اس بات کو پکا کر دیا تھا اور اب کوئی بھی اس بات کو سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا کہ وہ زندہ ہے اور کبھی آ جائے گی......سوائے برکتے کے......

☆

رینا بیگم اپنا سب کچھ لٹا کر پھر اس حویلی کی طرف لوٹ رہی تھی......جس کو اس نے یہ سوچ کر چھوڑا تھا کہ اب وہ کبھی دوبارہ یہاں لوٹ کر نہیں آئے گی۔ وہ بھاری دل اور بوجھل قدموں کے ساتھ گلی میں داخل ہوئی اچھو حسب معمول ہار پرو رہا تھا......رینا اس کے پاس کھڑی ہو کر اسے دیکھنے لگی......اچھو نظریں جھکائے اپنے کام میں مصروف رہا......جیسے جان بوجھ کر اسے نظرانداز کر رہا ہو......اس نے آہ بھری اور سیڑھیاں چڑھنے لگی......اچھو نے ایک ٹک اسے دیکھا اور گہری سانس لی۔

اسے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اچھو کے الفاظ یاد آنے لگے ''جو ایک بار یہ سیڑھیاں چڑھتا ہے......وہ مر کر ہی اترتا ہے'' اور اس نے جیتے جی ان سیڑھیوں سے اترنے کی کوشش کی تھی مگر نجانے ان سیڑھیوں میں کوئی مقناطیسی کشش تھی جو انہیں پھلانگنے والوں کو پھر اپنی طرف کھینچ لاتی

تھی...... وہ مایوسی سے سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر پہنچی تو شیریں بائی بڑی شان اور تمکنت سے اس کی جگہ مسہری پر بیٹھی تھی۔ چمن بیگم اسے پان کی گلوری بنا کر دے رہی تھی۔ اسے اچانک اپنے سامنے دیکھ کر دونوں چونک گئیں اور اسے سر سے لے کر پاؤں تک گھورنے لگیں...... اس کا حلیہ بگڑا ہوا تھا...... چہرہ مرجھایا ہوا اور اداس آنکھیں اس کے اندر کی ویرانی کی داستان سنا رہی تھیں۔

''آ...... آپ؟'' چمن بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

جواباً وہ خاموش رہی اور سر جھکا لیا۔

''آپ دوبارہ یہاں کیوں آئی ہیں؟ آپ کو جانے سے پہلے سب نے کتنا سمجھایا تھا کہ یہاں آنے والے مرد...... ناقابلِ اعتبار ہوتے ہیں...... وہ خواب تو آنکھوں میں بھرتے ہیں مگر تعبیر دینا ان کے بس میں نہیں ہوتا...... وہ تتلیوں سے ان کے رنگ بھی چھین لیتے ہیں اور ان کے پروں کو بھی نوچ ڈالتے ہیں اور جب وہ بے دم ہو کر گر جاتی ہیں تو انہیں تڑپتا ہوا چھوڑ جاتے ہیں...... طوائفوں کے ساتھ شروع سے یہی ہوتا آرہا ہے مگر ہر طوائف ہر بار دھوکہ کھا جاتی ہے...... یہ سوچ کر...... کہ...... اس کی زندگی میں آنے والا مرد سب مردوں سے مختلف ہوگا...... وہ اس کے ساتھ برا نہیں کرے گا...... مگر وہ تب اس پر یقین کرتی ہے...... جب وہ کسی قابل نہیں رہتی...... یقیناً آپ کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔'' شیریں بائی نے کہا۔

''ہاں......'' وہ مایوسی سے بولی۔

''کیا ہم نے آپ کو جانے سے پہلے سب کچھ نہیں سمجھایا تھا......؟'' چمن بیگم نے پوچھا۔

''ہاں......'' وہ آہ بھر کر بولی۔

''اور...... اب آپ دوبارہ یہاں آگئی ہیں؟'' شیریں بائی نے کہا۔

''ہاں'' اس نے جواب دیا۔

''جبکہ آپ اچھی طرح جانتی ہیں۔ اب آپ کے لئے یہاں کچھ بھی نہیں ہے...... نہ وہ مقام...... نہ وہ شان و شوکت اور نہ ہی وہ عزت...... جو اس حویلی نے آپ کو دی تھی'' شیریں بائی نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''ہاں......'' اس نے گہری سانس لیتے ہوئے چاروں طرف دیکھ کر کہا۔

''اب آپ یہاں کیا لینے آئی ہیں؟'' شیریں بائی نے پوچھا۔

''طوائف کو...... کوٹھے کے علاوہ اور کہیں پناہ نہیں ملتی'' اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

شیریں بائی نے چمن بیگم کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھا۔

''آپ کیا سوچ کر یہاں آئی ہیں؟'' شیریں بائی نے قدرے توقف کے بعد پوچھا۔

''زندگی کی آخری سانسوں تک سر چھپانے کے لئے، اس کے علاوہ اور کوئی ٹھکانہ نہیں'' اس نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''کس حیثیت سے......؟ کیا آپ وہی مقام دوبارہ حاصل کرنا چاہتی ہیں جواب میرے پاس ہے'' شیریں بائی نے کہا۔

"نہیں..... میں کوئی مقام حاصل نہیں کرنا چاہتی..... ملازمہ کی حیثیت سے بھی رہ لوں گی اور..... طوائف کی حیثیت سے بھی آپ جو چاہیں" اس نے آہ بھر کر جواب دیا۔

چمن بیگم نے شیریں بائی کے کان میں کچھ کہا اور شیریں بائی نے اس کی طرف بغور دیکھا۔

"ٹھیک ہے..... حویلی کے پچھواڑے میں آپ طوائفوں کے ساتھ رہ سکتی ہیں اور جب آپ کے رقص کی باری ہوا کرے گی..... ہم آپ کو اطلاع دے دیں گے..... اس کے علاوہ آپ نہ ہم سے کچھ طلب کریں گی اور نہ ہی آپ کو کچھ دیا جائے گا" شیریں بائی نے دوٹوک الفاظ میں کہا۔

اس نے گہری سانس لی اور خاموشی سے چمن بیگم کے ساتھ سیڑھیاں اتر کر حویلی کے پچھواڑے میں چلی گئی۔

☆

برکتے نے جب سے آہستہ آہستہ چھڑی کے سہارے چلنا شروع کیا تھا اس نے اپنے بچوں کو بھی اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں ان کی ہمت بندھائی تھی۔ سب بچوں نے برکتے کے ساتھ مل کر ملکے کے ساتھ تعلقات ختم کر لیے تھے۔

"تم لوگ بھکاریوں کے گھر پیدا ضرور ہوئے ہو..... مگر یہ ضروری نہیں کہ ساری زندگی بھیک مانگ کر بھکاری ہی رہو..... جو انسان محنت کے سہارے زندگی میں آگے بڑھنا چاہتا ہے..... رب ضرور اس کی مدد کرتا ہے..... محنت کی راہ مشکل ضرور ہوتی ہے مگر پیٹ کی بھوک کو سکون محنت کی روٹی ہی دیتی ہے..... لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلانے سے بہتر ہے رب کے آگے ہاتھ پھیلاؤ..... وہ پیٹ بھر کر روٹی بھی دے گا اور سکون بھی" برکتے نے سارے بچوں کو سمجھایا تھا۔ جگو اور منو بھی بھیک مانگ مانگ کر تنگ آ گئے تھے۔ ماں کے کہنے پر جگو نے ڈرائیوری سیکھ لی۔ منو نے ایک ورکشاپ میں کام شروع کر دیا۔ شبو نے لوگوں کے گھر صفائی کرنے کا کام شروع کر دیا۔ پپو اور جگو گھر میں ماں کے پاس رہ کر پڑھائی کرنے کی کوشش کرتے۔

جلد ہی انہوں نے شہر سے باہر ایک کچی بستی میں ایک چھوٹا سا پکی اینٹوں والا گھر کرائے پر لے لیا۔ سب کمائی کرنے لگے اور روز بروز ان کے حالات بہتر ہونے لگے۔

ملکا اور بھاگی جھگی میں ہی رہ گئے..... دونوں دن بھر بھیک مانگنے نکلتے..... شام کو گھر لوٹتے..... صبح جانے سے پہلے گالی گلوچ اور لڑائی جھگڑا ہوتا..... رات سونے سے پہلے پھر لڑائی جھگڑا اور مار کٹائی ہوتی..... بھاگی اسے کوستی جس نے اسے ورغلا کر اس سے شادی کی تھی اور پھر اس کی زندگی خراب کی تھی..... اس کے ہاں پھر کوئی بچہ پیدا نہ ہوا تھا اور اس کی ذمہ دار بھی وہ ملکے اور بچو کو ٹھہراتی مگر اسے کبھی یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ اس نے گڈی کو کس طرح تباہ کیا تھا..... وہ مطمئن تھی..... اسے صرف شکوے تھے..... وہ ہر ایک سے شکوے کرتی رہتی..... برکتے اور اس کے بچوں کے بارے میں سن کر اسے ہمیشہ حسد ہوتا تھا اور وہ جلن کے مارے پھر ملکے کے ساتھ جھگڑنا شروع کر دیتی..... یہی ان کے روز و شب کا معمول تھا۔

☆

شامو کے گھر سے جانے کے بعد فردوس نے کچھ ہیجڑوں کے گروپ میں شامل ہونے کی کوشش کی مگر اس کی بڑھتی عمر اور چہرے کی جھریوں کو میک اپ کی دبیز تہیں بھی نہیں چھپا سکیں اور بڑے شہر کے ہیجڑوں کے گروہ میں پڑھے لکھے نوجوان لڑکے بھی اپنی مرضی سے شامل ہو کر ناچ

گانے کی محفلوں میں شرکت کر کے کمائی کرتے۔ وہ سب بہت ماڈرن اور فیشن ایبل تھے۔ فردوس کی آواز، فیشن، کپڑوں اور میک اپ کو سب ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے...... اس کے لئے وہاں رہنا بھی مشکل ہو گیا...... وہ اپنے طور پر شادی بیاہ کی محفلوں میں جا کر ناچ گانا کرنے کی کوشش کرتی مگر وہاں بھی قسمت اس کا ساتھ نہ دیتی۔ وہ شہر سے باہر چند ہجڑوں کے ساتھ رہتی تھی۔ جو اس سے کھانے پینے اور گھر کا کرایہ بھی مانگتے تھے اور اسے اخراجات پورے کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی کام کرنا پڑتا تھا...... وہ تنگ آ گئی تھی۔ روزی روٹی کا کوئی وسیلہ نہیں بن رہا تھا اور شامو کے پاس جا کر کچھ مانگتے ہوئے اسے شرم آتی تھی۔

شامو کے پاس فرصت کم ہی ہوتی تھی۔ وہ جب بھی ڈرائیور کے ساتھ جا رہا ہوتا تو متلاشی نگاہوں سے کسی کو ادھر ادھر دیکھتا...... ہر بھکارن کو چونک کر بار بار دیکھتا، اسے امید تھی کہ کسی روز کہیں سے رانی بھیک مانگتی ہوئی آ جائے گی اور وہ اسے اپنی گاڑی میں بٹھا کر اپنے محل نما گھر میں لے آئے گا اور پھر اسے اپنے اس گھر کی ''رانی'' بنا کر رکھے گا۔ وہ اپنا سب کچھ اسے سونپ دے گا...... کہ...... اس کا سب کچھ...... اسی کا تو ہے...... وہ تو اس کی امانت کی حفاظت کر رہا تھا...... وہ اسی امید پر جی رہا تھا ہر ٹریفک سگنل پر اسے تلاش کرتا۔

وہ ایک بڑے شاپنگ سنٹر میں شاپنگ کے لئے گیا۔ اس نے اچانک فردوس کو میلا سا دوپٹہ اوڑھے ہوئے بھیک مانگتے ہوئے دیکھا۔ وہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلا کر بھیک مانگتی...... اور جب کوئی من چلا اس طرف بغور دیکھتا تو اس کو چھیڑ کر کہتا۔

''پہلے ٹھمکا لگا......''

وہ پہلے اسے گالیاں بکتی۔ جب وہ پچاس یا سو کا نوٹ دکھاتا تو وہ سرعام ناچنا شروع کر دیتی...... لڑکے اور مرد اس کے گرد اکٹھے ہو جاتے اس سے چھیڑ خانیاں کرتے اس کے ساتھ گھٹیا مذاق کر کے اسے پیسے دیتے اور وہ پیسوں کو جھپٹ کر اپنے دوپٹے کے پلو میں باندھ کر وہاں سے فرار ہو جاتی......

شامو نے اسے یہ سب کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور اسے سخت دکھ ہو رہا تھا...... جب وہ مجمع میں سے بھاگ رہی تھی تو شامو نے اس کو آواز دی...... مگر فردوس نے چونک کر اسے دیکھا اور اپنی چادر سے چہرہ چھپا کر تیزی سے بھاگ کھڑی ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گئی...... شامو انتہائی مایوسی اور غم کے عالم میں ایک ویران گوشے میں چند سیڑھیوں میں سب سے اوپر والی سیڑھی پر بیٹھ گیا۔ اس کا دل شدت غم سے پھٹ رہا تھا۔

''انسان اس پیٹ اور بھوک کے ہاتھوں کتنی ذلت سہتا ہے...... کتنا رسوا ہوتا ہے اور کتنا بے عزت'' شامو کی آنکھوں سے آنسو شدت سے رواں ہونے لگے۔ اس نے ارد گرد گھومتے پھرتے، کھاتے پیتے خریداری کرتے لوگوں کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔

اندر سے بہت سے انسانوں کے دکھ ایک جیسے ہیں...... مگر باہر سے سب دوسروں سے کتنے بے نیاز ہیں...... ہر ایک کا غم اس کا اپنا غم ہے...... اور...... ہر ایک کی زندگی اس کی اپنی زندگی ہے...... اور ہر ایک کی خوشی اس کی اپنی خوشی ہے...... ہر ایک کی اپنی دنیا ہے...... اور یہ دنیا کتنی ویران ہے...... یا خوش ہے...... اس کی خبر وہ کسی دوسرے انسان کو نہیں دینا چاہتا...... مگر پھر بھی یہ راز کسی نہ کسی طرح افشا ہو جاتا ہے...... اندر چھپے غم ابلتے لاوے کی طرح بہنے لگتے ہیں۔

جب کوئی ٹوٹا دل...... کسی زخمی دل کی چھوٹی سی بات پر اس کی طرف چونک کر دیکھتا ہے...... تو اس کا چہرہ اور آنکھیں اندر کی اس کیفیت کو بیان کر دیتی ہے...... کتنا سنبھل کر ایک دوسرے سے غم چھپانے والے پھر کہیں نہ کہیں مل جاتے ہیں۔

انسان کو انسان سے فرار ممکن نہیں۔

جیسے

نفس کو روح سے...... اور

روح کو جسم سے...... اور

جسم کو اس کی ضروریات سے...... اور

ضروریات کو طلب سے...... اور

طلب کو خواہش سے...... اور

خواہش کو حرص و لالچ سے...... اور

حرص و لالچ کو بھوک سے...... اور

جب کسی شے کی 'بھوک' بڑھتی چلی جاتی ہے تو وہ انسان کو اندر سے ایسا مضطرب کرتی ہے کہ وہ سب کچھ بھول جاتا ہے اسے یاد رہتا ہے تو اپنا 'وجود'...... جسے بچانے کے لیے وہ سر دھڑ کی بازی لگا دیتا ہے...... اور جب وہ بازی بھی ہار دیتا ہے...... تو پھر اسے احساس ہوتا ہے کہ اس کی 'بھوک' تو جوں کی توں اس کے اندر موجود تھی...... اور...... ہے...... اس بھوک کو مٹانے کے لیے اس نے جتنی کوششیں کیں۔ سب رائیگاں گئیں۔ وہ 'احساس زیاں، پھر اسے مضطرب کرنے لگتا ہے۔ 'اضطراب' سے 'اضطراب' تک کا سفر پھر جاری رہتا ہے اور انسان کو اس سے نہ فرار مل پائی ہے اور نہ ہی قرار۔

......❁......

# (۲۰)

ماسٹر باسط علی نے واپس جانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ سائیں مٹھا اور اس کی باتیں اٹھتے، بیٹھتے ان کے اندر سلگتی چنگاریوں کو بھڑکانے میں کامیاب ہو گئی تھیں۔ اب وہ آگ دن بدن ایسے الاؤ میں تبدیل ہو رہی تھی، جس کے شعلے ہر لحہ بلند ہو کر ان کے دماغ کے خلیوں کو جھلسا رہے تھے۔ اک ایسی آگ بھڑکی تھی جو کسی پل اسے سکون نہیں لینے دے رہے تھی۔ سکون پانے کے لئے وہ اپنا شہر چھوڑ کر دور پہاڑوں میں آ کر بسا تھا۔ نازی کو طلاق دینے کے بعد وہ صرف چند ماہ اس شہر میں رہا تھا۔ ملازمت بھی دلجمعی سے نہ کر سکا اور اسے جلد فارغ کر دیا گیا۔ ایک دو اور نوکریاں کیں مگر اندر کے اضطراب نے اسے کوئی بھی کام ٹھیک طرح سے نہ کرنے دیا۔ اس نے والدین سے ملنے گاؤں جانا چاہا، مگر ہمت نہ کر پایا کہ ان کا سامنا کیسے کر پاتا کئی شہروں میں خوار ہو کر وہ ان پہاڑوں میں آ بسا تھا۔ شہر کے ہنگاموں سے بہت دور، سکون کی تلاش میں۔ چند سو نفوس پر آباد بستی میں ملے جلے لوگ رہتے تھے، مگر سب ایک دوسرے سے بہت محبت اور عزت سے پیش آتے تھے۔ اس نے سکول میں ٹیچر کی نوکری کر لی تو اس کی عزت میں اور اضافہ ہو گیا...... یہاں سب کچھ تھا۔ خوبصورت قدرتی نظارے اور خوبصورت چہروں والے لوگ، مگر اس کا دل یونہی بے سکون رہتا۔ اذیت کے جن لمحات میں سے گزر رہا تھا، اس کی تکلیف کا سوائے اس کے اور خدا کے کوئی اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔

''ماسٹر صاحب، بہت اچھے اور نیک انسان ہیں، ان جیسا کوئی دوسرا انسان اس بستی میں نہیں۔ ماسٹر صاحب بے ضرر انسان ہیں، وہ کسی کو، کوئی اذیت دیں، اس کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔'' بستی کے ہر شخص کے ان کے بارے میں ایسے ہی خیالات تھے۔ انہیں یہاں بہت عزت ملی تھی...... مگر سائیں مٹھا نجانے کہاں سے آ گیا...... اور ان کی چوری پکڑنا شروع کر دی، وہ بوکھلا گئے۔ پچھلے چند ماہ سے سائیں کی باتوں نے ان کے اندر کو اس قدر بھڑکا دیا تھا کہ اب فرار ممکن نہیں تھی اور یہی سوچ کر انہوں نے واپس جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اپنے فیصلے پر بہت سوچا تھا، بہت دفعہ ہمت ہاری تھی، کئی بار اپنے آپ کو حوصلہ دیا تھا اور بالآخر انہوں نے اپنی کٹیا میں اپنے سامان کو سمیٹنا شروع کر دیا تھا۔ سارا سامان سمیٹ کر اس نے پھر بکھیر دیا۔ ''مجھے ان چیزوں کی کوئی ضرورت نہیں...... بھلا زندگی چیزوں کی محتاج ہوتی ہے......؟

''پھر زندگی کس کی محتاج ہوتی ہے......؟''

''انسان کی......؟''

''اور انسان...... کس کا...... محتاج ہوتا ہے......؟''

وہ سوچ میں ڈوب گیا......

''انسان کس کا محتاج ہوتا ہے......؟''

بار بار ان کے ذہن میں سوال گونجنے لگا، سوچ سوچ کر ان کا دماغ پھٹنے لگا۔

''شاید......انسان......انسان کا محتاج ہے۔''

''نہیں......بالکل بھی نہیں۔''

پھر......کس کا......؟

''شاید دنیا کا......''

''دنیا کا......نہیں......کبھی بھی نہیں'' ان کے ذہن نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔

''پھر......کس کا......؟''

وہ کٹیا کا دروازہ کھول کر باہر آ گیا اور ارد گرد سر سبز و شاداب اونچے، نیچے پہاڑوں، نیلگوں آسمان اور پہاڑوں کے وسط میں خوبصورت پھلدار درختوں اور رنگ برنگی پھولوں پر نظر دوڑانے لگا...... ہر چیز ایک سوال بن ان کے ذہن میں ابھری......اور وہ اپنے آپ سے الجھنے لگی۔

''میں اپنے ایک سوال کا جواب نہیں دے سکتا...... میں کس قدر کند ذہن انسان ہوں۔ اس قدر لاعلم......مجھ سے اچھا تو سائیں مٹھا ہے......ان پڑھ......گنوار انسان......ایسی باتیں کرتا ہے کہ میں سوچ میں ڈوب جاتا ہوں اور مجھے کسی بھی بات کا کچھ علم نہیں......ساری زندگی اپنے آپ سے لڑنے جھگڑنے میں گزاری اور حاصل کیا ہوا......؟ کچھ بھی نہیں......!

میں اپنے سوالوں کا خود جواب نہیں دے سکتا......میں کیسا بے علم انسان ہوں......یوں لگتا ہے......زندگی کا سفر اکارت گیا ہے۔'' ان کے اندر کے اضطراب اور چبھن میں بہت اضافہ ہونے لگا، وہ پریشان ہو کر سڑک پر چلنے لگے۔ ایک درخت کے نیچے سائیں مٹھا چھوٹے بچوں میں کوئی چیز بانٹ رہا تھا اور بچوں نے اسے گھیرا ڈال رکھا تھا۔ ماسٹر باسط حیرت سے انہیں دیکھنے لگے اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے سائیں کے پاس آ گئے۔

''اب تم لوگ جاؤ......کل آنا......جاؤ......اب......چلے جاؤ۔'' سائیں نے نرم لہجے میں بچوں کو کہا اور سب چلے گئے۔

''اب کیوں پریشان ہو رہے ہو......ماسٹر......؟ سائیں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ایک سوال نے الجھا دیا ہے......'' ماسٹر باسط علی نے جواب دیا۔

''صرف ایک سوال نے......؟ تمہارا تو ہر سوال تمہیں الجھاتا ہے......اوپر دیکھو......تمہارے سوال کا جواب اس میں ہے۔'' سائیں نے آسمان کو دیکھتے ہوئے کہا تو ماسٹر باسط علی نے چونک کر اوپر دیکھا۔ وسیع نیلگوں آسمان سے ان کی نگاہیں یوں ٹکرائیں جیسے پہلی بار وہ اسے دیکھ رہے ہوں۔ وہ اپنی نظریں اس پر یوں دوڑا رہے تھے جیسے کسی کی تلاش میں کوئی ادھر ادھر دیکھتا ہے۔ انہیں یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ پہلی بار آسمان کو دیکھ رہے ہوں یا پھر پہلی بار اس خاص نظر سے دیکھ رہے ہوں۔ اس نظر میں نجانے کہاں سے اتنی جستجو اور عجیب سی لذت بھر گئی تھی کہ وہ خود حیران رہ گئے۔ شاید سائیں کی فیض نظر انہیں بہت کچھ دکھا رہی تھی......یا پھر......کوئی اور......؟ آسمان کی وسعتوں کو دیکھتے ہوئے ان کے دل کے اندر اتنی وسعت پیدا ہو رہی تھی کہ انہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ان کے اندر کیا شے وسعت پا رہی ہے۔ دل کے دریچے یوں کھل رہے تھے جیسے روشنی کی کوئی کرن تاریک

تھوں کے اندر گھس کر اسے روشن کرتی جاتی ہے۔ ماسٹر باسط علی کے دل ونگاہ میں عجیب سی وسعت پیدا ہو رہی تھی۔

"یہ...... میں کیا دیکھ رہا ہوں...... اور میرے اندر کیا ہو رہا ہے؟ ماسٹر باسط علی نے چونک کر سوچا اور سائیں کی جانب دیکھا...... سائیں کے لبوں پر مسکراہٹ نمایاں تھی اور آنکھوں میں ویسی ہی چمک تھی جیسی وہ اپنے دل کے اندر محسوس کر رہا تھا۔

"سناؤ...... ماسٹر...... کیا نظر آیا؟" سائیں نے پوچھا۔

"وہ...... وہ...... وہ ہکلانے لگے اور اپنے چہرے پر آنے والا پسینہ اپنے ہاتھ سے صاف کیا۔"

"معلوم نہیں...... کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" ماسٹر باسط نے کہا۔

"چلو...... جو کچھ سمجھ میں آیا ہے۔ اسی کو سمجھ لو۔" سائیں نے ہنس کر کہا۔

"میں کچھ بتا نہیں سکتا۔" ماسٹر باسط علی نے کہا۔

"جو سمجھ میں تو آئے...... مگر...... کوئی بتا نہ پائے...... وہی تو حق، سچ ہے۔" سائیں نے پھر آسمان کی طرف دیکھ کر قہقہہ لگایا۔

"کیا مطلب......؟"

"انسان بھی تو کہتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو بہت سمجھتا ہے...... مگر جب اس کی حقیقت پوچھو تو گھبرا جاتا ہے...... بھولے بادشاہ...... اگر انسان اپنے آپ کو سمجھ گیا، تو اس کو سمجھ گیا...... جو اپنے آپ کو نہ سمجھ پایا تو اس کو کیا سمجھے گا......" سائیں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں...... سائیں جی آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں...... انسان کو سمجھنا واقعی بہت مشکل ہے...... اور اپنے آپ کو سمجھنا اس سے بھی مشکل۔"

ماسٹر باسط علی آہ بھر کر کہا۔

"ارے...... کچھ بھی مشکل نہیں...... روشنی کی ایک کرن، خوشبو کا جھونکا اور آگ کی ننھی سی چنگاری۔ بہت کچھ کر سکتی ہے۔ جب وہ دل کے اندر اپنے "نور" کی کرن داخل کرتا ہے تو سب کچھ روشن ہو جاتا ہے اور جب معرفت کی روشنی عشق کی آگ کو بھڑکاتی ہے تو سب کچھ بھسم ہو جاتا ہے...... نہ جسم، نہ جان باقی رہتی ہے...... صرف عشق اور...... روح۔ روح عشق کی طاقت سے اس تک پہنچ جاتی ہے۔

| | |
|---|---|
| ایمان سلامت ہر کوئی منگے | عشق سلامت کوئی |
| منگن ایمان، شرماون عشقوں | دل نوں غیرت ہوئی ہو |
| جس منزل تے عشق پہچاوے | ایمان خبر نہ کوئی ہو |
| عشق سلامت رکھیں باہو | دیاں ایمانوں دھروئی ہو |

ماسٹر باسط علی نے گہری سانس لی اور خاموشی سے سائیں کی طرف دیکھنے لگے۔

"جا...... اک منزل تیری راہ دیکھ رہی ہے۔ کیوں وقت ضائع کرتا ہے...... اگر تو ٹھہر گیا تو پھر ساری زندگی کے لئے ٹھہر جائے گا۔ جا...... اپنے عشق کو ڈھونڈ...... تیرے اندر ہی کہیں چھپا ہے، مگر تجھے نظر ہی کچھ نہیں آ رہا۔ سائیں نے کہا تو ماسٹر باسط علی نے گہری استفہامیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''تو جس سفر پر جا رہا ہے...... چلا جا...... دیر کیوں لگا رہا ہے...... تجھے کس کا انتظار ہے......؟'' سائیں نے کہا۔

''ہاں...... میں نے ارادہ کر لیا ہے'' ماسٹر باسط علی نے جواب دیا۔

''صرف ارادہ......؟ تجھے تو سفر کر لینا چاہئے۔

اگر تو نے اسے کھو دیا، تو بہت کچھ کھو دو گے۔ بہت کچھ...... بہت کچھ۔'' سائیں بولتا ہوا اور چھن چھن کرتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

ماسٹر باسط علی اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہ گئے۔ ان کے دل کی دنیا میں بہت بڑی تبدیلی آ رہی تھی۔ قلب و روح میں بہت بڑی تبدیلی آ رہی تھی۔ قلب و روح میں اک عجیب سا اضطراب پیدا ہو گیا تھا۔ اک عجیب سی ہلچل مچی تھی۔ اک ہنگامہ سا برپا تھا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ مضطرب ہو کر اپنی کٹیا میں واپس لوٹ آئے۔

☆

نازی اور تیمور بے حد خوش تھے۔ دونوں کورٹ میرج کرنے کے بعد حجلۂ عروسی میں بیٹھے تھے۔ دونوں کے دل خوشی اور مسرت کے جذبات سے سرشار ہو رہے تھے۔ نازی اس سے قبل دو دفعہ سیج پر بیٹھی تھی مگر ہر بار اس کے جذبات مختلف تھے۔ شاہ زیب کی سیج پر وہ بہت دکھی دل کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس کے جذبات بری طرح مجروح ہوئے تھے اور اس کا دل مسلسل رو رہا تھا۔

باسط علی کی سیج پر بیٹھے ہوئے وہ خوش بھی تھی اور مشکوک بھی۔ باسط علی کے بدلے رویے نے اس کے دل کی خوشی کو گرہن لگا دیا تھا۔ اس کی خوشی ماند پڑ چکی تھی اور اب تیمور کی سیج پر بیٹھے ہوئے، اس کی قلب و روح سرشار تھی، کیونکہ اس کے سامنے وہ شخص بیٹھا تھا جو اسے...... سب سے زیادہ چاہتا تھا اور نازی کو اپنی پوری زندگی میں یہی بات تو عزیز تھی کہ کوئی اس کی بھرپور پذیرائی کرے۔ اس کی محبت کا بھرپور جواب دے، بلکہ اس سے بھی زیادہ...... وہ جس طوفانی اور جذباتی محبت کی خواہشمند تھی۔ تیمور نے اس سے ایسی ہی محبت کی تھی اور اب وہ اس محبت سے سرشار ہونے جا رہی تھی۔

شعیب کا گھر چھوڑنے کے بعد تیمور نے اس شہر میں اپنے ایک دوست کے ہاں ملازمت کر لی تھی اور دوست کی وساطت سے ایک گھر کرائے پر لے کر سب سے پہلے شادی کی تھی۔ دونوں نے بہت محبت سے گھر کو سجایا تھا اور اپنی سیج بھی خود ہی سجائی تھی اور اس کو سجاتے ہوئے دونوں کتنے خوش تھے۔ کوئی اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔

نازی عروسی لباس میں بے حد خوبصورت لگ رہی تھی۔ گلاب کی خوبصورت ادھ کھلی کلی کی مانند نرم و نازک...... اب کی بار اس نے نہ تو زیادہ قیمتی زیورات پہن رکھے تھے اور نہ ہی اس کا لباس، بہت قیمتی تھا، مگر اس کے چہرے پر پھیلے خوبصورت قوس و قزح کے رنگ اس کے اندر کی خوشی کا پتہ دے رہے تھے۔

تیمور بھی بہت خوش تھا۔ اس نے جس کو چاہا تھا، جس سے بہت محبت کی تھی اور جس کو پانے کے لئے اس نے اپنا گھر، گھر والے، دولت و جائیداد سب کچھ چھوڑی تھی، وہ حسن و خوبصورتی کا شاہکار...... اس کی محبت کا ثمر...... اس کے سامنے ہوشربا حسن لئے بیٹھی تھی۔

''ہم دونوں بہت خوش قسمت ہیں۔'' تیمور نے مسکرا کر کہا۔

''کیوں......؟ نازی نے سر جھکاتے ہوئے پوچھا۔

''دونوں نے ایک دوسرے سے محبت کی اور ایک دوسرے کو پالیا، ورنہ اکثریت محبت کو پائے بغیر ہی دنیا سے رخصت ہو جاتی ہے اور جو اسے پالینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، وہ بہت خوش قسمت ہوتے ہیں۔'' تیمور نے محبت سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

''ہاں......آپ جیسے انسان کا ملنا...... بہت خوش قسمتی کی بات ہے۔'' نازی نے مسکرا کر کہا تو تیمور بھی مسکرانے لگا اور جیب میں سے ایک خوبصورت سونے کی انگوٹھی نکال کر اسے پہنانے لگا۔

اسی لمحے کمرے کا دروازہ زور سے بجا اور پھر جھٹکے کے ساتھ کھلا۔ آٹھ دس مسلح لوگ کمرے میں داخل ہوئے، نازی اور تیمور گھبرا گئے۔

''ک......کون......ہو......تم لوگ؟'' تیمور نے گھبرا کر پوچھا۔ کسی نے کوئی جواب نہ دیا اور سب نے نازی پر بندوقیں تان لیں۔

''یہ......یہ......کیا کر رہے ہو۔چھوڑو اسے۔'' تیمور چلایا۔

''ہم اس کو قتل کرنے آئے ہیں۔'' ایک نقاب پوش شخص نے تیمور کی جانب شعلہ برساتی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیوں......؟''

''یہی حکم ہے۔'' اس شخص نے جواب دیا۔

''کس کا......؟'' تیمور نے گھبرا کر پوچھا۔

''تمہارے پاس ایک ہی راستہ ہے۔ان کاغذات پر دستخط کرو۔'' اس شخص نے کاغذات اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا ہے......؟'' تیمور نے گھبرا کر پوچھا۔

''طلاق کے کاغذات ہیں......ابھی اور اسی وقت اسے طلاق دے دو، ورنہ ہم اسے تمہاری آنکھوں کے سامنے قتل کر دیں گے۔'' اس شخص نے بارعب انداز میں کہا۔

''نہیں......تیمور......خدا کے لئے مجھے طلاق مت دینا۔'' نازی روتے ہوئے چلائی۔

''ٹھیک ہے......اگر تمہیں اس کی زندگی عزیز نہیں تو ہم اسے قتل کر دیتے ہیں۔'' اور اس شخص نے ایک گولی کمرے کے دروازے کی جانب چلائی، اس میں سوراخ ہو گیا۔ تیمور بے حد ہراساں ہو گیا اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے ان کی جانب دیکھنے لگا۔

''جلدی کرو......ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں۔'' اس شخص نے جیب میں سے پین نکال کر اس کی جانب پھینکا۔

''تیمور......نہیں...... مجھے تمہارے بغیر یہ زندگی نہیں چاہئے۔ مجھے مر جانے دو......مگر مجھے طلاق مت دو۔'' نازی انتہائی شدت سے رونے اور چلانے لگی۔

اس شخص نے اپنی بندوق کا رخ نازی کی جانب کیا۔

''اکبر......خنجر نکال اور گھونپ دے اس کے پیٹ میں۔'' اس شخص نے ایک نوجوان کو کہا تو اس نے جلدی سے اپنی قمیص کے نیچے سے تیز

دھار خنجر نکالا۔ تیمور گھبرا گیا۔

''اسے کچھ مت کہنا......اسے قتل مت کرو، تم مجھے قتل کردو۔'' تیمور نے بےبسی سے کہا۔

''اگر تمہیں اس کی زندگی عزیز ہے تو طلاق کے ان کاغذات پر دستخط کردو......ورنہ......'' نقاب پوش شخص نے کہا اور دوسرے نے خنجر کی نوک نازی کے پیٹ پر رکھ دی۔

''تیمور......مجھے طلاق مت دینا......مجھے مر جانے دو......'' نازی نے ہاتھ جوڑ کر التجا کی۔

تیمور نے بےبسی سے نازی کی جانب دیکھا اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگیں۔

''نازی......مجھے تمہاری زندگی......اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔'' تیمور نے نم آنکھوں سے جواب دیا اور نقاب پوش شخص کے ہاتھ سے قلم پکڑا۔

''تیمور......تمہارے بغیر میں اس زندگی کا کیا کروں گی، خدا کے لیے دستخط نہ کرنا۔'' نازی نے روتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے......نہ دستخط کرو......مگر اس کی موت کے ذمہ دار تم ہوگے......ساری زندگی اس کی موت پر آنسو بہاتے رہنا۔'' نقاب پوش شخص نے کہا۔

''ہم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے......جو تم......ہمیں یوں جدا کرنا چاہتے ہو۔'' تیمور نے سسکتے ہوئے کہا۔

''ہم تو حکم کے بندے ہیں......جو حکم ملا......وہ کر رہے ہیں۔ ہماری......تمہارے ساتھ کوئی دشمنی نہیں۔'' اس شخص نے کہا۔

''پھر......کون......ہمیں جدا کرنا چاہتا ہے؟ تیمور نے پوچھا۔

''تمہارے گھر والے......تمہارے چاچے'' اس شخص نے جواب دیا۔

''کون......؟ میرے چچا......؟ تیمور نے حیرت سے پوچھا۔

''اگر جانتے ہو......تو......پھر پوچھتے کیوں ہو؟ جلدی کرو......وقت کم ہے......اس کی موت......یا......طلاق؟ اور یہ یاد رکھو......کہ ہم اپنا کام کر کے ہی جائیں گے۔ اس لیے تمہارے پاس کوئی راستہ نہیں۔'' اس شخص نے جواب دیا۔

''اگر تم مجھے قتل کرنا چاہتے ہو......تو......کردو......کس بات کا انتظار کر رہے ہو۔'' نازی نے چلاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے......ہم تمہاری خواہش بھی پوری کر دیتے ہیں۔'' اس شخص نے کہا اور دوسرے کو اشارہ کیا، اس نے خنجر کو دوسرے شخص کے ہاتھ میں پکڑایا اور اس نے نازی کی گردن کو زور سے جھٹکا دیا اور خنجر اس کی شہ رگ پر رکھ دیا۔

''اسے......چھوڑ......چھوڑ دو......میں دستخط کر دیتا ہوں۔'' تیمور نے گھبرا کر کہا اور طلاق کے کاغذات پر جلدی سے دستخط کر دیئے......نازی بلند آواز سے چلانے لگی......''نہیں......تیمور......نہیں نہیں......میں......'' نازی بیہوش ہوگئی۔ تیمور نے جلدی سے کاغذات پر دستخط کر دیئے اور وہ کاغذات لے کر چلے گئے۔

تیمور نے نازی کو ہوش میں لانے کی کوشش کی۔ نازی نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور زور زور سے چلانے لگی...... تیمور بھی رو رہا تھا۔

''ہم بہت بدقسمت ہیں......'' تیمور نے روتے ہوئے کہا۔

''تم...... نہیں...... میں سب سے زیادہ بدنصیب ہوں......'' وہ سسکنے لگی...... اور گھٹنوں پر سر رکھ کر رونے لگی۔

''جب میں کوئی کام کرنے کا ارادہ کر لیتا ہوں، تو دنیا کی کوئی طاقت میرا راستہ نہیں روک سکتی۔ مجھے اپنے آپ پر بہت یقین اور اعتبار ہے۔'' تیمور کے اپنے کہے ہوئے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے اور اسے اذیت دینے لگے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو شدت سے رواں ہو گئے۔ اسے قدرت نے بہت بری مات دی تھی...... کچھ دیر پہلے خوش قسمتی کا دعویٰ کرنے والے اب اپنے آپ کو سب سے زیادہ بدقسمت تصور کر رہے تھے۔ کیسے لمحوں میں تقدیریں بدل جاتی ہیں...... انسان اور اس کی سوچ بھی ...... اسے زندگی میں پہلی بار اتنی بری شکست ہوئی تھی۔ اس کی قسمت نے اس کو ایسا پچھاڑا تھا کہ اس میں اٹھنے کی ہمت نہ رہی تھی۔ اس کے اپنے کہے ہوئے الفاظ اور بلند و بانگ دعوے لمحوں میں ریت کی دیوار ثابت ہوئے تھے۔ سب کچھ بکھر گیا تھا اور گزرے لمحوں کی خاک پر وہ نوحہ کناں تھے۔ دونوں کتنی دیر بیٹھے آنسو بہاتے رہے، مگر ان کے آنسوؤں کی شدت میں کمی نہ آ رہی تھی۔ رات آہستہ آہستہ بیت رہی تھی، انہیں وقت گزرنے کا بالکل بھی احساس نہیں ہو رہا تھا۔ ایک دوسرے کے سنگ گزرا ایک ایک لمحہ ان کو یاد آ رہا تھا اور وہ اس کی یاد میں آنسو بہا رہے تھے۔ رفتہ رفتہ ساری رات گزر گئی۔ دن کی روشنی نمودار ہونے لگی۔ رو رو کر نازی اور تیمور کی آنکھیں سرخ اور پپوٹوں میں اتنی سوزش ہو گئی تھی کہ آنکھیں کھلنی اور بند ہونی مشکل ہو رہی تھیں۔

''میں...... جا رہا ہوں......'' تیمور نے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''کہاں......؟'' نازی نے چونک کر پوچھا۔

''معلوم نہیں......'' تیمور نے دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''اور...... میں...... میں کہاں جاؤں......؟'' نازی نے پوچھا۔

''ہمارے راستے جدا ہیں...... تم...... جو...... مناسب سمجھو......'' تیمور نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

''تیمور...... تم نے تو بہت دعوے کیے تھے...... کہ...... تم......'' نازی نے اسے اس کے بلند و بانگ دعوے یاد دلانا چاہے۔

''میں بھول گیا تھا...... کہ...... میں انسان ہوں...... بہت کمزور...... قسمت کے ہاتھوں بے بس۔'' تیمور نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''اگر...... مجھے یوں راستے میں چھوڑنا تھا...... تو...... پھر مجھے اتنی امید...... اور یقین کیوں دلایا؟'' نازی نے کہا۔

''اس وقت مجھے اپنے آپ پر یقین اور اعتبار تھا۔'' تیمور نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''اور...... اب......؟''

''اور اب نہ تو اپنے آپ پر اعتبار رہا ہے...... اور نہ کسی اور...... پر۔''

''تیمور...... تم نے بہت زیادتی کی ہے...... میرے ساتھ۔'' وہ روتے ہوئے بولی۔

''میں اس پر شرمندہ نہیں ہوں۔'' وہ آہستہ آواز میں بولا۔

''کیا......تم نے جو کچھ میرے ساتھ کیا ہے......اس پر......؟''

''میں بالکل بھی شرمندہ نہیں ہوں...... کیونکہ ہر انسان اپنی زندگی کو بچانے کی کوشش کرتا ہے اور میں نے بھی وہی کیا ہے......البتہ قسمت نے ہمارے ساتھ جو کھیل کھیلا ہے......اس پر بہت دکھی ہوں۔'' تیمور نے کہا اور اسے دیکھے بغیر کمرے سے باہر نکل گیا۔

وہ ہمیشہ کے لئے اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ نازی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی......اپنے سر کے بال نوچنے لگی، اپنے عروسی دوپٹے کو اس نے پھاڑ پھاڑ کر کترنوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ اپنے زیورات کو نوچ نوچ کر انہیں توڑ ڈالا تھا، جس کمرے کی آرائش ان دونوں نے بہت محبت سے کی تھی اور در و دیوار کو خوبصورت تازہ گلاب کی مہکتی کلیوں اور پھولوں سے سجایا تھا۔ اس نے ایک ایک کلی اور پھول کو اپنے ہاتھوں سے نوچ کر انہیں اپنے پاؤں تلے مسلا تھا۔ خوبصورت نرم و گداز بیڈ شیٹ اور تکیوں کو اس نے اٹھا کر کمرے سے باہر پھینک دیا تھا۔

''ہر بار...... ہر بار...... میرے ساتھ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ خدا...... کیوں میرے ساتھ یہ کرتا ہے...... اس نے مجھ پر اتنا ظلم کیوں کیا ہے......؟ وہ ہر بار مجھے...... میری خوشی اور محبت دے کر مجھ سے چھین لیتا ہے......اور میرا تماشا دیکھتا ہے......نجانے کیوں مجھے اتنا دکھ دیتا ہے......اتنا دکھ...... کہ میرا دل پھٹنے لگا ہے...... وہ ہر بار...... میرے ساتھ ایسا کرتا ہے...... ظالم......'' وہ سسکنے لگی۔

اور شاہ زیب اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ خوبصورت وجیہہ اور اچھا انسان...... اس نے بھی مجھ سے بہت محبت کی......مگر میں اس کی محبت بھی نہ بن سکی......تو نے مجھے اس کی بھی نہ ہونے دیا۔'' باسط علی......''جس سے میں بے پناہ محبت کرتی تھی اور اس کی محبت کی خاطر شاہ زیب کی محبت کو ٹھکرا دیا۔ وہ بھی میرا نہ بن سکا تو نے مجھے اس کی محبت بھی نہ بننے دیا اور اسے بھی مجھ سے جدا کرا دیا۔

''اور اب تیمور......جس نے مجھ سے بے حد محبت کی......اتنی محبت کہ میں اپنے پچھلے دکھ بھول گئی تھی......اور تو نے مجھ سے اس کو بھی چھین لیا، ہر بار میرے ساتھ ایسا کیوں کرتا ہے......؟ میں نے کیا گناہ کیا ہے......جو تو میرے ساتھ اتنا ظلم کر رہا ہے......مجھ سے ہر بار چھین کر تو خوش کیوں ہوتا ہے۔ بتا تو سہی میں نے کیا کیا ہے......یا......پھر مجھے کسی کی بددعا لگ گئی ہے کہ میں جس کو بھی پانے کی کوشش کرتی ہوں، وہی مجھ سے دور چلا جاتا ہے، وہی مجھ سے چھن جاتا ہے۔'' وہ روتے ہوئے سوچنے لگی اور اس کی آنکھوں کے سامنے شاہ زیب کا چہرہ گھومنے لگا۔ وہ بھی اسی طرح رویا اور تڑپا ہوگا......جس دن میں اسے چھوڑ کر چلی آئی تھی۔

کیا وہ بھی اسی اذیت سے گزرا ہوگا......جس سے میں گزر رہی ہوں......وہ کرب سے سوچنے لگی۔ ''لیکن......اس وقت میں نے شاہ زیب کے بارے میں بالکل بھی نہیں سوچا تھا......ایک لمحے کے لئے بھی نہیں۔ اس وقت صرف باسط علی، میرے دل اور آنکھوں میں بسا تھا اور کوئی نہیں...... مجھے شاہ زیب اور اس کی محبت کبھی دکھائی ہی نہیں دی۔

کیا میں نے شاہ زیب کے ساتھ کوئی زیادتی کی ہے، جس کی سزا مجھے اس صورت میں مل رہی ہے......؟ اس نے سوچا اور شاہ زیب کا دکھی چہرہ اور نم آنکھیں اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئیں، جب حویلی چھوڑنے سے پہلے اس نے شاہ زیب کی جانب دیکھا تھا، وہ بہت خاموش اور مغموم

تھا۔ شاید وہ رات بھر روتا رہا تھا...... یا پھر کئی راتوں سے سویا نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں بھی یونہی سرخ تھیں اور ان کے پپوٹے بھی یونہی بھاری تھے...... سب کچھ دیکھنے کے باوجود بھی وہ اس کے دل کی کیفیت نہیں جان پائی تھی...... وہ اس وقت صرف اپنے دل کی کیفیت کو جانتی تھی جو بہت مسرور اور شاداں تھا، جس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ وہ اپنی منزل کو پانے جا رہی تھی اور اس کے اندر فتح کا نشہ اور سرور تھا۔ وہ اپنے آپ میں اتنی بدمست ہو رہی تھی کہ اسے کسی کا ہوش نہ تھا...... اور اب پھر شاہ زیب اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ اسی طرح...... جس طرح باسط علی بتایا کرتا تھا اور وہ اسے جھوٹا اور فریبی سمجھتی تھی۔

وہ آنکھیں بند کرتی تو شاہ زیب اس کے سامنے ہوتا...... کھولتی تو اس کا چہرہ اسے گھور رہا ہوتا۔ وہ سونے کی کوشش کرتی تو اس کا اداس چہرہ اسے سونے نہ دیتا۔ وہ عجیب مخمصے اور الجھن کا شکار ہونے لگی تھی۔ شاہ زیب کے ہیولے اور اس کے عکس سے فرار ممکن نہیں تھا، وہ اس سے بھاگنا چاہتی تھی۔ اس کی آنکھوں اور چہرے کے حصار سے دور جانا چاہتی تھی، مگر وہ ایک لمحے کے لئے بھی اس سے جدا نہیں ہوتا تھا...... وہ بہت الجھنے لگی تھی...... پاگل ہونے لگی تھی...... تیمور اور باسط علی اس سے دور چلے گئے تھے...... اب صرف شاہ زیب اور اس کا اداس چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتا......

☆

''بہرام خان...... آج کسی کو میرے پاس نہ آنے دینا۔''

شاہ زیب نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

کیوں...... شاہ زیب بھائی؟'' بہرام خان نے حیرت سے پوچھا۔

''آج کوئی خاص مہمان آنے والا ہے۔''

''وہ...... کون......؟'' بہرام خان نے حیرت سے پوچھا۔

''ہے...... کوئی......'' شاہ زیب نے آہستہ آواز میں کہا۔

''کیا...... آپ کو اس کے بارے میں کوئی خواب آیا ہے؟'' بہرام خان نے پوچھا۔

''ایسا ہی سمجھو......'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

''بہرام خان خاموشی سے شاہ زیب کے چھوٹے سے حجرے سے باہر نکل گیا۔ حجرے میں ایک چارپائی اور مٹی کے فرش پر چٹائی کے علاوہ اور کچھ نہ تھا...... نجانے لوگوں کو کیسے معلوم ہو گیا تھا کہ شاہ زیب کی کہی ہوئی باتیں پوری ہوتی ہیں...... اور وہ اس سے اپنی حاجتیں بیان کرتے اور ان اپنے لئے دعائیں کرانے آتے تھے۔

شاہ زیب حیران ہوتا اور انہیں منع کرتا...... مگر روز بروز لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ دن کا آغاز ہوتے ہی لوگ اس کے ڈیرے پر پہنچ جاتے اور اس سے اپنے مسائل بیان کرنا شروع کر دیتے۔ وہ خاموشی سے سنتا رہتا اور ان کا دل رکھنے کے لئے اللہ سے دعا کرنے کو کہتا۔ وہ مطمئن ہو کر چلے جاتے...... وہ رات کے کسی پہر...... جانماز بچھا کر تمام حاجت مندوں کے لئے دعا کرتا اور ان کے معاملات اللہ کے سپرد کر

دیتا۔ دعائیں کب اور کیسے پوری ہوتیں۔ اسے خود بھی کچھ معلوم نہ ہوتا، مگر ہر روز لوگ اس کے پاس آ کر اسے خوشی سے بتاتے کہ ان کی مرادیں پوری ہوئی ہیں۔ اللہ نے اس کے ذریعے ان کی دعائیں سن لی ہیں۔ وہ ان کی نظروں میں اور معتبر ہو جاتا۔ اس کی عزت، اس کا رتبہ اور تعظیم پہلے سے بھی زیادہ کی جانے لگتی۔ وہ کیا تھا...... اور...... اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا...... اسے خود بھی معلوم نہیں تھا۔

اس کی دعائیں واقعی ہی پوری ہوتی ہیں...... یا...... نہیں اسے خود بھی ٹھیک طرح سے معلوم نہیں تھا...... اللہ اسے کیا عطا کر رہا تھا...... اسے خود بھی پتہ نہیں تھا...... اللہ کا اور اس کا کیا معاملہ تھا، وہ جان نہیں پایا تھا۔ وہ ان کے ہاں کتنا معتبر تھا...... یا...... اس کا کیا مقام تھا...... اسے کوئی خبر نہ تھی...... وہ تو بس اپنے اندر پھیلی اس روشنی کی تقلید کرتا...... جو اس کی آنکھوں کے دیپ بجھ جانے کے بعد روشن ہوئی تھی۔ وہ ایک ان پڑھ انسان تھا، جسے نہ کتابی علم آتا تھا اور نہ ہی کوئی دنیاوی...... اور...... نہ ہی اس کا ذہن زمانے کی مکارانہ چالوں اور سازشوں سے آشنا تھا، وہ قدرت کی تخلیق کردہ پاک روحوں میں سے ایک 'پاک روح' تھا۔ جس کی آشنائی اپنے خالق سے اس وقت ہوئی جب وہ نازی کے جانے کے بعد انتہائی اضطرابی دور میں سے گزر رہا تھا۔ ان لمحوں کی اذیت اور اس کے اندر جنم لینے والے اضطراب...... اور...... اس اضطراب میں پوشیدہ تکلیف...... اور...... کرب نے رفتہ رفتہ اسے ایک ایسی روشنی سے آشنا کرنا شروع کر دیا جو بھنور سے اٹھنے والی لہروں میں سے ایک پرسکون لہر کی مانند سر اٹھاتی اور اس کے اضطراب کو کم کرنے لگتی۔ اسے ایک لمحے کے لئے سکون دیتی...... اسے تسلی دیتی...... کبھی کبھی جنم لینے والا یہ سکون، اپنے اندر ایک ایسا سحر رکھتا، جس کی کشش نے اسے نازی کی بے وفائی اور جدائی سے پیدا ہونے والے اضطراب اور اذیت کو اس سے بہت دور کر دیا تھا۔ اس پرسکون لہر میں اتنا سحر تھا کہ وہ اکثر اپنا آپ بھول جاتا اور کبھی کبھی اٹھنے والی اس لہر کی تلاش میں سرگرداں رہتا۔ اپنے آپ میں مضطرب رہتا وہ پرسکون لہر اس کی زندگی کا حاصل بنتی جا رہی تھی۔

☆

"شاہ زیب بھائی...... کوئی خاتون آپ سے ملنا چاہتی ہیں، کہتی ہیں...... بہت دور سے آئی ہیں۔" بہرام خان نے دوپہر کے وقت اس کے حجرے میں آ کر اسے اطلاع دی۔

"ان کو اندر بھیج دو...... کیا ان کو کھانا کھلا دیا ہے۔" شاہ زیب نے پوچھا، کیونکہ اس کے ڈیرے پر آنے والے ہر شخص کو پہلے کھانا کھلایا جاتا تھا...... بعد میں وہ شاہ زیب کے پاس آتا تھا۔

"وہ...... کہتی ہیں...... انہیں بھوک نہیں۔" بہرام خان نے بتایا۔

"کیا...... تم نے انہیں اس ڈیرے کی روایت کے بارے میں نہیں بتایا؟ شاہ زیب نے پھر پوچھا۔

"سب بتایا ہے...... مگر...... وہ......" بہرام خان نے کہا۔

"ٹھیک ہے...... انہیں اندر بھیج دو۔" شاہ زیب نے جواب دیا۔

"شاہ زیب چارپائی پر بیٹھا تھا اور اس کی چھڑی اس کے پاس تھی۔ نازی نے سیاہ چادر اچھی طرح لپیٹ رکھی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی اندر داخل ہوئی اور شاہ زیب کی جانب دیکھنے لگی۔ وہ دروازے میں کھڑی ہو گئی، مگر شاہ زیب دروازے کی دائیں جانب والی دیوار کو دیکھ رہا

تھا۔ نازی اسے بغور دیکھتی رہی۔ وہ بے حد بدل چکا تھا۔ پہلے سے بہت کمزور ہو گیا تھا اور اس کے چہرے پر قدرے لمبی داڑھی، یہ شخص اس شاہ زیب سے بالکل مختلف دکھائی دے رہا تھا، جسے وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ وہ اس کی جانب نہیں دیکھ رہا تھا۔ اسے قدرے حیرت ہوئی۔

''وہ منتظر رہی...... کہ وہ اسے اندر آنے کو کہتا ہے، مگر وہ خاموش رہا...... وہ بھی خاموشی سے اس کی جانب منتظر نگاہوں سے دیکھتی رہی۔''

''اندر...... آ جائیے۔'' شاہ زیب قدرے توقف کے بعد بولا تو نازی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے پاس آ گئی۔

شاہ زیب نے اپنی چھڑی ٹٹولی اور اس کا سہارا لے کر اٹھتے ہوئے وہ ٹھوکر لگنے سے گرنے لگا۔

''آ...... آ...... پ......؟'' نازی نے ہکلاتے ہوئے پوچھنا چاہا۔

میں دیکھ نہیں سکتا، شاہ زیب نے جواب دیا اور چارپائی سے قدرے فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔

''آپ...... چارپائی پر بیٹھ جائیں۔'' شاہ زیب نے کہا۔

''کب سے......؟ نازی نے کچھ پوچھنا چاہا۔

جب...... خدا نے چاہا۔'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

نازی بہت کچھ سوچ کر آئی تھی۔ اسے دیکھ کر ایک دم گھبرا گئی اور سب کچھ بھول گئی۔ ''کیسی ہیں۔ آپ...... ؟ خوش ہیں نا؟ شاہ زیب نے مسکرا کر پوچھا۔

نازی کو اس کی بات سن کر جھٹکا سا لگا اور اسے ایک دم یاد آیا کہ وہ یہاں کس مقصد کے لئے آئی ہے۔

''نجانے آپ نے مجھے کیسی بددعا دی ہے...... کہ......'' نازی گلوگیر آواز میں بولی۔

''یہ آپ کی غلط فہمی ہے...... اللہ نے مجھے اتنا کم ظرف نہیں بنایا۔'' شاہ زیب نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''لیکن...... میرے ساتھ کچھ ایسا ضرور ہوا ہے...... کہ...... زندگی اور اس کی خوشیاں مجھ سے روٹھ گئی ہیں...... میں نے جس کی تمنا کی...... وہی نہ ملا...... جس کو پانا چاہا...... وہی چھن گیا۔'' نازی نے آہ بھر کر کہا۔

''کسی کو عطا کرنا اور محروم کرنا، کسی انسان کے بس میں نہیں...... یہ اختیار صرف مالک کے پاس ہے۔'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

''ہاں...... مگر......؟'' نازی نے کچھ کہنا چاہا۔

''باسط علی کہاں ہے؟'' شاہ زیب نے پوچھا۔

''معلوم نہیں......''

''کیوں......؟'' شاہ زیب نے حیرت سے پوچھا۔

''میں نے اس سے طلاق لے لی۔''

''طلاق......'' شاہ زیب کو جھٹکا لگا اور وہ حیرت سے بڑبڑایا۔

''ہاں......وہ بہت بدل گیا تھا۔ باسط علی......وہ نہیں رہا تھا......جس کی تمنا میں نے کی تھی۔'' نازی نے افسردگی سے جواب دیا۔

شاہ زیب خاموش ہو گیا، اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا......کہ کیا کہے۔

''اور......تیمور بھی مجھ سے چھن گیا۔'' نازی نے آہستہ آواز میں کہا۔

''تیمور......کون......؟'' شاہ زیب نے چونک کر پوچھا۔

''اس نے مجھ سے ویسی محبت کی تھی......جیسی......میں نے کبھی باسط علی سے کی تھی......نہ مجھے میری محبت ملی اور نہ تیمور کو اس کی محبت۔'' نازی نے روتے ہوئے بتایا۔

''ہر شے پر اللہ قادر ہے۔ انسان صرف سوچتا ہے مگر عطا وہ کرتا ہے۔'' شاہ زیب نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

''ہاں......لیکن مجھے اب احساس ہونے لگا ہے کہ میں نے آپ کے ساتھ بہت زیادتی کی۔ میں نے آپ کی محبت کو جھٹلایا اور خدا نے مجھ سے میری محبتیں چھین لیں......میں نے آپ کا گھر اجاڑا اور خدا نے میرا گھر کبھی بسنے ہی نہیں دیا۔ میں نے آپ کی ناقدری کی......اور اس نے مجھے بے وقعت بنا دیا......'' نازی نے نم آنکھوں کے ساتھ شاہ زیب کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ محض آپ کی سوچ ہے......ایسی بات نہیں۔'' شاہ زیب نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

نہیں......یہ......میرا یقین ہے۔'' نازی نے جواب دیا۔

''یقین کو اپنا ایمان مت بنائیں۔'' شاہ زیب نے کہا۔

''میں آپ سے معافی مانگنے آئی ہوں۔'' نازی نے کہا۔

''معاف کرنا، اسے زیب دیتا ہے......میری اتنی اوقات کہاں؟''

''کیا آپ مجھے معاف نہیں کریں گے؟'' نازی نے اس کی جانب بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا آپ مجھے اس قابل سمجھتی ہیں؟'' شاہ زیب نے پوچھا۔

''ہاں......آپ کے معاف کرنے سے مجھے سکون آ جائے گا۔'' نازی نے کہا۔

''میں آپ کے لیے دعا کروں گا۔'' شاہ زیب نے کہا۔

مجھے......اب کسی دعا کی ضرورت نہیں......مجھے کچھ نہیں چاہئے، کیا آپ ترس کھا کر میرے لئے دعا کریں گے......؟ کیا آپ اللہ کے اس قدر قریب ہو چکے ہیں کہ آپ کی دعائیں سنی جائیں گی......'' نازی کو نجانے کیا ہوا کہ وہ ایک دم مشتعل ہو گئی اور شاہ زیب اس کی باتیں سن کر حیرت سے آنکھیں جھپکانے لگا۔

''مجھے......آپ سے صرف معافی چاہئے......کوئی دعا نہیں......کیونکہ مجھے جتنی بددعائیں لگنی تھیں وہ لگ چکی ہیں......معافی اس لئے نہیں مانگ رہی کہ زندگی میں مجھے کسی اچھی بات کی توقع اور امید ہے۔ صرف اس لئے معافی مانگ رہی ہوں کہ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں نے آپ

کے ساتھ زیادتی کی ہے۔" نازی نے گہری سانس لے کر کہا۔

"میں نے آپ سے کبھی کوئی شکایت تو نہیں کی۔"

"یہ بات تو میرے لئے تکلیف دہ ہے..... اگر آپ شکوہ کرتے تو میں آج یہاں نہ آتی۔" نازی نے جواب دیا۔

"میں نے آپ کے لئے کبھی برا نہیں سوچا۔" شاہ زیب نے کہا۔

"کاش...... میں بھی آپ کے لئے کبھی اچھا سوچتی۔" نازی نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

"انسان اپنی سوچوں پر قادر نہیں ہوتا۔" شاہ زیب نے کہا۔

"میرے خیال میں بہت حد تک ہوتا ہے...." نازی نے جواب دیا۔

شاہ زیب اس کی باتیں سن کر خاموش ہو گیا۔

"کیا...... آپ نے دوسری شادی نہیں کی؟" نازی نے قدرے توقف کے بعد پوچھا۔

"میں نے تو پہلی شادی بھی نہیں کی۔" شاہ زیب نے گہری سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

"اور..... اس کی گنہگار میں ہوں....." نازی نے آہ بھر کر کہا۔

"شاید قسمت میں ہی یہ سب کچھ لکھا تھا۔" شاہ زیب نے کہا۔

"ہاں..... مگر..... ہر بات میں مجرم تو انسان ہی ٹھہرتا ہے۔ قسمت نہیں۔" نازی نے کہا۔

"ہاں...... جہاں انسان بے بس نظر آتا ہے...... وہاں قسمت کو الزام دیا جاتا ہے، ورنہ ہر بات میں انسان ہی قصوروار ٹھہرایا جاتا ہے۔" شاہ زیب نے اپنی چھڑی کے سہارے چلتے ہوئے کہا۔

"میرے جانے کے بعد آپ بہت دکھی ہوئے ہوں گے؟" نازی نے پوچھا۔

"ہاں......" وہ قدرے توقف کے بعد بولا۔

"اور.....اب......؟" نازی نے سوال کیا۔

"اب.....نہیں۔" شاہ زیب نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

"کیوں......؟" نازی نے پوچھا۔

"قدرت نے میرے دل کو بہت کچھ سمجھا دیا ہے......"

"کیا مطلب......؟" نازی نے چونک کر پوچھا۔

"بہت سی ان کہی اور نہ سمجھ میں آنے والی باتیں مگر آپ نہیں سمجھیں گی۔" شاہ زیب نے کہا۔

نازی خاموش ہو گئی اور شاہ زیب کی جانب دیکھنے لگی۔

''باسط علی کہاں ہے؟'' شاہ زیب نے اچانک پوچھا۔

''معلوم نہیں''۔

''کیا......وہ آپ کو کبھی یاد نہیں آیا؟''

''نہیں......'' نازی نے گہری سانس لے کر جواب دیا۔

''کیوں......؟'' شاہ زیب نے حیرت سے پوچھا۔

''جو لوگ اذیت دینے والے تیر کی طرح دل میں پیوست رہتے ہیں۔ انہیں یاد کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی......دل سے رستا لہو ہر دم ان کی یاد تازہ رکھتا ہے۔ مجھے معلوم ہے۔ آپ بھی مجھے کبھی نہیں بھول پائیں گے نہ ہی وہ......اور نہ ہی میں۔'' نازی نے کہا۔

شاہ زیب اس کی باتیں سن کر خاموش ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

''اب باسط علی اور تیمور سے زیادہ 'آپ' مجھے یاد آتے ہیں......جانتے ہیں......کیوں؟'' نازی نے شاہ زیب کے سامنے کھڑے ہو کر سوال کیا۔

شاہ زیب خاموش رہا اور کوئی جواب نہیں دیا۔

''آپ نے مجھے بہت کچھ عطا کیا اور کرنا چاہا۔ مگر میں نے آپ کو نہ تو کوئی حق دیا، بلکہ سب کچھ چھین لیا۔'' نازی نے آہستہ آواز میں کہا تو شاہ زیب کی آنکھوں کی نمی میں اور اضافہ ہونے لگا۔

''میں نے نہ تو آپ سے کبھی کوئی گلہ کیا......اور نہ ہی کوئی حق مانگا؟''

''یہی تو دکھ کی بات ہے......جو مجھے سکون نہیں لینے دیتی۔ میرے اندر ہر وقت اک آگ سی لگی رہتی ہے۔ ایسی بے سکونی پھیلی رہتی ہے، جس سے چھٹکارا پانا میرے لئے ناممکن ہو گیا ہے۔ میں کس قدر اذیت میں سے گزر رہی ہوں......آپ نہیں جانتے......مجھے اس اذیت سے نجات دلائیں......ورنہ مجھ سے سانس لینا مشکل ہو جائے گی۔'' نازی نے روتے ہوئے کہا۔

''خدا......آپ کو ہر تکلیف سے نجات دے۔'' شاہ زیب نے کہا۔

''میں خدا سے کچھ نہیں مانگ رہی......اور......اب مجھے اس سے کچھ چاہیے بھی نہیں......اس نے مجھے جو کچھ دینا تھا......دے دیا......اب زندگی بھر اس سے کچھ نہیں مانگوں گی۔ مجھے صرف آپ سے معافی چاہئے۔'' نازی قدرے چلاتے ہوئے بولی۔

''آپ......خدا سے اتنی ناامید کیوں ہو رہی ہیں؟''

''اس نے مجھ سے میری ساری امیدیں چھین لی ہیں......میرے پاس کچھ نہیں چھوڑا......میں ایسے خدا کو کیا کروں، جس نے مجھے اذیتیں دی ہیں اور ہر پل مجھے اذیت دے کر خوش ہوتا ہے۔'' نازی نے قدرے باغیانہ انداز میں کہا۔

''آپ اس کی حکمتوں کو نہیں سمجھ پا رہیں۔'' شاہ زیب نے نرم لہجے میں کہا۔

''اور...... میں کچھ ابھی نہیں چاہتی......''

''وہ انسانوں پر بہت مہربان ہے۔''

''ہوگا...... مجھے یقین نہیں۔'' نازی نے غصے سے کہا۔

''کیوں......؟'' شاہ زیب نے پوچھا۔

''اس نے آپ کے ساتھ کیا کیا......؟'' مجھ جیسی بے وفا عورت سے شادی کرائی، جو آپ کو دھوکہ دے کر چلی گئی...... پھر آپ سے آپ کی آنکھوں کی روشنی بھی چھین لی۔ کیا ایک اذیت کم تھی، جو دوسری بھی دے دی...... اور مجھ سے باسط علی کو چھینا، جس سے میں محبت کرتی تھی...... اور...... پھر تیمور کو بھی چھین لیا، جو مجھ سے محبت کرتا تھا۔ کیا انسان کے لئے ایک اذیت کم ہوتی ہے، جو اس کو دہری اذیتوں میں وہ ڈالتا ہے...... تاکہ انسان کو کسی پل سکون نہ آئے...... وہ ہر وقت روتا...... اور...... سسکتا رہے...... جیسے میں...... آپ...... باسط علی...... اور تیمور...... اور شاید سارے انسان۔'' نازی نے سسکتے ہوئے کہا۔

''آپ...... اپنی سوچ کو بدل لیں...... تو آپ کو سکون آجائے گا۔'' شاہ زیب نے آہستہ آواز میں کہا۔

''اور...... انسان کی سوچ کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں بدل سکتی...... اور میں بھی اسے بدلنا نہیں چاہوں گی۔'' نازی نے ڈھٹائی سے کہا۔

''آپ اتنی منفی باتیں کیوں کر رہی ہیں؟''

''کیا اب بھی نہ کروں...... اتنا کچھ سہنے کے بعد بھی۔'' نازی نے حیرت سے پوچھا۔

''آزمائش تو زندگی کا حصہ ہیں...... قدرت نے انسان کو آزمائشوں کے لئے ہی تو پیدا کیا ہے۔'' شاہ زیب نے سمجھانا چاہا۔

''ٹھیک ہے...... آزماتا رہے...... اس کو کون روک رہا ہے۔'' نازی نے غصے سے جواب دیا۔

شاہ زیب خاموش ہو گیا۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ وہ واقعی نازی کو نہ کبھی سمجھا پائے گا اور نہ ہی اس کی سوچ کو بدل پائے گا...... سوچ تب ہی بدلی جاتی ہے جب انسان کسی نقطے پر سر تسلیم خم کرتا ہے...... کسی بات کو ماننے کی خواہش اس کے اندر پیدا ہوتی ہے اور جب انسان اپنے اندر سے سب کچھ ختم کر دیتا ہے تو وہ خام مٹی کا کھنکتا ہوا بجنے والا انسان بن جاتا ہے۔ شاہ زیب کے چہرے پر بے بسی کے تاثرات نمایاں ہونے لگے۔

''کیا آپ مجھے معاف نہیں کریں گے؟'' نازی نے پوچھا۔

''میں نے آپ کو سب کچھ معاف کیا......'' شاہ زیب نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''شکریہ...... اب میں چلتی ہوں۔'' نازی نے اس کی جانب بغور دیکھا اور تیزی سے اس کے حجرے سے باہر نکل گئی۔

شاہ زیب حیرت زدہ رہ گیا۔ نازی کی سوچ، اس کا ایمان اور اس کی باتیں کتنی بدل گئی تھیں۔ وہ ضدی، خودسر اور خود غرض پہلے بھی تھی، مگر اب ان تمام جذبوں میں شدت آگئی تھی۔ وہ اپنی سوچ، ایمان اور باتوں پر سختی سے قائم تھی، وہ نہ تو کسی کی بات سننے کو تیار تھی نہ ماننے کو...... وہ کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتی تھی۔ شاہ زیب کو اس کے بارے میں سوچ سوچ کر دکھ ہوتا رہا...... مگر وہ اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتا تھا...... شاید دعا بھی

نہیں...... کیونکہ اس نے خود اسے کہا تھا کہ اسے دعاؤں کی کوئی ضرورت نہیں......شاہ زیب نے گہری سانس لی اور حجرے سے باہر نکل کر کھلے آسمان کی جانب دیکھنے لگا۔

"اپنی مخلوق سے تو ہی واقف ہے...... کسی انسان کے بس میں نہیں کہ وہ کسی کے دل و دماغ تک پہنچ پائے اور اس کی سوچوں کو بدل پائے۔" شاہ زیب نے دل میں سوچا اور اس کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات نمایاں ہونے لگے۔

☆

ماسٹر باسط علی نے ایک چھوٹا سا بیگ کندھے پر ڈالا، جس میں چند کتابوں کے علاوہ کچھ ضروری چیزیں تھیں اور کٹیا سے باہر نکل گئے۔ کٹیا کے دروازے پر کھڑے ہو کر پیچھے دیکھا، سب کچھ ویسے کا ویسا پڑا تھا۔ انہوں نے کوئی چیز بھی وہاں سے نہ اٹھائی تھی۔ انہوں نے تین سال اس بستی اور کٹیا میں گزارے تھے۔ جب وہ یہاں آ کر آباد ہوئے تھے۔ تب انہوں نے واپس جانے کا خیال ہمیشہ کے لئے ترک کر دیا تھا، مگر اب انہیں واپس جانا پڑ رہا تھا۔ سائیں کے بار بار کہنے پر...... یا...... پھر اپنے دل کی بے قرار کیفیت سے تنگ آ کر وہ واپس جانے پر مجبور ہو گئے تھے۔ انہوں نے حسرت بھری نگاہ کٹیا پر ڈالی اور جلدی سے وہاں سے باہر نکل آئے۔

ابھی سورج پوری طرح طلوع نہیں ہوا تھا۔ سڑکوں پر اتنی چہل پہل بھی نہیں تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ادھر ادھر متلاشی نگاہوں سے دیکھنے لگے کہ شاید سائیں مٹھا کہیں نظر آ جائے اور وہ اسے آخری بار مل کر چلے جائیں...... وہ باغ میں اس مخصوص ٹیلے کی جانب گئے جہاں سائیں اکثر بیٹھ کر اپنے آپ سے باتیں کرتا ہوا ملتا تھا، مگر وہ آج وہاں بھی نہیں تھا۔ وہ سڑک کے اس درخت کے پاس بھی گئے جہاں سائیں اکثر بچوں میں چیزیں بانٹتا تھا، مگر وہ آج وہاں بھی نہیں تھا۔ وہ اس آبشار تک بھی گئے، جہاں وہ اکثر تنہائی میں نجانے کیا پڑھتا رہتا تھا...... وہ ہر اس جگہ گئے جہاں اکثر سائیں پایا جاتا تھا، مگر وہ کہیں نہیں ملا۔ ان کے اندر مایوسی بڑھنے لگی...... جس کے اصرار پر وہ جا رہے تھے، وہی کہیں نہیں مل رہا تھا۔

"سائیں...... کہاں جا سکتا ہے؟" ماسٹر باسط علی نے مایوسی سے اپنے دل میں سوچا اور اپنا رخ شیرے کے کھوکھے کی جانب موڑ دیا۔ شیرا ابھی کھوکھے پر آ کر بیٹھا تھا اور اس کے آتے ہی اکا دکا لوگ بھی آنا شروع ہو گئے۔

"سلام ماسٹر جی...... خیر تو ہے...... بڑے دنوں کے بعد آپ تشریف لائے ہیں۔" شیرے نے پوچھا۔

"ہاں...... بس...... یونہی۔" انہوں نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

"چائے پئیں گے......؟" شیرے نے پوچھا۔

"نہیں...... مجھے جلدی ہے...... میں جا رہا ہوں۔" ماسٹر باسط نے جواب دیا۔

"کہاں......؟" شیرے نے حیرت سے پوچھا۔

"اس گاؤں کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر۔" ماسٹر باسط علی نے جواب دیا۔

"کیا مطلب...... آپ ہم سب کو چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ کیوں......؟ کیا کوئی ہم سے غلطی ہو گئی ہے......؟ کیا آپ کسی سے ناراض ہو گئے

ہیں؟ شیرے نے ایک دم پریشان ہو کر پوچھا۔

''ایسا کچھ بھی نہیں۔'' ماسٹر باسط علی نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''تو...... پھر...... کیا بات ہے؟ آپ ہم کو چھوڑ کر نہیں جا سکتے...... ہم آپ کو جانے نہیں دیں گے۔'' شیرے نے محبت سے حق جتلاتے ہوئے کہا۔

''آپ کی محبت کا شکریہ...... مگر...... اب میں یہاں مزید نہیں رہ سکتا۔'' ماسٹر باسط علی نے مسکرا کر جواب دیا۔

''مگر...... سرکار...... اس کی کوئی وجہ بھی تو ہونی چاہیے...... اگر ہم لوگوں سے کوئی خطا...... کوئی غلطی ہوگئی ہے تو معافی چاہتے ہیں...... مگر ہم آپ کو یوں جانے نہیں دیں گے۔'' شیرے نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

''شیرے بھائی...... میرا جانا بہت ضروری ہے۔'' ماسٹر باسط علی نے کہا۔

''مگر...... اتنی اچانک جانا کیوں ضروری ہوگیا ہے؟''

''ضرور آپ کسی سے ناراض ہوئے ہیں۔'' شیرے نے کہا۔

''بالکل بھی نہیں...... بس یوں سمجھ لو...... کہ اللہ کا جتنا حکم تھا...... یہاں رہ لیا...... اب جانے کا حکم ملا ہے تو چل پڑا ہوں...... ہر شے اسی کے حکم سے تو چلتی ہے۔'' ماسٹر باسط علی نے جواب دیا۔

''مگر...... آپ جیسے سچے موتیوں جیسے پاک انسان کہاں ملتے ہیں۔ آپ تو ہماری بستی کے لئے رحمت بن کر آئے تھے۔ بچوں کے لئے سکول کھولا، غریبوں کے لئے ہسپتال کھلوایا، ہر ایک کی مدد کی، ہر ایک سے پیار کیا، آپ انسان نہیں، فرشتہ ہیں۔'' شیرے نے فرط جذبات سے لبریز آواز کے ساتھ کہا۔

''نہیں...... میں بہت عام سا انسان ہوں۔'' ماسٹر باسط علی نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''ماسٹر جی...... آپ کتنے خاص ہیں...... یہ ہم جانتے ہیں...... آپ تو ہماری بستی کی رونق تھے...... میرے کھوکھے کی شان بڑھاتے تھے...... اب میں کس کا انتظار کیا کروں گا...... ماسٹر جی...... آپ ہمیں چھوڑ کر نہ جائیں۔'' شیرے نے بچوں کی طرح ضد کرتے ہوئے کہا۔

''میرا جانا...... بہت ضروری ہے...... اتنا ضروری...... کہ...... اگر...... میں نہ گیا...... تو شاید...... بہت دیر ہو جائے۔'' ماسٹر باسط علی نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے...... اگر آپ نے جانے کا ارادہ کر لیا ہے تو میں کیا کہہ سکتا ہوں......'' ''مگر آپ کے بغیر ہمارا دل نہیں لگے گا...... ہم سب بہت اداس ہو جائیں گے۔'' شیرے نے محبت سے ان کے ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

''آپ کی محبت اور چاہت میرے لئے بہت بڑا تحفہ ہے اور میں اس کے لئے شکر گزار ہوں۔ میں نے آپ لوگوں کے لئے جو کچھ بھی کیا...... وہ انسان ہونے کے ناطے کیا۔ یہ کسی پر کوئی احسان نہیں۔'' ماسٹر باسط علی نے نم آنکھوں کے ساتھ جواب دیا۔

''مگر سب انسان آپ جیسے کہاں......؟'' شیرے نے کہا۔

''ہر انسان کے ذمہ اللہ نے کچھ کام لگائے ہوتے ہیں، جو اسے ہر صورت میں پورے کرنے ہوتے ہیں---- میرے ذمہ بھی اس نے یہ کام لگایا تھا......اس میں میری کیا بڑائی ہے۔'' ماسٹر باسط علی نے نرم لہجے میں اسے سمجھایا۔

''ماسٹر صاحب......آپ کی پڑھی لکھی باتیں ہمیں کہاں سمجھ میں آتی ہیں......میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ آپ جیسے لوگ، دنیا میں بہت کم ہیں، جو دوسروں کا بھلائی سوچتے ہیں......ورنہ زیادہ تر لوگ تو دوسروں کے حصے کا لقمہ بھی چھیننا چاہتے ہیں۔'' شیرے نے کہا۔

''تمہاری محبت کا شکریہ......اب میں چلتا ہوں۔'' ماسٹر باسط علی نے کہا۔

''ماسٹر صاحب...... آج آخری بار تو چائے پی لیں۔'' شیرے نے محبت سے کہا تو ماسٹر باسط علی نے اس کی جانب دیکھنے لگے۔

''ٹھیک ہے......جیسے تمہاری مرضی۔'' ماسٹر باسط علی نے مسکرا کر کہا اور شیرا جلدی سے چائے بنانے لگا۔

''اوئے جالے......جلدی سے الماری میں سے دھلا ہوا کپ پلیٹ نکال کر لاؤ...... آج ماسٹر صاحب کو سب سے بڑھیا چائے پلانی ہے، تاکہ انہیں ہماری آخری چائے کبھی نہ بھولے۔'' شیرے نے قدرے جذباتی انداز میں کہا۔

''ماسٹر صاحب......کہاں جا رہے ہیں؟ چھوٹے نے گھبرا کر پوچھا۔

''ہم سب سے بہت دور......اب یہاں کبھی نہیں آئیں گے۔'' شیرے نے کہا تو سب لڑکے پریشان ہو کر ماسٹر باسط علی کے گرد اکٹھے ہو گئے اور ان سے مختلف سوالات کرنے لگے اور ماسٹر باسط علی انہیں مطمئن کرنے لگے۔ وہ چائے پی کر سب سے مصافحہ کرتے ہوئے باہر آ گئے۔ اتنی محبتوں پر ان کا دل بھر آیا اور آنکھوں میں نمی جمع ہونے لگی۔

ماسٹر باسط علی سڑک پر چلتے ہوئے متلاشی نگاہوں سے پھر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے بس سٹینڈ کی جانب چلنے لگے۔ بس پر سوار ہونے سے پہلے وہ پھر ادھر ادھر دیکھنے لگے، جیسے انہیں کسی کا انتظار ہو۔

''باؤ جی......بس چلنے کو تیار ہے......اگر اس میں سوار ہونا ہے تو جلدی کریں......ورنہ راستہ چھوڑیں۔'' کنڈیکٹر نے قدرے خفگی سے کہا، جو کافی دیر سے ان کے سوار ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔

ماسٹر باسط علی مایوس دل کے ساتھ بس میں سوار ہو گئے۔ سائیں سے نہ ملنے کا انہیں بہت دکھ ہو رہا تھا......نجانے کیوں وہ اسے آخری بار ضرور ملنا چاہتے تھے اور یہ خواہش ان کے اندر بہت شدید ہوتی جا رہی تھی......مگر سائیں کا کہیں کوئی اتا پتہ نہ تھا، وہ مایوسی سے بس کی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگے۔ بس آبادی سے نکل کر کچے پکے راستوں پر ہچکولے کھاتے ہوئے چلنے لگی تو اچانک ماسٹر باسط علی کی نظر ایک درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے سائیں پر پڑی، وہ ایکدم خوش ہو کر کھڑے ہو گئے۔

''بس......یہیں روک دو......مجھے یہاں ہی اترنا ہے۔'' ماسٹر باسط علی نے قدرے بلند آواز میں شور مچاتے ہوئے کہا۔ کنڈیکٹر نے غصے سے ان کی جانب دیکھا اور بس کو روکا۔ ماسٹر باسط علی جلدی سے بس سے نیچے اترے اور قدرے بھاگتے ہوئے سائیں کے پاس چلے گئے۔

''آ.....آپ کہاں تھے.....میں آپ کو ہر جگہ ڈھونڈتا رہا۔'' ماسٹر باسط علی نے سائیں سے شکایتی لہجے میں کہا۔

''ماسٹر.....تو نے مجھے سچے دل سے ڈھونڈا.....اور میں تجھے مل گیا.....ساری بات.....تو.....تیرے سچے من کی ہے نا.....'' سائیں نے مسکرا کر کہا۔

''ہاں.....آج میں جا رہا ہوں.....دعا کرنا.....کہ.....وہ۔'' ماسٹر باسط علی نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''اگر تو اپنے من کو صاف کر کے گیا.....تو.....سب رستے صاف ملیں گے.....من میں ذرا سا شک.....ذرا سی کھوٹ ہوئی تو ہر شے کیچڑ کیچڑ ہو جائے گی.....'' سائیں نے نرمی سے جواب دیا۔

''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے.....نجانے کیوں.....؟ سوچتا ہوں کس منہ سے اس کا سامنا کروں گا.....اور اس سے کیا بات کروں گا.....اور.....اگر.....اس نے مجھے دیکھ کر منہ پھیر دیا.....تو.....پھر.....میں کیا کروں گا.....میں کہاں جاؤں گا؟ ماسٹر باسط علی نے اپنے دل میں پیدا شدہ خدشات اس کو بتائے۔

''ماسٹر.....اک بات پلے سے باندھ لے.....بندہ جو سوچتا ہے.....وہ ہوتا نہیں.....اور.....ہوتا ہے وہ جو سوچتا نہیں.....یہی زندگی کا نچوڑ ہے.....اور یہی بندے بشر کی کہانی ہے۔ انسان کے پاس اپنا کچھ بھی نہیں۔''

سدا نہ باغیں بلبل بولے — سدا نہ باغ بہاراں
سدا نہ ماپے، حسن جوانی — سدا نہ صحبت یاراں
مان نہ کیجیے روپ گھنے دا — وارث کون حسن دا
سدا نہ رون شاخاں ہریاں — سدا نہ پھل چمن دا
سدا نہ رست بازاریں وکسی — سدا نہ رونق شہراں
سدا نہ موج جوانی والی — سدا نہ ندیاں، لہراں
سدا نہ لاٹ چراغاں والی — سدا نہ سوز پتنگاں
سدا اڈاراں نال قطاراں — وتن قد کلنگاں
سدا نہ چھوپے پا محمد — رل مل بہنا سنگاں

ماسٹر باسط علی توجہ سے سائیں کو سنتے رہے اور ایک ایک بات کو ذہن نشین کرتے رہے۔

''اب تو.....جا.....رب راکھا.....وقت بہت گزر گیا ہے اور اس کے پاس جلدی پہنچنے کی کوشش کرنا.....دیر ہو گئی تو ساری زندگی پچھتاتے رہو گے۔'' سائیں نے ذو معنی انداز میں کہا اور ماسٹر باسط علی نے حیرت سے سائیں کی جانب دیکھا۔

''اس کا کیا مطلب ہے.....؟ ماسٹر باسط علی نے پوچھا۔

''ماسٹر...... کچھ باتیں وقت سے پہلے بتا دی جائیں تو بڑے مسئلے پیدا ہو جاتے ہیں...... تو...... بس...... اس تک پہنچنے کی کوشش کر...... جا...... اب چلا جا......'' سائیں اس کے ساتھ کھڑا ہوتا ہوا بولا۔

ماسٹر باسط علی نے مصافحے کے لئے پہلی بار اپنے ہاتھ اس کی جانب بڑھائے۔ سائیں کے ہاتھ انتہائی یخ تھے اور چھونے میں روئی سے بھی زیادہ نرم محسوس ہوئے...... ایسے ہاتھوں کا لمس ماسٹر نے زندگی میں پہلی بار محسوس کیا، ان ہاتھوں کی لطافت ان کے رگ و پے میں اتر گئی...... انہوں نے جھرجھری لی...... اور ان کے سارے جسم میں اک عجیب سی برقی لہر دوڑ گئی اور سارا جسم کپکپانے لگا۔

''اللہ...... نگہبان۔'' سائیں نے ماسٹر باسط علی کی بدلتی کیفیت دیکھ کر اپنے ہاتھ چھڑائے اور مسکرا کر ان سے جدا ہو گیا۔ ماسٹر باسط علی دم بخود رہ گئے۔ سائیں اپنی لاٹھی سے چھن چھن کرتا نظروں سے اوجھل ہو گیا اور ماسٹر باسط علی حیرت سے اسے دیکھتے رہ گئے۔ اچانک ایک بس ان کے پاس آ کر رکی...... اور...... وہ اس میں سوار ہو گئے۔

☆

رات آدھی سے زیادہ گزر گئی تھی۔ اچانک شاہ زیب کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ایک دم ہڑبڑا گیا اور اپنی لاٹھی کو ٹٹولتے ہوئے اس کے سہارے کمرے میں چکر لگانے لگا۔ جب سے نازی اس کے پاس سے گئی تھی، وہ کئی روز سے اضطراب میں مبتلا رہا تھا...... اور...... اب دو تین راتوں سے وہ عجیب و غریب خواب دیکھ رہا تھا۔ کبھی نازی کو پریشان دیکھتا تو کبھی باسط علی کو...... مگر آج رات اس نے جو کچھ خواب میں دیکھا تھا۔ اس نے اسے بے حد مضطرب کر دیا تھا۔ وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا اور صبح ہونے کا شدت سے انتظار کرنے لگا۔ اس کے لئے ایک ایک لمحہ گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ کافی دیر بعد پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں آنے لگیں اور اسے صبح کی آمد کے بارے میں آگاہ کرنے لگیں۔

تھوڑی دیر بعد بہرام خان اس کے کمرے میں آیا...... اور اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات دیکھ کر چونک گیا۔

''شاہ زیب...... بھائی...... کیا بات ہے......؟ آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں...... خیریت تو ہے؟'' بہرام خان نے پوچھا۔

''ہاں...... سب ٹھیک ہے۔'' اس نے جواب دیا

''یوں لگ رہا ہے...... آپ رات بھر نہیں سوئے۔'' بہرام خان نے پوچھا۔

''ہاں...... اچانک آنکھ کھل گئی تھی۔'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

''کیا...... کوئی...... خواب دیکھا ہے؟'' بہرام خان قدرے تجسس ہو کر اس کے بہت قریب بیٹھ کر سرگوشی کے انداز میں بولا۔

''ہاں......'' شاہ زیب نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''کیا دیکھا ہے......؟''

''بہرام خان...... میرا آخری وقت آنے والا ہے۔ شاید ابھی، دوپہر کو، یا رات کو، یا پھر کل، یا پرسوں، مگر بہت جلد...... لیکن وعدہ کرو...... کسی کو نہیں بتاؤ گے۔'' شاہ زیب نے بہرام خان کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''یہ.....یہ.....آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ وہ بوکھلا کر بولا۔

''جو مجھے بتایا گیا ہے.....وہی بتا رہا ہوں۔''

''مگر.....یوں.....اچانک.....اتنی جلدی.....'' بہرام خان بے ربط انداز میں بولا۔

''پوری کائنات امر کن کی محتاج ہے.....جلدی.....یا دیر کی نہیں.....جب اس کا حکم آتا ہے تو پوری کائنات اور اس میں موجود ہر شے کو اس کا حکم ماننا پڑتا ہے۔'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

''مگر.....ہم.....آپ کے بغیر.....؟'' بہرام خان رونے لگا۔

''ہر ایک کو اپنا وقت پورا کرنا ہے.....سب زندہ رہتے ہیں۔ چاہے وہ کتنا واویلا کیوں نہ کریں۔..... ہر شے اس کی مرضی کے مطابق چلتی ہے.....'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

بہرام خان سسکیاں بھرنے لگا۔

''سنو.....میرے بعد.....یہاں ایک شخص آئے گا.....اسے میری قبر پر ہی روک لینا۔ اسے کہیں جانے مت دینا.....اس کی عزت کرنا.....اور اماں جی کو کہنا کہ اس سے کوئی شکایت نہ کریں.....اور اسے میری طرح ہی سمجھیں۔'' شاہ زیب نے آہستہ آہستہ اسے بتایا۔

''کون.....ہے.....وہ.....؟'' بہرام خان نے حیرت سے پوچھا۔

''ہے.....کوئی.....اس کا یہاں ٹھہرنا تم لوگوں کے لئے بہتر ہے۔ اسے جانے مت دینا.....میرے بارے میں جب تم سے پوچھے تو اسے کہنا کہ میں نے اسے معاف کیا.....وقت بہت کم ہے، لوگ ڈیرے پر میرے منتظر ہوں گے.....چلو.....چلتے ہیں۔'' شاہ زیب نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''آپ بیٹھئے.....میں ڈرائیور کو کہتا ہوں کہ گاڑی نکالے۔ بہرام خان اپنے آنسو پونچھتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ ڈیرے پر بہت سے لوگ موجود تھے۔ کئی تو صبح ہونے سے پہلے ہی وہاں آ گئے تھے۔ شاہ زیب کو گاڑی سے اترتے دیکھ کر سب اس کی جانب لپکے اور عقیدتاً اس کے ہاتھوں کو چومنے اور بوسہ دینے لگے۔

''سلام.....شاہ جی.....ہم غریبوں کے لئے دعا فرمائیں۔ ہم بہت پریشان ہیں.....'' ہر کوئی اپنی اپنی حاجت بتانے لگا۔ شاہ زیب خاموشی سے سنتا رہا۔

''کیا بات ہے.....شاہ جی.....آج آپ کچھ بول نہیں رہے۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔'' کئی لوگوں نے سوال کیا، مگر شاہ زیب خاموش رہا۔

''میرا خیال ہے.....آج تم لوگ چلے جاؤ.....شاہ جی کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔'' بہرام خان نے سب لوگوں سے کہا تو وہ سب اس کے لئے دعائیں کرتے ہوئے چلے گئے.....شاہ زیب اپنی سوچوں میں گم تھا۔ اسے ان کے جانے کی خبر ہی نہ ہوئی۔ بہرام خان اس کی جانب بغور

دیکھتا رہا اور پھر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

''میں جانتا ہوں...... آپ کیوں اداس ہو رہے ہیں...... زندگی بہر کیف زندگی ہے...... موت کا تصور ہی انسان کا دل دہلا دیتا ہے......''

بہرام خان نے بلاواسطہ انداز میں کہا تو شاہ زیب نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

''موت کا تصور ان کو دکھی کرتا ہے، جن کو زندگی سے پیار ہوتا ہے۔ جن کے لئے زندگی صرف دن اور رات گزارنے کا نام ہو...... وہ بھلا زندگی سے کیا محبت کریں گے۔'' شاہ زیب نے آہ بھر کر کہا۔

''پھر...... آپ کیوں اداس ہو رہے ہیں؟'' بہرام خان نے پوچھا۔

''جب سوچتا ہوں کہ زندگی میں کیا کھویا..... کیا پایا......؟ کہیں زندگی کا یہ سفر رائیگاں تو نہیں گیا..... تو اداسی کی اک لہر سی اٹھتی ہے، جو روح کو بے قرار کرنے لگتی ہے۔ زندگی میں خسارے زیادہ نظر آتے ہیں...... اور حاصل بہت کم......'' شاہ زیب نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''یہ معاملہ تو ہر انسان کے ساتھ ہے۔ شاید قدرت نے انسان کو ایسا ہی بنایا ہے..... یا پھر اس کی قسمت میں خسارے زیادہ لکھ دیے ہیں۔ انتہائی کوشش کے باوجود بھی وہ...... وہ کچھ نہیں حاصل کر پاتا..... جس کی تمنا وہ اندر سے کرتا ہے۔'' بہرام خان نے قدرے سنجیدگی سے جواب دیا، جو اس کی صحبت میں رہ کر قدرے روحانی گفتگو کرنے لگا تھا۔

''میرے لئے دعا کرنا..... اور اسے بھی کہنا...... جو یہاں آئے گا۔'' شاہ زیب نے کہا۔

''آپ کے لئے کوئی..... کیا دعا کرے...... آپ تو خود دوسروں کے لئے دعائیں کرتے ہیں۔'' بہرام خان نے کہا۔

''دعا کی ضرورت تو ہر انسان کو ہوتی ہے...... کونسا انسان یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس کی ساری دعائیں پوری ہوتی ہیں اور ویسے بھی جب خسارے انسان کا مقدر ہوں...... تو اسے دعا کی بھی اتنی ہی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

''شاہ زیب بھائی...... میں جب آپ کی زندگی کے بارے میں سوچتا ہوں تو بہت حیران ہوتا ہوں۔ آپ کیا تھے اور کیا ہو گئے ہیں...... قدرت نے آپ کو کیسے بدل دیا۔ انسان کو کیا خبر ہوتی ہے کہ آئندہ آنے والے وقت میں اس کے ساتھ کیا ہونا ہے...... اور...... وہ کیا ہو جائے گا؟'' بہرام خان نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں...... میں خود بھی سوچتا ہوں تو بہت حیران ہوتا ہوں۔ ایک ان پڑھ انسان پر اللہ اتنا کرم کرے کہ اسے بہت سی چیزیں بن کہے اور بن بتلائے سمجھ میں آنے لگیں تو ایسے انسان پر یہ خدا کی نظر کرم نہیں تو اور کیا ہے۔'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

''اور...... یہ کرم بہت خاص لوگوں پر ہوتا ہے۔'' بہرام خان نے کہا۔

جواباً شاہ زیب خاموش ہو گیا۔

''بہرام خان بھی اس کی جانب دیکھتا رہا اور اسے دیکھ کر اس کے اندر غم اور اضطراب پیدا ہوتا رہا۔ شاہ زیب اپنی لاٹھی کے سہارے اپنے حجرے کے اندر چلا گیا اور بہرام خان وہیں بیٹھا اس کے بارے میں سوچ سوچ کر دکھی ہوتا رہا کہ اس کے بغیر وہ سارے کام کیسے چلائے گا...... اور

اس کے بغیر وہ اپنے آپ کو کتنا ادھورا محسوس کرے گا۔ اس کی آنکھیں بار بار نم ہونے لگیں...... اور وہ آہیں بھرنے لگا...... دکھی دل کے ساتھ وہ ڈیرے کے مختلف کاموں میں مصروف رہا، مگر ایک لمحے کو بھی شاہ زیب اس کی سوچوں سے محو نہیں ہوا۔

شاہ زیب حجرے میں چارپائی پر لیٹا چھت کو اپنی تاریک آنکھوں کے ساتھ گھورتا رہا...... اور اپنی سوچوں میں مگن رہا۔

نجانے کتنا وقت گزر گیا تھا، اسے کوئی خبر نہ تھی، مگر ہر سو چھائی گہری خاموشی سے وہ رات کی تاریکی کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ اب حجرے کے باہر قدموں کی کوئی چاپ بھی سنائی نہ دے رہی تھی۔ بہرام خان کو اچانک شہر جانا پڑ گیا تھا۔ ان کے ایک ڈرائیور کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اور بہرام خان کا وہاں پہنچنا بہت ضروری تھا۔ وہ شاہ زیب کو بتا کر چلا گیا...... اور اس کے جانے کے بعد دو تین بار ملازمین اس سے مختلف ضروریات کے بارے میں پوچھنے کے لئے آتے رہے، مگر اسے کسی شے کی طلب نہ تھی...... اس کے ذہن میں پچھلی رات کو دیکھا ہوا خواب بار بار گھوم رہا تھا۔ اس نے بہت واضح انداز میں ایک قبر دیکھی تھی اور قبر کے باہر اس نے باسط علی کو بیٹھے دیکھا تھا۔ وہ باسط علی کے پاس کھڑا ہو کر بہت حیرت سے قبر کی جانب دیکھتا ہے اور سوال کرنے کی کوشش کرتا ہے، مگر اس کی زبان اس کا ساتھ نہیں دے پاتی۔

"یہ آپ کی قبر ہے۔" باسط علی اسے بتاتا ہے۔

"میری...... ؟" شاہ زیب حیرت سے سوال کرتا ہے۔

"ہاں...... بہت جلد...... آپ اس میں دفن کیے جائیں گے...... اور میں ہر روز اس پر پھول چڑھایا کروں گا...... یہ کام میرے ذمہ لگایا گیا ہے۔" باسط علی اسے بتاتا ہے اور گلاب کے پھول اور پتیاں دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر اس کی قبر پر پھیلانے لگتا ہے اور آنکھیں بند کر کے دعا میں مصروف ہو جاتا ہے۔" خواب ختم ہو جاتا ہے۔

"باسط علی کا میرے ساتھ کیا تعلق ہے...... وہ خواب دیکھنے کے بعد مسلسل یہی سوچ رہا تھا اور اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس سے قبل وہ اللہ سے جو سوال پوچھتا تھا اس کا جواب اسے فوراً مل جاتا تھا۔ ایسا بہت کم ہوا تھا کہ وہ کوئی سوال کرتا اور اسے جواب نہ ملتا۔ وہ صبح سے رات تک...... اٹھتے...... بیٹھتے...... لیٹے اور جاگتے ہوئے وہ مسلسل یہی سوال پوچھ رہا تھا، مگر اسے کوئی جواب نہیں دیا جا رہا تھا۔ ہر بار گہری خاموشی چھا جاتی۔

"باسط علی...... ہی کیوں...... ؟" اس کے ذمہ یہ کام کیوں لگایا گیا ہے...... ؟ میرا اس کے ساتھ کبھی بھی بہت گہرا تعلق نہیں رہا...... اس نے تو مجھے دھوکہ دیا...... اور...... میں نے کبھی اسے دل سے اچھا نہیں سمجھا...... اس سے تو کبھی ملنے کی تمنا بھی نہیں کی...... اسے کبھی اتنا اہم نہیں سمجھا کہ میرے بعد اسے میرا ایک کام سونپا جاتا...... اسے اپنے اور باسط علی سے تعلق کی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی...... اور یہ بات اس کے لئے بہت الجھن پیدا کر رہی تھی۔

اچانک اسے پانی کی شدید پیاس سی محسوس ہونے لگی...... اس کے حجرے کے باہر برآمدے میں پانی کا ایک گھڑا رکھا تھا۔ وہ اپنی چھڑی کے سہارے آہستہ آہستہ...... ٹٹولتا ہوا بڑی مشکل سے...... ٹھوکریں کھاتا ہوا گھڑے تک پہنچا۔ گھڑے پر کوئی ڈھکن نہیں تھا...... اس نے پاس رکھے گلاس کو ٹٹول کر گھڑے میں ڈال کر پانی نکالا اور آہستہ آہستہ پینے لگا۔ پورا گلاس پی کر وہ پھر حجرے میں چلا گیا اور چارپائی کے ساتھ بچھی چٹائی پر

کھڑا ہو کر نماز ادا کرنے لگا...... اس کا دل بہت شدت سے چاہ رہا تھا کہ وہ خدا کے حضور سجدہ ریز ہو کر اپنی کوتاہیوں اور گناہوں کی معافی طلب کرے...... نجانے کونسا لمحہ...... اس کی زندگی کا آخری لمحہ ہو...... وہ جیسے ہی نماز کے لئے کھڑا ہوا...... اس کی طبیعت گھبرانے لگی، پیٹ میں درد کے ساتھ ابکائیاں آنے لگیں۔ وہ وہیں تیورا کر گر گیا...... اس نے مدد کے لئے کسی کو بلانا چاہا، مگر اس کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ وہ یونہی تڑپنے لگا...... اس نے چھڑی کے سہارے اٹھنا چاہا اور چارپائی پر بیٹھنا چاہا، مگر نہ تو اس کی ابکائی رک رہی تھی اور نہ ہی درد...... کتنی ہی دیر وہ اسی اذیت بھری کیفیت سے دوچار ہوتا رہا...... اور پھر آنکھیں بند کرلیں...... اس کی سانس رک گئی...... ہمیشہ کے لئے...... صبح ہوتے ہی بہرام خان ڈیرے پر پہنچا...... تو...... جلدی سے حجرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو چٹائی پر شاہ زیب کے مردہ جسم کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ شاہ زیب کا سارا جسم نیلا ہو رہا تھا اور منہ سے ہلکی ہلکی جھاگ بھی نکل رہی تھی، یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے کوئی زہریلی شے کھائی ہو۔ بہرام خان نے ملازموں کو بلایا، اس وقت اکا دکا ڈیرے پر موجود تھے۔

''شاہ جی...... نے رات کو کیا کھایا تھا؟'' اس نے سب سے پوچھا۔

''انہوں نے تو رات کو کھانا بھی نہیں کھایا...... تھا...... کوئی شے بھی نہیں کھائی۔'' بہرام خان کو بتایا گیا۔

''پھر...... انہوں نے کیا کھایا......؟ بہرام خان نے ان کے ہاتھوں اور پاؤں کے نیلے ناخن دیکھتے ہوئے سوچا اور ان کا جسم اچھی طرح دیکھنے لگا کہ کسی سانپ یا بچھو نے...... ڈسا نہ ہو...... مگر جسم پر کہیں کوئی نشان نہ تھا، وہ پریشان ہو گیا۔

''خان جی...... ہوسکتا ہے شاہ جی نے گھڑے میں سے پانی پیا ہو۔'' ایک ملازم نے جو کہ دروازے میں کھڑا تھا۔ اچانک گھڑے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... دیکھو...... اس میں کوئی......'' بہرام خان نے کہا تو اس ملازم نے جلدی سے گھڑے کے اندر جھانکا اسے کوئی شے نظر آئی اور اس نے جلدی سے گھڑا زمین پر توڑ دیا، اس میں ایک چھوٹا سا مرا ہوا سانپ پڑا تھا...... سب حیرت اور خوف سے اسے دیکھنے لگے۔

''اف...... میرے خدایا...... یہ کیا......؟ یہ شخص جو بڑے بڑے سانپوں اور اژدھوں سے کبھی نہیں ڈرتا تھا...... سانپ، کیکڑوں اور بچھوؤں کو اپنے ہاتھوں سے مار دیتا تھا، اس کی موت اس سانپ سے ہوگئی ہے۔'' بہرام خان بری طرح سسکنے لگا۔

یہ سانپ تو اک وجہ ہے...... ورنہ وہ تو کل صبح ہی اپنی موت کی پیشین گوئی کر بیٹھا تھا...... یہ بات صرف بہرام خان جانتا تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ شاہ زیب کی موت کی خبر ہر طرف پھیلنے لگی۔ کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ زیتون بانو کا تو رو رو کر برا حال تھا۔ گاؤں کے ہر فرد کی آنکھیں نم تھیں۔ اس کی عمر صرف چالیس سال تھی اور اس کا وجود پورے گاؤں کے لئے اک رحمت بن چکا تھا۔ اس نے نہ کبھی مزارعوں کو ڈانٹا تھا نہ کبھی تنگ کیا تھا، نہ کبھی ان کی حق تلفی کی تھی اور نہ ہی انہیں کبھی شکایت کا موقع دیا تھا...... اس کی موت پر لوگ دل سے دکھی ہو رہے تھے۔ کسی گھر میں چولہا نہ جلا تھا...... سب لوگ اسے دل سے چاہتے تھے۔ اس کا کہا کبھی کسی نے نہیں ٹالا تھا اور جب سے انہیں یقین ہو گیا تھا کہ اس کی مانگی ہوئی دعائیں پوری ہوتی ہیں، تو وہ محسوس کرنے لگے تھے کہ اس کا اللہ کے ساتھ کوئی گہرا اور خاص تعلق ہے، اس لئے وہ شاہ زیب خان سے 'شاہ جی' مشہور ہو گیا۔ لوگ

بہت پرامید ہو کر اس کے پاس آتے تھے، وہ کوئی بڑا دعویٰ نہیں کرتا تھا کہ وہ کوئی اللہ والا ہے...... یا...... کوئی پیر...... فقیر ہے۔ وہ سب کے لئے ہاتھ اٹھا کر اجتماعی دعا کرتا تھا۔ کسی کی کیا دعا ہوتی، کب اور کیسے پوری ہوتی، اسے خود بھی خبر نہ ہوتی۔ اسے تب پتہ چلتا جب لوگ اس کے پاس شکریہ ادا کرنے آتے اور ان کو خوش اور مشکور کرنے والے خدا کا شکر بجالاتا۔ اس کی ساری زندگی لوگوں کے سامنے ایک کھلی کتاب تھی۔ ہزار کوشش کے باوجود بھی وہ یہ جان نہیں پائے تھے کہ اچانک شاہ زیب کے ساتھ کیا ہوا تھا کہ وہ اللہ والا ہو گیا تھا...... وہ تو بس اتنا جانتے تھے کہ اس کی آنکھیں بے نور ہو گئی تھیں اور انہوں نے دنیا کو دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔

''باہر کی دنیا نظر آنا بند ہوئی...... تو...... اندر کی دنیا دکھائی دینے لگی۔'' لوگ ایک دوسرے کو کہتے۔

''لیکن...... ایسا تو بہت لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے کہ ان کی آنکھیں بے نور ہو جاتی ہیں، مگر ہر ایک پر ایسا کرم کہاں ہوتا ہے جیسا شاہ جی پر ہوا...... وہ اللہ کے خاص بندے تھے۔'' انہیں میں سے کوئی جواب دیتا۔

''ہاں...... یہ تو...... مولا کے نظر کرم کی بات ہے...... ہر کوئی...... اس قابل کہاں؟ کوئی اور جواب دیتا۔

''شاہ جی کے جانے سے یہ گاؤں خالی ہو گیا ہے۔ اب...... کوئی اور ایسا دکھائی نہیں دیتا، جو ان کی جگہ لے۔''

ہاں......'' وہ سب مایوسی سے باتیں کرتے۔

سارا گاؤں حویلی کے وسیع و عریض صحن میں جمع تھا۔ زیتون بانو نے رو رو کر برا حال کر رکھا تھا۔ وہ بار بار بے ہوش ہو جاتیں...... تھوڑی دیر کے لئے ہوش آتی...... شاہ زیب کی کفن شدہ میت کو دیکھتیں اور پھر گر جاتیں۔

''بہرام خان...... اب کس بات کی دیر ہے...... شام ہو رہی ہے۔ نماز جنازہ ادا کر دینی چاہئے۔'' شاہ زیب کے ماموں نے کہا۔

''ہاں...... بس مولوی صاحب کا انتظار ہے...... وہ ساتھ والے گاؤں میں ایک جنازہ پڑھانے گئے ہیں، ابھی تک نہیں لوٹے۔'' بہرام خان نے جواب دیا۔

''کیا...... تم نے ان کو نماز جنازہ پڑھانے کو کہا تھا؟''

''کہا تھا......'' بہرام خان نے جواب دیا۔

سب منتظر تھے کہ کب مولوی صاحب تشریف لاتے ہیں، اچانک تیز آندھی چلنے لگی...... اور اس کے ساتھ ہی تیز بارش شروع ہو گئی، سب گھبرا گئے۔ میت کو اندر کمرے میں رکھا گیا، لوگ تر بتر ہو گئے، کچھ اپنے گھروں کو چلے گئے، ساری رات بارش ہوتی رہی، پورے گاؤں میں جل تھل ہو گئی۔ ہر طرف کیچڑ اور بارش کا پانی اکٹھا ہو گیا تھا۔ اگر شاہ زیب نیک انسان نہ ہوتا تو ہر کوئی یہی کہتا کہ یہ سب اس کے گناہوں اور برے اعمال کا نتیجہ ہے کہ قدرت نے اتنا طوفان برپا کر دیا ہے...... مگر شاہ زیب کی عصمت و عظمت کا ہر کوئی گواہ تھا، اس کے بارے میں کوئی برا لفظ کہنا بھی اس کی شان میں گستاخی کے برابر تھا۔ نجانے قدرت کی کیا مصلحت تھی کہ جو رات اس نے قبر میں گزارنی تھی، وہ حویلی کے کمرے میں اپنے عزیزوں کے درمیان گزاری۔ صبح ہوتے ہی بارش تھمی...... اور...... موسم قدرے خوشگوار ہو گیا۔ صاف شفاف نیلے آسمان پر سورج بہت پرسکون انداز میں چمک رہا

تھا۔ سب نمازِ جنازہ کے لئے قبرستان پہنچ گئے۔ ماسٹر باسط علی رات بھر سفر کر کے ڈیرے پر پہنچے تو وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔ ڈیرے پر اتنی ویرانی اور اداسی تھی...... انہیں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا، جس سے وہ شاہ زیب کے بارے میں پوچھتے۔ وہ مخمصے کا شکار ہو رہے تھے۔ ڈیرہ یوں کبھی بھی ویران نہیں ہو سکتا...... ضرور کوئی خاص بات ہے...... اور وہ حویلی جانا نہیں چاہتے تھے۔ زیتون بانو سے نظریں ملانے کی ان میں ہمت نہیں تھی۔ وہ بیگ اپنے کندھے پر ڈالے ڈیرے کو جاتی ہوئی سڑک پر چلنے لگے۔

اچانک لوگوں کا ایک بہت بڑا ہجوم جنازہ اٹھائے ڈیرے کی طرف آتا دکھائی دیا، یوں لگ رہا تھا پورا گاؤں جنازے کے ساتھ ہو...... ماسٹر باسط علی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ لوگ ڈیرے پر آنے کے بجائے اس سے قدرے فاصلے پر رک گئے اور میت کو دفنانے کی تیاری کرنے لگے۔ ماسٹر باسط علی ہجوم کو چیرتے ہوئے آگے بڑھے اور شاہ زیب کی میت دیکھ کر ٹھٹک گئے۔

''جا...... جلدی چلا جا...... ورنہ بہت دیر ہو جائے گی۔'' سائیں کے الفاظ ان کے ذہن میں گونجنے لگے۔

''یہ...... یہ...... کیسے ہو گیا ہے......؟'' ماسٹر باسط علی اپنے حواس پر قابو نہ رکھتے ہوئے چلانے لگے۔ بہرام خان نے چونک کر اس اجنبی شخص کو دیکھا اور اسے شک سا ہونے لگا کہ شاید یہ وہی شخص ہے...... جس کا ذکر شاہ زیب نے کیا تھا۔

''آپ...... کون ہیں؟ بہرام خان نے ماسٹر باسط علی سے پوچھا۔

''ماسٹر باسط علی کے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا، وہ بلند آواز میں روتے رہے۔ ان کی آہ و بکا دیکھ کر سب لوگ حیران ہونے لگے۔

''بہرام خان...... جلدی کرو...... پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے۔'' شاہ زیب کے ماموں نے کہا اور سب نے مل کر شاہ زیب کو لحد میں اتارا۔ سب لوگوں نے دعا کے لئے ہاتھ بلند کئے اور دعا پڑھنے کے بعد ان کی قبر پر پھول چڑھائے۔ سب آہستہ آہستہ وہاں سے جانے لگے، مگر بہرام خان کی نظر ماسٹر باسط علی پر تھی، جو ایک درخت کے نیچے کھڑے ہو کر شدت سے آنسو بہا رہے تھے۔ سب کے جانے کے بعد بہرام خان ان کے پاس آیا۔

''آپ...... کون ہیں...... اور کہاں سے آئے ہیں؟'' بہرام خان نے پوچھا۔

''ایک...... گنہگار'' ماسٹر باسط علی سسکتے ہوئے بولے۔

''کیا...... آپ...... شاہ زیب...... بھائی...... کو جانتے تھے؟'' بہرام خان نے پوچھا

''مجھ سے زیادہ...... کون...... ان کو جانتا ہو گا...... میں ان کا گنہگار اور مجرم ہوں...... ان سے معافی مانگنا چاہتا تھا، نجانے کیوں دیر ہو گئی......'' ماسٹر باسط علی نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''انہوں نے آپ کو معاف کر دیا تھا۔'' بہرام خان نے کہا۔

''ک...... کیسے ماسٹر باسط علی نے پوچھا......'' وہ بہت اللہ والے تھے...... ان کو آپ کی آمد کی خبر ہو چکی تھی۔'' بہرام خان نے کہا۔

''تم نہیں جانتے...... وہ کون ہے......؟ سائیں کے الفاظ پھر ماسٹر باسط علی کے ذہن میں گونجے۔

''اللہ...... والے......'' ماسٹر باسط علی بڑبڑائے۔

"ہاں......اللہ کے خاص بندے......جب سے ان کی آنکھوں کی روشنی چلی گئی تھی۔اللہ نے ان کے دل کی آنکھوں کو روشن کر دیا تھا۔ان کو بہت سچے خواب آنے لگے تھے اور ان کی کہی ہوئی باتیں اور دعائیں پوری ہونے لگی تھیں۔انہوں نے کل مجھے اپنی موت کی خبر بھی دے دی تھی۔"

بہرام خان نے کہا تو ماسٹر باسط علی چونک کر اس کی باتیں سننے لگے......انہیں اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔سائیں گا ہے بگا ہے شاہ زیب کے بارے میں اسے جو کچھ ذو معنی انداز میں بتاتا تھا، وہ سچ ثابت ہو رہا تھا۔ماسٹر باسط علی کے اندر وہی اضطراب پیدا ہونے لگا جو انہوں نے سائیں کی وساطت سے آسمان کو دیکھتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ان کے اندر پھر ویسے ہی دریچے کھلنے لگے تھے۔روشنی کی وہ لہر پھر نمودار ہوئی تھی، جو ان کے قلب و روح کو بے قرار کر رہی تھی۔رگ و پے میں برقی لہریں دوڑنے لگی تھی۔ان کے چہرے کی رنگت بدلنے لگی۔

"آپ......کو......کیا ہو رہا ہے؟" بہرام خان نے پوچھا۔

"معلوم نہیں......" ماسٹر باسط علی نے اپنے سرخ، تپتے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا اور وہاں سے جانے کے لئے مڑنے لگا۔

"آیئے......آپ بھی قبر پر پھول ڈال دیں۔" بہرام خان نے کہا اور ماسٹر باسط علی اس کی سنگت میں قبر پر چلے گئے......اور جیسے جیسے قبر پر پھول ڈالنے لگے۔ان کے اندر کے اضطراب کو سکون سا ملنے لگا......برقی لہر جو رگ و پے میں آگ لگا رہی تھی۔سرد پڑنے لگی۔ان کے بے قرار وجود کو سکون سا میسر آنے لگا۔ایسا سکون انہیں بہت عرصے کے بعد پہلی بار میسر آ رہا تھا۔یہاں سے جانے کے بعد وہ جس آگ میں بری طرح تڑپ رہے تھے اور سکون کا ایک لمحہ بھی میسر نہیں آ رہا تھا۔اس لمحے ایسا سکون ان کی روح میں اتر رہا تھا کہ وہ خود بھی حیران ہو رہے تھے۔دعا کے لئے ہاتھ بلند کرتے ہوئے وہ سسکنے لگے۔

"شاہ جی......میں آپ سے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا، مگر آپ نے مجھے کچھ بھی کہنے کا موقع نہیں دیا۔شاید قدرت کو منظور نہیں تھا......میں آپ کا سب سے بڑا گنہگار ہوں......خطاوار ہوں......آپ کا مجرم ہوں، آپ دوسروں کے لئے دعائیں کرتے رہے......میرے لئے بھی خدا کے حضور دعا فرما دیں......" ماسٹر باسط علی دل ہی دل میں گڑگڑا کر خدا سے دعائیں کرنے لگے......اور......دعا کرنے کے بعد وہ بیگ اٹھا کر واپس جانے کے لئے مڑے۔

"شاہ جی کا حکم تھا......کہ آپ کو یہاں سے جانے نہ دیا جائے۔" بہرام خان نے کہا۔

"کیا......مطلب......؟" ماسٹر باسط علی نے چونک کر پوچھا۔

"شاید آپ کو شاہ جی کی ذمہ داریاں نبھانی ہیں۔لوگوں کی بھلائی کے لئے کچھ کام کرنے ہیں۔" بہرام خان نے کہا تو ماسٹر باسط علی نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔

"میں......اس قابل کہاں؟" ماسٹر باسط علی نے حیرت سے پوچھا۔

اللہ کا فضل موسلا دھار بارش کی مانند ہوتا ہے، جس انسان پر برس جائے......وہ سرسبز و شاداب ہو گیا۔آپ خوش قسمت انسان ہیں، جن پر قدرت مہربان ہو رہی ہے اور اپنا خاص کرم کر رہی ہے۔" بہرام خان نے ماسٹر باسط علی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

ماسٹر باسط علی کی آنکھوں سے پھر آنسو رواں ہو گئے۔ ''اللہ واقعی بہت رحیم و کریم ہے۔ انسان کو وہاں سے عطا کرتا ہے، جہاں سے اس کو گمان بھی نہیں ہوتا......قدرت شاید انہیں کوئی منصب عطا کرنے جا رہی تھی اور وہ اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں سمجھ رہے تھے۔ ان کے اندر پھر ہلچل سی پیدا ہونے لگی، پھر آگ سی بھڑکنے لگی......اور طوفان سا برپا ہونے لگا۔ انہوں نے بے قرار ہو کر پھر پھول دونوں ہاتھوں میں لیے اور قبر پر ڈالنے لگے۔ انہیں پھر وہی سکون ملنے لگا......وہی قرار، وہی ٹھنڈک، ایک دم بھڑکتی آگ سرد پڑنے لگی۔

''اب......میں اس جگہ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا......ایسا قرار مجھے کہیں نہیں ملے گا......جو سکون اس قبر پر پھول ڈالنے سے مل رہا ہے، اس سے قبل کبھی نہیں ملا......کبھی نہیں ملا......'' ماسٹر باسط علی نے آنکھیں بند کر کے سوچا۔

''میں یہاں شاہ جی کا مزار بنواؤں گا اور آپ یہیں رہیں گے......اس مزار پر۔'' بہرام خان نے کہا تو ماسٹر باسط علی نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور مسکرا دیے۔ دونوں ہاتھوں میں پھول بھر بھر کر قبر پر ڈالنے لگے تو ان کے چہرے پر طمانیت سی پھیلنے لگی۔

# حصہ سوئم

# (۱)

بڑی سرکار کے عظیم الشان شاہی دربار میں حاضرین خاموش کھڑے تھے۔ انسانوں کو اذیت میں دیکھ کر وہ بھی مضطرب ہو رہے تھے اور بے شمار سوالات ان کے ذہنوں میں جنم لے رہے تھے۔ یہ کیسا شاہکار ہے جو اتنی اذیتیں اٹھا رہا ہے۔ کیا یہ صرف تکلیفیں اٹھانے کے لئے پیدا کیا گیا ہے؟ یہ کیسا انسان ہے...... جس کے لئے نعمتیں بھی آزمائش بن گئی ہیں۔ کوئی عطا بھی اذیت سے خالی نہیں۔ وہ سوچ رہے تھے اور مضطرب بھی ہو رہے تھے، مگر ابھی انہیں بڑی سرکار سے کچھ بھی پوچھنے کا اذن نہیں ملا تھا...... اس لئے وہ خاموش تھے۔ اچانک کسی مضطرب انسان کے شکووں اور آہوں کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ آہوں کی بازگشت شاہی دربار میں گونجنے لگی، حاضرین نے حیرانگی سے اِدھر اُدھر دیکھا، مگر صدائیں کہیں اور سے آ رہی تھیں۔ انہوں نے نیچے دیکھا۔

☆

شدید سردی کا موسم تھا، آدھی رات کا وقت تھا، ہر طرف گہری خاموشی چھائی تھی، شہیر اپنے بیڈ روم میں بیڈ پر کمبل اوڑھے نیم دراز تھا۔ اس کا دو سالہ بیٹا علی اس کے سینے پر سر رکھے سو رہا تھا۔ اس نے بہت مشکل سے اسے سلایا تھا۔ حرا کی نائٹ ڈیوٹی تھی، اس لئے شہیر کو اسے سلانا پڑا۔ شہیر کی صحت پہلے سے بہتر تھی۔ اس کے سر کے بال قدرے سفید ہو گئے تھے اور چہرے پر سنجیدگی کے تاثرات نمایاں تھے، آنکھوں میں ایک اداسی سی ٹھہر گئی تھی۔ رات کی اس تنہائی میں اسے زل بہت یاد آ رہی تھی، وہ کبھی بھی اسے بھول نہیں پایا تھا...... گو کہ بہت مشکل سے اس نے اس حقیقت کو تسلیم کیا تھا کہ زل کو پانا کبھی بھی ممکن نہیں۔ زل اس کے لئے آسمان پر چمکتے ستارے کی مانند تھی ...... جس کو دیکھ کر اور جس کو یاد کر کے وہ صرف خوش ہو سکتا تھا، مگر کبھی اسے پا نہیں سکتا تھا۔ اس نے اس کو پانے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ مگر قدرت نے ہر بار اسے بری طرح مات دی تھی...... اور اسے ایسی شکست سے دوچار کیا تھا، جو ہر وقت اسے اندر ہی اندر مضطرب اور بے چین رکھتی۔ وہ جب بھی تنہا ہوتا تو زل اس کے پاس آ جاتی۔ زل کی یاد سے فرار ناممکن تھی...... اس کی یادیں اسے اور بے چین کرنے لگتیں۔ لوگ کہتے ہیں...... جذبے سچے ہوں تو آرزوؤں کی تکمیل ضرور ہوتی ہے، مگر سچی محبت ہر بار کیوں ہار جاتی ہے......؟ کیا سچی محبت کی قسمت میں ایسی ہی ناکامی اور شکست لکھی گئی ہے......؟ محبت کی ساری داستانوں میں یہ ایسے ہی انجام سے دوچار ہوئی ہے...... محبت ہر بار ادھوری کیوں رہ جاتی ہے اور یہ ادھوری محبت کتنا تڑپاتی ہے...... کتنا مضطرب رکھتی ہے...... کاش کوئی سمجھ سکے......! اس نے چھت کی طرف اپنی نم آنکھوں سے دیکھا اور اپنے دل میں خدا سے شکوے کرنے لگا۔

''دنیا میں بہت سے لوگ محبت کرتے ہیں اور بہت سے لوگوں کو تو ملا بھی دیتا ہے...... میں نے کیا گناہ کیا تھا کہ تو نے مجھے ہر بار بری طرح شکست دی...... میں نے اس کو پانے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا...... اُسے یقین دلانے کے لئے اپنی جان کو داؤ پر لگایا...... اسے پانے کے لئے

ارسلان جیسے اچھے انسان کو اپنے راستے سے ہٹا دیا..... میں گنہگار اور قاتل بن گیا..... میں اپنی محبت کی شدت میں اس قدر جذباتی اور اندھا ہو رہا تھا کہ مجھے کچھ بھی یاد نہیں تھا..... میرا کوئی بھی مقصد نہیں تھا..... سوائے زل کو پانے کے..... اور جب وہ مجھے ملنے کے قریب تھی..... تو پھر تو نے اس کو مجھ سے چھین لیا۔ ہر بار میرے ساتھ ایسا کیوں کیا.....؟ اگر تو نے اسے میرے نصیب میں نہیں لکھا تھا..... تو پھر اس کی محبت میرے دل میں کیوں ڈالی..... اور اس کی محبت میرے دل میں ڈال کر اس کے دل میں کسی اور کی محبت ڈال دی..... یہ کیسا گورکھ دھندا ہے..... میں زل اور ارسلان کا مجرم بھی ٹھہرا..... اور اپنی نظروں میں بھی گنہگار.....؟ وہ سسکنے لگا۔

''محبت..... میرے لئے اتنی بڑی آزمائش بن جائے گی..... کاش مجھے معلوم ہوتا..... تو میں کبھی زل کی طرف بھی نہ دیکھتا..... مگر کسی کو چاہنا اور نہ چاہنا، نہ انسان کے بس میں ہوتا ہے اور نہ اس کے اختیار میں.....

میں حرا کا بھی مجرم ہوں..... جس نے نارمل زندگی تک لانے میں..... میرا کتنا ساتھ دیا، کتنی جدوجہد کی، کتنی قربانیاں دیں، اپنی محبت بھی قربان کر دی۔ میں جانتا تھا کہ وہ میر سے بہت محبت کرتی ہے اور میر اس سے، مگر میں کتنا غاصب نکلا کہ دونوں کو آزمائش میں ڈال کر ان سے ان کی محبت چھین لی اور وہ خاموش رہے..... شاید ان کی بددعا ہی مجھے لگ گئی ہے کہ مجھے میری محبت ملتے ملتے رہ گئی۔

''ہاں..... شاید..... یہ حرا کی بددعائیں تھیں..... میں نے اس کے ساتھ بہت زیادتی کی..... اسے بہت اذیت میں ڈالا۔'' شہیر کا دل بری طرح کانپنے لگا۔

''نہیں..... حرا..... مجھے بددعا نہیں دے سکتی..... کبھی بھی نہیں..... وہ تو مجھ سے بہت محبت کرتی ہے..... ''محبت''.....؟ اس کے دل نے حیرت سے سرگوشی کی۔

''حرا..... مجھ سے کیسے محبت کر سکتی ہے.....؟ جبکہ میں نے کبھی بھی اس سے ویسی محبت نہیں کی، جیسی زل سے کی ہے..... جبکہ زل نے تو میرے لئے کبھی بھی کچھ بھی نہیں کیا تھا، جو کچھ حرا نے میرے لئے کیا ہے۔ زل کے کینیڈا جانے کے بعد حرا نے کس کس طرح اس کے ٹوٹے دل کو سنبھالا تھا، یہ وہی جانتا تھا۔ اس نے زل سے اپنی شدید محبت کی ایک ایک بات اسے سنائی تھی اور وہ سب کچھ خاموشی سے سن کر اس کی دلجوئی کرتی رہی، کس عورت میں اتنا ظرف ہو سکتا ہے، جتنا حرا میں تھا۔

زل کو کینیڈا گئے پانچ سال ہو گئے تھے..... اور حرا سے شادی کو دس سال گزر گئے تھے۔ کتنے کٹھن مراحل طے کر کے اب وہ ایک نارمل زندگی گزار رہے تھے۔ شہیر نے اپنے فن میں بڑی عزت اور شہرت حاصل کی تھی اور اس مقام تک پہنچانے میں حرا نے ہر قدم پر اس کا بہت ساتھ دیا تھا..... اس نے اس کی ڈرنک کی عادت چھڑائی تھی..... اس کی صحت کا بہت خیال رکھتی تھی۔ اس کے احساسات اور جذبات کی بہت پروا کرتی تھی۔ اس نے اپنا سب کچھ شہیر کو دے دیا تھا۔ شاید محبت بھی.....''

''نہیں..... وہ مجھے کبھی بھی نہیں دے سکتی، جو اس کے دل میں میر کے لئے مخصوص تھی..... جس طرح میں زل کی محبت اسے کبھی نہیں دے پایا۔

علی نے کروٹ بدلی اور رونا شروع ہو گیا۔ شہیر نے اسے گلے سے لگایا اور چپ کرانے لگا، مگر وہ روتا ہی چلا جا رہا تھا، وہ اسے اٹھا کر گلے

سے لگا کر کمرے میں چکر لگانے لگا اور اسے محبت سے والہانہ انداز میں چومنے لگا۔

''یہ محبت کتنی مختلف ہے، اس محبت سے جو میں زل سے کرتا ہوں...... محبت کا ہر روپ کتنا انوکھا اور دلفریب ہے...... علی کو کچھ ہو جائے میں برداشت نہیں کر پاؤں گا۔ علی کو میں اپنے آپ سے جدا بھی نہیں کر پاؤں گا...... یہ میرے وجود کا حصہ ہے...... میرا خون ہے...... میری نسل ہے...... میری محبت کی نشانی ہے...... شاید میرا سب کچھ ہے، مگر اس کے لئے محبت اور ہے...... اور زل کے لئے اور...... اور...... حرا کے لئے......؟ حرا سے میں کیسی محبت کرتا ہوں......؟

''حرا مجھے کمرے میں نظر نہ آئے تو میں اسے مس کرتا ہوں۔ دکھائی نہ دے تو دیکھنے کو بے تاب ہو جاتا ہوں...... وہ روٹھ جائے تو مضطرب ہو جاتا ہوں۔'' رات گئے تک وہ اسے مس کال دیتا رہا......

''پھر بھی...... میں حرا سے زل جیسی محبت کیوں نہیں کر پایا...... وہ علی کو کندھے سے لگائے کمرے کا چکر کاٹتے ہوئے سوچنے لگا۔

اس کا موبائل بجنے لگا، حرا کا فون تھا۔

''کیا آپ سو رہے تھے؟''

''نہیں......''

''کیوں......؟''

''علی اٹھ گیا تھا۔ اس کو سلا رہا ہوں...... اب سویا ہے۔'' شہیر نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''کیا آپ نے میڈیسن لی ہیں؟''

''ہاں......''

''اپنا خیال رکھیے گا...... اور...... سو جائیں۔'' حرا نے کہا۔

''تھینکس......'' وہ بولا۔

''حرا......'' وہ قدرے توقف کے بعد بولا۔

''جی......'' وہ ایکدم یوں بولی جیسے وہ کچھ سننے کے لیے شدید بے تاب ہو۔

''حرا...... تھینکس...... فار یور کیئر...... اینڈ۔'' وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر بولا۔

''اینڈ......؟'' وہ پھر بے صبری سے بولی۔

''یور...... لو...... (Your Love) آئی......'' وہ آہستہ سے بڑبڑایا۔

''آئی......؟ کیا......؟'' حرا نے متجسس ہو کر پوچھا۔

''آئی...... مس...... یو'' اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

''آئی......تو......؟......'' وہ مایوس کن لہجے میں بولی۔

''بائے......اپنا خیال رکھنا......سردی بہت ہے۔'' شہیر نے کہا اور موبائل آف کر دیا۔

''میں حرا سے کبھی بھی اظہار محبت کیوں نہیں کر پاتا......میری زبان کیوں رک جاتی ہے......الفاظ میرا ساتھ کیوں چھوڑ دیتے ہیں...... میں اس کا بہت شکر گزار ہوں۔ اس کا معترف ہوں، اس سے محبت بھی کرتا ہوں......مگر اس سے کہہ کیوں نہیں پاتا۔ شاید اس لئے کہ ڈرتا ہوں کہ وہ میری محبت پر یقین نہیں کرے گی......اور مجھے دل سے اپنی محبت کا بھرم بھی تو رکھنا ہے......کہ میں اس جیسی محبت کسی اور سے نہیں کر پاؤں گا۔''

''یا خدایا! یہ تو نے ہمارے ساتھ کیسا کھیل کھیلا ہے......تو نے ہمیں کتنا الجھا دیا ہے......تو نے ہمیں کتنا مضطرب کر دیا ہے۔ کاش......! تو یہ سب کچھ نہ کرتا......کاش......! محبت کو ہمارے لئے اتنی بڑی آزمائش نہ بناتا......کاش......تو......؟'' شہیر اپنی آنسوؤں سے بھری آنکھوں سے چھت کی طرف دیکھنے لگا اور سسکنے لگا۔ اس کی آہیں اور سسکیاں سن کر حاضرین محفل بھی مضطرب ہونے لگے......اور سفید روشنی کی طرف استفہامیہ اور حیران کن نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ مگر ہر طرف گہری خاموشی تھی۔

☆

باہر شدید دھند اور سردی تھی۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ حرا کی ایمرجنسی روم میں نائٹ ڈیوٹی تھی۔ رات کو ایک بجے......ایک عورت ایمرجنسی حالت میں لائی گئی تھی......اس کے ہاں بچی پیدا ہوئی تھی اور اس کیس سے فارغ ہو کر حرا اپنے روم میں آ کر بیٹھی تھی۔ سردی اور تھکاوٹ سے اس کا جسم درد سے کراہ رہا تھا......اسے رفتہ رفتہ یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے اس میں پہلے جیسی ہمت اور طاقت نہ رہی ہو......اس کے اعصاب تھکنے لگے تھے۔ زندگی کے اتنے سال انتہائی جدوجہد میں ہی تو گزارے تھے۔ پہلے تعلیم حاصل کرنے کی تگ و دو اور پھر شادی کے بعد اپنے آپ سے لڑنے، سمجھانے اور شہیر کو سنبھالنے میں گزر گئے۔

دس سال اس نے جس طرح گزارے تھے یہ وہی جانتی تھی۔ اس نے اپنا اوورکوٹ اتار کر شال اوڑھی اور ہیٹر آن کیا۔ تھرماس میں سے گرم پانی کپ میں ڈال کر کافی بنائی اور آہستہ آہستہ پینے لگی۔ جسم میں کچھ حرارت سی پیدا ہونے لگی۔ اس نے گہری سانس لی اور کرسی کی پشت کے ساتھ سر ٹکا دیا۔ آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کی مگر نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس نے گہری سانس لی اور ایمرجنسی روم میں مریضوں کو دیکھنے کے لئے ایک راؤنڈ لینے چلی گئی۔ واپس کمرے میں آئی تو اس کے موبائل پر شہیر کی دو تین مسڈ کالز تھیں۔ اس نے حیرت سے ٹائم دیکھا۔ رات کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔ شہیر ابھی تک نہیں سویا تھا۔ اس نے اس کا نمبر ملایا۔ شہیر نے پہلی بیل پر فون اٹھایا۔ خیریت......آپ نے فون کیا تھا......؟ حرا نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......آج باہر بہت سردی ہو رہی ہے......آپ ٹھیک ہیں نا......؟'' شہیر نے پوچھا۔

''ہاں......میں ٹھیک ہوں......اور آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں......علی تنگ تو نہیں کر رہا؟'' حرا نے حیرانگی سے پوچھا۔

''نہیں......وہ سو رہا ہے......''

''اور......آپ......؟'' حرا نے متجسس انداز میں پوچھا۔

''نیند نہیں آرہی......''

''کیوں......؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا......'' حرا نے گھبرا کر پوچھا۔

''ہاں......''

''پھر......نیند کیوں نہیں آرہی؟'' حرا نے حیرت سے پوچھا۔

''آئی واز مسنگ یو......'' وہ آہستہ آواز میں بولا۔

''تھینکس......'' وہ زیر لب مسکرا کر بولی۔

''کسی چیز کی ضرورت تو نہیں......؟'' شہیر نے پوچھا۔

''اگر ہوگی......تو کیا آپ دینے آئیں گے؟'' حرا نے جان بوجھ کر معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''ہاں'' اس نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

''تھینکس......'' وہ قدرے پر مطمئن لہجے میں بولی۔

دونوں خاموش ہو گئے جیسے شہیر کچھ کہنا چاہتا ہو اور حرا کچھ سننے کے لئے بے تاب ہو مگر شہیر کچھ نہ بولا۔

''اپنا خیال رکھنا'' وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔

''تھینکس......اور آپ بھی سو جائیے'' حرا نے مایوس کن لہجے میں قدرے سنجیدگی سے کہا اور موبائل آف کر دیا۔ وہ کرسی کی پشت کے ساتھ دوبارہ سر لگا کر چھت کو گھورنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں نمی سی اترنے لگی۔

میں شطرنج کی بساط پر پٹا ہوا مہرہ ہوں جسے خود بھی معلوم نہیں کہ اسے کیسے کیسے اور کس کس نے مات دی ہے......؟

محبت نے......؟

سمیر نے......؟

شہیر نے......؟

ذل نے......؟

قسمت نے......؟

یا پھر......

خدا نے......؟

اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

محبت...... مجھے اس قدر آزمائے گی۔ مجھے معلوم نہ تھا...... میں تو اسے انتہائی خوبصورت اور لطیف جذبہ سمجھتی تھی...... بڑے مان سے میں نے اس کی شاہراہ پر قدم رکھا تھا...... سمیر کی محبت نے مجھے اتنا سرشار کر دیا تھا کہ مجھے دنیا کی ہر شے...... ہر شخص اور ہر جذبہ...... سمیر اور اس کی محبت کے سامنے بے معنی اور فضول محسوس ہوتا تھا۔ سمیر کی محبت نے مجھے اتنا خوش اور پر اعتماد بنا دیا تھا کہ مجھے اپنی منزل بالکل سامنے نظر آتی تھی...... مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ قدرت مجھے اس قدر آزمائے گی...... میری منزل میرے سامنے تھی...... چند قدم کے فاصلے پر...... اور درمیان میں شہیر حائل ہو گیا...... شہیر کہاں سے آ گیا......؟ وہ شخص مجھے ڈیزرو نہیں کرتا تھا...... یا پھر میں سمیر کے قابل نہیں تھی...... کہ خدا نے ہم دونوں کو ایک دوسرے سے چھین لیا......" وہ سسکیاں بھرنے لگی

اور مجھے اس شخص سے ملا دیا...... جسے نہ میری ضرورت تھی اور نہ ہی میری محبت کی...... اسے جس کی تمنا تھی...... اور جس کو وہ حاصل کرنا چاہتا تھا...... وہ کسی اور کی چاہت تھی...... یہ تو نے کیسی بساط بچھائی ہے؟ جس کا ہر مہرہ اپنی اپنی جگہ پر بری طرح مضطرب ہے...... میں شہیر...... سمیر...... اور شاید ژل بھی......" اس نے آہ بھر کر سوچا۔

اس کے موبائل پر شہیر کا میسج آیا تھا۔ وہ ابھی تک نہیں سویا تھا...... ژل اٹھ گیا تھا اور اس نے اسے فیڈر پلا کر پھر سلا دیا تھا...... وہ اسے مس کر رہا تھا۔ وہ میسج پڑھ کر زیر لب مسکرائی...... اور گہری سانس لی۔

"تم مجھے 'مس' کرتے ہو...... میں جانتی ہوں......"

"تم میری عزت کرنے لگے ہو...... مجھے معلوم ہے"

"تم میرا بہت خیال رکھنے لگے ہو۔ مجھے اس کا بھی اندازہ ہے"

"شاید...... تم مجھ سے محبت بھی کرنے لگے...... مجھے اس کا اندازہ نہیں"

"شادی کو دس سال گزر جانے کے بعد بھی...... تم نے مجھ سے ایک بار بھی اظہار محبت نہیں کیا...... تم ہمیشہ...... آئی...... کہتے کہتے رک جاتے ہو...... تو میں سمجھ جاتی ہوں...... تم کیا کہنا چاہتے ہو...... مگر تم کہہ نہیں پاتے...... شاید تم ڈرتے ہو...... اظہار محبت سے...... یا...... اقرار محبت سے کہ شاید میں تمہاری محبت پر یقین کروں یا نہ کروں...... شاید تم اپنے آپ سے بھی ڈرتے ہو کہ "ژل" کی محبت میں مجھے شریک کر کے اس سے کوئی بددیانتی نہ کر بیٹھو...... شہیر...... میں بے تاب رہتی ہوں...... اور بہت بے قرار بھی...... تم سے یہ سننے کے لئے...... کہ تم مجھ سے بھی ویسی محبت کرتے ہو...... جیسی ژل سے ابھی تک کرتے ہو...... میں جانتی ہوں تمہارے دل میں آج بھی "ژل" ہے...... اور میں کہیں آس پاس...... مگر میں تمہارے دل کے اس مقام تک نہیں پہنچ پائی...... جو اس کے لئے مخصوص ہے...... میں کس قدر محروم ہوں...... کس قدر مضطرب...... کس قدر تشنہ اور بے قرار......

میں نے سمیر کی محبت کی خاطر اتنی بڑی قربانی دی...... اپنا جسم اپنا دل...... اپنی زندگی اور اپنی روح...... اس شخص کو سونپ دی...... جو کبھی میرا نہیں تھا...... اور جس کو اپنا بنانے کے لئے مجھے کتنی کٹھن آزمائش میں سے گزرنا پڑا ہے...... آج وہ مجھ سے شناسائی کے سارے دعوے کر سکتا ہے...... میرے لئے اپنی دولت، اپنا آرام...... اپنی آسائشیں اور شاید اپنی جان بھی دینے کو تیار ہو سکتا ہے...... مگر...... محبت نہیں......" اس نے آہ بھر کر سوچا۔

تو نے میری محبت کا کاسہ اتنا خالی کیوں رکھا......؟

محبت کے معاملے میں مجھے اتنا محروم کیوں رکھا......؟

کیا میں کسی کی محبت کے قابل نہیں تھی۔

''نہ شہیر کی......اور نہ ہی سمیر کی......'' وہ سسکیاں بھرنے لگی اور دل میں چپکے چپکے کرنے والے شکوؤں کی بازگشت اوپر شاہی دربار میں سنائی دینے لگی۔ حاضرین افسردہ ہونے لگے۔

☆

شام کے ملگجے سائے ہر جانب پھیل رہے تھے۔ موسم سرد مگر خوشگوار ہو رہا تھا۔ ہر طرف ہوا سے جھولتی درختوں کی ٹہنیاں اور پتے اپنے اندر موسم کی سرشاری بھر رہے تھے اور گرد و پیش کی خوبصورتی ندا اور سمیر کے دلوں میں بھی سرشاری اور مسحور کن احساسات پیدا کر رہے تھے۔ آج چھٹی کا دن تھا۔ وہ لندن کے ایک بہت بڑے اور خوبصورت و سرسبز و شاداب پارک میں ایک بنچ پر بیٹھے تھے...... ندا اور سمیر کی شادی کو صرف چند ماہ گزرے تھے۔

سمیر نے شادی نہ کرنے کا مصمم ارادہ کر رکھا تھا...... حرا نے شادی کے پانچ سال کس قدر اذیت میں گزارے تھے...... سمیر اچھی طرح جانتا تھا حرا کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجتے تھے جب وہ پانچ سال پہلے پاکستان گیا تھا اور شہیر کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا...... ان دنوں حرا نے شہیر سے خلع لینے کا سوچا تھا مگر شہیر کو بیمار دیکھ کر اور سمیر کے کہنے پر اس نے اپنا ارادہ بدل لیا تھا...... انگلینڈ واپس آنے سے پہلے وہ آخری بار حرا سے ملا تھا۔ ایک بار پھر سمیر نے حرا کو اپنی محبت کا واسطہ دے کر اسے خلع لینے سے روکا تھا۔

''محبت خود غرض نہیں ہوتی...... بہت بے لوث ہوتی ہے...... اس کا دامن بہت وسیع ہوتا ہے یہ سب کے درد اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے...... میری خاطر...... میری محبت کی خاطر...... اپنا ارادہ بدل لو'' سمیر نے اسے کہا تو اس نے نم آنکھوں سے اس کی جانب دیکھا۔

''سمیر...... محبت صرف ایک بار ہوتی ہے...... بار بار نہیں...... تم نے مجھ سے میری محبت کا تاوان لینے کی کوشش کی ہے...... اب میں تمہیں بتاؤں گی کہ تاوان کیسے دیتے ہیں......؟ اس کے بعد حرا نے نہ کبھی اسے فون کیا...... نہ اس کی کال اٹینڈ کی اور نہ ہی اس سے کوئی رابطہ رکھا...... دو سال پہلے علی کی پیدائش کے بارے میں جان کر وہ بے حد خوش ہوا تھا اور حرا کو مبارکباد کا فون کیا تھا...... سمیر بے حد خوش تھا اور وہ اس کی پر جوش آواز سن کر خاموش رہی تھی۔ 'شکریہ' کہہ کر اس نے فون بند کر دیا...... سمیر مطمئن ہو گیا جب اسے معلوم ہوا کہ شہیر...... حرا کے ساتھ اچھی اور نارمل زندگی گزار رہا ہے۔ شہیر آرٹ میں بہت نام پیدا کر رہا ہے۔ سمیر اور حرا نے اپنی محبت کی جو قربانی دی تھی...... وہ اس میں کامیاب ہو گئے تھے۔

چار ماہ پہلے حرا نے اسے فون کیا تھا...... سمیر ایک آفس میں جاب کرتا تھا...... آفس ٹائم تھا جب حرا کا فون آیا تو وہ چونک گیا۔

''حرا تم......؟'' وہ انتہائی پر جوش انداز میں بولا۔

''ہاں...... میں...... آپ سے ایک درخواست کرتی ہوں...... وعدہ کریں آپ میری بات مانیں گے'' حرا نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔

''کوئی ایسی بات مت کہنا...... جو میرے اعصاب پر بھاری ہو...... اور...... جو......؟'' سمیر نے مزید کچھ کہنا چاہا۔

''نہیں......ایسی کوئی بات نہیں......آپ وعدہ کریں آپ وہی کریں گے جو میں کہوں گی......کیا میں اتنا بھی ڈیزرو نہیں کرتی؟'' حرا نے استفہامیہ انداز میں پوچھا۔

سمیر خاموش ہو گیا جیسے کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا ہو۔

''ٹھیک ہے......تم میرے ساتھ اتنی زیادتی نہیں کر سکتی جتنی میں نے تمہارے ساتھ کی ہے......آپ جو کہیں گی میں مانوں گا......'' سمیر نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''آپ شادی کر لیں......'' حرا نے جلدی سے کہا۔

''شادی......؟'' سمیر کے لئے یہ بات انتہائی غیر معمولی تھی۔

''ہاں......ممی آپ کی وجہ سے بہت اپ سیٹ رہتی ہیں'' حرا نے کہا۔

''کیا......تم بھی یہی چاہتی ہو......؟'' سمیر نے پوچھا۔

''ہاں......'' اس نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

''کس سے شادی کروں......یہ بھی بتا دو؟''

''جس کو آپ کا دل پسند کرے''

''اور اگر اسے پانا......ناممکن ہو......تو......؟''

''پھر......اس سے......جو آپ کو پسند کرے اور آپ سے شادی کی خواہشمند ہو'' حرا نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

''تم مجھے کتنی بڑی آزمائش میں ڈال رہی ہو......کیا تم جانتی ہو؟''

''اس سے بڑی......آزمائش تو نہیں ہو گی......جس میں......آپ نے مجھے ڈالا ہے'' حرا نے جواب دیا۔

''ہاں......'' سمیر نے مایوس کن لہجے میں جواب دیا۔

حرا نے فون بند کر دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☆

ندا سمیر کے آفس میں جاب کرتی تھی......انگلینڈ میں ہی پیدا ہوئی......اس کی عمر 23 سال تھی اور سمیر اس سے پندرہ سال بڑا تھا مگر وہ بہت ینگ سمارٹ اور ہینڈسم لگتا تھا۔ ندا کی دو سال پہلے اپنے کزن باسط سے شادی ہوئی وہ پاکستان سے آیا تھا مگر ندا کے ساتھ ایڈجسٹ نہ کر سکا اور دونوں میں طلاق ہو گئی۔ ندا بہت پریشان رہتی تھی اور سمیر ہمیشہ اسے دلاسہ دیتا......اور اس کا غم ہلکا کرنے کی کوشش کرتا......ندا سمیر میں دلچسپی لینے لگی......جب حرا نے سمیر کو شادی کرنے کو کہا تو اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اسے یہ پیغام ندا کے لئے دیا جا رہا ہو......ندا کا دل بہت ٹوٹا ہوا تھا اور وہ بہت اپ سیٹ تھی۔ سمیر اسے روتے دیکھ کر بہت افسردہ ہوتا تھا......حرا نے اسے شادی کا کہا تو ندا اس کی نظروں کے سامنے گھوم گئی۔

''ندا کو میری ضرورت ہے...... وہ بہت ٹوٹ چکی ہے...... حرا کی طرح۔ شاید میں حرا سے کی گئی زیادتی کی کچھ تلافی کر سکوں'' سمیر نے بہت سوچ کر ندا کو پرپوز کیا تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ وہ فوراً تیار ہو گئی۔ سمیر جیسا زبردست قسم کا انسان...... جس کا کسی کے ساتھ کوئی افیئر نہیں تھا۔ نہ آفس میں...... نہ...... آفس سے باہر...... جس کی سب سے دوستی تھی مگر کوئی لڑکی اس کے دل میں نہیں رہتی تھی۔ سمیر جیسا خالص انسان ندا کو مل رہا تھا۔ ندا بے حد خوش تھی۔

سمیر نے ممی اور ڈیڈی کو انگلینڈ بلایا اور وہیں سادگی سے ان کی شادی ہوئی۔ سمیر...... حرا کے سامنے نہ تو شادی کرنا چاہتا تھا اور نہ ہی ندا کو کبھی لے کر جانا چاہتا تھا...... ممی...... ڈیڈی بہت خوش تھے کہ سمیر کا گھر بس گیا ہے۔ ندا انہیں بھی بہت پسند آئی۔ بہت خوبصورت، دبلی، پتلی، لمبی، سمارٹ، تیکھے نقوش کی مالک...... انہیں بہت بھائی۔ ندا بے حد خوش تھی...... کہ اسے با سلطے سے اچھا شوہر ملا تھا...... سمیر...... ایسا شخص تھا جس پر وہ آنکھیں بند کر کے اعتبار کر سکتی تھی اور سب سے بڑھ کر اس کے لئے اطمینان کی بات یہ تھی کہ سمیر کے دل میں کوئی لڑکی نہ تھی سوائے ندا کے...... کوئی اور ہوتی تو سمیر اس سے ضرور شادی کر لیتا۔ سمیر میں کسی بھی بات کی کوئی کمی نہ تھی...... ندا کو بہت خوش فہمی تھی کہ وہ سمیر کی زندگی میں آنے والی ''پہلی'' اور شاید ''آخری'' لڑکی تھی۔ وہ سمیر کے بارے میں بہت پوزیسو تھی...... شادی کے بعد وہ ایک دم بدل گئی...... وہ پہلے بہت سنجیدہ اور سوبر دکھائی دیتی تھی۔ اب ایک دم لاابالی بن گئی۔ اس میں کھلنڈرا پن اور امیچورٹی نجانے کہاں سے آ گئی تھی۔ ناز نخرے ادائیں...... چھوٹی چھوٹی باتوں پر انتہائی خوش ہونا...... اپنے معمولی کاموں پر فخر محسوس کرنا...... دن بھر اپنے کیے ہوئے کاموں کو بتا کر تعریفیں کرنا...... ندا کی عادت تھی اور سمیر کو یہ سب کچھ جان کر سخت حیرت اور کوفت ہوتی۔ آفس میں اس کا رویہ قدرے مختلف تھا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ندا اس قدر بدل جائے گی...... شادی سے پہلے کی ندا اور اب کی ندا میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ آفس میں وہ سمیر کے سامنے ہمیشہ بہت سنجیدہ...... سوبر اور نم آنکھوں کے ساتھ آئی...... اور اب وہ بے ہنگم انداز میں ہنستی تو ہنستی ہی چلی جاتی اور سمیر حیرت سے اس کی جانب دیکھتا رہتا...... مگر کچھ نہ کہتا...... شاید دونوں کی عمروں میں بہت فرق تھا...... یا سوچ میں...... دو مختلف ذہنوں کے لوگ اچانک مل گئے تھے۔ ندا سمیر کو پا کر بے حد مسرور تھی۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے قدرت نے اپنی سب سے قیمتی شے سے اس کو نوازدیا تھا اور سمیر اسے پا کر بے حد اداس تھا...... اسے ہر لمحہ حرا یاد آتی وہ بھی شمیر کو پا کر یونہی اداس اور پریشان ہوتی ہوگی...... شاید قدرت مجھے اس درد اور اس کرب سے آشنا کرنا چاہ رہی ہے جس کو میں اس طرح محسوس نہیں کرتا تھا جس طرح اب کرتا ہوں...... سمیر وہی کرتا...... جو ندا چاہتی...... وہ تو اس کو خوش رکھنا اور خوش دیکھنا چاہتا تھا اور وہ خود کتنا خوش تھا...... یہ وہی جانتا تھا...... ندا کا سر فخر سے بلند ہونے لگتا۔ وہ سمجھتی کہ اس میں واقعی کوئی ایسی بات ہے...... ایسا کمال ہے جو سمیر اس کی باتوں کو مانتا ہے...... اور کبھی کبھی وہ کسی شاطر عورت کی طرح اسے ایکسپلائٹ بھی کرتی مگر وہ خاموش رہتا...... سمیر کی زندہ دلی...... زندگی میں جوش، جذبہ تو حرا کی شادی کے بعد ہی ختم ہو گیا تھا۔ رہی سہی کسر ندا نے پوری کر دی تھی۔

ندا کو گھومنے پھرنے کا بہت شوق تھا۔ چھٹی کا دن وہ گھر نہیں گزار سکتی تھی جبکہ سمیر کا دل بالکل بھی باہر جانے کو نہیں چاہتا تھا مگر وہ ندا کی خاطر چلا جاتا...... ہر چھٹی کے روز وہ کھانا بناتی اور دونوں پکنک کے لئے باہر چلے جاتے۔

آج بھی دونوں خوبصورت پارک کے ایک بنچ پر بیٹھے تھے...... ارد گرد لوگ گھوم پھر رہے تھے...... بچے کھیل رہے تھے۔ ندا بہت خوش تھی۔

''سمیر......اس پارک میں......میں......اور باسط اکثر آیا کرتے تھے'' ندا نے کہا تو سمیر اس کی بات سن کر خاموش رہا۔

''سمیر......تم نے کبھی مجھ سے باسط اور میرے ٹرمز کے بارے میں نہیں پوچھا''

''کیا پوچھوں......؟'' سمیر نے آہ بھر کر پوچھا۔

''کیا یہ بھی نہیں پوچھو گے......کہ میں اس سے زیادہ محبت کرتی ہوں یا تم سے؟'' ندا نے مسکرا کر پوچھا۔

''نہیں......پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟'' سمیر نے لاپروائی سے جواب دیا۔

''ہاں......شاید تم اس لئے نہیں پوچھو گے کہ تمہیں محبت کے بارے میں کچھ معلوم ہی نہیں'' ندا نے کہا تو سمیر نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔

''کیا مطلب......؟'' سمیر نے پوچھا۔

''محبت میں انسان بہت پوزیسو ہوتا ہے۔ وہ کسی کی پارٹنر شپ برداشت نہیں کرتا......اور میں دیکھتی ہوں میں جب بھی باسط کا نام لیتی ہوں تم کچھ بھی ری ایکٹ نہیں کرتے......اگر باسط تمہاری جگہ ہوتا تو وہ تمہارا نام سننا بھی پسند نہ کرتا......وہ بہت شکی اور تنگ نظر تھا......وہ میری زبان سے کسی کا نام بھی سننا پسند نہیں کرتا تھا......اس کی انہیں باتوں کی وجہ سے مجھے اس سے نفرت ہوگئی اور ہم دونوں میں علیحدگی ہوگئی'' ندا نے کہا۔

سمیر اس کی بات سن کر خاموش رہا......اور معنی خیز انداز میں اس کی جانب دیکھا۔

''میں......باسط سے محبت نہیں کر پائی......جیسی میں تم سے کرتی ہوں......آئی لو یو ٹو مچ'' وہ اس کے بازو کے ساتھ لپٹتے ہوئے بولی۔

''تھینکس......'' وہ آہستہ آواز میں یوں بولا جیسے اسے اس کی محبت کی ضرورت نہ ہو۔

''سمیر......میں تم سے اتنی محبت کرتی ہوں......اتنی......اتنی......اتنی کہ تمہیں بتا نہیں سکتی'' ندا بہت پر جوش انداز میں بولی۔

''رئیلی......'' وہ طنزیہ مسکراہٹ سے بولا۔

''ہاں......''

''تم......میری محبت میں کیا کر سکتی ہو؟'' سمیر کے منہ سے نادانستہ نکلا۔

''میں تمہارے لئے اچھے کھانے بنا سکتی ہوں......تمہارے کپڑے پریس کر سکتی ہوں جب تم بیمار ہو گے تمہارا خیال رکھوں گی......اور تمہارے بچے پیدا کروں گی......'' وہ شرما کر بولی۔

''اور......؟'' سمیر نے پوچھا۔

''اور......اور......کیا، کیا جا سکتا ہے؟'' ندا نے حیرت سے پوچھا۔

''اگر ہم دونوں کی شادی نہ ہوئی ہوتی......مگر تم مجھ سے بہت محبت کرتیں......اور میں تمہیں باسط سے شادی کرنے کو کہتا تو کیا تم میرے کہنے پر اس سے شادی کر لیتی......؟'' سمیر نے معنی خیز انداز میں بولا۔

ندا نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

''کبھی نہیں......'' وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔

''کیوں......؟'' سمیر کو ایک دم دھچکا سا لگا۔

''تمہاری محبت کی خاطر میں باسط سے کیوں شادی کرتی...... صرف تمہارے کہنے پر میں اپنی ساری زندگی برباد نہیں کر سکتی تھی۔

''کیا...... میری خاطر بھی نہیں؟'' سمیر نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں...... کیونکہ میرے لئے میری 'زندگی' زیادہ اہم ہے۔ 'محبت' نہیں...... زندگی ایک بار ملتی ہے اور محبت پھر بھی مل سکتی ہے...... اس لئے میں اپنی زندگی کبھی برباد نہ کرتی'' اس نے کہا تو سمیر کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

اور...... وہ جس نے میری خاطر اپنی زندگی، اپنی خوشیاں، اپنی محبت سب کچھ قربان کر دیا تھا...... جو کہتی تھی۔

''محبت صرف ایک بار ہوتی ہے...... بار بار نہیں اور وہ محبت میں تم سے کر چکی ہوں...... تم مجھ سے میری محبت کا تاوان مانگ رہے ہو...... اب میں تمہیں بتاؤں گی...... تاوان کیسے دیتے ہیں'' اور وہ دس سالوں سے تاوان دے رہی تھی۔ سمیر کی آنکھوں میں آنسو جمع ہونے لگے۔ اس نے آہ بھری۔

''کیا ہوا......؟'' ندا نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''کچھ نہیں......'' وہ منہ پھیرتے ہوئے بولا۔

''پلیز...... میری بات سے ہرٹ مت ہونا...... آئی ایم ویری پریکٹیکل...... اور ہر پریکٹیکل انسان اپنے فائدے کو زیادہ اہمیت دیتا ہے'' ندا نے کہا۔

''اور جو کسی کی خاطر اپنی زندگی...... اپنی خوشیوں...... اور اپنی محبت کی قربانی بھی دے دیتے ہیں...... وہ کون لوگ ہوتے ہیں؟'' سمیر نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''بے وقوف'' وہ مسکرا کر بولی۔

سمیر حیرت سے اس کی جانب دیکھتا رہ گیا۔

''سمیر...... ان فیکٹ...... تم نے زندگی میں کسی سے محبت نہیں کی ہے نا...... اس لئے تمہیں اس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں...... محبت کرنے والے بہت پوزیسو ہوتے ہیں وہ اس میں کسی دوسرے کو برداشت نہیں کر پاتے...... اور کوئی کسی کی خاطر اپنی محبت کی قربانی کیوں دے گا...... نان سینس...... آئیڈیا......'' ندا نے کہا تو سمیر اس انکشاف پر اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔

''سمیر...... تم بہت پرفیکٹ انسان ہو...... مگر محبت کے معاملے میں بالکل خالی...... تمہارے خلا کو میں اپنی محبت سے پر کروں گی...... تمہارے دل کو اپنی محبت سے بھر دوں گی...... پھر تمہیں خود ہی معلوم ہو جائے گا...... محبت کیا ہوتی ہے...... اور انسان اس کے بارے میں کتنا پوزیسو ہوتا ہے'' ندا نے فخریہ انداز میں کہا اور اپنی ایک دوست کو پارک میں کھڑے دیکھ کر اس کے پاس چلی گئی۔ سمیر کو شدید شاک لگا تھا...... اس نے سچ کی

پشت کے ساتھ سر ٹکایا اور ملگجے آسمان کو دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگیں۔

''ندا...... تم بہت بے وقوف ہو...... جو محبت کو نہ سمجھتے ہوئے بھی سمجھنے کا دعویٰ کر رہی ہو...... تمہیں کبھی معلوم ہی نہیں ہو پائے گا کہ میرے دل میں کون رہتا ہے اور تم میرے دل کو محبت سے خالی سمجھتی ہو...... جبکہ وہ تو اس کی محبت کے احساس سے ہی سرشار ہے۔

''تم...... کبھی بھی...... میرے دل کے اس مقام تک نہیں پہنچ پاؤ گی...... جو...... 'حرا' کے لئے مخصوص ہے۔ میں تم سے کبھی بھی ویسی محبت نہیں کر پاؤں گا...... جیسی میں حرا سے کرتا ہوں...... کبھی بھی نہیں......'' اور آنسو اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔ اس نے گہری سانس لی۔

کاش! میں کبھی یہ سب کچھ حرا کو بتا پاؤں کہ میں اس کے بغیر کتنا ادھورا ہوں...... اس کی محبت کے بغیر کتنا بے قرار......؟ اس نے اپنی بند آنکھیں کھولیں اور ٹکٹکی باندھ کر آسمان کی جانب دیکھنے لگا۔ جس پر رفتہ رفتہ تاریکی پھیلنے لگی تھی۔

''یہ تو نے میرے ساتھ کیا کیا ہے......؟

مجھے میری محبت کے سامنے ہی مجرم بنا دیا ہے......

ایسا مجرم...... جس کا جرم یہ ہے کہ اس نے اپنے رشتے کو اپنے فرض کو...... اپنی محبت پر ترجیح دی۔

''کیا میرا جرم اتنا سنگین تھا کہ تو نے مجھے ندا کی صورت میں سزا دی ہے...... جو اپنی جاہلانہ اور مصنوعی محبت سے لمحہ لمحہ میری روح کو کچوکے لگاتی رہے گی اور مجھے ہر پل...... ہر لمحہ...... حرا یاد آتی رہے گی...... تو نے میرے ساتھ بہت برا کیا...... بہت برا......'' وہ اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر سسکنے لگا اور اس کی آہوں کی بازگشت اوپر شاہی دربار میں سب کو سنائی دینے لگی...... ہر طرف افسردگی سی چھانے لگی۔

☆

آدھی رات کا وقت تھا...... باہر گہری تاریکی چھائی تھی اور ہر طرف گہرا سکوت تھا۔

روشنی بہت دنوں بعد گھر آئی تھی اور آتے ہی اس کی بھتیجی عائشہ اسے ایک آرٹ ایگزیبشن میں لے گئی...... اور وہ...... آرٹ گیلری میں جا کر گویا اپنا ہوش ہی بھول گئی...... آرٹ گیلری میں شہیر حسین کی پینٹنگز کی نمائش لگی تھی اور اس کے سامنے شہیر اپنی بیوی حرا کے ساتھ کھڑا تھا...... وہ پہلے سے بھی زیادہ ہینڈسم، سمارٹ اور سوبر لگ رہا تھا...... اور اس کی بیوی انتہائی خوبصورت، دراز قد، سمارٹ اور پرکشش ماڈرن لڑکی تھی۔

شہیر...... روشنی کو دیکھ کر چونکا اور انتہائی خوشی سے پرجوش انداز میں حرا سے اس کا تعارف کرایا۔

''حرا...... یہ میری بہت اچھی کلاس فیلو ''روشنی'' ہیں...... آج کل کسی کالج کی پرنسپل ہیں...... اور روشنی یہ میری بہت کیوٹ وائف ڈاکٹر حرا شہیر ہیں'' شہیر نے محبت سے حرا کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھ کر کہا اور اس کے کندھے پر اپنا بازو پھیلا کر اسے اپنے ساتھ لگایا۔

''ہیلو...... نائس ٹو میٹ یو......'' حرا نے روشنی سے ہاتھ ملایا۔

''تھینکس......'' روشنی نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

''روشنی کب آئی ہو......؟'' شہیر نے مسکرا کر پوچھا۔

''آج صبح...... اور یہ میری بھتیجی عائشہ ہے...... یہ بھی فائن آرٹ میں ماسٹرز کر رہی ہے۔ اسے آرٹ سے بہت محبت ہے اسی لئے مجھے بھی ایگزیبشن دکھانے لے آئی'' روشنی نے بتایا۔

''پھوپھو کیا یہ آپ کے کلاس فیلو ہیں...... فنٹاسٹک...... یو نو...... ہی از وری نائس پرسنالٹی'' عائشہ نے بعد میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا تو وہ مسکرا دی۔

شہیر...... حرا کو مہمانوں سے متعارف کرا رہا تھا اور وہ دونوں جس جس طرف جاتے...... روشنی حسرت سے ان کی طرف دیکھتی...... اس کا دل اندر ہی اندر کرچی کرچی ہونے لگا۔

''دونوں کس قدر خوش ہیں......'' اس نے آہ بھر کر سوچا۔

''شہیر...... حرا سے کتنی محبت کرتا ہے...... اس کی طرف کس قدر محبت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا جب وہ اسے روشنی سے متعارف کرا رہا تھا...... بار بار اسے اپنے ساتھ لگا رہا تھا۔ تو وہ زیادہ دیر وہاں نہ رک سکی۔ اس کے دل میں اتنا اضطراب پیدا ہونے لگا تھا کہ اگر وہ زیادہ دیر وہاں رکتی تو شاید رونے لگتی۔ اس کی آنکھیں بار بار آنسوؤں سے بھر رہی تھیں۔

وہ شہیر اور حرا سے اجازت لینے کے لئے مڑی...... اور شاید آخری بار اسے جی بھر کر دیکھنے کی طلب اسکے اندر بڑھنے لگی تھی۔

''اب...... اجازت چاہتی ہوں'' روشنی نے شہیر سے کہا۔

''تھینکس فار کمنگ...... ایگزیبشن کیسی لگی......؟'' شہیر نے پوچھا۔

''بہت اچھی......'' وہ آہستہ آواز میں بولی جبکہ اس نے ایک پینٹنگ بھی بغور نہیں دیکھی تھی۔

''روشنی...... کسی روز گھر آنا......'' شہیر نے کہا۔

''ہاں......ہاں......آپ گھر آیئے...... بلکہ میں تو شہیر کے سب فرینڈز کو انوائیٹ کرنا چاہتی ہوں'' حرا مسکرا کر بولی۔

''شہیر......تم لکی (خوش قسمت) ہو کہ تمہاری بیوی تمہارے فرینڈز سے جلس نہیں'' روشنی نے مسکرا کر کہا۔

''ہاں......میں واقعی بہت خوش قسمت ہوں......کہ حرا میری بیوی ہے'' شہیر نے محبت سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا......اور......کوئی چیز چھناکے سے روشنی کے اندر ٹوٹی۔

''خدا حافظ......'' روشنی نے جلدی سے حرا سے ہاتھ ملایا اور دونوں کو خدا حافظ کہہ کر باہر نکلی۔

سارا راستہ وہ مضطرب رہی۔ عائشہ شہیر کے فن کی تعریفیں کرتی رہی......اور وہ کچھ بھی نہیں سن رہی تھی۔

''پھوپھو......شہیر حسین کی وائف کتنی کیوٹ ہے......دونوں میں بہت انڈرسٹینڈنگ ہے......سب ان کو آئیڈیل کپل سمجھتے ہیں'' عائشہ نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے کہا۔

''کون......؟'' روشنی نے چونک کر پوچھا۔

''مسٹر اینڈ مسز شہیر'' عائشہ نے حیرانگی سے جواب دیا۔

''کون آئیڈیل کپل؟'' روشنی نے پھر بوکھلا کر پوچھا جیسے اس کا ذہن کہیں اور ہو......اور وہ کچھ اور سن رہی ہو......عائشہ نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

''کیا آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟'' عائشہ نے حیرت سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

روشنی نے اس کو دیکھ کر آہ بھری اور پھر دونوں خاموش ہو گئیں۔

گھر جا کر وہ اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔ اس کی ماں کو فوت ہوئے دو سال ہو گئے تھے اور وہ کبھی کبھار اپنے بھائی کے پاس آتی تھی......جب وہ اپنے شہر میں آتی تو اس کا دل اور مضطرب اور بے قرار ہونے لگتا۔ ماضی پرت پرت اس کے سامنے کھلنے لگتا......شہیر......اس سے وابستہ یادیں اس کو بے قرار کرنے لگتیں......اور آج تو وہ اس کے سامنے تھا......اس کے دل کو کیسے قرار آ سکتا تھا......جس کی محبت سے وہ کبھی دستبردار نہیں ہوئی تھی......اس کی ماں مرتے دم تک اسے شادی کے لئے مجبور کرتی رہی مگر وہ نہ مانی۔ اس کا دل شہیر کی محبت میں اتنا بے چین اور بے قرار رہتا تھا کہ اسے کوئی اور دکھائی ہی نہیں دیتا تھا۔ اس نے شہیر کی خاطر شادی نہیں کی تھی اور وہ شخص اس کے سامنے کسی اور پر اپنی محبت نچھاور کر رہا تھا......اس کی باتوں میں حرا کے لئے کتنی محبت تھی......اور اس کی شدید محبت اسے مضطرب کر رہی تھی......''روشنی......'' شہیر کی زندگی میں تم کہیں نہیں ہو......اور کبھی بھی نہیں تھی......

''پہلے نرمل تھی......اور......اب......حرا......''

تم نے اس یکطرفہ محبت میں اپنی زندگی برباد کر دی ہے......تمہیں کیا حاصل ہوا......؟ کیا ملا......؟ کچھ بھی نہیں......اس شخص کو ایک لمحے کے لئے بھی کبھی احساس نہیں ہوا کہ روشنی نے اب تک شادی کیوں نہیں کی......؟

روشنی تم کس کرب سے گزر رہی ہو......؟ روشنی......تم نے زندگی کے اتنے سال کس کے انتظار میں گزارے......؟

تم نے اپنے جذبوں کو کس کے لئے مخصوص کر رکھا ہے؟

''شہیر......تمہارے دل میں کبھی میرا خیال نہیں آیا......''

''تمہیں میری آنکھوں سے کبھی میرے دل کی کیفیت کا پتہ نہیں چلا۔ کیا محبت اتنی گونگی......بہری ہوتی ہے کہ دوسرے کے دل کی آواز نہ سن سکے......

شہیر کو میرے دل کی آواز کبھی سنائی نہیں دی......اس کا مضطرب دل اس قدر بے چین ہونے لگا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

یہ یکطرفہ محبت بھی کتنی اذیت ناک ہوتی ہے......جو گیلی لکڑی کی طرح اندر ہی آگ سلگائے رکھتی ہے......اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی......شہیر کتنا مطمئن اور پرسکون نظر آ رہا تھا......میں کس آگ میں جل رہی ہوں......اسے خبر ہی نہیں......

مجھے کیا ملا......؟

کچھ بھی نہیں......دو آنسو اس کی آنکھوں سے گرے۔

کیا حاصل ہوا......؟

شدید احساسِ زیاں......

آنسو اس کی آنکھوں سے بہنے لگے اور وہ کمرے کا دروازہ کھول کر ٹیرس پر چلی گئی۔ ہر طرف گھپ اندھیرا تھا......صرف چاند ستارے چمک رہے تھے۔ وہ ٹیرس کے فرش پر بیٹھ گئی اور حسرت بھری نگاہوں سے آسمان کی جانب دیکھنے لگی۔

وہ کتنے خوش نصیب لوگ ہوتے ہیں جنھیں تو محبت سے نوازتا ہے......وہ جس کی تمنا کرتے ہیں......انہیں تو عطا کرتا ہے......جیسے زل......اس نے ارسلان کو چاہا اور اسے پالیا......اس کا کزن اس سے محبت کرتا تھا......اور پھر دونوں نے ایک دوسرے کو پالیا......زل بہت خوش قسمت ہے......اور حرا بھی......جس کے پاس میری محبت ہے......جس کے لئے میں مضطرب رہتی ہوں......اور وہ اس کی دسترس میں ہے......مجھے جس شے کی تمنا اور طلب ہے......وہ اس سے حرا کو سیراب کر رہا......

حرا......اسے زل سے بھی زیادہ خوش نصیب دکھائی دینے لگی۔ دنیا کی سب سے خوش قسمت ترین عورت

جس کے پاس شہیر تھا......

اس کی محبت......اور اس کا سب کچھ......

وہ سسکنے لگی۔

اگر وہ میرا نصیب نہیں تھا......اور تُو اس کے دل میں میرے لئے کوئی جذبہ پیدا نہیں کر سکتا تھا......تو پھر میرے دل میں اس کے لئے اتنی محبت کیوں پیدا کی؟

میں کیا کروں......؟

شبیر کے علاوہ کوئی اور میرے دل میں سماتا ہی نہیں.....کوئی اور نظر ہی نہیں آتا۔

کتنی بھی کوشش کروں.... میرے دل سے شبیر محو نہیں ہوتا۔

جتنا اسے بھلانے کی کوشش کرتی ہوں.....اتنا ہی اضطراب بڑھتا جاتا ہے۔

میں بہت بے بس ہوں

بہت مضطرب......

بہت بے قرار......

یہ کیسی سزا ہے......؟

اور کس بات کی......؟

کاش مجھے بھی کچھ پتہ چلے.....میرا قصور.....میرا گناہ......؟

میں کس آگ میں جل رہی ہوں؟

یہ کیسی دوزخ ہے......

جو اندر ہی اندر ہر وقت مجھے سلگائے رکھتی ہے......

کبھی سرد نہیں پڑتی......

کاش.....کچھ تو پتہ چلے......،

کچھ تو حاصل ہو......!

لاحاصل کے اس سفر میں.....سب کچھ رائیگاں گیا.....کچھ بھی نظر نہیں آرہا.....سوائے خسارے کے......

محبت.....اتنا بڑا خسارہ بھی ہوسکتی ہے..... مجھے معلوم نہ تھا......

کاش.....وہ آسمان کی طرف دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

کاش......!وہ بڑبڑائی۔

کاش.....وہ سسکنے لگی۔

کاش......!اس کی ہچکی بندھ گئی۔

اور اس نے اپنے گھٹنوں پر سر رکھ دیا.....اور خاموش ہو گئی۔

اس کی آہیں.....سسکیاں.....ہچکیاں.....اور کرب سے ڈوبی ہوئی سرگوشیاں، شاہی دربار میں سنائی دینے لگیں.....سب ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے اور خاموش ہو گئے۔

☆

شام گہری ہو رہی تھی اور سردی بھی بہت تھی۔ زل اپنے بیڈروم میں ہیٹر آن کیے بیڈ پر لیٹی تھی اور اپنے چار سالہ بیٹے عاصم اور ایک سالہ بیٹی نگل کو اپنے ساتھ لٹا کر سلانے میں مصروف تھی۔ اس کا شوہر ایک کمپنی میں کمپیوٹرسٹ کی جاب کرتا تھا۔ آج کل آفس میں کام بہت تھا۔ اس لئے وہ رات کو دیر سے گھر آتا تھا۔ زل ایک سکول میں آرٹ ٹیچر کے طور پر جاب کرتی تھی۔

اس کی زندگی ظاہراً بہت پُرسکون اور مطمئن گزر رہی تھی۔

زل کو پانچ سال ہو گئے تھے کینیڈا میں مقیم ہوئے...... اور جنید کے ساتھ رہتے ہوئے...... دونوں میں نہ کبھی کوئی جھگڑا ہوا تھا نہ کبھی کوئی بحث و تکرار...... یا پھر دونوں نے ایک دوسرے سے اس حد تک سمجھوتہ کر لیا تھا کہ کسی کی کوئی بات بری ہی نہ لگتی۔ کینیڈا آنے سے پہلے جنید اور زل میں بہت محبت تھی۔ بہت فرینکنس تھی۔ وہ گھنٹوں ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہتے۔ گھومتے پھرتے انجوائے کرتے جھگڑا کرتے ناراض ہوتے اور پھر ایک دوسرے کو مناتے...... کئی کئی دن ایک دوسرے سے اگنور کرتے رہتے...... اور پھر ایک دوسرے سے صلح کرنے پر ٹریٹ دیتے...... مگر اب تو ان میں کوئی جھگڑا ہی نہیں ہوتا تھا...... زل بہت شدت سے محسوس کرتی تھی کہ اب دونوں کے درمیان ایک فاصلہ آ گیا تھا...... ایک دیوار حائل ہو گئی تھی...... جو نظر نہیں آتی تھی مگر جسے دونوں محسوس کرتے تھے...... نجانے وہ کونسی دیوار تھی۔ جس کو دونوں ہی نہیں گرا رہے تھے مگر جو دونوں کے درمیان اضطراب کا باعث تھی۔

زل جنید سے دوبارہ شادی کے لئے صرف اس لئے مانی تھی جب جنید اس کے گھر والوں کے سامنے بہت رویا تھا کہ وہ اب بھی زل سے بہت محبت کرتا ہے اور اس نے کینیڈین لڑکی سے شادی اتفاقاً کی تھی۔ اپنا کیریئر اسٹیبلش کرنے کے لئے اسے اس کی ضرورت تھی اور اب وہ اسے طلاق دے چکا ہے...... اسکے گھر والوں نے بھی زل کو قائل کیا اور ویسے بھی زل جب سے حرا سے ملی تھی...... وہ اپنے اندر بہت بے چینی محسوس کرنے لگی تھی۔ وہاں رہ کر وہ پھر شبیر کی دسترس میں ہوتی اور شبیر کبھی اس کا پیچھا نہ چھوڑتا...... ایسے میں اسے جنید کا پرپوزل بہت مناسب محسوس ہوا...... اس نے اسے پہلے والا جنید سمجھ کر شادی کی تھی جو اس سے بہت محبت کرتا تھا اور وہ اس سے...... شادی کے بعد بھی دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے...... مگر ویسی نہیں...... جیسی پہلے کرتے تھے شاید زل اور جنید کے درمیان 'ارسلان' حائل تھا یا جنید کی کینیڈین بیوی۔ وہ دونوں موجود نہیں تھے مگر ان کے 'ہونے' کا احساس دونوں کو مضطرب رکھتا تھا۔

''کیا...... تم ارسلان سے ویسی ہی محبت کرتی تھی جیسی مجھ سے؟'' جنید نے کینیڈا آتے ہی اس سے پوچھا تھا۔

اور وہ خاموش ہو گئی تھی۔

''زل...... میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں'' جنید نے پھر پوچھا۔

''نہ...... پوچھو تو بہتر ہے......'' زل نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''کیوں......؟''

''تم سچ نہیں سن پاؤ گے......''

''اور میں سچ ہی سننا چاہتا ہوں''

''تم مضطرب ہو جاؤ گے۔''

''ورنہ جان کر زیادہ مضطرب ہوں گا''

''میں ارسلان سے تم سے زیادہ محبت کرتی تھی...... کیونکہ اس نے مجھے اس وقت سنبھالا جب میں بالکل ٹوٹ چکی تھی اور مجھے تو تم نے توڑا تھا...... ارسلان کو نہ میری دولت سے غرض تھی نہ میرے اسٹیٹس سے...... اسے تو بس مجھ سے غرض تھی...... مجھ سے محبت تھی...... میری ذات...... میرا وجود اور میرا ٹوٹا دل اس کے لئے اہم تھا...... اور تم نے اپنے کیرئیر کی خاطر مجھے چھوڑا تھا...... اس نے زندگی کی آخری سانسوں تک میری بہت عزت کی...... اور مجھے بہت محبت دی...... اس کی محبت میں کبھی کمی نہ آئی...... '' زل نے کہا اور اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں...... جنید خاموش ہو گیا جیسے اس کے اندر کوئی چیز بری طرح ٹوٹی ہو۔

اس کے بعد جنید نے کبھی ارسلان کا نام نہ لیا...... مگر اس کے جوش میں کمی آ گئی...... اس کی محبت میں نہ سرشاری رہی نہ جولانی...... ایک ٹھہراؤ سا آ گیا...... جیسے کوئی رشتہ نبھانے کے لئے جتنی محبت کی ضرورت ہوتی ہے...... اتنی ہی کرتا ہے یا اتنی ہی جس سے پیاس بجھائی جا سکے...... اور بس زل بھی جنید کو پا کر بہت مضطرب ہو گئی تھی۔

شاید اس نے جنید کی محبت کھو کر ارسلان کی محبت پائی تھی اور ارسلان کی محبت کھو کر جنید کی محبت پائی تھی۔ اس کھونے اور پانے...... اور پا کر کھونے میں اس کا دل کتنا ٹوٹا تھا۔ یہ صرف وہی جانتی تھی۔

دونوں کی زندگیاں بہت مصروف گزر رہی تھیں...... ایک مشین کی مانند دونوں کام کرتے تھے اور جب کبھی زل کو چند لمحے میسر آتے تو ارسلان اس کے سامنے آ کھڑا ہوتا۔ وہ ارسلان کو کبھی نہیں بھول پائی تھی وہ آج بھی اس کے اندر زندہ تھا اس کے دل میں صرف ارسلان تھا...... جنید نہیں...... اسے کبھی کبھی بہت حیرت ہوتی...... اس کے دل میں محبت کی جوت جنید نے جلائی تھی مگر ارسلان نے اسے روشن رکھا تھا...... نجانے وہ کہاں سے آ گیا...... اور ان دونوں کے درمیان شہیر...... جو...... شاید ان دونوں سے بھی زیادہ اس سے محبت کرتا تھا کہ اپنی جان کے در پے ہو گیا تھا...... مگر وہ اپنی محبت کا اظہار نہیں کر پایا تھا...... اظہار بھی جب کیا...... جب بہت دیر ہو چکی تھی...... نجانے شہیر کے ساتھ قسمت کیا کھیل کھیلتی رہی...... جب وہ اس کو پا سکتا تھا...... تو ''ارسلان'' دونوں کے درمیان آ گیا اور پھر...... ''حرا''...... قدرت نے ہر بار اسے مات دی۔

وہ شہیر سے نفرت کبھی بھی نہیں کر پائی تھی...... وہ اسے اچھا لگتا تھا...... شاید ارسلان سے بھی زیادہ...... مگر وہ اس کے دل میں اپنی جگہ نہ بنا پایا...... نجانے اس کے پیچھے کیا راز تھا...... جس کو وہ آج تک سمجھ نہیں پائی تھی...... اس کے لئے کس کی محبت شدید تھی......؟ وہ اکثر اپنے آپ سے سوال کرتی۔

ارسلان کی...... جنید کی...... یا پھر شہیر کی وہ سوچتی۔ شہیر کی محبت سب سے شدید تر تھی...... مگر اتنی شدید محبت کے باوجود بھی وہ مجھے حاصل نہ کر سکا...... کتنی عجیب بات تھی...... اس میں کیا راز تھا جس کو وہ سمجھ نہیں پائی تھی۔

اس کے ذہن میں ان گنت سوالات ابھر رہے تھے اور وہ ان کو سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہی تھی۔

مجھے ہر محبت کے ساتھ ایسی کسک ملی ہے...... جس نے ہمیشہ میرے اندر کو مضطرب رکھا ہے ارسلان سے شادی کے بعد ہر وقت جنید کی بے وفائی اور شبیر کی جنونی محبت نے مجھے چین نہیں لینے دیا اور اب جنید سے شادی کے بعد ارسلان کی بے لوث محبت مجھے کسی دم نہیں بھولتی۔

محبت کیا کھیل کھیلتی ہے......؟ بہت عجیب...... نہ سمجھ آنے والا...... مگر بہت تکلیف دہ...... جو اندر ہی اندر بہت بے چین اور بے قرار رکھتا ہے۔

ایسا کیوں ہوتا ہے......؟

''کسی کو پا کر بھی قرار نہیں ملتا اور نہ پا کر بھی سکون نہیں ملتا'' اس نے دکھ سے سوچا۔

''کاش...... تو ارسلان کو مجھ سے نہ چھینتا...... تو آج میں کتنی خوش اور مطمئن ہوتی ...... میرا اندر مضطرب نہ ہوتا......''

میں کیا کروں......؟ اس اضطراب کو کیسے ختم کروں...... شاید یہ اضطراب اب زندگی بھر ختم نہیں ہوگا...... کیونکہ میں ارسلان کو زندگی کی آخری سانسوں تک نہیں بھول پاؤں گی...... وہ سسکنے لگی۔

بڑی سرکار کے دربار میں اسکی آہوں اور سسکیوں کی بازگشت سنائی دینے لگی۔ حاضرین محفل خاموش تھے اور افسردہ بھی۔

بڑی سرکار نے سچ فرمایا تھا۔ محبت ...... تمہاری آزمائش ہوگی۔ محبت اضطراب سے جنم لے گی اس لئے کسی کو قرار نہیں ملے گا...... ایک کو پا کر اور دوسرے کو کھو کر سب ہمیشہ مضطرب ہی رہیں گے۔

انسان کس قدر راویت میں ہے اسے کوئی شے بھی مکمل نہیں ملی۔

......❁......

# (۲)

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ دنیائے آسمان پر ٹمٹماتے ستاروں کی چمک ماند پڑ گئی تھی...... چاند کی غیر موجودگی نے رات کی تاریکی میں مزید اضافہ کر کے اسے ہولناک بنا دیا تھا۔

تمام نوری مخلوق خاموش تھی...... بڑی سرکار کے دربار سے ابھی کوئی نیا حکم صادر نہیں ہوا تھا۔ کسی کے دل سے انتہائی دلدوز چیخیں بلند ہوئیں اور پھر چیخیں...... آہوں و سسکیوں میں بدل گئیں۔ حاضرین محفل چونک گئے اور نیچے اس جانب دیکھنے لگے جہاں سے چیخیں...... آہیں اور سسکیاں بلند ہوئی تھیں...... آج پھر کوئی انسان اپنا حال دل بڑی سرکار کو رو رو کر سنانے کو بے تاب ہو رہا تھا۔

ڈاکٹر رمیض ساری رات کام کر کر کے تھک گیا تھا اور چند ساعتوں کے لئے اس نے جیسے ہی کرسی کی پشت کے ساتھ سر لگایا تھا اور چند لمحوں کے لئے آنکھیں بند کی تھیں تو اس کی یادداشت میں محفوظ بہت سی بند کھڑکیاں اور دروازے کھل گئے تھے۔ بہت سی باتیں...... بہت سی یادیں...... بہت سے چہرے...... اس کی بند آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے...... ان میں سے ایک چہرہ ڈاکٹر دُریہ اور دوسرا ڈاکٹر دانش کا تھا...... دریہ کو یاد کر کے اس کا دل بری طرح بے تاب ہونے لگا...... چیخیں مارنے لگا وہ اس کے اندر ایک ایسی یاد بن کر زندہ تھی جو اسے ہر پل...... ہر لحہ رلاتی تھی جو اسے ملی بھی...... اور...... چھن بھی گئی...... وہ اس کی دنیا سے کیا گئی...... اس کے وجود کو خالی کر گئی...... اور ابھی تک اس کا دل ان جذبوں سے خالی تھا...... جو وہ صرف...... اور صرف دریہ کے لئے محسوس کرتا تھا گو کہ انہیں جدا ہوئے پانچ سال گزر گئے تھے مگر وہ واقعہ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے آج ہی رونما ہوا ہو...... وہ کتنے کرائسس میں سے گزرا تھا...... نروس بریک ڈاؤن ہونے کے بعد ڈاکٹر محسن زیدی نے اسے جس طرح سنبھالا اور اس کا علاج کیا تھا یہ صرف وہی جانتا تھا۔ وہ زندگی سے اس قدر مایوس اور بددل ہو گیا تھا کہ ہاسپٹل سے گھر شفٹ ہونے کے بعد اس نے ایک بار خودکشی کی بھی کوشش کی تھی...... دریہ سے جدائی کو اس نے قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کیا تھا مگر دریہ کے ساتھ زندگی کی امید...... اور انتھک جدوجہد کا حاصل اس شخص نے چھینا تھا جس پر اس نے بہت اعتبار کیا تھا جس کو انسانیت کے ناتے اپنے سینے سے لگایا تھا جس کے درد کو اپنے دل میں محسوس کیا تھا اور جس کی بیمار مردہ زندگی میں روح پھونکنے کی کوشش کی تھی جس کو اپنے ایثار اور خلوص سے دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کی کوشش کی تھی...... اور وہی شخص اس سے اس کی زندگی...... اور...... اس کی خوشیاں چھین کرلے گیا تھا۔ اسے کس قدر آسانی سے دھوکہ دے گیا تھا اور اس نے کتنی آسانی سے اس پر اعتبار بھی کر لیا تھا۔ اس کی عقل کیسے دھوکہ کھا گئی...... اس کے فہم اور شعور پر اس شخص کی مکاری، عیاری اور چالاکی...... حاوی ہو گئی...... اس نے لمحوں میں اس کے ذہن کے اندر شکوک و شبہات کے تناور درختوں کا بیج بو دیا...... اسے سچ...... جھوٹ...... اور جھوٹ...... سچ لگنے لگا...... اس سے قبل اسے کبھی ایسا تلخ تجربہ نہیں ہوا تھا کہ کوئی انسان کسی انسان کو یوں صریحاً دھوکہ بھی دے سکتا ہے...... وہ تو انسانیت پر یقین کرنے والا...... انسانیت کی خدمت کرنے

والا اور انسانیت کا دکھ درد بانٹنے کا جذبہ اپنے اندر لے کر جوان ہوا تھا۔ اس سے قبل اسے کسی انسان نے دھوکہ نہیں دیا تھا۔ اس نے اس کے بارے میں سنا ضرور تھا اور کتابوں میں بھی پڑھا تھا مگر اسے بالکل بھی یقین نہیں تھا کہ یہ سب کچھ اس کے ساتھ بھی ہوگا اور وہی انسان اسے دھوکہ دے گا جس پر اس نے بہت سے احسانات کیے تھے۔ کوئی انسان اس قدر احسان فراموش، ناشکرا اور دھوکے باز بھی ہو سکتا ہے...... اس نے اس سے اس کی دریہ چھینی...... اس کے گھر کی خوشیاں چھینیں...... اور اس کے بہت سالوں کی جدوجہد بھی لوٹ کر لے گیا...... اس کا انسانیت سے اعتبار اٹھ گیا تھا...... وہ اپنا ملک اور اپنے لوگ چھوڑ کر امریکہ چلا آیا تھا۔ چند ماہ امریکہ میں گزارنے کے باوجود دل یونہی بے تاب رہا تو کینیڈا چلا گیا...... کینیڈا سے آسٹریلیا اور پھر انگلینڈ...... دو سال یونہی در در کی خاک چھانتے گزر گئے...... اس کے اندر کا ڈپریشن اور مایوسی بڑھتی گئی...... نہ کسی سے بات کرنے کو دل چاہتا تھا اور نہ ہی کسی کام میں دل لگتا تھا۔ ہر شے سے بے زاری...... اور اکتاہٹ محسوس ہوتی۔ زندہ رہنے کے لئے کبھی کسی پٹرول پمپ پر جاب کر لیتا...... کبھی کسی اسٹور میں...... اور کبھی کسی ہوٹل میں ویٹر کی جاب کرتا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اسے اپنا پروفیشن بھول گیا ہو یا پھر وہ خود ہی اسے بھلانا چاہتا ہو...... وہ اپنے حافظے میں موجود ہر اس بات کو کرید کرید کر ختم کرنا چاہتا تھا جو اسے ماضی سے وابستہ کچھ یاد دلاتی...... ایک اسٹور پر کام کرتے ہوئے اسے جیسٹ مل گئی...... خوبصورت، اسمارٹ سی لڑکی...... جو اسے ہر وقت گہری سوچوں میں ڈوبے دیکھ کر پریشان ہو جاتی...... جو ہر وقت گم صم...... کھویا کھویا سا رہتا جو کسی اور کو دیکھتا مگر...... اور اس کی نظریں کہیں اور کو دیکھتیں...... جو کسی سے کوئی بات کرنے کا خواہاں نہیں تھا...... جسے ہر وقت خاموشی اچھی لگتی تھی...... انہی دنوں شدید سردی سے وہ بہت بیمار پڑ گیا...... اس کے پاس رہنے کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ جیسٹ اسے اپنے اپارٹمنٹ میں لے آئی اور اس کی بہت دیکھ بھال کرنے لگی...... وہ اس کی اتنی خدمت اور تواضع پر بھی خاموش رہتا...... نہ کبھی کوئی شکوہ کرتا اور نہ ہی شکریہ ادا کرتا...... جیسٹ بہت حساس اور نازک دل لڑکی تھی۔ اسے دیکھ کر اس کا دل پریشان ہو جاتا......

''رمیض...... میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں'' جیسٹ نے ایک روز اس کی برستی آنکھوں کو دیکھ کر کہا۔

شادی کے نام پر اس نے چونک کر جیسٹ کو دیکھا...... اور خاموش ہو گیا۔

''بولو...... جواب دو...... کیا تم بھی......؟'' جیسٹ نے اشتیاق سے پوچھا۔

اس نے انتہائی خاموش آنکھوں سے اس کی جانب دیکھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ وہ بری طرح سسکنے لگا۔

''پلیز...... کبھی کچھ بولو...... کبھی تو کچھ بتاؤ...... تم مجھ سے بات کیوں نہیں کرتے؟'' جیسٹ اس کے پاس بیٹھ کر پر اصرار لہجے میں کہتی اور وہ خاموش نظروں سے اسے دیکھتا اور منہ پھیر لیتا...... بہت مشکل سے جیسٹ نے اسے شادی کے لئے منایا تھا مگر شادی کے بعد بھی اس کی سرد مہری میں کمی نہ آئی تھی۔ جیسٹ تنگ آ کر اسے ایک سائیکاٹرسٹ کے پاس لے گئی...... مختلف قسم کی تھراپیز اور علاج کرانے کے بعد وہ آہستہ آہستہ نارمل ہونے لگا تھا۔ جیسٹ اسے بے انتہا محبت کرتی تھی۔ اس کا بہت زیادہ خیال رکھتی تھی۔ وہ اسے زندگی کی جانب واپس لانے میں کسی حد تک کامیاب ہو گئی تھی۔ وہ جان کر بے حد خوش ہوتی تھی کہ وہ ایک قابل نیورو سرجن تھا۔ رمیض نے اسے کبھی اپنے بارے میں کچھ بتایا ہی نہیں تھا۔ وہ تو اسے ایک معمولی اسٹور کیپر یا ویٹر ہی سمجھتی رہی تھی۔ اس نے بہت جدوجہد کر کے اس کو ایک نیورو سرجن کا اسسٹنٹ لگوایا تھا۔ آسٹریلوی ڈاکٹر پامکو ایک عمر

رسیدہ تجربہ کار اور حلیم الطبع انسان تھا۔اس نے برین کے بارے میں کئی کتابیں لکھی تھیں۔ڈاکٹر رمیض سے اس کو بہت محبت ہوگئی تھی اس کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی۔اس کی بیوی مرچکی تھی اور وہ اپنا زیادہ تر وقت مریضوں اور ریسرچ میں گزارتا۔ڈاکٹر رمیض کو قدرت نے ایک سنہرا موقع دیا تھا۔وہ جو سب کچھ لٹا کر دیار غیر میں آیا تھا تو اسے بہت چاہنے والی بیوی اور اپنے پروفیشن سے متعلقہ اچھے لوگوں سے بھی ملوا دیا تھا۔ڈاکٹر ہاملٹن کی توجہ اور محبت سے اسے دوبارہ اپنے کام اور ریسرچ میں دلچسپی پیدا ہونا شروع ہوگئی تھی۔وہ زیادہ تر وقت اپنی ریسرچ میں مصروف رہتا......اس کی آدھی کی گئی ریسرچ کو ڈاکٹر دانش نے مکمل کیا تھا مگر اس کے خاطر خواہ نتائج برآمد نہ ہوئے تھے۔ان کی تیار کردہ ویکسین مخصوص وقت تک کام کرتی اور اس کے بعد مریض پھر پہلے والی حالت میں آجاتا.....جس ریسرچ نے ان کو شہرت کی بلندیوں تک پہنچایا تھا۔دو ماہ میں ہی وہ دھڑام سے نیچے آگرے تھے۔ہر طرف ویکسین کی ناکامی کا چرچا ہونے لگا۔ڈاکٹر رمیض نے ڈاکٹر ہاملٹن کی مدد سے دوبارہ اس ریسرچ پر کام شروع کیا تھا اور دونوں بہت محنت سے اس پر کام کر رہے تھے۔ابھی ان کی ریسرچ کا خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا تھا مگر وہ بہت پرامید تھے کہ وہ ضرور اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے کیونکہ ان کا مقصد انسانیت کی فلاح اور اس کی خدمت تھا۔

جینٹ نے رمیض سے بہت محبت کی تھی اور اس کی بہت خدمت بھی کرتی تھی۔اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی مگر جیسے ہی وہ نارمل ہوا۔ وہ اپنے پروفیشن اور ریسرچ میں مصروف ہوگیا۔دن رات وہ ڈاکٹر ہاملٹن کی لیب میں مصروف رہتا۔جینٹ اس کے معمول سے تنگ آگئی تھی اور اس کی دلچسپی اپنے ایک کولیگ چارلی میں پیدا ہونے لگی تھی۔رمیض نے دونوں کو کئی بار اکٹھے بھی دیکھا تھا مگر اس نے جینٹ سے کبھی کچھ نہ پوچھا۔ان کو دیکھ کر نادانستہ اس کے ذہن میں ڈاکٹر دانش کے الفاظ گونجنے لگے۔

''عورت بہت بے وفا ہوتی ہے......اس پر کبھی اعتبار نہیں کرنا چاہیے.....تمہاری بیوی بھی تم سے بے وفائی کر رہی ہے......وہ محبت تم سے کرتی ہے مگر اس کے دل میں کوئی اور ہے'' دریہ بھی ایسی ہی تھی......مگر ڈاکٹر رمیض نے دریہ کو کبھی کسی کے ساتھ نہیں دیکھا تھا ڈاکٹر دانش نے نجانے کہاں سے ثبوت اس کے خلاف اکٹھے کر لئے تھے اور اس نے یقین بھی کر لیا تھا مگر جینٹ اب سرعام چارلی کے ساتھ گھومتی پھرتی تھی اور وہ اسے کچھ نہیں کہتا تھا پھر جینٹ نے ایک روز دریہ کے انداز میں ہی اس سے طلاق مانگی تھی۔وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا تھا۔اس لمحے......اسے دریہ اور جینٹ ایک جیسی دکھائی دیں......اور اس نے جینٹ کو بھی طلاق دے دی......مگر جینٹ کے جانے سے اسے اتنا دکھ نہیں ہوا تھا جتنا کہ دریہ کے جانے سے ہوا تھا۔اس کی زندگی شدید تنہائی کا شکار ہوگئی تھی۔وہ ہر وقت اپنے کام میں مصروف رہتا......عورت ذات کو اس نے ہمیشہ کے لئے اپنی زندگی سے خارج کر دیا تھا۔ایک ناقابل اعتبار مخلوق......جس پر اب وہ کبھی اعتبار کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔اس کے اندر بہت ہی عجیب سی تبدیلیاں رونما ہوئیں تھیں۔تنہائی،وہم،وسوسوں کے علاوہ شکوک وشبہات......تنگ نظری اور چڑچڑا پن آگیا تھا۔وہ اپنے علاوہ کسی پر اعتبار نہیں کرتا تھا۔روز بروز ایک complexed پرسنالٹی میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا......ماضی میں وہ ہرگز ایسا نہیں تھا مگر ڈاکٹر دانش نے اس کے اندر کوئی ایسا بیج بو دیا تھا جس نے اس کی مثبت سوچ اور باتوں کو منفی بنا دیا تھا۔وہ اکثر اپنے اندر جنم لینے والی ان باتوں کو ناپسند کرتا......ان سے نفرت کرتا......مگر پھر بھی ان سے چھٹکارا پانا اس کے لئے بہت مشکل ہوگیا تھا۔وہ دریہ سے یکدم بہت محبت بھی محسوس کرنے لگتا اور پھر شدید نفرت سے اس کا اندر جلنے لگتا......جینٹ

اسے اچھی بھی لگتی اور وہ اگلے ہی لمحے اس سے بیزار بھی ہونے لگتا۔ ڈاکٹر ہاکنز مہربان بھی لگتے اور اگلے ہی لمحے وہ ان کے بارے میں مشکوک ہونے لگتا۔ اس کے اندر نجانے کیسی تبدیلیاں آ گئیں تھیں جنہوں نے اس کی اصل شخصیت کو مسخ کرنا شروع کر دیا تھا...... وہ محبت کرنے والا انسان اب کسی سے محبت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ انسانوں کی محبت کے بارے میں انتہائی مشکوک ہو گیا تھا اور جب اس کے اندر ہیجانی کیفیت پیدا ہونے لگتی۔ اسے محبت کی طلب محسوس ہونے لگتی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا۔ وہ اپنے آپ کو بے بس پاتا، سارا وقت اپنی ریسرچ میں مصروف رہتا...... ڈاکٹر ہاکنز سے ڈسکشن کے علاوہ وہ کسی سے زیادہ بات چیت نہ کرتا...... وہ اپنے آپ کو فنا کر کے...... اپنی ذات کو مٹا کر اپنے کام میں مصروف رہتا...... جب کبھی بہت تھک جاتا تو رات کی تنہائیوں میں اسے ماضی کی تلخ یادیں ذہنی اذیت سے دوچار کرتیں۔ اسے خود بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا سوچتا ہے اور کیا کرتا ہے، اس کا ذہن اس کی سوچوں کے برعکس کام کرنے لگا تھا سوائے اپنی ریسرچ کے۔ اس کے سارے کاموں سے توازن اور ہم آہنگی ختم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ بیٹھے بیٹھے شدید ڈپریشن کا شکار ہونے لگتا ...... اس کے اندر کی آہیں اور سسکیاں اس کے ڈپریشن کو ظاہر کرتیں۔

اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں اور دل آہوں و سسکیوں سے بے قرار ہو کر صدائے احتجاج بلند کر رہا تھا۔

”یا خدایا! میں نے کونسا ایسا گناہ کیا ہے...... کہ تو پہلے تو مجھے عطا کرتا رہا...... نوازتا رہا اور پھر چھینتا رہا...... تو نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا...... میری محبت...... بیوی، گھر...... خوشیاں...... سب کچھ...... سب کچھ...... صرف اس لئے کہ میں نے ایک ایسے انسان پر اعتبار کیا...... جو شاید اعتبار کے قابل ہی نہیں تھا...... میری عقل اور سمجھ بوجھ پر کیا پردہ پڑ گیا کہ میں اس سے دھوکہ کھا گیا...... اور اس کی باتوں پر یقین کر لیا...... اس نے مجھ سے یقین اور اعتماد کی دنیا چھین کر ایسا آلودہ کر دیا ہے کہ اب میرا کسی پر بھی اعتبار کرنے کو دل نہیں چاہتا...... ہر انسان بے اعتبار اور بے ایمان لگتا ہے...... تو نے مجھے اس کے شر سے کیوں نہیں بچایا...... مجھے اس کی صورت میں کیسی سزا دے ڈالی ہے کہ میں بھی اپنے آپ کو بہت بے اعتبار سمجھنے لگا ہوں...... میں کیا کروں......؟

میں دریہ کے بارے میں ایسا بدگمان ہو گیا کہ اس کی محبت چاہت خلوص اور رفاقت...... کو لمحوں میں بھلا دیا۔ ایسا کنفیوژ ہو گیا کہ جیت کی اتنی خدمت کو بالکل نظر انداز کر کے اسے یوں اپنی زندگی سے نکالا جیسے وہ کبھی تھی ہی نہیں۔ مجھے کیا ہو گیا ہے......؟ کسی کے ہونے یا نہ ہونے سے اب مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا...... میں وہ کیوں ہو گیا ہوں...... جو...... میں نہیں تھا...... یہ تو نے میرے ساتھ کیا کیا......؟ کیوں...... کیا......؟ میرے لئے اتنی بڑی سزا کیوں تجویز کی...... کہ...... میں اندر ہی اندر سلگتا رہتا ہوں...... کاش...... تم میرے دکھ کو سمجھ سکو...... کاش...... ! کاش...... ! سسکیاں اس کے دل کے اندر سے ابھریں اور آہوں میں بدل گئیں وہ بری طرح رونے اور سسکنے لگا تھا...... ہر طرف گہری خاموشی چھا گئی تھی۔

☆

رات کا پچھلا پہر تھا۔ ہر طرف گہری خاموشی اور ماحول میں اک عجب سی ویرانی چھائی تھی۔ دریہ اپنے بیڈ روم میں اپنے ایک سالہ بچے کو کندھے کے ساتھ لگائے اسے سہلا رہی تھی۔ وہ نیند سے بیدار ہو کر رونے لگا تھا اور دریہ اسے دوبارہ سلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ کافی تگ و دو کے بعد وہ دوبارہ سو گیا تھا اور وہ اسے اپنے ساتھ چمٹائے بیڈ پر لیٹ گئی۔ محبت سے اس کے چھوٹے چھوٹے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیرتی رہی اور اس کی

چھوٹی چھوٹی گرم سانسیں اور منہ سے بہتی رال اس کی گردن کو گیلا کرنے لگی۔ دونوں کے دلوں کی دھڑکن ہم آواز ہو کر ایک دوسرے میں جذب ہو رہیں تھی۔ دریہ کی آنکھوں میں نمی سی اترنے لگی اور اس نے بیڈروم کی کھڑکی سے باہر تاریک آسمان کو دیکھنا شروع کر دیا۔ "یا اللہ! کیا آپ بھی انسانوں سے ویسی محبت کرتے ہیں...... جیسی ایک ماں اپنی اولاد سے کرتی ہے...... مگر اولاد کا دکھ...... ماں تو برداشت نہیں کر سکتی...... پھر آپ ہمیں روتے، سسکتے اور تڑپتے دیکھ کر کیوں کچھ نہیں کرتے...... ہم انسان اذیتوں پر اذیتیں سہتے ہیں...... تکلیفوں اور آزمائشوں کے پہاڑ سر پر اٹھائے پھرتے ہیں۔ اک عجیب سی بے قراری، بے چینی اور ویرانی ہماری روحوں میں بس گئی ہے۔ نہ دکھائی دینے والا کرب ہر وقت ہمیں اندر ہی اندر کچو کے لگاتا رہتا ہے...... مگر ہم کچھ نہیں کر پاتے۔ ہم کس سے فریاد کریں...... جب تو ہی ہماری کوئی فریاد نہیں سنتا...... اور نہ ہی کوئی التجا تو ہم کہاں جائیں اور کس سے فریاد کریں......؟ کب اس اذیت اور کرب سے ہمیں نجات ملے گی...... جو آپ نے شاید ہماری قسمتوں میں لکھ کر انہیں ہماری 'تقدیر' بنا کر انہیں ہمارے گلے میں لٹکا دیا ہے...... جس سے کسی بھی طرح فرار ممکن نہیں...... یا...... پھر ہمارے اعمال...... ہماری قسمتیں بن کر ہمیں اپنے شکنجے سے نہیں نکلنے دیتے۔

میں کہاں سے کہاں پہنچ گئی......؟ میری قسمت نے مجھے وہ وہ دن دکھائے ہیں کہ مجھے خود پر بھی یقین نہیں آتا کہ میں اتنی بدل گئی ہوں۔ میں ڈاکٹر رمیض کے ان لفظوں کو برداشت نہ کر سکی اور میری قسمت نے مجھے ان لفظوں کا ایسا اسیر کر دیا کہ میں ان کے حصار سے آج تک نہیں نکل سکی...... اس وقت مجھے اپنے آپ کو 'بے اعتبار' کہلوانا کس قدر گراں گزرا...... اور وہ رشتہ ہی توڑ دیا جس میں بے اعتباری پیدا ہونے لگی تھی اور قدرت نے مجھے ایسے شخص سے ملا دیا...... جو حقیقت میں بے اعتبار ہے جو ہر لمحہ ہر آن گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا ہے...... جس کے نجانے کتنے روپ ہیں...... جس کی ہر شخصیت دوسری سے مختلف ہے...... جس کا ہر دن...... پہلے دنوں سے زیادہ کریہہ ہے۔ جس کی ہر حالت پہلے سے زیادہ مکروہ ہے...... جس کی سازشیں...... مکاریاں اور چالاکیاں مجھے ہر دم حیران کرتی ہیں...... جو انسان کم...... حیوان اور شیطان زیادہ ہے اور میں اس بے اعتبار شخص کے ساتھ بے اعتبار زندگی گزارنے پر مجبور ہوں کیونکہ اب میری زندگی میں امید باقی نہیں رہی...... مجھے اب محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر رمیض بہت اچھا انسان تھا...... نجانے مجھے کیا ہو گیا تھا...... اور میری عقل...... فہم و فراست نجانے کہاں گم ہو گئی تھی کہ میں نے ایک مکار شخص کی باتوں پر یقین کر لیا...... اس کی عیاری پر اعتبار کر لیا...... اور اتنی بھٹک گئی کہ آج تک پچھتاوے میرا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ میرے اندر ہر وقت ایک ایسی آگ لگی رہتی ہے جو کسی وقت بھی سرد نہیں پڑتی...... مجھے ڈاکٹر رمیض بہت یاد آتا ہے...... ہم اچھی اور پرسکون زندگی گزار رہے تھے کتنی محبت اور چاہت تھی...... ہم دونوں میں...... پھر نجانے کیا ہو گیا کہ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے بارے میں ایسے مشکوک ہو گئے کہ ایک دوسرے پر اعتبار اور اعتماد ہی ختم ہو گیا...... مگر ہم جدا ہو کر بھی جدا نہیں ہو سکے...... رمیض آج بھی میرے اندر زندہ ہے...... جب میں شیر افگن کی مکاریوں کو دیکھتی ہوں تو دل خون کے آنسو روتا ہے...... جس شخص میں کوئی خامی نہ تھی...... وہ مجھے سب سے بُرا لگنے لگا اور جس شخص میں بے شمار کمزوریاں اور خامیاں ہیں...... میں اس کے ساتھ کتنی خاموشی سے زندگی گزار رہی ہوں۔ کوئی احتجاج بھی نہیں کرتی...... وہ جو کچھ کہتا ہے...... خاموشی سے سنتی رہتی ہوں...... جو کچھ کرتا ہے اسے کرنے دیتی ہوں...... میں کیوں ایسی ہو گئی ہوں...... شاید انسانوں پر سے میرا اعتبار اٹھ گیا ہے...... یا پھر قسمت سے...... یا...... پھر اپنے آپ سے؟

یا خدایا......! شاید مجھے آپ پر بھی اعتبار نہیں رہا کسی پر بھی نہیں...... اگر آپ مجھ سے ماں جیسی محبت کرتے تو رمیض مجھ سے کبھی جدا نہ ہوتا اور شیر افگن جیسا بدتر انسان میری زندگی میں نہ آیا ہوتا...... آپ مجھے بچا سکتے تھے مگر آپ نے مجھے نہیں بچایا...... مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا...... رمیض میرا گھر...... خوشیاں...... اور سکون...... میں اب زندہ ہوں تو صرف اپنے بیٹے کے لئے...... اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور اس نے محبت سے اپنے بیٹے کے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور اسے چومنے لگی۔

''کاش......! ایسی محبت آپ بھی مجھ سے کرتے...... تو میں آج اس جہنم میں نہ ہوتی'' اس نے آہ بھری اور پھر سسکنے لگی۔

اس کی زندگی آناً فاناً ایک فلم کے مختلف مناظر کی مانند تبدیل ہوتی گئی۔ اس نے ہر قدم جلد بازی میں اٹھایا وہ اپنی زندگی کے فیصلے عقل و شعور سے نہیں بلکہ دل اور جذبات کی رو میں بہہ کر کرتی گئی۔ اس نے ڈاکٹر رمیض سے شادی کا فیصلہ بھی بہت جلدی میں کیا...... اور طلاق لینے کا فیصلہ اس سے بھی زیادہ جلدی میں...... شیر افگن سے شادی کس طرح اچانک ہوئی...... اسے خود بھی سمجھ نہ آیا...... ڈاکٹر رمیض سے طلاق لینے کے بعد وہ بہت اپ سیٹ رہتی تھی۔ ڈرائیونگ کرنے پر آتی تو دنیا و مافیہا سے بے خبر لانگ ڈرائیو پر نکل کھڑی ہوتی...... ایک روز یونہی لانگ ڈرائیو پر جا رہی تھی۔ اسے قطعی معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ...... اور کس طرف جا رہی ہے۔ اچانک اس کی گاڑی سفید مرسڈیز کار سے بری طرح ٹکرائی۔ شیر افگن کو کافی چوٹیں آئیں۔ وہ بوکھلا گئی اور انجانی پریشانی میں اسے اپنی گاڑی میں ڈال کر ہاسپٹل لے آئی۔ کچھ روز کی تیمارداری اور توجہ سے وہ ٹھیک ہو گیا۔ ان دنوں وہ سب کچھ بھول چکی تھی۔ اسے صرف شیر افگن کی فکر لاحق رہتی تھی اور شیر افگن اس سے بہت متاثر نظر آنے لگا۔ اسے ترقی کرنے والی...... کامیاب عورتیں ہمیشہ سے پسند تھیں ان سے اس کے بہت سے مفادات وابستہ رہتے تھے۔ اسے ہمیشہ سے گھریلو...... عام سی لڑکیاں ناپسند تھیں...... انہیں خوامخواہ میں گھر رکھنا...... ان کی پرورش کرنے کے مترادف سمجھتا تھا۔ فریحہ اس کو بہت پسند تھی اور وہ بھی اس کی کامیابیوں کی وجہ سے...... اور اس نے بہت مشکل سے اسے شیشے میں اتارا تھا۔ اسے کیسے کیسے قائل کیا تھا۔ کس طرح چالاکی سے اس کے دل کے تاروں کو چھیڑا تھا کتنی محنت سے اپنی ذات کو اس کی سوچوں کا محور بنایا تھا مگر دریہ سے ملنے کے بعد وہ فریحہ سے متنفر ہونے لگا۔ فریحہ...... اس کا ابنارمل بچہ...... اس کا شوہر...... اور پھر اس کے بارے میں موصول ہونے والی مختلف کالز نے اسے فریحہ سے دور کر دیا تھا۔ اس کے مقابلے میں دریہ ایک آسان شکار نظر آئی...... اس نے چند دنوں میں ہی دریہ کو اپنا ایسا گرویدہ بنالیا کہ وہ رمیض کو بھول گئی اور دونوں نے اچانک ہی شادی کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے گھر والے بھی اس کے فیصلے پر حیران تھے مگر وہ مطمئن تھی۔ شیر افگن کا معاشرے میں مقام تھا۔ عزت تھی، دولت تھی، وہ خوبصورت اور پرکشش شخصیت کا مالک تھا۔ گفتگو میں اس سے کوئی آگے نہیں جا سکتا تھا...... دریہ ہار گئی اور وہ جیت گیا...... اس نے دریہ کے دل کو ایسا قابو میں کیا کہ پھر فرار ممکن نہ رہی۔ شادی کے بعد شیر افگن ہر روز نیا رنگ اور روپ بدلنے لگا۔ دریہ پر اس کی حقیقتیں کھلنے لگیں...... وہ عورتوں کا رسیا تھا...... فون پر ہر وقت لڑکیوں سے باتیں کرتا رہتا...... دریہ ناراض ہوتی تو وہ مسکرا کر دل لگی کہہ کر اسے مطمئن کرنے کی کوشش کرتا۔ محبت اس کے لئے قابل قدر جذبہ نہیں تھا بلکہ ایک ایسا رنگ برنگی تتلیوں سے آنکھ مچولی کھیلنے کا کھیل تھا جو اسے ہر دم مسرور اور توانا رکھتا...... وہ اس سے ناراض ہوتی، جھگڑتی...... اور وہ مسکرا کر باہر چلا جاتا...... وہ ایسا بے اعتبار شخص تھا جس کے نزدیک نہ کوئی رشتہ قابل اعتبار تھا اور نہ ہی کوئی جذبہ...... دریہ اس کو چھوڑ نہیں سکتی تھی کیونکہ وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی تھی......

جو پیدا ہوتے ہی چل بسا...... اور اب ولید اس کی گود میں تھا...... شیر افگن اس سے بہت دور چلا گیا تھا۔ اس نے ایک اور خفیہ شادی کر رکھی تھی جس کا وہ اعتراف نہیں کرتا تھا۔ وہ دریہ کے پاس کبھی کبھار آتا۔ اس کا آنا اور نہ آنا اس کے لئے برابر تھا...... دریہ اب اس نام نہاد رشتے کو بھی توڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کا کیس کورٹ میں دائر تھا۔ وہ جلد از جلد شیر افگن سے نجات پانا چاہ رہی تھی اور وہ اس کے لئے نت نئے مسائل کھڑے کر رہا تھا۔ کبھی اسے قتل کی دھمکیاں دیتا...... کبھی اس سے ولید کو چھیننے کی اور کبھی اس کی جائیداد چھیننے کی...... مگر وہ خاموش رہتی...... خاموشی سے سب کچھ سنتی...... وہ آتا...... چیختا چلاتا اور چلا جاتا۔ ایک روز وہ چپکے سے اپنے بچے کو لے کر دوسرے شہر چلی گئی۔ شیر افگن اسے طلاق دے یا نہ دے...... اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس کا ولید اس کے پاس تھا...... مگر ان چند سالوں میں اس نے جتنی ذہنی اذیتیں اٹھائی تھیں اس کی سکت سے بہت زیادہ تھیں۔ اس کی گزشتہ زندگی کے لمحات انتہائی اذیت میں گزرے تھے۔ ڈاکٹر رمیض سے طلاق کے بعد اس نے زندگی اک عذاب میں گزاری تھی اور اب مزید گزار رہی تھی۔ وہ بے حد پریشان رہتی...... اٹھتے، بیٹھتے...... ہر لمحہ ہر آن...... اس کا دل ان باتوں اور فیصلوں پر کنتا رہتا...... جو اس نے جلد بازی میں کیے تھے...... اس کے پاس سوائے پچھتاوے کے اور کچھ نہیں تھا...... سب سے بڑا پچھتاوا ڈاکٹر دانش کی باتوں پر یقین کرنے کا تھا کاش! وہ اس شخص کی باتوں پر اعتبار نہ کرتی...... اس کے فریب میں نہ آتی...... تو آج وہ ڈاکٹر رمیض کے ساتھ خوشگوار زندگی گزار رہی ہوتی۔

کاش...... ایسے انسان دنیا میں نہ ہوں تو دنیا کس قدر پرسکون ہو......!

کاش، ہم جیسے لوگ کبھی بھی شاطر اور مکار لوگوں کی باتوں میں آکر اپنی زندگیوں کو پچھتاوؤں کی نذر نہ کریں...... کاش......! ایسے لوگ دوسروں کی زندگیوں میں زہر گھولنے سے پہلے ایک لمحے کے لئے سوچ لیں کہ وہ کس کس طرح انہیں تباہ و برباد کر رہے ہیں...... کاش! وہ ہم جیسے لوگوں کی اذیتوں کا کچھ تو ادراک کر سکیں۔ کاش...... وہ پھر سسکنے لگی...... اور اس کی سسکیاں شکوے، آہیں اس کے دل کو چیر کر اور پر کہیں سنائی دینے لگیں...... سب افسردہ ہو گئے اور آہ بھر کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

☆

رات ختم ہونے کو تھی اس کی تاریکی میں سحر کی روشنی کی آمیزش ہو رہی تھی۔ زینب ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو چکی تھی۔ اس کا بیمار و نحیف جسم اب اس قابل نہیں رہا تھا کہ وہ اسے گھسیٹ گھسیٹ کر بھی چل سکتی۔ اسی لئے وہ سارا وقت چارپائی پر لیٹی رہتی اپنی بے نور آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھتی رہتی...... جیسے کوئی روشنی کی کرن...... کسی امید کی صورت میں اس کے ویران دل کو منور کر دے...... وہ ہر وقت مضطرب رہتی...... قدرت بھی اسے بار بار آزما رہی تھی...... اور ان آزمائشوں نے اس کے وجود اور اعصاب کو شل کر دیا تھا۔ اسے نہ کھانے پینے کا ہوش تھا...... نہ کسی اور بات کا...... سوائے اپنے ڈاکٹر بیٹے کی رکھوالی کے جب سے اس کے دماغ پر چوٹ لگی تھی وہ اپنے حواس کھو بیٹھا تھا۔ وہ مکمل پاگل ہو چکا تھا...... اور اس کے صحت یاب ہونے کے چانسز بھی ختم ہو چکے تھے۔ فریحہ نے غصے میں اسے جو کرسی کھینچ کر ماری تھی اس کی ضرب اتنی کاری تھی کہ اس کا دماغ مکمل طور پر damage ہو گیا اس کی یادداشت ختم ہو گئی...... اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو گئی۔ اس کی تمام صلاحیتیں...... ذہانت...... فہم و ادراک...... عقل و شعور سب کچھ کہیں گم ہو گیا...... ڈاکٹروں نے اسے پاگل خانے میں بھجوا دیا...... مگر نذیر حسین سے اخبار میں اس کے ذہنی توازن کے بگڑنے کی

خبر سن کر برداشت نہ ہوا اور وہ اسے گھر لے آیا...... زینب اس کے آنے سے بے انتہا خوش تھی مگر وہ نہ تو ان کو پہچانتا تھا اور نہ ہی جانتا تھا۔ وہ ان کے لئے ایک اجنبی شخص تھا...... جن کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ حیرت سے ان کی جانب دیکھتا اور منہ پھیر لیتا...... زینب محبت سے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرتی...... اسے اس کا بچپن اور جوانی یاد دلانے کی کوشش کرتی اور وہ سب کچھ سن کر یوں منہ پھیر دیتا...... جیسے وہ کسی اور کی باتیں اسے سنا رہی ہو۔ وہ اچانک چیخنے لگتا...... اور کبھی کبھی اچانک ہی رونے لگتا۔ وہ بن بتائے گھر سے باہر نکل جاتا...... فر فر انگریزی بولتا...... کبھی گنگنانے لگتا...... گدھوں، گھوڑوں کے ساتھ انگریزی میں باتیں کرتا...... ان کے ساتھ کھیلنے لگتا تو کبھی بچوں کا ٹیچر بن کر ان کو مارنے لگتا۔ اس کے کپڑے گندے اور پھٹے ہوئے ہوتے۔ گلی محلے کے بچے اس کے پیچھے بھاگتے...... اس پر آوازیں کستے اسے تنگ کرتے اور وہ ان سے جان چھڑانے کے لئے کبھی ان کو کنکر مارتا...... کبھی اینٹیں اٹھا اٹھا کر مارتا...... لڑکے خوش ہو کر سیٹیاں بجاتے...... اور وہ کبھی پریشان ہو کر اونچی آواز میں رونے لگتا...... کبھی ہنسنے لگتا۔ نذیر حسین اس کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہتا، وہ کبھی کسی درخت پر چڑھ کر بیٹھا ہوتا، کبھی کسی سڑک پر لیٹا ہوا پایا جاتا۔ کبھی بسوں میں سفر کرتا، کبھی لوگ اس پر ترس کھا کر اسے بھیک دیتے...... کچھ ڈانٹتے پھٹکارتے...... کسی زمانے میں وہ چہرے سے ہی پڑھا لکھا اور مہذب شخص دکھائی دیتا مگر اب اس قدر گندا اور غلیظ ہوتا کہ اس کے پاس کوئی نہ بیٹھتا...... ایسی بدبو آتی کہ لوگ اسے دیکھ کر ناک منہ چڑھاتے...... اس کو دیکھ کر ہر ایک کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات پھیلنے لگتے...... اسے دیکھ کر کسی کو رحم نہ آتا...... سب اس سے بیزار اور خفا دکھائی دیتے...... وہ گزشتہ پانچ سالوں سے اس طرح کی کریہہ زندگی گزار رہا تھا...... اسے دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کا ماضی کبھی شاندار بھی رہا تھا...... کبھی وہ نارمل انسان بھی تھا...... کبھی اس نے اچھی زندگی گزاری تھی۔ وہ انتہائی ذہین اور فہم و فراست کا مالک بھی تھا...... کبھی وہ بہت مشہور بھی تھا، اس کی باتیں غور سے سنی اور کہی جاتی تھیں...... اب تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ معاشرے کا کوئی ناکارہ اور بیکار حصہ ہو...... نالی کا ایسا کیڑا ہو جو اتفاق سے رینگتا ہوا انسانوں کے درمیان آ گیا ہو اور انسان اب اسے پاؤں تلے روند رہے ہوں۔ وہ اپنی ذات، شناخت، شخصیت سب کچھ کھو بیٹھا تھا۔ نہ اس میں وہ تکبر رہا تھا...... نہ آن...... نہ شان...... انسانوں کو حقیر سمجھنے والا...... اب انسانوں کے درمیان اک ذرہ خاک بن کر رہ گیا تھا۔ لوگوں کو رسوا کرنے والا خود ذلیل و خوار ہو رہا تھا...... لوگوں کی زندگیوں میں زہر بھرنے والا اب خود زندگی کے کڑوے گھونٹ پی رہا تھا...... اپنے سازشی ذہن...... اور مکارانہ چالوں سے دوسروں کی زندگیوں کو شدید اذیت سے دوچار کرنے والا اب لمحہ لمحہ زندگی کا عذاب جھیل رہا تھا...... جسے اپنی عقل اور فہم و فراست پر بڑا ناز تھا...... اب اس عقل کے چھن جانے پر کیسے کیسے خوار ہو رہا تھا، جو اپنی کامیابیوں پر قدرے مغرور تھا اور اسے اپنی جدوجہد و محنت کا ثمر جانتا تھا...... جس نے قدرت کی مہربانیوں کو سائنس کی کرشمہ سازیاں سمجھ کر اپنی ذات سے اس کا عمل دخل خارج کر دیا تھا۔ اب قدرت کے ہاتھوں بری طرح شکست کھا کر سرعام رسوا ہو رہا تھا...... جس نے بہت سے لوگوں کی خوشیوں کو لوٹا تھا اور ان کے دلوں کو دکھوں سے بھر دیا تھا...... اور ان کی آنکھوں کو نہ تھمنے والے آنسو دیئے تھے اب سسک سسک کر زندگی گزار رہا تھا۔ لوگ اسے پتھر مارتے تو وہ گالیاں بکتا...... اور لوگ اس پر ہنستے...... اس کو دیکھ کر ناک پر کپڑا رکھ لیتے...... بچوں نے...... بڑوں نے اور بہت سے لوگوں نے اس کے کئی نام بگاڑ کر رکھے تھے۔ شہرت کے آسمان پر چمکنے والے ڈاکٹر دانش کا نام اب لوگ بھول چکے تھے۔ اس نے اپنا اصلی نام بھلایا تھا اور قدرت نے اس کا اپنا نام بھی لوگوں کے ذہنوں سے محو کر دیا تھا۔ وہ اپنی عمر سے بہت بوڑھا

لگنے لگا تھا۔ اسکی سانولی رنگت جل کر سیاہ ہوگئی تھی اور اس کے موٹے بھدے نقوش اور بگڑ گئے تھے......وہ انتہائی بدصورت اور کریہہ نظر آتا۔

زینب کو نذیر حسین کچھ باتیں بتاتا اور بہت سی چھپا لیتا مگر محلے کے بچے آ کر اسے ہنس ہنس کر اس کے بارے میں قصے سناتے تو زینب کا دل کٹنے لگتا وہ چارپائی پر پڑی کراہنے لگتی، سسکنے لگتی۔

دن کا اجالا پھیلنے لگا تھا مگر زینب کے لئے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اس کی بے نور آنکھوں میں قدرت نے ایسی تاریکی بھر دی تھی جو کسی طرح بھی کم نہ ہوتی تھی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی......اپنے رب سے فریاد کرنے لگتی اس سے شکوے کرتی۔

''یا الٰہی......یہ تو نے میرے بچے کے ساتھ کیا کیا......؟ اس کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا......اس کو اتنا بڑا دماغ دے کر اب اس کے دماغ کو خراب بھی کر دیا......اتنی عزت اور شان دے کر اب تو اسے یوں گلیوں......بازاروں میں رسوا کر رہا ہے......وہ اتنا بے عقل ہو گیا ہے کہ اسے نہ اپنے آپ کی ہوش ہے نہ کسی اور کی خبر......نہ وہ ماں کو پہچانتا ہے نہ باپ کو......یا اللہ......! یہ تو نے کیا کیا......؟ کیوں کیا......؟ میرا اتنا لائق بچہ......سارا وقت پڑھتا ہی رہتا تھا۔ اس نے دن رات اتنی پڑھائی کی اتنی محنت کی......اپنی زندگی بنائی......اور تو نے اس سے اسکا سب کچھ چھین لیا......وہ ہم سے نہیں ملتا تھا مگر یہ سکون تو تھا کہ وہ اپنی زندگی میں خوش ہے......اس نے بڑی ترقی کر لی ہے......بہت محنت سے اپنی زندگی بنائی ہے......اور اب تو......نے......اسے ہم سے ملا کر ہمیں اور دکھی کر دیا ہے......اس کے خراب دماغ اور اس کی پاگلوں جیسی حرکتوں کا سن کر میرا دل کتنا دکھی ہوتا ہے۔ میں کتنا روتی رہتی ہوں......کتنا تڑپتی ہوں......اسے کچھ خبر نہیں......مگر تو......تو سب جانتا ہے......یا اللہ!......میرے بچے کو ٹھیک کر دے......اس کو عقل اور سمجھ دے دے......اس کے بدلے میں......تو......میری جان لے لے......میرا دماغ لے لے......میری عقل اور سمجھ بوجھ لے لے......مگر اسے سب کچھ عطا کر دے......وہ بری طرح سسکنے لگی، وہ رات بھر گھر نہیں آیا تھا اور نذیر حسین اسے ساری رات تلاش کرتا رہا تھا......اور زینب ساری رات اس کی آمد کی منتظر رہی تھی......

پتا نہیں......اس نے روٹی بھی کھائی یا نہیں......پچھلی دفعہ وہ گھر سے غائب ہوا تو اگلے روز ملا......اور نذیر حسین نے بتایا کہ جب اسے بھوک لگی تو اس نے درختوں کے پتے اور کاغذ کھائے تھے......زینب یہ سن کر بری طرح روئی تھی اور پھر نذیر حسین نے اس کے نام اور ایڈریس کی تختی اس کے گلے میں لٹکا دی تھی جسے وہ اکثر غصے میں آ کر اتار پھینکتا تھا۔ اب بھی وہ غائب تھا اور زینب بے حد پریشان تھی۔ بُرے بُرے خیالات اس کے ذہن میں آ رہے تھے۔ نجانے وہ کہاں چلا گیا ہے؟ نجانے اس نے کچھ کھایا پیا بھی ہے کہ نہیں۔

دروازہ زور سے کھلا اور نذیر حسین گھبرایا ہوا اندر آیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا......سسکیاں بھرنے لگا۔ک......کیا ہوا......؟ زینب نے گھبرا کر پوچھا۔

''زینے......تیرے بیٹے کی اب وہ حالت ہوگئی ہے کہ اب تو خدا سے اس کے مرنے کی ہی دعا کر'' نذیر حسین ہچکیاں بھرتے ہوئے بولا۔

''خدا نہ کرے......اللہ نہ کرے......میں......یہ دعا کیوں کروں......؟ کوئی ماں اپنی اولاد کے لئے بھلا ایسی بد دعا کر سکتی ہے......مجھے بتا......کیا ہوا......اسے؟'' زینب نے گھبرا کر پوچھا۔

''ٹرین کے نیچے آ کر اس کی دونوں ٹانگیں کٹ گئی ہیں'' نذیر حسین نے بمشکل روتے ہوئے بتایا۔

زینب نے زور سے چیخ ماری......اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

''یا اللہ! تو میرے بچے کے ساتھ اتنا ظلم......کیوں کر رہا ہے......اتنا......ظلم......اتنا......'' وہ چیخیں مارنے لگی اور بری طرح سسکنے لگی۔

''اگر تو نے اس کے ساتھ یہی کچھ کرنا تھا......تو پھر اسے کیوں پیدا کیا......کیوں پیدا کیا؟'' زینب نے انتہائی دردناک آوازیں نکالیں۔

''یا اللہ! تو اتنا ظالم بھی ہو سکتا ہے'' زینب نے آسمان کی طرف دیکھ کر اونچی آواز میں کہا اور چیخیں مار کر رونے لگی۔ نذیر حسین بھی سسکتا رہا۔

ہر طرف گہری خاموشی چھائی تھی۔ زینب اور نذیر حسین کی سسکیاں اور آہیں......اوپر......ہر جانب سنائی دے رہی تھیں۔

تمام نوری مخلوق خاموش بھی تھی اور حیران بھی......انسان کی جرأت پر وہ حیران ہو رہے تھے جو برملا بڑی سرکار کو 'ظالم' کہتے تھے اور اپنی تمام اذیتوں......تکلیفوں اور پریشانیوں کی وجہ بڑی سرکار کو جانتے تھے۔ وہ منتظر تھے کہ بڑی سرکار غصے میں آ کر کوئی حکم نہ جاری کر دے مگر سفید روشنی بدستور روشن تھی اور اس سے نورانی شعاعیں نکل کر ماحول کو پرسکون بنا رہی تھیں اس کا مطلب تھا......بڑی سرکار انسانوں کے شکوے سن کر غصے میں نہ آئی تھی بلکہ بڑے تحمل اور بردباری سے سب کچھ سن رہی تھی۔ ان کے لئے یہ بہت حیرانگی کی بات تھی......وہ بھی خاموش رہے مگر ان کے دل اندر ہی اندر مضطرب ہو رہے تھے۔

شام کا ملگجا اندھیرا ہر جانب پھیل رہا تھا۔ ہوا میں خنکی کی شدت بہت بڑھ گئی تھی جس نے ماحول اور اس میں متحرک زندگی کو بھی قدرے سست بنا دیا تھا۔ زیادہ تر لوگ سرشام ہی اپنے گھروں میں دبک کر بیٹھ جاتے جوں جوں شام بڑھنے لگی تھی۔ دھند نے بھی ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ فریحہ اپنے بیڈروم میں ہیٹر کے سامنے فلور کشن پر بیٹھی تھی۔ وہ اپنے سامنے رکھے بہت سے اخبارات کو دیکھ رہی تھی جس میں انتہائی نمایاں انداز میں اس کی تصاویر شائع ہوئیں تھیں اور اس کے بارے میں انتہائی تعریفی کالمز شائع ہوئے تھے۔ ہر اخبار نے اس کی خدمات کو بھرپور انداز میں خراج تحسین پیش کیا تھا۔ صبح سے اس کے موبائل پر اسے مبارکباد کی فون کالز موصول ہو رہی تھیں اور اب اس نے موبائل بھی آف کر دیا تھا۔ وہ ایک اخبار اٹھاتی اس میں اپنی تصاویر دیکھتی...... اپنے بارے میں رپورٹ پڑھتی...... گہری آہ بھرتی اور اخبار دوسری جانب رکھ دیتی۔ اس نے یکے بعد دیگرے پانچ، چھ اخبارات یونہی پڑھ کر دوسری جانب رکھ دیے تھے...... اور ہر اخبار نے اس کے اندر کے کرب میں اضافہ کیا تھا۔

کسی اخبار نے اسے انسانیت کی 'مسیحا' لکھا تھا کسی نے دکھی دلوں کا مرہم...... کسی نے امید کی کرن...... الغرض ہر اخبار نے اسے بھرپور خراج تحسین پیش کیا تھا...... اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے......

کبھی کبھی انسان کو خود بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ جو کام کر رہا ہے...... کس لئے کر رہا ہے......؟ اس کا محرک کیا ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے......؟ اور وہ کیوں اتنی جدوجہد اور کس کے لئے کر رہا ہے؟

دنیا سمجھتی تھی کہ وہ انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے یہ کام کر رہی ہے...... مگر وہ جانتی تھی کہ وہ کس کے لیے یہ سب کر رہی تھی...... اپنی بے کار زندگی کو مصروف بنانے کے لئے...... اس نے عاصم کی یاد میں 'عزم' کے نام سے ابنارمل بچوں کے لئے ایک فلاحی ادارہ قائم کیا تھا۔ پانچ سالوں میں اس ادارے کی برانچز چار بڑے شہروں میں بھی کھولی تھیں...... جہاں ابنارمل بچوں کا مفت علاج بھی کیا جاتا اور ان کی پرورش و تعلیم و تربیت بھی کی جاتی...... شدید ذہنی معذور بچوں کے لئے نرسنگ کیئر سنٹر قائم کئے گئے تھے۔ فریحہ نے خود آرکیٹکچر میں زبردست نام اور شہرت حاصل کی تھی۔ وہ اپنی کمائی ان اداروں پر خرچ کرتی یا مخیر افراد اس کی معاونت کر دیتے۔ اس نے ان اداروں کی زبردست پلاننگ کی تھی۔ انتہائی پرسکون، خوشگوار اور تمام ضروری سہولیات ان سنٹرز میں میسر تھیں۔ بہت سے غریب، پسماندہ علاقوں کے والدین ان سنٹرز کے قائم ہونے سے خوش تھے اور فریحہ کے لئے دل کی گہرائیوں سے دعائیں کرتے تھے۔ ان سنٹروں کی سالانہ تقریبات میں ان کی کارکردگی کی رپورٹس ہر سال شائع ہوتی تھیں اور چند روز پہلے تمام شہروں میں سالانہ تقریبات منعقد ہوئی تھیں اور فریحہ کی خدمات کو زبردست خراج تحسین پیش کیا گیا تھا۔ اس نے جب سے 'عزم' کے نام سے ادارے قائم کئے تھے۔ اس کی عزت اور شہرت میں بے پناہ اضافہ ہوا تھا۔ وہ جہاں بھی جاتی، اس کا بہت احترام کیا جاتا اور اسے بہت عزت دی جاتی۔ ایسی عزت اور نیک نامی قدرت چند مخصوص لوگوں کی قسمت میں لکھتی ہے اور قدرت اسے اس عزت سے بھرپور انداز میں نواز رہی تھی......

قدرت اسے جتنا عطا کر رہی تھی اس میں اتنی ہی بے نیازی آتی جا رہی تھی۔ اسے رحمدلی اور منکسر المزاجی کو علامت سمجھا جانے لگا تھا جو بے غرض اور بے لوث ہو کر بغیر کسی مقصد کے انسانیت کی خدمت کر رہی تھی۔ اسے قابل فخر اور عظیم انسان سمجھا جانے لگا تھا۔ ایسا انسان جس کے دل میں قدرت نے اپنے ہی جیسے لوگوں کی محبت کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی۔

صحافی ہمیشہ اس سے یہی سوال کرتے تھے کہ اس نے اس نیک کام کو کیونکر شروع کیا......

کیا انسانیت کی خدمت کے لئے......؟

کیا کسی اور جذبے کے تحت......؟

کیا کسی مشن کی خاطر......؟

اور وہ ہر بار ایک ہی جواب دیتی...... "اپنے بیٹے عاصم کی یاد میں"

"آپ کا بیٹا کہاں ہے؟" ہر کوئی اس کا جواب سن کر پھر سوال کرتا اور وہ اس سوال کا جواب نہ دے پاتی بس خاموش رہتی اور اس کی آنکھیں بھیگنے لگتیں۔

اس نے اخبارات کو لپیٹ کر ایک جانب رکھ دیا اور ایزی چیئر پر نیم دراز ہو کر چھت کو گھورنے لگی۔

کیسے سب کو بتاؤں...... کہ...... میرا بیٹا کہاں چلا گیا؟ اس کو کس نے چھین لیا......؟

اس شخص نے جو اس کا باپ تھا۔ اس نے مجھ سے میری زندگی کی سب سے بڑی امید چھین لی...... اس نے مجھے اتنا تنہا اور بے آسرا کر دیا کہ زندگی کا ایک ایک پل گزارنا مشکل ہو گیا تھا...... اسے یاد آنے لگا کہ عاصم کے بعد وہ گھر آنے کی بجائے رات کو دیر تک آفس میں بیٹھی رہتی...... نہ کام کرنے کو دل چاہتا اور نہ ہی آرام کرنے کو...... نہ اسے نیند آتی اور نہ ہی کھانا کھانے کو دل چاہتا...... عاصم کی وفات اور اس کے بعد شیر افگن کی بے وفائی...... اس کو اندر ہی اندر ہر لمحہ رلاتی رہتی...... وہ ہر وقت سوچوں میں گم کئی کئی گھنٹے بیٹھ کر روتی رہتی...... اس نے اتنے بڑے گھر کے ایک کمرے میں اپنے آپ کو قید کر لیا تھا۔ اماں اسے بہت سمجھاتی مگر اس کا دل اور دماغ ایسے خالی ہوئے تھے کہ کسی بھی بات کو قبول کرنے کو تیار نہ ہوتے۔ زندگی اس قدر بے معنی، خالی اور فضول لگتی کہ اس کا دل چاہتا وہ بھی خودکشی کر لے۔ ڈاکٹر دانش نے نجانے اس سے کیسا انتقام لیا تھا کہ بڑی چالاکی سے منصوبہ بندی کر کے اس سے اس کا سب کچھ چھین لیا تھا۔ وہ اس قدر ٹوٹ پھوٹ چکی تھی کہ سنبھل نہیں پا رہی تھی۔ ہر وقت اندر ہی اندر سسکتی اور کڑھتی رہتی...... مگر کوئی پرسان حال نہ تھا۔ رفتہ رفتہ وہ بیمار ہونے لگی۔ وہ تب چونکی جب اس کے منہ سے خون آنا شروع ہو گیا...... ہر وقت کی کھانسی نے اسے بے حال کر دیا تھا...... اماں کے ناراض ہونے پر وہ ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہو گئی...... وہاں اس کی ملاقات ایک سوشل ورکر خاتون مسز نجیب سے ہوئی۔ مسز نجیب ایک ادھیڑ عمر خاتون تھیں جو وکیل چیئر پر ٹی بی کے مریضوں میں ہر رات پھل بانٹنے آتی تھیں۔ فریحہ نے ایک پرائیویٹ روم لے رکھا تھا۔ ایک رات یونہی وہ باہر نکلی اور مسز نجیب کے آنے پر مریضوں کی خوشی دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔ سب لوگ ان کے گرد جمع تھے اور وہ سب سے بہت محبت سے پیش آ رہی تھیں۔ وہ جانے لگیں تو فریحہ کو ایک بنچ پر اداس و پریشان بیٹھی دیکھ کر اس کے پاس آ گئیں۔

"بیٹا...... آپ اتنی اداس کیوں ہیں...... کیا یہاں...... اس ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہیں؟" مسز نجیب نے شفقت سے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

فریحہ نے چونک کر ان کی جانب دیکھا۔ محبت کے اس لمس میں نجانے کیا سحر تھا کہ وہ ان کی طرف نم آنکھوں سے دیکھنے لگی۔

''کس غم کو اتنا دل سے لگایا ہے کہ اس بیماری کا روگ لگا لیا ہے'' مسز نجیب نے نرم لہجے میں پوچھا۔

''خالی اور بے معنی زندگی میں صرف غم ہی باقی رہ جاتے ہیں'' فریحہ نے بمشکل کہا اور سسکنے لگی۔

''تم تعلیم یافتہ اور باشعور لگتی ہو...... پھر ایسی نا امیدی کی باتیں کیوں کر رہی ہو؟'' مسز نجیب نے پوچھا۔

''میری زندگی سے امید ہی تو ختم ہو چکی ہے'' فریحہ نے کہا۔

''کیسے......؟'' مسز نجیب نے حیرت سے پوچھا۔

''ایک شخص نے...... جو کبھی میرا شوہر تھا...... مجھ سے میرا سب کچھ چھین کر لے گیا...... اب کچھ بھی باقی نہیں رہا...... سوائے مایوسی...... بے بسی اور دکھی سوچوں کے'' فریحہ نے افسردگی سے جواب دیا اور کھانسنے لگی۔

''انسان...... انسان سے اس کی امید چھین سکتا ہے مگر ''اللہ'' نہیں'' مسز نجیب نے پرسکون لہجے میں کہا تو وہ چونک کر ان کی جانب دیکھنے لگی۔ اس کا دل جیسے ٹھہر سا گیا ہو...... ان کی بات اس کے دل میں کہیں اپنا گھر کر رہی ہو......

''ایک رات...... ڈاکو ہمارے گھر آ گئے...... میرے شوہر اور میرے جوان بچے کو انہوں نے گولیاں مار دیں...... میں بھاگنے لگی تو میری دونوں ٹانگوں پر فائر کر دیا...... ہمارا سب کچھ لوٹ کر لے گئے...... میں زندہ لاش کی مانند تڑپتی رہی بستر سے ہی نہ اٹھ پائی تھی...... اس قدر مایوس ہو گئی کہ مرنے کی دعائیں کرتی تھی...... خدا سے ہر وقت شکوے کرتی کہ اس نے میری ہری بھری بستی اجاڑ دی پھر اسی خدا نے مجھے حوصلہ دیا۔ میرے شوہر بہت اچھے انسان تھے۔ غریبوں کا بہت خیال رکھتے تھے ہر ویک اینڈ پر اس ہسپتال میں ہم دونوں آتے تھے اور مریضوں کی ضروریات پوری کرتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد میں پورے دو ماہ یہاں نہ آئی تو ہاسپٹل سے فون جانے لگے کہ مریض نجیب صاحب کا پوچھتے ہیں...... اور پھر میں ان کی یاد میں...... میں ہر روز یہاں آتی ہوں، ہماری ایک فلور مل ہے اور گاؤں میں زمینیں ہیں...... میں اپنی زیادہ تر آمدنی ان غریبوں پر خرچ کرتی ہوں...... اور خوش ہوتی ہوں کہ خدا نے مجھے ان کے لئے ایک امید...... اور ایسی خوشی بنایا ہے جو مجھے اندر سے خوش کرتی ہے...... ان کی دعائیں مجھے زندہ رکھے ہوئے ہیں...... اب میں اپنے مرنے کی نہیں بلکہ اپنی زندگی کی دعا کرتی ہوں...... میرے مر جانے سے ان کا بہت کچھ چھن جائے گا...... اس لئے بیٹا...... لوگوں کے لئے ایسی امید بن کر جیو...... کہ...... جو تمہیں...... کبھی مرنے نہ دے...... اور تمہاری امید تمہارے اندر ہے اس سے مدد طلب کرو'' مسز نجیب نے محبت سے اس کو اپنے ساتھ لگایا اور بہت دعائیں دے کر چلی گئیں...... فریحہ کے دل میں اچانک کچھ ہونے لگا...... نیا جوش، جذبہ پیدا ہونے لگا۔

''اس عورت کے پاس تو سب کچھ اچھا تھا جو چھن گیا اور میرے پاس تو کچھ بھی اچھا نہ تھا...... بدترین شوہر...... معذور بیٹا...... اور گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والے محبت کا نام نہاد دعوے دار......'' وہ گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ اس کے اندر مثبت تبدیلی پیدا ہونے لگی۔ وہ ہر شام مسز نجیب کی شدت سے منتظر رہتی اور ان سے باتیں کرتی ان کی باتوں سے اسے حوصلہ ملتا...... وہ جلد صحت یاب ہونے لگی...... اور مسز نجیب کے مشورے سے ہی اس نے عاصم کی یاد میں 'عزم' جیسے ادارے کی بنیاد رکھی...... مسز نجیب نے ہی اس کا افتتاح کیا...... وہ بہت خوش تھیں کہ فریحہ میں زندگی کی امید پیدا

ہو گئی تھی...... مسز نجیب کو فوت ہوئے دو سال ہو گئے تھے مگر وہ آج بھی فریحہ کے اندر زندہ تھیں۔ ایسی امید بن کر جو اسے کبھی مایوس نہیں ہونے دیتی تھیں۔ وہیل چیئر پر اپنے بیمار، لاغر اور معذور جسم کے ساتھ وہ لوگوں کو امید کا پیغام دیتی تھیں...... فریحہ بھی ان کی ڈگر پر چل رہی تھی۔ اسے نہ شہرت کی طلب تھی نہ نام کی خواہش...... اور نہ ہی کوئی اور ہوس تھی وہ تو مایوس لوگوں کی آنکھوں میں امید کی کرنیں دیکھ کر خوش ہوتی تھی...... لوگ اس کے لئے ویسی ہی دعائیں کرتے تھے جیسی مسز نجیب کے لئے کرتے تھے۔ اس کو ویسی ہی عزت اور پروٹوکول دیتے تھے جیسے مسز نجیب کو۔

فریحہ نے آہ بھری...... اور خوشی اور دکھ کے ملے جلے جذبات سے چھت کو دیکھنے لگی۔

''زندگی کس قدر عجیب ہے...... اور انسان اس سے بھی زیادہ عجیب مخلوق ہے...... کوئی انسان ساری امیدیں چھین لیتا ہے اور کوئی انسان اتنا پرامید بنا دیتا ہے کہ کبھی کبھی اس پر بھی یقین نہیں آتا...... اگر میں عاصم کی صورت میں ابنارمل بچوں اور ان کے کرب سے آشنا نہ ہوتی تو کبھی 'عزم' جیسے ادارے قائم نہ کرتی۔ اگر میں بیمار نہ ہوتی تو مسز نجیب سے کیسے ملتی اور ان کی باتیں مجھ میں امید کیسے پیدا کرتیں...... زندگی کے پرپیچ راستے اور اس کے الجھے ہوئے دھاگے قدرت نے کس قدر باریک بینی اور گہری منصوبہ بندی سے انسان اور اس کے حالات و واقعات کے ساتھ جوڑے ہیں کہ انسان خود بھی دنگ رہ جاتا ہے۔

''یا اللہ! بے شک تو بے نیاز ہے...... میں تیری ہستی کو سلام کرتی ہوں......'' فرطِ جذبات سے فریحہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور وہ سسکنے لگی...... اس کا دل خدا کی حمد و ثنا کرنے لگا۔ اس کے دل کی صدائیں اوپر سنی جانے لگیں۔ تمام نوری مخلوق نے چونک کر انہیں سنا اور حیران ہونے لگے۔ ہر انسان خدا سے شاکی تھا...... اکثریت شکوے کر رہی تھی...... اور اتنے بہت سے لوگوں میں سے صرف ایک خدا کی معترف تھی اور اتنی بہت سی آزمائشوں کے بعد اس کا شکر اور اس کی تعریف کر رہی تھی۔ یہ بات ان کے لئے انتہائی حیرت کا باعث تھی۔

ان کے لیڈر کے چہرے پر مایوسی سی پھیلنے لگی جو چپکے چپکے یہ منظر دیکھ اور سن رہا تھا۔

سب نے سفید روشنی کی طرف دیکھنے کی کوشش کی مگر ان میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اس کی جانب آنکھ بھر کر دیکھ سکتے۔ روشنی ایک دم زور سے چمکی...... جیسے یہ باتیں اور منظر دیکھ کر مسکرا رہی ہو۔ ہر طرف انتہائی خوشگوار تاثر پیدا ہونے لگا۔

......❁......

## (۳)

شاہی دربار میں سراسیمگی کا عالم تھا۔ حاضرین محفل خاموش بیٹھے تھے۔ انہیں انسانوں کے ادھورے پن، غربت و مفلسی کے ہاتھوں اٹھانے والی ذلتوں، بھوک اور شہوت سے جنم لینے والی رسوائیوں نے افسردہ کر دیا تھا۔

انسان کس لیے اور کیوں اتنا کرب اٹھا رہے ہیں؟

اتنی اذیتوں کا حاصل کیا ہے......؟

جنم لینے سے مرنے تک صبر آزما کٹھن مراحل سے گزرنے کی وجہ کیا ہے......اور......کون اس کا ذمہ دار ہے......؟ کیا انسان خود......

یا......پھر کوئی......اور......؟

وہ اپنی ہی سوچوں میں گم تھے......اور منتظر تھے کہ بڑی سرکار کے دربار سے ان کی سوچ کے بارے میں کیا رائے دی جاتی ہے......مگر انہیں نہ تو کوئی رائے ملی......اور......نہ ہی کوئی فرمان جاری ہوا...... ہر طرف گہری خاموشی چھائی تھی۔

اچانک مختلف صداؤں کا شور بلند ہوا......وہ بغور سننے لگے اور حیرت سے نیچے دیکھنے لگے۔

چاند کی چودھویں رات تھی اور چاند کی چاندنی نے رات کی تاریکی کو اپنی خوبصورت اور نرم و لطیف، ٹھنڈی روشنی سے منور کر رکھا تھا۔ حسن و خوبصورتی اور لطافت کے سحر انگیز احساس نے پورے ماحول کو سرشار کر رکھا تھا۔

حویلی میں رقص و سرور کی محفل عروج پر تھی۔ دو تہائی رات گزر چکی تھی۔ گھنگھروؤں کی جھنکار، ڈھولک کی تھاپ، طبلے کی تال اور آواز کے سُر......اور جادوئی سحر نے اک حسین سا تاثر پیدا کر رکھا تھا......حاضرین محفل دور رقاصاؤں کے رقص اور ان اداؤں سے جی بہلا رہے تھے......خوش اور مسرور ہو رہے تھے......رقاصاؤں کی شوخ اور چنچل اداؤں پر ان کے دل باغ باغ ہو رہے تھے......حویلی کی تیسری منزل پر موجود رقص ہال میں عیش و نشاط کی محفل سرگرم تھی اور حویلی کے پچھواڑے میں شب غم اپنی تمام تر اداسیوں اور مایوسیوں کے ساتھ ڈیرہ ڈالے وہاں رہنے والی طوائفوں کے دلوں کو افسردہ بنا رہی تھی......چھوٹے چھوٹے کمروں میں رہنے والی طوائفیں اپنے آپ کو بند قفس میں پھڑ پھڑاتے پر کٹے پرندوں کی مانند مجبور اور بے بس پا کر سسک رہی تھیں۔ کچھ ہنس گا رہی تھیں۔ کچھ گڑ گڑا کر شکوے کر رہی تھیں کبھی کسی کی سسکیوں کی آواز بلند ہوتی......تو......کبھی کسی کے رونے کی......کبھی کسی کی ہنسی اور گانے کی تو کبھی کسی کی آہوں اور شکوؤں کی......

رینا اپنے چھوٹے سے کمرے کی کھڑکی کھول کر چاند کی چاندنی کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی خوبصورتی کو رشک سے بھی دیکھ رہی تھی اور حیرت سے بھی سیاہ رات کے دامن میں خوبصورت، چمکتے چاند کے اندر چھپی داستان غم میں اپنے داغ دل اور زخمی روح کے نشانات کھوج رہی تھی......

''تمہارا اندر...... بھی...... میری طرح بنجر اور ویران ہے...... باہر کی چمک دمک اور خوبصورتی دوسروں کو دیوانہ بنا دیتی ہے...... لوگ سحر میں مبتلا ہو جاتے ہیں...... مگر تمہارے دکھ کو کوئی نہیں جان سکتا...... کاش کوئی تمہارے اندر بھی جھانک سکے اور میرے اندر بھی...... مگر اندر تک کسی کی رسائی ممکن نہیں...... سوائے اس کے جو جسم اور قلب و روح کے اندر موجود ہے...... جو سب کچھ خاموشی سے سنتا ہے...... ہر وقت، ہر لمحہ...... دن اور رات کی تاریکیوں میں بھی سنتا ہے مگر جواب نہیں دیتا...... نجانے وہ کیوں جواب نہیں دیتا...... شاید وہ ہم جیسی بے بس اور دھتکاری عورتوں کی کوئی بات سننا نہیں چاہتا...... لیکن میں آج اُسے سنا کر رہوں گی...... وہ سب کچھ...... جو میرے دل کے اندر غبار بن کر اڑ رہا ہے اور مجھ سے اس غبار کے دھوئیں میں سانس لینا مشکل ہو رہا ہے۔

''یا اللہ! تو نے انسان کو کیوں بنایا اور اگر بنا ہی دیا تو اس کے پاؤں میں مجبوریوں کی بیڑیاں، گلے میں رسوائیوں کے طوق اور دلوں میں خواہشات کے انبار کیوں لگا دیئے۔

تو کہتا ہے انسان ناداں ہے...... جلد باز ہے...... اور کمزور ہے مگر تو...... تو عقل کل ہے...... تجھے تو انسان کے ماضی حال اور مستقبل کا علم ہوتا ہے...... انسان نے کہاں اور کس رستے پر چلنا ہے...... تجھے سب معلوم ہوتا ہے...... پھر تو انسان کو کیوں ان راستوں کی طرف جانے دیتا ہے جو کھائیوں کی طرف جاتے ہیں جن میں گر کر انسان کو سوائے رسوائی اور ذلت کے کچھ بھی نہیں ملتا...... تو کہتا ہے کہ تو انسان سے بہت محبت کرتا ہے...... یہ کیسی محبت ہے کہ انسان کو نشان ذلت بنا کر اس کی بے بسی اور لاچاری کا تماشا دیکھتا ہے...... یہ کیسا گورکھ دھندا ہے...... جس کے جال میں تو نے ہم انسانوں کو پھنسا رکھا ہے...... نہ اس سے فرار ممکن ہے اور نہ ہی اس میں سکون ہے...... وہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے شکوہ کرنے لگی...... اس کی نظریں چاند پر تھیں۔

''ہر انسان خوبصورت اور چمکیلی چیزوں کو پانے کی خواہش کرتا ہے...... تو اُس کے دل کے اندر اس خواہش کے لئے اتنی تڑپ پیدا کر دیتا ہے کہ جب تک انسان اپنی اس خواہش کو پا نہیں لیتا وہ مضطرب رہتا ہے...... انسان کے اندر 'خواہش' بھی تو پیدا کرتا ہے اور اس کو پانے کی سزا بھی 'تو' ہی دیتا ہے۔

''میں نے بھی ایسی ہی ایک خواہش کی...... نگار بیگم بننے کی مگر تو جانتا تھا کہ نگار بیگم کی حقیقت کیا تھی...... تو مجھے ان راستوں پر لایا...... اسے دکھایا اور پھر میرے اندر اس جیسا بننے کی شدید خواہش پیدا کر دی...... میں اپنے اندر کی بھوک، گھر کی غربت اور مفلسی سے تنگ آ گئی تھی...... زندگی کی خوشیوں اور آسائشوں کو پانے کی تمنا کرتی تھی...... مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کے لئے مجھے کتنی بڑی قیمت ادا کرنا پڑے گی...... میں کیا سے کیا بن گئی؟ بھکارن سے ملازمہ...... ملازمہ سے طوائف اور فلمی ہیروئن اور اب رقاصہ اور اس کے ساتھ ساتھ ایک بدنام اور 'ذلیل عورت' اس نے گہری سانس لی اور اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

انسان کہاں غلطی کرتا ہے......؟

کیا...... جب وہ کوئی خواہش کرتا ہے......؟

ان دیکھی دنیا کو پانے کی تمنا کرتا ہے......؟

مگر

انسان کو کیا معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات ایک خواہش کے لئے اسے اپنی پوری زندگی داؤ پر لگانی پڑتی ہے اس کے لئے زندگی کا مقصد اس خواہش کا پورا کرنا ہوتا ہے......جس کے لئے وہ گڑگڑا کر دعائیں بھی کرتا ہے......اور کوشش بھی......تکلیفیں بھی اٹھاتا ہے اور ذلت بھی......مگر جب وہ خواہش اتنی تکالیف اور کٹھن مراحل سے گزرنے کے بعد پوری ہوتی ہے تو وہ خواہش مکمل طور پر اس صورت میں سامنے آتی ہے کہ انسان خود چونک جاتا ہے اس کی ساری خوشی ختم ہو جاتی ہے......اس نے اس کو پانے کے لئے جتنی اذیتیں اٹھائی ہوتی ہیں......وہ سب یاد آنے لگتی ہیں......تو پھر وہ تمنا کرتا ہے کہ کاش اس نے یہ خواہش نہ کی ہوتی......

میں نے نگار بیگم کو قتل کر دیا......کیونکہ میں اسے اپنے راستے کی رکاوٹ سمجھتی تھی......اور مجھے اپنی خواہش کی تکمیل کرنا تھی......اور جب میں نگار بیگم بن گئی......تو......میں نے اپنا سب کچھ کھو دیا......اپنی عزت......محبت......پاکیزگی......سب کچھ۔

دلبر مجھ سے روٹھ گیا......

کیا ہر انسان جو زندگی میں کچھ پانے کی تمنا کرتا ہے......کیا تو انہیں ایسی ہی سزائیں دیتا ہے......؟

تو انسان سے اس کے اندر کا سکون چھین لیتا ہے......

اس کو ذلیل و رسوا کر کے چھوڑتا ہے......اور

پھر وہ خالی ہاتھ کھڑا بے بسی سے تیری طرف دیکھتا رہ جاتا ہے......

یہ کیسی محبت ہے جو تو ہم انسانوں سے کرتا ہے......

یہ کیسی عطا ہے......جس میں تو رسوائیاں اس کے مقدر میں لکھ دیتا ہے......

اور یہ کیسا کرم ہے کہ تو سب کچھ چھین کر اسے خالی ہاتھ کر دیتا ہے......

اگر

تو نے ہمارے ساتھ یہی کچھ کرنا تھا تو ہمیں پیدا کیوں کیا؟

ہم تو اپنی مرضی سے مر بھی نہیں سکتے......اور نہ ہی سکون سے جی سکتے ہیں......

تو نے مجھے کیا کیا کچھ دکھایا......اور......پھر سب کچھ چھین لیا......

کیا یہ سب میری تقدیر تھی......؟ یا

میری خطا......؟ یا

میرے گناہ......؟ یا

میری آزمائش......؟ یا

میرا امتحان......؟

مگر جو کچھ بھی ہے اس نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا ہے......

یہ زندگی ہے یا سزا......؟

میں اپنی خواہشوں کو اپنی زندگی سمجھ بیٹھی اور ان کے پیچھے دیوانہ وار بھاگتی رہی مگر وہ خواہشیں سراب ثابت ہوئیں۔ ایسے سائے جو پلک جھپکتے ہی غائب ہو جاتے ہیں...... میں مانتی ہوں میں نادان تھی...... کچھ سمجھ نہ سکی...... مجھے کسی بھی شے کا نہ علم تھا اور نہ ہی تجربہ...... مگر میری اک بھول کی تو نے اتنی کڑی سزا دی...... ایسی سزا جس کے بعد کوئی سزا، سزا نہیں لگتی......

زندگی کی آخری سانسوں تک تو نے میرے اندر ایسی آگ بھڑکا دی ہے جس کے شعلے ہر وقت مجھے اپنی لپیٹ میں لیے رکھیں گے...... جو کبھی ٹھنڈی نہیں پڑے گی...... جس کی تپش سے میرا دل اور روح ہر وقت جلتی رہے گی...... تو نے مجھے ایسے پچھتاوے دے دیئے ہیں جو کبھی ختم نہیں ہوں گے...... ایسی تنہائی اور اداسی میرے اندر بھر دی ہے کہ دنیا کی کوئی رنگ برنگی محفل بھی اس اداسی اور تنہائی کو ختم نہیں کر سکے گی...... میرے اندر سے تمام امیدوں کو تو نے ختم کر دیا ہے...... امیدوں کے سہارے انسان جیتا ہے...... امیدیں انسان کو مرنے نہیں دیتیں...... اور...... میرے اندر تمام امیدیں دم توڑ چکی ہیں......

اب زندگی کی آخری سانسوں تک ان پچھتاوؤں پر آنسو بہاؤں گی......

میں ایسے کٹہرے میں کھڑی ہوں جہاں میں مجرم ہوں بھی اور نہیں بھی......

میں نے گناہوں کی دلدل میں قدم رکھا...... اور اس میں دھنستی چلی گئی...... مگر تو نے بھی تو مجھے نہیں بچایا...... تو تو بچانے والا ہے...... تو نے کہاں میرا ساتھ دیا؟ تو نے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا اور میں کٹی پتنگ کی طرح ادھر سے ادھر پھرتی رہی...... اب اتنی شکستہ حالت میں گری ہوں کہ کوئی پرسان حال نہیں......

میں فریب پہ فریب کھاتی رہی......

اپنے آپ سے...... لوگوں سے...... اور تم نے بھی تو مجھے فریب ہی دیا...... قوس قزح کے رنگ دکھا کر میری زندگی کے رنگ چھین لیے...... تو نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا......

مجھے کہیں بھی تھوڑی سی رعایت نہیں دی......

میری خواہشوں کو پورا کر کے مجھے ادھورا کر دیا......

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی...... اس کی آہوں اور سسکیوں کی آواز سن کر بڑی سرکار کے شاہی دربار کے حاضرین افسردہ ہونے لگے...... اور حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

☆

''ہائے ربا...... مجھ دکھیاری کی بھی فریاد سن......''

تمام حاضرین نے چونک کر اس آواز کو سنا اور اس کی طرف دیکھنے لگے......

رات کی تاریکی ختم ہونے کو تھی...... پو پھٹنے والی تھی...... ہر طرف ملگجا سا اندھیرا پھیل رہا تھا...... دن اپنی باری کا انتظار شدت سے کر رہا تھا...... کہ...... کب رات ختم ہو اور وہ نمودار ہو......

برکتے صحن میں چارپائی پر لیٹی کراہ رہی تھی...... تڑپ رہی تھی...... اس کے آنسو شدت سے بہہ رہے تھے...... کبھی وہ بے تاب ہو کر اٹھ بیٹھتی...... پھر لیٹ جاتی اور لیٹ کر آسمان کی طرف بے قراری سے دیکھنے لگتی۔

''ربا...... تو کاہے کو ہم غریبوں کو پیدا کرتا ہے...... ارے اب تو دکھ سہہ سہہ کر تھک گئے ہیں...... مگر نہ تو ہمارے دکھوں کو کم کرتا ہے...... نہ ہماری فریاد سنتا ہے...... اتنے دکھ...... اتنے دکھ...... کلیجہ پھٹے جا رہا ہے...... مگر نہ اس بڈھے جسم سے جان نکلتی ہے...... نہ دکھ کم ہوتے ہیں...... ارے...... تو نے سارے دکھ غریبوں کے لیکھوں میں ہی کیوں لکھ دیئے ہیں...... کچھ تو رہنے دیتا...... پتہ نہیں...... ہم نے کیا گناہ کیے ہیں...... کیا جلم کیے ہیں...... جو تو ہم سے غصے ہی ہوئے جاتا ہے...... ہماری طرف دیکھتا ہی نہیں...... کبھی ہماری سنتا ہی نہیں...... وہ سسکنے لگی۔

''ہائے...... میری رانی کو گئے اتنے سال ہو گئے ہیں...... نہ وہ ملی ہے اور نہ اس کی کوئی خبر آئی ہے...... ارے کہاں چلی گئی...... اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا...... میری جواں دھی کہاں گم ہو گئی...... اس کی یاد میں رو رو کر میری اکھیوں کا پانی خشک ہو گیا ہے...... پر...... تجھے مجھ بڈھیا پر رحم نہیں آتا...... تو کب مجھ پر رحم کھائے گا؟

ربا...... کس کس کو روؤں...... گڈی کو یا رانی کو...... گڈی میری دھی کتنی سوہنی جوان تھی...... جالموں نے اتنا جلم کیا اور تو دیکھتا رہا...... تو نے کسی کو سزا نہ دی...... کسی سے نہ پوچھا...... ہائے...... ہم تیرے کتنے بے بس بندے ہیں جن کے پاس چار پیسے بھی نہیں تھے کہ پولیس میں رپٹ لکھواتے...... میری جوان دھی مٹی کے نیچے دب گئی...... اور سب بھول گئے...... پر...... میں کیسے بھولوں...... جس نے اسے پیدا کیا...... اسے پالا...... میری دھی مر گئی اور میں بڈھی جندہ رہ گئی...... تو میری جان لے لیتا...... پر اس کو تو چھوڑ دیتا...... اس کی سادی بھی بنائی تو اس بدماش رجو کے ساتھ جس نے اس کو مار مار کر ادھ موا کر دیا۔ وہ اور نجو خوس باس پھرتے ہیں...... مگر...... میری دھی تو چلی گئی......

دن نمودار ہو چکا تھا...... اور سورج کی پہلی کرنوں نے ماحول کو روشن کرنا شروع کر دیا تھا...... اس کے پاس پپو اور مجو چارپائیوں پر سو رہے تھے۔ وہ اب کافی بڑے ہو چکے تھے پپو دس سال کا اور مجو بارہ سال کا ہو گیا تھا۔ پپو ایک درزی کے پاس سلائی سیکھتا تھا اور مجو ایک چھوٹے ہوٹل میں ملازم تھا...... اس نے آہ بھر کر بچوں کی طرف دیکھا۔

کیسے بدنصیب بچے ہیں...... جن کو نہ پیٹ بھر کر روٹی نصیب ہوتی ہے اور نہ تن ڈھانپنے کو کپڑا...... سوچا تھا مجو ڈرائیوری سیکھ کر کمائی کرنے لگے گا تو مجھ نصیبوں جلی کے دن بھی پھر جائیں گے...... مگر...... وہ تو سادی بنا کر اپنی دلہن کے ساتھ یہاں سے چلا گیا...... بولتا تھا......

''اماں...... کب تک تیرا اور تیرے بچوں کا پیٹ پالوں...... اب مجھے اپنے بچوں کی بھی فکر کرنی ہے''۔

برکتے سسکنا شروع ہوگئی۔۔۔۔۔ وہ بھی ٹھیک کہتا تھا۔۔۔۔۔ بچہ سا تھا جب سے بھیک مانگنے نکلتا تھا۔۔۔۔۔ چھوٹے چھوٹے ہاتھ لوگوں کے آگے پھیلاتا تھا تو میرا دل کتنا روتا تھا مگر ملکے نے سب کو ہی اس دھندے پر لگا دیا۔۔۔۔۔ میں خوش ہوں اب نوکری تو کرتا ہے اس کے ہاتھ میں ہنر ہے۔۔۔۔۔ وہ بھیک نہیں مانگتا مگر ماں کو ماں نہیں سمجھتا۔۔۔۔۔ اک بوجھ سمجھتا ہے۔۔۔۔۔ کبھی بھول کر بھی نہیں آتا۔۔۔۔۔ اسے خبر ہی نہیں کہ ماں اس کی جدائی میں کتنا روتی ہے۔۔۔۔۔

جدا تو وہ نمانا (بیچارہ) بھی ہو گیا۔۔۔۔۔ جس کا کوئی قصور ہی نہیں تھا۔۔۔۔۔ نجانے وہ کہاں ہوگا۔۔۔۔۔ ملکے نے تو اس کے ساتھ بڑا ہی جلم کیا۔۔۔۔۔

مجھے اسے اپنی گود میں بھی نہ لینے دیا اور نہ ہی دودھ پلانے دیا۔۔۔۔۔ نجانے اسے کہاں پھینک آیا۔۔۔۔۔ ہائے اتنا چھوٹا بچہ۔۔۔۔۔ کہاں گم ہو گیا۔۔۔۔۔ ہائے میرے بچوں کو تو کسی کی نجر ہی کھا گئی۔۔۔۔۔ سب ہی گم ہو گئے ہیں۔۔۔۔۔ کوئی کہیں۔۔۔۔۔ کوئی کہیں۔۔۔۔۔ ہائے میں نے تو کسی کے ساتھ کبھی جلم نہیں کیا تھا۔۔۔۔۔ اور تو نے میرے ساتھ اتنا بڑا جلم کر دیا۔۔۔۔۔ ملکا مجھے ہی الجام دیتا تھا کہ میں نے ایسا بچہ پیدا کیا۔۔۔۔۔ تو بتا۔۔۔۔۔ کیا اس میں میرا قصور تھا؟ کیا میں نے کوئی گناہ کیا تھا جس کی تو نے مجھے یہ سجا (سزا) دی۔۔۔۔۔ ارے مجھے بھی تو کچھ پتہ چلے۔۔۔۔۔ کہ میں نے کیا کیا گناہ کیے ہیں؟

سورج کی تیز روشنی آنکھوں میں چبھنے لگی۔۔۔۔۔ بیو اور مجو آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھے اور منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کر کے کام پر چلے گئے۔۔۔۔۔

برکتے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو گھسیٹ گھسیٹ کر چل رہی تھی جب سے اس کے کولہے کا آپریشن ہوا تھا وہ ٹانگ گھسیٹ کر مشکل سے چلتی تھی۔۔۔۔۔ وہ گھر میں بیٹھ کر کڑھائی کا کام کرتی تھی۔ بیو، مجو اور وہ مل کر مشکل سے گھر کا خرچہ چلاتے تھے۔ شوہر بھی ایسا ملا تھا جو بہت لالچی، خود غرض اور کمینہ انسان تھا جس کے سینے میں دل نہیں پتھر تھا۔ اس نے کبھی ان لوگوں کی خبر نہ لی تھی۔۔۔۔۔

مٹھو کمائی کرنے بڑے شہر چلا گیا تھا۔۔۔۔۔ اسے سال ہونے کو آ رہا تھا مگر وہ کبھی کبھار آتا۔۔۔۔۔ نہ ماں کو کوئی پیسہ دیتا اور نہ ہی بہن بھائیوں کو۔۔۔۔۔ وہ شہر میں کہیں اچھی نوکری کرتا تھا مگر چھ سات ماہ سے وہ گھر نہیں آیا تھا۔۔۔۔۔ برکتے نے نکو کو بہت پیغام بھیجے اور اس کا پتہ کرنے کو کہا۔۔۔۔۔ اور وہ جو خبر لایا اسے سن کر برکتے کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس نے نشہ کرنا شروع کر دیا تھا۔۔۔۔۔ جو کماتا تھا وہ نشے میں اڑا دیتا تھا۔۔۔۔۔ اٹھتے بیٹھتے وہ اس کے لئے دعائیں کرتی تھی کہ وہ ٹھیک ہو جائے۔۔۔۔۔ وہ اچھا خاصا اس کے پاس سے گیا تھا نجانے وہاں جا کر وہ کیوں بھٹک گیا۔

وہ کس کس کو روتی۔۔۔۔۔ اس کی آنکھوں سے آنسو خشک نہیں ہوتے تھے۔۔۔۔۔ شبو کسی کے گھر کا کام کرتی تھی اچھے پیسے کما لیتی تھی مگر وہاں اس نے کسی ملازم کے ساتھ شادی کر لی۔۔۔۔۔ وہ اس کے ساتھ کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر میں رہتی تھی۔ دونوں خوش تھے اور وہ کبھی کبھار برکتے سے ملنے آ جاتی۔ برکتے کے پاس صرف بیو اور مجو تھے اور دونوں ہی معذور تھے مگر تھوڑا بہت کما لیتے تھے جس سے بمشکل گزارہ ہوتا تھا۔ زندگی کی گاڑی چل رہی تھی مگر اس گاڑی میں اس کے ساتھ سفر کرنے والے اس کے بچے گم ہو گئے تھے۔۔۔۔۔ سب بکھر گئے تھے۔۔۔۔۔ اور اس کی زندگی کا ساتھی ملکا۔۔۔۔۔ اس نے کبھی پلٹ کر ان کی خبر نہ لی تھی۔۔۔۔۔ بھاگی کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا۔۔۔۔۔ اسے نہ برکتے کی پرواہ تھی نہ بچوں کی۔۔۔۔۔ اس کے نزدیک نہ رشتے اہم تھے اور نہ ہی انسان۔۔۔۔۔ اسے اپنی زندگی، اپنی خوشیاں اور اپنا کھانا پینا عزیز تھا۔۔۔۔۔ ایسے بے فکرے انسان کو نہ اولاد کے بچھڑنے کا غم تھا اور نہ ان کے مرنے کا۔ نہ کسی کے گم ہونے کا اور نہ ہی کسی کے معذور ہونے کا۔۔۔۔۔ ایسے بے حس انسان کو دوسرے حساس انسان دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ یہ کس مٹی سے بنے ہوتے ہیں جن پر نہ کسی کا کوئی دکھ اثر کرتا ہے اور نہ ہی کسی کی آنکھ کا آنسو۔۔۔۔۔ وہ اپنی ذات میں مگن رہنے والے چوپائے نما انسان، لاپرواہی سے

اپنا وقت گزارتے ہیں اور کچھ لوگوں کو دکھ اندر ہی اندر مار دیتے ہیں...... جیسے برکتے کو...... جس کی ہر سانس سے آہیں نکلتی تھیں...... اور بات بے بات آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑتے تھے...... دل ہر وقت پریشان رہتا تھا...... کس کے غم کو بھولے اور کس کو یاد کرے...... کچھ غم انسان بھلائے بھی نہیں بھول پاتا وہ اندر ہی اندر انسان کو دیمک کی طرح کھاتے رہتے ہیں اور انسان کھوکھلا ہو جاتا ہے۔ برکتے ہر رات یونہی گزار دیتی اور صبح...... دوپہر...... شام...... وہ چہرے اس کے ارد گرد منڈلاتے رہتے...... اور ان کے دکھ کو وہ اپنے سینے میں اتارے بے دلی سے پھرتی رہتی...... کام کرتی مگر دل ہر دم پریشان رہتا...... تھک ہار کر خدا سے شکوے کرنے لگتی...... ہر رات اپنا ایک ایک دکھ اسے سناتی...... ایک ایک بات اس کے آگے دہراتی...... وہی باتیں کسی اور کو سناتی تو شاید وہ اکتا جاتا اور کبھی اس کی چوکھٹ پر نہ آتا...... مگر خدا کا حوصلہ بہت بلند ہے...... جو ہر انسان کے شکوے سنتا رہتا ہے...... خاموشی سے...... اور انسان اسے کہتے نہیں تھکتا۔ برکتے بھی ہر رات اسے سب کچھ سناتی اور وہ سنتا رہتا...... "ربا...... تو ہم انسانوں کے ساتھ بہت برا کھیل رہا ہے...... تو ہمیں رلاتا ہے...... مگر پھر بھی تجھے ہم پر رحم نہیں آتا...... کیسا بے پرواہ ہے تو...... ؟ ہمیں دنیا میں بھیج کر ہم سے بے نیاز ہو گیا ہے...... پتہ نہیں کس گناہ کی سزا کاٹ رہے ہیں...... عمر قید...... جو ختم ہی نہیں ہو رہی...... ٹھیک ہے...... تو خوش ہو لے......" برکتے بے بسی سے آسمان کو دیکھ کر سسکنے لگی۔

حاضرین محفل کی آنکھیں برکتے کا دکھ سن کر اشکبار ہونے لگیں...... انہوں نے بڑی سرکار کی پر عظمت اور شان و شوکت والی اور آنکھوں کو چندھیا دینے والی روشنی کی جانب نظریں اٹھا کر دیکھا...... وہ پر امید تھے کہ برکتے کے شکوے سن کر کوئی جواب آتا ہے...... مگر وہاں ہر طرف اطمینان کی فضا تھی...... روشنی کی چمک میں تھوڑا سا بھی ارتعاش پیدا نہیں ہوا تھا...... وہ بدستور چمک رہی تھی...... جیسے مکمل طور پر مطمئن اور پر اعتماد ہو...... حاضرین حیران ہونے لگے...... ان کے لئے یہ اطمینان انتہائی حیران کن تھا۔

☆

اچانک کسی کے سرپٹ بھاگنے سیٹیاں اور تالیاں بجانے ہانپنے کی آوازیں آنے لگیں۔ سب نے حیرانگی سے اس جانب دیکھنا شروع کر دیا جہاں سے آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔

سہ پہر کا وقت تھا...... فردوس میلے کچیلے کپڑوں میں، بوسیدہ سی پھٹی پرانی چادر لیے خستہ حال گھر سے نکلی تو محلے کے چھوٹے بڑے بچوں نے اس پر آوازیں کسنا شروع کر دیں...... وہ تالیاں اور سیٹیاں بجاتے اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے اسے "کھسرا"...... "کھسرا"...... پکارتے چلے جا رہے تھے اور وہ پیچھے مڑ مڑ کر انہیں گالیاں دیتی ہوئی ان کے آگے بھاگتی چلی جا رہی تھی۔ لڑکے اس پر قہقہے لگا رہے تھے...... بچوں کو دیکھ کر پاس سے گزرنے والے مرد و زن بھی کھڑے ہو کر یہ تماشا دیکھتے اور اس پر ہنستے...... کوئی ایک بھی نہیں تھا جو ان کو روکتا...... وہ تیز تیز قدموں سے بھاگتی چلی جا رہی تھی۔ سامنے سے تین چار آوارہ لڑکوں کا گروپ آ رہا تھا وہ بری طرح ان سے ٹکرائی ایک نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگانا چاہا...... دوسروں نے چٹکیاں کاٹیں...... ایک نے اس کے سر سے چادر ہٹائی تو اس کی گندی، اکڑے بالوں والی وگ نیچے گر گئی...... اس کے نیچے سے اس کا گنجا سر نکل آیا۔ سب اس کے گنجے سر پر ہاتھ مار مار کر گنگنانے لگے اور ہنسنے لگے...... فردوس نے بے بسی سے ان کی طرف دیکھا...... اپنی وگ سر پر رکھ کر وہاں سے

بھاگی...... وہ سرپٹ بھاگتی رہی...... اس کی سانس پھولنے لگی...... اسے کافی عرصے سے دمے کا مرض لاحق ہوا تھا۔ وہ بے دم ہو کر گندگی کے ایک ڈھیر کے پاس گر گئی...... اس کی سانس زور زور سے چل رہی تھی اور عجیب طرح کی گڑگڑاہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے سینے کو زور سے ہلایا۔ بمشکل ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے اپنے کرتے کی جیب سے inhaler نکال کر منہ میں اسپرے کیا...... تھوڑی دیر بعد اس کی سانس بحال ہونے لگی...... وہ ڈھلتے سورج کی روشنی میں کھلے آسمان کے نیچے وسیع و عریض زمین پر گندگی کے ڈھیر کے پاس چت لیٹی تھی اس کی آنکھیں آسمان پر مرکوز تھیں۔ زبان خاموش مگر آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی رواں تھی جو آنکھوں سے بہتے ہوئے مٹی میں جذب ہو رہے تھے...... اس کا دل لہولہان ہو رہا تھا اور جسم بری طرح کانپ رہا تھا۔

"اتنی ذلت...... اتنی بے عزتی...... اتنی رسوائی...... تو سب دیکھ رہا ہے نا...... اسی لئے ہمیں پیدا کیا ہے...... ہمارا تماشا دیکھنے کو...... ہمیں دنیا والوں کی نظروں میں ذلیل کرنے کو...... تو نے ہمیں کیوں پیدا کیا......؟

اس لئے کہ لوگ ہمارا مذاق اڑائیں...... ہم پر طعنے کسیں ہم پر ہنسیں...... ہمیں تنگ کریں...... اور ہمیں ذلیل کریں...... پتہ نہیں تو کیا چاہتا ہے......؟ کاش تجھ سے کبھی سامنا ہو تو ضرور پوچھوں گی...... کہ تو نے ہمارے ساتھ کیسا بھیانک مذاق کیا ہے...... ہم ادھورے انسانوں کو بنا کر تو نے ہم پر اپنی زمین اور اس کی خوشیاں بھی تنگ کر دی ہیں...... انسانوں، جانوروں، پرندوں، چوپایوں اور درندوں کی بھی شناخت ہوتی ہے...... ان کی بھی گروہ بندی ہوتی ہے...... تو نے ہمیں صرف انسانوں کا ڈھانچہ دے کر ہمیں اندر سے کھوکھلے اور ادھورے انسان بنا کر ہمارے ساتھ کتنی بڑی زیادتی اور کتنا ظلم کیا ہے...... کاش! تجھے ہمارے دکھوں کا اندازہ ہو...... کاش! تو ہمارے صرف ایک دن اور ایک رات کا حساب رکھے تو تجھے پتہ چلے کہ تیری اس دنیا میں ہم جیسے نامکمل اور ادھورے انسانوں کا رہنا کتنا مشکل ہے...... تو کیسا رب ہے......؟ تو کیسا اللہ ہے...... تو کیسا خالق اور مالک ہے؟ جسے ہمارے دکھ درد کا ذرا بھی احساس نہیں...... لوگ ہمارے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہیں...... تو دیکھ رہا ہے نا...... اور...... پھر بھی تو انہیں ہی نوازتا ہے...... انہیں ہی رہنے کو اچھے گھر اور مال و دولت دیتا ہے...... غربت، تنگی، مفلسی اور بے روزگاری تو ہمارے حصے میں آئی ہے...... تو انہیں رشتے، ناتوں سے نوازتا ہے...... اور...... ہم سے ہمارے اپنے بھی چھین لیتا ہے...... کوئی ہم جیسوں کو کوڑے کے ڈھیر پر پھینک آتا ہے...... تو کوئی سر راہ...... جب دنیا والوں کو ہماری ضرورت نہیں تھی تو پھر کیوں ہمیں پیدا کیا...... ہمیں ذلیل کرنے کو۔" وہ سسکنا شروع ہو گئی اور بڑی مشکل سے اپنے بوڑھے وجود کو سہارا دے کر اٹھایا اور اٹھ کر چلنے کی کوشش کی مگر اس کی سانس ٹھیک طرح بحال نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اٹھ کر کچھ فاصلے پر ایک چھوٹی سی مسجد کی سیڑھیوں میں بیٹھ گئی...... نماز ختم ہونے کے بعد نمازی باہر نکل رہے تھے۔ جو کوئی بھی اسے سیڑھیوں میں بیٹھا دیکھتا اس کے چہرے پر حقارت اور ناگواری کے تاثرات نمایاں ہوتے...... جیسے انہیں اس کا وہاں بیٹھنا بہت برا لگ رہا ہو مگر شاید کچھ خدا کے خوف سے وہ اسے دیکھ کر خاموش ہو جاتے...... وہ سر جھکائے بیٹھی تھی کبھی کبھار سر اٹھا کر اللہ کے بندوں کو دیکھتی ان کی نظروں کی تاب نہ لا کر پھر سر جھکا لیتی...... ان کی آنکھوں میں چھپی چبھن سیدھی اس کے دل میں نشتر چبھوتی وہ گھبرا کر آہ بھرتی...... اور اٹھنے کی کوشش کرتی مگر اس میں اٹھنے کی طاقت نہ تھی۔

"ارے...... یہ ہیجڑا یہاں کیوں بیٹھا ہے...... کیا اس کو پتہ نہیں کہ یہ اللہ کا گھر ہے...... یہاں ناچ گانا نہیں ہوتا" ایک شوخ مزاج آدمی

نے مسجد سے نکل کر چونک کر اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہوسکتا ہے یہ بھی نماز پڑھنے آیا ہو" دوسرے نے مذاقاً کہا۔

"یہ لوگ نماز بھی ناچ گا کر پڑھتے ہوں گے..... ان کو مسجد میں گھسا کر نمازیوں کا اخلاق کیوں خراب کرنا ہے..... اٹھاؤ اس کو یہاں سے..... حلیہ تو دیکھو اس کا..... یوں جیسے گندگی کے ڈھیر سے اٹھ کر آیا ہو..... مسجد میں پاک صاف ہو کر جاتے ہیں اور یہ تو خود ہی غلاظت کا ڈھیر معلوم ہو رہا ہے مسجد کو بھی ناپاک کر دے گا" دوسرے تیز طرار آدمی نے کہا تو دونوں اس کی طرف چلے آئے اور اسے گھورنے لگے۔

"اوئے..... تم یہاں کیوں بیٹھے ہو.....؟ اٹھو یہاں سے..... معلوم ہے کہاں بیٹھے ہو.....؟ اٹھو یہاں سے..... کسی اور جگہ جا کر بیٹھو..... مسجد کو گندا مت کرو" دوسرے نے غصے سے کہا تو اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگیں اور وہ خاموشی سے وہاں سے اٹھ گئی اور ان آدمیوں کی نظروں سے اوجھل ہونے کے بعد دور کھڑی ہو کر مسجد کی طرف حسرت اور شکوے بھری نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

"دیکھ لیا..... تو نے.....؟ یہ صرف تیرے بندے ہیں اور تو ان کا رب ہے، ہمارا کون ہے؟ کوئی بھی نہیں..... تو بھی نہیں..... جب تو نے ہم پر رحم نہ کھایا تو پھر یہ کیوں ترس کھائیں..... تو نے ہمیں دھتکارا ہے..... تو پھر یہ کیوں ہمیں کچھ جانیں..... پتا نہیں زندگی کا یہ عذاب کب تک سہنا پڑے گا..... اچھا ہوا نرگس مر گئی..... بے بی مر گیا اور میں زندہ رہ گئی..... لوگوں کی گالیاں اور مار کھانے کو....." وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی..... وہ کتنی ہی دیر روتی رہی..... اور پھر اٹھ کر یونہی ادھر ادھر گھومنے لگی..... اسے بہت بھوک بھی لگ رہی تھی..... مگر اس کی جیب میں ایک روپیہ بھی نہ تھا کہ وہ کچھ خرید کر کھا سکتی..... اس نے ایک شاپنگ سنٹر کا رخ کیا..... وہاں اکثر عورتوں سے بھیک میں چند سکے مل جاتے تھے اور عورتیں شاید ان کے لئے نرم گوشہ رکھتی تھیں..... وہ ہیجڑوں کے ساتھ ویسی بدتمیزی نہیں کرتی تھیں جیسا کہ مرد کرتے تھے..... اسے بھیک میں چند روپے مل گئے اور اس نے ان سے پکوڑے اور روٹی خرید کر کھالی۔

وہ حسرت بھری نگاہوں سے خواتین کو شاپنگ بیگ اٹھائے، ہنستے مسکراتے، ادھر ادھر گھومتے پھرتے دیکھنے لگی..... کچھ کے ساتھ ضد کرتے اور روتے چلاتے بچے بھی تھے۔ وہ حیرت سے سب کی طرف دیکھتی کبھی عورتوں کی طرف تو کبھی بچوں کی طرف.....

"تم لوگ کتنی خوش نصیب ہو..... جنہیں رب نے کتنا کچھ دیا ہے..... خوبصورت گھر..... شوہر، بچے، خاندان..... رشتے دار..... بہن بھائی..... دوست..... اور..... ہمیں..... ان میں سے کچھ بھی نہیں....." اس نے آہ بھری اور آنسو اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔

"اچانک ایک ماڈرن سا لڑکا اپنی کار سے نکلا اور اس کے ساتھ ایک خوبصورت سا چھوٹا سا کتا تھا..... جس کے سفید ریشم جیسے بال ہوا کے جھونکوں سے ادھر ادھر ہل رہے تھے..... اس لڑکے نے باہر نکل کر اسے گود میں اٹھایا..... اسے پیار کیا اور سنٹر کے اندر چلا گیا..... فردوس نے حسرت بھری نگاہوں سے اس کتے کی طرف دیکھا۔

"ہم سے تو اچھے یہ کتے ہیں..... جنہیں انسان پیار کرتے ہیں..... ہماری اوقات اتنی بھی نہیں کہ کوئی جانوروں جتنی توجہ بھی ہمیں دے سکے..... اپنے اپنے نصیب کی بات ہے....." وہ کتنی ہی دیر ادھر بلا وجہ بیٹھی سوچتی رہی..... اور پھر بوجھل قدموں سے اٹھ کر بھیک مانگنے لگی..... شام

گہری ہونے تک اس نے چند پیسے اکٹھے کر لیے تھے جن سے رات کا کھانا کھا سکتی تھی..... وہ رات گئے گھر جا رہی تھی تو ایک لڑکا راستے میں مل گیا۔

''اے فردوس..... آج شام کو ہمارے گھر شادی ہے..... آ جانا'' لڑکے نے کہا۔

''اے مبارک ہو..... کس کی شادی ہو رہی ہے؟'' وہ خوش ہو کر بولی۔

''میرے بھائی کی.....'' لڑکے نے جواب دیا۔

''تو فکر نہ کر..... میں پہنچ جاؤں گی.....'' اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

''اور..... سن..... اچھے کپڑے پہن کر آنا..... امیر لوگوں نے آنا ہے..... میرا مطلب سمجھ گئی ہو نا'' لڑکے نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''ارے تو فکری نہ کر..... ایسی چھمک چھلو بن کر آؤں گی..... سب دلہن کی بجائے مجھے ہی دیکھیں گے'' فردوس نے قہقہہ لگا کر کہا۔

''ٹھیک ہے..... میں جا رہا ہوں..... تم آ جانا'' لڑکا کہہ کر مسکراتا ہوا چلا گیا..... اور اس نے اپنا صندوق کھولا اور اس میں سے ایک چمکدار جوڑا..... میک اپ، زیورات، چوڑیاں، لمبے بالوں والی وگ نکالی..... جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر کپڑے پہنے اور آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی..... اپنے بوڑھے اور جھریوں زدہ چہرے کی طرف بغور دیکھنے لگی۔ خوشی خوشی گنگناتے ہوئے میک اپ کی تہیں چہرے پر جمانے لگی..... تیار ہو کر اور وگ پہن کر اس نے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی بجائے کوئی اور کھڑا ہو..... اس سے اپنا آپ پہچاننا مشکل ہو رہا تھا۔

''انسان کیسے کیسے روپ بدلتا ہے..... ایک چہرے پر دوسرا چہرہ..... آنسوؤں کے ساتھ ہنسی..... غمی دل کے ساتھ لبوں پر مسکراہٹ..... اصل انسان کہاں ہے؟'' اس نے آہ بھر کر سوچا..... آج جو کچھ اس کے ساتھ ہوا تھا..... تقریباً ہر روز ہوتا تھا پھر کوئی نہ کوئی ایسی بات ہو جاتی تھی کہ وہ پھر سے پر امید ہو کر نیا دن گزارنے پر آمادہ ہو جاتی تھی..... انسان بھی کتنا ناقابل اعتبار ہے..... لمحوں میں بدل جاتا ہے..... کبھی ایک دم مایوس ہو جاتا ہے..... تو کبھی اچانک ہی پر امید ہو کر پرعزم..... اس نے اپنے سارے غم اور دکھ کہیں وقتی طور پر چھپا دیے تھے اور پر امید ہو کر تیار ہو رہی تھی..... تیار ہو کر اس نے اپنے آپ کو مسکرا کر دیکھا اور نادانستہ پرفیوم پکڑ کر اپنے اوپر چھڑکاؤ کیا..... اسے یاد ہی نہ رہا کہ ڈاکٹر نے اسے تیز پرفیوم لگانے سے منع کیا تھا اچانک اس کی طبیعت بگڑنے لگی اور اس کی سانس خراب ہونے لگی..... اس نے پھر inhaler نکالا اور اسپرے کیا..... تو اس کی طبیعت بہتر ہو گئی.....

اس نے خاموشی سے وگ اتاری..... میک اپ کی تہیں صاف کیں اور کپڑے بدل کر چارپائی پر لیٹ گئی.....

''میں اب مزید نہیں ناچ سکتی..... میرا جسم ہار گیا ہے..... میری سانس اب میرے جسم کا ساتھ نہیں دیتی.....'' اس نے بے بسی سے سوچا۔

اسے یاد آنے لگا..... چند روز پہلے جب وہ ایک شادی پر ناچ رہی تھی اچانک اس کی سانس اکھڑ گئی تھی اور وہ بے دم ہو کر گر پڑی تھی..... سب لوگ اسے لعن طعن کرنے لگے کہ اگر وہ بیمار تھی تو کیوں آئی..... سب لوگوں نے اسے بہت ذلیل کیا تھا اور وہ بڑی مشکل سے وہاں سے چل کر آئی تھی۔

''فردوس اب تجھ میں ہمت نہیں رہی..... تو بوڑھی ہو گئی ہے۔ تیرا جسم بیمار ہو گیا ہے..... میں اپنے آپ کو کتنی امیدیں دلاؤں..... کتنا حوصلہ دوں..... مگر اب میں ہار گئی ہوں..... جب تو ہرانے پر آتا ہے تو انسان ہارتا ہی چلا جاتا ہے..... اور جب تو ذلتوں کے ہار گلے میں پہنا کر بھیجتا

ہے تو پھر انسان کو عزت کہاں سے ملتی ہے۔۔۔۔۔ میں اپنے ٹوٹے دل، بیمار جسم اور اکھڑی سانسوں کے ساتھ کب تک ماری ماری پھرتی رہوں گی۔۔۔۔۔ بھیک مانگتی رہوں گی۔۔۔۔۔ میں ہار گئی ہوں۔۔۔۔۔ بہت بے بس ہو گئی ہوں" اور اس نے اپنی وگ پکڑ کر اس کا ایک ایک بال نوچ ڈالا۔۔۔۔۔ سارا میک اپ توڑ دیا اور چمکیلے دوپٹے کو تار تار کر دیا۔۔۔۔۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔۔۔۔۔

"اب تو بس کر دے۔۔۔۔۔ کہ مجھ سے سانس لینا مشکل ہو رہا ہے۔۔۔۔۔"

اس کی سسکیاں اور آہیں بلند ہونے لگیں۔ بڑی سرکار کے دربار میں موجود حاضرین کی آنکھیں نم ہونے لگیں اور کچھ نے انسانوں کے اس دکھ کو محسوس کرتے ہوئے گہری سانسیں لیں۔۔۔۔۔ ہر طرف ایسی خاموشی چھائی تھی جو سب کو ڈس رہی تھی اس خاموشی میں کرب اور دکھ کا ملا جلا احساس تھا۔

کچھ حاضرین نے بڑی سرکار کے خیالات و احساسات جاننے کے لئے اس مخصوص روشنی کی طرف دیکھا۔۔۔۔۔ روشنی کی لو قدرے دھیمی ہو گئی تھی جیسے کسی کے دکھ کے احساس کو محسوس کرتے ہوئے کوئی دکھی ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔ شاید اس احساس سے ہی سارا ماحول افسردہ ہو گیا تھا۔۔۔۔۔ شاید بڑی سرکار کو بھی دکھ ہو رہا تھا۔۔۔۔۔ یہ دیکھ کر۔۔۔۔۔ جو انسان دوسروں انسانوں کے ساتھ کر رہے تھے۔۔۔۔۔

سب نے گہری سانس لی۔ ہر طرف سوگواری سی محسوس ہونے لگی۔

☆

اچانک کسی کے آہوں کی صدا سنائی دینے لگی۔۔۔۔۔

سب چونکے اور اس کی جانب دیکھنا شروع کر دیا جہاں سے آہیں بلند ہو رہی تھیں۔

آدھی رات کا وقت تھا۔۔۔۔۔ ہر طرف گہری تاریکی چھائی تھی کیونکہ آج چاند نمودار نہیں ہوا تھا۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے تھے جنہوں نے چاند کو بھی چھپا دیا تھا۔۔۔۔۔ شاید آسمان کا دل بھی زمین والوں کے دکھ دیکھ دیکھ کر بادلوں سے بھر گیا تھا اور بھرپور انداز میں بارش برسا کر اس کا اظہار کرنا چاہتا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ شامو پارلر سے لوٹا تھا۔۔۔۔۔ وہ بہت تھکا ہوا تھا مگر پھر بھی اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ سینے میں عجیب سی گھٹن محسوس کر رہا تھا۔۔۔۔۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی سانس بند ہو رہی ہو۔۔۔۔۔ وہ اپنے محل نما گھر کے وسیع و عریض لان میں چکر لگانے لگا۔ اس کا دل بہت افسردہ ہو رہا تھا اور وہ آسمان کی طرف دیکھتا ہوا لمبی آہیں بھر رہا تھا۔۔۔۔۔

"مجھے تجھ سے کوئی شکوہ نہیں۔۔۔۔۔ کہ تو نے مجھے کچھ نہیں دیا۔۔۔۔۔ تو نے مجھے بہت کچھ دیا ہے۔۔۔۔۔ بہت کچھ۔۔۔۔۔ مگر یہ سب کچھ میرے لیے کتنا بے 'معنی' ہے شاید تمہیں بھی اس کا اندازہ ہے۔۔۔۔۔ اتنے بھرے گھر میں میرا ادھورا اور خالی وجود کیا معنی رکھ سکتا ہے۔۔۔۔۔ میں اپنے آپ کو ٹیبل پر رکھے ایک ڈیکوریشن پیس سے بھی زیادہ اہم نہیں سمجھتا۔۔۔۔۔ وہ ڈیکوریشن بھی کسی شے کی شان بڑھاتا ہے۔۔۔۔۔ اس کی خوبصورتی میں اضافہ کرتا ہے اور۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ میں کیا ہوں؟ کیوں ہوں۔۔۔۔۔؟ اور کس لئے ہوں۔۔۔۔۔؟ میرا وجود کسی کے لیے اہم نہیں۔۔۔۔۔ یہ سوالات مجھے ہر وقت اندر ہی اندر کتنا دکھ دیتے ہیں۔۔۔۔۔ شاید کوئی اس دکھ کو محسوس کر سکے۔۔۔۔۔ میں ہنر سیکھ کر سمجھتا تھا کہ میں اہم ہو گیا ہوں۔۔۔۔۔ جب لوگوں کو میری ضرورت محسوس ہوتی تو میرے اندر میری اہمیت کا احساس پیدا ہونے لگتا کہ میں لوگوں کی ضرورت بن گیا ہوں۔۔۔۔۔ ان کا کام میرے بغیر نہیں چل سکتا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ

احساس ہونے لگا ہے کہ نہیں...... میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ اگر میں آج دنیا سے چلا جاتا ہوں...... تو...... کل کو سب مجھے بھول جائیں گے اور بس...... میری کہانی ختم......" اس نے گہری سانس لی۔ اچانک تیز بارش شروع ہوگئی اور وہ گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ اپنے کمرے میں جا کر وہ شیشے کی بڑی سی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ بارش انتہائی تیز تھی...... ہر طرف جل تھل ہو گیا...... ایسی ہی بارش اس کے اندر بھی ہو رہی تھی...... آج اس کا دل بہت بری طرح ٹوٹا تھا...... وہ جو بہت عرصے سے مثبت سوچنے کی کوشش کر رہا تھا...... اچانک کرچی کرچی ہو کر بکھر گیا تھا...... وہ اپنی ذات کی پرچھائیں سے بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا...... اپنے آپ کو بھلا کر زندگی کی دوڑ میں شامل ہونے کی کوشش کر رہا تھا...... اور...... دن رات اپنے آپ کو بھلا کر زندگی کا حصہ بننے کی جدوجہد کر رہا تھا...... اچانک ٹوٹ گیا تھا...... ایسا وہ کئی بار ٹوٹا تھا...... جب وہ چودہ سال کی عمر میں اپنے گھر والوں کو تلاش کر کے انہیں ملنے گیا تھا...... اس کے بہن بھائیوں نے اسے دروازے سے ہی دھتکار دیا تھا......

"ہمارے گھر کبھی کوئی ہیجڑا پیدا نہیں ہوا...... اور...... تم کیا سوچ کر آئے ہو...... کہ...... ہم کسی ہیجڑے کو اپنے گھر گھسنے دیں گے...... یہ ہمارا گھر ہے کوئی تھیٹر نہیں...... جہاں تم اپنے ناچ گانے اور پھکڑ بازی سے ہمارا دل بہلاؤ گے...... بھاگو یہاں سے...... اور یہاں کبھی نہ آنا......" اس کے بڑے بھائی نے غراتے ہوئے کہا۔

"مجھے اپنی ماں سے ایک بار ملنے تو دو...... جب سے آنکھ کھولی ہے ماں کو دیکھنے کو ترس گیا ہوں" شامو نے روتے ہوئے کہا۔

"خبردار...... جو ماں کا نام لیا...... نجانے کون ہو...... اور...... کہاں سے آئے ہو...... یہاں تمہاری ماں نہیں رہتی" اس کے بھائی نے غصے سے کہہ کر دروازہ بند کر دیا...... اور وہ کرچی کرچی دل اور بہتی آنکھوں کے ساتھ وہاں سے لوٹ آیا اور دوسری بار جب نرگس نے اسے گھر سے نکالا تھا...... کہ وہ اب اس کو مفت میں روٹی نہیں کھلا سکتی کیونکہ وہ اس کا کچھ نہیں لگتا۔ وہ رات اس کی زندگی کی بھاری ترین رات تھی...... اسے تب سمجھ آگئی تھی کہ اسے زندگی کا سفر تنہا ہی کاٹنا ہے...... اگلی زندگی میں اس کا ساتھ دینے والا...... اس سے محبت کرنے والا...... اس کے لئے کچھ محسوس کرنے والا کوئی نہیں...... مگر استاد جمالے سے ملنے کے بعد اس کا ذہن اور سوچ بدلنی شروع ہو گئی...... کہ انسان کی زندگی میں سگے رشتے ہی نہیں...... غیر لوگ بھی اہم ہوتے ہیں...... اور جو کسی کے لئے دکھ درد محسوس کرے...... وہی اپنا ہوتا ہے...... وہی دل کے قریب ہوتا ہے...... اور وہ ہر دکھی انسان کی آگے بڑھ کر مدد کرتا تھا...... ہر ایک سے محبت سے بات کرتا تھا...... لوگ اس سے محبت کرنے لگے تھے...... انسانیت سے محبت کا جذبہ اسے دوسرے انسانوں کے قریب لا رہا تھا...... وہ اپنے ادھورے پن کو بھولنے لگا تھا خود کو انسان سمجھنے لگا تھا......

مگر......

آج...... وہ پھر وہیں کھڑا ہو گیا تھا...... جب چودہ سال کی عمر میں وہ دھتکارا گیا تھا...... تب سگے رشتوں نے دھتکارا تھا اور آج انہوں نے جو...... غیر تو تھے مگر جنہیں وہ اپنا سمجھتا تھا...... ایسی دھتکار وہ رانی کے ہاتھوں بھی سہہ چکا تھا مگر رانی کی بات اور تھی...... رانی نے اسے محبت کے راستے پر ڈالا تھا اور اس کی زندگی بن گئی تھی وہ انسانیت کے رشتے پر یقین کرنے لگا تھا...... مگر آج وہ رشتہ بھی ٹوٹ گیا تھا جس پر اس کو بڑا ناز تھا...... پارلر میں ایک جواں سال لڑکی روزی کو پارلر میں نوکری کرتے ہوئے چند ہفتے ہی ہوئے تھے...... وہ جب سے پارلر میں آئی، ہر وقت روتی

رہتی تھی کیونکہ اس کے باپ کو ٹیبی کا مرض لاحق تھا اور وہ ہر وقت اپنی غربت اور باپ کی بیماری کی وجہ سے دکھی اور غمگین رہتی تھی...... شمی اسے دیکھ کر بہت افسردہ ہوتا تھا ہر روز چپکے سے اسے پیسے تھما دیتا تھا...... وہ چونک کر اس کی طرف دیکھتی تو وہ اسے مسکرا کر کہتا۔

''کہ تم میری چھوٹی بہن ہو......'' تو وہ مسکرا دیتی۔

وہ پارلر میں آتے ہی اپنے گھر کی ساری باتیں اسے بتاتی...... اس کے باپ کو رات بھر کتنی تکلیف تھی اور وہ کس طرح رات بھر جاگتی رہی۔ اس کی ماں مر چکی تھی صرف دو بہنیں اور ایک چھوٹا بھائی تھا...... روزی کے علاوہ ان کا کمانے والا اور کوئی نہ تھا...... شمسی کی ہر روز کی مدد سے روزی کی پریشانی کافی کم ہو گئی تھی...... روزی اس کے لئے گھر سے کھانا بنا کر لاتی، اسے محبت سے بھائی کہہ کر بلاتی تو وہ خوشی سے پھولا نہ سماتا...... دونوں میں کافی دوستی ہونے لگی تھی...... جو اکثر لڑکیوں کو کھٹکتی تھی...... شمی کو اسلم نے کسی کام کے سلسلے میں اپنے آفس بلایا تھا۔ وہ پارلر میں نہیں تھا...... وہ پورے پارلر کا انچارج تھا۔ اسلم نے اس کی ترقی کر دی تھی۔ اب وہ صرف امیر اور انتہائی اہم و مشہور خاندان کی خواتین کا میک اپ اور کٹنگ کرتا تھا...... ورنہ اس سے پہلے وہ پارلر میں کام کرنے والی لڑکیوں کی نگرانی کرتا...... وہ بہت احسن طریقے سے پارلر چلا رہا تھا۔ اسلم اس سے بہت خوش تھا...... شمی کی موجودگی میں اکثر لڑکیوں کو ایک دوسرے سے بات کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا...... اس کا ایک مخصوص کیبن تھا جہاں ٹی وی پر سارے پارلر کی کارکردگی کیمروں کے ذریعے دکھائی جاتی تھی اور شمی وہاں بیٹھ کر سب کو آبزرو کرتا رہتا تھا...... جب ضرورت محسوس کرتا تو باہر جاتا ورنہ اندر ہی بیٹھا رہتا......

''شمی پارلر سے باہر گیا ہے......'' ایک لڑکی نے بتایا۔

''اچھا...... کب......؟'' دوسری نے پوچھا۔

کافی دیر ہو گئی ہے۔ دوسری نے جواب دیا اور دونوں اپنے کاموں میں مصروف ہو گئیں...... اور تھوڑی دیر بعد فارغ ہو کر لاؤنج میں صوفے پر بیٹھ گئیں...... لاؤنج کی ایک کھڑکی شمی کے کیبن میں کھلتی تھی اور اکثر وہاں ہونے والی گفتگو شمی کے کیبن میں سنی جاتی تھی...... شمی پچھلے دروازے سے کیبن میں آ کر بیٹھا ہی تھا...... کہ باہر سے مختلف آوازیں اسے سنائی دیں۔

''ہیلو...... روزی...... کہاں سے آ رہی ہو؟'' صوفے پر بیٹھی ایک لڑکی نے پوچھا۔

''ابو کو ہاسپٹل لے کر گئی تھی'' اس نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''اب وہ کیسے ہیں......؟'' دوسری نے پوچھا۔

''بہتر ہیں...... کیا شمی بھائی اپنے کیبن میں ہیں؟'' روزی نے پوچھا۔

''نہیں...... اور...... سنو...... تم انہیں شمی بھائی مت کہا کرو'' دوسری لڑکی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب......؟'' روزی نے چونک کر پوچھا۔

''کیا تمہیں کچھ معلوم نہیں؟'' لڑکی نے پوچھا۔

''نہیں......'' روزی نے معصومیت سے جواب دیا۔

"یہ تو انہیں خود بھی معلوم نہیں کہ وہ بھائی ہیں یا بہن" دوسری لڑکی نے قہقہہ لگا کر جواب دیا۔

"ک.....کیا.....مطلب.....؟" روزی نے حیرت سے پوچھا۔

"بھئی.....وہ.....ہیجڑا ہے" لڑکی نے رازدارانہ انداز میں قدرے اونچی آواز میں کہا۔

"ک.....کیا.....مطلب.....؟" روزی کی آواز میں کپکپاہٹ پیدا ہونے لگی۔

"یہ بالکل سچ بات بتا رہی ہوں.....یقین نہ آئے تو اپنے بھائی سے ہی پوچھ لینا.....تمہیں تو وہ سگی بہن سمجھتے ہیں" بیچارے" لڑکی نے ہنستے ہوئے کہا تو روزی دم بخود وہیں کی وہیں کھڑی رہ گئی۔

"چلو اب چلتے ہیں.....لیڈیز ہمارا انتظار کر رہی ہوں گی" وہ دونوں لڑکیاں اندر چلی گئیں اور روزی کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔وہ تو شمی کو آدمی نہیں فرشتہ سمجھتی تھی اور وہ تو آدمی بھی نہیں نکلا تھا.....اس کا مطلب ہے میں ایک ہیجڑے کی کمائی سے اپنے باپ کا علاج کراتی رہی اسے کراہت سی محسوس ہونے لگی اور وہ بوجھل قدموں سے پارلر کے اندر چلی گئی۔

شمی نے ساری باتیں سن لی تھیں اور اس کا دل بری طرح ٹوٹا تھا.....وہ تو یہی سمجھتا تھا کہ یہاں پر کام کرنے والے سب لوگ اس کی بڑی عزت کرتے ہیں.....اس سے محبت کرتے ہیں.....اسے انسان سمجھتے ہیں.....اور اب اسے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ اسے کیا سمجھتے تھے اور اس پر کس طرح ہنستے تھے.....وہ پریشان سا سر جھکا کر بیٹھا تھا جب روزی اس کے کیبن میں داخل ہوئی، اس نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"آؤ.....روزی.....کیسی ہو.....؟ اور تمہارے ابو کیسے ہیں؟" شمی نے اپنے آپ کو نارمل کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"سب ٹھیک ہیں.....اور.....یہ آپ کے پیسے.....باقی جو آپ نے میری مدد کی.....میں وہ سب جلد لوٹا دوں گی....." روزی نے نم آنکھوں سے کہا۔

"کیا مطلب.....اور یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ میں نے کچھ واپس لینے کی خاطر تو تمہاری مدد نہیں کی تھی.....اور میں نے مدد بھی نہیں کی.....میں تو تمہیں اپنی چھوٹی بہن سمجھتا ہوں" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں کسی ہیجڑے کی بہن نہیں ہوں.....اور.....نہ ہی کسی ہیجڑے کی کمائی سے اپنے باپ کا علاج کرانا چاہتی ہوں.....میں.....یہ پارلر چھوڑ کر جا رہی ہوں.....ہمیشہ کے لئے.....آپ کے پیسے آپ تک پہنچ جائیں گے" روزی کہہ کر اس کے کیبن سے نکل گئی اور اسے یوں محسوس ہوا کہ روزی نے اس کے چہرے پر ایسا طمانچہ مارا تھا کہ اس کے سارے زخم ہرے ہو گئے تھے.....اس طمانچے کی جلن وہ اپنی روح میں محسوس کر رہا تھا.....اس کا دل خون کے آنسو بہانے لگا۔اس نے بہت مشکل سے پارلر میں وقت گزارا اور گھر آ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا.....اتنا رویا کہ اس کی سانس رکنے لگی.....مگر آنسو کسی طرح تھم ہی نہ رہے تھے۔وہ آنکھیں جھپکتا تو آنسو گر پڑتے جیسے پلکوں میں کہیں جمع ہو گئے تھے.....اور آنکھوں کی ذرا سی جنبش سے وہ تڑپ کر آنکھوں سے گر پڑتے تھے.....

"ہم کیسے دھتکارے ہوئے لوگ ہیں.....جن کا نہ کوئی بننا چاہتا ہے اور نہ ہم کسی کو اپنا سکتے ہیں.....زندگی میں رشتے کتنے انمول ہوتے

ہیں......اور کتنے اہم......اور ہمارے پاس رشتے ہی نہیں......اور زندگی بھی ادھوری......شاید ہمارے خالی اور کھوکھلے وجود رشتوں کا بوجھ نہیں سہار سکتے تھے اس لیے خدا نے ہمیں رشتوں سے محروم رکھا۔

"یا اللہ! یہ تو نے ہمارے ساتھ کیا کیا ہے......؟ ہم کو کہاں کہاں رسوا کرتا ہے......؟

ہمارے پاس کچھ ایسا نہیں کہ ہم اپنے آپ پر سے یہ رسوائیاں مٹا سکیں......

ہم کیا کریں......؟

کہاں جائیں......؟

کس سے مانگیں......؟

کون ہے جو ہماری سنے......؟

اور ہمارے دکھ کو محسوس کر کے ہمارے زخموں پر مرہم رکھے...... چند بول تسلی کے بولے...... ہمارے ٹوٹے دلوں کو جوڑے...... ہماری شکستہ روحوں کے دکھ کو محسوس کرے......

کاش! کوئی تو سنے

مگر

کون سنے گا جب تو نہیں سنتا......؟

کون سمجھے گا جب تو نہیں سمجھتا......؟

کون محسوس کرے گا جب تو ہمارا احساس نہیں کرتا......؟

اس کی آہیں......سسکیاں اور آنسو شدت اختیار کرنے لگے آسمان بھی پورے جوش و خروش سے برس رہا تھا جیسے اس کے غم پر کھل کر رو رہا ہو۔

بڑی سرکار کے دربار میں موجود حاضرین نے بھی گہری سانسیں لیں......اور ان کی آنکھوں سے بھی اشک رواں ہو گئے۔ ہر طرف مکمل خاموشی تھی......

متبرک روشنی کی لو بھی مدہم ہونے لگی......جیسے وہ بھی ان کے دکھ سن کر افسردہ ہو رہی ہو۔

مگر ہر جانب مسلسل خاموشی طاری تھی۔

......❁......

# (۴)

کئی روز سے شدید حبس ہو رہا تھا...... گرمی اور حبس سے ہر کوئی پریشان ہو رہا تھا...... زیتون بانو کا دل کمرے کی گھٹن سے بری طرح گھبرا گیا تھا اور وہ صحن میں چارپائی پر سونے کی ناکام کوشش کر رہی تھی...... رات...... آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ آسمان پر چاند اور ستارے پوری آب و تاب سے چمک رہے تھے۔ ہر طرف گہری خاموشی اور ہو کا عالم تھا کہیں کہیں سے گیدڑوں کے چیخنے کی آوازیں رات کی ہولناکی میں مزید اضافہ کر رہی تھیں۔ زیتون بانو کو نیند بالکل بھی نہیں آ رہی تھی۔ وہ بار بار کروٹیں بدل رہی تھی۔ شاہ زیب کو اس سے جدا ہوئے دس سال ہو گئے تھے مگر وہ ایک لمحے کے لئے بھی اس سے جدا نہیں ہوا تھا اس کا اکلوتا بیٹا...... جسے اس نے بہت منتوں، مرادوں سے خدا سے لیا تھا۔ بہت محبت سے اس کی پرورش کی تھی جسے دیکھ دیکھ کر وہ جیتی تھی...... جس کی ایک خوشی کی خاطر وہ اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو جاتی تھی۔ اس کی آنکھ کا ایک آنسو اسے کتنا پریشان کر دیتا تھا...... اور اس کے وجود کی خوشبو سے اس کا گھر مہکتا تھا...... جس کی درازیٔ عمر کے لئے وہ ہر لمحہ دعائیں مانگتی تھی...... وہ اسے روتا تڑپتا چھوڑ کر دنیا سے چلا گیا تھا۔ اس کی جوان میت کا منظر اس کی آنکھوں سے محو نہیں ہوتا تھا...... وہ صرف چالیس سال کی زندگی لکھوا کر لایا تھا...... اتنی مختصر زندگی...... اور وہ بھی اتنی اذیت ناک......

زیتون بانو کو اگر دکھ تھا...... تو...... یہی...... کہ شاہ زیب کو اتنی تھوڑی زندگی ملی اور وہ بھی اذیتوں سے پر...... اتنا خوبصورت...... نیک اور پارسا انسان...... خوبصورت دل و دماغ کا مالک...... کیسے کیسے دکھ اٹھا کر دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ اسے زندگی کا کوئی سکھ نہ ملا تھا...... خوشیاں بھی ادھوری ملیں اور خواہشات گویا اس کے اندر تھیں ہی نہیں...... اس نے کبھی کوئی خواہش نہیں کی تھی...... بچپن میں بھی کبھی کسی شے کے لئے ضد نہیں کی تھی...... زیتون بانو اور اس کے شوہر کو حسرت ہی رہی کہ کبھی وہ کسی شے کے لئے ضد کرے اور اس کی ضد پوری کرنے کے لئے پریشان ہوں۔ باپ کی وفات کے بعد اس نے کس کس طرح زیتون بانو کی دلجوئی کی تھی یہ صرف وہی جانتی تھی۔ وہ اسے کبھی تنہا نہیں ہونے دیتا تھا۔ اس کی ضروریات کا خود خیال رکھتا...... اور وہ اسے دعائیں دیتی نہ تھکتی تھی۔

''میری...... کوئی دعا بھی اسے نہ لگی'' زیتون بانو نے آسمان کی جانب دیکھا اور سسکنے لگی۔

نہ اس کا گھر بسا...... نہ اچھی گھر والی ملی...... جس نے اسے اپنے قریب ہی نہ آنے دیا...... کتنا صبر تھا...... شاہ زیب میں...... کہ اس نے ماں کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی اور اپنی بیوی کا بھرم قائم رکھا......

نجانے...... وہ کیسی عورت تھی...... جس کو شاہ زیب جیسے انسان میں کوئی خوبی نظر نہ آئی...... وہ بڑی ہی بے وفا نکلی...... شاہ زیب اس سے وفا نبھاتا رہا اور وہ بے وفائی کی آخری حد تک چلی گئی...... اپنے محبوب کو شوہر کے مقابلے میں کھڑا کر دیا...... ایسی ظالم عورت بھی بھلا کوئی ہو سکتی ہے...... کاش مجھے پہلے معلوم ہو جاتا تو میں اسے ایک دن بھی اپنے گھر نہ رہنے دیتی مگر یہ شاہ زیب کا ظرف تھا کہ پہلے دن سے ہی اس کی دھتکار

خاموشی سے سہتا رہا اور اف تک نہ کی۔ خدا کرے...... تم کبھی سکھی نہ رہو...... تم اسی اذیت میں سے گزرو...... جس اذیت میں سے میرا بیٹا گزرتا رہا ہے۔ تم نے اس کو بے نام ونشان کیا...... تمہاری جگہ کوئی اچھی عورت ہوتی تو شاہ زیب کے نام کی مالا جپتی رہتی مگر تم تو بڑی ہی کٹھور نکلیں...... نجانے تم کس مٹی سے بنی تھیں......'' زیتون بانو چمکتے ستاروں کی جانب دیکھتے ہوئے اپنے آپ سے باتیں کرتی رہی۔

''اور...... مولا...... تم نے بھی تو اس کے ساتھ اچھا نہ کیا...... ایسی بدتر عورت اس کے نصیب میں لکھی...... جس نے اس کی ذرا سی بھی قدر نہ کی...... اور نہ اسے محبت دی...... اور...... پھر...... تو نے اس کی آنکھوں کی روشنی بھی چھین لی...... وہ کتنا بے بس اور مجبور ہو گیا تھا...... چلتے ہوئے جب ٹھوکریں کھاتا تھا تو میرا دل بری طرح کٹتا تھا...... وہ اپنی چھوٹی چھوٹی ضروریات کے لئے کتنا محتاج ہو گیا تھا کیا اچھے انسانوں کو ایسی سزائیں دی جاتی ہیں...... اس نے کیا گناہ کیے تھے جو تو نے اسے یہ سزائیں دیں......

آنکھوں کی روشنی جانے کے بعد وہ ایسا خاموش ہوا کہ مجھ سے بھی کوئی بات نہ کرتا تھا اور یونہی چپ چاپ اس نے دنیا چھوڑ دی......

مجھ سے اس کی موت کا صدمہ برداشت نہیں ہوتا...... میں کیا کروں...... جب اتنی زمین جائیداد اور مال و دولت دیکھتی ہوں...... اور ان سب کا کوئی وارث نظر نہیں آتا تو میرا دل کتنا دکھی ہو جاتا ہے...... بہرام خان بھی اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ شہر میں جا آباد ہوا ہے...... وہ کبھی کبھار گاؤں آتا ہے اور میں اسے کوئی حق بھی نہیں جتلا سکتی...... کیسے کہوں اس کی اپنی زندگی ہے...... میں اتنی بڑی حویلی میں کب تک ملازموں کے ساتھ زندگی گزاروں گی...... کون اس حویلی اور جائیداد کا وارث ہوگا...... کون یہ سب سنبھالے گا...... کیا کروں...... کس کو سب کچھ سونپ دوں...... تو نے مجھے کس آزمائش میں ڈال دیا ہے...... کوئی راستہ نظر نہیں آتا......؟

زیتون بانو چارپائی سے اٹھ کر سسکنے لگی۔

یا اللہ! تجھ سے کیسے...... تیرا رحم طلب کروں...... اور کیا مانگوں......؟ ہر طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے تو نے مجھ بڑھیا کا آخری سہارا چھین کر میرے ساتھ کتنا بڑا ظلم کیا ہے......

تو کیسا مالک ہے......؟ کیسا رب ہے......؟ جو اپنے بندوں کو یوں بے آسرا کر کے خاموشی سے ان کا تماشا دیکھتا رہتا ہے...... اب کوئی راہ بھی دکھا...... کچھ نظر نہیں آتا...... کچھ سجھائی نہیں دیتا...... کوئی تو میرے بیٹے کی یاد کو زندہ رکھنے والا ہوتا کوئی تو اس کا نشان باقی رکھتا...... کوئی تو اس کی قبر پر پھول ڈالنے اور دعا کرنے والا ہوتا......؟ کوئی تو ہوتا......؟

زیتون بانو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی...... اس کی آہیں...... سسکیاں...... او ر دل سے بلند ہوتی صدائیں...... خاموشی کے پردوں کو چاک کرتی ہوئی بڑی سرکار کے شاہی دربار میں پہنچنے لگیں...... جہاں تمام نوری مخلوق حیرت اور دکھ سے زیتون بانو کی آہ و بکا سن رہی تھی...... انہوں نے سفید روشنی کی طرف دیکھنے کی کوشش کی مگر وہ اس کی تاب نہ لا سکے...... وہ بڑی سرکار سے کچھ پوچھنا چاہتے تھے مگر ابھی انہیں کچھ پوچھنے کا اذن نہیں ملا تھا اس کے لئے وہ خاموش رہے...... مگر انسانوں کی اکثریت کے دکھ اور ان کے شکوے شکایات سن کر وہ بہت مضطرب ہو گئے...... اور بڑی سرکار کا اپنے انسان کو شاہکار کہنے کا دعویٰ مشکوک لگنے لگا۔

☆

شام ہوتے ہی نازی اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھی۔ اسے شدید ڈپریشن ہو رہا تھا..... بہت سالوں کے بعد کسی نے اس کے زخموں کو کریدا تھا..... کئی سالوں سے اس نے اپنے زخموں کو رسنے سے روک رکھا تھا۔ آج وہ پھر ہرے ہو گئے تھے اور ان سے خون بہنے لگا تھا۔ ان رستے زخموں پر اب کوئی مرہم لگانا مشکل ہو رہا تھا..... بہت عرصے بعد اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگیں تھیں..... ورنہ جب سے وہ حشمت خان کی حویلی واپس آئی تھی اور حشمت خان کی موت کے بعد اس نے زمینداری سنبھالی تھی..... وہ ایک ظالم و جابر زمیندارنی کے روپ میں دنیا کے سامنے آئی تھی۔ لوگ اس کو دیکھ کر حیران ہوتے تھے۔ وہ کیا سے کیا ہو گئی تھی..... وہ خوبصورت، نرم و نازک دوشیزہ سے ایک خوفناک اور سفاک عورت میں بدل چکی تھی۔ اس کی پورے گاؤں میں اس قدر دہشت پھیل چکی تھی کہ اس کی اجازت کے بغیر چڑی کو بھی پر مارنے کی اجازت نہ ہوتی تھی۔ ..... وہ حشمت خان سے بھی زیادہ ظالم ثابت ہوئی تھی شاید کردار کی یہ خامی اسے حشمت خان سے ورثے میں ملی تھی۔ ..... شاید سفاکی اس کے جینز میں شامل تھی جسے اظہار کا موقع اب ملا تو وہ باپ سے بھی دو ہاتھ آگے نکل گئی۔ حشمت خان تو اپنے نافرمانوں کو ایسا غائب کراتا تھا کہ ان کی خبر نہ ملتی تھی اور نازی اپنے سامنے نافرمانوں کو انتہائی دردناک اذیتیں دے کر انہیں قتل کرا دیتی اور خوش ہوتی ..... ان کی لاشوں کو ایسے ٹھکانے لگاتی کہ ان کا نام و نشان تک نہ ملتا۔ اس نے ظلم و بربریت کی ایسی فضا قائم کر رکھی تھی۔ جس میں گاؤں کے ہر فرد کے لئے سانس لینا مشکل ہو رہی تھی۔ ..... لوگ اس کے خلاف بولتے نہ تھکتے تھے مگر اسے کسی کی پرواہ نہیں تھی۔ اسے سرعام بددعائیں دیتے مگر اس کے کانوں پر جوں تک نہ رینگتی ..... اس کے سامنے کسی کو جرأت نہ تھی کہ اونچی آواز میں بات کر سکے۔ اس کے ساتھ ہر وقت ڈاکو نما کارندوں کا مسلح دستہ اس کے اشارے پر غارت گری کے لئے تیار رہتا..... وہ خود کتنے بے بس و بے گناہ لوگوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کر چکی تھی ..... اس کی پستول کا نشانہ کبھی خطا نہ جاتا ..... زمینوں کی دیکھ بھال ..... مزارعوں پر ظلم و ستم کے علاوہ ..... گاؤں کی کسی لڑکی یا لڑکے کو محبت کی پینگیں بڑھانے کا حق نہیں دیا گیا تھا ..... اس کے ڈر سے کئی نوجوان محبت کی راہوں پر قدم رکھنے سے پہلے ہی واپس لوٹ آتے۔ دل کی خواہشات اور ارمان دل میں ہی دبے رہ جاتے کئی آنکھوں نے سہانے خواب دیکھنے سے پہلے ہی محبت کے جگنوؤں کو اپنی آنکھوں سے نوچ ڈالا تھا..... کئی دلوں کی ان کہی اور ان سنی باتیں ..... سلگتے ارمانوں میں بدل چکی تھیں ..... وہ محبت کی ایسی بدتر دشمن ثابت ہوئی تھی کہ کسی کی محبت کے بارے میں خبر ملتے ہی اسے کٹہرے میں کھڑا کر دیتی اور اسے ایسی سزا دیتی کہ وہ دوبارہ محبت کا نام لینا ہی بھول جاتا..... محبت اک سزا بن گئی تھی.....؟ اور وہ اس سزا کی اذیت سے لطف اندوز ہوتی۔

اس کی ماں مر چکی تھی..... پورا گاؤں..... حویلی اور مال و دولت پر اس کا قبضہ تھا۔ دونوں بہنیں بیرون ملک مقیم تھیں اسے روکنے ٹوکنے والا کوئی نہ تھا..... وہ جو چاہتی..... کرتی..... جو کچھ سوچتی..... اس پر عمل کر دکھاتی۔ اس نے اپنی ذات سے نسوانی خواہشات اور نسوانیت بالکل ختم کر دی تھی۔ وہ مردوں کی طرح لباس پہنتی..... مردوں جیسی باتیں کرتی اور ظلم و ستم میں جابر مردوں سے بھی بڑھ گئی تھی..... اتنے سالوں میں کوئی بھی لمحہ ایسا نہیں آیا تھا جب اسے کوئی پچھتاوا..... یا..... افسوس ہوتا۔ اس کے اندر اتنا تعصب اور بربریت گھر کر چکی تھی کہ اسے اپنے سامنے کھڑا انسان کسی جانور سے زیادہ معلوم نہ ہوتا تھا اور اس کے ساتھ وہ جیسے چاہتی سلوک کرتی..... کوئی احتجاج کرنے والا نہیں تھا..... کوئی اس کے سامنے زبان کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا..... رفتہ رفتہ اس میں اتنا تکبر، انانیت، خود پسندی اور خود غرضی بڑھ گئی تھی کہ وہ اپنے آپ کو سب کچھ اور عقل کل سمجھنے لگی تھی۔

اس کے گاؤں کی ایک لڑکی رقعیہ شہر تعلیم حاصل کرنے گئی تھی اور اس نے کالج کے ایک لڑکے کو پسند کرلیا تھا اور اس سے شادی پر بضد تھی۔ اس کے ماں باپ وہاں اس کی شادی نہیں کرنا چاہتے تھے جب بات نازی تک پہنچی تو اس نے رقعیہ کو اپنے ہاں طلب کیا..... اور اس کو ایسی مار ماری کہ وہ لہولہان ہوگئی۔ اس کے چہرے کو اس نے گرم سلاخ سے داغ دار کردیا تھا۔ وہ روتی اور چلاتی رہی مگر نازی کو اس پر ذرا سا بھی ترس نہ آیا۔

''کیا اب بھی تم اس سے شادی کرنا چاہوگی؟'' نازی نے پوچھا۔

''ہاں'' وہ چلا کر بولی۔

نازی نے زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر لگایا۔

''میں تمہاری بوٹیاں کتوں کے آگے ڈال دوں گی'' نازی نے غصے سے کہا۔

''جو..... چاہے..... کرلو..... میں تم سے نہیں ڈرتی..... میں اس سے محبت کرتی ہوں..... تمہیں کیا معلوم..... محبت اور اس کی طاقت کیا ہوتی ہے..... تم جیسی ظالم عورت کو کبھی خدا محبت سے نہیں نوازتا..... تمہاری آنکھوں اور دل پر جہالت کے پردے ہیں..... جاہلوں کو خدا محبت کا تحفہ کبھی نہیں دیتا'' رقعیہ نے غصے سے چلاتے ہوئے کہا۔

رقعیہ کی باتیں سن کر نازی کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

''تمہاری..... یہ جرأت.....'' نازی نے ہاتھ لہرا کر اسے زوردار تھپڑ لگانا چاہا مگر رقعیہ نے اس کا ہاتھ روک دیا اور ویسا ہی زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر انتہائی زور سے مارا۔ نازی کا سر بری طرح چکرا گیا اسے قطعی توقع نہ تھی کہ اس کے ایک غریب مزارعے کی بیٹی اتنی نڈر اور بے باک ہو سکتی ہے۔ نازی نے غصے سے پھنکارتے ہوئے اس کی جانب دیکھا اور پاس پڑے ایک موٹے ڈنڈے کے ساتھ اسے پیٹنا شروع کردیا۔ رقعیہ لہولہان ہورہی تھی مگر اس کی زبان سے نازی کے لیے مسلسل بددعائیں نکل رہی تھیں۔

''اللہ تم پر بھی ایسا ہی ظلم کرے..... تجھے کبھی سکون نہ ملے..... تو..... موت مانگے اور تجھے موت نہ ملے..... اللہ کرے..... اللہ.....'' رقعیہ بڑبڑاتی ہوئی بے ہوش ہوگئی۔

نازی کے ہاتھ سے ڈنڈا گر گیا۔ اس نے رقعیہ کی جانب غصے سے دیکھا اور پاؤں سے اسے ٹھوکر لگائی۔ اس کے اندر کی آگ ابھی بھی سرد نہیں ہوئی تھی۔ اسے سکون نہیں ملا تھا۔ ابھی تو وہ اس پر بہت ظلم و ستم ڈھانا چاہتی تھی۔ اسے ایسی مار مارنا چاہتی تھی کہ وہ اس کے آگے گڑگڑا کر اپنی جان بخشی کے لیے التجائیں کرتی روتی چیختی..... مگر اس کو..... اس پر رحم نہ آیا..... مگر رقعیہ تو چند ڈنڈوں کے بعد ہی ڈھیر ہوگئی تھی۔

''اتنی باتیں کررہی تھی..... سارا دم خم نکل گیا..... اس کو ہوش بھی آجائے تو اس کو یونہی پڑے رہنے دینا۔ کھانے پینے کو کچھ نہیں دینا'' نازی نے غصے سے اپنے کارندوں سے کہا اور تہہ خانے سے باہر نکل آئی۔

اپنے کمرے میں آئی..... تو اس کا سر درد سے پھٹنے لگا..... غصے سے اس کا خون کھول رہا تھا..... ایک غریب کمتر لڑکی میں اتنی جرأت اور بے باکی کہاں سے آگئی تھی کہ وہ اس کے سامنے ڈٹ کر کھڑی ہوگئی تھی۔ اس نے سوچا۔

''محبت ایسے ہی نڈر اور بے باک بنا دیتی ہے.....وہ بھی تو شاہ زیب کے سامنے ڈٹ گئی تھی......وہ بھی تو اس وقت سب کچھ کرنے کو تیار تھی......موت کو گلے لگانے میں بھی خوف محسوس نہیں کرتی تھی۔ محبت کی خاطر......اور محبت اسے پھر بھی نہیں ملی تھی......اگر مجھے محبت نہیں ملی تو میں کسی اور کو بھی اس سے سیراب ہوتے نہیں دیکھ سکتی......کبھی بھی نہیں......میں اسے زندہ در گور کر دوں گی......مگر اسے محبت کی شادی کرنے کی اجازت نہیں دوں گی'' نازی نے غصے سے سوچا اور بیڈ پر لیٹ گئی۔

رقعیہ نے اس کے چہرے پر تھپڑ مارا تھا......وہ بیڈ پر لیٹی ہوئی اٹھ گئی اور اپنا گال سہلانے لگی۔ اسے وہ ابھی تک سرخ اور جلتا ہوا محسوس ہوا۔ میں اس کی سانسوں سے اس جلن کو ٹھنڈا کروں گی۔ اس کے بدن سے ایک ایک سانس کھینچ لوں گی۔ تب ہی مجھے سکون ملے گا۔

''اللہ کرے، تجھے کبھی سکون نہ ملے'' رقعیہ کے الفاظ اس کے ذہن میں گونجے۔

''سکون تو مجھے آج تک نہیں ملا......زندگی میں ایک پل کے لئے بھی نہیں، اس کی آنکھیں بھرنے لگیں۔ میں نے تو زندگی میں جس شے کی بھی تمنا کی......وہی نہیں ملی......نہ محبت......نہ سکھ......نہ ہی چین......اس کی بددعا سے میں کیوں ڈروں......میں تو پہلے ہی اس آگ میں جل رہی ہوں......جو اس کو نظر نہیں آئی۔

''اللہ کرے تو موت مانگے......اور تجھے موت نہ ملے۔ اللہ تجھ پر بھی ایسا ہی ظلم کرے'' رقعیہ کے الفاظ پھر اس کے ذہن میں گونجے اور اس نے بلند آواز میں قہقہے لگانے شروع کر دیئے۔

''تو......مجھ پر اور کیا ظلم کرے گا......اس سے بڑھ کر ظلم اور کیا ہو سکتا ہے......کہ تو انسان سے وہی چیز چھین لے......جو اسے اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز ہو......وہ خواہش ہی چھین لے......جس کو پورا کرنے کے لئے وہ اپنی جان کی بھی پروا نہ کرے......مجھ سے پوچھ......تو کتنا ظالم ہے......؟''

''تو......سب سے زیادہ ظالم ہے'' نازی بلند آواز میں چلائی اور مسلسل چلاتی رہی۔

''اللہ......تو......سب سے زیادہ ظالم ہے......تو......انسانوں پر مہربان نہیں......یہ سب جھوٹ ہے۔'' نازی چلاتی رہی......اور پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔ ''میں کسی کو نہیں چھوڑوں گی......میں سب کو تباہ و برباد کر کے رکھ دوں گی......تو نے مجھ سے جتنے بدلے لینے ہیں لے لے......جتنا ظلم ڈھانا ہے......ڈھالے......مجھے اب کسی کی پروا نہیں......تیری بھی نہیں......جو تو چاہتا ہے......کر لے......'' نازی چلاتی رہی......اور کمرے میں چکر لگاتی رہی۔

تمام نوری مخلوق حیرت سے ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگی......نازی کی بے باکی اور انتہائی گستاخانہ انداز گفتگو سے وہ حیران ہو رہے تھے......انسان اپنے خالق کے بارے میں اس قدر بدگمان بھی ہو سکتا ہے......انہیں یقین نہیں آ رہا تھا......اور ان کی تمام تر گستاخیوں کے باوجود بڑی سرکار انہیں اپنا شاہکار قرار دیئے پڑی تھی۔

''انسان اپنے رب کا اتنا ناشکرا بھی ہو سکتا ہے......؟ اتنا نافرمان......اور اتنا بے باک و گستاخ بھی'' نوری مخلوق سوچ میں پڑ گئی۔

بڑی سرکار بھی خاموشی سے نازی کی آہ و بکا اور شکوے و شکایات سنتی رہی......سفید روشنی بدستور روشن رہی......اس کی لو اور تابانی میں ذرا بھر

فرق نہ آیا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا...... جیسے بڑی سرکار بہت مطمئن اور پر اعتماد ہو...... نازی کے شکوے سننے کے باوجود بڑی سرکار بالکل جلال میں نہ آئی۔

نوری مخلوق منتظر تھی کہ بڑی سرکار کے شاہی دربار سے کوئی حکم صادر ہوگا...... ناراضگی کا اظہار ہوگا...... یا پھر...... کوئی اور بات ہوگی...... مگر ہر طرف خاموشی طاری رہی......

بڑی سرکار کی خاموشی اور اطمینان سے وہ حیران ہونے لگے...... اور انسان کے بارے میں مزید مشکوک ہونے لگے۔

☆

تیمور اپنی حویلی کے ایک تاریک کمرے میں کھڑا چھت کو گھور رہا تھا۔ اس نے چھت کے پنکھے کے ساتھ ایک رسی کا پھندا بنایا تھا اور اس پھندے کو اپنی گردن کے گرد باندھ کر دیکھ رہا تھا...... یہ کتنے مشکل اور اذیت ناک لمحات تھے جن سے وہ گزر رہا تھا...... وہ اپنی زندگی کو ختم کرنے جا رہا تھا...... اور اس نے یہ فیصلہ انتہائی مشکل حالات سے گزر کر کیا تھا...... وہ بہت سالوں سے اپنے آپ سے لڑتا آ رہا تھا مگر اب حالات اس کے لئے ناقابل برداشت ہو گئے تھے وہ اپنے آپ کو بہت کمزور...... مجبور اور بے بس محسوس کرنے لگا تھا۔ اسے کوئی راہ فرار نظر نہیں آ رہی تھی...... ہر راستہ بند ہو رہا تھا...... کہیں کوئی روشنی دکھائی نہیں دے رہی تھی...... یا پھر اس کے اندر اتنی تاریکی چھا گئی تھی کہ اسے روشنی کی کوئی کرن نظر نہیں آ رہی تھی یا پھر اس کے دل نے امید اور آس کے سارے دروازے بند کر دیئے تھے۔ وہ اس قدر مضطرب اور بے چین ہو گیا تھا کہ کوئی سوچ...... کوئی خیال بھی اسے پر امید نہیں بنا رہا تھا۔

اس نے پھندا گلے سے اتار کر اسے پنکھے کے ساتھ مضبوطی سے باندھا...... اور جیب میں سے سگریٹ نکال کر اس کے گہرے کش لگانے لگا۔ وہ کھڑکی میں کھڑا ہو گیا اور باہر دیکھنے لگا۔ ہر طرف گہری تاریکی چھائی تھی...... اور ہو کا عالم تھا۔

وہ کیوں اپنی جان لینے کی کوشش کر رہا ہے؟ اس کے ذہن میں سوال ابھرا۔

میں بہت بے بس ہو گیا ہوں...... اپنے آپ سے لڑ لڑ کر تھک گیا ہوں...... میرے اعصاب تھک گئے ہیں اور اب مجھ میں زندگی کا بوجھ سہنے کی مزید سکت نہیں...... زندگی نے مجھے دیا ہی کیا ہے......؟

بہت کم دے...... کر...... میرا سب کچھ چھین لیا ہے...... اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگیں اور ایک دم آنسو اس کی آنکھوں سے زار وقطار بہنے لگے...... اس کی آہیں اور سسکیاں بلند ہونے لگیں۔

اسے نازی سے جدا ہوئے دس سال گزر گئے تھے اور وہ اسے ایک دن کے لئے بھی بھلا نہیں پایا تھا۔ اس نے نازی سے ٹوٹ کر محبت کی تھی۔ ایسی محبت وہ زندگی بھر کسی اور سے نہیں کر پایا تھا...... اس کو طلاق دینے کے بعد وہ اس قدر ٹوٹ پھوٹ گیا تھا کہ پھر کبھی نارمل نہیں ہو پایا تھا۔ نازی سے جدائی کا دکھ اس کے دل کو ہر وقت مضطرب اور بے قرار رکھتا...... اسے کوئی شے آرے کی طرح کاٹتی ہوئی محسوس ہوتی...... اس روح فرسا اذیت اور دکھ سے فرار کے لئے اس نے نشہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ جب چرس کے بھرے سگریٹ بھی اسے مطمئن نہ کر پاتے تو اس نے ہیروئن پینا شروع کر دی۔ جب وہ نازی کو طلاق دے کر گھر آیا تو ثروت اور سرمد وقار نے اس کی خوب بے عزتی کی۔ اس کے چچا دبیر الحسن نے اس کو دو تین تھپڑ

بھی لگائے اور بہت دھمکیاں بھی دیں.......وہ خاموشی سے یوں سب کچھ سنتا رہا جیسے کچھ بھی نہ سن رہا ہو.......اسی وقت شہزادی کو گاؤں سے بلا کر دونوں کا نکاح کر دیا گیا.......وہ ایک بے جان لاش کی مانند بیٹھا رہا.......اس کے چچا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر نکاح نامے پر دستخط کیے.......اسے کوئی ہوش نہ تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے.......اسے جو کچھ کہا جا رہا تھا وہ کر رہا تھا.......یوں جیسے وہ اپنے حواسوں میں نہ ہو۔اس نے شہزادی کی طرف کبھی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا وہ روتی اور اس سے شکوے کرتی مگر وہ کوئی جواب نہ دیتا.......وہ اسے دیکھ کر منہ پھیر دیتا.......وہ اس سے باتیں کرتی اور وہ کوئی جواب نہ دیتا.......وہ اس کے کمرے میں ہی نہ آتا.......جب کبھی اس کا موڈ بہتر ہوتا اور وہ محبت کی باتیں شروع کرتی.......تو وہ حیرت سے اس کی جانب دیکھتا رہتا.......اسے غصہ آتا تو وہ نازی کا ذکر چھیڑ دیتی.......اسے برا بھلا کہتی.......اسے جی بھر کر کوستی تب تیمور غصے سے اسے گھورتا ہوا کمرے سے باہر نکل جاتا.......زندگی کے کئی سال یونہی گزر گئے تھے۔شہزادی نہ بیوہ تھی.......نہ سہاگن.......تیمور کو اس کے وجود سے ہی نفرت تھی وہ اس کی طرف دیکھنا ہی نہیں چاہتا تھا.......

ثروت بیاہ کر کے امریکہ چلی گئی تھی اور وہ اپنا بزنس شہزادی کے حوالے کر گئی تھی جسے وہ بہت کامیابی سے چلانے لگی تھی.......تیمور سارا وقت گھر میں بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہتا.......یا پھر نشہ کر کے سویا رہتا.......شہزادی جیسے جیسے ہی بزنس میں ترقی کرنے لگی وہ تیمور سے متنفر ہونے لگی.......تیمور سے نفرت کی بڑی وجہ نازی تھی.......وہ ان دیکھے نازی سے جتنی نفرت کرتی تھی اس سے کہیں زیادہ نفرت تیمور سے کرنے لگی تھی.......رفتہ رفتہ شہزادی کی دلچسپی اپنے ایک اسسٹنٹ احسن علی میں بڑھنے لگی۔مسز وقار کی وفات کے بعد وہ پورے گھر اور جائیداد کی مختار کل تھی۔اس نے کمال ہوشیاری سے جائیداد اور طلاق کے کاغذات پر تیمور کے دستخط کرا لیے اور احسن علی سے شادی کر کے اسے اپنے ساتھ حویلی میں لے آئی۔تیمور ہر وقت نشہ کر کے کمرے میں بند رہتا۔

اچانک ثروت امریکہ سے آئی تو تیمور کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گئی۔اس نے شہزادی پر سخت تنقید کی مگر شہزادی نے اس کی کوئی بھی بات سننے سے انکار کر دیا۔ثروت کو شہزادی کی دوسری شادی اور فریب سے تیمور کی حاصل کردہ جائیداد کے بارے میں سن کر سخت صدمہ ہوا۔شہزادی نے جھگڑا کر کے اسے بھی اپنی حویلی سے باہر نکال دیا۔تیمور کا وجود اس کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا اس لئے اس نے اسے وہیں رہنے دیا.......یا.......پھر دبیر الحسن کے ڈر سے اس نے اسے دھکے دے کر باہر نہ نکالا ورنہ وہ تیمور سے سخت نفرت کرتی تھی۔

تیمور بیمار رہنے لگا تھا.......اور کوئی پرسان حال نہ تھا۔وہ زندگی سے تنگ آ گیا تھا اور اپنے ہاتھوں سے اس کا خاتمہ کرنا چاہتا تھا.......

"کسی کو میری ضرورت نہیں.......ایسی بے وقعت زندگی کی بھلا کس کو ضرورت ہو سکتی ہے.......نہ میں اہم ہوں.......اور نہ ہی میری زندگی.......مجھے نفرت ہے اس زندگی سے.......نجانے خدا نے زندگی کا یہ طوق ہم انسانوں کے گلے میں کیوں ڈال رکھا ہے" اس نے رسی کا پھندا اپنے گلے میں ڈالا.......اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔شاید.......اس لئے.......کہ ہم سسک سسک کر مریں جائیں۔اس نے پھندا گلے میں ڈال کر اس کا حلقہ تنگ کیا۔

''زندگی ایک نعمت ہے'' کبھی پڑھا ہوا جملہ اس کے کانوں میں گونجا۔اس نے آہ بھری۔

"نہیں.......زندگی ایک لعنت ہے.......اک عذاب ہے، بہت بڑی آزمائش ہے.......مجھے اس زندگی سے نفرت ہے.......شدید نفرت.......

تیمور نے آہ بھر کر سوچا اور پھندے کے حلقے کو بہت تنگ کر دیا۔اس کے حلق سے چیخ نکلی.......اور اگلے چند لمحوں میں اس کا مردہ وجود چھت کے پنکھے کے ساتھ بے حس و حرکت لٹک رہا تھا.......کمرے سے بلند ہونے والی.......تیمور کی آخری دردناک صدائیں سن کر نوری خلوق افسردہ ہونے لگی۔وہ

مزید بے چین اور پریشان ہو گئے۔ بڑی سرکار کا شاہکار انسان کس قدر بے بسی اور مجبوری سے قابلِ رحم حالت میں چھت کے ساتھ لٹک رہا تھا...... اللہ کی بخشی ہوئی نعمت زندگی کا اس نے اپنے ہاتھوں سے خاتمہ کر دیا تھا۔

''زندگی...... انسان کے لئے اس قدر تکلیف دہ ہے...... کہ انسان اس کا طوق اپنے گلے سے اتارنے کے لئے ہر دم تیار رہتا ہے......''

ہر وقت کیا زندگی نعمت ہے......؟ اگر یہ نعمت ہے...... تو پھر کیسی نعمت ہے...... جس سے انسان چھٹکارا پانا چاہتا ہے...... انسان کیسی مخلوق ہے......؟ جو نعمت کو نعمت نہیں سمجھتا......

''اُف انسان کو سمجھنا بہت مشکل ہے......''

وہ پریشان ہو کر ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے...... انہیں زیادہ تر انسان مایوس کر رہے تھے۔ بڑی سرکار ابھی بھی خاموش تھی۔ سفید روشنی سے کوئی آواز بلند نہ ہوئی تھی۔ انسان کی انتہائی قابلِ رحم حالت دیکھ کر وہ دکھی بھی ہو رہے تھے اور پریشان بھی...... مضطرب بھی اور حیران بھی...... مگر وہ بھی خاموش رہے۔ کسی نے کوئی سوال نہ کیا...... اور نہ ہی بڑی سرکار کے دربار سے انہیں کچھ کہنے کا اذن ملا...... وہ حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

☆

ماسٹر باسط علی نے شاہ زیب کے مزار پر سرخ گلاب کی پتیوں اور پھولوں کو اپنے ہاتھوں سے ڈالا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر دعائے مغفرت کی۔ ان کے چہرے پر انتہائی اطمینان اور سکون تھا۔ داڑھی قدرے سفید ہو چکی تھی اور سر کے بال بھی بہت زیادہ سفید ہو گئے تھے۔ انہوں نے سر پر سفید رومال باندھ رکھا تھا۔ وہ دس سالوں سے شاہ زیب کے مزار پر اپنے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ وہ مزار سے ملحقہ ایک حجرے میں رات بھر عبادت کرتے...... صبح شاہ زیب کے مزار پھول ڈال کر دعا کرتے اور پھر مزار کے صحن میں آ کر لوگوں کی مذہبی، اخلاقی و روحانی تربیت کرتے۔ صاحب مزار کی فیض نظر سائیں کی دعا یا پھر اللہ کی نظرِ کرم سے...... انہیں ایسا مقام اور رتبہ ملا تھا جو لاکھوں، کروڑوں انسانوں میں سے کسی ایک کو نصیب ہوتا ہے۔ ان کو قدرت نے حق شناسی اور معرفت کے اسرار تک رسائی کے ایسے وصف سے نوازا تھا...... جس نے انہیں بے شمار انسانوں میں ممتاز کر دیا تھا...... وہ لوگوں کے لئے دعائیں کرتے تھے اور ان کی دعائیں قبول ہوتی تھیں...... وہ مذہب اور شریعت کے مسائل سے لوگوں کو آگاہ کرتے تھے...... انہیں ایسے روحانی پیشوا کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی جو ڈھیرے ڈھیرے لوگوں کی روحوں پر اثر انداز ہو کر انہیں حق اور سچائی کی راہوں پر گامزن کرتا ہے۔ وہ عام اور سادہ حلیے میں عوام الناس کے درمیان رہ کر ان کے مسائل حل کرنے کی کوشش کرتے تھے...... ان کے ماں باپ مر چکے تھے اور بہنیں اپنے گھروں کی ہو چکی تھیں زندگی کی ساری مادی خواہشات انہوں نے اپنے دل سے نکال دی تھیں...... کسی شے کی نہ طلب رہی تھی نہ حاجت...... نہ کوئی خواہش نہ کوئی آرزو...... نہ کوئی غرض نہ کوئی تمنا...... صرف انسان اور انسانیت...... بندہ اور خدا...... اللہ اور انسان......'' ان کے لئے سب سے مقدم تھے۔

زندگی گزر رہی تھی اور ہر گزرتے دن کے ساتھ قدرت انہیں نواز رہی تھی ان کی عزت...... مقام اور مرتبے میں اضافہ ہو رہا تھا...... ان کی

روح کو قدرت ایسے کشف اور معجزوں سے نواز رہی تھی...... جن کا شعور نہ تو عام انسان کو ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس تک اس کے ذہن کی رسائی ہو سکتی ہے...... وہ بہت خاموشی سے روحانیت کے ان درجات تک رسائی پا رہے تھے...... جن تک رسائی قدرت کی خاص نظر کرم سے ہی ممکن ہوتی ہے۔

شاہ زیب کے مزار پر لوگوں کا تانتا بندھا رہتا...... لوگ مزار پر پھول ڈالتے اور دعائیں کرتے...... فضا میں ایسی خوشبو رچی بسی رہتی جو ہر وقت ذہن کو معطر رکھتی۔ مزار پر ہر وقت رونق اور چہل پہل رہتی۔

رات کی تنہائی میں ماسٹر باسط علی مزار سے ملحقہ اپنے حجرے میں بیٹھ کر عبادات میں مصروف رہتے...... ماضی کے بارے میں سوچتے شاہ زیب سے اس روحانی تعلق کے بارے میں غور و فکر کرتے جس کو نبھانے کی خاطر سب کچھ چھوڑ کر ان کے مزار پر آ بسے تھے...... ماضی کے دھندلکوں میں کھویا نازی کا چہرہ اور محبت کی یادیں، سب بے معنی اور فضول باتیں محسوس ہوتیں...... نازی ایک ایسی یاد بن کر ان کے اندر زندہ تھی جس کے وجود نے ان کے اندر ایسا اضطراب اور بے چینی پیدا کر دی تھی مگر جس کو قرار شاہ زیب کی قبر پر آ کر ملا تھا......

اگر نازی ان کی زندگی میں نہ آتی اور نازی کی شادی شاہ زیب سے نہ ہوتی ...... وہ شاہ زیب سے نہ ملتے اور شاہ زیب کی حق تلفی کرنے سے ان کے اندر احساس گناہ نہ پیدا ہوتا اور وہ احساس گناہ انہیں پہاڑوں کی وادیوں میں نہ لے جاتا اور سائیں کی فیض نظر سے ان کی روح میں وہ تڑپ اور بے قراری نہ پیدا ہوئی ہوتی...... اور سائیں کے کہنے پر وہ شاہ زیب سے ملنے نہ آتے...... تو سب کچھ کیسے ممکن ہوتا......؟ وہ آج یہاں نہ ہوتے...... قدرت انہیں ان درجات سے نہ نوازتی...... وہ اتنے انسانوں کی رہنمائی نہ کر رہے ہوتے...... وہ ایک ایک بات کو سوچتے اور قدرت کی مصلحتوں کے قائل ہوتے جاتے اپنی کمزوریوں، خامیوں، خطاؤں، بے قراریوں اور بے تابیوں پر شرمندہ ہوتے۔ اپنا ہر عمل اور ہر سوچ انتہائی حقیر اور بے وقعت سی محسوس ہوتی...... قدرت کی مصلحتوں کے اسرار وں تک رسائی پانا کتنا کٹھن اور مشکل دکھائی دیتا مگر ان تک رسائی پا کر طمانیت کا احساس ان کے قلب و روح کو ایسا سرشار کر دیتا کہ ان کی جبیں سجدہ ریزی کے لیے مچلنے لگتی...... اور آنکھوں سے ندامت کے آنسو بہہ نکلتے...... یہ آنسو کتنے قیمتی ہوتے جو اپنے خالق سے محبت کے اظہار کے لیے آنکھوں سے یوں پھسلتے جیسے ٹوٹی مالا کے قیمتی موتی یکے بعد دیگرے گرنے لگتے ہیں اور جنہیں اکٹھا کر کے شمار کرنا مشکل ہو جاتا...... ایسی آنکھوں کے قیمتی آنسو گرتے ہی ان کے دل سے آہوں اور سسکیوں کے ساتھ صدائیں بلند ہوتیں۔

''ہم خطا وار انسان ہیں...... بہت گنہگار...... بہت نافرمان...... تیرے مجرم...... تیری رحمت کے طلب گار ہیں تو ہم انسانوں پر اتنا رحم اور کرم فرماتا ہے...... بے شک تو کرم فرمانے والا عرش عظیم کا حقیقی مالک ہے...... ساری عبادتیں...... ساری اطاعتیں...... اور ساری نیاز مندیاں تیرے واسطے ہیں...... ہم پر رحم فرما...... اپنا کرم فرما'' ماسٹر باسط علی کے دل کی صدائیں سن کر تمام نوری مخلوق نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا...... وہ حیران اور پریشان ہونے لگے۔ خدا سے شکوے و شکایات کرنے والے بے باک اور گستاخ انسانوں کے درمیان یہ کون صاحب نظر اور ہدایت یافتہ انسان گڑگڑا کر اتنی عجز و انکساری کے ساتھ بڑی سرکار کے دربار میں اپنی قدر و قیمت بڑھا رہا ہے...... وہ جو انسانوں کے بارے میں شاکی ہو رہے تھے اور اس حتمی فیصلے تک پہنچنے والے تھے کہ انسان شاہکار کبھی نہیں ہو سکتا...... ایک دم ہڑ بڑا گئے تھے...... ان کو کسی بات نے اندر ہی اندر مضطرب کر دیا تھا...... یوں جیسے ان کو خطرے کی گھنٹی بجتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی۔

انسان کتنا عجیب و غریب ہے......

کیسی حیران کن مخلوق ہے......

جس کے بارے میں کچھ بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا...... جو ہاری بازی کو جیت بھی سکتا ہے اور ہار بھی...... انسان...... انہیں الجھا رہا تھا...... انہیں پریشان کر رہا تھا۔

سفید لو میں طمانیت اور سکون کا احساس انہیں مزید حیران کرنے لگا تھا۔ انہیں یوں محسوس ہوا جیسے انسان قربت کے اس درجے پر پہنچنے والا تھا جس کا دعویٰ بڑی سرکار نے کیا تھا اور وہ جس کو ماننے کو تیار نہیں تھے مگر بڑی سرکار کے حکم اور حکمتوں کے سامنے وہ کچھ کہنے کی جرأت نہ کر سکتے تھے...... اور اب وہ اندر ہی اندر بہت کچھ مان رہے تھے...... قائل ہو رہے تھے......

مگر انسان قربت کا وہ درجہ اور مقام کیسے حاصل کرے گا......؟

وہ متجسس ہو کر سوچنے لگے......

شاہی دربار میں ماسٹر باسط علی کی نیاز مندانہ...... عجز و انکسار سے بلند ہوتی صدائیں...... محبت بھری سسکیاں اور آہیں انسان کے خالی وجود کو عظمتوں سے سرفراز کر رہی تھیں...... ان کی سجدہ ریزی انسان کے مقام و رتبے کو رفعتوں سے نواز رہی تھی...... انسان سربلند ہو رہا تھا اور وہ حیرانگی سے اسے دیکھ رہے تھے اور اندر ہی اندر پریشان ہو رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا...... جیسے ابھی انسان کو 'شاہکار' کیا جائے گا...... مگر بڑی سرکار خاموش رہی...... اور ہر طرف گہری خاموشی چھانے لگی۔

......❁......

حصہ چہارم
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

# (۱)

انسانوں کے شکوے اور ان کی آہ و بکا...... سن کر تمام مخلوق دم سادھے کھڑی تھی...... وہ حیرت سے سفید روشنی کی جانب دیکھنے لگے، وہ منتظر تھے کہ بڑی سرکار انسانوں کے شکوے شکایات اور ان کی گستاخیاں سن کر اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے...... انھیں اپنا 'شاہکار' کہنے سے انکار کر دے گی...... مگر وہ دم بخود رہ گئے...... جب سفید روشنی سے بارعب آواز بلند ہوئی۔

''کیا تم...... اب بھی انسان کو میرا 'شاہکار' نہیں مانتے؟ وہ بری طرح بوکھلائے اور حیرت سے ان کی زبانیں گنگ ہو گئیں۔

''شا...... ہکار...... آپ کی...... اتنی ناشکری کے باوجود بھی۔'' نوری مخلوق میں سے کسی نے بہت ہمت کر کے پوچھا۔

''ہاں...... اب...... بھی......'' سفید روشنی نے مسکرا کر جواب دیا۔

''مگر...... اتنا کم حوصلہ...... ناشکرا...... اور آپ سے جھگڑنے والا...... انسان......'' کسی نے پوچھا۔

سفید روشنی خاموش رہی۔

''کیا ایسا انسان آپ سے محبت کر سکتا ہے؟'' کسی دوسرے نے پوچھا۔

''میں...... انسان سے محبت کرتا ہوں۔'' سفید روشنی نے جواب دیا۔

''آ...... پ......؟ وہ سب حیرت سے چلائے۔

''انسان کی اتنی سرکشی اور بغاوت کے باوجود بھی......؟''

''ہاں......'' پرسکون اور انداز میں جواب دیا گیا۔

''اس محبت کی وجہ......؟'' انہوں نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''میرے لئے...... انسان کی جستجو۔'' بڑی سرکار نے جواب دیا۔

''کیسی جستجو......؟'' انہوں نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

''اس کائنات کی تمام مخلوقات...... مجھے مان کر میرے سامنے مطیع اور فرمانبردار رہے گی...... میری تسبیح کرے گی...... مگر مجھے جاننے کی جستجو کوئی نہیں کرے گا...... سوائے انسان کے۔''

''آپ کی جستجو......؟ یہ کیسے ممکن ہے؟'' سوال کیا گیا۔

''جب میری نشانیاں اور قدرتیں انسانوں کو اندر سے مضطرب کریں گی تو وہ میرے اسرار جاننے کی کوشش کرے گا...... جیسے جیسے اسرار کی

حقیقتوں سے وہ آشنا ہوتا جائے گا...... وہ میرے قریب آتا جائے گا...... اور اس کو میرا وہ قرب نصیب ہوگا جو کائنات میں کسی اور مخلوق کو کبھی نہیں ہو پائے گا......" مسکرا کر جواب دیا گیا۔

"کیسا قرب......؟" حیرت سے سوال کیا۔

"راز و نیاز کا......!"

"سرگوشی اور ہم کلامی کا......"

"محبت اور عشق کا......"

سب چونک کر سفید روشنی کی جانب حیرت سے دیکھنے لگے۔

"یہ سب کیسے ممکن ہوگا؟" قدرے توقف کے بعد سوال کیا گیا۔

سفید روشنی پرسکون انداز میں چمکتی رہی مگر کوئی جواب نہ دیا۔

وہ حیران ہو کر روشنی کی جانب دیکھنے لگے۔ اچانک کسی کی سرگوشیوں کی صدا ہر جانب سنائی دینے لگی۔ وہ سب چونک کر دیکھنے لگے۔

☆

پروفیسر امجد علی نے اپنے سامنے ٹیبل پر کتابوں کا ڈھیر لگا رکھا تھا۔ ان کی سٹڈی میں ہر طرف کتابیں اور میگزینز بکھرے نظر آ رہے تھے...... وہ تین روز سے...... ان کتابوں کی ورق گردانی میں مصروف تھے...... مگر انہیں ان کے سوال کا جواب نہیں مل رہا تھا...... وہ بار بار انٹرنیٹ کھول کر بیٹھ جاتے...... ان کی تیس سالہ پروفیشنل لائف میں یہ پہلا واقعہ تھا...... اور...... اس واقعہ نے انہیں...... نہ صرف اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا...... بلکہ ان کے علم اور تجربے پر بھی پانی پھیر دیا تھا......

یہ...... کیسے ممکن ہے......؟ وہ بار بار بڑبڑا رہے تھے، تھک کر کرسی پر بیٹھ جاتے...... اس کی پشت کے ساتھ سر ٹکا کر اسٹڈی روم کی خوبصورت مزین چھت کو گھورتے...... وہ ملک کے مشہور آرکیالوجسٹ تھے...... ان کی پچپن سالہ زندگی میں پہلی دفعہ رونما ہونے والے اس واقعے نے...... انہیں بری طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

"اٹس...... امپا...... سبل......؟" ہاؤ...... از...... اٹ پاسبل؟

وہ انٹرنیٹ آن کر کے Search کرنے لگے...... مختلف Web Sites کی Search نے ان کے اندر کی تشنگی کو مزید بڑھا دیا......

سائنسی علم کے مطابق ہر انسان Cells سے بنا ہے اور مرنے کے بعد Cells کی Decomposition (گلنا سڑنا) شروع ہوتی ہے......

تو...... پھر...... وہ 'انسان'...... کس مخصوص چیز سے بنا تھا......؟ انٹرنیٹ آن تھا اور وہ گہری سوچ میں ڈوب گئے تھے۔ ان کی نگاہیں دیوار پر مرکوز تھیں مگر ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔

"یہ...... یہ...... کیسے ممکن ہے......؟"

ایسا..... اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا..... اور نہ ہی انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ کیا وہ کوئی معجزہ تھا.....؟ ان کے ذہن نے سوال کیا..... نہیں..... نہیں..... یہ ممکن نہیں..... معجزے کچھ نہیں ہوتے..... یہ صرف انسانی سوچ..... ذہن کی اختراع اور سوچ ہوتی ہے..... جو چیز ہمیں سمجھ نہ آئے اور ہماری عقل اسے قبول نہ کرے تو ہم اسے معجزہ کہنا شروع کر دیتے ہیں.....

ہر شے..... ہر وجود اور ہر حقیقت کی کوئی نہ کوئی بنیاد ہوتی ہے..... زمین کی کھدائی کے دوران انہیں کئی بار بے شمار عجوبے ملے تھے۔ عجیب و غریب قسم کی انسانی ہڈیاں ٹیڑھی، میڑھی، ترچھی، بوسیدہ اور بدشکل..... جن کے قدیم ہونے کا بھی با آسانی پتہ چل سکتا تھا۔ انہوں نے انٹرنیشنل لیول پر بھی کئی ماہرین کے ساتھ مل کر بہت ریسرچ ورک کیا تھا..... مگر ایسا اتفاق کبھی نہیں ہوا تھا..... ایسی بات سُنی تو تھی مگر انہوں نے کبھی اس پر یقین نہیں کیا تھا..... اور اب جو کچھ خود دیکھا تھا..... دل اس پر یقین نہیں کر رہا تھا۔ کئی روز سے ان کا ذہن الجھا ہوا تھا اور کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔

انسان کیا ہے.....؟ کس سے جنم لیتا ہے اور اس کی ابتداء کہاں سے ہوئی ہے؟ یہ سوال پھر ان کے ذہن کو مضطرب کرنے لگا۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھے اور شیلف میں رکھی مختلف کتابوں کو دیکھنے لگے..... ایک کتاب نکال The Origin of human body کے Chapter کو کھول کر پڑھنے لگے..... وہی انفارمیشن جو وہ بار بار پڑھتے آئے تھے پھر بغور پڑھنے لگے..... انسان کس شے سے بنا ہے؟

اس کا جواب تھا Cell (خلیہ) جو مختلف شکل وصورت اور سائز کا Sack like Structure (تھیلی نما) اسٹرکچر ہوتا ہے جو خورد بین کی مدد کے بغیر نہیں دیکھا جا سکتا۔ ایک جیسے ہی شکل وصورت کے Cells مل کر ٹشو بناتے ہیں، پھر مخصوص ٹشوز مل کر Organs یعنی انسانی اعضاء بناتے ہیں اور اعضاء کی قدرتی ترکیب سے جسم انسانی بنتا ہے۔

اگر انسانی جسم Cell کے بغیر ممکن نہیں تو پھر اس انسان کا جسم کن Cells سے بنا تھا..... وہ سوچ میں پڑ گئے..... اور Cells کے بارے میں مختلف کتابیں کھول کر پڑھنے لگے..... ہر ایک میں Cell کی ساخت ایک جیسی لکھی تھی..... مثلاً تین اہم حصوں پر Cell مشتمل ہوتا ہے۔ Cell membrane (خلیئے کی جھلی) نیوکلیس (مرکزہ) اور سائٹو پلازم (نیوکلیس اور جھلی کے درمیان Fluid نیم سیال مادہ ہوتا ہے) جو کہ پروٹین Cell membrane خلیئے کی بیرونی جھلی اور چکنائیوں سے مل کر بنی ہے۔ یہ نیم مسام Semi permeable ہوتی ہے جو مخصوص اجزاء کو Cell میں داخل ہونے دیتی ہے اور بے کار اجزاء کو باہر نکال دیتی ہے یہ جھلی Cell کے تمام اجزاء کو سہارا بھی دیتی ہے۔

نیوکلیس جو کہ Cell کا مرکزی حصہ ہوتا ہے اسے Cell کا Brain بھی کہا جاتا ہے..... جو کہ Cell کے سارے System کو کنٹرول کرتا ہے۔ یہ گول یا بیضوی شکل کا ہوتا ہے، جس کے گرد باریک جھلی ہوتی ہے، جسے نیوکلیئر ممبرین کہتے ہیں..... اس کے اندر شفاف لیس دار مادہ ہوتا ہے جسے نیوکلیئر کا پلازمہ کہتے ہیں، اس میں بہت سے مرکبات ہوتے ہیں، اسی کے اندر کروموسومز اور نیوکلیولائی ہوتے ہیں۔ کروموسومز دھاگوں کا ایک جال ہوتا ہے جو نیوکلیس کے اندر پھیلا ہوتا ہے۔ ہر جاندار میں کروموسومز کی تعداد مختلف ہوتی ہے مگر انسانوں میں اس کی تعداد 46 یا 23 جوڑوں کی شکل میں ہوتی ہے۔ کروموسومز کے اوپر جینز (Genes) کوڈ کی صورت میں ہوتے ہیں..... یہ والدین کی خصوصیات بچوں میں منتقل کرتے ہیں اور وراثت کے ذمہ دار ہوتے ہیں..... کروموسومز پروٹین اور DNA سے مل کر بنتے ہیں جبکہ سائٹو پلازم، نیم شفاف لیس دار مادہ،

جس میں بہت سے مرکبات یعنی پانی، کاربوہائیڈریٹس، پروٹینز، نمکیات پائے جاتے ہیں۔ 70 فیصد ہوتا ہے۔ کاربوہائیڈریشن جو کہ Cell کو طاقت دیتا ہے اور اس کی خوراک میں مدد دیتا ہے...... پروٹینز جو کہ Cell کا 20-30 فیصد حصہ ہوتے ہیں...... یہ دو قسم کی پروٹینز ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو جسم کی ساختیں یعنی کھال، بال وغیرہ بناتی ہے۔ دوسری گلوبیولر پروٹین یا Cell کے مادوں میں حل ہو کر Enzym کا کام کرتی ہے۔

سائیٹو پلازم میں موجود چکنائیاں جسم کو غذائیت اور حرارت مہیا کرتی ہیں اور ٹشوز کی حفاظت بھی کرتی ہیں۔

Cell میں موجود نمکیات، پوٹاشیم، سوڈیم کلورائیڈ، کیلشیم، میگنیشیم، خلیات یعنی Cell کو کنٹرول کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ سنٹروسوم میں موجود غیر شفاف ذرات، جنہیں سنٹرولیس کہتے ہیں سیل کی Division (تقسیم) کے ذمہ دار سنٹروسوم ہوتے ہیں...... مائیٹو کونڈریا جن کی تعداد سینکڑوں میں ہوتی ہے۔ یہ سیل کی طاقت کا سرچشمہ ہوتے ہیں...... رائبوسوم سیل میں پروٹین بناتے ہیں۔ گالجی باڈیز سیل میں کیمیائی تبدیلیوں کا باعث بنتے ہیں...... انسانی جسم اور اس میں گردش کرنے والا خون بھی سیلز پر مشتمل ہوتا ہے...... انسانی جسم کی ابتدا Cell سے ہوتی ہے اور ساری زندگی Cell بنتے اور ٹوٹتے رہتے ہیں اور مرنے کے بعد بھی یہی Cell ختم ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ ہر کتاب سے انہیں یہی انفارمیشن مل رہی تھی......

Cells سے جنم لینے والے ہر انسان کے سیلز کا ختم ہونا بھی ضروری ہے...... اگر ایسا نہیں ہوتا...... تو...... پھر اس کے پیچھے ضرور کوئی راز ہے......؟ وہ راز کیا ہے......؟

کیا وہ 'انسان' کسی اور شے سے بنا تھا؟ کیا اس میں Cells موجود نہیں تھے......؟ اگر اس میں Cells موجود نہیں تھے...... تو پھر اور کیا تھا...... جس نے اس کی لاش کو گلنے سڑنے نہیں دیا...... کھدائی کے دوران انتہائی ویران اور کھنڈر علاقے سے انہیں ایک بوڑھے آدمی کی اسی سالہ پرانی لاش ملی تھی۔ جس کا نہ تو کفن خراب ہوا تھا اور نہ ہی اس کا جسم...... اس کی داڑھی کے بال، ناخن بھنویں اور پلکیں تک بالکل سلامت تھیں۔ اس کی جلد یوں تر و تازہ تھی جیسے ابھی ابھی دفنایا گیا ہو...... اس کے جسم پر ایک بھی خراش نہیں آئی تھی۔ اسے دفنائے ہوئے بھی ایک لمبا عرصہ گزر گیا تھا...... اس کی ساتھ والی قبروں میں موجود ہڈیاں بھی بوسیدہ ہو چکی تھیں...... اور صرف اس شخص کی لاش بالکل ٹھیک تھی۔ پروفیسر امجد کے لئے...... یہ ناقابلِ یقین واقعہ تھا...... دراز قد، دبلا پتلا، سرخ و سفید رنگت اور سفید داڑھی والا وہ شخص...... ان کے لئے ایک چیلنج بن گیا تھا...... ایک سوال...... ایک معمہ راز......؟ انہیں کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ مختلف کتابیں کھول کھول کر پڑھ رہے تھے...... مگر کوئی ایسی بات پتہ نہیں چل رہی تھی، جس سے وہ کسی حتمی نتیجے پر پہنچتے۔ اس شخص کی رنگت بھی خراب نہ ہوئی تھی۔ پروفیسر امجد...... تھک ہار کر کرسی کی پشت کے ساتھ سر ٹکا کر بیٹھ گئے، مگر ان کی آنکھوں کے سامنے پھر اسی بوڑھے شخص کی لاش اور چہرہ گھومنے لگا...... جب سے انہیں وہ لاش ملی تھی وہ ایک دن بھی نہیں سو پائے تھے۔ مختلف سوالات ان کے ذہن کو ڈسٹرب کر رہے تھے...... اور وہ جتنی جدوجہد کر رہے تھے انہیں کسی سوال کا جواب نہیں مل رہا تھا وہ وہیں کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو گئے۔

صبح بیدار ہوئے تو ان کا ذہن بہت تھکا ہوا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی تو انہوں نے بیزاری سے اٹھ کر دروازہ کھولا...... سامنے ان کا ملازم کھڑا تھا۔ اس نے انہیں ان کا موبائل پکڑایا۔

''جناب...... ڈاکٹر کیانی بہت دیر سے آپ کو کال کر رہے ہیں...... بیگم صاحب نے یہ موبائل دیا ہے کہ آپ ان سے بات کرلیں......''

نوجوان ملازم ان کا موبائل پکڑا کر چلا گیا۔

''ڈاکٹر کیانی......؟'' وہ کیوں فون کر رہے ہیں، انہیں بھلا کیا کام ہو سکتا ہے؟'' وہ سوچ رہے تھے کہ ڈاکٹر کیانی کا فون دوبارہ آ گیا۔

''ہیلو...... پروفیسر امجد...... آپ کہاں ہیں۔'' ڈاکٹر کیانی نے مسکرا کر پوچھا۔

''یونہی...... ایک ریسرچ میں مصروف تھا۔'' پروفیسر امجد علی نے جواب دیا۔

''مجھے بھی ایک ریسرچ کے سلسلے میں آپ کی مدد چاہیے...... آئی مین...... ایک ہزار سال پہلے انسانوں اور جانوروں کی ہڈیوں پر آپ کے ریسرچ پیپرز چاہئیں۔'' ڈاکٹر کیانی نے کہا تو پروفیسر امجد ایک دم چونکے اور ان کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے بولے۔

''ڈاکٹر کیانی...... انسانی جسم کی decomposition کب شروع ہوتی ہے اور یہ maximum Cycle کب تک مکمل ہوتا ہے؟'' پروفیسر امجد نے پوچھا۔

''کیا مطلب......؟ کیا آپ نہیں جانتے؟''

ڈاکٹر کیانی نے حیرت سے پوچھا۔

''جانتا ہوں...... مگر آپ سے کنفرم کرنا چاہتا ہوں......'' پروفیسر امجد نے جواب دیا۔

''انسان کے مرتے ہی یہ پروسیس شروع ہو جاتا ہے اور 365 دنوں میں انسان بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ صرف ہڈیاں باقی رہ جاتی ہیں۔''

ڈاکٹر کیانی نے جواب دیا۔

''ڈاکٹر کیانی...... کیا یہ ممکن ہے...... کوئی مردہ جسم اسی سال کے بعد بھی فریش ہو؟''

''امپاسبل......'' ڈاکٹر کیانی نے قطعیت سے جواب دیا۔

''کیا معجزانہ طور پر بھی نہیں؟''

''پروفیسر امجد...... آج آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں، سائنس کی اتنی ترقی کے باوجود بھی آپ معجزوں کی باتیں کر رہے ہیں...... پلیز آپ مجھے اپنے نوٹس Provide کر دیں جو انٹرنیشنل Journals میں شائع ہوئے ہیں۔'' ڈاکٹر کیانی نے کہا۔

''یس آف کورس...... لیکن میں آپ سے ملنا بھی چاہتا ہوں......'' پروفیسر امجد نے جواب دیا۔

''او کے...... ایز یو وش۔'' ڈاکٹر کیانی نے جواب دیا اور موبائل آف کر دیا۔

ڈاکٹر کیانی ملک کی مایہ ناز یونیورسٹی میں پروفیسر ڈاکٹر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ بائیو ٹیکنالوجی کے علاوہ Human Body & Organ پر ان کی ریسرچ کا بہت چرچا تھا۔ انٹرنیشنل کانفرنسز میں پڑھی جانے والی ان کی ریسرچ رپورٹس کو بہت Appreciate کیا جاتا تھا۔

پروفیسر امجد علی اور ڈاکٹر کیانی میں بہت گہری دوستی تھی...... ریسرچ کے مختلف شعبوں میں دونوں گھنٹوں بیٹھ کر سیر حاصل بحث کیا کرتے تھے۔ پروفیسر امجد علی تمام ریسرچ شدہ رپورٹس لے کر ڈاکٹر کیانی کے اسٹڈی روم میں بیٹھے گفتگو میں معروف تھے۔ ڈاکٹر کیانی خوبصورت شخصیت کے سنجیدہ مزاج شخص تھے۔ سفید بالوں اور نظر کی عینک لگائے وہ بہت سوبر دکھائی دیتے تھے۔ ان کی ذہین آنکھیں اک خاص چمک لئے ہوئے تھیں جو دیکھنے والے کو پہلی نظر میں ہی متاثر کرتی تھیں۔

ڈاکٹر کیانی نے پروفیسر امجد علی کی بات بغور سنی اور عینک اتار کر ان کی طرف حیرت سے دیکھنے لگے......

''آئی ڈونٹ بلیواٹ...... ہیومن باڈی کی Decomposition ایک نیچرل پراسیس ہے۔ باڈی کے تمام elements مٹی میں جانے سے پہلے ہی ایک Natural cycle کے ذریعے اپنا کام شروع کر دیتے ہیں...... یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ باڈی ویسی ہی ہو...... امجد تمہیں ضرور غلط فہمی ہوئی ہے......'' ڈاکٹر کیانی نے کہا۔

''پروفیسر مائیکل...... پروفیسر گردیزی اور میں...... ہم تینوں نے اسے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔'' پروفیسر امجد علی نے جواب دیا۔

''اب وہ باڈی کہاں ہے......؟'' ڈاکٹر کیانی نے پوچھا۔

''اس کے قریبی علاقے کے لوگوں کو جیسے ہی خبر ملی وہ اسے اٹھا کر لے گئے اور بہت عقیدت واحترام سے اسے دوبارہ دفنا دیا۔'' پروفیسر امجد علی نے جواب دیا۔

''کیا اس لاش کا دوبارہ ملنا ممکن نہیں...... آئی مین...... ریسرچ کے لئے...... ممکن ہے ریسرچ رپورٹس کچھ اور ہی نکلیں......'' ڈاکٹر کیانی نے کہا۔

''ناممکن ہے۔ اس علاقے کے لوگ تو اس ڈیڈ باڈی کے بارے میں بہت پوزیسو ہو رہے تھے...... لیکن میں نے تحقیق کر لی تھی وہ اسی سال پرانی لاش تھی۔'' پروفیسر امجد علی نے جواب دیا۔

ڈاکٹر کیانی ان کی بات سن کر سوچ میں ڈوب گئے۔

''آپ کیا سوچ رہے ہیں؟'' پروفیسر امجد علی نے پوچھا۔

ڈاکٹر کیانی نے اپنی...... لائبریری میں سے انتہائی قدیم اور جدید موٹی کتابیں نکال کر ٹیبل پر رکھیں اور ان کی ورق گردانی کرنے لگا۔ ''یہ دیکھو...... یہاں لکھا ہے کہ انسان کے مرتے ہی اس کی Decomposition (گلنا سڑنا) شروع ہو جاتی ہے...... اور یہ پروسیس جسم کے اندر اور باہر دونوں اطراف سے شروع ہوتا ہے۔ جیسے ہی سانس رکتی ہے اور دل دھڑکنا بند کرتا ہے تو جسم کے تمام Cell بھی مر جاتے ہیں اور جسم بیکٹیریا سے لڑنے کی قوت نہیں رکھتا Cells کے اپنے Enzymes اور بیکٹیریا کے Enzymes لاش کو Decompose کرتے ہیں۔ جس سے Skin کی اکڑن ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ مرتے ہی مکھیاں لاش کے نتھنوں اور منہ کے پاس ایسے انڈے دیتی ہیں جن میں موجود لاروا لاش کو Decomposition کے عمل کو تیز کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ Decomposition کے Five Steps پانچ مراحل بھی یہاں لکھے

ہیں......" ڈاکٹر کیانی نے پروفیسر امجد علی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تو وہ خاموشی سے ان کی جانب دیکھنے لگے......

"پہلا مرحلہ Initial decay جس میں مرنے کے تین دن تک جسم ظاہری طور پر ٹھیک تو نظر آتا ہے مگر اس کے اندر بہت سی تبدیلیاں رونما ہو جاتی ہیں۔ انتڑیوں میں موجود بیکٹریا انتڑیوں میں موجود مواد کو کھانا شروع کرتے ہیں۔ آخر کار یہ بیکٹریا جسم کے دوسرے حصوں میں پھیل کر انہیں ہضم کرنے لگتے ہیں اور انتڑیوں اور معدے میں خوراک کو ہضم کرنے والے Enzymes پھٹ کر معدے اور انتڑیوں سے خارج ہو کر جسم کے مختلف حصوں میں پھیل کر انہیں بھی ہضم کرنے لگتے ہیں اور بیکٹریا اس عمل کو مزید تیز کر دیتے ہیں۔ Cells کے اندر موجود Enzymes خارج ہو جاتے ہیں اور Cells کو ہضم کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

دوسرا مرحلہ Putrefaction ہے۔ مرنے کے بعد دس دن تک یہ عمل جاری رہتا ہے۔ بیکٹریا کی وجہ سے Cells کی ٹوٹ پھوٹ ہوتی ہے۔ اس سے پیدا ہونے والی گیسیں ہائیڈروجن سلفائیڈ، میتھین اور دوسری بدبودار گیسیں حشرات الارض کی پسندیدہ ہوتی ہیں اور وہ اس کی جانب تیزی سے بڑھتے ہیں۔ ان گیسوں کی بو سے جسم پھول جاتا ہے اور Cells سے مواد اور خون مائع کی صورت میں باہر آ جاتا ہے۔ بیکٹریا اور کیڑے مکوڑے ان کو مزید خوراک مہیا کرتے ہیں۔

تیسرا مرحلہ Black Putrefaction ہے۔ یہ مرحلہ مرنے کے 10-20 دنوں تک جاری رہتا ہے۔ Blotle باڈی بالآخر ختم ہو جاتی ہے۔ گوشت مائع یعنی کریم کی طرح مائع کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ جس کے ظاہری حصے سیاہ ہو جاتے ہیں اور جسم سے بدبو آنے لگتی ہے۔ بہت سے مواد مائع کی صورت میں جسم سے بہہ کر مٹی میں جذب ہونے لگتے ہیں...... جو زیادہ تر حشرات اور کیڑوں مکوڑوں کی خوراک بنتے ہیں...... یہ کیڑے مکوڑے جسم کی Cavaties میں داخل ہو کر اپنی خوراک حاصل کرتے ہیں...... اگر کیڑے مکوڑے نہ بھی ہوں تو وہاں موجود بیکٹریا بھی جسم کو ہضم کر لیتے ہیں۔ ان حشرات کی وجہ سے جسم کا درجہ حرارت بھی بڑھ جاتا ہے۔

چوتھا مرحلہ Butyric Putrefaction مرنے کے 22-50 دنوں تک جاری رہتا ہے۔ جسم پر موجود گوشت اس عرصے کے دوران ختم ہو جاتا ہے اور جسم خشک ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اس کی Cheesy Smell زمین میں موجود حشرات کو یعنی Moths کو Attract کرتی ہے۔ Moths خشک اکڑے ہوئے گوشت کو نہیں کھا سکتے جبکہ کھٹمل ان کو چبا چبا کر کھاتے ہیں جیسے Skin یا Legament کو۔

پانچواں مرحلہ Dry Decay 50-365 دنوں تک جاری رہتا ہے۔ جس میں جسم خشک ہو جاتا ہے اور آہستہ آہستہ ختم ہو جاتا ہے۔ بیکٹریا بالآخر لاش کے بال بھی کھا لیتے ہیں اور صرف ہڈیاں باقی رہ جاتی ہیں...... یہاں ہڈیاں عموماً غیر یقینی طور پر باقی رہ جاتی ہیں۔ لاش کے گلنے سڑنے کا عمل مکمل ہو جاتا ہے۔ ہر انسانی جسم کو مرنے کے بعد ان تمام مراحل میں سے گزرنا پڑتا ہے۔" ڈاکٹر کیانی نے کہا۔

"ڈاکٹر کیانی...... ممکن ہے Climate کی وجہ سے اس لاش کا Decay نہ ہوا ہو۔" پروفیسر امجد علی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"امجد...... پھر بھی یہ ممکن نہیں...... مرطوب زمین میں موجود حشرات اور زمین کا درجہ حرارت ان مراحل پر ہر صورت میں اثر انداز ہوتا ہے Decomposition کا پروسیس سردیوں کی نسبت گرمیوں میں تیز ہوتا ہے۔ اس طرح گرم علاقوں میں دوگنا اور پانی میں یہ عمل قدرے

ست ہوتا ہے۔ لیکن پھر بھی اتنے سالوں تک کوئی لاش بھی باقی نہیں رہتی۔......" ڈاکٹر کیانی نے جواب دیا۔

"کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی Cells باقی رہ گئے ہوں اور اسی وجہ سے جسم کی Decomposition نہ ہوئی ہو۔" پروفیسر امجد علی نے پھر پوچھا۔

"یہ ممکن ہی نہیں......جسم کے مرنے کے ساتھ ہی Cells کو اور ٹشوز کو آکسیجن مہیا ہونا رک جاتی ہے اور وہ تیزی سے مرنے لگتے ہیں......سب سے پہلے برین سیلز 7-3 منٹ کے اندر مر جاتے ہیں اور جلد کے Cells 24 گھنٹوں کے بعد مر جاتے ہیں اور لاش کو دفنانے کے فوراً بعد Decomposition کا عمل قدرتی طور پر شروع ہو جاتا ہے اور یہ نیچرل پروسیس ہے۔ کیا وہ لاش بہت زیادہ گہرائی سے نکلی تھی، کیونکہ اکثر لاشوں کو محفوظ کرنے کے لئے بہت زیادہ گہرائی میں دفنایا جاتا ہے؟" ڈاکٹر کیانی نے پوچھا۔

"ہاں......لیکن اس کے ساتھ کوئی کیمیکلز نہیں تھے اور نہ ہی قدیم مصری لاشوں کی طرح اسے حنوط Mumify کیا گیا تھا، بلکہ اس کے جسم سے ایک مخصوص خوشبو آ رہی تھی......" پروفیسر امجد علی نے کہا۔

"کیسی خوشبو......؟" ڈاکٹر کیانی نے چونک کر پوچھا۔

"جیسے کسی عطر کی......" پروفیسر امجد علی نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"امجد......تم کیسی عجیب باتیں کر رہے ہو......" ڈاکٹر کیانی نے کہا۔

"کیسی باتیں......؟ پروفیسر امجد علی نے پوچھا

"ناممکن......" ڈاکٹر کیانی نے جواب دیا۔

"کیا آپ اسے معجزہ نہیں سمجھتے......؟ پروفیسر امجد علی نے پوچھا۔

"تم......کیا منوانا چاہتے ہو......؟ کیا یہ کوئی معجزہ ہے......؟ اگر ایسی بات ہے تو میں اسے ہرگز معجزہ نہیں مانوں گا......" ڈاکٹر کیانی نے کہا۔

"کیوں......؟" پروفیسر امجد نے پوچھا۔

"ممکن ہے تم سے کہیں غلطی ہوگئی ہو......کیا تم لوگوں نے اسے Rigor mortis کے ذریعے Assess کیا تھا......؟" ڈاکٹر کیانی نے پوچھا۔

"ہاں......اسی سے تو پتہ چلا تھا کہ یہ اسی سال پرانی لاش ہے......" پروفیسر امجد علی نے جواب دیا۔

"امجد......تم مجھے کنفیوز کر رہے ہو......" ڈاکٹر کیانی نے جھنجھلا کر کہا۔

"کنفیوز......تو میں خود ہو رہا ہوں......سمجھ میں نہیں آ رہا......حقیقت کیا ہے......؟" پروفیسر امجد نے جواب دیا۔

"تم کیوں الجھ رہے ہو......چھوڑو......اسے اور اپنا کام کرو......جتنا سوچو گے اتنے ہی کنفیوز ہو گے......" ڈاکٹر کیانی نے کہا۔

"ریسرچ میرے پروفیشن کی Base ہے......کیسے نہ سوچوں......؟" پروفیسر امجد علی نے آہ بھر کر جواب دیا۔

"کیا یہ ضروری ہے کہ تم اسی کو ریسرچ کرو اور کسی ٹاپک پر اپنا وقت صرف کرو۔" ڈاکٹر کیانی نے کہا۔

''ڈاکٹر کیانی.....جسم کا جو حصہ تکلیف دیتا ہے.....کیا آپ اسے یونہی چھوڑ دیتے ہیں.....یا اس کا علاج کرتے ہیں.....؟'' پروفیسر امجد علی نے پوچھا۔

''ٹھیک ہے.....یار.....تم ریسرچ کرو.....مگر میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ.....اتنا سوچوں اور وہ بھی ایک.....اسی سالہ پرانی لاش کے بارے میں.....مجھے تو اپنا ریسرچ ورک مکمل کرنا ہے۔'' ڈاکٹر کیانی نے پروفیسر امجد کے دیئے ہوئے ریسرچ پیپرز اٹھائے اور باہر چلے گئے۔

پروفیسر امجد کی سوچیں پھر انہیں مضطرب کرنے لگیں.....وہ آنکھیں بند کرتے تو.....وہی لاش ان کی آنکھوں کے سامنے آنے لگتی.....ان کا ملازم چائے کے دو کپ ٹرے میں رکھ کر لایا اور حیرت سے ادھر ادھر دیکھنے لگا.....

''اوہ.....صاحب.....مہمان کہاں چلے گئے؟'' ملازم نے کہا تو پروفیسر امجد علی نے چونک کر.....نوجوان ملازم فیروز خان کی طرف دیکھا۔

''فیروز خان.....کبھی تم نے کئی سال پرانی لاش.....بالکل ٹھیک حالت میں دیکھی ہے؟'' پروفیسر امجد نے پوچھا۔

''کبھی نہیں صاب.....'' فیروز خان نے جواب دیا۔

''کبھی سنا بھی نہیں.....؟'' پروفیسر امجد نے پوچھا۔

''ہاں.....کبھی کبھار.....گھر کے بزرگوں سے سنتے تھے.....'' فیروز خان نے جواب دیا۔

''اس کا مطلب ہے.....ایسا ہونا ممکن ہے.....'' پروفیسر امجد علی بڑبڑائے۔

''ہاں.....بالکل.....'' فیروز خان قطعیت سے بولا۔

''فیروز خان.....مجھے اس کے بارے میں مزید کون بتا سکتا ہے؟'' پروفیسر امجد علی نے استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔

''میرا خیال ہے.....گورکن سے زیادہ بہتر کوئی نہیں بتا سکتا.....؟'' فیروز خان نے کہا۔

''گورکن.....؟'' پروفیسر امجد علی نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

''ہاں.....قبروں اور مردوں کے بارے میں معلومات اس سے زیادہ اور کون دے سکتا ہے۔ جس نے ساری زندگی قبرستان میں قبروں کی کھدائی کرنے اور مردوں کو دفنانے میں گزاری ہو۔'' فیروز خان نے پُرمطمئن انداز میں جواب دیا تو پروفیسر امجد علی گہری سوچ میں ڈوب گئے.....فیروز خان انہیں کہیں اور گم دیکھ کر خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

شام کا ملگجا اندھیرا ہر طرف پھیل رہا تھا۔ پروفیسر امجد علی شہر کے مختلف قبرستانوں میں گھوم پھر کر اب شہر کے سب سے بڑے اور پرانے قبرستان میں گئے تھے۔ ہر طرف خاموش.....مٹی کے تازہ اور پرانے ڈھیر ایسا ہولناک منظر پیش کر رہے تھے کہ پروفیسر امجد علی کا دل ایک لمحے کو دہل گیا.....انہوں نے بڑے وسیع اور پرانے کھنڈروں میں کھدائی اور ریسرچ کی تھی مگر کبھی ایسے احساسات سے دوچار نہیں ہوئے تھے.....جن سے اب ہو رہے تھے.....وہ ادھر اُدھر نظریں دوڑاتے رہے، کچھ قبروں پر اکا دکا لوگ نظر آئے، مگر وہ کہیں نظر نہ آیا.....جس کی انہیں تلاش تھی اور قبرستان اتنا وسیع تھا کہ اسے ڈھونڈنا قدرے مشکل لگ رہا تھا۔ اچانک ایک دس سالہ لڑکا کہیں سے نمودار ہوا اور اس نے ہاتھ میں پکڑے خالی لفافے میں قبروں

سے تازہ پھولوں کو چن چن کر لفافے میں ڈالنا شروع کر دیا۔ پروفیسر امجد علی درخت کی اوٹ میں چھپ کر اسے دیکھنے لگے۔

''یہ تم کیا کر رہے ہو......؟'' اچانک پروفیسر امجد علی نے سامنے آ کر پوچھا......

''ک......ک......کچھ نہیں۔'' وہ لڑکا گھبرا گیا اور لفافہ وہیں پھینکا اور اٹھ کر بھاگنے لگا۔

پروفیسر امجد علی نے آگے بڑھ کر اس کا بازو زور سے اپنے ہاتھ میں پکڑا۔

''کیا تم یہاں رہتے ہو......؟''

''ہاں......نہیں......نہیں......'' اس نے ہکلا کر جواب دیا۔

''میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا...... مجھے صاف صاف بتاؤ تم کون ہو......؟'' کیا یہیں رہتے ہو؟

''ہاں......اپنے ابا کے ساتھ......'' وہ لڑکا گھبرا کر بولا۔

''مجھے تمہارے باپ سے ملنا ہے۔ مجھے اس کے پاس لے چلو۔'' پروفیسر امجد علی نے قدرے رعب سے کہا۔

''صاحب......آپ مجھے پولیس کے حوالے تو نہیں کریں گے اور ابا کو بھی نہیں بتائیں گے نا...... میں یہ سب آئندہ نہیں کروں گا۔'' لڑکے نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

''کیا......؟'' پروفیسر امجد علی نے چونک کر پوچھا۔

''یہی......کہ میں قبروں سے پھول اٹھا کر انہیں بیچتا ہوں۔'' لڑکے نے سر جھکا کر کہا۔

''کیا تم یہ کام کرتے ہو؟'' پروفیسر امجد علی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......مگر اب ایسا نہیں کروں گا......'' لڑکے نے ہاتھ جوڑ کر روتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے......آئندہ تم نے ایسا کیا تو میں تمہیں پولیس کے پاس لے جاؤں گا۔ مگر ابھی مجھے تمہارے باپ سے ملنا ہے۔'' پروفیسر امجد علی نے کہا۔

''کیوں......؟ لڑکے نے گھبرا کر پوچھا۔

''مجھے اس سے کچھ پوچھنا ہے۔''

''کیا......؟'' لڑکے نے چونک کر پوچھا۔

''قبروں اور مردوں کے بارے میں۔''

''کیوں......؟'' کیا آپ کوئی کتاب لکھ رہے ہیں؟'' لڑکے نے سوال کیا۔

''کتاب......؟ کیا مطلب......؟'' پروفیسر امجد علی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......بہت سے لوگ ابا کے پاس اس کام کے لئے آتے ہیں......'' لڑکے نے کہا۔

''ہاں......ایسا ہی سمجھو...... مجھے جلدی ان کے پاس لے چلو......اندھیرا بڑھنے لگا ہے۔'' پروفیسر امجد نے ارد گرد دیکھتے ہوئے کہا تو لڑکا خاموشی سے اس کے ساتھ چلنے لگا اور مختلف راستوں سے ہوتا ہوا ایک خستہ حال کچے مکان میں داخل ہوا......ایک ادھیڑ عمر شخص چارپائی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ کچے صحن کے ایک کونے میں ایک ادھیڑ عمر عورت لکڑیاں جلا کر......روٹیاں پکانے میں مصروف تھی......کچھ بچے ادھر ادھر کھیل رہے تھے۔

پروفیسر امجد علی......اس لڑکے کے ہمراہ صحن میں داخل ہوئے......چارپائی پر بیٹھا شخص انہیں دیکھ کر چونکا اور چارپائی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا......اور حیرت سے انہیں دیکھنے لگا۔

''ابا......صاب نے کتاب لکھنی ہے......تجھ سے ملنے آئے ہیں۔'' لڑکے نے جلدی سے تعارف کرایا۔

''آؤ......بیٹھو......ادھر......صاب جی۔'' اس کا باپ خوش ہو کر بولا۔

''مجھے......آپ سے کچھ معلومات لینی ہیں......میرا نام امجد علی ہے......اور......'' امجد علی نے اپنا تعارف کرانا چاہا......مگر......طفیلے نے اسے کچھ کہنے کا موقع ہی نہ دیا اور اپنے بیٹے کی طرف دیکھ کر مخاطب ہوا۔

''جا......ماں سے کہہ......روٹی لائے۔'' طفیلے نے کہا تو امجد علی نے اسے زبردستی روکا۔ ''مجھے کسی بھی شے کی طلب نہیں......بس کچھ سوالات پوچھنا چاہتا ہوں......رات ہو رہی ہے اور مجھے واپس گھر بھی پہنچنا ہے......'' امجد علی نے کہا۔

''پوچھو......کیا پوچھنا چاہتے ہو......ویسے میرا نام محمد طفیل ہے مگر سب طفیلا کہتے ہیں۔ پانچ بچوں اور بیوی کے ساتھ اس جگہ رہتا ہوں......گزارہ بڑی مشکل سے ہوتا ہے۔'' طفیلے نے جلدی جلدی بتایا جیسے وہ اپنا انٹرویو دے رہا ہو۔

''مجھے آپ کے بارے میں نہیں......کسی لاش کے بارے میں معلومات چاہئے......'' امجد علی نے کہا تو طفیلے نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

''کیا مطلب......؟'' طفیلے نے حیرت سے پوچھا۔

''کیا آپ نے کبھی کوئی ایسی لاش دیکھی ہے جو ستر، اسی سال پرانی ہو اور وہ بالکل ٹھیک حالت میں ہو......اس کا کفن بھی خراب نہ ہوا ہو......'' امجد علی نے پوچھا۔

''صاب میری تو اپنی عمر پچاس سال ہے......اسی برس کی لاش کہاں سے دیکھوں گا......'' طفیلے نے کہا۔

''کیا آپ کو کبھی اتفاق نہیں ہوا......میرا مطلب ہے کوئی عجیب اور انوکھا واقعہ دیکھنے، سننے میں آیا ہو......'' امجد علی نے پوچھا۔

''ہاں، کبھی کبھار کسی قبر کے پاس سے گزرو تو اچانک گندی سڑاندی بدبو آتی ہے......اور کبھی کسی کے پاس سے خوشبو آتی ہے......اور......'' طفیلا سوچنے لگا۔

''اور......کیا......؟'' امجد علی نے متجسس ہو کر پوچھا۔

''اور کبھی کچھ نہیں......اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ بندے کے ساتھ اندر قبر میں کیا ہوتا ہے......یہ تو اس کے ہی راز ہیں اور وہ اپنے راز کسی کو نہیں بتاتا۔'' طفیلے نے کہا۔

''مگر میں نے خود اپنی آنکھوں سے اسی سالہ بزرگ کی لاش بالکل صحیح سلامت دیکھی ہے......اس لاش کی داڑھی کے بال اور ناخن تک بھی خراب نہیں ہوئے تھے۔'' امجد علی نے گہری سانس لیتے ہوئے بتایا۔

''ہاں میرا ابا...... بھی بتایا کرتا تھا...... مگر میں نے ابھی تک اپنی آنکھوں سے ایسی لاش نہیں دیکھی......'' طفیلے نے حقہ پیتے ہوئے کہا۔

''آپ کے والد کہاں ہیں......؟'' امجد علی نے پوچھا۔

''وہ بیمار ہے......اندر کمرے میں ہے......اٹھ نہیں سکتا......'' طفیلے نے کہا۔

''کیا میں ان سے مل سکتا ہوں؟'' امجد نے پوچھا۔

''ہاں......چلو......'' طفیلا اس کے ساتھ اٹھ کر قدرے فاصلے پر ایک چھوٹے سے کمرے میں داخل ہوا جس میں ہر طرف تاریکی تھی۔ طفیلے نے آگے بڑھ کر زیرو کا بلب آن کیا تو ایک نحیف و نزار بوڑھا آدمی پرانی چارپائی پر لیٹا تھا۔ کمرے میں روشنی دیکھ کر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

''کون ہے......کون ہے......؟'' بوڑھا بوکھلا کر بولا۔

''ابا......میں ہوں......طفیلا......ایک صاب جی آئے ہیں......تجھ سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔'' طفیلے نے ایک پرانی خستہ حال کرسی، چارپائی کے قریب رکھی اور امجد علی کو بیٹھنے کو کہا۔ امجد علی بیٹھ گیا اور بوڑھے کی جانب دیکھنے لگا، بوڑھا انتہائی لاغر اور عمر رسیدہ شخص تھا۔

''مجھ سے بھلا کیا پوچھنا ہے......مجھے تو اپنی خبر نہیں۔'' بوڑھے نے مایوسی سے کہا۔

''ابا......کیا تو نے کبھی کوئی پرانی لاش ٹھیک اسی حالت میں دیکھی ہے، جس حالت میں اسے دفنایا گیا ہو......؟'' طفیلے نے پوچھا تو بوڑھے کی آنکھیں ایک دم چمکیں اور وہ امجد علی کی طرف حیرت سے دیکھنے لگا۔

''ہاں......دو......بار......ایک بار ایک مرد کی لاش اور دوسری بار ایک عورت کی۔ مرد کی لاش......سو سال پرانی تھی اور عورت کی ساٹھ سال......دونوں کے کفن بھی سلامت تھے اور جسم بھی۔'' بوڑھا بولا۔

''یہ......یہ کیسے ممکن ہے......؟'' امجد علی پریشانی سے بولا۔

''اس میں حیرانگی کی کیا بات ہے، اللہ والوں کے جسموں کو نہ زمین کھاتی ہے اور نہ ہی زمین کے کیڑے۔'' بوڑھے نے جواب دیا۔

''اللہ والے......؟ کیا مطلب......؟'' امجد علی نے متجسس ہو کر پوچھا۔

''ہاں......اللہ کے سچے اور خالص بندے۔'' بوڑھے نے جواب دیا۔

''کیا......سب انسان اللہ کے بندے نہیں......کیا اس نے سب کو پیدا نہیں کیا......یا پھر اللہ کے بندے کوئی اور ہوتے ہیں؟'' امجد علی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں ہم سب اللہ کے بندے ہیں مگر اللہ والے نہیں......'' بوڑھے نے جواب دیا۔

''اللہ والے......؟ کیا وہ کوئی خاص لوگ ہوتے ہیں......؟'' امجد علی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......وہ......جن میں اللہ خود بولتا ہے۔ اللہ خود دیکھتا ہے......خود سنتا ہے......خود بات کرتا ہے......'' بوڑھے نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب......؟ آپ تو مجھے الجھا رہے ہیں......میں نے تو آج تک زندہ انسانوں میں ایسا انسان کبھی نہیں دیکھا......'' امجد علی نے جھنجھلا کر کہا۔

''بند آنکھوں سے......انسان......سوائے اندھیرے کے......اور کیا دیکھ سکتا ہے۔ اللہ والوں کو اندر کی آنکھ سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ کوئی عام انسان تھوڑا ہوتے ہیں جو ہر ایک کو دکھائی دیں......ہاؤ......ان کی، خوشبو بھی مختلف ہوتی ہے......ہمیں......تمہیں......بھلا وہ کہاں دکھائی دیں گے......اور وہ بھی خوش نصیب ہوتے ہیں جن سے اللہ اپنے ایسے بندوں کو ملاتا ہے۔'' بوڑھے نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''آپ کے خیال میں بہت نیک اور عبادت گزار اللہ والے ہوتے ہیں؟'' امجد علی نے پوچھا۔

''یہ تو اللہ ہی جانتا ہے......کون اس کے قریب ہے......صرف عبادت گزار یا صرف اس سے محبت کرنے والا......'' بوڑھے نے کہا۔

''آپ اللہ والا کس کو کہتے ہیں؟'' امجد نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

''جس کو دیکھ کر اللہ خود بخود یاد آجائے۔'' بوڑھے نے جواب دیا اور خاموش ہو گیا۔

''کیا آپ نے کبھی کسی اللہ والے سے ملاقات کی ہے......؟'' امجد علی نے پوچھا۔

''بہت کوشش کی......مگر میں اتنا خوش قسمت کہاں......مگر ان کے مرنے کے بعد دیدار ضرور ہوا......کیا خوبصورت......چمکتے چہرے تھے، نور برس رہا تھا......ان کی پیشانیوں سے اور جسم یوں نرم گرم تھے جیسے ابھی سانسیں رکی ہوں......یوں لگ رہا تھا جیسے آنکھیں بند کئے سو رہے ہوں، اور ان کے جسموں سے خوشبو آرہی ہو......'' بوڑھے نے مسکرا کر بتایا۔

''بابا......یہی تو سمجھ نہیں آرہا......کیا ان خاص لوگوں کے جسم کسی اور شے سے بنے ہوتے ہیں کہ وہ مٹی میں مل کر مٹی نہیں ہوتے......جبکہ دوسرے انسان مٹی میں دفن ہو کر ایک سال کے اندر گل سڑ جاتے ہیں......'' امجد علی نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''بیٹا......اللہ کے راز وہی جانتا ہے......مجھ ان پڑھ کو کیا خبر......؟ کسی علم والے سے پوچھو، ہو سکتا ہے وہ تمہیں کچھ بتا سکے۔'' بوڑھے نے جواب دیا۔ امجد علی نے آہ بھر کر بوڑھے کی جانب دیکھا اور کچھ دیر بیٹھنے کے بعد واپس لوٹ آیا۔ ان کا ذہن مزید الجھ گیا تھا اور تجسس بھی ہو رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار ''انسان'' ایک چیلنج بن کر ان کے سامنے آیا تھا......آغاز بھی مبہم تھا اور انجام اس سے بھی مبہم......امجد علی کا ذہن انتہائی منتشر ہو گیا تھا۔

''ہر چیز اپنے اصل کی طرف لوٹتی ہے......درخت کتنا مضبوط ہے......زمین میں پھیلی اس کی جڑیں اس کا پتا دیتی ہیں......اور انسان کیا ہے......؟ کتنا قدیم......زمین میں چھپے تاریخی آثار اس کی خبر دیتے ہیں......مگر یہ کتنی عجیب بات تھی کہ ہر قدیم زمانے کا انسان موجودہ دور اور موجودہ دور کا انسان آنے والے ادوار میں ہمیشہ ایک چیلنج ہی رہے گا۔ مٹی کے پتلے، نطفے اور Cells سے تخلیق اور پروان چڑھنے والے انسان کی اصل حقیقت کیا ہے......؟ وہ نہ تو کسی سائنسی کلیئے، مفروضے یا تحقیق پر پورا اترتا ہے اور نہ ہی عقلی اور منطقی دلیل پر، پروفیسر امجد علی نے اپنی ساری زندگی

انسان کے بارے میں تاریخی شواہد اور آثار اکٹھے کرنے میں گزار دی تھی مگر آج نتیجہ صفر نکلا تھا۔ ان کی تمام ریسرچ پر پانی پھر گیا تھا۔ انہوں نے اپنے علم اور تجربے کی بنیاد پر انسانوں کی جو تاریخی درجہ بندی کی تھی...... وہ بے سود ثابت ہوئی تھی...... انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا جو علم اور تجربہ انہوں نے حاصل کیا تھا۔ وہ بے کار ثابت ہوا تھا۔

''مٹی سے تخلیق ہونے والا انسان مٹی میں دفن ہو کر فنا ہو جاتا ہے......'' غلط ثابت ہوا تھا...... بوڑھے، ان پڑھ گورکن کی سادہ باتوں نے امجد علی...... کی سوچ اور تجربے کو جھٹلا دیا تھا...... وہ بہت مضطرب ہو رہا تھا۔ رات گئے فیروز خان اس کے کمرے میں آیا...... وہ بیڈ پر لیٹا بے یقینی سے چھت کر گھور رہا تھا۔ آج نہ تو اس کے بیڈ پر کتابیں بکھری تھیں اور نہ ہی اس کے سوئے ہوئے سر پر کھلی پڑی تھی۔ فیروز خان نے دودھ کا گلاس اس کی سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور اس کی جانب دیکھنے لگا۔

''صاب...... دودھ رکھ دیا ہے...... پی لیں۔'' فیروز خان نے کہا...... امجد علی نے اس کی طرف بغور دیکھا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''فیروز خان...... میں آج قبرستان گیا تھا، بوڑھے گورکن سے بھی ملا تھا......'' امجد علی بولا۔

''اچھا......'' فیروز خان متجسس ہو کر اس کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا اور حیرت سے پوچھنے لگا۔

''اس نے بتایا کہ اس نے دوبار ایسے مردے دیکھے ہیں...... جن کے کفن تک بھی محفوظ تھے۔''

''ہاں...... وہ بتا رہا تھا کہ اللہ والوں کے جسم کبھی فنا نہیں ہوتے۔'' امجد علی نے کہا۔

''ہاں...... اس نے ٹھیک کہا ہے...... ہمارے گاؤں میں مولوی صاحب بھی یہی کہا کرتے تھے...... اور مولوی صاحب کو قدرت نے بڑے نظارے کرائے تھے...... وہ ایسی عجیب عجیب باتیں سناتے تھے کہ ہم حیران رہ جاتے تھے...... اس وقت تو ہم نا سمجھ تھے...... ان کی باتوں پر یقین ہی نہیں کرتے تھے...... بلکہ ان کا مذاق بھی اڑاتے تھے مگر اب سوچیں تو...... یقین بھی آتا ہے اور حیرانگی بھی ہوتی ہے کہ ہم اتنے نا سمجھ کیوں تھے......'' فیروز خان نے افسردگی سے کہا۔

''کیا...... وہ اللہ والے تھے؟'' امجد علی نے پوچھا۔

''یقیناً ہوں گے...... ان سے بڑھ کر نیک پورے گاؤں میں کوئی اور نہیں تھا......'' فیروز خان نے قطعیت سے جواب دیا۔

''کیا وہ زندہ ہیں یا مر گئے؟'' امجد علی نے پوچھا۔

''کئی سال پہلے وہ حج کرنے گئے اور وہیں مر گئے...... اور انہیں وہیں دفنا دیا گیا...... خوش قسمت تھے...... جنہیں وہاں کی مٹی نصیب ہوئی۔'' فیروز خان اپنی ہی لے میں بولا۔

''فیروز خان...... کیا تم کسی اور اللہ والے کو جانتے ہو......'' میں جب تک کسی ایسے انسان سے مل نہیں لیتا...... مجھے قرار نہیں آئے گا...... میں اپنے اندر بہت بے چینی محسوس کر رہا ہوں......'' امجد علی نے مضطرب ہو کر کہا۔

''نہیں صاب...... میں نے تو مولوی صاحب کے بعد ان جیسا کوئی دوسرا آدمی نہیں دیکھا......'' فیروز خان نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا

تو امجد علی نے آ و بھر کر مایوسی سے اس کی جانب دیکھا اور خاموش ہو گیا...... فیروز خان چند ثانیے اسے دیکھتا رہا اور پھر واپس کمرے سے باہر نکل گیا۔

''مولوی صاحب......'' امجد علی کے ذہن میں ایک شبیہہ ابھری...... قدرے ادھیڑ عمر...... مولوی چراغ دین...... اس کے گاؤں میں......

بہت علم والے نیک...... مذہبی اور روحانی شخصیت سمجھے جاتے تھے۔ اس کے والد کے قریبی دوست ہونے کی وجہ سے وہ اکثر ان کے گھر بھی آتے جاتے تھے مگر امجد ان دنوں انتہائی اکھڑ اور بد مزاج نوجوان تھا مولوی صاحب اور ان کی دینداری کو سخت ناپسند کرتا تھا۔ اس کے نزدیک دین محض چند نظریات کا نام تھا۔ ان نظریات کو اعتقاد بنا کر اندھادھند ان کی پیروی کرنا انتہائی حماقت کی بات تھی۔ اس کے والدین سیدھے...... سادھے...... اور پکے ایمان کے حامل مسلمان تھے...... امجد کے بدلتے ہوئے نظریات سے اس کا باپ یار محمد بہت خائف ہونے لگا تھا۔ ہر وقت دونوں میں تکرار اور بحث ہوتی رہتی۔ یار محمد تو غصے میں اسے کافر تک کہہ دیتا اور اس کی ماں دونوں کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتی۔ اس کے ماں باپ دن بھر زمیندار کے کھیتوں میں کام کرتے، ان کی حیثیت کمیوں کی سی تھی اور امجد علی انہیں دیکھ کر کڑھتا تھا۔ وہ بہت کو مپلیکس اپنے اندر لے کر جوان ہوا تھا...... ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کے اندر...... نفرت اور حسد کے جذبات پیدا ہونے لگے تھے...... جب سے وہ شہر میں...... اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے لگا تھا۔ اس کے نظریات مزید تیزی سے بدلنے لگے...... جب اس نے ایک پارسی لڑکی سے شادی کی تو اس کے ماں باپ کو شدید دھچکا لگا اور انہوں نے زندگی بھر اس سے نہ ملنے کا عہد کیا...... مگر اینا سے اس کی شادی ایک سال بھی نہ نبھ سکی اور دونوں میں علیحدگی ہو گئی۔ امجد انتہائی ڈپریشن میں تھا اور اس ڈپریشن میں اسے پھر والدین کی یاد ستانے لگی۔ وہ روتا ہوا والدین کے پاس آیا اور ان سے گڑگڑا کر معافی مانگی۔

''علم انسان کو سنوارتا بھی ہے اور بگاڑتا بھی ہے...... اور تیرے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔ اس نے تجھے سنوارا کم اور بگاڑا زیادہ ہے......''

اس کے باپ نے غصے سے کہا۔

''معلوم نہیں...... میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اینا اور میں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے پھر نجانے محبت کیسے نفرت میں۔''

''محبت کبھی نہیں بدلتی...... ہمیشہ بڑھتی ہے اور جو بدل جائے وہ محبت نہیں ہوتی تم دونوں میں محبت تھی ہی نہیں......'' یار محمد نے کہا۔

''یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں......؟'' امجد نے چونک کر پوچھا۔

''کیا...... تمہارے دل نے میری اس بات کو نہیں مانا...... سچ بتاؤ......'' یار محمد نے پوچھا تو امجد نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔

''بیٹا...... میں ان پڑھ ضرور ہوں مگر جاہل نہیں۔ میرے پاس علم نہیں مگر زندگی کا تجربہ ضرور ہے اور پروردگار نے عقل سمجھ بھی دی ہے...... تمہارے علم نے تمہیں سر پھرا بنا دیا ہے۔ تمہاری عقل پر پردے ڈال دیئے ہیں اور میری عقل کو رب پاک نے اپنے کرم سے پختہ بھی بنایا ہے اور تمام شک و شبے بھی دور کیے ہیں۔ میری عقل، یقین، ایمان واضح اور پختہ ہے...... تم جیسے لوگ بہت آسانی سے بھٹک سکتے ہو ہم جیسے نہیں۔ تو نے زندگی کا پہلا فیصلہ اپنی مرضی سے کیا اور اس کا انجام خود ہی دیکھ لیا...... اب ہمارے پاس کیا لینے آئے ہو؟ یار محمد نے خفگی سے کہا۔

''ابا جی...... میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا...... اینا اور میں...... شروع سے ساتھ ساتھ کالج اور یونیورسٹی میں پڑھتے رہے تھے۔'' اسی لئے تیرے دماغ میں فتور آتا گیا...... الٹی سیدھی باتیں کرتا تھا...... کبھی تجھے مذہب برا لگتا تھا، کبھی والدین...... اور تو نے تو اللہ کو بھی نہ چھوڑا...... اس کے بارے میں بھی اول فول بکتا رہا۔ بیٹا...... تیرے ساتھ ایسا ہی ہونا تھا...... مجھے یقین تھا...... ایک دن تو...... یونہی شکست کھا کر آئے گا۔'' یار محمد نے

سنجیدگی سے کہا تو امجد علی نے چونک کر باپ کی جانب دیکھا۔

''کیا آپ نے مجھے کوئی بددعا دی تھی......؟'' امجد نے حیرت سے پوچھا۔

''کیا......تو......دعا......اور بددعا پر یقین رکھتا ہے؟'' یار محمد نے معنی خیز انداز میں پوچھا تو امجد شرمندہ ہو گیا۔

''بیٹا...... تجھے ایک نیک ماں نے دودھ پلایا ہے......وہ صرف دودھ نہیں تھا اس میں اس کے ایمان کی شیرینی تھی اور میں نے تجھے حق حلال کی کمائی کھلائی تھی اور حق حلال کی کمائی میں جب محنت کا پسینہ شامل ہوتا ہے تو وہ عام رزق نہیں رہتا پاکیزہ رزق بن جاتا ہے......ہم نے تجھے پاکیزگی کا تحفہ دیا اور تم نے اس پاکیزگی کو ارد گرد پھیلی بناوٹ اور بے ایمانی سے خراب کرنا چاہا......مگر بھول گئے کہ جیت ہمیشہ حق سچ اور ایمان کی ہوتی ہے۔ جھوٹ اور بے ایمانی کبھی فتح یاب نہیں ہوتے...... یہ قدرت کا اٹل فیصلہ ہے......ہم نے تجھے اختیار دیا...... جو تو چاہتا ہے...... کر...... ہمارے روکنے سے تو کبھی باز نہ آتا......اور تو نے جو کیا......وہ دیکھ بھی لیا...... تجھے شکست ہی ہونی تھی۔'' محمد یار نے قطعیت سے کہا تو امجد نم آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا۔

''ابا...... میرے لئے دعا کریں......کہ......'' اور وہ بری طرح سسکنے لگا۔

''ماں باپ...... ہمیشہ اولاد کے لئے دعائیں ہی کرتے ہیں...... یہ تو اولاد ہوتی ہے جو ان سے بدگمان ہوتی ہے۔'' یار محمد نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تو اس کی ماں نے آگے بڑھ کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''ابا...... میں آپ کو اور اماں کو اپنے ساتھ شہر لے جانا چاہتا ہوں۔'' امجد نے شہر واپس جانے سے پہلے کہا۔

''یہ نا ممکن ہے......'' یار محمد نے قطعیت سے جواب دیا۔

''کیوں......؟'' امجد نے چونک کر پوچھا۔

''والدین کی عزت ان کے خود مختار رہنے میں ہے...... اولاد کو سہارا دینے کے بجائے جب وہ ان کا سہارا لینے کی کوشش کرتے ہیں تو بے عزت ہو کر رہ جاتے ہیں اور ہمیں اپنی عزت بہت پیاری ہے۔'' یار محمد نے قطعیت سے کہا تو امجد حیرت سے باپ کی طرف دیکھنے لگا۔

''اور سن...... ہمیں کبھی روپیہ پیسہ بھیجنے کی کوشش بھی نہ کرنا...... میرے ہاتھوں کو صرف محنت کی کمائی لینے کی عادت ہے۔'' یار محمد نے کہا۔

''ابا جی...... مجھے کوئی تو حق ادا کرنے دیجئے۔'' امجد نے آدھ بھر کر کہا۔

''ہمارے ایمان اور عزت کا بھرم رکھ لو...... یہی سب سے بڑا حق ہوگا۔'' یار محمد نے کہا...... امجد چونک کر باپ کی طرف دیکھنے لگا۔ اب کی بار باپ کی باتوں نے اسے اندر سے جھنجھوڑا تھا ورنہ اس نے کبھی انہیں اہمیت ہی نہیں دی تھی۔ وہ اس کی سمجھدار باتوں سے ہمیشہ جھنجھلا جاتا تھا اور...... اب وہ باتیں بہت ذو معنی لگنے لگی تھیں۔

زندگی گزرتی گئی......وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے بیرون ملک چلا گیا......آرکیالوجی کی فیلڈ میں اس نے بہت عزت اور شہرت کمائی۔ انٹرنیشنل یونیورسٹیز میں لیکچرز بھی دیتا، اپنے ملک کی مایہ ناز یونیورسٹی میں وہ ایک قابل استاد تھا۔ اس نے اپنی ایک کولیگ شیریں سے شادی کر لی......وہ اچھی بیوی تو ثابت ہوئی مگر دونوں اولاد کی نعمت سے محروم رہے۔ زندگی میں یہ ایک ایسی کمی تھی، جس نے شیریں کو اندر سے بہت کھوکھلا کر دیا تھا۔ ہر

وقت اس کا بی پی ہائی رہتا، نہ وہ فیلڈ میں جاتی اور نہ ہی گھر سے باہر نکلتی...... نہ کسی پراجیکٹ میں دل لگتا اور نہ ہی کسی ایکٹویٹی میں۔" امجد کے بہت سمجھانے کے باوجود بھی اس کا ذہن نہیں بدلا تھا اور امجد نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ وہ زیادہ تر اپنا وقت سٹڈی روم میں یا فیلڈ میں مختلف پراجیکٹس کی ریسرچ میں گزارتا تھا...... مہینوں گھر سے باہر رہتا...... اور گھر آتا تو شیریں کی اس میں عدم دلچسپی اسے اور بھی متنفر کر دیتی...... زندگی بہت روکھی اور بدمزہ تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رہنے میں مجبور تھے کیونکہ پراہلم دونوں میں ہی موجود تھے اور وہ اپنی اس محرومی اور کمی کا الزام ایک دوسرے کو بھی...... نہیں دے سکتے تھے۔ اس لئے دونوں مجبوراً ایک دوسرے کے ساتھ زندگیاں گزار رہے تھے۔ دونوں Speechless ہو گئے تھے، جیسے کہنے کو ان کے پاس کچھ نہیں رہا تھا۔ ایک دوسرے کو دیکھتے اور بس خاموش رہتے۔ امجد جو ہر شے کو قبول کرنے سے پہلے کئی بار سوچتا تھا اور عقلی و منطقی دلائل کے بعد کسی شے کو مانتا تھا، اب قدرت کے سامنے بے بس ہونے لگا تھا۔ اپنی محرومی اور بدمزہ زندگی کے شکوے وہ اندر ہی اندر کرتا نہ تھکتا تھا...... اللہ اور اس کا تعلق کبھی اچھا نہیں رہا تھا۔

"اسے...... اللہ نے پیدا کیا ہے...... ایک نیچرل پروسیس کے ذریعے اور بس...... جو...... خدا نہ تو انسان کی دعائیں پوری کرے اور نہ اس کی محرومیاں دور کرے...... اس خدا کی انسان کو کیا ضرورت ہے...... وہ ہے اور ایک دن مر جائے گا...... مٹی میں مل کر مٹی ہو جائے گا اور پھر اس کا نام و نشان نہیں رہے گا...... اور اس کی کہانی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گی...... اس کے نزدیک ہر انسان کی کہانی کا یہی انجام ہونا ہے۔ زندگی کے بعد موت اور پھر فنا...... انسان کہاں سے آتا ہے اور کہاں چلا جاتا ہے، کوئی نہیں جانتا...... کبھی کبھار زمین کی تہوں میں آثار اس کے ہونے کا پتا دیتے، مگر کوئی انسان فنا ہونے سے کیسے محفوظ رہ سکتا ہے......؟ جس کا جسم اسی سال گزرنے کے باوجود بھی فنا نہیں ہوا...... وہ شاید یہ دنیا ختم ہونے کے بعد بھی فنا نہیں ہو پائے گا...... زمین...... کی انتہائی گہرائی سے ملنے والی لاش نے امجد علی کے نہ صرف نظریات کو چیلنج کیا تھا بلکہ...... اسے اندر سے بھی جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا...... انسان...... انسان کی تاریخ...... اور...... انسان...... کے انجام کے بارے میں...... پروان چڑھنے والے تمام نظریات ایک ہی وار میں لڑکھڑا گئے تھے۔ اس کا مطلب ہے انسان کو 'فنا' بھی ہے اور 'بقا' بھی...... فانی انسان کو کیا شے لافانی بناتی ہے......؟ وہ کیا شے ہے جو اسے ابدیت عطا کرتی ہے......؟ ایسے تمام خیالات نے اسے ایسے بلا کر رکھ دیا تھا کہ بے مقصدیت میں معنویت پیدا ہونے لگی تھی...... شکوک وشبہات اور بے یقینی کی فضا میں ایک امید پیدا ہونے لگی تھی...... جس نے اسے ایسے دوراہے پر کھڑا کر دیا تھا...... جہاں صرف سوالات ہی سوالات تھے، تجسس اور شوق تھا، بے یقینی اور اضطراب بھی تھا......

اچانک مولوی چراغ دین کی یاد کے ساتھ والدین گاؤں اور اس سے وابستہ بہت سی یادیں اسے ستانے لگیں اور اس نے گاؤں جانے کا ارادہ کر لیا...... عرصہ دراز گزر چکا تھا...... اسے گاؤں گئے ہوئے...... کبھی کبھار ماں باپ کا خط آ جاتا اور وہ اپنی خیریت کا جواب دے دیتا یا پھر کبھی اچانک ہی انہیں ملنے چلا جاتا۔

☆

ٹرین کے سفر میں آج ہر شے اور ہر جگہ اسے ایک دوسری سے مختلف دکھائی دے رہی تھی...... یہاں تک کہ ایک پتھر اور درخت بھی دوسرے کے مشابہ نہیں تھا...... پھر مختلف شکلوں اور جسامت کے انسان کیسے ایک جیسے ہو سکتے ہیں...... لیکن انسانی اعضا تو ایک جیسے ہوتے ہیں اور وہ

ایک جیسے افعال سرانجام دیتے ہیں، اگر کوئی مشین ایک جیسا کام کرتی ہے تو اس کی پروڈکشن بھی ہمیشہ ایک جیسی ہوگی ......ایک جیسے کام کرنے والے انسانی اعضاء کی صلاحیتیں مختلف کیوں ہیں......؟

اور اس کے حق میں منطقی اور عقلی دلائل کیا دیے جا سکتے ہیں......؟

وہ بہت سوچتا رہا مگر اسے کوئی سرا نہیں مل رہا تھا......وہ بہت زیادہ الجھنے لگا تھا......اور بہت سوچنے سے اس کا دماغ بھی تھکنے لگا تھا۔

ٹرین چھوٹے چھوٹے گاؤں کے ریلوے اسٹیشنز پر بھی رک رہی تھی اور سفر طویل ہوتا جا رہا تھا۔ مسافروں کو کوفت ہونے لگی۔ امجد کو کوئی خبر نہیں تھی کہ اس کے سامنے والی سیٹ پر کون بیٹھا تھا......اور کون اسے گہری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

شام ہو رہی تھی اور سورج بھی سارے دن کا طویل سفر طے کر کے اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھا اور اس کے زرد چہرے پر تھکاوٹ کے آثار نمایاں تھے۔ اس کی روشنی میں وہ جوش اور دم خم نہیں رہا تھا جو صبح اور دوپہر کو تھا......رفتہ رفتہ شام کے ملگجے سائے ہر جانب پھیلنے لگے ٹرین انتہائی تیز رفتاری سے سفر طے کر رہی تھی ......امجد کا دل بہت بے چین ہو رہا تھا وہ ریل کے ساتھ ساتھ اور پھر اچانک راستہ بدلنے والی پٹریوں کی جانب بغور دیکھتا رہا۔

''ذرا سا راستہ بدلنے سے منزل بدل جاتی ہے......'' اس نے ٹرین کو اپنی پٹری بدلتے دیکھ کر سوچا۔

''انسان کی اصل منزل اور مقام کیا ہے......؟ اتنے مختلف نظریات عقائد اور خیالات رکھنے والے انسانوں کی منزل ایک ہی کیسے ہو سکتی ہے......؟ وہ اپنی سوچوں میں بری طرح ڈوب گیا تھا۔ رات گہری ہونے لگی......ہر طرف گہری تاریکی چھانے لگی ......ٹرین ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر چند منٹوں کے لئے رکی، اکا دکا مسافر اس میں سوار ہوئے اور پھر ٹرین چلنے لگی......ٹرین میں مکمل خاموشی تھی، کسی کسی وقت اچانک کسی بچے کے رونے کی آواز یا کسی کی سرگوشیوں کی آوازیں ٹرین کے سکوت میں دراڑیں ڈال دیتیں اور اس سے خاموش لوگوں کے آرام میں خلل آتا۔

اچانک برق رفتار ٹرین ایک جھٹکے سے رک گئی، سب حیران رہ گئے۔ ہر طرف گہرا اندھیرا چھایا تھا، ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا......دونوں جانب وسیع و عریض کھیت تھے۔ شاید سامنے سے آنے والی ٹرین کا کراس تھا یا کوئی اور بات تھی......کئی مسافر جلدی سے نیچے اترے تا کہ ٹرین کے اچانک رکنے کی وجہ معلوم کر سکیں۔

''ٹرین کے انجن میں خرابی ہو گئی ہے......یہ خرابی کب دور ہوگی......معلوم نہیں۔'' مسافر بڑبڑاتے ہوئے ٹرین ڈرائیور کو کوستے تو کوئی ریلوے انتظامیہ کو......اب ٹرین کب چلے گی......کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا......''انتظار''......ایک ایسا عذاب تھا جو سب کو مضطرب کر رہا تھا۔ انتظار کی تکلیف دہ کیفیت سے گزرنا ان کے لئے مشکل ہو رہا تھا۔ بچے چیخنے چلانے لگے۔ ہر طرف گرمی اور حبس تھا، کسی وقت ہوا کا جھونکا چلتا......تو لوگ سکھ کا سانس لیتے......جوں جوں وقت گزر رہا تھا لوگوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا......کچھ تو گالیاں بکنا شروع ہو گئے......کچھ آپس میں ہی ایک دوسرے سے الجھنے لگے......عجیب بدمزگی پیدا ہو رہی تھی......سب بے بس تھے۔ پوری ٹرین کے لوگ مجبور بیٹھے تھے، کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

''یا اللہ! کوئی معجزہ ہی دکھا دے۔'' ایک عورت بلند آواز سے بولی تو امجد نے چونک کر اس آواز کی جانب دیکھنا چاہا مگر اسے اندھیرے

میں کچھ نظر نہ آیا۔

''معجزہ......'' اس کے ذہن میں اس لفظ کی بازگشت ہونے لگی۔

لوگ ہاتھ اٹھا اٹھا کر دعائیں مانگنے لگے مگر وہ خاموش مضطرب سا بیٹھا رہا۔ جوں جوں رات گزر رہی تھی لوگوں کا اضطراب بڑھ رہا تھا۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ڈرائیور کو مار ہی ڈالیں......کوئی خبر لاتا کہ انجن ٹھیک ہونے میں تھوڑا وقت لگے گا، کوئی آ کر بتاتا اب ٹرین صبح ہی چلے گی......''صبح'' کے بارے میں سن کر سب لوگ بڑبڑانے لگتے......کوسنے اور گالیاں بکنے لگتے......

ٹرین ساری رات بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ کبھی انہیں رات کی تاریکی خوفزدہ کرتی تو کبھی جانوروں کی آوازیں ڈرانے لگتیں......کبھی ڈاکوؤں اور لٹیروں کا خطرہ انہیں پریشان کرنے لگتا......عجیب سی بے بسی اور ویرانی کا منظر تھا۔ ڈرائیور پرامید تھا کہ سامنے سے آنے والی کسی ٹرین کا ڈرائیور ان کی مدد کرے گا مگر رات بھر کوئی ٹرین نہ آئی۔ یہ بات سب کے لئے حیران کن تھی کہ رات بھر کوئی ٹرین ان کے پاس سے نہیں گزری تھی۔ ساری رات بہت پریشانی میں گزری......لوگ پریشان ہو کر نیند سے بوجھل آنکھوں کے ساتھ ادھر ادھر پڑے تھے......کچھ گہری نیند میں خراٹے لے رہے تھے......کچھ نیند کے باوجود بھی نہیں سو پا رہے تھے اور کچھ بیٹھے بیٹھے اونگھ رہے تھے۔

صبح کا اجالا نمودار ہوتے ہی ٹرین میں ایک بھگدڑ سی مچ گئی......جو بھی خبر سنتا خدا کا شکر ادا کرتا کہ ایک تو خبر سن کر فوراً سجدہ ریز ہو گئے۔ دریا پر پل ٹوٹا ہوا تھا، رات کو آنے والی ٹرین دریا میں گر گئی تھی اور بہت سے لوگ دریا میں ڈوب کر مر گئے تھے، جو بھی سنتا اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے اور وہ ہاتھ باندھ کر خدا کا شکر ادا کرتا۔

''یہ تو بہت بڑا معجزہ ہوا ہے......واقعی......معجزہ اسے ہی کہتے ہیں۔'' امجد کی سامنے والی سیٹ پر بیٹھے ایک ادھیڑ عمر ویل ڈریسڈ آدمی نے انتہائی شستہ لہجے میں کہا تو امجد نے چونک کر انہیں دیکھا۔

''آپ کیا کرتے ہیں؟'' امجد نے پوچھا۔

''میں پروفیسر ہوں۔ یونیورسٹی میں پڑھاتا ہوں۔'' اس شخص نے جواب دیا۔

''کیا پڑھاتے ہیں۔'' امجد نے پوچھا۔

''فلسفہ......مگر سائیکالوجی، اسلامیات اور اردو میں بھی......میں نے ماسٹرز کر رکھا ہے۔'' اس شخص نے جواب دیا۔

''آپ کا نام......؟'' امجد نے پوچھا۔

''شمس مظہری......'' وہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

آپ ''معجزہ'' کسے کہتے ہیں؟'' امجد نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

''جسے دیکھ کر عقل حیران رہ جائے۔'' شمس مظہری نے جواب دیا۔

''معجزے کا تعلق کس سے ہوتا ہے؟'' امجد نے پھر پوچھا۔

''اللہ سے......'' اس شخص نے جواب دیا۔

''اتفاقات اور حادثات بھی تو معجزے سے جنم لے سکتے ہیں۔'' امجد نے پوچھا۔

''کیا مطلب......؟'' شمس نے حیرت سے پوچھا۔

''ممکن ہے، جس کو آپ معجزہ سمجھ رہے ہوں وہ دوسروں کے لئے عام سی بات ہو......اس کی کوئی فطری یا سائنسی وجوہات بھی تو ہو سکتی ہیں......'' امجد نے جواب دیا۔

''یعنی کہ آپ معجزے کے باطنی اور روحانی پہلو سے انکار کر رہے ہیں۔'' شمس مظہری نے پوچھا۔

''میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ جو بات آپ کے لئے معجزہ ہے...... ممکن ہے میرے لئے نہ ہو۔'' امجد نے کہا۔

''کیا آپ اس ٹرین کے رکنے کی سائنسی وجہ یعنی اس کے انجن کی کوئی خرابی بتا کر مطمئن ہونا چاہتے ہیں ......ٹرین کے انجن کا اچانک خراب ہونا......اور یوں ادھر ٹھہر جانا......اور ان سب مسافروں کا بچ جانا معجزہ نہیں...... بلکہ ایک قدرتی وجہ ہے۔'' شمس مظہری نے حیرت سے پوچھا۔

''شاید......'' امجد نے جواب دیا۔

اگر ٹرین کا انجن اسٹیشن پر ہی خراب ہو جاتا تو کوئی اس میں سوار نہ ہوتا...... اور یوں اندھیرے میں ٹرین کو کھڑا کر کے لوگوں کو اب اس بات کا احساس دلانا کہ آگے سفر کرنا ان کے لئے کتنا نقصان دہ تھا......اور اب ان کا شکر ادا کرنا...... معجزے کے روحانی پہلو کو خود بخود ہی ثابت کر رہا ہے...... معجزہ اپنا آپ خود منواتا ہے......'' پروفیسر شمس نے جواب دیا۔

''کیا آپ معجزوں کے قائل ہیں؟'' امجد نے پوچھا۔

''ہاں......اس لئے کہ معجزہ اللہ کی ذات سے وابستہ ہے......اور انسان بھی تو اس کائنات کا معجزہ ہے۔'' پروفیسر شمس نے کہا۔

''انسان...... معجزہ کیسے ہوا؟'' امجد نے حیرت سے پوچھا۔

''ایک جیسی جسامت، اعضاء اور ظاہری خدوخال رکھنے والے انسان اندر سے کتنے پیچیدہ اور مختلف ہیں......ایک شے کی مختلف شکلیں ہونا......اس کے اندر خوبیاں......اور خامیاں ہونا......معجزہ نہیں تو اور کیا ہے...... یوں کہہ لیں قدرت نے پوری کائنات کو انسان کے سانچے میں ڈال دیا ہے۔ یوں جیسے دریا کو اک کوزے میں بند کر دیا ہے......انسان...... پوری کائنات اپنے اندر لئے ہوئے ہے......'' پروفیسر شمس نے کہا تو امجد حیرت سے ان کی باتیں سننے لگا۔

''اور......اللہ......خود کیا ہے؟'' امجد نے جان بوجھ کر پوچھا۔

''کیا آپ کو معلوم نہیں؟'' پروفیسر شمس نے پوچھا۔

''میرا علم آپ کے علم سے بہت مختلف ہے۔'' امجد نے جواب دیا۔

''آپ کا علم اس بارے میں کیا کہتا ہے؟'' پروفیسر شمس نے پوچھا۔

''ایک طاقت جس نے اس کائنات اور انسان کو بنایا ہے......اور......'' امجد الجھتے ہوئے بولا......

''بس اور کچھ نہیں؟'' پروفیسر شمس نے حیرت سے پوچھا۔

''اور......کیا......؟'' امجد نے حیرت سے پوچھا۔

''کیا آپ نے اس کو کہیں اور محسوس نہیں کیا؟''

''مثلاً......کہاں؟'' امجد نے پوچھا۔

''اپنے اندر......بہت اندر......''

''نہیں......'' امجد نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

''کبھی بھی نہیں......؟''

''نہیں......''

''دل کے دھڑکنے......دماغ کے سوچنے......پیٹ کی طلب اور آنکھوں کے نور میں......کہیں بھی نہیں۔'' پروفیسر شمس نے حیرت سے پوچھا۔

''یہ سب کچھ تو جسمانی اعضاء کے فطری اور قدرتی عمل ہیں......اگر یہ اپنے افعال سرانجام نہیں دیں گے تو جسم کو ان کی کیا ضرورت ہو گی۔'' امجد نے جواب دیا۔

''کیا آپ اندر سے ویسے ہیں......جیسا آپ باہر سے دکھائی دیتے ہیں۔'' پروفیسر شمس نے پوچھا۔

''شاید......ہاں......شاید......نہیں۔'' امجد نے بے چینی سے الجھتے ہوئے جواب دیا۔

''مسٹر......'' پروفیسر شمس نے کچھ کہنا چاہا۔

''امجد......'' امجد جلدی سے بولا۔

''مسٹر امجد......آپ کو اپنے......آپ کو سمجھنے کی ضرورت ہے......آپ کیا ہیں......؟ آپ کو خود ہی معلوم نہیں......آپ کیا کر سکتے ہیں......اور آپ کی فیلنگز کیا ہیں......آپ کا کس کے ساتھ کیا تعلق ہے اور کیسا تعلق ہے؟ آپ کو اپنے بارے میں سب کچھ جاننے کی ضرورت ہے......اور جب آپ اپنے آپ کو جان لیں گے......تو آپ کو اپنے ہر سوال کا جواب مل جائے گا۔'' پروفیسر شمس مظہری نے کہا۔

''کیا آپ اپنے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں؟'' امجد نے معنی خیز انداز میں سوال کیا۔

''سب کچھ نہیں......مگر بہت کچھ۔'' پروفیسر شمس نے جواب دیا۔

''آپ سب کچھ کیسے جان پائے ہیں؟'' امجد نے سوال کیا۔

''علم ،مطالعے اور اپنے ذاتی تجربے سے......باہر کے واقعات جب آپ کے باطن پر یعنی اندر کے انسان پر اثر انداز ہوتے ہیں تو اس اندر کے انسان میں ایسی تبدیلیاں آتی ہیں جو انسان صرف خود محسوس کر سکتا ہے نہ کسی کو بتا سکتا ہے نہ کوئی اسے جان پاتا ہے......یہ قدرت کا بہت

عجیب و غریب نظام ہے..... اس لئے میں انسان کو اس کائنات کا معجزہ کہتا ہوں..... انسان دنیا میں اللہ کا ایک عظیم شاہکار ہے۔" پروفیسر شمس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"شاہکار..... اور..... انسان۔" امجد نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں....."

"میں نہیں مانتا....." امجد نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

"کس کو.....؟" پروفیسر نے حیرت سے پوچھا۔

"انسان..... کبھی بھی شاہکار نہیں ہو سکتا..... " امجد نے جواب دیا۔

پروفیسر مظہری خاموش ہو گئے۔

تمام نوری مخلوق چونک گئی..... ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی..... بڑی سرکار کس قدر ذوق و شوق سے انسان کو اپنا شاہکار بتا رہی تھی اور انہیں ہر طرح سے قائل کرنا چاہتی تھی..... اور جس انسان کو شاہکار بتایا جا رہا تھا..... وہی انسان اپنے آپ کو شاہکار ماننے سے انکار کر رہا تھا، کیسا عجیب مرحلہ آ گیا تھا۔ انہوں نے چونک کر سفید روشنی کی جانب دیکھا اور حیرت سے دیکھتے ہی رہ گئے۔ سفید روشنی بدستور روشن تھی..... بہت مطمئن اور پرسکون..... وہ اور زیادہ مضطرب ہونے لگے۔

پل ٹوٹا ہوا تھا..... ٹرین آگے نہیں جا سکتی تھی اور انجن بھی ٹھیک نہیں ہو رہا تھا۔ ایک اسپیشل ٹرین ریلوے اسٹیشن سے ان مسافروں کو لینے کے لئے بھیجی گئی..... اور تمام مسافر تتر بتر ہو گئے۔ پروفیسر مظہری کہاں چلے گئے..... وہ دوبارہ نظر نہ آئے۔ امجد انہیں ادھر ادھر دیکھتا اور تلاش کرتا رہا مگر وہ کہیں دکھائی نہ دیئے..... ان کی باتوں نے اس کے اندر سوالات کا ایک اور سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ پروفیسر شمس مظہری کی باتوں میں الجھا ہوا اپنے گاؤں کی جانب چل دیا۔

پورا گاؤں امجد سے ملنے آ رہا تھا۔ سب اسے زندہ اور صحت یاب دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ اس کے والدین عزیز و اقارب، دوست و احباب سب اسے ملتے اور دعائیں دیتے، وہ والدین کا اکلوتا بیٹا تھا اور اس کے والدین بہت عمر رسیدہ تھے۔ جن کی زندگی کا مقصد صرف امجد کے لئے ہر لمحہ دعائیں کرنا تھا..... وہ اسے دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے۔ ماں اس کی بلائیں لیتی نہ تھک رہی تھی..... باپ اسے زمین پر پاؤں نہیں رکھنے دے رہا تھا اور وہ اتنی شدید محبت سے جھنجھلانے لگتا مگر محبت کا لمس اندر ہی اندر مطمئن کرتا، اس کے ماں باپ شکر ادا کرتے نہ تھک رہے تھے کہ وہ موت کے منہ سے بچ کر آیا تھا..... اس واقعے نے اور پروفیسر شمس مظہری کی گفتگو نے بھی اس کے خیالات اور نظریات کو اپنے انداز سے جھنجھوڑا تھا..... وہ خاموش رہتا اور اس کے والدین اس کی خاموشی کا اور ہی مطلب سمجھ رہے تھے۔

"امجد..... موت سے خوفزدہ ہو گیا ہے، اس لئے خاموش رہتا ہے۔ یار محمد..... میں نے منت مان لی ہے، جس روز امجد کی خاموشی ختم ہو گی اور وہ ہنس بول کر باتیں کرے گا تو میں اسی روز شاہ بابا کے مزار پر جا کر حاضری دوں گی اور نیاز چڑھاؤں گی۔" اس کی ماں نے ایک روز شوہر سے

سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

''تو......تو......شاہ بابا کے مزار پر جانے کے بہانے ڈھونڈتی رہتی ہے......ذرا سی خوشی کی خبر ملتی ہے اور تو وہاں پہنچ جاتی ہے۔'' یار محمد نے مسکرا کر کہا۔

''سچ......وہاں جا کر مجھے بڑا سکون اور خوشی ملتی ہے۔'' امجد کی ماں بولی۔

''اور تیرا بیٹا......نہ مزاروں کو مانتا ہے اور نہ اللہ والوں کو۔'' یار محمد نے جواب دیا۔

''وہ تو باؤلا ہے......اور اب کی بار میں یہی دعا کروں گی کہ اللہ اس کو ہدایت دے اور اس کی عقل پر پڑے پردوں کو ہٹا دے۔'' امجد کی ماں نے کہا تو یار محمد مسکرانے لگا۔

امجد ہر وقت ......ایک معمولی کمرے میں چارپائی پر اٹھتا......بیٹھتا......کروٹیں بدلتا ہوا اپنی سوچوں میں گم رہتا۔

''تم ہر وقت کیا سوچتے رہتے ہو......؟'' گھر سے باہر جاؤ......یار دوستوں سے ملو......ان سے باتیں کرو......یوں لیٹ لیٹ کر بیمار ہو جاؤ گے......'' یار محمد نے ایک روز اس کے قریب بیٹھ کر کہا۔

''ابا جی......کیا مولوی چراغ دین زندہ ہیں؟'' امجد نے اچانک پوچھا۔

''ہاں......ہاں......کیوں نہیں......مگر بہت بزرگ ہو چکے ہیں......تم کیوں پوچھ رہے ہو؟'' یار محمد......نے حیرت سے پوچھا۔

''میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔'' امجد نے جواب دیا۔

''کیوں......؟'' یار محمد نے چونک کر پوچھا۔

''کچھ دیکھنا چاہتا ہوں......'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''کیا......؟'' یار محمد نے حیرت سے پوچھا۔

''آپ کے خیال میں کیا مولوی صاحب اللہ والے ہیں؟'' امجد نے پوچھا۔

''اللہ والے......؟'' یار محمد نے یوں چونک کر پوچھا، جیسے اسے جھٹکا لگا ہو۔

''ہاں......اللہ والے۔'' امجد نے پھر پوچھا۔

''تم آج کیسی باتیں کر رہے ہو؟ کیا کوئی خواب دیکھا ہے؟'' یار محمد نے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

''نہیں......کسی سے سنا تھا......مگر یقین نہیں آیا......اب مل کر دیکھنا چاہتا ہوں، کہ سچ کیا ہے۔'' امجد نے کہا۔

''اوہ......تو یہ بات ہے۔'' مجھے بھی حیرت ہو رہی تھی کہ تم کیسے ایسی باتوں پر یقین کرنے لگے۔''

''کیا مطلب......؟'' کیا میں......؟ امجد نے حیرت سے پوچھا۔

کسی بات کو ماننے کے لئے یقین اور یقین کرنے کے لئے......ایمان......چاہئے اور تمہارا تو ایمان ہی ڈولتا رہتا ہے۔ کبھی کسی بات کو

مانتے ہو..... تو کبھی خود ہی جھٹلا دیتے ہو..... " یار محمد نے ہنستے ہوئے کہا تو اسجد شرمندہ ہو گیا۔

" میرے ساتھ کبھی کچھ ایسا بھی تو نہیں ہوا..... جو میرے ایمان کو مضبوط کر سکے۔ اسجد نے آہ بھر کر کہا..... ایمان..... یونہی..... نہیں ملتا.......

ایمان تب ہی ملتا ہے جب دل روشن اور آنکھیں پر نور ہوں..... جب ہم ہر بات کو جان کر اور مان کر انکار کرتے جائیں تو ایمان کہاں سے جنم لے گا۔

پہلے رک کر کسی بات کے بارے میں سوچو تو سہی..... پھر آگے بڑھو..... اسجد علی..... میں نے تمہاری سوچوں پر کبھی پابندی نہیں لگائی..... تم نے

جو کچھ بھی سوچا..... میں نے تجھے روکا نہیں..... تم نے جو کچھ کرنا چاہا..... اس سے بھی نہیں روکا..... اب کی بار تم کیا سوچ کر آئے ہو۔" یار محمد نے پوچھا۔

" کچھ نہیں..... بس پریشان ہوں..... " اسجد نے آہ بھر کر کہا..... یار محمد نے پوچھا۔

" کیسی پریشانی ہے.....؟ "

" یہی تو سمجھ میں نہیں آ رہا..... بہت اضطراب ہے..... میرے اندر..... مولوی صاحب سے کچھ پوچھ کر اس اضطراب کو دور کرنا چاہتا

ہوں۔" اسجد علی نے جواب دیا۔

ٹھیک ہے..... میں مولوی صاحب کو کہوں گا وقت نکال کر گھر تشریف لائیں، مسجد میں تم ایسی باتیں نہیں پوچھ سکو گے..... ہر وقت ہجوم ان

کے گرد بیٹھا ہوتا ہے" یار محمد نے کہا تو اسجد علی خاموش ہو گیا اور یار محمد کمرے سے باہر نکل گیا.....

اسجد کی ماں صبح سویرے ہی شاہ بابا کے مزار پر جانے کی تیاری میں مصروف تھی..... اسجد کے ایک دو دیرینہ دوست اتفاق سے گاؤں آئے

تھے اور اسجد ان کے ساتھ..... قدرے مصروف تھا۔ ایک دو بار کھیتوں میں بھی چلا گیا اس کا بدلا ہوا مزاج دیکھ کر اس کی ماں قدرے خوشی محسوس کر رہی

تھی اور اسی خوشی مین وہ مزار پر نیاز چڑھانے جا رہی تھی۔

" اسجد بیٹا..... ہم دونوں شاہ بابا کے مزار پر جا رہے ہیں..... تم گھر پر ہی رہو گے یا باہر جانے کا پروگرام ہے۔" اسجد کی ماں نے پوچھا۔

" گھر پر ہی رہوں گا..... " اسجد نے جواب دیا۔

" اگر گھر پر ہی رہنا ہے تو ہمارے ساتھ چلو..... شاہ بابا کے مزار پر جانے سے دل کو بہت سکون ملتا ہے..... میں تو کہتی ہوں..... چل

ہمارے ساتھ۔" اسجد کی ماں نے کہا۔

" جن باتوں کو میرا دل نہیں مانتا..... میں وہ نہیں کرنا چاہتا..... " اسجد نے کہا تو اس کی ماں اس کا جواب سن کر خاموش ہو گئی۔ دونوں کے

جانے کے بعد..... اسجد اپنے کمرے میں سونے کے لئے چلا گیا۔

دروازے پر دستک ہوئی تو وہ جھنجلا کر اٹھا اور دروازہ کھولنے چلا گیا..... دروازہ کھولا تو سامنے مولوی چراغ دین کھڑے تھے۔ انتہائی

بوڑھے ہو چکے تھے..... سفید داڑھی کافی لمبی ہو چکی تھی اور جسم پہلے سے بھی زیادہ لاغر اور کمزور ہو چکا تھا۔ اسجد نے بہت مشکل سے انہیں پہچانا۔

" السلام علیکم مولوی صاحب۔" اسجد بمشکل بولا۔

" وعلیکم السلام..... کیسے ہو بیٹا..... یار محمد کہاں ہے..... بہت اصرار کر رہا تھا کہ گھر آؤں..... آج تھوڑا سا وقت ملا تو چلا آیا ہوں۔" مولوی

صاحب نے کہا۔

''اماں اور ابا تو شاہ بابا کے مزار پر حاضری دینے گئے ہیں...... آپ اندر تشریف لائیے۔'' امجد نے انہیں اندر آنے کو کہا تو مولوی صاحب اس کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوئے۔

امجد نے ایک کرسی آگے کی اور انہیں عزت سے بٹھایا۔

''یار محمد بتا رہا تھا تم کچھ پریشان ہو اور مجھ سے ملنا چاہتے تھے...... خیریت تو ہے۔'' مولوی صاحب نے پوچھا۔

''ہاں...... الجھ سا گیا ہوں...... کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا...... حقیقت کیا ہے؟'' امجد علی بولا۔

''کیا مطلب......؟'' مولوی صاحب نے پوچھا۔

''مولوی صاحب...... انسان کس شے سے بنا ہے؟''

''مٹی سے......'' مولوی صاحب نے جواب دیا۔

''مٹی سے...... یا...... نطفے سے......؟'' امجد نے پوچھا۔

''نطفے سے وہ جنم لیتا ہے...... اور مٹی سے تخلیق ہوا ہے...... جیسا کہ اللہ نے فرمایا ہے'' اور انسان کی پیدائش کو مٹی سے شروع کیا پھر اس کی نسل خلاصے یعنی حقیر پانی (نطفے) سے کی پھر اسے درست کیا پھر اس میں اپنی طرف سے روح پھونکی اور تمہارے کان آنکھیں اور دل بنائے مگر تم بہت کم شکر کرتے ہو۔ (السجدہ...... 9-7)

''مولوی صاحب...... کیا یہ بات الجھن پیدا نہیں کرتی کہ...... پہلے آدم کے پتلے کو مٹی سے بنا کر فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور پھر باقی نسل انسانی کو نطفے سے تخلیق کیا، پھر آدم کو مٹی کا پتلا بنا کر پیش کرنے کا کیا مقصد تھا......؟'' امجد نے پوچھا۔

''بیٹا...... کیسی باتیں کر رہے ہو...... خدا قادر مطلق ہے...... وہ جو چاہتا ہے...... پیدا کرتا ہے اور...... آدم کا پتلا مٹی سے بنا کر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کرنے کا مقصد یہ تھا کہ انسان کی اُن پر برتری ظاہر کرنی تھی جبکہ نطفے سے پیدا ہونے والا انسان مختلف مراحل میں سے گزر کر پہلے ایک بچہ بنتا ہے اور پھر اس کی ماں اسے جنم دیتی ہے...... نطفے سے جنم لینے والے بچے کو کس طرح فرشتوں کے سامنے پیش کیا جا سکتا تھا...... اللہ کی حکمتیں ہر شے میں پوشیدہ ہوتی ہیں...... انسان صرف سوچ سکتا ہے...... اس کے رازوں تک رسائی اس کے بس میں نہیں......'' مولوی صاحب نے قطعیت سے کہا۔

''مولوی صاحب...... کیا اللہ والے بھی اللہ کے رازوں تک رسائی نہیں کر پاتے؟'' امجد نے اچانک پوچھا تو مولوی صاحب نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

''اللہ کے سب بندے...... اللہ والے ہی ہوتے ہیں۔'' مولوی صاحب نے جواب دیا۔

''کیا...... اللہ والے کوئی خاص اور اس کے بہت قریب ہوتے ہیں اور آپ جیسے...... اور میری طرح کے...... اس کو ماننے والے......

دونوں اللہ والے ہی ہیں۔" امجد نے معنی خیز انداز میں سوال کیا۔

مولوی صاحب اس کا سوال سن کر ایکدم چونکے......اور ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گئے۔

"مولوی صاحب......آپ تو بہت نیک ہیں......عبادت گزار ہیں......اور......میں تو بہت گنہگار ہوں......نہ کبھی ڈھنگ سے اس کی عبادت کی ہے......اور نہ ہی اس پر ویسا ایمان رکھتا ہوں......جیسا آپ اس پر ایمان رکھتے ہیں۔" امجد نے پوچھا۔

"میاں......تم کیوں الجھی الجھی باتیں کر رہے ہو، خود بھی الجھ رہے ہو......مجھے بھی الجھا رہے ہو......" مولوی صاحب نے کہا تو امجد ان کی بات سن کر حیران ہو گیا اور گہری سانس لی۔

"مولوی صاحب آپ تو علم والے ہیں ......آپ بتایئے اللہ کی حقیقت کیا ہے؟" امجد نے کہا تو وہ پھر چونکے۔

"کیا تم نہیں جانتے کہ وہ کون ہے اور کیا ہے......؟ وہ ہم سب کا خالق ہے......اس نے انسان کو پیدا کیا ہے ......اور ساری کائنات کا خالق و مالک ہے......ہر شے اس کے دائرہ اختیار میں ہے......اس نے ہر چیز انسان کے لئے بنائی ہے......وہ فرماتا ہے۔

"میں نے سورج اور چاند کو تمہارے لئے کام پر لگا دیا اور دونوں (دن، رات) ایک دستور پر چل رہے ہیں اور رات اور دن کو بھی تمہاری خاطر کام میں لگا دیا، جو کچھ تم نے مانگا، سب میں نے تمہیں عطا کیا اور اگر خدا کے احسان گننے لگو تو تم شمار نہ کر سکو گے۔" (ابراہیم (34-33)) مولوی صاحب نے کہا تو امجد نے گہری سانس لے کر ان کی جانب دیکھا۔

"اور......انسان کیا ہے......؟" امجد نے پوچھا۔

"اللہ کا بندہ، زمین پر اس کا نائب......" مولوی صاحب نے مطمئن انداز میں جواب دیا۔

"اللہ اور انسان کا تعلق کیا ہے......؟" امجد نے کہا

"خالق اور مخلوق کا......معبود اور عبد کا......اللہ نے انسان کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کرے......

"کیا انسان صرف خدا کا نائب ہے......اور کچھ نہیں......؟" امجد نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"میاں......کیا تم اس بات کو جھٹلا رہے ہو......جس کا ذکر وہ خود کرتا ہے۔"

"اور وہی تو ہے جس نے تمہیں زمین میں اپنا نائب بنایا اور ایک کے دوسرے پر درجے بلند کئے تاکہ اس نے جو کچھ تمہیں بخشا ہے، اس میں تمہاری آزمائش کرے۔" (الانعام-166)

کیسی آزمائش......آپ تو کہہ رہے تھے کہ "اللہ نے انسان کو عبادت کے لئے پیدا کیا ہے اور اب کہہ رہے ہیں کہ آزمائش کے لئے......مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا؟" امجد نے حیرت سے پوچھا۔

"لگتا ہے تم نے صرف علم پڑھا ہے......کسی رٹو طوطے کی طرح......علم کو سمجھا نہیں......یہ دنیا اور اس کی زندگی انسان کے لئے بہت بڑی آزمائش ہے۔ خیر و شر کی آزمائش اگر انسان اللہ کا حکم مانتے ہوئے نیکی کا راستہ اختیار کرتا ہے تو یہ اس کی آزمائش ہے۔ خیر کے راستے پر چلنا بہت

مشکل ہے، قدم قدم پر رکاوٹیں...... اور تکالیف ہیں۔'' اللہ فرماتا ہے:

''اور ہم نے انسان کو تکلیف کی حالت میں رہنے والا بنایا ہے...... کیا وہ خیال کرتا ہے کہ اس پر کوئی قابو نہیں پائے گا...... بھلا ہم نے اسے دو آنکھیں نہیں دیں...... زبان اور دو ہونٹ نہیں دیے...... اور اس کو دونوں راستے خیر اور شر کے دکھا دیے۔ (البلد 10-4)

''مولوی صاحب...... کیا واقعی ہی انسان کو...... کسی قسم کا کوئی اختیار دیا گیا ہے؟'' اسجد نے پوچھا۔

''تم کہنا کیا چاہتے ہو......؟'' مولوی صاحب نے پوچھا۔

''میں تو سمجھتا ہوں کہ انسان بہت بے بس ہے، کچھ نہیں کر سکتا...... انسان اپنی تقدیر کے ہاتھوں مجبور ہے۔'' اسجد نے جواب دیا۔

''بالکل بھی نہیں...... تقدیر دعا سے بدل سکتی ہے...... اور انسان کو اللہ نے عقل سلیم عطا کی ہے...... اسے یہ شعور دیا ہے کہ کیا اچھا ہے اور کیا بُرا اگر وہ اچھائی کو بہتر سمجھ کر اسے اپناتا ہے تو وہ ہدایت پر ہے...... کامیابی اور فلاح اس کا مقدر ہے...... اگر برائی اختیار کرتا ہے اور شر کے راستے پر چلتا ہے تو اس کا نتیجہ خسارہ ہے اور انسان نقصان میں رہتا ہے۔'' مولوی صاحب نے جواب دیا۔

''انسان کی فطرت کیا ہے...... وہ کس بنا پر خیر یا شر کو منتخب کرتا ہے......؟'' اسجد نے پوچھا۔

''انسان فطرتاً کمزور، جھگڑالو، جلد باز اور ناشکرا ہے...... مگر قدرت نے اسے فطرت سلیمہ پر پیدا کیا ہے...... یعنی نیک فطرت پر...... اس کی سرشت میں خیر اور شر دونوں ہیں...... جب خیر غالب آتا ہے تو وہ نیکی کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور شر غالب آنے پر وہ شیطانی راستوں پر چلتا ہے۔'' مولوی صاحب نے جواب دیا۔ مولوی صاحب کی باتیں سن کر اسجد کے دل میں عجیب سی بے اطمینانی پیدا ہونے لگی اور وہ خاموش ہو گیا۔

''شاید تمہیں میری باتیں پُر اثر نہیں لگیں، جو تمہارے دل کو متاثر کرتیں؟'' مولوی صاحب نے پوچھا۔

مولوی صاحب نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا۔

''میاں مجھے تمہاری آنکھوں میں بے یقینی دکھائی دے رہی ہے میں نے تو تمہیں جو کچھ بھی بتایا ہے کتاب اللہ سے سُنایا ہے کیا تمہیں ان باتوں پر یقین نہیں آیا؟'' مولوی صاحب نے پوچھا۔

''بات یقین کی نہیں۔ دل کی کیفیت بدلنے کی ہے نہ میں کتاب اللہ کی باتوں سے انکار کر رہا ہوں اور نہ ہی آپ کی باتوں کو جھٹلا رہا ہوں مگر میرے دل میں نہ سرشاری کے احساسات پیدا ہو رہے ہیں جو میرا ایمان بن سکے نہ کسی قسم کے منفی۔ بس اک خاموشی سی ہے۔'' اسجد نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

''شاید تمہیں میری باتیں پُر اثر نہیں لگی جو تمہارے دل کو متاثر کرتیں؟''

مولوی صاحب نے پوچھا۔

''معلوم نہیں......'' اسجد نے آہ بھر کر جواب دیا۔ دونوں ایک دم خاموش ہو گئے۔

''ٹھیک ہے اب میں چلتا ہوں......'' مولوی صاحب نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''مولوی صاحب...... کیا آپ انسان کو اس کائنات کا معجزہ سمجھتے ہیں؟'' امجد نے پوچھا۔

''اس کائنات کی ہر شے اور ہر مخلوق ایک معجزہ ہی ہے کیونکہ وہ کسی نہ کسی طرح عقل کو حیران کرتی ہے۔ انسان اللہ کی مخلوق ہے اور بس......'' مولوی صاحب نے جواب دیا۔

''کیا آپ انسان کو اللہ کا شاہکار مانتے ہیں؟'' امجد نے سوال کیا۔

''میاں...... تم کیسی باتیں کر رہے ہو، میں نے تمہیں اللہ کی کتاب سے بے شمار آیتیں پڑھ کر سنائی ہیں۔ اس نے صرف انسان کو بندہ اور نائب کہا ہے، بے شک اس نے انسان کو تمام مخلوقات پر فضیلت دی ہے، مگر وہ شاہکار کیسے ہو سکتا ہے...... کیونکہ اس کی بے شمار خامیوں، برائیوں اور گمراہیوں کا ذکر اللہ نے خود کیا ہے...... 'شاہکار' تو اپنی ذات میں اتنا مکمل ہوتا ہے کہ اس میں کوئی خامی، کوئی کمزوری ڈھونڈنے سے بھی نظر نہیں آتی، انسان......اور...... شاہکار؟ کبھی بھی نہیں۔'' مولوی صاحب نے مدلل انداز میں کہا تو امجد خاموش ہو گیا۔

تمام نوری مخلوق بھی چونک گئی۔ اللہ کی کتاب کو پڑھنے اور پڑھانے میں جس شخص نے اپنی ساری زندگی گزار دی۔ اس کا بھی یہی کہنا تھا کہ انسان شاہکار نہیں...... جبکہ بڑی سرکار بہت دعوے سے انسان کو اپنا 'شاہکار' بتا رہی تھی، اس کا مطلب ہے انسان کو خود ہی اپنے مرتبے اور حیثیت کا علم نہیں، یہ کتنی حیران کن بات تھی۔ انہوں نے سفید روشنی کی جانب دیکھا جو بدستور پر مطمئن اور مثبت انداز میں روشن تھی۔ اس کا مطلب وہ اچھی طرح سمجھتے تھے، اس لئے خاموش رہے۔

''اچھا...... میاں اب میں چلتا ہوں...... بہت دیر ہو گئی...... وقت کا احساس ہی نہیں ہوا...... چونکہ تم الجھنوں کا شکار تھے...... تمہیں مطمئن کرنا ضروری تھا، اس لئے بیٹھ گیا بیٹا...... میں نے تو تمہیں وہ کچھ بتا دیا جو میں نے اللہ کی کتاب میں پڑھا ہے...... کیا اب تمہاری تسلی ہو گئی ہے......؟'' مولوی صاحب نے مسکرا کر پوچھا۔

''جی......'' امجد نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

''اللہ کا شکر ہے...... اللہ تمہیں اپنی حفظ وامان میں رکھے...... میں چلتا ہوں، یار محمد آئے تو میرا بہت سلام کہنا۔'' مولوی صاحب نے امجد سے بغلگیر ہوتے ہوئے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئے۔ امجد انہیں دروازے تک رخصت کرنے آیا۔ کمرے میں واپس آ کر وہ بہت مضطرب ہو گیا۔

مولوی صاحب نے انسان کے بارے میں اپنی جو رائے دی تھی، اس نے اسے پھر الجھن میں ڈال دیا تھا۔ ڈاکٹر کیانی، پروفیسر شمس مظہری اور مولوی صاحب کی باتوں میں کتنا اختلاف تھا...... تینوں انسان کی حیثیت اور مرتبے کے بارے میں کوئی ٹھوس اور حتمی رائے نہیں رکھتے تھے۔ امجد کی اپنی رائے بھی مشکوک ہو گئی تھی۔ اس نے تینوں سے اللہ اور انسان کے بارے میں سوالات کیے تھے مگر کسی کی بات پر اس کا دل مطمئن ہو کر پرسکون نہیں ہوا تھا، وہ ابھی تک پہلے کی طرح مضطرب تھا۔ اسے اطمینان کیسے ملے گا......؟'' وہ پریشان ہو کر سوچنے لگا اور اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

شام گہری ہو رہی تھی جب یار محمد اور اس کی بیوی شاہ بابا کے مزار سے گھر واپس لوٹے۔ دونوں بہت تھکے ہوئے مگر بہت خوش تھے۔ یوں

مطمئن تھے جیسے ان کے ذہن سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔ انہوں نے جو نیاز شاہ بابا کے مزار پر منت کے طور پر مانی تھی وہ اسے پورا کر آئے تھے۔

''بیٹا...... تم نے نہ جا کر بہت بڑی غلطی کی ہے...... سچ مانو اتنا سکون ملا ہے، وہاں جا کر بتا نہیں سکتا۔'' یار محمد نے کہا۔

''مولوی صاحب آئے تھے......؟'' امجد نے باپ کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

''مولوی صاحب...... آج...... آئے تھے......'' یار محمد نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

''ہاں انہیں آج فرصت ملی تھی۔'' امجد نے جواب دیا۔

''اور کتنے افسوس کی بات ہے ہم انہیں گھر نہیں مل سکے......'' یار محمد نے قدرے تاسف سے کہا۔

''میرا خیال ہے...... بڑے ہی لمبے عرصے کے بعد وہ ہمارے گھر آئے...... میرا خیال ہے پانچ سال تو ہو ہی گئے ہیں...... ابا جی کے ختم پر آئے تھے۔'' امجد کی ماں نے کہا۔

''ہاں...... شاید'' یار محمد نے جواب دیا۔

''واپس کب گئے؟'' امجد کی ماں نے پوچھا۔

''ابھی تھوڑی دیر پہلے...... آج بہت دیر بیٹھے...... بس باتوں میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔'' امجد نے بتایا۔

''ماشاءاللہ...... مولوی صاحب پر اللہ کا بڑا ہی کرم ہے، ہر بات اللہ کی کتاب کے حوالے سے کرتے ہیں۔ بڑے علم والے ہیں...... دنیا میں بڑے بڑے علم والے ہیں...... ایک سے بڑھ کر ایک...... یہ سب اللہ کی نظر کرم ہے، جس کو نواز دے...... اب سنا ہے کہ شاہ بابا کے مزار پر بڑے علم والے اور اللہ والے صوفی صاحب ہیں...... مگر وہ کسی کو کم ہی ملتے ہیں۔'' یار محمد اپنی ہی لے میں بولا۔

''اللہ والے......؟'' امجد نے چونک کر پوچھا۔

''ہاں اللہ کے پیارے اور قریبی بندے...... جس سے بھی پوچھو تو یہی کہتا ہے ابھی یہیں تھے، مگر آج تک میری ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ بڑا شوق ہے ان سے ملنے کا۔'' یار محمد نے قدرے اداس لہجے میں کہا تو امجد حیرت سے ان کی جانب دیکھنے لگا۔

''ابا جی...... آپ اللہ والا کس کو کہتے ہیں؟'' امجد نے اچانک سوال کیا۔

''بیٹا...... اللہ کے خاص الخاص بندے...... جن پر وہ اپنا بڑا کرم کرتا ہے۔'' یار محمد نے جواب دیا۔

''کیسا کرم......؟'' امجد نے چونک کر پوچھا۔

''اپنے قرب کا کرم......'' یار محمد نے جواب دیا۔

''کیا مطلب......؟'' امجد نے پھر حیرت سے سوال کیا۔

''بیٹا...... کچھ لوگ صرف اللہ کے 'بندے' ہوتے ہیں جنہیں وہ پیدا کرتا ہے اور وہ اس سے محبت کرتے ہیں...... اور...... کچھ اللہ سے ایسا ''عشق'' کرتے ہیں کہ اپنی جان بھی اس کی محبت میں فنا کر دیتے ہیں...... وہ اللہ کے خاص بندے ہوتے ہیں...... مگر یہ بہت کم ہوتے ہیں...... اللہ

والے ہمیشہ کم ہوتے ہیں..... کم دکھائی دیتے ہیں مگر ہزاروں، کروڑوں پر بھاری ہوتے ہیں۔" یار محمد نے جواب دیا، جس نے اپنی ساری زندگی ایسے لوگوں کی محبت میں گزارنے کی کوشش کی تھی۔

"میں نے تو آج تک ایسا کوئی انسان نہیں دیکھا۔" امجد نے حیرت سے کہا۔

"بیٹا..... ایسے انسان نظر نہیں آتے ان کو دیکھنے کے لئے بھی ویسی ہی نظر چاہئے..... اور تمہاری نظر ابھی بہت کچی ہے..... تجھے تو الف ب کی بھی خبر نہیں۔" یار محمد نے کہا تو امجد حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا جو شاید پہلی بار اس سے ایسی باتیں کر رہا تھا۔

"کیا مولوی صاحب اللہ والے نہیں؟" امجد نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ اللہ کے نیک بندے ہیں..... اللہ والے نہیں۔" یار محمد نے جواب دیا۔

"کیا مطلب.....؟" امجد نے پھر حیرانگی سے پوچھا۔

"اللہ کے نیک بندے، اس کے حکموں پر عمل کرتے ہیں، اس پر ایمان رکھتے ہیں، نیک کام کرتے ہیں اور برائی سے باز رہنے کی کوشش کرتے ہیں اور اللہ والے تو اپنا آپ ہی اللہ کو سونپ چکے ہوتے ہیں، وہ ارد گرد کے لوگوں میں بہت "عام" مگر اللہ کی نظر میں بہت "خاص" ہوتے ہیں....." یار محمد نے جواب دیا۔

"کیا اللہ والے..... اللہ کے نیک بندے نہیں ہوتے۔" امجد نے متجسس ہو کر پوچھا۔

"تو بھی بے وقوف ہے..... اللہ کے بندے سچے اور نیک بن کر ہی اللہ والے بنتے ہیں..... فرق ایسے ہے جیسے پہلی سیڑھی اور آخری سیڑھی کا ہے۔ اللہ کے 'نیک بندوں' کو اللہ آسمانوں پر دکھائی دیتا ہے اور "اللہ والوں" کو اپنے سینوں میں۔" یار محمد نے کہا تو امجد نے انتہائی حیرت سے باپ کی طرف دیکھا، اپنی زندگی میں پہلی بار کسی انسان کے بارے میں ایسی باتیں سن رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا۔

"کیا واقعی.....؟ ایسے انسان بھی ہوتے ہیں؟" امجد نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

"ہاں..... کیوں نہیں..... صوفی صاحب کے بارے میں یہی مشہور ہے، مگر مجھے ان سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا، ہمیشہ حسرت ہی رہی۔" یار محمد نے جواب دیا۔

"ابا جی..... کیا صوفی صاحب کے علاوہ آپ کسی اور اللہ والے سے ملے ہیں؟" امجد نے پوچھا۔

"بیٹا..... مجھے تو ساری زندگی شوق ہی یہی رہا کہ اللہ والوں سے ملوں مگر سوائے ایک، دو کے..... کسی اور سے ملاقات نہیں ہوئی..... جن سے ملاقات ہوئی..... انہوں نے اپنے اپنے انداز سے چونکایا۔" یار محمد نے جواب دیا۔

"کھانا لاؤں..... بیٹا تمہیں تو بھوک لگی ہوگی۔" امجد کی ماں نے پوچھا۔

"نہیں..... مجھے بھوک نہیں..... اور وہ اٹھ کر گھر سے باہر نکل گیا..... اس کا دل بری طرح بے چین ہو رہا تھا..... " یار محمد کی باتوں نے اسے مزید الجھا دیا تھا۔

"ایسا انسان...... کیسا ہوتا ہے......؟"

"ایسے انسان کو دیکھنے کے لئے خاص نظر چاہئے؟ ایسے لوگوں کے سینوں میں اللہ کیسے موجود ہو سکتا ہے......؟ اور دوسروں کو اس کی خبر کیسے ہوتی ہے؟" امجد کے ذہن میں بے شمار سوالات ابھر رہے تھے اور اس کا دل انتہائی مضطرب ہو رہا تھا، یوں لگ رہا تھا۔ کسی نے اس کا سینہ جکڑ دیا ہو اور جیسے اس سے سانس لینا مشکل ہو رہی ہو، وہ یونہی ادھر ادھر پھرتا رہا، پاس سے گزرتے لوگوں سے یوں بے نیاز ہو کر چل رہا تھا جیسے کسی کو جانتا ہی نہ ہو...... کئی شناسا لوگوں نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا اور اسے اپنی سوچوں میں محو پا کر وہ اس کو حیرت سے دیکھتے رہے مگر وہ پاس سے گزر گیا، اس کا ذہن تو کہیں اور کھویا ہوا تھا۔ وہ رات گئے گھر لوٹا تو اس کے ماں باپ سونے کی تیاری کر رہے تھے۔

"بیٹا...... تو کہاں چلا گیا تھا...... روٹی بھی نہیں کھائی اور اب آ رہا ہے ...... کتنی رات گزر گئی ہے...... کیا کوئی یار دوست مل گیا تھا؟......" اس کی ماں نے تشویش سے پوچھا۔

"نہیں ......" وہ آہستہ آواز میں بولا۔

"کیا تجھے شہر یاد آ رہا ہے؟" اس کی ماں نے کریدا۔

"نہیں......" اس نے جواب دیا اور چارپائی پر لیٹ کر چھت کو گھورنے لگا۔ اس کے چہرے پر چھائی پریشانی اس کے اندر کے اضطراب کی خبر دے رہی تھی۔ اس کی ماں تھکی ہوئی تھی اٹھ کر لیٹ گئی۔

اور چارپائی پر لیٹتے ہی خراٹے لینے لگی۔ امجد بار بار کروٹیں بدل رہا تھا...... یار محمد اس کو ہر بار دیکھتا......

"امجد...... تجھے نیند کیوں نہیں آ رہی؟" یار محمد نے سرگوشی کے انداز میں امجد سے پوچھا جو اس کی ساتھ والی چارپائی پر لیٹا تھا کمرے میں نیم تاریکی تھی، زیرو کا بلب روشن تھا۔

"ابا جی...... یہ کیسے پتہ چلتا ہے کہ فلاں انسان اللہ والا ہے۔" امجد نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"اچھا...... تو...... تو ابھی تک اس بات سے پریشان ہے۔" یار محمد ہنسا۔ "بیٹا...... ایسے لوگ دنیا میں سب کے درمیان رہ کر سب سے بے نیاز ہوتے ہیں...... ویسے تو وہ اردگرد کے انسانوں کو دیکھ رہے ہوتے ہیں مگر وہ ان کو نہیں...... ان کے اندر کے انسانوں کو دیکھتے ہیں۔ وہ ظاہر نہیں باطن میں زندہ رہتے ہیں...... وہ بغیر کسی واسطے اور ذریعے کے دلوں اور روحوں تک پہنچ جاتے ہیں...... ان کی سیدھی سادی باتوں میں بڑے گہرے مطلب ہوتے ہیں، وہ باتیں تو پاس بیٹھے لوگوں سے کر رہے ہوتے ہیں مگر ان کی باتوں کا مطلب کچھ اور ہوتا ہے۔" یار محمد اسے بتانے لگا۔

"لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟" امجد نے جھنجھلا کر پوچھا۔

"بیٹا...... تو نے ابھی دنیا دیکھی کہاں ہے؟ تجھے کیا خبر مولا نے کیسے کیسے شاہکار لوگ بنائے ہیں۔" یار محمد نے آہستہ آواز میں کہا۔

"شاہکار......؟" امجد نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں...... ایسے نایاب لوگ اللہ کے 'شاہکار' ہی ہوتے ہیں۔" یار محمد نے اپنی ہی لے میں کہا تو امجد حیرت سے ابا کی جانب دیکھنے لگا۔

''ابا جی...... کیا انسان اس دنیا میں اللہ کا ''شاہکار'' ہے؟'' امجد نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں...... بالکل......'' یار محمد نے جواب دیا۔

''لیکن مولوی صاحب تو نہیں مانتے...... وہ تو کہتے ہیں کہ انسان صرف اللہ کا نائب اور بندہ ہے اور اس کی دوسری مخلوقات کی طرح ایک مخلوق ہے۔'' امجد نے جواب دیا۔

''وہ بھی ٹھیک کہتے ہیں۔'' یار محمد نے جواب دیا۔

''مگر وہ انسان کو شاہکار نہیں مانتے۔'' امجد نے جھنجھلا کر کہا۔

''نہ مانیں......'' یار محمد نے لاپروائی سے کہا۔

''ابا جی...... مجھے آپ کی باتوں سے الجھن ہونے لگی ہے۔'' امجد زچ ہو کر بولا۔

''بیٹا...... ہر انسان 'شاہکار' نہیں ہوتا...... کچھ انسانوں کو اللہ نے خود جانوروں سے بھی بدتر کہا ہے مگر وہ ہوتے تو انسان ہی ہیں نا...... اور کچھ میں شر اور بدی اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ انہیں شیطان کہا جاتا ہے، مگر وہ بھی انسان ہوتے ہیں۔ ''شاہکار'' تو اسے کہتے ہیں جس پر اس کا بنانے والا فخر محسوس کرے...... اور ایسے شاہکار لوگ ہر دور ہر زمانے میں موجود ہوتے ہیں، مولا ان کو ایسا بناتا ہے کہ لوگ ان کو دیکھ کر عش عش کر اٹھتے ہیں اور مولا کو بھی ان پر فخر محسوس ہوتا ہے۔'' یار محمد نے کہا تو امجد کے دل میں اس کی بات ایک دم کھب گئی۔

''ابا جی...... آپ کو یہ سب باتیں کہاں سے معلوم ہوئیں، آپ تو زیادہ پڑھے لکھے بھی نہیں۔'' امجد نے حیرت سے پوچھا۔

''اوئے...... بیوقوفا...... تجھے کس نے کہا ہے کہ یہ باتیں کتابیں پڑھ کر معلوم ہوتی ہیں...... بیٹا...... میرے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں ہوئے۔ میں نے تو ساری حیاتی اللہ والوں کے ساتھ گزارنے کی کوشش کی ہے...... وہ لوگ تو بہت کم ملے مگر علم ان کے بارے میں بڑا ملا۔'' یار محمد نے مسکرا کر کہا۔

''ابا جی...... مولوی صاحب ایسی باتیں نہیں کرتے؟'' امجد نے حیرت سے پوچھا۔

''بیٹا...... مولوی صاحب بہت اچھے اور نیک انسان ہیں مگر ان کے اپنے نظریات ہیں، وہ تو شاید اللہ والوں کو ہی نہیں مانتے...... ایک دو دفعہ میری ان کے ساتھ بحث ہوئی تھی...... وہ کسی ایسے انسان کے وجود کو مانتے ہی نہیں تو پھر میں نے ان سے بحث کرنا ہی چھوڑ دی۔'' یار محمد نے کہا۔

''ابا جی...... کہیں آپ بھی تو اللہ والے نہیں؟'' امجد نے مسکرا کر پوچھا۔

''ارے نہیں بیٹا...... میری اتنی اوقات کہاں......؟ ہم تو مٹی کے بے وقعت ذرے ہیں...... وہ لوگ تو سیپ میں بند موتیوں جیسے قیمتی اور خوبصورت لوگ ہوتے ہیں...... ہم تو ان کے پاؤں کی خاک بھی نہیں...... لیکن یہ ان کی نظروں کا فیض ہے کہ مجھ گنہگار میں بھی تھوڑی بہت سمجھ بوجھ پیدا ہو گئی ہے...... یہ بھی اللہ کا بڑا کرم ہے کہ وہ ایسے لوگوں سے کبھی کبھار ملا دیتا ہے...... اب صوفی صاحب سے ملنے کو بڑا جی چاہتا ہے...... کئی بار گیا ہوں وہ ملے ہی نہیں...... پتا نہیں مولا نے کب ان کا دیدار کرانا ہے۔'' یار محمد نے حسرت سے کہا تو امجد حیرت سے باپ کی جانب دیکھنے لگا۔ اس کے

دل میں بھی صوفی صاحب کو ملنے کا تجسس پیدا ہونے لگا......اس نے تو ساری زندگی باپ سے کبھی کھل کر بات ہی نہیں کی تھی کہ وہ کھیتوں میں ہل چلانے والا ان پڑھ مزارع اس کی کتابی اور علمی باتوں کو کیسے سمجھ سکے گا......اور آج اس کے باپ نے اس کی ساری علمیت کو مات دی تھی......اسے ایسے استاد ملے تھے جنہوں نے اس کو سب کچھ کتابوں کے ذریعے ہی پڑھایا تھا۔اب اسے اپنا باپ ان سے بہت برتر اور افضل محسوس ہونے لگا۔جس کی باتیں مدلل تھیں اور جس کی باتوں میں اتنی کشش تھی کہ اس کا دل فوراً مان گیا تھا۔اس کے باپ نے ایک ہی لمحے میں کئی دنوں سے پیدا شدہ الجھن کو کیسے عام فہم انداز میں ختم کر دیا تھا......وہ چارپائی پر لیٹ گیا اور سکون سے آنکھیں بند کر لیں۔"میں کل صوفی صاحب سے ملنے ضرور جاؤں گا۔" اس نے متجسس ہو کر سوچا......اور اپنے اس عزم کو بار بار دہراتا ہوا گہری نیند سو گیا۔

تمام نوری مخلوق یار محمد کی باتیں سن کر چونک گئی اور ایک دوسرے کی جانب حیرت سے دیکھا......اور......پھر آہستہ آہستہ سفید روشنی کی جانب دیکھا جو بدستور روشن تھی۔انہیں اس روشنی میں پہلے سے بھی زیادہ اطمینان محسوس ہونے لگا۔ان کے اندر انسان کے شاہکار ہونے کے بارے میں شکوک و شبہات قدرے ماند پڑنے لگے۔وہ الجھن کا شکار ہونے لگے۔

☆

امجد صبح سویرے اٹھ بیٹھا تھا اور کہیں جانے کی تیاری میں مصروف تھا۔ یار محمد منہ اندھیرے ہی کھیتوں میں جا چکا تھا۔ اس کی ماں صحن میں چولہا جلائے روٹیاں پکانے میں مصروف تھی۔ امجد کو تیار دیکھ کر حیرت سے دیکھنے لگی۔ ''خیر تو ہے بیٹا...... کہیں جا رہے ہو؟'' اس کی ماں نے توے پر روٹی ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں...... کچھ دوستوں کے ساتھ گھومنے جا رہا ہوں۔'' امجد نے بہانہ بناتے ہوئے کہا۔

''اچھا...... خیر سے جا...... اور...... خیر سے آ...... شام کو جلدی آ جانا......!'' اس کی ماں نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے......'' امجد نے جواب دیا۔

''لے...... روٹی کھا لے......'' اس کی ماں نے روٹی اور انڈہ فرائی کر کے اس کے سامنے چھوٹی سی ٹیبل پر رکھا

''اماں...... شاہ بابا کا مزار کہاں ہے؟'' امجد نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

''کیوں...... تم لوگوں کا وہاں جانے کا بھی ارادہ ہے؟''

''شاید......'' امجد نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

''ضرور...... ضرور جانا...... کل...... تو...... تو ہمارے ساتھ گیا نہیں...... آج دوستوں کے ساتھ ہی چلے جانا۔ بچ بڑا سکون ہے، ان کے مزار پر...... اور سنا ہے بڑی کراماتوں والے تھے...... اچانک نابینا ہو گئے مگر اللہ نے ان کے دل کی آنکھیں روشن کر دیں۔ وہ وقت سے پہلے ہر بات بتانے لگے اور سنا ہے کل ہونے والی باتیں اللہ انہیں رات کو خواب میں دکھا دیتا تھا...... ایسے اللہ والے کم ہی ہوتے ہیں......'' اس کی ماں نے انتہائی حیرت سے بتایا تو امجد خاموشی سے سنتا رہا۔

''اور...... یہ صوفی صاحب کون ہیں...... جن کے بارے میں ابا جی کل بتا رہے تھے۔'' امجد نے باتوں باتوں میں ماں سے بھی معلومات لینا چاہیں۔

''معلوم نہیں...... پر ان کے بارے میں بڑی باتیں سنی ہیں۔ بڑے سالوں سے شاہ بابا کے مزار کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ اللہ والے ہیں۔'' اس کی ماں نے بتایا۔

''اور ان کی کوئی کرامت مشہور نہیں؟'' امجد نے مسکرا کر پوچھا۔

''پتا نہیں...... اس کے بارے میں نہیں سنا...... بس تیرا باپ ہی بڑی تعریف کرتا ہے، کئی بار ملنے گیا مگر ملاقات ہی نہیں ہو سکی۔'' اس کی ماں نے بتایا۔

''ملاقات کیوں نہیں ہو سکی؟'' امجد نے حیرت سے پوچھا۔

''اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔'' اس کی ماں نے کہا اور چائے کا کپ اس کے سامنے رکھا اور امجد کو شاہ بابا کے مزار کا ایڈریس سمجھانے لگی۔

دوپہر کے قریب امجد شاہ بابا کے مزار پر پہنچا جو اس کے گاؤں سے کافی دور تھا۔ شاہ زیب کی قبر پر بہرام خان نے سفید سنگِ مرمر کی انتہائی

دیدہ زیب عمارت بنوائی تھی جس کے اندر قدم رکھتے ہی گلاب کے تازہ پھولوں کی مسحور کن خوشبو اور اگربتیوں کی مہک زائرین کے قلب و روح کو معطر کر دیتی۔ اک عجیب سے سکون اور خوشی کا احساس روح میں سرایت کرتا ہوا محسوس ہوتا۔ شاہ زیب کی وفات کو پندرہ سولہ برس ہو گئے تھے اور ماسٹر باسط علی اس وقت سے ہی مزار کی ہر طرح کی خدمت میں مصروف رہتے۔ وہ رات رات بھر قبر کے سرہانے بیٹھ کر آنکھوں میں اشکوں کا سیلاب لئے قرآن پاک کی تلاوت میں مصروف رہتے۔ صبح باسی پھولوں کو اٹھا کر تازہ پھول ڈال کر اور شاہ زیب کی روح کے لئے دعائیں مانگ کر مزار سے باہر چلے جاتے۔ پھر سارا دن وہ مزار پر نہ آتے اور جب رات کو اکا دکا لوگ رہ جاتے تو پھر مزار پر آ جاتے۔ شاہ زیب لوگوں کے لئے ''شاہ بابا بن اور شاہ جی'' بن چکا تھا، جس کے مزار سے وہ بے حد عقیدت اور محبت رکھتے تھے۔ ...اور ان کا عقیدہ بھی تھا کہ ان کے مزار پر دعائیں مانگنے والوں کی دعائیں بھی پوری ہوتی ہیں۔

امجد نے مزار پر بھرپور نظر دوڑائی اور گہری سانس لی..... اک خوشگوار سا احساس اس کے رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ اس سے پہلے وہ کبھی مزاروں پر نہیں گیا تھا اور نہ ہی مزاروں پر جانے کو اچھا خیال کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے باپ کی مخالفت کرتا تھا، اس لئے بھی یار محمد اس کے سامنے بہت کم کسی مزار یا بزرگ کا ذکر کرتا تھا۔ اس نے دعا پڑھی اور مزار پر پھول ڈال کر باہر نکل آیا۔ کچھ لوگ مزار کے باہر دریوں پر قطار میں بیٹھے تھے اور ایک سفید باریش آدمی ان میں کھانا تقسیم کر رہا تھا۔ امجد اس آدمی کو بغور دیکھنے لگا۔ وہ پاس ہی کھڑے ایک لڑکے کے پاس چلا گیا۔

''کیا یہ صوفی صاحب ہیں؟'' اس نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔

''ارے..... نہیں..... وہ یہاں کہاں؟'' لڑکا مسکرا کر بولا۔

''تو..... پھر..... وہ کہاں ہوں گے؟'' امجد نے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

''وہ سارا دن کھیتوں میں ہوتے ہیں..... یا..... پھر مدرسے میں۔'' اس لڑکے نے جواب دیا۔

''اس وقت وہ کہاں ہوں گے؟''

''میرا خیال ہے..... کھیتوں میں ہوں گے.....''

''کھیت کس طرف کو ہیں.....؟'' امجد نے اس سے پوچھا۔

''ادھر آؤ..... میں بتاؤں.....'' وہ لڑکا اسے لے کر مزار سے باہر چلا گیا۔ اس کچی سڑک پر سیدھے چلتے جاؤ، جہاں ختم ہوتی ہے وہاں کھیت شروع ہوتے ہیں۔'' لڑکے نے اسے بتایا۔

''شکریہ.....'' وہ کہہ کر جانے لگا۔

''آپ صوفی صاحب سے کیوں ملنا چاہتے ہو.....؟'' لڑکے نے اچانک پیچھے سے سوال کیا، جس کا امجد کے پاس بھی کوئی جواب نہ تھا۔ اس نے اس کی جانب دیکھا اور خاموشی سے چلنے لگا۔

''وہ..... واقعی ان سے کیوں ملنا چاہتا ہے..... اور اگر وہ مل گئے تو ان سے کیا سوال کرے گا.....؟ کیا وہ ان کو یہ کہے گا کہ وہ صرف ان کو

دیکھنے آیا ہے...... یا پھر اپنے اندر کا کوئی اضطراب دور کرنے آیا ہے...... یا پھر محض ان سے ملنے کا شوق اور تجسس اسے ان کے پاس لے آیا ہے......"

وہ اپنی ہی سوچوں میں گم یونہی سڑک پر چلنے لگا، سڑک اس قدر لمبی تھی کہ ختم ہونے کو ہی نہ آ رہی تھی، سڑک کے دونوں جانب گندم کے کھیت تھے، فصل تیار کھڑی تھی...... درختوں اور وسیع کھیتوں کے علاوہ کوئی بندہ بشر دکھائی نہ دے رہا تھا۔

"اصل کھیت...... تو اس سڑک کے ختم ہونے پر شروع ہوں گے...... اور یہ سڑک نجانے کب ختم ہوگی؟" اس نے پریشان ہو کر سوچا۔ موسم قدرے گرم بھی تھا اور سورج بھی عین سر پر تھا۔ اچانک اسے اپنے پیچھے قدرے فاصلے پر گدھا گاڑی کی آواز آئی وہ رک گیا اور اس کا انتظار کرنے لگا...... گدھا گاڑی پر دو نوجوان لڑکے سوار تھے...... امجد نے انہیں رکنے کا اشارہ کیا ..... اور ان کے ساتھ سوار ہو گیا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" امجد نے پوچھا۔

"کھیتوں تک ......" ایک نے جواب دیا۔

"مجھے بھی وہیں جانا ہے۔" امجد نے بتایا۔

"کیوں......؟" دوسرے نے حیرت سے پوچھا۔

"کسی سے ملنا ہے۔" امجد نے جواب دیا۔

"کیا...... صوفی صاحب سے؟" اس لڑکے نے حیرت سے پوچھا، تو امجد خاموش ہو گیا، وہ دونوں بھی خاموش ہو گئے۔ سڑک کافی آگے جا کر ختم ہوئی تو انہوں نے اسے اترنے کو کہا۔

"یہاں سے کھیت شروع ہوتے ہیں..... ویسے یہاں تم کس سے ملنے آئے ہو......؟ لوگ تو یہاں صوفی صاحب کو ہی ملنے آتے ہیں۔" اسی لڑکے نے متجسس ہو کر پوچھا۔

"ہاں...... میں بھی ان سے ملنے آیا ہوں۔" امجد نے کہا۔

"پھر تو بڑے ہی بے وقوف ہو...... میں نے پوچھا بھی تم نے بتایا نہیں...... اگر وہیں بتا دیتے تو ہم تمہیں ادھر ہی بتاتے کہ صوفی صاحب کو آج اچانک شہر جانا پڑ گیا تھا، وہ تو شہر چلے گئے ہیں۔ اس لڑکے نے بتایا تو امجد کے چہرے پر پسینہ آنے لگا، اتنی لمبی سڑک اور اتنے سفر کا سوچ کر اس کے اوسان خطا ہونے لگے۔

"ک...... کب...... واپس آئیں گے؟" امجد نے پوچھا۔

"اب تو رات کو ہی آئیں گے...... بہرام خان کا بیٹا اچانک بیمار ہو گیا ہے اور صوفی صاحب کو وہاں جانا پڑ گیا...... مگر یہ بھی پتہ نہیں کہ وہ رات کو بھی آتے ہیں یا نہیں...... ویسے تو وہ کم ہی وقت گاؤں سے باہر گزارتے ہیں کیونکہ انہوں نے رات کو ہر حال میں شاہ بابا کے مزار پر حاضری دینا ہوتی ہے...... اس لیے ممکن ہے وہ رات کو آ جائیں، لڑکے نے اسے تفصیلاً بتایا۔ امجد انتہائی پریشان ہونے لگا۔

"یہاں سے واپس جانا کیسے ممکن ہے...... میرا مطلب ہے کوئی سواری......؟" امجد نے ڈھلتے سورج کی طرف نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''سواری کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا...... البتہ ہم کوئی دو گھنٹے بعد واپس جائیں گے۔'' سبزیاں لینے آئے ہیں، اگر انتظار کر سکتے ہو...... تو...... کرلو......'' لڑکے نے قدرے لاپروائی سے کہا۔

''ٹھیک ہے...... میں یہیں کہیں انتظار کر لیتا ہوں۔'' اور وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔

''ٹھیک ہے......'' دونوں کھیتوں کے اندر چلے گئے اور امجد افسردہ دل کے ساتھ درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگیں۔

''انسان کتنا دکھی ہوتا ہے جب اتنا لمبا سفر اچانک رائیگاں چلا جاتا ہے ...... شدید قسم کا احساسِ زیاں اس کے دل کو پریشان کرنے لگا۔ یقیناً اباجی نے بھی کئی بار کوشش کی ہوگی مگر وہ بھی صوفی صاحب کو نہیں مل پائے...... آخر وہ کیوں نہیں مل پاتے ...... اس میں کیا راز ہے......؟ وہ متجسس ہو کر سوچنے لگا۔

''کیا مزار پر موجود لڑکے کو معلوم نہیں تھا کہ صوفی صاحب شہر گئے ہیں؟ ہو سکتا ہے اسے اس بات کی خبر نہ ہو......'' کئی سوالات اس کے ذہن میں آنے لگے۔ ...... وہ بھی اٹھ کر ٹہلنے لگتا، کبھی تھک کر بیٹھ جاتا اور کبھی لیٹ جاتا۔ ایک ایک لمحہ گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ اسے رات تک گھر بھی پہنچنا تھا۔ اس کی ماں نے اسے خصوصی تاکید کی تھی کہ وہ شام تک گھر لوٹ آئے۔ اس نے بڑی مشکل سے دو گھنٹے گزارے اور سبزیوں سے لدی گدھا گاڑی پر ان دو لڑکوں کے ساتھ واپس آ گیا۔ وہ قدرے مایوس تھا، اس کے دل میں عجیب سا ملال تھا۔ صوفی صاحب سے نہ ملنے کا رنج اسے بہت شدت سے اندر ہی اندر دکھ دے رہا تھا۔ وہ رات کو بہت دیر سے گھر پہنچا تو اس کے ماں باپ بے حد فکر مند ہو رہے تھے۔ اسے دیکھ کر انہیں قدرے سکون آ گیا۔

''بیٹا...... تو...... کہاں چلا گیا تھا...... تیری ماں بتا رہی تھی کہ دوستوں کے ساتھ شاہ بابا کے مزار پر گیا ہے۔ مجھے تو بڑی حیرت ہوئی کہ تجھے اچانک کیا ہو گیا۔ ایک دن پہلے تو...... تو...... ہمارے ساتھ جانے پر راضی نہ تھا اور ہمیں بھی منع کر رہا تھا...... اور اگلے دن خود ہی چلا گیا...... یہ تیرے دل کی دنیا کیسے بدل گئی......؟'' یار محمد نے مسکرا کر پوچھا۔

''اباجی...... آپ نے اللہ والوں کی اتنی تعریفیں کیں کہ دل نے چاہا...... ان سے جا کر ملوں...... مگر......'' امجد خاموش ہو گیا۔

''مگر...... صوفی صاحب نہیں ملے۔'' یار محمد نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ہاں...... مگر وہ کیوں نہیں ملتے؟'' امجد نے جھنجلا کر پوچھا۔

''سنا ہے...... وہ بہت کم لوگوں سے ملتے ہیں...... کوئی ملنے جائے تو اس قدر خاموش ملتے ہیں کہ لوگ خاموشی سے ہی لوٹ آتے ہیں...... وہ بہت کم کسی سے بات کرتے ہیں۔'' یار محمد نے بتایا۔

''اباجی...... کیا یہ تکبر کی بات نہیں......؟ کہ لوگ اتنی دور سے سفر طے کر کے جائیں اور ان کا رویہ اتنا سرد ہو کہ جانے والے لوگ مایوس ہو جائیں۔'' امجد نے آہ بھر کر کہا۔

''بیٹا.....وہ اس بات سے منع کرتے ہیں کہ لوگ ان کے پاس اپنی ضرورتوں کے لئے دعائیں کرانے نہ آئیں۔ دعائیں قبول کرنے والا اللہ ہے جو اپنے ہر بندے کی پکار کا جواب دیتا ہے۔'' یار محمد نے جواب دیا تو اسجد باپ کی بات کا قائل ہو گیا کیونکہ وہ خود بھی یہی نظریات رکھتا تھا اسی لئے مزاروں پر جانے کے خلاف تھا۔ صوفی صاحب کی بات اس کے دل میں اتر گئی اور وہ خاموش ہو گیا..... لیکن اس کے دل میں صوفی صاحب کو ملنے کی خواہش مزید زور پکڑنے لگی۔ وہ ان کے بارے میں اٹھتے، بیٹھتے ہوئے سوچنے لگا اور دو تین دنوں کے بعد اس نے پھر وہاں جانے کا پروگرام بنایا مگر اس بار وہ گھر بتا کر گیا کہ اگر اسے دو تین دن وہاں لگ جائیں تو وہ پریشان نہ ہوں۔ یار محمد نے اس کا شوق دیکھ کر خوشی سے اسے اجازت دے دی۔ اسجد مزار پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ صوفی صاحب کھیتوں میں ہیں، وہ اسی راستے پر چل پڑا، بڑی مشکل سے کھیتوں میں پہنچا تو وہاں کوئی نظر نہ آیا، کہیں دور دور اکا دکا مزارے کام کرتے نظر آئے۔ وہ کھیتوں کے درمیان ایک پگڈنڈی پر چلتا ہوا ایک کھلی جگہ پر آیا جہاں درختوں کے سائے تلے دو تین چارپائیاں بچھی تھیں اور ان پر دو تین آدمی بیٹھے تھے۔ اسجد نے ان سے سلام لے کر مصافحہ کیا اور صوفی صاحب کے بارے میں پوچھنے لگا۔ ''وہ یہیں کہیں ہوں گے۔ .....'' ایک آدمی نے کھڑے ہو کر دور تک نظر دوڑائی۔

''میرا خیال ہے.....وہ.....وہاں پر ہیں.....'' اس شخص نے دور کھیتوں میں کام کرتے ہوئے ایک شخص کی طرف اشارہ کیا۔

''وہاں..... کہاں.....؟'' اسجد نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ..... دیکھو.....جو آدمی گھٹا سر پر اٹھائے چلا آ رہا ہے۔'' اس شخص نے کہا تو اسجد نے چونک کر اس شخص کی جانب یوں دیکھا جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو۔

''کیا.....وہ صوفی صاحب ہیں؟'' اسجد نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

''ہاں.....بھئی.....صوفی صاحب درویش آدمی ہیں.....میں نے بتا دیا.....تو اب تم انہیں پہچان لو گے.....ورنہ کوئی صوفی صاحب کو نہیں پہچان سکتا.....جاؤ مل لو۔'' اس آدمی نے کہا اور واپس جا کر چارپائی پر بیٹھ گیا اور اسجد حیرت و خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ قدرے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اس شخص تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔ جس نے ملگجا سا تہبند باندھ رکھا تھا اور لٹھے کی بنیان نما کرتی پہنی ہوئی تھی، بازو ننگے تھے اور پاؤں میں ربڑ کی خستہ حال چپل تھی، سر پر گھاس کا گٹھا تھا، گندمی رنگت دھوپ میں کام کرنے کی وجہ سے جل کر قدرے سیاہ ہو چکی تھی۔ اسجد قدرے بھاگتا ہوا ان کے پیچھے گیا اور بلند آواز میں 'صوفی صاحب' پکارا.....انہوں نے نہ تو کوئی جواب دیا اور نہ ہی مڑ کر دیکھا۔ یوں چلتے رہے جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ اسجد بھاگتا اور قدرے ہانپتا ہوا ان کے قریب جا پہنچا۔

''صوفی صاحب.....'' اسجد نے ہانپتے ہوئے کہا تو صوفی صاحب نے سر ذرا سا اس کی جانب گھما کر دیکھا۔ ان کا چہرہ اور جسم پسینے سے شرابور ہو رہا تھا..... پسینے کے قطرے ان کی کھچڑی داڑھی کو بری طرح تر کر رہے تھے۔ بازوؤں اور گلے سے بھی پسینے کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ جسم پر پہنی لٹھے کی کرتی بھی بری طرح گیلی ہو رہی تھی۔

''صوفی.....صاحب.....میں آپ سے ملنے آیا ہوں.....بہت دور سے۔'' اسجد نے ان کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ صوفی صاحب

نے چونک کر اور قدرے حیرت سے اس نوجوان کی جانب دیکھا اور خاموش رہے۔

"میں اس روز بھی آیا تھا...... بہت لمبا سفر کر کے...... میں کھیتوں تک بہت مشکل سے پہنچا مگر یہاں پہنچ کر معلوم ہوا آپ شہر گئے ہیں...... میں بہت مایوس اور پریشان ہوا۔" امجد تیز تیز بولا۔

صوفی صاحب خاموشی سے سنتے رہے اور کوئی جواب نہ دیا۔ سر پر گٹھا اٹھائے چلتے رہے۔

"مجھے آپ سے ملنے کی بہت خواہش ہو رہی تھی۔" امجد نے قدرے پر جوش انداز میں کہا تو صوفی صاحب نے اسے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا۔

"صوفی صاحب...... آپ...... میری کسی بات کا جواب کیوں نہیں دے رہے۔" امجد نے پوچھا۔

"آپ نے سوال...... کب کیا ہے؟ صوفی صاحب نے انتہائی آہستہ آواز میں کہا۔ ان کے لہجے میں انتہائی اعتماد اور قطعیت تھی...... اور آواز میں قدرے رعب سا تھا۔ امجد ان کی بات سن کر خاموش ہو گیا...... واقعی...... اس نے ان سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ وہ کس بات کا جواب دیتے وہ تو اپنی ہی باتیں سنا رہا تھا...... امجد خاموش ہو گیا...... نجانے اس پر کیسا سحر طاری ہو گیا کہ وہ مزید کچھ نہ بول سکا۔ ان کے سنگ چلتا رہا اور وہ بھی خاموشی سے چلتے رہے...... امجد انکھیوں سے ان کی جانب دیکھتا مگر مزید کچھ کہنے کی جرأت نہ کر سکا کچھ فاصلے پر کھلی جگہ میں گائے، بھینسوں کا باڑہ تھا...... ہر طرف بیل گائے بھینسیں اور بکریاں تھیں۔ صوفی صاحب نے سر پر اٹھایا گٹھا نیچے اتارنا چاہا تو امجد نے آگے بڑھ کر ان کی مدد کرنا چاہی۔

"انسان کو اپنا بوجھ خود اٹھانا چاہئے۔" انہوں نے امجد سے کہا۔ امجد فوراً پیچھے ہٹ گیا۔ انہوں نے اپنا گٹھا اتار کر زمین پر رکھا...... پاس رکھے مٹی کے گھڑے سے پانی کا گلاس لا کر اس کی جانب بڑھایا۔ امجد نے حیرت سے ان کی جانب دیکھا اور گلاس پکڑ لیا۔ واپس جا کر انہوں نے دوسرا گلاس پانی سے بھرا اور پینے لگے۔

امجد نے بھی جلدی سے پانی پیا، اسے بھی سخت پیاس محسوس ہو رہی تھی۔

صوفی صاحب اس کے سامنے چارپائی پر بیٹھ کر اسے بغور دیکھنے لگے۔

"کیوں آئے ہو......؟"

"آپ سے ملنے کی خواہش تھی۔"

"کیوں......؟"

"آپ کے بارے میں بہت سنا تھا۔"

"سنی...... سنائی باتوں پر یقین کرنا حماقت ہے۔"

"کچھ باتوں میں سچائی بھی ہوتی ہے۔"

"یوں کہو...... سچ جاننے آئے ہو۔"

امجد نے چونک کر ان کی جانب دیکھا جیسے اس کی کوئی چوری پکڑی گئی ہو...... وہ خاموش ہو گیا۔

''اپنے اندر کی بے چینی دور کرنا چاہتے ہو نا۔'' صوفی صاحب نے کہا تو امجد نے پھر چونک کر انہیں دیکھا اور قدرے گھبرا سا گیا۔

''پہلے اپنے آپ پر ایمان لاؤ...... پھر سچ کو جاننا۔'' امجد نے چونک کر دیکھا...... اسے یوں محسوس ہونے لگا، جیسے اس کا دل کسی شے سے خالی ہو رہا ہو...... اس کے اعصاب شل اور ہمت جواب دے رہی ہو۔

''ک...... کک...... کیا...... مطلب......؟'' اس نے بمشکل پوچھا۔

''سچ کو سامنے دیکھ کر پھر...... مکر جاتے ہو مگر...... سچ کبھی نہیں بدلتا...... ایک بار دیکھو یا سو بار۔'' صوفی صاحب نے کہا تو وہ چونک گیا۔

''کتنی بار حقیقت کو قریب سے دیکھا ہے؟'' صوفی صاحب نے پھر اس کی آنکھوں کی جانب بغور دیکھتے ہوئے کہا تو امجد یوں چونکا جیسے اسے کوئی جھٹکا لگا ہو۔

''اللہ والے...... دل کی باتیں جان لیتے ہیں۔'' اس کے باپ کی آواز اس کے ذہن میں گونجی اس کے چہرے پر پسینہ آنے لگا۔

''کیا...... آ...... آپ...... اللہ...... والے ہیں؟'' اس نے بمشکل پوچھا۔

''استغفر اللہ...... میں اس قابل کہاں؟'' صوفی صاحب نے آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''پھر...... آپ کون ہیں؟''

''اس کا ادنیٰ سا غلام...... غریب مزارع...... بس اور کچھ نہیں۔ اپنا وقت مت ضائع کرو...... میرے پاس کچھ نہیں...... سب اس کے پاس ہے۔'' انہوں نے پھر آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے کہا اور چارپائی سے اٹھ کر جانے لگے۔ امجد خاموشی سے ان کی جانب دیکھنے لگا، جیسے ان سے کچھ کہنا بھی چاہتا ہو...... مگر کہہ نہ پا رہا ہو۔

صوفی صاحب ایک چھوٹے سے کمرے میں چلے گئے اور جا کر اپنا لباس بدلا، سفید کاٹن کی شلوار قمیص پہنی اور اسے دیکھے بغیر وہاں سے چلے گئے...... امجد خاموش بیٹھا رہا۔

''تم...... کون ہو...... اور یہاں کیوں بیٹھے ہو؟'' ایک درمیانی عمر کے آدمی نے باڑے میں سے آ کر پوچھا۔

''وہ...... میں...... صوفی صاحب۔'' وہ بمشکل بولا۔

''اب وہ نہیں آئیں گے...... مدرسے چلے گئے ہیں اور وہاں سے شاہ بابا کے مزار پر چلے جائیں گے۔ تم بھی جاؤ...... یہاں سے......''

اس آدمی نے کہا تو امجد نے آہ بھری اور وہاں سے چلا گیا۔

''اس کے پاس واقعی کہنے کو کچھ ایسا نہیں تھا جو صوفی صاحب کو اس کی جانب متوجہ کر سکتا مگر...... شاید صوفی صاحب کے پاس بہت کچھ ایسا تھا جس نے اس کے اندر کے اضطراب کو تجسس میں بدل دیا تھا۔ اس کا دل ان کے پیچھے لپک رہا تھا...... اور ان سے مزید ملنے کی تمنا اور باتیں کرنے کی خواہش زور پکڑ رہی تھی۔ وہ شام ہونے تک بہت مشکل سے شاہ بابا کے مزار پر پہنچا تو وہاں رات کا کھانا تقسیم ہو رہا تھا، اس نے کھانا کھایا اور منتظر نگاہوں سے اس راستے کی جانب دیکھنے لگا جہاں سے صوفی صاحب کے آنے کی امید تھی۔ اس کا انتظار بڑھتا جا رہا تھا مگر صوفی صاحب نہیں آ رہے تھے۔

رات گہری ہونے لگی اور ہر طرف تاریکی چھانے لگی.....لوگوں کا ہجوم کم ہونے لگا.....اکا دکا لوگ ادھر اُدھر پھر رہے تھے۔ جب صوفی صاحب مزار پر پہنچے، امجد ان کو دیکھ کر فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور ان کے پیچھے لپکا۔

''صوفی صاحب.....'' اس نے آہستہ آواز میں پکارا.....تو انھوں نے مڑ کر حیرت سے اسے دیکھا۔

''تم.....ابھی تک یہاں ہو۔'' انھوں نے حیرت سے کہا۔

''ہاں.....وہ.....میں۔'' وہ بمشکل بولا۔

صوفی صاحب نے ایک ٹک اس کی جانب دیکھا اور مزار کے اندر چلے گئے.....اس نے بھی ان کے پیچھے جانا چاہا مگر ایک آدمی نے اسے روک دیا۔

''اب کوئی بھی اندر نہیں جا سکتا.....'' اس آدمی نے کہا۔

''کیوں.....؟'' امجد نے حیرت سے پوچھا۔

''صوفی صاحب.....مزار پر بیٹھ کر تلاوت کرتے ہیں اور اس دوران وہ کسی قسم کی دخل اندازی پسند نہیں کرتے.....'' اس آدمی نے کہہ کر مزار کا دروازہ بند کر دیا۔

امجد پریشان ہو گیا.....اور مزار کے صحن میں ایک چٹائی پر بیٹھ کر صبح ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ کس قدر مشکل ہو رہا تھا ایک ایک لمحہ گزارنا.....انتظار.....اور اضطراب.....دونوں ایسی کیفیتیں ہوتی ہیں جو اندر ہی اندر انسان کو بہت بے قرار رکھتی ہیں اور ایسی ذہنی اذیت سے دوچار کرتی ہیں، جس کا مداوا.....وصل کے علاوہ کوئی اور شے نہیں کر سکتی۔ وہ وہاں سے جانا بھی نہیں چاہتا تھا کیونکہ یونہی چلے جانے سے اس کے اندر کا اضطراب اور بڑھ جاتا.....اور جس کیفیت سے وہ گزر رہا تھا.....اس میں نہ قرار تھا اور نہ ہی فرار کی کوئی راہ، وہ کبھی چٹائی پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرتا اور کبھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا۔ ساری رات اسی طرح بے چینی میں گزری۔

جیسے ہی صبح کی روشنی نمودار ہوئی شاہ بابا کے مزار کا دروازہ کھلا، صوفی صاحب نے گلاب کے تازہ پھول منگوائے، انہیں قبر پر پھیلایا اور دعا پڑھ کر وہاں سے باہر نکل آئے۔ امجد نے ان کے پیچھے جانا چاہا مگر وہ اسے دیکھے بغیر مزار کے پیچھے اپنے حجرے میں چلے گئے۔ امجد ان کے پیچھے چلا گیا مگر انھوں نے دروازہ بند کر لیا وہ پھر مایوس سا ان کے حجرے کے باہر بیٹھ گیا۔ دن کافی چڑھ گیا تھا۔ امجد کو بھوک ستانے لگی تو وہ صحن میں آ گیا.....چند لوگ مزار کے صحن میں موجود تھے، انہیں ناشتہ دیا جا رہا تھا، وہ بھی بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگا اور ناشتے سے فارغ ہو کر دوبارہ صوفی صاحب کے حجرے کے پاس گیا، مگر دروازہ باہر سے بند تھا۔ صوفی صاحب جا چکے تھے۔ وہ انتہائی پریشان ہونے لگا اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگیں، اس نے مایوسی سے آسمان کی طرف دیکھا۔ ''یہ.....یہ.....سب کیا ہو رہا ہے.....میں نہ تو یہاں سے جا سکتا ہوں اور نہ ہی بیٹھ کر انتظار کر سکتا ہوں، کیا کروں.....؟'' اس نے بے بسی سے سوچا۔ اس کا دل مایوسی اور اضطراب سے بے قرار ہونے لگا۔

''مجھے پھر کھیتوں میں جانا چاہئے.....وہ ضرور وہاں گئے ہوں گے.....'' اس نے سوچا اور مزار کے احاطے سے باہر نکلنے لگا۔

"اگر وہ وہاں نہ ہوئے.....تو......؟" اس سوچ نے اس کے قدم جکڑ لئے اور اس نے ایک دو لوگوں سے صوفی صاحب کے بارے میں پوچھا۔

"آج.....وہ کھیتوں میں نہیں گئے....."

"پھر.....کہاں گئے؟"

"معلوم نہیں.....وہ بتا کر نہیں گئے۔"

امجد بے حد مایوس ہوا اور واپس مزار کے صحن میں آ کر انتظار کرنے لگا۔ پہلے رات نہیں گزر رہی تھی اور اب دن گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس کا دل اس قدر بے قرار ہو رہا تھا کہ پھٹنے کو تیار تھا۔ اس کی آنکھوں میں بار بار آنسو آ رہے تھے۔

"کیا اللہ والے..... لوگ ایسے ہوتے ہیں..... جو دوسروں کے احساسات کی پروا نہیں کرتے..... انہیں ذرا بھی احساس نہیں ہوتا کہ لوگ کتنی مشکل سے ان تک پہنچتے ہیں....." امجد کے دل نے شکایت کی اور اس نے گہری سانس لی۔

امجد نے انتہائی مفلسی میں بچپن گزارا تھا۔ اس کے ماں باپ غریب مزارعے تھے، جو دن شروع ہونے سے پہلے کھیتوں میں چلے جاتے اور رات گئے گھر واپس لوٹتے۔ اتنی محنت کا صلہ صرف انہیں اناج کی صورت میں ملتا اور اگر چند روپے ملتے بھی تو اس کے عوض ان سے اتنا کام کروایا جاتا کہ تھکے ہارے گھر لوٹتے تو اٹھنے کی ہمت نہ ہوتی۔ امجد نے انتہائی محرومی اور کسمپرسی میں وقت گزارا تھا۔ بہت مشکل سے تعلیم حاصل کر کے وہ شہر چلا گیا تھا اور شہر میں مختلف جگہوں پر نوکری کر کے اس نے اپنی تعلیم مکمل کی تھی۔ زندگی بھر اتنی محنت کا صلہ اس کے ماں باپ کو کیا ملا تھا......؟

دونوں سچے اور نیک انسان تھے..... مگر نہ کبھی نیکی نے اُن کی قسمت بدلی تھی اور نہ ہی سچائی نے..... ان کی زندگیوں میں کبھی ہرے دن نہیں آئے تھے اور اس نے خود کتنی محنت سے تعلیم حاصل کی تھی وہ ہونہار اور لائق طالب علم رہا تھا، اس سے کم ذہین لڑکے اس سے آگے نکل جاتے...... اور وہ ہر بار مایوسیوں کا شکار ہو جاتا......اور جب اس نے نوکری شروع کی تھی تو ہر طرف اس کی قابلیت کے ڈنکے بجنے لگے۔

اسے خدا سے اتنے شکوے اور شکایتیں تھیں کہ کبھی کبھار وہ شرمندہ بھی ہو جاتا اور باغی بھی، وہ ہر وقت اندر ہی اندر خدا سے ناراض رہتا...... جب لوگ اللہ کی مصلحتوں اور اس کی حکمتوں کی تعریفیں کر رہے ہوتے تو وہ خاموشی سے وہاں سے چلا جاتا...... اللہ اس کے اندر موجود تھا...... ایک رقیب کی طرح......ایک ایسی طاقت کی طرح...... جو بہت قوتوں کا مالک ہے۔ مگر وہ طاقت اس کے لئے نہ تو بہتر سوچتی تھی اور نہ کچھ بہتر کرتی تھی۔ وہ ایسی خاموش قوت کی مانند تھی جو اس کی اذیتیں اور تکلیفیں بڑھا کر خوش ہوتی تھی...... جس نے انسان کو تماشا بنا رکھا ہے...... جس نے انسان کو زندگی کے گورکھ دھندوں میں الجھا کر اس کی تکلیفیں بڑھائی ہیں...... جو انسان کو خوش نہیں دیکھ سکتا اور اگلے ہی لمحے اسے کسی ایسی آزمائش اور اذیت میں ڈال دیتا ہے، جس سے اس کی ساری خوشیاں ختم ہو جاتی ہیں...... جو کسی بھی لمحے انسان کو پر سکون نہیں ہونے دیتا...... جس نے زندگی کو انسان کے لئے اتنا مشکل بنا دیا ہے کہ وہ اس سے فرار بھی نہیں حاصل کر سکتا...... مرنا چاہے تو اپنی مرضی سے مر بھی نہیں سکتا...... اس نے انسان کو آکٹوپس کی طرح ایسے شکنجے میں جکڑ دیا ہے، جس سے رہائی ممکن نہیں...... وہ تب ہی اسے اپنے شکنجے سے آزاد کرے گا جب انسان مر جائے گا۔ ہر طرف مجبوری، بے بسی اس کی اذیتیں بڑھاتی رہتی ہیں۔

''نجانے کن ناکردہ گناہوں کی سزا انسان اس دنیا میں بھگت رہا ہے۔'' وہ بے بسی سے سوچتا۔ وہ یقین اور بے یقینی کے درمیان سفر کرتا تھا۔ دن کا زیادہ حصہ وہ اللہ سے شکوے، شکایتیں کرتا اور کبھی کبھار اس کے بارے میں پر امید ہو کر مثبت انداز میں سوچنے لگتا...... مگر امید کا وہ لمحہ بہت ناپائیدار ثابت ہوتا اور اگلے ہی لمحے وہ پھر مایوس ہو جاتا، منفی سوچیں اور مایوسیاں اس کو ہر وقت اتنا مضطرب، اداس اور پریشان رکھتیں کہ وہ ہنسنا بھول گیا تھا...... اور ان منفی سوچوں نے اسے قدرے بداعتماد بھی بنا دیا تھا، کیونکہ جو وہ سوچتا تھا اور جو نظریات اس نے خود سے گھڑ لئے تھے۔ دوسرے اکثر ان کو جھٹلا دیتے اور ان کو رد ہوتے دیکھ کر وہ اور مایوسی کا شکار ہو جاتا۔

''زندگی اس سے کیا کھیل...... کھیل رہی تھی...... وہ خود نہیں جانتا تھا مگر وہ زندگی سے بے حد مایوس ہو چکا تھا...... اور سب سے زیادہ اپنے آپ سے...... انسان سے اور اس سے بڑھ کر اللہ سے......''

سارا دن انتہائی اضطراب میں گزرا...... شام ہوئی تو اس نے شکر ادا کیا، کیونکہ صوفی صاحب کے آنے کی امید بندھ گئی تھی۔ رات گئے صوفی صاحب آئے اور شاہ بابا کے مزار کے اندر داخل ہونے لگے۔ امجد دروازے کے ساتھ کھڑا ان کا انتظار کر رہا تھا۔

''تم...... ابھی تک گئے نہیں؟'' صوفی صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں......'' اس نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

''کیوں......؟''

امجد نے سر جھکا لیا اور خاموش ہو گیا۔ صوفی صاحب نے بغور اس کی جانب دیکھا اور خاموشی سے اندر چلے گئے، اس نے بھی جانے کی کوشش کی، لیکن اسی آدمی نے اسے روک لیا، جس نے اسے کل روکا تھا اور جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ امجد مایوس ہو کر پھر مزار کے صحن میں چٹائی پر بیٹھ گیا۔ ''ایسا کب تک ہوتا رہے گا...... اللہ بھی سنگدل ہے اور اللہ والے بھی۔'' اس نے نم آنکھوں سے تاریک آسمان کو دیکھتے ہوئے اپنے دل میں کہا اور سسکنے لگا۔

''تمام نوری مخلوق نے چونک کر اس کی آواز سنی...... انسان کی اتنی جرأت اور بے باکی...... کہ وہ برملا اللہ کی شان میں گستاخی کر رہا تھا۔ انہوں نے گھبرا کر سفید روشنی کی جانب دیکھا...... انہیں امید تھی کہ اب کی بار بڑی سرکار ضرور جلال میں آئے گی اور ممکن ہے ایسے گستاخ انسانوں کو نیست و نابود کر دے...... مگر سفید روشنی اسی طرح پرسکون انداز میں چمک رہی تھی...... اس کی روشنی میں جلال دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ حیران رہ گئے...... کہ...... بڑی سرکار انسان کو کس قدر مہلت اور چھوٹ دیتی جا رہی ہے...... نہ تو اتنے انسانوں کے شکوے، شکایتوں پر جلال میں آئی اور نہ ہی اس شخص کو پکڑ میں لیا، جو کتنا بڑا گستاخ اور بے ادب تھا...... بلکہ انہیں روشنی میں سے ٹھنڈک سی نکلتی محسوس ہوئی...... جیسے کوئی حلیم اور بردبار ہستی، چھوٹے اور بے ادب لوگوں کی نافرمانیوں کو انکی نادانیاں سمجھ کر مسکرا دے۔

''اللہ...... تو...... بہت ظالم ہے...... ہم انسانوں کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ ہم پر ظلم کرے...... تو اپنی تسکین کے لئے...... ہم انسانوں کو مجبور اور بے بس کر کے...... مجرم بنا کر اپنے سامنے ہر وقت کٹہرے میں کھڑا رکھتا ہے...... ہم انسان تیرے ہاتھ میں کٹھ پتلیاں ہیں۔ جن کی ڈوریں تیرے ہاتھ میں ہیں اور تو ہمارے ساتھ کھیل...... کھیلتا رہتا ہے...... ہمارے آنسوؤں پر مسکراتا ہے۔ تجھے ہم پر ذرا بھی رحم نہیں آتا...... تو بہت جابر

ہے..... بہت ظالم" امجد انتہائی غصے میں بڑبڑانے لگا۔

"نوری مخلوق نے گھبرا کر ایک دوسرے کو دیکھا "انسان"...... جسے فخر سے شاہکار بتایا جاتا ہے...... وہ اس قدر بے ادب، گستاخ اور بدتمیز ہے کہ اس کی شان میں گستاخی پر گستاخی کرتے جا رہا ہے۔

اب بڑی سرکار اسے نہیں چھوڑے گی...... اور اس سرکش کو عبرت ناک سزا دے گی۔" انہوں نے سوچا ہر طرف گہرا سکوت چھا گیا تھا۔

"اللہ بہت بے رحم ہے..... وہ ہم انسانوں پر ذرا سا رحم نہیں کرتا..... ہمیں اذیتیں دے کر خوش ہوتا ہے..... اگر ہمارے ساتھ یہی کرنا تھا تو ہمیں پیدا ہی کیوں کیا..... خود ہی پیدا کر کے..... خود ہی ہمیں مصیبتوں میں ڈال دیا ہے..... اور..... اگر ہم روئیں..... چلائیں..... شکوے کریں..... تو ہم گنہگار......

یہ کیسا انصاف ہے......؟"

ہمیں تو نے دیا کیا ہے..... ؟ ہر شے تو نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے..... جسے چاہتا ہے تو عطا کرتا ہے..... جس سے چاہتا ہے تو چھین لیتا ہے..... جو سچائی اور نیکی کے راستے پر چلنا چاہتا ہے زیادہ تکلیفیں ملتی ہیں..... اور تو ایک بار نہیں..... بار بار آزماتا ہے..... انسان کو تو اتنا بے بس، مجبور بنا کر کہتا ہے "میں نے انسان کو اچھا..... اور برا کام کرنے کا اختیار دیا ہے؟ انسان کے پاس اختیار ہے ہی کب..... ؟ وہ اپنی مرضی سے کر ہی کیا سکتا ہے......؟"

"کچھ بھی نہیں..... کچھ بھی نہیں امجد کا دل چلا چلا کر واویلا کرنے لگا اور اس کی آنکھوں سے آنسو شدت سے رواں ہو گئے۔ وہ سسکیاں بھرنے لگا۔

تمام نوری مخلوق اس کے واویلا کرنے کی آوازیں اور اس کے شکوے سن کر چونک رہی تھی..... امجد کے ہر لفظ پر وہ حیران ہو رہے تھے۔

"انسان..... کس قدر گستاخ اور بے ادب ہے..... کہ بات کرتے ہوئے سوچتا بھی نہیں کہ وہ کس عظیم الشان ہستی سے مخاطب ہے..... ادب و لحاظ تو ایک جانب..... وہ اپنی ہر بری بات..... ہر محرومی..... کا الزام اللہ کو دے رہا ہے..... مگر بڑی سرکار ہمیشہ کی طرح پرسکون تھی..... یوں جیسے مسکرا رہی ہو..... اور ان کے لئے یہ بات بہت حیران کن تھی کہ بڑی سرکار..... اس گستاخ انسان کی باتوں پر ذرا سی بھی ناراض نہیں ہو رہی...... آخر کیوں......؟ کیا وجہ ہے......؟"

کیا بڑی سرکار کو اپنے اس شاہکار انسان سے اتنی محبت ہے کہ اس کی ہر بری بات کو نظر انداز کر رہی ہے..... اس کو کچھ بھی کہنے سے نہیں روک رہی اور اس کی خاطر اس نے ان کے لیڈر کو دھتکار دیا بڑی سرکار کو انسان سے اتنی محبت کیوں ہے؟ کیوں......؟

ان کا لیڈر بھی بڑی سرکار سے بہت محبت کرتا تھا اور جب انسان اس محبت میں شریک ہوا تو وہ انسان کا دشمن بن گیا...... اور جب اس نے انسان سے دشمنی کا اعلان کیا تو وہ خود اس کے خلاف انسان کا محافظ بن گیا..... وہ ہر لمحے اور ہر موقع پر انسان کی ڈھال بن رہا تھا..... تمام نوری، ناری، آبی اور بے شمار مخلوقات کا خالق صرف خاکی مخلوق کے لئے اتنا نرم گوشہ اور اتنی محبت دکھا رہا تھا کہ ان کی اتنی بڑی بڑی غلطیوں اور گستاخیوں پر ان کو پکڑ نہیں رہا تھا۔

''اتنی محبت......اس 'انسان' کے لئے......؟'' ان کے اندر شکوک وشبہات پیدا ہونے لگے......انہیں اس محبت کی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی اور وہ بہت مضطرب اور پریشان ہونے لگے۔ صوفی صاحب نے رات بھر مزار پر گزاری اور صبح شاہ بابا کے مزار پر پھول ڈال کر اور دعا مانگ کر اپنے حجرے میں چلے گئے......امجد اپنی نگاہوں کو حجرے کے دروازے پر مرکوز کئے بیٹھا رہا کہ جیسے ہی دروازہ کھلے گا وہ ان کے پاس چلا جائے گا......مگر اچانک ایک آدمی نے اسے اس کی جگہ سے ہٹا دیا اور صفائی کرنے لگا......وہ اٹھ کر دوسری جگہ بیٹھا تو اس شخص نے اسے وہاں سے بھی اٹھا دیا۔ امجد کو سخت غصہ آنے لگا......اسے اپنی انتہائی تذلیل محسوس ہونے لگی اور وہ اٹھ کر مزار سے باہر آ گیا۔ صوفی صاحب اس کے پاس سے گزر گئے اور اسے خبر ہی نہیں ہوئی۔ وہ کافی دیر انتظار کرتا رہا اور ان کے حجرے کی جانب گیا مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ ''صوفی صاحب تو کھیتوں میں چلے گئے ہیں۔'' ایک شخص نے بتایا۔ امجد بہت سٹپٹایا اور اسے پھر غصہ آنے لگا۔ آج اسے تیسرا دن ہونے کو تھا اور صوفی صاحب اس سے ٹھیک طرح سے بات بھی نہیں کر رہے تھے......اسے ان پر بھی بہت غصہ آ رہا تھا مگر اس کا دل اس قدر مضطرب تھا کہ وہ اس حالت میں گھر واپس جانا بھی نہیں چاہتا تھا......وہ عجیب دوراہے پر کھڑا تھا۔

''مجھے ایک بار پھر کوشش کرنی چاہئے......آخری بار اور پوری طرح......'' امجد نے سوچا اور کھیتوں کی جانب چلنے لگا۔ وہ اپنی ہی سوچوں میں مگن کبھی اپنے آپ کو برا بھلا کہتا......اور کبھی اللہ سے شکوے، شکایتیں کرتا ہوا......کچی سڑک پر چل رہا تھا۔ اچانک ایک بارہ، تیرہ سالہ لڑکا بہت تیزی سے سائیکل چلاتا ہوا اس کے پاس سے گزرا، وہ بہت مستی میں پر جوش انداز میں زگ زیگ سائیکل چلا رہا تھا......اچانک وہ امجد سے ٹکرایا، امجد سڑک پر گر گیا۔ لڑکا جھینپنے لگا اور اٹھ کر پھر سائیکل پر سوار ہو کر جانے لگا۔ امجد کو اس کی حرکت پر انتہائی غصہ آیا اور اس نے لڑکے کو گریبان سے پکڑ کر مارنا شروع کر دیا، امجد کے اندر جتنا غصہ بھرا تھا وہ سب اس لڑکے پر نکال رہا تھا، کبھی اسے گھونسوں سے مارتا......کبھی لاتوں سے لڑکے کے ناک منہ سے خون نکلنے لگا۔

''اللہ کے واسطے......معاف کر دو......غلطی ہو گئی......؟'' وہ لڑکا اس کے آگے گڑگڑانے لگا......مگر امجد کا غصہ کسی طرح ٹھنڈا ہی نہیں ہو رہا تھا۔

''معاف کر دو......رحم کرو......آئندہ نہیں کروں گا۔'' لڑکا پھر گڑگڑایا۔

''زندہ رہو گے......تو تب نا......میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' امجد نے اسے زمین پر لٹایا اور اس کی گردن پر اپنا پاؤں رکھ دیا۔

''اللہ کے واسطے......اتنے بے رحم......اتنے ظالم نہ بنو......اللہ میاں مجھے اس ظالم انسان سے بچا۔'' اس لڑکے نے روتے ہوئے آسمان کی جانب دیکھ کر کہا۔

نوری مخلوق انتہائی حیرت سے دیکھ رہی تھی کہ کچھ دیر پہلے خدا سے شکوے، شکایتیں کرنے والا شخص......اللہ کو ظالم اور بے رحم کہنے والا خود کس قدر سنگدل، ظالم اور بے رحم تھا کہ ایک بچے کی چھوٹی سی غلطی معاف نہیں کر رہا تھا۔ اسے نہ اس کے آنسوؤں پر رحم آ رہا تھا......نہ اس کے گڑگڑا کر معافی مانگنے پر......اور نہ اس کے خون رستے زخموں پر......

''انسان......کیسی عجیب مخلوق ہے......خود تو اچھائیوں اور کامیابیوں کا طلب گار رہتا ہے اور دوسروں کی ذرا سی خطائیں معاف نہیں کر سکتا......اس قدر کم ظرف انسان......اس قدر جھگڑالو......'' وہ حیرت سے سوچنے لگے۔

''اللہ کے واسطے......چھوڑ دو......دوبارہ کبھی اس راستے پر نہیں آؤں گا۔'' وہ لڑکا پھر گڑگڑایا مگر امجد اسے چھوڑنے کو تیار ہی نہیں تھا۔

اچانک ایک آوارہ کتا کہیں سے بھاگتا ہوا آیا وہ انتہائی تیز رفتاری سے بھاگ رہا تھا اور مسلسل بھونک رہا تھا۔ امجد اسے اپنی جانب آتے ہوئے دیکھ کر ڈر گیا اور فوراً پیچھے ہٹ گیا، وہ لڑکا جلدی سے اٹھ کر امجد پر ہنسنے لگا۔

''آیا...... بڑا...... تمیں مار...... کتے سے ڈر گیا۔'' اور کہہ کر جلدی سے اپنی سائیکل پر سوار ہوا اور یہ جا...... وہ جا...... کتا بھی بھاگتا ہوا دور نکل گیا...... مگر امجد اپنی جگہ...... انتہائی شرمندہ اور پریشان ہو رہا تھا، وہ بچپن سے ہی کتوں سے بہت ڈرتا تھا...... وہ سر جھٹک کر منہ بناتا ہوا اپنے راستے پر چلنے لگا۔

''بڑ ہانکنا شیخیاں بگھارنا، انسان کی اوقات...... بس اتنی ہی ہوتی ہے...... اتنا کمزور...... اور ناتواں''

''انسان اندر سے کتنا کمزور ہے۔'' نوری مخلوق نے سوچا اور حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔

صوفی صاحب کھیتوں میں گندم کی کٹائی میں مصروف تھے۔ انہوں نے وہی پرانا تہبند اور سوتی بنیان پہن رکھی تھی پورا جسم پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ امجد ان کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا...... وہ اپنے کام میں مصروف رہے۔

''آپ...... مجھ سے بات کیوں نہیں کرتے......؟'' امجد نے قدرے خفگی سے کہا۔

''تم...... خود سے اتنی باتیں کر لیتے ہو...... تمہیں کسی کی کیا ضرورت......؟'' صوفی صاحب نے اس کی جانب دیکھے بغیر جواب دیا۔

امجد ایک دم چونک گیا۔

''میں آپ سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔'' امجد نے کہا۔

''انسان کے شکوے اور شکایتیں کبھی ختم نہیں ہوتیں۔'' صوفی صاحب نے لمبی آہ بھر کر کہا۔

امجد نے انتہائی حیرت سے ان کی جانب دیکھا اور یوں شرمندہ ہونے لگا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔ اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔

''م...... مم...... میں......؟'' وہ بمشکل بولا۔

''انسان بڑا ہی تنگ دل اور کم ظرف ہے...... وہ چیزیں مانگتا ہے جو خود دینا نہیں چاہتا۔'' صوفی صاحب نے گندم کا گٹھا باندھتے ہوئے اپنے آپ سے کہا تو امجد گھبرا گیا۔

''انسان سے بڑھ کر ظالم...... بے رحم اور جاہل کوئی نہیں۔'' صوفی صاحب پھر معنی خیز انداز میں آہستہ آواز میں بولے۔

امجد کے چہرے پر پسینہ آنے لگا...... کچھ دیر پہلے جو کچھ ہوا تھا...... وہ اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔

''اگر اللہ اور اس کی مصلحتیں انسان کے درمیان میں نہ آئیں تو زمین پر ہر طرف فتنہ و فسادی ہو۔'' امجد کو ایک دم بھاگتا ہوا کتا یاد آنے لگا...... اس نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچے۔

''انسان بڑا ہی گنہگار اور بے ادب ہے...... جو زبان دیتا ہے...... جو بولنا سکھاتا ہے...... اس کے خلاف ہی بولتا ہے...... ہے نا...... ناشکری کی بات......؟

واہ......واہ...... کیا کہنا بھئی......انسان کا......ذرۂ خاک بڑھ بڑھ کر آفتاب سے جھگڑتا ہے......" صوفی صاحب نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"بس کریں......صوفی صاحب......معاف کردیں۔" امجد شرمندگی سے اپنے دونوں ہاتھ ان کے سامنے باندھ کر رونے لگا۔

"کیا ہوا......؟" میں نے تمہیں تو کچھ نہیں کہا......اور میں کون ہوتا ہوں......تمہیں معاف کرنے والا......میری اوقات ہی کیا ہے؟ صوفی صاحب نے سر پر رکھے کپڑے سے اپنے چہرے کا پسینہ صاف کرتے ہوئے کہا اور دوبارہ گندم کاٹنے میں مصروف ہو گئے۔ امجد کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا......سوائے ندامت کے آنسو بہانے کے......

"جانتے ہو برائی کی جڑ کیا ہے......؟" کافی دیر بعد صوفی صاحب نے امجد کی جانب دیکھا جو بہت پشیمان ان کے پاس بیٹھا تھا......اس کا جسم بھی دھوپ میں جل رہا تھا مگر وہ خاموش تھا۔ اس کے اندر جو بے قراری اور اضطراب تھا اس کی جلن...... دھوپ کی جلن سے کہیں زیادہ تھی۔

"انسان کا اپنے آپ کو بھول جانا" صوفی صاحب کہہ کر پھر خاموش ہو گئے۔

"ہوس ہر شے کی کرنا...... مانگنا بہت کچھ...... نہ ملنے پر واویلا کرنا...... اور یہ بھی نہ سوچنا کہ میرا کشکول اس قابل ہے بھی کہ نہیں...... بھئی...... پہلے اپنے آپ کو اس قابل تو بنا لو...... نہ ملے...... تو پھر کہنا...... مانگنا سب کچھ......اور سنبھال کچھ بھی نہ سکنا...... ہے نا عجیب بات؟" صوفی صاحب اپنے آپ سے بولے تو امجد نے چونک کر ان کی جانب دیکھا۔ اسے محسوس ہونے لگا جیسے صوفی صاحب نے اس کی ایک بہت بڑی کمزوری پکڑی ہو......اس کے اندر بچپن سے ہی ہوس اور حسد بہت زیادہ تھی وہ ہر وقت دوسروں کی چیزیں اور دولت دیکھ کر کڑھتا تھا...... جو دوسروں کو ملا ہے......اسے کیوں نہیں ملا...... اس سے کم اہلیت والے لوگ آگے نکل گئے ہیں......اس کی ساری زندگی ایسی منفی سوچوں کی نذر ہوئی تھی۔ امجد کا چہرہ شرمندگی سے انتہائی سرخ ہونے لگا اور اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے صوفی صاحب اس کے دل کے ایک ایک خانے میں جھانک رہے ہوں اور اس کے دل میں چھپی کدورتوں، نفرتوں اور کینے کو باری باری نکال کر اسے دکھا رہے ہوں، وہ جو ہمیشہ اپنے آپ کو بے قصور اور مظلوم سمجھتا تھا......اپنے آپ کو بے ضرر خیال کرتا تھا۔ اب خود ہی اپنے آپ کو سب سے بڑا ظالم، جابر اور کمینہ تصور کر رہا تھا......اسے اپنے آپ سے نفرت اور کراہت محسوس ہونے لگی۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر اس کی زبان نے اس کا ساتھ نہ دیا۔

"جاؤ......میاں......یہاں سے......تم کیا سمجھو گے......ان باتوں کو......؟" صوفی صاحب نے کہا اور کٹی ہوئی گندم کا دوسرا گٹھا باندھنے لگے۔

"صوفی......صاحب......جلدی......آیئے......" ایک درمیانی عمر کا مزارع انتہائی تیزی سے چلاتا ہوا صوفی صاحب کی جانب بھاگتا ہوا آ رہا تھا۔

"خیر......تو ہے......اکبر علی......" صوفی صاحب نے اس کی جانب متوجہ ہو کر پوچھا۔

"صوفی صاحب......میرے چھوٹے بیٹے نے چوہے مار گولیاں......کھا لی ہیں......وہ......انہیں میٹھی گولیاں سمجھ کر کھا گیا ہے خدا کے لئے جلدی چلیں......اور اس کا کچھ علاج کریں......ورنہ وہ مر جائے گا۔" اکبر علی بلند آواز سے رونے لگا۔ صوفی صاحب سب کچھ وہیں چھوڑ کر اس کے ساتھ چلے گئے اور امجد بھی ان کے پیچھے چل پڑا، وہ مزارع کھیتوں میں جانوروں کے باڑے کے پاس ایک جھونپڑی میں رہتا تھا۔ اس کی بیوی

بچے جانوروں کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ پانچ سالہ بچہ چارپائی پر آنکھیں بند کئے لیٹا تھا۔ اس کا سارا جسم نیلا ہو رہا تھا۔ اس کی ماں اس کے پاس بیٹھی بلند آواز سے رو رہی تھی...... اور اسے آوازیں دے رہی تھی۔ "صوفی صاحب کو دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"صوفی صاحب...... اللہ کے واسطے...... کچھ کریں...... میرے بیٹے کو بچالیں۔" اس عورت نے دونوں ہاتھ باندھ کر کہا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"بی بی...... بچانے والی اللہ کی ذات ہے...... سب دعا کرو...... میں بھی دعا کرتا ہوں اور صوفی صاحب نے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعا کے لئے اپنے دونوں ہاتھ بلند کئے۔ وہاں موجود تمام لوگوں نے بھی دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے...... امجد بھی پاس کھڑا دیکھتا رہا۔ اس نے ہاتھ بلند تو نہ کئے مگر ہاتھوں کا رخ آسمان کی جانب کر دیا۔ صوفی صاحب آہستہ آہستہ آنکھیں بند کئے دعا پڑھتے رہے اور باقی سب لوگ بھی دعا کرتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد صوفی صاحب نے آنکھیں کھولیں اور بچے پر دم کیا۔

"بی بی...... تھوڑا سا پانی لاؤ......" صوفی صاحب نے عورت سے کہا اور وہ بھاگ کر ایک گلاس میں پانی لے آئی۔ انہوں نے پانی پر کچھ پڑھ کر پھونک ماری...... "اسے بچے کو پلا دو...... ٹھیک ہو جائے گا...... گھبرانے کی بات نہیں۔" صوفی صاحب یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور اس عورت نے بچے کو تھوڑا تھوڑا پانی پلایا۔ کچھ اس کے اندر گیا اور کچھ منہ سے باہر نکل گیا۔ "اب...... میں چلتا ہوں۔" صوفی صاحب نے کہا۔

"نہیں...... صوفی صاحب...... ابھی نہیں...... پہلے اسے ٹھیک ہو لینے دیں...... میں آپ کو یوں جانے نہیں دوں گی۔" اس عورت نے گھبرا کر کہا تو صوفی صاحب خاموش ہو گئے اور بچے کی طرف بغور دیکھنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد بچے کے جسم میں تھوڑی سی حرکت پیدا ہوئی...... تو اس عورت نے خوش ہو کر صوفی صاحب کی جانب دیکھا۔

"ٹھیک ہو جائے گا...... فکر نہیں کرو۔" صوفی صاحب نے انتہائی نرم لہجے میں کہا۔

"تھوڑی دیر بعد بچہ زور سے ہلا اور اٹھ کر قے کر دی، اس کے اندر سے گندا سا مادہ خارج ہوا۔ بچہ پھر آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا، جیسے پرسکون ہو گیا ہو۔

"اب یہ بالکل ٹھیک ہے...... زہر اس کے جسم سے نکل چکا ہے...... بچہ ٹھیک ہو جائے تو اللہ کے حضور سجدہ شکر ادا کرنا...... وہ بہت کرم کرنے والا ہے...... سب اسی کا کرم ہے...... کہ بچہ ٹھیک ہو گیا۔" صوفی صاحب نے کہا اور بچے کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیر کر چلے گئے۔

امجد نے ایسا منظر اپنی زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ بچے کا زندہ بچ جانا کسی معجزے سے کم نہیں تھا، وہ صرف سائنس پر یقین رکھتا تھا اور چیزوں کے کیمیائی رد عمل کے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے اچھی طرح دیکھا تھا کہ زہر بچے کے ناخنوں تک پھیل چکا تھا۔ موت اور زندگی میں صرف چند قدم کا فاصلہ تھا...... اور اس مرحلے پر بچے کا زندہ بچ جانا کیسے ممکن ہے......؟ یہ یقیناً صوفی صاحب کی دعا کے سبب ہوا......

کیا دعاؤں میں اتنی قوت ہوتی ہے کہ انسان کو موت کے چنگل سے بچا کر لے آئے...... یا...... پھر...... صرف صوفی صاحب کی دعا میں اتنا اثر ہے...... وہ جوں جوں غور و فکر کر رہا تھا، چونک رہا تھا اس کے اندر عجیب سی کشمکش پیدا ہونے لگی تھی...... بہت مبہم اور پراسرار مگر پر کیف سی

کیفیت...... جسے وہ کوئی نام نہیں دے سکتا تھا...... بس محسوس کرسکتا تھا۔ اس نے...... اس کے اندر اضطراب پیدا کر دیا تھا...... صوفی صاحب جا چکے تھے اور وہ وہیں کھڑا بچے کو بغور دیکھ رہا تھا۔ ماں نے بچے کو ہلایا اور اس نے تھوڑی دیر بعد آنکھیں کھول دیں۔ ماں نے خوش ہو کر اسے سینے سے لگایا اور پیار کرنے لگی۔ محبت بھرا یہ منظر دیکھ کر اسجد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اس کی آنکھوں میں بھلا آنسو کیوں آنے لگے تھے...... اس نے خود ہی سوچا اور اپنی انگلیوں کی پوروں سے اپنی آنکھوں کی نمی کو صاف کر کے وہاں سے چلا گیا۔ وہ کھیتوں میں واپس آ کر صوفی صاحب کو تلاش کرنے لگا مگر وہ اسے وہاں نہ ملے۔ اس نے ایک دو لوگوں سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ صوفی صاحب شاہ بابا کے مزار پر گئے ہیں۔

اس وقت......؟ ابھی سہ پہر بھی نہیں ہوئی تھی اور صوفی صاحب تو رات کو شاہ بابا کے مزار پر جاتے تھے، دو راتیں مزار پر گزارنے سے انہیں ان کے معمول کا پتہ چل گیا تھا۔

''کبھی...... کبھی وہ جلدی چلے جاتے ہیں۔'' ایک شخص نے بتایا۔

''صوفی صاحب...... شاہ بابا کے مزار پر کب سے ہیں؟'' اسجد نے اس شخص سے پوچھا۔

''پندرہ...... سولہ سال...... یا اس سے بھی زیادہ عرصہ گزر گیا ہے...... معلوم نہیں ہے...... جب یہاں آئے تو جوان تھے اب تو اپنی عمر سے بھی زیادہ بوڑھے ہو گئے ہیں۔'' اس شخص نے جواب دیا۔

''کیا ان کی زندگی کا یہی معمول ہے...... کھیتوں میں کام کرنا اور شاہ بابا کے مزار پر حاضری دینا۔'' اسجد نے پوچھا۔

''ہاں...... بہرام خان نے تو ان کو کئی بار کہا ہے کہ وہ بس مزاروں کی نگرانی کریں...... کھیتوں میں کام نہ کریں...... وہ ان کو روپیہ، پیسہ سب کچھ دیں گے...... مگر صوفی صاحب اپنی محنت سے زیادہ ایک روپیہ لینا بھی حرام سمجھتے ہیں...... ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جن کے اندر ذرا سا بھی لالچ اور ہوس نہیں ہوا۔ انہوں نے تو کبھی مزار پر تقسیم ہونے والے لنگر سے کھانا نہیں کھایا۔ اپنے حجرے میں جا کر خود اپنے ہاتھوں سے روٹی پکا کر کھاتے ہیں...... صوفی صاحب...... سونا آدمی ہیں...... سونا بالکل خالص۔'' اس شخص نے بتایا۔

''اور ان کے بیوی بچے...... گھر بار......؟'' اسجد نے سوال کیا۔

''معلوم نہیں...... یہاں تو اکیلے ہی آئے تھے...... اور اب تک اکیلے ہی ہیں...... بہت نیک اور شریف انسان ہیں۔ کسی کی طرف کبھی نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا......'' وہ شخص بولا۔

''کیا...... صوفی صاحب اللہ والے ہیں؟'' اسجد نے تصدیق کرنا چاہی۔

''تم اللہ والے، کسے کہتے ہو؟'' اس شخص نے پوچھا تو اسجد بوکھلا گیا۔

''میں...... وہ......؟ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا جواب دے اسے تو خود معلوم نہیں تھا کہ ''اللہ'' کیا ہے؟ اور ''اللہ والے'' کیا ہوتے ہیں۔ اسے تو بس لفظوں سے آشنائی تھی...... ان کی حقیقت تو وہ بالکل بھی نہیں جانتا تھا...... اس نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری...... اور خاموش ہو

گیا۔ ''جنہیں دیکھ کر اللہ یاد آ جائے...... وہی اللہ والے ہوتے ہیں...... صوفی صاحب واقعی اللہ والے ہیں...... دیکھو...... نا...... جس شخص کو نہ کوئی تمنا ہو، نہ لالچ ہو...... نہ دنیا سے کوئی طلب ہو...... اور نہ ہی کوئی تعلق...... تو وہ اللہ والے ہی ہوتے ہیں...... اور جانتے ہو...... ایسے لوگوں کی طرف دل خود بخود کھنچے چلے جاتے ہیں...... ضرور ان میں کوئی ایسی بات ہوتی ہے...... جو ہم...... تم جیسے لوگوں کو سمجھ میں نہیں آتی۔'' اس شخص نے جواب دیا۔

''اچھا...... اب میں چلتا ہوں...... مجھے صوفی صاحب سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔'' امجد نے کہا اور اس شخص کو خدا حافظ کہہ کر چل پڑا۔

وہ سارا راستہ صوفی صاحب کے بارے میں سوچتا رہا...... اس کا دل ان سے ملنے کو بے تاب ہو رہا تھا۔ اس شخص نے ساری باتیں ٹھیک کہیں تھیں...... وہ نہ بھی بتاتا تو اس کا دل انہیں بہت کچھ مان چکا تھا۔ شام ہونے کو تھی جب وہ مزار پر پہنچا...... اسے بہت بھوک لگ رہی تھی اور اس کے جاتے ہی لنگر تقسیم ہونا شروع ہو گیا، مگر اس نے ایک نوالہ کھانا بھی گوارا نہ کیا...... اس نے ایک تک دیکھا اگلے ہی لمحے اس کے پیٹ کی بھوک بڑھنے لگی......

''صوفی صاحب نے آج تک لنگر نہیں کھایا...... حجرے میں اپنے ہاتھ سے خود روٹی پکا کر کھاتے ہیں......''

وہ خاموشی سے مزار کے اندر چلا گیا، وہاں بہت زیادہ لوگ جمع تھے۔ کچھ تلاوت میں مصروف تھے، کچھ ہاتھ بلند کر کے دعا کر رہے تھے اور کچھ قبر پر پھول ڈال رہے تھے، وہ ایک کونے میں خاموش بیٹھ گیا، صوفی صاحب نے آج جو کچھ بھی اس سے کہا تھا، وہ الفاظ اس کے ذہن میں گونج رہے تھے...... اور ان الفاظ کی صداقت کے پیمانے میں اپنی ذات کو جانچ رہا تھا...... ہر بار اس کے پلڑے میں ندامت اور شرمندگی آتی۔

''انسان اپنا محاسبہ کرنے کو خود ہی کافی ہے۔'' اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کا دل بری طرح رو رہا ہو...... مولوی صاحب نے اسے جو کچھ کتاب اللہ سے سنایا تھا اور صوفی صاحب نے جو کچھ کہا تھا...... وہ ایک ایک لفظ کو اپنی ذات کے آئینے میں دیکھ رہا تھا اور اس کا اپنا عکس دھندلا اور بدنما ظاہر ہو رہا تھا۔ وہ کافی دیر اپنے آپ سے الجھتا رہا...... اپنی کسی بات اور عمل کی حمایت میں کوئی دلیل دینے کی کوشش بھی کرتا تو بری طرح ناکام ہوتا...... آج اس کا ضمیر اسے بری طرح پچھاڑ رہا تھا...... آج نجانے اسے کیا ہو گیا تھا کہ وہ اس کی کوئی دلیل نہیں مان رہا تھا یا پھر اس نے پہلے کبھی اپنے ضمیر کو اتنا بولنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔

رفتہ رفتہ مزار خالی ہونے لگا...... لوگ جانا شروع ہو گئے...... رات گہری ہونے لگی...... وہ ایک کونے میں چھپ کر بیٹھ گیا تا کہ وہاں سے آسانی سے دکھائی نہ دے سکے۔ ایک شخص اندر آیا...... ادھر اُدھر دیکھا...... مزار کے اندر کوئی نہیں...... اپنی تسلی کر کے چلا گیا...... تھوڑی دیر بعد صوفی صاحب اندر تشریف لائے، سفید شلوار قمیض میں...... سفید ٹوپی سر پر پہنے انتہائی صاف ستھری اور نکھری نکھری شخصیت لئے ہوئے سلام پڑھتے ہوئے اندر داخل ہوئے...... باہر سے کسی نے دروازے کو کنڈی لگا دی...... صوفی صاحب نے مزار کی تمام روشنیوں کو بند کر دیا...... صرف ایک کونے میں دیوار پر لگے زیرو کے بلب کو روشن رکھا۔ قبر کے سرہانے کی جانب کافی فاصلے پر ایک محراب نما جگہ بنی تھی، صوفی صاحب نے وہاں جانماز بچھائی اور جیسے ہی نماز ادا کرنے کے لئے کھڑے ہوئے۔ امجد نے آہستہ آواز میں ان کو پکارا ''صوفی صاحب......''

انہوں نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ امجد ان کے پاس کھڑا تھا۔

''تم......؟'' وہ انتہائی حیرت سے بولے۔

''ہاں......میں......''

''یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''آپ کا انتظار......''

''جاؤ......یہاں سے......میرا اور اپنا وقت ضائع نہ کرو۔''

''آج میں نہیں جاؤں گا۔''

''فضول باتیں مت کرو......'' صوفی صاحب نے لائٹیں آن کیں اور دروازے کی جانب بڑھے تاکہ دروازہ کھٹکھٹا کر اسے باہر نکالیں۔

''صوفی صاحب......اگر اللہ اور اللہ والے......گنہگاروں کو دھتکار کر خوش ہوتے ہیں......تو......مجھے ضرور باہر دھکا دے دیں۔'' امجد نے آنسوؤں سے لبریز آواز کے ساتھ کہا تو صافی صاحب نے چونک کر اس کی جانب دیکھا......اس کی آنکھوں میں نمی اور چہرے پر بے بسی دیکھ کر خاموش ہو گئے۔

''تم......آخر چاہتے......کیا ہو......؟''

''اپنے اندر کا اضطراب دور کرنا چاہتا ہوں......سکون چاہتا ہوں۔''

صوفی صاحب اس کی بات سن کر خاموش ہو گئے اور جانماز پر جا کر بیٹھ گئے......امجد بھی ان کے پاس بیٹھ گیا۔ صوفی صاحب نے ایک لمحے کو اپنی آنکھیں بند کیں اور اپنے سر کو جھکا دیا۔

''سرکار......یہ شخص ہدایت کا طلب گار ہے......اپنے اندر کا اضطراب دور کرنے مجھ گنہگار کے پاس آیا ہے......میں ذرۂ خاک کہاں اس قابل کہ......اس کا اضطراب دور کر سکوں......میری زبان اور میرے الفاظ سب آپ کی عطا ہیں......میری مدد فرمایئے کہ میں اس کی مدد کر سکوں۔'' صوفی صاحب کے دل نے انتہائی مؤدبانہ انداز میں دعا کی۔

تمام نوری مخلوق چونک گئی اور دم بخود رہ گئی۔ صوفی صاحب کے دل کی آواز بغیر کسی وسیلے اور ذریعے کے سیدھی بڑی سرکار سے مخاطب تھی۔ پہلے بھی لوگ گڑگڑاتے تھے، شکوے، شکایتیں اور واویلا کرتے تھے مگر ان کی آوازیں اس طرح بڑی سرکار سے مخاطب نہیں ہوتی تھیں......جس طرح صوفی صاحب کی آواز تھی......یوں جیسے کوئی دوست دوسرے دوست سے سرگوشی کے انداز میں کسی بات کی اجازت طلب کر رہا ہو۔

وہ سب ٹھٹھکے......انہیں یوں محسوس ہونے لگا کہ بڑی سرکار نے انسان کے شاہکار ہونے کے بارے میں جو دعویٰ کیا تھا......شاید اس دعوے کی سچائی کا وقت قریب آ گیا تھا۔

جو بڑی سرکار نے انسان کی رسائی کے بارے میں فرمایا تھا۔

''وہ فرش پر ہوگا......مگر عرش پر مجھ سے مخاطب ہوگا......باتیں اپنے ہم جنسوں سے کرے گا مگر مشورہ مجھ سے طلب کرے گا وہ اس سے سوال کریں گے......وہ جواب مجھ سے طلب کرے گا۔'' اتنے قرب اور ایسی رسائی کے بارے میں وہ مشکوک ہو گئے تھے۔

مٹی کے انسان کی اتنی رسائی.....اور وہ بھی بڑی سرکار تک.....انہیں بہت ناممکن لگی.....اور اب تک انہوں نے انسانوں کا جتنا مشاہدہ کیا تھا تو ان میں سے اکثریت لاعلم اور جاہل تھی.....جنہیں نہ تو بڑی سرکار کی عظیم الشان ہستی کا کوئی شعور تھا اور نہ ہی کوئی خبر.....اور وہ مطمئن تھے کہ خاکی انسان کی اتنی پرواز ہو ہی نہیں سکتی اور اب وہ انسان کی بلند پروازی دیکھ کر حیران ہو رہے تھے.....اور اس قدر دم بخود تھے کہ انہیں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اگلے لمحے کیا ہونے والا ہے.....؟

انہوں نے حیرت سے سفید روشنی کی جانب دیکھا اس سے کوئی آواز بلند نہ ہوئی۔

صوفی صاحب.....آنکھیں بند کئے بہت عجز و انکساری اور انتہائی مؤدبانہ انداز میں رقت بھری آواز میں گڑگڑا رہے تھے۔

''سرکار.....میری مدد فرمائیے.....اپنی نظر کرم کیجئے.....ہم خطاوار.....گنہگار.....سیاہ کار انسان آپ کی رحمت کے طلب گار ہیں.....''

صوفی صاحب کی بند آنکھوں میں نمی جمع ہونے لگی اور آنکھوں کی نمی ان کے دل کی آواز کو گلوگیر اور رقت آمیز کرنے لگی۔

نوری مخلوق نے محسوس کیا جیسے بڑی سرکار صوفی صاحب کی اس رقت بھری ... گڑگڑاتی آواز سے لطف اندوز ہو رہی ہو۔ سفید روشنی سے ایسی خوشگوار نرم و لطیف چمک سی خارج ہونے لگی..... جو اس سے پہلے کبھی نوری مخلوق نے نہیں دیکھی تھی۔ اس سے خوشگوار اور پرکیف و مسحور کن احساس پیدا ہونے لگا وہ حیران ہو رہے تھے۔ ایسی روشنی کا مشاہدہ انہوں نے پہلے کبھی نہیں کیا تھا.....اور وہ ایک دم چونکنے لگے..... ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی، وہی لطیف اور پرکیف روشنی.....صوفی صاحب کے سینے کو منور کرنے لگی۔ سفید روشنی سے خارج ہونے والی مسحور کن روشنی کی کرنیں صوفی صاحب کے دل کو اپنے حصار میں لینے لگیں اور اس سے ان کا سینہ یوں جگمگانے لگا جیسے کسی نے نور کے فوارے ان کے سینے میں نصب کر دیے ہوں اور ان فواروں سے مختلف قسم کی روشنیاں پھوٹنے لگیں.....

نوری مخلوق گھبرا گئی.....دم بخود رہ گئی.....ایسا قرب.....ایسی رسائی.....انہیں یقین نہیں آ رہا تھا.....

انسان پر اللہ کے لطف و کرم اور رحمتوں کی اتنی نوازش دیکھ کر وہ چونکنے لگے.....کپکپانے لگے.....انسان ان سے آگے بڑھ رہا تھا.....قدم بہ قدم.....لمحہ بہ لمحہ.....ان کے اندر اضطراب پیدا ہونے لگا۔

''نجانے.....اس قرب کی انتہا کیا ہونے والی ہے.....؟ یہ سوچ کر وہ مزید مضطرب ہو گئے۔

صوفی صاحب نے ایک دم اپنی آنکھیں کھولیں.....ان کی آنکھیں بے انتہا سرخ ہو رہی تھیں، جیسے شدت جذبات سے مغلوب ہو رہی ہوں اور ان سے ایسی چمک خارج ہو رہی تھی.....جس کی جانب نظر اٹھا کر دیکھنے کی.....امجد میں ہمت نہ تھی.....اس نے نظریں جھکا لیں۔

''پوچھو.....کیا جاننا چاہتے ہو؟'' صوفی صاحب نے آہ بھر کر نم آواز میں کہا۔

''اللہ کیا ہے.....؟''

''جو نظر نہ آئے مگر کائنات کی ہر شے اور ذرے ذرے میں دکھائی دے۔''

''انسان کیا ہے.....؟''

''جو نظر وہ آئے...... جو اندر سے نہ ہو...... مگر حقیقت میں کچھ ''اور'' ......

''اللہ نے انسان کو کیوں پیدا کیا ہے؟''

''آزمائش کے لیے...... کہ کون اس کے راستے پر چلتا ہے...... کون اس کی رضا پر راضی رہتا ہے...... کون اس کی شکرگزاری کرتا ہے اور کون اس کی نافرمانی کرتا ہے۔''

''وہ...... انسان جس کو اس نے خود جھگڑالو، کمزور، جلد باز...... احسان فراموش اور ناشکرا کہا ہے کیسے اس میں شکرگزاری اور فرمانبرداری پیدا ہو سکتی ہے؟'' امجد نے پوچھا۔

''اس نے کچھ انسانوں کو چوپایوں سے بدتر بھی کہا ہے اور بہت سے انسانوں پر خود سلام بھی بھیجا ہے۔''

''وہ نیکوکاروں اور گمراہوں کو خود ہی پیدا کرتا ہے...... اچھا یا برا ہونا انسان کے اپنے بس میں تو نہیں؟'' امجد نے پھر پوچھا۔

''فطرتِ سلیمہ ہر انسان کے اندر موجود ہے اور ہدایت کے مواقع بھی سب کو ملتے ہیں...... اس لیے بہت کچھ انسان کے بس میں ہے ویسے بھی نیکوکار، بدکاروں سے زیادہ آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں۔''

''کیسی آزمائش......؟'' امجد نے چونک کر پوچھا۔

''جن کو نعمتیں ملتی ہیں...... وہ اس آزمائش میں ہوتے ہیں کہ وہ ان کو کیسے...... کس طرح اور کہاں استعمال کرتے ہیں...... دولت، عزت، شہرت، اقتدار اور صحت کو کہاں اور کس کے لئے خرچ کیا اور گنہگاروں کے لئے نعمتیں یوں آزمائش بنتی ہیں کہ انہوں نے ان کو کس طرح برباد کیا۔ جواب دیا گیا۔

''کچھ لوگ ساری زندگی مصائب، تکالیف، غربت، بیماریوں اور اذیتوں میں گزارتے ہیں...... جبکہ کچھ لوگ ساری زندگی خوشحال رہتے ہیں...... خوش اور پرسکون رہتے ہیں...... ناخوش اور غریب انسان کا کیا قصور ہے کہ وہ ایسی زندگی گزارتا ہے اور خوشحال نے کیا اچھے کام کیے ہیں کہ قدرت ہمیشہ ان پر مہربان رہتی ہے؟'' امجد نے پھر سوال کیا۔

''مصیبت زدہ...... غریب اور خوشحال دونوں ہی قدرت کی جانب سے آزمائش میں ہے۔ پریشان تو اللہ کی طرف سے آزمائش میں ڈالا جاتا ہے اور دوسرے اس کے اردگرد خوشحال لوگوں کی یہ آزمائش یہ ہے کہ وہ اس پریشان اور دکھی انسان کی تکالیف کس طرح کم کرتے ہیں...... اگر وہ ان کے لئے کوئی جدوجہد نہیں کرتے تو وہ زیادہ عذاب کے مستحق ہوں گے۔''

''انسان اتنا مضطرب کیوں رہتا ہے؟''

''اپنے آپ سے دوری کی وجہ سے...... اپنی خوشیوں اور سکون کا سامان دنیا سے ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہے...... مگر خوشی اور سکون تو اسے اپنے اندر ملتا ہے مگر وہ اس کی طرف توجہ نہیں دیتا اور مضطرب رہتا ہے۔

''انسان کیسے اللہ کا شکرگزار بنے؟''

''انسان کا جسم.....اس کا ایک عضو.....اس کے جسم کی حرکات.....اس کی سانسیں.....ہر شے اللہ کے حکم کی تابع ہے.....اگر اللہ آنکھ، کان، ناک، دل، دماغ سے اس کی صلاحیت چھین لے.....تو کون اس کو وہ سب عطا کرنے والا ہے.....انسان جب ان نعمتوں کے بارے میں غور و فکر کرتا ہے تو اس کے اندر تشکر کے احساسات پیدا ہوتے ہیں.....جو اسے رفتہ رفتہ اللہ کے قریب لے آتے ہیں اور اسی سے وہ اس کا 'شکر گزار' بن جاتا ہے۔

''انسان کو ناشکرا کیوں کہا گیا ہے؟''

''دنیا کے سب انسانوں کو سب نعمتیں نہیں ملتیں.....ہر ایک کے اندر یا باہر اللہ کوئی نہ کوئی کمی ضرور رکھتا ہے.....تاکہ انسان.....اپنے آپ کو سب سے افضل اور برتر نہ سمجھے.....اسے اپنی کم مائیگی کا احساس رہے.....مگر انسان اس کمی کو ہی اپنی زندگی کا حاصل اور سب کچھ سمجھ کر واویلا کرتا رہتا ہے اور دوسری بے شمار نعمتوں کو بھول جاتا ہے.....اس شے کے نہ ہونے پر اللہ سے شکوے شکایتیں کرتا ہے، جھگڑے اور بحثیں کرتا ہے اور 'ناشکرا' کہلاتا ہے۔

''انسان کو تکلیف میں پیدا کیا گیا ہے۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی بے قراری اسے پریشان رکھتی ہے یا پھر باہر کے مسائل.....انسان نے کیا گناہ کیا ہے.....کہ اسے کبھی سکون نہیں ملتا.....؟''

''انسان کی سرشت میں بے قراری اور اضطراب رکھا گیا ہے یہ 'اضطراب' انسان کے لیے ایک نعمت ہے.....یہی اضطراب اسے اللہ تک لے جاتا ہے.....پرسکون اور پرمطمئن انسان کبھی نہ.....تو اللہ کی طرف دیکھے.....اور نہ ہی اس کی جستجو کرے۔ مگر وہ اس اضطراب کی وجہ نہیں سمجھتا اور بے سکون رہتا ہے۔

''اللہ نے یہ دنیا انسان کے لئے ہے بنائی اور پھر انسان کو کہتا ہے کہ اس میں دل نہ لگاؤ.....اگر انسان دنیا کی جانب نہیں دیکھتا تو کیا دنیا کو بنانے کا مقصد ختم نہیں ہو جائے گا؟''

''اللہ نے دنیا انسان کے لئے بنائی ہے اور انسان اپنے لئے بنایا ہے.....بگاڑ تب پیدا ہوتا ہے جب انسان اپنی راہیں بدلتا ہے.....''

''بعض اوقات.....کچھ انسان ساری زندگی انتہائی محنت اور جدوجہد کرتے ہیں مگر انہیں صلہ کچھ نہیں ملتا.....یا پھر بہت کم ملتا ہے.....کیا یہ نہیں فرمایا گیا کہ انسان کو وہی ملتا ہے.....جتنی وہ جدوجہد کرتا ہے.....پھر ایسا کیوں ہوتا ہے؟''

''یہ بھی آزمائش ہوتی ہے کہ کون اس کی رضا پر صابر و شاکر رہتا ہے مگر انسان واویلا کرنے لگتا ہے اور اللہ کے وعدے کو بھول جاتا ہے کہ وہ نہ تو کسی کے ایمان کو ضائع کرے گا اور نہ کسی کے رتی بھر عمل کو.....وہ انسان کو ہر شے کا پورا پورا بدلہ دے گا۔ انسان فوری نتیجہ چاہتا ہے مگر اللہ دانا اور حکیم ہے وہ بہتر جانتا ہے کہ انسان کو کب اور کیا ملنا مناسب ہے۔''

''انسان کسی ایک بات پر مطمئن کیوں نہیں ہوتا.....اگر وہ اپنے آپ کو اللہ کی رضا پر ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے تو اگلے ہی لمحے اس میں دنیا کی طلب جڑ پکڑنے لگتی ہے.....اور انسان خود ہی پریشان ہو جاتا ہے۔''

''مٹی کی فطرت ہی یہی ہے۔ کبھی ہوا کے جھونکوں کے ساتھ اڑنے لگتی ہے تو کبھی بارش کے پانی کے سنگ مائع بن کر بہنے لگتی ہے اور کبھی دھوپ کی حدت سے کڑکڑانے لگتی ہے، مگر جتنا اسے کھودتے جاؤ.....اندر سے وہ.....وہ کچھ ملتا ہے کہ انسان حیران رہ جاتا ہے۔ اسی طرح جب

انسان بھی اپنے اندر کا راز پا لیتا ہے تو اسے قرار آنے لگتا ہے۔"

"کیسا راز......؟"

"مٹی کا راز......اور......اس میں چھپے خزانوں اور اس ذرّہ نایاب کا راز"

"وہ کیا ہے......؟"

"اللہ کا عرفان......"

"وہ کیسے ملتا ہے......؟"

"اپنے آپ کو کھوجنے سے......"

"کیسی کھوج......؟"

"یہ کہ انسان کے پاس اپنا کیا ہے...... اور اللہ کا دیا ہوا کیا کچھ ہے...... اور جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پاس تو اپنا کچھ بھی نہیں سب کچھ اللہ کا دیا ہوا ہے...... تو اسے اس کی ہستی کا 'عرفان' حاصل ہونے لگتا ہے......"

"اس کا انسان پر منفی اثر بھی تو ہو سکتا ہے...... اور وہ اپنے آپ کو بے بس...... مجبور اور بدقسمت سمجھنے لگتا ہے کہ وہ قدرت کے ہاتھ میں ایک کٹھ پتلی کی مانند ہے...... جو سانس بھی اپنی مرضی سے نہیں لے سکتا...... جس کی کوشش تب کامیاب ہو گی...... جب وہ چاہے گا...... اس کو وہی ملے گا...... جو اللہ نے اس کی قسمت میں لکھا ہوگا...... وہ ہزار جدوجہد کرے...... منصوبے بنائے...... کوششیں کرے...... اسے کچھ نہیں ملے گا...... سوائے خدا کی مرضی کے......؟"

"سوچ کا یہی فرق اسے عرفان کی بلندیوں تک بھی لے جا سکتا ہے اور ذلت کی پستیوں تک بھی...... اگر انسان مثبت انداز میں سوچتا ہے کہ اس کی نیت، سوچ، ارادے اور عمل پر قدرت حاوی ہے...... انسان کی مجال کچھ نہیں تو وہ اس کی رضا پر مطمئن ہونے لگتا ہے اور اس کے اندر شکر گزاری اور قناعت پسندی پیدا ہونے لگتی ہے...... وہ 'شاکرین' اور 'صالحین' میں شامل ہونے لگتا ہے اور جب وہ منفی طور پر سوچنا شروع کرتا ہے اور اپنے آپ کو بے بس اور مجبور خیال کرتا ہے تو اس کے اندر منفی جذبات پیدا ہونے لگتے ہیں وہ اپنے آپ کو بے بس اور مجبور سمجھ کر واویلا کرنے لگتا ہے...... شکوے کرنے لگتا ہے اور ناشکروں اور گنہگاروں کی صف میں کھڑا ہو جاتا ہے...... بات صرف سوچ کے زاویے ٹھیک رکھنے کی ہے۔"

"انسان کو نیکی اور بدی کی توفیق بھی تو وہی دیتا ہے...... اور خود کہتا ہے" کہ انسان کچھ سوچ بھی نہیں سکتا مگر جو میں چاہوں۔" انسان کیسے اور کس بات پر عمل کرے...... جبکہ سوچ ہی اس کے اختیار میں نہیں......؟"

"انسان کی سوچ پر اس کی فطرت غالب آتی ہے اور ہر وہ انسان جو فطرت سلیم یعنی خدا کی فطرت پر قائم رہے گا...... اس کی سوچ اس کی فطرت کے مطابق رہے گی...... سوچ کی ڈوریں انسان کی فطرت کے ہاتھ میں ہوتی ہیں...... اگر فطرت اچھی ہے تو انسان میں ہزار منفی سوچیں جنم لے لیں مگر وہ اپنی فطرت کے مطابق ہی عمل کرے گا...... دوسری بات سوچ کا تعلق انسان کے دماغ سے ہے جو کچھ بھی نہیں مگر ایک سیال مادہ ہے،

دماغ سے سوچ کو منسوب کرنا اس کی شان ہے...... انسان کے تمام اعضاء یعنی دل، دماغ، آنکھوں اور پیٹ میں موجود اعضاء کی باطنی خصوصیات کا تعلق اللہ سے ہے۔ گوشت پوست، خون اور ہڈیوں سے بنا انسان کچھ بھی نہیں...... اصل انسان تو اس کے اندر ہے...... اس کا باطن...... اور باطن کا تعلق روح سے ہے اور روح کا اللہ سے...... انسان ظاہری اور باطنی طور پر اللہ سے منسلک ہے...... انسان اپنے باطن میں موجود ذرا سی اچھائی بھی محسوس کرے گا...... تو اللہ اسے اس راستے کی توفیق ضرور دے گا......"

"اور جن کے دلوں...... آنکھوں اور کانوں پر وہ مہر لگا دیتا ہے...... جو شر پھیلاتے ہیں تو اس میں ان کا کیا قصور ہے......؟"

"پوری دنیا میں مٹی، کہیں ایک سی نہیں ہوتی، کہیں بنجر...... تو...... کہیں زرخیز...... یہ قدرت کی شان ہے۔ بنجر میں ہزار بیج بوؤ...... پانی دو...... کھاد ڈالو...... مگر وہ کبھی بھی پھل پھول نہیں اُگائے گی...... اور زرخیز کو تو ایک پھوار ہی کافی ہوتی ہے۔ نیک فطرت لوگ نیک ماحول کا اثر جلد قبول کر لیتے ہیں اور بدفطرت لوگ نیکی کے سائے میں رہ کر بھی اس کا اثر قبول نہیں کرتے ایسے لوگ نیکوکاروں کے لئے آزمائش بنتے ہیں...... وہ اپنی بداعمالیوں سے ان کی راہوں میں کانٹے بچھاتے ہیں...... اگر دنیا کے سارے انسان ہی نیک ہوتے تو ان کی آزمائش کیسے ہوتی...... ایسے لوگ اپنے لئے اور نیک لوگوں کے لئے آزمائش بن کر آتے ہیں۔ رہی بات ان کے قصور کی...... تو اللہ کسی بھی انسان پر ظلم نہیں کرتا اور نہ ہی کرے گا...... کبھی کبھی کسی ظالم انسان کا معمولی سا عمل اسے نیکوکاروں کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے اور کبھی نیکوکاروں کی معمولی سی خطائیں انہیں گنہگار اور مجرم بنا دیتی ہیں...... ہر بات میں اس کی مصلحت کارفرما ہوتی ہے...... اور انسان اس کی مصلحتوں کو کبھی نہیں سمجھ پاتا......

"تو پھر اللہ انسان سے کیا چاہتا ہے......؟"

"مکمل فرمانبرداری......"

"کیسی فرمانبرداری......؟"

"وہ جو بھی کہے...... اس کو دل سے مان لے...... جہاں سے منع کرے...... اس راستے کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھے۔ جب اس کی مصلحتیں سمجھ میں آنے لگتی ہیں تو انسان خود بخود فرمانبرداری میں سرشاری محسوس کرنے لگتا ہے۔"

"کیا یہ آسان ہے......؟"

"یہی تو انسان کا امتحان ہے۔"

"اور انسان اللہ سے کیا چاہتا ہے؟"

"قدردانی...... جب وہ انسان کی ذرا سی جدوجہد کو سراہتا ہے...... اور اس کے ایمان و عمل کی تعریف کرتا ہے تو وہ اس کی خاطر ہر خطرے میں کودنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ دونوں کے درمیان محبت کا تعلق مضبوط ہونے لگتا ہے۔"

"اللہ کو انسان کا کونسا عمل برا لگتا ہے؟"

"ناشکری...... بے قدری اور احسان فراموشی کا۔"

''کیا انسان کو بھی وہی بات خوش کرتی ہے جو اللہ کو......؟''

''انسان اللہ کی ذات کا پرتو ہے...... اس نے اپنی ذات کی خوبیاں انسان کو عطا کی ہیں۔ ان خوبیوں سے اللہ کی ذات کا اظہار ہوتا ہے...... جب انسان رحمٰن...... رحیم...... کریم...... غفور...... غفار...... اور ستار جیسی خوبیوں کا مظہر بنتا ہے تو دنیا انسانِ کامل ﷺ جیسی ہستی کی برکات سے لطف اندوز ہوتی ہے اور جب انسان قہار و جبار جیسی صفات کو اپنے اوپر حاوی کر لیتا ہے تو انسان فرعونیت اور نمرودیت کا لبادہ اوڑھ کر دنیا کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیتا ہے۔''

کیا انسان کے اندر اتنا سب کچھ ہے......؟''

''ہاں...... مٹی اپنے سینے پر سنگلاخ چٹانوں کے بلند و بالا پہاڑوں...... برف پوش چوٹیوں...... وسیع و عریض سمندروں، سبز و شاداب میدانوں اور بے آب و گیاہ، ویرانوں اور خوفناک تاریک جنگلوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے اور یہ سب کچھ انسان کے اندر بھی ہے...... پہاڑوں جیسی ہمت...... برف پوش چوٹیوں جیسی اونچائی اور سردمہری...... سمندروں جیسی روانی اور گہرائی...... شاداب میدانوں جیسی زرخیزی ویران میدانوں کا سا بنجر پن...... اداسی...... ویرانی اور جنگلوں کی سی تاریکی سب اس کے اندر موجود ہے۔''

اتنی صلاحیتوں کا مالک انسان...... لمحوں میں مایوس اور ناامید کیوں ہو جاتا ہے؟''

''انسان صلصال (کھنکتے گارے) اور طین لازب (چپکتی ہوئی مٹی) سے بنا ہے۔ کھنکتا ہوا گارا ذرا سی حرکت پر بجنے لگتا ہے۔ انسان بھی ایک لمحے میں خوش ہو جاتا ہے اور طین لازب (چپکتی ہوئی مٹی) سے بنا انسان فوراً پرنم ہو جاتا ہے۔ یہ مٹی کی سرشت ہے۔ ہوا سے اڑنے لگتی ہے اور ذرا سی پھوار سے پرنم ہو جاتی ہے...... انسان بھی ذرا سی بات سے خوش ہو جاتا ہے اور ذرا سی بات پر دکھی اور پرنم...... آنسو بہانے لگتا ہے...... کھنکتا گارا...... بات کی حقیقت اور مصلحت جانے بغیر واویلا کرنے لگتا ہے......'' ''اللہ نے انسان کو ہی اپنا نائب کیوں بنایا؟ کسی نوری یا ناری کو کیوں نہیں؟''

''اللہ بہت وسعت والا ہے...... اور مٹی میں جو وسعت ہے وہ نور یا نار میں نہیں...... نور میں بہت نورانیت اور تابانی ہوتی ہے مگر ویسی وسعت نہیں جیسی مٹی میں ہوتی ہے۔ نار بھی (آگ) لمحوں میں بھڑک کر جلا کر راکھ کر دیتی ہے، جبکہ مٹی کو جتنا کھودتے جاؤ...... تہہ در تہہ اس کے اندر سے خزانے ملتے جائیں گے...... نور اور نار میں مٹی اور اس کی صلاحیتوں کا جذب ہونا ناممکن تھا، جبکہ مٹی اپنے اندر نور اور نار کی صلاحیتیں سمو سکتی ہے...... مٹی ظاہراً عام مگر بہت پراسرار ہوتی ہے۔ اپنے اندر عجائبات کے خزانے پوشیدہ رکھتی ہے مگر کچھ ظاہر نہیں کرتی...... انسان بھی اپنے اندر وہ کچھ رکھتا ہے جس کو اسے خود ساری زندگی خبر نہیں ہو پاتی۔''

''کیوں......؟''

''وہ باہر دیکھتا ہے اور اپنے اندر جھانکنے کی کوشش نہیں کرتا، وہ ایسا کیوں نہیں کرتا......؟''

''اپنے اندر جھانکنے کے لئے دیدۂ بینا چاہئے...... ایسی آنکھ جس میں جستجو، شوق، لگن اور محبت ہو...... مگر انسان فطرتاً جلد باز ہے...... وہ ہر بات کا فوری نتیجہ چاہتا ہے...... مگر اللہ کی مصلحتیں انسان سے صبر اور ثابت قدمی کا تقاضا کرتی ہیں...... انسان فوری نتیجہ نہ پا کر گھبرا جاتا ہے۔ واویلا

کرنے لگتا ہے اور سرکشی پر اتر آتا ہے اور اسی جلد بازی میں اپنے کام خود ہی بگاڑ لیتا ہے...... اسی لئے اللہ نے انسان کی قسمت خود لکھی ہے اگر اس کا بھی اختیار انسان کو دے دیا جاتا تو وہ نہ تو کبھی خدا کی طرف رجوع کرتا اور نہ ہی کسی اور کو اپنے سے آگے بڑھنے دیتا...... روئے زمین پر صرف تباہی و بربادی اور غارت گری نظر آتی...... کیونکہ انسان کو اپنی ذات، اپنا وجود، اپنا نفس، اپنی خوشیاں اور اپنے غم بہت عزیز ہیں...... وہ کسی شے کو کھونا نہیں چاہتا، اسے دوسروں کی تکلیف اور رنج کا اندازہ جب ہی ہوتا ہے جب وہ اپنی کسی عزیز شے کو کھو کر ان مراحل میں سے گزرتا ہے...... اس لئے قدرت نے یہ فیصلہ اور اختیار اپنے پاس رکھا ہے کہ کسی کو کیا ملنا ہے...... اور کس کو کس شے سے محروم رکھنا ہے...... جبکہ حقیقت میں دونوں ہی آزمائش میں سے گزر رہے ہوتے ہیں...... مگر انسان سمجھتے نہیں۔"

"انسان اتنا پیچیدہ کیوں ہے؟"

"اللہ کو ایسے ہی انسان کی ضرورت تھی۔ سیدھا سادھا بے وقوف انسان اللہ تک کبھی نہ پہنچ پاتا۔"

"کیا مطلب......؟"

"یہ پوری کائنات اللہ کا کینوس ہے اور انسان اس کینوس پر اس کا شاہکار ہے۔"

"شاہکار......؟"

"ہاں......"

"سب انسان یا صرف چند......؟"

"انسان کا جسم...... اس کے اعضاء...... ان کی بناوٹ...... ان کے افعال...... اس کے اندر انسان کا نفس...... اس کا باطن...... اس کی روح...... اس کے اندر خیر و شر، خوبیاں و خامیاں اضطراب، بے قراری...... سکون...... اور پھر ان کے اندر پوشیدہ 'عرفان'...... جس میں یہ سب ہو وہی اس کا 'شاہکار' ہے۔"

"کس کا عرفان......؟"

"اللہ کا...... جس کے لئے اس نے اسے پیدا کیا ہے۔"

"انسان کو پیدا کرنے کا مقصد کیا ہے؟"

"اللہ ایک چھپا ہوا خزانہ تھا۔ اس کی بے شمار صلاحیتوں، کرامات، معجزات کا اظہار انسان کے ذریعے ہوتا ہے...... اگر انسان نہ ہوتا تو اللہ کو کون جان پاتا۔"

"اللہ اور انسان کا تعلق کیا ہے؟"

"جو "اللہ اور انسان" کے آغاز میں "الف" کا ہے۔"

"کیا مطلب......؟"

''الف سے مراد 'اسرار' اور 'امید' ہے۔''

''اللہ اسرار تھا اور انسان بھی اسرار ہے۔ 'اسرار' نے 'اسرار' کو تخلیق کیا ہے۔''

''کیسا اسرار......؟''

''اللہ کی حقیقت کوئی نہیں جان سکتا مگر انسان کے ذریعے اس اسرار سے واقفیت ہوتی ہے۔''

''کیسے......؟''

''انسان کا نفس بہت بڑا اسرار ہے، جب انسان اپنے نفس کے اسراروں سے آشنا ہو کر اپنے بہت اندر چلا جاتا ہے تو وہاں اسے اللہ کے اسراروں سے آشنائی ہوتی ہے۔''

''کیسی آشنائی......؟''

''اللہ کی ذات سے آشنائی...... انسان جب اپنی ذات کی نفی کرتے ہوئے اور نفس کے تقاضوں کو جھٹلا کر اور اسے پاک کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہے تو اسے اپنے سینے کے اندر 'اللہ' مل جاتا ہے اور جب وہ مل جاتا ہے تو انسان اس دنیا کی ہر شے سے بے نیاز ہو جاتا ہے...... اسے کسی شے کی نہ ہوس رہتی ہے نہ لالچ...... اس کا دل دنیا کی ہر شے سے بھر جاتا ہے اور کوئی خوشی اسے مطمئن اور خوش نہیں کر پاتی...... سوائے اس خوشی کے...... کہ وہ اس کے راستے پر...... اس تک پہنچنے کی جدوجہد کر رہا ہے۔ دنیا سمٹ کر ذرۂ خاک بن جاتی ہے، اس کی نظر افلاک پر نہیں اپنے دل کے نہاں خانوں میں، اس ہستی کو پانے کی جستجو میں لگی رہتی ہے...... دنیا کی ہر شے اس کے سامنے بے وقعت اور بے حقیقت ہو جاتی ہے۔ اسی آشنائی تک پہنچ کر وہ 'اللہ' کے اسرار کو پاتا ہے۔ اسرار تک رسائی اسے...... اس 'دیے' تک لے جاتی ہے جو روشن تو عرش پر ہے مگر جس کی روشنی انسان کے سینے کو ہر دم منور کرتی رہتی ہے اور الف سے شروع ہونے والے اسرار کا یہ سفر امید پر ختم ہوتا ہے۔''

''کیسی امید؟''

''جب انسان بہت مایوس اور دکھی ہوتا ہے...... تو اگلے ہی لمحے وہ پرامید ہو جاتا ہے...... کیونکہ اللہ انسان کے اندر ہمیشہ ایک 'امید' کی صورت میں موجود رہتا ہے، جو انسان کو نہ کسی آزمائش میں تنہا چھوڑتا ہے نہ کسی دکھ میں...... نہ تنہائی میں...... نہ گھٹا ٹوپ اندھیروں میں...... نہ طوفانوں میں...... نہ ویرانوں میں...... نہ آگ کے الاؤ میں اور نہ سولی کے تختہ داروں پر...... انسان اٹھ اٹھ کر گرتا ہے...... پھر اٹھتا ہے...... مات کھاتا ہے...... پھر حوصلہ پاتا ہے...... پھر جدوجہد کرتا ہے...... اور ساری زندگی جدوجہد کا یہ سفر جاری رہتا ہے...... کیونکہ اس جدوجہد کے پیچھے اللہ ایک 'امید' کی صورت میں اندر ہی اندر انسان کو حوصلہ دیتا رہتا ہے۔''

''جب انسان تنہائی میں آنسو بہاتا ہے...... تو وہ اندر سے اسے حوصلہ دیتا ہے...... دیکھو...... میں تمہارے ساتھ ہوں...... مجھ پر یقین رکھو...... اگر تم مجھ پر ایمان رکھو گے تو...... میں تمہیں کبھی ٹوٹنے...... اور جھکنے نہیں دوں گا...... اگر مجھ پر توکل اور بھروسہ رکھو گے...... تو ہر خطرے اور ہر آزمائش سے میں تمہیں بچاؤں گا...... اگر تم مجھ سے محبت کرو گے...... تو اپنی ایسی محبت سے نوازوں گا کہ دنیا کی ساری محبتوں کو بھول جاؤ گے...... اگر

اپنی چاہتوں کو میری چاہتوں کے سپرد کرو گے تو میں ایسی چاہتوں سے نوازوں گا کہ کسی شے کی تمنا نہیں رہے گی......'' صوفی صاحب رکے اور ان کی آنکھوں سے آنسو شدت سے رواں ہو گئے اور وہ ہچکیاں لینے لگے...... سسکیاں بھرنے لگے...... امجد کی بھی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ نوری مخلوق پر ہیبت سی طاری ہونے لگی...... بڑی سرکار تک ایسی رسائی...... اور ایسے قرب...... کا وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے...... یہ بندۂ خاکی کہاں سے کہاں جا پہنچا تھا...... ایسی محبت...... ایسا عشق...... ایسا عرفان...... اور اس پر یہ اشکباری......؟ وہ اپنے آپ کو بے بس پانے لگے...... انہوں نے سفید روشنی کی جانب دیکھنا چاہا مگر دیکھ نہ سکے جو انتہائی فاتحانہ انداز میں چمک رہی تھی۔ آپ پاک ہیں، ہمارا علم اور عقلیں محدود ہیں...... ہم آپ تک ایسی رسائی کبھی بھی نہیں پا سکتے تھے...... انسان واقعی ہی آپ کا شاہکار ہے۔'' انہوں نے سر جھکا لیے۔

سفید روشنی چمکی...... یوں جیسے مسکرا رہی ہو۔

صوفی صاحب کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہونے لگی مگر ان کے آنسو تھم نہیں رہے تھے۔

''وہ ہم انسانوں سے بہت محبت کرتا ہے...... مگر ہم نہ تو اس کی محبت کو سمجھ پاتے ہیں اور نہ ہی اس سے ویسی محبت کر پاتے ہیں...... جیسی وہ ہم سے کرتا ہے...... کہتا ہے...... میری طرف ایک قدم بڑھاؤ گے میں تمہاری طرف دوڑ کر آؤں گا۔ جب تم اپنے نفس کو میری خواہشات رضا کے تابع کرو گے...... تو میں تم پر اپنی رحمتوں اور برکتوں کے دروازے کھول دوں گا...... تم کو وہ کچھ عطا کروں گا...... جن کا تم تصور بھی نہیں کر سکو گے...... مگر ہم گنہگار اس سے ویسی محبت کر ہی نہیں پاتے......''

''کیوں......؟''

''ہم سب کچھ جاننے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ مانتے بھی ہیں...... اور پھر عمل کرتے ہوئے رک جاتے ہیں۔ وجہ ہماری جہالت ہے۔''

''کیا...... انسان کو اللہ کی محبت پر یقین نہیں ہوتا......؟''

''یقین تو ہوتا ہے...... مگر اس کی محبت کی راہ بہت کٹھن ہے...... انسان گھبرا جاتا ہے...... اندر ہی اندر ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے...... سنبھلنے کی کوشش کرتا ہے...... پھر بکھر جاتا ہے...... کھڑا ہوتا ہے، پھر گر جاتا ہے...... اور اس قدر ٹوٹنے اور گرنے سے وہ ہمت ہار بیٹھتا ہے...... اس کی محبت کی راہ پر کانٹے ہی کانٹے ہیں جو انسان کو لہولہان کر دیتے ہیں...... اس کی محبت کا دم بھرنے والے بھی اس سے شکوے کرنے لگتے ہیں...... شور مچانے لگتے ہیں...... اسے پکارتے ہیں کہ وہ ان کی مدد کیوں نہیں کر رہا، کھوکھلے دعوے کرنے والے...... وہیں سے پلٹ جاتے ہیں...... مگر جو اس سے سچی محبت کا دعویٰ کرتے ہیں اور ثابت قدم رہتے ہیں، وہ اس سے شکوے نہیں کرتے...... واویلا نہیں کرتے...... اور اسے پکارتے بھی نہیں...... اس سے مدد بھی طلب نہیں کرتے...... اور نہ ہی کوئی سوال کرتے ہیں......''

''کیوں......؟''

''وہ کہتے ہیں...... ہمارا سب کچھ تیرا ہے...... ہم تیری رضا پر راضی...... اور...... شاکر ہیں...... تو ہمیں...... ہم سے بڑھ کر جاننے والا ہے...... اور اللہ اپنے ایسے بندوں سے بہت خوش ہوتا ہے اور ان پر سلام بھیجتا ہے:

"سَلَامٌ عَلٰی عِبَادَ اللّٰہِ الصّٰلِحِین"

(اللہ کے نیک بندوں پر سلام ہو)

''اوران کے مرنے کے بعدان کی روحوں کا یوں استقبال کرتا ہے۔''

''اے اطمینان پانے والی روح...... اپنے پروردگار کی طرف لوٹ جا...... تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی...... تو میرے ممتاز بندوں میں شامل ہو جا...... اور...... میری بہشت میں داخل ہو جا۔'' (البلد 28-27)

اتنا بڑا مقام...... اتنا عظیم الشان رتبہ...... اتنی قدر و منزلت اتنی توقیر و عزت...... اتنا کرم...... اور اتنی سربلندی وہ اپنے ایسے بندوں کو عطا کرتا ہے...... کہ انسان تصور بھی نہیں کر سکتا ...... ''صوفی صاحب پھر سسکیاں بھرنے لگے اور ان کی آنکھیں شدت سے آنسو بہانے لگیں۔

''کیا...... محبت...... عبادت اور اطاعت سے یہ مقام ملتا ہے؟''

''کیا یہ مقام ساری زندگی کی جدوجہد کے بعد حاصل ہوتا ہے...... ؟''

''نہیں...... اس کے حضور شدتِ محبت اور خلوص کے ساتھ...... پرامید ہو کر...... نیاز مندانہ سجدہ کرنے سے اور یہی وہ چاہتا ہے۔

وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ (العلق-19)

(اور اسے سجدہ کرو اور اس کے قریب ہو جاؤ)''

صوفی صاحب نے شدت جذبات سے مغلوب ہو کر بلند آواز میں ''اللہ اکبر'' کہا اور اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو گئے۔ امجد بھی بے تاب ہو کر سجدے میں گر گیا۔ دونوں زار و قطار رو رہے تھے...... ان کے لب خاموش تھے مگر ان کے دل تیزی سے دھڑک رہے تھے جیسے کسی کے قرب اور وصال کی تمنا کے لئے بے تاب ہو رہے ہوں۔

''یا اللہ! ہمیں معاف فرما...... ہم سے تمام برائیوں کو دور کر دے اور ہمیں نیکو کاروں کے ساتھ اٹھانا۔''

وہ فریاد کر رہے تھے، رو رہے تھے گڑگڑا رہے تھے۔ امجد کے آنسو اس کے دل کی ساری کثافتوں کو دھو رہے تھے۔ جیسے جیسے اس کے آنسوؤں میں شدت آ رہی تھی۔ اس کے دل سے بوجھ کم ہو رہا تھا۔ نجانے اس سجدے میں کیا لطف تھا کہ اس سے سر اٹھانے کو جی ہی نہیں چاہ رہا تھا۔

تمام نوری مخلوق حیران ہو رہی تھی...... انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا کہ صوفی صاحب کے ''اللہ اکبر'' کی صدائیں پوری کائنات میں ہر جگہ گونج رہی ہوں...... اور ہر ہر شے نیاز مندی سے خدا کے حضور سرنگوں ہو رہی ہو...... چاند...... ستارے...... زمین و آسمان پہاڑ و دریا...... درخت چرند و پرند...... جانور درندے...... جس تک یہ صدا پہنچ رہی تھی...... سب سر تسلیم خم کر رہے تھے۔

''انسان کا سجدہ کس قدر انمول اور قیمتی تھا...... شاید اس کا علم اسے خود بھی نہیں تھا...... تقرب کا یہ سجدہ...... آنسوؤں سے لبریز...... انسان کو رفعت اور قدر و منزلت عطا کر رہا تھا...... جس کا اسے خود بھی اتنا شعور نہیں تھا مگر کائنات کا ذرہ ذرہ اور تمام مخلوقات اس پر رشک کر رہی تھی۔''

نوری مخلوق بھی انسان کی اس صدا پر بے تاب ہو گئی...... انہوں نے سفید روشنی کی جانب دیکھا...... جس سے ست رنگی شعاعیں پھوٹ

رہی تھیں......اور یوں چمک رہی تھی......جیسے فاتحانہ انداز میں مسکرا رہی ہو۔"

وہ سب بھی بے تاب ہو کر بڑی سرکار کے حضور سجدہ ریز ہو گئے......

ان کے اندر کا اضطراب بھی ختم ہو گیا تھا......

"انسان کی تخلیق کا مقصد پورا ہو رہا تھا......جو اپنی نیاز مندی اور اطاعت گزاری سے رازِ ہستی کے اسرار سے پوری کائنات کو آشنا کر رہا تھا اور تمام مخلوقات انسان کے ساتھ مل کر اپنے خالق کی تعریف و تسبیح کر رہی تھی۔"

"ساتوں آسمان، زمین اور جو لوگ ان میں ہیں، سب اسی کی تسبیح کرتے ہیں اور مخلوقات میں سے کوئی چیز نہیں مگر اس کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتی ہے مگر تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھ سکتے۔" (بنی اسرائیل-44)

"ہم انسان کو آپ کا 'شاہکار' مانتے ہیں اور آپ کے حضور نیاز مندی سے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔" تمام نوری مخلوق نے نیاز مندی سے گڑگڑا کر کہا۔

سفید روشنی ایک دم تیزی سے چمکی......یوں جیسے فاتحانہ انداز میں مسکرا رہی ہو......اس روشنی سے نورانیت اور محبت کی ایسی شعاعیں نکل رہیں تھیں، جو کائنات کی تمام مخلوقات اور ذرے ذرے کو اپنے حصار میں لے رہی تھی اور سب اس محبت سے محظوظ اور پُر امید ہو رہے تھے۔ پوری کائنات اور تمام مخلوقات مل کر نیاز مندی سے اس کی تسبیح کر رہی تھی۔ تمام مخلوق سلام بھیج رہی تھی اور خالق سلام قبول کر رہا تھا ہر طرف نور ہی نور پھیلنے لگا اور نور کی نورانیت ہر شئے اور 'قلب' کو منور کرنے لگی۔

"سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ وَ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْم"

"اللہ پاک ہے اور اسی کی تعریف ہے اور اللہ بزرگ و برتر بہت ہی پاک ہے۔"

# ختم شد